تکملہ
تفسیر ترجمان القرآن
بلطائف البیان

للامام النواب محمد صدیق حسن خان القنوجی رحمہ اللہ

تالیف

مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۲۶۲-۱۳۴۰ھ)

تصحیح وتنقیح ونظرثانی

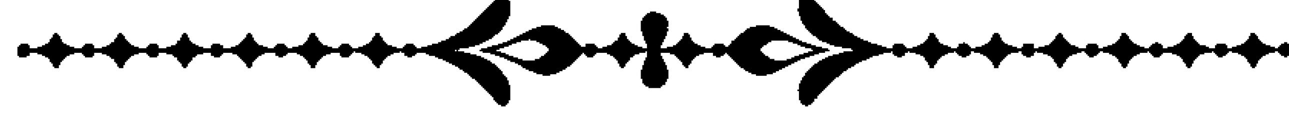
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف رحمۃ اللہ علیہ | حافظ عبداللہ سلیم حفظہ اللہ

تسہیل: محمد یحیی قریشی تخریج: حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد ہشتم

دار ابی الطیب للبحث والتحقیق

مکتبہ قدوسیہ



نام کتاب: ــــــــــ تکملہ تفسیر ترجمان القرآن

تالیف: ــــــــــ مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی

قیمت: ــــــــــ

طبع اول: ــــــــــ جون 2024ء



ناشر

دار ابی الطیب

للبحث والتحقیق

گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ

www.darabitayyab.com darabitayyab1@gmail.com

www.facebook.com/darabitayyab/

+92-55-3823990

فہرست

❊ سورت فاطر 15

❊ سورت یٰسٓ 105

❊ پارہ نمبر 23 130

❊ سورۃ الصافات 232

❊ سورۃ صٓ 372

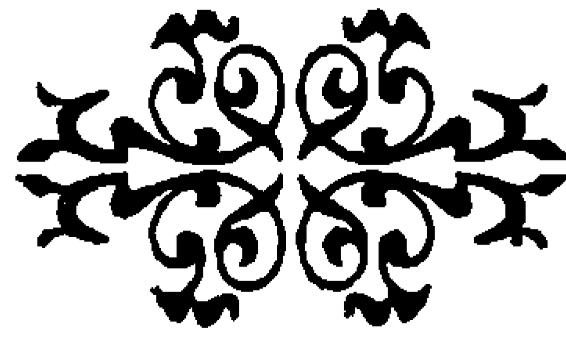
❊ سورۃ الزمر 487

❊ پارہ نمبر 24 552

❊ سورۃ المؤمن 644

❊ سورت حٰم السجدۃ 787

❊ پارہ نمبر 25 883



فہرست مضامین

* سورت فاطر 15
* قدرتِ الٰہی کے کرشمے: 15
* رحمت الٰہی کو کوئی روکنے والا نہیں ہے: 19
* توحیدِ باری تعالیٰ کی ایک ٹھوس دلیل: 21
* سابقہ انبیاء کی تکذیب کا ذکر اور رسول اللہ ﷺ کو تسلی: 22
* قیامت آ کر ہی رہے گی: 24
* شیطان تمھارا دشمن ہے، اسے دشمن ہی سمجھو: 24
* برے اعمال کو اچھا سمجھنے والوں پر افسوس مت کیجیے: 27
* زندگی بعد الموت کی دلیل: 30
* دنیا و آخرت میں عزت کا طالب اللہ ہی سے عزت طلب کرے: 31
* نیک عمل اللہ تعالیٰ کی طرف بلند ہوتا ہے: 32
* اللہ تعالیٰ ہی خالق اور علام الغیوب ہے: 33
* اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کی قدرت کی نشانیاں: 42
* مشرکوں کے معبود کسی چیز کے مالک نہیں: 43
* سب لوگ اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں: 49
* ایک موازنے کے ذریعے مومن اور کافر کے برابر نہ ہونے کا ثبوت: 54
* عظیم الشان قدرتِ الٰہی کا بیان: 59
* مسلمان ہی آخرت کی تجارت سے فائدہ اٹھانے والے ہیں: 66
* قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے: 66
* قرآنِ مجید کے وارثوں کی تین قسموں کا بیان: 69
* طریقِ دیگر: 71

- اثرِ دیگر: 72
- کافروں کی سزا جہنم کی آگ اور جہنم میں ان کی حالت کا بیان: 84
- عذر بہانے ختم ہونے کی عمر کا بیان: 85
- حدیثِ دیگر: 86
- اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب اور زمین میں لوگوں کو ایک دوسرے کا جانشین بنانے والا ہے: 91
- مشرکوں کے شریکوں کے عجز کا اور قدرتِ الٰہی کا بیان: 93
- مشرکوں کی طرف سے آمدِ رسول کا مطالبہ: 97
- رسولوں کو جھٹلانے والوں کا برا انجام: 101
- مواخذے میں دیر کیوں؟ 101

سورت یٰسٓ 105

- تعارف: 105
- فضائل: 105
- یٰسٓ کا مفہوم: 108
- قرآنِ کریم رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا ثبوت: 109
- رسول اللہ ﷺ ہادیِ عالم: 109
- بدبختوں کی حالت کا بیان: 113
- اصحاب القریہ کی پیغمبروں سے بدسلوکی: 125
- کیا بشر رسول نہیں ہو سکتے؟ 126
- انبیاء علیہم السلام کو منحوس سمجھنا اور انھیں دھمکی دینا: 131
- قوم میں سے ایک آدمی کی ان کو دعوت: 132
- کاش! میری قوم جان لے! بندۂ خدا کی مرنے کے بعد بھی قوم کی خیر خواہی: 139
- جھٹلانے والوں پر اظہارِ افسوس: 145
- عقیدۂ تناسخ کا رد: 146
- خالقِ کائنات کا وجود اور زندگی بعد الموت کا ثبوت: 150
- دن رات اور سورج و چاند جیسی قدرتِ الٰہی کی عظیم الشان نشانیاں: 154

- ✵ کشتی کی سواری، قدرتِ الٰہی کی ایک نشانی: 167
- ✵ مشرکوں کی گمراہی کا بیان: 172
- ✵ کافروں کا روزِ قیامت کو محال و بعید سمجھنا: 176
- ✵ تیسری مرتبہ صور میں پھونکے جانے پر لوگوں کے اٹھ کھڑے ہونے کا بیان: 179
- ✵ اہلِ جنت کا عیش و آرام: 183
- ✵ میدانِ حشر میں کافروں کا کیا حال ہوگا: 191
- ✵ کافروں کی جہنم پر پیشی کے وقت ڈانٹ ڈپٹ: 195
- ✵ روزِ قیامت مجرموں کے مونہوں پر مہر: 195
- ✵ انسان کو بڑی عمر کے بعد پہلی حالت پر پھیرنے کا بیان: 203
- ✵ رسول اللہ ﷺ کو شعر گوئی نہیں سکھائی گئی: 203
- ✵ چوپائے قدرتِ الٰہی کی ایک نشانی اور اس کی نعمت ہے: 212
- ✵ مشرکوں کے باطل معبود اُن کی مدد نہیں کر سکتے: 215
- ✵ رسول اللہ ﷺ کو تسلی: 215
- ✵ موت کے بعد زندگی کا انکار اور اس کی تردید: 218
- ✵ مسئلہ: 224
- ✵ کیا آسمانوں و زمین کا خالق انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں؟! 226

✵ **سورت الصافات 232**

- ✵ فرشتے اللہ تعالیٰ کی توحید پر گواہ ہیں: 233
- ✵ معبودِ برحق اللہ تعالیٰ ہی ہے: 233
- ✵ ستارے آسمانِ دنیا کی زینت اور شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ ہیں: 238
- ✵ حیات بعد الممات کا ثبوت: 244
- ✵ قیامت کی ہولناکیوں کا بیان: 246
- ✵ روزِ قیامت مشرکین کی باز پرس اور ان کی بے بسی: 253
- ✵ قیامت کے روز مشرکوں کا باہم جھگڑا: 254
- ✵ مشرکوں کی سزا اور مخلصین کی جزا کا بیان: 262

✵ اہلِ جنت کی باہم میل ملاقات: 272

✵ جہنمیوں کا کھانا اور پینا تھوہر کا درخت اور کھولتا ہوا پانی: 283

✵ حکایت: 289

✵ ڈرائے گئے لوگوں کا انجامِ بد: 291

✵ نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر: 292

✵ طوفانِ عام کا بیان: 295

✵ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر: 298

✵ قصہ ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی کا: 300

✵ ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت اور آزمائش: 309

✵ ذبیح کون تھے اسحاق علیہ السلام یا اسماعیل علیہ السلام: 310

✵ اسماعیل ذبیح ہیں یا اسحاق؟ سلف سے مروی آثار: 317

✵ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ذکر: 332

✵ الیاس علیہ السلام کا ذکر: 333

✵ قومِ لوط کی تباہی کا بیان: 339

✵ یونس علیہ السلام کا قصہ: 341

✵ اللہ تعالیٰ کی اولاد ثابت کرنے والوں کا رد: 352

✵ مشرکوں کی بات کو وہی قبول کرتا ہے جو ان سے بڑھ کر گمراہ ہے: 353

✵ فرشتوں کا مقام اور ان کا صف بستہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا: 359

✵ کفارِ قریش کا کسی کتابِ نصیحت کے ملنے کی تمنا کرنا: 360

✵ انبیاء سے نصرت کا وعدہ اور قریش سے اعراض کا حکم: 364

✵ اللہ رب العزت کی تسبیح اور رسولوں پر سلام: 366

✵ **سورت صٓ 372**

✵ رسولوں کو جھٹلانے والوں کا ذکر: 373

✵ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرنے والوں کا کیا حال ہوا؟ 376

✵ مشرکوں کے رسالت اور توحید پر تعجب کرنے کا بیان: 380

- ان آیاتِ کریمات کا سببِ نزول: 380
- مشرکین کا رسالت وقرآن سے تعجب: 385
- ہلاک شدہ گذشتہ اقوام سے عبرت: 387
- مشرکوں کے جلد عذاب طلب کرنے کا بیان اور داود علیہ السلام کا تذکرہ: 392
- داود علیہ السلام پر انعاماتِ الٰہیہ کا تذکرہ: 396
- قصہ دو جھگڑنے والوں کا: 402
- حکام وسلاطین کو وصیت: 406
- ذکرِ ابتلاء: 411
- تضعیفِ قصہ مذکور: 413
- دنیا کی پیدائش میں حکمتِ الٰہی: 417
- سلیمان بن داود علیہما السلام کا تذکرہ: 420
- سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا ذکر: 428
- ایوب علیہ السلام کا تذکرہ: 444
- چند انبیائے کرام علیہم السلام کا تذکرہ: 452
- نیک بختوں کا اچھا ٹھکانا: 454
- بدبختوں کے انجامِ بد کا بیان: 461
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ایک عظیم الشان خبر: 470
- قصہ آدم علیہ السلام اور ابلیس لعین کا: 475
- تکلفات سے ہمارا کیا لینا دینا: 483
- قرآنِ مجید ایک نصیحت: 484

سورۃ الزمر 487

- سورۃ الزمر کی فضیلت: 487
- اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کا حکم اور شرک کا رد: 488
- قدرتِ الٰہی اور توحید باری تعالیٰ کے دلائل: 495
- اللہ تعالیٰ کفر سے ناراض اور شکر سے راضی ہوتا ہے: 501

- اطاعت گزار اور نافرمان برابر نہیں ہیں: 507
- تقویٰ، ہجرت اور اخلاصِ عمل کا حکم: 512
- عذابِ الٰہی کا ڈر اور خوف: 516
- نیکوکار لوگوں کے لیے بشارت: 520
- بدبختوں کا انجامِ بد: 523
- متقیوں کے لیے جنت کے بالا خانے: 524
- دنیا کی زندگی کی ایک مثال: 528
- حق والے اور باطل پرست برابر نہیں ہیں: 531
- کلامِ الٰہی قرآنِ مجید کی مدح سرائی: 532
- جھٹلانے والے ظالموں کا انجام: 540
- بطلانِ شرک کی ایک مثال: 543
- رسول اللہ ﷺ کی وفات: 544
- جھوٹے اور سچے لوگوں کی جزا و بدلہ: 553
- سچائی لانے والا اور اس کی تصدیق کرنے والے کون لوگ ہیں: 553
- اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کافی ہے: 558
- مشرکین کا توحیدِ ربوبیت کا اعتراف: 559
- اللہ تعالیٰ ہی مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے: 564
- سفارش صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے: 565
- اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا طریقہ: 572
- قیامت کے دن کوئی فدیہ قبول نہیں ہوگا: 574
- حکایت: 576
- حضرتِ انسان کی مختلف حالتوں کا بیان: 577
- عذاب سے پہلے توبہ کی دعوت: 582
- مایوسی سے ممانعت کے بارے میں احادیث: 583
- قنوط (مایوسی) کی نفی پر احادیث: 586

- ✵ اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے والوں اور ماننے والوں کا انجام: 599
- ✵ اللہ تعالیٰ ہی خالق ومتصرف ہے: 600
- ✵ شرک سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، لہٰذا اکیلے اللہ کی عبادت بجا لاؤ: 605
- ✵ مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر شناسی نہیں کی: 605
- ✵ صور میں پھونکنے اور فیصلے اور بدلے کا دن: 615
- ✵ کفار کو جہنم کی طرف ہانکا جائے گا: 624
- ✵ پرہیز گاروں کو گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا: 628
- ✵ قیامت کے روز نبیِ مکرم ﷺ کا شرف وفضل: 628
- ✵ جنت کے دروازے آٹھ ہیں: 631
- ✵ جنت کے دروازوں کی فراخی کا ذکر: 632
- ✵ حمد ہی سے آغاز اور اسی پر اختتام: 636

✵ سورت غافر 644

- ✵ حوامیم کی فضیلت: 644
- ✵ ﴿حٰمٓ﴾ کی فضیلت: 647
- ✵ کتاب اتارنے والا اللہ بخشنے اور عذاب دینے میں بے مثل ولاثانی ہے: 648
- ✵ اللہ تعالیٰ کی وسعت وغنا کا بیان: 649
- ✵ اللہ تعالیٰ کی آیات میں جھگڑنا، کفار کی ایک نشانی ہے: 655
- ✵ تنبیہ: 660
- ✵ کافروں کا داخلِ دوزخ ہونے پر نادم ہونا: 671
- ✵ کفار کی دنیا میں لوٹائے جانے کی خواہش: 672
- ✵ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو: 674
- ✵ نکتہ: 678
- ✵ صفاتِ الٰہی کا بیان اور وحیِ الٰہی کا مقصد: 679
- ✵ فکرِ آخرت: 681
- ✵ جھٹلانے والوں کے انجامِ بد کا بیان: 692

- موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ: 695
- آلِ فرعون کے ایک مردِ مومن کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کی تائید: 701
- آلِ فرعون کا دردِ دل رکھنے والا ایک مومن شخص: 710
- آلِ فرعون کے مومن کا مزید وعظ ونصیحت 725
- مومن آلِ فرعون کا اختتامی خطاب اور فریقین کا انجام: 728
- عذابِ قبر کا اثبات: 730
- اہلِ نار کا باہمی جھگڑا: 737
- رسولوں اور مومنوں کی دنیا وآخرت میں نصرتِ الٰہی: 741
- نکتہ: 745
- حیات بعد الممات: 749
- دعا کی اہمیت وحکم: 750
- قدرتِ الٰہی اور توحیدِ باری تعالیٰ کی نشانیاں: 760
- نکتہ: 763
- شرک کی ممانعت اور توحید کا حکم: 766
- انکار کرنے والوں اور جھٹلانے والوں کا انجامِ بد: 769
- نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کا حکم اور فتح کی بشارت: 776
- چارپائے اللہ تعالیٰ کے انعامات اور آیات ہیں: 777
- سابقہ لوگوں کے حال سے عبرت: 782

سورت حم السجدۃ 787

- شانِ قرآن اور اعراض کرنے والوں کے بہانے: 788
- بشر رسول کی طرف سے توحید کی دعوت: 795
- تخلیقِ کائنات کی کچھ تفصیلات: 801
- جھٹلانے والوں کی سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ: 819
- قیامت کے روز مجرموں کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے: 829
- اعضاء کی گواہی کے بارے میں مروی احادیث: 829

- اللہ تعالیٰ کے علم سے بے پروائی تباہی کا باعث ہے: 832
- مشرکوں کے ہم نشین ان کے برے اعمال خوش نما کر کے دکھاتے ہیں: 834
- کفار کی ایک دوسرے کو قرآن نہ سننے کی نصیحت: 842
- توحیدِ الٰہی پر استقامت اختیار کرنے والوں کے لیے خوش خبری: 846
- داعی الی اللہ کی فضیلت: 856
- دعوت میں حکمتِ عملی: 858
- نکتہ: 864
- حکایت: 864
- قدرتِ الٰہی کی نشانیاں: 866
- آیاتِ الٰہی میں کج روی اختیار کرنے والوں کی سزا: 873
- قرآنِ مجید کا انکار کرنا عناد اور سرکشی ہے: 874
- قرآنِ مجید ہدایت اور شفاء ہے: 875
- نکتہ: 877
- موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے محمد ﷺ کو تسلی دینا: 884
- ہر شخص اپنے عمل کے مطابق ہی بدلہ پائے گا: 885
- قیامت کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے: 885
- مشرکوں کا قیامت کے دن شرکاء سے انکار: 886
- تنگ دستی کے بعد خوش حالی سے انسان میں کیا تبدیلی واقع ہوتی ہے: 886
- نکتہ: 890
- حکایت: 890
- انسان بڑا تھڑدلا ہے: 895
- صداقتِ قرآن کے دلائل: 895



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سُوْرَةُ فَاطِرٍ

اس سورتِ مبارکہ کو سورتِ ملائکہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی آیتیں پینتالیس (۴۵) یا چھیالیس (۴۶) ہیں۔ یہ سورت مکی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سب کے قول میں ہے۔[1] امام بخاری، ابن ضریس، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ نے دلائل میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سورۃ الفاطر مکے میں اتاری گئی۔[2] یہ سورت ختام ہے (مہر لگانے والی) ان سورتوں کا جو حمد کے ساتھ شروع کی گئی ہیں، جن میں چار نعمتوں کی تفصیل کی گئی ہے، کون سی نعمتیں جو نعمتوں کے اصول ہیں، جن کا مجموعہ سورۃ الفاتحہ میں ہے۔ وہ چار نعمتیں یہ ہیں: ایجادِ اول، پھر ابقائے اول، پھر ایجادِ ثانی جس کی طرف سورت سبا کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے، پھر ابقائے ثانی، یہ سب سے زیادہ خوش گوار اور محکم تر ہے۔ یہ وہ ختام ہے جس کی طرف اس سورت سے اشارہ کیا گیا ہے جو ابتداء کے ساتھ شروع کی گئی ہے۔[3] (قالہ الخطیب)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓىِٕكَةِ
رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا
يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، فرشتوں کو قاصد بنانے والا ہے اور جو دو دو، تین تین اور چار چار پَروں والے ہیں، وہ اللہ جو چاہے (اپنی) مخلوق میں زیادہ کرتا ہے، بلاشبہ اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ①

قدرتِ الٰہی کے کرشمے:

مخلوق میں زیادہ کرتا ہے، یعنی بڑھاتا ہے، یعنی چار سے زیادہ پَر والے بھی ہیں۔ جبریل علیہ السلام کے چھ سو پَر ہیں۔ انتہیٰ۔

① فتح القدیر (٤/٤٤٥) ② الدر المنثور (٧/٣) ③ فتح البیان (١١/٢١٥)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نہیں جانتا تھا کہ ﴿ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کیا ہے، یہاں تک کہ میرے پاس دو اعرابی آئے، وہ ایک کنویں کے بارے میں جھگڑتے تھے، ان میں سے ایک کہتا تھا: ”أَنَا فَطَرْتُهَا أَيْ: بَدَأْتُهَا“ یعنی میں نے اس کی ابتداء کی ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے: ”أَيْ: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ“ یعنی آسمانوں اور زمین کا نیا بنانے والا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر شے جو قرآن شریف میں ﴿ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] ہے تو وہ ”خَالِقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ“[1] ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک میں ہر جگہ ﴿ فَاطِرِ ﴾ کے معنی خالق ہیں۔

﴿ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ۚ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اپنے اور اپنے نبیوں کے درمیان پیغام لانے والا مقرر کرنے والا ہے۔ فرشتے پَر والے ہیں جن سے وہ اڑتے ہیں، تاکہ جس شے کا ان کو حکم ہوا ہے، اسے جلد پہنچیں۔ ان میں سے کسی کے دو پر ہیں، کسی کے تین، کسی کے چار اور کسی کے اس سے زیادہ، جس طرح کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج میں جبریل علیہ السلام کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے چھ سو پَر تھے، ان کے ہر دو پر کے درمیان اتنا فاصلہ تھا جتنا مشرق و مغرب کے درمیان ہے،[2] اسی لیے اللہ جل وعلا نے یوں فرمایا ہے: ﴿ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ۚ ﴾ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے پَروں میں اور ان کی خلق میں زیادہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ امام زہری اور ابن جریج رحمہما اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد حسنِ صوت ہے۔[3] (رواه البخاري عن الزهري في الأدب و ابن أبي حاتم في تفسيره)۔ قراءتِ شاذہ میں پڑھا گیا ہے: ”يَزِيْدُ فِي الْحَلْقِ مَا يَشَآءُ“ بہ حائے مہملہ۔ واللّٰہ أعلم۔[4] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ فاطر سے یہ مراد ہے کہ اللہ پاک آسمان و زمین کا خالق اور مبدع ہے بغیر کسی پہلے سے موجود نمونے پر اور غیر مادّی پر۔ مفسرین رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ ظاہر یوں ہے کہ یہ ازراہِ لغت ”فطر“ کے معنی سے نہیں ہے۔ مفسرین نے صرف معنی و سیاقِ کلام سے اس کو لیا ہے۔ لغت میں ”فطر“ کی اصل مطلقاً ”شَقٌّ عَنِ الشَّيْءِ“ ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”فَطَرْتُهُ فَانْفَطَرَ“ یعنی فلاں شے کو میں نے چیرا تو وہ چر گئی۔ ”فطر“ بہ معنی شگافتن ہے، اسی معنی سے ”فَطَرَ نَابُ الْبَعِيْرِ“ ہے، جبکہ اونٹ کا دانت نکلتا ہے اس وقت بولتے ہیں اور اس اونٹ کو ”بَعِيْرٌ فَاطِرٌ“ کہتے ہیں۔ ”تَفَطَّرَ الشَّيْءُ“ بہ معنی ”تَشَقَّقَ“ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ”فطر“ اس کو بولتے ہیں جو طول میں شق ہو، گویا معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے عدم کو آسمان و زمین نکالنے کے ساتھ

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (۳۱۷۰/۱۰)

② مسند أحمد (٤۰۷/۱) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: (الإسراء والمعراج: ۱۰۱/۱، ۱۰۲)

③ الدر المنثور (٤/۷)

④ تفسیر ابن کثیر (۷۱۵/۳، ۷۱٦)

2

چیرا، اس سے باب "فطر" کا "نصر" ہے، جیسا کہ مختار میں ہے۔[1] فطر کے معنی ابتداء و اختراع کے بھی ہیں۔ فتح میں کہا ہے کہ اس جگہ یہی مراد ہے۔[2] معنی یہ ہوئے کہ سب خوبی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا مبدع (ابداع نو بیرون آوردن نہ بر مثال۔ واختراع شگافتن ونو بیرون آوردن وآفریدن۔ صراح) ومخترع ہے۔

اس سے مقصود یہ ہے کہ جو ذات پاک اس خلقِ عظیم کی ابتداء کرنے پر قادر ہے تو وہ اعادے پر بھی قادر ہے۔ اللہ پاک نے اپنے نفسِ مقدس کی اس وصف کے ساتھ جو حمد فرمائی تو اس کا مقصد اپنی عظمت ظاہر کرنا ہے اور اپنے بندوں کو تعریف کرنے کی کیفیت کی تعلیم دینا ہے، تاکہ بندے اس کی حمد وثنا اس طرح کیا کریں۔ جمہور نے ﴿ فَاطِرِ ﴾ بہ صیغۂ اسم فاعل پڑھا ہے۔ امام زہری اور ضحاک رحمہما اللہ نے "فَطَرَ" بہ صیغۂ ماضی پڑھا ہے۔ پہلے کی بنا پر اللہ پاک سبحانہ کے اسم کی صفت ہے، اس لیے کہ ﴿ فَاطِرِ ﴾ کی اضافتِ محضہ، یعنی معنوی ہے، کیوں کہ وہ ماضی کے معنی میں ہے اور اگر اضافت غیر محضہ ہوگی تو بدل ٹھہرے گا۔ اسی کے مثل ﴿ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا ﴾ میں ہر دو وجۂ مذکور جائز ہیں۔[3] طیبی رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ اس جگہ ﴿ جَاعِلِ ﴾ استمرار کے لیے ہے۔ چنانچہ بایں اعتبار کہ ماضی پر دلالت کرتا ہے، صلاحیت رکھتا ہے کہ معرفہ کی صفت ہو جائے اور اس اعتبار سے کہ حال واستقبال پر دال ہے صالح ہے عمل کرنے کا۔ نصب ﴿ رُسُلًا ﴾ کا فعل مضمر سے ہے بنا بر وجہ اول، یعنی جبکہ ﴿ جَاعِلِ ﴾ اسم پاک کی صفت ہو، کیوں کہ اسم فاعل جبکہ بہ معنی ماضی ہوتا ہے تو عمل نہیں کرتا ہے۔ اور امام کسائی رحمہ اللہ نے اس کے عمل کو جائز رکھا ہے اور وجۂ ثانی کی بنیاد پر، یعنی ﴿ جَاعِلِ ﴾ بدل ہو تو منصوب ہوگا ﴿ جَاعِلِ ﴾ سے۔

فرشتوں میں سے رسول یہ چار فرشتے ہیں: جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل ۔علیہم الصلاۃ والسلام۔ چنانچہ ملائکہ سے مراد بعض ملائکہ ہیں، کیوں کہ وہ سب کے سب رسول نہیں ہیں، چنانچہ یہ بات معلوم ہے۔ یحییٰ بن سلاّم نے کہا ہے کہ اللہ پاک ان کو انبیاء علیہم السلام کی طرف بھیجتا ہے کہ وہ ان کو اللہ پاک کی رسالتیں پہنچاتے ہیں وحیِ الہام اور رؤیائے صادقہ کے ساتھ۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بندوں کی طرف نعمت یا سزا و عذاب کے ساتھ بھیجتا ہے، یا وہ اس کی کاری گری کے آثار اُن کی طرف پہنچاتے ہیں۔ حسن رحمہ اللہ نے ﴿ جَاعِلِ ﴾ کو برفع پڑھا ہے اور خلیل بن نشیط اور یحییٰ بن یعمر رحمہما اللہ نے "جَعَلَ" بہ صیغۂ ماضی اور حسن اور حمید نے "رُسْلًا" بہ سکونِ سین پڑھا ہے۔ یہ تمیم کی لغت ہے۔[4] ﴿ أُولِيْٓ ﴾ بہ معنی "ذَوِيْ" اسمِ جمع ہے "ذُوْ" کا۔ ﴿ أَجْنِحَةٍ ﴾ جمع ہے "جَنَاحٌ" کی اور ﴿ أُولِيْٓ أَجْنِحَةٍ ﴾ ﴿ رُسُلًا ﴾ کی صفت ہے۔ یہ قول لفظ کے اعتبار سے جید ہے، کیوں کہ تنکیر میں صفت و موصوف دونوں کا توافق ہے۔ یا ﴿ اَلْمَلٰٓئِكَةِ ﴾ کی صفت ہے، یہ قول معنی کے لحاظ سے جید ہے، اس لیے کہ سارے فرشتوں کے پَر ہیں، چنانچہ یہ صفتِ کاشفہ ہے۔

---

[1] مختار الصحاح (٥١٧/١) [2] فتح القدير (٤٤٥/٤) [3] فتح القدير (٤٤٥/٤)

[4] تفسير القرطبي (٣٢٠/١٤) فتح القدير (٤٤٥/٤، ٤٤٦)

رہی یہ بات کہ ﴿ اَلْمَلٰٓىِٕكَةِ ﴾ معرفہ ہے اور ﴿ اُولِيْۤ اَجْنِحَةٍ ﴾ نکرہ تو نکرہ معرفہ کی صفت کیسے ہوگا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ اَلْمَلٰٓىِٕكَةِ ﴾ میں الف لام جنسی ٹھہرایا گیا، اس لیے صفت ہونا ٹھیک بن گیا۔

﴿ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ﴾ ﴿ اَجْنِحَةٍ ﴾ کی صفات ہیں، ان میں مقصود ان کی کثرت اور مختلف ہونا ہے پَروں کی تعداد میں۔ اسی عدد میں حصر کرنا مراد نہیں ہے، ورنہ ان میں سے بعض کے تو چھے سو پَر ہیں اور اس کے سوا یہ تینوں کلمے غیر منصرف ہیں۔ اس لیے کہ ان میں تکرر عدل کا ہوا ہے، کیوں کہ الفاظ اعداد سے معدول ہوئے ہیں، ایک طرح کی صورتوں سے دوسری صورتوں کی طرف جس طرح کہ عمر عامر سے معدول ہے اور تکریر سے غیر تکریر کی طرف، چنانچہ عدل کی تکرار دو سبب کے قائم مقام ہوگئی۔ کسی نے کہا ہے کہ عدل و وصف کی وجہ سے غیر منصرف ہیں۔ اعتماد اسی قول پر ہے۔ سورۃ النساء میں اس کی تقریر گزر چکی ہے۔[1]

بالجملہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض کے دو پَر ہیں اور بعض کے تین۔ شاید تیسرا پشت کے وسط میں ہو دو پَروں کے درمیان کہ وہ ان کو قوت کے ساتھ مدد دیتا ہو اور بعض کے چار پر ہیں۔ وہ فرشتے ان پَروں کے سبب سے آسمان سے زمین کی طرف اترتے ہیں اور زمین سے آسمان کی طرف چڑھتے ہیں۔ صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل دو پَر ہیں، اس لیے کہ وہ بہ منزلہ دو ہاتھ ہیں۔ پھر تیسرا اور چوتھا زیادہ ہے اصل پر اور یہ زیادہ تر اڑنے کے لیے قوت دینے والا ہے اور اس پر زیادہ تر معین (مددگار) ہے۔[2] غرضیکہ پہلے ملائکہ کی حالت کے فرق کا ذکر کیا تو جملہ مستانفہ ﴿ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ﴾ لاکر اس کی تقریر فرمائی، اس کو ثابت اور پختہ کیا، یعنی اللہ پاک فرشتوں کی پیدائش میں اور پَروں میں جو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔

امام زجاج اور فراء رحمہما اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے، کہا کہ پیدائش میں یہ زیادتی فرشتوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ امام زہری اور ابن جریج رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ وہ زیادتی خوش آوازی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آنکھوں میں ملاحت (خوبصورتی) اور ناک میں حسن اور زبان کی مٹھاس ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ چہرۂ خوب۔ کسی نے کہا ہے خطِ خوب۔ کسی نے کہا ہے کہ شعرِ جعد، یعنی پُرشکن بال۔ کسی نے عقل اور تمیز۔ کسی نے کہا ہے کہ علوم و صنائع۔ کسی نے کہا کہ دلکش آواز، نغمہ اور جودت اور متانتِ عقل ہے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ کسی خاص نوع تک ہی زیادت سمجھی جائے، بلکہ ہر زیادۃ فی الخلق کو شامل ہے، جیسے: طولِ قامت، اعتدالِ صورت، تمامی در اعضاء اور قوت بطش میں، حصافت عقل میں، جزالت رائے میں، جرأت دل میں، سماحت نفس میں، لباقت تکلم میں، حسنِ تانی مزاولتِ امور میں، ذلاقت زبان میں، محبت مومنین کے دلوں میں اور ان جیسے اور امور جو بیان سے باہر ہیں۔

---

[1] ، قبہ الآیة (۳) [2] فتح البیان (۱۱/۲۱۸) [3] تفسیر القرطبي (۱٤/ ۳۲۱)

امام زمخشری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] جملہ ﴿ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ تعلیل ہے ماقبل کی، یعنی جملہ ﴿ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ﴾ کی۔[2]

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲

اللہ لوگوں کے لیے (اپنی) رحمت سے جو کھول دے تو کوئی اسے بند کرنے والا نہیں، اور جسے وہ بند کر دے اس کے بعد کوئی اسے بھیجنے (کھولنے) والا نہیں، اور وہ غالب، خوب حکمت والا ہے ②

رحمت الٰہی کو کوئی روکنے والا نہیں ہے:

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے چاہا وہ ہو گیا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا اور اس شے کا روکنے والا کوئی نہیں جو اس نے عطا کی اور نہ کوئی اس شے کا عطا کرنے والا ہے جو اس نے روک رکھی۔ کاتبِ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ورّاد سے مروی ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ تو مجھے لکھ بھیج جو تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ چنانچہ مجھے سیدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ نے بلایا تو میں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف یہ لکھا: بے شک میں نے سنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ جب نماز سے فارغ ہوتے تو فرماتے تھے: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ وَلَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ» ''اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے۔ اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔ اے اللہ! تیری عطا کو کوئی روکنے والا نہیں اور تیری روکی ہوئی چیز کو کوئی عطا کرنے والا نہیں اور کسی دولت مند کو اس کی تونگری تیرے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔'' نیز میں نے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیل و قال و کثرتِ سوال سے اور مال کے ضائع کرنے سے اور بیٹیوں کے زندہ گاڑ دینے سے اور ماؤں کی نافرمانی سے اور منع وہات (دوسروں کے حق روکنے اور سوال کے لیے ہاتھ پھیلانے) سے منع فرماتے تھے۔[3] (أخرجه الإمام أحمد وأخرجاه من طرق عن ورّاد به)

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تو فرماتے: «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ، مِلْءَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، اَللّٰهُمَّ أَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ، أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ، وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ»[4] (أخرجه مسلم في صحيحه) ''اللہ نے سن لی جس نے اس کی حمد کی،

① الكشاف (٣/ ٦٠٥۔ ٦٠٦) ② فتح البيان (١١/ ٢١٧۔ ٢١٩)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٨) صحيح مسلم (٥٩٣) مسند أحمد (٤/ ٢٥٤) ④ صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧٧)

اے اللہ! ہمارے رب! تیرے ہی لیے تعریف و توصیف ہے آسمان بھر، زمین بھر اور ان کے سوا جو تو چاہے اس کی وسعت بھر۔ ثنا اور عظمت کے حقدار اے اللہ! (یہی) صحیح ترین بات ہے جو بندہ کہہ سکتا ہے اور ہم سب تیرے ہی بندے ہیں۔ اے اللہ! جو کچھ تو عنایت فرمانا چاہے، اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جس سے تو محروم کر دے، وہ کوئی دے نہیں سکتا اور نہ ہی کسی مرتبے والے کو تیرے سامنے اس کا مرتبہ نفع دے سکتا ہے۔'' یہ آیتِ کریمہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ﴾ [یونس: ۱۰۷] ''اور اگر تم کو اللہ کوئی تکلیف پہنچائے تو بجز اس کے اور کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تم کو کوئی خیر پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں۔'' اس کی نظیر اور بہت سی آیتیں ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جس وقت لوگ پانی برسائے جاتے تھے تو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''مُطِرْنَا بِنَوْءِ الْفَتْحِ'' یعنی ہم پانی برسائے گئے بہ سبب بچھتر فتح کے، پھر یہ آیت پڑھتے: ﴿ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ ... الآية ﴾ [1] (رواه ابن أبي حاتم عن يونس بن وهب عنه، كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ تیرے واسطے امر سے کچھ نہیں ہے، یعنی تیرے قبضے میں کچھ نہیں ہے، چنانچہ جس شے کو اللہ تعالیٰ بندوں کے پاس لے آئے بارش، روزی، نعمت، صحت، امن، علم اور حکمت میں سے اور ان کے سوا اور امور جن کا احاطہ نہیں ہو سکتا ہے تو کوئی قادر نہیں ہے کہ اس کو روک رکھے اور ان میں سے جونسی شے وہ روک رکھے تو کوئی قدرت نہیں رکھتا کہ اس کو اس کے روکنے کے بعد بھیج سکے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھول دے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں ہے، وہ چاہیں تو توبہ کریں اور چاہیں انکار کریں اور جو کچھ اس نے بابِ توبہ سے روک رکھا ہے تو اس کے سوا کوئی اس کو بھیجنے والا نہیں ہے اور وہ توبہ نہ کریں گے۔[2]

رحمت کے اطلاق اور ارسال کو جو استعارۂ پیرایۂ فتح میں ادا فرمایا تو اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ رحمت اس کے خزانوں میں سے سب سے عمدہ ہے جس میں رغبت کرنے والے رغبت کرتے ہیں اور وہ خزانہ جس کو مل جائے، نیز یہ خزانہ بہت بڑا اور غالب ہے۔ رحمت کو نکرہ اشاعت اور ابہام کے لیے ذکر کیا ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ کوئی سی رحمت ہو آسمانی یا زمینی۔ یہ عموم ﴿ مَا ﴾ جو اسمِ شرط ہے اس سے سمجھا جاتا ہے اور ﴿ مِنْ رَّحْمَةٍ ﴾ اس عام کا بیان ہے کسی قسم سے ہو۔ جو جمع معرف کہ اسمِ شرط کے مطابق ہوتی ہے عموم میں، اس جگہ اس سے نکرۂ مفرد لا کر کفایت کی گئی ہے۔ تقدیر: ''مِنَ الرَّحَمَاتِ'' ہے۔

کلمۂ ﴿ مِنْ رَّحْمَةٍ ﴾ موضع حال میں ہے: ''أَيْ: كَائِنًا مِنْ رَّحْمَةٍ''۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ رسول لوگوں پر رحمت کے لیے بھیجے گئے، چنانچہ ان کے بھیجنے پر سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی قادر نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے

[1] الموطأ (١٩٢/١) تفسير ابن كثير (٧١٦/٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣١٧١/١٠)

کہ رحمت سے مراد دعا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ توبہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہدایت کی توفیق ہے۔ اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ معنی یہ ہیں کہ ہر وہ شے جس کو اللہ پاک اپنے رحمت کے خزانوں میں سے لوگوں کے لیے کھول دے، چنانچہ یہ شامل ہو جائے گی ہر نعمت کو جو اللہ پاک اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے اور اسی طرح امساک (روکنا) ہر اس شے کو شامل ہے جس کو اللہ اپنی نعمتوں میں سے روک رکھتا ہے۔ چنانچہ اللہ پاک معطی، مانع، قابض اور باسط ہے، اس کے سوا نہ کوئی عطا کرنے والا ہے اور نہ کوئی انعام کرنے والا ہے اور وہ زبردست حکمتوں والا ہے، ہر اس شے میں جس کو روکا یا جس کو بھیجا اپنی حکمت کے تقاضے کے طور پر۔

پھر اللہ پاک نے اپنے بندوں کو حکم کیا کہ جن بے شمار نعمتوں کا ان پر شب و روز فیضان ہو رہا ہے ان کو یاد کریں، جیسے اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے: ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ [إبراهيم: ٣٤] ''اگر تم اللہ کے احسان گننا چاہو تو انھیں پورے گن بھی نہیں سکتے۔'' چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۳ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۴﴾

اے لوگو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دے؟ اس کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں، پھر تم کہاں بہکائے جاتے ہو؟③ اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو تحقیق آپ سے پہلے (بھی) کئی رسول جھٹلائے گئے ہیں اور سب اُمور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں④

توحیدِ باری تعالیٰ کی ایک ٹھوس دلیل:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہوشیار کرتا ہے اور ان کو اپنی توحید پر استدلال کرنے کی راہ بتاتا ہے، اس طرح سے کہ وہ تنہا اسی کی عبادت کریں جس طرح کہ پیدا کرنے اور رزق عطا کرنے کے ساتھ وہ مستقل ہے، اس کے سوا کوئی یہ کام نہیں کرتا تو اسی طرح چاہیے کہ اکیلے اسی کی پوجا کی جائے۔ بت اور شریک اور آستانے جو غیر اللہ ہیں، اس کے ساتھ شریک نہ کیے جائیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ﴾ یعنی اس بیان اور برہان کی وضاحت کے بعد پھر تم کہاں سے الٹے جاتے ہو اور اس کے بعد تم شریکوں اور بتوں کو پوجتے ہو۔ واللّٰه أعلم.

[1] فتح البيان (١١/٢١٩_٢٢٠)

سابقہ انبیاء کی تکذیب کا ذکر اور رسول اللہ ﷺ کو تسلی:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اے محمد! اگر یہ مشرک لوگ تیری تکذیب کریں اور جس توحید کو تو اُن کے پاس لے کر آیا ہے، اس میں تیرے مخالف ہوں تو تجھے پہلے رسولوں کی پیروی کرنی چاہیے، کیوں کہ وہ اسی طرح اپنی قوموں کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور توحید کا ان کو حکم کیا تو انھوں نے ان کی مخالفت کی۔ ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم عن قریب ان کو اس پر پوری جزا دیں گے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

کہا گیا ہے کہ ﴿ اُذْكُرُوْا ﴾ کا خطاب اہلِ مکہ کو ہے۔ اللہ کی نعمت اُن پر یہ ہے کہ ان کو حرم میں بسایا اور لوگوں پر جو لوٹ کھسوٹ ہوا کرتی تھی اس کو ان سے روکا۔ کسی نے کہا ہے کہ خطاب سب لوگوں کو ہے۔ اللہ کی نعمت ان پر یہی ہے کہ زمین کو بچھونے کی طرح بچھا دیا اور آسمان کو بغیر ستون کے بلند کیا، راہ بتانے کے لیے رسول بھیجے کہ اللہ کی طرف بلائیں، اس کا قرب حاصل ہو، خلق میں زیادتی کی، رزق کے دروازے کھولے، یہ سب امور گزر چکے ہیں۔ اللہ کی نعمت یاد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان کو شکر کرنے کی ہدایت کی تاکہ وہ نعمتیں دوام پذیر ہوں اور ان سے زیادہ کی طالب ہوں۔ صرف زبان سے ان کا ذکر کرنا مراد نہیں، لیکن مراد یہ ہے کہ زبان اور دل سے ان کو یاد کریں، مطلب یہ ہے کہ تم ان کو مت بھولو۔ اس جگہ نعمت انعام کے معنی میں ہے۔ جلال محلی نے اسی طرح کہا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ نعمت بہ معنی منعم بہ ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس نعمت سے آگاہ کیا جو ساری نعمتوں کا سر ہے، یعنی منعم کا اتحاد۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ... الآية ﴾ استفہام تقریر و انکار اور سرزنش کا ہے۔ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زاید ہے تاکید کے لیے۔ ﴿ خَالِقٍ ﴾ مبتداء ہے ﴿ غَيْرُ اللّٰهِ ﴾ اس کی صفت ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفع ﴿ غَيْرُ ﴾ کا اس معنی کی بنا پر ہے کہ "هَلْ خَالِقٌ غَيْرُ اللّٰهِ"، کیوں کہ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زائدہ موکدہ ہے اور جس نے ﴿ غَيْرُ ﴾ کو زیر دیا ہے تو اس نے لفظ پر اس کو صفت ٹھہرایا ہے۔ جمہور نے بہ رفع ﴿ غَيْرُ ﴾ پڑھا ہے۔ نیز حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے بہ جر پڑھا ہے اور فضل بن ابراہیم نے بہ نصب پڑھا ہے بنا بر استثناء۔[3] جملۂ ﴿ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ خبر ہے مبتداء کی، یعنی ہے کوئی خالق اللہ کے سوا کہ تم کو روزی دیتا ہے آسمان و زمین سے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک کے سوا کوئی خالق نہیں ہے۔ یا جملہ مستانفہ ہے، یا دوسری صفت ہے خالق کی اور خبر محذوف ہے۔ بالجملہ آسمان سے رزق تو پانی

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٧١٦/٣، ٧١٧) [2] تفسیر الجلالین (٥٧١/١) [3] فتح القدير (٤٤٦/٤)

کے ساتھ ہے اور زمین سے نبات، یعنی سبزے وغیرہ سے۔ جملۂ ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ مستانفہ ہے، جو نفی استفہام سے سمجھی جاتی ہے اس کی تقریر اور تثبیت کے لیے لایا گیا ہے۔

﴿ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴾ یعنی جب توحید کی حجت قائم ہو چکی تو پھر تم کیوں کر پھیرے جاتے ہو؟! یہ ماخوذ ہے "أَفْك" بالفتح سے، "أَفْك" صرف کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "مَا أَفَكَكَ عَنْ كَذَا" یعنی تجھے کس شے نے اس سے پھیر دیا؟ کسی نے کہا ہے کہ "إِفْك" بالکسر بہ معنی کذب سے ماخوذ ہے، اس لیے کہ کذب صدق سے پھیرا گیا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی ہیں: کہاں سے واقع ہوتا ہے تم کو افک اور تکذیب اللہ کی توحید اور بعث کے ساتھ،[1] حالاں کہ تم اس بات کا اقرار کرنے والے ہو کہ اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے اور روزی دی ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے نبی کریم ﷺ کو تسلی دی، فرمایا: ﴿ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ﴾ تاکہ وہ اپنے سے پہلے کے نبیوں کا اقتداء کریں اور کفارِ عرب جو آپ ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں، اس سے آپ ﷺ کو تسلی ہو۔ اسی لیے ﴿ رُسُلًا ﴾ کو نکرہ ذکر کیا ہے، یعنی بہت سے رسول، آیات اور معجزات والے، بڑی لمبی عمر والے، صاحبِ صبر و عزم، کیوں کہ اس میں آپ ﷺ کے لیے زیادہ تر تسلی ہے۔ جواب شرط کا محذوف ہے: "أَيْ: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرُوْا" یعنی تو صبر کر جیسا کہ انھوں نے صبر کیا۔ اس محذوف جواب پر ﴿ فَقَدْ كُذِّبَتْ ...الخ ﴾ دال ہے۔

﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ کا یہ مقصد ہے کہ اللہ ہی کی طرف تمام کام رجوع کرتے ہیں نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔ چنانچہ وہ ہر ایک کو بدلا دے گا جس بدلے کا وہ مستحق ہو گا۔ امام حسن، اعرج، یعقوب، ابن عامر، ابو حیوہ، ابن محیصن، حمید، اعمش، یحییٰ بن وثاب، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے ﴿ تُرْجَعُ ﴾ بہ فتحِ تائے فوقیہ پڑھا ہے، بہ صیغۂ معروف اور باقی قراء نے بہ ضم بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔[2] (كذا في فتح البيان)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۥ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ؕ ۝۶ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷

اے لوگو! بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، چناں چہ تمھیں دنیوی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور تمھیں بڑا دھوکے باز (شیطان بھی) اللہ کے بارے میں دھوکے میں نہ ڈالے ⑤ بے شک

[1] معاني القرآن (٤/٢٦٣) [2] تفسير القرطبي (١٤/٣٢٣) فتح البيان (١١/٢٢٠، ٢٢١)

شیطان تمھارا دشمن ہے، لہٰذا تم اسے دشمن ہی جانو، بس وہ تو اپنے گروہ کو اس لیے بلاتا ہے کہ وہ جہنم والوں میں سے ہو جائیں⑥ جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے⑦

قیامت آ کر ہی رہے گی:

﴿ وَعْدَ اللّٰهِ ﴾ سے مراد معاد ہے، یعنی اللہ پاک کا وعدۂ معاد ضرور ہونے والا ہے۔ چنانچہ دھوکا نہ دے تم کو دنیا کا جینا، یعنی یہ زندگی حقیر ہے، اس عظیم خیر کی نسبت جو اللہ نے اپنے دوستوں اور رسولوں کی پیروی کرنے والوں کے لیے تیار کر رکھی ہے، لہٰذا کہیں وہ فانی جینا اس باقی جینے سے یہ فانی رونق دکھا کر تم کو مشغول نہ کرے۔ ﴿ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴾ غرور سے مراد شیطان ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے،[1] یعنی تم کو شیطان فتنے میں نہ ڈالے اور تم کو اللہ کے رسولوں کی پیروی کرنے سے نہ پھیرے اور اس کی باتوں کی تصدیق کرنے سے نہ پھیرے، کیوں کہ بے شک وہ بڑا دغاباز، کذاب اور افاک ہے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے جو سورت لقمان کے آخر میں ہے: ﴿ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴾ [لقمان: ٣٣] ”تمھیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ دھوکے باز (شیطان) تمھیں دھوکے میں ڈال دے۔“

امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ وہ شیطان ہے، جیسا کہ مومنوں نے منافقوں سے کہا ہے روزِ قیامت کو جبکہ ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی: ﴿ لَهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴾ [الحدید: ١٣۔ ١٤] ”جس میں دروازہ بھی ہوگا۔ اس کے اندرونی حصے میں تو رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب ہوگا۔ یہ چلا چلا کر ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہاں تھے تو سہی لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں پھنسا رکھا تھا اور انتظار میں ہی رہے اور شک وشبہہ کرتے رہے اور تمھیں تمھاری فضول تمناؤں نے دھوکے میں ہی رکھا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ پہنچا اور تمھیں اللہ کے بارے میں دھوکا دینے والے نے دھوکے میں ہی رکھا۔“

شیطان تمھارا دشمن ہے، اسے دشمن ہی سمجھو:

پھر اللہ پاک نے ابنِ آدم کے لیے ابلیس کی عداوت بیان کی، فرمایا: ﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ ...الآیۃ ﴾ یعنی شیطان تم سے کھلم کھلا دشمنی کرنے والا ہے تو تم بھی اس سے بہت سخت دشمنی رکھو اور اس کی مخالفت کرو اور جس

[1] تفسير الطبري (٢٠/٤٣٩)

شے کے ساتھ تم کو دھوکا دیتا ہے، اس میں اس کو جھٹلاؤ۔ وہ تو یہی قصد کرتا ہے کہ تم کو بہکائے یہاں تک کہ تم اس کے ساتھ دوزخ کے عذاب میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ یہ وہی کھلا دشمن ہے۔ ہم اللہ قوی عزیز سے یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم کو شیطان کا دشمن بنائے اور ہم کو اپنی کتاب کا اتباع اور اپنے رسول کے طریقے کی پیروی نصیب فرمائے۔ إِنَّهُ عَلَى مَا يَشَاءُ قَدِيرٌ وَبِالْإِجَابَةِ جَدِيرٌ.

یہ آیت اس آیت کی مثل ہے: ﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴾ [الكهف: ٥٠]

''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، یہ جنوں میں سے تھا، اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی، کیا پھر بھی تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا دوست بنا رہے ہو؟ حالاں کہ وہ تم سب کا دشمن ہے ایسے ظالموں کا کیا ہی برا بدل ہے۔'' جب اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا کہ ابلیس کی پیروی کرنے والوں کا انجام کار دوزخ کی طرف ہے تو اس کے بعد یہ ذکر فرمایا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے، کیوں کہ انھوں نے شیطان کی اطاعت کی اور رحمان کی نافرمانی کی اور جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کے رسولوں پر اور بھلے کام کیے، ان کے لیے اس گناہ کی مغفرت ہے جو اُن سے ہوا اور اس خیر پر بڑا اجر ہے جو انھوں نے کی۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ بے شک اللہ کا وعدۂ بعث ونشور وحساب وعقاب و جنت و نار حق ہے، چنانچہ ﴿ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ سے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ﴿ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ دنیا کی زندگی اپنی زینت، نعیم، عیش اور آرام سے تم کو دھوکا نہ دے۔ ظاہر میں حیاتِ دنیا کو نہی ہے، لیکن مراد خاطبین کو نہی ہے کہ تم اس سے دھوکا مت کھاؤ، جس طرح کہ عرب کے اس قول میں ہے: "بِعَيْنٍ مَّا لَا أُرِيَنَّكَ هٰهُنَا" یعنی کسی آنکھ سے ہرگز میں تجھے اس جگہ نہ دیکھوں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حیاتِ دنیا کا دھوکا یہ ہے کہ آدمی اس کی نعمتوں اور لذتوں کے سبب سے آخرت کے عمل سے مشغول ہو جائے، یہاں تک کہ یوں کہے: ﴿ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴾ [الفجر: ٢٤] ''کاش کہ میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا۔''[2]

معنی یہ ہیں کہ دھوکا نہ دے تم کو دنیا اور اس کے ساتھ تمتع لینا اور اس کے منافع سے مزہ لینا۔ غافل نہ کر دے تم کو عمل سے آخرت کے لیے اور اس شے کی طلب سے جو اللہ پاک کے پاس ہے۔ جمہور نے "غَرُوْر" کو بہ فتحِ غین پڑھا ہے، یعنی غرور میں مبالغہ کرنے والا۔ ابن سکیت اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شیطان ہے۔ یہ بھی جائز ہے

[1] تفسير ابن كثير (٧١٧/٣) [2] تفسير القرطبي (٣٢٣/١٤، ٣٢٤)

کہ مصدر ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کو بعید سمجھا ہے، اس لیے کہ "غَرَرْتُہٗ"متعدی ہے اور متعدی کا جو مصدر ہوتا ہے، وہ فعل کے وزن پر آتا ہے، جیسے: "ضَرَبْتُہٗ ضَرْبًا" مگر اشیائے یسیرہ میں جو معروف ہیں، ان پر قیاس نہیں کیا جاتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ دھوکا نہ دے تم کو شیطان اللہ کے ساتھ، یعنی اس کے حلم اور مہلت دینے کے سبب سے، وہ تم سے یہ کہے کہ اللہ تم سے درگزر کرے گا اور اپنے فضل سے تم کو بخش دے گا۔ یا اس لیے کہ اس کی رحمت تم کو سما لے گی۔ امام ابوحیوہ، ابوسماک اور محمد بن سمیفع رحمہ اللہ نے بہ ضم غین پڑھا ہے۔ غرور باطل کو کہتے ہیں۔ ابن سکیت رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غرور بہ ضم وہ شے ہے جو متاعِ دنیا میں سے ہے اور دھوکا دیتی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: جائز ہے کہ غُرور بالضم جمع ہو غار کی، جیسے "قَاعِدٌ وَقُعُوْدٌ"۔ کسی نے کہا ہے کہ جائز ہے کہ "غَرَّہٗ" کا مصدر ہو، جیسے: لزوم ونہوک۔ اس میں وہی استبعاد ہے جو زجاج رحمہ اللہ سے پہلے گزر چکا ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے اپنے بندوں کو شیطان سے ڈرایا اور ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ ﴾ یعنی بے شک شیطان تم سب کے لیے کھلی عداوت والا دشمن ہے، اس نے تمھارے باپ کے ساتھ کیا جو کچھ کیا، حالاں کہ تم اس کے ساتھ اس شخص کا سا معاملہ کرتے ہو جس کو اس کے احوال کا کچھ پتا اور علم نہیں ہے۔ ﴿ عَدُوٌّ ﴾ کو نکرہ لا کر تعظیم کی ہے، یعنی بڑا دشمن، کیوں کہ اس کی عداوت عامّہ اور قدیمہ ہے۔ عموم تو کلمۂ ﴿ لَكُمْ ﴾ سے سمجھا جاتا ہے، اس وجہ سے کہ اس کا دشمن ہونا خاص نہیں کیا گیا، بعض کا ہو بعض کا نہ ہو، بلکہ فرمایا: ﴿ لَكُمْ ﴾ یعنی تم سب کا بڑا دشمن ہے اور دشمنِ قدیمہ ہونا جملہ اسمیہ سے معلوم ہوتا ہے جو دوام واستمرار بتا رہا ہے۔

﴿ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ﴾ چنانچہ تم اللہ کی اطاعت کر کے اس کو دشمن رکھو اور اللہ پاک کے معاصی میں اس کی اطاعت مت کرو اور صمیم قلب سے اپنے احوال وافعال وعقائد میں اس سے بچتے رہو اور جب کوئی کام کرو تو اس کے لیے ہوشیار اور چوکنے ہو جاؤ، کیوں کہ بسا اوقات وہ اس فعل میں تم پر ریا کو داخل کر دے گا اور بری باتیں تم کو اچھی کر دکھائے گا۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صبر نہیں کیا جاتا اس کی عدوات پر، مگر اللہ رب العزت کی استعانت کے ساتھ، کیوں کہ وہ تو تمھاری دشمنی سے غافل نہیں ہوتا، لہٰذا تم اپنے مولیٰ سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہونا۔ (ذکرہ الخطیب)

پھر اللہ پاک نے اپنے بندوں کے لیے اس کی عداوت کی کیفیت بیان کی اور اس کی طاعت سے ان کو ڈرایا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ ... الآية ﴾ یعنی وہ تو اپنے گروہ اور پیروکاروں اور فرماں برداروں کو اللہ پاک کے معاصی کی طرف بلاتا ہے، تاکہ وہ اہلِ نار سے ہو جائیں۔ حرفِ لام تعلیل کا ہے۔ موصول کا محل ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ میں رفع ہے بنا بر ابتداء اور ﴿ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴾ اس کی خبر ہے۔ یا رفع بنا بر بدل ہے ﴿ لِيَكُوْنُوْا ﴾ کے فاعل

[1] فتح القدير (٤/٤٤٧)

سے۔ یا نصب ہے بنا بر بدل ﴿ حِزْبَهٗ ﴾ سے۔ یا جر ہے بنا بر بدل ﴿ اَصْحٰبِ ﴾ سے اور رفع بنا بر ابتداء سب وجهوں سے زیادہ قوی ہے۔

اس لیے کہ اول اللہ پاک نے شیطان کی عداوت اور اس کا بلانا اپنے گروہ کو ذکر کیا، اس کے بعد فریقین کا حال ذکر کیا، ایک گروہ تو اس کا مطیع دوسرا اس کا نافرمان۔ چنانچہ پہلے گروہ کے حق میں یہ فرمایا: ﴿ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴾ اور دوسرے گروہ کی شان میں ارشاد کیا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ یعنی اللہ پاک ایمان اور عملِ صالح کے سبب سے ان کی مغفرت کر دے گا اور ان کو بڑا اجر عطا فرمائے گا، وہ جنت ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن شریف میں جہاں کہیں ﴿ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴾ اور ﴿ وَرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ ہے تو اس سے مراد جنت ہے۔[1]

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ۭ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ڮ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۸

کیا پھر وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل پرکشش بنا دیا گیا، سو وہ اسے اچھا دیکھتا ہے (ہدایت یافتہ شخص کی طرح ہوسکتا ہے؟) چناں چہ بے شک اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے، لہٰذا آپ کی جان ان پر افسوس کرتے ہوئے نہ جاتی رہے، یقیناً اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ⑧

برے اعمال کو اچھا سمجھنے والوں پر افسوس مت کیجیے:

کیا وہ شخص اس کے برابر ہے جو بھلے برے کی تمیز رکھتا ہے۔ انتہٰی.

یعنی جیسے کفار و فُجار کہ وہ برے کام کرتے ہیں اور وہ ان میں اعتقاد کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں، یعنی پھر جو شخص ایسا ہے جس کو اللہ نے گمراہ کیا ہے کیا تیرے واسطے اس میں حیلہ و تدبیر ہے؟ اس کے حق میں تیرے لیے کوئی حیلہ نہیں ہے، کیوں کہ اللہ بہکاتا ہے جس کو چاہے اور راہ پر لاتا ہے جس کو چاہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت اور گمراہی اس کی تقدیر سے ہے، لہٰذا تو اس پر افسوس مت کر، کیوں کہ اللہ حکمت والا ہے، اپنی تقدیر میں وہ تو گمراہ کرتا ہے جس کو گمراہ کرتا ہے اور ہدایت کرتا ہے جس کو ہدایت کرتا ہے، اس لیے کہ اس میں اس کی حجت بالغہ اور مکمل علم ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن دیلمی سے روایت کیا ہے، کہا: میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور وہ

---

[1] تفسير الطبري (٣٩٣/١٧) فتح البيان (٢٢١/١١ـ٣٢٣)

طائف کے ایک باغ میں تھے جس کو وہط کہتے ہیں، کہا: میں نے سنا رسول اللہ ﷺ کو کہ فرماتے تھے: بے شک اللہ نے اپنی خلق کو تاریکی میں پیدا کیا، پھر ان پر اپنا نور ڈالا، پھر اس وقت جس کو اس کے نور سے کچھ پہنچا تو وہ راہ یاب ہوا اور جو کوئی اس سے چوک گیا، وہ گمراہ ہوا، چنانچہ اسی لیے میں کہتا ہوں: « جَفَّ الْقَلَمُ عَلٰى مَا عَلِمَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ »[1] "اللہ کے علم پر خشک ہو گیا ہے۔" پھر زید بن اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم پر رسول اللہ ﷺ نکلے تو فرمایا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ يَهْدِيْ مِنَ الضَّلَالَةِ وَيُلْبِسُ الضَّلَالَةَ عَلٰى مَنْ أَحَبَّ »[2] "سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے جو گمراہی سے ہدایت دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے گمراہی کو ملتبس کرتا ہے۔" (وهذا أيضا حديث غريب جدا كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے جو فریقین کے انجام کار کے درمیان فرق ذکر فرمایا تو ﴿ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ ...الخ﴾ کے جملہ مستانفہ سے اس تفاوت کی تقریر فرمائی، اس کو ثابت اور پختہ کیا۔ کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ موضع رفع میں ہے بنا بر ابتداء اور خبر محذوف ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "ذَهَبَتْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ" کہا کہ ﴿ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ﴾ اس محذوف پر دال ہے اور کہا کہ یہ ایک ظریف عربی کلام ہے، اس کو بہت تھوڑے جانتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقدیر "كَمَنْ هَدَاهُ" ہے۔ ان دو کے سوا اور نے یہ تقدیر کی ہے: "كَمَنْ لَمْ يُزَيَّنْ لَهُ" یہ قول اولیٰ ہے، اس لیے کہ لفظ و معنی سے موافق ہے، صاحبِ کشاف نے وہم کیا تو کسائی کے قول کو زجاج سے نقل کیا۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس میں بہترین امام کسائی رحمہ اللہ کا قول ہے، اس وجہ سے جو ذکر کی ہے کہ اس میں محذوف پر دلالت ہے۔[3] کسی نے کہا: تقدیر یہ ہے: ﴿ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ ... الخ﴾ تُرِيْدُ أَنْ تَهْدِيَهُ" یعنی کیا جس کو اس کے برے کام اچھے کر کے دکھائے گئے ہیں تو چاہتا ہے کہ اس کو ہدایت کرے، یہ تو اللہ ہی کی طرف ہے، تیری طرف نہیں ہے۔ تیرے ذمے جو ہے وہ پہنچا دینا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے اپنے نبیوں کو اس سے منع فرمایا کہ ان پر سخت غم کریں، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ ﴾ [الكهف: ٦] "کیا ان کے پیچھے آپ اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے۔"

امام قتادہ اور حسن رحمہ اللہ نے کہا: واللہ! شیطان نے ان کے لیے گمراہیوں کو زینت دی۔[4] کسی نے کہا ہے کہ اس کے نفسِ امارہ اور بری خواہشات نے زینت دی۔ ﴿ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ ﴾ میں موصوف کی طرف صفت کی اضافت ہے،

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤٢) تفسير ابن أبي حاتم (٣١٨٢/١٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٧٦)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣١٧٢/١٠، ٣١٧٣) تفسير ابن كثير (٧١٧/٣، ٧١٨) اس کی سند میں ایک سے زیادہ ضعیف راوی ہیں۔

[3] تفسير القرطبي (٣٢٥/١٤، ٣٢٦) فتح القدير (٤٤٧/٤، ٤٤٨) [4] تفسير الطبري (٤٤١/٢٠)

یعنی "عَمَلُهُ السَّيِّئُ"۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت ابوجہل اور مشرکینِ مکہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ خواہش پرست اور بدعتی لوگوں کے بارے میں اتری ہے۔ انہیں میں سے خوارج ہیں جو مسلمانوں کے خون اور مال کو حلال جانتے ہیں۔ کبیرہ گناہ کرنے والے ان میں سے نہیں ہیں، کیوں کہ یہ لوگ کبیرہ گناہوں کے حرام ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، باوجود اس کے کہ ان کا ارتکاب کرتے ہیں۔

جملہ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ مقرر ہے ماقبل کا اور اس حق کو ثابت کرتا ہے کہ ہر چیز اللہ پاک کی مشیت سے ہے، یعنی وہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اور ہدایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے کہ ہدایت کرے۔ یہ آیتِ کریمہ قدریہ کے قول کو ان پر رد کرتی ہے۔ جمہور نے "تَذْهَبُ" کو بہ فتحِ تائے فوقانیہ و ہاء پڑھا ہے، اس کا فاعل "نَفْسُكَ" ہے، اس کی بنا پر "لَا أُرَيَنَّكَ هٰهُنَا" کے باب سے ہوگا، یعنی تو اس کے بارے میں غور وفکر مت کر۔ امام ابوجعفر، شیبہ، ابن محیصن اور اشہب رحمہم اللہ نے بہ ضمِ تاء و کسرِ ہاء و نصب "نَفْسَكَ" پڑھا ہے۔

"حَسَرَاتٍ" کا نصب بنا بر مفعول لہ ہے: "أَيْ: لِلْحَسَرَاتِ" جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غمگین ہونے کی زیادتی معلوم ہو جائے ان کی قباحتوں کی کثرت پر جو ان پر حسرت اور افسوس کرنے کا موجب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿حَسَرٰتٍ﴾ منصوب ہو بنا بر حال، گویا نفس کل کا کل حسرتیں ہو گیا، فرطِ تحسر کے مارے، جیسا کہ امام سیبویہ رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمیز ہے۔[2] اور ﴿عَلَيْهِمْ﴾ صلہ ہے ﴿تَذْهَبْ﴾ کا، جس طرح کہ محاورے میں بولتے ہیں: "هَلَكَ عَلَيْهِ حُبًّا وَّمَاتَ عَلَيْهِ حُزْنًا"۔ حسرت: شدتِ حزن اور ہمِ نفس ہے اس امر پر جو فوت ہو گیا اور سخت افسوس ہے اس شے پر جو ضائع ہو گئی۔ جملہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾ ماقبل کی تعلیل ہے وعدِ شدید کے ساتھ جو اس کے ضمن میں ہے، یعنی اس لیے کہ اللہ پاک پر اُن کے افعال و اقوال سے کوئی پوشیدہ شے مخفی نہیں ہے۔ پھر اللہ سبحانہ نے اپنی بدیع صنعت اور عظیم قدرت کی قسموں میں سے ایک قسم کی خبر دی، تاکہ اس میں غور و فکر کریں اور اس سے عبرت لیں۔ چنانچہ فرمایا:[3]

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ

[1] تفسیر البغوي (٦/٤١٣) [2] فتح القدير (٤/٤٤٨) [3] فتح البيان (١١/٢٢٣، ٢٢٤)

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ ۝١٠ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ
مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا ۚ وَمَا تَحْمِلُ
مِنْ أُنثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَمَا يُعَمَّرُ مِن مُّعَمَّرٍ
وَلَا يُنقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝١١

اور اللہ ہی وہ ذات ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے، وہ بادل اُٹھاتی ہیں تو ہم اسے مردہ شہر کی طرف ہانک لے جاتے ہیں، پھر ہم اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے مردہ (بنجر) ہو جانے کے بعد زندہ کرتے ہیں، اسی طرح (انسانوں کا) دوبارہ جی اُٹھنا ہے ⑨ جو شخص عزت چاہتا ہے، پس عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے، اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور عملِ صالح انھیں اوپر اُٹھاتا ہے اور جو لوگ بُری چالیں چلتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے اور انہی لوگوں کی چال ہی برباد ہو کے رہے گی ⑩ اور اللہ ہی نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر اس نے تمھیں جوڑے جوڑے بنایا اور جو بھی مادہ حاملہ ہوتی اور بچہ جنتی ہے، اسے اس کا علم ہوتا ہے اور بڑی عمر والے کو عمر دی جاتی ہے یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے (وہ) ایک کتاب (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے، بلاشبہ یہ (بات) اللہ پر نہایت آسان ہے ⑪

زندگی بعد الموت کی دلیل:

یعنی عزت اللہ کے ہاتھ ہے۔ تمھارے ذکر اذکار اور اچھے کام چڑھتے جاتے ہیں، جب اپنی حد کو پہنچیں گے تب بدی پر غلبہ کریں گے اور کفر دفع ہو گا، اسلام کو عزت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ پر یہ بات آسان ہے، یعنی ہر ایک کام آہستہ آہستہ ہوتا ہے، جیسے آدمی کا بننا۔ انتہٰی۔

اللہ تعالیٰ زمین کے مردہ ہونے کے بعد زندہ ہونے سے قیامت اور حشر پر استدلال فرماتا ہے، جس طرح کہ سورۃ الحج کے شروع میں اپنے بندوں کو اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ اس سے اس پر قیاس کریں، کیوں کہ زمین مردہ دبی پڑی ہوتی ہے، اس میں کسی طرح کا سبزہ نہیں ہوتا، پھر جب اس کی طرف بادل بھیجا، جو پانی سے بھرا ہوا ہے اور اس کو زمین پر نازل کیا تو وہ زمین حرکت کرتی اور ابھرتی ہے اور ہر قسم کی بارونق سبزی اُگاتی ہے۔ اسی طرح جسموں کا حال ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ ان کے دوبارہ زندہ کرنے اور اٹھانے کا ارادہ فرمائے گا تو عرش کے نیچے سے ایک بارش اتارے گا جو ساری زمین کے لیے عام ہو گی اور جسم اپنی قبروں سے اُگ اٹھیں گے، جس طرح کہ زمین میں

دانہ اگتا ہے۔ اسی لیے صحیح میں مروی ہے کہ سب کا سب ابن آدم بوسیدہ ہو جاتا ہے، مگر عجب الذنب، اسی سے پیدا کیا گیا ہے اور اسی سے مرکب کیا جائے گا[1] اور اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ﴾۔ سورۃ الحج میں ابو رزین رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث گزر چکی ہے کہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا اور اس کی خلق میں اس کی کیا نشانی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو رزین! کیا تو نہیں گزرا اپنی قوم کی وادی میں سے اس حال میں کہ وہ خشک پڑی ہوئی ہو، پھر تو اس پر گزرا اس حال میں کہ وہ سبزے سے لہرا رہی ہے؟ میں نے عرض کی: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا۔[2]

دنیا و آخرت میں عزت کا طالب اللہ ہی سے عزت طلب کرے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو کوئی اس بات کو پسند کرے کہ وہ دنیا اور آخرت میں عزیز ہو تو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کو لازم پکڑے۔ بے شک اسے اپنا مقصود حاصل ہو جائے گا، کیوں کہ اللہ پاک دنیا اور آخرت کا مالک ہے اور ساری عزت اسی کی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ [النساء: ١٣٩] ”جن کی یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے پھرتے ہیں، کیا ان کے پاس عزت کی تلاش میں جاتے ہیں؟ (تو یاد رکھیں کہ) عزت تو ساری کی ساری اللہ کے قبضہ میں ہے۔“ اور اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ [یونس: ٦٥] ”اور آپ کو ان کی باتیں غم میں نہ ڈالیں۔ تمام تر غلبہ اللہ ہی کے لیے ہے۔“ اور اللہ جل جلالہ نے فرمایا: ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [المنافقون: ٨] ”سنو! عزت تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان داروں کے لیے ہے لیکن یہ منافق جانتے نہیں۔“

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو شخص بتوں کے پوجنے سے عزت چاہتا ہے تو بے شک عزت ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: چاہیے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل کی اطاعت کے ساتھ عزت حاصل کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ جو شخص عزت کا علم چاہتا ہے کہ وہ کس کے لیے ہے تو بے شک عزت ساری اللہ کے لیے ہے۔ اس قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔[3] (امام فراء رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[4] كما في الفتحين) ”کلم طیّب“ سے مراد ذکر، تلاوت اور دعا ہے، یہ قول سلف میں سے کئی ایک اہل علم کا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٥) [2] المعجم الكبير (٢٠٨/١٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٣٣٤)
[3] تفسير الطبري (٤٤٣/٢٠۔ ٤٤٤) [4] فتح القدير (٤٤٩/٤) فتح البيان (٢٢٦/١١)

نیک عمل اللہ تعالیٰ کی طرف بلند ہوتا ہے:

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے مخارق بن سلیم سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ہم سے فرمایا کہ جس وقت ہم تم سے کوئی حدیث بیان کریں گے تو ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب سے اس کی تصدیق تمھارے پاس لائیں گے، بے شک ایک مسلمان بندے نے جس وقت کہا: "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ"، تو ایک فرشتہ ان کلموں کو لیتا ہے، پھر ان کو اپنے بازو کے نیچے رکھتا ہے، پھر ان کو آسمان کی طرف چڑھا لے جاتا ہے۔ چنانچہ وہ فرشتوں کی کسی جماعت پر ان کلمات کو لے کر نہیں گزرتا، مگر وہ ان کلمات کے کہنے والے کے لیے استغفار کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ان کلمات کو اللہ عزوجل کے روبرو لاتا ہے۔ پھر سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ﴾

پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن شقیق رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بے شک "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" کے لیے البتہ عرش کے گرد شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ایک بھنبھناہٹ ہے، جو اپنے کہنے والے کا ذکر کرتے ہیں اور عمل صالح خزائن میں ہے۔[1] یہ اسناد صحیح ہے کعب احبار رحمہ اللہ تک اور مرفوعاً بھی مروی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے جلال سے کوئی تسبیح ذکر کرتے ہیں اور کوئی تکبیر اور کوئی تحمید اور کوئی تہلیل ذکر کرتے ہیں تو وہ کلمات عرش کے گرد ایک دوسرے پر مائل ہوتے ہیں، ان کی ایسی بھنبھناہٹ ہوتی ہے، جیسی بھنبھناہٹ شہد کی مکھیوں کی ہوتی ہے، وہ اپنے کہنے والے کا ذکر کرتے ہیں، کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اللہ کے نزدیک کوئی ایسی شے ہو جس کے ساتھ ہمیشہ اس کا ذکر کیا جائے۔[2] (هكذا رواه ابن ماجه عن النعمان به)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "كَلِم طَيِّب" اللہ کا ذکر ہے، اس کو اللہ عزوجل کی طرف چڑھا لے جاتے ہیں اور عملِ صالح ادائے فریضہ ہے، لہٰذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا، اس کے ادائے فرائض میں تو اس کا عمل اللہ تعالیٰ کے ذکر کو اٹھا لے گا اور اس کو اللہ عزوجل کی طرف چڑھا لے جائے گا اور جس نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور اس کے فرائض ادا نہ کیے تو اس کا کلام اس کے عمل پر رد کیا جائے گا تو وہ اس کا زیادہ مستحق ہوگا۔ اسی طرح امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عملِ صالح اس کلامِ طیب کو اٹھاتا ہے، اسی طرح امام ابو العالیہ، عکرمہ، ابراہیم نخعی، ضحاک، سدی، ربیع بن انس، شہر بن حوشب رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے۔ قاضی ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٤٤٤ تا ٤٤٥)

[2] مسند أحمد (٤/ ٢٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٠٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣٥٨)

3

عملِ صالح نہ ہوتا تو کلام نہ اٹھایا جاتا۔ حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قول قبول نہیں کیا جاتا مگر عمل کے ساتھ۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ امام مجاہد، سعید بن جبیر اور شہر بن حوشب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ اپنے اعمال سے ریا کرنے والے ہیں،[2] یعنی لوگوں کے ساتھ مکر کرتے ہیں، اس وہم میں ڈالتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت میں ہیں، حالاں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف مبغوض، یعنی اللہ ان کا دشمن ہے۔ اپنے اعمال کا دکھاوا کرتے ہیں اور بہت تھوڑا اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ مشرک ہیں۔[3] صحیح یہ ہے کہ آیت عام ہے اور مشرک اس میں بطریقِ اولیٰ داخل ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ ﴾ یعنی ان لوگوں کا مکر فاسد و باطل ہو جائے گا اور ان کا کھوٹا پن ظاہر ہو جائے گا، عن قریب دانا اور بینا لوگ اسے جان لیں گے، کیوں کہ جس کسی نے بھی جب کوئی پوشیدہ کام چھپایا تو اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کر دیتا ہے اس کے چہرے پر اور فلتاتِ زبان پر، (یعنی اچانک اس کی زبان سے ایسی بات نکل جاتی ہے جس سے اس کا حال معلوم ہو جائے گا۔) اور نہیں چھپایا کسی نے کوئی پوشیدہ کام مگر اللہ اس کو ایک چادر پہناتا ہے، اگر خیر کا کام ہے تو خیر کی چادر اور اگر شر ہے تو شر کی چادر۔ چنانچہ ریا کار کا کام رواج نہیں پاتا اور نہ چل جاتا ہے مگر غبی، یعنی کند ذہن لوگوں پر۔ رہے مومن جو عقل و فراست والے ہیں تو وہ ان پر رواج نہیں پاتا، بلکہ عن قریب ان پر کھل جاتا ہے اور عالم الغیب پر تو کوئی چھپی چیز چھپتی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی خالق اور علام الغیوب ہے:

قولہ تبارک و تعالیٰ: ﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک نے تمھارے باپ آدم کی پیدایش مٹی سے کی۔ ﴿ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ [السجدة: ٨] ''پھر اس کی نسل ایک بے وقعت پانی کے نچوڑ سے چلائی۔'' پھر تمھارے جوڑے جوڑے بنائے، یعنی نر اور مادہ۔ اس کی مہربانی اور رحمت سے یہ ہے کہ تمھارے لیے تمھاری جنس سے جوڑے بنائے، تاکہ تم ان سے چین پکڑو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ﴾ یعنی نہیں حاملہ ہوتی کوئی مادہ اور نہ وہ جنتی ہے، مگر اس کے علم سے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اس کا جاننے والا ہے، اس پر اس سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے، بلکہ کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو جانتا ہے اور نہ کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں ہے اور نہ کوئی گیلی چیز ہے اور نہ سوکھی چیز مگر وہ کھلی کتاب میں ہے۔ اس آیت پر کلام گزر چکا ہے۔ ﴿ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ﴾ [الرعد: ٨۔ ٩] ''مادہ اپنے

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/٤٤٥) تفسیر ابن کثیر (٣/٧١٩) [2] تفسیر الطبري (٢٠/٤٤٦) الدر المنثور (٧/١٠)

[3] تفسیر الطبري (٢٠/٤٤٦) الدر المنثور (٧/١٠)

شکم میں جو کچھ رکھتی ہے اسے اللہ بہ خوبی جانتا ہے اور پیٹ کا گھٹنا بڑھنا بھی، ہر چیز اس کے پاس اندازے سے ہے۔ ظاہر و پوشیدہ کا وہ عالم ہے (سب سے) بڑا اور (سب سے) بلند و بالا۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ﴾ یعنی بعض نطفوں کو جو طویل عمر دی جاتی ہے، وہ اس کے علم سے ہے اور وہ اس کے نزدیک کتابِ اول میں ہے۔ ﴿ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ ﴾ کی ضمیر جنس کی طرف راجع ہے نہ کہ عین، یعنی معین (دیکھنے والے) کی طرف، کیوں کہ جو شخص اللہ کے علم میں اور کتاب میں طویل العمر ہے، اس کی عمر سے کم نہیں کیا جاتا۔ ﴿ عُمُرِهٖٓ ﴾ کی ضمیر جنس کی طرف راجع ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ عرب کے اس قول کی طرح ہے کہ "عِنْدِيْ ثَوْبٌ وَنِصْفُهُ، أَيْ: وَنِصْفُ ثَوْبٍ آخَرَ"[1] یعنی میرے پاس کپڑا ہے اور آدھا۔ دوسرے کپڑے کا مطلب یہ ہے کہ "نِصْفُهُ" کی ضمیر معینِ ثوب کی طرف راجع نہیں ہے، بلکہ جنسِ ثوب کی طرف پھرتی ہے۔ اسی طرح ﴿ مِنْ عُمُرِهٖٓ ﴾ کی ضمیر معمر معین کی طرف راجع نہیں ہے، بلکہ جنس کی طرف عائد ہوتی ہے۔

بہ طریقِ عوفی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس کے لیے میں طولِ عمر و حیات کا فیصلہ کر چکا، مگر وہ اس عمر کو پہنچنے والا ہے، جو میں نے اس کے لیے مقدر کی اور مقرر میں جب اس کو اس کے لیے پورا کر چکا تو وہ اسی کتاب تک پہنچے گا جو میں مقدر کر چکا ہوں، اس سے زیادہ نہ کی جائے گی اور کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس کے لیے میں یہ فیصلہ کر چکا کہ وہ قصیر العمر والحیات ہے کہ وہ پہنچنے والا ہے عمر کو، لیکن وہ اس کتاب تک پہنچے گا جو میں نے اس کے لیے لکھی، چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ قول ہے: ﴿ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ﴾.

فرماتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کے نزدیک کتاب میں ہے۔ اسی طرح امام ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ اپنے باپ سے راوی ہیں کہ ﴿ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ﴾ وہ ادھورے بچے جن کو رحموں نے پھینک دیا ہے۔ عبدالرحمان نے اس کی تفسیر میں یوں کہا ہے: کیا تو دیکھتا نہیں ہے کہ لوگوں میں سے ایک آدمی سو برس تک زندہ رہتا ہے اور دوسرا پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے: "فَهٰذَا هٰذَا"۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ شخص جس کی عمر سے کم کیا جاتا ہے، چنانچہ وہ ہے جو ساٹھ برس سے پہلے مر جاتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس کی ماں کے پیٹ میں یہ اس کے لیے لکھا جاتا ہے۔ تمام خلق ایک عمر پر پیدا نہیں کی گئی، بلکہ اس شخص کے لیے ایک عمر ہے اور اس شخص کے لیے ایک عمر ہے کہ وہ اس کی عمر سے کم ہے اور وہ اس کے جانے کا وقت ہے۔[3]

① تفسیر الطبري (٢٠/٤٤٨) ② تفسیر الطبري (٢٠/٤٤٧، ٤٤٨) تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣١٧٦)
③ تفسیر ابن أبي حاتم (٣١٧٦، ٣١٧٥)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب معلوم ہے برس بعد برس کے اور مہینا بعد مہینے کے اور جمعہ بعد جمعے کے اور دن بعد دن کے اور ساعت بعد ساعت کے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کتاب میں سب لکھا ہوا ہے۔ اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابو مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور اسی طرف امام سدی اور عطاء خراسانی رحمہما اللہ گئے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے قول اول کو اختیار کیا ہے اور وہ ویسے ہی ہے جیسے اس نے کہا ہے۔[1] یعنی واقع میں وہ اختیار کے قابل ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے رزق میں فراخی اور اس کی عمر میں تاخیر کی جائے تو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔[2] (وقد رواه البخاري ومسلم وأبو داود من حديث يونس بن يزيد الأيلي به)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ذکر کیا (اصل میں اسی طرح ہے، مذکور کا ذکر نہیں ہے، واللہ اعلم) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تاخیر نہیں دیتا جب اس کی اَجل آجاتی ہے۔ عمر کی زیادتی جو ہے وہ نیک اولاد کے ساتھ ہے، جو بندے کو دی جاتی ہے، وہ اس کے لیے دعا کرتی ہے اس کے بعد، تو اُن کی دعا اس کو قبر میں لاحق ہوتی ہے، چنانچہ یہ ہے زیادتِ عمر۔[3] قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ یعنی یہ اس پر سہل ہے، اس کا علم اس کے نزدیک آسان ہے اور اس کی تفصیل اپنی ساری مخلوقات میں اسے معلوم ہے، کیونکہ اس کا علم تو سب کو شاملِ حال ہے، اس پر کچھ بھی مخفی نہیں ہے۔[4] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

جمہور نے ﴿ اَلرِّيٰحَ ﴾ بہ صیغۂ جمع پڑھا ہے اور امام ابن کثیر، ابن محیصن، اعمش، یحییٰ، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے "اَلرِّيْحَ" بہ صیغۂ مفرد پڑھا ہے[5] اور یہ سبعیہ ہے۔ اللہ پاک نے پہلے ﴿ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ ﴾ بہ صیغۂ ماضی ذکر کیا، اس کے بعد ﴿ فَتُثِيْرُ سَحَابًا ﴾ بہ صیغۂ مضارع فرمایا، اس سے اس صورتِ بدیع کا ظاہر کرنا منظور ہے جو کمالِ قدرت اور حکمت پر دال ہے، کیوں کہ عبرت لینے والوں کے عبرت لینے میں اس کو زیادہ تر دخل ہے، معنی یہ ہیں کہ ہوائیں بدلی کو اُبھارتی ہیں اور حرکت دیتی جاتی ہیں، اس جگہ سے جہاں وہ ہے۔ پھر ﴿ فَسُقْنٰهُ ﴾ میں غیبت سے التفات ہے متکلم کی طرف۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طرزِ کلام یہ تھا کہ "فَتَسُوْقُهُ" ہوتا، کیوں کہ پہلے ﴿ فَتُثِيْرُ سَحَابًا ﴾ فرمایا ہے۔ کہا ہے کہ مضارع کے بعد دو ماضیوں سے تعبیر کرنے میں نکتہ تحقق پر دلالت ہے۔ ﴿ بَلَدٍ مَّيِّتٍ ﴾ سے

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/٤٤٨، ٤٤٩) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٧٥، ٣١٧٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٩٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٣٨)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٨٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٥٣٢٣)

[4] تفسير ابن كثير (٣/٧١٨_٧٢١)

[5] تفسير القرطبي (١٤/٣٢٨)

مراد وہ زمین ہے جس میں نہ کچھ روئیدگی ہے نہ چراگاہ۔ "بلد" مذکر و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے "بلدۃ وبلد" کے ایک معنی ہیں۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مَیْتٌ" وَ "مَیِّتٌ" ایک ہیں اور کہا کہ یہ قول بصریوں کا ہے اور اس کی سند میں یہ شعر پڑھا: ؎

لَيْسَ مَنْ مَاتَ فَاسْتَرَاحَ بِمَيْتٍ   إِنَّمَا الْمَيِّتُ مَيِّتُ الْأَحْيَاءِ[1]

یعنی جو شخص مرگیا پھر اس نے راحت پائی وہ مردہ نہیں ہے۔ مردہ تو زندوں کا مردہ ہے، یعنی مسافر جو سفر کے مصائب میں مبتلا یا وہ گھر بار اور اہل وعیال سے مہجور پڑا ہے۔ بالجملہ ﴿ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ ﴾ میں ضمیر مطر کی طرف راجع ہے گو پہلے اس کا ذکر نہیں گزرا، لیکن سحاب تو اس پر دال ہے۔ یا سحاب کی طرف پھرتی ہے اس لیے کہ سحاب مطر کا سبب ہے، یعنی پھر زندہ کیا ہم نے مطر کے ساتھ جو بدلی سے زمین پر اس کی خشکی کے بعد اترنے والا ہے اس طرح سے کہ اس میں سبزہ اگایا۔ احیاء کا استعارہ نبات کے لیے کیا اور موت کا خشکی کے لیے کیا۔

﴿ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ﴾ یعنی اسی طرح اللہ بندوں کو ان کے مرنے کے بعد زندہ کرے گا، جس طرح کہ زمین کو اس کی خشکی کے بعد زندہ کیا۔ نشور بعث کے معنی میں ہے جو ماخوذ ہے "نَشَرَ الْإِنْسَانَ نُشُوْراً" سے۔ حرفِ کاف محلِ رفع میں ہے بنا بر خبریت، یعنی صحتِ مقدوریت میں اور سہولتِ تحصل میں مردوں کا زندہ کرنا مردہ زمین کو زندہ کرنے کی طرح ہے، کیونکہ دونوں کے درمیان صرف مقیس علیہ میں مادہ کا اختلاف ہے اور اس کو اس میں کچھ دخل نہیں پھر کیوں تم اس کا انکار کرتے ہیں حالانکہ بارہا تم اس شے کا مشاہدہ کر چکے ہو جو اس کی شبیہ ومثل ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک فرشتہ صور لے کر آسمان وزمین کے درمیان کھڑا ہو گا، پھر اس میں پھونکے گا تو آسمانوں اور زمین میں اللہ کی خلق میں سے کوئی باقی نہ رہے گا مگر وہ مرجائے گا سوائے اس کے جس کو اللہ چاہے۔ پھر اللہ عرش کے نیچے سے مردوں کی منی کی طرح منی بھیجے گا تو اس پانی سے ان کے جسم اور گوشت اُگ اٹھیں گے جس طرح زمین تری سے اُگاتی ہے (اصل روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: "كما تنبت الأرض من الثرى")۔ پھر یہ آیت پڑھی۔[2] (أخرجه ابن جرير و ابن المنذر و ابن أبي حاتم)

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو شخص عزت چاہتا ہے تو چاہیے کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ عزت حاصل کرے۔[3] چنانچہ "لِلّٰهِ الْعِزَّةُ" کے معنی یہ ٹھہرائے کہ اس ذات کی اطاعت کی طرف بلائے جس کے لیے عزت ہے جس طرح کہ محاورے میں بولتے ہیں: "مَنْ أَرَادَ الْمَالَ فَالْمَالُ لِفُلَانٍ" یعنی جو کوئی مال چاہے تو مال فلاں کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو چاہیے کہ فلاں سے اسے طلب کرے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے کہ جو اللہ کی عبادت کے ساتھ عزت چاہتا ہے تو عزت اللہ پاک لیے ہے،

---

[1] فتح القدير (٤/٤٤٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٧٣) [3] تفسير الطبري (٢٠/٤٤٤)

بے شک اللہ پاک اس کو دنیا اور آخرت میں عزت دے گا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد مشرکین ہیں، کیوں کہ بتوں کی عبادت کے ساتھ عزت دار ہوتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴾ [مریم: ۸۱] ''انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے لیے باعثِ عزت ہوں۔''

آیت میں ظاہر معنی یہ ہیں کہ جو شخص عزت چاہتا ہے اور اس کو طلب کرتا ہے تو چاہیے کہ اسے اللہ عزوجل سے طلب کرے۔ چنانچہ ساری عزت اللہ عزوجل کے لیے ہے، اس کے غیر کے لیے اس میں سے کچھ نہیں ہے۔ اب آیت شامل ہو جائے گی ہر اس شخص کو جو عزت کا طالب ہے اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ صاحبِ اقدار اور ارادہ کو اس بات سے آگاہ کیا جائے کہ عزت کہاں سے ملتی ہے اور کہاں سے اس کا استحقاق ہوتا ہے اور کس طریقے سے طلب کی جاتی ہے۔ چنانچہ الف و لام استغراق کے لیے ہوگا اور اس سورت کی آیتوں سے یہی سمجھا جاتا ہے۔ صعود اُوپر کی طرف حرکت کرنے کو کہتے ہیں اور یہی عروج بھی ہے۔ ثواب کی جگہ اوپر کی طرف اور عذاب کی جگہ نیچے کی طرف ہے۔

کلمِ طیب کا اللہ کی طرف چڑھنا؛ اس کے معنی اس کا قبول کرنا ہے۔ یا فرشتوں میں سے جو اعمال لکھنے والے ہیں ان کا نامۂ اعمال لے کر، جن کو وہ لکھتے ہیں، بالخصوص کلمِ طیب کو لے کر اوپر چڑھنا ہے، اس لیے کہ ثواب کا دار و مدار انھیں پر ہے۔ کلمۂ طیب میں ہر وہ کلام شامل ہے جس میں طیب ہونے کی صفت ہے: ذکر اللہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تلاوتِ قرآن شریف وغیرہ، اس کی کوئی وجہ نہیں کہ کلمِ طیب کو صرف کلمۂ توحید، تحمید اور تمجید کے ساتھ خاص کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے چڑھنے سے ان کا آسمانِ دنیا کی طرف چڑھنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس آسمان اور اس جگہ میں چڑھنا جس میں اس کے سوا اور کسی کا کوئی حکم جاری نہیں ہوتا ہے۔

فتح البیان میں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے مخلوق کے اوپر بلندی پر ہونے کی دلیل ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بذاتہٖ خلق سے بائن، یعنی علاحدہ ہے، جس طرح کہ اور صریح آیات اور صحیحہ احادیث اس پر دال ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے صعود سے مراد اللہ پاک کو اس کا علم ہونا ہے۔ مگر پہلے ذکر کردہ ہمارا قول زیادہ مناسب ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ عملِ صالح کلمِ طیب کو اٹھاتا ہے، جیسا کہ حسن رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کلمِ طیب صرف عملِ صالح کے ساتھ ہی مقبول ہوتا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يَرْفَعُهٗ ﴾ کا فاعل کلمِ طیب ہے اور عملِ صالح اس کا مفعول ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عملِ صالح مقبول نہیں ہوتا مگر توحید و ایمان کے ساتھ۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يَرْفَعُهٗ ﴾ کا فاعل وہ ضمیر ہے جو اللہ پاک کی طرف پھرتی ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ عملِ صالح کو کلمِ طیب پر اٹھاتا ہے، اس لیے کہ عمل کلام کو محقق کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عملِ صالح اپنے صاحب کو اٹھاتا ہے، یہ وہی شخص ہے جس نے عزت کا ارادہ کیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ عملِ صالح کو اس کے

---

[1] معاني القرآن (٤/٢٦٤) [2] فتح البيان (١١/٢٢٧) [3] تفسير الطبري (٢٠/٤٤٥)

صاحب کے لیے اٹھاتا ہے[1] یعنی اس کو قبول فرماتا ہے۔ اس بنا پر ﴿ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ ﴾ مبتداء ہو گا اور اس کی خبر ﴿ يَرْفَعُهُ ﴾ اور اسی طرح اس کے قول پر جس نے کہا ہے: "يَرْفَعُ صَاحِبَهُ". یعنی عملِ صالح کرنے والے کو اٹھاتا ہے۔

جمہور نے ﴿ يَصْعَدُ ﴾ پڑھا ہے "صَعِدَ" ثلاثی سے اور ﴿ الْكَلِمُ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے بنابر فاعلیت اور علی اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے بہ ضمِ حرف مضارع "أَصْعَدَ" ثلاثی مزید فیہ سے اور "الْكَلِمَ" کو بہ نصب بنا بر مفعولیت پڑھا ہے اور امام ضحاک رحمہ اللہ نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ "كَلِمٌ" جمہور کی قراءت ہے اور ابوعبدالرحمان نے "اَلْكَلَامُ" پڑھا ہے اور ﴿ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ ﴾ کو جمہور نے بہ رفع پڑھا ہے بنا بر عطف، یا بنا بر ابتداء اور ابن ابی عبلہ نے اور عیسی بن عمر نے بہ نصب بنا بر اشتغال پڑھا ہے۔[2] ﴿ السَّيِّئَاتِ ﴾ ﴿ يَمْكُرُونَ ﴾ کا مفعول بہ نہیں ہے، اس لیے کہ "مکر" فعل لازم ہے، چنانچہ اس کا نصب اس بنا پر ہے کہ مصدر محذوف کی صفت ہے: "أَيْ: يَمْكُرُوْنَ الْمَكَرَاتِ السَّيِّئَاتِ" یہ بھی جائز ہے کہ "يَكْسِبُوْنَ" کے معنی "يَمْكُرُوْنَ" میں شامل ہوں تو اب سیئات اس کا مفعول بہ ہو جائے گا۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا: یہ لوگ اہلِ ریاء ہیں۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ وہ ہیں جنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکر کیا، جبکہ دارالندوہ میں جمع ہوئے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: وہ ہیں جو دنیا میں سیئات کرتے ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکین ہیں۔[3] غرض یہ کہ ان کی سزا یہ ذکر کی کہ ﴿ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴾ یعنی ان کے لیے وہ عذاب ہے جو شدت میں انتہا کے درجے کو پہنچنے والا ہے۔

﴿ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ ﴾ یعنی ان لوگوں کا مکر ہالک وفاسد وباطل ہو گا۔ اسی باب سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَكُنتُمْ قَوْمًا بُورًا ﴾ [الفتح: ۱۲] "دراصل تم لوگ ہو بھی ہلاک ہونے والے۔" بے شک اللہ پاک نے ان کے مکروں کے سبب سے ان کو خوب ہی ہلاک کیا، جبکہ ان کو مکے سے نکالا اور ان کو قتل کیا اور چاہِ بدر میں ان کا اثبات کیا، چنانچہ ان کے تینوں مکر جن میں سے ایک کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اکتفا کیا تھا، ان سب کو انہیں پر جمع کر دیا۔ مکر اصل میں خدیعت و احتیال ہے، یعنی فریب وحیلہ گری کرنا۔ ﴿ أُولَٰئِكَ ﴾ کا اشارہ ہے ﴿ الَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ ﴾ کی طرف، بنا بر اختلافِ اقوال جو اُن کے مکر کی تفسیر میں ہے۔

﴿ هُوَ يَبُورُ ﴾ کا جملہ ﴿ مَكْرُ أُولَٰئِكَ ﴾ کی خبر ہے۔ اسم اشارہ ﴿ أُولَٰئِكَ ﴾ کو جو "هُمْ" کی ضمیر کے بجائے رکھا ہے تو اُس سے اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ جس شر اور فساد پر وہ جمے ہوئے ہیں، اس کے سبب سے انھیں سارے مفسدوں سے ایک ممتاز مقام حاصل ہوا ہے اور وہ اس کے ساتھ بہت زیادہ مشہور ہو رہے ہیں، گویا محسوس ہیں اور نظر آ رہے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے بعث اور نشور کے صحیح ہونے پر ایک اور دلیل ذکر کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاللَّهُ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ﴾ یعنی اللہ نے تم کو تمھارے باپ آدم علیہ السلام کی پیدایش کے ضمن میں مٹی سے پیدا

[1] تفسير الصنعاني (١٣٤/٣) [2] فتح القدير (٤٥٠/٤) [3] تفسير القرطبي (٣٣٣/١٤)

کیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد آدم علیہ السلام ہیں۔[1] اس بنا پر تقدیر یہ ہے کہ تمھارے اول باپ کو اور تمھاری اصل کو جس کی طرف تم رجوع کرتے ہو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے جس کو تمھارے باپ کی پشت سے نکالا۔

﴿ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تمھارے بعض کا بعض سے جوڑا کیا، چنانچہ نر جوڑا ہے مادہ کا، یا یہ معنی ہیں کہ تم کو صنف صنف بنایا نر اور مادہ۔ ﴿ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ نہیں ہوتا ہے حمل اور جننا، مگر حال یہ ہے کہ اللہ اس کا عالم ہے، اس کے علم اور تدبیر سے کوئی شے خارج نہیں ہوتی ہے۔ کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ زائدہ ہے۔ ﴿ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ﴾ جمہور نے ﴿ يُنْقَصُ ﴾ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور ﴿ مِنْ عُمُرِهٖٓ ﴾ بہ ضم میم پڑھا ہے۔ یعقوب وسلام نے ''یَنْقُصُ'' بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور ابو عمرو رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔

امام حسن، اعرج اور زہری رحمہم اللہ نے ''مِنْ عُمْرِہٖ'' بہ سکونِ میم پڑھا ہے، معنی یہ ہیں کہ نہیں دراز ہوتی ہے کسی کی عمر اور نہ ہی اس کی عمر میں سے کم کیا جاتا ہے، مگر وہ لوحِ محفوظ میں ہے۔[2] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ عُمُرِهٖٓ ﴾ کی ضمیر سے مراد دوسرا شخص ہے پہلے کا غیر، چنانچہ اس سے ضمیر کے ساتھ کنایہ کیا ہے گویا وہ اول ہی ہے، کیوں کہ اگر ثانی کا لفظ ظاہر ہوتا تو وہ مثل اول کے ہوتا۔ گویا یوں کہا: ''وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِ مُعَمَّرٍ'' چنانچہ ضمیر ﴿ مِنْ عُمُرِهٖٓ ﴾ کی دوسرے کی طرف پھرتی ہے، جو اول کے علاوہ ہے۔ اس کے مثل تیرا یہ قول ہے: ''عِنْدِيْ دِرْهَمٌ وَّنِصْفُهٗ''، یعنی میرے پاس ایک درہم ہے اور نصف دوسرے درہم کا ہے۔ کہا ہے کہ ابتداءً جو معمر کا نام معمر رکھا تو اس اعتبار سے کہ آخر کو وہ اس کی طرف منتقل ہوگا، معنی یہ ہیں کہ کسی کی عمر میں درازی نہیں کی جاتی ہے اور نہ کسی کی عمر میں کمی کی جاتی ہے، لیکن اس بنا پر نہیں کہ اس کی عمر سے اس کے زائد ہونے کے بعد کمی نہیں کی جاتی، بلکہ اس معنی کی بنیاد پر کہ ابتداء سے کمی نہیں کی جاتی، مگر حال یہ ہے کہ وہ کتاب میں ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی بھی معمر نہیں عمر دیا جاتا، مگر یہ لکھا جاتا ہے کہ اس کی عمر کتنے سال، کتنے مہینے، کتنے دن اور کتنی گھڑی ہے۔

پھر دوسری کتاب میں لکھا جاتا ہے کہ اس کی عمر سے ایک گھڑی کم ہوئی، ایک دن کم ہوا، ایک مہینا کم ہوا، ایک سال کم ہوا یہاں تک کہ اپنی اَجل کو پورا کر لیتا ہے، چنانچہ یہ نقصان ہے، اور جس عمر کا استقبال کرتا ہے، وہ وہ ہے جو عمر دیا جاتا ہے۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ کلام اس کلام کی قبیل سے ہے جس میں سامعین کے افہام پر اعتماد کرنے کے لیے تسامح کیا جاتا ہے، یعنی سہولت دی جاتی ہے اس کی تاویل کرنے میں اور ان کے ٹھیک کرنے پر بھروسا کرنے کے لیے، یعنی ان کے معنی کو اپنی عقلوں سے ٹھیک کرنے پر اور اس بات پر کہ اُن کو ایک شخص کی عمر کا زیادہ اور کم ہونا محال معلوم نہیں ہوگا۔

[1] تفسیر الطبري (٤٤٧/٢٠) [2] فتح القدير (٤٥١/٤) [3] تفسير القرطبي (٣٣٤/١٤)

اسی بنیاد پر لوگوں کا یہ کلام ہے جو کہتے ہیں: ”لَا يُثِيْبُ اللّٰهُ عَبْدًا وَّلَا يُعَاقِبُهُ إِلَّا بِحَقٍّ“، یعنی اللہ کسی بندے کو ثواب اور دوسرے بندے کو عذاب نہیں کرتا مگر حق کے ساتھ۔ یا آیتِ کریمہ کی تاویل یہ ہے کہ صحیفے میں اس کی عمر لکھی جاتی ہے، یعنی اتنے اتنے برس، پھر اس کے نیچے یہ لکھا جاتا ہے کہ ایک دن گیا، دو دن گئے، یہاں تک کہ اپنے آخر وقت پر آجاتا ہے، چنانچہ یہ اس کی عمر کا نقصان یا کم ہونا ہے۔[1] انتھیٰ۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ نے انسان کی عمر لکھی، اتنی اگر وہ اطاعت کرے اور اس سے کم اگر وہ نافرمانی کرے، چنانچہ ان میں سے جس کو پہنچا، چنانچہ وہ کتاب میں ہے، اس بنا پر ضمیر معمر کی طرف راجع ہوگی۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کوئی معمر نہیں عمر دیا جاتا بڑھاپے تک اور نہیں کم کیا جاتا دوسرا بڑھاپے کی عمر سے، مگر اللہ کی کتاب میں ہے، یعنی اللہ کی قضا سے۔ یہ قول امام ضحاک رحمہ اللہ کا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ کہا: اور یہ قول ظاہر تنزیل کے زیادہ مشابہ ہے سب قولوں سے۔[2]

اولیٰ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ ظاہر نظم قرآنی یہ ہے کہ عمر کا لمبا کیا جانا اور کم کیا جانا اللہ پاک کی قضا وقدر سے ہیں، کئی وجوہ سے جو زیادتی کے مقتضی ہوتے ہیں اور کئی اسباب سے جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ عمر کم کی جائے۔ چنانچہ عمر کے لمبا ہونے کے اسباب میں سے وہ ہے جو صلہ رحم کے باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہوا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور عمر کم کیے جانے کے اسباب میں اللہ پاک کے معاصی کی کثرت ہے، چنانچہ وہ عمر جو آدمی کے لیے مقرر کی گئی ہے، وہ اگر مثلاً ستر برس ہو تو تحقیق اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس میں زیادہ کرتا ہے، جب وہ عمر کی زیادتی کے اسباب اختیار کرے اور کبھی اس سے کم کر دیتا ہے جبکہ وہ نقصان کے اسباب اختیار کرے اور ہر چیز کتابِ مبین میں ہے۔ اب اس آیت میں اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے: ﴿ فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٣٤] ”پس جس وقت ان کی معیاد معین آجائے گی اس وقت ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهٗٓ أُمُّ الْكِتٰبِ ﴾ [الرعد: ٣١] ”اللہ جو چاہے مٹا دے اور جو چاہے ثابت رکھے، لوحِ محفوظ اسی کے پاس ہے۔“ اسی کی تائید کرتا ہے۔ پہلے ہم اس کی تفسیر میں جو شے ذکر کر آئے ہیں وہ وضاحت اور بیان میں اس جگہ کے ذکر سے زیادہ ہے۔

سیدنا حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نطفے کے رحم میں چالیس یا پینتالیس رات قرار پکڑنے کے بعد اس پر فرشتہ داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے: اے رب! کیا یہ بدبخت ہے یا نیک بخت، نر ہے یا مادہ؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور یہ دونوں باتیں لکھی جاتی ہیں، پھر اس کا عمل اور اس کا رزق لکھا جاتا ہے اور اس کی اجل لکھی جاتی ہے اور اس کا اثر لکھا جاتا ہے، یعنی اس کے نقشِ قدم اور مصیبت، پھر اس کا صحیفہ لپیٹا جاتا ہے،

---

[1] تفسير النسفي (٣/٣٣٨) [2] تفسير القرطبي (١٤/٣٣٤)

چنانچہ اس میں نہ زیادہ کیا جائے نہ اس سے کم کیا جائے۔[1] (أخرجه أحمد ومسلم وأبو عوانة وابن حبان والطبراني وابن المنذر وابن أبي حاتم) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے (دعا کرتے ہوئے) کہا: اے اللہ! مجھے میرے خاوند رسول اللہ ﷺ، میرے والد ابوسفیان اور میرے بھائی معاویہ (کی درازیِ عمر) سے مستفید فرما! تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو نے اللہ تعالیٰ سے ان مدتوں کا سوال کیا ہے جو مقرر کی جا چکیں، ان دنوں کا جو گنے جا چکے اور ایسے رزقوں کا جو تقسیم کیے جا چکے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو اس کا وقت آنے سے پہلے نہیں لاتا اور نہ اسے موخر ہی کرتا ہے، اگر تم اللہ تعالیٰ سے یہ مانگتی کہ وہ تمھیں جہنم میں دیے جانے والے عذاب اور قبر میں دیے جانے والے عذاب سے بچا لے تو یہ تمھارے لیے بہتر ہوتا۔[2] (أخرجه ابن أبي شيبة ومسلم والنسائي وأبو الشيخ، وهذه الأحاديث مخصصة بما ورد من قبول الدعاء وإنه يعتلج هو والقضاء وبما ورد في صلة الرحم أنها تزيد في العمر فلا معارضة بين الأدلة كما قدمنا)

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴾ یعنی بے شک یہ خلق اور جو اس کے بعد ذکر ہوا ہے اللہ پر آسان ہے۔ اس میں سے اللہ پر کوئی شے مشکل نہیں ہے اور اس سے نہ کوئی کثیر غائب ہوتا ہے نہ قلیل اور نہ کبیر اور نہ صغیر۔[3] (كذا في فتح البيان) پھر اللہ پاک نے اپنی عجیب صنعت کاری اور قدرت میں سے ایک اور قسم کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۖ وَمِن كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۖ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٢﴾ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِن قِطْمِيرٍ ﴿١٣﴾ إِن تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ ۚ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ﴿١٤﴾

اور دو دریا برابر نہیں، یہ (ایک) میٹھا خوب میٹھا پینے میں خوشگوار ہے اور یہ (دوسرا) کھارا سخت

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٤) مسند أحمد (٦/٤) صحيح ابن حبان (٥٢/١٤) المعجم الكبير (١٧٦/٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٣) مصنف ابن أبي شيبة (٥٠/٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٧٤/٦)

[3] فتح البيان (٢٢٥/١١۔٢٣١)

کڑوا ہے اور ہر ایک میں سے تم تازہ گوشت (مچھلی) کھاتے ہو اور زیور نکالتے ہو جنھیں تم پہنتے ہو اور آپ اس (دریا) میں پانی کو پھاڑ کر چلنے والی کشتیاں دیکھیں گے، تاکہ تم اس (اللہ) کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو⑫ وہ رات کو دن میں داخل کرتا اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا ہے، ہر ایک مقرر وقت تک چل رہا ہے، یہی اللہ تمھارا رب ہے، اس کی بادشاہی ہے اور جنھیں تم اس کے سوا پکارتے ہو، وہ کھجور کی گٹھلی کی باریک جھلی جتنا بھی اختیار نہیں رکھتے⑬ اگر تم انھیں پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر وہ سن بھی لیں تو وہ تمھیں جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے دن وہ تمھارے (اس) شرک کا انکار کر دیں گے اور کوئی آپ کو خوب باخبر (اللہ) کے مانند خبر نہیں دے گا⑭

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کی قدرت کی نشانیاں:

دو دریا برابر نہیں، یعنی کفر و اسلام برابر نہیں۔ اللہ کفر کو مغلوب ہی کرے گا، اگرچہ تم کو دونوں سے فائدہ ملے گا، مسلمانوں سے قوت اور کافروں سے جزیہ وخراج۔ گوشت میٹھے اور کھاری دونوں قسم کے پانی سے نکلتا ہے، یعنی مچھلی اور گہنا یعنی موتی مونگا اور جواہرا اکثر کھارے پانی سے نکلتے ہیں اور کبھی میٹھے پانی سے بھی نکلتے ہیں۔ یہ جو فرمایا: جو پہنتے ہو تو معلوم ہوا کہ صرف جواہر پہننا مردوں کو حرام نہیں ہے۔ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، یعنی رات دن کی طرح کبھی کفر غالب ہے، کبھی اسلام اور سورج چاند کی طرح ہر چیز کی مدت مقرر ہے دیر سویر نہیں ہوتی، پھر اس میں سے اللہ کی وحدانیت نکلی۔ ﴿قِطْمِيْرٍ﴾ اس چھلکے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی پر ہوتا ہے۔ کوئی بھی حق تعالیٰ جیسا خبردار خبریں نہ دے گا، یعنی اللہ سے زیادہ احوال کون جانے، وہی فرماتا ہے کہ یہ شریک غلط ہیں۔ انتھیٰ.

اللہ تعالیٰ نے جو مختلف اشیاء پیدا کی ہیں، ان کے پیدا کرنے میں اپنی عظیم قدرت کے متعلق آگاہ فرماتا ہے کہ اس نے دو دریا پیدا کیے: ایک شیریں جو پیاس بجھاتا ہے، خوشگوار ہے، وہ یہی چھوٹی بڑی ندیاں ہیں جو لوگوں کے درمیان بہہ رہی ہیں، اس ضرورت کے مطابق جو اُن کی مختلف اقالیم اور شہروں میں، آبادی اور جنگل و بیابان میں ہے۔ یہ ندیاں شیریں ہیں، ان کا پانی، اس شخص کے لیے جو اسے لینا چاہے، خوشگوار ہے۔ ﴿وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾ یعنی اور یہ کھارا اور کڑوا ہے۔ یہ وہی دریائے ساکن ہے جس میں بڑے بڑے جہاز چلتے ہیں اور یہ نہایت درجے کا کھارا کڑوا ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾ أَيْ: مُرٌّ، یعنی کڑوا۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ﴾ ﴿لَحْمًا طَرِيًّا﴾ سے مراد مچھلی ہے اور ﴿حِلْيَةً﴾ سے مراد موتی مونگا ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝ فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ [الرحمن: ۲۲۔ ۲۳] ''ان دونوں میں سے موتی اور مونگے برآمد ہوتے ہیں۔ پھر تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟'' ﴿ مَوَاخِرَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جہاز دریا کو اپنی حیزوم سے پھاڑتے ہیں۔ حیزوم اس کے آگے کی جانب اونٹ کی کوہان کی شکل کی طرح ہے جو پرندے کے سینے کے مشابہ ہوتی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "تَمْخُرُ الرِّيحُ السُّفُنَ وَلَا تَمْخُرُ الرِّيحُ مِنَ السُّفُنِ إِلَّا الْعِظَامَ"[1] ''ہوا کشتیوں کو پھاڑ دیتی ہے اور وہ بڑی بڑی کشتیوں ہی کو پھاڑتی ہے۔''

قولہ جل و علا: ﴿ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ یعنی تاکہ تم ایک قطر (کنارا) سے دوسرے قطر کی طرف اور ایک سمندر سے دوسرے سمندر کی طرف اپنی تجارت کے سفروں میں اس کا فضل تلاش کرو۔ ﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ اور شاید اپنے رب کا شکر کرو اس بات پر کہ اس نے تمھارے لیے اس عظیم خلق کو، یعنی دریا کو مسخر کر دیا جس میں تم جس طرح چاہتے ہو تصرف کرتے ہو اور جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاتے ہو۔ اس میں سے کوئی شے تمھارے لیے رکاوٹ نہیں بنتی، بلکہ اس نے تو اپنی قدرت سے آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کو تمھارا مسخر کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے فضل اور رحمت سے ہے۔

مشرکوں کے معبود کسی چیز کے مالک نہیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ یہ بھی اللہ پاک کی قدرتِ تام اور سلطانِ عظیم سے ہے کہ اس نے رات کو اس کی تاریکی کے ساتھ اور دن کو اس کی روشنی کے ساتھ تمھارا مسخر کر دیا ہے۔ ایک کی درازی سے لیتا ہے اور اس کو کم کر دیتا ہے، چنانچہ وہ برابر ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ اس میں سے لیتا ہے اور اس میں داخل کرتا ہے تو یہ لمبا ہو جاتا ہے اور دوسرا گھٹ جاتا ہے۔ پھر سردی اور گرمی کے موسم میں باہم ایک دوسرے کو کترتے ہیں اور مسخر کیا سورج چاند کو، یعنی نجوم اور سیارے کو اور ثوابت اپنی روشنیوں کے ساتھ آسمانوں کے جسموں میں باقی ہیں۔ سب کے سب ایک مقدارِ معین کے ساتھ اور ایک متعین راہ پر چلتے ہیں۔ یہ اندازہ عزیز و علیم کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے اور یہ ایک مقررہ مدت تک ہے، یعنی روزِ قیامت تک۔

﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ﴾ یعنی جس نے یہ سب کام کیے، وہی ربِ عظیم ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اس کے سوا جن بتوں اور شریکوں کو تم پکارتے ہو، جن کو تم خیال کرتے ہو کہ یہ ملائکہ مقربین ہیں وہ تو قطمیر کے بھی مالک نہیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، عطاء، عطیہ عوفی، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ قطمیر وہ لفافہ ہے جو کھجور کی گٹھلی پر ہوتا ہے۔[2] یعنی وہ آسمانوں اور زمین سے کسی شے کے مالک نہیں ہیں اور نہ ہی اس

[1] تفسیر ابن کثیر (۷۲۱/۳) [2] تفسیر الطبري (۴۵۶/۲۰)

قطمیر کے برابر کسی چیز کے مالک ہیں۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: اگر تم ان کو پکارو تو تمھاری پکار کو نہ سنیں، یعنی جن معبودوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمھاری پکار کو سنتے نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ تو جماد ہیں، ان میں روحیں نہیں ہیں، اور اگر وہ سنیں تو تم کو جواب نہ دیں، یعنی جو کچھ تم ان سے طلب کرتے ہو اس میں سے کسی شے پر قدرت نہیں رکھتے۔

﴿ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن وہ تم سے بے زار ہوں گے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [الأحقاف: ٦۔ ٧] ''اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہوگا جو اللہ کے سوا ایسوں کو پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی دعا قبول نہ کر سکیں بلکہ ان کے پکارنے سے محض بے خبر ہوں۔ اور جب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو یہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی پرستش سے صاف انکار کر جائیں گے۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ [مریم: ٨١۔ ٨٦] ''انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے لیے باعثِ عزت ہوں، لیکن ایسا ہرگز ہونا نہیں۔ وہ تو اُن کی پوجا سے منکر ہو جائیں گے اور اُلٹے ان کے دشمن بن جائیں گے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ امور کے عواقب اور انجام کی تجھے کوئی خبر نہ دے گا، اس شخص کی طرح جو ان کی خوب خبر رکھتا ہے اور واقف کار ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد خبیر سے اس کا نفسِ مقدس ہے تبارک وتعالیٰ، کیوں کہ واقعے کی اس نے پکی خبر دی ہے اور جو شے حتمی طور پر واقع ہونے والی ہے، وہ بتائی ہے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے: ﴿ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ ﴾ یعنی ان میں سے ایک انتہائی شیریں ہے۔ ﴿ سَآىِٕغٌ شَرَابُهٗ ﴾ اس کی شیرینی کے باعث اس کا پینا رچتا ہے اور اس کا حلق میں اترنا سہل ہوتا ہے۔ ﴿ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ﴾ اور دوسرا انتہائی کھارا ہے۔ کسی نے کہا: وہ ہے جو اپنے کھاری پن کی وجہ سے حلق کو جلا دیتا ہے۔ چنانچہ ''بحرین'' سے مراد میٹھا اور کھاری دریا ہیں ''عَذْبٌ فُرَاتٌ'' تو شیریں دریا ہوا اور ''اُجَاجٌ'' کڑوا۔ عیسی بن عمر نے ''سَیِّغَ'' بہ تشدیدِ یائے تحتانی پڑھا ہے اور اس کا سکون بھی مروی ہے۔ امام طلحہ اور ابو نہیک رحمہما اللہ نے ''مَلح'' کو بہ فتحِ میم پڑھا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ آیت سے مقصود مثل کا بیان ہے۔ اللہ پاک نے مومن و کافر کی مثال بیان فرمائی ہے۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/٧٢١، ٧٢٢) [2] فتح القدير (٤/٤٥٢)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا ﴾ ﴿ لَحْمًا طَرِيًّا ﴾ سے مراد وہ حیوانات ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے، جو میٹھے اور کھاری دریا سے شکار کیے جاتے ہیں۔ یہ آیت اور اس کا ما بعد یا تو بحرین کی صفت میں استطراد ہے، یعنی ان کو دور تک لے جانا ہے اور ان نعمتوں اور منافعوں کا استطراد ہے جو ان میں ہیں۔ یا تمثیل کا کامل کرنا ہے، معنی یہ ہیں کہ جس طرح دونوں دریا اگرچہ مشترک ہیں، وہ بعض فوائد میں برابر نہیں ہوتے ہیں، اس حیثیت سے کہ وہ اس شے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں جو ان کی اصل ہے، یعنی پانی، اس لیے کہ ان میں سے ایک میں وہ شے مل گئی ہے جس نے اس کو فاسد کر دیا ہے اور اس کی فطرت سے اس کو بگاڑ دیا ہے۔ اسی طرح کافر مومن کے برابر نہیں ہوتا، اگرچہ بعض صفات میں کافر مومن کا شریک ہے، جیسے: شجاعت وسخاوت اور اس جیسی اور صفات۔ وہ برابر نہیں ہو سکتے اس شے میں ایک دوسرے سے دوری کی وجہ ہے جو خاصیتِ عظمیٰ ہے، اس لیے کہ ان میں سے ایک تو اپنی اصلی فطرت پر باقی ہے اور اپنے کمالِ لائق کا جامع ہے جب کہ دوسرا ایسا نہیں ہے۔

یا کڑوے پانی کی کافر پر فضیلت ہے، اس لحاظ سے کہ بہت سے منافع کھاری دریا اور شیریں دریا میں مشترک ہیں اور کافر منافع سے بالکل خالی ہے۔ یہ فضیلت اس آیت کے طریقے پر ہے: ﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [البقرة: ٧٤] ''پھر اس کے بعد تمھارے دل پتھر جیسے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہوگئے، پتھروں سے تو نہریں بہ نکلتی ہیں، اور بعض پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے، اور بعض اللہ تعالیٰ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں، اور تم اللہ کو اپنے اعمال سے غافل نہ جانو۔''[1] (قاله أبو السعود)

﴿ حِلْيَةً ﴾ سے مراد لؤلؤ اور مرجان ہیں۔ مرجان چھوٹے موتیوں کو کہتے ہیں۔ طرطوشی نے کہا: مرجان سرخ عروق ہیں، دریا سے نکلتے ہیں ہاتھ کی انگلیوں کی طرح اور اسی طرح مغاربِ ارض میں ہم نے بہت مشاہدہ کیا ہے۔ انتھی. ظاہر یہ ہے کہ معنی یہ ہیں کہ تم دونوں دریاؤں سے زیور نکالتے ہو۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حِلْيَةً ﴾ تو کھاری دریا سے ہی نکالا جاتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ﴿ حِلْيَةً ﴾ ان میں سے جب ہی نکالا جاتا ہے، جب کہ دونوں آپس میں مل جائیں، نہ کہ اُن میں سے اکیلے اکیلے ہر ایک سے نکالا جاتا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے مبرد کے قول کو ترجیح دی ہے،[2] لبسِ حلیہ کے معنی یہ ہیں کہ تم اس میں سے ہر شے کو اس کی مناسبت کے لحاظ سے پہنتے ہو، یعنی جو شے جس عضو کے مناسب ہے، اس کو اسی میں پہنتے ہو، جیسے: انگوٹھی کو انگلی میں، کنگن کو ہاتھ میں، گلوبند

[1] تفسير أبي السعود (١٤٧/٧) [2] فتح القدير (٤٥٢/٤)

کو گردن میں اور خلخال کو پاؤں میں اور جو چیزیں پہنی جاتی ہیں، ان میں سے حلیہ سلاح ہے، جو اٹھایا جاتا ہے، جیسے: تلوار و زِرہ اور ان کے مثل اور چیزیں۔

﴿ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ دیکھتا ہے تو جہازوں کو کہ وہ دریاؤں میں سے ہر ایک میں ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فِيْهِ ﴾ کی ضمیر خاص کر کھاری دریا کی طرف راجع ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اللہ پاک "فیھما" ضمیر تثنیہ فرماتا۔ "مَخَر" پھاڑنے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "مَخَرَتِ السَّفِيْنَةُ تَمْخُرُ" جبکہ وہ دریا میں اپنے چلنے سے پانی کو پھاڑے، معنی یہ ہیں: دیکھے تو جہازوں کو دونوں دریاؤں میں پانی کو پھاڑتے ہوئے۔ بعض جہاز تو آگے آنے والے ہیں اور بعض پیچھے جانے والے ہیں ایک ہی ہوا سے۔ سورۃ النحل میں اس پر کلام گزر چکا ہے۔[1]

﴿ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ میں حرفِ لام اس فعل سے متعلق ہے جس پر پہلا کلام دلالت کرتا ہے: "أَيْ: فَعَلَ ذٰلِكَ لِتَبْتَغُوْا" یعنی اللہ پاک نے یہ کام کیا کہ جہازوں کو دریا میں چلایا، تاکہ تم اس کے فضل سے تلاش کرو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فضل کا تلاش کرنا دریا میں دور دور شہروں کی طرف تھوڑی مدت میں جا کر تجارت کرنا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔[2] ﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ اور شاید تم اللہ کا شکر کرو ان نعمتوں پر جن کا اس نے تم پر مذکورہ نعمتوں میں سے انعام فرمایا ہے۔ ﴿ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ دن اور رات کے بعض اجزاء دوسرے کے ساتھ ملا دیتا ہے تو ان میں ایک کو بڑھا دیتا ہے دوسرے میں کمی کر کے۔ اس کی تفسیر آلِ عمران میں اور قرآن میں کئی جگہ گزر چکی ہے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ معطوف ہے ﴿ يُوْلِجُ ﴾ پر، لیکن ﴿ يُوْلِجُ ﴾ مضارع اور ﴿ سَخَّرَ ﴾ ماضی؟ تو صیغے کا یہ اختلاف اس لیے ہے کہ ایک کا دوسرے میں داخل کرنا، موقع بہ موقع متجدد ہوتا رہتا ہے۔ سورج اور چاند کی تسخیر ایک ایسا امر ہے جس میں کسی طرح کا تجدد و تعدد نہیں ہے۔ متعدد و متجدد تو اس کے آثار ہیں۔ بالجملہ سورج اور چاند اپنے فلک میں ایک مدتِ مقرر کے لیے چلتے ہیں جو مدت اللہ تعالیٰ نے ان کے چلنے کے لیے مقرر فرما دی ہے، وہ قیامت کا دن ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ مدت ہے جس میں فلک کو قطع کرتے ہیں اور وہ سورج کے لیے ایک برس ہے اور چاند کے لیے ایک مہینا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد سورج کا دن میں چلنا اور چاند کا رات میں چلنا ہے۔ اس کی تفسیر سورت لقمان میں پوری طرح پر گزر چکی ہے۔[4]

﴿ ذٰلِكُمُ ﴾ مبتداء ہے ﴿ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ﴾ اس کی خبر ہے، یعنی ان افعال کا فاعل جن کا ذکر سورت کے شروع سے لے کر یہاں تک گزر چکا ہے اور جس کی صنعت سے مذکورہ امور ہیں، وہ خالقِ مقدر اور قادرِ مقتدر،

---

① رقم الآية (١٤) ② تفسير القرطبي (٣٣٦/١٤) ③ رقم الآية (٢٧) ④ رقم الآية (٢٩)

مالکِ عالم ہے اور اس میں تصرف کرنے والا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ لَهُ الْمُلْكُ ﴾ جملہ مستقلہ ہو اس آیت کے مقابلے میں: ﴿ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴾ یعنی جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، نہ وہ قطمیر پر قادر ہیں اور نہ اس کے پیدا کرنے پر۔ ﴿ قِطْمِيْرٍ ﴾ وہ باریک پوست، یعنی پردہ ہے جو کھجور اور گٹھلی کے درمیان ہوتا ہے اور ان پر لفافے کی طرح ہو جاتا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شقِ نواۃ ہے، یعنی گٹھلی کا کٹاؤ۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ قمع ہے (''قِمع'' بالکسر مع سکون وحرکت و بالفتح ایضاً ''غلافِ خرما'' صراح) جو گٹھلی کے سر پر ہوتا ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: اور کہتے ہیں کہ وہ نکتۂ سفید ہے جو گٹھلی کی پیٹھ میں ہوتا ہے، جس سے کھجور کا درخت اُگتا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ قِطْمِيْرٍ ﴾ قشر ہے اور ایک لفظ میں یہ ہے کہ وہ جلد ہے جو گٹھلی کی پیٹھ پر ہوتی ہے۔[2] یہ بات معلوم ہے کہ گٹھلی میں چار چیزیں ہوتی ہیں، جن کے ساتھ قلت کی مثال بیان کی جاتی ہے: فتیل: یہ وہ ہے جو گٹھلی کے شگاف میں ہوتا ہے۔ قطمیر: یہ لفافہ ہے۔ ثفروق: یہ وہ ہے جو قمع اور گٹھلی کے درمیان ہوتا ہے۔ نقیر: یہ وہ ہے جو اس کی پشت میں ہوتا ہے (نقیر بہ معنی چاہک دانۂ خرما)۔ پھر اللہ پاک نے ان لوگوں کا حال بیان کیا جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں کہ وہ نہ نفع دیتے ہیں نہ ضرر پہنچاتے ہیں۔

ارشاد فرمایا: ﴿ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ﴾ یعنی اگر تم حوادث میں ان سے فریاد رسی چاہو تو وہ تمھاری پکار کو نہ سنیں، کیوں کہ وہ تو جمادات ہیں اور مدرکات، یعنی سمجھ آنے والی چیزوں میں سے کسی شے کو نہیں سمجھتے اور اگر بالفرض والتقدیر سن لیں تو تم کو جواب نہ دیں، اس لیے کہ وہ اس سے عاجز ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر وہ سن لیں تو تم کو نفع نہ پہنچائیں۔[3] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر ہم ان کے واسطے زندگی اور سننے کی طاقت کرتے، پھر وہ تمھاری پکار کو سنتے تو البتہ وہ تمھارے بارے میں اللہ کے زیادہ مطیع ہوتے اور جس کفر کی طرف تم نے ان کو بلایا ہے، اس کے لیے تمھارا کہنا نہ مانتے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ تمھارے ان کو پوجنے سے بیزار ہوں گے اور کہیں گے کہ تم ہم کو نہیں پوجتے تھے۔

یہ بھی جائز ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ﴾ اور اس کا مابعد کفار کے ان معبودین کی طرف راجع ہے جو عقل رکھنے والے ہیں۔ یہ لوگ ملائکہ، جن اور فرشتے ہیں، یعنی یہ لوگ اس سے انکار کریں گے کہ جو کچھ تم نے کیا، وہ حق ہو اور اس کا انکار کریں گے کہ انھوں نے تم کو اپنی عبادت کا حکم کیا، جس طرح کہ اللہ پاک نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے خبر دی ہے کہ وہ اس طرح کہیں گے: ﴿ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ﴾ امام قرطبی رحمہ اللہ

[1] تفسير القرطبي (٣٣٧/١٤) [2] تفسير الطبري (٤٥٢/٢٠) [3] تفسير القرطبي (٣٣٧/١٤)

نے کہا: جائز ہے کہ اس میں اصنام بھی شامل ہوں، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ان کو زندہ کردے یہاں تک کہ اس بات کی خبر دیں کہ وہ عبادت کے لائق نہیں ہیں۔[1]

﴿ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴾ کے خطاب کی دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو خطاب ہے۔ دوسری یہ ہے کہ کسی کے ساتھ خاص نہیں ہے، یعنی مذکور ہوا جو کچھ مذکور ہوا اور اے سننے والے! وہ کوئی ہو تجھے خبیر کی طرح خبر نہ دے گا۔ یا یہ معنی ہیں: اے شخص! تو اسبابِ غرور (دھوکے کے اسباب) کی وجہ سے جو آزمائش میں پڑا ہوا ہے، تجھے کوئی بھی خبر نہیں دے گا، اس شخص کی طرح جو اشیاء کی خوب خبر رکھتا ہے اور چھپے ہوئے امور کا جاننے والا ہے اور وہ اللہ پاک ہے، کیوں کہ کسی کو اس کی خلق اور ان کے اقوال و افعال کی اس سے بڑھ کر خبر نہیں ہے۔ اس کو امور کی حقیقت اور حقائق کی خوب خبر ہے۔ پھر اللہ پاک نے یہ بیان کیا کہ خلق کو اس کی طرف افتقار ہے، یعنی حاجت ہے اور اس کے فضل و کرم کی اسے بہت حاجت ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۭ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

اے لوگو! تم (سب) اللہ ہی کے محتاج ہو اور اللہ ہی بالکل بے نیاز، قابلِ تعریف ہے (15) اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے (فنا کر دے) اور (تمھاری جگہ) ایک نئی مخلوق لے آئے (16) اور اللہ کے لیے یہ (بات) کچھ مشکل نہیں (17) اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا اور اگر کوئی بوجھ لدا شخص اپنا بوجھ اُٹھانے کو بلائے گا تو اس (کے بوجھ میں) سے کچھ بھی اُٹھایا نہ جائے گا، اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہو، بس آپ تو انہی لوگوں کو ڈراتے ہیں جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو پاک ہوا تو وہ اپنے ہی لیے پاک ہوتا ہے اور (سب کو) اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (18)

---

[1] تفسير القرطبي (٣٣٧/١٤) [2] فتح البيان (٢٣٢/١١-٢٣٦)

4

سب لوگ اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں:

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ وہ اپنے ماسوا سے بے نیاز ہے اور ساری مخلوقات اس کی طرف محتاج ہیں اور اس کے سامنے ذلیل و مطیع ہیں۔ فرماتا ہے: لوگو! تم اللہ کی طرف محتاج ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سارے حرکات و سکنات میں اس کے محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے غنی بالذات ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴾ یعنی وہی اکیلا غنیٰ کے ساتھ منفرد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور اپنے سارے افعال و اقوال و تقدیر و شریعت میں محمود ہے، وہ ایسی قدرت والا ہے کہ اگر وہ چاہتا تو اے لوگو! تم کو لے جاتا اور تمھارے سوا اور قوم کو لے آتا، یہ کام اس کے لیے کوئی دشوار اور ممنوع نہیں ہے، اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ﴾ یعنی قیامت کے دن کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور اگر کوئی اپنے بوجھوں تلے دبا ہوا شخص اس بات کی طرف پکارے گا کہ جو گناہ اس پر ہیں، ان کے اٹھانے میں یا اُن میں سے کچھ اٹھانے میں اس کی مدد کی جائے تو اس سے کچھ بھی نہ اٹھایا جائے گا، گو وہ اس کا ناتے دار ہی کیوں نہ ہو، یہاں تک کہ گو اس کا باپ یا بیٹا ہو۔ ہر کوئی اپنے نفس اور حال میں مشغول ہوگا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے ﴿ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰی حِمْلِهَا لَا یُحْمَلْ مِنْهُ شَیْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ پڑوسی ہے، جو قیامت کے دن اپنے پڑوسی سے چمٹے گا، پھر کہے گا: یا رب! تو اس سے پوچھ کہ یہ میرے آگے اپنے گھر کا دروازہ کیوں بند کرتا تھا اور بے شک کافر قیامت کے دن البتہ مومن سے چمٹے گا اور اس سے کہے گا: اے مومن! بے شک تیرے پاس میرا ایک احسان ہے، تحقیق تو جانتا ہے کہ دنیا میں، میں تیرے لیے کیسا تھا اور تحقیق آج میں تیری طرف محتاج ہوا ہوں، چنانچہ مومن اس کے لیے اپنے رب کے پاس ہمیشہ شفاعت کرتا رہے گا، یہاں تک کہ اس کو ایک ایسی منزل کی طرف پھیر لے جائے گا جو اس سے کم درجے کی ہوگی اور وہ آگ میں ہے۔ اور بے شک قیامت کے دن والد اپنے بیٹے سے چمٹے گا اور کہے گا: بیٹا میں تیرے لیے کیسا والد تھا؟ تو بیٹا خیر کے ساتھ اس کی ثنا کرے گا، پھر باپ اس سے کہے گا کہ بیٹا! بے شک مجھے تیری نیکیوں میں سے ذرہ بھر نیکی کی حاجت ہے کہ اس کے سبب سے میں اس عذاب سے نجات پالوں گا جو تو دیکھ رہا ہے، تو اس کا بیٹا اس سے کہے گا: ابا کیا ذرا سی شے ہے جو تم نے مانگی، لیکن میں بھی اسی کے مثل ڈر رہا ہوں جو تم ڈر رہے ہو، لہٰذا مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ تم کو کچھ دوں۔ پھر وہ اپنی جورو سے چمٹے گا اور کہے گا: اے فلانی! یا اے عورت! میں تیرا کیسا خاوند تھا؟ تو وہ خیر کے ساتھ اسے یاد کرے گی، چنانچہ وہ اس سے کہے گا: میں تو ضرورت مند ہو کر تجھ سے ایک نیکی طلب کرتا ہوں کہ تو وہ مجھے بخش دے، شاید میں اس کے ساتھ اس شے سے نجات حاصل کرلوں جس کو تو دیکھ رہی ہے۔ راوی نے کہا: پھر وہ کہے گی: کیا ذرا سی شے ہے جو تو نے طلب کی ہے لیکن مجھ

میں طاقت نہیں ہے کہ تجھے کچھ دوں، میں تو ویسے ہی ڈر رہی ہوں جس طرح تو ڈر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا ﴾ اور اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ لَا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ﴾ [لقمان: ٣٣] ''جس دن باپ اپنے بیٹے کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کا ذرا سا بھی نفع کرنے والا ہوگا۔'' نیز فرماتا ہے: ﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿٣٤﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿٣٥﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴾ [عبس: ٣٤۔ ٣٧] ''اس دن آدمی اپنے بھائی سے اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا، ان میں سے ہر ایک کو اس دن ایسی فکر (دامن گیر) ہوگی، جو اس کے لیے کافی ہوگی۔''[1] (رواه ابن أبي حاتم بسنده)

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ﴾ یعنی جس شے کو تو لے کر آیا ہے اس سے وہی لوگ نصیحت پذیر ہوتے ہیں جو دانائی اور بینائی اور عقل والے ہیں۔ اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں، جس کام کا ان کو حکم دیا ہے اس کے کرنے والے ہیں۔ ﴿ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جو کوئی نیک کام کرے گا تو اس کا فائدہ اسی کی طرف رجوع کرے گا اور اللہ ہی کی طرف مرجع اور مآب ہے اور وہ جلد حساب لینے والا ہے، ہر عامل کو اس کے عمل کی جزاء دے گا۔ خیر ہے تو خیر، شر ہے تو شر۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ لوگ سارے امورِ دین ودنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف محتاج ہیں، چنانچہ علی الاطلاق وہ اپنی جانوں میں اور باقی امور میں جو ان کو پیش آتے ہیں، اس کی طرف محتاج ہیں۔ ﴿ اَلْفُقَرَآءُ ﴾ کو جو الف اور لام کے ساتھ معرفہ ذکر فرمایا تو اس سے ان کے فقر میں مبالغہ کرنا ہے، گویا ان کی فقیری کی شدت اور حاجت کی کثرت کی وجہ سے وہی فقراء ہیں اور باقی خلائق کا فقر اُن کے فقر کی نسبت کسی شمار میں نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴾ [النساء: ٢٨] ''اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔'' ان کا نام فقراء حقارت کی وجہ سے نہیں رکھا گیا، بلکہ وہ استغناء پر تعریض کے لیے ہے۔ اسی لیے اپنے نفسِ مقدس کو غنا کے ساتھ موصوف کیا ہے جو اغنیاء کا مطمع ہوتی ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ یعنی غنی تو علی الاطلاق اللہ ہی ہے اور اپنے بندوں کی حمد اور ستایش کا مستحق وہی ہے، اس لیے کہ اس نے ان پر احسان کیا ہے۔ پھر جن امور میں اللہ کی طرف بندوں کا فقر اور اللہ کا استغناء ان سے خوب ثابت ہوتا ہے، ان میں سے ایک قسم کا ذکر کیا اور ارشاد فرمایا: ﴿ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٧٨) [2] تفسير ابن كثير (٣/٧٢٢، ٧٢٣)

بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴾ یعنی اگر وہ چاہے تو تم سب کو عدم کی طرف لے جائے اور تم کو فنا کر ڈالے۔ پھر استغناء کے بیان کو اور زیادہ کیا، فرمایا کہ تمھارے عوض ایک نئی مخلوق لے آئے کہ وہ اس کی اطاعت کریں اور اس کی نافرمانی نہ کریں۔ یا مخلوق کی قسموں میں سے ایک قسم لے آئے اور تمھارے جہان کے بجائے کوئی اور جہاں لے آئے جس کو تم پہچانتے ہو، اور تمھارا یہ لے جانا اور دوسروں کو لے آنا، اللہ تعالیٰ کے لیے ممنوع نہیں اور نہ ہی کچھ مشکل ہے۔ اس میں کامل بلاغت ہے، یعنی تمھارا لے جانا صرف اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ اس کی تفسیر سورت ابراہیم میں گزر چکی ہے۔[1] ﴿ وَلَا تَزِرُ ﴾ کے معنی ہیں: "لَا تَحْمِلُ" ﴿ وَازِرَةٌ ﴾ صفت ہے "نَفْسٌ" محذوف کی، اس کو بہ سبب معلوم ہونے کے محذوف کر دیا۔ یعنی نہ اٹھائے گا کوئی نفس گناہ گار کسی دوسرے نفس کا گناہ، بلکہ ہر نفس اپنے گناہ کے بوجھ کو آپ ہی اٹھائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ [العنکبوت: ۱۳] "اور یقیناً وہ اپنے بوجھ اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کئی اور بوجھ ضرور اُٹھائیں گے۔" اس آیت کے مخالف نہیں ہے، اس لیے کہ وہ اپنی گمراہی کے بوجھ کے ساتھ دوسروں کو گمراہ کرنے کے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور یہ سب انھیں کے بوجھوں سے ہے نہ کہ ان کے غیر کے بوجھوں سے۔ اسی کے مثل یہ حدیث شریف ہے: «مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ»[2] یعنی جو کوئی برا طریقہ نکالے تو اس پر اس کا گناہ ہے اور اس شخص کا گناہ جو اس پر قیامت کے دن تک عمل کرے گا، کیوں کہ جس شخص نے وہ برا طریقہ نکالا، اس نے اپنے ہی برے طریقے کا گناہ اٹھایا۔ اس آیت پر پورا کلام گزر چکا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مُثْقَلَةٌ ﴾ سے مراد "نَفْسٌ مُثْقَلَةٌ" ہے، یعنی وہ نفس جو اپنے گناہوں کے بوجھ تلے دبا ہوا مر رہا ہے۔ کہا: اور یہ مذکر اور مونث کے لیے واقع ہوتا ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اگر کوئی نفسِ مثقلہ کسی انسان کو اپنے بوجھ کی طرف بلائے، اس بوجھ سے مراد اس کے گناہ ہیں، تو اس کے بوجھ میں سے کچھ نہ اٹھایا جائے گا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس لیے کہ اس پر گناہ ہے اور وہ کوئی ایسا نہیں پاتا جو اس کی طرف سے اس کے گناہ میں سے کچھ اٹھائے۔[4]

﴿ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ﴾ یعنی اگرچہ وہ شخص، جس کو وہ نفسِ مثقلہ بلاتا ہے، اس کے ناتے والا ہو، پھر بھی وہ اس کے بوجھ میں سے کچھ بھی نہیں اٹھائے گا۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر بلائے کوئی شخص جو گناہوں سے بھاری ہو رہا ہے، کسی دوسرے شخص کو کہ وہ اس کے ساتھ مل کر اس کے گناہوں میں سے کچھ اٹھا لے تو جس کو بلایا ہے وہ ان گناہوں میں سے کچھ نہ اٹھائے گا، گو وہ نسب میں اس کا قریبی ہو، جیسے: باپ، ماں، بیٹا، بھائی۔ پھر جس شخص کے ساتھ بلانے والے کی کچھ رشتے داری نہیں ہے تو وہ بھلا کیوں کر اٹھائے گا!! "حِمل" بالکسر وہ ہے جو پیٹھ وغیرہ پر اٹھایا جاتا ہے، اس کی جمع "أَحْمَالٌ وَّحُمُوْلٌ" ہے۔ کہا جاتا ہے: "حَمَلْتُ الْمَتَاعَ حَمْلًا" "میں نے بھاری

[1] رقم الآية (١٩)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٣)
[3] تفسير القرطبي (١٤/ ٣٣٩)
[4] تفسير الطبري (٢٠/ ٤٥٥)

سامان اٹھایا۔'' یہ باب ''ضَرَبَ'' سے ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: ''أَنَا حَامِلٌ'' اور ''الْأُنْثٰی حَامِلَةٌ'' تائے تانیث کے ساتھ اس لیے کہ یہ صفتِ مشترکہ ہے۔ ابن سکیت رحمہ اللہ نے کہا: ''حَمل'' بالفتح وہ ہے جو پیٹ میں ہے، یا درخت کے سر پر۔ اور ''حِمل'' بالکسر وہ ہے جو پیٹھ پر ہے یا سر پر۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا: صحیح یہی ہے اور یہی قول امام اصمعی رحمہ اللہ کا ہے۔ اور کہا ہے کہ عورت جب پیٹ سے ہو تو اس کو ''اِمْرَأَةٌ حَامِلٌ وَّحَامِلَةٌ'' کہتے ہیں۔ کسی نے ''ذُوْ قُرْبٰی'' پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ كَانَ ﴾ تامہ ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ ﴾ [البقرة: ٢٨٠] ''اور اگر کوئی تنگی والا ہو۔''

امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نظم کلام بہت خوب ہے از روئے ملاءمت واسطے ناقصہ کے، اس لیے کہ معنی یہ ہیں کہ مثقلہ جس وقت کسی کو اپنے بوجھ کی طرف بلائے تو اس سے نہ اٹھایا جائے، اگرچہ وہ شخص جس کو بلایا جائے وہ اس کا قریبی رشتے دار ہو۔ یہ کلام ملتئم ہے۔ اور اگر تو یوں کہے: اگرچہ پایا جائے ''ذُوْ قُرْبٰی'' تو کلام اپنے التئام سے نکل جائے گا۔[1] انتھٰی.

سیدنا عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا: ''خبردار! نہیں گناہ کرتا کوئی گناہ کرنے والا مگر اپنی جان پر، نہیں جنایت (گناہ) کرتا کوئی والد اپنی اولاد پر اور نہ کوئی اولاد اپنے والد پر۔''[2] (أخرجه أحمد والترمذي و صححه والنسائي و ابن ماجه)۔ ابو رمثہ کہتے ہیں: میں اپنے باپ کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، پھر جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے باپ سے فرمایا: یہ تیرا بیٹا ہے؟ اس نے کہا: ہاں ربِ کعبہ کی قسم! فرمایا: خبردار! بے شک وہ نہیں جنایت کرتا ہے تجھ پر اور نہ تو جنایت کرتا ہے اس پر، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔[3] (أخرجه أبو داود والترمذي والنسائي والبيهقي وغيرهم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ باپ اور ماں بیٹے سے ملیں گے تو وہ دونوں اس سے کہیں گے: اے میرے بیٹے! تو ہمارے بعض گناہ ہم سے اٹھا تو وہ کہے گا: میں طاقت نہیں رکھتا ہوں، میرے لیے تو وہی بوجھ بہت ہے جو مجھ پر ہے۔[4] جملہ: ﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ متانفہ ہے، اس کا مقصد اس شخص کا بیان کرنا ہے جو اِنذار سے نصیحت پذیر ہوتا ہے، یعنی تو انہیں کو ڈراتا ہے جو اپنے رب سے اس حال میں ڈرتے ہیں کہ اس کے عذاب سے غائب ہیں۔ یا ڈرتے ہیں اس حال میں کہ وہ عذاب ان سے غائب ہے۔ یا اس

---

[1] الكشاف (٦١٦/٣)

[2] مسند أحمد (٤٩٨/٣) سنن الترمذي (٣٠٨٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٤٤/٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث ٢٦٦٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٨٠)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٩٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٣٢) سنن البيهقي الكبرىٰ (٢٧/٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٣١٧)

[4] تفسير البغوي (٤١٧/٦)

سے اپنی خلوتوں میں، یعنی لوگوں سے الگ اور تنہا ہو کر ڈرتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی تاویل یہ ہے کہ تیرا انذار انہیں کو نفع دیتا ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں،[1] چنانچہ گویا تو اُن کو ڈراتا ہے نہ کہ اُن کے غیر کو ان لوگوں میں سے جن کو ڈرانا فائدہ نہیں دیتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴾ [النازعات: ٤٥] ''آپ تو صرف اس سے ڈرتے رہنے والوں کو آگاہ کرنے والے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴾ [يٰس: ١١] ''بس آپ تو صرف ایسے شخص کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت پر چلے اور رحمان سے بے دیکھے ڈرے، چنانچہ آپ اس کو مغفرت اور باوقار اجر کی خوشخبریاں سنا دیجیے۔''

اقامتِ صلاۃ کے یہ معنی ہیں کہ نماز کے کام کا اہتمام و اعتناء کیا۔ اس سے کسی شے کے ساتھ مشغول نہ ہوئے ان چیزوں میں سے جو اُن کو مشغول کریں اور اس پر دوام کیا۔ ﴿ تَزَكّٰى ﴾ سے مراد شرک اور فواحش کے میل کچیل سے پاک ہونا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جو شخص معاصی چھوڑ کر پاک ہوا اور کثرت سے عملِ صالح کیے تو وہ جو پاک ہوتا ہے تو اپنے نفس کے لیے ہوتا ہے، کیوں کہ اس کا فائدہ خاص طور پر اسی کو پہنچے گا جس طرح کہ وہ شخص جو معاصی کا مرتکب ہوا، اس کا گناہ اسی پر ہوگا نہ کہ اس کے غیر پر۔ جمہور نے ''وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى'' پڑھا ہے اور ابو عمرو نے ''فَاِنَّمَا يَزَّكّٰى'' پڑھ کر تاء کا زاء میں ادغام کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود اور طلحہ رضی اللہ عنہما نے ''وَمَنِ ازَّكّٰى فَاِنَّمَا يَزَّكّٰى'' پڑھا ہے۔[2] اللہ پاک نے اولاً یہ ذکر کیا کہ کوئی کسی کا گناہ نہیں اٹھاتا۔ ثانیاً یہ ذکر کیا کہ گناہ گار اگر اپنے غیر کو بلائے، گو وہ اس کے رشتے داروں سے ہو کہ وہ اس کے گناہوں میں سے کچھ اٹھالے تو وہ اس کو نہ اٹھائے گا۔ پھر ثالثاً یہ ذکر کیا کہ طاعت کا ثواب اس کے فاعل کے ساتھ خاص ہے، اس کے غیر کے لیے اس میں کچھ نہیں ہے۔ پھر مومن اور کافر کے لیے ایک مثال بیان کی۔ پھر ان کے آپس میں تعارض و تضاد کو بیان کیا، پہلے ان کی ذاتوں کے درمیان، پھر اُن کی صفات کے درمیان، پھر دونوں کے آخرت میں جائے قرار اور گھر کے درمیان۔ چنانچہ فرمایا:[3]

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿٢٠﴾
وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ﴿٢١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ
اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي
الْقُبُوْرِ ﴿٢٢﴾ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿٢٣﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا

[1] معاني القرآن (٢٦٧/٤) [2] فتح القدير (٤٥٦/٤) [3] فتح البيان (٢٣٩٢٣٦/١١)

وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝۲۴ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝۲۵ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝۲۶

اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں (ہو سکتے) ⑲ اور نہ اندھیرے اور نہ روشنی ⑳ اور نہ سایہ اور نہ دھوپ ㉑ اور نہ زندے اور نہ مردے برابر ہو سکتے ہیں، بے شک اللہ جسے چاہے سنوا دیتا ہے اور آپ ان کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں ㉒ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں ㉓ بلاشبہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوش خبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا (آیا) ہو ㉔ اور اگر وہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو ان لوگوں نے بھی تو جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے ہوئے، ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے ㉕ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑ لیا جنھوں نے کفر کیا، پس (دیکھو) میرا عذاب کیسا (عبرتناک) تھا؟ ㉖

ایک موازنے کے ذریعے مومن اور کافر کے برابر نہ ہونے کا ثبوت:

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں، یعنی ساری خلق برابر نہیں جن کو ایمان دینا ہے، انہیں کو ملے گا۔ تو بہتیری آرزو کرے تو کیا ہوتا ہے۔ یہ جو فرمایا: نہ اندھیرا نہ روشنی، یعنی نہ اندھیرا روشنی کے برابر ہے اور نہ روشنی اندھیرے کے برابر ہے اور فرمایا تو ان کو نہیں سنا سکتا جو قبروں میں ہیں۔ حدیث میں ہے کہ مردوں کو سلام کرو، وہ سنتے ہیں اور بہت جگہ مردے کو خطاب کیا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مردے کی روح سنتی ہے اور قبر میں پڑا ہوا دھڑ نہیں سن سکتا۔ کوئی امت ایسی نہیں جس میں ڈرانے والا نہ گزرا ہو، ڈرانے والا خواہ نبی ہو خواہ نبی کی راہ پر۔ انتہی[1].

اللہ پاک فرماتا ہے کہ جس طرح یہ مختلف اشیاء جو ایک دوسرے سے علاحدہ ہیں برابر نہیں ہیں، جیسے: اندھا اور دیکھنے والا کہ دونوں برابر نہین ہیں، بلکہ ان کے درمیان بڑا فرق ہے اور جس طرح اندھیرا اور اُجالا برابر نہیں اور نہ ہی سایہ اور دھوپ برابر ہیں، اسی طرح زندے اور مردے برابر نہیں ہیں۔ یہ اللہ پاک نے مومنوں کے لیے ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ مومن زندہ ہیں اور کافروں کے لیے فرمایا کہ مردہ ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ﴾ [الأنعام: ۱۲۲]

”ایسا شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور دے دیا کہ وہ اس کو لیے ہوئے

آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے، کیا ایسا شخص اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں سے نکل ہی نہیں پاتا ہے؟'' نیز اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ﴾ [هود: ٢٤] ''ان دونوں فرقوں کی مثال اندھے، بہرے اور دیکھنے سننے والے جیسی ہے، کیا یہ دونوں مثال میں برابر ہیں؟'' چنانچہ مومن تو دیکھتا، سنتا، روشنی میں چلتا ہے، دنیا اور آخرت میں سیدھی راہ پر ہوتا ہے، یہاں تک کہ یہ حال اس کو سایہ دار چشمے والے باغوں میں قرار پذیر کر دے گا۔ اور کافر اندھا اور بہرا ہے، وہ اندھیروں میں ہی چلتا ہے، وہ ان سے نکل نہیں سکتا، بلکہ وہ اپنی سرکشی اور گمراہی میں دنیا اور آخرت میں حیران و سرگرداں ہے، یہاں تک کہ یہ حال اس کو لو اور گرم پانی کی طرف پہنچا دے گا اور سائے والے دھوئیں میں پہنچائے گا کہ وہ نہ سرد ہے اور نہ عزت کا مقام ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے تاکہ وہ حجت کو سنے اور اس کو قبول کرے اور اس کا مطیع اور فرماں بردار ہو۔ ﴿ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح مردوں کو مرنے کے بعد اور قبروں میں پہنچ جانے کے بعد ہدایت اور اس کی طرف دعوت دینا کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ یہ لوگ کافر ہیں، اسی طرح یہ مشرک ہیں جن پر بدبختی لکھی جا چکی ہے۔ تیرے لیے ان کے حق میں کوئی حیلہ اور تدبیر نہیں ہے اور نہ تو اُن کی ہدایت کی طاقت رکھتا ہے۔ ﴿ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴾ یعنی تیرے ذمے تو صرف رسالت کا پہنچا دینا اور ڈرانا ہے۔ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔

﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ یعنی بے شک ہم نے تجھ کو مومنوں کے واسطے خوش خبری سنانے والا اور کافروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ ﴿ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴾ یعنی بنی آدم سے کوئی امت ایسی نہیں گزری کہ اللہ نے اس میں ڈرانے والا نہ بھیجا ہو اور ان کی علتیں اور بہانے دور نہ کر دیے ہوں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ [الرعد: ٧] ''آپ تو صرف آگاہ کرنے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ہادی ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۚ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ [النحل: ٣٦] ''ہم نے ہر اُمت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو۔ پس بعض لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور بعض پر گمراہی ثابت ہوگئی، پس تم خود زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا کچھ ہوا؟'' اس بارے میں آیات بہت ہیں۔

قولہ تبارک و تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴾ بینات سے مراد واضح معجزات اور قطعی دلائل اور پہلی آسمانی کتابیں ہیں اور کتابِ منیر کتاب واضح و بین

ہے، یعنی باوجود اس سب کے انھوں نے رسولوں کو اس شے میں جھٹلایا جس کو وہ لے کر آئے۔ پھر میں نے ان کو عذاب اور سزا کے ساتھ پکڑا، چنانچہ کیسا دیکھا تو نے کہ میرا انکار کرنا ان پر کیسا عظیم اور سخت اور بلیغ ہوا! واللّٰہ أعلم۔[1] (کذا في ابن کثیر)

فتح البیان کا بیان:

"استویٰ" من جملہ ان افعال کے ہے جن میں ایک کافی نہیں ہوتا، چنانچہ اگر یوں کہو کہ استویٰ زید تو صحیح نہ ہو گا، اسی وجہ سے اس کے فاعل پر عطف یا فاعل کی تعداد زیادہ ہونا لازمی ہے۔ اعمیٰ وہ ہے جس سے دیکھنے کی قوت سلب کر لی گئی ہے اور بصیر وہ ہے جس کے لیے دیکھنے کا ملکہ موجود ہے۔ کافر کی اعمیٰ سے تشبیہ دی اور مومن کی بصیر سے۔ کسی نے کہا ہے کہ جاہل اور عالم کی مثال ہے اور باطل کی تشبیہ تاریکیوں سے دی ہے اور حق کی نور سے۔ ظلمات کو جمع اور نور کو واحد ذکر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ باطل کی بہت سی اقسام ہیں اور حق متحد ہے۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا النُّوْرُ ﴾ اور ﴿ وَلَا الْحَرُوْرُ ﴾ میں کلمۂ ﴿ لَا ﴾ زائد ہے۔[2] تقدیر یہ ہے: "وَمَا تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّوْرُ وَلَا الظِّلُّ وَالْحَرُوْرُ"۔ کلمۂ "حَرُوْر" بالفتح سورج کی سخت گرمی کو کہتے ہیں، یہ بَرد کے خلاف ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "حَرَّ الْيَوْمُ وَالطَّعَامُ يَحَرُّ مِنْ بَابِ تَعِبَ وَحَرَّ حَرًّا وَحُرُوْرًا مِنْ بَابَيْ ضَرَبَ وَقَعَدَ لُغَةً، وَالإِسْمُ: اَلْحَرَارَةُ، فَهُوَ حَارٌّ وَحَرَّتِ النَّارُ تَحَرُّ مِنْ بَابِ تَعِبَ وَتَوَقَّدَتْ وَاسْتَعَرَتْ"۔ "حَرَّةٌ" بالفتح سیاہ پتھر والی زمین کو کہتے ہیں: جمع "حِرَارٌ" ہے، جیسے: "كَلْبَةٌ وَكِلَابٌ" اور حرور بروزن رسول گرم ہوا کو بولتے ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: حرور نہیں ہوتا مگر دن کے وقت سورج سے اور سموم رات کو ہوتی ہے۔ کسی نے اس کا عکس کہا ہے۔

روبہ بن عجاج نے کہا ہے کہ "حَرُوْرٌ" خاصتاً رات میں اور سموم خاصتاً دن میں ہوتی ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سموم نہیں ہوتی ہے مگر دن میں اور حرور رات دن دونوں میں ہوتی ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول سب سے صحیح ہے۔ قُطرب نے کہا: "حَرُوْرٌ" حر ہے اور "ظل" برد۔ معنی یہ ہیں: برابر نہیں ہوتا وہ سایہ جس میں گرمی نہیں ہے اور نہ ایذاء ہے اور وہ حَر جو ایذاء دیتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد ثواب اور عتاب ہے۔ شدتِ حر میں مبالغہ کرنے کے لیے حَر کا نام حرور رکھا ہے، کیوں کہ بنا کی زیادتی معنی کی زیادتی کی دلیل ہوتی ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظِل سے مراد جنت ہے اور حَرور سے نار۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا: یعنی سایہ رات کا اور دھوپ دن کی۔[3]

پھر اللہ پاک نے مومن اور کافر کی ایک اور مثال پہلے سے زیادہ موثر ذکر کی۔ فرمایا: زندے اور مردے برابر نہیں ہیں۔ چنانچہ مومنوں کو زندوں سے اور کافروں کو مردوں سے تشبیہ دی، اس میں پہلی مثال سے مبالغہ اس لیے زیادہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/٧٢٣، ٧٢٤) [2] تفسیر القرطبي (١٤/٣٤٠) [3] فتح القدير (٤/٤٥٦)

ہے کہ زندہ اور مردہ کے درمیان مکمل طور پر تضاد ہے۔ اسی لیے فعل کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہے اور اندھے اور دیکھنے والے کے درمیان جو منافات (تضاد) ہے، وہ پوری نہیں، کیوں کہ بہت سے ادراکات، یعنی محسوس ہونے والی چیزیں دونوں کے لیے مشترک ہوتی ہیں۔

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اَحیاء عقلاء ہیں اور اَموات جہلاء۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ سب امثال ہیں، یعنی جس طرح یہ چیزیں برابر نہیں ہوتیں، اسی طرح کافر اور مومن برابر نہیں ہیں تینوں جگہ میں۔[1] کلمۂ ﴿ لَا ﴾ زیادہ کیا گیا ہے پانچ بار۔ دو پہلی میں اور دو دوسری میں اور ایک تیسری میں اور سب کے سب ان کے برابر نہ ہونے کی تاکید کے لیے ہیں، چنانچہ یہ زیادتی ان کی اصل زیادتی میں شامل ہے، جیسے: پہلے جملے میں ہے اور دوسرے جملے کی طرح اس کے دُہرانے کے لیے ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یعنی بے شک اللہ سناتا ہے جس کو سنانا چاہتا ہے اپنے دوستوں سے جن کو اس نے اپنی جنت کے واسطے پیدا کیا ہے اور ان کو اپنی طاعت کی توفیق دی ہے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کو تسلی دینے کی ابتداء ہے، اس کی انتہاء ﴿ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ پر ہے۔ ﴿ يُسْمِعُ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ وہ ہدایت کرتا ہے اور پہنچا دیتا ہے جس کا پہنچنا اور ہدایت کرنا چاہتا ہے تو اس کو قبروں سے زندہ کر دیتا ہے۔ ﴿ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ سے مراد کفار ہیں جن کے دلوں کو کفر نے مردہ کر دیا ہے، یعنی جس طرح وہ نہیں سنتا جو مر گیا ہے، اسی طرح وہ نہیں سنتا جس کا دل مر گیا ہے۔

جمہور نے ﴿ بِمُسْمِعٍ ﴾ کو بہ تنوین و بہ قطعِ اضافت پڑھا ہے اور حسن، عیسی ثقفی اور عمرو بن میمون رحمہم اللہ نے بہ اضافت پڑھا ہے۔[2] ﴿ إِنْ أَنْتَ إِلَّا نَذِيْرٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تو تُو صرف ایک ڈرانے والا پیغمبر ہے، تجھ پر یہی ڈرانا اور پہنچا دینا ہے۔ ہدایت سے تیرے لیے کچھ نہیں ہے، یعنی ہدایت دینا تیرا ذمہ نہیں۔ ہدایت اور گمراہی تو اللہ عزوجل ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ جائز ہے کہ محلِ نصب میں ہو بنا بر حال فاعل سے۔ "أَيْ: إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ مُحِقِّيْنَ" یا مفعول سے: "أَيْ: مُحِقًّا" یا مصدر محذوف کی صفت ہے: "أَيْ إِرْسَالًا مُتَلَبِّسًا بِالْحَقِّ، أَيْ: بِالْهُدَى" یا ﴿ بَشِيْرًا ﴾ سے متعلق ہے "أَيْ: بَشِيْرًا بِالْوَعْدِ الْحَقِّ وَنَذِيْرًا بِالْوَعِيْدِ الْحَقِّ"۔ اولیٰ یہ ہے کہ مصدر محذوف کی صفت ہو اور ﴿ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اہلِ طاعت کو خوش خبری دینے والا اور اہلِ معصیت کو ڈرانے والا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴾ یعنی نہیں ہے کوئی اُمت گذشتہ امتوں میں سے مگر گزر چکا ہے اس میں کوئی نذیر انبیاء میں سے کہ اسے ڈرائے۔ امت جماعتِ کثیرہ کو کہتے ہیں اور ہر اہلِ عصر، یعنی ہر زمانے کے

[1] تفسیر القرطبي (٣٤١/١٤) ‏ [2] فتح القدير (٤٥٦/٤)

لوگوں کو کہتے ہیں، اس جگہ اہلِ عصر مراد ہیں۔ نذیر کے ذکر پر اکتفا کیا بشیر کا ذکر نہیں فرمایا، اس لیے کہ اس مقام کے مناسب حال یہی ہے۔ پھر اگر کوئی کہے کہ جو فترہ (زمانہ) عیسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان ہے، اس میں کتنی امتیں ہیں، جن میں کوئی نذیر نہیں گزرا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب نذرات کے آثار باقی تھے تو نذیر سے خالی نہ رہیں، مگر یہ کہ آثارِ نذرات مندرس (پرانے) ہو جائیں اور جس وقت عیسیٰ علیہ السلام کے آثارِ نذرات مندرس ہو گئے تو اللہ پاک نے محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین افضل انبیاء و رسل کو مبعوث فرمایا اور آپ ﷺ کی نذرات کے آثار روزِ قیامت تک باقی ہیں، کیوں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ ﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ [القمر: ۱۵] پھر ہے کوئی نصیحت پذیر۔

یہ تقریر اس بات کی مقتضی ہے کہ اہلِ فترت مکلّف تھے، اس لیے کہ پہلے رسولوں کے آثار ان میں باقی تھے۔ یہ بات اس امر کے خلاف ہے جو شرح ابن حجر علی الہمزیہ میں ہے۔ اس میں یوں کہا ہے کہ اہلِ فترت اہلِ جنت سے ہیں، گو انھوں نے دین میں تبدیلی کی اور غیر اللہ کو پوجا، اس لیے کہ ان کی طرف کوئی رسول نہیں بھیجا گیا، کیوں کہ پہلے رسولوں کی رسالت ان کی موت کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اس لیے کہ کسی رسول کی موت کے بعد اس کی رسالت کا جاری رہنا معلوم نہیں ہوا سوائے ہمارے نبی ﷺ کے، چنانچہ اہلِ فترت غیر مکلّف ہیں اس چیز کے ساتھ جس کو وہ کرتے ہیں، گو وہ دیکھنے میں معصیت ہو، لیکن بعض اہلِ فترت کے عذاب دیے جانے کے متعلق نص (صریح حکم) وارد ہوئی ہے، جیسے: عمرو بن لُحَی۔ تو اس نص کو صرف اُن کے حق میں ہی سمجھا اور ملایا جائے جن کے بارے میں وارد ہوئی ہے نہ اس لیے کہ جو کچھ انھوں نے کیا وہ کفر ہے، بلکہ کسی حکمت کے سبب سے جس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور ہمیں اس کی خبر نہیں۔ انتہیٰ ملخصًا.

چنانچہ ظاہر یہ ہے کہ آیت کے اور اس تقریر کے درمیان جو بیان ہوئی اتصال حاصل نہ ہوگا، مگر اس طرح سے کہ اس بات کا التزام کیا جائے کہ تمام عرب ایک اُمت ہیں اور اس میں اسماعیل علیہ السلام کے تقدم کے ساتھ نذیر کا تقدم صادق آئے اور بنی اسرئیل ایک اُمت ہیں اور ان میں عیسیٰ علیہ السلام کے تقدم کے ساتھ نذیر کا تقدم صادق آئے اور ان سے پہلے کے لوگوں پر۔ (فتامّل)

پھر اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کی تعزیت اور تسلی کے لیے ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ﴾ "بینات" سے مراد واضح معجزے اور ظاہر دلیلیں ہیں اور "زُبُر" سے مراد کتبِ مکتوبہ ہیں، جیسے صحفِ ابرہیم علیہ السلام ہیں۔ یہ تیس تھے اور تورات سے قبل صحفِ موسیٰ علیہ السلام ہیں یہ دس تھے اور صحفِ شیث علیہ السلام کی مثل یہ ساٹھ ہیں۔ چنانچہ تمام صحیفے ایک سو ہوئے ان کے ساتھ چاروں کتابیں ملائی جائیں تو تمام کتابیں جو انبیاء علیہم السلام پر اتاری گئیں، ایک سو چار ہوئیں۔ (قالہ الحفناوي)

کتابِ منیر، جیسے: تورات و انجیل۔ کسی نے کہا ہے کہ کتابِ منیر زُبُر و بینات کے تحت میں داخل ہے۔ عطف

مفہوم کے مختلف ہونے کے لیے ہے، اگرچہ سچا ہونے میں وہ متحد ہیں۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ بینات کی تخصیص معجزات کے ساتھ ہو اور "زُبُرِ" کے ساتھ ان کتابوں کو خاص کیا جائے جن میں نصیحتیں ہیں اور کتاب منیر کے ساتھ اس کتاب کو خاص کیا جائے جس میں شرائع اور احکام ہیں۔ شرط کا جواب محذوف ہے اور مذکور اس کی دلیل ہے: "أَيْ: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرُوْا" یعنی پس تو صبر کر جیسا انھوں نے صبر کیا۔

"ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ" کی جگہ ﴿ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ فرمایا۔ ضمیر کے بجائے اسم ظاہر رکھا، چنانچہ اس کا فائدہ یا مقصد یہ ہے کہ ان کی مذمت کی تصریح اس شے کے ساتھ کی جائے جو صلہ کے تحت میں ہے اور "أَخذ" کی وجہ کو ظاہر کرنا ہے، یعنی ان کے پکڑنے کا سبب ان کا کفر تھا، یہی کفران کو عذاب دیے جانے کا سبب ہوا۔ ﴿ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ میں استفہام تقریری ہے، جیسا کہ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں غور کرنا چاہیے، یعنی پھر ان پر میرا انکار کیسا ہوا اور میری سزا کیسی رہی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے موقع میں واقع ہوا۔ ﴿ نَكِيْرِ ﴾ بہ معنی انکار ہے۔ انکار کہتے ہیں: تغییر منکر کو۔ اس کا بیان عن قریب گزر چکا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنی قدرت باہرہ کی قسموں میں سے ایک قسم کا ذکر کیا اور اپنی مخلوقات بدیعہ سے ایک عجیب خلق کا بیان فرمایا، چنانچہ ارشاد ہوا:[1] (كذا في فتح البيان)۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝۲۷ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝۲۸ ﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بلاشبہہ اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر ہم نے اس کے ذریعے سے ایسے پھل نکالے جن کے رنگ مختلف ہیں، اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ گھاٹیاں ہیں، ان کے رنگ مختلف ہیں اور بہت گہری سیاہ (بھی) (27) اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں میں سے بھی (ایسے ہیں کہ) ان کے رنگ مختلف ہیں، بس اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں، بلاشبہہ اللہ نہایت غالب، بہت بخشنے والا ہے (28)

عظیم الشان قدرتِ الٰہی کا بیان:

مختلف رنگ، یعنی سفید بھی کئی درجے اور سرخ بھی کئی درجے، یہ سب رنگا رنگ کی قدرت کا بیان ہے، اسی

[1] فتح البيان (۱۱/۲۳۹۔۲۴۲)

طرح انسان میں ہر ایک کی صورت جدا ہے۔ اسی طرح مومن اور کافر بھی الگ الگ ہیں۔ ایک دوسرے جیسا ہو جائے، یہ کب ممکن ہے، یہ نبی اکرم ﷺ کو تسلی ہے۔ اللہ سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں، یعنی سب آدمی ڈرنے والے نہیں۔ اللہ سے ڈرنا سمجھ والوں کی صفت ہے اور اللہ کی معاملت بھی دو طرح کی ہے، وہ زبردست بھی ہے کہ ہر خطا پر پکڑے اور غفور بھی ہے کہ گناہ گار کو بخشے۔ انتہیٰ.

اللہ تعالیٰ اپنی کمالِ قدرت پر آگاہ فرماتا ہے، اس بات میں کہ اس نے ایک شے سے قسم قسم کی مختلف چیزیں پیدا کیں، وہ شے پانی ہے جس کو آسمان سے اتارتا ہے، اس کے سبب سے میوے نکالتا ہے، جن کے رنگ مختلف ہیں: زرد، سرخ، سبز اور سفید، ان کے سوا میووں کے اور رنگ بھی ہیں۔ یہ رنگ تو اصل ہیں، پھر ان کو ترکیب دے کر اور رنگ پیدا ہوتے ہیں جس طرح کہ اس بات کا مشاہدہ میووں کے رنگ اور مزہ اور بو کے مختلف قسم کے ہونے سے ہوتا ہے۔ ہر قسم کا رنگ و مزہ و بو الگ الگ ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ [الرعد: ٤] ”اور زمین میں مختلف ٹکڑے ایک دوسرے سے لگتے لگاتے ہیں اور انگوروں کے باغات ہیں اور کھیت ہیں اور کھجوروں کے درخت ہیں، شاخ دار اور بعض ایسے ہیں جو بے شاخ ہیں، سب ایک ہی پانی پلائے جاتے ہیں۔ پھر بھی ہم ایک کو ایک پر پھلوں میں برتری دیتے ہیں اس میں عقلمندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے اسی طرح پہاڑوں کو بھی مختلف رنگ پیدا کیا ہے، چنانچہ اس بات کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ پہاڑ سفید اور سرخ ہوتے ہیں اور بعض میں مختلف رنگ کی راہیں ہوتی ہیں۔ ﴿ جُدَدٌ ﴾ بہ معنی طرائق جمع ”جُدَّةٌ“ کی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ﴿ جُدَدٌ ﴾ طرائق یعنی راستے ہیں۔ اسی طرح ابو مالک، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ غَرَابِيْبُ ﴾ لمبے سیاہ پہاڑ ہیں۔ اسی طرح ابو مالک اور عطاء خراسانی اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ جس وقت سیاہ کا وصف بہت زیادہ سیاہی سے کرتے ہیں تو اسود غربیب کہتے ہیں۔ اسی لیے بعض مفسرین نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ آیت مقدم و موخر کے باب سے ہے۔ ﴿ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴾ یعنی ”سُوْدٌ غَرَبِيْبُ“، لیکن اس قول میں نظر ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ ﴾ یعنی اسی طرح حیوانات کا حال ہے۔

[1] تفسير الطبري (٢٠/٤٦١) تفسير ابن كثير (٣/٧٢٤)

آدمیوں اور دواب (چوپائے) سے کہ وہ بھی مختلف رنگ ہیں۔ ''دَابَّۃٌ'' ہر وہ حیوان ہے جو دبیب کرتا ہے (دبیب نرم رفتن) قوائم پر اور ﴿ وَالْاَنْعَامِ ﴾ عطفِ خاص علی العام کے باب سے ہے، کیوں کہ انعام دواب میں داخل ہیں۔ غرضیکہ آدمیوں میں سے بربر وحبوش وطماطم ہیں، جو انتہائی سیاہ ہیں اور صقالبہ اور روم انتہا درجے کے سفید ہیں اور عرب ان کے درمیان اور اہلِ ہند ان سے کم ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴾ [الروم: ٢٢] ''اور تمھاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف (بھی ہے)، دانشمندوں کے لیے اس میں یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔'' اور اسی طرح مختلف رنگوں کے چوپائے اور جانور ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے ایک جنس بلکہ ایک قسم کے مختلف رنگ ہیں، بلکہ ایک ہی حیوان کا ابلق رنگ کر دیا گیا ہے کہ اس میں یہ رنگ بھی ہے وہ رنگ بھی۔ ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ [المؤمنون: ١٤] ''برکتوں والا ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی کہ کیا تیرا رب رنگتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ایسا رنگ جو نہ سرخ ہے نہ زرد اور نہ سفید۔[1] (رواه الحافظ أبو بكر البزار وروى مرسلا وموقوفاً، والله أعلم) اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ فرمایا ہے: ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ یعنی اس سے جو ڈرتے ہیں جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے تو وہ علمائے عارفین ہیں، یعنی جن کو اس کا علم اور معرفت ہے، کیوں کہ جب اللہ علیم، قدیر اور عظیم کی معرفت ہوگی جس کی صفتیں کمال اور جس کے اسمائے حسنیٰ ہیں اور جب اس کی مکمل معرفت حاصل ہوگی اور مکمل علم بھی حاصل ہوگا تو اس کی خشیت یعنی ڈر اور خوف بھی بہت زیادہ اور کثرت سے ہوگا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: علماء وہ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔[2] ان سے دوسری روایت میں یہ ہے کہ اس کے بندوں میں سے رحمان کے ساتھ علم رکھنے والا وہ ہے جس نے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا، اس کے حلال کو حلال کیا اور اس کے حرام کو حرام کیا اور اس کی وصیت کی حفاظت کی اور اس بات کا یقین کر لیا کہ وہ اس سے ملنے والا ہے اور اس سے اس کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خشیت وہ ہے جو تیرے اور اللہ عزوجل کی معصیت کے درمیان حائل ہوتی ہے۔[3] امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عالم وہ ہے جو رحمان سے بن دیکھے ڈرا اور اس نے اس شے میں رغبت کی جس کی طرف اللہ نے رغبت دلائی ہے اور اس شے سے بے رغبتی کی جس میں اللہ نے خفگی کی۔ پھر حسن رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾۔

---

[1] مسند البزار (٣٠٤/١١) اس کی سند میں ''عطاء بن سائب'' متکلم فیہ راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (٢٠/ ٤٦٢) [3] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٧٢٥)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ علم کثرتِ حدیث سے نہیں ہے، لیکن علم کثرتِ خشیت سے ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علم کثرتِ روایت سے نہیں ہے۔ علم تو ایک نور ہے جس کو اللہ دل میں رکھ دیتا ہے۔ احمد بن صالح مصری (جو عن ابن وہب عن مالک سے راوی ہیں) نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ خشیت کثرتِ روایت سے معلوم نہیں ہوتی اور وہ علم جس کی پیروی اللہ عزوجل نے فرض کی ہے، وہ یہی کتاب وسنت ہے اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اُن کے بعد جو مسلمانوں کے امام ہیں، ان سے آیا ہے، چنانچہ اس کا ادراک نہیں کیا جاتا مگر روایت کے ساتھ۔ اور ان کا یہ قول کہ وہ نور ہے تو اس سے ان کی مراد علم کا فہم اور اس کے معانی کی معرفت ہے۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ نے عن ابی حیان تیمی عن رجل روایت کیا ہے کہ کہا جاتا تھا کہ علماء تین قسم کے ہیں: ایک عالم باللہ عالم بامر اللہ، دوسرے عالم باللہ جو عالم بامر اللہ نہیں ہے اور تیسرے عالم بامر اللہ جو عالم باللہ نہیں ہے۔ چنانچہ عالم باللہ و بامر اللہ وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے اور فرائض اور حدود کو جانتا ہے اور عالم باللہ جو عالم بامر اللہ نہیں ہے، وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے اور حدود وفرائض کو نہیں جانتا۔ اور عالم بامر اللہ جو عالم باللہ نہیں ہے، وہ ہے جو حدود و فرائض کو جانتا ہے اور اللہ عزوجل سے نہیں ڈرتا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ کا خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے، یا ہر اس شخص کو ہے جو اس خطاب کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہ رویتِ قلبی بہ معنی علم ہے۔ ﴿ مَآءً ﴾ سے مراد آبِ باراں ہے، یعنی کیا نہیں جانا تو نے کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ ﴿ اَنَّ ﴾ اپنے اسم اور خبر کے ساتھ ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ کے دو مفعول کے قائم مقام ہے۔ پھر اللہ پاک نے "فَأَخْرَجَ بِهٖ" کے بجائے ﴿ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ﴾ فرمایا۔ غائب سے متکلم کی طرف التفات کے لیے۔ اس کا نکتہ یہ ہے کہ فعل اخراج سے مقصود کمال اہتمام اور اعتناء (اہتمام) کا ظاہر کرنا، کیوں کہ اس اخراج میں ایک منفرد کاری گری ہے اور اس لیے کہ زمین سے پیداوار کو نکالنا پانی کے اتارنے سے بھی زیادہ بڑی قدرت اور نعمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر ہم نے اس پانی سے میوے نکالے جن کے رنگ مختلف ہیں۔

﴿ مُخْتَلِفًا ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ ﴿ ثَمَرٰتٍ ﴾ کی صفت ہے۔ "أَلْوَانٌ" سے مراد ثمرات کی مختلف جنسیں اور قسمیں ہیں، مثلاً: انار، سیب، انگور اور اُن کے سوا اُور بہت سے پھل جن کا احاطہ کرنا بیان سے باہر ہے۔ یا "ألوان" سے مراد ان کی ہیئتیں اور شکلیں ہیں، یعنی بعض سفید، بعض سرخ، بعض زرد، بعض سبز، بعض سیاہ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سفید وسرخ وسیاہ۔[2] ﴿ جُدَدٌ ﴾ جمع ہے "جُدَّةٌ" بالضم کی۔ "جُدة"، طریق کو

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٨٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٧٢٤ـ ٧٢٥)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣١٧٩)

کہتے ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر یہ جدید کی جمع ہوتی تو اللہ تعالیٰ "جُدُدٌ" فرماتا بہ ضم جیم و دال، جیسے: "سَرِیْرٌ" کی جمع "سُرُرٌ" آتی ہے۔ جمہور نے ﴿ جُدَدٌ ﴾ بہ ضم جیم اور فتح دال پڑھا ہے اور امام زہری رحمہ اللہ نے بہ ضم جیم و دال پڑھا ہے جمع "جَدِیْدَةٌ"۔ محاورے میں بولتے ہیں: "جَدِیْدَةٌ وَجُدَدٌ وَجَدَائِدُ" امام ابو الفضل نے کہا ہے کہ اس کے معنی آثارِ جدیدہ واضحۃ الألوان ہیں۔

امام زہری رحمہ اللہ سے ہر دو کی فتح کے ساتھ بھی مروی ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے نقل و معنی کے لحاظ سے اس کو رد کیا ہے اور غیر ابو حاتم رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اور کہا ہے کہ فتح کے ساتھ "جَدَد" ہر دو طریقِ واضح اور بیّن کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا: "جُدَدٌ" بہ معنی قطع ہے ماخوذ "جَدَدْتُ الشَّيْءَ إِذَا قَطَعْتَهُ" سے۔ امام ابن بحر نے اس کو حکایت کیا ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "جُدَّةٌ" (یعنی خطِ پشتِ خر کہ مخالف لون او باشد. صراح) وہ خُطہ ہے (خطہ بالضم بہ معنی خط ہے، اس کی جمع خطط ہے) جو گدھے کی پیٹھ میں ہوتا ہے، اس کے رنگ کے مخالف اور "جُدَّةٌ" طریقہ ہے جمع "جُدَد وجَدَائِد" ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "جُدَدٌ" طرائق و خطوط ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا اور اس کے مثل مفسرین نے "جدد" کی تفسیر میں کہا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: وہ طرق ہیں جو پہاڑوں میں عروق (رگوں کی) کی طرح سفید و سیاہ و سرخ ہوتی ہیں۔ اس کا واحد "جُدّة" ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے طرائقِ جبال کی، یا ان خطوط کی جو ان میں ہوتے ہیں، خبر دی کہ بعض کا رنگ سفید ہے اور بعض کا سرخ، یا یہ کہ شدت اور ضعف میں ان کے رنگ مختلف ہیں۔

﴿ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴾۔ ﴿ غَرَابِيْبُ ﴾ جمع ہے "غَرْبِيْبٌ" کی۔ "غَرْبِيْبٌ" سخت سیاہ کو کہتے ہیں، جس کا رنگ کوے کے رنگ کے مشابہ ہوتا ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: تو کہے کہ "هَذَا سُوْدٌ غَرْبِيْبٌ" یعنی یہ شے سخت سیاہ ہے اور جب تو یوں کہے کہ ﴿ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴾ تو ﴿ سُوْدٌ ﴾ کو ﴿ غَرَابِيْبُ ﴾ سے بدل ٹھہرائے گا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر: "وَسُوْدٌ غَرَابِيْبُ" ہے۔ اس لیے کہ "أَسْوَدُ غَرْبِيْبٌ" بولتے ہیں اور "غَرْبِيْب أسود" بہت کم بولتے ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ "غَرْبِيْبُ"، "أَسْوَدُ" کی تاکید ہے، جیسے: احمر کی تاکید قانی سے ہوتی ہے۔ تاکید کا حق یہ ہے کہ موکد کے تابع ہو، یہاں جو اس کو پہلے رکھا ہے تو وہ مبالغہ کے واسطے ہے۔

﴿ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا ﴾ صفت ہے ﴿ جُدَدٌ ﴾ کی اور ﴿ غَرَابِيْبُ ﴾ معطوف ہے جدد پر بایں معنی اور پہاڑوں سے ﴿ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ ﴾ ہیں اور پہاڑوں سے ﴿ غَرَابِيْبُ ﴾ ہیں ایک رنگ پر کہ وہ سیاہی ہے۔ یا معطوف ہے ﴿ حُمْرٌ ﴾ پر بایں معنی اور پہاڑوں میں سے "جدد بیض وحُمر وسود" ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ

---

[1] فتح القدير (٤/٤٥٨)

﴿ بِيضٌ ﴾ پر معطوف ہے اور مضاف محذوف کی تقدیر ضرور ہے قبل ﴿ جُدَدٌ ﴾ کے۔ "أَيْ: وَمِنَ الْجِبَالِ ذُوْ جُدَدٍ" اس لیے کہ ﴿ جُدَدٌ ﴾ بعض پہاڑوں کے رنگوں سے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ ﴾ ﴿ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ ﴾ موصوف محذوف کی صفت ہے۔ "أَيْ: وَمِنْهُمْ صِنْفٌ أَوْ نَوْعٌ أَوْ بَعْضٌ ﴿ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ ﴾"، یعنی آدمیوں اور دواب وانعام سے ایک صنف یا ایک نوع یا بعض ایسے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں سرخی وسفیدی وسبزی وزردی میں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: ان میں سے ایک خلق ایسی ہے کہ اس کے مختلف رنگ ہیں میووں کے مختلف ہونے کی طرح اور پہاڑوں کے مختلف ہونے کی طرح۔ اللہ پاک نے جو ان چیزوں میں رنگوں کے اختلاف کا ذکر فرمایا تو یہ اس لیے کہ یہ اختلاف اللہ تعالیٰ کی منفرد کاریگری اور قدرت پر بہت بڑی دلیل ہے۔

امام زہری رحمہ اللہ نے "دَوَاب" کو بہ تخفیفِ باء پڑھا ہے اور سمیفع نے "أَلْوَانُهَا" پڑھا ہے۔ ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر یہ ہے: "مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ اِخْتِلَافًا كَائِنًا كَذٰلِكَ"، یعنی اس کے رنگ بالکل مختلف ہیں، ایسے مختلف جیسے جبال اور ثمار (پھلوں) کے رنگوں میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ مابعد سے متعلق ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ کے بندوں میں سے علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں جو اللہ کی مخلوقات میں اور ان کے رنگوں کے مختلف ہونے میں غور وفکر کرتے ہیں۔ اس قول کو امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، لیکن یہ مردود ہے، اس لیے کہ ﴿ إِنَّمَا ﴾ کا مابعد اس کے ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ راجح وجہ اول ہے اور ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ پر وقف تام ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے استیناف کلام کیا اور یہ خبر دی: ﴿ إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ ... الآية ﴾۔ یا یہ آیت: ﴿ إِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ﴾ [الفاطر: ١٨] کے تتمہ سے ہے، اس معنی سے کہ اللہ پاک سے جو لوگ بن دیکھے ڈرتے ہیں، وہ وہی ہیں جو اس کو جانتے ہیں اور اس کی صفاتِ جلیلہ وافعالِ جمیلہ کو جانتے ہیں جو اس کی ذات پاک کے لائق ہیں۔ بر ہر تقدیر اللہ پاک نے اس آیت میں اپنے اہلِ خشیت کو معین کر دیا۔ یہ لوگ علماء ہیں جو اس کو اور اس کی عظیم قدرت کو جانتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: عالم وہی ہے جو اللہ عزوجل سے ڈرا، اسی کے مثل شعبی سے مروی ہے۔ امام مسروق رحمہ اللہ نے کہا: "كَفٰى بِخَشْيَةِ اللّٰهِ عِلْمًا وَّكَفٰى بِالْاِغْتِرَارِ جَهْلًا"

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے، لہٰذا جو شخص اللہ پاک کا زیادہ تر عالم ہوگا، وہی اس کے لیے زیادہ خشیت رکھتا ہوگا۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: جو شخص اللہ سے نہ ڈرا وہ عالم نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: علماء باللہ وہ ہیں جو اس سے ڈرتے ہیں۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، مومن کے

[1] فتح القدير (٤/٤٥٩)

علم کے لیے یہ کافی ہے کہ اللہ سے خشیت رکھے۔[1] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی کام کیا، پھر آپ ﷺ نے اس میں رخصت دی تو ایک قوم نے اس سے تنزہ کیا، یعنی وہ کام نہ کیا۔ یہ بات نبی اکرم ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے خطبہ پڑھا، اللہ کی حمد کی۔ پھر فرمایا: کیا حال ہے اقوام کا کہ تنزہ (پرہیز) کرتے ہیں اس شے سے جس کو مَیں کرتا ہوں، قسم ہے اللہ کی! بے شک میں البتہ زیادہ عالم ہوں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اللہ کے لیے ازروئے خشیت ان سب سے زیادہ سخت ہوں۔[2] (أخرجه البخاري و مسلم)

نکتہ:

مفعول کو پہلے رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مقامِ حصر فاعلیت کا مقام ہے اور اگر موخر کیا جاتا تو امر منعکس ہو جاتا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے برفعِ اسم شریف ﴿ اَللّٰهُ ﴾ اور نصب ﴿ اَلْعُلَمٰٓؤُا ﴾ پڑھا ہے اور یہی قراءت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ کشاف میں کہا ہے کہ خشیت اس قراءت میں استعارہ ہے۔ "وَالْمَعْنَى: أَنَّهُ يُجِلُّهُمْ وَيُعَظِّمُهُمْ كَمَا يُجَلُّ الْمَهِيبُ الْمَخْشِيُّ مِنَ الرِّجَالِ بَيْنَ النَّاسِ"[3] یعنی اللہ ان کی تعظیم و جلال و عزت کرتا ہے جس طرح کہ لوگوں کے درمیان مردوں میں سے جو شخص ہیبت ناک و خوفناک ہوتا ہے، اس کی تعظیم اور تکریم کی جاتی ہے۔ جملہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴾ خشیت کی تعلیل ہے، اس لیے کہ یہ جملہ اس پر دال ہے کہ اللہ پاک اپنی معصیت پر عذاب کرنے والا ہے اور اس کے بندوں میں سے جو بندہ توبہ کرے تو اس کے لیے بخشنے والا ہے۔ لہٰذا جس ذات پاک کی یہ صفت ہے تو اس سے خوف اور خشیت رکھنا واجب ہے۔[4]

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿٢٩﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿٣٠﴾ وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٣١﴾

بلاشبہ جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کی اُمید رکھتے ہیں جو ہرگز

[1] تفسير القرطبي (١٤/٣٤٤) الدر المنثور (٧/٢٠، ٢١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٥٦)

[3] الكشاف (٣/٦٢٠) [4] فتح البيان (١١/٢٤٣_٢٤٥)

تباہ نہیں ہوگی ﴿29﴾ تاکہ وہ (اللہ) انھیں ان کے اجر پورے دے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دے، بے شک وہ بہت بخشنے والا، نہایت قدردان ہے ﴿30﴾ اور (اے نبی!) ہم نے جو کتاب آپ کی طرف وحی کی وہی حق ہے، ان (کتب) کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہیں، بے شک اللہ اپنے بندوں سے خوب باخبر، (انھیں) خوب دیکھنے والا ہے ﴿31﴾

مسلمان ہی آخرت کی تجارت سے فائدہ اٹھانے والے ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کے حال کی خبر دیتا ہے جو اس کی کتاب کو پڑھتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کرتے ہیں، یعنی رات اور دن کے مشروع اوقات میں نماز کا قائم رکھنا اور اللہ پاک نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خرچ کرنا اور اللہ کے نزدیک ثواب کی امید رکھنا اور اس کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہیں، یعنی ضرور اُن کو ملے گا۔ چنانچہ تفسیر کے شروع میں جب فضائلِ قرآن کا ذکر کیا گیا تو ہم یہ ذکر کر آئے ہیں کہ قرآن شریف اپنے صاحب سے کہے گا کہ ہر تاجر اپنی تجارت کے پیچھے ہے اور بے شک تو آج کے دن کل تجارت سے بڑھ کر ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یہ فرمایا ہے: ﴿ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ ﴾ یعنی تاکہ پورا دے ان کو اس کام کا ثواب جو انھوں نے کیا ہے اور اس کو ان لیے ایسی زیادتیوں سے بڑھائے گا، جن کا خیال تک ان کے دل پر نہیں گزرا۔

﴿ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴾ یعنی بے شک وہ ان کے گناہوں کو بخشنے والا ہے اور ان کے اعمال میں قلیل عمل کی بھی قدردانی کرنے والا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مُطَرِّف رحمہ اللہ جس وقت یہ آیت پڑھتے تو کہتے کہ یہ آیۃ القراء ہے۔[1] سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ جس وقت بندے سے راضی ہوتا ہے تو اس پر سات قسم کی بھلائیوں سے ثنا کرتا ہے جن کو اس نے نہیں کیا اور جس وقت بندے پر خفا ہوتا ہے تو اس پر سات قسم کے شر سے ثنا کرتا ہے جس کو اس نے نہیں کیا۔[2] (رواه الإمام أحمد رحمه الله تعالى)۔ یہ حدیث نہایت درجہ غریب ہے۔

قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ کتاب سے مراد قرآن شریف ہے اور ﴿ لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ سے مراد اگلی کتابیں ہیں جن کی قرآن تصدیق کرتا ہے، جس طرح کہ وہ

---

① تفسير الطبري (٢٠/٤٦٤)

② مسند أحمد (٣/٣٨) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٠٤٦)

کتابیں اس کے لیے شرف کی گواہی دیتی ہیں اور اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں کی خوب خبر رکھتا ہے اور دیکھتا ہے اس شخص کو جو اس شے کا مستحق ہے، جس کے ساتھ اس کو فضیلت بخشی ہے اور بعض کے درجے بلند کیے ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے مرتبہ و مقام کو سب سے اوپر کیا ہے۔ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِمْ أَجْمَعِيْنَ۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ کتاب سے مراد قرآن شریف ہے اور یہ قول کہ مراد جنسِ کتاب اللہ ہے بے وجہ ہے، یعنی وہ لوگ جو ہمیشہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز کو اس کے وقتوں میں اس کے ارکان و اذکار کو پورا کر کے ادا کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ حصین بن حارث بن عبدالمطلب بن عبد مناف کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[2] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً ﴾ میں خرچ کرنے کی رغبت دلانا ہے، کسی طرح میسر ہو، پھر اگر پوشیدہ کر کے میسر ہو تو افضل ہے، ورنہ پھر علانیہ۔ اور یہ گمان کہ ظاہر طور پر دینا ریا ہو جائے گا، یہ خیال اس کو خرچ کرنے سے باز نہ رکھے، کیوں کہ اس کے خوف سے خیر کا چھوڑ دینا عین ریا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ﴿ سِرًّا ﴾ سے مراد صرف صدقہ ہو اور ﴿ عَلَانِيَةً ﴾ سے مراد زکاۃ ہو۔ تقریر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (ذكره الكرخي) کسی نے کہا ہے کہ ﴿ سِرًّا ﴾ تو مسنونہ میں ہے اور ﴿ عَلَانِيَةً ﴾ مفروضہ میں۔

﴿ يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ ثوابِ طاعت کے امیدوار ہیں جو ہرگز کھوٹا اور ضائع نہ ہوگا۔ اللہ پاک کا یہ خبر دینا کہ وہ اپنے اعمال کے ثواب کے امیدوار ہیں تو یہ بہ منزلہ وعدہ کے ہے کہ ان کی امید برآئے گی۔ جملہ ﴿ يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴾ محلِ نصب میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ہے، جیسا کہ ثعلب وغیرہ نے کہا ہے۔

﴿ لِيُوَفِّيَهُمْ ﴾ میں حرفِ لام ﴿ لَنْ تَبُوْرَ ﴾ سے متعلق ہے، اس معنی میں کہ وہ تجارت ہرگز گھاٹے میں نہ ہوگی، اس لیے کہ ہم ان کو ان کے اعمالِ صالحہ کا اجر پورا دیں گے۔ اس کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ [النساء: ١٧٣] پس جو لوگ ایمان لائے اور شائستہ اعمال کیے ان کو ان کا پورا پورا ثواب عنایت فرمائے گا اور اپنے فضل سے انھیں اور زیادہ دے گا۔'' کسی نے کہا ہے کہ حرفِ لام محذوف سے متعلق ہے، جس پر سیاقِ کلام دال ہے۔ ''أَيْ: فَعَلُوْا ذٰلِكَ لِيُوَفِّيَهُمْ''، یعنی انھوں نے یہ کام کیا، تا کہ ان کو پورا اجر دے۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ٧٢٥، ٧٢٦)

[2] روح المعاني (٢٢/ ١٩٢)

﴿ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک ان پر اپنا فضل و کرم اور مہربانی فرمائے گا، ان کے اجروں پر جو اُن کے اعمال کی جزا ہیں مزید اضافہ کر کے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اضافہ اس طرح سے ہوگا کہ ان کی قبروں کو فراخ کر دے گا، یا ان کی سفارش ان کے حق میں قبول کرے گا جس نے ان پر احسان کیا ہے، یا ان کی نیکیوں کی تضعیف کرے گا، یعنی ان کو کئی گنا کر دے گا، یا اپنے ملاقات کے وعدے کو محقق کر دے گا، یعنی اپنے دیدارِ فائض الانوار سے ان کو مشرف فرمائے گا۔ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا، آمِين:

جملہ ﴿ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴾ ما قبل کی تعلیل ہے، یعنی پورا اجر دینا اور زیادہ عطا کرنا، یہ اس لیے ہے کہ وہ ان کے گناہ بخشنے والا ہے اور ان کی طاعات کو قبول کرنے والا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ جملہ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ہے اور جملہ ﴿ يَرْجُوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ لیکن قولِ اول زیادہ مناسب ہے۔ کتاب سے مراد قرآن شریف ہے۔ کسی نے کہا: لوحِ محفوظ ہے اس بنا پر کہ حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیضیہ ہے یا ابتدائیہ۔ ﴿ هُوَ الْحَقُّ ﴾ موصول کی خبر ہے۔ ﴿ مُصَدِّقًا ﴾ منصوب ہے بنا بر حال: "أَيْ: مُوَافِقًا لِّمَا تَقَدَّمَهُ مِنَ الْكُتُبِ"، یعنی جو وحی کی ہم نے تیری طرف قرآن سے یا لوحِ محفوظ سے وہ حق ہے، درآں حالیکہ وہ اگلی کتابوں کے موافق ہے۔ ﴿ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں کے سارے امور ظاہر و باطن کا احاطہ کرنے والا ہے۔[1]

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ؀۳۲ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ؀۳۳ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ؀۳۴ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ؀۳۵

پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث بنایا جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا، پھر بعض تو ان میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں میانہ رو ہیں اور بعض ان میں اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں، یہی بہت بڑا فضل ہے (32) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، وہاں انھیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے

[1] فتح البیان (۱۱/۲۴۶، ۲۴۷)

جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا (33) اور وہ کہیں گے: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے
ہیں جس نے ہم سے غم دور کر دیا، بے شک ہمارا رب بہت بخشنے والا، خوب قدر دان ہے (34)،
جس نے اپنے فضل سے ہمیں ہمیشہ رہنے کے گھر میں اُتارا، اس میں ہمیں کوئی تکلیف نہیں
پہنچتی اور اس میں ہمیں کوئی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی (35)

قرآنِ مجید کے وارثوں کی تین قسموں کا بیان:

وارث بنایا، یعنی پیغمبر کے بعد کتاب کے وارث کیے ایک اور چُنے ہوئے بندے، یعنی یہ اُمت۔ اُن میں تین درجے بتائے: ایک گناہ گار، ایک میانہ اور ایک اعلیٰ درجے کا، سب کو گنا، چنے ہوئے بندوں میں، امید ہے کہ بالآخر سب جنتی ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے گناہ گار کو معافی ہے اور میانہ رو سلامت ہے اور جو آگے بڑھے سو سب سے آگے بڑھے۔ اللہ کریم ہے اس کے یہاں کمی نہیں۔ سونا اور ریشم مسلمانوں کو وہاں ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جو (مرد) ریشم پہنے دنیا میں، نہ پہنے گا وہ آخرت میں۔ دنیا کا غم دور کیا، گناہ بخشتا ہے اور طاعت قبول کرتا ہے۔ رہنے کا گھر اس سے پہلے کوئی نہ تھا، ہر جگہ چل چلاؤ تھا اور روزی کمانے کی فکر اور دشمنوں کا ڈر اور رنج اور تکلیف تھی، وہاں پہنچ کر یہ سب کچھ ختم ہوگئے۔ انتہیٰ۔

اللہ پاک فرماتا ہے کہ پھر ہم نے اپنے بندوں سے ایسے لوگ چُن لیے جو کتابِ عظیم کے قائم رکھنے والے ہیں اور پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ وہ لوگ یہ امت ہیں۔ پھر ان کی تین قسمیں بنائیں: چنانچہ فرمایا: ﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ یعنی ان میں سے ایک قسم اپنی جان کا برا کرنے والے ہیں، ان میں سے وہ شخص ہے جو بعض واجبات کے کرنے میں کمی کرتا ہے اور بعض محرمات کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور ﴿ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ﴾ یہ واجبات کا ادا کرنے والا ہے اور محرمات کا تارک ہے اور کبھی بعض مستحبات کو ترک کر دیتا ہے اور بعض مکروہات کو کر لیتا ہے۔

﴿ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ یہ واجبات و مستحبات کا کرنے والا ہے۔ محرمات و مکروہات اور بعض مباح چیزوں کا تارک ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ لوگ محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمت ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہر اس کتاب کا وارث کیا جس کو نازل کیا۔ چنانچہ ان میں سے ظالم کی مغفرت کی جائے گی اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ کا آسان حساب ہوگا اور ﴿ سَابِقٌ ﴾ ان کا بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا۔[1] امام ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن فرمایا کہ میری شفاعت میری اُمت کے اہلِ کبائر کے لیے ہے۔

(1) تفسیر الطبري (٢٠/٤٦٥)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ ﴾ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہو گا اور ﴿ مُّقْتَصِدٌ ﴾ اللہ کی رحمت سے جنت میں داخل ہو گا اور ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ اور اصحابِ اعراف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے جنت میں داخل ہوں گے[1] اور اسی طرح سلف میں سے کئی ایک اہلِ علم سے مروی ہے کہ ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ اس اُمت کے چنے ہوئے لوگوں میں سے ہے، اس کجی اور قصور کے باوجود جو اُس میں ہے۔ دوسرں نے کہا: بلکہ ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ اس اُمت سے نہیں ہے اور نہ ہی ان چنے ہوئے لوگوں سے ہے جو کتاب کے وارث ہیں۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ فرمایا: وہ کافر ہے۔ اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیا ہے اور نیز عکرمہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ (فيما رواه ابن جرير)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ اصحابِ "مَشْأَمَة" ہیں۔ امام مالک نے زید بن اسلم، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ سے روایت کیا ہے کہ یہ منافق ہے۔ پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے: یہ تین قسمیں ان تین اقسام کی طرح ہیں جو سورۃ الواقعہ کے شروع میں اور آخر میں مذکور ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ اسی امت سے ہے اور یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا اختیار کردہ ہے،[2] جس طرح کہ ظاہر آیت یہی ہے اور جس طرح کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی حدیثیں آئی ہیں ایسے طریقوں سے جو ایک دوسرے کو پختہ کرتے ہیں اور ان میں سے جو حدیثیں میسر ہوئیں ہم ان کو، إن شاء اللّٰه تعالىٰ، لائیں گے:

1 سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے بارے میں فرمایا کہ یہ سب کے سب لوگ بہ منزلہ واحدہ ہیں اور سب کے سب جنت میں ہیں۔[3] (أخرجه الإمام أحمد و هذا حديث غريب من هذا الوجه وفي إسناده من لم يسم و قد رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم من حديث شعبة به نحوه)۔ بہ منزلہ واحدہ کے یہ معنی ہیں کہ وہ ایک رُتبے میں ہیں، اس بات میں کہ وہ اس اُمت سے ہیں اور وہ اہلِ جنت سے ہیں، اگرچہ ان کے منازلِ جنت میں فرق ہے۔

2 سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ﴾ چنانچہ وہ لوگ جو سابق ہوئے وہ وہ ہیں جو جنت میں بغیر

---

[1] المعجم الكبير (١١/١٨٩) اس کی سند میں "موسیٰ بن عبدالرحمان صنعانی" سخت ضعیف راوی ہے۔ البتہ مرفوع حدیث صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ دیکھیں: (سنن أبي داود، رقم الحديث: ٤٧٣٩ سنن الترمذي، رقم الحديث: ٢٤٣٥ صحيح الجامع، رقم الحديث: ٣٧١٤)

[2] تفسير الطبري (٢٠/٤٦٧-٤٦٩)

[3] مسند أحمد (٣/٧٨) تفسير الطبري (٢٠/٤٧٠، ٤٧١) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٨١) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

حساب کے داخل ہوں گے اور جنھوں نے اقتصاد کیا، یعنی جو مقتصد ہیں وہ وہ ہیں جن کا محاسبہ کیا جائے گا حسابِ یسیر۔ اور وہ لوگ جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، وہ وہ ہیں جو طولِ محشر میں روکے جائیں گے۔ پھر وہ وہ ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تلافی کر دی، چنانچہ وہ وہی ہیں جو کہیں گے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ﴾[1] (أخرجه الإمام أحمد)

طریقِ دیگر:

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ فرماتے تھے: ﴿ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ﴾ فرمایا: پس ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ وہ ہے جو روکا جائے گا، یہاں تک کہ اس کو غم اور حزن پہنچے گا، پھر جنت میں داخل ہوگا۔ (رواه ابن أبي حاتم ورواه ابن جرير من حديث سفيان الثوري عن الأعمش) امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابو ثابت نے ذکر کیا کہ وہ مسجد میں داخل ہوا اور سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے پہلو کی طرف بیٹھا۔ پھر کہا: "اَللّٰهُمَّ آنِسْ وَحْشَتِيْ، وَارْحَمْ غُرْبَتِيْ، وَيَسِّرْ لِيْ جَلِيْسًا صَالِحاً" یعنی اے اللہ! تو میری وحشت کو انس دے اور میری غربت پر رحم کر اور میرے لیے کوئی نیک ہم نشین میسر کر۔ چنانچہ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بولے: اگر تو سچا ہے تو البتہ میں اس کے ساتھ تجھ سے زیادہ بہرہ مند ہوں، ابھی میں تجھ سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں جس کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ میں نے اس کو جب سے آپ ﷺ سے سنا ہے، بیان نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے یہ آیت ذکر کی: ﴿ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا... الآية ﴾ چنانچہ سابق بالخیرات وہ ہے جو اس میں بغیر حساب کے داخل ہوگا اور مقتصد وہ ہے جس کا آسان حساب لیا جائے گا اور ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ وہ ہے جس کو اس جگہ غم اور حزن میں سے پہنچے گا۔ وذلک قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ﴾[2]

3 سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: وہ سب کے سب اس امت سے ہیں۔[3] (أخرجه الحافظ أبو القاسم الطبراني)

4 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: میری امت تین ثلث ہیں: ایک ثلث تو جنت میں بغیر حساب اور عذاب کے داخل ہوں گے اور ایک

---

[1] مسند أحمد (١٩٨/٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ علی بن عبداللہ کا سماع سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسير الطبري (٤٧٠/٢٠)

[3] المعجم الكبير (١٦٧/١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه محمد بن عبدالرحمن بن أبي ليلى وهو سيء الحفظ" (مجمع الزوائد: ٢١٦/٧)

ثلث سے آسان حساب لیا جائے گا، پھر جنت میں داخل ہوں گے۔ ایک ثلث کی جانچ پڑتال ہوگی۔ پھر فرشتے آئیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے ان کو پایا کہ وہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ" کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: انھوں نے سچ کہا، نہیں ہے کوئی معبود مگر میں، ان کو ان کے "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ" کہنے کے سبب سے جنت میں داخل کرو اور ان کے خطایا کو اہلِ نار پر لاد دو اور یہ وہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے: ﴿ وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ ﴾ [العنكبوت: ١٣] "اور یقیناً وہ اپنے بوجھ اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کئی اور بوجھ ضرور اُٹھائیں گے۔" اور اس کی تصدیق اس میں ہے جس میں فرشتوں کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ... الآية ﴾ فَجَعَلَهُمْ ثَلَاثَةَ أَفْوَاجٍ وَهُمْ أَصْنَافٌ كُلُّهُمْ، فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ فَهٰذَا الَّذِي يُمَحَّصُ وَيُكْشَفُ.[1] غريب جدا. "انھیں تین گروہوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ان میں سے ایک تو اپنے اوپر ظلم کرنے والا گناہ گار ہوگا، یہ وہی ہے جس کی حساب میں جانچ پڑتال ہوگی۔"

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ امت روزِ قیامت میں تین ثلث ہے: ایک ثلث تو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے اور ایک ثلث کا حساب یسیر لیا جائے گا اور ایک ثلث بڑے گناہ لے کر آئیں گے، یہاں تک کہ اللہ عزوجل کہے گا: کیا ہیں یہ لوگ؟ حالاں کہ اللہ تعالیٰ تو خود جانتا ہے، چنانچہ فرشتے کہیں گے کہ یہ لوگ بڑے گناہ لے کر آئے ہیں، مگر انھوں نے تیرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا تو رب عزوجل فرمائے گا: ان کو میری رحمت میں داخل کرو اور عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ... الآية ﴾[2]

اثرِ دیگر:

امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے عقبہ بن صہبان ہنائی سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا: اے بیٹے! یہ لوگ جنت میں ہیں، لیکن سابق بالخیرات وہ شخص ہے جو رسول اللہ ﷺ کے عہد میں گزرا اور اس کے لیے رسول ﷺ نے جنت کے ساتھ گواہی دی اور مقتصد وہ ہے جس نے آپ ﷺ کے اصحاب سے آپ ﷺ کے اثر کی پیروی کی، یہاں تک کہ ان سے جا ملا اور ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ وہ ہے جو میرے اور تمھارے مثل ہے۔ راوی نے کہا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے نفس کو ہمارے ساتھ ٹھہرایا۔[3] یہ بات ان کی کسرِ نفسی اور تواضع ہے، ورنہ وہ تو سابقین بالخیرات میں سے بھی بہت بزرگ تھیں، اس لیے کہ دوسری عورتوں پر ان کی فضیلت

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٨١) المعجم الكبير (١٨/٧٩) اس کی سند میں "سلامہ بن روح" متکلم فیہ راوی ہے۔

[2] تفسير الطبري (٢٠/٤٦٥) [3] مسند الطيالسي (١/٢٠٩)

ایسے ہے جیسے ثرید کو دوسرے کھانوں پر ہے۔ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ کے بارے میں فرمایا کہ وہ ہمارے لیے اہلِ بدو ہیں اور ہم میں سے مقتصد ہمارے اہلِ حضر ہیں اور ہم میں سے سابق اہلِ جہاد ہیں۔[1] (رواه ابن أبي حاتم)

عوف اعرابی نے کہا: ہم سے عبداللہ بن حارث بن نوفل نے بیان کیا ہے کہ ہم کو حدیث کی کعب احبار رحمہ اللہ نے، کہا کہ ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ اس امت سے ہے اور مقتصد اور ﴿ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ ﴾ سب کے سب جنت میں ہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ ...تا... لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ﴾ یعنی جنت میں سب کے سب ایک ساتھ جائیں گے، ایک کا کندھا دوسرے کے کندھے سے چھوتا جائے گا۔ قسم ہے ربِ کعبہ کی! پھر اپنے اعمال کے مطابق فضیلت ملے گی، جیسا جس کا عمل ہوگا ویسا ہی درجہ پائے گا۔ پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابو اسحاق سبیعی رحمہ اللہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ امام ابو اسحق رحمہ اللہ نے کہا: "أَمَّا مَا سَمِعْتُ مِنْ ذِيْ سِتِّيْنَ سَنَةً فَكُلُّهُمْ نَاجٍ" "ساٹھ سال سے میں نے یہ سن رکھا ہے کہ وہ سب نجات پانے والے ہیں۔" پھر محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ بے شک یہ امت امتِ مرحومہ ہے۔ "ظَالِمٌ" مغفور لہ ہے اور مقتصد جنتوں میں ہے اللہ کے نزدیک اور سابق بالخیرات درجوں میں ہے اللہ کے نزدیک۔[2] (ورواه الثوري عن إسماعيل بن سميع عن رجل عن محمد بن الحنفية بنحوه)

امام ابو الجارود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے محمد بن علی سے، یعنی امام محمد باقر رحمہ اللہ سے ﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا: یہ وہ ہے جس نے عملِ صالح اور دوسرا عملِ بد ملایا۔ چنانچہ احادیث و آثار جو اس مقام سے متعلق ہیں، یہی میسر ہوئے جن کا ذکر ہوا۔ جب بات یہ ٹھہری تو آیت اس امت کے تمام اقسامِ ثلاثہ کے لیے عام ہے۔ چنانچہ علماء سب سے بڑھ کر اس قابل ہیں کہ اس نعمت کی وجہ سے ان پر رشک کیا جائے اور وہ اس رحمت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، وہ تو ایسے ہیں جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے قیس بن کثیر سے روایت کیا ہے، کہا: ایک شخص مدینہ سے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی طرف آیا اور وہ دمشق میں تھے۔ انھوں نے کہا: اے میرے بھائی! تجھ کو کون سی چیز میرے پاس لائی؟ اس نے کہا: ایک حدیث۔ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم اس کو رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہو۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تو کسی تجارت کے لیے تو نہیں آیا؟ کہا: نہیں۔ کہا: کیا تو کسی اور حاجت کے لیے تو نہیں آیا؟ کہا: نہیں۔ کہا: کیا تو صرف اس حدیث کی طلب میں آیا؟ کہا: ہاں۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، فرماتے تھے: جو شخص چلا کسی راہ کو کہ اس میں علم کو طلب کرتا ہے تو اس کے سبب سے اللہ تعالیٰ اس کی راہ کو جنت کی طرف چلائے گا اور بے شک البتہ فرشتے اپنے پر اس شخص کے لیے رکھتے ہیں جو علم کا طالب ہوتا ہے اور بے شک حال یہ ہے کہ البتہ عالم کے لیے اللہ سے مغفرت مانگتا ہے جو کوئی آسمانوں میں

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳۱۸۲/۱۰) [2] تفسير الطبري (۲۰/۴٦٦، ۴٦۷)

ہے اور جو زمین میں ہے۔ یہاں تک کہ مچھلیاں پانی میں بھی اس کے لیے بخشش مانگتی ہیں۔ اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہے جیسے چاند کی فضیلت باقی تاروں پر ہے۔ بے شک علماء ہی انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور بے شک انبیاء نے دینار اور درہم کا وارث نہیں کیا، انھوں نے صرف علم کا وارث کیا ہے، چنانچہ جس شخص نے ان سے علم کو اَخذ کیا تو اس نے بہت بڑا حصہ لیا۔[1] (وأخرجه أبو داود والترمذي وابن ماجه من حديث كثير بن قيس ومنهم من يقول قيس بن كثير عن أبي الدرداء رضی اللہ عنہ)۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے اس کے طرق اور اس میں روایت کا جو اختلاف ہے وہ صحیح البخاری کی اپنی شرح کی کتاب العلم میں ذکر کر دیا ہے۔

سورت طٰہٰ کے شروع میں سیدنا ثعلبہ بن حکم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ علماء سے فرمائے گا کہ میں نے اپنا علم اور اپنی حکمت تم میں اس لیے رکھی تھی کہ میں ارادہ کرتا تھا کہ تم سے جو کچھ ہوا اس کو بخشوں اور میں پروا نہیں کرتا ہوں۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ مِنْ اَسَاوِرَ ... الآية ﴾ یعنی یہ لوگ جن کو اللہ پاک نے اپنے بندوں میں سے چن لیا اور اس کتاب کا وارث کیا جو رب العالمین کی طرف سے اتاری گئی ہے۔ اللہ سبحانہ خبر دیتا ہے کہ ان کا ماویٰ اور مسکن قیامت کے دن جناتِ عدن ہے۔ ﴿ عَدْنٍ ﴾ سے مراد اقامت ہے، یعنی رہنے بسنے کے لیے باغات ہیں۔ قیامت کے دن ان میں داخل ہوں گے اور اللہ عزوجل کے حضور میں حاضر ہوں گے، وہاں ان کو سونے اور موتی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ چنانچہ صحیح میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن کا زیور وہاں تک ہو گا جہاں تک وضو کا پانی پہنچتا ہے۔[3] اور وہاں ان کا لباس حریر (ریشم) ہے، اس لیے دنیا میں ان پر حرام کیا گیا تھا تو آخرت میں اللہ پاک نے اس کو ان کے لیے حلال فرما دیا۔ اور صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس شخص نے دنیا میں حریر پہنا تو وہ اس کو آخرت میں نہ پہنے گا اور فرمایا کہ وہ دنیا میں کفار کے لیے ہے اور آخرت میں تمھارے لیے۔[4]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے حدیث کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حدیث کی اور اہلِ جنت کے زیور کا ذکر فرمایا تو ارشاد کیا کہ وہ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے، جن میں چاندی سے جڑے ہوئے موتی ہوں گے اور ان پر موتی کے تاج ہوں گے جن میں یاقوت جڑے

---

1. مسند أحمد (١٩٦/٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٨٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٢٩٧)
2. المعجم الكبير (٨٤/٢) اس کی سند میں "علاء بن مسلمہ" سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٦٧)
3. صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٠)
4. صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٩٤، ٥٣١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٧٣، ٢٠٦٧)

ہوئے ہوں گے۔ ان کے تاج بادشاہوں کے تاج کی طرح ہوں گے۔ وہ جوان ہوں گے ڈاڑھی مونچھ کے بغیر اور سرمگیں چشم ہوں گے۔[1] اور وہ کہیں گے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ﴾۔ "حزن" سے مراد خوفناک شے سے ڈرانا ہے، یعنی اللہ نے اس کو ہم سے دور کر دیا اور دنیا اور آخرت کے ڈر و خوف جن سے ہم ڈرا کرتے تھے، ان سے ہم کو راحت دی۔ عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے، وہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" والوں پر ان کی قبروں میں کوئی وحشت نہیں اور نہ ان کے نشور میں ہے۔ گویا میں "لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" والوں کے ساتھ ہوں کہ وہ اپنے سروں سے مٹی کو جھاڑ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴾۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے کہ ان کی سیئات میں سے کثیر کو بخش دیا اور ان کے لیے حسنات سے یسیر کا شکر کیا، یعنی گناہوں کے انبار بخش دیے اور ذرا سی نیکی قبول کر لی۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ۔ وہ ایسا ہی غفور و شکور ہے، اس کے بغیر ہم جیسے گناہ گاروں کا کیا ٹھکانا ہوسکتا ہے۔ اَللّٰهُمَّ تُبْ عَلَيْنَا وَاغْفِرْ لَنَا، آمِيْن.

﴿ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ کہتے ہیں کہ وہ ایسا غفور و شکور ہے کہ اس نے اپنے فضل اور احسان اور رحمت سے ہم کو یہ منزلت اور مقام عطا فرمایا، ہمارے اعمال اس کے مساوی نہ تھے، جیسا کہ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میں سے کسی کو اس کا عمل ہرگز جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اور نہ آپ کو یا رسول اللہ؟ فرمایا: اور نہ مجھ کو، مگر یہ کہ اللہ مجھ کو اپنی طرف سے فضل اور رحمت کے ساتھ ڈھانک لے۔[3] ﴿ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ نہیں چھوتا، ہم کو اس میں کوئی دکھ، تھکاوٹ، تکلیف اور بیماری۔ ﴿ نَصَبٌ ﴾ اور ﴿ لُغُوْبٌ ﴾ میں سے ہر ایک کا تعب (رنج اور تکلیف و تھکاوٹ) میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کی جو اُن سے نفی کی ہے تو گویا مراد یہ ہے کہ نہ ان کے بدنوں پر کسی طرح کا تعب ہے اور نہ ان کی روحوں پر۔ واللّٰه أعلم۔ چنانچہ وہ اسی وجہ سے دنیا میں اپنے نفسوں کو عبادت کا خوگر کیا کرتے تھے۔ اب جنت میں داخل ہونے سے تمام تکالیف ان سے ساقط ہوگئیں اور وہ ہمیشگی والی راحت میں ہو گئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْۗـــًٔۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴾ [الحاقة: ٢٤] "(ان سے کہا جائے گا) کہ مزے سے کھاؤ پیو، اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزشتہ زمانے میں کیے۔"[4] (كذا في ابن كثير)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٧٣٠/٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] المعجم الأوسط (١٨١/٩) اس کی سند میں "یحییٰ حمانی اور عبدالرحمان بن زید" ضعیف راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٨٥٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٦)

[4] تفسير ابن كثير (٧٢٦/٣-٧٣٠)

فتح البیان کا بیان:

اصل عبارت یوں ہے: "ثُمَّ أَوْرَثْنَا الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا الْكِتٰبَ" یعنی وارث کیا ہم نے کتاب کا ان لوگوں کو جن کو ہم نے اپنے بندوں سے چن لیا، چنانچہ اول مفعول ﴿ اَلَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا ﴾ ہے اور دوسرا ﴿ اَلْكِتٰبَ ﴾۔ دوسرے کو اول سے پہلے اس لیے رکھا کہ کتاب کی تشریف اور تعظیم مقصود ہے۔ کتاب سے مراد قرآن شریف ہے، یعنی ہم نے حکم کیا اور اس بات کو مقدر کیا کہ ہم، اے محمد! تیری امت میں سے علماء کو اس کتاب کا وارث کریں گے جس کو ہم نے تجھ پر نازل کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَوْرَثْنَا ﴾ بہ معنی "أَعْطَيْنَا" ہے،[1] اس بنیاد پر اس میں استعارہ تبعیہ ہوگا، چوں کہ ان کی طرف کتاب کو پہنچانے میں ان کو کسی طرح کی محنت و مشقت نہیں ہوئی، اس لیے ان کو کتاب عطا کرنے کا نام ایراث (وارثت) رکھا، غرض یہ ہے کہ جس طرح وارث کو میراث بغیر کسی تکلیف اور مشقت کے ملتی ہے، اسی طرح ان کو کتاب عطا ہوئی۔

﴿ مِنْ عِبَادِنَا ﴾ میں کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ بیانیہ ہے، یعنی وہ چنے ہوئے لوگ ہمارے بندے ہیں۔ یا تبعیضیہ ہے، یعنی وہ برگزیدہ لوگ ہمارے بعض بندے ہیں نہ کہ وہ سارے کے سارے۔ برگزیدہ بندوں سے مراد نبی ﷺ کی امتِ اجابت ہے، برابر ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو حفظ کیا یا نہ کیا، چنانچہ وہ عطیہ ہے ان سب کے لیے، حتی کہ جس نے اس کی حفاظت نہ کی، اس کے لیے بھی کیوں کہ وہ کتاب اس کا پیشوا ہے اور اس میں اس کی ہدایت و برکت ہے۔ اصطفائے عباد کے معنی ان کو اختیار کرنا اور ان کو خالص کرنا ہے۔ بے شک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان سے بعد والے لوگوں میں سے علماء جو روزِ قیامت تک آئیں گے، اللہ پاک نے ان کو باقی بندوں پر شرف عطا فرمایا ہے اور ان کو امتِ وسط قرار دیا ہے اور ان کو عادل ٹھہرایا ہے، تاکہ وہ لوگوں پر گواہ ہوں اور اس بات کے ساتھ ان کی عزت کی ہے کہ ان کو تمام انبیاء سے بہتر اور اولادِ آدم کے سردار کی اُمت میں سے ٹھہرایا ہے۔ عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمُ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ۔ اور ان کو تمام کتابوں سے بہترین کتاب کے اٹھانے کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: مراد یہ ہے کہ ہم نے محمد ﷺ کے قرآن کو ایسا کیا کہ وہ ان لوگوں کی طرف منتہیٰ ہوتا ہے جن کو ہم نے اپنے بندوں سے برگزیدہ کیا۔[2] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس کو اگلی اُمتوں سے وارث کیا، یعنی اس کو ان سے موخر کیا اور اسے ان لوگوں کو عطا کیا، جن کو ہم نے چن لیا۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان لوگوں کی تین قسمیں بیان کیں جن کو اپنی کتاب کا وارث کیا اور اپنے بندوں میں سے ان کو منتخب کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ ﴾۔ ﴿ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ ﴾ کے بعد جو ﴿ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ فرمایا تو اس میں اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ اس مرتبے کا ملنا صعب و دشوار ہے۔ یہ اللہ پاک

---

[1] تفسير البغوي (٦/٤٢٠) [2] فتح القدير (٤/٤٦٠)

کی تیسیر اور توفیق سے نصیب ہوتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک کے امر و ارادہ یا اس کے علم سے نصیب ہوتا ہے۔ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتدا ہے اور ﴿ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴾ خبر ہے۔ یعنی کتاب کا وارث کرنا اور برگزیدہ کرنا یا خیرات کی طرف سبقت کرنا، پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ وہ فضلِ کبیر ہے جس کا اندازہ نہیں ہوسکتا ہے۔ بہت سے اہلِ علم نے اس آیت کے معنی کو مشکل شمار کیا ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ کی قسم کو برگزیدہ بندوں میں سے ٹھہرایا ہے۔

بھلا اللہ نے جس کو چن لیا وہ کیسے ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ ہوسکتا ہے؟ تو اس کے جواب میں کسی نے تو یوں کہا ہے کہ تقسیم عباد کی طرف راجع ہے، یعنی ہمارے بندوں میں سے ایک قسم ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ ہے، اس سے مراد کافر ہے اور ﴿ يَدْخُلُوْنَهَا ﴾ کی ضمیر ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ و ﴿ سَابِقٌ ﴾ کی طرف راجع ہوگی۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ سے مراد وہ شخص ہے جو کتاب پر عمل کرنے میں تقصیر (کمی) کرنے والا ہے، یہ وہ ہے جو امرِ الٰہی کو موخر کرنے والا ہے (اصل روایت کے الفاظ ہیں: "وهو المرجي لأمر الله" اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اللہ کے امر کے لیے تاخیر کیا گیا ہے، یعنی اللہ کو اختیار رہے چاہے عذاب دے، چاہے بخش دے۔ واللّٰہ أعلم)۔

وراثتِ کتاب سے اس کی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ ﴾ [الأعراف: ١٦٩] ''پھر اُن کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے کہ کتاب کو ان سے حاصل کیا۔'' اس قول میں نظر ہے، اس لیے کہ نفس کا ظلم اصطفا کے مناسب نہیں ہے۔ کسی نے کہا ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ وہ ہے جس نے صغیرہ گناہ کیے، یہ قول سیدنا عمر، عثمان، عبداللہ بن مسعود، ابو الدرداء اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، یہی قول راجح ہے، اس لیے کہ صغیرہ گناہ کا ارتکاب اصطفا کے منافی نہیں ہے اور نہ اس سے منع کرتا ہے کہ اس کا کرنے والا ان لوگوں میں شامل ہو جو جنت میں داخل ہوں گے۔[1] اور اس کے ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ ہونے کی یہ وجہ ہے کہ اس نے ان صغیرہ گناہ کرنے کی وجہ سے اپنے نفس کو ثواب سے ناقص کیا، جو اس کے لیے بخش دیے گئے، کیوں کہ اگر وہ ان صغائر کے بجائے طاعات کرتا تو اس کے نفس کے لیے ثواب کا ایک عظیم حصہ ہوتا۔ کسی نے کہا ہے کہ ظالم کبیرہ گناہ کرنے والا ہے۔ اشکال کا منشا یہ ہے کہ وارثینِ کتاب نبی اکرم ﷺ کی اُمت کے علماء ہی کو ٹھہرایا ہے، اس لیے کہ اگر وراثت ساری امت کے لیے قرار دی جاتی تو اشکال دور ہو جاتا، کیوں کہ یہ بات قطعی یقینی ہے کہ ان میں سے ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ ہے اور اصطفا کے منافی اس لیے نہیں ہے کہ وہ اور امتوں پر فضیلت دی گئی ہے، اس بارے میں بہت کچھ وارد ہوا ہے۔ چنانچہ یہ بات مخفی نہیں ہے اور اس کی تائید بحث کے آخر میں آئے گی۔ إن شاء اللہ تعالیٰ۔ واللّٰہ أعلم.

---

[1] فتح القدير (٤/٤٦٠)

﴿ سَابِقٌ ﴾ و ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ کی تفسیر میں سلف نے اختلاف کیا ہے، چنانچہ عکرمہ وقتادہ وضحاک رحمہم اللہ نے کہا کہ ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ مومن عاصی ہے اور ﴿ سَابِقٌ ﴾ تقی علی الاطلاق ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ اصحابِ مشأمہ، ﴿ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ﴾ اصحابِ میمنہ اور ﴿ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ ﴾ سارے لوگوں میں سے سابقین ہیں۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ وہ ہے جو دنیا کو اس کا حق دیتا ہے اور آخرت کو اس کا حق دیتا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ ظَالِمٌ ﴾ وہ ہے جس کی بدیاں اس کی نیکیوں سے بڑھ گئیں اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ وہ ہے جس کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوئیں اور سابق وہ ہے جس کی نیکیاں بدیوں سے بڑھ گئیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ اہلِ توحید میں سے کبیرہ گناہ والے ہیں اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ وہ ہے جو کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب نہیں ہوا اور ﴿ سَابِقٌ ﴾ وہ ہے جس نے اعمالِ صالحہ کی طرف سبقت کی۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے کہ ظالم کبیرہ گناہوں والا ہے اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ وہ ہے جو بدیوں سے نیکیوں کے بڑھ جانے سے جنت کا مستحق ہوا ہے۔[1]

چنانچہ قولہ تعالیٰ: ﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا ﴾ ان کے لیے ہوگا جنھوں نے بھلائیوں کے ساتھ سبقت کی اور بس۔ اور یہ اہلِ نظر میں سے ایک جماعت کا قول ہے، اس لیے کہ حقیقتِ نظر میں ضمیر زیادہ تر اس شے کے لیے ہوتی ہے جو اس سے متصل ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ یعنی ان کی ذریت سے ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ ہے۔ سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سَابِقٌ ﴾ عالم ہے اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ متعلم ہے اور ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ جاہل ہے۔ ذوالنون مصری نے فرمایا: ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ فقط اپنی زبان سے اللہ کا ذکر کرنے والا ہے اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ اپنے دل سے کرنے والا ہے اور ﴿ سَابِقٌ ﴾ وہ ہے جو اس کو بھولتا نہیں ہے۔ انطاکی نے کہا ہے کہ ظالم صاحبِ اقوال ہے اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ صاحبِ افعال ہے اور ﴿ سَابِقٌ ﴾ صاحبِ احوال ہے۔

امام ابن عطاء نے کہا ہے کہ ﴿ ظَالِمٌ ﴾ وہ ہے جو اللہ کو دنیا کے سبب سے دوست رکھتا ہے اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ وہ ہے جو اللہ کو عقبیٰ کے سبب سے دوست رکھتا ہے اور سابق وہ ہے جس نے حق کی خاطر اپنی خواہشات اور ضروریات کو ساقط کر دیا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظَالِمٌ ﴾ وہ ہے جو دوزخ سے ڈر کر اللہ کی عبادت کرتا ہے اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ وہ ہے جو جنت میں طمع کر کے اس کو پوجتا ہے اور سابق وہ ہے جو کسی سبب کے بغیر اس کی عبادت کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظَالِمٌ ﴾ وہ ہے جو اپنے نفس کو دوست رکھتا ہے اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ وہ ہے جو اپنے دین کو دوست رکھتا ہے اور سابق وہ ہے جو اپنے رب کو دوست رکھتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "اَلظَّالِمُ الَّذِيْ يَنْتَصِفُ وَلَا يُنْصِفُ،

[1] تفسير فتح القدير (٤/٤٦٠، ٤٦١)
[2] تفسير القرطبي (٤/٣٤٨)

وَالْمُقْتَصِدُ الَّذِيْ يُنْصِفُ وَيَنْتَصِفُ وَالسَّابِقُ الَّذِيْ يُنْصِفُ وَلَا يَنْتَصِفُ'' یعنی ظالم وہ ہے جو اپنے حق میں انصاف کرتا ہے اور دوسرے کے حق میں نہیں کرتا، ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ وہ ہے جو اپنے اور غیر کے حق میں انصاف کرتا ہے، سابق وہ ہے جو دوسرے کے حق میں انصاف کرتا ہے اور اپنے حق میں نہیں کرتا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظَالِمٌ ﴾ وہ ہے جو تاخیر کیا گیا امر اللہ کے لیے اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ وہ ہے جس نے عملِ صالح بھی اور بدعمل بھی کیے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تاویل تنزیل کے مطابق ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [التوبة: ١٠٠] ''اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بڑی کامیابی ہے۔'' اور اس کے بعد فرمایا ہے: ﴿ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١٠٢] ''اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے اقراری ہیں، جنھوں نے ملے جلے عمل کیے تھے، کچھ بھلے اور کچھ برے، اللہ سے امید ہے کہ ان کی توبہ قبول فرمائے۔ بلاشبہہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے۔'' اور اس کے بعد فرمایا: ﴿ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١٠٦] ''اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ اللہ کا حکم آنے تک ملتوی ہے ان کو سزا دے گا یا ان کی توبہ قبول کرلے گا، اور اللہ خوب جاننے والا بڑا حکمت والا ہے۔''[1] انتھیٰ۔

امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ظَالِمٌ ﴾ کبیرہ گناہوں والا ہے اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ صغیرہ گناہوں والا اور ﴿ سَابِقٌ ﴾ دونوں سے بچنے والا ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے کسی نے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: کلہم مومنین ہیں۔''[2] رہی صفت کفار کی تو اس کے بعد ہے، یعنی ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ... الآية ﴾ اور لیکن تینوں طبقے تو یہ وہی ہیں جن کو اللہ نے اپنے بندوں میں سے چن لیا ہے اور وہ اہلِ ایمان ہیں۔ جمہور اسی قول پر ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ظالم وہ ہے جس کا ظاہر اس کے باطن سے بہتر ہے اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ وہ ہے جس کا ظاہر اور باطن برابر ہے اور سابق وہ ہے جس کا باطن اس کے ظاہر سے بہتر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظَالِمٌ ﴾ قرآن شریف کا تلاوت کرنے والا ہے اور اس کا عالم ہے مگر اس پر عامل نہیں ہے اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ اس کا تلاوت کرنے والا اور اس کا عالم اور اس پر غیر عامل ہے اور سابق اس کی تلاوت کرنے والا اور اس کا عالم ہے اور اس پر عامل ہے۔

[1] تفسير النسفي (٣/٣٤٣) [2] تفسير النسفي (٣/٣٤٤)

امام ثعلبی رحمہ اللہ وغیرہ نے بہت سے اقوال ذکر کیے ہیں، اس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے کہ ﴿ ظَالِمٌ ﴾، ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ اور ﴿ سَابِقٌ ﴾ کے لغوی معانی معروف اور مشہور ہیں اور صرف ظلم النفس سے ہی یہ بات صادق آتی ہے کہ اس کو حصے سے محروم کرے اور جو شے اس کے لیے بہتر ہے اس کو ضائع کرے، لہٰذا جو شخص تارک استکثار طاعات (طاعات کی کثرت کو بجا نہ لانے والا) کا ہے تو یقیناً اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا، اس ثواب کے لحاظ سے جو اس سے فوت کیا گیا، گو وہ اس کام پر قائم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب کیا ہے اور اس کام کا تارک ہے جس سے اس کو منع فرمایا ہے، چنانچہ وہ اس حیثیت سے ان لوگوں میں سے ہے جن کو اللہ نے برگزیدہ کیا ہے اور اہلِ جنت سے ہے۔ اب آیت میں کسی طرح کا اشکال نہیں ہے اور اسی باب سے آدم علیہ السلام کا یہ قول ہے: ﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ﴾ [الأعراف: ٢٣] ''اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔'' اور یونس علیہ السلام کا یہ قول ہے: ﴿ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٨٧] ''بے شک میں ظالموں میں سے ہوگیا۔'' اور ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ سے مراد وہ شخص ہے جو امرِ دین میں توسط کرتا ہے اور افراط وتفریط کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ یہ شخص اہلِ جنت سے ہے۔ رہا ﴿ سَابِقٌ ﴾ تو وہ شخص ہے جو امورِ دین میں دوسروں سے سابق ہوا، یہ شخص ان تینوں میں سے بہترین ہے۔

پھر اس میں اشکال کیا ہے کہ ﴿ ظَالِمٌ ﴾ کو ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ سے پہلے رکھا اور ان دونوں کو ﴿ سَابِقٌ ﴾ سے پہلے رکھا باوجود اس کے کہ ﴿ مُقْتَصِدٌ ﴾ ﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ سے افضل ہے اور سابق دونوں سے بہتر ہے؟ تو اس کے جواب میں کسی نے تو یہ کہا ہے کہ تقدیم کچھ شرف کی مقتضی نہیں ہوتی جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ﴾ [الحشر: ٢٠] ''اہلِ نار اور اہلِ جنت (باہم) برابر نہیں۔'' اور اسی طرح اور آیاتِ قرآنی ہیں جن میں اہلِ شر کو اہلِ خیر سے مقدم ذکر کیا اور مفضولین کی فاضلین پر تقدیم آئی ہے۔ کسی نے کہا: اس جگہ تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ ظالمین کثیر ہیں اور اہلِ معاصی کی نسبت مقتصدین قلیل ہیں اور سابقین ان دونوں فریق کی نسبت بہت ہی قلیل ہیں، چنانچہ اکثر کو اقل پر مقدم کیا، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ محض کثرت ہی پہلے ذکر کرنے کی مقتضی نہیں ہوتی۔

امام ابن عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظالم کو جو پہلے ذکر کیا ہے تو اس لیے کہ وہ اس کے فضل سے نا امید نہ ہو جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کو اس لیے مقدم کیا ہے کہ اسے یہ بات معلوم کرائی کہ اس کا گناہ اسے اس کے رب سے دور نہ کرے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ اول احوال معصیت ہے، پھر توبہ پھر استقامت۔ امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ظالمین سے ابتداء کی، یہ بات بتانے کے لیے کہ اس کی طرف تقرب صرف اس کے کرم کے ساتھ ہی کیا جاتا ہے اور صرف ظلم برگزیدہ ہونے میں اثر نہیں کرتا۔ پھر ثانیاً مقتصدین کا ذکر کیا اس لیے کہ وہ خوف ورجا کے درمیان ہیں،

6

پھر سابقین کے ساتھ ختم کیا، تا کہ امن میں نہ ہو کوئی اس کے مکر سے اور سب کے سب جنت میں ہیں۔[1] تقدیم کے جو وجوہ ہم نے ذکر کیے، ان کے سوا اور وجوہ بھی ذکر کیے گئے ہیں جن کو ذکر کر کے اس تفسیر کو طول دینے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

فتح البیان میں اس سب کے بعد سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ پھر سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ اس کی اسناد میں ایک شخص مجہول ہے۔ پھر سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے اس کے بعد بیہقی کا قول نقل فرمایا ہے: "إِذَا كَثُرَتْ رِوَايَاتٌ فِيْ حَدِيْثٍ ظَهَرَ أَنَّ لِلْحَدِيْثِ أَصْلًا" انتھی. ''جب کسی حدیث کی روایات کثیر ہوں تو یہ اس کی اصل کا پتا دیتی ہیں۔'' پھر کہا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کی اسناد میں محمد بن اسحاق رحمہ اللہ ہیں اور امام ابن حاتم رحمہ اللہ کی اسناد میں ایک شخص مجہول ہے، پھر عوف بن مالک کی حدیث ذکر کی ہے، اس کے بعد حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا ایک بہت ہی غریب قول نقل کیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا ہے: یہ حدیث بعض کو قوت دیتی ہیں اور ان کی طرف جانا واجب ہے اور جس شخص نے ﴿ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ کو کافر پر محمول کیا ہے، اس کا قول ان حدیثوں سے دفع کیا جائے۔ پھر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اور عقبہ بن صہبان رحمہ اللہ سے مروی حدیث کو ان حدیثوں کا موید ٹھہرایا ہے۔ پھر سیدنا عبداللہ بن مسعود، عمر، عبداللہ بن عباس، عثمان اور براء بن عازب رضی اللہ عنہم کے اقوال ذکر کیے ہیں جو ظالم کے جنتی ہونے پر مشتمل ہیں۔

پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول، جس میں ﴿ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ کا کافر و ہالک ہونا مذکور ہے، ذکر کیا ہے، اس کے بعد فرمایا ہے کہ یہ قول جو اُن سے مروی ہے، اس بات کے مطابق نہیں ہے جو نظمِ قرآنی سے ظاہر ہے اور نہ ان روایتوں کے موافق ہے جو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے ذکر کر آئے ہیں۔ پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا وہ قول نقل کیا ہے جس میں انھوں نے کعب سے سوال کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ ہم پہلے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے وہ قول نقل کر آئے ہیں جو یہ معنی دیتا ہے کہ ﴿ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ نجات پانے والوں سے ہے، اب ان کے اقوال باہم ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے اور قولہ تعالیٰ: ﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا﴾ میں ضمیر اصنافِ ثلاثہ کی طرف راجع ہے، چنانچہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کو آخری صنف پر قصر کریں۔ یہ سب احادیث اور اقوال پہلے مذکور ہو چکے ہیں۔[2]

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ﴾ متبداء ہے ﴿يَّدْخُلُوْنَهَا﴾ اس کی خبر ہے۔ زِرّ بن حُبَیش وغیرہ نے جنۃ کو واحد اور جحدری نے جنات کو بہ نصب پڑھا ہے بنا بر اشتغال۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے یہ بھی جائز رکھا ہے کہ ﴿جَنّٰتُ﴾ بہ رفع اسم اشارہ کی خبرِ ثانی ہو۔ امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے "يُدْخَلُوْنَهَا" بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔[3] ﴿يُحَلَّوْنَ فِيْهَا﴾ ﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ﴾

---

[1] تفسیر القرطبي (٣٤٩/١٤) [2] فتح البیان (١١/ ٢٥١۔ ٢٥٤) [3] فتح القدیر (٤٦٢/٤)

کی خبرِ ثانی ہے۔ ماخوذ ہے "حَلِيَتِ الْمَرْأَةُ" سے، چنانچہ یہ حال ہے۔ اس میں سرعتِ دخول کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ جنت کے باہر اُن کے زیور پہنانے میں داخل ہونے کی تاخیر ہے۔ چنانچہ جب ﴿ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا ﴾ فرمایا تو اس طرف اشارہ کیا کہ ان کا داخل ہونا سرعت کے ساتھ ہے۔

﴿ مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ ﴾ میں پہلا حرف ﴿ مِنْ ﴾ تبعیضیہ ہے اور دوسرا بیانیہ۔ یعنی پہنائے جائیں گے بعض کنگن جو سونے سے بنائے گئے ہیں۔ ﴿ اَسَاوِرَ ﴾ جمع ہے "أَسْوِرَةٌ" کی۔ "أَسْوِرَةٌ" جمع ہے "سِوَارٌ" کی۔ "سِوَارٌ" دست برنجن اور یعنی کنگن کو کہتے ہیں۔ ﴿ وَلُؤْلُؤًا ﴾ معطوف ہے ﴿ مِنْ اَسَاوِرَ ﴾ کے محل پر۔ کسی نے زیر سے پڑھا ہے اور ﴿ ذَهَبٍ ﴾ پر عطف کیا ہے۔ اول کے معنی یہ ہیں کہ سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے۔ ثانی کے معنی یہ ہیں کہ پہنائے جائیں گے کنگن سونے اور موتی کے، یعنی مرکب ہوں گے سونے اور موتیوں سے، سونے میں موتی جڑے ہوں گے۔ زیادہ صحیح وہی ہے جو منقول ہے کہ پہنائے جائیں گے کنگن سونے کے اور کنگن چاندی کے اور کنگن موتیوں کے۔ تذکرۂ قرطبی میں کہا ہے کہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ نہیں ہے کوئی اہلِ جنت مگر اس کے ہاتھ میں تین کنگن ہیں: ایک سونے کا اور ایک چاندی کا اور ایک موتی کا۔[1] صحیح میں وارد ہوا ہے کہ مومن کا زیور اس کے بدن میں وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو پہنچتا ہے،[2] چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا قول ﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ ... الآية ﴾ پڑھا۔ پھر فرمایا: بے شک ان پر تاج ہیں اور بے شک ادنیٰ موتی مشرق و مغرب کے مابین کو روشن کر دے گا۔[3] (أخرجه الترمذي والحاكم وصححه والبيهقي في البعث)

﴿ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴾ یعنی وہاں ان کی پوشاک ریشمی کپڑا ہے، اس لیے کہ اس میں لذت اور زینت ہے۔ اس آیت کی تفسیر سورۃ الحج میں پورے طور پر گزر چکی ہے۔[4] ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ﴾ جمہور نے بہ فتحِ حاء وزاء اور جناح بن حبیش نے بہ ضمِ حاء وسکونِ زاء پڑھا ہے۔ ماضی کا صیغہ اس لیے کہا کہ تحقق پر دلالت کرے، یعنی جس وقت وہ جنت میں داخل ہوں گے تو یوں کہیں گے: ساری خوبیاں اللہ کو جس نے ہم سے حزن کو دور کیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حُزن موت کا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حزن سیئات و ذنوب کا اور خوف ردِ طاعات کا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حُزن نار کا۔[5] قاسم نے کہا ہے کہ نعمتوں کے زوال کا حزن اور عاقبت کا خوف۔ کسی نے کہا ہے کہ قیامت کی ہولنا کیوں کا حزن۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شے جو قیامت کے امور کے بارے میں ان کو دنیا میں غمگین کیا کرتی تھی۔

---

① التذكرة للقرطبي (٥٧٨/١) ② اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

③ سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٦٢) مستدرك الحاكم (٤٦٢/٢) اس کی سند میں "دراج عن ابی الهيثم" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١٨٨٢)

④ رقم الآية (٢٣) ⑤ تفسير الطبري (٤٧٢/٢٠)

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دنیا میں روٹی کا فکر۔ کسی نے کہا ہے کہ معاش کی فکر۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اہلِ جنت سے سارے رنج دور کر دیے جو معاش کے لیے تھے یا قیامت کے متعلق تھے۔[1] یہ قول تمام اقوال سے زیادہ راجح ہے، کیوں کہ دنیا میں اگر کسی حد تک نعمتیں مل بھی گئیں تو بھی وہ شوائب ونوائب (مصیبتوں) سے خالی نہیں ہوتیں، جن کے سبب سے رنج وغم بہت ہوتے ہیں، خاص کر اہلِ ایمان تو اللہ کے عذاب وعتاب سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں۔ ہر وقت ان کے دل مضطرب و بے قرار رہتے ہیں، اس بات پر کہ آیا ان کے اعمال قبول ہوتے ہیں یا مسترد کیے جاتے ہیں، وہ برے انجام اور خاتمے سے خوف زدہ ہوتے ہیں، پھر ان کی پریشانیاں اور غم ہمیشہ رہتے ہیں، یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو جائیں۔ رہے گناہ گار لوگ تو اگرچہ ان کے گلے کی رسی دنیا میں ذرا کشادہ کر دی گئی ہے، جو دھوکے کا گھر ہے اور دارِ قرار کو انھوں نے بھلا رکھا ہے، چنانچہ ان کی زندگی میں ایک نہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا، جب ان کا خوف سخت ہو اور اُن کی مصیبت عظیم ہو، جب وہ موت کے اور آخرت کی منزلوں کے قریب ہوں گے، پھر جب ان کی روحیں قبض کی جائیں گی اور اُن کے اعمال کی جزا کھل جائے گی جو ان کو بُری لگے گی تو ان کا ہم اور غم زیادہ ہوگا۔

پھر اگر اللہ پاک نے ان پر بخشش کا فضل وکرم کیا اور جنت میں ان کو داخل کر دیا تو بے شک اس نے ان سے تمام غم اور فکر اور اندیشے دور کر دیے۔ پھر وہ کہیں گے کہ بے شک ہمارا رب غفور ہے کہ اس نے ہمارے عظیم گناہوں کو بخشا اور وہ شکور ہے کہ ہمارے اعمال میں سے چھوٹے سے چھوٹے اور تھوڑے سے اعمال کو قبول کر لیا، وہ بڑا قدر دان ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ گناہوں کو بخشتا ہے اور طاعات کو قبول کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس شخص کے لیے غفور ہے جس نے اس کی نافرمانی کی اور شکور اس کے لیے جس نے اس کی اطاعت کی ہے۔

﴿ اَلَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ...الآية﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس نے ہم کو قیامت کے گھر میں اتارا، جس میں ہمیشہ رہنا ہے اور اس سے نکلنا نہیں ہے، یہ اس کا فضل وکرم اور رحمت ہے۔ ہم کو جنت میں کوئی دُکھ اور رنج اور مصیبت نہیں پہنچتی اور اس میں ہمیں نہ تھکاوٹ ہوتی ہے اور نہ درماندگی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ وہ دنیا میں ایک قوم ہے جو اللہ سے ڈرتی ہے اور اس کے لیے چھپی اور کھلی ہوئی عبادت میں سعی کرتی ہے اور ان کے دلوں میں ان گناہوں کا غم ہے جو اُن سے سرزد ہو چکے ہیں، چنانچہ انھیں یہ ڈر اور خوف ہے کہ کہیں ان کی یہ سعی ان گناہوں کے سبب سے جو اُن سے ہو چکے ہیں، قبول نہ ہو، چنانچہ اس وقت وہ کہیں گے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ ... الآية﴾[2] (أخرجه عبد بن حميد وابن المنذر وابن أبي حاتم)۔ غرضیکہ جب اللہ پاک اپنے صالح بندوں کی جزا کا ذکر کر چکا تو اپنے ظالم بندوں کی جزا کا ذکر کیا۔ ارشاد فرمایا:[3]

---

[1] فتح القدير (٤/٤٦٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٨٣) [3] فتح البيان (١١/٢٤٧-٢٥٦)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۚ﴿۳۶﴾ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۳۷﴾

اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، ان کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ ان سے اس (جہنم) کا عذاب ہلکا کیا جائے گا، ہم ہر ناشکرے کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ㊱ اور وہ اس (جہنم) میں چلاّئیں گے (اور کہیں گے:) اے ہمارے رب! تو ہمیں (اس سے) نکال، (اب) ہم نیک عمل کریں گے نہ کہ وہ جو (پہلے) کرتے تھے، (اللہ فرمائے گا:) کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو شخص نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کر لیتا؟ اور تمھارے پاس ڈرانے والا بھی آیا، اب تم (عذاب کا مزہ) چکھو، پس ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ㊲

کافروں کی سزا جہنم کی آگ اور جہنم میں ان کی حالت کا بیان:

ہم کو نکال لے، ہم اچھے کام کریں گے، وہ نہیں جو کرتے تھے۔ یعنی اس وقت تو اسی کو اچھا سمجھتے تھے، پھر اب نہیں کریں گے۔ انتھی۔

﴿ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا ﴾ اس آیت کے مثل ہے: ﴿ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴾ [الأعلیٰ: ۱۳] ''نہ وہ مرے گا نہ جیے گا (بلکہ حالتِ نزع میں پڑا رہے گا)۔'' صحیح مسلم میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''لیکن اہلِ نار جو اس کے اہل ہیں تو وہ اس میں نہ مریں گے اور نہ جئیں گے۔''[1] نیز اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۖ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴾ [الزخرف: ۷۷] ''اور پکار پکار کر کہیں گے کہ اے مالک! تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے، وہ کہے گا کہ تمھیں تو (ہمیشہ) رہنا ہے۔'' چنانچہ وہ اپنی اس حالت میں موت کو اپنے لیے راحت خیال کریں گے، لیکن اس کی طرف کوئی راہ نہ ہو گی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ﴾ جیسا کہ فرمایا ہے:

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۵)

﴿ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٧٤۔ ٧٥] ''بے شک گناہ گار لوگ عذابِ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ عذاب کبھی بھی ان سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اس میں مایوس پڑے رہیں گے۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٧] ''جب کبھی وہ بجھنے لگے گی ہم ان پر اسے اور بھڑکا دیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴾ [النبأ: ٣٠] ''اب تم (اپنے کیے کا) مزہ چکھو، ہم تمھارا عذاب ہی بڑھاتے رہیں گے۔''

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴾ یعنی یہ بدلہ ہے اس شخص کا جس نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا اور حق کی تکذیب کی۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ دوزخ میں چیخ وپکار کرتے ہیں، اللہ عزوجل کی طرف زاری کرتے ہیں اپنی آوازوں سے کہ ﴿ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ﴾ یعنی دنیا کی طرف لوٹ جانے کا سوال کریں گے، تا کہ وہ اپنے پہلے اعمال کے علاوہ دوسرے اچھے اعمال کریں اور اللہ عزوجل جان چکا ہے کہ اگر اُن کو پھر دارِ دنیا کی طرف لے جائے تو وہ پھر ویسے ہی کریں جس سے وہ منع کیے گئے تھے اور بے شک وہ البتہ جھوٹے ہیں، اسی لیے وہ ان کے سوال کو نہ مانے گا جس طرح کہ ان کی طرف سے خبر دی ہے ان کے اس قول میں: ﴿ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾ [الشورىٰ: ٤٤] ''کیا واپس جانے کی کوئی راہ ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ﴾ [المؤمن: ١٢] ''یہ (عذاب) تمھیں اس لیے ہے کہ جب صرف اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا تو تم انکار کر جاتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے۔'' یعنی وہ تمھارا کہنا نہ مانے گا، کیوں کہ تم تو ایسے تھے کہ اگر پھیر دیے جاؤ تو تم اس شے کی طرف رجوع کرو جس سے تم منع کیے گئے۔

عذر بہانے ختم ہونے کی عمر کا بیان:

اسی لیے اس جگہ یہ فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ﴾ یعنی کیا تم دنیا میں اتنی عمر زندہ نہیں رہے کہ اگر تم ان لوگوں میں سے ہوتے، جو حق سے نفع لیتے ہیں تو تم اس سے اپنی عمر میں نفع لیتے۔ اس جگہ عمر کی جو مقدار مراد ہے اس میں مفکرین نے اختلاف کیا ہے، چنانچہ علی بن حسین امام زین العابدین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سترہ برس کی مقدار ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جان رکھو کہ طولِ عمر حجت ہے، لہٰذا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس سے پناہ مانگ کہ تو طولِ عمر کے ساتھ دھوکا کھائے۔ یقیناً یہ آیت: ﴿ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ﴾ نازل ہوئی اور حال یہ ہے کہ ان میں البتہ اٹھارہ برس کی عمر کا تھا، اسی طرح ابو غالب شیبانی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں بیس برس مروی ہیں اور امام حسن رحمہ اللہ سے

چالیس برس۔ امام مسروق ﷫ کہا کرتے تھے کہ جس وقت تم میں سے کوئی چالیس برس کو پہنچے تو چاہیے کہ اپنا حِذر لے، یعنی اللہ عزوجل سے بچاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ ہوشیار ہو جائے اور عملِ صالح میں مصروف ہو۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت میں یہی ہے، جیسا کہ امام ابن جریر ﷫ نے بہ روایتِ مجاہد سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ عذر جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے لیے اس آیت: ﴿ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ ...الآیۃ﴾ میں قطع کر دیا ہے، وہ چالیس برس ہے۔ یہ قول ابن جریر ﷫ کا مختار ہے۔ پھر ابن جریر ﷫ نے بہ طریقِ دیگر بہ روایتِ مجاہد عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ عمر جس میں اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے لیے اس آیت: ﴿ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ﴾ میں عذر قطع کیا ہے، وہ ساٹھ برس ہے۔[1] چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت صحیح تر ہے اور حقیقت میں بھی یہی صحیح ہے۔ اس لیے کہ اس میں حدیث ثابت ہوئی ہے، چنانچہ ہم اس کو لائیں گے۔ بات ویسی نہیں ہے جو امام ابن جریر ﷫ نے زعم کیا ہے کہ اس بارے میں حدیث صحیح نہیں ہوئی، اس لیے کہ اس کی اسناد میں وہ شخص ہے جس کے امر میں تثبت واجب ہے۔

اصبغ بن نباتہ ﷫ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ عمر جس کے ساتھ اللہ نے اپنے اس فرمان میں: ﴿ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ﴾ ان کو عمر دی، ساٹھ برس ہے۔[2] امام ابن ابی حاتم نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو کہا جائے گا: کہاں ہیں ساٹھ برس کی عمر والے! اور یہ وہ عمر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ﴾[3] (وكذا رواه ابن جرير بسنده يعني عن علي بن شعيب عن إسماعيل بن أبي فديك به وكذا رواه الطبراني من طريق ابن أبي فديك به وهذا الحديث فيه نظر لحال إبراهيم بن الفضل (یہ شخص ابراہیم بن ابی فدیک کے استاد ہیں) والله أعلم)

حدیثِ دیگر:

امام احمد ﷫ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: البتہ اللہ تعالیٰ نے واقعی اس بندے میں عذر قطع کر دیا ہے جس کو اس نے زندہ رکھا، یہاں تک کہ وہ ساٹھ یا ستر برس کی عمر کو پہنچا۔ « لَقَدْ أَعْذَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى إِلَيْهِ، لَقَدْ أَعْذَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى إِلَيْهِ »[4] اسی طرح امام بخاری ﷫ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

---

[1] تفسير الطبري (٤٧٨،٤٧٧/٢٠) تفسير ابن كثير (٧٣١/٣) [2] تفسير الطبري (٤٧٨/٢٠)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣١٨٤/١٠) تفسير الطبري (٤٧٧/٢٠) المعجم الكبير (١٧٧/١١) امام ہیثمی ﷫ فرماتے ہیں: "وفيه إبراهيم بن الفضل المخزومي وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٢١٧/٧)

[4] مسند أحمد (٢٧٥/٢)

روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مرد کی طرف سے عذر قطع کر دیا جس کی عمر کو تاخیر دی، یہاں تک کہ وہ ساٹھ برس کو پہنچا۔ پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا: "تابعه أبو حازم و ابن عجلان عن سعيد المقبري عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ"۔[1] چنانچہ امام ابو حازم رحمہ اللہ کی متابعت کے الفاظ ابن جریر رحمہ اللہ کے نزدیک یہ ہیں کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ساٹھ برس کی عمر دی تو واقعی اس کی عمر کے بارے میں عذر قطع کر دیا۔[2] (وقد رواه الإمام أحمد والنسائي في الرقاق جميعاً عن قتيبة عن يعقوب بن عبد الرحمن به)۔ (امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کی کتاب الرقاق میں اس حدیث کی اسناد میں یوں کہا ہے: "حدثنا عبد السلام بن مطهر عن عمر بن علي عن معن بن محمد الغفاري عن سعيد المقبري عن أبي هريرة... الخ")۔[3]

امام بزار رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ عمر جس میں اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کا عذر قطع کر دیا ہے، ساٹھ برس ہے، یعنی ﴿ اَوَ لَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيۡهِ مَنۡ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيۡرُ ﴾[4] اور امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے نزدیک ابن عجلان رحمہ اللہ کی متابعت کے الفاظ یہ ہیں: وہ شخص کہ آئے اس پر ساٹھ برس تو یقیناً اللہ نے اس کا عمر کے بارے میں عذر قطع کر دیا۔[5] (وكذا رواه الإمام أحمد عن أبي عبد الرحمن هو المقري به و رواه أحمد أيضا عن خلف عن أبي معشر عن أبي سعيد المقبري) (اس طریق میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے راوی محمد بن عبدالرحمان غفاری ہیں، جس طرح کہ اول طریقوں میں سعید مقبری تھے)

دوسرے طریق سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: البتہ یقیناً اللہ عزوجل نے ساٹھ اور ستر برس کی عمر والے کا عذر قطع کر دیا۔[6] (أخرجه ابن جرير) چنانچہ یہ حدیث ان طریقوں سے صحیح ہوئی ہے، پھر اگر اس طریق کے سوا جس کو ابو عبداللہ بخاری شیخِ صناعتِ حدیث نے پسند کیا ہے، کوئی اور طریق نہ ہوتو وہی کافی ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ کا یہ قول کہ اس کے رجال میں سے بعض وہ ہے جس کے بارے میں تثبت واجب ہے، بخاری کی تصحیح کی وجہ سے قابلِ توجہ نہیں ہے۔ واللّٰه أعلم۔ بعض نے ذکر کیا ہے کہ طبیبوں کے نزدیک انسان کی طبیعی عمر ایک سو بیس برس کی ہے، چنانچہ انسان ساٹھ برس کی عمر تک ازدیاد (زیادتی) میں رہتا ہے، اس کے بعد نقص اور بڑھاپا شروع ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

إِذَا بَلَغَ الْفَتَى سِتِّيْنَ عَامًا فَقَدْ ذَهَبَ الْمَسَرَّةُ وَالْفَتَاءُ

یعنی جس وقت جوان ساٹھ برس کو پہنچ گیا تو یقیناً جوانی اور خوشی چلی گئی، جبکہ یہ وہ عمر ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف عذر قطع کرتا ہے اور اس کے سبب سے ان سے علتیں اور بہانے دور کرتا ہے تو اس امت کی

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٥٦) ② تفسير الطبري (٤٧٨/٢٠) مسند أحمد (٤١٧/٢)
③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٥٦) ④ مسند البزار (١٦٧/١٥)
⑤ تفسير ابن أبي حاتم (٣١٨٥/١٠) مسند أحمد (٣٢٠/٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٩٤٥)
⑥ تفسير الطبري (٤٧٧/٢٠، ٤٧٨)

عمروں پر یہی عمر غالب ہوئی، چنانچہ اس بارے میں حدیث وارد ہوئی ہے۔ حسن بن عرفہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری اُمت کی عمریں ساٹھ سے ستر برس کے درمیان ہیں اور اُن کا کم تر وہ ہے جو اس سے تجاوز کرے۔[1] (وهكذا رواه الترمذي وابن ماجه جميعاً في كتاب الزهد عن الحسن بن عرفه به، ثم قال الترمذي: هذا حديث حسن غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه وهذا عجب من الترمذي فإنه قد رواه أبوبكر بن أبي الدنيا من وجه آخر و طريق أخرى عن أبي هريرة حيث قال: حدثنا سليمان بن عمرو عن محمد بن ربيعة عن كامل بن العلاء عن أبي صالح عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «أعمار أمتي ما بين الستين إلى السبعين و أقلهم من يجوز ذلك» و قد رواه الترمذي في كتاب الزهد أيضا عن إبراهيم بن سعيد الجوهري عن محمد بن ربيعة به ثم قال: هذا حديث حسن غريب من حديث أبي صالح عن أبي هريرة رضي الله عنه وقد روى من غير وجه عنه هذا نصه بحروفه في الموضعين والله أعلم)

حافظ ابو یعلیٰ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معترک منایا ساٹھ اور ستر کے درمیان ہے (یعنی موضع قتال موتون کا مطلب یہ ہے کہ ساٹھ ستر کے درمیان بہت مریں گے)۔ اسی سند سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت سے ستر برس کی عمر کو پہنچنے والے لوگ کم ہیں اس کی اسناد ضعیف ہے۔[2] اسی معنی سے ایک اور حدیث ہے۔ حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے اس کو سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ عرض کی: یا رسول اللہ! آپ ہمیں اپنی امت کی عمروں کی خبر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پچاس سے ساٹھ کے درمیان۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! پھر ستر کی عمر والے۔ فرمایا کم ہے میری امت میں سے وہ جو اس کو پہنچے۔ اللہ رحم کرے ستر سال والوں کو اور اللہ رحم کرے اسی سال والوں پر۔ پھر بزار نے کہا ہے کہ ان الفاظ سے مروی نہیں ہے مگر اسی اسناد سے۔ اہلِ بصرہ میں سے عثمان بن مطر راوی قوی نہیں ہیں۔[3] صحیح میں ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تریسٹھ برس زندہ رہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ساٹھ برس۔ کسی نے کہا ہے کہ پینسٹھ برس۔ مشہور قول پہلا ہے۔ والله أعلم.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ اور ابو جعفر باقر رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ "نذیر" سے مراد شیب ہے، یعنی بڑھاپا اور بال سفید ہو جانا۔ امام سدی اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴾ [النجم: ٥٦] "یہ (نبی) ڈرانے والے ہیں پہلے ڈرانے والوں میں سے۔" امام قتادہ رحمہ اللہ سے یہی قول صحیح ہے۔ شیبان نے ان سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے یوں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر عمر اور رسولوں کے ساتھ حجت قائم کی ہے۔ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٣٦)

② مسند أبي يعلىٰ (١١/٤٢٢، ٤٢٣) اس کی سند میں "ابراہیم بن فضل مخزومی" سخت ضعیف راوی ہے۔

③ مسند البزار (٣٣٤٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه عثمان بن مطر وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ١٠/٣٤٣)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٤٩)

ہے[1] اور یہی ظاہر تر ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ۝ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴾ [الزخرف: ۷۷۔ ۷۸] ''اور پکار پکار کر کہیں گے کہ اے مالک! تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے، وہ کہے گا تمھیں تو (ہمیشہ) رہنا ہے۔ ہم تو تمھارے پاس حق لے آئے لیکن تم میں سے اکثر لوگ حق سے نفرت رکھنے والے تھے۔'' یعنی البتہ تحقیق ہم نے تمھارے لیے رسولوں کی زبان پر بیان کر دیا، لیکن تم نے نہ مانا اور مخالفت کی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۵] ''اور ہماری سنت نہیں کہ رسول بھیجنے سے پہلے ہی عذاب کرنے لگیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ كُلَّمَاۤ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ﴾ [الملك: ۸۔ ۹] ''جب کبھی اس میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا اس سے جہنم کے داروغے پوچھیں گے کہ کیا تمھارے پاس ڈرانے والا کوئی نہیں آیا تھا؟ وہ جواب دیں گے کہ بے شک آیا تھا، لیکن ہم نے اسے جھٹلایا اور ہم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ بھی نازل نہیں فرمایا۔ تم بہت بڑی گمراہی میں ہی ہو۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تم نے جو اپنی عمر کی مدت میں انبیاء کی مخالفت کی تو اس کی جزاء یہ ہے کہ تم عذاب چکھو، اب آج کے دن تمھارا کوئی مددگار نہیں ہے کہ تمھیں اس عذاب اور سزا اور طوق سے تم کو چھڑائے جس میں تم پڑے ہو۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

جمہور نے ﴿ فَيَمُوْتُوْا ﴾ بہ نصب پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ نفی کا جواب ہے اور عیسیٰ بن عمر اور حسن رحمہ اللہ نے ''فَيَمُوْتُوْنَ'' بہ اثباتِ نون پڑھا ہے۔ امام مازنی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی بنا اس پر ہے کہ ﴿ يُقْضٰى ﴾ پر معطوف ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراءت ضعیف ہے، لیکن اس کے ضعیف کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴾[3] [المرسلات: ۳۶] ''اور نہ انھیں معذرت کی اجازت دی جائے گی۔'' معنی یہ ہیں کہ منکروں کے لیے دوزخ کی آگ ہے، ان کے لیے یہ حکم نہیں کیا جائے گا کہ وہ مرجائیں اور عذاب سے راحت پائیں اور نہ ان سے عذاب کو ہلکا کیا جائے گا، بلکہ جس وقت ان کے چمڑے پک جائیں گے تو ہم ان کے چمڑے بدل دیں گے، تاکہ عذاب چکھیں اور جب آگ بجھ جائے گی تو اس کو اور زیادہ دھکایا جائے گا، اس سخت جزا کے مثل ہم جزا دیتے ہیں ہر اس شخص کو جو کفر میں حد سے بڑھا ہوا ہے نہ اس سے خفیف اور ہلکی جزا۔ ابوعمرو نے ''يُجْزٰى'' بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۷۳۳/۳) الدر المنثور (۳۱/۷۔ ۳۲) [2] تفسیر ابن کثیر (۷۳۱/۳۔ ۷۳۴) [3] فتح القدير (۴۶۶/۴)

''اصطراخ'' ماخوذ ہے صُراخ سے۔ صراخ بہ معنی صیاح ہے، یعنی چیخنا چلانا۔ صارخ مستغیث کو کہتے ہیں، یعنی استغاثہ کرنے والا۔ وہ آگ میں اپنی آوازیں بلند کرتے ہوئے کہیں گے: اے ہمارے رب!۔ یا اس حال میں کہیں گے: ﴿ رَبَّنَآ ﴾۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ندا کریں گے: ﴿ رَبَّنَآ ﴾، یعنی اے ہمارے پروردگار! ہم کو نکال، ہم عملِ صالح کریں گے اس شرک اور معاصی کے سوا جو ہم کیا کرتے تھے، چنانچہ جس کفر پر ہم تھے اس کے بدلے ایمان لے آئیں گے اور معصیت کے بجائے طاعت کریں گے۔[1]

﴿ صَٰلِحًا ﴾ کا نصب یا تو اس لیے ہے کہ مفعول مطلق محذوف کی صفت ہے: ''أَيْ: عَمَلًا صَالِحًا'' یا موصوف محذوف کی صفت ہے: ''أَيْ نَعْمَلُ شَيْئًا صَالِحًا'' کسی نے کہا ہے کہ ﴿ غَيْرَ الَّذِىْ كُنَّا نَعْمَلُ ﴾ کے زیادہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انھوں نے جو اعمالِ غیر صالحہ کیے، اس پر حسرت و افسوس کریں گے، اس بات کے اقرار کے ساتھ کہ دنیا میں ان کے اعمال غیر صالح تھے۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان کی بات کا یہ جواب دیا: ﴿ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ﴾ سوالیہ انداز ان کو دھمکانے اور سرزنش کرنے کے لیے ہے اور حرفِ واو کا عطف ہے مقدر پر جس طرح کہ اس کے نظائر میں ہوتا ہے اور کلمۂ ﴿ مَا ﴾ نکرۂ موصوفہ ہے، یعنی کیا اب وہ یوں کہتے ہیں اور ہم نے ان کو ایسی عمر نہیں دی کہ جس کو نصیحت لینا ہو، وہ اس میں نصیحت لے سکے۔

اس عمر میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ساٹھ برس۔ کسی نے کہا ہے کہ چالیس برس۔ کسی نے کہا ہے کہ اٹھارہ برس۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت قولِ اول کی قائل ہے، ان میں سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔ دوسرے قول کے قائل امام حسن اور مسروق رحمہ اللہ وغیرہما ہیں۔ تیسرے کے امام عطاء اور قتادہ رحمہ اللہ قائل ہیں۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول چھیالیس برس کا بھی مروی ہے۔[3] امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمہور مفسرین اس کے قائل ہیں کہ ﴿ النَّذِيْرُ ﴾ سے مراد نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ امام عکرمہ، سفیان بن عیینہ، وکیع، حسن بن الفضل، فراء اور ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیب ہے۔ اس قول پر معنی یہ ہیں: کیا نہیں عمر دی ہم نے تم کو یہاں تک کہ بوڑھے ہو گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد قرآن شریف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تپ (بخار) ہے، ازہری نے کہا ہے کہ تپ موت کا قاصد ہے، گویا وہ موت کے آنے کے بارے میں بتاتا ہے اور اس کے آنے سے ڈراتا ہے اور شیب (بڑھاپا) بھی نذیر ہے، کیوں کہ میانہ کسالی (بڑھاپے کی وجہ) سے سفید بال آتے ہیں اور یہ اس بات کی نشانی ہے کہ بچپن کی عمر چلی گئی جو لہو و لعب کی عمر تھی۔[4] کسی نے کہا ہے کہ مراد عزیز و اقارب کی موت ہے۔ کسی نے کہا: کمالِ عقل۔ کسی نے کہا: بلوغ۔

---

[1] فتح القدير (٤/٤٦٦)　[2] ان کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] الدر المنثور (٧/٣١)　[4] فتح القدير (٤/٤٦٧)

﴿ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴾ میں ذوق (چکھنے) کا جو امر کیا تو اس امر کی ترتیب کے لیے ماقبل پر حرفِ فاء ہے جس میں عمر دینے کا اور نذیر آنے کا ذکر ہے اور ﴿ فَمَا ﴾ میں فاء تعلیل کے لیے ہے، یعنی پس چکھو جہنم کا عذاب، اس لیے کہ تم نے نہ تو عبرت لی اور نہ نصیحت پذیر ہوئے، چنانچہ اب تمھارے لیے کوئی مددگار نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے تم کو روکے اور تمھارے اور اس کے درمیان حائل ہو جائے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: "فَذُوْقُوْا فَمَا لِلْمُشْرِكِيْنَ مِنْ مَانِعٍ يَّمْنَعُهُمْ"[1] "پس چکھو! مشرکین سے اس (عذاب) کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔" (كذا في فتح البيان)

إِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿٣٨﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿٣٩﴾

بلاشبہ اللہ آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزیں جانتا ہے، بے شک وہ سینوں کے بھید خوب جانتا ہے ﴿38﴾ وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں جانشین بنایا، پھر جس نے کفر کیا تو اس کے کفر کا وبال اسی پر ہوگا اور کافروں کو ان کا کفران کے رب کے ہاں ناراضی ہی میں زیادہ کرتا ہے اور کافروں کو ان کا کفر نقصان ہی میں زیادہ کرتا ہے ﴿39﴾

اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب اور زمین میں لوگوں کو ایک دوسرے کا جانشین بنانے والا ہے:

زمین میں قائم مقام کیا، یعنی رسولوں کے پیچھے ریاست دی۔ یا اگلی امتوں کے پیچھے، اب اس کا حق ادا کرو۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ وہ آسمان اور زمین کے غائب کو جانتا ہے اور اس شے کو جانتا ہے جس کو سرائر چھپاتے ہیں اور جس کو سینے لپیٹے ہوئے ہیں اور وہ ضرور ہر عامل کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔ پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی وہی ذات پاک ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ کیا کہ ایک قوم اپنے سے پہلے کے لوگوں کی قائم مقام ہوتی ہے اور ایک گروہ اپنے سے اگلے گروہ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ﴾ [النمل: ٦٢] "اور تمھیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے۔"

پھر جو کوئی ناشکری کرے تو اس کا وبال اسی کی جان پر پڑے گا نہ کہ اس کے غیر پر۔ ﴿ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جتنا وہ اپنے کفر پر چلتے رہیں گے، اتنا ہی اللہ ان سے بغض رکھے گا اور

[1] فتح القدير (٤/٤٦٧) فتح البيان (١١/٢٥٦۔ ٢٥٨)

جب تک وہ اس میں مستمر رہیں گے، یعنی جے رہیں گے اپنا اور اپنے گھر والوں کا نقصان کریں گے روزِ قیامت میں، مومنوں کے برعکس کہ ان میں سے کسی کی عمر جتنی دراز ہوتی جائے گی اور اس کا عمل اچھا ہوگا، اتنا ہی جنت میں اس کا درجہ اور مقام بلند ہوگا اور اس کا اجر بڑھے گا اور اس کا خالق و باری رب العلمین اسے چاہے گا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جمہور نے ﴿عٰلِمُ﴾ کو ﴿غَيْبِ﴾ کی طرف مضاف کیا ہے اور جناح بن حبیش رحمہ اللہ نے بہ تنوین "عَالِمٌ" اور بہ نصب "غَيْبَ" پڑھا ہے۔[2] معنی یہ ہیں کہ وہ ہر شے کو جاننے والا ہے، اسی میں سے تمھارے اعمال ہیں، اس پر کوئی مخفی شے پوشیدہ نہیں رہتی، لہٰذا اگر وہ تم کو دنیا کی طرف پھیر دے تو تم عملِ صالح نہ کرو گے، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾ [الأنعام: ٢٨] "اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھیج دیے جائیں تب بھی یہ وہی کام کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا۔"

جملہ ﴿اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ تعلیل ہے ماقبل کی، کیوں کہ جب وہ سینوں کی چھپی باتوں کو جانتا ہے، حالاں کہ وہ ہر شے سے زیادہ پوشیدہ ہیں تو ان کے مافوق کو تو بالاولی جانے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے کا مفسر ہے کلمۂ "ذات" تانیث ہے ذو بہ معنی صاحب کی، یعنی "بِالْاُمُوْرِ صَاحِبَةِ الصُّدُوْرِ" مطلب یہ ہے کہ وہ امور سینوں سے مصاحب اور لگے ہوئے رہتے ہیں۔ امور کی سینوں سے مصاحبت اس لحاظ سے ہے کہ وہ ان میں چھپے ہوئے اور دبے ہوئے رہتے ہیں۔

﴿خَلٰٓئِفَ﴾ "خَلِيْفَةٌ" کی جمع ہے اور مستخلف کو خلیفہ بولتے ہیں۔ خلیف اول کی جمع "خَلَائِف" ہے اور دوسرے کی "خُلَفَاء" آتی ہے، یعنی تم کو ایک ایسی امت کیا جو اگلوں کے لیے قائم ہونے والی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا "خَلْفًا بَعْدَ خَلْفٍ وَقَرْنًا بَعْدَ قَرْنٍ"[3] یعنی ایک گروہ گیا اس کے بعد دوسرا آیا، ایک قرن گزرا، دوسرا آیا۔ "خلف" سے مراد متقدم کے واسطے تالی ہے، یعنی اگلے سے پیچھے جو آیا وہ خلف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ نے تم کو اپنی زمین میں اپنا خلیفہ بنایا، غرضیکہ پھر جو کوئی تم میں سے اس نعمت کی ناشکری کرے گا تو اس کی ناشکری کا ضرر اسی پر ہوگا، اس کے غیر کی طرف تجاوز نہیں کرے گا۔ "مَقت" کے معنی غضب و بغض کے ہے۔ اور خسار نقصان اور ہلاکت کو کہتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ کفر ان کو اللہ کے پاس نفع نہ دے گا، اس لحاظ سے کہ نہ بڑھائے گا ان کے لیے مگر غیظ و غضب اور بغض اور ان کی جانوں کے حق میں ان کو نفع نہ دے گا اس لیے کہ نہ بڑھائے گا ان کو مگر نقصان اور ہلاکت میں۔

[1] تفسیر ابن کثیر (٧٣٤/٣) [2] فتح القدیر (٤٦٧/٤) [3] تفسیر القرطبي (٣٥٥/١٤)

اس جگہ کلمۂ ﴿ يَزِيدُ ﴾ کو دوبارہ ذکر کر کے اس بات پر زیادہ تقریر اور آگاہ کیا ہے کہ یہ دونوں امور ہولناک اور بہت برے ہیں، ان میں سے ہر ایک حقیقی طور پر اور مستقل طور پر کفر ہی کی وجہ سے ہے۔ پھر اللہ پاک نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ ان کو زجر و توبیخ اور سرزنش کریں۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَا ذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝41

آپ کہہ دیجیے: بھلا بتاؤ تو اپنے جن شریکوں (معبودوں) کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ انھوں نے زمین سے کیا کچھ پیدا کیا ہے یا ان کا آسمانوں (کی پیدائش) میں کوئی حصہ ہے؟ یا ہم نے انھیں کوئی کتاب دی ہے اور وہ اس کی کسی واضح دلیل پر (قائم) ہیں؟ بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض پُرفریب وعدہ دیتے ہیں (40) بلاشبہ اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے (کہیں) وہ دونوں (اپنی جگہ سے) ہٹ نہ جائیں اور فی الواقع اگر وہ ہٹ جائیں تو اس کے بعد انھیں کوئی بھی تھام نہیں سکے گا، بلاشبہ وہ بڑا حلم والا، بہت بخشنے والا ہے (41)

مشرکوں کے شریکوں کے عجز کا اور قدرتِ الٰہی کا بیان:

اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ مشرکوں سے کہیں: بھلا دیکھو اپنے شریک جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، یعنی بت اور شریک، مجھے بتاؤ کہ انھوں نے زمین میں کیا بنایا ہے، یا آسمانوں میں ان کی کوئی شراکت ہے، یعنی ان کے لیے اس میں سے کچھ بھی نہیں ہے، وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ کیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس میں شرک و کفر ہے جس کے وہ قائل ہیں۔ بات اس طرح ہرگز نہیں ہے، بلکہ انھوں نے تو اس معاملے میں صرف اپنی خواہشوں اور رایوں کی پیروی کی ہے اور اپنی آرزوؤں کے پیچھے لگے رہے ہیں، وہ

[1] فتح البیان (۱۱/۲۵۸۔ ۲۵۹)

آرزوئیں جن کی تمنا انھوں نے اپنے لیے کی ہے۔ یہ سب فریب اور باطل اور جھوٹ ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنی عظیم قدرت کی خبر دی ہے جس کی وجہ سے آسمان وزمین قائم ہیں اور اس قوت کی جو اُن میں تھامنے والی رکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ﴾ یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کو تھامتا ہے کہ وہ اپنی جگہوں سے مضطرب نہ ہو جائیں۔ جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [الحج: ٦٥] ''وہی آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ زمین پر اس کی اجازت کے بغیر گر نہ پڑے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ﴾ [الروم: ٢٥] ''اس کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ آسمان وزمین اسی کے حکم سے قائم ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَىِٕنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان کے دوام پر اور ان کے باقی رکھنے پر کوئی قادر نہیں ہے، مگر وہی اور وہ باوجود اس کے حلیم وغفور ہے، یعنی وہ دیکھ رہا ہے اپنے بندوں کو اس حال میں کہ وہ اس کے ساتھ کفر کر رہے ہیں اور اس کی نافرمانی کر رہے ہیں اور وہ حکم کرتا ہے اور تاخیر و مہلت دیتا ہے دیر لگاتا ہے، جلدی نہیں کرتا اور دوسروں کی پردہ پوشی کرتا ہے اور بخشتا ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک غریب بلکہ منکر حدیث سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے وارد کی ہے۔ کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر موسیٰ علیہ السلام سے حکایت کرتے تھے۔ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کے جی میں واقع ہوا کہ آیا اللہ عزوجل سوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا، اس نے ان کو تین بار (تین راتیں) جگایا اور ان کو دو شیشیاں دیں، ہر ہاتھ میں ایک شیشی اور ان کو کہا کہ ان کو حفاظت سے رکھیں، فرمایا: پھر وہ سونے لگے اور قریب تھا کہ ان کے دونوں ہاتھ مل جائیں، پھر وہ جاگتے تو ایک شیشی کو دوسری سے روکے رکھتے، یہاں تک کہ ایسی نیند آئی کہ ان کے دونوں ہاتھ آپس میں لڑ گئے اور دونوں شیشیاں ٹوٹ گئیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ مثال بیان فرمائی کہ اگر اللہ پاک سو رہتا تو آسمان وزمین تھامے نہ جاتے۔[1] (فتح البیان میں ہے: وأخرجه أبو يعلىٰ وابن جرير وابن أبي حاتم والدار قطني والبيهقي في الأسماء والصفات و غيرهم وروي من طرق عن ابن سلام وابن أبي بردة)۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ حدیث مرفوع نہیں ہے، بلکہ اسرائیلیاتِ منکرہ میں سے ہے، کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام اس سے برتر

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٨٦) مسند أبي يعلىٰ (١٢/٢١) تفسير الطبري (٢٠/٣٩٣، ٣٩٤) فتح البيان (١١/٢٦١) اس کی سند میں ''حکم ابن ابان'' متکلم فیہ راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٠٣٤)

ہیں کہ اللہ سبحانہ پر نیند کی تجویز کریں اور اللہ عزوجل نے اپنی کتابِ عزیز میں یہ خبر دی ہے: ﴿ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ [البقرۃ: ٢٥٥] ''وہ زندہ ہے اور سب کو تھامنے والا ہے، جسے نہ اونگھ آئے نہ نیند، اس کی ملکیت میں زمین اور آسمان کی تمام چیزیں ہیں۔'' نیز صحیحین میں سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ سوتا نہیں ہے اور نہ اسے لائق ہے کہ سوئے۔ « يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ » (''أي العدل ويرفعه أي ينزله إلى الأرض مرة ويرفعه أخرى''.[1] (كذا في مجمع البحار) یعنی عدل کو زمین کی طرف اتارتا ہے ایک بار اور کبھی اس کو اٹھا لیتا ہے)۔ اٹھایا جاتا ہے اس کی طرف رات کا عمل دن سے قبل اور دن کا عمل رات سے قبل۔ اس کا حجاب نور ہے یا نار، اگر وہ اس حجاب کو اٹھا دے تو اس کے چہرے کی روشنی اس کی مخلوق میں ہر اس شے کو جلا ڈالے جس کی طرف اس کی بصر پہنچے۔[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابو وائل رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو کہاں سے آیا ہے؟ اس نے کہا: شام سے۔ فرمایا: کسی سے ملاقات کی؟ کہا: میں کعب سے ملا۔ فرمایا: تجھے کعب نے کیا حدیث بیان کی؟ کہا: مجھے یہ حدیث بیان کی کہ آسمان ایک فرشتے کے مونڈھے پر چکر کھاتے ہیں۔ فرمایا: پھر کیا تو نے اس کی تصدیق کی یا تکذیب؟ کہا: میں نے نہ اس کی تکذیب کی نہ تصدیق۔ فرمایا: البتہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ تو اس کی طرف سفر کرنے کے بجائے اپنی سواری اور اس کے کجاوے کو فدیہ کرتا۔ کعب نے جھوٹ کہا، بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ... الآية ﴾ یہ اسناد کعب تک اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تک صحیح ہے۔ پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ سندِ خود ابراہیم سے روایت کیا ہے، کہا: جندب بجلی شام میں کعب کی طرف گئے۔ پھر روایت مذکور کی طرح ذکر کیا۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فقیہ یحییٰ بن ابراہیم بن مزین طلیطلی کی سیر الفقہاء نام کتاب میں، مَیں نے دیکھا ہے کہ وہ اس اثر کو ''عن محمد بن عيسى بن الطباع عن وكيع عن الأعمش به'' لائے ہیں اور اس آیت سے حجت پکڑی ہے اور اس حدیث سے کہ مغرب میں توبہ کے لیے ایک دروازہ ہے کہ وہ ہمیشہ کھلا رہے گا، یہاں تک کہ سورج اس سے طلوع کرے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح میں ہے۔[4] والله سبحانه وتعالىٰ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا حاصل یہ ہے کہ تم مجھے اپنے شرکاء کے متعلق خبر دو جن کو تم نے معبود ٹھہرایا ہے اور ان کو اللہ کے سوا پوجا ہے، مراد بت وغیرہ ہیں۔ جملہ ﴿ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ ﴾ ﴿ اَرَءَيْتُمْ ﴾ سے بدلِ اشتمال ہے، معنی یہ

[1] مجمع بحار الأنوار (٧٢/٢) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٩) [3] تفسير الطبري (٤٨١/٢٠، ٤٨٢)
[4] سنن الترمذي (٣٥٣٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٣٤٤/٦) تفسير ابن كثير (٧٣٤/٣، ٧٣٥) صحيح الترغيب والترهيب (١٢١/٣)

ہیں کہ مجھ کو اپنے شرکاء کے بارے میں خبر دو کہ انھوں نے زمین سے کون سی چیز پیدا کی ہے؟ کسی نے کہا ہے کہ دونوں فعل، یعنی ﴿ أَرَءَيْتُمْ ﴾ اور ﴿ أَرُونِي ﴾ باب تنازع سے ہیں اور دوسرے فعل کو بنا بر اختیار بصریین کے عمل دیا گیا ہے۔ ﴿ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ یعنی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کچھ شرکت ہے آسمانوں کے پیدا کرنے میں، یا ان کی ملکیت میں، یا ان کے قبضے میں، یہاں تک کہ اس وجہ سے وہ الوہیت میں شریک ہونے کے مستحق ہوں، یا ہم نے ان پر شرکت کے سلسلے میں کوئی کتاب نازل کی ہے، جس سے ان کو ظاہر اور واضح حجت حاصل ہوگئی ہے۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: کیا ہم نے کفارِ مکہ کو کوئی کتاب دی ہے[1] جس میں یہ بیان ہے کہ اللہ کے ساتھ کوئی شریک ہے۔ بہتر ہے کہ ﴿ لَهُمْ ﴾ کی ضمیر اور ﴿ اٰتَيْنٰهُمْ ﴾ کی ضمیر شرکاء کی طرف راجع ہو، ضمیروں کے تناسق کے سبب سے، یعنی سب ضمیریں برابر ترتیب وار ایک شے کی طرف راجع ہوں، جیسے: موتیوں کی لڑی۔ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر مشرکین کی طرف پھرتی ہے، یعنی ﴿ اٰتَيْنٰهُمْ ﴾ کی ضمیر۔ اس صورت میں خطاب سے غیبت (غائب) کی طرف التفات ہوگا۔ دونوں جگہ کلمۂ ﴿ بَلْ ﴾ منقطعہ ہے بہ معنی ﴿ بَلْ ﴾ و ہمزہ۔ چنانچہ اللہ پاک نے پہلے استفہام سے اضراب کیا (التفات کیا) اور دوسرے استفہام میں شروع فرمایا اور استفہام انکاری ہے۔ "بَيِّنَة" کو امام ابن کثیر، ابو عمرو، حمزہ اور حفص رحمہ اللہ نے عاصم رحمہ اللہ سے بہ صیغۂ مفرد پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ صیغۂ جمع "بینات" پڑھا ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے دونوں استفہام سے اضراب کر کے ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ إِنْ يَعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُوْرًا ﴾ یعنی نہ یہ بات ہے کہ ان کے بتوں وغیرہ کو آسمانوں میں کسی طرح کی شرکت ہے، نہ ہم نے کوئی کتاب ان پر شرک کے بارے میں نازل کی، بلکہ بات یہ ہے کہ ظالم لوگ ایک دوسرے کو وعدہ نہیں دیتے، جس طرح کہ سردار اپنے اتباع کو وعدے دیتے ہیں، مگر وہ فریب ہوتا ہے کہ اس سے ان کو دھوکا دیتے ہیں اور اس کو ان کے لیے اچھا کر دکھاتے ہیں۔ غرور وہ باطل اور بے اصل باتیں ہیں جو دھوکا دیں اور ان کی کچھ حقیقت نہ ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سردار اپنے اتباع سے کہتے تھے کہ یہ معبود ان کو فائدہ دیں گے اور ان کو اللہ کے قریب کر دیں گے اور اس کے پاس ان کی سفارش کریں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ شیاطین مشرکوں کو اس کا وعدہ دیتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ جو وعدہ ایک دوسرے کو دیا کرتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں پر مدد دیے جائیں گے اور ان پر غالب ہوں گے۔

غرضیکہ پہلے تو اللہ پاک نے بتوں کا ضعف بیان کیا اور یہ بتایا کہ انھیں کسی شے پر قدرت نہیں ہے۔ اس کے بعد جملہ مستانفہ سے اپنی قدرت اور منفرد کاری گری بیان کی۔ فرمایا: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُوْلَا ﴾ یعنی وہ ان دونوں (آسمانوں اور زمین) کو زوال سے روکتا ہے، جیسا کہ زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[3] (اس قول میں تقدیر کی ضرورت نہیں ہے) یا روکتا ہے ان کو واسطے کراہت اس بات کی کہ وہ زائل ہو جائیں، یا تا کہ ٹل نہ جائیں۔ کسی نے کہا: معنی

---

[1] تفسير البغوي (٦/٤٢٦) [2] تفسير القرطبي (١٤/٣٥٦) [3] معاني القرآن (٤/٢٧٣).

یہ ہے کہ ان کا شرک آسمان اور زمین کے زوال کا مقتضی ہے جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ ﴾ [مریم: ۹۰۔ ۹۱] ''قریب ہے کہ اس قول کی وجہ سے آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں کہ وہ رحمان کی اولاد ثابت کرنے بیٹھے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ﴾ یعنی البتہ اگر وہ ٹل جائیں تو نہ تھام سکے ان کو کوئی اس کے تھامنے کے بعد یا ان کے ٹل جانے کے بعد۔ جملہ ﴿ اِنْ اَمْسَكَهُمَا ﴾ قسم وشرط کے جواب کے قائم مقام ہے۔ پہلا حرف ﴿ مِنْ ﴾ زائدہ ہے اور دوسرا ابتدائیہ۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر وہ ٹل جاتے تو اُن کو کوئی نہ تھام سکتا۔[1] کہا اور یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴾ [الروم: ۵۱] ''اور اگر ہم بادِ تند چلا دیں اور یہ لوگ انھی کھیتوں کو (مرجھائی ہوئی) زرد پڑی ہوئی دیکھ لیں تو پھر اس کے بعد ناشکری کرنے لگیں۔'' کسی نے کہا ہے کہ مراد ان کا قیامت کے دن زائل ہونا ہے۔ جملہ ﴿ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾ ماقبل کی تعلیل ہے۔ یعنی اللہ پاک آسمانوں اور زمین کو تھامتا ہے، اس لیے کہ وہ تحمل والا ہے اور بڑا بخشنے والا ہے۔[2]

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۝ اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۚ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝

اور انھوں نے اللہ کی پختہ قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ ضرور ہر ایک امت سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے، پھر جب ان کے پاس ڈرانے والا آیا تو اس (کی آمد) نے ان کو (حق سے) نفرت ہی میں زیادہ کیا ﴿42﴾ زمین میں تکبر کرنے اور بری چال اس کے چلنے والے ہی کو گھیرتی ہے، پھر وہ پہلے لوگوں کے (بارے میں اللہ کے) طریقے کا انتظار ہی تو کرتے ہیں، چناں چہ آپ اللہ کا طریقہ بدلتا ہرگز نہ پائیں گے اور آپ اللہ کا طریقہ ٹلتا ہرگز نہ پائیں گے ﴿43﴾

مشرکوں کی طرف سے آمدِ رسول کا مطالبہ:

عرب لوگ جو یہودیوں سے اپنے نبی کی تعلیمات کے خلاف باتیں سنتے تو کہتے کہ اگر ہم میں ایک نبی آجائے

[1] تفسیر القرطبي (۱۴/۳۵۶) [2] فتح البیان (۱۱/ ۲۵۹۔۲۶۲)

تو ہم اس کے بہت اچھے ساتھی بنیں۔ پس منکروں نے اور عداوت کی۔ انتہی[1].

اللہ پاک قریش کی اور عرب کی خبر دیتا ہے کہ انھوں نے قسمیں کھائیں اللہ کی، تاکید کی قسمیں، رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے۔ وہ قسمیں اس بات پر کھائی تھیں کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آئے گا تو البتہ وہ ان ساری امتوں سے بہتر راہ چلیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے۔ یہ قول امام ضحاک رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ﴾ [الأنعام: ١٥٦- ١٥٧] ''کہیں تم لوگ یوں نہ کہو کہ کتاب تو صرف ہم سے پہلے جو دو فرقے تھے، ان پر نازل ہوئی تھی اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے محض بے خبر تھے۔ یا یوں نہ کہو کہ اگر ہم پر کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان سے بھی زیادہ راہِ راست پر ہوتے سو اب تمھارے پاس تمھارے رب کے پاس سے ایک کتاب واضح اور راہنمائی کا ذریعہ اور رحمت آچکی ہے۔ اب اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو ہماری ان آیتوں کو جھوٹا بتائے اور اس سے روکے۔'' نیز اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ۝ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الصافات: ١٦٧- ١٧٠] ''کفار تو کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے سامنے اگلے لوگوں کا ذکر ہوتا تو ہم بھی اللہ کے چیدہ بندے بن جاتے، لیکن پھر اس قرآن کے ساتھ کفر کر گئے، پس اب عن قریب جان لیں گے۔''

اللہ پاک نے فرمایا: ان کے پاس نذیر آیا، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، اس کتابِ عظیم اور قرآنِ مبین کے ساتھ جو اُن کے ساتھ اتارا گیا تو انھوں نے صرف اپنے کفر ہی میں اور زیادتی کی، یعنی اضافہ کیا، پھر اس کا بیان اس قول سے کیا کہ ﴿ اِسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی انھوں نے آیاتِ الٰہی کی پیروی کرنے سے تکبر کیا۔ ﴿ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ﴾ اور لوگوں کے ساتھ مکر کیا ان کو اللہ کی راہ سے روکنے میں۔ ﴿ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ﴾ یعنی اس کا وبال خود انھیں پر پڑے گا، کسی اور پر نہیں پڑے گا۔ ابو زکریا کوفی ایک شخص سے راوی ہیں، اس نے ان کو یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تو برے کام کا داؤ کرنے سے بچ۔ بے شک نہیں اُلٹے گا برائی کا داؤ مگر انہیں داؤ کرنے والوں پر اور اُن کے لیے اللہ کی طرف سے ایک طالب ہے۔[1] (رواه ابن أبي حاتم) امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا: تین چیزیں جس نے ان کو کیا تو اس نے نجات نہ پائی، یہاں تک کہ وہ اس پر نازل ہوں جس نے مکر کیا، یا بغاوت کی یا عہد شکنی کی اور اس کی تصدیق کتاب اللہ میں ہے: ﴿ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ﴾[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ پھر

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٨٧) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہے۔ [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٨٧)

اب وہی اللہ کی سزا کی راہ دیکھتے ہیں، اس بات پر کہ انھوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی اور اس کے حکم کی مخالفت کی اور تو ہرگز نہ پائے گا اللہ کے دستور میں کسی طرح کا تبدل اور نہ تغیر، بلکہ وہ ہر جھٹلانے والے میں اسی طرح جاری ہے۔ ﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴾ یعنی جس وقت اللہ پاک کسی قوم سے برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے کسی طرح کا رد نہیں ہے اور نہ کوئی اس کو اُن سے ہٹاتا ہے اور دوسری طرف منتقل کرتا ہے۔ واللّٰہ أعلم۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ مراد قریش ہیں کہ انھوں نے اس سے قبل یہ قسم کھائی تھی کہ اللہ پاک نبی اکرم ﷺ کو مبعوث فرمائے، جب کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ اہلِ کتاب نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تو کہا کہ اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ ان کے پاس رسول آئے اور انھوں نے ان کو جھٹلایا۔ قریش نے اللہ کی قسم کھائی کہ اگر ہمارے پاس کوئی نذیر آئے گا تو ہم از روئے دین البتہ یہود و نصاریٰ کی نسبت زیادہ ہدایت پانے والے ہوں گے۔ پھر جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا تو ان کو جھٹلایا، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی۔ امم سے مراد وہ امتیں ہیں جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی اور نذیر سے مراد نبی اور ہدایت سے مراد استقامت ہے۔ عرب یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ ان میں سے کوئی رسول ہو جس طرح کہ بنی اسرائیل میں رسول ہوئے۔ ﴿ اِحْدَى ﴾ کی تانیث اس لیے ہے کہ امت مونث ہے، جیسا کہ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: ''مِنْ إِحْدَى الْأُمَمِ عَلَى الْعُمُوْمِ'' ''بالعموم امتوں میں سے ایک امت''۔ کسی نے کہا ہے کہ زیادہ تر راہ پانے والے اس اُمت سے جس کو ﴿ اِحْدَى الْاُمَمِ ﴾ کہا جاتا ہے اس کی فضیلت کی وجہ سے، یعنی جو اُمت فضیلت میں یکتائے روزگار ہے، ہم اس سے بھی بڑھ کر ہدایت یاب ہوتے۔

﴿ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ ﴾ یعنی پھر جب ان کے پاس وہ شے آئی جس کی تمنا کی تھی، یعنی رسول اللہ ﷺ جو کہ تمام نذیروں سے اشرف اور تمام رسولوں سے زیادہ عزت والے ہیں اور وہ انھیں میں سے تھے تو اُن کے آنے نے ان کو صرف نفرت میں بڑھایا۔ یعنی ان سے نفرت کی اور بِد کے اور ان کے ماننے سے دور ہوئے اپنے تکبر اور سرکشی کی وجہ سے۔ یا ﴿ اِسْتِكْبَارًا ﴾ بدل ہے ﴿ نُفُوْرًا ﴾ سے، یا حال ہے جیسا کہ امام اخفش نے کہا ہے۔ ﴿ مَا زَادَهُمْ ﴾، ''لَمَّا'' کا جواب ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ ''لَمَّا'' حرف ہے، ظرف نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے بعد جو ﴿ مَا ﴾ ہے وہ نافیہ ہے، اس کے ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ اس کے کئی نظائر گزر چکے ہیں۔ رہی یہ بات کہ زیادت کی نسبت نذیر کی طرف ہے تو یہ مجاز ہے، اس لیے کہ نذیر زیادت میں سبب ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ ﴾ [التوبة: ١٢٥] ''ان کی گندگی کے ساتھ اور گندگی بڑھا دی۔''

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٧٣٥، ٧٣٦) [2] تفسير القرطبي (١٤/ ٣٥٨)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ﴾ یعنی انھوں نے تکبر اور مکرِ سيء پر عمل کی وجہ سے نفرت کی، یا انھوں نے مکر کیا مکرِ سیئ۔ مکر موصوف ہے اور سیئ صفت۔ موصوف کو صفت کی طرف مضاف کر دیا جس طرح کہ "مَسْجِدُ الْجَامِعِ" اور "صَلَاةُ الْأُوْلیٰ" میں ہے۔ مکر کے معنی حیلہ، دھوکا اور قبیح عمل ہیں۔ جمہور نے ﴿ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ﴾ کو بہ خفضِ ہمزہ اور اعمش اور حمزہ رحمہ اللہ نے بہ سکونِ ہمزۂ وصل میں پڑھا ہے۔ بہت سے نحویوں نے اس قراءت کو غلط ٹھہرایا ہے اور امام اعمش رحمہ اللہ کی تنزیہ کی ہے، باوجود ان کی جلالت کے اس سے کہ وہ اس کو پڑھیں، کہا کہ وہ تو سکون کے ساتھ صرف وقف کیا کرتے تھے، چنانچہ جس نے ان سے روایت کی ہے اس نے غلطی کی کہ وہ وصل میں سکون کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس قراءت کی توجیہ ممکن ہے اس طرح سے کہ جس نے اس کو پڑھا ہے تو وصل کے بجائے وقف جاری کیا ہے، اسی کی مثل اس شخص کی قراءت ہے جس نے "مَا يُشْعِرُكُمْ" کو بہ سکونِ راء پڑھا ہے۔ اور اس کی مثل ابوعمرو کی قراءت ہے: "إِلٰى بَارِئْكُمْ" بہ سکونِ ہمزہ۔ ان کے سوا اور نظائر بہت ہیں۔ ابو علی فارسی نے کہا ہے کہ یہ بنا بر اجراء وصل ہے مجرائے وقف کی۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "مَكْرًا سَيِّئًا" پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ نہیں نازل ہوتا انجام برائی کا مگر اس پر جس نے برا کیا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ يَحِيْقُ ﴾ بہ معنی "يُحِيْطُ" ہے اور "حوق" احاطہ کو کہتے ہیں۔ عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: "حَاقَ بِهِ كَذَا أَيْ: أَحَاطَ بِهِ"۔ عرب کی لغت میں ﴿ يَحِيْقُ ﴾ کے یہی معنی ظاہر ہیں، لیکن قطرب نے اس جگہ ﴿ يَحِيْقُ ﴾ کی تفسیر "يَنْزِلُ" سے کی ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یعنی پس نہیں انتظار کرتے مگر اللہ کے دستور کا جو ان میں رہا اس طرح سے کہ نازل ہوا ان پر عذاب جیسا کہ ان پر نازل ہوا۔ حرفِ فاء ﴿ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴾ میں تعلیل کے لیے ہے۔ یہ حکم جو ان پر لگایا کہ وہ عذاب کے منتظر ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اب صرف عذاب کا انتظار کر رہے ہیں، اس لیے کہ اس پر کوئی قادر نہیں کہ اللہ پاک کے دستور کو بدل دے جس کو اس نے جھٹلانے والی اُمتوں کے لیے مقرر کیا ہے کہ اپنا عذاب ان پر نازل کرتا ہے، کسی کی یہ مجال نہیں کہ اس کے بدلے میں اس کی جگہ کسی اور کو رکھ دے۔

﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس عذاب پر اللہ پاک کا دستور جاری ہو چکا ہے، کسی کی تاب نہیں کہ اس کو ان سے منتقل کر دے، یا پھیر دے کہ اس کو ان سے دور کر کے کسی اور پر رکھ دے۔ تبدیل وتحویل کے پائے جانے کی نفی دراصل ان کے وجود کی نفی کی طرف اشارہ ہے، بطریقِ برہانی ان میں سے ہر ایک کو مستقل نفی کے ساتھ خاص کرنا، ان کی انتفا کی تاکید ہے، یعنی نہ تو اللہ کا دستور تبدیل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس دستور کے تحت سزا ایک سے دوسرے کو منتقل کی جا سکتی ہے۔[2]

[1] فتح القدير (٤/٤٦٩) [2] فتح البيان (١١/٢٦٢، ٢٦٣)

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ
مِن قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ
مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ﴿٤٤﴾
وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا
مِن دَابَّةٍ وَلَٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ
أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيرًا ﴿٤٥﴾

کیا وہ زمین میں چلتے پھرتے نہیں کہ وہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے جبکہ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور اللہ (ایسا) نہیں کہ اسے کوئی چیز آسمانوں میں اور زمین میں عاجز کر دے، بلاشبہہ وہ خوب جاننے والا، بڑی قدرت والا ہے﴿44﴾ اور اگر اللہ لوگوں کو اس وجہ سے پکڑتا جو انھوں نے کمایا تو وہ اس (زمین) کی پشت پر چلنے والا کوئی جاندار نہ چھوڑتا، لیکن وہ انھیں ایک مقررہ وقت تک ڈھیل دیتا ہے، پھر جب ان کا مقررہ وقت آ جائے گا (تو وہی انھیں سزا دے گا) یقیناً اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے﴿45﴾

رسولوں کو جھٹلانے والوں کا برا انجام:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد! تو ان لوگوں سے کہہ دے جو تیری رسالت کے جھٹلانے والے ہیں جس کو تو ان کے پاس لے کر آیا ہے کہ تم ملک میں پھرو، پھر دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جنھوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ان کو اللہ نے کیسے ہلاک کر ڈالا اور منکروں کے لیے ویسا ہی ہونا ہے۔ ان کے منازل اور مکانات ان سے خالی ہو گئے اور وہ جس عیش و آرام اور ناز و نعمت میں تھے، وہ سب ان سے سلب کر لیا گیا، اس کے بعد کہ وہ لوگ کمال قوت والے اور بہت زیادہ ساز و سامان والے اور زیادہ تعداد میں تھے اور ان کے مال اور اولاد بھی بہت تھی، مگر یہ سب ان کے کچھ کام نہ آئے، نہ ان سے اللہ کا عذاب دور کر سکے جب تیرے رب کا حکم آ پہنچا، کیوں کہ اللہ پاک جب کسی شے کا آسمانوں اور زمین میں ہونا چاہتا ہے تو کوئی شے اس کو تھکاتی نہیں ہے، بے شک وہ بڑا جاننے والا ہے، سب کچھ کر سکتا ہے، یعنی اس کو ساری کائنات کا علم ہے اور وہ ساری کائنات پر قدرت رکھنے والا ہے۔

مواخذے میں دیر کیوں؟

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا﴾ یعنی اگر اللہ پاک لوگوں سے ان کے

سارے گناہوں کا مواخذہ کرتا تو سارے آسمان اور زمین والوں کو اور چوپایوں اور رزقوں کو جن کے وہ مالک ہیں، ہلاک کر ڈالتا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: قریب ہے جُعل (سیاہ آبی جانوروں میں سے ہے۔ (كذا في الصراح)۔ لیکن سنا یوں ہے کہ یہ گبریلا کیڑا ہے جو خوشبو پہنچتے ہی مر جاتا ہے) کہ عذاب کیا جائے اپنے سوراخ میں ابن آدم کے گناہ کے سبب سے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا ﴾[1] سعید بن جبیر اور سدی رحمہما اللہ نے ﴿ مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ البتہ نہ پلاتا ان کو مینہ کا پانی تو سارے دواب مر جاتے، لیکن وہ ان کو روزِ قیامت تک مہلت دیتا ہے، پھر اس دن ان سے حساب لے گا اور ہر عامل کو اس کے عمل کی پوری جزا دے گا، پس اہلِ طاعت کو تو ثواب کے ساتھ جزا دے گا اور اہلِ معصیت کو سزا کے ساتھ جزا دے گا، اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴾[2] (كذا في ابن كثير

آخر تفسير سورة الفاطر ولله الحمد والمنة)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ﴾ میں ہمزہ انکار کے لیے ہے، یا نفی کے لیے اور حرفِ واو عطف کے لیے ہے مقدر پر جو لائقِ مقام ہے اور جملہ ماقبل کی تقریر و تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ یعنی اللہ کا دستور بدلتا نہیں۔ کیا یہ لوگ سرزمینِ شام و یمن و عراق میں پھرے نہیں کہ اس عذاب کو دیکھیں جو ہم نے عاد، ثمود اور مدین پر اور ان جیسی اور قوموں پر نازل کیا، جب انھوں نے رسولوں کی تکذیب کی، کیوں کہ یہ عذاب کا نازل کرنا اللہ کے دستور سے ہے، وہ دستور جو نہ تبدیل کیا جاتا ہے نہ اس کی تحویل ہوسکتی ہے اور یہ عذاب مکذبین پر نازل کیا جاتا ہے۔

اللہ پاک نے جو کچھ ان پر نازل کیا اس کے آثار اور ان کے عذاب کی نشانیاں ان کے گھروں میں موجود اور ظاہر ہیں، حالاں کہ وہ عمروں میں ان سے زیادہ دراز، قوت میں ان سے زیادہ سخت، مالوں میں ان سے زیادہ کثرت والے اور بدنوں میں ان سے زیادہ قوی تھے۔ چنانچہ نہ تو طولِ مدت نے ان کو کچھ فائدہ دیا اور نہ ہی ان کی قوت کی شدت ان کے کچھ کام آئی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی تجارت کے سفروں میں ان کے گھروں میں گئے ہیں اور عذاب کے آثار مشاہدہ کیے ہیں۔ اس کے باوجود دشمنی اور سرکشی کے مارے ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ برابر رسول اور قرآن کی تکذیب کیے جاتے ہیں۔ غرضیکہ اس آیت سے یہ بات سمجھی گئی کہ اللہ پاک نے اگلی اُمتوں کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالا، ہلاک کر دیا۔

پھر اس مضمون کی تقریر و تاکید اس آیت سے فرمائی: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٦٧) [2] تفسير ابن كثير (٣/٧٣٦، ٧٣٧)

﴿ فِي الْأَرْضِ ﴾ یعنی اللہ وہ نہیں جس سے آسمان وزمین کی کوئی شے سبقت کر جائے اور اس سے فوت ہو جائے۔ پھر اس تقریر وتاکید کی یہ علت ذکر فرمائی کہ ﴿ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ﴾ یعنی اس لیے کہ وہ تو بڑے علم وقدرت والا ہے، کوئی شے اس سے مخفی نہیں رہتی، نہ کوئی امر اس پر مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ پھر اگر یہ وہم ہو کہ جب وہ ایسے علم اور قدرت والا ہے تو کفار کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالتا، ان کو چھوڑ کیوں رکھا ہے؟ تو اس وہم کو اس سے دور فرما دیا: ﴿ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ ﴾ یعنی اگر اللہ لوگوں سے ان گناہوں کا مواخذہ کرتا جو انھوں نے کمائے اور ان خطاؤں پر پکڑنے لگتا جو انھوں نے کی تو زمین پر کوئی دابہ دواب میں سے نہ چھوڑتا جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں، وہ کوئی ہوں۔ بنی آدم کو تو ان کے گناہوں کے سبب سے اور ان کے علاوہ دوسروں کو بنی آدم کے گناہوں کی بدقسمتی کے سبب سے۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ نہ چھوڑتا زمین کی پشت پر کوئی دابہ جو چلتا پھرتا ہے، بنی آدم اور جن میں سے۔ اول کے قائل عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمہ اللہ ہیں اور ثانی کے قائل کلبی ہیں۔

امام ابن جریج، اخفش اور حسین بن فضل رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ ﴿ دَابَّةٍ ﴾ سے مراد فقط آدمی ہیں نہ کہ ان کے علاوہ کوئی اور۔[1] کہا ہے کہ شرط اور جزاء کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ جس وقت اللہ مواخذہ کرے لوگوں سے ان کاموں کا جو انھوں نے کیے تو اُن سے وہ نعمتیں منقطع ہو جائیں جن میں سے مینہ کا پانی ہے۔ پھر جب ان سے مینہ کا پانی منقطع ہو جائے تو روئیدگی منقطع ہو جائے، پھر سارے حیوانات مر جائیں، چنانچہ یہ ایک کنایہ ہے جس سے ملزوم مراد ہے۔

﴿ عَلَىٰ ظَهْرِهَا ﴾ میں استعارہ مکنیہ ہے۔ زمین کو ﴿ دَابَّةٍ ﴾ سے تشبیہ دی جس پر انسان سوار ہوتا ہے، اس لحاظ سے کہ انسان کو زمین پر قدرت وتمکن حاصل ہے۔ پھر زمین کے لیے وہ شے ثابت کی جو مشبہ بہ، یعنی دوابّ کے لوازم سے ہے، وہ لفظ "ظَهر" ہے، یعنی پشت۔ پھر اگر کوئی کہے کہ زمین سے جس جگہ پر خلق رہتی بستی ہے، اس کو وجہ الارض اور ظہر الارض کیوں کہتے ہیں، باوجود اس کے ظہر تو وجہ کے مقابل ہے؟ تو یہ اطلاقِ ضدین کے قبیل سے ہوا ایک شے پر، یعنی ایک ہی چیز پر دو متضاد چیزوں کا اطلاق ہوا تو کہیں گے کہ یہ دو اعتبار سے درست ہے، کیوں کہ ظاہر زمین کو "ظهر الأرض" بولتے ہیں، اس لیے کہ زمین بوجھ اٹھانے والے جانور کی طرح ہے اور "وجه الأرض" اس کو اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں کا ظاہر وجہ حیوان کی طرح ہے، گو اس کے علاوہ مثل بطن کے ہے اور وہ اس میں کا باطن ہے۔ بالجملہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ اس کو زمانہ نوح علیہ السلام میں کر چکا۔ یحییٰ بن سلام نے کہا: یعنی روک دے اللہ مینہ کا پانی تو ہر شے ہلاک ہو جائے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ ﴾ یعنی لیکن اللہ ان کو روزِ قیامت تک تاخیر دیتا ہے، پھر جب آیا ان کا وعدہ تو اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے سب بندے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو خوب جانتا

[1] فتح القدير (٤/٤٦٩) [2] تفسير القرطبي (١٤/٣٦١)

ہے جو اُن میں سے ثواب کا مستحق ہے اور ان میں سے اس کو جو سزا کے لائق ہے۔ اس آیت میں مومنوں کے لیے تسلی ہے اور کافروں کو وعید ہے۔ کلمۂ ﴿ فَإِذَا ﴾ میں عامل ﴿ جَآءَ ﴾ ہے ﴿ بَصِيْرًا ﴾ عامل نہیں ہے۔[1] واللّٰه أعلم بالصواب.

الحمد للّٰه والمنة کہ اس سورت مبارکہ کی تفسیر وقت عشا دہم ماہ شعبان مکرم ۱۳۱۲ ہجری کو محلہ امیر گنج میں تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہٗ قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی قوت دے۔ کاتبِ حروف خاکسار ذوالفقار کو چار ماہ سے بخار کی کشاکشی رہی، ہشتم شوال سے لکھنا شروع کیا تھا اس کی تمامی بھی ضعف و بخار میں ہوئی۔ اللہ سبحانہٗ اپنے فضل و کرم سے مرض کو دور کرے اور اپنی مرضیات کی توفیق دے۔ آمین۔ اللهم اغفرلنا وارحمنا، واستر عوراتنا وآمن روعاتنا، ووفقنا لما تحب وترضى، وأحسن عواقبتنا في الأمور كلها، وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب الآخرة، وثبّتنا بالقول الثابت في الحياة الدنيا وفي الآخرة، اللهم ارحم صاحب الترجمان رحمة واسعة لا تغادر ذنبا، وبارك لمن هو في هذا الأمر باعث في نفسها وما لها وجاهها وجميع شيونها، وانصره على أعدائها وشانيها. آمين يا رب العالمين. وصلى الله علىٰ سيدنا ومولانا محمد شفيع المذنبين رحمة للعالمين سيد الأنبياء والمرسلين وعلىٰ آله وصحبه وأشياعه وأتباعه إلى يوم الدين ملء ما علم وزنة ما علم وعدد ما علم آمين، والحمد لله أولا وآخرا وظاهرا وباطنا، ورزقنا الله الحسنى، وأذاقنا حلاوة رضوانه الأسنىٰ، آمين.

---

[1] فتح البیان (۱۱/۲٦٤_۲٦٥)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوْرَةُ یٰسٓ

تعارف:

اس سورت مبارکہ کی بیاسی (۸۲) آیتیں ہیں۔ محلی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] ان کے سوا اور مفسرین نے تراسی (۸۳) کہا ہے۔ فتح البیان میں اس قول کو اولیٰ کہا ہے،[2] اس لیے کہ اور مفسرین اسی کے قائل ہیں۔ یہ سورت مکی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے، مگر ایک فرقے نے کہا ہے کہ آیت: ﴿ وَنَكۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَاٰثَارَهُمۡ ﴾ انصار کے حق میں قبیلۂ بنی سلمہ میں نازل ہوئی، جب انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے گھروں کو چھوڑ دیں اور رسول اللہ ﷺ کے قرب و جوار میں اٹھ آئیں۔[3] اس کا بیان آیندہ آئے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورت یٰسٓ مکے میں نازل ہوئی۔ (رواه ابن الضريس والنحاس وابن مردويه والبيهقي في الدلائل) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔[4] (رواه ابن مردويه) امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکی ہے، یا مگر قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ ۖ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴾ مدنی ہے۔[5] انتہیٰ۔ امام جمل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے نہیں دیکھا کہ مفسرین میں سے ان کے غیر نے اس اختلاف کو ذکر کیا ہو۔ انتہیٰ۔

فضائل:

1 سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک ہر شے کے لیے ایک دل ہے اور قرآن کا دل یٰسٓ ہے۔ جو شخص یٰسٓ پڑھے تو اس کی قراءت کے سبب سے اس کے لیے دس بار قرآن کی قراءت کا اجر لکھ دیا جائے گا۔[6] (أخرجه الدارمي والترمذي ومحمد بن نصر والبيهقي في الشعب، قال الترمذي: هذا حديث غريب

---

① ہمارے پاس تفسیر الجلالین (۵۷۸/۱) کے مطبوعہ نسخے میں ۸۲ کے بجائے ۸۳ آیات ہی کا ذکر ہے۔

② فتح البیان (۲٦۷/۱۱) ③ تفسیر القرطبي (۱/۱۵) ④ الدر المنثور (۳۷/۷)

⑤ ہمارے پاس تفسیر الجلالین (۵۷۸/۱) کے مطبوعہ نسخے میں اس آیت کے بجائے آیت ﴿ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّقُوۡا مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡكُمۡ وَمَا خَلۡفَكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴾ کے مدنی ہونے کا ذکر ہے۔

⑥ سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۸۸۷) سنن الدارمي (۵٤۸/۲) اس کی سند میں ''ہارون ابو محمد'' مجہول اور ''مقاتل بن سلیمان'' سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۱٦۹)

لا نعرفه إلا من حديث حميد بن عبدالرحمن وفي إسناده هارون أبو محمد وهو شيخ مجهول) انی باب میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور وہ اس کی اسناد کے ضعف کے سبب سے صحیح نہیں ہے۔ اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، وہ بھی منظور فیہ ہے، یعنی وہ بھی محلِ نظر ہے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو تو حکیم ترمذی نے اپنی کتاب "نوادر الأصول" میں روایت کیا ہے۔[1] رہی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث تو امام بزار رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود یوں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک ہر شے کا ایک دل ہے اور قرآن کا دل یٰسٓ ہے۔ پھر کہا، یعنی بزار نے "لَا نَعْلَمُ رَوَاهُ إِلَّا زَيْدُ بْنُ الْحُبَابِ عَنْ حُمَيْدٍ الْمَكِّيِّ مَوْلٰى آلِ عَلْقَمَةَ"[2]

2 حافظ ابویعلیٰ رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص یٰسٓ کو کسی رات کو پڑھے تو صبح کو اس حال میں اٹھے گا کہ اس کے لیے مغفرت کی گئی ہو گی اور جو کوئی "حم" کو پڑھے گا جس میں دخان کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ صبح کو اس حال میں اٹھے گا کہ اس کے لیے مغفرت کی گئی ہو گی۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد جید ہے۔

3 سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو کوئی کسی رات کو اللہ کی رضا کے لیے یٰسٓ پڑھے تو اس کے لیے اس رات میں مغفرت کی جائے گی۔ (أخرجه الدارمي والطبراني في الأوسط و ابن مردويه والبيهقي في الشعب) (صاحبِ فتح القدیر کے الفاظ یہ ہیں: "وأخرج الدارمي وأبو يعلىٰ والطبراني في الأوسط، وابن مردويه، والبيهقي في الشعب عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم" پھر حدیث کے الفاظ ذکر کیے ہیں۔ پھر کہا ہے: "قال ابن كثير: إسناده جيد"[4] حالاں کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے صرف ابویعلیٰ کی حدیث مذکور ذکر کر کے "إسناده جيد" کہا ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق حدیثِ مذکور علاحدہ کر کے لکھی گئی۔ واللّٰه أعلم)۔

4 جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو کوئی اللہ کی رضا کے لیے کسی رات سورت یٰسٓ کو پڑھے تو اس کے لیے مغفرت کی جائے گی۔[5] (أخرجه ابن حبان في صحيحه)

---

[1] نوادر الأصول (٦/٨٩) شعب الإيمان (٢/٤٨٠) اس کی سند میں "محمد بن عبدالرحمان جدعانی" سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٢٦٠)

[2] مسند البزار (١٦/١٩٠) اس کی سند میں "حمید مکی" مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٦٩)

[3] مسند أبي يعلىٰ (١١/٩٣) اس کی سند میں "ہشام بن زیاد" سخت ضعیف راوی ہے۔

[4] سنن الدارمي (٢/٥٤٩) المعجم الأوسط (٤/٢١) شعب الإيمان (٢/٤٨٠) فتح القدير (٤/٤٧٢) اس کی سند میں انقطاع ہے، حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٦٢٣)

[5] صحيح ابن حبان (٦/٣١٢) اس کی سند میں انقطاع ہے، حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٦٢٣)

5 سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اَلْبَقَرَةُ سَنَامُ الْقُرْآنِ وَذِرْوَتُهٗ'' یعنی سورۃ البقرہ قرآن کا کوہان اور اس کی بلندی ہے، اس کی ہر آیت کے ساتھ اسّی (۸۰) فرشتے اترے اور: ﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴾ کو عرش کے نیچے سے نکالا گیا۔ ''فَوُصِلَتْ بِهَا أَوْ فَوُصِلَتْ بِسُوْرَةِ الْبَقَرَةِ'' یعنی وہ جوڑا گیا سورۃ البقرہ سے اور یٰسٓ قرآن کا دل ہے، اس کو کوئی بھی فرد پڑھے گا اور وہ اللہ کی رضا مندی چاہتا ہوگا اور دارِ آخرت کی بھلائی چاہتا ہوگا تو اس کے لیے مغفرت کی جائے گی اور تم اس کو اپنے مردوں پر پڑھو۔[1]
(أخرجه الإمام أحمد و كذا رواه النسائي في اليوم والليلة عن محمد بن عبد الأعلیٰ عن معتمر بن سليمان به)

6 امام احمد رحمہ اللہ کی دوسری روایت بہ سندِ دیگر سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم اس کو یعنی یٰسٓ کو اپنے مُردوں پر پڑھو۔[2] (ورواه أبو داود والنسائي في اليوم والليلة وابن ماجه من حديث عبد الله ابن المبارك به إلا أن في رواية النسائي عن أبي عثمان عن معقل بن يسار رضي الله عنه) (امام احمد رحمہ اللہ نے معقل کی حدیث کے دو اسناد ذکر کیے ہیں: ایک میں تو ایک شخص مجہول ہے اور دوسرے میں ذکر کیا ہے: ''عن أبي عثمان وقال: ليس بالنهدي عن أبيه عن معقل''[3] كذا في فتح البيان)۔ اسی لیے بعض علماء رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس سورت کے خصائص سے یہ ہے کہ یہ جب بھی کسی مشکل کے وقت پڑھی جائے گی تو اللہ اس کو آسان کر دے گا۔ اور میت کے پاس اس کا پڑھنا اس لیے ہے کہ رحمت اور برکت نازل ہو اور اس کی روح کا نکلنا اس پر آسان ہو جائے۔ واللّٰه تعالیٰ أعلم۔ امام احمد رحمہ اللہ نے صفوان سے روایت کیا ہے کہ مشیخہ کہا کرتے تھے کہ جس وقت یٰسٓ میت کے نزدیک پڑھی جائے تو اللہ اس کے سبب سے اس سے تخفیف کرتا ہے۔[4]

7 امام بزار رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ البتہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ سورت یٰسٓ میری امت کے ہر انسان کے دل میں ہو۔[5] (كذا في ابن كثير)

8 امام حسان بن عطیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے سورت یٰسٓ پڑھی تو گویا اس نے قرآن دس بار پڑھا۔[6] (أخرجه سعيد بن منصور والبيهقي)

---

① مسند أحمد (٢٦/٥) سنن النسائي الكبریٰ (٢٦٥/٦) اس کی سند میں دو راوی مجہول ہیں جن کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٨٦١)

② مسند أحمد (٢٦/٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٢١) سنن النسائي الكبریٰ (٢٦٥/٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٤٨) اس کی سند میں ''ابو عثمان عن أبیہ'' دونوں مجہول راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٨٦١)

③ فتح البيان (٢٦٨/١١) . ④ مسند أحمد (١٠٥/٤)

⑤ كشف الأستار عن زوائد البزار (٨٧/٣) تفسير ابن كثير (٧٣٨،٧٣٧/٣) اس کی سند میں ''ابراہیم بن حکم'' ضعیف راوی ہے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٥٧٢)

⑥ شعب الإيمان (٤٧٩/٢) یہ روایت مرسل ہے۔

9 سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کسی نے ہر رات میں یٰسٓ پڑھنے پر مداومت کی، پھر وہ مرا تو شہید مرا۔[1] (أخرجه الطبراني وابن مردويه قال السيوطي بسند ضعيف)

10 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جو کوئی صبح کے وقت سورت یٰسٓ پڑھے تو وہ اپنے دن کا یسر، یعنی آسانی دیا جائے گا، یہاں تک کہ شام کرے اور جو کوئی اس کو اپنے رات کے شروع میں پڑھے تو وہ اپنی رات کی آسانی دیا جائے گا، یہاں تک کہ صبح کرے۔[2] (أخرجه الدارمي)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
يٰسٓ ۚ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ﴿۳﴾ عَلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ؕ﴿۴﴾ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۵﴾ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ
اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۶﴾ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ
فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۷﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

یٰسٓ ① قسم ہے قرآنِ حکیم کی ② بلاشبہ آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں ③ راہِ راست پر ہیں ④ یہ (قرآن) نہایت غالب، خوب رحم کرنے والے (اللہ) کا اُتارا ہوا ہے ⑤ تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جس کے باپ دادا نہیں ڈرائے گئے، لہٰذا وہ (دین سے) غافل ہیں ⑥ بلاشبہ ان کی اکثریت پر (اللہ کا) قول ثابت ہو گیا ہے، چناں چہ وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑦

یٰسٓ کا مفہوم:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سورۃ البقرہ کے شروع میں حروفِ مقطعہ پر کلام گزر چکا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، ضحاک، حسن اور سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ﴿ يٰسٓ ﴾ بہ معنی "يا إنسان" ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اسی طرح لغتِ حبشہ میں ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔[3] قرآنِ حکیم، یعنی قرآنِ محکم، مضبوط، پختہ اور پُرکار کہ جس کے پاس نہ باطل اس کے آگے سے آتا ہے نہ پیچھے سے۔

① المعجم الأوسط (١١٦/٧) اس کی سند میں "سعید بن موسیٰ" سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٨٤٤)

② سنن الدارمي (٥٤٩/٢) ③ تفسير الطبري (٤٨٨/٢٠) تفسير ابن كثير (٧٣٨/٣)

قرآنِ کریم رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا ثبوت:

﴿ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ یعنی قسم ہے قرآنِ محکم کی کہ بے شک تو اے محمد! البتہ رسولوں میں سے ہے، سیدھی راہ پر اور دینِ قویم اور شرعِ مستقیم پر ہے۔ ﴿ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴾ یعنی یہ راہ اور دین جس کو تو لے کر آیا ہے یہ رب العزت کی طرف سے اتارا گیا ہے، جو اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴾ [الشوریٰ: ٥٢۔ ٥٣] ''بے شک آپ راہِ راست کی راہنمائی کر رہے ہیں، اس اللہ کی راہ کی جس کی ملکیت میں آسمانوں اور زمین کی ہر چیز ہے۔ آگاہ رہو! سب کام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ ہادیِ عالم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ سے مراد عرب ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، صرف ان کا ذکر کرنا ان کے سوا اور لوگوں کی نفی نہیں کرتا جس طرح کہ بعض افراد کا ذکر عموم کی نفی نہیں کرتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے عمومِ بعثت میں جو آیات و احادیثِ متواترہ آئی ہیں، ان کا ذکر اس آیتِ کریمہ کی تفسیر کے تحت پہلے گزر چکا ہے: ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الأعراف: ١٥٨] ''آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰۤى اَكْثَرِهِمْ ﴾ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ البتہ یقیناً واجب ہوا عذاب ان کے اکثر پر اللہ تعالیٰ کے اذن سے۔ ان پر اُم الکتاب، یعنی لوحِ محفوظ میں یہ بات یقیناً واجب کی گئی کہ وہ ایمان نہ لائیں گے، لہٰذا وہ نہ اللہ پر ایمان لائیں گے نہ اس کے رسولوں کی تصدیق کریں گے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

جمہور نے ﴿ يٰسٓ ﴾ کو بہ سکونِ نون پڑھا ہے۔ امام ابن کثیر، ابوعمرو، حمزہ، حفص، قالون اور ورش رحمہم اللہ نے بہ ادغامِ نون واو میں، جو اس کے بعد ہے، پڑھا ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے بہ فتحِ نون پڑھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، ابن ابی اسحاق اور نصر بن عاصم رحمہم اللہ نے بہ کسرِ نون پڑھا ہے۔ چنانچہ فتحہ تو مبنی ہونے کی بنیاد پر ہے، یا اس بنا پر کہ فعلِ مقدر کا مفعول ہے۔ تقدیر "اُتْلُ يٰسٓ" ہے اور کسر بھی مثل جیر کے مبنی ہونے پر بنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فتح و کسر التقائے ساکنین سے بچنے کے لیے ہے۔ رہی جمہور کی قراءت کی وجہ تو وہ یہ ہے کہ یس بطور تعدید و شمار کے مسرود و مذکور ہے، اس لیے اس کے لیے کوئی اِعراب نہیں ہے۔ ہارون اعور، محمد بن سمیفع اور کلبی رحمہم اللہ نے بہ ضمِ نون پڑھا ہے مبنی ہونے کی

[1] تفسیر الطبري (٢٠/٤٩٢) تفسیر ابن کثیر (٣/٧٣٨)

بنیاد پر مثل "منذ"، "حیث" اور "قط" کے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اس بنا پر ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: هٰذِهِ يٰسٓ"۔ بہ سبب علمیت و تانیث کے غیر منصرف ہوا ہے۔ اس لفظ کے معنی میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی "يَا رَجُلُ" یا "يَا إِنْسَانُ" ہیں، یعنی اے مرد! یا اے انسان!۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يٰسٓ ﴾ پر وقف حسن ہے، اس شخص کے نزدیک جو اس کا قائل ہے کہ ﴿ يٰسٓ ﴾ سورت کا افتتاح ہے، اور جو اس کا قائل ہے کہ اس کے معنی یا رجل ہیں اس نے وقف نہیں کیا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ﴿ يٰسٓ ﴾ نبی اکرم ﷺ کے اسمائے مبارک سے ایک اسم ہے، اس کی دلیل: ﴿ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ ہے۔ اسی باب سے اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلْ يَاسِيْنَ ﴾ [الصافات: ١٣٠] "کہ الیاس پر سلام ہو۔" "أَيْ: آلِ محمد" اور اسی باب سے سید حمیری کا یہ قول ہے:

يَا نَفْسُ لَا تَمْحَضِيْ بِالنُّصْحِ جَاهِدَةً ... عَلَى الْمَوَدَّةِ إِلَّا آلَ يَاسِيْنَ[2]

"اے نفس! تو خالص نصیحت و خیر خواہی مت کر، درآں حالیکہ تو سعی و کوشش کرنے والا ہے دوستی پر مگر آلِ یاسین کی۔"

آلِ یاسین سے جو مراد ہے اس کا ذکر۔ إن شاء اللّٰه۔ سورۃ الصافات میں آئے گا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مفسرین نے کہا ہے کہ مراد یا انسان ہے، یعنی محمد ﷺ۔ ابوبکر وراق نے کہا ہے کہ اس کے معنی یا سید البشر ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں سے ایک نام ہے۔ یہ قول اشہب نے ان سے روایت کیا ہے۔ ابوعبدالرحمان سلمی نے امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے کہ اس کے معنی "یا سید" ہیں۔ کعب نے کہا ہے کہ یہ ایک قسم ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ قسم کھائی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس کے معنی "یا محمد" ہیں۔ اس میں اختلاف کیا ہے کہ ﴿ يٰسٓ ﴾ عربی ہے یا غیر عربی۔ امام سعید بن جبیر اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ حبشی ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سریانی ہے۔ عرب نے اس کے ساتھ تکلم کیا، لہٰذا وہ ان کی لغت میں سے ہوگیا۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ طی کی لغت میں ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلب کی لغت میں ہے۔[3] سورت طٰہٰ اور سورۃ البقرہ کے شروع میں وہ تقریر گزر چکی ہے، جس کو طوالت کے خوف سے یہاں نہیں دیا جا رہا۔ بہتر یہ ہے کہ یوں کہیں: "اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ"

﴿ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴾ مجرور ہے اس بنا پر کہ مقسم بہ ابتداءً ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يٰسٓ ﴾ پر معطوف ہے، اس تقدیر پر کہ وہ مجرور بہ اضمار قسم ہو۔ امام نقاش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اپنے نبیوں میں سے کسی کے

---

[1] تفسير القرطبي (٣/١٥) فتح القدير (٤٧٤/٤) [2] تفسير القرطبي (٤/١٥)

[3] تفسير القرطبي (١٥/ ٤ـ ٥) فتح القدير (٤/ ٤٧٤)

لیے اپنی کتاب میں قسم نہیں کھائی سوائے نبی کریم ﷺ کے۔ آپ ﷺ کی تعظیم اور بزرگی کے لیے قسم کھائی ہے۔[1]
حکیم کے معنی ہیں: محکم، یعنی اس میں نہ تناقض ہے نہ تضاد۔ یا قرآنِ حکیم کے یہ معنی ہیں کہ اس کا قائل حکیم ہے، یا بہ معنی ذی حکمت ہے، یا اس لیے اس کو حکیم کہا ہے کہ دلیل ناطق بہ حکمت ہے بطریقِ استعارہ، یا متصف بہ حکمت ہے اور متصف بہ حکمت بنا بر اسناد مجازی ہے۔

﴿ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ قسم کا جواب ہے، یعنی بیشک تو البتہ رسولوں سے ہے جو طریقۂ مستقیم پر بھیجے گئے ہیں۔ کفار نے جو "لَسْتَ مُرْسَلًا" کہہ کر آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کیا، تو یہ آیت ان پر رد ہے۔ چونکہ ان کا انکار بڑھا ہوا تھا، اس لیے اللہ پاک نے "إِنَّ" اور تاکید کا حرفِ لام لا کر آپ ﷺ کی رسالت کا اثبات فرمایا۔ ﴿ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ "إِنَّ" کی دوسری خبر ہے، یعنی بے شک تو سیدھی راہ پر ہے جو مطلوب کی طرف پہنچانے والی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تو ان نبیوں کے طریقے پر ہے جو تجھ سے پہلے گزر چکے ہیں۔[2] یہ بھی جائز ہے کہ بنا بر حال محلِ نصب میں ہو۔

﴿ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴾ کو نافع وابن کثیر وابوعمرو اور ابوبکر نے بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ محذوف مبتداء کی خبر ہے: "أَيْ: هُوَ تَنْزِيْلٌ"۔ یہ بھی جائز ہے کہ یٰسٓ کی خبر ہو، جبکہ اس کو سورت کا نام ٹھہرائیں۔ باقی قراء نے بہ نصب پڑھا ہے بنا بر مفعول مطلق: "أَيْ: نَزَّلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ" یعنی اتارا اس کو اللہ نے اتارنا عزیز رحیم کا۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف اتارنا ہے عزیز رحیم کا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ بے شک تو اے محمد! تنزیل ہے عزیز رحیم کا، جب کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تنزیل نصب کی قراءت پر بنا بر مدح منصوب ہے۔ اللہ پاک نے جو منزل کو پیرایۂ مصدر میں ادا فرمایا تو مبالغے کے لیے، یہاں تک کہ گویا قرآن شریف نفسِ تنزیل ہے۔ امام ابوحیوہ، ترمذی، ابوجعفر اور شیبہ نے بہ جر پڑھا ہے، اس بنا پر کہ قرآن کی صفت ہے یا اس سے بدل ہے۔[3]

﴿ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ میں حرفِ لام تنزیل سے متعلق ہو سکتا ہے، یا فعلِ مضمر سے متعلق ہے جس پر ﴿ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ دال ہے۔ "أَيْ: أَرْسَلْنٰكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا" یعنی ہم نے تجھ کو بھیجا، تاکہ ایک قوم کو ڈرائے۔ قوم سے مراد عرب وغیرہم ہیں۔ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ نافیہ ہے، یعنی ایسی قوم کہ ان کے باپ دادے ڈرائے نہیں گئے۔ یہ بھی جائز ہے کہ موصولہ یا موصوفہ ہو: "أَيْ لِتُنْذِرَ قَوْمًا الَّذِيْ أُنْذِرَ آبَاؤُهُمْ" "أَوْ لِتُنْذِرَهُمْ عَذَابًا أُنْذِرَهُ آبَاؤُهُمْ" یعنی تاکہ تو ڈرائے ایک قوم کو اس شے سے جس سے ان کے باپ دادے ڈرائے گئے، یا تاکہ تو ان کو ڈرائے اس عذاب سے جس سے ان کے آباء ڈرائے گئے۔ یا مصدریہ ہے: "أَيْ: إِنْذَارَ آبَائِهِمْ" یعنی تاکہ تو ان کو ڈرائے ان کے آباء کا ڈرانا بنا بر قولِ نافیہ، معنی یہ ہیں تاکہ تو ڈرائے اس قوم کو جن کے آباء نہیں ڈرائے

[1] فتح القدير (٤/٤٧٤) [2] معاني القرآن (٤/٢٧٧) [3] فتح القدير (٤/٤٧٥)

گئے رسول کے ساتھ جو انھیں میں سے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ مراد یہ ہو کہ فترت کی مدت دراز ہونے کی وجہ سے ان کے اقرب آباء نہیں ڈرائے گئے، ورنہ ان کے آبائے ابعد (زیادہ پہلے کے لوگ) تو یقیناً ڈرائے گئے اسماعیل علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جو اُن سے قبل گزرے ہیں۔

﴿ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ وجہ اول کی بنا برنفیِ انذار سے متعلق ہے، یعنی ان کے آباء نہیں ڈرائے گئے تو وہ اس سبب سے غافل ہیں اور وجوہِ اخیر کی بنا پر ﴿ لِتُنْذِرَ ﴾ سے متعلق ہے۔ یعنی پس وہ اس شے سے غافل ہیں جس کے ساتھ ہم نے ان کے باپ دادوں کو ڈرایا۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَهُمْ ﴾ کی ضمیر قوم کی طرف راجع ہے،[1] یعنی وہ قوم ایمان اور رشد سے غافل ہیں۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضمیر فریقین کی طرف پھرتی ہے، یعنی قوم اور ان کے آباء، مطلب یہ ہے کہ وہ سب غافل ہیں۔[2] اکثر مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ معنی نفی کی بنا پر ہیں، ﴿ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ کی اپنے ماقبل پر ترتیب کی بنا پر ظاہر نظمِ قرآنی یہی ہے۔

﴿ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ ﴾ میں حرفِ لام اللہ کی قسم کے لیے ہے، البتہ یقیناً فیصلہ اور قضائے ازلی، یا اکثر اہلِ مکہ پر عذاب، یا علی الاطلاق اکثر کفار پر، یا اکثر کفارِ عرب پر ثابت و متحقق و واجب ہوا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ کفر پر مرے اور اپنی مدتِ حیات میں کفر پر جمے رہے اس اعتبار سے ﴿ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ اپنے ماقبل پر متفرع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ پاک ان سے اس بات کو جان چکا تھا کہ جس کفر میں وہ ہیں اس پر جمے رہیں گے اور اسی پر مریں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ جو قول مذکور ہے، اس سے مراد اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۝ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [صٓ: ٨٤۔ ٨٥] ''سچ تو یہ ہے اور میں سچ ہی کہا کرتا ہوں کہ تجھ سے اور تیرے تمام ماننے والوں سے (بھی) میں جہنم کو بھر دوں گا۔'' کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت ابو جہل اور اس کے دو ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی جو مخزومی تھے۔[3] (كذا في فتح البيان)

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ
فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝۸ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا
وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝۹ وَسَوَآءٌ
عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰ اِنَّمَا
تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ
بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ۝۱۱ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا

[1] تفسير الجلالين (٥٧٩/١) [2] تفسير أبي السعود (١٥٩/٧) [3] فتح البيان (٢٦٩/١١۔٢٧٢)

8

وَاٰثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٢﴾

بے شک ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں اور وہ (ان کی) ٹھوڑیوں تک ہیں، لہٰذا وہ سر اوپر اُٹھائے ہوئے ہیں ⑧ اور ہم نے ان کے آگے ایک دیوار بنا دی اور ان کے پیچھے بھی ایک دیوار، پھر ہم نے ان (کی آنکھوں) کو ڈھانک دیا، لہٰذا وہ دیکھ نہیں سکتے ⑨ اور ان پر برابر ہے، خواہ آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑩ بس آپ تو صرف اس شخص کو ڈراتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرے اور رحمان سے بن دیکھے ڈرے، لہٰذا آپ اسے مغفرت اور باعزت اجر کی بشارت دے دیجیے ⑪ بلاشبہہ ہم ہی مردوں کو زندہ کریں گے، اور جو (اعمال) وہ آگے بھیج چکے انھیں ہم لکھ رہے ہیں اور ان کے آثار (نشاناتِ قدم) کو بھی، اور ہم نے ہر شے کو واضح کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے ⑫

بدبختوں کی حالت کا بیان:

جو اعمال آگے بھیجتے ہیں اور جو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں، یعنی جو آگے بھیج چکے وہ اعمال ہیں، اور جو پیچھے رہے وہ نشانِ اولاد اور عمارت، یا کوئی اچھی یا بری رسم ڈالی۔ انتھی۔[1]

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جن لوگوں پر بدبختی واجب ہو چکی ہے، ہم نے ان کی طرف ہدایت کے پہنچنے کی مثال اس طرح ٹھہرائی ہے جیسے وہ شخص جس کی گردن میں ایک طوق ڈالا گیا ہے، چنانچہ اس کے دونوں ہاتھ گردن کے ساتھ اور ٹھوڑی کے نیچے اکٹھے کیے گئے تو اس کا سر اونچا ہو گیا، چنانچہ وہ مُقمح ہو گیا، اسی لیے فرمایا: ﴿ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴾۔ ''مُقْمَحٌ'' اپنے سر کو اوپر اٹھانے والا ہے، جیسا کہ اُم زرع نے اپنے کلام میں کہا ہے: ''وَأَشْرَبُ فَأَتَقَمَّحُ''، یعنی میں پیتی ہوں تو سیراب ہو جاتی ہوں اور اپنا سر اٹھالیتی ہوں رچنے اور سیراب ہونے کے لیے۔ عنق میں غل کا ذکر کر کے ہاتھوں کے ذکر سے کفایت کی ہے، گو وہ دونوں بھی مراد ہیں۔ عرب لوگ ایسا کیا کرتے ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فَمَا أَدْرِيْ إِذَا يَمَّمْتُ أَرْضًا أُرِيْدُ الْخَيْرَ أَيُّهُمَا يَلِيْنِيْ
أَ الْخَيْرُ الَّذِيْ أَنَا أَبْتَغِيْهِ أَمِ الشَّرُّ الَّذِيْ لَا يَأْتَلِيْنِيْ

معنی یہ ہیں میں نہیں جانتا ہوں، جبکہ میں نے کسی زمین کا قصد کیا جس میں خیر کا ارادہ کرتا ہوں، کہ خیر و شر سے مجھے کون ملے گا، آیا خیر مجھے ملے گی جس کو میں چاہتا ہوں یا شر جو مجھے نہ ملے۔ یہاں ''أَيُّهُمَا'' کی ضمیر خیر و شر کی طرف راجع ہے، حالاں کہ شر کا ذکر پہلے نہیں ہوا ہے، لیکن کلام اس پر دال ہے۔ اس میں ذکرِ خیر کے ساتھ ذکرِ شر سے

کفایت کی ہے، اس لیے کہ کلام و سیاق اس پر دال ہے۔ اسی طرح یہ آیت ہے، جبکہ غل کے یہی معنی معروف ہیں کہ دونوں ہاتھ گردن کے ساتھ جمع کیے جائیں تو عنق (گردن) کا ذکر کر کے اسے ہاتھوں کے لیے بھی کافی سمجھا گیا۔

امام عوفی رحمہ اللہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ ﴾ [بني إسرائيل: ٢٩] ''اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ۔'' اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے ہاتھ ان کی گردنوں کی طرف بندھے ہوئے ہیں، وہ ان کو خیر کے ساتھ پھیلا نہیں سکتے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اٹھانے والے ہیں اپنے سروں کو اور ان کے ہاتھ ان کے منہ پر رکھے ہوئے ہیں چنانچہ وہ ہر خیر سے مغلول ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''عَنِ الْحَقِّ'' ﴿ وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''عَنِ الْحَقِّ فَهُمْ يَتَرَدَّدُوْنَ'' یعنی بنائی ہم نے ان کے آگے دیوار حق سے اور ان کے پیچھے دیوار حق سے، چنانچہ وہ متردد ہو رہے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گمراہیوں میں۔[1] قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَغْشَيْنٰهُمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ڈھانک دیا ہم نے ان کی آنکھوں کو حق سے۔ ﴿ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴾ چنانچہ وہ خیر سے منتفع نہیں ہوتے ہیں اور نہ اس کی طرف راہ پاتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ ''فَأَعْشَيْنٰهُمْ'' پڑھتے تھے بہ عینِ مہملہ عشا سے ماخوذ۔ عشا آنکھ کی ایک بیماری ہے۔

عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دیوار ان کے اور اسلام اور ایمان کے درمیان بنائی، لہٰذا وہ اس کی طرف نہیں پہنچتے اور یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ٩٦۔ ٩٧] ''یقیناً جن لوگوں کے حق میں آپ کے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے، وہ ایمان نہ لائیں گے، گو ان کے پاس تمام نشانیاں پہنچ جائیں جب تک کہ وہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں۔''

پھر کہا کہ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ منع کرے، وہ طاقت نہیں رکھتا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوجہل نے کہا: البتہ اگر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں تو ''لَأَفْعَلَنَّ وَلَأَفْعَلَنَّ'' یعنی تو البتہ میں ایسا کروں اور ایسا کروں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴾ کہا: پس لوگ کہتے تھے کہ یہ ہے محمد تو ابوجہل کہتا: کہاں ہے وہ، کہاں ہے وہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھتا تھا۔[2] (رواہ ابن جریر)

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: مجھے حدیث کی یزید بن زیاد نے محمد بن کعب سے، محمد نے کہا ہے کہ ابوجہل نے کہا اور لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ محمد یہ زعم کرتا ہے کہ اگر تم اس کی متابعت کرو گے تو تم بادشاہ ہو جاؤ گے، پھر جب تم

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/ ٤٩٤۔ ٤٩٥) [2] تفسیر الطبري (٢٠/ ٤٩٥۔ ٤٩٦)

مر جاؤ گے تو مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے اور تمھارے لیے اُردن کے باغوں سے بہتر باغ ہوں گے اور بے شک تم اگر اس کی مخالفت کرو گے تو تمھارے لیے قتل ہونا ہوگا، پھر تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے اور تمھارے لیے آگ ہوگی کہ تم اس سے عذاب کیے جاؤ گے۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت ان پر نکلے۔ آپ ﷺ کے ہاتھ میں مٹی کا ایک بڑا سا کاسہ تھا، یعنی اس میں مٹی بھری ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو آپ ﷺ کے پرے سے پکڑ لیا، آپ ﷺ اس مٹی کو ان کے سروں پر ڈالنے لگے اور پڑھنے لگے: ﴿ يٰسٓ ۟ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴾ یہاں تک کہ آپ ﴿ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴾ تک پہنچے اور رسول اللہ ﷺ اپنی حاجت کے لیے چلے اور ان لوگوں نے رات آپ ﷺ کے دروازے پر تکتے ہوئے بسر کی، یہاں تک کہ ان پر اس کے بعد گھر سے کوئی نکلا تو اس نے کہا: تم کو کیا ہے؟ وہ بولے کہ ہم محمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس شخص نے کہا کہ وہ تو تم پر اس طرح نکل گئے کہ تم میں سے کوئی مرد نہ رہا، مگر انھوں نے اس کے سر پر مٹی ڈالی۔ پھر وہ اپنی حاجت کے لیے چلے گئے۔ پھر وہ لوگ اپنے سروں پر سے مٹی جھاڑنے لگے۔ نبی اکرم ﷺ کو ابوجہل کی بات پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں کہتا ہوں کہ یہ بے شک ان کے لیے مجھ سے البتہ ذبح ہے اور بے شک میں البتہ ان کو پکڑوں گا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان پر مہر لگا دی ہے ساتھ گمراہی کے، چنانچہ نہ ڈرانا ان کو فائدہ دیتا ہے اور نہ وہ اس سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ اس کی نظیر سورۃ البقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے[2] اور جس طرح کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ٩٦- ٩٧] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آ جائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔'' ﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ ﴾ یعنی تیرے ڈرانے سے تو مومنین کو ہی فائدہ ہوتا ہے جو ذکر کی پیروی کرتے ہیں۔ ذکر سے مراد قرآنِ عظیم ہے۔ ﴿ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ﴾ اور وہ رحمان سے ایسی جگہ میں ڈرا کہ جہاں اس کو کوئی نہیں دیکھتا، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ جانتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اس پر مطلع ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے، اس کا عالم ہے۔

﴿ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴾ چنانچہ تو اس کو اس کے گناہوں کی معافی کی خوش خبری دے اور اجرِ کثیر، واسع، حسن اور جمیل کی خوش خبری دے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴾ [الملك: ١٢] ''بے شک جو لوگ اپنے پروردگار سے غائبانہ طور پر ڈرتے رہتے ہیں ان کے لیے بخشش ہے اور بڑا ثواب ہے۔'' پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى ﴾ یعنی ہم ہیں جو

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/٧٣٩، ٧٤٠) [2] رقم الآية (٦)

قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کے دل کو چاہتا ہے زندہ کرتا ہے، کفار میں سے جن کے دل گمراہی کے سبب مر چکے ہیں، پھر اس کے بعد حق کی طرف ان کو ہدایت کرتا ہے جس طرح کہ اللہ پاک نے دلوں کے سخت ہونے کے ذکر کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ [الحديد: ١٧] ''یقین مانو کہ اللہ ہی زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ ہم نے تو تمھارے لیے اپنی آیتیں بیان کر دیں تا کہ تم سمجھو۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ﴾ یعنی ہم وہ اعمال لکھتے ہیں جن کو وہ آگے بھیج چکے ہیں اور ان کے پیچھے آثار رہے۔ آثار میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ ہم ان کے اعمال لکھتے ہیں جن کو خود انھوں نے اپنی ذات سے کیا ہے اور ان کے آثار جن کو انھوں نے اپنے بعد چھوڑا ہے، چنانچہ اس پر بھی ان کو جزا دے گا، خیر عمل ہیں تو خیر جزا اور شر ہیں تو شر جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: جو کوئی اسلام میں کوئی اچھا طریقہ نکالے تو اس کے لیے ہوگا اجر اس کا اور اس شخص کا اجر جو اس پر عمل کرے گا، اس کے بغیر کہ ان کے اجر میں سے کچھ کم کرے۔ اور جو شخص اسلام میں کوئی برا طریقہ نکالے تو اس پر ہوگا اس کا گناہ اور اس شخص کا گناہ جو اس پر عمل کرے گا اور اس کے گناہ میں سے کچھ کم نہ ہوگا۔[1] (رواه مسلم عن جرير بن عبد الله البجلي رضی اللہ عنہ، وفيه قصة مجتابي النمار المضريين، رواه ابن أبي حاتم عن جرير بن عبد الله فذكر الحديث بطوله ثم تلا هذه الآية: ﴿ وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ﴾ وقد رواه مسلم من طريق أخرى عن جرير)

اسی طرح دوسری حدیث جو صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جس وقت ابن آدم مر گیا تو اس کا عمل منقطع ہو گیا، مگر تین چیزیں: علم کہ اس سے نفع لیا جاتا ہے، یا نیک لڑکا کہ اس کے لیے دعا کرتا ہے، یا صدقہ جاریہ اس کے بعد۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: "مَا أَوْرَثُوْا مِنَ الضَّلَالَةِ" یعنی آثار سے مراد وہ گمراہی ہے جس کے وارث بنا کر گئے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اٰثَارَهُمْ ﴾ سے مراد "مَا أَثَرُوْا" ہے، یعنی وہ طریقہ جس کو نکال گئے، پھر اس پر اس کی موت کے بعد ایک قوم نے عمل کیا، اگر وہ خیر ہے تو اس کے لیے بھی ان عمل کرنے والوں کے اجر کی طرح ہے اور جس نے اس پر عمل کیا، اس کے اجر سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ اور اگر وہ شر ہے تو اس کے لیے ان کے گناہوں کی طرح ہے، جنھوں نے اس پر عمل کیا اور جس نے اس پر عمل کیا اس کے گناہوں سے کچھ کم نہیں کرے گا۔[3] (ذكرهما ابن أبي حاتم) امام بغوی کا مختار یہ قول ہے۔[4]

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ان کے قدموں کے نشان ہیں طاعت کی طرف یا معصیت کی طرف۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَا قَدَّمُوْا ﴾ "أَعْمَالَهُمْ"، ﴿ وَ اٰثَارَهُمْ ﴾ "قَالَ: خُطَاهُمْ بِأَرْجُلِهِمْ"۔ اسی طرح حسن

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠١٧) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣١٩٠ـ ٣١٩١) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٣١)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣١٩٠) تفسير ابن كثير (٣/ ٧٤٠ـ ٧٤١) [4] تفسير البغوي (٩/٧)

اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اٰثَارَهُمْ ﴾ سے مراد "خُطَاهُمْ" یعنی ان کے قدموں کے نشان ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "لَوْ كَانَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مُغْفِلًا شَيْئًا مِنْ شَأْنِكَ يَا ابْنَ آدَمَ أَغْفَلَ مَا تَعْفِي الرِّيَاحُ مِنْ هٰذِهِ الْآثَارِ وَلٰكِنْ أَحْصَى عَلَى ابْنِ آدَمَ أَثَرَهُ وَعَمَلَهُ كُلَّهُ حَتّٰى أَحْصَى هٰذَا الْأَثَرَ فِيمَا هُوَ مِنْ طَاعَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى أَوْ مِنْ مَعْصِيَتِهِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يَكْتُبَ أَثَرَهُ فِي طَاعَةِ اللّٰهِ فَلْيَفْعَلْ"[1] یعنی اگر اللہ عزوجل اے ابن آدم! تیرے حال سے کسی شے کو بے کار چھوڑنے والا ہوتا تو ان قدموں کے نقش کو بے کار چھوڑ دیتا جن کو ہوائیں مٹا دیتی ہیں، لیکن اس نے تو ابن آدم کے قدموں کے نشانات کو گن رکھا ہے، یہاں تک کہ یہ بھی شمار کر رکھا ہے کہ کون سا قدم اللہ کی اطاعت کے لیے ہے اور کون سا اس کی معصیت کے لیے ہے، لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس کی طاقت رکھے کہ اس کا اثر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لکھا جائے تو چاہیے کہ کرے۔ اس معنی میں کئی حدیثیں وارد کی گئی ہیں:

① سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مسجد نبوی کے اردگرد زمین کے قطعات خالی ہوئے تو بنی سلمہ نے ارادہ کیا کہ وہ مسجد کے قریب منتقل ہو جائیں، چنانچہ یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ بے شک مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تم مسجد کے قریب اُٹھ آنے کا ارادہ کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: جی ہاں یا رسول اللہ! ہم نے واقعی اس کا ارادہ کیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يَا بَنِي سَلِمَةَ دِيَارَكُمْ تُكْتَبْ آثَارُكُمْ دِيَارَكُمْ تُكْتَبْ آثَارُكُمْ » یعنی اے بنی سلمہ! تم اپنے گھروں کو لازم پکڑے رہو تمھارے نقش قدم لکھے جائیں گے۔[2] (رواہ أحمد وهكذا رواہ مسلم عن جابر)

② سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بنی سلمہ مدینے کے ایک کنارے میں تھے، چنانچہ انھوں نے چاہا کہ مسجد کے قریب اٹھ آئیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ﴾ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تمھارے نقشِ قدم لکھے جاتے ہیں تو انھوں نے نقل مکانی نہیں کی۔[3] (أخرجه ابن أبي حاتم، تفرد بإخراجه الترمذي عند تفسير هذه الآية عن محمد بن الوزير به ثم قال: حسن غريب من حديث الثوري، ورواه ابن جرير من طريق الثوري وقد روى من غير طريق الثوري)۔ چنانچہ حافظ ابوبکر بزار نے طریقِ ثوری کے علاوہ دو طریق سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ایک یہ ہے: عن ابی نضرۃ عن ابی سعید رضی اللہ عنہ۔ کہا کہ بنی سلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد سے اپنے گھروں کی دوری کا شکوہ کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ﴾ پھر وہ اپنی جگہ ٹھہرے رہے۔ دوسرا طریق بھی عن ابی نضرۃ عن ابی سعید رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مثل ہے۔ اس حدیث میں غرابت ہے، اس لحاظ سے کہ اس آیت کا شانِ نزول ذکر کیا ہے، حالاں کہ پوری سورت مکی ہے۔ فاللّٰه أعلم.[4]

---

① تفسير الطبري (٤٩٩/٢٠) تفسير ابن أبي حاتم (٣١٩٠/١٠) ② صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٦٥) مسند أحمد (٣٣٢/٣)
③ سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٢٦) تفسير ابن أبي حاتم (٣١٩٠/١٠) تفسير الطبري (٤٩٨/٢٠) صحيح الجامع (١٥١٥)
④ تفسير ابن كثير (٧٤١/٣)

③ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ انصار کے گھر مسجد شریف سے دور تھے، انھوں نے ارادہ کیا کہ نقل مکانی کر کے مسجد کے قریب آجائیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ﴾ چنانچہ وہ بولے کہ ہم اپنی جگہ پر ہی ثابت رہیں گے۔[1] (رواه ابن جرير هكذا رواه وليس فيه شيء مرفوع) یہ روایت تو بہ طریقِ عکرمہ تھی۔ طبرانی کے الفاظ بہ طریقِ سعید بن جبیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ انصار کے گھر مسجد سے دور تھے تو انھوں نے ارادہ کیا کہ مسجد کی طرف اٹھ آئیں، اس پر آیتِ مذکور نازل ہوئی، چنانچہ وہ اپنے گھروں میں ثابت رہے۔[2]

④ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص مدینے میں وفات دیا گیا تو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز پڑھی اور فرمایا کہ کاش! وہ اپنی جائے پیدایش کے علاوہ کسی اور جگہ مرتا، اس پر لوگوں میں سے ایک شخص نے عرض کی: کیوں یا رسول اللہ؟! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک مرد جب اپنی غیر جائے پیدایش میں وفات دیا جاتا ہے تو اس کی جائے پیدایش سے لے کر اس کے نقشِ قدم قطع ہونے کی جگہ تک، اس کے لیے جنت میں ناپا جاتا ہے۔[3] (رواه الإمام أحمد ورواه النسائي وابن ماجه بإسنادهما)۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ثابت سے روایت کیا ہے، کہا: میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے ہمراہ چلا، چنانچہ میں جلد جلد چلا تو انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر ہم آہستہ آہستہ چلے، پھر جب ہم نماز پوری کر چکے تو سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ہمراہ چلا اور میں تیز چلا تو انھوں نے کہا: اے انس! کیا تو نے نہ جانا کہ آثار لکھے جاتے ہیں۔[4] اس قول کے اور پہلے قول کے درمیان کچھ تضاد نہیں ہے، بلکہ اس میں تو بطریقِ اولیٰ اس بات پر تنبیہ اور دلالت ہے، کیوں کہ جب یہ آثار لکھے جاتے ہیں تو ان آثار کا لکھا جانا تو اور بھی زیادہ درست ہے جن میں ان کے ساتھ خیر یا شر کی اقتداء ہے۔ واللّٰه أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْۤ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی ساری کائنات کتاب میں لکھی ہوئی ہے، لوحِ محفوظ میں مسطور و مضبوط ہے۔ اس جگہ ﴿ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ سے مراد ام الکتاب ہے۔ یہ قول امام مجاہد، قتادہ اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہم اللہ کا ہے[5] اور اسی طرح (یعنی جس طرح اس آیت میں امام سے مراد نامۂ اعمال ہے، اسی طرح یہاں بھی کتابِ اعمال مراد ہے، یہ دوسرا قول ہوا) اس آیت میں ہے: ﴿ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ ﴾ [الإسراء: ۷۱] ''جس دن ہم ہر جماعت کو اس کے پیشوا سمیت بلائیں گے۔'' یعنی امام سے مراد ان کی کتابِ اعمال ہے

① تفسير الطبري (۲۰/۴۹۷، ۴۹۸)
② المعجم الكبير (۱۲/۸) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني عن شيخه عبدالله بن محمد بن سعيد بن أبي مريم وهو ضعيف" مجمع الزوائد (۷/۲۱۸)
③ مسند أحمد (۲/۱۷۷) سنن النسائي، رقم الحديث (۱۸۳۲) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۶۱۴) صحيح الجامع (۱۶۱۶)
④ تفسير الطبري (۲۰/۴۹۸) ⑤ تفسير الطبري (۲۰/۴۹۹)

جو ان پر گواہی دینے والی ہے، اس خیر وشکر کی جو انھوں نے کیا ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ ﴾ [الزمر: ٦٩] ''اور نامۂ اعمال حاضر کیے جائیں گے، نبیوں اور گواہوں کو لایا جائے گا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ [الکہف: ٤٩] ''اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیے جائیں گے پس تو دیکھے گا کہ گناہ گار اس کی تحریر سے خوفزدہ ہو رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے: ہائے ہماری خرابی! یہ کیسی کتاب ہے جس نے کوئی چھوٹا بڑا عمل بغیر گھیرے کے باقی ہی نہیں چھوڑا اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا سب موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم وستم نہ کرے گا۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

جملہ ﴿ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا ﴾ ماقبل کی تقریر ہے، کیوں کہ ماقبل کا مضمون یہی ہے کہ ان کے اکثر پر قضائے ازلی ثابت ہو چکی ہے، چنانچہ وہ ایمان نہ لائیں گے، اپنے کفر پر جمے رہیں گے۔ اس مضمون کی تقریر وتثبیت جملہ ﴿ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا ﴾ سے فرمائی۔ ان کے حال کی مثال ان لوگوں کے حال سے دی جن کی گردنوں میں طوق ڈالے گئے ہیں اور وہ طوق ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں اور وہ نہ ادھر ادھر دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی گردن کو موڑ سکتے ہیں۔

﴿ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴾ کے یہی معنی ہیں کہ وہ اپنے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور اپنی نگاہوں کو پست کیے ہوئے ہیں۔ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ''مُقْمَحٌ'' وہ ہے جو اپنا سر اٹھانے کے بعد اپنی نگاہ کو پست کرنے والا ہے۔ ''إِقْمَاحٌ'' کے معنی ہیں سر کا اُٹھانا اور نگاہ کا پست کرنا۔ جس وقت اونٹ اپنا سر اوپر اٹھا لیتا ہے اور پانی نہیں پیتا تو عرب محاورے میں بولتے ہیں: ''أَقْمَحَ الْبَعِيْرُ وَقَمَحَ''. امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ جبکہ اُن کے ہاتھ ان کی گردنوں کے ساتھ مغلول ومحبوس ہوئے تو اُن کے طوق اُن کی ٹھوڑیوں تک اٹھا لیے گئے اور ان کے سر اوپر کی طرف اٹھ گئے، چنانچہ وہ ان طوقوں کے اٹھانے سے مرفوع الرؤس ہو گئے، یعنی طوقوں نے ان کے سروں کو اوپر اٹھا دیا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُّقْمَحُوْنَ ﴾ کے معنی ''مَغْلُوْلُوْنَ'' ہیں،[2] لیکن قولِ اول زیادہ مناسب ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اونٹ جب اپنا سر حوض سے اٹھا لیتا ہے اور پانی نہیں پیتا تو کہتے ہیں: ''قَمَحَ الْبَعِيْرُ''. امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ سے دوسرا قول یہ مروی ہے کہ یہ ایک مثال ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہدایت سے باز رہنے کے لیے بیان کیا ہے مغلول کے باز رہنے کی طرح، جیسے بولتے ہیں کہ فلاں حمار ہے، یعنی ہدایت کو نہیں

[1] تفسیر ابن کثیر (٧٣٩/٣۔٧٤٢)   [2] تفسیر الطبري (٤٩٤/٢٠)

دیکھتا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک ضرب المثل ہے، یعنی ہم نے ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکا ہے، یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ ﴾ [بني إسرائيل: ٢٩] ''اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا مت رکھ۔'' امام ضحاک رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] امام بیضاوی رحمہ اللہ بھی تمثیل کے قائل ہیں۔[2] امام محلی رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق اس طرح ڈالے کہ ان کے ہاتھ بھی ان طوقوں کے ساتھ ملائے گئے ہیں، کیوں کہ طوق ہاتھوں کو گردن کے ساتھ اکٹھا کرتے ہیں، چنانچہ وہ ہاتھ اذقان کی طرف جمع کیے گئے۔

''أذقان'' ''ذقن'' کی جمع ہے۔ ''ذقن'' وہ جگہ ہے جہاں دونوں جبڑے جمع ہوتے ہیں۔ ﴿ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴾ چنانچہ وہ اٹھانے والے ہیں اپنے سروں کو، ان کو نیچے کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہ ایک تمثیل ہے، مراد یہ ہے کہ کفار ایمان کی طرف کان نہیں دھرتے اور نہ اس کے لیے اپنے سر جھکاتے ہیں۔[3] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ﴿ فَهِيَ ﴾ کی ضمیر اغلال کی طرف راجع کی ہے[4] اور امام محلی رحمہ اللہ نے ''أَيْدِي'' کی طرف راجع کی ہے،[5] اگرچہ عبارت میں ''أَيْدِي'' کا ذکر نہیں ہوا، ''غِل'' کا لفظ اس پر دال ہے، کیوں کہ غل کے معنی ہاتھوں کو گردن کے ساتھ جمع کرنا ہے، چنانچہ اس کا بیان آیندہ بھی آئے گا۔ ان اقوال سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوا کہ یہ آیت تمثیل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت اپنی حقیقت پر ہے اس حال کی طرف اشارہ ہے جو قیامت کے دن دوزخ میں کئی قوموں کے ساتھ کیا جائے گا، ان کی گردنوں میں طوقیں اور زنجیریں ڈالی جائیں گی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ﴾ [المؤمن: ٧١] ''جبکہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور زنجیریں ہوں گی۔'' اس واقع کی خبر صیغۂ ماضی میں دی ہے، جس کا مطلب ہے کہ یہ حقیقتاً وقوع پذیر ہوگا۔ اس قول کو امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[6]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یوں پڑھا ہے: ''إِنَّا جَعَلْنَا فِيْ أَيْمَانِهِمْ أَغْلَالاً'' امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ ایمان سے مراد ایدی (ہاتھ) ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراءت تفسیر ہے، جو شے مصحف کے مخالف ہے اس کے ساتھ قراء ت نہیں کی جاتی ہے، کہا کہ جماعت کی قراءت کی بنا پر عبارت میں حذف ہے، یعنی ''إِنَّا جَعَلْنَا فِيْ أَعْنَاقِهِمْ وَفِيْ أَيْدِيْهِمْ أَغْلَالاً فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَان'' پس لفظ ''هِيَ'' کنایہ ہے ''أَيْدِيْ'' سے نہ کہ ''أعناق'' سے، یعنی ''هِيَ'' کی ضمیر ''أَيْدِي'' کی طرف راجع ہے۔ ''أَعْنَاق'' کی طرف راجع نہیں ہے۔ عرب لوگ ایسا حذف کیا کرتے ہیں، اس کی نظیر یہ آیت ہے: ﴿ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ ﴾ [النحل: ٨١] ''أَيْ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْبَرْدَ'' کیونکہ جو شے گرمی سے بچاتی ہے تو وہ سردی سے بھی بچاتی ہے، اس لیے کہ طوق جبکہ گردن میں ہو تو ضروری ہے کہ ہاتھ میں بھی ہو۔ خصوصاً اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ ﴾ تو

---

(1) فتح القدير (٤/٤٧٥۔٤٧٦) (2) تفيسر البيضاوي (٤/٤٢٦) (3) تفسير الجلالين (١/٥٧٩)
(4) تفسير البيضاوي (٤/٤٢٦) (5) تفسير الجلالين (١/٥٧٩) (6) تفسير القرطبي (١٥/٩)

معلوم ہوا کہ اس سے مراد ہاتھ ہیں۔①

﴿فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ﴾ یعنی پس وہ اٹھانے والے ہیں اپنے سروں کو، جھکا نہیں سکتے، اس لیے کہ جس شخص کے دونوں ہاتھ ٹھوڑی تک مغلول ہوئے تو اس کا سر اونچا ہو گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے یوں پڑھا ہے: "إِنَّا جَعَلْنَا فِيْ أَيْدِيْهِمْ أَغْلَالًا" اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے یوں پڑھا ہے: "إِنَّا جَعَلْنَا فِيْ أَيْمَانِهِمْ أَغْلَالًا" جس طرح کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پہلے مذکور ہو چکا ہے۔② سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ "اَلْأَغْلَالُ مَا بَيْنَ الصَّدْرِ إِلَى الذَّقْنِ فَهُمْ مُقْمَحُوْنَ كَمَا تَقْمَحُ الدَّابَّةُ بِاللِّجَامِ"③ "وہ طوق سینے سے ٹھوڑی تک پہنچے ہوئے ہیں تو اس وجہ سے وہ اپنے سروں کو اٹھائے ہوئے ہیں جس طرح چار پایہ لگام کی وجہ سے سر اٹھاتا ہے۔"

پھر اللہ پاک نے دوسری تمثیل بیان فرمائی: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا﴾ یعنی ہم نے ان کو ایمان سے روکا ہے رکاوٹوں کے ساتھ، چنانچہ وہ کفر سے ایمان کی طرف نکل نہیں سکتے اس شخص کی طرح جس کے آگے اور پیچھے دیواریں بنا دی گئی ہیں۔ "سُد" بہ ضم وفتح سین دو لغت ہیں۔ ﴿فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ یہاں مضاف حذف ہے۔ "غَطَّيْنَا أَبْصَارَهُمْ" یعنی ہم نے ان کی آنکھوں کو ڈھانک دیا ہے، چنانچہ وہ اس کے سبب سے کسی شے کو دیکھ نہیں سکتے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "فَأَلْبَسْنَا أَبْصَارَهُمْ غِشَاوَةً أَيْ عَمًى، فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ سَبِيْلَ الْهُدَى" یعنی ہم نے ان کی آنکھوں پر اندھا پن پہنا دیا ہے، چنانچہ وہ ہدایت کا راستہ نہیں دیکھتے۔ اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ ہدایت کو نہیں دیکھتے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھتے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر مشورہ کیا تھا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلی "سد" سے مراد دنیا اور دوسری سے آخرت ہے۔④

﴿فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ بعث سے اندھے ہو گئے اور دنیا میں شریعت کو قبول کرنے سے نابینا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ [حٰم السجدة: ٢٥] "اور ہم نے ان کے کچھ ہم نشین مقرر کر رکھے تھے جنھوں نے ان کے اگلے پچھلے اعمال ان کی نگاہوں میں خوبصورت بنا رکھے تھے۔" یعنی زینت دی ان کے واسطے دنیا اور بلایا ان کو آخرت کی تکذیب کی طرف۔ اسی بنا پر یوں کہا گیا: ﴿بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا﴾ یعنی دنیا کے ساتھ غرور ﴿وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا﴾ اور

① تفسیر القرطبي (١٥/٧۔ ٨)
② تفسیر الطبري (٢٠/٤٩٣) فتح القدیر (٤/٤٧٦)
③ تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣١٨٩)
④ فتح القدیر (٤/٤٧٦، ٥٧٧)

آخرت کی تکذیب۔ کسی نے کہا ہے کہ ”مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ“ سے مراد آخرت ہے اور ”مَا خَلْفَهُمْ“ سے دنیا۔

جمہور نے ”أَغْشَيْنَا“ کو بہ غینِ معجمہ پڑھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عمر بن عبدالعزیز، حسن، یحییٰ بن یعمر، ابو رجاء اور عکرمہ رحمہم اللہ نے بعینِ مہملہ پڑھا ہے ماخوذ ''عشا'' سے۔ ''عشا'' ضعفِ بصر کو کہتے ہیں، اسی معنی سے یہ آیت ہے: ﴿ وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴾[1] [الزخرف: ٣٦] ''اور جو شخص رحمان کی یاد سے غفلت کرے، ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں، وہی اس کا ساتھی رہتا ہے۔'' امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک اور تمثیل ہے ان لوگوں کے ساتھ جن کو دو دیواروں نے گھیر لیا، چنانچہ ان کی آنکھوں کو ایسے ڈھانک دیا کہ وہ اپنے آگے اور پیچھے کو نہیں دیکھتے۔ تمثیل اس بات میں ہے کہ کفار مطمورۂ جہالت میں محبوس ہیں (یعنی جہالت کے تہہ خانہ میں قید ہیں) آیات و دلائل میں نظر کرنے اور غور و فکر کرنے سے روکے گئے ہیں۔ انتہیٰ۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ وہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرتے تھے، مگر آپ کو دیکھتے نہ تھے۔ ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ قریش نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر جمع ہوئے، آپ کے نکلنے کا انتظار کرتے تھے، تاکہ آپ کو ایذاء پہنچائیں، چنانچہ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گزری تو جبریل علیہ السلام سورت یٰسٓ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر نکلنے کا کہا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی مٹی لی اور نکلے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھتے تھے اور ان کے سروں پر مٹی بُربُراتے (اڑاتے) تھے، چنانچہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم گزر گئے، پھر اُن میں سے جو بھی اپنے سر کو چھوتا تھا تو مٹی کو پاتا تھا۔ ان میں سے کوئی آیا اور کہنے لگا کہ تم کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ وہ بولے کہ ہم محمد کا انتظار کر رہے ہیں تو اس نے کہا: البتہ میں نے تو اس کو واقعی مسجد کے اندر دیکھا ہے، کہا کہ تم یہاں سے اٹھ جاؤ اس نے واقعی تم پر جادو کر دیا۔[3]

پہلے تو اللہ پاک نے مجموعی طور پر تمثیل کے طور پر بیان کیا، اس کے بعد ان کا حال بطور توبیخ بیان کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ ﴾ یعنی تیرا ان کو ڈرانا اور نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں۔ جملہ: ﴿ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ مستانفہ ہے، ماقبل میں جو برابری ہے اس کا بیان کرتا ہے، یا حالِ موکد ہے، یا اس سے بدل ہے۔ اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں پڑھ رہے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونچی آواز سے پڑھا، یہاں تک کہ قریش کے کچھ لوگوں کو اس سے تکلیف ہوئی اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑنے کے لیے کھڑے ہوئے، اچانک ان کے ہاتھ ان کی گردنوں سے چمٹ گئے اور وہ اندھے

---

[1] فتح القدير (٤/٤٧٧) [2] تفسير البيضاوي (٤/٤٢٧) [3] الدر المنثور (٧/٤٤) فتح القدير (٤/٤٧٨)

تھے، انھیں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پھر وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی: اے محمد! ہم تجھ کو اللہ کی اور رحم کی قسم دیتے ہیں، کہا کہ قریش میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جس سے نبی اکرم ﷺ کی قرابت نہ ہو، چنانچہ آپ ﷺ نے دعا کی، یہاں تک کہ ان سے وہ حالت جاتی رہی، اس پر ﴿ يٰسٓ ... إلىٰ قوله... لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ نازل ہوئی۔ کہا کہ پھر اس گروہ میں سے کوئی ایمان نہ لایا۔[1] شانِ نزول میں اور بہت سی روایتیں ہیں۔ یہ روایت ان سب سے صحت کے لحاظ سے احسن و اقرب ہے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے یہ آیت غیلان قدری پر پڑھی تو وہ بولا کہ گویا میں نے اس کو پڑھا ہی نہیں، میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں قدر کے بارے میں اپنے قول سے توبہ کرتا ہوں تو انھوں نے فرمایا: الٰہی! اگر اس نے سچ کہا تو تُو اس پر رجوع ہو، یعنی اس کی توبہ قبول کر لے اور اگر وہ جھوٹ بول رہا ہے تو تُو اس پر اس شخص کو مسلط کر جو اس پر رحم نہ کرے۔ پھر ہشام بن عبدالملک نے اس کو ان کے پاس سے پکڑ لیا، پھر اس کے دونوں ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے اور دمشق کے دروازے پر اس کو سولی چڑھا دیا۔[2] امام زجاج رحمہ اللہ نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ جس شخص کو اللہ گمراہ کرے تو اس کو ڈرانا نفع نہ دے گا۔[3] ڈرانا تو اس کو نفع دے گا جس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴾

﴿ بِالْغَيْبِ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال فاعل سے، یا مفعول سے اور حرفِ ''فاء'' بشارت کی ترتیب یا بشارت کے امر کے لیے ہے جو اتباعِ ذکر اور خشیت پر ہے۔ یعنی تُو تو اسی کو ڈرائے جس نے قرآن کی پیروی کی اور رحمان سے ڈرا، حالاں کہ وہ رحمان سے غائب ہے یا دنیا میں رحمان اس سے غائب ہے، چنانچہ تو اس شخص کو، جس نے قرآن کی پیروی کی، خوش خبری دے ایک عظیم مغفرت کی اور اجرِ حسن، یعنی جنت کی۔

پھر اللہ پاک نے مُردوں کے زندہ کرنے کی خبر دی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى ﴾ یعنی بے شک ہم ان کو موت کے بعد زندہ اٹھا کھڑا کریں گے۔ یہ ایک عظیم حالت کا بیان ہے جو اجمالی طور پر ڈرانے اور خوش خبری دینے پر مشتمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ڈرانا اور خوش خبری دینا تو دنیا میں ہے، اس کا ثمرہ قیامت کے دن معلوم ہو گا۔ امام حسن اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا: یعنی ہم ان کو جہالت کے بعد ایمان کے ساتھ زندہ کرتے ہیں،[4] مطلب یہ ہے کہ نبی کا کام تو جہالت کے بعد ان کو خوش خبری دینا اور ڈرانا ہے۔ ایمان کے ساتھ ان کے دلوں کا زندہ کرنا اللہ ہی کا کام ہے۔ وہی جس کو چاہے ہدایت کرے، اس میں کسی کا اختیار نہیں ہے۔ قولِ اول زیادہ مناسب ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کے آثار لکھنے کی وعید سنائی، ارشاد فرمایا: ﴿ وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ﴾ یعنی ہم

[1] الدر المنثور (٤٢/٧، ٤٣) [2] تفسیر القرطبي (١١/١٥)
[3] معاني القرآن (٢٨٠/٤) [4] تفسیر القرطبي (١١/١٥)

فرشتوں کے صحیفوں میں ان کے چھوٹے بڑے اعمال لکھتے ہیں جن کو وہ آگے بھیج چکے ہیں اور وہ حسنات جو اپنے بعد چھوڑ گئے ہیں جن کا نفع موت کے بعد منقطع نہیں ہوتا، مثلاً وہ شخص جو اچھا طریقہ نکال گیا ہے، جیسے علم جس کو سکھا گیا، یا کوئی کتاب تصنیف کر گیا، یا کوئی وقف کر گیا ہے، یا مسجد یا سرائے یا پُل یا اس جیسی کوئی چیز عام لوگوں کے فائدے کے لیے بنا گیا۔ یا وہ سیئات اپنے پیچھے چھوڑ گیا جو اپنے فاعل کے بعد باقی رہتے ہیں، مثلاً وہ شخص جو کوئی برا طریقہ نکال گیا، جیسے کوئی وظیفہ یا ٹیکس جو ظالموں نے مسلمانوں پر مقرر کر دیا، یا کوئی سکہ نکالا جس میں ان کا نقصان ہے، یا کوئی ایسی شے ایجاد کر دے جس میں اللہ کے ذکر سے روکنا ہے، مثلاً: گانے بجانے اور لہو ولعب کے آلات یا اس جیسی اور چیزیں۔

امام مجاہد اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کی نظیر یہ آیت ہے: ﴿ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ﴾ [الانفطار: ٥] ”(اس وقت) ہر شخص اپنے آگے بھیجے ہوئے اور پیچھے چھوڑے ہوئے (یعنی اگلے پچھلے اعمال) کو معلوم کرے گا۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ﴾ [القيامة: ١٣] ”آج انسان کو اس کے آگے بھیجے ہوئے اور پیچھے چھوڑے ہوئے سے آگاہ کیا جائے گا۔“ کسی نے کہا ہے کہ اس آیت سے مراد آثار ہیں ان لوگوں کے جو مساجد کی طرف چلنے والے ہیں۔ صحابہ و تابعین میں سے ایک جماعت اس کی قائل ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کچھ اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے، یہ قول ان سب سے زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ اس کا نزول اسی میں ہوا ہے،[1] چنانچہ اس بارے میں احادیث پہلے گزر چکی ہیں۔ اس کا یوں جواب دیا ہے کہ اعتبار آیت کی عمومیت کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصیت سببِ نزول کا۔

آیت کا عموم اس بات کا مقتضی ہے کہ سارے آثار خیر و شر لکھے جائیں، اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْۤ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی ہم نے ہر شے کا شمار ﴿ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ میں کر رکھا ہے، یعنی بندوں کے اعمال ہوں یا اور کوئی شے ہو، سب کو شمار کر رکھا ہے۔ ﴿ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی ایسی کتاب کہ جس کا اقتداء کیا جاتا ہے اور وہ ہر شے کو واضح کرنے والی ہے۔ امام مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔[2] ایک فرقے نے کہا ہے کہ اس سے مراد اعمال کے صحیفے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ اعمال کا لکھا جانا تو احیاء، یعنی زندہ ہونے سے بھی پہلے ہے، پھر اس کو ذکر بعد میں کیوں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کتابت امرِ احیاء کی معظم ہے، کیوں کہ اگر احیاء حساب کے لیے نہ ہو تو کچھ عظیم نہیں ہے اور اگر احیاء و اعادہ (دوبارہ زندہ ہونا) نہ ہو تو فی نفسہ کتابت کی کچھ اصلیت نہ رہے۔ معتبر احیا ہی ہے اور کتابت اس کے امر کی موکد و معظم ہے، اس لیے احیاء کو کتابت سے پہلے رکھا ہے۔ (كذا قاله الكرخي)۔ جمہور نے ﴿ نَكْتُبُ ﴾ بہ صیغۂ معروف متکلم پڑھا ہے اور زر اور مسروق رحمہما اللہ

[1] تفسیر القرطبي (١٥/١١۔ ١٢) [2] تفسیر القرطبي (١٥/١٣)

نے بہ صیغۂ مجہول، یعنی "یُکْتَبُ"، اور جمہور نے ﴿ کُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ ﴾ بہ نصب پڑھا ہے بنا بر اشتغال اور ابو السماک نے بہ رفع بنا بر ابتداء پڑھا ہے۔ (کذا في فتح البیان)[1]

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾

اور آپ ان کے لیے بستی والوں کی مثال بیان کیجیے جب ان کے پاس (اللہ کے) بھیجے ہوئے آئے ⑬ جب ہم نے ان کی طرف دو (رسول) بھیجے تو انھوں نے انھیں جھٹلایا، پھر ہم نے (انھیں) تیسرے کے ساتھ تقویت دی، تب انھوں نے کہا: بلاشبہ ہم تمھاری طرف بھیجے گئے (رسول) ہیں ⑭ وہ کہنے لگے: تم ہم جیسے بشر ہی تو ہو اور رحمان نے (تم پر) کوئی چیز (بھی تو) نازل نہیں کی، تم تو نرا جھوٹ بولتے ہو ⑮ انھوں نے کہا: ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم یقیناً تمھاری ہی طرف بھیجے گئے ہیں ⑯ اور ہمارے ذمے تو صرف کھول کر پہنچا دینا ہے ⑰

اصحاب القریہ کی پیغمبروں سے بدسلوکی:

یہ بستی انطاکیہ شہر تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے دو یار وہاں پہنچے، شہر والوں نے ٹال دیا، پھر تیسرے یار پہنچے، یہ تیسرے بڑے تھے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! تو اپنی قوم کو جنھوں نے تجھے جھٹلایا، اس گاؤں والوں کی ایک کہاوت بیان کر، جب کہ اس میں اللہ کے بھیجے ہوئے، یعنی رسول آئے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، کعب احبار اور وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے جو کچھ پہنچا ہے، اس میں اس طرح ہے کہ یہ قریہ شہر انطاکیہ ہے، اس میں ایک بادشاہ تھا، اس کو انطیخس بن انطیخس کہتے تھے، وہ بتوں کو پوجا کرتا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف تین رسول بھیجے جو صادق و صدوق و شلوم تھے۔ اس نے ان کو جھٹلایا۔[2] اسی طرح بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ،

① فتح القدير (٤/٤٧٧) فتح البيان (١١/٢٧٢۔٢٧٦) ② تفسير الطبري (٢٠/٥٠٠)

عکرمہ، قتادہ اور زہری رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے کہ وہ انطاکیہ ہے۔[1] بعض ائمہ نے اس کے انطاکیہ ہونے کو مشکل شمار کیا ہے، اس کی وجہ کو ہم قصہ تمام ہونے کے بعد ذکر کریں گے۔ إن شاء اللہ تعالیٰ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ ﴾ یعنی جب بھیجے ہم نے ان کی طرف دو تو انھوں نے جلدی سے ان کی تکذیب کی، یعنی جھٹ پٹ ان کو جھٹلا دیا، پھر ہم نے ان کو تیسرے رسول کے ساتھ قوت دی۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے عن وہب بن سلیمان عن شعیب الجبائی روایت کیا ہے کہ پہلے دو رسولوں کا نام شمعون اور یوحنا تھا اور تیسرے کا بولص اور قریہ انطاکیہ ہے۔ ﴿ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴾ یعنی تب تینوں نے ان گاؤں والوں سے کہا کہ بے شک ہم تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے آئے ہیں، جس رب نے تم کو پیدا کیا ہے، وہ تم کو صرف اپنی عبادت کا امر فرماتا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ (قالہ أبو العالیة) قتادہ بن دعامہ نے زعم کیا ہے کہ یہ تینوں انطاکیہ والوں کی طرف مسیح علیہ السلام کے رسول تھے۔[2]

کیا بشر رسول نہیں ہو سکتے؟

﴿ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ یعنی وہ بولے: پھر تمھاری طرف کیسے وحی کی گئی، حالاں کہ تم بشر ہو اور ہم بشر ہیں، پھر تمھاری طرح ہماری طرف کیوں وحی نہ کی گئی، اگر تم رسول ہوتے تو البتہ فرشتے ہوتے۔ جھٹلانے والی اُمتوں میں سے بہت سی اُمتوں کا یہ ایک شبہہ ہے، چنانچہ اللہ پاک نے ان کی طرف سے یہ خبر دی ہے: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ﴾ [التغابن: ٦] ''یہ اس لیے کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے تو انھوں نے کہہ دیا کہ کیا انسان ہماری راہنمائی کرے گا۔'' یعنی بشر کے رسول ہونے پر انھوں نے تعجب کیا اور اس کے منکر ہوئے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [إبراهيم: ١٠] ''انھوں نے کہا کہ تم تو ہم جیسے ہی انسان ہو تم چاہتے ہو کہ ہمیں ان خداؤں کی عبادت سے روک دو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے۔ اچھا تم ہمارے سامنے کوئی کھلی دلیل پیش کرو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴾ [المومنون: ٣٤] ''اگر تم نے اپنے ہی جیسے انسان کی تابعداری کر لی تو بے شک تم سخت خسارے والے ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٤] ''لوگوں کے پاس ہدایت پہنچ چکنے کے بعد ایمان سے روکنے والی صرف یہی چیز رہی کہ انھوں نے کہا: کیا اللہ نے ایک انسان کو ہی رسول بنا کر بھیجا؟''

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/٥٠٠) تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣١٩١)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣١٩٢، ٣١٩١)

اسی لیے ان کفار نے یوں کہا کہ تم تو یہی ہو ہم جیسے بشر اور رحمان نے کچھ نہیں اتارا، تم تو صرف جھوٹ ہی کہتے ہو۔ تینوں رسولوں نے ان کو یہ جواب دیا کہ اللہ جانتا ہے کہ بے شک ہم اس کے بھیجے ہوئے تمھاری طرف آئے ہیں، ہم اگر اس پر جھوٹ باندھنے والے ہوتے تو وہ ہم سے ضرور سخت انتقام لیتا، لیکن وہ تو ہمیں تم پر ضرور عزت اور نصرت دے گا اور تمھیں معلوم ہوجائے گا کہ عاقبت کا گھر کس کا ہوگا۔ جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [العنکبوت: ۵۲] ''کہہ دیجیے کہ مجھ میں اور تم میں اللہ تعالیٰ کا گواہ ہونا کافی ہے وہ آسمان و زمین کی ہر چیز کا عالم ہے، جو لوگ باطل کے ماننے والے اور اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے والے ہیں وہ زبردست نقصان اور گھاٹے میں ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ یعنی ہمارے ذمے تو یہی ہے کہ جو رسالت دے کر ہم تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں، اس کو تمھیں پہنچا دیں، پھر جب تم اطاعت کروگے تو دنیا اور آخرت میں تمھارے لیے سعادت و بہرہ مندی ہوگی اور اگر تم نہ مانو گے تو اس کے بعد عن قریب تم جان لو گے، یعنی اس کی کیا کچھ سزا تمھیں ملے گی۔ واللّٰہ أعلم۔[1]

فتح البیان کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ﴾ کی نظیر پر سورۃ البقرہ اور سورۃ النمل میں کلام گزر چکا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ بیان کر ان کے لیے مثال۔ یا اپنے نفس کے لیے اصحابِ قریہ کی مثال بیان کر، یعنی تو ان کی مثال اپنے نفس کے نزدیک اصحابِ قریہ کے ساتھ دے۔ پہلے قول کی بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ ﴿ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ اور فرمایا: ﴿ لِتُنْذِرَ قَوْمًا ﴾ تو فرمایا کہ تو ان سے کہہ دے کہ میں رسولوں میں سے کوئی نیا نہیں ہوں، کیوں کہ مجھ سے ذرا پہلے اصحابِ قریہ کے پاس رسول آئے اور ان کو اس شے کے ساتھ ڈرایا جس کے ساتھ میں نے تم کو ڈرایا اور توحید کا ذکر کیا اور قیامت کا خوف دلایا اور آخرت کے گھر کی نعمتوں کی خوش خبری سنائی۔

دوسرے قول کی بنیاد پر مطلب یہ ہوگا کہ جب یہ فرمایا کہ ڈرانا اس شخص کو فائدہ نہ دے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کیا اور اس پر لکھ چکا کہ وہ ایمان نہ لائے گا تو نبی اکرم ﷺ سے فرمایا کہ تو اپنے نفس کے لیے اور اپنی قوم کے لیے ایک مثل بیان کر، یعنی ان کو اپنی مثال دے اصحابِ قریہ کے ساتھ اس لحاظ سے کہ ان کے پاس تین رسول آئے اور وہ ایمان نہ لائے اور ان کے رسولوں نے ایذاء پر صبر کیا اور تُو تو اُن کی طرف اکیلا ہی آیا ہے اور تیری قوم ان تینوں کی

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/۷٤۲۔ ۷٤۳)

قوم سے زیادہ ہے، کیوں کہ وہ تو ایک بستی والوں کی طرف آئے تھے اور تجھ کو میں نے سارے لوگوں کی طرف بھیجا ہے۔

معنی یہ ہیں کہ تو اُن کے لیے اصحابِ قریہ کی مثال بیان کر، یعنی تو اُن کے لیے ایک عجیب قصہ، یعنی اصحابِ قریہ کا قصہ بیان کر۔ چنانچہ کلمۂ مثل کو چھوڑ دیا ہے اور اصحابِ قریہ کو اعراب میں اس کی جگہ رکھا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ مثل کے مقدر ماننے کی کچھ حاجت نہیں ہے، بلکہ معنی یہ ہیں کہ اصحابِ قریہ کو ان کے واسطے اس بنا پر مثل ٹھہرا کر ﴿ مَثَلًا ﴾ اور ﴿ اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ﴾ دو مفعول ہوں ﴿ اِضْرِبْ ﴾ کے، یا ﴿ اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ﴾ بدل ہو ﴿ مَثَلًا ﴾ سے۔ اس پر پہلے ہم بات کر چکے ہیں کہ ان دو مفعولوں میں سے پہلا مفعول ﴿ مَثَلًا ﴾ ہے یا ﴿ اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ﴾۔ کہا ہے کہ کبھی تو ضربِ مثل اس بات میں استعمال کیا جاتا ہے کہ غریب کی ایک حالت اسی کے مثل اور حالت سے تطبیق دی جائے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ﴾ [التحريم: ١٠] ''اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے نوح کی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان فرمائی۔'' اور کبھی اس میں استعمال کیا جاتا ہے کہ ایک حالتِ غریب ذکر کی جائے اور لوگوں کے لیے اس کا بیان ہو بغیر اس کے کہ اس کی نظیر کے ساتھ اس کی تطبیق کا ارادہ کیا جائے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴾ [إبراهيم: ٤٥] ''ہم نے (تو تمھارے سمجھانے کے لیے) بہت سی مثالیں بیان کر دی تھیں۔'' یعنی ہم نے تمھارے لیے عجیب وغریب اور نادر احوال بیان کیے کہ وہ غرابت اور ندرت میں مثلوں کی طرح ہیں۔

چنانچہ یہاں جو اللہ پاک نے ﴿ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا ﴾ فرمایا ہے تو اس میں دونوں امر کا اعتبار ٹھیک ہو سکتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے مفسروں کے قول کے مطابق یہ قریہ انطاکیہ ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس اور بریدہ رضی اللہ عنہم بھی اسی کے قائل ہیں، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس قریہ میں چشمے ہیں، اس کی فصیل پتھروں کی ہے، اس کے اندر پانچ پہاڑ ہیں اس کا دور، یعنی قطر (گھیر) بارہ میل ہے۔ عواصم کئی بلاد ہیں، انطاکیہ ان کا قصبہ ہے اور وہ ارضِ روم میں ہے۔

قولہ: ﴿ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ بدلِ اشتمال ہے ﴿ اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ﴾ سے اور ﴿ اَلْمُرْسَلُوْنَ ﴾ اصحابِ عیسیٰ علیہ السلام ہیں، انطاکیہ والوں کی طرف ان کو بھیجا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ان کو بلائیں۔ وہ لوگ بت پرست تھے۔

﴿ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ ﴾ میں جو اللہ پاک نے ان کا بھیجنا اپنی ذاتِ مقدس کی طرف منسوب فرمایا تو اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ سبحانہٗ کے حکم سے ان کو بھیجا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان رسولوں کو بلا واسطہ ان کی طرف بھیجا ہو۔

﴿ فَكَذَّبُوْهُمَا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ان کی تکذیب کی۔ کسی نے کہا کہ ان کو مارا اور قید کیا۔ کسی نے کہا کہ پہلے

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/١٥)

9

دو رسولوں کے نام یوحنا اور شمعون ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ تینوں کے نام صادق، مصدوق اور شلوم ہیں۔ (قاله ابن جرير وغيره) کسی نے کہا ہے کہ ''شمعان و یحییٰ و بولس۔ امام وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یحییٰ و بولس۔ کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صادق اور صدوق۔ کسی نے کہا ہے کہ تیسرے کا نام شمعون تھا۔ کسی نے کچھ اور کہا۔ جمہور نے ﴿فَعَزَّزْنَا﴾ کو بہ تشدید پڑھا ہے اور ابوبکر نے عاصم سے بہ تخفیفِ زاء۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "يُخَفَّفُ وَيُشَدَّدُ، أَيْ: قَوَّيْنَا وَشَدَّدْنَا"۔ [1] چنانچہ اس معنی کی بنا پر دونوں قراء تیں بیک معنی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "مخفف" بہ معنی "غَلَبْنَا وَقَهَرْنَا" ہے، اسی معنی سے یہ آیت ہے: ﴿وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ﴾ [ص: ٢٣] ''اور مجھ پر بات میں بڑی سختی برتتا ہے۔'' اور مشدد بہ معنی "قَوَّيْنَا وَكَثَّرْنَا" ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ موسیٰ بن عمران اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے درمیان ایک ہزار نو سو برس تھے۔ دونوں کے درمیان فترت نہ تھی۔ ان کے درمیان بنی اسرائیل میں سے ایک ہزار نبی بھیجے گئے، یہ ان کے علاوہ تھے جو غیر بنی اسرائیل سے بھیجے گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے درمیان پانچ سو انہتر برس تھے، ان سے پہلے تین نبی مبعوث ہوئے جن کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿اِذْ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ﴾ جس نبی کے ساتھ قوت دی گئی وہ شمعون ہیں، یہ حواریوں میں سے تھے۔ جس فترت میں اللہ تعالیٰ نے کوئی رسول مبعوث نہیں کیا وہ چار سو چونتیس برس ہے۔ [2] (أخرجه ابن سعد وابن عساكر)

غرض کہ پھر تینوں رسولوں نے مل کر کہا: ﴿اِنَّاۤ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ﴾ یعنی بے شک ہم تمھاری طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ اپنے کلام کو مؤکد اس لیے کیا کہ پہلے دو کی تکذیب ہو چکی تھی اور دو کی تکذیب تیسرے کی تکذیب ہے، اس لیے کہ سب ایک ہی شے کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ وہ یہی اللہ عزوجل کی طرف دعوت دینا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے، سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ جب تیسرے رسول کے ساتھ ان کو قوت دی تو انھوں نے کیا کہا؟ تو یہ اس کا جواب ہے۔ اسی طرح جملہ ﴿قَالُوْا مَاۤ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ مستانفہ ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ اہلِ انطاکیہ نے رسولوں سے کیا کہا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ انھوں نے یہ کہا ہے کہ نہیں ہو تم مگر ہماری طرح کے بشر، یعنی تم تو بشریت میں ہمارے شریک ہو، چنانچہ تم کو ہم پر کوئی فضیلت اور شرف نہیں ہے جس کے ساتھ تم مختص ہو۔ یہ خطاب تینوں کو ہے۔

پھر انطاکیہ والوں نے آسمانی کتابوں کے نزول کا صاف انکار کیا تو یوں بولے: ﴿وَمَاۤ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ﴾ یعنی جس بات کا تم دعویٰ کرتے ہو اور تمھارے سوا اور رسول جو تم سے پہلے تھے اور اُن کے پیروکار جس کا دعویٰ کرتے ہیں، اس میں سے رحمان نے کچھ نازل نہیں کیا۔ چونکہ انطاکیہ والوں نے بار بار انکار کیا، اس لیے رسولوں

---

[1] تفسير القرطبي (١٤/١٥) [2] الدر المنثور (٧/ ٤٩۔ ٥٠)

نے بھی اپنے کلام کو مؤکد کیا، یعنی تاکید کے ساتھ بار بار اپنی رسالت کے اثبات کا اس طرح سے جواب دیا: ﴿ رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴾ یعنی ہمارا رب جانتا ہے کہ بے شک ہم تمھاری طرف البتہ بھیجے ہوئے آئے ہیں۔

اس جواب میں تین تاکیدیں ہیں: ایک تو قسم جو ﴿ رَبُّنَا يَعْلَمُ ﴾ سے سمجھی جاتی ہے۔ دوسری کلمۂ "إنَّ" حرفِ تحقیق کا، تیسرے لامِ تاکید۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تکرار کی وجہ یہ ہے کہ اول ابتداءِ اخبار ہے اور ثانی انکار کا جواب ہے۔[1] انتہیٰ۔ یہ قول اس کے مخالف ہے جو مفتاح میں ہے کہ انھوں نے پہلی بار میں کلام کو مؤکد کیا، اس لیے کہ تکذیب دو کی تکذیب ہے تیسرے کی۔ تکذیب بہ سببِ اتحاد مقالہ کے ہے۔ پھر جب انھوں نے اپنی تکذیب میں مبالغہ کیا تو رسولوں نے زیادہ تاکید کی۔ امام زمخشری رحمہ اللہ جس طرف گئے ہیں وہ یہ نظر کرنے کے بعد ہے کہ مجموعۂ ثلاثہ سے نہ اخبار سابق ہوا ہے نہ ان کی پہلی بار میں تکذیب ہوئی ہے، چنانچہ پس پہلی بار میں تاکید خبر کے اعتناء واہتمام کے لیے ہے۔[2] (كذا قال الشهاب)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ یعنی ہمارے رب کی طرف سے ہم پر واجب نہیں ہے، مگر اس کی رسالت کو واضح اور ظاہری طور پر کھلی کھلی دلیلوں کے ساتھ پہنچا دینا ہے۔ یہ دلیلیں یہ ہیں: مادر زاد اندھے کو، کوڑھی، بیمار کو اچھا کرنا ہے اور مردے کو زندہ کرنا ہے، اس کے سوا اور کچھ ہمارے ذمے نہیں ہے۔[3] (كذا في فتح البيان)

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٨﴾ قَالُوْا طَاىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿١٩﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢٠﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٢﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿٢٣﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٤﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿٢٥﴾

وہ کہنے لگے: ہم تو تمھیں منحوس خیال کرتے ہیں، اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمھیں ضرور سنگسار کر دیں گے اور تمھیں ہماری طرف سے ضرور دردناک سزا پہنچے گی ⑱ انھوں نے کہا: تمھاری

[1] الكشاف (١١/٤) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٢٣٤/٧) [3] فتح البيان (٢٧٦/١١-٢٧٩)

نحوست تو تمھارے ساتھ ہی ہے، کیا اگر تمھیں نصیحت کی جائے (تو یہ نحوست ہے؟ ہرگز نہیں!) بلکہ تم لوگ ہی حد سے بڑھنے والے ہو⑲ اور شہر کے پرلے سرے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا: اے میری قوم! تم رسولوں کی پیروی کرو⑳ تم ان کی پیروی کرو جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے، جبکہ وہ (خود) ہدایت یافتہ ہیں㉑ اور مجھے کیا ہے کہ میں اس ذات کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا؟ اور تم (سب) اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے㉒ کیا میں اس (اللہ) کے سوا (دوسروں کو) معبود بنا لوں؟ اگر رحمان مجھے تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے تو ان کی شفاعت میرے کچھ بھی کام نہ آئے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں گے㉓ یقیناً میں اس وقت کھلی گمراہی میں ہوں گا㉔ بلاشبہہ میں تمھارے رب پر ایمان لایا ہوں، لہٰذا تم میری بات سنو㉕

انبیاء علیہم السلام کو منحوس سمجھنا اور انھیں دھمکی دینا:

شاید کفر کی شامت سے قحط ہوا ہوگا اس کو وہ نحوست سمجھے، یا آپس میں اختلاف ہوا ہو، کسی نے مانا، کسی نے نہ مانا، اس کو نحوست کہا، ہر طرح شامت انھیں کی ہے۔ آگے نقل کرتے ہیں کہ قوم نے اس کو شہید کیا اور بعض کہتے ہیں اللہ نے زندہ اٹھا لیا۔ انتہٰی.

جب رسولوں نے تاکید کے ساتھ اپنی رسالت کی تبلیغ کی تو اہلِ انطاکیہ نے کہا: ﴿ اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ﴾ یعنی ہم نے تمھارے چہروں پر اپنی زندگی میں کوئی خیر نہیں دیکھی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم کو کوئی شر پہنچے تو وہ صرف تمھارے سبب سے ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: وہ کہتے ہیں کہ جس بستی میں تم جیسا کوئی داخل ہوا تو اس کے لوگ عذاب کیے گئے۔ ﴿ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ ﴾ یعنی البتہ اگر تم باز نہ آؤ گے تو البتہ ہم تم کو رجم کریں گے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پتھروں سے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شتم سے، یعنی ہم تم کو گالیاں دیں گے۔[1]

﴿ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ سے مراد سخت تکلیف ہے۔ چنانچہ ان کے رسولوں نے ان سے کہا: ﴿ طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ﴾ یعنی تمھاری نحوست تمھیں پر مردود ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون کے حق میں فرمایا ہے: ﴿ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [الأعراف: ١٣١] ”پس جب ان پر خوش حالی آجاتی تو کہتے کہ یہ تو ہمارے لیے ہونا ہی چاہیے اور اگر ان کو کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتاتے، یاد رکھو کہ ان کی نحوست اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔“ اور قوم صالح علیہ السلام کے حق میں فرمایا ہے: ﴿ اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [النمل: ٤٧] ”ہم تو

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/٥٠٦) تفسیر ابن کثیر (٣/٧٤٣)

تیری اور تیرے ساتھیوں کی بدشگونی لے رہے ہیں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: تمھاری بدشگونی اللہ کے ہاں ہے۔"

امام قتادہ اور وہب رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: "أَعْمَالُكُمْ مَعَكُمْ"[1] یعنی تمھارے اعمال تمھارے ساتھ ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴾ [النساء: ۷۸] "اور اگر انھیں کوئی بھلائی ملتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے۔ انھیں کہہ دو کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ انھیں کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات سمجھنے کے بھی قریب نہیں۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴾ یعنی اس سب سے کہ ہم نے تم کو نصیحت کی اور سمجھایا اور اللہ کی توحید کا اور اس کے لیے خاص عبادت کرنے کا تم کو حکم دیا تم نے اس بات سے ہمارا مقابلہ کیا اور ہم کو وعید سنائی اور ہم کو تہدید کی۔ کوئی نہیں بلکہ تم ایک حد سے بڑھنے والی قوم ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: إِنْ ذَكَّرْنَاكُمْ بِاللّٰهِ تَطَيَّرْتُمْ بِنَا بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُسْرِفُوْنَ" یعنی اس سبب سے کہ ہم نے تم کو اللہ کے ساتھ تذکیر کی تم نے ہم سے بدشگونی لی، بلکہ تم ایک مسرف قوم ہو۔

قوم میں سے ایک آدمی کی ان کو دعوت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، کعب احبار اور وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے ابن اسحاق رحمہ اللہ کو جو کچھ پہنچا ہے، اس میں یہ ہے کہ اہلِ قریہ نے اپنے رسولوں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو ایک شخص شہر کے پَرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا، یعنی اس لیے کہ اپنی قوم کے مقابلے میں ان کی مدد کرے۔ کہا کہ یہ شخص حبیب ہے، رسیاں بنایا کرتا تھا اور بیمار آدمی تھا، جذام نے اس میں سرعت کی تھی، یعنی پھیل گیا تھا، صدقہ بہت دیا کرتا تھا، اپنی آدھی کمائی خیرات کر دیتا تھا، مستقیم الفطرت تھا۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے عن رجل سماہ عن الحکم عن مقسم، یا عن مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ صاحبِ یٰسٓ کا نام حبیب ہے، جذام اس میں پھیل گیا تھا۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا: عن عاصم الاحول عن ابی مجلز روایت کیا ہے کہ اس کا نام حبیب بن سری تھا۔ شبیب بن بشر نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ صاحبِ یٰسٓ کا نام حبیب نجار تھا، چنانچہ اس کو اس کی قوم نے مار ڈالا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دھوبی تھا۔ عمر بن الحکم نے کہا ہے کہ کفش دوز تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہاں ایک غار میں عبادت کرتا تھا۔[2] ﴿ قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ یعنی اس نے کہا: اے میری قوم! رسولوں کی پیروی کرو۔ اپنی قوم کو رسولوں کے اتباع کی رغبت دلاتا ہے، وہ رسول جو

---

[1] تفسير الطبري (۲۰/۵۰۳) [2] تفسير الطبري (۲۰/۵۰٤، ۵۰۵) تفسير ابن كثير (۳/۷٤٤)

اُن کے پاس آئے تھے۔ ﴿ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ یعنی اس شخص کی پیروی کرو جو رسالت پہنچانے پر تم سے اُجرت نہیں مانگتا اور اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی طرف، جو وہ تم کو بلاتے ہیں، اس میں وہ راہ پائے ہوئے ہیں۔

﴿ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی کون سی چیز مجھے اس وحدہ لاشریک لہ کی خالص عبادت کرنے سے منع کرتی ہے کہ جس نے مجھ کو پیدا کیا اور قیامت کے دن اسی کی طرف تم پھر جاؤ گے، پھر وہ تم کو تمھارے اعمال پر جزا دے گا، خیر ہیں تو خیر، شر ہیں تو شر۔ یعنی اچھے اعمال ہیں تو اچھی جزا اور برے ہیں تو بری جزا۔ ﴿ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ... الآية ﴾ یہ سوالیہ انداز انکار اور دھمکی اور ڈانٹ کا ہے، یعنی کیا میں اس کے سوا اور معبود پکڑوں کہ اگر رحمان مجھے کچھ تکلیف پہنچانا چاہے تو مجھے ان کی سفارش کچھ کام نہ آئے اور نہ ہی وہ مجھ کو چھڑائیں، یعنی یہ معبود جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، یہ کسی شے کے مالک نہیں ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اگر مجھ سے کسی برائی کا ارادہ کرے تو اس کے سوا اس کو دور کرنے والا کوئی نہیں اور یہ بت اس کو دور کرنے اور ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ وہ مجھے اس شے سے چھڑائیں جس میں مَیں مبتلا ہوں۔

﴿ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی بے شک میں اب البتہ کھلی گمراہی میں ہوں اگر میں ان کو اللہ کے سوا معبود پکڑوں۔ ﴿ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴾ ابن اسحاق رحمہ اللہ کو جو بات سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، کعب اور وہب رحمہ اللہ سے پہنچی ہے، اس میں یہ ہے کہ وہ اپنی قوم سے کہتا ہے: بے شک میں ایمان لایا تمھارے رب پر جس کے تم منکر ہوئے، لہٰذا تم میری بات سن لو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے یہ خطاب رسولوں کو کیا کہ میں تمھارے رب پر ایمان لایا، جس نے تمھیں بھیجا ہے، چنانچہ تم اس کے پاس میرے لیے گواہی دو۔

اس قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے۔ یوں کہا: "وَقَالَ آخَرُوْنَ: بَلْ خَاطَبَ بِذٰلِكَ الرُّسُلَ" یعنی دوسروں نے کہا ہے: بلکہ اس نے اس کا خطاب رسولوں سے کیا اور ان سے کہا کہ تم میری بات سن لو، تا کہ تم میرے لیے میرے رب کے پاس اس بات کی گواہی دو جو میں تم سے کہتا ہوں کہ میں تمھارے رب پر ایمان لایا اور تمھاری پیروی کی۔ یہ قول جو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ان لوگوں سے حکایت کیا ہے معنی میں ظاہر تر ہے۔ واللہ أعلم۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کو جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، کعب اور وہب رحمہ اللہ سے پہنچا ہے، اس میں یہ ہے کہ پھر جب اس نے یہ کہا تو قوم نے اس پر اس طرح جست کی، یعنی چڑھائی کی جس طرح ایک مرد جست کرتا ہے، یعنی سب نے مل کر یک بارگی حملہ کیا اور اس کو مار ڈالا، اس کو اس بات سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اس کو پتھروں سے مارتے تھے اور وہ کہتا تھا: "اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" پھر وہ اس کو مارتے رہے، یہاں تک کہ اس کو فی الفور اسی جگہ مار ڈالا اور وہ اسی طرح کہتا تھا۔[1] (كذا في ابن كثير)

---

[1] تفسير الطبري (۲۰/۵۰۷، ۵۰۸) تفسير ابن كثير (۳/۷۴۳، ۷۴۴)

فتح البیان کا بیان:

جملہ ﴿ رَبُّنَا يَعْلَمُ ﴾ متانفہ ہے۔ اسی طرح جملہ: ﴿ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ...الخ﴾ متانفہ ہے جو سوال مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا کہ قوم نے رسولوں کو کیا جواب دیا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ قوم نے ان سے کہا کہ ہم نے تمھاری نحوست دیکھی، اس لیے کہ ہم سے تمھاری وجہ سے بارش منقطع ہوگئی۔ انھوں نے کوئی جواب اس کے سوا نہ پایا کہ رسولوں کو دیں۔ یہ ایسا جواب ہے جو جہل اور نادانی پر مبنی ہے اور اس سے ان کی انتہائی کند ذہنی کی خبر دیتا ہے اور اس بات کی کہ انھوں نے کوئی ایسی حجت اور دلیل نہ پائی جس سے رسولوں کی بات کو رد کریں۔ جاہلوں کی عادت ہوتی ہے کہ جس شے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور ان کی طبیعت اس کو قبول کرتی ہے تو اس سے مبارکی لیتے ہیں، یعنی نیک شگون لیتے ہیں اور جس شے سے نفرت کرتے ہیں اور اس کو مکروہ سمجھتے ہیں تو اس سے نامبارکی (بدشگونی) لیتے ہیں۔ چنانچہ اگر ان کو کوئی بلا یا نعمت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں شے کی شومی اور نحوست سے یہ بلا پہنچی اور فلاں شے کی برکت سے یہ نعمت ملی۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تین برس ان سے بارش روک دی گئی تھی تو انھوں نے رسولوں سے کہا کہ تمھاری نحوست سے روکی گئی۔[1] کسی نے کہا ہے کہ رسول دس برس ٹھہرے اور ان کو ڈراتے رہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انھوں نے صرف اس لیے نامبارک سمجھا کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ جس نبی نے جس وقت اپنی قوم کو دعوت کی، پھر انھوں نے اس کی دعوت قبول نہ کی تو ان کا انجام ہلاکت ہوا۔ ﴿ تَطَيُّرٌ ﴾ کی اصل ''فال لینا'' ہے ''طیر'' سے، کیوں کہ وہ یہ زعم کرتے تھے کہ سانح خیر کا سبب ہوتا ہے اور بارح شر کا (سانح وہ شکار ہے جو تیرانداز کے بائیں طرف سے آتا ہے اور بارح وہ ہے جو سیدھی طرف سے شکاری کے بائیں جانب کو جاتا ہے۔ عرب لوگ بارح سے بدشگون اور سانح سے نیک شگون لیتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ شکاری کے لیے ممکن نہیں کہ شکار کو تیر مارے، یہاں تک کہ وہ منحرف ہو)۔ پھر ﴿ تَطَيُّرٌ ﴾ کا ہر اس شے میں استعمال کیا گیا جس سے بدفالی لی جاتی ہے۔

پھر جب ان کے سینے تنگ ہوئے اور علتوں بہانوں نے ان کو تھکا دیا، عاجز کر دیا تو تجبر اور تکبر کی طرف رجوع کر کے یوں بولے: ﴿ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ ﴾ حرفِ لام توطیہ قسم کا ہے، یعنی واللہ! البتہ اگر تم اس دعوے کو نہ چھوڑو گے اور اس بات سے اعراض نہ کرو گے تو البتہ ہم تم کو پتھروں سے رجم کریں گے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: عامۂ قرآن شریف میں جو رجم کا لفظ آیا ہے، اس سے مراد قتل ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رجم اپنے باب پر ہے، یعنی پتھروں سے رجم کرنا۔[2] ﴿ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ یعنی البتہ تم کو ہماری طرف سے

---

[1] تفسير القرطبي (١٦/١٥) [2] تفسير القرطبي (١٦/١٥)

عذابِ الیم چھوئے گا، اس سے مراد عذابِ شدید فظیع ہے، یعنی انتہائی سخت عذاب۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی آگ سے جلانا ہے یا قتل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ گالیاں دینا۔ کسی نے کہا ہے کہ درد دینے والی تعذیب ہے جو بغیر کسی قید کے خاص قسم سے ہو۔ ظاہر یہی قول ہے۔ غرض یہ کہ رسولوں کو خوب ڈرایا دھمکایا۔ قتل اور دردناک عذاب کی وعید سنائی، لیکن وہ اپنی اس قسم کو توڑنے والے ہوئے، کیوں کہ ان کو اس کے پورا کرنے کی قدرت نہ ہوئی، اس لیے کہ اللہ پاک نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔

پھر انھوں نے رسولوں سے بدشگونی لینے کا جو زعم کیا تھا، رسولوں نے اس کی تردید کرنے کے لیے ان کو یہ جواب دیا: ﴿ طَآئِرُكُمۡ مَّعَكُمۡ ﴾ یعنی تمھاری نحوست تمھارے ساتھ ہے، وہ خود تمھاری طرف سے ہی تمھاری گردنوں میں ہے، وہ ہماری نحوست سے نہیں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طائر سے مراد رزق، قدر اور عمل ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[1] مختار میں ہے: "طَائِرُ الْإِنْسَانِ عَمَلُهُ الَّذِيْ قَلَّدَهُ" یعنی آدمی کا طائر اس کا عمل ہے جس کا پٹا اس کے گلے میں ڈالا گیا ہے اور طیر اسم ہے تطیر سے۔ اسی باب سے یہ ہے: "لَا طَيْرَ إِلَّا طَيْرَ اللّٰهِ وَتَطَيَّرَ مِنَ الشَّيْءِ وَبِالشَّيْءِ" اسم طیرہ بروزن عنبہ ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالُوا اطَّيَّرۡنَا بِكَ ﴾ [النمل: ٤٧] "وہ کہنے لگے ہم تو تیری بدشگونی لے رہے ہیں۔" کی اصل ﴿ تَطَيَّرۡنَا ﴾ ہے، پھر اس میں ادغام کیا گیا ہے۔ جمہور نے ﴿ طَآئِرُكُمۡ ﴾ بہ صیغۂ اسم فاعل پڑھا ہے: "أَيْ: مَا طَارَ لَكُمْ مِنَ الْخَيْرِ وَالشَّرِّ"۔ امام حسن رحمہ اللہ نے "إِطَّيْرُكُمْ" پڑھا ہے۔ "أَيْ: تَطَيُّرُكُمْ"

قولہ تعالیٰ: ﴿ أَئِنۡ ذُكِّرۡتُمۡ ﴾ (یعنی سورت نمل میں) کو جمہور نے سبعہ وغیرہم سے ہمزۂ استفہام پڑھا ہے، اس کے بعد "إن" شرطیہ ہے اس اختلاف کے ساتھ جو اُن کے درمیان تسہیل و تخفیف میں ہے اور دونوں ہمزوں کے درمیان الف کے داخل کرنے اور عدمِ ادخالِ الف میں۔ امام ابو جعفر، زر بن حبیش، ابن سمیفع اور طلحہ رحمہم اللہ نے دو ہمزۂ مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور امام اعمش، عیسیٰ بن عمر اور حسن رحمہم اللہ نے "أَيْنَ" بہ صیغۂ ظرف بہ فتح ہمزہ و سکونِ یائے تحتیہ پڑھا ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ اور یونس رحمہ اللہ کا اس بات میں اختلاف ہے کہ جب استفہام اور شرط دونوں جمع ہوں تو جواب کس کا دیا جائے۔

امام سیبویہ رحمہ اللہ تو اس طرف گئے ہیں کہ استفہام کا جواب دیا جائے اور یونس رحمہ اللہ نے کہا کہ شرط کا، چنانچہ دونوں قولوں کی بنا پر جواب اس جگہ محذوف ہے۔ "أَيْ: أَئِنْ ذُكِّرْتُمْ وَوُعِظْتُمْ وَخُوِّفْتُمْ فَتَطَيَّرْتُمْ"۔ جواب کو اس لیے حذف کیا کہ ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے۔ ماجشون نے "أَنْ ذُكِّرْتُمْ" بہ ہمزۂ مفتوحہ پڑھا ہے، "أَيْ: لِأَنْ ذُكِّرْتُمْ" یہ ساری قراءتیں سبعیہ ہیں، غرضیکہ وعظ و نصیحت کرنا نحوست کا سبب ہو یا وعید سنانے کا یا اصلاح

[1] تفسير القرطبي (١٥/١٦) [2] مختار الصحاح (١/٤٠٣)

کرنے والا ہو جس کے مقتضی استفہام وشرط ہیں۔ رسولوں نے اس سے ہٹ کر یوں کہا: ﴿ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴾ یعنی بات یوں نہیں ہے کہ وعظ ونصیحت نحوست کا سبب ہو اور وعید سنانے کی موجب ہو، بلکہ شومی ونحوست کا سبب یہ ہے کہ تم ایک ایسی قوم ہو کہ تمھاری عادت معصیت میں زیادتی کرنا ہے، لہٰذا اس سبب سے تم کو شومی آئی ہے۔ یہ تمھاری اپنی طرف سے ہے اللہ کے رسولوں کی جانب سے نہیں ہے، نہ ان کے وعظ ونصیحت کرنے کی وجہ سے ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: بلکہ تم اپنی بدفالی لینے میں مُسرف ہو۔

امام یحییٰ بن سلام رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم اپنے کفر میں مسرف ہو۔ امام ابن بحر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ سرف سے مراد فساد ہے۔ اصل میں اسراف حق کی مخالفت میں حد سے بڑھنے کو کہتے ہیں۔[1] یعنی تم اپنے شرک کے سبب سے حد سے بڑھنے والے ہو۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ اہلِ انطاکیہ پہلے مومنین ہوں، عیسی علیہ السلام کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں، کیوں کہ بادشاہ اور اس کی قوم ایمان لے آئے اور حبیب کے قاتلوں کے ہلاک ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اہلِ انطاکیہ سب کے سب ہلاک ہوئے۔ انتہیٰ.

﴿ اَلْمَدِيْنَةِ ﴾ سے مراد وہی بستی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اس کی بڑائی اور وسعت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اس جگہ اس کی تعبیر مدینہ سے کی ہے۔ ﴿ رَجُلٌ ﴾ کی تفسیر میں کئی قول پہلے گزر چکے ہیں، ان کے علاوہ ایک یہ ہے کہ اس کا نام حبیب بن مری تھا۔ امام مجاہد اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حبیب بن اسرائیل نجار تھا اور بت تراشا کرتا تھا۔[2] یہ شخص عیسیٰ علیہ السلام کے رسولوں پر ایمان لے آیا تھا۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اس کے ایمان لانے کا سبب یہ ہوا کہ یہ مجذوم تھا، اس نے اپنی بیماری کے دور ہونے کے لیے ستر برس بتوں کو پوجا، مگر وہ دور نہ ہوئی۔ پھر جب رسولوں نے اس کو اللہ کی عبادت کی طرف بلایا تو ان سے کہا: کوئی نشانی ہے؟ تو انھوں نے اس سے کہا کہ ہم اپنے ربِ قادر مطلق سے دعا کریں گے تو وہ تمھاری بیماری کو دور کر دے گا۔ اس نے کہا: بے شک یہ عجیب ہے کہ میں نے ان بتوں کو ستر برس پوجا اور وہ اس کو دور نہ کر سکے۔ پھر کیا تمھارا رب ایک دن میں اس کو دور کر سکتا ہے؟ رسول بولے: ہاں " رَبُّنَا عَلٰى مَا يَشَاءُ قَدِيْرٌ " یعنی ہمارا رب جس شے کو چاہتا ہے اس پر قادر ہے، چنانچہ انھوں نے اپنے رب سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بیماری دور کر دی تو وہ ایمان لے آیا۔[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شخص ان میں سے ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں، ان کے درمیان چھے سو برس کی مدت تھی، جس طرح کہ تبع اکبر اور ورقہ بن نوفل وغیرہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، سوائے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی کسی نبی پر ان کے عہد سے پہلے ایمان نہیں لایا، لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت سے لوگ ان کے ظہور سے پہلے ایمان لائے۔[4] انتہیٰ۔ بعض نے اس قول کو ضعیف اور بعید کہا ہے۔ غرضیکہ حبیب نجار کا گھر شہر کے پرلے سرے پر

[1] تفسیر القرطبي (١٥/١٦، ١٧) فتح القدير (٤/٤٨١)
[2] تفسير القرطبي (١٥/١٧، ١٨)
[3] البحر المحيط (٧/٣١٤)
[4] تفسير القرطبي (١٥/١٨)

تھا، جب اس نے سنا کہ قوم نے رسولوں کی تکذیب کی تو وہاں سے دوڑتا ہوا آیا اور قوم سے کہا: ﴿ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ﴾ یہ جملہ مستانفہ ہے جواب ہے سوالِ مقدر کا۔ گویا کسی نے پوچھا کہ اس نے اپنے آنے کے وقت قوم سے کیا کہا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ اس نے یوں کہا: اے میری قوم! ان رسولوں کی پیروی کرو جو تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں، اس لیے کہ وہ حق لائے ہیں۔

پھر اس بات کی تاکید اور تکرار کر کے یوں کہا: ﴿ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا ﴾ یہ جملہ ﴿ الْمُرْسَلِیْنَ ﴾ سے بدل ہے باعادۂ عامل، یا اس کا تابع ہے، یعنی ان کی پیروی کرو جو تم سے ہدایت پر کوئی مزدوری نہیں مانگتے، جس کو وہ تمھارے پاس لے کر آئے ہیں۔ ﴿ وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ اور وہ خود بھی راہ پائے ہوئے ہیں۔ اگر وہ سچے نہ ہوتے تو تم سے مال کا سوال کرتے، لہٰذا جیسے وہ راہ پائے ہوئے ہیں ویسے تم بھی ان کی پیروی کر کے راہ پاؤ۔

پھر اس نے اپنے نفس کو نصیحت کرنے کے پیرائے میں قوم کو نصیحت کرنا شروع کیا، چنانچہ کہا: ﴿ وَمَا لِیَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ﴾ یعنی میری طرف سے کون مانع ہے جو مجھے اس ذات کے پوجنے سے منع کرے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ پھر قوم کی طرف اپنے خطاب کا رخ موڑا یہ بات بیان کرنے کے لیے کہ میں نے جو تقریر کی اس سے مراد میرا نفس نہیں ہے، بلکہ تم مراد ہو۔ چنانچہ کہا: ﴿ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی تم اسی کی طرف پھر کر جاؤ گے۔ فطرت کی نسبت اپنے نفس کی طرف کی اور رجوع کی نسبت قوم کی طرف، اس لیے کہ فطرت نعمت کا اثر ہے اور وہ اس پر بہت ظاہر تھا اور رجوع میں زجر (دھمکی) کے معنی ہیں، چنانچہ یہ قوم کے لیے زیادہ مناسب تھا، اسی لیے اس نے "إِلَيْهِ أُرْجَعُ" نہ کہا۔ ﴿ تُرْجَعُوْنَ ﴾ میں زیادہ موثر دھمکی ہے۔ یہ طریقہ جو مذکور ہوا احسن ہے، اس سے کہ یہاں التفات کا دعویٰ کیا جائے۔

پھر مزید تاکید اور وضاحت کے لیے پہلے اسلوبِ بیان کی طرف رجوع کیا، یعنی ارشاد اور نصیحت میں تلطف ولینت کا لحاظ کر کے اپنے نفس کے پیرائے میں ان کی خیر خواہی شروع کی۔ چنانچہ کہا: ﴿ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ﴾ انکار کو اپنے نفس کی طرف متوجہ کیا اور اس سے مراد قوم ہے، یعنی کیا میں اللہ کے سوا اور معبود پکڑوں اور ان کو پوجوں اور جو عبادت کا مستحق ہے اور اس نے مجھے پیدا کیا ہے، اس کی عبادت کو چھوڑ دوں۔ ہرگز ایسا نہ کروں گا، مطلب یہ ہے کہ تم ایسا نہ کرو۔

پھر ان پر انکار کرنے کے لیے اور ان کی عقلوں اور سمجھ کی گمراہی اور کمی بیان کرنے کے لیے ان بتوں کا حال بیان کیا، جن کو وہ اللہ پاک کے سوا پوجتے ہیں۔ چنانچہ کہا: ﴿ اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ ﴾۔ یہ شرط ہے، اس کا جواب یہ ہے: ﴿ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا وَّلَا یُنْقِذُوْنِ ﴾ یہ جملہ شرطیہ صفت ہے ﴿ اٰلِهَةً ﴾ کی، یا مستانفہ ہے عدمِ نفع و دفع ہیں، بتوں کا حال بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ یعنی جن بتوں کو وہ پوجتے ہیں ان کا حال اپنی بے کسی و بے بسی میں یہ ہے کہ اگر رحمان مجھے کوئی بدی اور مکروہ چیز پہنچانے کا ارادہ کرے تو مجھے ان کی سفارش کسی طرح کا نفع نہ دے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے کسی طرح کی سفارش نہیں ہے کہ وہ مجھے نفع دے اور نہ وہ مجھے

اس برائی سے چھڑائیں گے جس کا رحمان نے میرے ساتھ ارادہ کیا ہے۔
طلحہ بن مصرف رحمہ اللہ نے ﴿ اِنْ یُّرِدْنِ ﴾ کو بہ فتحِ یائے تحتیہ پڑھا ہے۔[1] ﴿ اِنِّیْۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴾، یعنی جس وقت میں اللہ کے سوا اور معبود پکڑوں اور غیر اللہ کو پوجوں تو بے شک میں ظاہر و واضح گمراہی میں ہوں، کیوں کہ جو شے کسی طرح پر نہ نفع دے نہ ضرر کو دور کرے ایسی شے کا اس ذات پاک پر اختیار کرنا جو خالق ہے اور نفع اور ضرر پر پوری قدرت رکھتا ہے اور اس کو اس کے ساتھ شریک کرنا ایسی کھلی گمراہی ہے کہ کسی عقل مند سے پوشیدہ نہیں۔ یہ قول قوم پر تعریض ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ضلال سے مراد خسران اور نقصان ہے۔
پھر اس نے وعظ و نصیحت کے بعد اپنے ایمان کی ایسی صاف تصریح کی کہ جس کے بعد کسی طرح کا شک باقی نہ رہے۔ کہا: ﴿ اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴾ بہ کسرِ نون۔ یہ نون وقایہ ہے، لغتِ عالیہ یہی ہے۔ کسی نے بہ فتحِ نون پڑھا ہے اور یہ غلط ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ قوم نے اس کے قتل کا ارادہ کیا تو وہ مرسلین پر متوجہ ہوا۔ پھر کہا: اے رسولو! میں تمھارے رب پر ایمان لایا، چنانچہ تم میرے ایمان کو سن لو اور میرے ایمان کی گواہی دو۔ کسی نے کہا ہے کہ اس نے اس کلام کے ساتھ اپنی قوم کو خطاب کیا، جب انھوں نے اس کے قتل کا ارادہ کیا، غرض اس سے دین میں سختی کا اظہار کرنا اور حق میں شدت کا اظہار ہے اور قتل کی پروا نہ کرنا ہے۔
پھر جب اس نے یہ بات کہی اور ایمان کی تصریح کی تو وہ اس پر دوڑ پڑے اور اسے قتل کر ڈالا۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے پاؤں سے اسے روند ڈالا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جلا ڈالا اور شہر کی فصیل میں اس کو لٹکا دیا، اس کی قبر انطاکیہ کی فصیل میں ہے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے اس قول کو بیان کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے لیے ایک گڑھا کھودا اور اس کو اس میں ڈال دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو آسمان کی طرف اٹھا لیا اور وہ جنت میں ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس کو آری سے چیرا یہاں تک کہ وہ اس کے دونوں پاؤں کے درمیان سے نکل گئی، پس قسم ہے اللہ کی کہ اس کی روح نہ نکلی مگر جنت میں، چنانچہ وہ اس میں داخل ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:[3]

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۷ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝۲۸ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ۝۲۹

کہا گیا: تو جنت میں داخل ہو جا، اس نے کہا: کاش! میری قوم جان لے (26) (یہ بات) کہ

---
[1] فتح القدير (٤/٤٨٢) [2] تفسير القرطبي (١٤/١٩) [3] فتح البيان (١١/٢٨٠-٢٨٤)

میرے رب نے مجھے بخش دیا ہے اور اس نے مجھے معزز لوگوں میں (شامل) کر دیا ہے ﴿27﴾ اور ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نازل نہیں کی اور نہ ہم نازل ہی کرنے والے تھے ﴿28﴾ وہ تو صرف ایک (ہولناک) چیخ تھی، پھر یکایک وہ سب بجھ کر رہ گئے ﴿29﴾

کاش! میری قوم جان لے! بندۂ خدا کی مرنے کے بعد بھی قوم کی خیر خواہی:

قوم نے اس سے دشمنی کی کہ اس کو مار ڈالا، مگر اس کو بہشت میں بھی قوم کی خیر خواہی رہی کہ اگر ان کو میرا حال معلوم ہو تو سب ایمان لے آئیں۔ انتھٰی.

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے اس کو اپنے پاؤں سے روند ڈالا، یہاں تک کہ اس کی آنتیں اس کی دُبر سے نکل گئیں اور اللہ نے اس سے کہا ہے کہ بہشت میں چلا جا، چنانچہ وہ اس میں چلا گیا، لہٰذا وہ وہاں رزق دیا جاتا ہے۔ اللہ نے اس سے دنیا کی بیماری وغم اور تکلیف دور کر دی۔ (قاله محمد بن إسحاق عن بعض أصحابه)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حبیب نجار سے کہا گیا کہ تو جنت میں داخل ہو جا، یہ اس لیے کہ وہ قتل کیا گیا، چنانچہ وہ اس کے لیے واجب ہو گئی۔

پھر جب اس نے ثواب دیکھا تو کہا: ﴿ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: نہ ملے گا تو مومن سے مگر اس حال میں کہ وہ ناصح و خیر خواہ ہو گا اور تو اس سے اس حال میں نہ ملے گا کہ وہ غالش ہو، یعنی دھوکا دینے والا۔ جب اس نے اللہ کی کرامت سے اس شے کو دیکھا جس کو کہ دیکھا تو کہنے لگا: ﴿ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ اس نے واللہ! اس بات کی تمنا کی کہ اس کی قوم کو وہ شے معلوم ہو جائے جس کا اس نے اپنی آنکھوں سے معائنہ کیا، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کرامت اور عزت اسے اچانک مل گئی، اسے اس کی قوم جان لے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس نے اپنی زندگی میں یہ بات کہہ کر اپنی قوم کی خیر خواہی کی: ﴿ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ اور مرنے کے بعد اس قول سے اپنی قوم کی خیر خواہی کی: ﴿ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ (رواه ابن أبي حاتم)

سفیان ثوری نے عن عاصم الاحول عن ابی مجلز روایت کیا ہے کہ یہ کہہ کر خیر خواہی کی: ﴿ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴾ یعنی کہ مجھے میرے رب نے بخش دیا اور مجھ کو عزت والوں میں سے کر دیا، اس وجہ سے کہ میں اپنے رب پر ایمان لایا اور رسولوں کی تصدیق کی۔[1] مقصد اس کا یہ ہے کہ اگر انھیں اس کی اطلاع ہو جائے کہ ثواب و جزا اور نعیم مقیم سے مجھے کیا کچھ حاصل ہوا ہے تو البتہ یہ بات انھیں رسولوں کی پیروی کرنے کی طرف کھینچ لائے، اللہ اس پر رحم کرے اور اس سے راضی ہو! البتہ واقعی وہ اپنی قوم کی ہدایت پر حریص تھا۔

[1] تفسير الطبري (٥٠٨/٢٠، ٥٠٩) تفسير ابن كثير (٧٤٥/٣)

عبدالملک بن عمیر کہتے ہیں کہ سیدنا عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ آپ مجھے میری قوم کی طرف بھیجیں کہ میں ان کو اسلام کی دعوت دوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ وہ تجھے مار ڈالیں۔ عروہ نے عرض کی: اگر وہ مجھے سوتا ہوا پائیں تو مجھے نہ جگائیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے قتل کا خوف نہیں ہے، وہ میرے مطیع ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چلا جا۔ پھر وہ چلا تو لات وعزیٰ پر گزرا تو کہا کہ البتہ کل میں صبح کو تیرے پاس آؤں گا، وہ شے لے کر جو تجھے بری لگے۔ اس پر ثقیف خفا ہوئے تو عروہ نے کہا: اے گروہِ ثقیف! بے شک لات کوئی لات نہیں ہے اور عزیٰ کوئی عزیٰ نہیں ہے، اسلام لاؤ تو سلامت رہو گے۔ اے گروہِ احلاف! "إِنَّ الْعُزَّى لَا عُزَّى وَإِنَّ اللَّاتَ لَا لَاتَ أَسْلِمُوْا تَسْلَمُوْا" یہ بات تین دفعہ کہی، تو ایک شخص نے اسے تیر مارا تو اس کے ہفت اندام رگ میں لگا جس نے اس کو قتل کر ڈالا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ شخص صاحبِ یٰسٓ کی طرح ہے: ﴿قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ﴾[1] (أخرجه ابن أبي حاتم)

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود کعب سے روایت کیا ہے کہ کعب سے حبیب بن زید بن عاصم برادر بنی مازن بن نجار کا ذکر کیا گیا جس کو مسیلمہ کذاب نے یمامہ میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ جس وقت مسیلمہ حبیب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھنے لگا؛ یعنی اس سے کہتا: کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟ تو حبیب کہتا: ہاں۔ پھر اس سے کہتا: کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ تو حبیب کہتا: میں سنتا نہیں ہوں، پس مسیلمہ -لعنه الله- اس سے کہتا: کیا تو اس کو سنتا ہے اور اس کو نہیں سنتا تو حبیب کہتا: ہاں۔ پھر وہ ایک ایک عضو کر کے اس کے ٹکڑے کرنے لگا۔ جب مسیلمہ حبیب سے پوچھتا: تو وہ اس سے زیادہ کچھ جواب نہ دیتا، یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں میں مر گیا۔ چنانچہ کعب نے کہا، جب ان کو یہ بتایا گیا کہ اس کا نام حبیب تھا، کہا: واللہ! صاحبِ یٰسٓ کا نام بھی حبیب تھا۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ﴾ اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے کہ قوم نے جب حبیب کو قتل کر دیا تو اس نے خفا ہو کر اس کی قوم سے انتقام لیا، اس لیے کہ انھوں نے اس کے رسولوں کو جھٹلایا، اس کے ولی کو قتل کیا۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ اس نے ان پر آسمان سے کوئی فرشتوں کا لشکر نازل نہیں کیا اور نہ ہی ان کو ہلاک کرنے کے لیے اس چیز کی ضرورت پڑی، بلکہ کام اس سے بہت آسان تھا۔ (قاله ابن مسعود رضي الله عنه فيما رواه ابن إسحق عن بعض أصحابه أنه قال في قوله تعالى: ﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ﴾ أي ما كاثرناهم بالجموع، الأمر كان أيسر علينا من ذلك).

﴿اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] مستدرك الحاكم، رقم الحديث (٧١٣/٣) تفسير ابن كثير (٧٤٥/٣)
[2] تفسير الطبري (٥٠٥/٢٠)

نے اس بادشاہ کو اور اہلِ انطاکیہ کو ہلاک کیا، چنانچہ وہ روئے زمین سے ہلاک ہو گئے پھر اُن میں سے کوئی باقی نہ بچا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں: نہیں ہیں ہم کہ ہم اُمتوں کو ہلاک کرنے کے لیے فرشتوں کو اتاریں، بلکہ ہم ان پر عذاب بھیج دیتے ہیں جو اُن کو ہلاک کر دیتا ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ کے معنی ہیں: "مِنْ رِسَالَةٍ أُخْرٰی إِلَيْهِمْ" (قاله مجاهد و قتادة) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "فَلَا وَاللّٰهِ! مَا عَاتَبَ اللّٰهُ قَوْمَهُ بَعْدَ قَتْلِهِ ﴿ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴾"

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ رسالت کا نام ﴿ جُنْدٍ ﴾ نہیں رکھا جاتا۔[2] مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا تو انھوں نے ان کے دروازۂ شہر کے دونوں بازو پکڑے، پھر ان پر ایک چنگھاڑ لگائی، تب ہی وہ سب کے سب بجھ گئے ان میں کوئی روح باقی نہ رہی کہ جسم میں آئے جائے۔ بہت سے سلف سے یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ یہ بستی انطاکیہ ہے اور یہ تینوں رسول عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے بھیجے ہوئے آئے تھے۔ چنانچہ قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے اس پر نص کی ہے اور یہ وہ بات ہے کہ قتادہ کے سوا متاخرین مفسرین میں سے کسی اور سے بیان نہیں ہوئی۔ اس میں کئی وجہ سے نظر ہے:

ایک وجہ یہ ہے کہ ظاہر قصہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ لوگ اللہ عزوجل کے رسول تھے مسیح علیہ السلام کی طرف سے نہیں تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ... ﴾ إلی ﴿ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ اگر یہ لوگ حواریوں میں سے ہوتے تو کوئی ایسی عبارت کہتے جو اس کے مناسب ہوتی کہ وہ مسیح علیہ السلام کے پاس سے ہیں۔ واللّٰه تعالیٰ أعلم۔ پھر اگر وہ مسیح علیہ السلام کے رسول ہوتے تو قوم ان سے یہ نہ کہتی کہ ﴿ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾

دوسری وجہ یہ ہے کہ انطاکیہ والے مسیح علیہ السلام کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ یہ پہلا شہر ہے جو مسیح علیہ السلام پر ایمان لایا اور اسی لیے نصاریٰ کے نزدیک انطاکیہ ان چار شہروں میں سے ایک شہر ہے جن میں بتارکہ ہیں، وہ یہ ہیں: قدس ہے، اس لیے کہ یہ مسیح علیہ السلام کا شہر ہے اور انطاکیہ ہے، اس لیے کہ یہ پہلا شہر ہے جو مسیح علیہ السلام پر ایمان لایا، یعنی اس کے سارے شہر والے ایمان لائے اور اسکندریہ ہے، اس لیے کہ اس میں صلح ہے اتخاذ بتارکہ ومطارنہ واساقفہ وقساقسہ وشمامسہ اور رہابین پر۔ پھر رومیہ ہے، اس لیے کہ یہ قسطنطین بادشاہ کا شہر ہے، جس نے ان کے دین کی مدد کی اور اس کو محکم اور استوار کیا ہے اور جب اس نے قسطنطنیہ بنایا تو بترک کو رومیہ سے منتقل کر کے اس کی طرف لے گئے۔ (كما ذكره غير واحد ممن ذكر تواريخهم كسعيد بن بطريق وغيره من أهل الكتاب والمسلمين) چنانچہ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ

[1] تفسير الطبري (٢٠/ ٥١٠، ٥١١) [2] تفسير الطبري (٢٠/ ٥١٠، ٥١١)

انطاکیہ وہ پہلا شہر ہے جو ایمان لایا تو اس اہلِ قریہ کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ انھوں نے اس کے رسولوں کی تکذیب کی اور اس نے ان کو صیحۂ واحدہ سے ہلاک کیا جس نے ان کو پکڑا۔ واللّٰہ أعلم۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ انطاکیہ کا قصہ تورات کے نزول کے بعد مسیح علیہ السلام کے حواریین اصحاب کے ساتھ ہے۔ حالانکہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے اور کئی ایک اہلِ علم نے سلف میں سے یہ بات ذکر کی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تورات نازل کرنے کے بعد کوئی عذاب بھیج کر کسی بھی اُمت کو پورے کا پورا ہلاک نہیں کیا، بلکہ اس کے بعد کہ مومنین کو مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم فرمایا۔ اس بات کو اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى ﴾ [القصص: ٤٣] ''اور ان اگلے زمانہ والوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ایسی کتاب عنایت فرمائی۔''

چنانچہ اس بنا پر یہ بات متعین ہوگئی کہ یہ قریہ جو قرآن شریف میں مذکور ہے، انطاکیہ کے سوا کوئی اور قریہ ہے۔ (كما أطلق ذلك غير واحد من السلف أيضاً) یا اس قصے میں انطاکیہ کا لفظ محفوظ ہو تو یہ انطاکیہ کوئی اور شہر ہے، اس مشہور و معروف شہر کے علاوہ، کیوں کہ اس میں یہ بات معروف نہیں ہے کہ وہ شہر ہلاک کیا گیا نہ تو ملتِ نصرانیہ میں اور نہ اس سے قبل۔ واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم۔ رہی وہ حدیث جس کو ابو القاسم طبرانی نے عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ سبق تین ہیں: چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سابق یوشع بن نون ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سابق صاحبِ یٰسٓ ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سابق علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔[1] یہ حدیث منکر ہے معروف نہیں ہے، سوائے حسین اشقر کے طریق سے، یہ شخص شیعی متروک ہے۔ واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم بالصواب۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

پہلے گزر چکا ہے کہ حبیب نجار کے بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ قتل کیا گیا، دوسرا یہ ہے کہ قتل نہیں ہوا، بلکہ آسمان کی طرف اُٹھا لیا گیا۔ چنانچہ پہلے قول کی بنا پر ﴿ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ قتل کے بعد اس کی عزت اور تکریم کے لیے اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو، چنانچہ اپنے شہداء بندوں کے لیے یہ اللہ پاک کا طریقہ ہے۔ آیتِ کریمہ کے نظم میں ''لَهٗ'' کا لفظ مذکور نہیں ہوا، اس کی یہ وجہ ہے کہ غرض صرف قول کو بیان کرنا ہے، جس سے کہا گیا اس کا بیان کرنا مقصود نہیں، اس لیے کہ وہ تو پہلے ہی معلوم ہے۔

دوسرے قول کی بنیاد پر معنی یہ ہوں گے کہ جب قوم نے اس کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ پاک نے قتل سے اسے نجات دی اور اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جنت اب مخلوق اور موجود

[1] المعجم الكبير (٩٣/١١) اس کی سند میں ''حسین اشقر'' سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٥٨)

[2] تفسير ابن كثير (٧٤٥/٣۔٧٤٧)

ہے جبھی تو اس سے کہا: ﴿ادْخُلِ الْجَنَّةَ﴾ اس کی بنا پر ﴿ادْخُلِ﴾ کا حکم، حکمِ تکوینی ہے امرِ امتثال نہیں ہے۔ جس طرح کہ ﴿اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [یٰسٓ: ۸۲] ''کہ فرما دے کہ ہو جا، وہ اسی وقت ہو جاتی ہے۔'' میں امرِ تکوین ہے۔ چنانچہ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے اس کو جلد ہی بہشت میں داخل کر دیا۔

پھر جب وہ اس میں داخل ہوا اور اس کی نعمتوں اور عیش و راحت کا مشاہدہ کیا تو کہا: ﴿يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ﴾ یہ جملہ مستانفہ ہے جواب ہے مقدر کا۔ مثلاً کسی نے کہا کہ جب اس سے ﴿ادْخُلِ الْجَنَّةَ﴾ کہا گیا اور وہ جنت میں داخل ہوا تو اس کے بعد اس نے کیا کہا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ اس نے یوں کہا: ﴿يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ﴾ قوم سے مراد وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس کو قتل کیا، یا اس کے قتل کا ارادہ کیا، دونوں مذکور قولوں کی بنا پر اس نے اپنی زندگی میں اور موت کے بعد بھی ان کی خیر خواہی کی۔ ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سُبّاقِ امم تین ہیں، جنھوں نے طرفۃ العین (پلک جھپکنے کی مدت) میں بھی اللہ کے ساتھ کفر نہیں کیا۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور یہ ان سب سے افضل ہیں اور مومن آلِ فرعون اور صاحبِ یٰسٓ اور یہ لوگ صدیق ہیں۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس کو مرفوعاً ذکر کیا ہے،[1] لیکن اسی مضمون کی ایک حدیث بروایتِ طبرانی حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے، چنانچہ پہلے گزر چکی ہے اور اس کو حدیثِ منکر کہا ہے۔ دوسرے صاحبِ یٰسٓ کے ایمان کا قصہ پہلے گزر چکا ہے کہ اس نے ستر برس بتوں کو پوجا، پھر رسولوں پر ایمان لایا، اگر یہ صحیح طور پر مروی ہے تو طرفۃ العین کفر نہ کرنے کے کیا معنی ہیں؟! واللّٰہ أعلم.

﴿بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ﴾ میں کلمۂ ﴿مَا﴾ مصدریہ ہے۔ کسی نے کہا: موصولہ ہے: ''أَيْ: بِالَّذِيْ غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ''۔ حرفِ باء صلہ ہے ﴿يَعْلَمُوْنَ﴾ کا اور عائد محذوف ہے: ''أَيْ: غَفَرَهٗ لِيْ رَبِّيْ''۔ اس قول کو ضعیف شمار کیا ہے، اس لیے کہ اس کی یہ تمنا کہ اس کی قوم اس کے ذنوب مغفورہ کو معلوم کریں۔ اس کے کچھ معنی نہیں ہیں، مراد تو صرف اس کی تمنا ہے کہ اس کی قوم اس بات کو جان لے کہ اللہ نے اسے بخش دیا، تقریر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قوی قول یہی ہے کہ ما مصدریہ ہے: ''أَيْ: بِغُفْرَانِ رَبِّهٖ لَهٗ''

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ما'' استفہامیہ ہے اصل پر بہ معنی تعجب آیا ہے اور حرفِ باء صلہ ہے ﴿غَفَرَ﴾ کا، گویا یوں کہا: ''بِأَيِّ شَيْءٍ غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ'' یعنی کاش! میری قوم جان لیں کہ کس عجیب شے کے سبب سے میرے رب نے مجھے بخشا، اس شے سے مراد ان کے دین سے علاحدگی اختیار کرنا اور ان کے تکلیف دینے پر صبر کرنا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: اگر یہ قول صحیح ہوتا تو اللہ تعالیٰ ''بِمَ'' الف کے بغیر فرماتا۔ اس کا یہ جواب دیا ہے کہ لغتِ عرب میں الف کا اثبات وارد ہوا ہے گو بہ نسبت حذفِ الف کے قلیل ہے۔[2] اس کی تمنا میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ اس نے یہ تمنا کی کہ اس کے حال کو جان لیں، تاکہ اس کا اچھا انجام اور اچھی عاقبت معلوم کریں۔ اس سے غرض ان کا

---

[1] تفسیر القرطبی (۲۰/۱۵) الکشاف (۱۲/۴۔ ۱۳)
[2] فتح القدیر (۴۸۲/۴)

ذلیل کرنا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ اس نے یہ تمنا کی کہ اس کے حال کو معلوم کریں، تاکہ اس کے ایمان کی طرح ایمان لے آئیں تو آخر کو اُن کا حال بھی اس کے حال کی طرح ہو جائے۔

غرضیکہ قوم نے حبیب نجار کے ساتھ جو کچھ کرنا تھا کیا تو اللہ پاک نے اس کے لیے غصہ کیا اور ان کے لیے سزا میں جلدی کی اور ان کو صیحہ سے ہلاک کر ڈالا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ ﴾ یعنی ہم نے حبیب نجار کی قوم پر کوئی لشکر آسمان سے ان کو ہلاک کرنے اور ان سے انتقام لینے کے لیے اس کے بعد نہیں اتارا، جب انھوں نے اس کو قتل کر دیا، یا پہلے دیے ہوئے اختلاف کی بنا پر جب اس کو آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو ہلاک کرنے کے لیے ہم اس کے محتاج نہیں ہوئے کہ آسمان سے لشکر بھیجیں، جیسا کہ بدر کے دن نبی کریم ﷺ کے لیے ہوا کہ ان کی مدد کے لیے اور ان کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیجے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی ہلاکت کے لیے بعض وجوہ رکھی ہیں جو کسی حکمت کے تحت، جو اس کی مقتضی ہوئی، ظاہر ہوتی تھیں۔ یہ اصول صرف بعض قوموں کے لیے ہی نہیں تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی اُمتوں کو انواع واقسام کے عذاب سے ہلاک کیا ہے، کسی کو کسی عذاب سے کسی کو کسی آفت سے، اس کی حکمت وہی خوب جانتا ہے۔ وَلِلّٰهِ سُبْحَانَهُ الْحِكْمَةُ الْبَالِغَةُ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُوْنَ۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے الفاظ اس کی تفسیر میں یہ ہیں: "مَا كَاثَرْنَاهُمْ بِالْجُمُوْعِ، أَيْ: اَلْأَمْرُ أَيْسَرُ عَلَيْنَا مِنْ ذٰلِكَ"[1] ﴿ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴾ یعنی ہماری قضا وحکمت میں یہ بات ٹھیک نہیں ہوئی کہ ہم ان کے ہلاک کرنے کو کوئی لشکر اتاریں، اس لیے کہ ہماری قضا وقدر یوں سابق ہو چکی تھی کہ ان کا ہلاک کرنا چنگھاڑ سے ہے، لشکر نازل کرنے سے نہیں ہے۔ امام قتادہ، مجاہد اور حسن رحمہم اللہ نے کہا: نہیں اتاری ہم نے ان پر کوئی رسالت آسمان سے اور نہ کوئی نبی اس کے قتل کے بعد۔ امام حسن رحمہ اللہ سے بھی یہی مروی ہے کہ ﴿ جُنْدٍ ﴾ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو وحی لے کر نبیوں پر نازل ہوتے ہیں۔[2]

ظاہر یہ ہے کہ نظم قرآن کے معنی ان کی شان کا حقیر کرنا اور ان کے کام کا ذلیل اور صغیر کرنا ہے، یعنی وہ اس لائق نہیں کہ ہم ان کو ہلاک کرنے کے لیے آسمان سے کوئی لشکر نازل کریں، بلکہ ہم نے تو ان کو ایک چنگھاڑ سے ہلاک کر ڈالا، جس طرح کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً ﴾ اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی نہیں تھی وہ عقوبت یا انتقام یا اخذۃ یعنی پکڑ مگر ایک چنگھاڑ جس کو جبریل نے چیخ دیا تھا، سو ان کو ہلاک کر ڈالا۔

﴿ فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴾ یعنی تبھی وہ مردہ ہو رہے، ان کی کوئی حس سنائی نہیں دیتی تھی، جیسے آگ جب کہ وہ بجھ جائے۔ ان کے مرنے کی آگ سے تشبیہ دی ہے، جبکہ وہ بجھ جائے، اس لیے کہ حیات حرکت اور بھڑکنے میں چمکتی

[1] تفسیر الطبري (۲۰/۵۱۰، ۵۱۱) [2] تفسیر القرطبي (۱۵/۲۰)

10

ہوئی آگ کی طرح ہے اور موت اس کے بجھنے کی طرح ہے۔ جمہور نے ﴿ صَيْحَةً ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "كَانَ" ناقصہ ہے، اسم اس کا ضمیر ہے جو اس شے کی طرف پھرتی ہے جو سیاق سے سمجھی جاتی ہے، یعنی عقوبت وغیرہ۔ چنانچہ اس کے مرجع کی طرف ترجمہ میں اشارہ ہو چکا ہے۔ ابو جعفر، شیبہ، اعرج اور معاذ قاری رحمہم اللہ نے بہ رفع پڑھا ہے بنا بر "كَانَ" تامہ، "أَيْ: وَقَعَ وَحَدَثَ"

امام ابو حاتم نے اور بہت سے نحویوں نے اس کا انکار کیا ہے، بہ سبب تانیث کے جو ﴿ إِنْ كَانَتْ ﴾ میں ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر ویسا ہوتا جیسا ابو جعفر نے پڑھا ہے تو اللہ تعالیٰ "إِنْ كَانَ إِلَّا صَيْحَةٌ" فرماتا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس قراءت کی تقدیر کی ہے: "إِنْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ صَيْحَةٌ إِلَّا صَيْحَةٌ وَّاحِدَةٌ" اور زجاج کے علاوہ نے یہ تقدیر کی ہے: "مَا وَقَعَتْ عَلَيْهِمْ إِلَّا صَيْحَةٌ وَّاحِدَةٌ"۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "إِنْ كَانَتْ إِلَّا زَقْيَةً وَّاحِدَةً" پڑھا ہے۔ "زَقْيَةٌ" بہ معنی "صَيْحَةٌ" ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مصحف کے مخالف ہے اور نیز مشہور لغت "زَقَا يَزْقُوا إِذَا صَاحَ" ہے۔ اسی باب سے یہ مثل ہے: "أَثْقَلُ مِنَ الزَّوَاقِي"۔ لہٰذا اس بنا پر یہ واجب تھا کہ "زَقْوَةٌ" ہوتا۔ اس کا جواب اس بات سے دیا ہے جو امام جوہری رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے کہ "اَلزَّقْوُ وَالزَّقْيُ مَصْدَرٌ، وَقَدْ زَقَا الصَّدَا يَزْقُوا زَقًا، أَيْ: صَاحَ وَكُلُّ صَائِحٍ زَاقٍ وَالزَّقْيَةُ الصَّيْحَةُ"[1] (كذا في فتح البيان)

﴿ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۰ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝۳۱ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝۳۲ ﴾

ہائے افسوس بندوں پر! ان کے پاس جو بھی رسول آیا وہ اس کا مذاق ہی اُڑاتے (رہے) (30) کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی اُمتیں ہلاک کر دیں؟ بے شک وہ ان کے پاس نہیں لوٹیں گی (31) وہ سارے کے سارے (لوگ) ہی ہمارے پاس حاضر کیے جائیں گے (32)

جھٹلانے والوں پر اظہارِ افسوس:

علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ﴾ کی تفسیر "يَا وَيْلَ الْعِبَادِ" کی ہے، یعنی کیا خرابی ہے بندوں کی! امام قتادہ رحمہ اللہ کے الفاظ "يَا حَسْرَةَ الْعِبَادِ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ عَلٰى مَا ضَيَّعَتْ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ وَفَرَّطَتْ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ" ہیں، یعنی کیا حسرت ہے بندوں کی اپنی جانوں پر اس شے پر جس کو اللہ

[1] فتح القدير (٤/٤٨٤) فتح البيان (١١/٢٨٣-٢٨٦)

کے امر سے ضائع کیا اور اللہ کے امر میں کمی کی یا قرب و جوار میں کمی کی۔ بعض قراءتوں میں "یَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ عَلٰى أَنْفُسِهَا" ہے،[1] اس کے معنی یہ ہیں: کیا حسرت ہے ان کی اور قیامت کے دن ان کی ندامت ہے، جبکہ عذاب کا معائنہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں کو کیوں جھٹلایا اور اللہ کے امر کی کیوں مخالفت کی، چنانچہ بے شک وہ دارِ دنیا میں جھٹلانے والے تھے، ان کے پاس جب بھی کوئی رسول آیا، وہ اس سے ٹھٹھا کرتے تھے، یعنی اس کو جھٹلاتے اور اس سے ٹھٹھا کرتے تھے اور اس حق کا انکار کرتے تھے جس کے ساتھ وہ بھیجا گیا۔

عقیدۂ تناسخ کا رد:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَیْهِمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴾ یعنی کیا رسولوں کے جھٹلانے والوں نے اس بات سے نصیحت حاصل نہیں کی کہ جن کو اللہ نے ان سے پہلے ہلاک کر ڈالا ہے کہ کس طرح وہ لوگ اس دنیا میں واپس لوٹ کر نہیں آئے۔ بات ویسی نہیں ہے جو اُن میں سے بہت سے جاہلوں فاجروں نے کہی ہے کہ ﴿ اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا ﴾[المؤمنون: ۳۷] "(زندگی) تو صرف دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے جیتے رہتے ہیں۔" یہ دہریہ میں سے وہی لوگ ہیں جو دَور کے قائل ہیں اور یہی لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ دنیا کی طرف پھر آئیں گے، جیسے کہ اس میں تھے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے قولِ باطل کو ان پر رد فرمایا اور یوں ارشاد کیا: ﴿ اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ ... الآیة ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ کُلٌّ لَّمَّا جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴾ یعنی ساری اُمتیں گزشتہ اور آیندہ آنے والی عن قریب قیامت کے دن اللہ عزوجل کے روبرو حساب کے لیے حاضر ہوں گی، پھر وہ ان کو ان کے سارے اچھے اور برے اعمال کی جزا دے گا۔ اس آیت کے معنی اس آیت کی طرح ہیں: ﴿ وَاِنَّ کُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ﴾ [هود: ۱۱۱] "یقیناً ان میں سے ہر ایک جب ان کے روبرو جائے گا تو آپ کا رب اسے اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔" قراء نے اس حرف کے ادا کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ ان میں سے کسی نے تو "وَإِنْ كُلٌّ لَمَا" کو بہ تخفیف پڑھا ہے، اس کے نزدیک "إِنْ" اثبات کے لیے ہے اور کسی نے ﴿ لَمَّا ﴾ کو مشدد پڑھا ہے اور "إِنْ" کو نافیہ اور ﴿ لَمَّا ﴾ کو بہ معنی "إِلَّا" قرار دیا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَمَا كُلٌّ إِلَّا جَمِيْعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ" (ومعنی القراءتين واحد")۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

جمہور نے ﴿ یٰحَسْرَةً ﴾ بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ منادیٰ منکر ہے، گویا حسرت کو پکارا اور اس سے کہا:

[1] تفسير الطبري (۲۰/۵۱۲) [2] تفسير ابن كثير (۳/۷۴۷)

اے حسرت! یہ تیرا وقت ہے چنانچہ تو حاضر ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ منصوب ہے بنا بر مصدریت اور منادیٰ محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "یَا هٰؤُلَاءِ تَحَسَّرُوْا حَسْرَةً"، یعنی اے لوگو! حسرت کرو جس طرح حسرت کرنا چاہیے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے "یٰحَسْرَةُ" بالضم پڑھا ہے بنا بر ندا اور یہی اُبی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ میں کہا ہے کہ اختیار نصب ہے اور اگر نکرہ رفع دیا جائے تو جائز ہے۔ اور کئی اشیاء سے استشہاد کیا ہے جن کو عرب سے نقل کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ عرب سے اس طرح سنا گیا ہے: "یَا مُهْتَمُّ بِأَمْرِنَا لَا تَهْتَمَّ" اور یہ مصرع پڑھا ہے: ع یَا دَارُ غَيَّرَهَا الْبِلَى تَغْيِيْرًا

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں باب ندا کا یا اس کے اکثر کا باطل کرنا ہے۔ کہا کہ امام فراء رحمہ اللہ نے جو ذکر کیا ہے اس کی تقدیر یہ ہے: "یَا أَیُّهَا الْمُهْتَمُّ بِأَمْرِنَا لَا تَهْتَمَّ" اور مصرع کی تقدیر یہ ہے: "یَا أَیَّتُهَا الدَّارُ" حقیقت حسرۃ کی یہ ہے کہ انسان کو ندامت سے وہ شے لاحق ہو کہ جس کے سبب سے وہ حسیر ہو جائے،[1] یعنی ماندہ و دریغ خوردہ۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: اے حسرت بندوں سے ان کی جانوں پر اور ندامت و افسوس ان کے اللہ کے رسولوں کے ساتھ ٹھٹھا کرنے میں۔[2] اس معنی کی مؤید عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور علی بن الحسین رحمہ اللہ کی قراءت ہے: "یَا حَسْرَةَ الْعِبَادِ" بنا بر اضافت۔ اُبی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ قراءت مروی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حسرت کا صدور بندوں سے ہے اللہ سے نہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حسرت کفار پر فرشتوں کی حسرت ہے، جبکہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔ کسی نے کہا: یہ اس شخص کے قول سے ہے جو شہر کے پرلے سرے سے آیا تھا۔ کسی نے کہا: ﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ﴾ کے قائل کفار مکذبین ہیں اور "عباد" سے مراد رسول ہیں۔ یہ یوں ہے کہ جس وقت کفار نے عذاب دیکھا تو رسولوں کے قتل پر حسرت کی اور ایمان کے متمنی ہوئے۔ یہ قول امام ابو العالیہ اور مجاہد رحمہما اللہ کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان پر حسرت کرنا اللہ عزوجل کی طرف سے ہے بہ طریقِ استعارہ۔ اس سے اس شے کی تعظیم ہے جو انھوں نے جنایت کی، یعنی ان کا جرم بڑا بھاری ہے کہ اللہ عزوجل بہ طور استعارہ ان پر حسرت کرتا ہے۔

ابن ہرمز، مسلم بن جندب، عکرمہ اور ابو الزناد رحمہم اللہ نے "یَا حَسْرَةْ" بہ سکونِ ہاء پڑھا ہے، اس لیے کہ وصل کو مجرائے وقف میں جاری کیا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ "یَا حَسْرَتَا" ہے چنانچہ سورۃ الزمر میں بھی اسی طرح پڑھا گیا ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: "أَيْ: یَا وَیْلًا لِلْعِبَادِ"۔ ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: "اَلنَّدَامَةُ عَلَى الْعِبَادِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"۔[5] امام محلی رحمہ اللہ نے ﴿الْعِبَادِ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: "هٰؤُلَاءِ وَنَحْوُهُمْ مِمَّنْ كَذَّبُوا الرُّسُلَ فَأُهْلِكُوْا"۔[6] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ﴿الْعِبَادِ﴾ میں

---

[1] تفسیر القرطبي (١٥/٢٢، ٢٣) فتح القدير (٤/٤٨٤) [2] تفسیر الطبري (٢٠/٥١١، ٥١٢)
[3] تفسیر القرطبي (١٥/٢٣) فتح القدير (٤/٤٨٤، ٤٨٥) [4] رقم الآیة (٥٦)
[5] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣١٩٣) [6] تفسیر الجلالین (١/٥٨١)

الف و لام تعریفِ جنس کے لیے ہے، یعنی جنسِ کفارِ مکذبین۔ اور یہ تحسر ملائکہ کی طرف سے ہے۔ یا مومنین کی جانب سے، یا اللہ پاک کی طرف سے بطور استعارہ ان کے جرم کی تعظیم کے لیے۔ اس صورت میں حسرت کا لفظ ان کلمات میں سے ہوگا جو اللہ کے حق میں وارد ہوئے ہیں، جیسے: ضحک، نسیان، سخریہ، تعجب اور تمنی۔ انتہیٰ.

جملہ ﴿مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ﴾ مستانفہ ہے، اس سے مقصود رسولوں کی تکذیب اور ان سے استہزاء کرنے کا بیان کرنا ہے جس پر وہ قائم تھے اور یہی ان پر حسرت کرنے کا سبب ہے۔ پھر اللہ پاک نے ان کے حال سے تعجب دلایا، اس لیے کہ انھوں نے اپنی طرح کی پہلی اُمتوں کے حال سے عبرت نہ لی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ﴾ یعنی کیا انھوں نے پہلی اُمتوں کے ان بہت سے لوگوں کے بارے میں نہ جانا جن کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو جھٹلانے کے سبب سے بہت سی اُمتوں کو ہلاک کر ڈالا ہے اس کے باوجود، پھر بھی رسولوں کی تکذیب کیے جاتے ہیں اور اس سے باز نہیں آتے۔

قولہ تعالیٰ ﴿أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ﴾ بدل ہے ﴿كَمْ أَهْلَكْنَا﴾ سے بنا بر معنی، کیوں کہ معنی یہ ہیں کہ وہ یہ بات جان چکے ہیں کہ ہم نے اگلی اُمتوں میں سے بہت سے لوگوں کو ہلاک کیا ہے، یعنی یہ جان چکے ہیں کہ وہ ان کی طرف لوٹ کر نہیں آتے ہیں۔ امام سیبویہ نے کہا ہے کہ ﴿أَنَّهُمْ﴾ ﴿كَمْ﴾ سے بدل ہے اور وہ خبریہ بہ معنی کثیر ہے۔ چنانچہ اسی لیے غیر استفہام کا اس سے بدل پڑنا جائز ہوا، معنی یہ ہیں: کیا انھوں نے نہ جانا کہ اگلی اُمتیں جن کو ہم نے ہلاک کیا ہے، وہ ان کی طرف لوٹ کر نہیں آتیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿كَمْ﴾ موضع نصب میں ہے دو وجہ سے: ایک تو ﴿يَرَوْا﴾ سے، دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿أَهْلَكْنَا﴾ سے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلی وجہ محال ہے، اس لیے کہ "کَمْ" میں اس کا ماقبل عمل نہیں کرتا، کیوں کہ "کَمْ" استفہام ہے اور یہ محال ہے کہ استفہام اپنے ماقبل کے تحت میں داخل ہو اور اسی طرح "کَمْ" کا حکم ہے، جبکہ خبریہ ہو۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے اس کی طرف کچھ اشارہ کیا ہے کہ ﴿أَنَّهُمْ﴾ کو ﴿كَمْ﴾ سے بدل ٹھہرایا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے اس کا خوب رد کیا ہے۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے ﴿أَلَمْ يَرَوْا﴾ کے استفہام کو تقریری کہا ہے،[2] جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ [الانشراح: ۱] "کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھول دیا۔"

بالجملہ پہلے تو اللہ پاک نے یہ بیان کیا کہ جو لوگ ہلاک ہوگئے ہیں، وہ دنیا کی طرف لوٹ کر نہ آئیں گے، اس کے بعد یہ بیان کیا کہ سب کے سب محشر کی طرف رجوع کریں گے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَإِن كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ﴾ یعنی سب کے سب قیامت کے دن ہمارے پاس حساب کے لیے حاضر کیے جائیں گے۔ کسی

[1] تفسیر القرطبي (٢٤/١٥) [2] تفسیر الجلالین (٥٨١/١)

نے کہا کہ ﴿مُحۡضَرُوۡنَ﴾ بہ معنی ''مُعَذَّبُوۡنَ'' ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ﴿مُحۡضَرُوۡنَ﴾ اپنے حقیقی معنی پر ہے، یعنی حساب اور جزا کے لیے حاضر کرنا۔ امام ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے ﴿لَمَّا﴾ کو بہ تشدید پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ تخفیف۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے مشدد پڑھا ہے تو اس نے ﴿لَمَّا﴾ کو بہ معنی ''إِلَّا'' اور ''إِنْ'' کو بہ معنی ''مَا'' ٹھہرایا ہے: ''أَيْ: کُلٌّ إِلَّا جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ''[1] اور ﴿جَمِیۡعٌ﴾ کے معنی ''مَجْمُوْعُوْنَ'' ہیں۔ چنانچہ فعیل بہ معنی مفعول اور ﴿لَّدَیۡنَا﴾ اس کا ظرف ہے۔

دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ کلمۂ ﴿جَمِیۡعٌ﴾ کلمۂ ﴿کُلٌّ﴾ کے ساتھ مستدرک نہیں ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ استدراک نہیں کیا جاتا، مگر جب بطور تاکید مستعمل ہو۔ حاصل یہ ہے کہ ''کُلٌّ'' کے ساتھ تو اشارہ کیا گیا ہے افراد کے استغراق اور شمول کے لیے اور جمیع سے ایک جگہ میں سب کے اجتماع کے لیے اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ حشر ہے۔ غرضیکہ کلمۂ ﴿جَمِیۡعٌ﴾ تاکید نہیں ہے تاسیس ہے۔ (كذا قاله الحفناوي) اور تخفیف کی بنا پر ﴿اِنۡ﴾ مخففہ ہے مثقلہ سے اور اس کا مابعد مرفوع بہ ابتداء ہے اور تنوین ﴿کُلٌّ﴾ کے عوض ہے مضاف الیہ سے: ''أَيْ: کُلُّ الْخَلَایِقِ'' اور مابعد اس کی خبر ہے اور حرف لام وہی ہے جو مخففہ و نافیہ کے درمیان فارق ہوتا ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس قراءت کی بنا پر کلمۂ ''مَا'' زائد ہے۔ اس کے نزدیک تقدیر یہ ہے: ''وَإِنْ کُلٌّ لَجَمِيعٌ''۔ پھر اللہ پاک نے توحید اور حشر پر برہان کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنی نعمتوں کا شمار کیا اور ان کو یاد دلایا، تاکہ بندے اپنے منعم کی توحید کے قائل ہوں اور حشر و نشر کا اقرار کریں۔ چنانچہ فرمایا:[2]

وَاٰیَۃٌ لَّہُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَیۡتَۃُ ۚۖ اَحۡیَیۡنٰہَا وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡہَا حَبًّا فَمِنۡہُ یَاۡکُلُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلۡنَا فِیۡہَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ وَّفَجَّرۡنَا فِیۡہَا مِنَ الۡعُیُوۡنِ ﴿۳۴﴾ لِیَاۡکُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتۡہُ اَیۡدِیۡہِمۡ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۵﴾ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّہَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَمِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۶﴾

اور ان کے لیے مردہ زمین ایک (عظیم) نشانی ہے، ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس سے (اناج کا) دانہ نکالا، پھر وہ اسی سے کھاتے ہیں (33) اور ہم نے اس (زمین) میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کیے اور ہم نے ان میں چشمے جاری کیے (34) تاکہ وہ اس کے پھلوں سے کھائیں اور وہ (پھل) ان کے ہاتھوں نے نہیں بنائے، پھر کیا وہ شکر نہیں کرتے؟ (35)

---

[1] تفسير القرطبي (٢٤/١٥) [2] فتح البيان (٢٨٧/١١-٢٨٩)

پاک ہے وہ ذات جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے، ان چیزوں کے بھی جنھیں زمین اُگاتی ہے اور خود ان (انسانوں) کے اپنے بھی اور اُن کے بھی جنھیں وہ نہیں جانتے (36)

خالقِ کائنات کا وجود اور زندگی بعد الموت کا ثبوت:

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ﴾ یعنی ان کے لیے صانع کے وجود پر اور اس کی قدرتِ تامہ پر اور مُردوں کو زندہ کرنے پر مُردہ زمین میں ایک طرح کی دلیل ہے، جبکہ وہ مری دبی پڑی ہوتی ہے، اس میں کوئی بھی روئیدگی نہیں ہوتی، پھر جس وقت اللہ پاک اس پر پانی نازل کرتا ہے تو وہ ہلتی ہے اور اُبھرتی ہے اور ہر قسم کی بارونق روئیدگی اُگاتی ہے۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اَحْيَيْنٰهَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴾ یعنی ہم نے اس کو زندہ کیا اور ہم نے اس میں سے اناج نکالا، چنانچہ اسی میں سے کھاتے ہیں، یعنی ہم نے اس چیز کو نکالا جو اُن کا اور ان کے چوپایوں کا رزق ہے۔

﴿ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴾ یعنی ہم نے اس میں نہریں اور ندیاں بنائیں جو ایسی جگہوں کی طرف جاری ہوتی ہیں، جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ﴿ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ﴾ یعنی تاکہ وہ اس کے میووں میں سے کھائیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر کھیتیاں پیدا کرنے کا احسان رکھا تو ساتھ ہی پھلوں کا اور ان کی طرح طرح کی قسموں کا ذکر کیا۔

﴿ وَ مَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ﴾ یعنی یہ سب کچھ ان پر اللہ پاک کی رحمت سے ہے، یہ ان کی کوشش اور محنت سے یا ان کی قوت اور اختیار سے نہیں ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴾ یعنی پھر وہ ان بے حد وحساب نعمتوں کا شکر کیوں نہیں کرتے جس کا اس نے ان پر انعام کیا ہے؟! امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ جزم کیا ہے (یعنی ڈٹے رہے) اور اس کے سوا کوئی اور معنی بیان نہیں کیے، مگر صرف احتمال کے طور پر کہ ﴿ وَ مَا عَمِلَتْهُ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مَا ﴾ بہ معنی ﴿ الَّذِيْ ﴾ ہے۔ تقدیر یہ ہے: "لِيَأْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ أَيْ: غَرْسُوْهُ وَنَصَبُوْهُ"، یعنی تاکہ اس کے میوے کھائیں اور اس چیز سے کھائیں جس کو انھوں نے لگایا ہے اور نصب کیا ہے۔ کہا اور یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں اسی طرح ہے: "لِيَأْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمِمَّا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ أَفَلَا يَشْكُرُوْنَ"[1]

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ ﴾ یعنی پاک ذات ہے جس نے سب چیزوں سے، جس کو زمین اُگاتی ہے، یعنی کھیتیاں اور میوے اور روئیدگی، جوڑے بنائے ﴿ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾

[1] تفسير الطبري (٢٠/٥١٥)

یعنی اور خود اُن میں سے بھی نر اور مادہ بنائے۔ ﴿ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ اور ان مختلف مخلوقات میں بھی جوڑے بنائے، جن کو وہ پہچانتے نہیں ہیں، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [الذاریات۔ ٤٩] ''اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے، تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔''[1] (کذا في ابن کثیر)

فتح البیان کا بیان:

﴿ وَاٰيَةٌ ﴾ خبر مقدم ہے اور اس کی بڑائی کے لیے اس کو نکرہ ذکر کیا ہے اور ﴿ لَّهُمُ ﴾ اس کی صفت ہے، یا ﴿ اٰيَةٌ ﴾ سے متعلق ہے، اس لیے کہ ﴿ اٰيَةٌ ﴾ بہ معنی علامت ہے اور ﴿ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ﴾ مع موصوف وصفت مبتداء ہے، یعنی مردہ زمین بعث وتوحید پر ایک بڑی عظیم الشان نشانی ہے، ایسی نشانی کہ ان کے لیے ہونے والی ہے، یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ اٰيَةٌ ﴾ مبتداء ہو، کیوں کہ صفت کے ساتھ اس کی تخصیص ہوگئی اور اس کا مابعد خبر ہے۔ اہلِ مدینہ نے ''مَيِّتَةٌ'' کو بہ تشدید پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ تخفیف پڑھا ہے۔

جملہ ﴿ اَحْيَيْنٰهَا ﴾ مستانفہ ہے۔ ارضِ مَیْتہ کے آیت ونشانی ہونے کی کیفیت کو بیان کرتا ہے، یعنی مردہ زمین کا بعث وتوحید پر علامت ہونا یہ ہے کہ ہم نے اس کو پانی سے زندہ کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ''أرض'' کی صفت ہے، یعنی ایسی مردہ زمین کہ ہم نے اس کو زندہ کیا، چنانچہ اللہ پاک نے مردہ زمین کو زندہ کرنے سے مردوں کے زندہ کرنے کے بارے میں آگاہ کیا ہے اور بندوں کو اپنی نعمتیں اور اپنی کمالِ قدرت یاد دلائی، اس لیے کہ اس نے اپنی کمال قدرت سے زمین کو روئیدگی اُگا کر زندہ کر دیا اور اس سے دانے نکالے جن کو وہ کھاتے ہیں اور غذا حاصل کرتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴾ کے یہی معنی ہیں۔ ''حَبٌّ'' وہ دانے ہیں جن کو کھاتے ہیں۔ کلمۂ ''مِنْهُ'' کو پہلے رکھا، تا کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ بڑی شے جو کھائی جاتی ہے اور جس سے اکثر معاش اور گزران کا قیام ہوتا ہے، وہ اناج ہے۔ پھر فواکہ کا ذکر کیا اور فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ﴾ یعنی ہم نے زمین میں کھجوروں اور انگور کی مختلف اقسام کے باغ بنائے۔ ان دونوں کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کہ یہ سب میووں سے اعلیٰ اور زیادہ فائدہ دینے والے ہیں۔ کلمۂ ''نَخْلٌ وَّنَخِيْلٌ'' کے ایک ہی معنی ہیں، ان کا واحد ''نَخْلَةٌ'' ہے۔ مصباح میں کہا ہے کہ ''نَخْلٌ'' اسم جمع ہے اور واحد ''نَخْلَةٌ'' ہے جس کے جمع اور واحد کے درمیان حرفِ تاء سے فرق کیا جاتا ہے، اس کو حجاز والے مونث استعمال کرتے ہیں اور نجد اور تمیم والوں کے ہاں یہ مذکر مستعمل ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بارے میں کچھ اختلاف نہیں ہے۔[2] ''أَعْنَابٌ''، ''عِنَبٌ'' کی جمع ہے اور ''عِنَبَةٌ''، ''عِنَبٌ'' کا واحد ہے۔ پھر اور نعمت کا ذکر کیا جس سے میوے پیدا ہوتے ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/٧٤٧، ٧٤٨) [2] المصباح المنیر (١/٣٠٧)

فرمایا: ﴿ وَفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴾ کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے: "أَيْ: بَعْضًا مِنَ الْعُيُوْنِ" موصوف کو حذف کیا اور صفت کو اس کی جگہ میں رکھا، یعنی ہم نے زمین میں بعض ایسے بہائے جو چشموں میں سے بہتے ہیں، یا حرف ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے اس شخص کے مطابق جو کسی چیز کے اثبات میں "مِنْ" کی زیادتی کو جائز سمجھتا ہے۔ یعنی اخفش اور اس کے موافق لوگ۔ ﴿ الْعُيُوْنِ ﴾ مفعول ہے اور عیون سے مراد پانی کے چشمے ہیں۔ جمہور نے ﴿ وَفَجَّرْنَا ﴾ کو بہ تشدید پڑھا ہے اور جناح بن حبیش نے بہ تخفیف پڑھا ہے۔ "فجر وتفجير" (فجر آب راندن يقال: فجرت الماء فانفجر وفجرته للمبالغة فتفجر" صراح) لفظ اور معنی میں "فتح و تفتيح" کی طرح ہیں۔[1]

﴿ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ﴾ میں حرفِ لام ﴿ وَجَعَلْنَا ﴾ سے متعلق ہے اور ﴿ ثَمَرِهٖ ﴾ کی ضمیر لفظ مذکور کی طرف راجع ہے جو ﴿ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ﴾ کو شامل ہے، ورنہ "مِنْ ثَمَرِهِمَا" چاہیے تھا۔ یعنی ہم نے زمین میں کھجور اور انگور کے باغ بنائے، تاکہ ان کے میووں سے کھائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر مائے عیون کی طرف راجع ہے، یعنی تاکہ مائے عیون کے میووں سے کھائیں، کیوں کہ میوے اس سے ہوتے ہیں، یہ قول جرجانی کا ہے۔ جمہور نے ﴿ ثَمَرِهٖ ﴾ کو بہ فتحِ مثلثہ ومیم پڑھا ہے اور حمزہ اور کسائی نے بہ ضمِ ہر دو پڑھا ہے اور امام اعمش رحمہ اللہ نے بہ ضمِ مثلثہ واسکانِ میم۔ سورۃ الانعام میں اس کے متعلق کلام گزر چکا ہے۔[2]

﴿ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ﴾ میں کلمہ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے۔ یعنی تاکہ اس کے میووں سے کھائیں اور اس شے میں سے جس کو ان کے ہاتھوں نے بنایا ہے۔ جیسے: عصیر و دِبس (عصير افشره انگور و دبس بالكسر و شاب۔ صراح)۔ اور ان جیسی اور چیزیں جو کھجور اور انگور سے بناتے ہیں اور اسی طرح وہ درخت جو بندوں نے اپنے ہاتھوں سے نصب کیے اور کنویں وغیرہ جو خود انھوں نے اپنی محنت اور مشقت سے کھودے۔ اس معنی کی بنا پر اس میں مجاز ہے، کیوں کہ حقیقت میں ان اشیاء کا بھی خالق اور فاعل اللہ ہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کلمہ ﴿ مَا ﴾ نافیہ ہے، معنی یہ ہیں کہ بندوں نے اس کو نہیں بنایا، بلکہ اس کا بنانے والا اللہ عزوجل ہے۔ یعنی انھوں نے اشیائے مذکورہ کو بنا ہوا پایا، ان میں ان کی کچھ کاریگری نہیں ہے۔ یہ قول امام ضحاک اور مقاتل رحمہما اللہ کا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَا ﴾ نکرہ موصوفہ ہے بہ معنی شے، کلام اس میں مثل مائے موصولہ کے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مائے مصدریہ ہے: "أَيْ: عَمَلُ أَيْدِيْهِمْ" مصدر موقع مفعول بہ میں واقع ہے، چنانچہ معنی راجع ہوں گے موصولہ یا موصوفہ کے معنی کی طرف۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ "وَجَدُوْهَا مَعْمُوْلَةً لَمْ تَعْمَلْهَا أَيْدِيْهِمْ"، یعنی فرات، دجلہ، نہرِ بلخ اور اس کے مشابہ اور نہریں۔[4] مراد چشمے اور نہریں ہیں جن کو مخلوق کے ہاتھ نے نہیں بنایا۔ جمہور نے ﴿ عَمِلَتْهُ ﴾ پڑھا ہے اور کوفیوں نے ضمیر حذف کرکے "عَمِلَتْ" پڑھا ہے۔

(1) فتح القدير (٤/٤٧٦) (2) تفسير القرطبي (١٥/٢٥) (3) تفسير البغوي (٧/١٧) (4) الدر المنثور (٧/٥٥)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ ﴾ میں سوالیہ انداز ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے اور حرفِ فاء مقدر پر عطف کے لیے ہے، جس کا کہ مقام مقتضی ہے۔ "أَيْ: أَيَرَوْنَ هٰذِهِ النِّعَمَ؟ أَوْ أَيَتَنَعَّمُوْنَ بِهَا فَلَا يَشْكُرُوْنَهَا؟" یعنی اس استفہام سے مقصود ان کو اس بات پر سرزنش کرنا ہے کہ وہ ان نعمتوں کا شکر نہیں کرتے جن کا شمار کیا گیا۔ معنی یہ ہیں: کیا وہ دیکھتے ہیں ان نعمتوں کو یا کیا ان سے مزہ لیتے ہیں، پھر ان کا شکر نہیں کرتے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا ﴾ جملہ مستانفہ ہے، مقصد اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا ہے اس شے سے جو اُن سے واقع ہوئی کہ انھوں نے اس کی مذکورہ نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا اور اس بات پر تعجب ہے کہ ان چیزوں پر شکر کرنے میں انھوں نے خلل اندازی کی۔ حقیقت میں یہ بندوں کو حکم ہے کہ جو بات اس رب العزت کے لائق نہیں ہے اس سے اس کی پاکی بیان کریں۔ ﴿ سُبْحٰنَ ﴾ کے معنی میں پورے طور پر کلام گزر چکا ہے۔ ازواج سے مراد انواع و اصناف ہیں۔ چنانچہ ہر زوج ایک صنف ہے، اس لیے کہ رنگ، مزہ، شکل، خردی اور بزرگی میں وہ مختلف ہوتی ہے، چنانچہ ان کا مختلف ہونا ہی دراصل ان کا ازدواج ہے۔

﴿ مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ ﴾ ازواج کا بیان ہے۔ اس سے مراد تمام مذکورہ اشیاء وغیرہ ہیں جو اس میں اُگتی ہیں، اس لیے کہ وہ اصناف ہیں۔ ﴿ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ یعنی اور خود ان میں جوڑے پیدا کیے، مراد مذکر و مونث ہیں اور ﴿ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾ سے مراد خشکی اور دریا میں اور آسمان و زمین میں اللہ کی مخلوق کی قسمیں ہیں۔ چنانچہ جنگلوں اور دریاؤں میں ایسی چیزیں ہیں جن کو لوگ نہیں جانتے اور نہ اللہ پاک نے ان کو ان کے بارے میں بتایا ہے اور نہ ہی ان کے پہچاننے کی طرف ان کی رسائی ہوئی ہے۔ اس آیت میں استدلال کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ پاک پیدا کرنے میں منفرد ہے تو پھر یہ جائز نہیں کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔[1] (كذا في فتح البيان)۔ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایک اور نشانی ذکر کی جو اس کی توحید وقدرت اور الٰہ ہونے پر دال ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۙ﴿۳۷﴾
وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ؕ﴿۳۸﴾
وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ
یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ
وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾

اور ان کے لیے ایک نشانی رات ہے، ہم اس سے دن کو کھینچ نکالتے ہیں، پھر (دن ختم ہونے پر)

[1] فتح البيان (۱۱/۲۸۹۔۲۹۱)

یکا یک وہ اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں۝37 اور سورج اپنے ٹھکانے (پر پہنچنے) کے لیے رواں دواں رہتا ہے، یہ نہایت غالب، خوب جاننے والے (اللہ) کا اندازہ ہے۝38 اور چاند کی ہم نے (اٹھائیس) منزلیں مقرر کر رکھی ہیں، حتی کہ وہ کھجور کے خوشے کی پرانی ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہو جاتا ہے۝39 نہ سورج کے یہ لائق ہے کہ وہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے پہلے آ سکتی ہے اور ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیرتا پھرتا ہے۝40

دن رات اور سورج و چاند جیسی قدرتِ الٰہی کی عظیم الشان نشانیاں:

چاند اور سورج مہینے کے آخر میں ملتے ہیں تو چاند چھپ گیا، جب آگے بڑھا تو نظر آیا، پھر منزل منزل بڑھتا چلا، جب تک پھر اسی جگہ آ پہنچا ٹہنی کی طرح نظر آیا، پھر ٹہنی سا ہو کر چھپا، درمیان میں بڑھ کر پورا ہوا اور گھٹا اٹھائیس منزلیں ہیں۔ سورج چاند ملتے ہیں تو چاند سورج کو پکڑتا ہے سورج چاند کو نہیں پکڑتا اور رات دن میں سے کوئی آگے بڑھے، اس طرح کہ دن پر دوسرا دن آئے بغیر درمیان میں رات آئے اور ہر ستارہ ایک ایک گھیرا رکھتا ہے، اسی راہ پر پھرتا ہے، معلوم ہوا کہ ستارے آپ چلتے ہیں یہ نہیں کہ آسمان میں گڑے ہیں اور آسمان چلتا ہی نہیں تو پھرنا نہ فرماتے۔ انتہی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے لیے اس کی عظیم قدرت کی دلیل ہے رات اور دن کے پیدا کرنے میں۔ رات تو اپنے اندھیرے سے اس کی قدرت بتاتی ہے اور دن اپنی روشنی سے اس کے اقتدارِ کامل کا اظہار کرتا ہے۔ اس نے دونوں کو بنایا ہے اس طریقے پر کہ ایک دوسرے کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ رات آتی ہے تو دن جاتا ہے اور دن آتا ہے تو رات جاتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''وہ شب سے دن کو ایسے طور پر چھپا دیتا ہے کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آلیتی ہے۔''

اسی لیے اللہ عزوجل نے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ ﴾ یعنی رات ایک نشانی ہے ان کے لیے، ہم اس سے دن کو قطع کر لیتے ہیں تو وہ چلا جاتا ہے۔ پھر رات آتی ہے، اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴾۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے: «إِذَا أَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هٰهُنَا وَأَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هٰهُنَا وَغَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ أَفْطَرَ الصَّائِمُ»[1] یعنی جس وقت رات مشرق سے منہ کرے اور دن مغرب سے پیٹھ دے اور سورج ڈوب جائے تو روزہ دار روزہ افطار کر لے۔ آیت سے جو معنی ظاہر ہیں، وہ یہی ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کا یہ زعم ہے کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ﴾ [الفاطر: ١٣] ''وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔'' امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس جگہ قتادہ رحمہ اللہ کے قول کو ضعیف کیا

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٨٥٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٠٠)

ہے اور کہا ہے کہ ایلاج کے معنی تو یہی ہیں کہ لینا رات سے دن میں اور دن سے رات میں حالاں کہ اس آیت میں یہ مراد نہیں ہے۔ یہ بات جو ابن جریر رحمہ اللہ نے کہی حق ہے۔

﴿ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ﴾ کے معنی میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ سورج کا مستقر مکانی مراد ہے اور وہ عرش کے نیچے ہے اس جانب سے جو زمین سے متصل ہے اور وہ کہیں ہو عرش کے نیچے ہی ہے، وہ اور ساری مخلوقات کا چھت ہے۔ عرش کرہ نہیں، جیسا کہ ہیئت والوں میں سے بہتوں کا خیال ہے، وہ تو ایک قبہ ہے پایوں والا، فرشتے اس کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ فوق العالم ہے، اس طرف سے جو سرہائے مردم کے متصل ہے۔ چنانچہ سورج جس وقت قبۂ فلک رابع میں اس مقام کے مقابل ہوتا ہے تو یہ آدھی رات کا وقت ہوتا ہے تو اس وقت سب وقتوں سے زیادہ عرش سے دور ہوتا ہے تو وہ اس وقت سجدہ کرتا ہے اور طلوع ہونے کی اجازت چاہتا ہے، چنانچہ اس بارے میں حدیثیں آئی ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ میں مسجد میں غروبِ شمس کے وقت نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو ذر! کیا تو جانتا ہے کہ سورج کہاں ڈوبتا ہے؟ میں نے عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک وہ جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ﴾[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت ان الفاظ سے بیان کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا مستقر زیرِ عرش ہے۔[2] (هكذا أورده ههنا وقد أخرجه في أماكن متعددة ورواه بقية الجماعة إلا ابن ماجه من طرق عن الأعمش به)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے، کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں تھا، جب کہ سورج ڈوبا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو ذر! تو جانتا ہے کہ سورج کہاں جاتا ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک وہ جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے رب عز وجل کے روبرو سجدہ کرتا ہے، پھر وہ لوٹ جانے کا اذن مانگتا ہے، چنانچہ اس کو اذن دیا جاتا ہے، گویا اس سے کہا جاتا ہے کہ لوٹ جا جہاں سے تو آیا ہے، چنانچہ وہ اپنے مطلع کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہ اس کا مستقر ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا: ﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ﴾[3]

سفیان ثوری رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا جب سورج ڈوبا: کیا تو جانتا ہے کہ وہ کہاں جاتا ہے؟ میں نے عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٢٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩)

[3] مسند أحمد، رقم الحديث (١٥٢/٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٢٨)

ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ بے شک جاتا ہے، یہاں تک کہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے، پھر اذن مانگتا ہے تو اس کو اذن دیا جاتا ہے اور قریب ہے کہ وہ سجدہ کرے تو اس سے قبول نہ کیا جائے اور اذن مانگے تو اسے اذن نہ دیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ لوٹ جا جہاں سے تو آیا ہے تو وہ اپنے مغرب سے طلوع کرے، چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾[1]

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ سورج طلوع کرتا ہے تو بنی آدم کے گناہ اس کو رد کرتے ہیں، یہاں تک کہ جس وقت وہ ڈوبتا ہے تو سلام کرتا ہے اور سجدہ کرتا ہے اور اذن مانگتا ہے تو اسے اذن دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ جس وقت ایک دن ہوگا تو وہ ڈوبے گا، پھر سلام کرے گا اور سجدہ کرے گا، پھر جتنا اللہ چاہے گا اس کو روکا جائے گا، پھر اس سے کہا جائے گا تو وہاں سے طلوع کر جہاں سے تو غروب ہوا ہے، کہا: بے شک پھر اس دن سے قیامت کے دن تک کسی نفس کو اس کا ایمان کوئی فائدہ نہ دے گا، جو اس سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا، یا اس نے اپنے ایمان میں کوئی خیر نہ کمائی ہوگی۔[2] کسی نے کہا ہے کہ مستقر سے مراد اس کا انتہائے سیر ہے اور وہ موسم گرما میں اس کی آسمان میں انتہائی بلندی ہے، اور یہ اس کی اَوج (بلندی) ہے، پھر اس کی غایتِ انخفاض، یعنی انتہائی پستی موسم سرما میں ہے، یہ اس کی حضیض ہے۔

قولِ ثانی یہ ہے کہ اس کے مستقر سے مراد اس کا منتہائے سیر ہے، یہ روزِ قیامت ہے۔ اس کا چلنا باطل ہو جائے گا اور اس کی حرکت ساکن ہو جائے گی اور وہ بے نور کر دیا جائے گا اور یہ عالم اپنی غایت کی طرف منتہی ہوگا، یہ اس کا مستقر زمانی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ ''أَيْ: لِوَقْتِهَا وَلِأَجَلٍ لَا تَعْدُوْهُ''[3] یعنی سورج اپنے وقت اور اپنی مدت پر چلا جاتا ہے، اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے مطالع صیفی (موسم گرما کے مطلعوں) میں ایک مدت تک منتقل ہوتا رہتا ہے، اس سے آگے نہیں بڑھتا، پھر مطالع شتائی (موسم سرما کے مطلعوں) کی طرف منتقل ہوتا ہے اور وہاں ایک مدت تک منتقل ہوتا رہتا ہے، اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یوں پڑھا ہے: ''وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لَا مُسْتَقَرَّ لَهَا''[4] یعنی سورج چلتا ہے اس کو کوئی قرار اور سکون نہیں ہے، بلکہ رات دن چلتا ہے، نہ سست ہوتا ہے نہ ٹھہرتا ہے، جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ﴾ [إبراهيم: ٣٣] ''اسی نے تمھارے لیے سورج چاند مسخر کر دیا ہے کہ برابر ہی چل رہے ہیں۔'' یعنی سورج، چاند روزِ قیامت تک سست نہیں ہوتے اور نہ ٹھہرتے ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٧) [2] تفسير الصنعاني (١٤٢/٣)
[3] تفسير الطبري (٥١٧/٢٠) الدر المنثور (٥٧/٧) [4] تفسير ابن كثير (٧٤٩/٣)

﴿ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ یعنی یہ اندازہ ہے اس زبردست کا جس کی نہ کوئی مخالفت کرتا ہے نہ ممانعت اور اس باخبر کا اندازہ ہے جو ساری حرکات وسکنات کو جانتا ہے، اس نے اس کا اندازہ کیا ہے اور اس کو ایسے انداز پر مقرر کیا ہے جس میں نہ کسی طرح کا اختلاف ہے اور نہ تضاد، جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ [الأنعام: ٩٦] ''وہ صبح کا نکالنے والا ہے اور اس نے رات کو راحت کی چیز بنایا ہے اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے۔ یہ ٹھہرائی ہوئی بات ہے ایسی ذات کی جو قادر ہے بڑے علم والا ہے۔'' اور اسی طرح سے سورت حم السجدہ کی اس آیت کو ختم کیا ہے: ﴿ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ [حم السجدة: ١٢] ''یہ تدبیر اللہ غالب و دانا کی ہے۔''

پھر اللہ جل وعلا نے فرمایا: ﴿ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ ﴾ یعنی بنایا ہم نے چاند کہ چلتا ہے ایک اور چال جس سے مہینوں کے گزرنے پر استدلال کیا جاتا ہے، جس طرح کہ سورج سے رات اور دن پہچانا جاتا ہے۔ جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۗ ﴾ [البقرة: ١٨٩] ''لوگ آپ سے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجیے کہ یہ لوگوں (کی عبادت) کے وقتوں اور حج کے موسم کے لیے ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴾ [يونس: ٥] ''وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو نورانی بنایا اور اس کے لیے منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں بے فائدہ نہیں پیدا کیں۔ وہ یہ دلائل ان کو صاف صاف بتلا رہا ہے جو دانش رکھتے ہیں۔'' اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٢] ''ہم نے رات اور دن کو اپنی قدرت کی نشانیاں بنائی ہیں، رات کی نشانی کو تو ہم نے بے نور کر دیا ہے اور دن کی نشانی کو روشن بنایا ہے، تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کر سکو اور اس لیے بھی کہ برسوں کا شمار اور حساب معلوم کر سکو اور ہر ہر چیز کو ہم نے خوب تفصیل سے بیان فرما دیا ہے۔''

چنانچہ اللہ پاک نے سورج کے لیے ایک ایسا ضوء بنایا ہے جو اس کے ساتھ خاص ہے اور چاند کے لیے ایک ایسا نور ٹھہرایا ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے اور دونوں کی چالوں کے درمیان فرق رکھا ہے، چنانچہ سورج تو ہر روز طلوع کرتا ہے اور اس کے آخر میں ایک روشنی پر ڈوبتا ہے، لیکن اپنے طلوع اور غروب کی جگہوں میں گرمی وسردی میں منتقل ہوتا رہتا ہے، اس کے سبب سے دن بڑھتا ہے رات گھٹتی ہے، پھر رات لمبی ہوتی ہے اور دن چھوٹا ہوتا ہے اور اس کا تسلط دن میں رکھا ہے۔ چنانچہ وہ کوکب نہاری ہے۔ رہا چاند تو اس کی منزلیں مقرر کی ہیں مہینے کی پہلی رات میں

سکڑا ہوا کم نور طلوع ہوتا ہے۔ پھر دوسری رات میں اس کا نور زیادہ ہوتا ہے اور اس کی منزل مرتفع ہوتی ہے، پھر جتنی وہ مرتفع ہوتی جاتی ہے اتنا ہی اس کا نور بڑھتا جاتا ہے، اگرچہ اس کی روشنی سورج سے حاصل کی ہوئی ہے کہ از مہر پرتو بود ماہ را۔ ''چاند کی روشنی سورج کی مرہونِ منت ہے۔'' یہاں تک کہ چودھویں رات میں اس کا نور پورا ہو جاتا ہے، پھر کم ہونا شروع ہوتا ہے آخر ماہ تک یہاں تک کہ پرانی ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ عرجون اصل عذق ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرجونِ قدیم یعنی عذقِ یابس۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد یہ ہے کہ عنقود کی اصل رطب سے ہے، جبکہ وہ پرانی اور خشک ہو جائے اور منحنی ہو جائے، اسی طرح ان کے سوا اَوروں نے کہا ہے۔

پھر اللہ پاک اس کے بعد دوسرے مہینے کے شروع میں اس کو جدید کر کے ظاہر کرتا ہے۔ عرب لوگ چاند کے اعتبار سے مہینے کی ہر تین راتوں کا ایک نام رکھتے ہیں۔ چنانچہ پہلی تین راتوں کو ''غرر'' کہتے ہیں اور ان کے بعد کی راتوں کو ''نفل'' اور ان کے مابعد کو ''تسع'' کہتے ہیں، اس لیے کہ ان کے آخر کی رات نویں ہے، پھر ان کے مابعد کو ''عشر'' کہتے ہیں، اس لیے کہ ان کی پہلی رات دسویں ہے اور ان کے مابعد کو ''بیض''، اس لیے کہ ان میں چاند کی روشنی ہوتی ہے آخر رات تک اور ان کے مابعد کو ''دُرَع'' کہتے ہیں۔ یہ ''دَرْعَاء'' کی جمع ہے، اس لیے کہ ان راتوں کے شروع میں چاند کے دیر سے نکلنے کی وجہ سے سیاہی ہوتی ہے۔ ''شاۃِ درعاء'' وہ بکری ہے جس کا سر سیاہ ہوتا ہے۔ ان کے بعد تین راتیں ''ظلم'' ہیں، پھر تین ''حنادس'' ہیں اور تین ''دراری'' اور تین ''محاق''، اس لیے کہ ان میں چاند یا مہینا بے نور ہوتا ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ ''تسع'' اور ''عشر'' کا انکار کرتے تھے، کتاب غریب المصنف میں اسی طرح کہا ہے۔ کاتبِ حروف۔ عفا اللّٰہ عنہ۔ عرض کرتا ہے کہ علامہ میر عبد الجلیل بلگرامی رحمہ اللہ نے ان ناموں کو کیا خوب نظم فرمایا ہے ؎

غُرر نُفل تسع است و عشر بود بابیض دُرع ظلم چو حنادِس دراری ست و محاق

''(چاند کی) روشنی کا ارتقاء نو دن تک اور بالکل سفید راتیں دس ہوتی ہیں، اندھیرے کا سایہ تاریکی کی مانند لمبا ہوتا ہے اور پھر تین راتیں وہ ہوتی ہیں، جن میں چاند نظر نہیں آتا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سورج اور چاند میں سے ہر ایک کے لیے ایک حد ہے کہ وہ اس سے تجاوز نہیں کرتا اور نہ ہی اس سے پہلے قاصر ہوتا ہے۔ جب اس کا سلطان آیا تو یہ چلا گیا اور جب یہ چلا گیا تو اس کا سلطان آیا۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ شبِ ہلال ہے۔[3] (قال عبدالرزاق أخبرنا معمر عن الحسن... الخ)۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ سے

---

[1] تفسیر الطبري (۲۰/۵۱۸) [2] تفسیر ابن کثیر (۳/۷۵۰) [3] تفسیر الصنعاني (۳/۱۴۳)

روایت کیا ہے کہ ہوا کا ایک بازو ہے اور چاند پانی کے ایک غلاف کی طرف ٹھکانا پکڑتا ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود ابو صالح سے روایت کیا ہے کہ یہ اس کی روشنی کو نہیں پاتا اور نہ یہ اس کی روشنی کو۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: مراد یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک سلطان ہے، چنانچہ سورج کو یہ لائق نہیں کہ رات میں طلوع ہو۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا الَّيۡلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس وقت رات ہو تو یہ لائق نہیں ہے کہ اور رات ہو جائے، یہاں تک کہ دن ہو، چنانچہ سورج کا سلطان تو دن میں ہے اور چاند کا سلطان رات میں ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رات اس جگہ سے نہیں جاتی، یہاں تک کہ اس جگہ سے دن آتا ہے اور اپنے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو تیز طلب کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک دوسرے سے ادھیڑا جاتا ہے۔[2] اس میں مراد یہ ہے کہ رات اور دن کے درمیان کوئی مہلت نہیں ہے، بلکہ ان میں سے ہر ایک بغیر کسی مہلت اور تاخیر کے بغیر دوسرے کے پیچھے آتا ہے، کیوں کہ ان دونوں کو اس طرح مسخر کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو بہت تیزی سے طلب کرتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكُلٌّ فِيۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ﴾ یعنی رات اور دن اور سورج اور چاند سب کے سب فلکِ سماء میں دَور کرتے ہیں۔[3] (قاله ابن عباس رضي الله عنهما وعكرمة والضحاك والحسن وقتادة وعطاء الخراساني)۔ عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: "فِيۡ فَلَكٍ بَيۡنَ السَّمَاءِ وَالۡأَرۡضِ"[4] یعنی آسمان و زمین کے درمیان ایک گھیرے میں دور کرتے ہیں۔ (رواه ابن أبي حاتم و هو غريب جدا بل منكر) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سلف میں سے کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے: "فِيۡ فَلۡكَةٍ كَفَلۡكَةِ الۡمِغۡزَلِ"[5] یعنی ایک گھیرے میں اس طرح دور کرتے ہیں جس طرح تکلے کا گھیرا ہوتا ہے۔ "فلكه" مغزل کا ڈمرکا ہے جس میں تکلا لگا ہوتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "اَلۡفَلَكُ كَحَدِيۡدَةِ الرَّحَى أَوۡ فَلۡكَةِ الۡمِغۡزَلِ لَا يَدُوۡرُ الۡمِغۡزَلُ إِلَّا بِهَا، وَلَا تَدُوۡرُ إِلَّا بِهِ" یعنی فلک لوہے کی چکی کی طرح ہے، یا ڈمرکے تکلے کی طرح ہے، تکلا نہیں پھرتا مگر ڈمرکے کے ساتھ اور ڈمرکا نہیں پھرتا مگر تکلے کے ساتھ۔[6] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

"سلخ" کشط اور نزع کو کہتے ہیں (کشط برہنہ کردن دجل از پشت ستور برگرفتن ونزع کشیدن و برکندن۔ص)۔ محاورے میں بولتے ہیں: "سَلَخَهُ اللّٰهُ مِنۡ بَدَنِهٖ" یعنی اللہ اس کے بدن سے اس کا پوست اتارے۔ پھر "سلخ" کا استعمال اخراج کے معنی میں کیا جاتا ہے، چنانچہ اللہ پاک نے روشنی کے جانے کو اور تاریکی کے آنے کو "سلخ" کی

---

[1] تفسير الطبري (٥٢٠/٢٠) تفسير ابن كثير (٧٥٠/٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣١٩٦/١٠، ٣١٩٥)

[3] تفسير الطبري (٥٢١/٢٠) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٣١٩٦/١٠)

[5] تفسير الطبري (٥٢٠/٢٠، ٥٢١) [6] تفسير ابن كثير (٧٤٨/٣_٧٥١)

طرح ٹھہرایا ہے اور یہ ایک استعارۂ بلیغہ ہے۔ ﴿ فَاِذَا هُمۡ مُّظۡلِمُوۡنَ ﴾ کلمۂ "إِذَا" مفاجات کا ہے اور "إِظْلَام" اندھیرے میں داخل ہونے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَظْلَمْنَا" یعنی ہم داخل ہوئے رات کی تاریکی میں۔ اسی طرح "أَظْهَرْنَا وَأَمْسَيْنَا وَأَصْبَحْنَا" ہے، یعنی ہم داخل ہوئے ظہر کے وقت میں اور داخل ہوئے شام میں اور صبح میں۔ کسی نے کہا: ﴿ مِنۡهُ ﴾ بہ معنی "عَنْهُ" ہے، معنی یہ ہیں کہ ہم رات سے دن کی روشنی کو کھینچتے ہیں تو اسی وقت وہ تاریکی میں داخل ہوتے ہیں، اس لیے کہ دن کی روشنی ہوا میں داخل ہوتی ہے تو وہ روشن ہو جاتی ہے، پھر وہ روشنی جب اس سے نکلتی ہے تو تاریک ہو جاتی ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: "يُرْمَى بِالنَّهَارِ عَلَى اللَّيْلِ فَيَأْتِي بِالظُّلْمَةِ"[1] اس کی وجہ یہ ہے کہ ظلمت اصل ہے اور دن رات پر داخل ہے، پھر جب سورج ڈوب گیا تو دن رات سے سلخ کیا گیا، یعنی کھینچ لیا گیا اور زائل کیا گیا، چنانچہ ظلمت ظاہر ہو جاتی ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے ﴿ نَسۡلَخُ ﴾ کے معنی "نَفْصِلُ" لکھے ہیں۔[2] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ہم زائل کرتے ہیں اس سے دن کو۔ ظاہر اس کا (یعنی محلی کا کلام) یہ خبر دیتا ہے کہ دن رات پر طاری ہے۔ امام مرزوقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ رات دن سے پہلے ہے، کیوں کہ جس میں سے کسی چیز کو کھینچا جائے وہ کھینچے جانے والی شے سے پہلے ہوتا ہے[3] جس طرح کہ مغطی (جس پر پردہ ڈالا جائے) پردے سے پہلے ہوتا ہے، لیکن اس بارے میں سورۃ الرعد میں کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ رات اور دن کے درمیان تو الج و تداخل ہے، یعنی باہم ایک دوسرے میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يُكَوِّرُ الَّيۡلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيۡلِ ﴾ [الزمر: ٥] "رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹ دیتا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالشَّمۡسُ تَجۡرِىۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ﴾ میں یہ احتمال ہے کہ حرفِ واو ﴿ الَّيۡلُ ﴾ پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَآيَةٌ لَّهُمُ الشَّمْسُ" یعنی سورج ان کے لیے ایک اور نشانی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حرفِ واو ابتدائیہ ہو اور ﴿ الشَّمۡسُ ﴾ مبتداء اور اس کا مابعد خبر ہو۔ اس صورت میں یہ جملہ مستانفہ ایک مستقل آیت کے ذکر پر مشتمل ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ کلام میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "تَجْرِي لِمَجْرًى مُسْتَقَرٍّ لَهَا" اس صورت میں حرفِ لام علت کا ہوگا، یعنی وہ منتہی ہوتا ہے اپنے چلنے میں ایک مجری کے لیے جو اس کا مستقر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حرفِ لام بہ معنی "إِلَى" ہے اور کسی نے اسی طرح پڑھا بھی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مستقر سے مراد روزِ قیامت ہے، چنانچہ وہ اس وقت ٹھہر جائے گا، اس کی حرکت باقی نہ رہے گی۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا مستقر وہ دور کی جگہ ہے، جس کی طرف وہ منتہی ہوتا ہے اور اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ کسی نے کہا ہے کہ گرمی میں اس کی انتہائی بلندی اور سردی

---

[1] فتح القدير (٤/٤٨٦) [2] تفسير الجلالين (١/٥٨٢) [3] روح المعاني (٨/١٣٦)

میں اس کا بہت نیچے آجانا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا مستقر عرش کے نیچے ہے، کیوں کہ وہ وہاں جاتا ہے، پھر سجدہ کرتا ہے، پھر رجوع کا اذن مانگتا ہے تو اسے اذن دیا جاتا ہے۔ راجح قول یہی ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سورج کے لیے سال میں تین سو ساٹھ مطلع ہیں، ہر روز ایک مطلع میں نزول کرتا ہے، پھر وہ ایک سال تک اس میں نزول نہیں کرتا، وہ ان ہی منزلوں میں چلتا ہے، یہی اس کا مستقر ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ سورج رات میں چلتا ہے اور ایک اور اہلِ زمین میں عالم پر طلوع کرتا ہے اگرچہ ہم اس کو پہچانتے نہیں ہیں۔ (یہی وجہ ہے کہ پہلے پہل اس عالم کی تلاش کے لیے مسلمان لوگ گئے، مگر اسباب کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام پورا نہ ہو سکا۔ یہ بات کسی تاریخِ نصاریٰ میں لکھی ہے، بعد میں جب اللہ پاک نے چاہا تو اسباب مہیا کر دیے اور نئی دنیا پر مطلع فرما دیا)۔ اس قول کی تائید وہ بات کرتی ہے، جو فقہاء نے بابِ مواقیت میں کہی ہے، جیسے: شمسِ رملی کے پانچوں وقت بہ سبب اختلافِ جہات ونواحی کے مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے پاس مغرب کا وقت دوسروں کے پاس عصر کا وقت ہوتا ہے اور ہمارا ظہر کا وقت دوسروں کے نزدیک صبح ہوتی ہے اور اسی طرح دوسرے اوقات۔ اور اقوال بھی ہیں۔ راجح قول یہی ہے کہ اس کا مستقر زیرِ عرش ہے۔ چنانچہ اس بارے میں حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔

امام محی الدین نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مفسرین نے اس میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ ایک جماعت ظاہر حدیث کی قائل ہوئی۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قول کی بنا پر جس وقت روزانہ سورج ڈوبتا ہے تو عرش کے نیچے ٹھہرتا ہے، یہاں تک کہ طلوع ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک مستقر کی طرف چلتا ہے اور ایک اصل کی طرف جو اس کے لیے مقرر ہے جس سے تجاوز نہیں کرتا ہے۔ اس قول کی بنا پر اس کا مستقر اس کے چلنے کی وہ آخری جگہ ہے جہاں دنیا کا آخری حصہ ہے۔ رہا سورج کا سجدہ کرنا تو وہ ایک تمیز اور ادراک ہے جو اللہ تعالیٰ اس میں پیدا کر دیتا ہے۔ والله سبحانه أعلم.[2] انتهى.

سیدنا عبداللہ بن مسعود، بن عباس رضی اللہ عنہم، امام عکرمہ، امام زین العابدین، ان کے فرزند امام محمد باقر اور ان کے فرزند امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے "لَا مُسْتَقَرَّ لَهَا" پڑھا ہے، یہ لائے نفی جنس و بنائے مستقر بر فتح اور ابن ابی عبلہ نے "لَا مُسْتَقَرٌّ لَهَا" پڑھا ہے، یہ لا بہ معنی "لَيْسَ" اور "مُسْتَقَر" اس کا اسم اور ﴿ لَهَا ﴾ اس کی خبر۔[3] ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ ہے جریِ شمس کی طرف ہے جو ﴿ تَجْرِيْ ﴾ سے مفہوم ہوتی ہے، یعنی سورج کا یہ چلنا اس حساب پر ہے جس کے استخراج سے نظر بند ہوئی جاتی ہے اور فہم اس کے استنباط سے حیران رہ جاتے ہیں۔

﴿ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ اندازہ ہے اس ذات پاک کا جو اپنی قدرت سے ہر مقدور پر غالب اور قاہر ہے اور جس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ "مُسْتَقَر" کی طرف راجع ہو، یعنی

---

[1] تفسير القرطبي (٦٨/١٥)   [2] المنهاج للنووي (١٩٥/٢-١٩٧)   [3] فتح القدير (٤٨٧/٤)

یہ "مُسْتَقَر" اللہ کی تقدیر ہے اس کا اندازہ کیا ہوا ہے۔ کاتب حروف ۔عفا اللّٰہ عنہ۔ کہتا ہے کہ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث جو سجدۂ شمس کے بارے میں پہلے مذکور ہو چکی ہے،[1] اس کے متعلق کسی کتاب میں ایک فائدہ لکھا ہوا دیکھا تھا، اس کو لکھ رکھا تھا، کتاب کا نام یاد نہیں، چوں کہ یہ جگہ اس کے لیے مناسب ہے اور بات نفیس ہے، اس لیے یہاں لکھی جا رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اس روایت کی دوسری حدیث میں یوں تفصیل کی گئی ہے کہ سورج جس وقت غروب ہوتا ہے تو چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ عرش کے نیچے پہنچتا ہے تو اللہ کے لیے سجدہ کرتا ہے اور دوسرے دن کو اہلِ دنیا پر طلوع ہونے کا اذن مانگتا ہے تو اسے اذن دیا جاتا ہے اور حُلہ ہائے نور سے ایک حُلہ اس کو پہنا دیا جاتا ہے، پھر وہ دنیا کی طرف آتا ہے اور اپنے نور اور اشراق سے ان پر طلوع ہوتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس حدیث کے لیے عالم کی ہیئت ایسی وجہ پر مروی ہے کہ اس کا ذکر کرنا طول کا مقتضی ہے۔ اس روایت کی تحقیق ہمارے نزدیک یہ ہے کہ سورج زیرِ زمین میں دائرۂ نصف النہار میں پہنچتا ہے تو وہ ہماری طرف نسبت کر کے انتہا درجے کے انحطاط میں ہوتا ہے، اگرچہ وہ فی نفسہٖ زمین کے اوپر ہے، اپنے آسمان میں اور اس کا آسمان زیرِ عرش ہے، وہ کسی جگہ ہو، لیکن اس مقام میں اس کی طرف نظر بہ نسبت ہمارے ہے اور بہ نسبت اس معنے کے جس کا فیضان اس سے ہم پر ہوتا ہے۔ بے شک علمِ نجوم والوں کے لیے معانی اور کیفیات مختلف ہیں، اس بات میں کہ سورج وغیرہ ستاروں سے ان کا فیضان ہوتا ہے موافق ان کے اوضاع کے بیوت دوازدہ گانہ میں، چنانچہ یہ مقام، یعنی سورج کی غایتِ انحطاط کا مقام، اس سے سجود کے ساتھ تعبیر کی جاتی ہے اور شرع شریف سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بندہ سب اوقات سے بڑھ کر اپنے رب کے قریب اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ ساجد ہو اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ وہ سجدے میں اپنے قیام کی حالت کی نسبت زیادہ دور ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی طرح سورج کو حق کی طرف ایک قربِ معنوی حاصل ہوتا ہے، جو اس قرب سے زیادہ ہوتا ہے جو اس کو انتہائی بلند مقام میں حاصل ہوتا ہے۔ اور اس کے سوا اور اوضاع (طریقوں) میں حاصل ہوتا ہے۔

پھر جس وقت وہ طلوع کرتا ہوا مرتفع ہوا تو بیٹھے ہوئے شخص کی طرح ہوا، پھر جب وہ انتہائی بلندی تک مرتفع ہوا تو قیام کرنے والے شخص کی طرح ہو گیا، پھر جب اُفقِ غربی کی طرف پست ہوا تو رکوع کرنے والے شخص کی طرح ہو گیا، چنانچہ اس کا اسی طرح سے دور کرنا اس کی نماز ہے، جیسا کہ شیخ فارابی نے اپنی کتاب فصوص میں کہا ہے:

"فَصٌّ: صَلَّتِ السَّمَاءُ بِدَوَرَانِهَا وَالْأَرْضُ بِرُجُحَانِهَا وَالْمَاءُ بِسَيَلَانِهِ وَالْمَطَرُ بِهَطَلَانِهِ وَأَنْتَ قَدْ تُصَلِّيْ وَلَا تَشْعُرُ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ" (دوران: گردیدن، رجحان: میلان، سیلان: روان شدن، ہطلان: روان شدن باران)۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اس کے ان احوال کی خبر دی ہے اور اس کی حرکت کی صلاۃ سے تشبیہ دی ہے کہ وہ

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

سجدہ کرتا ہے عرش کے نیچے اور بہ مددِ روحانی اسے روشنی اور اشراق کی قوت عطا کی جاتی ہے اور اسی طرح وہ دنیا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ بات ان معانی روحانیہ کو کبیہ کے موافق ہے جو آپ کے نفس شریف و کریم وصافی میں نقش ہوئے۔ واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم وعلمه أتم و أسلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ ﴾ امام نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہم اللہ نے بہ رفع "اَلْقَمَرُ" پڑھا ہے، بنا بر ابتداء اور باقی قراء نے بنا بر اشتغال بہ نصب پڑھا ہے۔ ﴿ مَنَازِلَ ﴾ کا نصب اس بنیاد پر ہے کہ مفعول ہے، اس لیے کہ "قَدَّرْنَا" بہ معنی "صَیَّرْنَا" ہے، یعنی ہم نے اس کو منزلیں کر دیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ منصوب ہو بنا بر حال، یعنی مقدر کی ہم نے اس کی چال اس حال میں کہ وہ ذو منازل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ظرفیت کی بنا پر منصوب ہو، یعنی ہم نے منزلوں میں اس کی چال مقدر کی۔ امام ابو عبید نے ﴿ اَلْقَمَرَ ﴾ میں نصب کو اختیار کیا ہے، کہا: اس لیے کہ اس سے پہلے فعل ہے، یعنی ﴿ نَسْلَخُ ﴾ اور اس کے بعد فعل ہے، یعنی "قَدَّرْنَا"۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: میرے علم میں سارے اہلِ عربیت قولِ ابو عبید کے خلاف ہیں۔ ان میں سے امام فراء رحمہ اللہ ہیں۔ کہا کہ مجھے رفع زیادہ پسند ہے، کہا کہ اہلِ عربیت کے نزدیک جو صرف رفع اولیٰ ہوا تو وہ اس لیے کہ وہ اپنے ماقبل پر معطوف ہے، معنی اس کے یہ ہیں: "وَآيَةٌ لَهُمُ الْقَمَرُ"

امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا کہ رفع اولیٰ ہے، اس لیے کہ تو نے ضمیر کے ساتھ اس سے فعل کو مشغول کر دیا ہے، چنانچہ اس کو ابتداء کے ساتھ مرفوع کیا ہے۔ منازلِ قمر اٹھائیس ہیں، ان میں سے ہر رات ایک میں نزول کرتا ہے، نہ اس سے آگے بڑھتا ہے نہ اس سے پیچھے رہتا ہے، ایک برابر اندازے پر ان منزلوں میں چلتا ہے، چاند رات سے اٹھائیسویں رات تک، پھر دو رات یا ایک رات چھپ جاتا ہے، جبکہ مہینا ناقص ہوتا ہے۔ پھر جب چاند اُن کے آخر میں ہوتا ہے تو اُن میں سے پہلی منزل کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ اٹھائیس راتوں میں فلک کو قطع کرتا ہے، پھر دو رات چھپ رہتا ہے، پھر ہلال ہو کر طلوع ہوتا ہے، چنانچہ ان منزلوں کے قطع کرنے میں فلک سے عرجون (سوکھی ٹہنی) کی طرح لوٹتا ہے۔ یہ منزلیں معروف ہیں۔[1]

چنانچہ خطیب نے کتاب النجوم میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اٹھائیس منزلیں ہیں۔ جن میں چاند ہر ماہ نزول کرتا ہے، ان میں چودہ تو شامی ہیں اور چودہ یمانی ہیں، چنانچہ پہلی منزلیں یہ ہیں: شرطین، بطین، ثریا، دبران، ہقعہ، ہنعہ، ذراع، نثرہ، طرف، جبہہ، زبرہ، صرفہ، عواء اور سماک یہ آخری شامیہ منزل ہے اور غفر، زُبانی، اکلیل، قلب، شولہ، نعائم، بلدہ، سعد الذابح، سعد بلع، سعد السعود، سعد الاخبیہ، مقدم الالو، مؤخر الالو، وحوت یہ آخری یمانی منزل ہے۔ پھر جب ان اٹھائیس منزلوں کو چل لیتا ہے تو عرجونِ قدیم (پرانی سوکھی ہوئی ٹہنی) کی طرح عود

[1] فتح القدير (٤/٤٨٧)

کرتا ہے، جیسا کہ مہینے کے شروع میں تھا۔[1]

رملی سے کسی نے پوچھا کہ آیا چاند جو ایک ماہ میں ہوتا ہے، وہی دوسرے ماہ میں ہوتا ہے یا کوئی اور ہوتا ہے؟ تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ ہر ماہ میں چاند نیا ہوتا ہے۔ انتہیٰ۔ یہ قول تجددِ امثال کے صحیح ہونے کی دلیل ہے، اگر شارع کی نص سے ثابت ہو اور اسی طرح سورج میں بھی ممکن ہے، لیکن اس سب پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ دوسرے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قولِ مذکور رملی کے قول کو رد کرتا ہے۔ "فَلْیَتَأَمَّلْ"۔

بالجملہ چاند اپنی منزلوں میں چلتا رہتا ہے۔ ﴿حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ﴾ یعنی یہاں تک کہ اپنی آخری منزل میں عود کرتا ہے اور آنکھ کے دیکھنے میں پرانی ٹہنی کی طرح ہوتا ہے۔ "عُرْجُوْنٌ" بالضم شمراخ کی لکڑی ہے، جب خشک ہو جائے اور ٹیڑھی پڑ جائے۔ قدیم وہ ہے جس پر سال بھر گزر جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عرجونِ قدیم اصل عذقِ عتیق ہے۔[2] ("عرجون" بالضم درخت کثر شدہ و شاخہائے بریدہ از روئے "عِذق" بالکسر خوشۂ خرما۔ "شماریخ"، جمع "شمراخ" بالکسر درخت کثر شدہ و شاخ خرما۔ (كذا في الصراح) حاصل یہ ہے کہ عذق تو ہوا خوشۂ خرما اور عرجون وہ زرد لکڑی ہے جس میں باریک باریک ٹہنیاں ہوتی ہیں، ان ٹہنیوں کو شماریخ بولتے ہیں، ان کے سروں پر کھجوریں لگتی ہیں۔ غرضیکہ وہ زرد لکڑی جو خوشۂ خرما کی اصل ہے جب خشک ہو جاتی ہے تو کمان کی طرح ٹیڑھی ہو جاتی ہے، اس سے ہلال کی تشبیہ دیا کرتے ہیں)۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرجون وہ عوذِ عذق ہے حس میں شماریخ ہوتی ہیں۔ اس کا وزن "فُعْلُوْنٌ" ہے۔ "انعراج" سے ماخوذ ہے۔ "انعراج" کہتے ہیں، "انعطاف" کو، یعنی مڑنا۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی منازل میں چلتا ہے، یہاں تک کہ جس وقت اپنی آخری منازل میں ہوتا ہے تو باریک و کمان و صغیر ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ عرجونِ قدیم کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس قول کی بنا پر نون زائد ہوگا۔

امام قتادہ نے کہا ہے کہ عرجون عذقِ یابس منحنی ہے نخلہ سے۔ امام ثعلب رحمہ اللہ نے کہا: عرجون وہ ہے جو نخلہ میں باقی رہتا ہے، جبکہ وہ قطع کی جاتی ہے۔ اور قدیم بہ معنی بوسیدہ اور پرانی ہے۔ خلیل نے کہا: عرجون اصل عذق ہے اور وہ زرد عریض ہے، ہلال کو اس سے تشبیہ دی جاتی ہے، جبکہ وہ منحنی ہو جاتا ہے اور اسی طرح امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عرجون" وہ اصل عَذق ہے جو ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور شماریخ اس سے کاٹ لی جاتی ہیں تو وہ نخل پر خشک باقی رہ جاتا ہے، اور "عَرْجَنَهُ" کے یہ معنی ہیں کہ اس کو "عرجون" سے مارا، اس بنا پر نونِ اصلی ہوگا۔ جمہور نے بہ ضمِ عین و جیم پڑھا ہے، اور سلیمان تیمی نے بہ کسرِ عین و فتحِ جیم پڑھا ہے، یہ دونوں دو لغت ہیں۔[3] امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وجہِ ہلال اور عرجون میں تشبیہ مرکب ہے، یعنی زردی، باریکی اور کجی۔[4] سمین نے کہا ہے کہ یہ تشبیہ بدیع ہے۔ قمر کی تشبیہ عرجونِ قدیم کے ساتھ تین چیزوں میں دی ہے: ایک تو اس کا باریک ہونا، دوسرے کمان کی طرح ٹیڑھا ہونا اور تیسرے زرد ہونا۔

---

[1] الدر المنثور (٥٧/٧) [2] تفسير الطبري (٥١٨/٢٠)

[3] تفسير القرطبي (٣٠/١٥، ٣١) فتح القدير (٤٨٧/٤) [4] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٢٤٢/٧)

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا الشَّمْسُ يَنۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ ﴾ مرفوع بہ ابتداء ہے بہ سبب عدمِ جوازِ عملِ لا کے معرفہ میں، یعنی سورج کے لیے یہ درست، ممکن، راست اور سہل نہیں ہے کہ جلدی چل کر چاند کو پا لے اور اس منزل میں نزول کرے، جس میں چاند ہے اور ایک وقت میں اس کے ساتھ مل جائے اور اس کے سلطان میں مداخلت کرے اور اس کا نور مٹا دے، اس لیے کہ یہ بات نباتات کے ہونے اور حیوانات کی زندگی میں خلل انداز ہوتی ہے اور اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک مستقل سلطان ہے، ان میں سے کسی کو یہ قدرت نہیں کہ دوسرے پر داخل ہو اور اس کے سلطان کو لے جائے، یہاں تک کہ اللہ پاک قیامت کے قائم ہونے کا اذن دے تو سورج اپنے مغرب سے طلوع ہو۔

اس آیت سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ سورج کی تسخیر کے ساتھ اس کی حرکت ہے۔ یہ حرکت اس کے ارادے سے نہیں ہے۔ اللہ پاک نے شمس سے اس کے ادراک کی نفی کی اس کے برعکس نہ کیا، اس لیے کہ چاند کی چال زیادہ تیز رفتار ہے، کیوں کہ وہ تو مہینا بھر میں اپنے فلک کو قطع کر لیتا ہے اور سورج اپنے فلک کو قطع کرنے میں سال بھر لیتا ہے۔ چنانچہ سورج اس بات کا مستحق ہوا کہ اس کو ادراک کی نفی کے ساتھ موصوف کیا جائے، اس سبب سے کہ اس کی رفتار سست ہے اور چاند اس لائق ہو کہ اس کی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے اس کو نفیِ سبق کے ساتھ موصوف کیا جائے، جس طرح کہ آگے اس کا ذکر آ رہا ہے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت سورج طلوع ہوتا ہے تو چاند کی روشنی نہیں ہوتی اور جب چاند طلوع ہوتا ہے تو سورج کے واسطے روشنی نہیں ہوتی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک کی روشنی دوسرے کی روشنی کے مشابہ نہیں ہوتی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شبِ ہلال کو خاص طور پر دونوں آسمان میں جمع نہیں ہوتے، اسی طرح یحییٰ بن سلام نے بھی کہا ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ جس وقت دونوں آسمان میں جمع ہوتے ہیں تو اُن میں سے ایک دوسرے کے آگے ہوتا ہے، ایک منزل میں کہ جس میں دونوں شریک نہیں ہوتے۔ کسی نے کہا ہے کہ چاند سمائے دنیا میں ہے اور سورج چوتھے آسمان میں، اس کو نحاس و مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمام اقوال سے زیادہ حسین اور واضح جو اس کے معنی میں کہا گیا ہے، یہ ہے کہ چاند کی چال تیز ہے اور سورج چلنے میں اس کو نہیں پاتا۔[1]

رہی یہ آیت: ﴿ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴾ [القیامۃ: ۹] ''اور سورج چاند جمع کر دیے جائیں گے۔'' تو یہ اس وقت ہوگا جب سورج طلوع سے رُوکا جائے گا، چنانچہ اس کا بیان سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے اور سورۃ القیامہ میں بھی آئے گا۔ سورج اور چاند کا جمع ہونا دنیا کے ختم ہونے کی اور قیامت کے قائم ہونے کی نشانی ہے۔

[1] تفسير القرطبي (۳۲/۱۵، ۳۳)

بالجملہ پھر اللہ پاک نے دوسری قدرت بیان فرمائی: ﴿ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ﴾ یعنی اور نہ رات دن سے سبقت کرتی ہے کہ اس کو فوت کرے، لیکن اس کے پیچھے لگی آتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے وقت میں آتا ہے اور اپنے صاحب سے سبقت نہیں کرتا۔ کسی نے کہا ہے کہ لیل و نہار سے مراد ان کی دو نشانیاں ہیں، یعنی سورج اور چاند۔ اس قول کی بنا پر عکس یہ ہوگا ﴿ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ ﴾ کا، یعنی چاند سبقت نہیں کرتا ہے سورج سے اور سبق کا ادراک کی جگہ میں لانا قمر کی رفتار کی تیزی کی وجہ سے ہے، یہ دونوں نیر ہیں، ان کا حال ہمیشہ اسی ترتیب پر رہے گا، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔

پھر اللہ پاک شمس و قمر کو جمع کرے گا اور سورج اپنے مغرب سے طلوع ہوگا۔ یہ بات اس کے منافی نہیں ہے کہ لیل اپنے وجود میں نہار سے آگے ہے، یہ دو قولوں میں سے ایک قول ہے۔ بعض نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ نہار کو لیل سے پہلے پیدا کیا گیا ہے اور لیل پیدایش کے لحاظ سے اس سے پہلے نہیں ہوئی، اس استدلال کی وجہ یہ ہے کہ معنی یہ ہیں کہ "لَيْسَ اللَّيْلُ سَابِقَ النَّهَارِ" یعنی بلکہ نہار ہی سابق ہے۔ یہ بات ناظر ہے جملہ لیل کے جملہ نہار کے ساتھ مقابلے کی طرف اور قیامت میں دونوں قولوں میں سے ہر ایک کا احتمال ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ ﴿ كُلٌّ ﴾ میں تنوین عوض ہے مضاف الیہ سے۔ "أَيْ: وَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا" فلک جسم مستدیر ہے یا سطح مستدیر ہے یا دائرہ ہے۔ عماد ابن کثیر نے کتاب "البداية والنهاية" میں کہا ہے (بعض احباب سے سنا ہے کہ کتاب "البداية والنهاية" نہایت نفیس کتاب ہے۔ نواب صاحب ٹونک ـسلمه الله تعالیٰـ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ فليعلم) کہ ابن حزم، ابن جوزی اور کئی ایک اہل علم نے اس بات پر اجماع بیان کیا ہے کہ سماوات کریۂ مستدیرہ ہیں اور اس پر اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: "يَدُوْرُوْنَ" اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "فِيْ فَلَكَةٍ مِثْلُ فَلَكَةِ الْمِغْزَلِ" لوگوں نے کہا ہے کہ اس پر یہ بات دال ہے کہ سورج غروب ہوتا ہے مغرب میں، پھر اس کے آخر میں مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک جماعت نے اس پر اجماع حکایت کیا ہے کہ "سمٰوٰت" مستدیرہ ہیں اور اس پر دلائل قائم کیے ہیں اور اہل جدل کے تھوڑے فرقوں نے اس کی مخالفت کی ہے۔ ابن العربی نے کہا ہے کہ "سمٰوٰت" ساکن ہیں، ان میں کچھ حرکت نہیں۔ اللہ پاک نے ان کو ثابت و مستقر بنایا ہے، وہ ہمارے لیے ایسے ہیں جیسے گھر کے لیے چھت ہوتا ہے اور اسی لیے ان کا نام سقفِ مرفوع رکھا ہے۔ (سقف مرفوع ہونے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ متحرک نہ ہوں، اس سے کون مانع ہے کہ وہ سقف مرفوع بھی ہوں اور متحرک بھی ہوں۔ والله أعلم)۔

[1] البداية والنهاية (۱/۳۱)

اہلِ بدیع نے ﴿ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ ﴾ سے صنعتِ قلب نکالی ہے اور اسی کے مثل قولہ تعالیٰ: ﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ [المدثر: ۳] ''اور اپنے ہی رب کی بڑائی بیان کر۔'' ''سبح'' وہ سیر ہے جو بہ انبساط و سہولت ہو ﴿ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ کو بہ صیغۂ جمع فرمایا، مطالع شمس اور قمر کے مختلف ہونے کے اعتبار سے۔ پس گویا وہ دونوں تعددِ مطالع کے سبب سے متعدد ہیں۔ یا مراد شمس، قمر اور کواکب ہیں۔ پھر جن نعمتوں کی اللہ پاک نے اپنے بندوں پر منت رکھی ہے، ان میں سے ایک اور نوع ذکر کی۔[1] ارشاد فرمایا:

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ۝۴۱ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ۝۴۲ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ۝۴۳ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ۝۴۴

اور ان کے لیے ایک نشانی (یہ) ہے کہ بے شک ہم نے ان کی نسل کو (نوح کی) بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا (41) اور ہم نے ان کے لیے ویسی ہی (اور چیزیں) پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں (42) اور اگر ہم چاہیں تو انھیں غرق کر دیں، پھر نہ تو کوئی ان کی فریاد سننے والا ہوگا اور نہ وہ چھڑائے ہی جا سکیں گے (43) مگر (ان کی نجات) ہماری رحمت ہی سے ہے اور ایک مدت تک فائدہ (اٹھانے کے لیے) ہے (44)

کشتی کی سواری، قدرتِ الٰہی کی ایک نشانی:

یعنی نوح علیہ السلام کے وقت ان کو کشتی میں سوار کیا، نہیں تو انسان کا تخم بھی نہ رہتا۔ انتہیٰ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کی قدرت پر اُن کے لیے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے دریا کو مسخر کر دیا ہے، تاکہ کشتیوں کو اٹھائے، چنانچہ ان میں سے، بلکہ سب سے پہلی نوح علیہ السلام کی کشتی ہے، جس میں اللہ پاک نے ان کو اور ان کے ساتھ کے مومنوں کو نجات دی، جن کے سوا آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے روئے زمین پر کوئی بھی باقی نہ رہا، اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴾ یعنی ان کے لیے ایک اور نشانی ہے، یہ کہ ہم نے ان کے باپ دادوں کو اس کشتی میں اٹھایا جو سامان، اسباب اور حیوانات سے بھری ہوئی تھی۔ وہ حیوان جن کے دو دو جوڑے اس کشتی میں لاد لینے کا ہم نے ان کو حکم دیا تھا۔

[1] فتح البیان (۱۱/ ۲۹۱۔ ۲۹۸)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مَشْحُوْنٌ" کے معنی ہیں موقر یعنی بوجھل، امام سعید بن جبیر، شعبی، قتادہ اور سدی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام ضحاک، قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نوح علیہ السلام کی کشتی ہے۔ ﴿ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴾۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد اونٹ ہیں، اس لیے کہ وہ خشکی کی کشتیاں ہیں، ان پر بوجھ لادتے ہیں اور سوار ہوتے ہیں۔ اسی طرح امام عکرمہ، مجاہد اور حسن رحمہ اللہ نے اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے ایک روایت میں اور عبداللہ بن شداد وغیرہم نے کہا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے ایک روایت میں کہا ہے کہ اس سے مراد انعام ہیں، یعنی چوپائے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بہ روایت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴾ کیا ہے؟ ہم نے کہا: نہیں۔ فرمایا: یہ وہ کشتیاں ہیں جو سفینۂ نوح علیہ السلام کے بعد اس کے نمونے پر بنائی گئیں۔ اسی طرح ابو مالک، ضحاک، قتادہ، ابو صالح اور سدی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ اس سے مراد کشتیاں ہیں۔[1] قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَاۤ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴾ [الحاقة: ١١۔ ١٢] "جب پانی میں طغیانی آگئی تو اس وقت ہم نے تمھیں کشتی میں چڑھا لیا، تاکہ اسے تمھارے لیے نصیحت اور یادگار بنا دیں، اور (تاکہ) یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔" اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان معنی میں اس مذہب کا مقوی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴾ یعنی اگر ہم چاہیں تو ان لوگوں کو غرق کر دیں جو کشتیوں میں ہیں، پھر کوئی ان کا اس بلا سے جس میں وہ ہیں فریادرس نہ ہو اور نہ ہی وہ اس آفت سے خلاصی دیے جائیں جو ان کو پہنچی۔ ﴿ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا ﴾ میں استثناء منقطع ہے، تقدیر یہ ہے "وَلٰكِنْ بِرَحْمَتِنَا"، یعنی لیکن ہم اپنی رحمت سے تم کو سیر کراتے ہیں خشکی اور دریا میں اور سلامت رکھتے ہیں تم کو ایک مدتِ مقرر تک۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴾ یعنی ایک وقت تک جو اللہ عزوجل کے نزدیک معلوم اور مقرر ہے، کام چلانے کے لیے ہے۔[2] (كذا في ابن كثير)۔

فتح البیان کا بیان:

﴿ اٰيَةٌ لَّهُمْ ﴾ مرفوع ہے اس بنا پر کہ خبر مقدم ہے اور مبتداء ﴿ اَنَّا حَمَلْنَا ﴾ ہے، یا اس کا عکس۔ آیت سے مراد دلالت وعلامت ہے۔ کسی نے کہا: یہاں ﴿ اٰيَةٌ ﴾ کے معنی عبرت ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ نعمت ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ نذارت ہیں، یعنی ڈرانا۔ ﴿ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ کے معنی میں اختلاف ہے اور اس بات میں کہ ضمیر کس کی

[1] تفسير الطبري (٢٠/٥٢٢۔٥٢٤) [2] تفسير ابن كثير (٣/٧٥١)

طرف پھرتی ہے، کیوں کہ ﴿ اٰيَةٌ لَّهُمُ ﴾ کی ضمیر اہلِ مکہ کی طرف راجع ہے، یا کفارِ عرب کی طرف، یا صرف کفار کی طرف جو نبی اکرم ﷺ کے عہدِ سعادت مہد میں تھے۔ چنانچہ کسی نے کہا کہ ضمیر قرونِ ماضیہ کی طرف راجع ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرونِ ماضیہ کی ذریت کو فلکِ مشحون میں اٹھایا۔ اس قول کی بنا پر دونوں ضمیریں مختلف ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس قول کو امام اخفش رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دونوں ضمیریں کفارِ مکہ اور ان جیسے لوگوں کی طرف راجع ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ نے ان کی ذریات کو ان کی اولاد وضعفاء سے کشتی پر اٹھایا (یعنی اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے کشتیاں بنائیں جن میں بچے اور کمزور لوگ جن کو چلنے کی طاقت نہیں ہے سوار ہوتے ہیں۔ اس صورت میں دونوں ضمیریں متفق ہوں گی، اہلِ مکہ کی طرف پھریں گی اور فلک اسمِ جنس ہوگا۔[1] كذا في القرطبي)۔

چنانچہ اللہ پاک نے ان پر اس کا احسان رکھا، یعنی جس وقت وہ سفر کرتے ہیں یا اپنی اولاد کو تجارت کے لیے بھیجتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان کی ذریت کا ذکر کیا، خود اُن کا ذکر نہ کیا تو اس لیے کہ ان پر احسان رکھنے کے لیے یہ زیادہ موثر ہے اور اس کی قدرت پر تعجب کرنے کے لیے زیادہ موثر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ذریت سے مراد اُن کے آباء و اجداد ہیں اور فلک سے مراد سفینۂ نوح علیہ السلام ہے۔ یعنی اللہ پاک نے ان لوگوں کے باپ دادوں کو نوح علیہ السلام کی کشتی میں اٹھایا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذریت کا لفظ آباء پر واقع ہوتا ہے، جس طرح اولاد پر واقع ہوتا ہے۔[2] (جمل نے قرطبی رحمہ اللہ سے یوں نقل کیا ہے کہ اس قول کو ابو عثمان کا ٹھہرایا ہے۔ واللّٰه أعلم)۔

امام ابو عثمان رحمہ اللہ نے کہا: "وَسَمَّى الْآبَاءَ ذُرِّيَّةً لِأَنَّ مِنْهُمْ ذَرَأَ الْأَبْنَاءَ" یعنی آباء کا نام ذریت اس لیے رکھا ہے کہ ان سے ابناء کو پیدا کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ذریت سے مراد نطفے ہیں جو عورتوں کے شکم میں ہوتے ہیں اور شکم کی تشبیہ فلکِ مشحون سے دی۔[3] (قاله علي بن أبي طالب رضي الله عنه، ذكره الماوردي)۔ راجح دوسرا قول ہے، پھر پہلا، پھر تیسرا۔ چوتھا قول انتہائی بعید اور منکر ہے۔ سورۃ البقرہ میں ذریت اور اس کے اشتقاق کے بارے میں پورے طور پر کلام گزر چکا ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لَهُمُ ﴾ کی ضمیر عباد کی طرف پھرتی ہے جن کا ذکر ﴿ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ﴾ میں ہوا ہے، اس لیے کہ اس کے بعد یوں کہا ہے: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ﴾ اور فرمایا ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ﴾ پھر فرمایا: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ تو گویا یوں فرمایا: "وَآيَةٌ لِلْعِبَادِ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّاتِ الْعِبَادِ" یہ لازم نہیں ہے کہ ایک ضمیر سے اُن میں سے بعض مراد ہوں اور دوسری ضمیر میں دوسرے بعض مراد ہوں۔ یہ قول حسن ہے۔ فلک کا اطلاق واحد و جمع دونوں پر ہوتا ہے، جیسا کہ سورت یونس میں گزر چکا ہے اور مذکر و مونث مستعمل ہوتا ہے۔[5]

﴿ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیضیہ ہے یا زائدہ۔ ہر تقدیر کے لحاظ سے اس

---

[1] تفسير القرطبي (٣٤/١٥) [2] فتح القدير (٤٩٠/٤)
[3] تفسير القرطبي (٣٤/١٥) [4] رقم الآية (١٢٤) [5] رقم الآية (٢٢)

کا مدخول محلِ نصب میں ہے بنابر مفعول مؤخر سے، یعنی ﴿ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴾ (قاله الحفناوي) اور کلمۂ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے۔
امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مثل کے معنی میں تین قول ہیں۔ (یعنی اصل یہی تین قول ہیں۔) یہ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ کا مذہب ہے اور مفسرین کی ایک جماعت سے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے کہ اس کے معنی اونٹ ہیں۔ اللہ پاک نے ان کو ان کی سواری کے لیے پیدا کیا ہے، جن پر خشکی میں اس طرح سواری کی جاتی ہے جیسے دریا میں کشتیوں پر کی جاتی ہے۔ عرب لوگ اونٹوں کو کشتیوں سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ مثل سے مراد خاص اونٹ ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مراد کشتیاں ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سب سے زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے متصل الاسناد ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ "خَلَقَ لَهُمْ سُفُنًا أَمْثَالَهَا يَرْكَبُوْنَ فِيْهَا" یعنی اللہ پاک نے ان کے لیے کشتیِ نوح علیہ السلام کی طرح کی کشتیاں پیدا کیں کہ ان میں سوار ہوتے ہیں۔ امام حسن، ضحاک اور ابو مالک رحمہ اللہ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بڑی کشتیوں کی طرح چھوٹی کشتیاں ہیں جن کو پیدا کیا ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے اور حسن اور قتادہ رحمہما اللہ سے بھی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ وہ کشتیاں ہیں جو سفینۂ نوح علیہ السلام کے بعد بنائی گئی۔ ایک پانچواں قول بھی ہے، وہ یہ ہے کہ عورتیں خاوندوں کے سوار ہونے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس قول کے بارے میں کہا ہے: "لَمْ أَرَهُ مَحْكِيًّا"[1]

فتح البیان میں فرمایا ہے کہ عموم اولیٰ ہے، تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ چنانچہ ﴿ مِّنْ مِّثْلِهٖ ﴾ ہر اُس شے کو شامل ہے جس پر سواری کی جائے، حیوان ہو یا جماد، دھواں ہو یا ہوا، جیسے اس وقت میں ریل ایجاد ہوئی ہے، یا غبارہ یا اس کے سوا آیندہ زمانے میں غور وفکر کے نتیجے میں اور کوئی سواری ایجاد ہو۔[2] رہی یہ بات کہ جس وقت ﴿ مِّنْ مِّثْلِهٖ ﴾ سے مراد کشتیاں ہوں تو اُن کی طرف خلق کی نسبت کیسے درست ہوگی، حالاں کہ وہ تو بندوں کی صنعت سے ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی اصل سفینۂ نوح علیہ السلام چوں کہ اللہ پاک کے الہام وتعلیم سے تیار ہوئی، اس لیے سب کی طرف خلق کا نسبت کرنا ٹھیک ہوا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴾ تتمۂ آیت سے ہے جس کا اللہ پاک نے بندوں پر احسان رکھا ہے۔ احسان رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ دریاؤں کی گہرائیوں میں ان کو غرق نہیں کیا، باوجود اس کے کہ اللہ پاک اس پر قادر ہے۔ ﴿ صَرِيْخَ ﴾ بہ معنی "مُصْرِخٌ" ہے۔ مصرخ مغیث، یعنی فریاد رس کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی منعۃ ہے ("مَنَعة" بالتحریک جمع مانع، مراد خویش واقارب وتوابع ہیں)۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس طرح ﴿ صَرِيْخَ ﴾ کا اطلاق مغیث پر کیا جاتا ہے، اسی طرح "صَارِخٌ" پر بھی بولا جاتا ہے۔ "صَارِخٌ"

[1] تفسیر القرطبي (١٥/ ٣٤، ٣٥) [2] فتح البیان (١١/ ٢٩٩)

کہتے ہیں مستغیث کو، چنانچہ یہ اضداد میں سے ہے، جس طرح کہ اہلِ لغت نے اس کی تصریح کی ہے اور ﴿ صَرِيْخَ ﴾ بہ معنی اغاثہ مصدر بھی ہوتا ہے، اس لیے کہ اصل میں یہ معنی "صُرَاخٌ" ہے، "صُرَاخٌ" ایک مخصوص آواز ہے۔ اس جگہ ان میں ہر ایک معنی صحیح ہے۔[1] شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات منقول نہیں ہوئی کہ ﴿ صَرِيْخَ ﴾ مصدر ہے "أَصْرَخَ" سے، بہ معنی إصراخ و إغاثہ۔

﴿ نُغْرِقْهُمْ ﴾ کی ضمیر اصحابِ ذریت یا ذریت کی طرف راجع ہے، یا اقوال کے اختلاف کی بنا پر سب کی طرف راجع ہے۔ "إِنْقَاذٌ" خلاصی ونجات دینے کو کہتے ہیں۔ جس وقت کوئی شخص کسی شخص کو کسی مکروہ سے خلاصی دیتا ہے تو اس وقت محاورۂ عرب میں بولتے ہیں کہ "أَنْقَذَهُ وَاسْتَنْقَذَهُ" یعنی اس نے اس کو خلاصی دی۔ ﴿ إِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا ﴾ کا نصب بنا بر مفعول لہ ہے اور استثناء مفرغ ہے اعم علل سے، یعنی اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں، پھر نہ کوئی ان کا فریاد رس ہو اور نہ وہ خلاصی دیے جائیں، سوائے اس صورت سے کہ ہماری رحمت ان کے شاملِ حال ہو۔ امام کسائی اور زجاج رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ استثناء منقطع ہے، یعنی لیکن ہماری طرف سے رحمت کے لیے۔ کسی نے کہا ہے کہ منصوب ہے بنا بر مصدریت فعلِ مقدر سے۔ "أَيْ: نَرْحَمُهُمْ رَحْمَةً" یعنی ہم ان پر صحیح معنوں میں رحم کرتے ہیں۔ ﴿ وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِيْنٍ ﴾ معطوف ہے ﴿ رَحْمَةً ﴾ پر، یعنی اور واسطے برتنے کے، یا فائدہ دیتے ہیں ہم ان کو دنیا کی زندگی کے ساتھ ایک وقت تک۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حِيْنٍ ﴾ سے مراد موت ہے۔ یحییٰ بن سلام نے کہا ہے کہ قیامت ہے۔[2]

﴿ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ ﴾ میں حرفِ فاء رابطہ ہے، اس جملے کو ما قبل سے ربط دیتی ہے، چنانچہ ﴿ لَهُمْ ﴾ کی ضمیر "مُغْرَقِيْنَ" کی طرف راجع ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اس وجہ کو جائز رکھا ہے اور ایک اور وجہ کو اور اس کو اس سے احسن ٹھہرایا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ دریا کے مسافروں کو خبر دی ہے کہ وہ "ناجین" ہوں یا "مغرقین" ان کی یہی حالت ہے کہ ان کے لیے کسی طرح کی نجات نہیں ہے، مگر اللہ سبحانہ کی رحمت سے اور ﴿ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ ﴾ "مُغْرَقِيْنَ" سے مربوط نہیں ہے۔

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں کہ پھر کوئی فریاد رس نہیں جو اُن کے لیے غرق ہونے کو روکے اور جب وہ غرق ہونے لگیں تو خلاصی نہ دیے جائیں کبھی عذاب سے۔ خلاصی کبھی عذاب کو شروع سے ہی دور کرنے سے ہوتی ہے اور کبھی عذاب کے واقع ہو جانے کے بعد اسے دور کرنے سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ان سے خلاصی پانے کے دونوں طریقوں کی نفی ہے۔ پہلے کی نفی کی طرف تو ﴿ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ ﴾ میں اشارہ کیا، یعنی ان کا کوئی فریاد رس نہیں ہے کہ غرق ہونے کو اُن سے دور کرے اور دوسرے کی طرف ﴿ وَلَا هُمْ

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٢٤٣/٧) [2] تفسير القرطبي (٣٥/١٥) فتح القدير (٤٩١/٤)

﴿ يُنْقَذُوْنَ ﴾ سے اشارہ کیا، یعنی اور نہ وہ عذاب میں واقع ہونے کے بعد نجات دیے جائیں گے۔ اور اگر یہ بات تسلیم کی جائے کہ غرق نہ ہونے کے سبب سے وہ موت سے چھٹکارا پاتے ہیں تو غلط ہے، کیوں کہ موت سے جس کو اللہ پاک نے ان کے لیے مقدر کر رکھا ہے، اس کا وقتِ مقرر آجانے پر اس سے بچا نہیں سکتا۔[1]

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے: اس (عذاب) سے بچو جو تمھارے سامنے (دنیا میں) اور جو تمھارے پیچھے (آخرت میں) ہے، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿45﴾ اور ان کے رب کی نشانیوں میں سے جو بھی نشانی ان کے پاس آتی ہے تو وہ اس سے منہ موڑنے والے ہوتے ہیں ﴿46﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے: اللہ نے تمھیں جو رزق دیا ہے تم اس میں سے خرچ کرو (تو) وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان لوگوں سے جو ایمان لائے، کہتے ہیں: کیا ہم اسے کھلائیں جسے اگر اللہ چاہتا تو کھلا دیتا؟ تم تو کھلی گمراہی میں ہو ﴿47﴾

مشرکوں کی گمراہی کا بیان:

اگلے سے مراد جزا کا دن اور پچھلے سے مراد اپنے چھوڑے ہوئے اموال۔ نئے کام میں تقدیر کا حوالہ دینا اور اپنے مرنے میں لالچ رکھنا ہی گمراہی ہے۔ انتہیٰ۔

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ مشرک لوگ اپنی گمراہی میں اور اپنے اگلے گمراہوں کی بے پروائی کرنے میں اور جو شے قیامت میں ان کو پیش آنے والی ہے، اس سے منہ موڑنے میں متمادی ہیں، ان سب امور پر جمے ہوئے ہیں۔ ﴿ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ ﴾ یعنی تم ان آفات اور نوازل سے بچو جو تمھارے آگے اور پیچھے ہیں، کیوں کہ وہ تمھارا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: بچو ان وقائع سے جو تم سے پہلی امتوں میں واقع ہو چکے ہیں اور وہ جو آخرت میں تمھارا پیچھا کریں گے۔ سعید بن جبیر اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا: ﴿ مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ ﴾ وہ گناہ ہیں جو گزر چکے ہیں اور ﴿ وَمَا خَلْفَكُمْ ﴾ وہ ہیں جو اُن میں سے باقی ہیں۔ کسی نے اس کے الٹ کہا ہے۔ سفیان

[1] فتح البیان (۱۱/۲۹۸۔۳۰۰)

نے کہا ہے کہ ﴿ مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ ﴾ دنیا ہے اور ﴿ وَمَا خَلْفَكُمْ ﴾ آخرت ہے۔ یعنی عذابِ دنیا اور آخرت۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے اس قول کا عکس سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حکایت کیا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ ﴾ وہ شے ہے جو تمھارے لیے ظاہر ہوئی اور ﴿ وَمَا خَلْفَكُمْ ﴾ وہ شے ہے جو تم سے مخفی رہی۔ ﴿ اِذَا ﴾ کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "إِذَا قِيلَ ذٰلِكَ أَعْرَضُوْا"

چنانچہ قولہ تعالیٰ ﴿ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴾ اس پر دال ہے ﴿ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ علت ہے ﴿ اتَّقُوْا ﴾ کی، یا اس کے واو سے حال ہے "أَيْ: رَجَاءَ أَنْ تُرْحَمُوْا أَوْ كَيْ تُرْحَمُوْا أَوْ رَاجِيْنَ أَنْ تُرْحَمُوْا" مطلب یہ ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ان آفات سے بچو جو تم سے اگلی اُمتوں پر رسولوں کی تکذیب کی وجہ سے واقع ہو چکی ہیں، کہیں ویسی ہی آفات تم پر بھی واقع ہوں اور اس عذاب سے جو آخرت میں تمھارے واسطے تیار کیا گیا ہے، اس بات کی اُمید رکھتے ہوئے کہ تم رحم کیے جاؤ، یعنی شاید اللہ پاک اس بچنے کی وجہ سے تم پر رحم کرے اور اپنے عذاب سے تم کو امن دے، کیوں کہ تم جان چکے ہو کہ نجات کی اصل تو صرف اللہ کی رحمت ہی ہے، تو وہ اس بات کا کچھ جواب نہیں دیتے، بلکہ اس سے اعراض کرتے ہیں۔

غرضیکہ جب اللہ پاک یہ بات بیان کر چکا کہ وہ لوگ آفاقی آیتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد ان سے منہ موڑتے ہیں اور ان میں غور و فکر نہیں کرتے تو اس کے بعد یہ بیان کیا کہ تنزیلی آیتوں سے بھی اعراض کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ ﴾ کلمہ ﴿ مَا ﴾ نافیہ ہے اور پہلا ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے تاکید کے لیے اور دوسرا ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے۔ مضارع کا صیغہ اس لیے ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اپنے رب کی آیتوں میں سے کوئی آیت ان کے پاس آتی جاتی نہیں ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سچائی اور نبوت پر اور توحید کی صحت کی دلالت کرتی ہے، مگر وہ اس سے منہ موڑنے والے ہی ہوتے ہیں (جملہ ﴿ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴾ بنا بر حال محلِ نصب میں ہے)۔ اعراض سے مراد یہ ہے کہ نہ اس کی طرف توجہ کی، نہ اس میں غور کیا، نہ اس کو سوچا سمجھا، نہ اسے قبول کیا، نہ اس سے فائدہ اٹھایا۔ کسی نے کہا ہے کہ ظاہر آیت تنزیلی و تکوینی آیتوں کو شامل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت اس ارشادِ الٰہی سے متعلق ہے: ﴿ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۳۰] جبکہ ان کے پاس رسول آئے تو ان کی تکذیب کی اور جب آیتیں لائے تو ان سے اعراض کیا۔

بالجملہ کفار نے ساری تکالیفِ شرعیہ میں خلل اندازی کی، کیوں کہ جملہ تکالیف دو امر کی طرف راجع ہیں: ایک تو تعظیم جانبِ الٰہی کے، دوسرا خلق اللہ پر شفقت و مہربانی۔ چنانچہ پہلے امر کا بیان تو ہو چکا کہ اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی اور اس کی آیتوں سے اعراض کیا، دوسرے امر کا بیان یہ ہے: ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا ﴾ یعنی جب ان

[1] تفسیر الطبري (۲۰/۵۲۶) تفسیر القرطبي (۱۵/۳۶)

سے کہا جاتا ہے کہ فقراء پر اس مال سے خیرات کرو، جو اللہ نے تم کو عطا کیا ہے اور جس کا تم پر انعام فرمایا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مراد یہود ہیں، ان کو حکم دیا گیا تھا کہ فقراء کو کھلائیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومنین نے کفارِ قریش سے کہا کہ تم اپنے مالوں، کھیتوں کی پیداوار اور جانوروں میں سے مساکین پر خرچ کرو، وہ مال اور کھیتیاں جن کے بارے میں تم نے گمان کیا ہے کہ وہ اللہ کے واسطے ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا ﴾[1] [الأنعام: ١٣٦] ''اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی پیدا کیے ہیں ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا۔''

ان کا یہ جواب ہوا جو اللہ پاک نے ان کی طرف سے اپنے اس قول میں نقل فرمایا ہے: ﴿ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ﴾ یعنی منکروں نے ایمان والوں کو ان کی بات کا ٹھٹھا کر کے کہا: کیا ہم ایسے شخص کو کھلائیں جس کو اگر اللہ چاہتا تو کھلاتا، یعنی وہ شخص کہ اگر اللہ چاہتا تو اسے رزق دیتا۔ وہ مسلمانوں سے یہ بات سن چکے تھے کہ رازق اللہ ہی ہے، وہی غنی کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور فقیر کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ گویا اس بات سے مسلمانوں کو الزام دینے کا ارادہ کیا اور کہا کہ ہم تو مشیتِ الٰہی کے مطابق کرتے ہیں اور ہم اس شخص کو نہیں کھلاتے جسے اللہ نے نہیں کھلایا۔ حالاں کہ یہ بات ان کی طرف سے بالکل غلط اور تکبر اور باطل کے ساتھ مجادلہ کرنا ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے تو اپنی بعض مخلوق کو آزمایش اور امتحان کی خاطر غنی اور بعض کو فقیر کیا ہے۔

چنانچہ فقیر سے دنیا کو بخل کی وجہ سے نہیں روکا اور نہ ہی غنی کو دنیا اس لیے دی ہے کہ یہ اس کا استحقاق ہے۔ غنی کو حکم دیا ہے کہ فقیر کو کھلائے اور اس کو فقیر کے ذریعے سے اس صدقے میں آزمایا ہے جس کو اس کے مال میں سے فقیر کے لیے فرض کیا ہے۔ کسی کا اللہ کی مشیت اور حکمت میں، جو اس نے اپنی مخلوق میں رکھی ہے، اعتراض نہیں بنتا۔ اور مومن اللہ پاک کے حکم کی موافقت کرتا ہے۔ اور کفار کی یہ بات کہ ﴿ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ﴾ اگرچہ فی نفسہٖ ٹھیک ہے، لیکن چوں کہ انھوں نے اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کیا اور باوجود اللہ کی قدرت کے جوازِ امر باتفاق کے انکار کا قصد کیا، اس لیے اس انداز سے ان کا حجت پکڑنا باطل ٹھہرا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ کلامِ کفار کے تتمہ سے ہے، یعنی اے مسلمانو! تمھارے اسلام کے اعتقاد کے باوجود تمھارا ہم کو یہ کہنا اور فقراء کے لیے مال طلب کرنا اور ہمیں فقراء کو کھلانے کا امر کرنا، ان سب باتوں میں تم ایسی کھلی گمراہی میں ہو جو نہایت واضح اور ظاہر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ کلام اللہ پاک کے کلام میں سے ہے۔ کفار نے جو بات کہی تھی، اللہ پاک نے اس کا جواب دیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: احتمال ہے

[1] فتح القدير (٤/٤٩١)

کہ یہ اللہ پاک کے کلام سے ہو، جبکہ کافروں نے مسلمانوں سے مناظرہ کیا اور ان کی بات کو رد کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: ﴿ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴾

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں نظر ہے۔[1] واللّٰہ أعلم۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اصحاب نبی ﷺ کے قول سے ہے۔ انھوں نے یہ بات کفار سے کہی۔ امام قشیری اور ماوردی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت زنادقہ میں سے ایک قوم کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ کفارِ قریش اور ان کے سوا باقی عربوں میں ایک قوم زندیق تھی، جو صانع پر ایمان نہیں لاتی تھی، انھوں نے یہ بات مسلمانوں سے استہزا اور بحث کر کے کہی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس قول کی مثل عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حکایت کیا ہے[2] اور اسی لیے ﴿ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ﴾ کہا ہے۔ اضمار کے بجائے اظہار کیا ہے۔ کسی نے کہا: عاص بن وائل سہمی سے جب مسکین سوال کرتا تو اس سے کہتا کہ تو اپنے رب کی طرف جا، وہ تیرے ساتھ مجھ سے اولیٰ ہے اور کہتا کہ اللہ نے تو اس سے روک کر رکھا، پھر میں اس کو کھلاؤں![3] (كذا في فتح البيان وابن كثير)

تفسیر قرطبی میں ہے، کسی نے کہا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمان مسکینوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے، چنانچہ ابوجہل ان سے ملا اور کہا: اے ابوبکر! کیا تو یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو کھلانے پر قادر ہے؟ کہا: ہاں۔ ابوجہل بولا: پھر یہ کیا حال ہے کہ اس نے ان لوگوں کو نہیں کھلایا؟ فرمایا کہ اس نے ایک قوم کی آزمایش فقر سے کی ہے اور ایک قوم کی آزمایش غنا کے ساتھ کی ہے۔ اور فقراء کو حکم دیا ہے صبر کا اور غنی لوگوں کو حکم دیا ہے عطا کرنے کا۔ ابوجہل بولا: واللہ! اے ابوبکر! تو گمراہی میں ہے، کیا تو یہ زعم کرتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو کھلانے پر قادر ہے، حالاں کہ وہ تو اُن کو کھلاتا نہیں اور تو ان کو کھلاتا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور یہ آیت: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴾[4] [الليل: ٥۔ ٦] ”جس نے دیا (اللہ کی راہ میں) اور ڈرا (اپنے رب سے)۔ اور نیک بات کی تصدیق کرتا رہا۔“ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں دو مختلف قسم کے کفار کا ذکر ہے۔

﴿ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ﴾ سے مراد زنادقہ ہیں جو اللہ مختار کے وجود کے منکر ہیں، اس لیے یہاں ”قَالُوْا“ نہ کہا، بلکہ اظہار کیا اور قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَیْهِمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ٣١] سے مراد کفارِ قریش ہیں جو اللہ پاک کے وجود کے معترف تھے، اس کے باوجود کہ وہ بتوں کو پوجتے تھے، تاکہ وہ ان کو اللہ کے قریب کریں۔ پھر اللہ پاک نے انھیں کفارِ قریش کے ساتھ کلام رجوع کیا جو اللہ کے وجود کو مانتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

[1] تفسير الطبري (٥٢٧/٢٠) تفسير ابن كثير (٧٥٢/٣) [2] تفسير القرطبي (٣٧/١٥)
[3] تفسير ابن كثير (٧٥٢/٣) فتح البيان (٣٠٠/١١۔٣٠٢) [4] تفسير القرطبي (٣٧/١٥)

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۴۸ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ۝۴۹ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ۝۵۰

اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ (48) وہ تو صرف ایک (ہولناک) چیخ کا انتظار کر رہے ہیں جو انھیں آ پکڑے گی، جبکہ وہ (آپس میں) جھگڑ رہے ہوں گے (49) پھر نہ تو وہ کسی وصیت کرنے کی طاقت رکھیں گے اور نہ اپنے اہل وعیال کے پاس لوٹ ہی سکیں گے (50)

کافروں کا روزِ قیامت کو محال و بعید سمجھنا:

یعنی قیامت اچانک آئے گی اور وہ اپنے معاملات میں غرق ہوں گے۔ انتہیٰ۔

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ کفار قیامت کے قائم ہونے کو بعید سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب واقع ہوگا؟ اس کو وہ لوگ جلدی مانگتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے ہیں۔ اللہ عزوجل نے فرمایا کہ نہیں انتظار کرتے مگر ایک چنگھاڑ کا۔ واللّٰہ أعلم۔ یہ ﴿صَيْحَةً﴾ نفخۂ فزع ہے۔ صور میں نفخۂ فزع پھونکا جائے گا اور لوگ حسبِ عادت اپنے بازاروں اور کام کاج کی جگہوں میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے، چنانچہ وہ اس حال میں ہوں گے کہ اللہ عزوجل اسرافیل کو حکم دے گا تو وہ صور میں ایک پھونک پھونکیں گے، اس کو طول دیں گے، کھینچیں گے، پھر روئے زمین پر کوئی باقی نہیں رہے گا، مگر وہ صفحۂ گردن (گردن کے کنارے) کو جھکائے گا اور اٹھائے گا، تکلف کر کے آسمان کی طرف سے آواز کو سنے گا۔

پھر وہ لوگ جو موجود ہوں گے آگ کے ساتھ محشرِ قیامت کی طرف ہنکائے جائیں گے۔ وہ آگ ان کو چاروں طرف سے گھیرے گی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً﴾ یعنی پھر ان کو اتنی مہلت نہ ملے گی کہ اس شے کے متعلق وصیت کر جائیں جس کے وہ مالک ہیں۔ کام اس سے زیادہ اہم ہوگا، یعنی ایسی سخت ہولناک حالت ہوگی کہ وصیت کرنے کی بھی مہلت نہ ملے گی اور نہ ہی وہ اپنے گھر کی طرف لوٹ سکیں گے۔ اس جگہ آثار اور احادیث وارد ہوئی ہیں، ہم نے ان کو اور جگہ ذکر کیا ہے، پھر اس کے بعد نفخۂ بعث ہوگا۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ کفار کہتے ہیں: کب ہے یہ وعدہ بعث کا، عذاب کا، قیامت کا اور جنت اور نار کی طرف جانے کا، جس کا وعدہ تم ہم کو دیتے ہو، اگر تم اس بات میں سچے ہو جو تم کہتے ہو اور جس کا ہم کو وعدہ

[1] تفسیر ابن کثیر (۷۵۲/۳)

12

دیتے ہو تو بتاؤ؟ انھوں نے مومنین کو یہ بات ٹھٹھا کرنے کے لیے کہی، مقصود اُن کا امورِ مذکورہ کا بالکل انکار کرنا ہے اور اُن کے حق ہونے کی نفی ہے اور اُن کے وقوع کا انکار ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان کو اس بات کا یہ جواب دیا کہ وہ انتظار نہیں کرتے مگر ایک صیحہ کا۔ اللہ پاک نے جو اُن کو منتظر ٹھہرایا، حالاں کہ وہ منتظر نہ تھے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ انھوں نے ﴿ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ ﴾ کہا، اس لحاظ سے ان کو منتظر قرار دیا، کیوں کہ جو کوئی یوں کہے کہ فلاں شب کب واقع ہوگی؟ تو اس کی بات سے یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اس کے وقوع کا انتظار کرتا ہے۔ ﴿ صَيْحَةً ﴾ سے مراد صور میں نفخۂ اسرافیل ہے، یہ وہی نفخۂ اولیٰ ہے اور یہی نفخۂ صعق ہے جس سے جو کوئی روئے زمین پر ہوگا وہ مر جائے گا۔

﴿ تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴾ یعنی وہ ان کو آ پکڑے گی، اس حال میں کہ وہ امورِ دنیا، یعنی خرید و فروخت میں باہم لڑتے جھگڑتے ہوں گے اور بازاروں اور مجلسوں میں اور کام کاج کی جگہوں میں آپس میں بات چیت کرتے ہوں گے کہ نہایت درجہ غفلت کی حالت میں ان پر قیامت آجائے گی۔ ﴿ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً ﴾ یعنی ان میں سے کوئی اتنی طاقت نہ رکھے گا کہ وہ کسی کو اس بات کی وصیت کر سکے کہ اس کا کسی پر کیا حق ہے یا اس پر کسی کا کیا حق ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ کوئی اس بات کی طاقت نہ رکھے گا کہ دوسروں کو توبہ کی اور گناہوں سے باز رہنے کی وصیت کر جائے۔ بلکہ اپنے بازاروں میں اور جس جگہ ہوں گے وہیں مر جائیں گے۔

﴿ وَلَاۤ اِلٰۤى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ یعنی اور اپنے گھروں کی طرف نہ لوٹیں گے جن کے باہر وہ مرے ہیں، بلکہ جس جگہ چنگھاڑ سنیں گے اسی جگہ مر کر رہ جائیں گے، کیوں کہ قیامت اُن کو کچھ مہلت نہ دے گی۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: "لَا يَرْجِعُوْنَ إِلٰى أَهْلِهِمْ قَوْلًا"، یعنی ایسے ہولناک ہوں گے کہ اپنے گھر والوں سے کوئی بات نہ کر سکیں گے۔ قراء نے ﴿ يَخِصِّمُوْنَ ﴾ میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ حمزہ نے تو بہ سکونِ خاء و تخفیفِ صاد پڑھا ہے "خَصَمَ يَخْصِمُ" سے۔ معنی یہ ہیں: "يَخْصِمُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا"۔ مفعول محذوف ہے۔ ابو عمرو نے اور قالون نے بہ اخفائے فتحۂ خاء و تشدیدِ صاد اور امام نافع، ابن کثیر اور ہشام رحمہم اللہ نے اسی طرح مگر فتحۂ خاء کا اخلاص کیا ہے، یعنی بہ اظہارِ فتحۂ خاء۔ باقی قراء نے بہ کسرِ خاء و تشدیدِ صاد پڑھا ہے۔ تینوں قراءتوں میں اصل "يَخْتَصِمُوْنَ" ہے، حرفِ تاء کو صاد میں ادغام کیا ہے۔ چنانچہ امام نافع، ابن کثیر اور ہشام نے تو فتحۂ تاء کو ساکن ماقبل کی طرف بہ نقلِ کامل نقل کیا ہے اور ابو عمرو و قالون نے اس کی حرکت کا اختلاس کیا ہے اس بات پر آگاہ کرنے کو کہ اصل حرفِ خاء کا سکون ہے اور باقی قراء نے اس کی حرکت کو حذف کیا ہے۔ پھر دو ساکن ملے تو اول کو کسرہ دے دیا۔ ابو عمرو اور قالون سے یہ بھی مروی ہے کہ بہ تسکینِ خاء و تشدیدِ صاد پڑھا ہے، یہ قراءت مشکل ہے، اس لیے کہ اس میں دو ساکن جمع ہو گئے ہیں۔

سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے بنا بر اصل "يَخْتَصِمُوْنَ" پڑھا۔[1] قیامت کے ناگہاں آنے میں آثار و احادیث آئی ہیں۔

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۵/۳۸)

ان میں سے یہ ہیں: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ﴿ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے کہ قیامت قائم ہوگی اور لوگ اپنے بازاروں میں خرید وفروخت کرتے ہوں گے اور کپڑے ناپتے ہوں گے اور اونٹنیاں دوھتے ہوں گے اور اپنی حاجتوں میں ہوں گے۔ ﴿ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ (أخرجه عبدالرزاق والفريابي وغيرهما)
سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قیامت قائم ہوگی اور مرد کپڑا ناپتا ہوگا اور مرد اونٹنی دوھتا ہوگا، پھر آیتِ مذکور پڑھی۔[1] (أخرجه عبد بن حميد و عبد الله بن أحمد وغيرهما)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: البتہ قائم ہوگی قیامت اس حال میں کہ دو مردوں نے اپنا کپڑا پھیلایا، پھر وہ اس کو خرید وفروخت نہ کر چکیں گے اور نہ ہی اس کو لپیٹ چکیں گے کہ قیامت قائم ہوگی اور وہ درست کر رہا ہوگا اپنے حوض کو، پھر نہ پلائے گا اس میں سے کہ البتہ قیامت قائم ہوگی اور یقیناً مرد اپنی اونٹنی کا دودھ دوہ کر لوٹے گا، پھر اس دودھ کو نہ کھائے پیے گا کہ قیامت قائم ہوگی اور وہ اپنا لقمہ اپنے منہ کی طرف اٹھائے گا اور اس کو ابھی کھائے گا نہیں کہ قیامت قائم ہوگی۔[2] (أخرجه البخاري ومسلم وغيرهما)۔ بالجملہ یہ حال تو پہلے نفخے کا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اس حال کی خبر دی جو دوسرے نفخے کے وقت ہوگا۔ چنانچہ فرمایا:[3]

وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ۝٥١ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ۝٥٢ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝٥٣ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٥٤

اور (جب) صور پھونکا جائے گا تو یکایک وہ (اپنی) قبروں سے (نکل کر) اپنے رب کی طرف تیزی سے دوڑیں گے (51) وہ کہیں گے: ہائے ہماری بربادی! کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اُٹھا دیا؟ یہی تو ہے جو رحمان نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا (52) وہ بس ایک (ہولناک) چیخ ہوگی، پھر یکایک وہ سب ہمارے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے (53) چناں چہ آج کسی جان (شخص) پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور تمھیں صرف اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو تم عمل کرتے تھے (54)

---

(1) فتح القدير (٤/٤٩٢) (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٤)
(3) فتح البيان (١١/٣٠٣، ٣٠٤)

تیسری مرتبہ صور میں پھونکے جانے پر لوگوں کے اٹھ کھڑے ہونے کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ تیسرا نفخہ ہے اور یہی نفخۂ بعث ونشور ہے قبروں سے اُٹھ کھڑے ہونے کے لیے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴾ نسلان کہتے ہیں جلدی چلنے کو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴾ [المعارج: ٤٣] ''جس دن یہ قبروں سے دوڑتے ہوئے نکلیں گے، گویا کہ وہ کسی جگہ کی طرف تیز تیز جا رہے ہیں۔'' ''مرقد'' سے مراد ان کی قبریں ہیں جن سے نہ اُٹھنے کا دنیا میں اعتقاد کیا کرتے تھے، پھر جس شے کی تکذیب کر چکے تھے، جب اپنے محشر میں اس کا معائنہ کیا تو بولے: اے خرابی ہماری! ہمیں ہماری نیند کی جگہ سے کس نے اٹھایا! یہ بات قبروں میں ان کو عذاب ہونے کی نفی نہیں کرتی، کیوں کہ قبر کا عذاب بہ نسبت اس کے مابعد کے شدت میں نیند کے مثل ہے۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، امام مجاہد، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ بعث سے پہلے وہ ایک نیند سوئیں گے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نیند دو نفخوں کے درمیان ہو گی، چنانچہ اسی لیے وہ یوں کہیں گے: ﴿ مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ﴾ پھر جب وہ یہ کہیں گے تو مومنین ان کو جواب دیں گے: ﴿ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ (قاله غير واحد من السلف) امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ جواب تو اُن کو فرشتے دیں گے۔[1] ان دونوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے، کیوں کہ جمع ممکن ہے، یعنی مومنین بھی اور فرشتے بھی جواب دیں۔ والله سبحانه و تعالىٰ أعلم. یعنی ہوسکتا ہے کہ مومنین اور فرشتے دونوں جواب دیں۔

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ جمیع، یعنی ﴿ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ سب کا سب قولِ کفار سے ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو نقل کیا ہے اور قولِ اول کو پسند فرمایا ہے[2] اور وہ اصح ہے اور وہ مثل اس آیت کے ہے جو سورت صافات میں مذکور ہے: ﴿ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ [الصّٰفّٰت: ٢٠۔ ٢١] ''اور کہیں گے کہ ہائے ہماری خرابی یہی جزا (سزا) کا دن ہے۔ یہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلاتے رہے۔'' نیز اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۭ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الروم: ٥٥۔ ٥٦] ''اور جس دن قیامت برپا ہو جائے گی گناہ گار لوگ قسمیں کھائیں گے کہ (دنیا میں) ایک گھڑی کے سوا نہیں ٹھہرے، اسی طرح یہ بہکے ہوئے ہی رہے۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا وہ جواب دیں گے کہ تم تو جیسا کہ کتاب اللہ میں ہے یوم قیامت تک ٹھہرے رہے۔ آج کا یہ دن قیامت ہی کا دن ہے، لیکن تم تو یقین ہی نہیں مانتے تھے۔''

---

[1] تفسير الطبري (٥٣٢/٢٠) تفسير ابن كثير (٧٥٣/٣) [2] تفسير الطبري (٥٣٣/٢٠)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴾ [النازعات: ١٣۔ ١٤] ''(معلوم ہونا چاہیے) وہ تو صرف ایک (خوفناک) ڈانٹ ہے کہ (جس کے ظاہر ہوتے ہی) وہ ایک دم میدان میں جمع ہوجائیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ﴾ [النحل: ٧٧] ''اور قیامت کا امر تو ایسا ہی ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب۔'' نیز فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٢] ''جس دن وہ تمھیں بلائے گا تم اس کی تعریف کرتے ہوئے تعمیلِ ارشاد کرو گے اور گمان کرو گے کہ تمھارا رہنا بہت ہی تھوڑا ہے۔'' یعنی ہم تو ان کو صرف ایک امر کریں گے پھر تب ہی وہ سب کے سب حاضر ہوں گے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ﴾ یعنی پھر آج کے دن کوئی شخص اپنے عمل کے لحاظ سے ظلم نہ کیا جائے گا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ یہ وہی نفخہ ہے جس کے باعث وہ اپنی قبروں سے مبعوث ہوں گے، دونوں نفخوں کے درمیان چالیس برس کا وقفہ ہے۔ بخاری و مسلم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''دو نفخوں کے درمیان چالیس ہیں۔'' لوگوں نے کہا: اے ابو ہریرہ! چالیس دن؟ کہا: میں باز رہتا ہوں۔ کہا: چالیس مہینے؟ کہا: میں باز رہتا ہوں۔ کہا: چالیس برس؟ کہا: میں باز رہتا ہوں (اصل روایت کے الفاظ ''أَبَيْتُ'' ہیں، یعنی میں نے صرف ''أربعون'' کا لفظ سنا ہے، میں نبی اکرم ﷺ پر جھوٹ بولنے سے اور بغیر علم کے خبر دینے سے باز رہتا ہوں)۔ پھر آسمان سے پانی نازل کرے گا تو وہ اس طرح اگیں گے جیسے ترکاری اُگتی ہے۔ انسان سے کوئی شے نہیں ہے مگر وہ بوسیدہ ہو جاتی ہے، سوائے ایک ہڈی کے اور وہ عجب الذنب ہے اور قیامت کے دن مخلوق اسی سے ترکیب دی جائے گی۔[2]

''نفخ'' میں زمانۂ مستقبل کو ماضی کے پیرائے میں ادا فرمایا، اس لیے کہ اس میں اس کے یقینی طور پر واقع ہونے سے آگاہ کرنا ہے۔ صور میں پھونکا جانا گو آیندہ زمانے میں ہوگا مگر اس کا ہونا ایسا یقینی ہے، گویا اس کا وقوع ہو چکا ہے، جیسا کہ اہلِ بیان نے ذکر کیا ہے اور اس آیت کو اُس کے مثل ٹھہرایا ہے۔ ''صُوْر'' واؤ کے سکون کے ساتھ وہ قرن ہے، یعنی نرسنگھا جس میں اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے جس طرح کہ اس بارے میں حدیث شریف وارد ہوئی ہے۔ لغتِ عرب میں صور کا اطلاق قرن پر مشہور ہے۔ اس کا مکمل بیان سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا

---

① تفسیر ابن کثیر (٣/٧٥٣) ② صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٦٥١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٥٥)
③ رقم الآیة (٧٣)

ہے کہ صور بہ فتحِ واو جمع ہے صورۃ کی، یعنی روحیں صورتوں میں پھونکی جائیں گی۔[1] "أَجْدَاثٌ" جمع ہے "جَدَثٌ" بہ معنی قبر کے۔ کسی نے "أَجْدَافٌ" بہ فاء پڑھا ہے، یہ بھی ایک لغت ہے، فصیح لغت بہ ثائے مثلثہ ہے۔

﴿ يَنْسِلُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں: "يُسْرِعُوْنَ وَيَعْدُوْنَ" یعنی قبروں سے زندہ ہو کر نکلیں گے جلدی کرتے ہوئے دوڑتے ہوئے جائیں گے، جبر اور قہر کی وجہ سے نہ کہ اپنے اختیار سے۔ "نسل" اور "نسلان" چلنے میں جلدی کرنے کو کہتے ہیں۔ محاورے میں بولتے ہیں: "نَسَلَ الذِّئْبُ يَنْسِلُ" جیسے: "ضَرَبَ يَضْرِبُ" اور "يَنْسُلُ" بہ ضم بھی کہتے ہیں۔ غرضیکہ جس وقت نفخۂ صور کے سبب سے اپنی قبروں سے مبعوث ہوں گے تو کہیں گے: ﴿ يٰوَيْلَنَا ﴾ اپنی ویل اور خرابی کو پکاریں گے۔ گویا اس سے کہیں گے کہ اے خرابی! تو کہاں ہے؟ حاضر ہو یہ تو تیری حاضری کا وقت ہے۔ "وَيْلٌ" مصدر بہ معنی ہلاک ہے، اس کا فعل اس کے لفظ سے نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی سے ہے، یعنی "هَلَكَ"۔ اس "وَيْلٌ" کو پکارنے والے کفار ہیں۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ يٰوَيْلَنَا ﴾ پر وقف کرنا اچھا ہے، پھر ﴿ مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ ﴾ سے کلام کی ابتداء ہوتی ہے۔ جمہور نے ﴿ يٰوَيْلَنَا ﴾ پڑھا ہے اور امام ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ نے حرفِ تاء کے اضافے کے ساتھ "يَاوَيْلَتَنَا" پڑھا ہے۔

جمہور نے ﴿ مَنْۢ بَعَثَنَا ﴾ کو بہ فتحِ میم بنا بر استفہام اور ﴿ بَعَثَنَا ﴾ کو بہ صیغۂ ماضی پڑھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ضحاک اور ابونہیک رحمہم اللہ نے بہ کسرِ میم بنا بر حرفِ جر اور "بَعْثِنَا" بہ صیغہ مصدریہ پڑھا ہے۔ یہ قراءت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، اس کی بنا پر حرف "مِنْ" "وَيْلٌ" سے متعلق ہوگا۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "مَنْ أَهَبَنَا" ہے[2] جو "هَبَّ مِنْ نَوْمِهِ إِذَا انْتَبَهَ" سے ماخوذ ہے۔ جب کوئی شخص اپنی نیند سے جاگتا ہے تو کہتے ہیں: "هَبَّ مِنْ نَوْمِهِ"۔ مرقد کہتے ہیں مضجع کو، مضجع لیٹنے سونے کی جگہ کو کہتے ہیں، یعنی کس نے ہم کو ہماری خواب گاہ سے اٹھایا، چوں کہ ہولناکی اور پریشانی کی وجہ سے ان کی عقلیں خلط ملط ہوگئیں، اس لیے خیال کیا کہ وہ سوئے ہوئے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اس وقت کہیں گے کہ جہنم کا معائنہ کریں گے۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت پہلا نفخہ پھونکا جائے گا تو اہلِ قبور سے عذاب اُٹھا لیا جائے گا اور دوسرے نفخے تک ایک نیند سو جائیں گے۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ عذاب سے راحت پائیں گے دوسرے نفخے سے ذرا پہلے اور نیند کا مزہ چکھیں گے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ دونوں نفخوں کے درمیان اللہ پاک ان سے عذاب رفع کر دے گا تو وہ سو جائیں گے، پھر دوسرے نفخے میں جب مبعوث ہوں گے تو قیامت کی ہولناکیوں کا معائنہ کریں گے اور ویل پکاریں گے، ان قولوں کی بنا پر ان کا قول ﴿ مِنْ مَّرْقَدِنَا ﴾ حقیقت ٹھہرے گا، کیوں کہ مرقد حقیقی خواب گاہ کو کہتے ہیں۔

---

[1] فتح القدير (٤/٤٩٣) تفسير القرطبي (١٥/٤٠)
[2] تفسير القرطبي (١٥/٤١) فتح القدير (٤/٤٩٣)
[3] تفسير القرطبي (١٥/٤١)
[4] الدر المنثور (٧/٦٣)

قولہ تعالیٰ: ﴿ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ ان کو فرشوں کی طرف سے جواب ہے، یا مومنین متقین کی طرف سے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ کفار کے کلام میں سے ہے، ایک دوسرے کو یہ جواب دیں گے۔ اول کے امام فراء رحمہ اللہ قائل ہیں اور دوسرے کے امام مجاہد رحمہ اللہ۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ پاک کے کلام سے ہے۔[1]

کلمۂ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے اور اس کی ضمیر محذوف ہے۔ "أَيْ: هٰذَا الَّذِيْ وَعَدَهُ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ فِيْهِ الْمُرْسَلُوْنَ قَدْ حَقَّ عَلَيْكُمْ وَنَزَلَ بِكُمْ" یعنی یہ جس کا رحمان نے وعدہ کیا ہے اور رسول اس میں سچے ہوئے، تم پر ثابت اور نازل ہوا۔ ﴿ وَعَدَ ﴾ و ﴿ صَدَقَ ﴾ کے دونوں مفعول محذوف ہیں: "أَيْ: وَعَدَكُمُوْهُ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَكُمُوْهُ الْمُرْسَلُوْنَ"۔ اصل "وَعَدَكُمْ بِهٖ وَصَدَقَكُمْ فِيْهِ" ہے۔ یا "وَعَدَنَاهُ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَنَاهُ الْمُرْسَلُوْنَ" ہے۔ اس بنا پر کہ یہ مومنین کے قول سے یا کفار کے قول سے ٹھہرے۔ ایسے وقت میں اقرار کیا گیا کہ اقرار اُن کو فائدہ نہیں دیتا۔

پھر اللہ پاک نے اپنی قدرت ذکر فرمائی۔ ﴿ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴾ یعنی نہیں ہوگا یہ نفخۂ ثانیہ جس کا ذکر ابھی گزرا ہے، مگر ایک چنگھاڑ جس کو اسرافیل چیخے گا صور میں اپنے پھونکنے سے، پھر تب ہی وہ جلدی سے ہمارے پاس حساب اور عقاب کے لیے جمع کیے ہوئے حاضر ہوں گے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ایک صیحہ سے ان کو اُٹھانا اور زندہ کرنا ہوگا۔ وہ اسرافیل کا یہ قول ہے: "أَيَّتُهَا الْعِظَامُ النَّخِرَةُ وَالْأَوْصَالُ الْمُتَقَطِّعَةُ وَالْعِظَامُ الْمُتَفَرِّقَةُ وَالشُّعُوْرُ الْمُتَمَزِّقَةُ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُنَّ أَنْ تَجْتَمِعْنَ لِفَصْلِ الْقَضَاءِ"[2] یعنی او بوسیدہ ہڈیو اور ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جوڑو اور جدا جدا پڑی ہوئی ہڈیو اور ریزہ ریزہ ہوئے بالو! بے شک اللہ تم کو حکم فرماتا ہے کہ تم فیصلے کے لیے اکٹھے ہو جاؤ اور یہ اس آیت کے معنی ہیں: ﴿ يَوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴾ [ق: ٤٢] "جس روز اس تند و تیز چیخ کو یقین کے ساتھ سن لیں گے، یہ دن ہوگا نکلنے کا۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ ﴾ مبتداء و خبر ہے۔ ﴿ جَمِيْعٌ ﴾ نکرہ ہے ﴿ مُحْضَرُوْنَ ﴾ اس کی صفت ہے۔ ﴿ مُحْضَرُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں "مَجْمُوْعُوْنَ"۔ حساب کی جگہ پر حاضر کیے جائیں گے۔ غرضیکہ جو عذاب ان کے لیے تیار کیا گیا ہے جس وقت وہ اس کو دیکھیں گے تو اُن سے جو بات حق کو ثابت کرنے کے لیے اور انھیں ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر کہی جائے گی اللہ پاک نے اس کو بیان فرمایا ہے: ﴿ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ﴾ یعنی پھر آج کے دن کوئی بھی شخص اس شے سے جس کا وہ مستحق ہے ذرا بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے ثوابِ عمل سے کچھ بھی کمی نہ کی جائے گی اور نہ وہ اس میں کسی طرح کا ظلم کیا جائے گا۔ اور تم نہ جزا دیے جاؤ گے مگر اس شے کی جزا جس کو تم دنیا میں کرتے تھے، یا اس شے کے سبب سے جس کو کرتے تھے، یا اس کے مقابلے میں۔

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَالْيَوْمَ ﴾ منصوب ہے ﴿ لَا تُظْلَمُ ﴾ سے اور ﴿ شَيْـًٔا ﴾ مفعول لہ ہے، یا

[1] تفسير القرطبي (١٥/٤٢) [2] تفسير القرطبي (١٥/٤٢)

مصدر "أَيْ: شَيْئًا مِنَ الظُّلْمِ" چنانچہ ﴿ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ ﴾ تو مومن کی امان کے لیے ہے اور ﴿ وَلَا تُجْزَوْنَ ﴾ کافر کی نا امیدی کے لیے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں کیا فائدہ ہے کہ مجرم کی نا امیدی کی طرف اشارہ کیا تو خطاب کا طریقہ اختیار کیا اور مومن کی امان کی طرف اشارہ کرتے وقت خطاب نہ کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ﴾ عموم کے معنی دیتا ہے اور اس مقام میں مقصود یہی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہ کرے گا، وہ مومن ہو یا کافر۔

رہا ﴿ وَلَا تُجْزَوْنَ ﴾ تو یہ کافر کے ساتھ خاص ہے، اس لیے کہ مومن کو اللہ پاک ایسی شے کے ساتھ جزا دے گا جو اس نے وراثت کے طور پر اور اختصاصِ الٰہی کے طور پر نہیں کی وہ اپنی رحمت کو جس کے لیے چاہتا ہے خاص کرتا ہے جس طرح کہ وہ اس کو اعمال کی جہت سے جزا دے گا، چنانچہ اس لیے پہلے حصے میں خطاب کو ترک کیا اور دوسرے حصے میں خطاب لایا۔ بالجملہ جب اللہ پاک نے کافروں کا حال بیان کیا تو اس کے بعد اپنے نیک بندوں کے بارے میں فرمایا اور اس کو ان باتوں میں سے ٹھہرایا جو اس دن کفار سے ان کی حسرت اور ندامت بڑھانے کے لیے کہی جائیں گی اور اس لیے کہی جائیں گی تاکہ ان کی جزع اور فزع کامل ہو اور جو بلا اُن پر نازل ہوئی اور جس شقاوت اور بدبختی کا انھوں نے مشاہدہ کیا، وہ پوری ہو۔ پھر اللہ پاک نے ان کے لیے جو عذاب تیار کر رکھا ہے اور اپنے دوستوں کے لیے انواع اور اقسام کے جو عیش اور آرام مہیا کر رکھے ہیں، جب وہ ان کو دیکھیں گے تو ان کے دلوں میں انتہا درجے کی ایذا پہنچے گی اور ان کے سینوں میں تنگی اتنی زیادہ ہو جائے گی جس کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾

بے شک اہلِ جنت آج ایک شغل میں خوش وخرم ہوں گے (55) وہ اور اُن کی بیویاں سایوں میں تختوں پر ٹیک لگائے ہوں گے (56) ان کے لیے وہاں (ہر قسم کے) پھل ہوں گے اور ان کے لیے وہ ہوگا جو وہ مانگیں گے (57) (انھیں) نہایت مہربان رب کی طرف سے سلام کہا جائے گا (58)

اہلِ جنت کا عیش و آرام:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں اللہ پاک اہلِ جنت کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ قیامت کے دن جس وقت وہ

[1] فتح البیان (۱۱/ ۳۰۴۔ ۳۰۶)

عرصات سے کوچ کریں گے اور جنتوں کے چمنوں میں نازل ہوں گے تو اپنے غیر کی نسبت شغل میں ہوں گے، اس نعیمِ مقیم اور عظیم کامیابی کے سبب جس میں وہ ہوں گے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ اور اسماعیل بن خالد نے کہا ہے کہ وہ اس عذاب سے شغل میں ہیں جس میں اہلِ نار ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فِیْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴾ "أَيْ: فِيْ نَعِيْمٍ مُعْجَبُوْنَ أَيْ: بِهٖ" اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "فَاكِهُوْنَ أَيْ: فَرِحُوْنَ" سیدنا عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام سعید بن مسیّب، عکرمہ، حسن، قتادہ، اعمش، سلیمان تیمی اور اوزاعی رحمہم اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ شغل ان کا افتضاضِ ابکار ہے، یعنی کنواری عورتوں کا بکر توڑنا۔[1]
سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں بہ سماع الاوتار ہے، یعنی باجوں کے سننے سے وہ خوش ہوتے ہوں گے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا: شاید سننے والے کی غلطی ہے، وہ تو یہی افتضاض الابکار ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "وَحَلَائِلُهُمْ ﴿ فِیْ ظِلٰلٍ ﴾ أَيْ: فِيْ ظِلَالِ الْأَشْجَارِ" یعنی وہ اور ان کی بیویاں درختوں کے سایوں میں ہیں۔ ﴿ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، محمد بن کعب، حسن، قتادہ، سدی اور خصیف رحمہم اللہ نے کہا: "اَلْأَرَائِكُ" "اَلسُّرُرُ تَحْتَ الْحِجَالِ" ہیں ("حجال" جمع "حجلة" بہ تحریک بہ معنی خانۂ عروسی) یعنی ﴿ الْاَرَآىِٕكِ ﴾ سے مراد چھپر کھٹوں کے نیچے تخت ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے: "نَظِيْرُهُ فِي الدُّنْيَا هٰذِهِ التُّخُوْتُ تَحْتَ الْبَشَاخِيْنِ" وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى أَعْلَمُ۔[3] یعنی "أَرَائِك" کی نظیر دنیا میں یہی تخت ہیں جو بشاخین کے نیچے ہوتے ہیں۔ بشاخین سے مراد شاید مسہریاں اور چھپر کھٹ ہیں۔ ﴿ لَهُمْ فِیْهَا فَاكِهَةٌ ﴾ یعنی ان کے لیے جنت کے میووں کی ساری اقسام ہیں۔

﴿ وَّلَهُمْ مَّا یَدَّعُوْنَ ﴾ یعنی جو چیز طلب کریں گے پائیں گے تمام لذت دینے والی چیزوں سے۔ غرض یہ ہے کہ لذت اور مزے کی چیزوں میں سے جو کچھ مانگیں گے وہ پائیں گے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "أَلَا هَلْ مُشَمِّرٌ إِلَى الْجَنَّةِ؟ فَإِنَّ الْجَنَّةَ لَا خَطَرَ لَهَا هِيَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ نُوْرٌ كُلُّهَا يَتَلَأْلَأُ وَرَيْحَانَةٌ تَهْتَزُّ وَقَصْرٌ مَشِيْدٌ وَنَهْرٌ مُطَّرِدٌ وَثَمَرَةٌ نَضِيْجَةٌ وَزَوْجَةٌ حَسْنَاءُ جَمِيْلَةٌ وَحُلَلٌ كَثِيْرَةٌ وَمُقَامٌ فِيْ أَبَدٍ فِيْ دَارِ سَلَامَةٍ وَفَاكِهَةٍ خَضِرَةٍ وَخَيْرَةٍ وَنَعْمَةٍ مَحَلَّةٍ عَالِيَةٍ بَهِيَّةٍ. قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَحْنُ الْمُشَمِّرُوْنَ لَهَا. قَالَ ﷺ: قُوْلُوْا: إِنْ شَاءَ اللّٰهُ فَقَالَ الْقَوْمُ: إِنْ شَاءَ اللّٰهُ"[4] (وكذا رواه ابن ماجه في كتاب الزهد من سننه) یعنی خبردار! کیا کوئی جنت کی طرف سعی و کوشش

---

[1] تفسیر الطبري (۲۰/۵۳٤_۵۳٦) [2] الدر المنثور (٦٥/٧)
[3] تفسیر الطبري (۲۰/۵۳۸، ۵۳۹) تفسیر ابن کثیر (۳/۷۵۳، ۷۵٤)
[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٣٢) اس کی سند میں "ضحاک معافری" مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٣٥٨)

کرنے والا ہے؟ چنانچہ جنت کے لیے کوئی مثال وعوض نہیں ہے۔ ربِ کعبہ کی قسم! وہ ایک نور ہے، سب کا سب جھلملا رہا ہے اور ایک ریحانہ ہے کہ لہرا رہا ہے اور ایک پکا محل ہے اور ایک بہتی ہوئی نہر ہے اور ایک پکا ہوا میوہ ہے اور ایک حسین اور جمیل بی بی ہے اور بہت سے جوڑے ہیں اور سلامتی کے گھر میں ہمیشگی کی قیام گاہ ہے اور ایک میوہ ہے سرسبز تر و تازہ اور خیر ونعمت ہے اور ایک محل ہے بلند روشن۔ صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! ہم اس کے لیے سعی اور کوشش کرنے والے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہو ان شاء اللہ، چنانچہ لوگوں نے ان شاء اللہ کہا۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: ''قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى ﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴾ فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى نَفْسَهُ سَلَامٌ عَلٰى أَهْلِ الْجَنَّةِ''۔ یہ جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ﴾ [الأحزاب: ٤٤] ''جس دن یہ (اللہ سے) ملاقات کریں گے ان کا تحفہ سلام ہوگا۔'' امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اس دوران میں کہ اہلِ جنت اپنی نعمتوں میں ہوں گے کہ ان پر ایک نور ساطع ہوگا (بلند ہو کر چمکے گا) تو وہ اپنے سر اٹھائیں گے، ناگاہ رب تعالیٰ نے یقیناً ان پر ان کے اوپر سے جھانکا۔ پھر کہا: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ''

چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴾ کہا: پس وہ ان کی طرف نظر کرے گا اور وہ اس کی طرف نظر کریں گے، پھر وہ نعمتوں میں سے کسی شے کی طرف توجہ نہیں کریں گے، جب تک اس کی طرف نظر کریں گے، یہاں تک کہ وہ ان سے حجاب کرے گا اور اس کا نور و برکت ان پر اور ان کے گھروں پر باقی رہ جائے گا۔[1] (ورواه ابن ماجه في كتاب السنة من سننه قال ابن كثير: في إسناده نظر. (فتح البیان اور فتح القدیر میں ہے ''وأخرج ابن ماجه وابن أبي الدنيا في صفة الجنة والبزار وابن أبي حاتم والآجري فى الرؤية وابن مردويه عن جابر... الخ'') امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ اللہ تعالیٰ جس وقت اہلِ جنت اور نار سے فارغ ہوگا تو بادل اور فرشتوں کے سایوں میں متوجہ ہوگا، کہا: پھر وہ اہلِ جنت پر سلام کرے گا تو وہ اس کو سلام کا جواب دیں گے۔ امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا، جو عمر رحمہ اللہ سے راوی ہیں: اور یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے: ﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴾

پھر اللہ عزوجل فرمائے گا: مجھ سے مانگو تو وہ کہیں گے: اے رب! ہم تجھ سے کیا مانگیں؟ فرمائے گا: ہاں، مجھ سے مانگو۔ کہیں گے: اے رب! ہم تجھ سے تیری رضا مانگتے ہیں۔ فرمائے گا کہ میری رضا نے تو تم کو میرے عزت والے گھر میں داخل کیا ہے۔ کہیں گے: یا رب! پھر وہ کیا شے ہے جو تجھ سے مانگیں؟ پس قسم ہے تیری عزت و جلال کی

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٤) كشف الأستار عن زوائد البزار (٦٧/٣) تفسير ابن كثير (٥٠١/٤) فتح البيان (٣١٠/١١) اس کی سند میں ''فضل رقاشی'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٢٣٦٣)

اور ارتفاعِ مکان کی! اگر تو ہم پر ثقلین کا رزق تقسیم کر دیتا تو البتہ ہم ان کو کھلاتے اور پلاتے اور پہناتے اور ان کی خدمتی دیتے، یہ سب کچھ ہمارا کچھ کم نہ کرتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بے شک میرے پاس مزید ہے: "قَالَ فَيَفْعَلُ ذٰلِكَ لَهُمْ فِيْ دَرَجِهِمْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ فِيْ مَجْلِسِهٖ" کہا: پھر ان کے پاس اللہ عزوجل کی طرف سے تحفے آئیں گے جن کو فرشتے اٹھائے ہوں گے۔[1] پھر اس طرح کی روایت ذکر کی۔ یہ غریب خبر ہے جسے ابن جریر نے کئی طرق سے روایت کیا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

کوفیین اور ابن عامر رحمہ اللہ نے ﴿ شُغُلٍ ﴾ کو بہ ضمتین پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ ضم شین اور سکونِ غین پڑھا ہے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں، جیسا کہ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام مجاہد، فراء، ابو السماک رحمہم اللہ نے بہ فتحتین اور یزید نحوی اور ابن ہبیرہ رحمہما اللہ نے بہ فتحِ شین اور سکونِ غین پڑھا ہے۔[3] ﴿ شُغُلٍ ﴾ وہ شان اور حال ہے جو آدمی کو روکتا ہے اور اپنے سوا اس کے سب حالات سے مشغول کرتا ہے، اس لیے وہ حال اس کے نزدیک سارے حالات سے زیادہ اہم ہوتا ہے، یا تو اس لیے کہ وہ کمال مسرت اور تازگی کا موجب ہوتا ہے، یا کمال برائی اور غم کا موجب ہوتا ہے۔ یہاں مراد پہلی حالت ہے۔ ﴿ شُغُلٍ ﴾ کی تنکیر اور ابہام سے یہ بات بتانا مقصود ہے کہ وہ شغل کا ایسا عالی درجہ ہے جو بیان سے باہر ہے۔

اب رہی یہ بات کہ وہ کیا شغل ہے تو اس میں اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے جو پہلے گزر چکا ہے کہ کنواری عورتوں کی بکارت توڑنے میں مشغول ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مومن ہر بار جب اپنی بی بی کا ارادہ کرے گا تو اس کو کنواری پائے گا۔[4] اسی طرح مرفوعاً بھی مروی ہے۔[5] امام وکیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا شغل سماع میں ہوگا۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک دوسرے کی زیارت اور ملاقات میں مشغول ہوں گے۔[6] کسی نے کہا ہے کہ اس دن اللہ جبار کی ضیافت میں مشغول ہوں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ اہلِ نار جس حال میں ہیں علی الاطلاق اس سے ان کو شغل ہوگا۔ یا ان کے گھر والے جو نار میں ہیں، ان سے مشغول ہوں گے، ان کے حال کی ان کو کچھ فکر نہ ہوگی اور ان کی کچھ پروا نہ کریں گے، تاکہ ان کے عیش و آرام میں ان پر کسی طرح کا تنغص (تلخی) داخل نہ ہو۔ اولیٰ یہ ہے کہ ان کے شغل کو کسی خاص چیز کے ساتھ مخصوص نہ کیا جائے۔ مراد یہ ہے کہ وہ ایسے انواع اور اقسام کی لذتوں میں ہیں جو اُن کو باقی باتوں سے بالکل مشغول اور بے پروا کرتے ہیں، کیوں کہ وہاں تو وہ چیزیں ہیں

① تفسير الطبري (٢٠/٥٤٠، ٥٤١) ② تفسير ابن كثير (٣/٧٥٣، ٧٥٤)
③ فتح القدير (٤/٤٩٥) ④ الدر المنثور (٧/٦٤، ٦٥)
⑤ المعجم الصغير (١/١٦٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه معلى بن عبد الرحمن الواسطي وهو كذاب" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٧٧١)
⑥ تفسير القرطبي (١٥/٤٣)

جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں ان کا خیال گزرا۔

رہی یہ بات کہ اکابرِ سلف سے ﴿ شُغُلٍ ﴾ کی تفسیر میں جو خاص خاص اقوال مروی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، مثلاً: کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد افتضاضِ ابکار ہے، یا سماع ہے، یا ضربِ اوتار ہے، یا تزاور ہے، یا ضیافتِ جبار ہے تو ان کی مراد شغل کو کسی ایک مخصوص کام میں محصور کرنا نہیں ہے، بلکہ اس بات کا بیان ہے کہ یہ امور ان کے اشغال میں سے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک نے جو اُن امور میں سے کسی کو خاص طور پر ذکر کیا تو یہ اس پر محمول ہے کہ اس کے بیان کرنے کا مقام اس کا مقتضا ہو۔

﴿ فٰكِهُوْنَ ﴾ جمہور نے یہ رفع پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ہے اور ﴿ فِيْ شُغُلٍ ﴾ اس سے متعلق ہے۔ یا بنا بر حال محلِ نصب میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مرفوع ہو بنا برخبرِ ﴿ اِنَّ ﴾ اور ﴿ فٰكِهُوْنَ ﴾ خبرِ ثانی۔ امام اعمش اور طلحہ بن مصرف نے ''فَاكِهِيْنَ'' پڑھا ہے بہ نصب بنا بر حال اور ﴿ فِيْ شُغُلٍ ﴾ خبر۔ امام حسن، ابوجعفر، ابوحیوہ، ابو رجا، شیبہ، قتادہ اور مجاہد رحمہم اللہ نے ﴿ فٰكِهُوْنَ ﴾ پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں دو لغت ہیں، جیسے: ''فَارِهَ وَفَرِهَ'' اور ''حَاذِرَ وَحَذِرَ''۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ ''فَاكِهٌ''، ''ذُو الْفَاكِهَةِ'' ہے، جیسے: ''تَامِرٌ وَلَابِنٌ ذُوْ التَّمْرِ وَذُو اللَّبَنِ'' اور ''فَكِهٌ'' بہ معنی ''مُتَفَكِّهٌ وَمُتَنَعِّمٌ'' ہے۔ امام ابو زید رحمہ اللہ نے کہا: محاورے میں بولتے ہیں: ''رَجُلٌ فَكِهٌ''، جبکہ وہ طیب النفس ضحوک ہو، یعنی خوش طبع ہنسوڑ ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ''اَلْمُعْجَبُوْنَ'' امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ نے مثل قولِ قتادہ کے کہا ہے اور امام سدی رحمہ اللہ نے مثل قولِ کسائی کے۔[1] کسی نے کہا: ''نَنَاعِمُوْنَ مُتَلَذِّذُوْنَ فِي النَّعْمَةِ'' ماخوذ ہے۔ ''فَكَاهَةٌ'' سے ''فَكَاهَةٌ'' کے معنی ہیں: ''تَمَتَّعَ وَتَلَذَّذَ'' ماخوذ ''فَاكِه'' سے، یعنی وہ نعمت میں لذت لیتے ہیں، مزے اٹھاتے ہیں۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر بہ طیبِ عیش ونشاط کی ہے۔ یعنی وہ اچھے عیش ونشاط میں ہیں۔

﴿ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ ﴾ جملہ مستانفہ ہے، اس سے مقصود ان کے شغل اور تفکہ کا بیان کرنا ہے اور ان کا ایسی شے کے ساتھ کامل کرنا ہے جو اُن کے سرور اور رونق کو بڑھائے، وہ یہ ہے کہ ان کی بیبیاں ان کے ساتھ ہیں، اس حال میں کہ سایوں کے نیچے تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھی ہیں۔ ﴿ هُمْ ﴾ کی ضمیر مبتداء ہے اور ﴿ وَاَزْوَاجُهُمْ ﴾ اس پر معطوف ہے اور ﴿ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴾ خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ هُمْ ﴾ اس ضمیر کی تاکید ہو جو ﴿ فٰكِهُوْنَ ﴾ میں ہے اور ﴿ وَاَزْوَاجُهُمْ ﴾ اس ضمیر پر معطوف ہو اور ﴿ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴾ کا رفع اس بنا پر ہو کہ مبتدائے محذوف کی خبر ٹھہرے اور ﴿ فِيْ ظِلٰلٍ ﴾ اس سے متعلق ہو، یا حال ہو، اسی طرح ﴿ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ﴾۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے یہ جائز رکھا ہے کہ ﴿ فِيْ ظِلٰلٍ ﴾ خبر

[1] تفسير القرطبي (٤٤/١٥) فتح القدير (٤٩٥/٤)

ہے اور ﴿ عَلَى الْأَرَآئِكِ ﴾ کلامِ مستانف ہے۔[1] جمہور نے ﴿ ظِلٰلٍ ﴾ بکسرِ ظاء والف پڑھا ہے، یہ جمع ہے "ظِلٌّ" بہ معنی سایہ کی۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام عبید بن عمیر، اعمش، یحییٰ، حمزہ، کسائی اور خلف نے ﴿ ظُلَلٍ ﴾ بہ ضم ظاء بدون الف پڑھا ہے۔ ﴿ ظُلَلٍ ﴾ جمع ہے "ظُلَّةٌ" کی۔ دونوں قراءتوں کی بنا پر فرش اور ستور ہیں جو اُن پر سایہ کرتے ہیں، جیسے: خیمے اور چھپر کھٹ۔ "ظِلٌّ" وہ جگہ ہے جس پر دھوپ نہیں پڑتی اور "ظُلَّةٌ" وہ شے ہے جو دھوپ سے ستر کرتی ہے۔ "أَرَائِكُ" جمع ہے "أَرِيكَةٌ" کی، جیسے: "سَفَائِنُ" "سَفِينَةٌ" کی جمع ہے، اس سے مراد وہ تخت ہیں جو حجلوں میں ہوتے ہیں۔ امام احمد بن یحییٰ ثعلب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَرِيكَةٌ" نہیں ہوتا ہے مگر تخت قبے میں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ظِلٰلٍ ﴾ سے مراد اکنانِ قصور ہیں،[2] یعنی محلوں کی چھت جن سے دھوپ وغیرہ کا بچاؤ ہوتا ہے۔ (اس بنا پر مراد یہ ہوگی کہ اہلِ جنت اپنی ازواج کے ساتھ چھتوں کے نیچے سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے۔ ازمصحح سلمہ اللہ تعالیٰ)۔

جملہ ﴿ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ ﴾ سے مقصود کھانے پینے کی چیزوں کا اور جسمانی اور روحانی لذتوں کا بیان کرنا ہے جن سے وہ جنت میں تمتع اٹھائیں گے اور مزہ لیں گے، اس کے بیان کے بعد کے وہاں ان کے لیے مجالسِ اُنس و محافلِ قدس ہیں، یعنی طرح طرح کے میووں میں سے ہر قسم کے بہت سے میوے ہیں۔ ﴿ وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُونَ ﴾ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے اور عائد محذوف "أَيْ: مَا يَدَّعُوْنَهُ"، یا موصوفہ ہے، یا مصدریہ۔

﴿ يَدَّعُوْنَ ﴾ مضارع ہے "اِدَّعىٰ" کا، اصل اس کی "يَدْتَعِيُوْنَ" ہے بروزن "يَفْتَعِلُوْنَ" ضمہ یاء پر ثقیل تھا نقل کر کے ماقبل کو دیا، پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے حرفِ یاء کو حذف کیا گیا تو "يَدْتَعُوْنَ" ہوا، تاء کو دال سے بدلا اور دال کو دال میں ادغام کیا تو ﴿ يَدَّعُوْنَ ﴾ ہو گیا۔ غرضیکہ باب افتعال ہے "دَعَا يَدْعُوْ" سے، اور تمنا کے معنی اس کو پلائے گئے ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يَدَّعُوْنَ ﴾ بہ معنی "يَتَمَنَّوْنَ" ہے۔[3] عرب بولتے ہیں: "اِدَّعِ عَلَيَّ مَا شِئْتَ أَيْ: تَمَنَّ"، یعنی تمنا کر مجھ پر جس شے کی تو چاہے۔ "وَفُلَانٌ فِيْ خَيْرِ مَا يَدَّعِيْ أَيْ: يَتَمَنّٰى"، مطلب یہ ہے کہ جنت میں ان کے لیے وہ شے ہے جس کی وہ تمنا کریں گے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ دعا سے ہے: "أَيْ: يَدْعُوْنَهُ أَهْلُ الْجَنَّةِ يَأْتِيْهِمْ"،[4] مِنْ دَعَوْتُ غُلَامِيْ" یعنی اہلِ جنت جس شے کو بلائیں گے، وہ ان کے پاس آئے گی، پس افتعال بہ معنی فعل ہوگا، جیسے: اجتمال بہ معنی جمل (جمل یعنی چربی پگھلانا) اور ارتحال بہ معنی رحل۔ کسی نے کہا ہے کہ افتعل بہ معنی تفاعل ہے: "أَيْ مَا يَتَدَاعُوْنَهُ

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (١٠٨٤/٢، ١٠٨٥)
[2] تفسير القرطبي (٤٤/١٥) فتح القدير (٤٩٦/٤)
[3] تفسير القرطبي (٤٥/١٥)
[4] معاني القرآن (٢٩٢/٤)

كَقَوْلِهِمْ أَرْتَمُوْا وَتَرَامُوْا" (یعنی "إن كل ما يطلبه أحد من صاحبه فهو حاصل لهم بلا طلب")۔
کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جو کوئی ان میں سے کسی شے کا دعویٰ کرے گا تو وہ اس کے واسطے ہو گی، کیوں کہ اللہ پاک نے ان کو مطبوع ومخلوق کیا ہے، اس بات پر کہ ان میں سے کوئی شے کا دعویٰ نہ کرے، مگر اس حال میں کہ اس کا دعویٰ کرنا اس کے لیے حسین اور جمیل ہے۔ کسی نے ﴿ يَدَّعُوْنَ ﴾ کو بہ تخفیف "يَدْعُوْنَ" پڑھا ہے، اس کے معنی واضح ہیں۔

﴿ مَا يَدَّعُوْنَ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ لَهُمْ ﴾ خبر اور جملہ ماقبل پر معطوف ہے۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ يَدَّعُوْنَ ﴾ پر وقف حسن ہے، پھر سلام سے کلام کی ابتداء ہے بایں معنی کہ "لَهُمْ سَلَامٌ".[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ سَلٰمٌ ﴾ ﴿ مَا ﴾ کی خبر ہے: "أَيْ: مُسَلِّمٌ خَالِصٌ أَوْ ذُوْ سَلَامَةٍ" اور ﴿ لَهُمْ ﴾ ﴿ سَلٰمٌ ﴾ سے متعلق ہے بایں معنی کہ "مَا يَدَّعُوْنَهُ سَلَامٌ خَالِصٌ لَهُمْ لَا يُنَازِعُهُمْ فِيْهِ مُنَازِعٌ" یعنی جس شے کی وہ تمنا کریں گے، وہ سالم اور خالص ہو گی ان کے لیے اس میں ان سے کوئی نزاع کرنے والا نزاع نہیں کرے گا۔ رفع سلام کی ایک وجہ یہ ہوئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ سَلٰمٌ ﴾ ﴿ مَا ﴾ سے بدل ہے "أَيْ: وَلَهُمْ سَلَامٌ أَيْ: أَنْ يُّسَلِّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ" یعنی جنت والوں کے لیے یہ ہے کہ اللہ پاک ان پر سلام کرے گا اور یہ ان کی تمنا اور مراد ہے۔ یہ قول امام زجاج رحمہ اللہ کا ہے۔[2] امام زمخشری رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے۔[3] اس میں یہ خلل ہے کہ جب بدل ہو گا تو ﴿ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴾ خاص ہو جائے گا، حالانکہ ظاہر و اولیٰ یہ ہے کہ ﴿ لَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴾ عموم پر محمول ہو اور یہ سلام بدخولِ اولیٰ اس کے تحت میں داخل ہو۔

﴿ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴾ کو کسی نوعِ خاص پر مقصور کرنا بے وجہ ہے گو سلام اس کی اشرف انواع ہے۔ عموم پر محمول کرنے سے غرض عموم کے معنی کو حق ثابت کرنا ہے اور اس شے کی رعایت کرنا ہے جس کی مقتضی نظمِ قرآنی ہے اور جب عموم ہو گا تو اس سے بدل نہ ٹھہرے گا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ سَلٰمٌ ﴾ ﴿ مَا ﴾ کی صفت ہے، اس بنا پر کہ ﴿ مَا ﴾ موصوف بہ معنی شے ہے ﴿ يَدَّعُوْنَ ﴾ صفتِ اول اور ﴿ سَلٰمٌ ﴾ صفتِ ثانی۔ موصولہ ومصدریہ کی صورت میں معرفہ اور نکرہ کی صفت ہونا بہ سببِ اختلاف متعذر ہو گا۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ ﴿ سَلٰمٌ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی: "أَيْ: هُوَ أَوْ ذٰلِكَ سَلَامٌ"

پانچویں یہ ہے کہ ﴿ سَلٰمٌ ﴾ مبتداء ہے اور خبر اس کی وہ فعل ہے جو ناصب ہے ﴿ قَوْلًا ﴾ کا۔ "أَيْ: سَلَامٌ يُقَالُ لَهُمْ قَوْلًا" کسی نے کہا ہے کہ تقدیر "سَلَامٌ عَلَيْكُمْ" ہے۔ چھٹی یہ ہے کہ ﴿ سَلٰمٌ ﴾ مبتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴾ ہے اور ﴿ قَوْلًا ﴾ مصدر مؤکد ہے جملہ مضمون کے لیے اور یہ مصدر مع اپنے عامل کے جملہ معترضہ ہے مبتداء وخبر کے درمیان۔ یہ سب وجوہ تو جمہور کی قراءت پر تھیں جو بہ رفعِ سلام ہے۔ سیدنا اُبی، ابن مسعود رضی اللہ عنہما اور عیسیٰ رحمہ اللہ نے "سَلَامًا" بہ نصب پڑھا ہے اس بنیاد پر کہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ "أَيْ: سَلَّمَ اللّٰهُ

[1] تفسير القرطبي (۱۵/۴۵) [2] معاني القرآن (۲۹۲/۴) [3] الكشاف (۲۵/۴)

عَلَيْهِمْ فِي الْجَنَّةِ سَلَامًا» یعنی اللہ پاک جنت میں ان پر سلام کرے گا، سلام کرنا ان کی تعظیم اور اکرام کے لیے۔ یا منصوب ہے بنا بر حال بہ معنی خالصاً[1] «أَيْ: لَهُمْ مُرَادُهُمْ خَالِصًا» یعنی ان کے لیے ان کی مراد ہے، درآں حالیکہ وہ سالم و خالص ہے۔ ان سے کوئی منازع اس کے بارے میں نزاع نہ کرے گا۔ (قاضی نے کہا: احتمال ہے کہ بہ نصب بنا بر اختصاص ہو،[2] یعنی بنا بر مدح بہ تقدیر «أَعْنِي» لیکن امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس وجہ کو زیادہ موثر کہا ہے،[3] کیوں کہ یہ مقام مدح کا مقام ہے، اس لحاظ سے کہ یہ قول رب رحیم سے صادر ہے، مقامِ تعظیم میں تو لائق ہے کہ اس کے امر و قدر کی بڑائی اور تعظیم کی جائے اور جملہ مستقلہ ماقبل سے جدا ہو۔ کذا قال زادہ)۔

﴿سَلٰمٌ﴾ یا تو تحیت سے ہے یا سلامت سے۔ امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے ﴿سَلْمٌ﴾ پڑھا ہے۔ گویا یوں کہا کہ «مَا يَدَّعُوْنَ سِلْمٌ لَهُمْ لَا يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهِ». ﴿قَوْلًا﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ مفعول مطلق ہے فعل محذوف کا «أَيْ: قَالَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ قَوْلًا أَوْ يَقُوْلُ لَهُمْ قَوْلًا أَوْ يُقَالُ لَهُمْ قَوْلًا مِنْ رَّبٍّ رَحِيْمٍ أَيْ: مِنْ جِهَتِهِ» کہا ہے کہ اللہ پاک ان کی طرف سلام بھیجے گا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتے اہلِ جنت پر ہر دروازے سے داخل ہوں گے۔ کہیں گے: «سَلَامٌ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ مِنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ»۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «إِنَّ اللّٰهَ هُوَ يُسَلِّمُ عَلَيْهِمْ»[5] یعنی خود اللہ پاک ان پر سلام کرے گا اور اسی طرح سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ پاک فرمائے گا: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ»[6] صرف امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿سَلٰمٌ﴾ مبتداء ہے اور ﴿قَوْلًا﴾ بہ نزعِ خافض منصوب ہے: «أَيْ: بِالْقَوْلِ» اور ﴿مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ اس کی خبر ہے۔[7] غرضیکہ جو بات مومنین سے کہی جائے گی، جب اللہ پاک اس کا ذکر کر چکا تو جو کچھ مجرمین سے کہا جائے گا، اس کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[8]

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٥٩﴾ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٠﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٢﴾

اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ (59) اے بنی آدم! کیا میں نے تمھیں (اس بات کی) تاکید نہیں کی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا، بلاشبہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے (60) اور یہ کہ تم میری ہی

---

(1) فتح القدير (٤/٤٩٦) (2) تفسير البيضاوي (٤/٤٣٨) (3) الكشاف (٤/٢٥) (4) فتح القدير (٤/٤٩٦)
(5) الدر المنثور (٧/٦٦) (6) اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ (7) تفسير الجلالين (١/٥٨٤)
(8) فتح البيان (١١/٣٠٧-٣١٠)

عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے (61) اور بلاشبہہ اس نے تم میں سے بہت سی مخلوق کو گمراہ کر دیا، کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے؟ (62)

میدانِ حشر میں کافروں کا کیا حال ہوگا:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک اس حال کی خبر دیتا ہے جو قیامت کے دن کفار کا ہوگا، وہ یہ ہے کہ اللہ ان کو حکم دے گا کہ وہ مومنوں سے الگ ہو کر کھڑے ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ﴾ [یونس: ۲۸] ''اور وہ دن بھی قابلِ ذکر ہے جس روز ہم ان سب کو جمع کریں گے۔ پھر مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمھارے شریک اپنی جگہ ٹھہرو، پھر ہم ان کے آپس میں پھوٹ ڈال دیں گے۔'' نیز اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴾ [الروم: ١٤] ''اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن (جماعتیں) الگ الگ ہو جائیں گی۔'' نیز فرمایا: ﴿ يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴾ [الروم: ٤٣] ''اس دن سب متفرق ہو جائیں گے۔'' یعنی وہ دو صدع دو فرقے ہو جائیں گے۔ نیز فرمایا: ﴿ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴾ [الصافات: ٢٢۔ ٢٣] ''ظالموں کو اور ان کے ہمراہیوں کو اور (جن) جن کی وہ اللہ کے علاوہ پرستش کرتے تھے (ان سب کو) جمع کر کے انھیں دوزخ کی راہ دکھا دو۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ یہ دھمکی اور ڈانٹ ہے اللہ کی طرف سے بنی آدم کے کفار کو، جنھوں نے شیطان کی اطاعت کی، حالاں کہ وہ ان کا کھلا دشمن ہے اور رحمان کی نافرمانی کی اور اسی نے ان کو پیدا کیا اور رزق دیا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾ یعنی میں نے تم کو دارِ دنیا میں حکم کیا تھا کہ شیطان کا کہنا نہ ماننا اور میری عبادت کرنا اور یہ ہی سیدھی راہ ہے۔ مگر تم اس کے سوا چلے اور جس بات کا میں نے تم کو امر کیا تھا، تم نے اس میں شیطان کی پیروی کر لی۔ اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ﴾ ﴿ جِبِلًّا ﴾ کو بہ کسرِ جیم و تشدیدِ لام بولتے ہیں اور بہ ضمِ جیم و باء و تخفیفِ لام بھی بولتے ہیں اور بعض حرفِ باء کو ساکن کرتے ہیں، اس سے مراد خلقِ کثیر ہے۔ یہ قول امام مجاہد، قتادہ، سدی اور سفیان بن عیینہ کا ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی کیا پھر تم کو اس بات کی عقل نہ تھی کہ تم نے اپنے رب کی مخالفت

---

(1) تفسیر الطبري (٢٠/٥٤٣) تفسیر ابن کثیر (٣/٧٥٥) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے، نیز ''اسماعیل بن رافع'' ضعیف راوی ہے۔

کی اس امر میں جس کا تم کو حکم دیا تھا کہ اسی وحدہ لاشریک لہٗ کو پوجنا اور تم نے شیطان کی اتباع کو اختیار کیا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ تعالیٰ حکم دے گا تو اس سے ایک عنق ساطع مظلم نکلے گی ("عنق" سے مراد ایک طائفہ ہے نار سے، یعنی اس کا ایک ٹکڑا بلند تاریک) اور کہے گی: ﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ .... تا .... اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴾ ﴿ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ ﴿ وَ امْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ پس لوگ جدا ہو جائیں گے اور گھٹنوں کے بل بیٹھیں گے اور یہ وہی ہے جو اللہ عزوجل فرماتا ہے: ﴿ وَ تَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الجاثیة: ۲۸] "اور آپ دیکھیں گے کہ ہر امت گھٹنوں کے بل گری ہوئی ہو گی۔ ہر گروہ اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلایا جائے گا، آج تمھیں اپنے کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔"

فتح البیان کا بیان:

یہاں بھی قول مقدر ہے: "أَيْ: وَيُقَالُ لِلْمُجْرِمِيْنَ: اِمْتَازُوْا أَيْ: اِعْتَزِلُوْا" ماخوذ ہے "مَازَهٗ يَمِيْزُهٗ" سے۔ جب تو کسی شے کو کسی شے سے الگ کرے گا تو محاورۂ عرب کے مطابق یوں کہے گا: "مِزْتُ الشَّيْءَ مِنَ الشَّيْءِ" معنی یہ ہیں کہ مجرموں سے کہا جائے گا: الگ ہو جاؤ۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: "اِعْتَزِلُوْا الْيَوْمَ يَعْنِيْ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الصَّالِحِيْنَ" یعنی تم لوگ آخرت میں صالحین سے الگ ہو جاؤ۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علاحدہ ہو جاؤ۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "اِنْفَرِدُوْا عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ"[1] یعنی مومنین سے تنہا ہو جاؤ۔ یہ اس وقت ہو گا جب مومنین جمع کیے جائیں گے اور ان کو جنت کی طرف لے جائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر کافر کے لیے آگ میں ایک گھر ہے۔ چنانچہ وہ اس گھر میں داخل کیا جائے گا اور اس کا دروازہ بند کر دیا جائے گا، پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں ہو گا، نہ وہ کسی کو دیکھے گا نہ اسے کوئی دیکھے گا، چنانچہ اس قول کی بنا پر خود مجرمین بھی ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہوں گے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہر خیر سے علاحدہ کیے گئے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجرمین بعض بعض سے جدا ہوں گے۔ چنانچہ یہود ایک الگ فرقہ ہو گا اور نصاریٰ ایک فرقہ اور مجوس ایک فرقہ اور صابئین ایک فرقہ اور بت پرست ایک فرقہ۔ داود بن جراح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسلمین مجرمین سے الگ ہوں گے، مگر اصحابِ اہواء ("أھواء" جمع ہے "ھوٰی" کی۔ "ھوٰی" وہ ہے جس کی طرف نفس اور اس کی خواہش بلاتی ہے، اصحابِ اہواء سے مراد یہی قدریہ اور جبریہ وغیرہ اہلِ سنت و جماعت کے مخالف فرقے ہیں۔ واللّٰہ أعلم)۔ چنانچہ وہ مجرموں کے ساتھ ہوں گے۔[2]

---

[1] فتح القدیر (٤/٤٩٧) [2] تفسیر القرطبي (١٥/٤٦)

13

پھر اللہ پاک نے ان کو دھمکایا اور ڈرایا۔ ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ﴾ یہ بھی من جملہ اس کے ہے جو اُن سے کہا جائے گا۔ عہد بہ معنی وصیت ہے اور کسی امر کا پہلے سے بتا دینا جس میں خیر اور فائدہ ہے۔ یہاں مراد وہ اوامر ونواہی ہیں جن کے ساتھ اللہ پاک نے رسولوں کی زبانوں پر ان کو مکلف کیا۔ یعنی کیا میں نے تم کو وصیت نہیں کی تھی اور اپنے رسولوں کی زبانی تم کو یہ بات نہیں پہنچا دی تھی کہ شیطان کی عبادت، یعنی اس کی اطاعت نہ کرو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: "أَلَمْ أَتَقَدَّمْ إِلَيْكُمْ عَلىٰ لِسَانِ الرُّسُلِ يَا بَنِيْ آدَمَ"، یعنی کیا میں نے اے بنی آدم! اپنے رسولوں کی زبان پر پہلے سے نہیں پہنچا دیا تھا۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "اَلَّذِيْنَ أُمِرُوْا بِالْاِعْتِزَالِ"[1] مطلب یہ ہے کہ اس کے مخاطب وہی لوگ ہیں جن کو جدا ہونے کا حکم ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ عہد یا میثاق ہے جو اُن سے لیا گیا، جب کہ وہ آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالے گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد وہ دلائلِ عقلی ہیں جو اللہ پاک نے ان کے لیے نصب کیے اپنے زمین و آسمان میں اور ان میں مرکوز فرمائے اور وہ نقلی دلائل جو اُن پر نازل کیے۔ شیطان کی عبادت سے مراد اس کی طاعت ہے اس شے میں جس کا وسوسہ وہ ان کی طرف پہنچاتا ہے اور اس کو اُن کے لیے اچھا کر دکھاتا ہے۔ اس طاعت کو جو عبادت کے پیرائے میں ادا فرمایا تو اس سے مقصود شیطان کی اطاعت سے زیادہ ڈرانا اور نفرت دلانا ہے گویا کہ اس کا کہنا ماننا اس کا پوجنا ہے۔

غرضیکہ شیطان کی اطاعت کرنے اور اس کے وسوسے کو قبول کرنے سے جو منع فرمایا تو اس کی وجہ یہ ذکر فرمائی: ﴿ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی تم اس کا کہا مت مانو اور اس کے وسوسے قبول مت کرو، اس لیے کہ وہ تو تمھارا کھلا دشمن ہے۔ پھر اس کے بعد اپنی عبادت کا حکم فرمایا: ﴿ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ﴾ کلمہ ﴿ اَنْ ﴾ دونوں جگہ مفسرہ عہد کا ہے جس میں قول کے معنی ہیں، یعنی وہ عہد یہ ہے کہ شیطان کو مت پوجو اور مجھے پوجو۔ یہ بھی جائز ہے کہ دونوں جگہ مصدریہ ہو: "أَيْ: أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ بِأَنْ لَّا تَعْبُدُوْا وَبِأَنِ اعْبُدُوْنِيْ أَوْ فِيْ تَرْكِ عِبَادَةِ الشَّيْطَانِ وَفِيْ عِبَادَتِيْ؟" نہی کو امر سے پہلے رکھا، چنانچہ اس کے دو فائدے ہیں: ایک یہ ہے کہ تخلیہ مقدم ہوتا ہے تحلیہ پر، یعنی نفس کا رذائل سے خالی کرنا مقدم ہے، اس کے فضائل کے ساتھ آراستہ کرنے سے جس طرح کہ کلمۂ توحید میں نفی کو اثبات سے پہلے رکھا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ ﴿ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾ اس سے متصل ہو جائے، کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف اشارہ ہے جو توحید اور اسلام سے عبارت ہے۔ یعنی یہ توحید اور اسلام انتہا درجے کا سیدھا راستہ ہے، اس سے بڑھ کر اور کوئی سیدھی راہ نہیں ہے۔

---

[1] فتح القدير (٤/٤٩٧)

پھر اللہ پاک نے ملامت کی شدت اور ملامت و سرزنش کی تاکید کے لیے جملہ مستانفہ سے شیطان کی بنی آدم کے ساتھ عداوت کا ذکر کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ﴾ حرفِ لام توطیہ قسم کا ہے، یعنی قسم ہے اللہ کی البتہ واقعی اس نے تم میں سے خلقِ کثیر کو بہکایا ہے، جیسا کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے، یا جموع کثیرہ کو بہکایا ہے، جیسا کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ یا امم کثیرہ کو جیسا کہ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ امام نافع اور عاصم رحمہما اللہ نے بہ کسرِ جیم و باء و تشدیدِ لام اور ابو عمرو ابن عامر نے بہ ضم جیم و سکونِ یاء اور باقی قراء نے بہ ضمتین مع تخفیفِ لام پڑھا ہے۔ امام ابن ابی اسحاق، زہری اور ابن ہرمز رحمہم اللہ نے بہ ضمتین مع تشدیدِ لام پڑھا ہے۔

اسی طرح حسن، عیسیٰ بن عمرو اور نضر بن انس، ابو یحییٰ، حماد بن سلمہ اور اشہب عقیلی رحمہم اللہ نے بہ کسرِ جیم اور اسکانِ باء اور تخفیفِ لام پڑھا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان سب سے زیادہ ظاہر پہلی قراءت ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ ﴿ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ [الشعراء: ١٨٤] کو سب نے بہ کسرِ جیم و باء اور تشدیدِ لام پڑھا ہے۔ چنانچہ ﴿ جِبِلًّا ﴾ جمع "جِبِلَّةٌ" کی ہوگی اور اشتقاق سب کا "جَبَلَ اللّٰهُ الْخَلْقَ" سے ہے: "أَيْ: خَلَقَهُمْ" امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساری قراءتیں بہ معنی "خلق" ہیں۔ کسی نے کہا: "جِيَلًا" بہ جیم و یائے تحتیہ پڑھا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جیلِ واحد دس ہزار کا ہوتا ہے اور کثیر کا شمار سوائے اللہ عزوجل کے کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ قراءت سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[1]

﴿ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴾ کو جمہور نے بہ تائے خطاب پڑھا ہے اور طلحہ اور عیسیٰ نے بہ یائے غیبت۔ ہمزہ دھمکی اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے اور حرفِ فاء کو مقدر پر عطف کے لیے رکھا ہے جس کا مقام مقتضا ہے۔ چنانچہ اس کے نظائر میں گزر چکا ہے: "أَيْ: أَتُشَاهِدُوْنَ آثَارَ الْعُقُوْبَاتِ فَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ" یعنی کیا تم مشاہدہ کرتے ہو عقوبتوں کے نشانوں کا، پھر تم نہیں سمجھتے ہو۔ یا یہ معنی ہیں: کیا پھر تم اپنے لیے شیطان کی عداوت کو نہیں بوجھتے، یا کیا پھر تم اصلاً کسی شے کو نہیں بوجھتے۔[2] (كذا في فتح البيان) پھر جس وقت وہ دوزخ کے قریب ہوں گے تو اُن سے یہ کہا جائے گا۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿٦٣﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٦٤﴾ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿٦٦﴾

(1) تفسير القرطبي (١٥/٤٧) فتح القدير (٤/٤٩٧، ٤٩٨) (2) فتح البيان (١١/٣١٠ـ٣١٢)

وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾

یہ وہ جہنم ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا (63) آج کے دن اس میں داخل ہو جاؤ، کیوں کہ تم کفر کیا کرتے تھے (64) آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے، اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور اُن کے پیر گواہی دیں گے اس کی جو کچھ وہ کماتے تھے (65) اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں مٹا دیں، پھر وہ دوڑیں راستہ (تلاش کرنے) کو، تو وہ کیوں کر دیکھ سکیں گے! (66) اور اگر ہم چاہیں تو انہی کی جگہوں پر ان کی صورتیں مسخ کر دیں، پھر وہ (آگے) چلنے کی طاقت نہ رکھیں اور نہ وہ لوٹ سکیں (67)

کافروں کی جہنم پر پیشی کے وقت ڈانٹ ڈپٹ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن بنی آدم میں سے کفار کو ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے کہا جائے گا، اس حال میں کہ جہنم ان کے سامنے لائی گئی ہوگی: ﴿ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ یعنی یہ وہ جہنم ہے جس سے تم کو رسولوں نے ڈرایا، چنانچہ تم نے ان کی تکذیب کی۔ ﴿ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [الطور: ۱۳۔ ۱۵] ”جس دن وہ دھکے دے دے کر آتشِ جہنم کی طرف لائے جائیں گے۔ یہی وہ آتشِ دوزخ ہے، جسے تم جھوٹ بتلاتے تھے۔ (اب بتاؤ) کیا یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے ہی نہیں ہو۔“

روزِ قیامت مجرموں کے مونہوں پر مہر:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ ﴾ یہ قیامت کے دن کفار اور منافقین کا حال ہے، جب وہ اس جرم کا انکار کریں گے، جو دنیا میں کر چکے ہیں اور قسم کھائیں گے کہ انھوں نے وہ جرم نہیں کیا تو اللہ پاک ان کے منہ پر مہر کر دے گا اور ان کے اعضاء کو بولنے کی قوت دے گا اور وہ ان کاموں کا بتائیں گے جو انھوں نے کیے ہیں۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچلیاں کھل گئیں۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں کس شے پر ہنسا؟ ہم نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا کہ بندے کے قیامت کے دن اپنے رب سے جھگڑنے سے۔ وہ کہے گا: اے میرے رب! کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی؟ اللہ فرمائے گا: ہاں، پھر بندہ کہے گا کہ میں اپنے اوپر اپنے نفس سے بہتر کوئی گواہ جائز نہیں سمجھتا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا ”كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا وَّبِالْكِرَامِ الْكَاتِبِيْنَ شُهُوْدًا“ یعنی آج کے دن تجھ

پر حساب لینے والا تیرا نفس کافی ہے اور کرام کاتبین گواہ کافی ہیں، پھر اس کے منہ پر مہر کر دی جائے گی اور اس کے اعضاء سے کہا جائے گا: بولو تو وہ بولیں گے اور اس کے اعمال کی خبر دیں گے۔

پھر اس کے اور بات کرنے کے درمیان تخلیہ کیا جائے گا تو کہے گا: "بُعْداً لَكُنَّ وَسُحْقًا فَعَنْكُنَّ كُنْتُ أُنَاضِلُ"، یعنی تم کو دوری ہو! میں تو تمھاری ہی طرف سے جھگڑتا تھا۔[1] (رواه ابن أبي حاتم وقد رواه مسلم والنسائي كلاهما عن أبي بكر بن أبي النضر عن أبي النضر عن عبيد الله بن عبدالرحمن الأشجعي عن سفيان هو الثوري به ثم قال النسائي: لا أعلم أحدا روى هذا الحديث عن سفيان غير الأشجعي وهو حديث غريب۔ والله تعالىٰ أعلم۔ كذا قال وقد تقدم من رواية أبي عامر عن عبد الملك بن عمرو الأسدي و هو العقدي عن سفيان) عبدالرزاق نے کہا ہے کہ ہم کو خبر دی معمر نے عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده عن النبي ﷺ کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّكُمْ تُدْعَوْنَ مُفَدَّمًا عَلٰى أَفْوَاهِكُمْ بِالْفِدَامِ فَأَوَّلُ مَا يُسْأَلُ عَنْ أَحَدِكُمْ فَخِذُهُ وَكَفَّاهُ »[2] (رواه النسائي عن محمد بن رافع عن عبدالرزاق به) (فدام و فدّام سرپوش ابریق و دہان بند)۔ یعنی تم بلائے جاؤ گے اس حال میں کہ تمھارے منہ دہان بند سے بندھے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ بات کرنے سے ممنوع ہوں گے، منہ سے نہ بول سکیں گے، چنانچہ تمھارے جسم سے سب سے پہلے جس سے سوال کیا جائے گا وہ ران ہے اور دونوں ہتھیلیاں ہیں۔

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے عن سہیل عن ابیہ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ قیامت کے بارے میں طویل حدیث میں روایت کیا ہے، اس میں کہا ہے کہ پھر وہ ملاقات کرے گا اللہ تعالیٰ سے تو وہ فرمائے گا: کیا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: میں تیرا بندہ ہوں، میں تجھ پر ایمان لایا اور تیرے نبی پر اور تیری کتاب پر اور روزے رکھے اور نماز پڑھی اور صدقہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی سب سے اچھی ثنا کرے گا جس کی اس کو طاقت ہے۔ کہا: پھر اس سے کہا جائے گا: کیا ہم تجھ پر اپنا گواہ نہ پیش کریں؟ پھر وہ اپنے جی میں سوچے گا کہ وہ کون ہے جو اس پر گواہی دے گا، پس اس کے منہ پر مہر کر دی جائے گی اور اس کی ران سے کہا جائے گا: بول، کہا: پھر اس کی ران بولے گی اور اس کے ساتھ اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں بھی بولیں گی اور جو وہ کرتا تھا وہ بتائیں گی اور یہ کہ یہ منافق ہے، یہ سب اس لیے ہوگا کہ اس کا کوئی عذر نہ رہے اپنے نفس پر اور یہ وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ خفا ہوگا۔[3] (ورواه مسلم وأبو داود من حديث سفيان بن عيينة به بطوله)

پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس دن انسان کے منہ پر مہر کر دی جائے گی، اس دن پہلی ہڈی جو کلام کرے گی وہ اس کی بائیں

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٢٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٥٠٨/٦)

② مصنف عبد الرزاق (١٣٠/١١) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٥١/٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧١٣)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٦٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٣٠)

پاؤں کی ران ہے۔ (ورواه ابن جرير عن محمد بن عوف عن عبد الله بن المبارك عن إسماعيل بن عياش به مثله) امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی اسناد کو جید کہا ہے۔ حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں: «إِنَّ أَوَّلَ عَظْمِ الْإِنْسَانِ يَتَكَلَّمُ يَوْمَ يُخْتَمُ عَلَى الْأَفْوَاهِ فَخِذُهُ مِنَ الرِّجْلِ الشِّمَالِ»[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن مومن کو حساب کے لیے بلایا جائے گا، چنانچہ اس کا رب اس پر اس کے وہ اعمال پیش کرے گا جو اُس کے اور اس کے درمیان ہیں تو وہ اقرار کرے گا اور کہے گا: ہاں اے میرے رب! ہاں میں نے یہ عمل کیا، ہاں میں نے یہ عمل کیا، ہاں میں نے یہ عمل کیا۔ کہا: چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دے گا اور اس گناہ کو اور لوگوں سے پوشیدہ رکھے گا، چنانچہ زمین پر کوئی مخلوق نہیں ہے جو ان گناہوں میں سے کسی شے کو دیکھے اور اس کی نیکیاں ظاہر ہوں گی اور وہ چاہے گا کہ سارے لوگ ان کو دیکھیں۔ اور جب کافر اور منافق حساب کے لیے بلایا جائے گا اور اس کا رب اس کے اعمال پیش کرے گا تو وہ انکار کرے گا اور کہے گا: اے رب! قسم ہے تیری عزت کی! البتہ مجھ پر اس فرشتے نے واقعی وہ شے لکھ دی ہے جو میں نے نہیں کی تو فرشتہ اس سے کہے گا: کیا تو نے فلاں دن فلاں جگہ پر یہ کام نہیں کیا؟ وہ کہے گا: تیری عزت کی قسم اے رب! میں نے اس کو نہیں کیا۔ چنانچہ جب وہ یہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر کر دے گا۔ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: چنانچہ میں گمان کرتا ہوں کہ اس کے جسم میں سے پہلی شے جو بولے گی، وہ دائیں ران ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰۤى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴾ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو البتہ گمراہ کر دیتے ان کو ہدایت سے، پھر وہ کیسے راہ پاتے اور ایک بار کہا: اگر ہم چاہتے تو ان کو اندھا کر دیتے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر اللہ چاہتا تو ان کی آنکھیں مٹا دیتا اور ان کو اندھا کر دیتا، وہ تردد کرتے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صراط سے مراد طریق ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ صراط سے مراد حق ہے۔ پھر وہ کہاں سے دیکھتے، حالاں کہ ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں یہ الفاظ بیان کیے ہیں: "لَا يُبْصِرُوْنَ الْحَقَّ".

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣١٩٨/١٠) تفسير الطبري (٥٤٥/٢٠) مسند أحمد (١٥١/٤) امام البانی رحمہ اللہ نے السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧١٣) میں مفصل بحث کرتے ہوئے اس روایت کا ذکر کیا اور فرمایا کہ حدیث کے آخر میں (بائیں ران) کے الفاظ درست نہیں ہیں۔

[2] تفسير الطبري (٥٤٤/٢٠)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ ﴾ امام عوفی رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے "أَهْلَكْنَاهُمْ" ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "لَغَيَّرْنَا خَلْقَهُمْ" یعنی البتہ ہم بدل دیتے ان کی خلق کو۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا: البتہ کر دیتے ہم ان کو پتھر۔ امام حسن بصری اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ البتہ بٹھا دیتا ان کو ان کے پاؤں پر اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ یعنی پھر وہ نہ آگے کی طرف چل سکتے اور نہ پیچھے کی طرف لوٹتے، بلکہ ایک حال کو لازم پکڑتے، نہ آگے بڑھتے نہ پیچھے ہٹتے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

جملہ ﴿ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ مستانفہ ہے تمام قسم کی ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کے بعد جب وہ جہنم کے کنارے پر پہنچیں گے تو اس کے ساتھ ان کو خطاب کیا جائے گا۔ یعنی فرشتے ان سے کہیں گے: یہ وہ جہنم ہے جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا تھا دنیا میں رسولوں کی زبان پر، پھر اُن سے کہیں گے: ﴿ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴾ یہ امر ملامت اور توہین کا ہے جس طرح کہ اور جگہ فرمایا ہے: ﴿ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴾ [الدخان: ٤٩] یعنی تم اس میں گھسو آج کے دن اور اس کی گرمی کھینچو اور اس میں انواع واقسام کا عذاب چکھو اس سبب سے کہ دنیا میں تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے تھے اور شیطان کی اطاعت کرتے تھے اور بتوں کو پوجتے تھے۔

﴿ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ ﴾ ﴿ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴾ سے مرتبط ہے۔ مروی ہے کہ جب یہ ان سے کہا جائے گا تو اس شے کا انکار کریں گے جو دنیا میں ان سے صادر ہو چکی ہے، یعنی شرک اور تکذیبِ رسل۔ چنانچہ جھگڑیں گے: ﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣] "قسم اللہ کی ہم مشرک نہ تھے۔" اور کہیں گے ہم اپنے اوپر اپنی جانوں کے سوا کوئی گواہ پسند نہیں کرتے، چنانچہ اللہ پاک ان کے منہ پر ایسی مہر کر دے گا کہ وہ اس کے ساتھ بات کرنے پر قادر نہیں ہوں گے اور ان کے اعضاء سے کہا جائے گا کہ بولو؛ تو اُن کے ہاتھ بولیں گے اور بتائیں گے جو کچھ وہ کرتے تھے اور ان کے پاؤں ان پر اس کام کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔ یہاں جو صیغۂ مخاطب سے غائب کی طرف التفات کیا تو اس کا نکتہ یہ ہے کہ بتانا منظور ہے کہ ان کے قبیح افعال اس لائق ہیں کہ ان کو مخاطب کرنے سے اعراض کیا جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے منہ پر مہر کرنے کا سبب یہ ہے کہ موقف والے ان کو پہچان لیں۔ کسی نے کہا: یہ ہے کہ ان کے اعضاء سے اقرار ہو جائے، اس لیے کہ غیر ناطق کی شہادت بطور حجت زیادہ موثر ہے ناطق کی شہادت سے، کیوں کہ یہ امر خارج ہے مخرجِ اعجاز میں۔ یعنی یہ ایک معجزہ ہے۔ کسی نے کہا: یہ ہے کہ وہ اس بات کو جان لیں کہ ان کے اعضاء جو گناہوں میں ان کے مددگار تھے، وہی ان پر گواہ ہو گئے۔

[1] تفسیر الطبري (٢٠/٥٤٥_ ٤٥٧) تفسیر ابن کثیر (٣/٧٥٥_٧٥٧)

رہا یہ امر کہ جس بات کے ساتھ ان کے ہاتھوں نے نطق کیا اس کو تو کلام واقرار ٹھہرایا اور جس کے ساتھ پاؤں نے نطق کیا، اس کو شہادت قرار دیا؟ تو اس کی حکمت یہ ہے کہ اکثر گناہوں کو کرنے والے ہاتھ ہوتے ہیں، اور کسی فاعل کا کلام اپنے نفس پر اس فعل کا اقرار ہوتا ہے جو اس نے کیا اور پاؤں ہر معصیت کے وقت حاضر ہوتے ہیں اور حاضر کا کلام اس کام کی شہادت ہوتی ہے جو اس نے دیکھا۔ یہ وجہ اکثریت کے لحاظ سے ہے ورنہ کبھی خود پاؤں گناہ کے کرنے میں ہاتھوں کی طرح شامل ہوتے ہیں۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے مہر کرنے کی نسبت تو اپنی طرف کی اور کلام اور شہادت کو ہاتھوں اور پاؤں کی طرف منسوب کیا، تا کہ اس میں یہ احتمال نہ ہو کہ یہ کام ان سے جبراً یا قہراً ہوا، کیوں کہ جبر کے ساتھ اقرار کرانا قبول نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ ﴾ یعنی ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے اپنے اختیار سے اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ ان کو بات کرنے کی قدرت دے گا، تاکہ یہ زیادہ تر دال ہو ان سے گناہ صادر ہونے پر۔ ﴿ اَلْيَوْمَ ﴾ ظرف ہے ﴿ نَخْتِمُ ﴾ کا اور کسی نے ”يُخْتَمُ“ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے نائب فاعل اس کا ﴿ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ ﴾ ہے۔

پھر اگر کفار یہ خیال کریں کہ اعضاء کا بولنا کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اس پر ان کو ملامت کی اور ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی اس کی قدرت کے سامنے اس کی کیا ہستی ہے، وہ تو ہر شے پر قادر ہے، وہ اگر چاہے تو دنیا میں ان کو اندھا کر دے اور ان کی صورت بدل ڈالے یا پتھر کر دے۔ جو اس پر قادر ہے تو وہ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں کو بولنے والا کر دے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: ”طَمَسَ يَطْمِسُ وَيَطْمُسُ“ اور ”طَمِيْسٌ وَمَطْمُوْسٌ“ اہلِ لغت کے نزدیک وہ شخص ہے جس کی دونوں آنکھوں میں شق نہ ہو۔[1] ﴿ نَشَآءُ ﴾ کا مفعول محذوف ہے: ”أَيْ: لَوْ نَشَاءُ أَنْ نَطْمِسَ عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ لَطَمَسْنَا“ (اس لیے کہ ﴿ لَوْ ﴾ کا جواب اس پر دال ہے۔ قرآن شریف میں بہت جگہ مشیت کا مفعول ﴿ لَوْ ﴾ کے بعد محذوف ہے مثلاً: ﴿ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا ﴾ [السجدة: ١٣] ﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٢٠]، ﴿ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ ﴾ [الإسراء: ٨٦]، ﴿ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [النحل: ٩] اور اس طرح کی اور آیتیں)۔

﴿ فَاسْتَبَقُوا ﴾ معطوف ہے ﴿ لَطَمَسْنَا ﴾ پر اور ﴿ الصِّرَاطَ ﴾ بہ نزعِ خافض منصوب ہے (امام بیضاوی رحمہ اللہ نے نصب ﴿ الصِّرَاطَ ﴾ کی چار وجہیں ذکر کی ہیں: ایک نزعِ خافض۔ دوسری بتضمینِ استباق بہ معنی ابتداء۔ تیسری یہ ہے کہ مسبوق الیہ کو مسبوق ٹھہرائیں مجازاً بنا بر مفعول بہ۔ چوتھی بنا بر ظرف۔[2] امام عیسی بن عمر رحمہ اللہ نے ”فَاسْتَبِقُوا“

[1] تفسير القرطبي (٤٩/١٥) [2] تفسير البيضاوي (٤٣٩/٤)

بہ صیغہ امر پڑھا ہے: ''أي: فیقال لھم: استبقوا)[1] أَيْ: فَاسْتَبِقُوا إِلَيْهِ أَيْ: تبادرُوا إِلَى الطَّرِيقِ لِيُجَوِّزُوهُ وَيَمْضَوا فِيهِ ﴿ فَأَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴾ أَيْ: فَكَيْفَ يُبْصِرُوْنَ الطَّرِيقَ وَيُحْسِنُوْنَ سُلُوكَهُ وَلَا أَبْصَارَ لَهُمْ''۔ معنی یہ ہیں کہ ہم اگر چاہیں کہ ان کی آنکھیں مٹا دیں تو مٹا دیں، یعنی ان کی آنکھوں کو لے جائیں اور ان کو ایسا کر دیں کہ نہ ان کے لیے شق ظاہر ہو نہ جفن، یعنی پپوٹا۔

مطلب یہ ہے کہ بالکل برابر کر دیں جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ﴾ [البقرۃ: ۲۰] ''اور اگر اللہ چاہے تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو بیکار کر دے۔'' پھر وہ راستے کی طرف دوڑیں، تاکہ اسے طے کریں اور اس میں چلیں، پھر وہ راستے کو کیسے دیکھیں اور کیسے اس پر صحیح طریقے سے چلیں، جبکہ ان کی آنکھیں ہی نہیں ہیں۔ اس معنی کی بنا پر صراط سے مراد یہی راستہ ہے، جو محسوس ہے۔ اس آیت کے بارے میں کئی قول ہیں: ایک قول تو یہی ہوا۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ہم نے ان کے دلوں کو اندھا کر دیا اور اگر چاہیں تو اُن کی ظاہر آنکھوں کو لے جائیں، اس طرح سے کہ ان کا جفن (پپوٹا) نہ ظاہر ہو اور نہ شق، پھر وہ ایسے ہو جائیں کہ اگر وہ راستے کی طرف دوڑیں، تاکہ اس پر اپنے بعض مقاصد کی خاطر چلیں تو وہ اس پر قادر نہ ہوں، پھر وہ کیسے دیکھیں، حالاں کہ ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس پر قدرت رکھتے ہیں کہ دنیا میں ان کے ساتھ یہ کام کر دیں جس طرح کہ آخرت میں ان کے اعضاء کو بولنے والا کر دیا۔ وہ اپنے کفر کے سبب سے اس بات کے مستحق ہو چکے ہیں، لیکن ہم نے ان پر سزا کی جلدی نہیں کی، تاکہ توبہ کریں اور ان پر جو میری نعمت ہے، اس کا شکر ادا کریں، اس کے بعد کہا کہ یہ قول امام حسن اور سدی رحمہ اللہ کا ہے۔ دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مقاتل، قتادہ اور عطا رحمہم اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان کی گمراہی کی آنکھوں کو پھوڑ ڈالیں، پھر ان کی گمراہی سے ان کو اندھا کر دیں اور ان کی آنکھوں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف پھیر دیں۔ پھر وہ راستے کی طرف دوڑیں تو راہِ حق کی طرف راہ پائیں اور اس کو دیکھ لیں۔ ﴿ فَأَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی پھر وہ کیونکر دیکھیں، لیکن جب ہم نے یہ نہ چاہا تو ان کے ساتھ یہ نہ کیا۔ انتہیٰ.

اس قول کی بنا پر صراط سے مراد راہِ محسوس نہیں ہے، بلکہ راہِ حق مراد ہے۔ فتح القدیر میں امام حسن اور سدی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے: ''لَتَرَكْنَاهُمْ عُمْيًا يَتَرَدَّدُوْنَ لَا يُبْصِرُوْنَ طَرِيقَ الْهُدَى وَاخْتَارَ هٰذَا ابْنُ جَرِيْرٍ''[2] انتہیٰ. اس میں ذرا غور کرو معنی بالعکس ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ''لَتَرَكْنَاهُمْ'' سہوِ کاتب ہے، صحیح ''تَرَكْنَاهُمْ'' ہے اور یہ بعینہٖ دوسرے قول کا حاصل ہے جو مذکور ہوا، یعنی جبکہ ہم نے یہ نہ چاہا تو ان کے ساتھ یہ نہ کیا۔ اس کا حاصل یہ

[1] فتح القدیر (۴/۴۹۸۔ ۴۹۹) [2] فتح القدیر (۴/۴۹۸) تفسیر الطبري (۲۰/۵۴۶)

ہوا کہ ہم نے ان کو اندھا کر رکھا ہے، راہِ ہدایت کو نہیں دیکھتے، لو اب معنی ٹھیک ہو گئے۔ وللّٰہ الحمد واللّٰہ سبحانہ أعلم۔ ان کے مادے کا قصور ہے، قابلِ ہدایت نہیں، ؎ ورنہ ان سے کیا ضد تھی ہاگر وہ کسی قابل ہوتے۔ وللّٰہ سبحانہ الحکمۃ البالغۃ والحجۃ التامۃ في کل ما فعل ولا یسأل عما یفعل وھم یسألون. وقد قال تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴾ [النحل: ٩] ''اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو راہِ راست پر لگا دیتا۔'' عبد کا کام عبدیت ہے معبود کا کام وہ خود جانے، چہ دانی تو اے بندہ کار خدائی! یعنی اے بندے! تو اللہ کے کاموں کو کیا جانے؟''

پھر فتح القدیر میں امام عطاء، مقاتل اور قتادہ رحمہ اللہ کا قول ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: ''معنی یہ ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ہم ان کی آنکھیں پھوڑ دیں اور ان کی گمراہی سے ان کو اندھا کر دیں، اور ان کی آنکھوں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف پھیر دیں تو وہ اپنی ہدایت کو دیکھ لیں اور ہدایت یافتہ ہو جائیں اور وہ آخرت کی راہ کی طرف دوڑیں۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اس میں نام نہیں لیا، بلکہ ان کا یہ قول نقل کیا ہے: ''أَعْمَیْنَاھُمْ وَأَضْلَلْنَاھُمْ عَنِ الْھُدٰی ﴿ فَاَنّٰى یُبْصِرُوْنَ ﴾ فَکَیْفَ یَھْتَدُوْنَ''[2] (أخرجه ابن جریر وابن المنذر وابن أبي حاتم والبیھقي في الأسماء والصفات)

یہ قول بھی قولِ دوم مذکور کا حاصل ہے، یعنی ہم نے ان کو اندھا کر دیا اور ہدایت سے گمراہ کیا، پھر وہ کیونکر راہ پائیں۔

تفسیر ابنِ کثیر میں قولِ مذکور ان الفاظ کے ساتھ ہے: ''وَلَوْ نَشَاءُ لَأَضْلَلْنَاھُمْ عَنِ الْھُدٰی فَکَیْفَ یَھْتَدُوْنَ، وَقَالَ مَرَّۃً: أَعْمَیْنَاھُمْ'' اس میں بھی وہی خلل ہے۔ صحیح وہی الفاظ ہیں جو پہلے مذکور ہوئے: ''وَقَالَ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ: لَوْ شَاءَ اللّٰہُ لَطَمَسَ عَلٰی أَعْیُنِھِمْ فَجَعَلَھُمْ عُمْیًا یَتَرَدَّدُوْنَ، وَقَالَ السُّدِّيُّ: یَقُوْلُ: وَلَوْ نَشَاءُ أَعْمَیْنَا أَبْصَارَھُمْ... انتھی'' فتح البیان میں یہی تین قول ذکر کیے ہیں،[3] حقیقت میں دو ہی قول ہیں۔ غرضیکہ پہلے قول کی بنا پر اللہ پاک کی قدرت ونعمت کا اظہار ہے اور کفار کو ملامت اور ڈانٹ ہے اور در پردہ وہی لطف وکرم سے توحید اور اتباعِ رسول کی طرف دعوت ہے۔ اور دوسرے قول کی بنا پر ان کفار کا بیان ہے جو اپنے مادہ اور ازلی بدبختی کی وجہ سے کفر پر قائم رہیں اور دوزخ کے طبقات میں جلیں گے۔ أعاذنا اللّٰہ تعالیٰ منه.

پھر اللہ پاک نے دوسری تہدید سنائی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ ﴾ ''مسخ'' کہتے ہیں تبدیلِ خلقت کو، یعنی صورت کا بدل دینا اور قویٰ کا باطل کر دینا، مثلاً: پتھر یا کوئی اور جماد کر دینا یا چوپایہ بنا دینا۔ ''مَکَانَۃٌ'' بہ معنی مکان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''مَکَانَۃٌ'' خاص مکان ہے، مثلاً: ''مَقَامَۃٌ وَمَقَامٌ''۔ جمہور نے واحد پڑھا ہے اور امام حسن، زرّ بن حبیش اور ابوبکر رحمہ اللہ نے عاصم سے جمع کے صیغے سے ''مَکَانَاتِھِمْ'' پڑھا ہے۔[4] معنی یہ ہیں اگر ہم چاہیں تو ان کی خلق کو بدل دیں اس مکان پر جس میں وہ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہم ان کو مسخ کریں اسی جگہ پر جس میں انھوں نے معصیت کی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم ان کو ہلاک کر دیں، ان کے مساکن میں۔[5]

[1] فتح القدیر (٤/٤٩٨) [2] تفسیر الطبري (٢٠/٥٤٥، ٥٤٧) [3] تفسیر ابن کثیر (٣/٧٥٧) فتح البیان (١١/٣١٥)
[4] تفسیر القرطبي (١٥/٥٠) [5] تفسیر الطبري (٢٠/٥٤٧)

﴿ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ یعنی پھر وہ قادر نہ ہوں جانے پر نہ آنے پر۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہم ان کو بٹھا دیں، پھر وہ اس کی طاقت نہ رکھیں کہ اپنے آگے جائیں، اور نہ اس کی طاقت رکھیں کہ اپنے پیچھے پھریں۔ جماد ایسا ہی ہوتا ہے کہ نہ آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ جمہور نے ﴿ مُضِيًّا ﴾ بہ ضم میم اور امام ابو حیوہ رحمہ اللہ نے بہ فتحِ میم پڑھا ہے۔ ان سے بہ کسرِ میم بھی مروی ہے اور کسائی رحمہ اللہ سے بھی روایت کی گئی ہے۔[1] جس وقت کوئی زمین میں جائے تو محاورے میں بولتے ہیں: "مَضَى يَمْضِيُ مُضِيًّا" اور جس وقت لوٹ جائے، جہاں سے آیا ہے تو کہتے ہیں: "رَجَعَ يَرْجِعُ رُجُوْعًا" کسی نے کہا ہے کہ معنی ہیں: "لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رُجُوْعًا" فعل کو مصدر کی جگہ میں رکھ دیا ہے مراعاتِ فاصلہ کے لیے۔ حاصل یہ ہے کہ اگر اللہ پاک ان کو عذاب کرنا چاہتا اس طرح سے کہ ان کی آنکھیں مٹا دیتا اور اُن کو مسخ کر دیتا جس طرح کہ ان کے گناہ اسی کے مقتضی ہیں، لیکن اس نے طریقۂ رحمت و حکمت پر لحاظ کر کے اس کو نہ چاہا۔ یہ دونوں یہ چاہتے ہیں کہ ان کو مہلت دی جائے۔

یحییٰ بن سلام نے کہا: "هٰذَا كُلُّه يَوْمَ الْقِيَامَةِ" یعنی یہ طمس و مسخ قیامت کے دن ہوگا۔ قرطبی میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے آیت میں غیر ما تقدم مروی ہے، انھوں نے اس کی تاویل اس پر کی ہے کہ یہ روزِ قیامت میں ہے اور کہا ہے کہ جس وقت قیامت کا دن ہوگا اور پل صراط دراز کیا جائے گا تو ایک منادی آواز لگائے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اُمت کھڑے ہوں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے نیک اور بد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہوں گے، تاکہ پل صراط پر سے گزریں، پھر جس وقت وہ اس پر آجائیں گے تو اللہ پاک ان میں سے فجار کی آنکھوں کو مٹا دے گا، پھر وہ دوڑیں گے پل صراط کو تو اس کو کہاں سے دیکھیں گے، تاکہ اس کے پار ہوں، پھر اسی طرح عیسی علیہ السلام کو اور باقی انبیاء علیہم السلام کو آواز دی جائے گی۔ (ذكره النحاس و قد ذكرناه في التذكره.[2] انتهٰی) لیکن اس قول سے صرف طمس معلوم ہوا، مسخ کا ذکر نہیں ہے۔ پھر اللہ پاک نے بعث پر اور طمس و مسخ پر ایک دلیل ذکر کی، ارشاد فرمایا:

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۚ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۰﴾

اور جس شخص کو ہم (زیادہ) عمر دیں (گویا) ہم اسے (حالتِ) پیدائش کی طرف لوٹا دیتے ہیں، کیا پھر وہ عقل نہیں رکھتے؟ (68) اور ہم نے اس (رسول) کو شعر کہنا نہیں سکھایا اور نہ (یہ)

[1] تفسير القرطبي (۵۰/۱۵) فتح القدير (۴۹۹/۴) [2] تفسير القرطبي (۵۰/۱۵)

اس کے لائق ہی تھے، یہ (کلامِ الٰہی) تو سراسر نصیحت اور واضح قرآن ہے﴿69﴾ تاکہ وہ اسے
ڈرائے جو زندہ ہے اور کافروں پر (اللہ کے عذاب کی) بات ثابت ہو جائے﴿70﴾

انسان کو بڑی عمر کے بعد پہلی حالت پر پھیرنے کا بیان:

پیدائشی حالت کی طرف پھیر دیتے ہیں، یعنی جیسا بچہ سست تھا بوڑھا بھی ویسا ہی ہو گیا۔ یہ نشانی ہے پھر پیدا ہونے کی۔ ہر اس شخص کو آگاہ کر دے جو زندہ ہے، یعنی وہ جو نیک اثر پکڑتا ہو اس کے فائدے کے لیے اور منکرین پر الزام اتارنے کے لیے۔ انتہٰی.

اللہ پاک ابنِ آدم کے حال کی خبر دیتا ہے کہ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے، وہ دن بدن قوت اور نشاط کے بعد کمزوری اور عاجزی کی طرف پھرتا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴾ [الروم: ٥٤] ''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمھیں کمزوری کی حالت میں پیدا کیا، پھر اس کمزوری کے بعد توانائی دی۔ پھر اس توانائی کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا۔ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ سب سے پورا واقف اور سب پر پورا قادر ہے۔'' نیز اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۚ ﴾ [النحل: ٧٠] ''تم میں ایسے بھی ہیں جو بدترین عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں کہ بہت کچھ جاننے بوجھنے کے بعد بھی نہ جانیں۔'' واللّٰہ أعلم.

اس سے مراد اس گھر کی خبر دینا ہے کہ یہ گھر زوال اور انتقال کا ہے، دوام اور استقرار کا نہیں ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی کیا وہ پھر اپنی عقلوں سے غور و فکر نہیں کرتے۔ اپنی پیدایش میں آدمی پیدا ہوتے وقت کیسا ضعیف اور کمزور ہوتا ہے، پھر قوت آتے آتے جوان اور قوی ہوتا ہے، پھر بڑھاپے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، بال سفید ہو جاتے ہیں، پھر بڑھاپے کی انتہا کو پہنچتا ہے، تاکہ یہ جان لیں کہ وہ ایک اور گھر کے لیے پیدا کیے گئے ہیں جس کو نہ کسی طرح کا زوال ہے نہ اس سے کسی اور جگہ منتقل ہونا یا اس سے نکل سکنا ہے، یہ وہی دارِ آخرت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو شعر گوئی نہیں سکھائی گئی:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴾ اللہ پاک نے اپنے نبیِ کریم محمد ﷺ کی طرف سے خبر دی ہے کہ اس نے ان کو شعر کہنا نہیں سکھایا اور نہ وہ ان کے لائق ہے، یعنی ان کی طبیعت میں نہیں ہے، چنانچہ وہ نہ اسے اچھی طرح کہہ سکتے ہیں نہ اسے پسند کرتے ہیں اور نہ ان کی جبلت اس کی مقتضی ہے۔ اسی لیے وارد ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نظم کے وزن پر ایک بیت بھی یاد نہیں رکھتے تھے، بلکہ اگر پڑھتے تو

اسے ناموزون کر دیتے، یا اس کو پورا نہ فرماتے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا: "مَا وَلَدَ عَبْدُ الْمُطَّلِبِ ذَكَرًا وَّلَا أُنْثٰى إِلَّا يَقُوْلُ الشِّعْرَ إِلَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ" یعنی عبدالمطلب کے جو لڑکا لڑکی پیدا ہوا وہ شعر کہتا تھا سوائے رسول اللہ ﷺ کے کہ آپ ﷺ نے شعر نہیں کہا۔ امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے عتبہ بن ابی لہب کے ترجمے میں اس کا ذکر کیا ہے جس کو زرقاء میں شیر نے کھا لیا تھا۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس بیت کے ساتھ تمثل فرمایا کرتے تھے (تمثل کہتے ہیں: دوسرے کے شعر پڑھنے کو): ع كَفٰى بِالْإِسْلَامِ وَالشَّيْبِ لِلْمَرْءِ نَاهِيًا

پس سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! "كَفٰى الشَّيْبُ وَالْإِسْلَامُ لِلْمَرْءِ نَاهِيًا" یعنی بڑھاپا اور اسلام مرد کو ممنوعہ چیزوں سے منع کرنے والا کافی ہے۔ سیدنا ابوبکر یا عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾[1] (أخرجه ابن أبي حاتم)

اور اسی طرح بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عباس بن مرداس سلمی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تو کہتا ہے:

أَتَجْعَلُ نَهْبِيْ وَنَهْبَ الْعُبَيْدِ بَيْنَ الْأَقْرَعِ وَعُيَيْنَةَ

"کیا آپ نے مالِ غنیمت میں سے میرا اور میرے گھوڑے عبید کا حصہ اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کے مابین تقسیم کر دیا ہے؟"

تو سیدنا عبداللہ عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کی: وہ تو یوں ہیں: "بَيْنَ عُيَيْنَةَ وَالْأَقْرَعِ" آپ ﷺ نے فرمایا: سب برابر ہے،[2] یعنی معنی میں ایک جیسا ہے۔ صلوات الله و سلامه عليه والله أعلم۔

امام سہیلی رحمہ اللہ نے "الروض الأنف" میں ذکر کیا ہے کہ اس بیت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے کلام میں جو تقدیم و تاخیر واقع ہوئی، اس میں ایک مناسبت ہے کہ آپ نے اس میں غرابت فرمائی۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اقرع بن حابس کو آپ نے عیینہ بن بدر فزاری پر شرف دیا، کیوں کہ صدیق رضی اللہ عنہ کے وقت میں یہ شخص مرتد ہو گیا بہ خلاف اس کے۔[3] والله أعلم۔ اسی طرح ارموی نے اپنے مغازی میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بدر کے مقتولین کے درمیان چلنے لگے اور آپ یوں فرماتے تھے: «نُفَلِّقُ هَامًا» تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیت کو مکمل کرنے کو یوں کہتے تھے:

مِنْ رِجَالٍ أَعِزَّةٍ عَلَيْنَا وَهُمْ كَانُوْا أَعَقَّ وَأَظْلَمَا

یہ شعر بعض شعرائے عرب کا اپنے قصیدے میں ہے، یہ قصیدہ حماسہ میں ہے۔[4] یعنی ہم چیرتے ہیں کھوپڑیاں مردوں کی جو ہم پر عزیز ہیں اور وہ بہت نافرمان اور بہت ظالم تھے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس وقت خبر میں شک کرتے تو اس بارے میں طرفہ کے بیت کے ساتھ تمثل فرمایا کرتے تھے:

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۲۰۰، ۳۲۰۱) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] دلائل النبوة (۵/۱۸۱، ۱۸۲) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] الروض الأنف (٤/۲۷۰) [4] ديوان حماسة (۱/٦۱)

وَيَأْتِيْكَ بِالْأَخْبَارِ مَنْ لَّمْ تُزَوِّدِ

یعنی تیرے پاس خبریں لے آئے گا وہ شخص جس کو تو نے زادِ راہ نہیں دیا۔[1] (أخرجه الإمام أحمد وهكذا رواه النسائي في اليوم والليلة من طريق إبراهيم بن مهاجر عن الشعبي عنها ورواه الترمذي والنسائي أيضا من حديث المقدام ابن شريح بن هانئ عن أبيه عن عائشة رضي الله عنها كذلك، ثم قال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح) (نسخہ ابن کثیر میں "إذا استراب" بہ بائے موحدہ ہے، لیکن صحیح "استراث" بہ ثائے مثلثہ معلوم ہوتا ہے۔ "استراثه" بہ معنی درنگ خواستن ہے، یعنی خبر میں جب دیر سمجھتے)۔

حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشعار سے تمثیل فرمایا کرتے تھے:

وَيَأْتِيْكَ بِالْأَخْبَارِ مَنْ لَّمْ تُزَوِّدِ[2]

(اس کی اسناد میں یوں ہے: "حدثنا يوسف بن موسى، حدثنا أسامة عن زائدة عن عكرمة عن ابن عباس... الخ، ثم قال: و رواه عن زائدة عن سماك عن عكرمة عن عائشه رضي الله عنها")

یہ طرفہ ابن العبد کے شعر میں اس کے مشہور معلقہ میں ہے اور یہ مصرع مذکور اس کے بیت کا آخر ہے۔ اول اس کا یہ ہے:

سَتُبْدِيْ لَكَ الْأَيَّامُ مَا كُنْتَ جَاهِلًا ۔۔۔ وَيَأْتِيْكَ بِالْأَخْبَارِ مَنْ لَّمْ تُزَوِّدِ
وَيَأْتِيْكَ بِالْأَخْبَارِ مَنْ لَّمْ تَبِعْ لَهُ ۔۔۔ بَتَاتًا وَلَمْ تَضْرِبْ لَهُ وَقْتَ مَوْعِدِ[3]

سعید بن ابی عروبہ نے امام قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ کسی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمثل کرتے تھے کسی شے کا شعر کے ساتھ؟ تو فرمایا: "كَانَ أَبْغَضَ الْحَدِيْثِ إِلَيْهِ" یعنی سب باتوں سے زیادہ مبغوض آپ کو شعر تھا۔ سوائے اس کے کہ اخی بنی قیس کے بیت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمثل کرتے تو اس کے اول کو آخر اور آخر کو اول کرتے تھے، چنانچہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ یوں نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں واللہ! شاعر نہیں ہوں اور نہ وہ مجھے لائق ہے۔[4] (رواه ابن أبي حاتم وابن جرير وهذا لفظه)

معمر نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شے کی شعر کے ساتھ تمثیل فرماتے تھے تو فرمایا: نہیں مگر طرفہ کے بیت "سَتُبْدِيْ لَكَ الْأَيَّامُ... الخ"، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہنے لگے: «مَنْ لَّمْ تُزَوِّدِ بِالْأَخْبَارِ» تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ یوں نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

1. مسند أحمد (٣١/٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٤٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٢٤٨/٦) السلسلة الصحيحة (٢٠٥٧)
2. كشف الأستار عن زوائد البزار (٥/٣) 3. ديوان طرفة بن العبد (٢٩/١) 4. تفسير الطبري (٥٤٩/٢٠) یہ روایت مرسل ہے۔

فرمایا: میں شاعر نہیں ہوں اور نہ مجھے لائق ہے۔[1] حافظ ابوبکر بیہقی رحمہ اللہ نے عن عروۃ عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے، کہا: جمع نہیں کیا رسول اللہ ﷺ نے بیتِ شعر کو کبھی مگر ایک بیت کو ؎

تَفَاءَلْ بِمَا تَهْوَى يَكُنْ فَلَقَلَّمَا يُقَالُ لِشَيْءٍ كَانَ إِلَّا تَحَقَّقَا

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ ابو الحجاج مزی سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا: "هُوَ مُنْكَرٌ وَلَمْ يُعْرَفْ شَيْخُ الْحَاكِمِ وَلَا الضَّرِيْرُ".[2] (یعنی ابوحفص عمر بن احمد بن نعیم وکیل المتقی ببغداد اور ان کے شیخ ابو محمد عبداللہ بن ہلال النحوی الضریر)۔ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے خندق کھودنے کے دن عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے ابیات کے ساتھ تمثل فرمایا تھا، لیکن اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کے قول کی پیروی کر کے، کیوں کہ وہ خندق کھودنے کے حال میں رجز پڑھتے جاتے تھے۔ چنانچہ یوں کہتے تھے: ؎

اَللّٰهُمَّ لَوْ لَا أَنْتَ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

فَأَنْزِلَنْ سَكِيْنَةً عَلَيْنَا وَثَبِّتِ الْأَقْدَامَ إِنْ لَاقَيْنَا

إِنَّ الْأُولٰى قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا إِذَا أَرَادُوْا فِتْنَةً أَبَيْنَا

آپ ﷺ اپنی آواز کو "أَبَيْنَا" کہنے کے ساتھ بلند کرتے اور اس کلمے کو کھینچتے تھے[3] اور صحیحین میں بھی زحاف کے ساتھ مروی ہے اور اسی طرح ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے حنین کے دن فرمایا اور آپ ﷺ خچر پر سوار تھے، اس کو دشمنوں کے مقابلے میں بڑھاتے تھے: ؎ (اصل روایت کے الفاظ: "في نحر العدو" ہیں یعنی دشمن کے سینے میں)

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبُ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبُ[4]

لیکن کہا ہے کہ یہ اتفاقاً واقع ہوگیا بغیر قصدِ وزنِ شعر کے، بلکہ بغیر ارادہ کے زبان پر جاری ہوگیا۔ اسی طرح وہ ہے جو جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں ثابت ہوا ہے۔ کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ایک غار میں تھے: "فَنُكِبَتْ أُصْبُعُهُ"، یعنی آپ کی انگشت مبارک کو پتھر لگ گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ؎

هَلْ أَنْتِ إِلَّا أُصْبُعٌ دَمِيْتِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ما لَقِيْتِ[5]

یعنی تو تو یہی ایک انگلی ہے کہ خون آلود ہوگئی ہے اور اللہ کی راہ میں ہے جس شے سے تو ملے۔ اور آیندہ زیرِ تفسیر قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا اللَّمَمَ ﴾ [النجم: ۳۲] اس شعر کا پڑھنا آئے گا:

إِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا وَأَيُّ عَبْدٍ لَّكَ مَا أَلَمَّا

---

[1] تفسير الصنعاني (۱٤٥/۳) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] سنن البيهقي الكبرىٰ (٤٣/٧) تفسير ابن كثير (٧٥٩/٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۸۸۰) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۸۰۳)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۷۷۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۷٦)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲٦٤۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۹٦)

یعنی تیری شان سے تو بڑے بڑے گناہوں کا بخشنا ہے، رہے چھوٹے چھوٹے گناہ تو اُن کی تیری طرف نسبت نہیں کی جاتی ہے، کیوں کہ ان سے تو کوئی خالی نہیں رہتا اور کبائر سے بچنے کے سبب سے وہ مٹا دیے جاتے ہیں۔ (یہ شعر اُمیہ بن صلت کا ہے، نبی اکرم ﷺ نے اس کو پڑھا ہے۔ کلمہ ﴿إِنْ﴾ شک کا نہیں ہے، بلکہ تعلیل کا ہے، جیسے: "إن كنت سلطانا فأعط الجزيل أي لأجل أنك غفار"[1] (كذا في المجمع))۔

غرضیکہ یہ سب جو مذکور ہوا اس بات کے خلاف نہیں کہ نبی ﷺ کو شعر نہیں سکھایا گیا اور نہ وہ ان کے لائق ہے، کیونکہ اللہ پاک نے تو آپ کو صرف قرآنِ عظیم سکھایا ہے جس کے نہ آگے سے باطل آتا ہے اور نہ پیچھے سے۔ یہ حکیم حمید کی طرف سے اتارا گیا ہے اور وہ شعر نہیں ہے جیسا کہ کفارِ قریش کے جاہلوں کے ایک گروہ نے زعم کیا ہے اور نہ وہ کہانت ہے، نہ بنایا ہوا ہے اور نہ سحرِ منقول ہے جس طرح کہ اس بارے میں گمراہوں اور جاہلوں کے طرح طرح کے اقوال اور آراء واقع ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ کی طبیعت شعر بنانے سے طبعاً وشرعاً نفرت کرتی تھی۔

چنانچہ امام ابو داود رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے:« مَا أُبَالِيْ مَا أُوْتِيْتُ إِنْ أَنَا شَرِبْتُ تِرْيَاقًا أَوْ تَعَلَّقْتُ تَمِيْمَةً أَوْ قُلْتُ الشِّعْرَ مِنْ قِبَلِ نَفْسِيْ »[2] (تفرد به أبو داود) (پہلا "ما" نافیہ ہے اور دوسرا موصولہ اور "إن أنا" شرطیہ ہے۔ جزا اس کی مدلول ما تقدم ہے: "أي: أن يصدر مني أحد الثلاثة كنت ممن لا يبالي بما يفعل ولا يزجر عما يجرم عليه" اور "تميمة" سے مراد تمائم ورقائے جاہلیت ہیں۔ "ترياق" بہ کسرِ تاء و بہ ضم ایک مرکب دوا ہے جو زہر کے اثر کو دور کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے، یہ کلمہ معرب ہے، اس کو درياق بھی بولتے ہیں۔ اس کی کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں سانپوں کا گوشت اور شراب پڑتی ہے۔ تریاق کی کئی قسمیں ہیں۔ جس قسم میں اشیائے مذکورہ نہ ہوں تو وہ "لا بأس به" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ سبب اطلاقِ حدیث کے سب قسموں سے اجتناب کیا جائے۔ (كذا في المجمع۔ اصل ابن کثیر میں "ما أوتيت" ہے، لیکن صحیح "ما أتيت" ہے)۔

امام احمد رحمہ اللہ نے ابونوفل سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کے نزدیک شعر جائز تھا؟ تو فرمایا: "قَدْ كَانَ أَبْغَضَ الْحَدِيْثِ إِلَيْهِ" "یہ (شعر) آپ ﷺ کو سخت ناپسند تھے۔" اور یہ بھی ان سے روایت کیا ہے کہ "كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُعْجِبُهُ الْجَوَامِعُ مِنَ الدُّعَاءِ وَيَدَعُ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ"[3] "آپ ﷺ کو جامع دعائیں پسند تھیں، دیگر کو آپ ترک کر دیتے۔" امام ابو داود رحمہ اللہ نے عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٥٠٩/٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٦٩) اس کی سند میں "عبدالرحمان بن رافع تنوخی" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع: ٤٩٧٦)

[3] مسند أحمد (١٤٨/٦)

عن ابی ﷺ روایت کیا ہے کہ تم میں سے کسی کا پیٹ پیپ سے بھرے تو بہتر ہے اس سے کہ شعر سے بھرے۔[1]

(انفرد به من هذا الوجه و إسناده على شرط الشيخين ولم يخرجاه)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:« مَنْ قَرَضَ بَيْتَ شِعْرٍ بَعْدَ الْعِشَاءِ الْآخِرَةِ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةُ تِلْكَ اللَّيْلَةِ »[2] یعنی جو کوئی عشاء کے بعد بیتِ شعر کہے تو اس کی اس رات کی نماز قبول نہ ہو گی۔ یہ حدیث اس وجہ سے غریب ہے کہ کتبِ ستہ والوں میں سے کسی نے اس کی تخریج نہیں کی۔ اس سے مراد شعر کا نظم کرنا ہے، پڑھنا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات ہے کہ شعر میں بعض قسم مشروع ہے، یعنی مشرکوں کی ہجو جس کو شعرائے اسلام کیا کرتے تھے، جیسے: حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اور اُن کے مثل اور شعراء۔

شعر کی ایک قسم وہ ہے جس میں حکمت کی باتیں، نصیحتیں اور آداب ہوتے ہیں، جس طرح کہ جاہلیت کی ایک جماعت کے شعر میں پائی جاتی ہیں، ان میں سے امیہ بن ابی صلت ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:« آمَنَ شِعْرُهُ وَكَفَرَ قَلْبُهُ »[3] یعنی اس کا شعر ایمان لایا اور اس کے دل نے کفر کیا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ کے لیے سو بیت پڑھے، آپ ہر بیت کے بعد فرماتے تھے:« هِيهِ » یعنی اس سے زیادہ طلب فرماتے تھے تو وہ اور زیادہ ابیات سناتا تھا۔[4]

امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:« إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا وَإِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكَمًا »[5] یعنی بعض بیان سحر کا سا اثر کرتا ہے اور بعض اشعار حکمت آمیز ہوتے ہیں، اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو شعر نہیں سکھایا۔ ﴿ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ﴾ أَيْ: مَا يَصْلُحُ لَهُ، یعنی شعر آپ ﷺ کے لائق نہیں ہے۔ ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی یہ شے جو ہم نے اس کو سکھائی ہی نہیں ہے، وہ مگر ذکر اور قرآنِ بین و واضح وجلی ہے، اس شخص کے لیے جو اس کو سوچے سمجھے۔

اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا ﴾ یعنی تاکہ یہ قرآن ہر زندہ کو جو روئے زمین پر ہے ڈرائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الأنعام: ١٩] ''تاکہ میں اس قرآن کے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٠٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٠٤٨)
[2] مسند أحمد (١٢٥/٤) اس کی سند میں ''عاصم بن مخلد'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٤٢٨)
[3] التمهيد لابن عبد البر (٧/٤)
[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٥٥)
[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠١٠_٥٠١٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٢١٥)

ذریعے سے تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو ڈراؤں۔'' نیز اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [ھود: ١٧] ''اور تمام فرقوں میں سے جو بھی اس کا منکر ہو اس کے آخری وعدے کی جگہ جہنم ہے۔'' قرآن کے ڈرانے کا فائدہ اسی کو ہوتا ہے جو زندہ دل ہے اور منور البصیرت ہے، جیسا کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''حَيُّ الْقَلْبِ حَيُّ الْبَصَرِ'' امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: یعنی عاقل۔[1] ﴿ وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ یعنی قرآن رحمت ہے مومنوں کے لیے اور حجت ہے کافروں پر۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

جمہور نے ﴿ نُنَكِّسْهُ ﴾ بہ فتحِ نونِ اولیٰ، سکونِ نونِ ثانی اور ضمِ کاف مخففہ پڑھا ہے اور عاصم اور حمزہ نے بہ ضمِ نونِ اولی، فتحِ ثانی اور بہ کسرِ کافِ مشددہ اور ﴿ يَعْقِلُوْنَ ﴾ کو جمہور نے بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے۔ نافع اور ابن ذکوان نے بہ تائے خطاب پڑھا ہے۔[3] اسی آیت کی طرح یہ آیت ہے: ﴿ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴾ [التین: ٥] ''پھر اسے نیچوں سے نیچا کر دیا۔'' معنی یہ ہیں کہ جس شخص کی عمر ہم دراز کرتے ہیں تو اس کی شکل وصورت کو متغیر کر دیتے ہیں اور جس قوت، زور، طراوت اور تازگی پر وہ پہلے تھا، اس کے برعکس اس کو کر ڈالتے ہیں، کیا پھر وہ اپنی عقلوں سے اس بات کو نہیں جانتے کہ جو ذات پاک اس پر قادر ہے، وہی بعث اور نشور پر بھی قادر ہے۔

غرضیکہ جب کفارِ مکہ نے قرآن شریف کو شعر کہا جو اثباتِ بعث اور توحید پر مشتمل ہے اور نبی اکرم ﷺ جو اس کو لے کر آئے، ان کو شاعر کہا تو اللہ پاک نے آیت: ﴿ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ ﴾ نازل کر کے کفار کے قول کو رد فرمایا۔ پہلے قرآن کے شعر ہونے کی نفی کی کہ ہم نے اس کو شعر نہیں سکھایا، کیوں کہ شعر تو ایک ایسا کلام ہے کہ تکلف کر کے اس کو بناتے ہیں اور ایک مزخرف ومزین قول ہے جس کو وزن اور قافیہ کی طرز پر درست کرتے ہیں، اس کی بنا واہی خیالات اور اوہام پر ہوتی ہے، پھر بھلا شعر کہاں اور اللہ عزوجل کا نازل کردہ کلام کہاں جو کلامِ بشر کی مماثلت سے مبرا ومنزہ اور طرح طرح کی حکمتوں اور احکامِ ظاہرہ اور باہرہ سے بھرا ہوا اور دنیا اور آخرت کی سعادت کی طرف پہنچانے والا ہے۔

پھر نبی اکرم ﷺ کے شاعر ہونے کی نفی کی۔ فرمایا: ﴿ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ﴾ یعنی شعر اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے، نہ وہ اس سے بن سکتا ہے نہ اس پر سہل اور آسان ہوتا ہے اگر وہ اس کو چاہے اور اس کے کہنے کا ارادہ کرے۔ اس کی طبیعت، خصلت اور فطرت اس کی مقتضی نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے اس کو اُمی کیا ہے، خط کتابت کر نہیں سکتا، تاکہ کلام اللہ کی حجت بالکل ثابت ہو جائے اور تمام شبہات زائل ہو جائیں، بلکہ نبی کریم ﷺ جب ارادہ کرتے کہ کسی

[1] تفسير الطبري (٢٠/٥٥٠) [2] تفسير ابن كثير (٣/٧٥٧-٧٦٠) [3] فتح القدير (٤/٤٩٩)

شاعر کے بیت کو تمثیل کر کے پڑھیں تو اس کے وزن کو توڑ دیتے تھے، کیوں کہ جب آپ نے طرفہ کے شعر کو پڑھا تو یوں پڑھا: ''وَيَأْتِيكَ مَنْ لَّمْ تُزَوِّدْهُ بِالْأَخْبَارِ'' [1] اس کے سوا اور اشعار جو آپ ﷺ نے پڑھے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، آپ ﷺ سے ایسا بہت واقع ہوا ہے۔

رہا وہ کلامِ موزون جو آپ ﷺ سے صادر ہوا جس کا ذکر پہلے ہوا ہے تو وہ اتفاق سے ہے کہ بغیر ارادے کے وہ ہو گیا۔ چنانچہ قرآن شریف میں بعض آیتیں موزون واقع ہوئی ہیں، حالاں کہ وہ شعر نہیں ہیں اور نہ شعر اُن سے مراد ہے، بلکہ اتفاقاً ان کا اتفاق ہو گیا ہے، جس طرح کہ لوگوں کی بہت سی باتوں میں ایسا ہو جاتا ہے، کیوں کہ کبھی وہ ایسا کلام بولتے ہیں کہ اگر کوئی معتبر اس کا اعتبار کرے تو شعر کے وزن پر ٹھیک ہو جائے، حالاں کہ اس کو شعر شمار نہیں کرتے۔ جیسے قرآن شریف میں یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ﴾ [آل عمران: ۹۲] ''جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو گے ہرگز بھلائی نہ پاؤ گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ﴾ [سبا: ۱۳] ''اور حوضوں کے برابر لگن اور چولھوں پر جمی ہوئی مضبوط دیگیں۔''

اس کے علاوہ یہ ہے کہ امام اخفش رحمہ اللہ کہہ چکے ہیں کہ « أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِب... الخ » شعر نہیں ہے۔ خلیل نے کتاب العین میں کہا ہے کہ جو سجع دو جزء پر آیا ہے، وہ شعر نہیں ہوتا۔ امام ابن عربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کے حال سے ظاہر تر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بہ رفعِ باء ''لَا كَذِبُ'' اور بہ خفضِ باء ''عبد المطلبِ'' فرمایا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: بعض نے کہا ہے کہ روایت جو ہے وہ اِعراب کے ساتھ ہے اور جب اعراب کے ساتھ ہوئی تو شعر نہ ہوا، کیوں کہ جس وقت کذب کے حرفِ باء کو فتح دیا یا ضمہ یا اس کو منون (تنوین والا) کیا اور ثانی کی باء کو کسرہ دیا تو شعر کے وزن سے نکل گیا۔ [2] کسی نے اس جھگڑے کا لحاظ کر کے کہا ہے کہ ﴿ لَهٗ ﴾ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے، یعنی قرآن کے لائق نہیں کہ وہ شعر ہو، لیکن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث جو پہلے گزر چکی ہے، اس میں ہے: « وَاللّٰهِ مَا أَنَا بِشَاعِرٍ وَّلَا يَنْبَغِيْ لِيْ » [3] یہ حدیث قولِ مذکور کو رد کرتی ہے۔

امام بیضاوی اور خازن رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ علماء نے فرمایا ہے کہ آپ ﷺ کے لیے شعر کے بیت موزون نہیں ہوتے تھے اور اگر آپ ﷺ کسی بیتِ شعر کے ساتھ تمثل فرماتے تھے تو آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر مکسر جاری ہوتے تھے اور اگر آپ ﷺ ان لوگوں میں سے ہوتے جو شعر کہتے ہیں تو عقلاً آپ ﷺ پر تہمت لگانے کی راہ نکلتی اس بات میں کہ جو کچھ آپ ﷺ لے کر آئے ہیں وہ خود اُن کے پاس سے ہے [4] اور اسی لیے فرمایا: ﴿ وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ کیوں کہ اب باقی نہیں رہا مگر عناد جو ہلاکت کا موجب ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے بعض اوقات میں وزن کا ٹھیک ہونا اس بات کا موجب نہیں کہ آپ شعر کو جانیں۔ کقوله: « أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِب... الخ »

---

(1) اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
(2) تفسير القرطبي (۱۵/ ۵۲، ۵۳)
(3) اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
(4) تفسير البيضاوي (۴/ ۴۴۰) تفسير الخازن (۶/ ۱۵)

اس کے مان لینے پر کہ یہ شعر ہے؛ معول علیہ انفصال میں یہ بات ہے کہ اس کو بیت کے ساتھ تمثل کرنا اس بات کو واجب نہیں کرتا کہ اس کا قائل عالم بالشعر ہے اور نہ اس بات کو کہ اس کا نام شاعر رکھا جائے باتفاقِ علماء، جس طرح کہ کسی نے اتفاق سے سی لیا تو وہ درزی نہیں ہو جاتا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: مَا جَعَلْنَاهُ شَاعِرًا" یعنی ہم نے اس کو شاعر نہیں کیا ہے۔

یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ وہ اگر بغیر قصد کے کوئی شعر انشاء کریں تو وہ شعر نہ ہو۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا کہ جو کچھ اس باب میں کہا گیا یہ قول اس سے بہتر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ عزوجل نے صرف یہ خبر دی ہے کہ اس نے ان کو شعر نہیں سکھایا، یہ خبر نہیں دی کہ وہ شعر انشاء نہیں کرتے۔ حالاں کہ لوگوں نے یوں کہا ہے، ہر وہ شخص جو کوئی ایک قولِ موزون کہے اور اس سے اس کا ارادہ شعر کا نہ ہو تو وہ شاعر نہیں ہوتا، سوا اس کے نہیں کہ وہ شعر کے موافق ہو گیا ہے۔ چنانچہ جو موزون کلام زبان پر جاری ہو جاتا ہے، وہ شعر شمار نہیں کیا جاتا۔ شعر سے مراد تو وہی معدود ہوتا ہے جو شعر کے وزن پر بالقصد یعنی ارادے کے ساتھ جاری ہو۔ امام خلیل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "كَانَ الشِّعْرُ أَحَبَّ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ كَثِيْرِ الْكَلَامِ وَلٰكِنْ لَا يَتَأَتّٰى مِنْهُ"[1] انتھیٰ. یعنی شعر آپ کو بہت سے کلام سے محبوب تر تھا، مگر آپ سے بن نہیں آتا تھا۔ محبوب ہونے کی تائید اس حدیث سے ہو سکتی ہے جس میں ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے سو شعر سنے۔ محبوب وہی شعر ہے جس میں کفار کی ہجو ہے، یا اللہ کی حمد وثنا اور نبی اکرم ﷺ کی صفت ہے، یا کوئی اور حکمت اور نصیحت ہے اور مذموم وہ ہے جس میں مسلمانوں کو ہجو یا ہزلیات واہیات باتیں ہیں۔ قولِ فیصل یہ ہے کہ "اَلشِّعْرُ كَلَامٌ حَسَنُهُ حَسَنٌ وَقَبِيْحُهُ قَبِيْحٌ" "شعر ایک ایسا کلام ہے اگر اچھا ہو تو درست ہے اور اگر برا ہو تو غلط ہے۔" آزاد رحمہ اللہ نے "تسلية الفواد" میں اس کی خوب تنقیح کی ہے اور سیدنا ابو الوفاء صاحب ترجمان رحمہ اللہ نے "دليل الطالب" وغیرہ میں اس کی خوبی بیان کی ہے۔

بالجملہ جب قرآن کے جنسِ شعر ہونے کی نفی کی تو جو وہ حقیقت میں ہے اس کا ذکر فرمایا: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی نہیں ہے قرآن مگر اذکار میں سے ایک ذکر ہے اور نصیحتوں میں سے ایک نصیحت ہے جس کے ذریعے جن وانس کو نصیحت کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتابوں میں سے ایک کتاب ہے جو احکامِ شرعیہ پر مشتمل ہے۔ قرآنِ مجید محرابوں اور عبادت خانوں میں تلاوت کیا جاتا ہے، اس کی تلاوت کرنے اور اس پر عمل کرنے سے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل ہوتی ہے اور درجات ملتے ہیں، پھر بھلا اس میں اور شعر میں کتنا بڑا فرق ہے۔ کہاں قرآن جو رب العالمین کا کلام ہے اور کہاں شعر جو ہمزاتِ شیاطین اور شعرائے کا ذہین کی گھڑی ہوئی باتوں سے ہے!!

جمہور نے ﴿ لِّيُنْذِرَ ﴾ بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے اور امام نافع اور ابن عامر رحمہ اللہ نے بہ تائے فوقیہ۔ اول کی بنا پر ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اور ثانی کی بنا پر نبی اکرم ﷺ کو خطاب ہے۔[2] معنی یہ ہیں: تاکہ ڈرائے قرآن، یا تو

[1] تفسير القرطبي (۱۵/۵۳،۵۲) [2] تفسير القرطبي (۱۵/۵۵)

ڈرائے اس شخص کو جو زندہ ہے اور سمجھتا ہے اس شے کو جس کے ساتھ خطاب کیا جاتا ہے، یعنی مومن جس کا دل صحیح وسالم ہے، حق کو مانتا ہے، باطل کا انکار کرتا ہے، کیوں کہ کافر تو مردے کی طرح ہے، نہ سوچتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ اور تاکہ ان کافروں پر عذاب کا کلمہ واجب ہو، جو کفر پر اصرار کرنے والے ہیں اور اللہ پر ایمان لانے سے باز رہنے والے ہیں اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتے ہیں۔ ﴿ مَنْ كَانَ حَيًّا ﴾ کے مقابلے میں کفار کا لانا اس بات کا بتانا ہے کہ ان کے آثارِ حیات سے خالی ہونے کے سبب سے، جو معرفت ہے، وہ فی الحقیقت مردے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اپنی عظیم قدرت کا ذکر کیا اور اپنا انعام جو اس کے بندوں پر ہے اس کا ذکر کیا اور کافروں کا اس کی نعمت کا انکار کرنا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۞ ۷۱ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ۞ ۷۲ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۞ ۷۳

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے جو چیزیں بنائیں، ان میں یقیناً ہم نے ان کے لیے چوپائے بھی پیدا کیے؟ پھر وہ ان کے مالک (بن گئے) ہیں ۷۱ اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا، چناں چہ ان میں سے کچھ ان کی سواریاں ہیں، اور ان میں سے کچھ کو وہ کھاتے ہیں ۷۲ اور ان کے لیے ان (چوپایوں) میں (اور بھی) فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں، کیا پھر وہ شکر نہیں کرتے؟ ۷۳

چوپائے قدرتِ الٰہی کی ایک نشانی اور اس کی نعمت ہے:

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مٰلِكُوْنَ ﴾ کے معنی "مُطِيْقُوْنَ" ہیں، یعنی اللہ پاک نے اپنی خلق کو چوپایوں پر قاہر اور غالب کر دیا، وہ ان کے آگے عاجز اور مطیع ہیں، ان سے سرتابی نہیں کرتے، بلکہ اگر چھوٹا بچہ بھی اونٹ کے پاس آئے تو اسے بٹھا دے اور اگر چاہے تو اٹھا دے اور ہانک لے جائے اور وہ اس کے ہمراہ عاجز اور مطیع ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر سو اونٹ کی قطار ہو یا اس سے زیادہ تو ایک بچے کے چلانے سے سب کے سب چلتے ہیں، پھر اپنے سفروں میں ان میں سے بعض پر سوار ہوتے ہیں اور ان پر بوجھ لاد کر شہر شہر اور ملک ملک پھرتے ہیں اور ان میں کسی کو کھاتے ہیں، جب چاہتے ہیں نحر کر لیتے ہیں اور ان میں ان کے لیے فائدے ہیں؛ ان کی صوف، اون اور بال اپنے کام میں لاتے ہیں۔ یہ سب اشیاء ایک وقت تک ان کا اثاثہ اور متاع ہیں۔ ﴿ وَمَشَارِبُ ۭ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان کے دودھ پیتے ہیں اور دوا کے طور پر ان کے پیشاب کام میں لاتے ہیں، اس طرح کے اور فائدے ہیں۔ ﴿ اَفَلَا

﴿ يَشْكُرُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جو ان اشیاء کا پیدا کرنے والا اور مطیع کرنے والا ہے، اس کی توحید کیوں نہیں کرتے کہ اس کو ایک جانیں اور اس کی نعمتوں کا شکر کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا ﴾ میں ہمزہ ان کے حال سے انکار اور تعجب کرنے کے لیے ہے اور حرفِ واو مقدر پر عطف کے لیے ہے، جس طرح کہ اس کے نظائر میں ہوتا ہے اور رویتِ قلبی بہ معنی علم ہے: "أَيْ: أَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا وَلَمْ يَعْلَمُوْا". ﴿ لَهُمْ ﴾ کے معنی ہیں: "لِأَجْلِهِمْ وَانْتِفَاعِهِمْ"۔ کلمۂ "ما" موصولہ ہے اور عائد کو بہ سبب طولِ صلہ کے حذف کر دیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مصدریہ ہو۔ ﴿ اَنْعَامًا ﴾ مفعول ہے ﴿ خَلَقْنَا ﴾ کا۔ "أَنْعَامٌ"، "نَعَمٌ" کی جمع ہے۔ "نعم" کہتے ہیں: گائے، بز و اونٹ کو۔ ان کا خاص کر ذکر کیا گیا، گویا ساری اشیاء اللہ کی پیدایش اور ایجاد سے ہیں، اس لیے کہ عرب کے اکثر اموال یہی ہیں۔ اور ان سے عام طور پر فائدہ لیا جاتا ہے۔ انعام کی تحقیق میں کلام گزر چکا ہے۔ معنی یہ ہیں: کیا انھوں نے غور وفکر نہیں کیا اور تفکر و اعتبار سے یہ نہ جانا کہ ہم نے ان کے لیے اور ان کے فائدے کے لیے ان اشیاء کو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور ایجاد کیا بغیر کسی کے واسطے اور شرکت کے۔

عمل کی نسبت ہاتھوں کی طرف اس لیے کی کہ پیدا کرنے میں اپنی انفرادیت اور خصوصیت میں مبالغہ کیا جائے، جس طرح کہ ہم میں سے کوئی یوں کہتا ہے کہ فلاں شے کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ اس سے غرض یہ بات بتانا ہے کہ میں اس کے بنانے میں اکیلا ہوں، اس میں کسی کی شرکت نہیں ہے۔ ﴿ خَلَقْنَا ﴾ کے بعد جو ﴿ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ ﴾ فرمایا تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان نعمتوں کا پیدا کرنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے اور وہی ان کے ساتھ مستقل ہے۔ چنانچہ یہ کنایہ عرفی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کنایہ تمثیلی ہے، یعنی ان اشیاء میں سے جن کے پیدا کرنے اور ایجاد کرنے کے ہم متولی ہوئے ہیں اور ہمارا کوئی غیر اُن کی ایجاد پر قادر نہیں ہے۔

پھر اللہ پاک نے وہ فوائد اور منافع بیان کیے جو انعام کے پیدا کیے جانے پر حاصل ہوتے ہیں۔ فرمایا: ﴿ فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴾ یعنی وہ ان کے ضابط اور قاہر ہیں، جس طرح چاہتے ہیں ان میں تصرف کرتے ہیں، اگر ہم ان کو وحشی پیدا کرتے تو اُن سے نفرت کرتے اور وہ ان کے ضبط پر قادر نہ ہوتے۔ یا یہ مراد ہے کہ وہ ان کی ملکیت میں ہو گئے اور جو اموال ان کی طرف ملکیت کی وجہ سے منسوب ہیں من جملہ ان کے معدود ہو گئے۔ یہ قول ظاہر تر ہے، تاکہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ ﴾ ایک مستقل نعمت کے لیے تاسیس ہو جائے اور ما قبل کا تتمہ نہ ٹھہرے، یعنی ہم نے ان کو ان کے لیے مسخر کر دیا ہے، وہ ان منافع سے جن کا وہ ان سے ارادہ کرتے ہیں، سرتابی نہیں کرتے، یہاں تک

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٧٦١/٣)

کہ ان کو ذبح تک کر لیتے ہیں اور ایک بچہ ان کو کھینچ کر لے جاتا ہے تو اس کے مطیع اور فرماں بردار ہو جاتے ہیں اور وہ بچہ ان کو زجر کرتا ہے، مارتا ہے یا ڈانٹتا ہے تو اس کو سہہ لیتے ہیں۔

﴿ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ ﴾ میں حرفِ فاء تفریع احکام تذلیل کے لیے ہے، یعنی ان میں سے ان کی سواریاں ہیں جن پر سوار ہوتے ہیں۔ سوار ہونے کا ذکر اس لیے کیا کہ ان کا سب سے بڑا فائدہ سواری ہے اور بوجھ لادنے کا تعرض نہ کیا، اس لیے کہ یہ رکوب کے تمہ سے ہے۔ جمہور نے ﴿ رَكُوْبُهُمْ ﴾ بہ فتح راء پڑھا ہے۔ "رَكُوبٌ" بہ معنی مرکوب آتا ہے، جس طرح کہ "ناقته حلوب" (دودھ دینے والی اونٹنی) کو "محلوبة" کے معنی میں بولتے ہیں۔ امام اعمش، حسن اور ابن سمیفع رحمہ اللہ نے بہ ضمِ راء پڑھا ہے بنا بر مصدر اور سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے "رَكُوبَتُهُمْ" پڑھا ہے۔ "رَكُوبٌ وَرَكُوبَةٌ" کے ایک ہی معنی ہیں، جیسے: "حَلُوبٌ وَحَلُوبَةٌ وَحَمُولٌ وَحَمُولَةٌ"۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "رَكُوبَةٌ" واحد اور جمع کے لیے ہوتا ہے اور رکوب صرف جماعت کے لیے ہوتا ہے۔ امام ابو حاتم کا زعم یہ ہے کہ "رُكُوبُهُمْ" بہ ضمِ راء جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ مصدر ہے اور "رَكُوبٌ" رکوب وہ ہے جس پر سواری کی جاتی ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اس کو جائز کہا ہے۔ جس طرح کہ یوں بولتے ہیں: "فَمِنْهَا أُكُلُهُمْ وَمِنْهَا شُرْبُهُمْ"۔ اکل وشرب بہ معنی ماکول اور مشروب ہے۔[1]

﴿ وَمِنْهَا يَأْكُلُوْنَ ﴾ حرفِ "مِنْ" تبعیض کا ہے: "أَيْ: مَا يَأْكُلُونَ مِنْ لَحْمِهَا" یعنی اور ان میں سے وہ ہے جس کے گوشت میں سے کھاتے ہیں۔ اس جگہ اسلوبِ کلام کو صرف اس لیے بدلا ہے کہ اکل سارے انعام کے لیے عام ہے بخلاف رکوب کے کہ وہ ان میں سے صرف اونٹ کے لیے خاص ہے۔ ﴿ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان کے لیے انعام میں اس کے ساتھ دونوں قسم کے فائدے ہیں سوائے سوار ہونے اور کھانے کے۔ یہ وہی فائدے ہیں کہ ان کی صوف، اون اور بالوں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور ان کی چربی سے دُھن (تیل) بناتے ہیں اور اسی طرح ان پر بوجھ لادنا ہے اور ان سے کاشتکاری کرنا ہے اور ان کے چمڑوں سے اور نسل سے نفع لینا ہے۔

﴿ وَمَشَارِبُ ﴾ یعنی اور ان کے لیے ان میں مشارب ہیں ان کے دودھ سے جو حاصل ہوتا ہے۔ ﴿ مَشَارِبُ ﴾ "مَشْرَبٌ" کی جمع ہے مشرب جائے شرب ہے یا شراب۔ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد اُن کے تھن ہیں۔ ﴿ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴾ یعنی کیا پھر اللہ پاک کا ان نعمتوں پر شکر نہیں کرتے اور اس کی توحید نہیں کرتے اور عبادت کے ساتھ اس کو خاص نہیں ٹھہراتے۔ مطلب یہ ہے کہ ضرور ایسا کرنا چاہیے، کیوں کہ وہ منعم ہے اور منعم کا شکر کرنا واجب ہے۔[2] (كذا في فتح البيان)۔ پھر اللہ پاک نے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ جاہل اور مغرور ہیں، بجائے نعمت کا شکر ادا کرنے کے کفرانِ نعمت کرتے ہیں۔ خالق، رازق اور منعم کو چھوڑ کر غیر کو پوجتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

---

[1] تفسير القرطبي (٥٦/١٥) [2] فتح البيان (٣٢٠/١١_٣٢٢)

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾

اور انھوں نے اللہ کے سوا کئی معبود بنا لیے، تا کہ ان کی مدد کی جائے ﴿74﴾ وہ (معبود) ان کی مدد کی طاقت نہیں رکھتے، جب کہ وہ (مشرکین) تو خود ان (بتوں) کے حاضر باش لشکری (حمایتی) ہیں ﴿75﴾ لہٰذا ان کی باتیں آپ کو غمگین نہ کریں، بلاشبہ ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں ﴿76﴾

مشرکوں کے باطل معبود اُن کی مدد نہیں کر سکتے:

اللہ پاک مشرکوں پر اس بات میں انکار کرتا ہے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ انداد (شریکوں) کو معبود ٹھہرایا ہے۔ اس سے وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ معبود ان کی مدد کریں گے اور ان کو روزی دیں گے اور اللہ کے پاس ان کا درجہ قریب کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ ان کی مدد نہ کر سکیں گے، یعنی معبود اپنے عابدوں کی مدد کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، بلکہ وہ تو اس سے ضعیف تر، قلیل تر، حقیر تر اور مدحور تر (دور ہٹائے گئے) ہیں، بلکہ وہ اپنی جانوں کے لیے بدلہ لینے پر قادر نہیں ہیں، اس شخص سے جو اُن کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کرے، کیوں کہ وہ تو جماد ہیں نہ سنتے ہیں نہ عقل رکھتے ہیں۔

﴿ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی حساب کے وقت[1] یہ بت محشور ہوں گے اور قیامت کے دن اپنے عابدوں کے حساب کے وقت وہاں جمع ہوں گے، تا کہ یہ ان کے حُزن میں اور اضافہ کرے اور ان پر حجت قائم کرنے کے لیے ان پر اَدَلّ ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معبود اُن کی مدد کی طاقت نہ رکھیں گے اور حال یہ ہے کہ یہ مشرک دنیا میں اپنے معبودوں کے لیے غصہ کرتے ہیں، حالاں کہ وہ نہ تو ان کی طرف کوئی بھلائی کھینچ لاتے ہیں اور نہ کوئی برائی ان سے دور کرتے ہیں، وہ تو یہی بت ہیں۔ اسی طرح امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ یہ قول خوب ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو تسلی:

﴿ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان کا جھٹلانا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا تجھے غمگین نہ کرے۔[2]

---

① تفسير الطبري (٢٠/٥٥٢) ② تفسير الطبري (٢٠/٥٥٢، ٥٥٣) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٠١، ٣٢٠٢)

﴿ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴾ یعنی جس حال میں وہ ہیں اس کو سب جانتے ہیں اور ہم ان کو ان کے اس وصف اور بیان کا بدلہ دیں گے اور ان سے معاملہ کریں گے جس دن وہ اپنے اعمال میں سے کسی جلیل اور حقیر چیز کو اور کسی چھوٹی اور بڑی چیز کو گم نہ پائیں گے، بلکہ ان کے نئے اور پرانے اعمال جو کچھ وہ کرتے تھے، وہ سب ان پر پیش کیے جائیں گے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ انھوں نے بتوں وغیرہ سے اللہ کے سوا اور معبود پکڑے، ان کو پوجتے ہیں، حالاں کہ ان کو کسی شے پر کوئی قدرت نہیں اور نہ ان سے کوئی فائدہ حاصل ہوا اور نہ ان کو پوجنے سے ان کو کوئی نفع ملا۔ ﴿ لَعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ یعنی اس بات کی امید رکھی کہ اگر ان پر کوئی عذاب نازل ہوا یا ان کو کوئی امر آ دبائے تو ان کو ان کی طرف سے کوئی مدد ملے گی۔ ﴿ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ﴾ جملہ مستانفہ ہے۔ اللہ پاک نے اس جملے سے صاف بیان کر دیا کہ انھوں نے ان سے جس نفع کی اُمید رکھی، وہ باطل ہے اور اُن کی تدبیر بالکل اُلٹ ہے، وہ ہرگز ان کی مدد نہ کر سکیں گے۔ بتوں کے لیے واو اور نون کے ساتھ عقلاء کی جمع ذکر فرمائی، یہ اس لیے کہ مشرکوں کا زعم ہے کہ وہ نفع نقصان دے سکتے ہیں اور عقل رکھتے ہیں۔

﴿ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴾ یعنی حال یہ ہے کہ کفار بتوں کے لیے دنیا میں ایک لشکر ہیں، ان کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدلہ لیتے ہیں بتوں کے لیے اور وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے ہیں۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ان سے منع کرتے ہیں اور اُن سے دفع کرتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دنیا میں ان کے لیے غصہ کرتے ہیں،[3] یعنی دنیا میں اگر کوئی بتوں سے برائی کا ارادہ کرتا ہے تو مشرک لوگ ان کی طرف سے غصہ کر کے ان کا بدلہ لیتے ہیں اور اُن کی مدد کرتے ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کفار بتوں کو پوجتے ہیں اور ان کی خدمت کرتے ہیں، چنانچہ یہ ان کے لیے لشکر کی طرح ہیں۔

یہ سب قول اس بنیاد پر ہیں کہ ﴿ هُمْ ﴾ کی ضمیر کفار کی طرف راجع ہو اور ﴿ لَهُمْ ﴾ کی ضمیر ﴿ اٰلِهَةً ﴾ کی طرف راجع ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ هُمْ ﴾ کی ضمیر ﴿ اٰلِهَةً ﴾ کی طرف اور ﴿ لَهُمْ ﴾ کی مشرکوں کی طرف پھرتی ہے، یعنی بت مشرکوں کے لیے ایک لشکر ہیں کہ ان کے ساتھ تیار کیے گئے ہیں اور آگ میں حاضر کیے گئے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی کسی سے کوئی عذاب دور نہ کرے گا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ یہ بت ان کافروں کے لیے جہنم میں ان پر اللہ کے لشکر ہیں، کیوں کہ وہ ان پر لعنت کریں گے اور ان سے بے زار ہوں گے۔ کسی نے کہا: معنی

---

[1] تفسير ابن كثير (٧٦١/٣) [2] فتح القدير (٥٠٤/٤) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٠١/١٠، ٣٢٠٢)

یہ ہیں کہ کفار یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ بت قیامت کے دن ان کے لیے ایک لشکر ہیں، جواُن کی مدد کے لیے حاضر ہوں گے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کی تسلی فرمائی: ﴿ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ﴾ حرفِ فاء ماقبل پر ترتیبِ نہی کے لیے ہے۔ کیوں کہ بالضرور اس سے یہ مراد ہے کہ جس شے کے ساتھ انھوں نے خالی طمعیں اور اُمیدیں باندھ رکھی تھیں، وہ اس سے خائب، خاسر اور محروم ہوئے اور ان کی بے کار طمع ان پر اُلٹی ہوگئی، اس طرح سے کہ جس شے کو انھوں نے خیر کی اُمید پر اختیار کیا تھا، وہ ان کے لیے شر کا باعث ہوگئی۔ تو یہ بات اس قسم سے ہے کہ کام کو آسان کر دے اور تسلی کی موجب ہو، پس تو تسلی رکھ ان کی بات تجھے غمگین نہ کرے۔ یہ نہی گو ظاہری طور پر ان کے قول کی طرف متوجہ ہے، لیکن حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کی جانب متوجہ ہے۔

قول سے مراد وہی بات ہے جو ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ سے معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ وہ ضرور یہ کہیں گے کہ یہ لوگ ہمارے معبود ہیں اور معبودیت میں اللہ کے شریک ہیں اور اس کی مثل اور خرافات باتیں۔ کہا ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کو کنایہ کے طور پر ان باتوں کا اثر لینے سے منع کرنا ہے جس کا مقصد اس کو زیادہ موثر کرنا اور تاکیداً کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ کفار کو نہی ہے ان اسباب سے جو آپ ﷺ کو غمگین کریں اور آپ کو نہی ہے ان باتوں کا اثر لینے سے جو کفار سے صادر ہوتی ہیں۔ یہ نہی "لَا أُرِيَنَّكَ هٰهُنَا" کے باب سے ہے، کیوں کہ متکلم کی اس سے مراد مخاطب کو اس کے پاس حاضر ہونے سے نہی کرنا ہے۔ خود متکلم کو اس بات کی نہی نہیں کہ وہ اپنے نفس کو رویت کرنے دے۔ یہ قول بعید ہے، اولیٰ قول پہلا ہے اور کلام تسلی کے باب سے ہے، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ قولِ مذکور سے کفار کا یہ قول مراد ہو کہ وہ ساحر ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴾ نہی مذکور کی تعلیل ہے، کیوں کہ اللہ پاک ان کے چھپے کھلے کاموں کو جو جانتا ہے تو یہ اس بات کو لازم کرتا ہے کہ وہ ان کو اس کی جزا دے گا اور جو کچھ ان سے صادر ہوتا ہے، سب اس سے غائب نہیں ہے، خواہ وہ چھپا ہو یا کھلا۔ چھپی چیز کو کھلی اور اعلانیہ چیز سے جو پہلے ذکر کیا، تو یہ اس بات میں مبالغے کے لیے ہے کہ اللہ پاک کا علم ساری معلومات کو شامل ہے۔ کلمۂ ﴿ اِنَّا ﴾ کو مکسور اور مفتوح پڑھا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص نے یہ زعم کیا کہ جس نے ﴿ اِنَّا نَعْلَمُ ﴾ کو بہ فتح پڑھا تو اس کی نماز فاسد ہوگئی اور اگر اس کے معنی کا اعتقاد کیا تو کافر ہوگیا تو اس نے خطا کی، کیوں کہ فتح کا حذف لامِ تعلیل پر محمول کرنا ممکن ہے اور یہ حذف قرآن میں اور شعر میں اور ہر کلام میں کثرت سے ہے۔ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ کا تلبیہ ہے: « اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ » امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مکسور پڑھا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے مفتوح پڑھا ہے اور دونوں تعلیل ہیں۔[1] كما تقدم.

---

[1] تفسير النسفي (١٤/٤) فتح البيان (٣٢٢/١١، ٣٢٣)

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿٧٧﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿٧٨﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿٧٩﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ﴿٨٠﴾

کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے؟ پھر یکایک وہ کھلا جھگڑالو ہو گیا⑰ اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور وہ اپنی پیدایش کو بھول گیا، اس نے کہا: ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، جب کہ وہ گلی سڑی ہوں گی؟⑱ آپ کہہ دیجیے: انھیں وہی (اللہ) زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا اور وہ ہر طرح کے پیدا کرنے کو خوب جانتا ہے⑲ وہ (اللہ) جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ بنا دی، پھر یکایک تم اس سے آگ سلگا لیتے ہو⑳

موت کے بعد زندگی کا انکار اور اس کی تردید:

یعنی پتھر سے نکالتے ہیں۔ یا بعضے درخت سے اس کی سبز ٹہنیاں آپس میں رگڑتے ہیں تو آگ نکلتی ہے، جیسے: بانس یا مرخ یا عفار۔ انتھیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام مجاہد، عکرمہ، عروہ بن زبیر، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اُبی بن خلف ۔لعنہ اللہ تعالیٰ۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ ہڈی تھی اور وہ اس کو ریزہ ریزہ کرتا تھا اور اسے ہوا میں اڑاتا تھا اور کہتا تھا: اے محمد! کیا تو زعم کرتا ہے کہ اللہ اس کو اٹھائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں اللہ تعالیٰ تجھے مارے گا، پھر تجھے مبعوث کرے گا، پھر آگ کی طرف تیرا حشر کرے گا اور سورت یٰسٓ کی یہ آخری آیات نازل ہوئیں: ﴿ أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ ﴾

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ عاص بن وائل نے بطحا سے ایک ہڈی لی۔ پھر اس کو اپنے ہاتھ سے ریزہ ریزہ کیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے کہا: کیا اللہ اس کو زندہ کرے گا، اس شے کے بعد جس کو میں دیکھ رہا ہوں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں، اللہ تجھ کو مارے گا، پھر تجھے زندہ کرے گا، پھر تجھے جہنم میں داخل کرے گا۔ اور سورت یٰسٓ کے آخر کی آیات نازل ہوئیں۔ اس روایت میں عن سعید بن جبیر عن ابن عباس ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ذکر نہیں

کیا اور بطریقِ عوفی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی ایک ہڈی لایا، پھر اس کو پارہ پارہ کیا اور روایتِ مذکور کی طرح ذکر کیا۔[1] یہ حدیث منکر ہے اس لیے کہ سورت مکی ہے اور عبداللہ بن ابی ہر لحاظ سے مدینے میں تھا۔ برابر ہے کہ یہ آیتیں ابی بن خلف کے بارے میں نازل ہوئی ہوں یا عاص بن وائل کے بارے میں یا دونوں کے حق میں، کچھ بھی ہو مذکورہ آیات بعث کے ہر منکر کے حق میں عام ہیں۔ ﴿ الْاِنْسَانُ ﴾ میں الف و لام جنسی ہے، ہر منکرِ بعث کے لیے عام ہے۔

﴿ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے: کیا منکرِ بعث نے پہلی دفعہ کے پیدا کرنے کے ساتھ دوبارہ پیدا کرنے پر استدلال نہیں کیا تھا، کیوں کہ اللہ پاک نے انسان کی پیدایش کی ابتداء ﴿ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ [السجدة: ٨] سے کی، یعنی ایک بے قدر پانی کے خلاصے سے۔ چنانچہ اس کو ایک حقیر ضعیف بے قدر شے سے بنایا ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿٢٠﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿٢١﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ [المرسلات: ٢٠۔ ٢٢] ''کیا ہم نے تمھیں حقیر پانی (منی) سے پیدا نہیں کیا۔ پھر ہم نے اسے مضبوط اور محفوظ جگہ میں رکھا ہے۔ ایک مقررہ وقت تک۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ﴾ [الدھر: ٢] ''بے شک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا۔'' یعنی ہم نے انسان کو ملے جلے خلطوں میں سے ایک بوند سے پیدا کیا، چنانچہ جس ذات نے اس کو اس ضعیف نطفے سے بنایا کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ موت کے بعد اس کو دوبارہ زندہ کر دے جیسا کہ امام احمد نے بشر بن جحاش سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنی ہتھیلی میں تھوکا، پھر اس پر اپنی انگلی رکھی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابن آدم! کیا تو مجھے عاجز کرے گا، حالاں کہ میں نے تجھ کو اس جیسے پانی سے بنایا ہے، یہاں تک کہ جس وقت میں نے تجھ کو ٹھیک بنایا اور برابر کیا تو تو اپنی دو چادروں کے درمیان چلا، حالاں کہ زمین کے لیے تجھ سے وئید ہے ("شدة صوت الوطي علی الأرض" یعنی زمین پر روندنے کی سخت آواز)۔

پھر تو نے جمع کیا اور منع کیا، یہاں تک کہ جس وقت جان ہنسلی تک پہنچی تو تو نے کہا: میں صدقہ کرتا ہوں اور کہاں ہے وقت صدقے کا؟! امام ابن ماجہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔[2] اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ﴾ یعنی وہ اس بات کو بعید سمجھا کہ اللہ تعالیٰ جسموں کو اور بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ پیدا کرے گا، وہ اللہ جو بڑی قدرت والا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، اور بھول گیا اپنی جان کو اور اس بات کو کہ اللہ نے اس کو عدم سے وجود کی طرف پیدا کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے نفس سے اس شے کو جان چکا

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/٥٥٣، ٥٥٤) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٠٢، ٣٢٠٣)

[2] مسند أحمد (٤/٢١٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٠٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٩٩)

ہے جو اس سے بھی عظیم تر ہے، جس کو وہ بعید سمجھا ہے اور اس کا انکار کیا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے:
﴿ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ یعنی ان کو زندہ کرے گا، وہی جس نے ان کو پہلی بار بنایا۔
﴿ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴾ یعنی وہ جانتا ہے ہڈیوں کو زمین کے سارے کونوں اور کناروں میں جہاں وہ گئیں اور جہاں متفرق اور ریزہ ریزہ ہوئیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ربعی سے روایت کیا ہے کہ عقبہ بن عمرو نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا: تو ہم کو اس شے کی حدیث کیوں نہیں کرتا جو تو نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے؟ تو سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ بولے: میں نے آپ ﷺ کو سنا، فرماتے تھے: ایک شخص کو موت حاضر ہوئی، چنانچہ جب وہ زندگی سے نا امید ہوا تو اس نے اپنے گھر والوں کو وصیت کی کہ جب میں مرجاؤں تو میرے لیے بہت سی موٹی پکی لکڑیاں جمع کرنا، پھر ان میں آگ جلانا یہاں تک کہ جب وہ میرا گوشت کھالے اور میری ہڈیوں کو پہنچے، پھر میں کوئلہ ہو جاؤں تو ان کو لینا اور باریک کوٹنا، پھر ان کو دریا میں بہا دینا، چنانچہ اس کے گھر والوں نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف جمع کیا۔ پھر اس سے فرمایا کہ تو نے یہ کیوں کیا؟ وہ بولا: تیرے ڈر سے۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے اس کو بخش دیا، عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے بھی آپ ﷺ کو سنا کہ یہ فرماتے تھے: وہ نباش تھا، یعنی کفن چور۔

صحیحین میں بھی اس کی تخریج کی ہے[1] عبدالملک بن عمیر کی حدیث سے جو ربعی سے راوی ہے، بہت سے الفاظ سے۔ ان الفاظ میں سے یہ ہیں کہ اس نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ اسے جلا ڈالیں، پھر اس کو پیسیں، پھر اس میں آدھا تو جنگل میں اڑا دیں جس دن کہ بہت تیز ہوا چلتی ہو اور آدھا دریا میں بہا دیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا تو جو کچھ اس میں تھا، اس نے اس کو جمع کر دیا اور جنگل کو حکم دیا تو جو کچھ اس میں تھا، اس نے اس کو اکٹھا کر دیا، پھر اس سے کہا: ہو جا، تبھی وہ ایک مرد بن کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس سے فرمایا کہ کون سی چیز تجھے اس کام کے کرنے کا باعث ہوئی جو تم نے کیا؟ بولا: تیرا خوف، اور تو زیادہ جانتا ہے۔ "فَمَا تَلَافَاهُ أَنْ غَفَرَ لَهُ"[2] یعنی پھر جس شے کے ساتھ اس کی تلافی کی وہ یہ ہے کہ اس کو بخش دیا، ("ما" موصولہ "أي: فما تداركه به للمغفرة" یا نافیہ ہے اور "إلا" استثناء کا محذوف ہے: "أي: فما تداركه بشيء إلا بأن غفر له")۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا ﴾ یعنی جس ذات پاک نے ابتداء کی اس درخت کی پیدائش کی پانی سے، یہاں تک کہ وہ سبز و تر و تازہ ہو گیا، پھر وہ بار آور ہوا اور پکا، پھر اس کو ایسی حالت کی طرف عود کیا کہ سوکھی لکڑی ہو گیا، جس سے آگ جلائی جاتی ہے۔ اسی طرح وہ کرنے والا ہے جس شے کو چاہتا ہے، وہ قادر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦٦) مسند أحمد (٥/٣٩٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٦) صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ہے اس شے پر جس کا ارادہ کرتا ہے، کوئی شے اس کو روک نہیں سکتی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ جس ذات نے یہ آگ نکالی اس درخت سے، وہ اس بات پر قادر ہے کہ اس کو مبعوث کرے۔[1] کسی نے کہا: اس شجر سے مراد مرخ وعفار کا درخت ہے، یہ زمینِ حجاز میں اُگتا ہے، چنانچہ آتا ہے جو شخص آگ نکالنا چاہتا ہے اور اس کے پاس چقماق نہیں ہوتی تو اس درخت سے دو سبز ٹہنیاں لیتا ہے اور ایک کو دوسری سے رگڑتا ہے تو ان کے درمیان سے چقماق کی طرح آگ پیدا ہوتی ہے۔

یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ مثل میں بولتے ہیں: "لِكُلِّ شَجَرٍ نَارٌ وَاسْتَمْجَدَ الْمَرْخُ وَالْعِفَارُ" "ہر درخت میں آگ ہے، البتہ مرخ اور عفار میں زیادہ ہے۔" ("أي: استكثرا منها كأنهما أخذا من النار ما هو حسبهما" كذا في الصراح۔ یعنی ان دونوں درختوں نے آگ سے بہت لیا ہے، گویا انھوں نے آگ سے وہ شے لی ہے جو ان کو کافی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سب درختوں میں آگ ہے مگر مرخ وعفار میں سب سے زیادہ ہے۔ مرخ چوبِ آتش زنہ جو نیچے رہتی ہے اور عفار وہ ہے جو اُوپر رہتی ہے۔ مرخ زندہ ہے اور عفار زند۔ غرض یہ ہے کہ چقماق دو پتھروں سے یا دو لوہے کے ٹکڑوں سے یا دو لکڑیوں سے جھڑاتے ہیں، اوپر کی لکڑی کے ٹکڑے کو زند اور نیچے کے ٹکڑے کو زندہ بولتے ہیں۔ اسی طرح عفار اور مرخ کی لکڑی سے آگ نکالتے ہیں تو عفار کی لکڑی کو اوپر اور مرخ کی لکڑی کو نیچے رکھتے ہیں، پھر ان کو رگڑتے ہیں تو آگ نکل آتی ہے۔ چوں کہ ان میں سب درختوں کی نسبت آگ زیادہ ہے، اس لیے مرخ اور عفار کو چوبِ آتش زنہ کہتے ہیں، یعنی چقماق کی لکڑی)۔ اور حکماء نے کہا ہے کہ ہر درخت میں آگ ہے سوائے عناب کے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

جملہ ﴿ اَوَ لَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴾ مستانفہ ہے۔ اس سے مقصود منکرِ بعث پر حجت قائم کرنے کا بیان ہے اور اس کی جہالت پر تعجب دلانا ہے۔ اس لیے کہ خود بنی آدم کا پیدا کرنا شروع سے لے کر آخر تک اس کے مختلف درجوں کا مشاہدہ کرنا، اس بات کو مستلزم ہے کہ قادرِ حکیم کی قدرت کا اقرار کریں، اس شے پر جو اس سے کم ہے، یعنی اجسام کا مبعوث کرنا اور پھر ان کو ویسا ہی کر دینا جیسے وہ پہلے تھے۔ اس آیت میں جو انسان مذکور ہے، اس سے مراد جنسِ انسان ہے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اَوَ لَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴾ [مريم: ٦٧] "کیا یہ انسان اتنا بھی یاد نہیں رکھتا کہ ہم نے اسے اس سے پہلے پیدا کیا، حالاں کہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔"

---

[1] تفسير الطبري (٥٥٦/٢٠) [2] تفسير ابن كثير (٧٦٣_٧٦١/٣)

اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ کسی معین انسان کے ساتھ اس کو مخصوص کیا جائے جس طرح کہ بعض نے کہا ہے کہ عبداللہ بن اُبی ہے۔ یہ اس سے کہا گیا جبکہ اس نے بعث سے انکار کیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ امیہ بن خلف ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عاص بن وائل سہمی ہے۔ امام قتادہ اور مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابی بن خلف جمحی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ابوجہل ہے۔[1] ان میں سے اکثر قول پہلے گزر چکے ہیں، کیوں کہ اگر چہ ان لوگوں میں کوئی اس آیت کے نزول کا سبب ہے، لیکن آیت سے مراد صرف عام انسان کو خطاب ہے نہ کہ کسی خاص انسان کو اور جو شخص اس کے نزول کا سبب ہے وہ بدخولِ اولیٰ جنسِ انسان کے تحت میں داخل ہے۔

جملہ ﴿ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴾ معطوف ہے جملہ منفیہ پر جو اس سے پہلے ہے، اس لیے اس کے ساتھ یہ بھی انکار میں داخل ہے جو استفہام سے سمجھا جاتا ہے۔ کلمۂ "إذا" فجائیہ بمعنی ناگاہ ہے، معنی یہ ہیں کہ کیا دیکھتا نہیں آدمی کہ اللہ پاک نے اس کو ایک ذرا سے حقیر وضعیف گندے پانی سے پیدا کیا ہے جو آلۂ تناسل کے سوراخ سے نکلتا ہے، وہ سوراخ جو نجاست کی نکلی ہے۔ پھر جب وہ ہو گیا تو ہم سے اس کے بارے میں جھگڑتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی حجتیں اور برہانیں اس پر قائم ہو چکیں اور جس کی صحت اور حقیقت کے بارے میں اس کی مبدئے فطرت (پیدائش کی جگہ) نے کھلی گواہی دی۔

مطلب یہ ہے کہ اس جھگڑنے والے کی جہالت پر تعجب ہے کہ باوجود اپنی اصلیت کی ذلت اور حقارت کے اللہ جبار وقہار سے جھگڑنے کے لیے آگے آتا ہے اور اس سے بحث کرنے کے لیے ظاہر ہوتا ہے اور بعث کا انکار کرتا ہے اور اپنی پیدائش کی ابتداء میں غور وفکر نہیں کرتا، یعنی یہ نہیں سوچتا کہ وہ ایک ذرا سے گندے پانی سے پیدا ہوا ہے، حالاں کہ یہ انتہا درجے کا مکابرہ، یعنی بحث ہے۔ ﴿ خَصِيْمٌ ﴾ کہتے ہیں سخت جھگڑا کرنے والے اور بہت زیادہ لڑائی کرنے والے کو۔ یعنی سخت جھگڑالو ہے۔ ﴿ مُّبِيْنٌ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جس بات کو کہتا ہے اس کو اپنے رخسار کی قوت اور اپنی زبان کی تیزی سے ظاہر کرتا ہے اور واضح کرتا ہے، یعنی اپنی حجت کو بڑی تڑاق پڑاق سے خوب کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔

جملہ ﴿ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ﴾ معطوف ہے جملہ منفیہ پر داخل ہے انکار کے تحت میں، جو استفہام سے سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ تکمیل ہے انسان کے حال سے تعجب دلانے کے لیے اور اس بات کا بیان ہے کہ وہ حقائق سے جاہل ہے۔ اس نے تو اپنے نفس میں فکر کرنے کو چھوڑ رکھا ہے اللہ کی باقی مخلوقات میں فکر کرنے کا کیا ذکر! یہ بھی جائز ہے کہ جملہ ﴿ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴾ ﴿ خَلَقْنَا ﴾ پر معطوف ہو اور یہ جملہ اس پر معطوف ہو، یعنی اس نے وارد کیا ہماری شان میں ایک عجیب قصہ، حقیقت میں وہ قصہ ہمارے ہڈیوں کو زندہ کرنے کے عمل کا انکار کرنا ہے، یا اس کے زعم میں وہ قصہ عجیب ہے اور اس کو بعید سمجھا ہے اور اس کو مثل کے قبیل سے شمار کیا ہے اور اس کا

[1] تفسیر الطبري (٢٠/٥٥٣۔ ٥٥٤) فتح القدير (٤/٥٠٥)

سخت منکر ہوا ہے، وہ قصہ یہی ہمارا ہڈیوں کو زندہ کرنا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ اس نے ہمارے لیے ایک مثال خلق سے ٹھہرائی ہے اور ہماری قدرت کو ان کی قدرت کی طرح سمجھا ہے اور نفی کل کی علی العموم کی ہے۔

چنانچہ پہلے قول کی مثال کی بنا پر اللہ کے ہڈیوں کو زندہ کرنے کا انکار ہے، کیوں کہ یہ ایک عجیب امر ہے اپنی غرابت کے لحاظ سے اور بعید از عقل ہونے کے سبب سے اس لائق ہے کہ مثل شمار کیا جائے اس بات کی ضرورت کے واسطے کہ عقول انکار کے بطلان کا جزم کرتے ہیں اور منکر کے وقوع کا، کیوں کہ وہ پیدا کرنے کی طرح ہے، بلکہ وہ تو قیاسِ عقل میں پیدا کرنے سے بھی زیادہ آسان ہے۔ دوسرے قول کی بنیاد پر مثل زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کا ہے ہڈیوں کو، کیوں کہ یہ اس کے زعم میں ایک عجیب بات ہے۔ اس نے اس کو بعید سمجھا ہے اور قبیل مثل سے شمار کیا ہے، باوجود اس کے کہ قریب تر شے ہے وقوع سے، کیوں کہ مثل انشا کے ہے۔ یا اس سے بھی زیادہ سہل ہے۔ اور تیسرے قول کی بنا پر کچھ فرق نہیں ہے درمیان اس کے کہ مثل انکار ہو یا منکر۔

﴿ وَنَسِيَ خَلْقَهُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ بھول گیا اس بات کو کہ ہم نے اس کو منی سے پیدا کیا، جو اس مثل کے بطلان پر دال ہے، جو اس نے بیان کی اور اس سے غافل ہو گیا اور جھگڑے اور مقابلے کی وجہ سے اس کا ذکر چھوڑ دیا، چنانچہ منی سے پیدا کرنا ہڈی کے زندہ کرنے سے بھی زیادہ عجیب وغریب ہے۔ یہ جملہ معطوف ہے ﴿ ضَرَبَ ﴾ پر، یا محلِ نصب میں ہے بنا برحال بہ تقدیر "قَدْ" اور جملہ ﴿ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظٰمَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴾ مستانفہ ہے سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا کہ وہ کیا مثال ہے جو اس نے بیان کی؟ تو اس کا یہ جواب ہے کہ اس نے یوں کہا: کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو، حالاں کہ وہ بوسیدہ ہیں۔ یہ استفہام انکار کا ہے، کیوں کہ اس نے اللہ پاک کی قدرت کا قیاس بندے کی قدرت پر کیا۔ چنانچہ اس بات کا انکار کیا کہ اللہ تعالیٰ بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کر دے، اس لیے کہ یہ بات بشر کی قدرت میں نہیں۔

﴿ رَمِيْمٌ ﴾ پرانی بوسیدہ ہڈی کو کہتے ہیں۔ ہڈی جب بوسیدہ ہو جاتی ہے تو محاورے میں یوں بولتے ہیں: "رَمَّ الْعَظْمُ يَرِمُّ رَمًّا فَهُوَ رَمِيْمٌ وَرِمَامٌ" اور ﴿ رَمِيْمٌ ﴾ فرمایا "رَمِيْمَةٌ" نہ فرمایا، باوجود اس کے کہ یہ مونث کی خبر ہے۔ چنانچہ یہ اس لیے کہ ﴿ رَمِيْمٌ ﴾ بوسیدہ ہڈیوں کا اسم ہے صفت نہیں ہے، جیسے: رمہ و رفات۔ کسی نے کہا: یہ وجہ ہے کہ ﴿ رَمِيْمٌ ﴾ معدول ہے "فَاعِلَةٌ" سے اور ہر معدول جو اپنی وجہ سے ہے، وہ مصروف ہوتا ہے اپنے اِعراب سے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴾ [مریم: ۲۸] "اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔" کیوں کہ یہ مصروف ہے "بَاغِيَةٌ" سے۔ امام بغوی اور قرطبی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے[1] اور اول قول کے صاحبِ کشاف قائل ہیں۔[2] اولیٰ یہ ہے کہ یوں کہیں کہ ﴿ رَمِيْمٌ ﴾ بروزن فعیل بہ معنی فاعل ہے "رَمَّ الشَّيْءُ"،

---

(1) تفسير البغوي (٢٩/٧) تفسير القرطبي (٥٨/١٥) (2) الكشاف (٣٣/٤)

سے، بہ سبب غلبے کے اسم ہو گیا ہے، یا بہ معنی مفعول ہے اور فعیل بہ معنی مفعول میں مذکر اور مونث برابر ہوتے ہیں جس طرح کہ جریح وصبور میں کہتے ہیں۔

مسئلہ:

جو شخص ہڈیوں میں حیات کو ثابت کرتا ہے اور مردار کی ہڈیوں کو نجس کہتا ہے، اس لیے کہ موت ان میں اثر کرتی ہے، اس وجہ سے کہ حیات ان میں حلول کرتی ہے، وہ اس آیت سے حجت پکڑتا ہے اور وہ حنفیہ کے نزدیک پاک ہیں اور اسی طرح بال اور پٹھے، کیوں کہ حیات ان میں حلول نہیں کرتی تو موت بھی ان میں موثر نہیں ہوتی اور اس آیت میں ہڈیوں کو زندہ کرنے سے مراد ان کو اس حال میں پھیر دینا ہے جس پر وہ پہلے تھیں، یعنی بدن میں تروتازہ، زندہ اور حساس۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے بعض اصحاب نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ہڈیاں اس قسم سے ہیں جس میں حیات حلول کرتی ہے۔ (فتح البیان کی اتباع میں یہ دونوں نسبتیں اس طرح بیان کی گئی ہیں، یعنی حلولِ حیات کی نسبت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرف اور عدمِ حلولِ حیات کی نسبت امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف اور یہ کتبِ مذاہب کے خلاف ہے اور نیز جو چند سطر پہلے گزر چکا ہے، اس کے بھی خلاف ہے)۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حیات ان میں حلول نہیں کرتی اور ﴿ مَنْ يُّحْيِ الْعِظٰمَ ﴾ سے مراد "مَنْ يُّحْيِي أَصْحَابَ الْعِظَامِ" ہے بر تقدیر مضاف محذوف۔ اس قول کا یوں رد کیا ہے کہ یہ تقدیر ظاہر کے خلاف ہے (یہ رد تام نہیں مجازاً حیات کی نسبت قرآنِ مجید میں شائع ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: ﴿ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ﴾ [الروم: ۵۰] "وأمثالها كثيرة" پھر خلافِ ظاہر ہونا کیسا۔ از مصحح)۔

پھر اللہ پاک نے اس مثل بیان کرنے والے کا جواب دیا اور نبی اکرم ﷺ کو خطاب کیا کہ تو یوں کہہ دے: ﴿ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ یعنی اس کو ملامت کر اور ڈانٹ ڈپٹ کر اور وہ جو اپنی فطرت کو بھول گیا ہے جو حقیقتِ حال پر دال ہے، وہ اس کو یاد دلا اور کہہ: اُن کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کی ابتداء کی ہے اور پہلی بار بغیر کسی شے کے ان کو بنایا ہے اور جو ذات پاک پہلی دفعہ کی پیدائش پر قادر ہوا ہے، وہی دوسری دفعہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔

﴿ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے اور نہ اس کے علم سے کوئی شے خارج ہے، وہ کوئی سی شے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے علم سے مخلوقات کی تفاصیل کو جانتا ہے اور ان کی خلق کی کیفیت سے واقف ہے۔ چنانچہ جو جسم پارہ پارہ اور متفرق ہو چکے ہیں، ان کے اصول اور فصول کے اجزاء کو اور ان کے گرنے کی جگہوں کو اور ان کے الگ الگ ہو جانے کو اور بعض کو بعض کی طرف جوڑنے کو پرانی طرز پر اور ان میں جو اعراض اور قوتیں تھیں

ان کے لوٹانے کو یا ان کے مثل نئے پیدا کرنے کو جانتا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہر خلق کو مجملاً ومفصلاً جانتا ہے، یعنی اس کے پیدا کرنے سے پہلے اور اس کو پیدا کرنے کے بعد اس کو جانتا ہے۔ یہ آیت اس شخص پر حجت ہے، جو اس کا منکر ہے کہ اللہ پاک جزئیات کو جانتا ہے۔ اس آیت کی طرح کی یہ آیت ہے: ﴿ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴾ [الطلاق: ١٢] ''اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو بہ اعتبارِ علم گھیر رکھا ہے۔''

پھر اللہ پاک نے تقریر ما تقدم کی طرف رجوع کیا، یعنی کفار جو بعث کو بعید سمجھتے تھے، پھر اس کا رد کرنا شروع کیا۔ ارشاد فرمایا: ﴿ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا ﴾ چنانچہ اللہ پاک نے اپنی وحدانیت سے متنبہ کیا اور اپنی قدرت پر آگاہی بخشی کہ وہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے، اس دلیل سے جس کا وہ مشاہدہ کر رہے ہیں کہ اس نے جلانے والی آگ سبز تر و تازہ لکڑی سے نکالی، یہ وہی مرخ وعفار کا درخت ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ حکماء نے کہا ہے کہ ہر درخت میں آگ ہے مگر عناب میں، کیوں کہ کپڑے کوٹنے کی مصلحت سے اس میں آگ نہیں رکھی گئی۔ اسی لیے دھوبیوں کے کپڑے کوٹنے والے سونٹے عناب کے درخت سے بنائے جاتے ہیں۔

اللہ پاک کی تخلیق کے عجائبات میں سے یہ ہے کہ ہرے بھرے درخت سے آگ نکل آتی ہے، باوجود اس کے کہ آگ اور پانی میں باہم دشمنی ہے، آگ پانی سے بجھ جاتی ہے۔ چنانچہ جو قادر اور حکیم ہرے درخت میں پانی اور آگ جمع کرنے پر قادر ہے، وہی اس پر بھی قادر ہے کہ انسان کی موت اور زندگی میں معاقبہ کرے، یعنی ایک کو دوسرے کے بعد میں لائے۔ عقلی طور پر ایک ضد کو دوسری ضد پر بہ تعقیب جاری کرنا اس سے زیادہ آسان ہے کہ دو ضدوں کو بلا ترتیب جمع کرے۔

رہی یہ بات کہ اخضر فرمایا خضرنہ کہا تو اس کی یہ وجہ ہے کہ لفظِ شجر کا اعتبار کیا۔ کسی نے شجر کے معنی کا اعتبار کر کے خضر پڑھا ہے (تفسیر بیضاوی اور مدارک میں ''من الشجر الخضراء''[1] ہے)۔ یہ بات بجائے خود ثابت ہو چکی ہے کہ اسم جنس کی تذکیر و تانیث دونوں جائز ہیں، چنانچہ قرآن شریف میں تذکیر و تانیث دونوں آئی ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴾ و ﴿ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ﴾ [القمر: ٢٠، الحاقة: ٧] ''جڑ سے کٹے ہوئے کھجور کے تنے۔'' ''کھجور کے کھوکھلے تنے۔''

چنانچہ بنی تمیم تو اسم جنس کا مذکر استعمال کرتے ہیں اور اہلِ حجاز مونث استعمال کرتے ہیں مگر بہت کم۔ (یہ عجیب آیت ہے کہ اس میں اسم جنس کی تذکیر و تانیث دونوں آئی ہیں: ﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ۝ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ۝ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴾ [الواقعة: ٥١۔ ٥٤] ﴿ مِنْهَا ﴾ اور ﴿ عَلَيْهِ ﴾ کی ضمیر شجر کی طرف راجع ہے، اول میں معنی کا لحاظ کیا اور ثانی میں لفظ کا، بھلا اس کا

---
[1] تفسير البيضاوي (٤/٤٤٣) تفسير النسفي (٤/١٥)

عکس کیوں نہ کیا، شاید اس کا نکتہ یہ ہو کہ اول کے بعد جمع ہے اور ثانی کے بعد واحد۔ واللّٰه أعلم)۔ موصول ثانی یعنی ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا﴾ موصول اول سے بدل ہے۔

﴿فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک کی کتنی کھلی قدرت ہے کہ جب تم نے مرخ اور عفار کی دو سبز تر و تازہ پانی ٹپکتی ٹہنیاں آپس میں رگڑیں تو اسی دم اس میں سے بغیر تکلف کے آگ نکل پڑی۔ امام سعدی رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے: "پس ناگہاں شما ازاں درخت آتش می افروزید" شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے: پس آن ہنگام شما ازو را می فروزید۔ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے "پس اس وقت تم اس میں سے روشن کرتے ہو۔ ذرا ان ترجموں میں غور کرو، "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست" کو خوب سمجھو۔ امام محلی رحمہ اللہ نے خوب کہا ہے کہ یہ قدرت علی البعث پر دال ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے اس درخت میں پانی اور آگ اور لکڑی کو جمع کیا ہے، چنانچہ نہ تو پانی آگ کو بجھاتا ہے نہ آگ لکڑی کو جلاتی ہے۔[1] سبحانه ما أقدره۔ پھر اللہ پاک نے وہ شے بیان کی جو انسان کی پیدائش میں نہایت درجہ بڑی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى ۗ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

کیا وہ (اللہ) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ ان جیسے (انسان) پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہی تو (سب کچھ) پیدا کرنے والا، خوب جاننے والا ہے (81) جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے (82) چناں چہ پاک ہے وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے (83)

کیا آسمانوں و زمین کا خالق انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں؟!

اللہ پاک اپنی عظیم قدرت سے آگاہ فرماتا ہے کہ اس نے ساتوں آسمان بنائے، ان کواکبِ سیارہ اور ثوابت کے ساتھ جو اُن میں ہیں اور ساتوں زمینیں بنائیں اور جو کچھ اُن میں ہے، یعنی پہاڑ اور ریت اور دریا اور جنگل وغیرہ

[1] تفسیر الجلالین (۱/۵۸٦) [2] فتح البیان (۱۱/۳۲٤_۳۲۸)

اور جو کچھ آسمان اور زمین کے درمیان ہے، اس کو پیدا کیا۔ اور وہ اس بات کی راہ بتاتا ہے کہ ان بڑی بڑی چیزوں کے پیدا کرنے سے انسانی جسموں کے دوبارہ پیدا کرنے پر استدلال کریں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ ﴾ [المؤمن: ٥٧] ''آسمان و زمین کی پیدائش یقیناً انسان کی پیدائش سے بہت بڑا کام ہے۔'' اور اس جگہ فرمایا ہے ﴿ اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ ﴾ ﴿ مِثْلَهُمْ ۚ ﴾ کے معنی ہیں: مثل البشر یعنی کیا جس نے ایسی بڑی بڑی چیزیں بنائیں، وہ قادر نہیں ہے کہ مثل بشر کے بنائے، پھر ان کا اعادہ کرے، یعنی موت دینے کے بعد ان کو دوبارہ ویسے ہی بنائے، جیسا پہلے بنایا تھا۔ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا ہے۔[1] یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [الأحقاف: ٣٣] ''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے وہ نہ تھکا، وہ یقیناً مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے؟ کیوں نہ ہو؟ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔'' نیز اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ یعنی وہ تو شے کو صرف امر کرتا ہے، وہ دوبارہ حکم کرنے یا تاکید کرنے کا محتاج نہیں: ؎

إِذَا مَا أَرَادَ اللّٰهُ أَمْرًا فَإِنَّمَا   يَقُوْلُ لَهُ قَوْلَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ

یعنی اللہ پاک جس وقت کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو یہی اس کو ''کُنْ'' کہہ دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندو! تم سب کے سب گناہ گار ہو، سوائے اس کے جس کو میں عافیت دوں، لہٰذا تم مجھ سے مغفرت مانگو میں تم کو بخش دوں گا اور تم سب محتاج ہو مگر جس کو میں غنی کروں۔ بے شک میں جواد، ماجد اور واجد ہوں، کرتا ہوں جو چاہتا ہوں، عطا میری کلام ہے اور عذاب میرا کلام ہے، جب میں کسی شے کا ارادہ کرتا ہوں تو اس سے یہی کہہ دیتا ہوں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔[2] (أخرجه الإمام أحمد)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی تنزیہ و تقدیس و تبرہ ہے برائی سے واسطے حی قیوم کے، یعنی اللہ حی قیوم کو ہر برائی سے منزہ، مقدس، مبرا اور پاک کرنا ہے، وہ اللہ جس کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں اور اسی کی طرف سارے کام رجوع ہوتے ہیں اور پیدا کرنے کی قدرت اور حکم اسی کا ہے اور اسی کی طرف قیامت کے دن بندے لوٹ کر جائیں گے، پھر وہ ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا اور وہ عدل کرنے والا، انعام کرنے والا اور فضل و کرم کرنے والا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ کے معنی اس آیت کی طرح

---

[1] تفسير الطبري (٥٥٦/٢٠) [2] مسند أحمد (١٧٧/٥)

ہیں: ﴿ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [المؤمنون: ٨٨] ”پوچھیے کہ تمام چیزوں کا اختیار کس کے ہاتھ میں ہے۔“ اور اس آیت کی طرح ہے: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ [الملك: ١] ”بہت بابرکت ہے وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔“ پس ملک اور ملکوت معنی کے لحاظ سے ایک ہیں، جیسے: رحمت ورحموت اور رہبۃ ورہبوت وجبر وجبروت۔ لوگوں میں سے کسی کا یہ زعم ہے کہ ملک تو عالم اجسام ہے اور ملکوت عالم ارواح ہے۔ صحیح قول پہلا ہے اور اسی پر جمہور مفسرین وغیرہم ہیں۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک رات میں رسول اللہ کے ساتھ کھڑا ہوا آپ ﷺ نے سات رکعتوں میں سبع طوال سورتیں پڑھیں اور آپ ﷺ جس وقت رکوع سے اپنا سر اٹھاتے تو فرماتے: «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ» پھر فرماتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ذِي الْمَلَكُوْتِ وَالْجَبَرُوْتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ» اور آپ کا رکوع آپ کے قیام کی طرح تھا اور آپ کا سجود آپ کے رکوع کی طرح تھا، پھر آپ فارغ ہوئے اور میرے دونوں پاؤں ٹوٹنے کے قریب ہوگئے تھے۔[1] (أخرجه الإمام أحمد)

امام ابو داود اور ترمذی کی شمائل کے بارے میں روایت کے الفاظ اور نسائی کی روایت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ رات کو نماز پڑھ رہے ہیں اور آپ فرماتے تھے: «اَللّٰهُ أَكْبَرُ» تین بار «ذِي الْمَلَكُوْتِ وَالْجَبَرُوْتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ» پھر آپ ﷺ نے شروع کیا تو سورۃ البقرہ پڑھی۔ پھر رکوع کیا تو آپ ﷺ کا رکوع آپ کے قیام کے قریب تھا اور آپ ﷺ اپنے رکوع میں فرماتے تھے: « سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ» پھر آپ ﷺ نے اپنا سر رکوع سے اٹھایا تو آپ ﷺ کا قیام قریب تھا آپ ﷺ کے قیام سے (پہلا قیام «سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ» کے بعد کا قیام ہے اور دوسرے قیام سے مراد قراءت کا قیام ہے)۔ فرماتے تھے: «لِرَبِّيَ الْحَمْدُ» پھر آپ ﷺ نے سجدہ کیا تو آپ ﷺ کا سجود آپ ﷺ کے قیام سے قریب تھا اور اپنے سجدے میں فرماتے تھے: « سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى» پھر آپ ﷺ نے اپنا سر اٹھایا سجود سے اور دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھتے تھے اپنے سجود کے قریب اور فرماتے تھے: «رَبِّ اغْفِرْ لِيْ، رَبِّ اغْفِرْ لِيْ»

چنانچہ آپ ﷺ نے چار رکعتیں پڑھیں اور ان میں سورت بقرہ، آلِ عمران، نساء اور مائدہ یا انعام پڑھیں۔ شعبہ نے شک کیا، یہ لفظ امام ابو داود کے ہیں۔[2] (”من حديث شعبة عن عمرو بن مرة عن أبي حمزة مولى الأنصار عن رجل من بني عبس عن حذيفة وقال النسائي: أبوحمزة عندنا طلحة بن يزيد

---

[1] مسند أحمد (٣٨٨/٥) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٧٤) الشمائل المحمدية (٢٢٩/١، ٢٣٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٦٩) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: (صحيح أبي داود: ٢٧/٤)

و هذا الرجل يشبه أن يكون صلة كذا قال والأشبه أن يكون ابن عم حذيفة كما تقدم في رواية الإمام أحمد والله أعلم و أما رواية صلة بن زفر عن حذيفة في صحيح مسلم[1] ولكن ليس فيها ذكر للملكوت و الجبروت و الكبرياء و العظمة"[2] (كذا في ابن كثير))

امام ابو داود رحمہ اللہ نے عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑا ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ البقرہ پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کسی آیتِ رحمت پر گزرتے تو ٹھہرتے اور سوال کرتے اور جب کسی عذاب کی آیت پر گزرتے تو ٹھہرتے اور پناہ مانگتے۔ کہا: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کیا اپنے قیام جتنا، اپنے رکوع میں فرماتے تھے:« سُبْحَانَ ذِي الْمَلَكُوتِ وَالْجَبَرُوتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ » پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اپنے قیام جتنا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سجدے میں اسی کے مثل کہا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تو آلِ عمران پڑھی، پھر ایک ایک سورت پڑھی۔[3] (ورواه الترمذي في الشمائل والنسائي من حديث معاوية بن صالح به) آخر تفسير سورة يٰسٓ ولله الحمد والمنة كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

﴿ اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ ... الآية﴾ اللہ پاک کی طرف سے جملہ مستانفہ ہے، اس جواب کی تحقیق کے لیے جس کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ کفار کو مخاطب کر کے دیں۔ ہمزہ انکار و نفی کا ہے اور حرفِ واو عطف کے لیے ہے مقدر پر جس کا مقام مقتضی ہے، جس طرح کہ اس جیسی آیات میں ہوا کرتا ہے: "أَيْ: لَيْسَ الَّذِيْ أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ، وَلَيْسَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا وَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ"۔ یعنی کیا نہیں ہے وہ جس نے ہڈیوں کو اول بار بنایا اور نہیں ہے وہ جس نے تمھارے لیے ہرے درخت سے آگ بنائی اور نہیں ہے وہ جس نے آسمان و زمین بنائے اس بات پر قادر کہ پیدا کرے ان آدمیوں کی مثل جو مر گئے۔ مراد وہ اور اُن کے امثال ہیں بطور تقدیم و تاخیر کے۔ یا مراد وہی ہیں بر طریقِ کنایہ جس طرح کہ "مِثْلُكَ يَفْعَلُ كَذَا"، میں ہے کہ مثل سے مراد خود مخاطب ہے۔[4] (كذا قال الشهاب)

مطلب یہ ہے کہ جو ذات پاک آسمانوں اور زمین کے بنانے پر قادر ہے، حالاں کہ یہ دونوں بڑائی میں انتہا درجے کے ہیں اور ان کے اجزاء بڑے بڑے ہیں، وہی بشر کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے، جو شکل میں بہت چھوٹا ہے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧٢) [2] تفسير ابن كثير (٧٦٤/٣)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٧٣) الشمائل المحمدية (٢٥٦/١) سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٤٩) تفسير ابن كثير (٧٦٣/٣، ٧٦٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح أبي داود: ٢٧/٤)

[4] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٢٥٤/٧)

اور قوت کے لحاظ سے بہت کمزور ہے۔ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ البتہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے پیدا کرنے سے بہت بڑا ہے۔ جمہور نے ﴿ بِقٰدِرٍ ﴾ بصیغۂ اسم فاعل پڑھا ہے اور جحدری وغیرہ، (یعنی ابن ابی اسحاق، اعرج، سلام بن منذر اور ابو یعقوب حضرمی) نے ''یَقْدِرُ'' صیغۂ فعل مضارع سے پڑھا ہے۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے انکار تقریری کا جو استفہام سے معلوم ہوتا ہے، خود جواب دیا فرمایا: ﴿ بَلٰى ﴾ یعنی ہاں وہ اس پر قادر ہے ﴿ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴾ یعنی وہ خلق و علم میں اکمل و اتم وجہ پر بڑے مبالغے والا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کثیر الخلق ہے اور ہر شے کو جانتا ہے۔ کسی (یعنی حسن بصری، جحدری اور مالک بن دینار رحمہم اللہ) نے ''خالق'' بھی پڑھا ہے۔ پھر اللہ پاک نے وہ بات ذکر کی جو اس کی کمال قدرت پر دال ہے اور اس بات پر دال ہے کہ اس کے لیے پہلی دفعہ پیدا کرنا اور دوسری دفعہ پیدا کرنا سہل اور آسان ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ . . . الآیۃ ﴾ یعنی اس کی شان یہ ہے کہ جس وقت اس کا ارادہ کسی شے کے ساتھ متعلق ہوتا ہے، وہ کوئی سی شے ہو تو اس سے کہہ دیتا ہے: واقع ہو جا تو وہ واقع یا پیدا ہو جاتی ہے، بغیر توقف کے، کسی طرح کی دیر نہیں ہوتی۔ اس کی تفسیر سورۃ النحل اور سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ جمہور نے ﴿ فَيَكُوْنُ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے بنا بر استیناف اور کسائی نے بہ نصب ﴿ يَقُوْلَ ﴾ پر معطوف کیا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنی ذات کی پاکیزگی بیان فرمائی، اس سے کہ اس کا وصف غیر قدرت کے ساتھ کیا جائے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾

یہ اللہ تعالیٰ کی پاکی ہے اس شے سے جس کے ساتھ کفار نے اس کا وصف کیا اور ان باتوں سے تعجب دلانا ہے جو انھوں نے اس کی شان میں کہیں۔ کلامِ عرب میں ﴿ مَلَكُوْتُ ﴾ مبالغے کا ہے ملک میں، جس طرح کہ جبروت و رحموت ہے۔ گویا یوں کہا: چنانچہ پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں تمام اشیاء کی ملکیت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ یعنی مفاتح ہر شے ہے۔ جمہور نے ﴿ مَلَكُوْتُ ﴾ پڑھا ہے اور اعمش، طلحہ اور ابراہیم تیمی نے ''مَلَكَةُ'' بروزن شجرۃ اور کسی نے ''مَمْلَكَةُ'' بروزن مفعلہ پڑھا ہے اور کسی نے ''مَلْكُ''، لیکن ﴿ مَلَكُوْتُ ﴾ سب سے ابلغ ہے۔ جمہور نے ﴿ تُرْجَعُوْنَ ﴾ کو بہ تائے خطاب بہ صیغۂ مجہول اور سلمی، زر بن حبیش اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب نے بہ یائے تحتیہ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور زید بن علی نے بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔[2] معنی یہ ہیں کہ تم اس کی طرف رجوع کیے جاؤ گے نہ کہ اس کے غیر کی طرف اور پھیرے جاؤ گے اور عود کیے جاؤ گے بغیر فوت کیے ہوئے، یہ دارِ آخرت میں ہوگا بعد بعث کے۔[3] (كذا في فتح البيان)

فاضل طیبی نے کہا ہے کہ یہ سورت اپنے شروع سے اختتام تک امہات علم الاصول و جمیع مسائل معتبرہ کی تقریر میں ہے جن کو علماء اپنی مصنفات میں لائے ہیں، ان سب کی تقریر اس میں ابلغ اور اتم وجہ سے ہے۔ پھر اس کی وجہ

---

[1] فتح القدير (٥٠٦/٤) [2] تفسير القرطبي (٦٠/١٥) فتح القدير (٥٠٧/٤) [3] فتح البيان (٣٢٩،٣٢٨/١١)

مفصل بیان کی ہے، یہاں تک کہا ہے کہ ﴿ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ مثل فذلکہ ہے واسطے مذکورات کے اور ﴿ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ مثل خاتمہ کے ہے جو اسرارِ عجیبہ پر مشتمل ہے، اس میں عقلیں حیران رہ جاتی ہیں اور زبان اور قلم اس کی تشریح کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، اسی لیے حبرِ اُمت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ سورت یٰسٓ کی فضیلت میں جو کچھ مروی ہے، وہ اسی آیت کی وجہ سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یٰسٓ کو جو قلبِ قرآن یا اصل اور لبِ قرآن کہا گیا ہے تو وہ اس لیے کہ تمام کتابوں میں جو اہم احکام نازل کیے گئے ہیں، ان میں سے یہ ہے کہ لوگ حشر کیے جائیں گے اور سب کے سب اس کے پاس حاضر ہوں گے اور مطیع وفرماں بردار لوگ اپنے ان اعمال کی احسن جزاء دیے جائیں گے جو وہ کرتے تھے اور مجرم لوگ ان سے جدا ہوں گے۔

یہ سب امور اس سورت میں بہت موثر اور موکد طریقے سے بیان کیے گئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سورت یٰسٓ اپنے مُردوں پر پڑھو۔[1] امام نے کہا: اس کی یہ وجہ ہے کہ مرتے وقت زبان بہت کمزور ہوتی ہے اور اسی طرح دوسرے اعضاء بھی کمزور ہوتے ہیں، لیکن دل بالکل اللہ پاک کی طرف متوجہ ہوتا ہے، پھر جب یہ سورتِ کریمہ پڑھی جاتی ہے تو اس کے دل کی قوت بڑھتی ہے اور اصولِ دین کے ساتھ اس کی تصدیق سخت ہوتی ہے تو اس کے دل کا اشراق نورِ ایمان سے اور بڑھتا ہے اور معرفت کی روشنی کے ساتھ اس کی بصیرت قوت پکڑتی ہے۔ (كذا في شيخ زاده)

الحمد لله و المنة کہ یہ سورت وقت یک ساعت شب بست و دوم (۲۲) ماہ شوال ۱۳۱۲ھ کو محلّہ امیر گنج میں تمام ہوئی۔ اللہ پاک قبول فرمائے اور آگے لکھنے کی توفیق اور قوت دے۔ لا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم القوي العزيز، اللهم إني ضعيف فقوني في رضاك، اللهم اشرح لي صدري ويسرلي أمري واحلل عقدة من لساني يفقهوا قولي، وارزقني طي القلم وسرعة الكتابة مع الإدراك التام بالضبط والإتقان على التمام، اللهم اغفرلنا وارحمنا وعافنا وارزقنا واجبرنا واسترنا وأحسن عواقبنا في الأمور كلها وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب الآخرة، آمين وصلى الله علىٰ سيدنا محمد وآله وسلم وصحبه أجمعين إلى يوم الدين، آمين فقط.

---

[1] اس کی تخریج اسی سورت کے شروع میں گزر چکی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سُوۡرَةُ الصّٰٓفّٰتِ

اس سورت مبارکہ کی ایک سو بیاسی (۱۸۲) آیتیں ہیں اور مکی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ مکے میں نازل ہوئی۔[2] (أخرجه ابن الضريس وابن النحاس وابن مردويه والبيهقي في الدلائل) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو تخفیف کا حکم فرماتے تھے اور اَلصّٰٓفّٰت کے ساتھ ہماری امامت کرتے تھے۔[3] (أخرجه النسائي والبيهقي في سننه وقال ابن كثير: تفرد به النسائي) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو کوئی جمعے کے دن یٰسٓ اور الصّٰٓفّٰت پڑھے، پھر اللہ پاک سے سوال کرے تو وہ اس کو اس کا سوال عطا کرے۔ (أخرجه ابن أبي داود في فضائل القرآن و ابن النجار في تاريخه) نیز سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جبکہ ملوک حضر موت نے سوال کیا، جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر اس میں سے کچھ پڑھیں جو آپ پر نازل کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا﴾ پڑھا، یہاں تک کہ آپ ﴿وَرَبُّ الْمَشٰرِقِ﴾ تک پہنچے۔[4] الحديث. (أخرجه أبو نعيم في الدلائل والسلفي في الطيوريات)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا ۙ﴿۲﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكۡرًا ۙ﴿۳﴾
اِنَّ اِلٰهَكُمۡ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا
وَرَبُّ الۡمَشَارِقِ ؕ﴿۵﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے قطار در قطار صفیں باندھنے والوں (فرشتوں) کی ① پھر جھڑک کر ڈانٹنے والوں کی ② پھر قرآن کی تلاوت کرنے والوں کی ③ بلاشبہ تمھارا معبود ایک ہی ہے ④ (وہی) رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور (اس کا بھی) جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور (تمام) مشرقوں کا رب ہے ⑤

[1] تفسير القرطبي (۶۱/۱۵) [2] الدر المنثور (۷۷/۷)

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (۸۲۶) سنن البيهقي الكبرىٰ (۱۱۸/۳) [4] الدر المنثور (۷۷/۷، ۷۸)

فرشتے اللہ تعالیٰ کی توحید پر گواہ ہیں:

صف باندھنے والے فرشتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کا حکم سننے کے لیے قطار میں کھڑے ہوتے ہیں، پھر وہ شیطانوں کو جھڑکتے ہیں، جو سننے کے لیے جا لگتے ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کا حکم اتر چکا تو اس کو ایک دوسرے کو بتانے کے لیے پڑھتے ہیں، شمال سے جنوب تک ایک طرف مشرقین ہیں۔ سورج کے لیے ہر روز ایک علاحدہ جگہ ہے اور ہر ستارے کی جگہ علاحدہ ہے اور دوسری طرف اتنے ہی مغربین ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿ وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ﴾ فرشتے ہیں۔ ﴿ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ﴾ فرشتے ہیں اور ﴿ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ﴾ فرشتے ہیں۔ (رواہ سفيان عن الأعمش عن أبي الضحى عن مسروق عنه) اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مسروق، سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد، سدی، قتادہ اور ربیع بن انس رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتے آسمان میں صفیں ہیں۔[1] امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم لوگوں پر تین باتوں میں فضیلت دیے گئے: ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح ٹھہرائی گئیں اور ہمارے لیے سب کی سب زمین مسجد ٹھہرائی گئی اور اس کی خاک ہمارے لیے پاک کرنے والی ٹھہرائی گئی، اگر ہمیں پانی نہ ملے۔[2]

نیز مسلم، ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ نے سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم ویسے صف کیوں نہیں باندھتے جیسے فرشتے اپنے رب کے پاس صف باندھتے ہیں؟ فرمایا کہ وہ پورا کرتے ہیں اگلی صفوں کو اور صف میں مل کر کھڑے ہوتے ہیں۔[3] امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا: ﴿ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ فرشتے بادل کو ڈانٹتے ہیں۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ﴾ وہ شے ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں زجر فرمایا ہے، اسی طرح امام مالک نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ ﴿ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ﴾ کے متعلق امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتے کتاب اور قرآن کو اللہ کے پاس سے لوگوں کی طرف لاتے ہیں۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴾[4] [المرسلات: ۵۔ ۶] ”اور وحی لانے والے فرشتوں کی قسم! جو (وحی) الزام اتارنے یا آگاہ کر دینے کے لیے ہوتی ہے۔“

معبودِ برحق اللہ تعالیٰ ہی ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ﴾ جس پر قسم کھائی ہے وہ یہی ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ تعالیٰ جو رب

---

1. تفسير الطبري (۲۱/۷۔۹) 2. صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۲۲)
3. صحيح مسلم، رقم الحديث (۴۳۰) سنن أبي داود، رقم الحديث (۶۶۱) سنن النسائي، رقم الحديث (۸۱۶) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۹۹۲)
4. تفسير الطبري (۲۱/۸) تفسير ابن كثير (۵/۴)

ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان مخلوقات کا جو اُن کے درمیان میں ہیں اور ﴿ وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ﴾ یعنی خلق کا مالک اور متصرف وہی ہے اس طرح سے کہ جو کچھ اس میں ثوابت، سیارے اور ستارے ہیں، ان کو مسخر کیا ہے۔ مشرق سے ظاہر ہوتے ہیں اور مغرب میں غروب ہوتے ہیں۔ مشارق کا ذکر کر کے مغارب سے اکتفا کیا ہے، کیوں کہ مشارق مغارب پر دال ہے۔

اس آیت میں مغارب کی تصریح فرمائی ہے: ﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴾ [المعارج: ٤٠] ''پس مجھے قسم ہے مشرقوں اور مغربوں کے رب کی (کہ) ہم یقیناً قادر ہیں۔'' اور دوسری آیت میں یوں فرمایا: ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴾ [الرحمن: ١٧] ''وہ رب ہے دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا۔'' مراد سردی اور گرمی کے دو مشرق و مغرب ہیں سورج اور چاند کے لیے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

امام ابوعمر اور حمزہ رحمہما اللہ نے، اور کسی نے کہا ہے کہ صرف حمزہ نے یوں پڑھا ہے کہ ﴿ وَالصّٰٓفّٰتِ ﴾ کی تاء کا ﴿ صَفًّا ﴾ کے صاد میں اور ﴿ فَالزّٰجِرٰتِ ﴾ کی تا کا ﴿ زَجْرًا ﴾ کی زاء میں اور ﴿ فَالتّٰلِيٰتِ ﴾ کی تاء کا ﴿ ذِكْرًا ﴾ کی ذال میں ادغام کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے جب اس قراءت کو سُنا تو اس کا انکار کیا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عربیت میں تین وجہ سے یہ بعید ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ حرفِ تاء صاد کے مخرج سے نہیں ہے اور نہ زاء و ذال کے مخرج سے اور نہ ان کی اخوات سے ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حرفِ تاء ایک کلمے میں ہے اور اس کا مابعد دوسرے کلمے میں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جب تم نے ادغام کیا تو دو کلموں کے دو ساکنوں میں جمع کیا۔ دو ساکنوں کے درمیان ایسے موقعے میں جمع کرنا اسی وقت جائز ہے کہ دونوں ایک کلمے میں ہوں۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تاء کا ادغام صاد میں اچھا ہے دونوں حرفوں کی مقارنت کے سبب سے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ دونوں زبان کے کنارے سے نکلتے ہیں۔ باقی قراء نے سب لفظوں کے اظہار سے پڑھا ہے۔ صف ترتیب جماعت کو کہتے ہیں ایک خطِ مستقیم پر۔ جس طرح کہ نماز میں صف باندھی جاتی ہے۔ صافات میں کئی قول ہیں: ایک یہ ہے کہ مراد وہ فرشتے ہیں جو دنیا میں لوگوں کی صفوں کی طرح آسمان میں صف باندھتے ہیں۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے پَروں کی صف باندھتے ہیں، یعنی ان کو ہوا میں پھیلاتے ہیں۔ اس میں ٹھہرے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ پاک ان کو جس بات کا چاہے حکم فرمائے، یعنی چڑھنے اُترنے وغیرہ کا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: اچھی طرح صف باندھنے

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/ ٥۔٦)

والے ہیں، اس طرح جس طرح ہم اپنی نماز میں اپنے رب کے سامنے صفیں باندھتے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مراد طیور ہیں جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ ﴾ [الملك: ١٩] ''کیا یہ اپنے اوپر پر کھولے ہوئے پرندوں کو نہیں دیکھتے۔'' تیسرا یہ ہے کہ مراد مومن لوگوں کی جماعت ہے، جب وہ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں اور جنگ میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کو امام قشیری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔[1] اسی طرح ﴿ اَلزّٰجِرٰتِ ﴾ میں کئی قول ہیں۔ ''زجر'' اصل میں قوت سے دور کرنے کو کہتے ہیں، یہاں مراد قوتِ تصویت ہے، یعنی زور سے آواز کرنا۔ اسی معنی سے ''زَجَرْتُ الْإِبِلَ وَالْغَنَمَ'' ہے جبکہ تو اپنی آواز سے اونٹوں اور بکریوں کو ڈرائے۔

ایک قول یہ ہے کہ مراد زجر کرنے والے فرشتے ہیں، یا تو اس لیے ان کو ''زَاجِرٰت'' کہتے ہیں کہ وہ بادلوں کو زجر کرتے ہیں، جیسا کہ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے، یا اس لیے کہ وعظ و نصیحت کے ساتھ معاصی سے زجر کرتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد زواجرِ قرآنی ہیں، یعنی ہر وہ حکم جو بری بات سے نہی اور زجر کرتا ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ مراد علماء ہیں، کیوں کہ یہی لوگ اہلِ معاصی کو معاصی سے زجر کرتے ہیں۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ اسی طرح ﴿ اَلتّٰلِيٰتِ ﴾ کے بارے میں کئی قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام حسن، مجاہد، ابن جبیر اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اکیلے جبریل علیہ السلام مراد ہیں، ان کی تعظیم کے لیے جمع کا لفظ ذکر کیا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ اپنے تابع فرشتوں سے وہ خالی نہیں رہتے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مراد ہر وہ شخص ہے جو ذکر اللہ اور کتبِ الٰہیہ کی تلاوت کرتا ہے۔ (قاله قتادة) چوتھا قول یہ ہے کہ مراد قرآن شریف کی آیات ہیں، ان کو موصوف بہ تلاوت کیا، حالاں کہ وہ متلو ہیں جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [النمل: ٧٦] ''یقیناً یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے بیان کر رہا ہے۔'' کسی نے کہا ہے کہ آیات کو تالیات اس لیے کہا کہ ایک آیت دوسری آیت کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ مراد انبیاء علیہم السلام ہیں، ذکر کو اپنی اُمتوں پر تلاوت کرتے ہیں۔[2] (ذكره الماوردي)

﴿ صَفًّا ﴾ اور ﴿ زَجْرًا ﴾ کا نصب بنا بر مفعول مطلق ہے، ''صَافَّات و زَاجِرَات'' کی تاکید کے لیے آئے ہیں اور ﴿ ذِكْرًا ﴾ کا نصب بنا بر مفعول بہ ہے (ذکر سے مراد قرآن شریف، تسبیح اور تحمید وغیرہ ہے)۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ صَفًّا ﴾ و ﴿ زَجْرًا ﴾ کی طرح مفعول مطلق ہو۔ ﴿ اَلتّٰلِيٰتِ ﴾ کے معنی سے، کیوں کہ وہ ''ذٰكِرٰتِ'' کے معنی میں ہے، یہ وجہ ماقبل کے ساتھ زیادہ تر موافق ہے۔ حرفِ واو تینوں جگہ قسم کا ہے۔ مقسم بہ میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے

[1] تفسير القرطبي (٦١/١٥، ٦٢) فتح القدير (٥٠٨/٤، ٥٠٩) [2] تفسير القرطبي (٦٢/١٥) فتح القدير (٥٠٩/٤)

کہ ان اشیاء کا خالق مقسم بہ ہے، اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع کیا ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ ایسی جگہ میں قسم محلوف بہ کی تعظیم کے لیے ہوتی ہے اور ایسی تعظیم اللہ پاک کے سوا اور کسی کو لائق نہیں۔ اس لیے تقدیرِ عبارت یہ ہے: "وَرَبِّ الصّٰفّٰتِ وَالزَّاجِرَاتِ وَالتَّالِيَاتِ" دوسرا قول جس پر اکثر ہیں، یہ ہے کہ مقسم بہ یہی چیزیں ہیں بہ سبب ظاہر لفظ کے، چنانچہ اس سے ہٹنا خلافِ دلیل ہے۔

رہی غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت تو وہ مخلوق کو ہے کہ غیر اللہ کی قسم نہ کھائیں اور خالق جل جلالہ اس سے مستثنیٰ ہے، وہ اپنی بعض مخلوقات کی قسم کھاتا ہے، ان کی تعظیم ظاہر کرنے کے لیے، جیسے: "وَالشَّمْسِ، وَالَّيْلِ، وَالضُّحٰى وَالطُّوْرِ، وَالنَّجْمِ، وَالتِّيْنِ، وَالزَّيْتُوْنِ" وغیرہ۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَالزّٰجِرٰتِ ﴾، ﴿ فَالتّٰلِيٰتِ ﴾ میں حرفِ فاء یا تو وجود میں صفات کی ترتیب کے لیے ہے، یا ان کے موصوفات کی فضیلت میں ترتیب کے لیے ہے۔ ان دونوں قولوں میں نظر ہے۔ اس کی تفصیل شیخ زادہ وغیرہ میں خوب لکھی ہے۔

بالجملہ اللہ پاک نے "صافات" وغیرہ کی قسم کھا کر فرمایا: ﴿ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ﴾ یعنی بے شک تمھارا معبود البتہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ قسم کا جواب ہے قسم کے جواب میں ﴿ اِنَّ ﴾ مکسور آتا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے ایسے ﴿ اِنَّ ﴾ کا فتح بھی جائز رکھا ہے۔ اشیائے مذکورہ کے ساتھ قسم کھانے میں کئی فائدے ہیں: ایک یہ ہے کہ ان اشیاء کے ذاتی شرف اور کمال مراتب پر آگاہ کرنا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ بتوں کے عابدین کے قول کا رد کرنا ہے، وہ کہتے تھے کہ یہ معبود ہیں۔ تیسرے یہ ہے کہ ما تقدم کی تاکید منظور ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے اکثر سورتوں میں توحید اور صحتِ بعث اور قیامت کو یقینی دلیلوں سے ثابت کیا ہے۔ چنانچہ سورت یٰسٓ کے آخر میں ابھی گزر چکا ہے۔ لہٰذا جبکہ ان دلیلوں کا ذکر پہلے ہولیا ہے تو ما تقدم کی تاکید کے لیے قسم کا ذکر کر کے ان کا ثابت کرنا کچھ بعید نہیں ہے۔ خاص کر قرآن شریف تو لغتِ عرب میں اتارا گیا ہے اور اُن کے نزدیک قسم سے اپنی بات کو ثابت کرنا ایک معروف طریق ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ اللہ پاک نے اشیائے مذکورہ کی قسم کھائی، اس بات پر کہ معبود ایک ہے تو اس کے بعد یقینی دلیل بیان کی، یعنی ﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ﴾ یعنی وہ رب ہے آسمان اور زمین کا اور ان مخلوقات اور کائنات کا جو اُن کے درمیان میں ہیں اور رب ہے مشرقوں کا۔ مطلب یہ ہے کہ اس مخلوقات کا ایسی انوکھی اور نادر شکل میں موجود ہونا سب سے واضح دلیل ہے قادر مطلق کے وجود اور قدرت پر اور اس بات پر کہ وہ اس سب کا خالق و مالک ہے۔

﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ ﴾ خبرِ ثانی ہے ﴿ اِنَّ ﴾ کی، یا بدل ہے ﴿ لَوَاحِدٌ ﴾ سے، جیسا کہ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے، یا خبر ہے مبتدائے محذوف کی، جیسا کہ ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَوَاحِدٌ ﴾ پر وقف حسن ہے اور ﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ ﴾ سے ابتدائے کلام ہے، اس معنی سے کہ "هُوَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ". کلمۂ ﴿ رَبُّ ﴾ دوبارہ ذکر

فرمایا کہ مشارق میں ربوبیت کا بہت زیادہ ظہور ہوتا ہے اور وہ ہر دن نئے نئے ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ پاک نے سورج کے لیے ہر دن کا ایک مشرق اور مغرب پیدا فرمایا ہے، سال کے دنوں کی تعداد کے مطابق ہر دن ایک مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور ایک مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ امام ابن انباری اور ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ مشارق سے مراد کواکب ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ مراد مشارقِ آفتاب، یعنی سورج کے طلوع ہونے کی جگہیں ہیں۔ مشارق کے ذکر کو کافی سمجھا گیا، جس طرح کہ ﴿ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ ﴾ [النحل: ۸۱] میں "حر" کے ذکر پر اکتفا کیا۔ "اور کرتے جو تمھیں گرمی سے بچائیں۔" یعنی "والبرد" اور خود مشارق و مغارب پر دال ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کا عکس کیوں ذکر نہ کیا، چنانچہ اس کی یہ وجہ ہے کہ شروقِ شمس پہلے ہوتا ہے اس کے غروب سے۔

دوسری یہ بات ہے کہ شروق نعمت میں ابلغ ہے اور اس میں فائدہ زیادہ ہے بہ نسبت غروب کے۔ چنانچہ مشرق کا ذکر کیا یہ بتانے کے لیے کہ اللہ پاک کا اپنے بندوں پر احسان بہ کثرت ہے اور اسی باریکی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام نے مشرق کے ساتھ استدلال کیا تو یوں فرمایا: ﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۸] "اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق کی طرف سے لے آتا ہے تو اسے مغرب کی جانب سے لے آ۔" یہاں تو "مشارق" بہ صیغۂ جمع فرمایا اور اس کے مقابل کو حذف کیا اور سورۃ الرحمٰن میں ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴾ بہ تثنیہ اور سورۃ المعارج میں ﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ ﴾ بہ جمع اور سورۃ المزمل میں ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ﴾ واحد ذکر کیا اور تینوں جگہ مقابل کو ذکر کیا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن شریف کلامِ عرب کے اسلوبِ بیان اور فنون پر نازل ہوا ہے، جو اُن کے نزدیک معلوم و معروف ہیں، چنانچہ ان میں سے اجمال، تفصیل، ذکر، حذف، تثنیہ، جمع اور افراد ہے مختلف اعتبار سے۔

چنانچہ سورۃ المزمل میں تو واحد ذکر کیا اور اجمالاً ذکر کیا، مراد مشرق و مغربِ گرما و سرما ہے۔ سورۃ المعارج میں جمع اور تفصیل کی، مراد سال کے سارے مشارق و مغارب ہیں، یہ سب سات سو سے زیادہ ہیں۔ سورۃ الرحمٰن میں تثنیہ اور تفصیل کی، مراد گرمیوں اور سردیوں کے دو مشرق و مغرب ہیں اور اس جگہ جمع و حذف کیا، مراد سال کے سارے مشارق ہیں، ان پر اکتفا اس لیے کیا کہ محذوف پر دال ہیں، چنانچہ پہلے اس طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ اس جگہ جمع کا صیغہ اس لیے خاص کیا کہ سورت کے شروع میں جن چیزوں کو صیغۂ جمع کے ساتھ ذکر کیا گیا، ان کے مطابق ہو اور حذف کو زینت کی مناسبت کے لیے مخصوص کیا، کیوں کہ زینت غالباً ضیاء اور نور ہی سے ہوتی ہے اور یہ دونوں مشرق سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ مغرب سے۔ اور سورۃ الرحمٰن میں جو تثنیہ کو خاص کیا تو یہ ﴿ يَسْجُدٰنِ ﴾ اور ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ

[1] تفسیر القرطبي (۱۵/ ۶۳) فتح القدیر (۴/ ۵۰۹۔ ۵۱۰)

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ کی مناسبت سے کیا اور مقابلین کا ذکر ان کی صفات کے بیان اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کی مناسبت سے کیا۔

پھر سورۃ المعارج میں جمع کو خاص کیا، اس لیے کہ ان سے پہلے اور بعد جن کا ذکر کیا گیا وہ جمع کے صیغے میں تھا اور کثرتِ تاکید کے لیے مقابلین کا ذکر کیا قسم اور جوابِ قسم میں اور سورت مزمل میں صیغۂ واحد اس لیے خاص کیا کہ وہ اس سے پہلے ذکر کی جانے والی شے کے مطابق ہو، اس سے پہلے نبی اکرم ﷺ کا ذکر بہ صیغۂ واحد ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر بہ صیغۂ واحد ہے اور مقابلین کا ذکر اس لیے کیا کہ جو بات ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ میں ہے، اس کا احاطہ ہو جائے اور اس لیے کہ وہاں نبی اکرم ﷺ کو اللہ کے احکام کا بیان ہے۔[1] (كذا قال الكرخي والله أعلم)

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ۟ ﴿6﴾ وَحِفْظًا مِّنْ
كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ﴿7﴾ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى
وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿8﴾ دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ
وَّاصِبٌ ﴿9﴾ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿10﴾

بے شک ہم ہی نے آسمانِ دنیا کو ستاروں سے زینت دے کر سجایا ہے ⑥ اور ہر سرکش شیطان سے (اس کی) حفاظت کے لیے ⑦ (تاکہ) وہ عالمِ بالا کی (باتیں) سن نہ پائیں اور (ان پر) ہر طرف سے (شہاب) پھینکے جاتے ہیں ⑧ (انھیں) بھگانے کے لیے، اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے ⑨ مگر جو کوئی (ایک آدھ بات) اچانک اُچک کر لے جائے تو نہایت چمکتا ہوا ستارہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے ⑩

ستارے آسمانِ دنیا کی زینت اور شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ ہیں:

آسمانِ دنیا کو ستاروں کی زینت سے آراستہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تارے سب آسمانِ دنیا میں ہیں، اگرچہ ہر ایک کا پھیرا اوپر ہو یا نیچے ہو۔ انہیں تاروں کی روشنی سے آگ نکلتی ہے جس سے شیطانوں کو مار پڑتی ہے، جیسے: سورج اور آتشی شیشے سے۔ انتھیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ اس نے زمین والوں کے لیے آسمانِ دنیا کو زینت دی، جو اس کی طرف نظر کرنے والے ہیں ان کو تاروں کی ایک رونق دکھائی دیتی ہے۔ زینت کو بہ اضافت اور بہ تنوین

[1] فتح البيان (۱۱/۳٦۷-۳۷۰)

دونوں طرح پڑھا ہے اور تنوین کی بنا پر کواکب کو زینت کا بدل ٹھہرایا ہے، دونوں کے ایک معنی ہیں، چنانچہ کواکب کی روشنی خواہ وہ سیارے ہوں یا ثوابت، شفاف آسمان کے جرم (جسم) کو پھاڑتی ہے تو وہ اہلِ زمین کے لیے چمکتے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَٰبِيحَ وَجَعَلْنَٰهَا رُجُومًا لِّلشَّيَٰطِينِ ۖ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ﴾ [الملك: ٥] ''بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے آراستہ کیا اور انھیں شیطانوں کو مارنے کا ذریعہ بنایا اور شیطانوں کے لیے ہم نے (دوزخ کا جلانے والا) عذاب تیار کر دیا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّٰهَا لِلنَّٰظِرِينَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنَٰهَا مِن كُلِّ شَيْطَٰنٍ رَّجِيمٍ ﴿١٧﴾ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُۥ شِهَابٌ مُّبِينٌ ﴾ [الحجر: ١٦۔ ١٨] ''یقیناً ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور دیکھنے والوں کے لیے اسے سجا دیا گیا ہے اور اسے ہر مردود شیطان سے محفوظ رکھا ہے۔ ہاں مگر جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرے اس کے پیچھے دھکتا ہوا (کھلا شعلہ) لگتا ہے۔''

چنانچہ اس جگہ جو اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَحِفْظًا مِّن كُلِّ شَيْطَٰنٍ مَّارِدٍ ﴾ اس کی تقدیر یہ ہے: ''وَحَفِظْنَاهَا حِفْظًا'' یعنی ہم نے اس کو اچھی طرح محفوظ رکھا ہے، ہر سرکش اور متمرد شیطان سے، جب وہ چھپ کر سننے کا ارادہ کرتا ہے تو ایک چمکتا ہوا انگارا آتا ہے اور اس کو جلا دیتا ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ لَّا يَسَّمَّعُونَ إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ ﴾ یعنی تاکہ وہ ملائے اعلیٰ تک، یعنی آسمان میں موجود فرشتوں تک نہ پہنچ سکیں، جبکہ وہ اس شے کے بارے میں بات چیت کرتے ہیں جس کی اللہ تعالیٰ اپنی شریعت اور تقدیر میں سے وحی کرتا ہے جس طرح کہ اس کا بیان ان حدیثوں میں گزر چکا ہے جن کو ہم نے آیتِ کریمہ: ﴿ حَتَّىٰٓ إِذَا فُزِّعَ عَن قُلُوبِهِمْ ﴾ [سبا: ٢٣] کی تفسیر میں وارد کیا ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَيُقْذَفُونَ مِن كُلِّ جَانِبٍ ﴿٨﴾ دُحُورًا ﴾ یعنی پھینکے جاتے ہیں ہر طرف سے جس سے آسمان کا قصد کرتے ہیں، جس سے ہانکے جاتے ہیں اور روکے جاتے اور منع کیے جاتے ہیں، وہاں تک پہنچنے سے اور رجم کیے جاتے ہیں۔ ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ ﴾ یعنی دارِ آخرت میں ان کے لیے دائمی اور درد دینے والا عذاب ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ ﴾ مگر جو کوئی اُچک لایا شیطانوں میں سے۔ ﴿ الْخَطْفَةَ ﴾ سے مراد وہ کلمہ ہے جس کو آسمان سے سن لیتا ہے، پھر اس کو اس شیطان کی طرف ڈال دیتا ہے جو اس کے نیچے اور وہ اس کی طرف اس کا القا کرتا ہے جو اس کے تحت ہے۔ پھر کبھی تو اس کو انگارا پا لیتا ہے، اس سے پہلے کہ وہ اس کو ڈال دے اور کبھی اس کو ڈال دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اس سے قبل کہ انگارا اس کو پہنچے اور جلا ڈالے۔ پھر وہ دوسرا اس کو کاہن کی طرف لے جاتا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں گزر چکا ہے اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُۥ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴾ ''أَيْ: مُسْتَنِيْرٌ'' یعنی روشن انگارا۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آسمان میں شیطانوں کی بیٹھکیں تھیں، فرمایا: شیاطین وحی سننے کے لیے کان رکھتے تھے۔ فرمایا: اور تارے چلتے نہ تھے اور شیاطین مارے نہ جاتے تھے۔ فرمایا: جب وہ وحی سنتے تو زمین کی طرف اترتے، پھر اس میں نو کلمے بڑھاتے، یعنی ایک کلمہ تو آسمانی ہوتا اور نو کلمے اور زیادہ کر دیتے تھے۔ فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو شیطان اپنی بیٹھک میں بیٹھنے لگا تو اس کو ایک انگارا آیا جو اس سے چوکتا نہ تھا، یہاں تک کہ اسے جلا ڈالتا۔ فرمایا: پھر وہ اس کی شکایت ابلیس ۔لعنہ اللّٰہ۔ کے پاس لے گئے تو وہ بولا کہ یہ کسی ایسے معاملے کی وجہ سے ہے جو نیا ہوا ہے۔ فرمایا: پھر اس نے اپنے لشکروں کو پھیلایا تو کیا دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ فرمایا: پھر وہ ابلیس کی طرف لوٹے اور اسے خبر دی، چنانچہ اس نے کہا: یہ وہ ہے جو نیا واقعہ ہوا ہے۔[1] اس بارے میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ اور آثار سورۃ الجن کی آیت: ﴿ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا ﴾ [الجن: ٨] کے تحت مذکور ہیں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

سمائے دنیا سے مراد وہ آسمان ہے جو زمین سے متصل ہے۔ دنیا ماخوذ ہے دنو سے، دنو بہ معنی قرب ہے، چنانچہ یہ آسمان سب آسمانوں سے بڑھ کر زمین کے قریب ہے۔ جمہور نے زینت کو کواکب کی طرف مضاف کیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے سمائے دنیا کو کواکب کے ساتھ زینت دی، یعنی حسنِ کواکب کے ساتھ۔ مسروق وغیرہ (امام اعمش، نخعی اور حمزہ رحمہم اللہ) نے بہ تنوینِ "زِیْنَةٍ" اور بہ کسرۂ "اَلْکَوَاکِبِ" پڑھا ہے بنا بر بدل زینت سے اس بنیاد پر کہ زینت سے مراد اسم ہے مصدر نہیں ہے، تقدیر بعد طرح مبدل منہ کی یہ ہے: "إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِالْكَوَاكِبِ" یعنی ہم نے سمائے دنیا کو ستاروں کے ساتھ زینت دی، کیوں کہ تارے خود ایک زینتِ عظیم ہیں، اس لیے کہ اندھیری رات میں دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ایسے دکھائی دیتے ہیں، جیسے کہ نیلگوں سطح پر جواہر آب دار چمک دمک رہے ہیں۔

امام عاصم رحمہ اللہ نے ابوبکر کی روایت میں بہ تنوینِ "زِیْنَةٍ" ونصبِ "اَلْکَوَاکِبَ" پڑھا ہے، اس بنا پر کہ زینت مصدر ہے اور فاعل اس کا محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "بِأَنَّ اللّٰهَ زَيَّنَ الْكَوَاكِبَ بِكَوْنِهَا مُضِيْئَةً حَسَنَةً فِيْ أَنْفُسِهَا"[3] یعنی ہم نے دنیا کے آسمان کو اس طرح سے زینت دی کہ اللہ نے زینت دی کواکب کے ساتھ ان کے فی نفسہٖ روشن اور خوبصورت ہونے کے۔ یا "کواکب" منصوب ہے باضمارِ "أَعْنِيْ"۔ یا بدل ہے سماء سے بدلِ اشتمال۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ ہم نے سمائے دنیا کو "کواکب" کی ضوء کے ساتھ زینت دی، کیوں کہ ضوء اور نور احسن اور اکمل صفات سے ہیں، اگر یہ تارے آسمان میں موجود نہ ہوتے تو وہ غروبِ آفتاب کے وقت سخت تاریک ہوتا۔ کسی نے کہا ہے کہ زینتِ کواکب سے ان کی متناسب شکلیں ہیں، جیسے: "جوزا، بنات النعش" وغیرہ کی شکلیں۔ اس کے سوا اور اقوال بھی ہیں۔

[1] تفسير الطبري (١٢/٢١) [2] تفسير ابن كثير (٧٠٦/٤) [3] تفسير القرطبي (٦٤/١٥) فتح القدير (٥١٠/٤)

16

﴿ وَحِفْظًا ﴾ منصوب ہے اس بنا پر کہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے، "أَيْ: حَفِظْنَاهَا حِفْظًا"۔ یا مفعول لہ ہے "أَيْ: زَيَّنَّاهَا بِالْكَوَاكِبِ لِلْحِفْظِ" یا معطوف ہے ﴿ بِزِيْنَةِ ﴾ کے محل پر۔ گویا یوں کہا: "إِنَّا خَلَقْنَا الْكَوَاكِبَ زِينَةً لِلسَّمَاءِ وَحِفْظًا"۔ ﴿ مَّارِدٍ ﴾ کے معنی ہیں عاتی (حد سے بڑھنے والا)، متمرد، سرکش اور طاعت سے نکلنے والا۔ اس قسم کے شیطانوں کو تاروں سے اور انگاروں سے مارتے ہیں۔ جملہ: ﴿ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى ﴾ مستانفہ ہے، اس سے مقصود آسمان کی حفاظت کے بعد شیاطین کی حالت کا بیان ہے۔ کسی نے کہا: جواب ہے سوالِ مقدر کا۔ گویا کسی نے کہا کہ حفظِ آسمان کے بعد اُن کا کیا حال ہوا؟ تو یہ جملہ اس کا جواب ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ جملہ ﴿ كُلِّ شَيْطٰنٍ ﴾ کی صفت ہے۔

امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَا يَسَّمَّعُوْنَ ﴾ کے معنی "لِئَلَّا يَسْمَعُوا" ہیں،[1] (یعنی اصل اس کی "لئلا يسمعوا" ہے پہلا لام محذوف ہوا تو "أن لا يسمعو" باقی رہا۔ پھر "أن" حذف ہوا اور اس کا عمل باطل کیا گیا تو فعل مرفوع ہو گیا۔ پھر کلمۂ "لام" و "أن" حذف کیا گیا تو فعل مرفوع ہو گیا)، اسی طرح امام کلبی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قول میں تعسف ہے (بے راہ چلنا)۔ ایسے تعسف سے قرآن شریف کا بچانا واجب ہے، کیوں کہ "لام" اور "أن" کا الگ الگ حذف کرنا مردود نہیں ہے، لیکن یکبارگی دونوں کا حذف کر دینا منکر ہے اور "سَمِعْتُ فُلَانًا يَتَحَدَّثُ، وَسَمِعْتُ إِلَيْهِ يَتَحَدَّثُ، وَسَمِعْتُ حَدِيْثَهُ، وَسَمِعْتُ إِلٰى حَدِيْثِهِ" کے درمیان فرق ہے، جو خود متعدی ہوتا ہے وہ تو ادراک کا فائدہ دیتا ہے اور جو کلمۂ ﴿ اِلٰى ﴾ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے وہ اصغاء کا مفید ہے مع ادراک کے۔[2] انتھٰی۔

غرضیکہ جملہ مذکورہ میں کئی قول ہیں: ایک تو استیناف بیانی۔ دوسرا جواب سوالِ مقدر۔ تیسرا صفتِ شیطان۔ چوتھا یہ کہ اس سے حال ہے۔ پانچواں یہ کہ بہ تقدیر "لِئَلَّا يَسْمَعُوا" علت ہے ﴿ حِفْظًا ﴾ کی۔ امام سمین رحمہ اللہ نے ان سب قولوں کو فاسد کہا ہے اور فساد کو بیان کیا ہے۔ مختار قول یہ لکھا ہے کہ اعراب میں یہ جملہ ماقبل سے منقطع ہے۔

﴿ الْمَلَاِ الْاَعْلٰى ﴾ سے مراد اہلِ سمائے دنیا ہیں اور اس سے اوپر کے آسمانوں کے لوگ۔ ان میں سے کل کا نام اعلی رکھا بہ نسبت ملائے ارض کے، کیوں کہ وہ لوگ آسمان میں سکونت پذیر ہیں۔ ﴿ لَا يَسَّمَّعُوْنَ ﴾ کی ضمیر شیاطین کی طرف راجع ہے۔ جمہور نے بہ سکونِ سین اور تخفیفِ میم پڑھا ہے، اور امام حمزہ، کسائی اور عاصم رحمہم اللہ نے حفص کی روایت میں بہ تشدید سین و میم پڑھا ہے۔ اصل "يَتَسَمَّعُوْنَ" ہے حرفِ تاء کو سین میں ادغام کیا۔ چنانچہ پہلی قراءت تو انتفائے سماعِ شیاطین پر دال ہے نہ کہ استماع پر اور دوسری قراءت سماع و استماع دونوں کے انتفاء پر دال ہے۔ پہلی کے معنی میں یہ آیت ہے: ﴿ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴾ [الشعراء: ٢١٢] "بلکہ وہ تو سننے سے بھی محروم

[1] تفسير القرطبي (١٥/٦٥) [2] تفسير النسفي (١٧/٤)

کر دیے گئے ہیں۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ تکلف کے ساتھ سننے کے لیے کان لگاتے، لیکن سنتے نہ تھے۔ امام ابوعبید رحمہ اللہ نے دوسری قراءت پسند کی ہے، اس لیے کہ عرب لوگ ''سَمِعْتُ إِلَيْهِ'' نہیں کہتے اور ''تَسَمَّعْتُ إِلَيْهِ'' بولتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بہ تخفیف پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہ تسمع کرتے تھے، لیکن سنتے نہ تھے۔[1]

قولہ: ﴿ وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا ﴾ محاورے میں بولتے ہیں: ''دَحَرْتُهُ دَحْرًا وَّدُحُوْرًا: طَرَدْتُهُ'' پس ''دُحُوْر'' بہ معنی ''طرد'' ہے۔ نصب اس کا یا تو اس بنا پر ہے کہ مفعول لہ ہے، یا حال ہے بہ معنی ''مَدْحُوْرِيْنَ''۔ یا مفعول مطلق ہے فعل مقدر کا ''أَيْ: يُدْحَرُوْنَ دُحُوْرًا'' یا منصوب بہ نزعِ خافض ہے۔ اصل ''بِدُحُوْرٍ'' ہے، پھر حرفِ باء کو حذف کر دیا تو منصوب ہو گیا، جیسا کہ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: ''يُقْذَفُوْنَ بِمَا يَدْحَرُهُمْ أَيْ: بِدُحُوْرٍ''۔ جمہور نے ﴿ دُحُوْرًا ﴾ بہ ضمِ دال پڑھا ہے اور علی، سلمی، یعقوب حضرمی اور ابن ابی عبلہ رحمہم اللہ نے بہ فتحِ دال پڑھا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''دُحُوْر'' جمع ہے ''دَاحِرٌ'' کی، جیسے ''قَاعِدٌ'' کی جمع ''قُعُوْدٌ'' ہے، اس صورت میں حال ہو گا۔ امام ابوعمرو رحمہ اللہ سے ''يَقْذِفُوْنَ'' بہ صیغۂ معروف مروی ہے۔ یہ قراءت غیر مطابق ہے اس شے سے جو نظمِ قرآنی سے مراد ہے۔[2] معنی یہ ہیں کہ پھینکے جاتے ہیں آسمان کی جانب اور جہت سے انگاروں کے ساتھ ان کو ہانکنے کے لیے، یا اس حال میں کہ وہ ہانکے گئے ہیں، جب کہ چھپ کر سننے کے لیے چڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ آیا انگاروں سے ان کو مارنا مبعث (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے) سے پہلے تھا یا اس کے بعد۔ ایک گروہ تو اس کا قائل ہے کہ پہلے تھا اور دوسرا گروہ اس کا قائل ہے کہ بعد میں تھا اور ایک گروہ نے دونوں قولوں کو جمع کیا ہے کہ مبعث سے قبل شیاطین ایسا مارنا نہیں مارے جاتے تھے کہ سننے سے ان کو قطع کر دے، وہ ایک وقت مارے جاتے اور دوسرے وقت نہیں، اور ایک جانب سے مارے جاتے دوسری جانب سے نہیں، پھر مبعث کے بعد ہر وقت میں اور ہر جانب سے مارے گئے، یہاں تک کہ ایسے ہو گئے کہ کسی شے کے سننے پر قدرت نہیں رکھتے ہیں۔

﴿ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴾ بہ معنی دائم غیر منقطع عذاب ہے، اس سے مراد آخرت کا عذاب ہے سوائے اس عذاب کے جو دنیا میں انگارے مارنے سے ہوتا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ''دَائِمًا إِلَى النَّفْخَةِ الْأُوْلٰى'' یعنی یہ شہاب سے مارنے کا عذاب ان کے لیے پہلے نفخے تک دائم رہے گا۔ لیکن پہلا قول اولیٰ ہے۔ جمہور مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ ﴿ وَّاصِبٌ ﴾ بہ معنی دائم ہے۔ امام سدی، ابو صالح اور کلبی رحمہم اللہ نے کہا: ﴿ وَّاصِبٌ ﴾ وہ عذابِ دردناک ہے جس کا درد قلب کی طرف پہنچتا ہے، یہ ماخوذ ہے ''وَصَبٌ'' یا ''وُصُوْبٌ'' سے جس کے معنی مرض ہیں۔[3] کسی نے کہا کہ بہ معنی شدید ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/٦٥) [2] فتح القدير (٤/٥١١) [3] تفسير القرطبي (١٥/٦٦) فتح القدير (٤/٥١١)

﴿ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ ﴾ میں استثناء یا تو ﴿ لَا یَسَّمَّعُوْنَ ﴾ سے ہے یا ﴿ یُقْذَفُوْنَ ﴾ سے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ استثناء غیر وحی کی طرف راجع ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴾ [الشعراء: ۲۱۲] یعنی شیاطین سننے سے کنارے کر دیے گئے ہیں۔ بلکہ ان میں سے ایک اچک لیتا ہے کوئی کلمہ ان باتوں سے جن میں فرشتے گفتگو کرتے ہیں اور ان کے درمیان دائر ہوتے ہیں، ان امور میں سے جو زمین والوں کے جاننے سے پہلے عالم بالا میں ہوں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے۔ "خَطْفٌ" چوری سے جھپٹ لینے کو اور جلدی سے کسی شے کے لے لینے کو کہتے ہیں۔ جمہور نے "خَطِفَ" کو بہ فتحِ خاء وکسرِ طائے مخففہ پڑھا ہے اور امام قتادہ اور حسن رحمہ اللہ نے بہ کسرِ ہر دو وتشدیدِ طاء پڑھا ہے، یہ لغت تمیم بن مرہ اور بکر بن وائل کی ہے اور عیسیٰ بن عمر نے بہ فتحِ خاء وکسرِ طا مشددہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بہ کسرِ ہر دو مع تخفیفِ طاء پڑھا ہے۔[1]

﴿ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴾ یعنی پھر لاحق ہوتا ہے اس کو اور پیچھے لگتا ہے اس کے شہابِ ثاقب، یعنی نجم مضی یا مستوقد، پھر اسے جلا دیتا ہے یا مار ڈالتا ہے یا مجنون کر دیتا ہے اور کبھی اس کو ایسا نہیں کرتا تو جو بات اُچک لایا ہے، اس کو اپنے ساتھیوں کی طرف ڈال دیتا ہے۔ یہ شُہب جن سے شیطانوں کو مارتے ہیں ثوابت تاروں سے نہیں ہیں، بلکہ غیر ثوابت سے ہیں۔ اصل ثقوب کی اضاءت ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت آگ روشن ہوتی ہے تو بولتے ہیں: "ثَقَبَتِ النَّارُ تَثْقُبُ ثَقَابَةً"[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جس وقت شہابِ ثاقب پھینکا جاتا ہے تو وہ خطا نہیں کرتا، اس سے جس کو وہ مارا گیا اور یہ آیت پڑھی: ﴿ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴾ نیز فرمایا کہ وہ قتل نہیں کیے جاتے شہاب سے اور نہ وہ مرتے ہیں، لیکن وہ جلاتا ہے اور مجنون کرتا ہے اور زخمی کرتا ہے بغیر قتل کے۔[3] کہا ہے کہ مراد یہ نہیں ہے کہ وہ اجرام کواکب سے مارے جاتے ہیں، بلکہ جائز ہے کہ تاروں سے کوئی شعلہ نکلے جس سے شیطان مارا جائے اور تارے اپنے حال پر باقی رہیں۔

یہ مثل اس قبس (یعنی آگ کے انگارے) کے ہے جو آگ سے لیا جاتا ہے اور وہ اپنے حال پر رہتی ہے۔ رہی یہ بات کہ شیطان جانتا ہے کہ شہاب اسے لگے گا اور وہ اپنے مقصد کو نہ پہنچے گا، اس کے باوجود دوبارہ کیوں جاتا ہے؟ تو اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ اپنے مطلوب کو پانے کی امید اور سلامتی کا طمع رکھتے ہوئے جاتا ہے، جیسے: دریا میں سوار ہونے والا کہ کبھی غرق کا مشاہدہ کر لیتا ہے، لیکن سلامتی اور اپنا مقصد حاصل کرنے کی امید پر دوبارہ سوار ہوتا ہے۔ امام جمل رحمہ اللہ نے خازن رحمہ اللہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔[4] (كذا في فتح البيان)

---

① فتح القدير (٥١١/٤)
② تفسير القرطبي (٦٨/١٥)
③ تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٠٥/١٠) تفسير الطبري (١٩،١٨/٢١)
④ فتح البيان (٣٧٣-٣٧٠/١١)

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ
طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا
يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ
اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ﴿۱۵﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا
لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾ۙ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾ؕ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ
دَاخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ۚ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾
وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ
كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ؑ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا
كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ۙ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ
الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾

پھر آپ ان سے پوچھیے: کیا انھیں پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا جو کچھ ہم نے پیدا کیا؟ بے شک ہم نے ان (انسانوں) کو لیس دار مٹی سے پیدا کیا⑪ بلکہ آپ نے (کفار کے انکارِ آخرت پر) تعجب کیا، جبکہ وہ ٹھٹھا کرتے ہیں⑫ اور جب انھیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت قبول نہیں کرتے⑬ اور جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو خوب مذاق اُڑاتے ہیں⑭ اور وہ کہتے ہیں: یہ تو بالکل کھلا جادو ہے⑮ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہمیں سچ مچ (دوبارہ) اٹھایا جائے گا؟⑯ کیا ہمارے پہلے باپ دادوں کو بھی؟⑰ آپ کہہ دیجیے: ہاں! اور تم ذلیل و خوار ہو گے⑱ سو بس وہ (اُٹھانا) تو ایک جھڑکی ہی ہو گی، تو وہ یکا یک (زندہ ہو کر) دیکھتے ہوں گے⑲ اور وہ کہیں گے: ہائے ہماری بدبختی! یہ تو جزا کا دن ہے⑳ یہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلاتے تھے۔㉑ (اے فرشتو!) اکٹھا کرو ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا، اور ان کے جوڑوں کو اور (ان کو) جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے㉒ اللہ کے سوا، پھر انھیں دوزخ کی راہ دکھا دو㉓

حیات بعد الممات کا ثبوت:

تو تعجب کر رہا ہے اور یہ مسخرا پن، یعنی تجھ کو ان پر تعجب آتا ہے کہ کیوں ایمان نہیں لاتے اور ان کو تجھ سے ٹھٹھا

سوجھتا ہے۔ ان سب کو جمع کر کے دوزخ کی راہ دکھا دو۔ یہ فرشتوں کو حکم ہوگا کہ ان کے جوڑ کو، یعنی ان کی جوروؤں کو یا ایک قسم کے گناہ گاروں کو جہنم کی راہ دکھا دو۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تو ان بعث کے منکروں سے کہہ کہ خلق میں کون سخت تر ہے، یہ آسمان و زمین اور جو اُن کے درمیان میں ہے، یعنی فرشتے اور شیاطین اور مخلوقاتِ عظیم۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "أَمْ مَنْ عَدَدْنَا" پڑھا ہے،[1] یعنی یا وہ لوگ جن کا ہم نے شمار کیا ہے، کیوں کہ وہ اس کا اقرار کریں گے کہ یہ مخلوق پیدایش میں ان سے سخت تر ہے اور جب بات ایسی ہے تو پھر بعث کا انکار کیوں کرتے ہیں، حالاں کہ وہ اس شے کا مشاہدہ کر رہے ہیں جو اس شے سے نہایت درجہ بڑی ہے جس کا انکار کیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [المؤمن: ٥٧] ''آسمان و زمین کی پیدایش یقیناً انسان کی پیدایش سے بہت بڑا کام ہے، لیکن (یہ اور بات ہے) کہ اکثر لوگ بے علم ہیں۔''

پھر یہ بات بیان کی کہ وہ تو ایک ضعیف شے سے پیدا کیے گئے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴾ امام مجاہد، سعید بن جبیر اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا: یہ وہ عمدہ گارا ہے جس کا بعض بعض کے ساتھ چپکتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: "هُوَ اللَّزِجُ الْجَيِّدُ" یعنی عمدہ چپکتا گارا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہے جو ہاتھ سے چپکتا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے: بلکہ اے محمد! تو نے ان منکرینِ بعث کی تکذیب سے تعجب کیا اور جس عجیب امر کی اللہ تعالیٰ نے تجھے خبر دی ہے تو اس پر یقین لانے والا اور اس کی تصدیق کرنے والا ہے، یعنی جسموں کے فنا ہونے کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کرنا اور یہ لوگ تیرے امر کے خلاف اپنی شدتِ تکذیب کے مارے اس شے کے بارے میں ہنستے ہیں جو تو اُن کو کہتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تو تعجب کیا اور گمراہ لوگوں نے ہنسی کی۔[3]

﴿ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴾ یعنی جس وقت اس پر کوئی واضح دلیل دیکھتے ہیں تو ہنسی میں ڈال دیتے ہیں۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يَسْتَسْخِرُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں: "يَسْتَهْزِءُوْنَ"۔[4] ﴿ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی اور کہتے ہیں کہ نہیں ہے یہ شے جس کو تو لے کر آیا ہے مگر کھلا جادو ہے۔ ﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ بعث کو بعید سمجھتے ہیں اور اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ ﴿ قُلْ نَعَمْ

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠/٢١)
[2] تفسیر الطبري (٢١/٢١، ٢٢) تفسیر ابن کثیر (٧/٤)
[3] تفسیر الطبري (٢٣/٢١)
[4] تفسیر الطبري (٢٤/٢١)

﴿ وَاَنْتُمْ دٰخِرُوْنَ ﴾ یعنی اے محمد! تو اُن سے کہہ: ہاں، تم اٹھائے جاؤ گے قیامت کے دن اس کے بعد کہ تم مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے اور قدرتِ عظیم کے تحت تم ذلیل وحقیر ہو گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴾ [النمل: ۸۷] ''اور سارے کے سارے عاجز و پست ہو کر اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''یقین مانو کہ جو لوگ میری عبادت سے خودسری کرتے ہیں، وہ ابھی ابھی ذلیل ہو کر جہنم میں پہنچ جائیں گے۔''

قیامت کی ہولناکیوں کا بیان:

پھر فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴾ یعنی وہ تو صرف ایک امر ہے اللہ عزوجل کی طرف سے کہ ان کو ایک پکار دے گا کہ وہ زمین سے نکلیں تو وہ اسی دم اس کے روبرو کھڑے ہوئے قیامت کی ہولناکیوں کو دیکھتے ہوں گے۔ ﴿ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿٢٠﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ کفار قیامت کے دن ملامت کرنے کے لیے اپنی جانوں پر لوٹ پڑیں گے اور اس بات کا اقرار کریں گے کہ دارِ دنیا میں وہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

پھر جب قیامت کی ہولناکیوں کا معائنہ کریں گے تو انتہائی پشیمان ہوں گے، ایسی جگہ کہ ان کو پشیمانی کچھ فائدہ نہ دے گی اور کہیں گے: اے ہماری خرابی! یہ ہے دن جزا کا، تو فرشتے اور مومنین ان سے کہیں گے: یہ فیصلے کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے، یہ بات ان سے ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر کہی جائے گی اور اللہ پاک فرشتوں کو حکم دے گا کہ کافروں کو مومنوں سے ان کے موقف میں اور محشر اور منشر میں الگ کر دیں۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴾ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ وَاَزْوَاجَهُمْ ﴾ سے مراد ان کے مشابہ اور اُن جیسے اور لوگ ہیں۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد، سدی، ابو صالح، ابو العالیہ اور زید بن اسلم رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔

سفیان ثوری نے عن سماک عن النعمان بن بشیر عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، فرمایا کہ اس سے مراد ''إِخْوَانَهُمْ'' ہے۔ اور شریک نے عن سماک عن النعمان روایت کیا ہے، کہا: میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو سنا کہ اس کی تفسیر میں فرماتے تھے کہ ''أَشْبَاهَهُمْ''، فرمایا کہ زنا والے زنا والوں کے ساتھ آئیں گے اور سود والے سود والوں کے ہمراہ اور شراب والے شراب والوں کے ساتھ۔ خصیف نے عن مقسم عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ ﴿ اَزْوَاجَهُمْ ﴾ ''أَيْ: نِسَاءَهُمْ'' یعنی ازواج سے مراد ان کی عورتیں ہیں۔ یہ قول غریب ہے۔ ان سے معروف ومشہور قول قولِ اول ہے، جیسا کہ امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ نے ان سے روایت کیا ہے کہ ﴿ اَزْوَاجَهُمْ ﴾ ''قُرَنَاءَهُمْ''.[1] ﴿ وَمَا كَانُوْا

[1] تفسير الطبري (۲۱/ ۲۷-۲۸) تفسير ابن كثير (٤/ ٨)

يَعْبُدُوْنَ ﴿٢٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ یعنی بت اور شریک ان کی جگہوں میں ان کے ساتھ حشر کیے جائیں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴾ یعنی ان کو جہنم کی راہ بتاؤ۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے:
﴿ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٧] ''ایسے لوگوں کا ہم بروزِ قیامت اوندھے منہ حشر کریں گے، درآں حالیکہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ جب کبھی وہ بجھنے لگے گی ہم ان پر اسے اور بھڑکا دیں گے۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اب تو منکرینِ بعث کفار سے پوچھ، کیا وہ سخت تر ہیں خلق میں اور زیادہ قوی ہیں جسموں میں اور زیادہ بزرگ ہیں اعضاء میں اور زیادہ مضبوط ہیں بنیان میں اور زیادہ مشقت والے ہیں ایجاد میں اور زیادہ مشکل ہیں بنانے میں یا وہ جن کو ہم نے بنایا ہے آسمان اور زمین اور پہاڑ اور ملائکہ وغیرہ۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں تو اُن سے پوچھ پوچھنا تقریر کا، کیا وہ بناوٹ میں زیادہ مضبوط ہیں یا وہ اگلی اُمتیں جن کو ہم نے ان سے پہلے بنایا۔[2] مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے سوا اور اُمتوں سے پیدایش کے لحاظ سے زیادہ محکم اور مضبوط نہیں ہیں، حالاں کہ ہم نے ان کو تکذیب کے سبب سے ہلاک کر دیا ہے۔ پھر وہ کون سی چیز ہے جو اُن کو عذاب سے بے خوف کر رہی ہے۔

جمہور نے ﴿ اَمْ مَّنْ ﴾ بہ تشدیدِ میم پڑھا ہے یہ ﴿ اَمْ ﴾ متصلہ ہے، اس نے ﴿ مَنْ ﴾ کا عطف کیا ہے ضمیر ''هُمْ'' پر اور امام اعمش رحمہ اللہ نے ''أَمَن'' بہ تخفیفِ میم پڑھا ہے۔ ان کی قراءت پر یہ دوسرا استفہام ہے۔[3] کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ مبتداء ہے اس کی خبر محذوف ہے: ''أَيْ: اَلَّذِيْنَ خَلَقْنَاهُمْ أَشَدُّ''، یعنی کیا وہ لوگ جن کو ہم نے پیدا کیا ہے سخت تر ہیں، چنانچہ یہ دونوں جملے مستقل ہیں۔ عاقل کو غیر عاقل پر غلبہ دیا ہے، اسی لیے کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ کا ذکر کیا ہے۔ (كذا قال السمين) کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ اس جگہ کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ سے جدا لکھا جاتا ہے۔

پھر اللہ پاک نے انسان کی پیدایش کا ذکر کیا، فرمایا: ﴿ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴾ یعنی ہم نے ان کے باپ آدم کی ضمنِ خلق میں ان کو چپکتے گارے سے پیدا کیا۔ ﴿ لَّازِبٍ ﴾ بہ معنی ''لَاصِق'' ہے۔ جب کوئی شے کسی شے سے چپکتی ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: ''لَزَبَ يَلْزُبُ لُزُوْبًا''۔ باب اس کا ''دَخَلَ'' ہے۔ امام قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ''لَازِبٌ'' ''لَاصِقٌ'' ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''لَزِج'' امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''اَلْجَيِّدُ الَّذِيْ يُلْصَقُ بِالْيَدِ''، یعنی عمدہ گارا جو ہاتھ سے چپکتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''لَازِمٌ''، عرب لوگ ''طِيْنٌ لَازِبٌ وَلَازِمٌ'' دونوں طرح بولتے ہیں۔ ''صَارَ الشَّيْءُ ضَرْبَةَ لَازِبٍ''، یعنی فلاں شے ثابت ہوگئی۔ اسی معنی سے نابغہ کا قول ہے:

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٨٠٧/٤) [2] معاني القرآن (٢٩٩/٤) [3] اللباب في علوم الكتاب (٢٨٤/١٦)

لَا تَحْسَبُوْنَ الْخَيْرَ لَا شَرَّ بَعْدَهُ   وَلَا تَحْسَبُوْنَ الشَّرَّ ضَرْبَةَ لَازِبِ

امام فراء رحمہ اللہ نے عرب سے ﴿ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴾ بیان کیا ہے بہ معنی "لَازِمٌ" اور "لَاتِبٌ"، بہ معنی "ثَابِتٌ" ہے۔ اصمعی نے کہا لاتب، لاصق ہے مثل لازب کے۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا ﴿ لَّازِبٍ ﴾ بہ معنی "مُنْتِن" ہے[1] یعنی بدبودار، کہا ہے کہ "لَازِمٌ وَلَاتِبٌ" پڑھا گیا ہے، مگر معلوم نہیں کس نے یوں پڑھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ "لَازِبٌ"، "مُلْتَصِقٌ"۔ دوسرا "لَزِجٌ جَيِّدٌ"۔ تیسرا یہ ہے کہ "لَازِبٌ"، "حَمَأٌ" اور "طِيْنٌ" ایک ہیں، اول اس کا تو خاک تھا، پھر سیاہ بدبودار ہوا، پھر چپکتا گارا ہوگیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے آدم علیہ السلام کو بنایا۔[2] معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ معاد کو کس طرح بعید جانتے ہیں، حالاں کہ یہ تو اس ضعیف خلق سے بنائے گئے ہیں اور جو اُن سے خلق میں زیادہ قوی، زیادہ عظیم اور زیادہ باکمال اور مکمل ہے، اس نے اس کا انکار نہیں کیا۔ یہ آیت ان پر ضعف کی شہادت دیتی ہے، کیوں کہ جو شے گارے سے بنائی جاتی ہے، وہ موصوف بہ صلابت وقوت نہیں ہوتی۔ یا ان پر حجت ہے، اس طرح سے کہ جو ﴿ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴾ جس سے وہ بنائے گئے وہ مٹی ہے۔ پھر اسی کے مثل مٹی سے پیدا کیے جانے کو کہاں سے اوپرا سمجھا، جبکہ یوں کہا: ﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴾ اس معنی کی تائید ان کا انکارِ بعث کرتا ہے جس کا ذکر بعد میں آتا ہے۔ اس سیاق سے غرض قیامت کا اثبات ہے اور اس کے محال ہونے کا جو وہ دعویٰ کرتے ہیں اس میں ان کی تردید ہے۔

پھر اللہ پاک نے کلامِ سابق سے ہٹ کر ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴾ یعنی اے محمد! بلکہ تو نے تعجب کیا اور اللہ کی قدرت سے یا ان کے تجھ کو جھٹلانے سے اور یہ لوگ اپنی جہالت کے مارے اس سے ہنسی کرتے ہیں۔ حرفِ واو حالیہ ہے یا استیناف کا۔ معنی یہ ہیں کہ وہ تیرے تعجب کی وجہ سے تجھ سے ہنسی کرتے ہیں، یا قیامت کے اثبات کے بارے میں جو تو دعویٰ کرتا ہے اس کے سبب سے وہ تجھ سے ہنسی کرتے ہیں۔ جمہور نے بہ فتحِ تائے ﴿ عَجِبْتَ ﴾ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ اور امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے بہ ضمِ تا بہ صیغۂ متکلم پڑھا ہے۔ یہ قراءت سیدنا علی، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے اور اسی کو امام ابو عبید اور فراء رحمہما اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگوں نے اس کو بہ فتح وضم پڑھا ہے اور بہ ضم مجھ کو زیادہ تر محبوب ہے، کیوں کہ اصحابِ مذکورین سے مروی ہے۔ کہا: "عجب" کی نسبت اگر اللہ پاک کی طرف کی جائے تو اس کے معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ویسے نہیں ہوتے، جیسے کہ اس کے معنی بندوں کی طرف سے ہوتے ہیں۔

امام ہروی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض ائمہ نے کہا ہے: "بَلْ عَجِبْتُ" کے معنی "بَلْ جَازَيْتُهُمْ عَلٰى عَجَبِهِمْ" ہیں، کیوں کہ اللہ پاک نے کئی جگہ اُن کی طرف سے تعجب کی خبر دی ہے، چنانچہ فرمایا ہے: ﴿ وَعَجِبُوْٓا اَنْ

---

[1] تفسیر القرطبي (٦٩/١٥) فتح القدير (٥١٢/٤)   [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٠٦/١٠)

﴿ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ﴾ [صٓ: ٤] ''اور کافروں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک انھیں ڈرانے والا آ گیا۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ [صٓ: ٥] ''واقعی یہ بہت عجیب بات ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ ﴾ [یونس: ٢] ''کیا ان لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیج دی۔'' پس معنی یہ ہوئے کہ کفار نے جو اُمورِ مذکورہ سے تعجب کیا، میں اس تعجب کا ان کو بدلہ دوں گا۔ علی بن سلیمان رحمہ اللہ نے کہا: دونوں قراءتوں کے ایک معنی ہیں۔ تقدیر یہ ہے: ''قُلْ يَا مُحَمَّدُ بَلْ عَجِبْتُ'' کیوں کہ نبی اکرم ﷺ قرآن کے ساتھ مخاطب ہیں۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول خوب ہے اور قول کی تقدیر بہت ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے جو خود اپنی طرف سے تعجب کی خبر دی اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے امر وسخط (غصہ) سے اس کے منکروں پر وہ شے ظاہر ہوئی جو مخلوق کی طرف سے عجب کے قائم مقام ہے۔ امام ہروی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''عَجِبَ رَبُّكُمْ'' کے یہ معنی ہیں: ''رَضِيَ رَبُّكُمْ وَأَثَابَ'' یعنی تمھارا رب راضی ہوا اور ثواب دیا، چنانچہ اس کا نام عجب رکھ دیا ہے، حالاں کہ حقیقت میں عجب نہیں ہے، چنانچہ اس جگہ ﴿ عَجِبْتَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ''عَظُمَ فِعْلُهُمْ عِنْدِيْ'' یعنی میرے نزدیک ان کا فعل بڑا ہوا۔ امام نقاش رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے کہ ﴿ بَلْ عَجِبْتَ ﴾ کے معنی ''بَلْ أَنْكَرْتَ'' ہیں۔ حسن بن فضل نے کہا ہے کہ تعجب اللہ کی طرف سے انکار اور تعظیم شے ہے اور یہ عرب کی لغت ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی انکار اور مذمت ہیں۔

امام جنید رحمہ اللہ سے کسی نے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی شے سے تعجب نہیں کرتا لیکن اس نے اپنے رسول کی موافقت کی اور جب اس کے رسول نے تعجب کیا تو فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ﴾ [الرعد: ٥] ''اگر تجھے تعجب ہو تو واقعی ان کا یہ کہنا عجیب ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی پیدایش میں ہوں گے۔'' یعنی وہ ویسا ہی ہے جیسا تو کہتا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک اپنی کمال قدرت اور کثرتِ مخلوقات میں وہاں تک پہنچا کہ اس سے تعجب کیا اور یہ لوگ اپنی نادانی کے مارے اس سے ہنسی کرتے ہیں۔

﴿ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴾ یعنی جس وقت وہ اللہ تعالیٰ کے وعظ اور نبی ﷺ کی نصیحتوں میں سے کسی موعظت کے ساتھ وعظ کیے جاتے ہیں تو اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتے اور نہ ہی جو کچھ اس میں ہے اس سے فائدہ لیتے ہیں۔ امام سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگلے جھٹلانے والوں پر جو عذاب اور بلا نازل ہوئی ہے، جب اس کا ذکر اُن سے کیا جاتا ہے تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور سوچتے نہیں۔[3] ﴿ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴾ کے

---

① تفسیر القرطبي (٦٩/١٥، ٧٠) فتح القدير (٥١٢/٤، ٥١٣) ② تفسير البغوي (٣٦/٧) ③ فتح القدير (٥١٣/٤)

یہ معنی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں سے کوئی معجزہ دیکھتے ہیں، جیسے: چاند کا پھٹنا تو ہنسی میں مبالغہ کرتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "یَسْتَسْخِرُوْنَ" یعنی ہنستے ہیں اور کہتے کہ وہ ایک سحر یہ ہے۔[1] یعنی مذاق ہے۔ محاورے میں "سَخِرَ وَاسْتَسْخَرَ" بیک معنی آتا ہے، جیسے "قَرَّ واسْتقرَّ وَعَجِبَ وَاسْتَعْجَبَ"، لیکن قولِ اول اولیٰ ہے، یعنی بہ نسبت "سَخِرَ" کے "اِسْتَسْخَرَ" میں "سُخْرِیه" کا مبالغہ ہے، کیوں کہ بنا کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دال ہوتی ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اپنے غیر سے سحر یہ کے طالب ہوتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ "یَسْتَهْزِءُوْنَ" کے معنی میں ہے۔[2]

﴿ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی نہیں ہے یہ جس کو تو ہمارے پاس لاتا ہے مگر واضح اور ظاہر جادو ہے۔ ﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴾ استفہام انکار کا ہے: "أَيْ: أَنُبْعَثُ إِذَا مِتْنَا" یعنی کیا ہم اٹھائے جائیں گے جب کہ مر چکے۔ کلمۂ ﴿ اِذَا ﴾ میں عامل "أَنُبْعَثُ" ہے جس پر ﴿ ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴾ دال ہے، خود "مَبْعُوْثُوْنَ" عامل نہیں ہے۔ اس لیے کہ درمیان میں وہ شے آگئی ہے جو اس کو منع کرتی ہے "إِذَا" میں عمل کرنے سے۔ کفار نے جملہ فعلیہ کو اسمیہ سے بدلا اور ظرف کو مقدم کیا اور ہمزہ کو مکرر لائے تاکہ انکار میں مبالغہ ہو۔ اور یہ بات بتانے کے لیے کہ بعث فی نفسہ ایک اوپری بات ہے اور اس حالت میں تو نہایت درجہ اوپری شے ہے۔ یہ بعث کا انکار جو ان سے صادر ہوا یہی وہ سبب ہے جس کی وجہ سے انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور جو کچھ بلا ان پر نازل ہوئی اور جو معجزے وہ لائے ان پر مذاق کیا۔ اس آیت کے معنی کی تفسیر کئی جگہ گزر چکی ہے۔

﴿ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴾ مبتداء ہے اس کی خبر محذوف ہے: "أَيْ: مَبْعُوْثُوْنَ" یعنی کیا ہمارے باپ دادے اٹھائے جائیں گے؟ مطلب یہ کہ وہ تو بڑے پرانے ہیں، ان کا اٹھانا تو اور بھی زیادہ بعید اور باطل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "إِنَّ" اور اس کے اسم پر معطوف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "مَبْعُوْثُوْنَ" میں جو ضمیر ہے اس پر معطوف ہے، اس لیے ان کے درمیان فصل واقع ہوگئی ہے اور ہمزہ انکار کا ہے حرفِ عطف پر داخل ہوا ہے۔ اسی لیے جمہور نے بہ فتحِ واؤ پڑھا ہے اور امام نافع، ابن عامر اور قالون نے بہ سکونِ واؤ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "أَوْ" عاطفہ ہے اور ہمزہ استفہام کا نہیں ہے۔[3]

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول کو حکم فرمایا کہ ان کے ڈانٹنے کے لیے یہ جواب دیں: ﴿ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دٰخِرُوْنَ ﴾ یہ جملہ حال ہے "مَبْعُوْثُوْنَ" کے نائب فاعل سے جس پر ﴿ نَعَمْ ﴾ دال ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "دُخُوْر" بہت زیادہ ذلت کو کہتے ہیں[4] اور خطاب ان کو اور ان کے آباء کو ہے بہ طریقِ تغلیب، یعنی ہاں تم

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۲٤) [2] تفسیر الطبري (۲۱/۲٤) [3] فتح القدیر (٤/٥١٣) [4] فتح القدیر (٤/٥١٣)

سب کے سب اٹھائے جاؤ گے، اس حال میں کہ تم نہایت درجہ ذلیل اور حقیر ہوگے۔ پھر اللہ پاک نے ذکر کیا کہ ان کا اٹھانا تو زجرۂ واحدہ سے ہوگا، چنانچہ فرمایا ﴿ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴾ یہ جملہ جواب ہے شرط مقدر کا، یا علت ہے نہی مقدر کی اور ضمیر قصہ کی ہے، یا راجع ہے طرف بعث کے جو ماقبل سے معلوم ہوتا ہے، یعنی جب امر ایسا ہوگا تو قصہ بعث کا یا بعث صرف ایک جھڑکی ہوگی، یا تم بعث کو مشکل نہ سمجھو اس لیے کہ وہ تو صرف ایک چیخ ہوگی اسرافیل کی جو بعث کے وقت صور میں پھونک دے گا۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: مراد نفخۂ ثانیہ ہے۔[1] "صَیْحَة" کا نام زجرۃ اس لیے رکھا ہے کہ مقصود اس سے زجر ہے، ماخوذ ہے اس محاورے سے کہ جس وقت چرواہا اونٹوں پر یا بکریوں پر چیختا ہے تو اس وقت یوں بولتے ہیں "زَجَرَ الرَّاعِيُ الْإِبِلَ أَوِ الْغَنَمَ" ﴿ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴾ یعنی جب بعث کا زجرہ ہو گا، تو اسی دم وہ زندہ اور دیکھتے ہوں گے، اپنے بد اعمال پر نظر کرتے ہوں گے۔ کسی نے کہا کہ ﴿ يَنْظُرُوْنَ ﴾ بہ معنی "يَنْتَظِرُوْنَ" ہے، یعنی انتظار کرتے ہوں گے اس معاملے کا جو اُن کے ساتھ کیا جائے گا، یعنی عذاب کا، لیکن قولِ اول اولیٰ ہے اور یہ مبعوثین جب بعث کا معائنہ کریں گے، جس کی دنیا میں تکذیب کیا کرتے تھے تو کہیں گے: ﴿ يٰوَيْلَنَا ﴾ یعنی اپنی جانوں پر ویل پکاریں گے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "وَيْلٌ" ایک کلمہ ہے جس کو کہنے والا ہلاکت کے وقت کہتا ہے۔[2] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصل اس کی "يَا وَيْ لَنَا" ہے۔ "وَيْ" بہ معنی حزن ہے۔ گویا یوں کہا: "يَا حُزْنَ لَنَا" یعنی اے رنج وغم واسطے ہمارے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: اگر ویسا ہوتا، جیسا کہ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا تو وہ منفصل ہوتا، حالاں کہ مصحف میں متصل ہے، ہم نہیں جانتے کہ کوئی اس کو لکھے، مگر متصل[3] اور وقف اس جگہ تام ہے۔ اس لیے کہ اس کے ما بعد مستقل کلام ہے، جیسا کہ امام محلی رحمہ اللہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ فرشتے ان سے کہیں گے: ﴿ هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴾[4] یا یہ جملہ تعلیل ہے ان کے ویل پکارنے کی اور ﴿ الدِّيْنَ ﴾ بہ معنی جزا ہے۔ گویا انھوں نے کہا: اے ہماری خرابی! تو آ یہ تیرا وقت ہے، اس لیے کہ یہ وہ دن ہے جس میں ہم اپنے اعمالِ کفر اور تکذیبِ رسل کی جزا دیے جائیں گے۔ چنانچہ فرشتے ان کو جواب دیں گے کہ ﴿ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ یہ بھی جائز ہے کہ کفار کے قول سے ہو جو بعض بعض سے کہیں گے۔ "فصل" بہ معنی حکم وقضا ہے۔ اس لیے کہ اس میں فیصلہ کیا جائے گا نیک اور بد کے درمیان۔

﴿ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ ﴾ یہ اللہ پاک کی طرف سے فرشتوں کو حکم ہے کہ جمع کریں مشرکوں کو اور ان کے ازواج کو۔ یا خود فرشتے ایک دوسرے کو خطاب کریں گے ظالموں کو جمع کرنے کے لیے ان کے مقام سے موقف کی طرف۔ کسی نے کہا ہے کہ موقف سے دوزخ کی طرف۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ

---

[1] تفسير القرطبي (٧٢/١٥) [2] معاني القرآن (٣٠١/٤) [3] تفسير القرطبي (٧٢/١٥) [4] تفسير الجلالين (٥٨٨/١)

بات فرشتے زبانیہ سے کہیں گے۔[1] "أَزْوَاجٌ" سے مراد شرک میں ان کے مشابہ اور مماثل ہیں اور کفر میں ان کے تابع اور پیرو ہیں جو تکذیبِ رسل میں اُن کی پیروی کیا کرتے تھے۔ امام قتادہ اور ابو العالیہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام حسن اور مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَزْوَاجٌ" سے مراد ان کی مشرک بیویاں ہیں جو ظلم اور کفر میں ان کے موافق تھیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد شیطانوں میں سے ان کے ساتھی ہیں، ہر کافر اپنے شیطان کے ساتھ حشر کیا جائے گا۔

امام مقاتل رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں، یہ تین قول ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بھی پہلے قول کی طرح مروی ہے، فرمایا کہ ان کے امثال جو ان جیسے ہیں، آئیں گے۔ سود والے سود والوں کے ساتھ، زنا والے زنا والوں کے ساتھ اور شراب والے شراب والوں کے ساتھ۔ جنت میں بھی مختلف قسم کے لوگ ہیں اور آگ میں مختلف قسمیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ "أَشْبَاهَهُمْ" اور "نُظَرَاءَهُمْ" ہیں[2] یعنی گناہ گاروں میں سے ان کی نظیر۔ بت پرست بت پرستوں کے ساتھ، ستارہ پرست ستارہ پرستوں کے ہمراہ۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴾ [الواقعة: ۷] "اور تم تین جماعتوں میں ہو جاؤ گے۔"

اس سے کوئی مانع نہیں ہے کہ آیت سب قولوں پر محمول ہو: ﴿ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿٢٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ یعنی اور جمع کرو اس شے کو جس کو وہ پوجتے تھے، اللہ کے سوا بتوں اور شیطانوں وغیرہ سے۔ یہ عموم، جو مائے موصولہ سے معلوم ہوتا ہے کیوں کہ مراد معبود ہیں عابد نہیں ہیں، جیسا کہ کہا گیا ہے، مخصوص ہے اس لیے کہ کفار کے طائفوں میں سے کسی نے تو مسیح علیہ السلام کو پوجا ہے اور کسی نے فرشتوں کو، چنانچہ یہ لوگ اس عموم سے اس آیت کے سبب سے خارج ہوں گے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى اُولٰٓىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ۱۰۱] "البتہ بے شک جن کے لیے ہماری طرف سے نیکی پہلے ہی ٹھہر چکی ہے، وہ سب جہنم سے دور ہی رکھے جائیں گے۔"

بتوں کے حشر کرنے کی وجہ باوجود اس کے کہ وہ جماد ہیں عقل نہیں رکھتے، یہ ہے کہ منظور اُن کی عبادت کرنے والوں کو ڈانٹنا اور دھمکی دینا ہے اور ان کو ذلیل کرنا ہے اور اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ وہ نفع دیتے ہیں نہ ضرر۔ کسی نے کہا ہے کہ موصول عبارت ہے مشرکوں سے، اس کو خاص طور پر تعلیلِ حکم کے لیے لائے ہیں اس شے کے ساتھ جو اس کے صلے کے تحت میں ہے، چنانچہ نہ عموم ہے نہ تخصیص ہے۔ ﴿ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴾ یعنی ان محشورین کو آگ کا راستہ بتاؤ اور ان کو اس کی طرف ہانکو۔ محاورے میں بولتے ہیں: "هَدَيْتُهُ الطَّرِيْقَ وَهَدَيْتُهُ إِلَيْهَا، أَيْ: دَلَلْتُهُ عَلَيْهَا" اس میں ان کے ساتھ تہکم (مذاق) ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "وَجِّهُوْهُمْ وَدُلُّوْهُمْ إِلٰى طَرِيْقِ النَّارِ"[3] یعنی ان کو متوجہ کرو اور ان کو آگ کی راہ بتاؤ۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳۲۰۷/۱۰) [2] تفسير القرطبي (۷۳/۱۵) فتح القدير (۵۱۵/٤)

[3] تفسير الطبري (۲۹/۲۱) تفسير ابن أبي حاتم (۳۲۰۸/۱۰) فتح البيان (۳۷۳/۱۱-۳۷۹)

وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿24﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿25﴾
بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿26﴾ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ
يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿27﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿28﴾ قَالُوْا
بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿29﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ
بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿30﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿31﴾
فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿32﴾ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ
مُشْتَرِكُوْنَ ﴿33﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿34﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا
اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿35﴾ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا
لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ﴿36﴾ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿37﴾

اور انھیں ٹھہراؤ، بلاشبہ ان سے باز پرس کی جائے گی﴿24﴾ (کہا جائے گا:) تمھیں کیا ہوا، تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟﴿25﴾ بلکہ آج وہ (سب) فرماں بردار ہیں﴿26﴾ اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باہم پوچھیں گے﴿27﴾ کہیں گے: بے شک تم تو ہمارے پاس دائیں (اور بائیں) طرف سے آیا کرتے تھے﴿28﴾ وہ کہیں گے: (نہیں!) بلکہ تم خود ہی ایمان لانے والے نہیں تھے﴿29﴾ اور تم پر ہمارا کوئی زور نہیں تھا، بلکہ تم خود ہی سرکشی کرنے والے تھے﴿30﴾ پھر ہم (سب) پر ہمارے رب کی بات ثابت ہو گئی، بے شک ہم (سب ہی عذاب کا مزہ) چکھنے والے ہیں﴿31﴾ چناں چہ ہم نے تمھیں گمراہ کیا، بلاشبہ ہم خود بھی گمراہ تھے﴿32﴾ چناں چہ یقیناً وہ اس دن عذاب میں مشترک ہوں گے﴿33﴾ بے شک ہم مجرموں سے ایسا ہی (سلوک) کرتے ہیں﴿34﴾ بے شک جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو وہ تکبر کرتے تھے﴿35﴾ اور کہتے: کیا بھلا ہم اپنے معبودوں کو ایک دیوانے شاعر کے کہنے پر چھوڑ دیں؟﴿36﴾ بلکہ وہ تو حق لایا ہے اور اس نے (سب) رسولوں کی تصدیق کی ہے﴿37﴾

روزِ قیامت مشرکین کی باز پرس اور ان کی بے بسی:

ان کو ٹھہرا لو، یعنی حکم کے بعد ٹھہرا کر آپس میں لڑا دیں گے۔ تم تو ہمارے پاس ہماری دائیں طرف سے آتے

تھے، یعنی ہم پر چڑھے آتے تھے، تاکہ زور سے اور رُعب سے ہمیں بہکاؤ۔ داہنا ہاتھ زور کا ہوتا ہے۔ ہمارے رب کی بات ثابت ہو چکی، یعنی ﴿ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكَ وَمِمَّنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴾ [صٓ: ۸۵] ''کہ تجھ سے اور تیرے تمام ماننے والوں سے میں (جہنم) کو بھر دوں گا۔'' انتھٰی.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ مَّسۡـُٔوۡلُوۡنَۙ ﴾ یعنی ان کو ٹھہراؤ، یہاں تک کہ وہ اپنے اقوال اور اعمال کے بارے میں پوچھے جائیں، جو دنیا میں اُن سے صادر ہوئے، جیسا کہ امام ضحاک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "أَيْ: اِحْبِسُوْهُمْ إِنَّهُمْ مُحَاسَبُوْنَ"[1] یعنی ان کو روکو ان سے حساب لیا جائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بلانے والا خواہ اس نے کسی شے کی طرف بلایا ہو گا، وہ قیامت کے دن ٹھہرایا ہوا ہو گا، اس کے ساتھ نہ وہ اسے چھوڑے گا نہ اس سے علاحدہ ہو گا، اگرچہ ایک مرد نے ایک ہی مرد کو بلایا ہو، پھر آیتِ مذکور پڑھی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو لیث بن ابی سلیم سے مروی حدیث سے روایت کیا ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن رجل عن انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کیا ہے۔[2] عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے کہا: میں نے عثمان بن زائدہ کو سنا، وہ کہتے تھے کہ سب سے پہلے مرد کو جس کے بارے میں پوچھا جائے گا، وہ اس کے ہم نشین ہیں۔[3]

پھر ان سے ملامت اور سرزنش کے طور پر کہا جائے گا: ﴿ مَا لَكُمۡ لَا تَنَاصَرُوۡنَ ﴾ یعنی جیسا تم نے زعم کیا تھا کہ تم سب منتصر ہو۔ ﴿ بَلۡ هُمُ الۡيَوۡمَ مُسۡتَسۡلِمُوۡنَ ﴾ یعنی بلکہ وہ آج کے دن اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطیع اور فرماں بردار ہیں، نہ اس کی مخالفت کریں گے نہ اس سے بھاگیں گے۔ واللّٰہ أعلم.

قیامت کے روز مشرکوں کا باہم جھگڑا:

﴿ وَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَسَآءَلُوۡنَ ﴾ اللہ پاک ذکر فرماتا ہے کہ کفار عرصاتِ قیامت میں ایک دوسرے کو ملامت کریں گے جس طرح کہ آگ کے مختلف طبقوں میں جھگڑیں گے۔ ﴿ فَيَقُوۡلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡۤا اِنَّا كُنَّا لَـكُمۡ تَبَعًا فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا نَصِيۡبًا مِّنَ النَّارِ ۞ قَالَ الَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡۤا اِنَّا كُلٌّ فِيۡهَاۤ اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ حَكَمَ بَيۡنَ الۡعِبَادِ ﴾ [المؤمن: ٤٧۔٤٨] ''کمزور لوگ تکبر والوں سے (جن کے یہ تابع تھے) کہیں گے کہ ہم تو تمھارے پیرو تھے تو کیا اب تم ہم سے اس آگ کا کوئی حصہ ہٹا سکتے ہو؟ وہ بڑے لوگ جواب دیں گے ہم

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲۰۸/۱۰)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳۲۲۸) تفسیر الطبري (۳۰/۲۱) اس کی سند میں ''بشر'' راوی مجہول اور ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ۵۱۷۰)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲۰۸/۱۰)

تو سبھی اس آگ میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلے کر چکا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [سبا: ۳۱۔ ۳۳] ''اے دیکھنے والے! کاش کہ تو ان ظالموں کو اس وقت دیکھتا جبکہ یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو الزام دے رہے ہوں گے، کمزور لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے: اگر تم نہ ہوتے تو ہم تو مومن ہوتے۔ یہ بڑے لوگ ان کمزوروں کو جواب دیں گے کہ کیا تمھارے پاس ہدایت آچکنے کے بعد ہم نے تمھیں اس سے روکا تھا؟ (نہیں) بلکہ تم (خود) ہی مجرم تھے۔ (اس کے جواب میں) یہ کمزور لوگ ان متکبروں سے کہیں گے، (نہیں نہیں) بلکہ دن رات مکروفریب سے ہمیں اللہ کے ساتھ کفر کرنے اور اس کے شریک کرنے کا تمھارا حکم دینا ہماری بے ایمانی کا باعث ہوا، اور عذاب کو دیکھتے ہی سب کے سب دل میں پشیمان ہو رہے ہوں گے، اور کافروں کی گردنوں میں ہم طوق ڈال دیں گے، انھیں صرف ان کے کیے کرائے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔''

اسی طرح یہاں بھی ضعفاء نے متکبرون سے یہ کہا: ﴿ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴾۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ضعفاء کہتے ہیں کہ تم ہم کو اپنی قدرت سے دباتے تھے، جو تم کو ہم پر حاصل تھی، کیوں کہ ہم تو ذلیل اور دبے ہوئے تھے اور تم عزیز اور غالب۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''يَعْنِي عَنِ الْحَقِّ، وَالْكُفَّارُ تَقُوْلُهُ لِلشَّيَاطِيْنِ'' مطلب یہ ہے کہ کافر شیاطین سے کہتے ہیں کہ تم ہم کو حق سے منع کرتے تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدمیوں نے جنوں سے کہا کہ تم ہمارے پاس خیر کی جانب سے آتے تھے۔ چنانچہ ہم کو اس سے روکتے تھے اور سست کرتے تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم حق کی جانب سے آتے تھے اور باطل کو ہمارے لیے اچھا کر کے دکھاتے تھے اور حق سے ہم کو باز رکھتے تھے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ''أَيْ: وَاللّٰهِ يَأْتِيهِ عِنْدَ كُلِّ خَيْرٍ يُرِيْدُهُ فَيَصُدُّهُ عَنْهُ'' امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم ہمارے اور خیر کے درمیان حائل ہوتے تھے۔ اور تم نے ہم کو اسلام سے اور ایمان سے اور خیر کے عمل کرنے سے پھیرا، جس کا ہم کو حکم کیا گیا تھا۔ یزید رشک نے کہا: ''مِنْ قِبَلِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' یعنی تم لا الہ الا اللہ کی طرف سے آتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے ہم کو روکتے تھے۔ خصیف نے کہا: ''مِنْ قِبَلِ مَيَامِنِهِمْ''۔

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ایسی جگہ سے کہ ہم تم کو امین جانتے تھے۔[1] ﴿ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جن و انس کے سردار اپنے فرماں برداروں سے کہیں گے کہ بات ویسی نہیں ہے جو تم خیال کرتے ہو، بلکہ تمھارے ہی دل ایمان کے منکر اور کفر اور عصیان کے قابل تھے۔

﴿ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ﴾ یعنی ہماری تم پر کوئی حجت نہ تھی اس شے کے صحیح ہونے پر جس کی طرف ہم نے تم کو بلایا۔ ﴿ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴾ یعنی بلکہ تمھیں میں طغیان و سرکشی اور حق سے تجاوز کرنا تھا، چنانچہ اسی لیے تم نے ہمارا کہا مان لیا اور اس حق کو چھوڑ دیا جس کو انبیاء علیہم السلام تمھارے پاس لائے اور اس کی صحت پر تمھارے لیے حجتیں قائم کیں۔ پھر تم نے ان کی مخالفت کی۔ ﴿ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴾ بڑے لوگ ضعیف لوگوں سے کہتے ہیں کہ ثابت ہوئی ہم پر اللہ کی بات کہ ہم بدبختوں سے ہیں جو قیامت کے دن عذاب کو چکھنے والے ہیں۔

﴿ فَاَغْوَيْنٰكُمْ ﴾ یعنی پھر ہم نے تم کو گمراہی کی طرف بلایا۔ ﴿ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴾ یعنی پھر ہم نے اس شے کی طرف بلایا جس میں ہم تھے، چنانچہ تم نے ہمارا کہنا مان لیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴾ یعنی وہ سب کے سب آگ میں ہیں، ہر کوئی اپنے اعمال کے موافق۔ ﴿ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴾ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ یعنی جب ان سے دنیا میں "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہنے کے لیے کہا جاتا تو اس کے کہنے سے تکبر کرتے جس طرح کہ مومنین اسے کہتے تھے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: میں حکم کیا گیا ہوں اس بات کا کہ لوگوں سے لڑوں، یہاں تک کہ وہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہیں۔ پس جس شخص نے "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہہ لیا تو مقرر اس نے مجھ سے اپنا مال و جان بچا لیا، مگر اس کے حق کے ساتھ اور اس کا حساب اللہ عزوجل پر ہے۔ اور نازل کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور ذکر کیا اس قوم کا جس نے تکبر کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾[2] نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو العلاء رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: یہود قیامت کے دن لائے جائیں گے، پھر ان سے کہا جائے گا کہ تم کیا پوجتے تھے؟ تو کہیں گے: اللہ کو اور عزیر علیہ السلام کو، چنانچہ ان سے کہا جائے گا: لو بائیں جانب۔ پھر نصاریٰ لائے جائیں گے تو اُن سے کہا جائے گا: تم کیا پوجتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہم اللہ کو اور مسیح علیہ السلام کو پوجتے تھے، چنانچہ ان سے کہا جائے گا: لو بائیں طرف۔ پھر مشرک لائے

---

[1] تفسير الطبري (٣١/٢١، ٣٢) تفسير ابن كثير (٩/٤)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢١٠/١٠) یہ روایت آیت کے ذکر کے بغیر صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١) میں بھی مروی ہے۔

17

جائیں گے، چنانچہ ان سے کہا جائے گا: ”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ“ تو وہ تکبر کریں گے، چنانچہ ان سے کہا جائے گا کہ لو بائیں جانب۔ ابونضرہ نے کہا: پھر وہ پرندوں سے بھی بڑھ کر تیز چلیں گے۔ (ابونضرہ اس حدیث کی سند میں نہیں ہیں۔ شاید سعید جریری جو ابوالعلاء سے راوی ہیں ان کی کنیت ہو۔ واللّٰه أعلم) امام ابوالعلاء رحمہ اللہ نے کہا: پھر مسلمان لائے جائیں گے تو اُن سے کہا جائے گا: تم کیا پوجتے تھے؟ تو وہ کہیں گے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو پوجتے تھے، پھر ان سے کہا جائے گا: تم اس کو پہچان لو گے، جب اس کو دیکھو گے؟ تو کہیں گے: ہاں، پھر ان سے کہا جائے گا: تم اس کو کس طرح سے پہچانو گے، حالاں کہ تم نے اس کو دیکھا نہیں ہے؟ تو وہ کہیں گے: یہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس جیسا کوئی نہیں ہے، چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ و تقدس ان کے لیے جان پہچان کا ہو جائے گا اور اللہ مومنوں کو نجات دے گا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ﴾ یعنی کیا ہم اپنے اور اپنے باپ دادا کے معبودوں کو پوجنا ایک شاعر مجنون کے کہنے پر چھوڑ دیں، ان کی مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جھٹلانے اور ان پر رد کرنے کے لیے فرمایا: ﴿ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی وہ شاعر اور مجنون نہیں ہے، بلکہ اللہ کا رسول ہے اور ساری خبروں اور مطالبوں میں حق لے کر آیا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے شریعت اور دین ٹھہرایا ہے۔ ﴿ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ یعنی جن صفاتِ حمیدہ اور مناہجِ سدیدہ (صحیح راستوں) کی رسولوں نے خبر دی ہے، ان میں ان کی تصدیق کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی شریعت اور تقدیر میں خبر دی ہے، جیسی انھوں نے خبر دی ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۚ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [حم السجدة: ٤٣] ”آپ سے وہی کہا جاتا ہے جو آپ سے پہلے کے رسولوں سے بھی کہا گیا، یقیناً آپ کا رب معافی والا اور دردناک عذاب والا ہے۔“[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

محاورے میں بولتے ہیں: ”وَقَفْتُ الدَّابَّةَ أَقِفُهَا وَقْفًا فَوَقَفَتْ وَهِيَ وُقُوْفًا“ یعنی ٹھہرایا میں نے سواری کو تو وہ ٹھہر گئی۔ مطلب یہ ہے کہ وقوف لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے، ”قِفُوْهُمْ“ میں متعدی ہے۔ فرشتوں کو حکم ہوگا کہ ان کو موقف میں روکو۔ ان کا یہ روکنا جہنم کی طرف ہانکنے سے پہلے ہوگا، یعنی حساب کے لیے ان کو ٹھہراؤ، پھر اس کے بعد جہنم کی طرف ہانکو۔ گویا فرشتوں کو جو اُن کے جہنم کی طرف ہانکنے کا حکم ہوا تھا تو انھوں نے اس حکم کی طرف سرعت کی، اس لیے ان کو یہ فرمایا کہ ان کو ٹھہراؤ۔

﴿ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ﴾ پہلے جملے کی تعلیل ہے، یعنی اس لیے کہ ان سے پوچھنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ٹھہرانا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢١٠)
[2] تفسير ابن كثير (٤/٨-١٠)

کچھ اس لیے نہیں کہ ان سے عفو و درگزر کیا جائے، نہ اس لیے کہ عذاب کی تاخیر سے آرام پائیں، بلکہ اس لیے ہے کہ ان سے باز پرس کی جائے، لیکن اس سوال سے مراد ان کے عقائد و اعمال کا سوال نہیں ہے، جیسا کہ بعض نے کہا ہے، کیوں کہ یہ تو جہنم کی طرف حکم ہونے سے پہلے واقع ہو چکا ہے، بلکہ یہ سوال تو اس شے کے بارے میں ہے جس پر ﴿ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴾ ناطق ہے۔ یہ مذاق اور زجر و توبیخ کے طور پر ہو گا۔ یعنی تم کو کیا ہوا ہے کہ تم میں سے کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا، جیسے کہ تم دنیا میں کرتے تھے؟! اس سوال کی تاخیر اس وقت تک اس لیے کی کہ یہ وقت تنجیز عذاب کا ہے اور مدد کی سخت حاجت کا موقع ہے اور اس سے امید بالکل ٹوٹ جانے کی حالت ہے، چنانچہ ایسے وقت میں ڈانٹ اور سرزنش کا بہت اثر ہوتا ہے۔ یہ حاصل ہے ابوالسعود کا۔[1]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس سوال کو عقائد اور اعمال کا سوال ٹھہرایا ہے اور تقدیم اور تاخیر کا یہ جواب دیا ہے کہ حرفِ واو ترتیب کا فائدہ نہیں دیتا ہے۔[2] دوسرے یہ بھی جائز ہے کہ اس موقف میں ٹھہرانے کا سبب یہی سوال ہو اور اس کی جگہ جہنم ہو۔ پوری تقریر شیخ زادے میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَا لَكُمْ ﴾ کا اشارہ ابو جہل کے قول کی طرف ہے جو اس نے بدر کے دن کہا تھا: ﴿ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴾ [القمر: ٤٤] ''ہم غلبہ پانے والی جماعت ہیں۔'' امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے اعمال، اقوال اور افعال کے متعلق پوچھے جائیں گے، یعنی سب کے متعلق۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی خطاؤں کے بارے میں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ "لا إله إلا الله" کے متعلق۔ کسی نے کہا ہے کہ بندوں پر ظلم کے بارے میں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن بندے کے دونوں قدم زائل نہ ہوں گے (حرکت نہ کر سکیں گے) جب تک کہ اس سے چار چیزوں کے متعلق پوچھا نہ جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ اس کو کس شے میں فنا کیا اور اس کے علم کے متعلق کہ اس پر کہاں تک عمل کیا اور اس کے مال کے متعلق کہ اس کو کہاں سے کمایا اور کس شے پر خرچ کیا اور اس کے جسم کے متعلق کہ کس شے میں اس کو بوسیدہ کیا؟[4] اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس کی جوانی کے متعلق کہ کس شے میں پرانی کی۔[5] (أخرجه الترمذي)

جمہور نے ﴿ اِنَّهُمْ ﴾ کو بہ کسرِ ہمزہ اور عیسیٰ بن عمر رحمہ اللہ نے بہ فتحِ ہمزہ پڑھا ہے۔ امام کسائی نے کہا: "أَيْ: لِأَنَّهُمْ أَوْ بِأَنَّهُمْ"۔ ﴿ تَنَاصَرُوْنَ ﴾ کی اصل "تَتَنَاصَرُوْنَ" ہے، ایک تاء کو تخفیف کے لیے گرا دیا ہے۔ پھر اللہ پاک نے ماقبل کے مضمون سے ہٹ کر وہ حالت بیان کی جس پر وہ وہاں ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ

---

[1] تفسير أبي السعود (١٨٨/٧) [2] تفسير البيضاوي (٩/٥) [3] تفسير القرطبي (٧٤/١٥)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤١٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٣٠٠) یہ روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤١٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٩٩)

﴿ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ وہ آج مطیع و فرماں بردار ہیں، اس لیے کہ حیلہ اور تدبیر سے عاجز ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے عذاب میں خاضع (عاجز) ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: اپنے ہاتھوں سے ڈالنے والے ہیں۔[1] جب کوئی شخص کسی شے کے لیے فرماں بردار اور عاجز ہوتا ہے تو بولتے ہیں: ''اِسْتَسْلَمَ لِلشَّيْءِ'' ﴿ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴾ یعنی بعض کفار بعض پر متوجہ ہوں گے، باہم ایک دوسرے کو ملامت کریں گے اور آپس میں جھگڑیں گے۔ کہا ہے کہ یہ لوگ اتباع اور رؤسا ہیں، ایک دوسرے سے سوال کریں گے، وہ سوال سرزنش، ملامت اور مخاصمت کا ہوگا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ یہ اس وقت ہوگا جب دوسرے نفخے سے اٹھائے جائیں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول کفار کا شیاطین کو ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انسانوں کا جنوں کو ہے،[2] لیکن قولِ اول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ یہ قول ﴿ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴾ اتباع کا رؤسا کو ہے، یعنی تم ہمارے پاس حق، دین اور طاعت سے ہم کو روکنے کے لیے آتے تھے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: دین کی طرف سے، چنانچہ تم ہمارے خیال میں یہ بات ڈالتے تھے کہ دینِ حق وہی شے ہے جس کے ساتھ تم ہم کو بہکاتے ہو۔[3] ''يَمِيْنٌ'' حق سے عبارت ہے۔ یہ اس قول کی طرح ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی طرف سے دی ہے: ﴿ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ﴾ [الأعراف: ١٧] ''پھر میں ان پر حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی، ان کے پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور اُن کی بائیں جانب سے بھی۔''

امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ معانی نے کہا ہے کہ رؤسا نے ان اتباع کے واسطے قسم کھائی تھی کہ جس شے کی طرف وہ اُن کو بلاتے ہیں حق وہی ہے، چنانچہ انھوں نے ان کی قسموں پر اعتماد کیا۔ ﴿ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم ہمارے پاس آتے تھے قسموں کی طرف سے جن کو تم کھاتے تھے، چنانچہ ہم نے ان پر وثوق کیا، کہا: اور مفسرین پہلے قول پر ہیں۔[4] کسی نے کہا کہ یہ معنی ہیں کہ تم آتے تھے داہنی طرف سے جس کو ہم دوست رکھتے تھے اور اس سے نیک فال لیتے ہیں، تاکہ تم اس کے ساتھ ہم کو نصیحت اور خیر خواہی کے انداز سے دھوکا دو۔ جو شے داہنی طرف سے آتی ہے، عرب لوگ اس سے نیک فال لیتے ہیں اور اس کا نام سانح (کھال کھینچنے والا) رکھتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ''یمین'' بہ معنی قوت ہے، یعنی تم ہم کو قوت و غلبہ اور قہر کے ساتھ منع کرتے تھے، جس طرح اس آیت میں ہے: ﴿ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ﴾ [الصافات: ٩٣] ''پھر تو (پوری قوت کے ساتھ) دائیں ہاتھ سے

---

[1] تفسير القرطبي (٧٤،٧٣/١٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٠٩/١٠) تفسير الطبري (٣١/٢١)
[3] معاني القرآن (٣٠٢/٤) [4] فتح القدير (٥١٦/٤)

انھیں مارنے پر پل پڑے۔'' یعنی قوت کے ساتھ۔ جملہ مذکورہ مستانفہ ہے، سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے پوچھا کہ اتباع نے رؤسا سے کیا کہا؟ تو یہ جواب ہے کہ انھوں نے کہا: ﴿ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴾

اسی طرح جملہ ﴿ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾ مستانفہ ہے۔ گویا کسی نے کہا کہ رؤسا نے ان کو کیا جواب دیا؟ تو اس کا یہ جواب ہے کہ رؤسا نے اتباع سے کہا یا شیاطین نے کہا: بلکہ تم مومن نہ تھے اور ہم نے تم کو ایمان سے نہیں روکا۔ مطلب یہ ہے کہ تم کبھی مومن ہی نہ تھے کہ ہم تم کو ایمان سے کفر کی طرف پھیرتے، بلکہ تم تو اصل سے کفر پر تھے اور اسی پر جمے رہے، غرضیکہ رؤسا نے یا شیاطین نے پانچ جواب دیے: ایک تو یہ ہے جو بیان ہوا۔ دوسرا یہ ہے: ﴿ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ﴾ یعنی ہم کو تم پر کوئی قوت وقدرت اور غلبہ نہ تھا کہ ہم تم کو کفر میں داخل کریں اور ایمان سے نکالیں۔

تیسرا جواب یہ ہے: ﴿ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴾ یعنی تم خود کفر اور گمراہی میں حد سے بڑھنے والے تھے۔

چوتھا یہ ہے: ﴿ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴾ یعنی واجب اور لازم ہوا ہم پر اور تم پر ہمارے رب کا قول۔ مراد یہ قول ہے: ﴿ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [صٓ: ٨٥] ''تجھ سے اور تیرے تمام ماننے والوں سے میں (بھی) جہنم کو بھر دوں گا۔'' کہ ہم سب البتہ اس عذاب کو چکھنے والے ہیں، جس کی وعید وارد ہوئی۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی گمراہ کرنے والا اور گمراہ آگ میں ہیں۔[1]

پانچواں جواب یہ ہے: ﴿ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے تم کو راہِ ہدایت سے بہکایا اور تم کو اس گمراہی کی طرف بلایا جس میں ہم تھے۔ اور جس کفر پر تم تھے، اس کو ہم نے تمھارے لیے اچھا کر دکھایا، چنانچہ تم نے ہمارا کہا مانا اپنے اختیار سے اور گمراہی کو ہدایت سے زیادہ پسند کرنے کی وجہ سے۔ ہم خود بھٹکنے والے تھے، چنانچہ اس بات میں ہم پر کسی طرح کا عتاب نہیں کہ ہم نے تمھیں گمراہ کرنے کی کوشش کی، کیوں کہ ہم نے چاہا کہ تم بھی گمراہی میں ہم جیسے ہو جاؤ۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے تمھیں گمراہ کرنے کے لیے اقدام کیا، کیوں کہ ہم خود گمراہی کے ساتھ موصوف تھے۔ چنانچہ یہاں یہ اقرار کیا کہ وہ ان کو گمراہ کرنے کا سبب ہوئے، لیکن زبردستی اور غلبے سے نہیں اور پہلے اپنے آپ سے قہر اور غلبے کی نفی کی تھی، یوں کہا: ﴿ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ﴾

پھر اللہ پاک نے تابعین اور متبوعین کی طرف سے یہ خبر دی: ﴿ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴾ یعنی جس دن وہ آپس میں سوال کریں گے اور لڑیں جھگڑیں گے اس تقریر سے جس کا ذکر ہو چکا، سب کے سب عذاب میں شریک ہوں گے جس طرح کہ گمراہی میں شریک تھے۔ ﴿ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴾

---

[1] معاني القرآن (٣٠٢/٤)

یعنی ہم ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ جرم والوں سے مراد مشرکین ہیں، جس طرح کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ (﴿ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر خبر "كَانَ" یا محلِ رفع میں ہے اس بنا پر کہ "اِنَّ" کی خبر ہے اور "كان ملغی" ہے) یعنی جب ان سے کہا جاتا کہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کہو تو اس کے قبول کرنے سے تکبر کرتے تھے۔

فتح البیان میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جو مذکور ہو چکی ہے ﴿ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ کے بعد اتنا زیادہ ہے: ﴿ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ﴾ [الفتح: ٢٦] "جبکہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں حمیت کو جگہ دی اور حمیت بھی جاہلیت کی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مومنین پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا اور وہ اس کے اہل اور زیادہ مستحق تھے۔"

یہ کلمہ "لا إله إلا الله محمد رسول الله" ہے۔ مشرکوں نے اس سے تکبر کیا حدیبیہ کے دن کہ جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مدت کے معاملے پر مکاتبہ کیا۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کیا جاتا تھا تو استنکاف کرتے تھے،[2] یعنی ننگ و عار کرتے تھے۔ حق سے مراد قرآن شریف ہے جو توحید اور وعد و وعید پر مشتمل ہے۔ ﴿ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس توحید و وعد و وعید و اثباتِ دارِ آخرت کو رسول لے کر آئے ان میں ان کی تصدیق کی اور ان کی مخالفت نہیں کی اور وہ شے نہیں لائے جس کو ان سے پہلے کے رسول نہیں لائے۔[3] (كذا في فتح البيان)

اِنَّكُمْ لَذَآىِٕقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۴۳﴾ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۴﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۴۵﴾ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾

بے شک تم اب دردناک عذاب (کا مزہ) ضرور چکھو گے ﴿۳۸﴾ تمھیں بس اسی کا بدلہ دیا جائے

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] الدر المنثور (۸۶/۷) [3] فتح البیان (۳۷۹/۱۱۔۳۸۳)

گا جو تم عمل کرتے تھے ﴿39﴾ مگر اللہ کے چنے ہوئے بندے (عذاب سے محفوظ رہیں گے) ﴿40﴾
انہی (لوگوں) کے لیے مقررہ روزی ہے ﴿41﴾ یعنی (جنت کے) لذیذ پھل، اور وہ لوگ معزز ہوں
گے ﴿42﴾ نعمت کے باغوں میں ﴿43﴾ ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر (براجمان) ہوں گے ﴿44﴾ ان
کے لیے جاری چشمے سے شراب (طہور) کا بھرا جام پھرایا جائے گا ﴿45﴾ سفید رنگ (بالکل صاف
شفاف) پینے والوں کے لیے لذت (والی ہوگی) ﴿46﴾ نہ اس سے سر چکرائے گا اور نہ وہ اس سے
مدہوش ہوں گے ﴿47﴾ اور ان کے پاس ہوں گی نیچی نگاہ والی، غزال چشم (خوبصورت آنکھوں والی
حوریں) ﴿48﴾ گویا کہ وہ پردوں میں چھپائے ہوئے (شتر مرغ کے) انڈے ہیں ﴿49﴾

مشرکوں کی سزا اور مخلصین کی جزا کا بیان:

یعنی ان کے گناہوں کے بدلے معاف نہیں ہوئے۔ چھپائے ہوئے انڈے۔ بعض کہتے ہیں کہ مراد شتر مرغ کے انڈے ہیں جو بہت خوش رنگ ہوتے ہیں۔ انتہٰی.

اللہ پاک لوگوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ بے شک تم البتہ عذابِ الیم چکھنے والے ہو اور بدلہ نہ دیے جاؤ گے مگر اسی چیز کا جو تم کرتے تھے۔ پھر اس سے اپنے مخلص بندوں کو نکالا اور فرمایا: ﴿ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ جس طرح کہ فرمایا: ﴿ وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ [العصر: ۱۔ ۳] ''زمانے کی قسم! بے شک (بالیقین) انسان سرتا سر نقصان میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴾ [مریم: ۷۱۔ ۷۲] ''تم میں سے ہر ایک وہاں ضرور وارد ہونے والا ہے، یہ تیرے پروردگار کے ذمے قطعی، فیصل شدہ امر ہے پھر ہم پرہیزگاروں کو تو بچالیں گے اور نافرمانوں کو اسی میں گھٹنوں کے بل گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ [التین: ٤۔ ٦] ''یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا، پھر اسے نیچوں سے نیچا کر دیا، لیکن جو لوگ ایمان لائے اور (پھر) نیک عمل کیے۔'' نیز فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴾ [المدثر: ۳۸۔ ۳۹] ''ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔ مگر دائیں ہاتھ والے۔'' اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ یعنی اللہ کے مخلص بندے عذابِ الیم نہ چکھیں گے اور نہ حساب میں اُن سے باریکی کی جائے گی، بلکہ ان کے گناہوں سے تجاوز کیا جائے گا، اگر ان کے گناہ ہوں گے اور نیکی

کا دس گنا بدلا دیے جائیں گے سات سو گنا تک، بلکہ بہت سے گنوں تک جتنے گنے تک اللہ چاہے گا۔

﴿ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا: ﴿ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾ سے مراد جنت ہے۔① پھر خود اپنے قول سے اس کی تفسیر کی، فرمایا: ﴿ فَوَاكِهُ ﴾ یعنی انواع و اقسام کے میوے ہیں۔ ﴿ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾ یعنی خدمت کے لیے ان کو خادم ملیں گے اور طرح طرح کی نعمتیں اور عیش اور آرام ملے گا نعمت کے باغوں میں۔ ﴿ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴾ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک دوسرے کی گدی کی طرف نظر نہیں کرے گا۔② مطلب یہ ہے کہ سب تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے، ایک کا منہ دوسرے کے مقابل ہو گا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے زید بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ہم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴾ یعنی بعض ان کا بعض کی طرف نظر کرے گا۔③ حدیث غریب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴾ جیسا کہ اللہ عزوجل نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۱۸﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴾ [الواقعة: ۱۷۔ ۱۹] ”ان کے پاس لڑکے جو ہمیشہ (لڑکے ہی) رہیں گے آمد و رفت کریں گے۔ آبخورے اور جگ لے کر اور ایسا جام لے کر جو بہتی ہوئی شراب سے پر ہو۔ جس سے نہ سر میں درد ہو نہ عقل میں فتور آئے۔“ اللہ پاک نے جنت کی شراب کو ان آفتوں سے بری کیا جو دنیا کی شراب میں ہوتی ہیں، دردِ سر و دردِ شکم۔ غول یہی ہے اور عقل کو بالکل لے جاتی ہے، یہ باتیں وہاں کی شراب میں نہیں ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ لوگ ان پر معین کا، یعنی شراب کا پیالہ لیے پھرتے ہیں، بہتی نہروں میں سے کہ جن کے ختم ہو چکنے کا خوف نہ کریں گے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ بہتی ہوئی سفید رنگ کی شراب۔ اس کا رنگ چمکتا ہوا حسین اور بارونق ہو گا۔ دیکھنے میں دنیا کی شراب کی طرح نہ ہو گی۔ جیسی وہ مکروہ، ردی، سرخی یا سیاہی یا زردی یا کدورت لیے ہوتی ہے۔ ان کے سوا اور باتیں جن سے طبع سلیم نفرت کرتی ہے، وہ ان سب باتوں سے پاک ہو گی۔ ﴿ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴾ یعنی جیسی خوش رنگ ہو گی ویسی ہی خوش مزہ ہو گی اور اس کا خوش مزہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان سب امور میں وہ دنیا کی شراب سے مختلف ہو گی خوشبو وغیرہ میں۔

﴿ لَا فِيْهَا غَوْلٌ ﴾ یعنی وہ ان میں غول کا اثر نہ کرے گی۔ ﴿ غَوْلٌ ﴾ دردِ شکم کو کہتے ہیں۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے، جیسا کہ دنیا کی شراب کثرتِ استعمال کی وجہ سے قولنج

① تفسیر الطبري (۲۱/۳۵) ② تفسیر الطبري (۱۷/۱۱۰)

③ المعجم الکبیر (۵/۲۲۰) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ۱۳۶۸)

وغیرہ پیدا کرتی ہے۔ کسی نے کہا: یہاں ﴿ غَوْلٌ ﴾ سے مراد دردِ سر ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ غَوْلٌ ﴾ دردِ سر اور دردِ شکم ہے۔ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ سے مروی ہے کہ ''لَا تَغْتَالُ عُقُوْلَهُمْ''[1] یعنی ان کی عقلوں کو نہ لے جائے گی، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: ؎

فَمَا زَالَتِ الْكَأْسُ تَغْتَالُنَا وَتَذْهَبُ بِالْأَوَّلِ الْأَوَّلِ

یعنی پھر شراب کا پیالہ ہم کو مدہوش کرتا رہا اور اول اول کو لے جاتا رہا، یعنی جو جو کوئی پیتا رہا، اس کی عقل جاتی رہی۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں نہ کسی طرح کا مکروہ ہے نہ کوئی ایذا۔[2] صحیح قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے کہ ﴿ غَوْلٌ ﴾ دردِ شکم ہے۔ ﴿ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی عقلیں نہ جائیں گی۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام محمد بن کعب، حسن، عطاء بن ابی مسلم خراسانی اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی کہا ہے۔[3] امام ضحاک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ شراب میں چار خصلتیں ہیں: نشہ اور دردِ سر، قے اور پیشاب۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جنت کی شراب کا ذکر فرمایا تو اس کو ان خصلتوں سے منزہ کیا۔[4] جس طرح کہ سورۃ الصافات میں ذکر کیا ہے۔

﴿ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴾ یعنی ان کے پاس پاک دامن اور پارسا عورتیں ہیں، اپنے خاوندوں کے سوا غیر کی طرف نظر نہیں کرتی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، زید بن اسلم، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم نے اسی طرح کہا ہے۔[5] ﴿ عِيْنٌ ﴾ یعنی حسین آنکھوں والیاں۔ کسی نے کہا: بڑی بڑی آنکھوں والیاں، یہ قول اول کی طرف راجع ہے۔ یعنی ''نَجْلَاءُ عَيْنَاهُ'' یعنی فراخ وبزرگ چشم۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان عورتوں کی آنکھوں کی تعریف حسن اور عفت کے ساتھ کی، جیسا کہ زلیخا نے یوسف علیہ السلام کے حق میں اس وقت کہا جب ان کو سنوارا اور ان عورتوں پر ان کو نکالا، پھر ان کو عظیم اور کبیر سمجھا اور خیال کیا کہ وہ اپنے حسن اور چہرے کی رونق کی وجہ سے فرشتوں میں سے ایک فرشتے ہیں تو کہا: ﴿ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ ﴾ [یوسف: ۳۲] ''یہی ہیں جن کے بارے میں تم مجھے طعنے دے رہی تھی، میں نے ہر چند اس سے اپنا مطلب حاصل کرنا چاہا لیکن یہ بال بال بچا رہا۔'' یعنی وہ باوجود اس حسن و جمال کے پاک دامن اور تقی اور نقی ہے۔ اسی طرح حورِ عین ﴿ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴾ ہیں اور اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۝ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ یعنی وہ نازک بدن ہیں، ان کا رنگ بہترین رنگ ہے، گویا چھپے ہوئے انڈے ہیں۔ علی بن طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ﴿ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ ''يَقُوْلُ: اَللُّؤْلُؤُ الْمَكْنُوْنُ''[6] یعنی گویا

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٣٧، ٣٨) [2] تفسير الطبري (٢١/٣٨) [3] تفسير الطبري (٢١/٣٩، ٤٠)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢١١) [5] تفسير الطبري (٢١/٤١، ٤٢) [6] تفسير الطبري (٢١/٤٣)

چھپے ہوئے موتی ہیں اور اس جگہ ابو دہبل شاعر کا شعر پڑھتے تھے، یہ شعر اس کے ایک قصیدے میں سے ہے:

وَهِيَ زَهْرَاءُ مِثْلُ لُؤْلُؤَةِ الْغَوَّاصِ مِيزَتْ مِنْ جَوْهَرٍ مَكْنُوْنِ

کسی عورت کے حسن و جمال کا وصف کرتا ہے کہ وہ ایسی گوری چمکتی با رونق ہے جیسے غواص کا موتی کہ چھپے ہوئے جواہر سے جدا کیا گیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: یعنی "مَحْصُوْنٌ لَمْ تَمَسَّهُ الْأَيْدِيْ" یعنی گویا وہ محفوظ انڈے ہیں جن کو ہاتھوں نے نہیں چھوا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "اَلْبَيْضُ فِيْ عُشِّهِ مَكْنُوْنٌ" یعنی انڈے اپنے گھونسلے میں محفوظ ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "بَطْنُ الْبَيْضِ" مطلب یہ ہے کہ ﴿ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ سے مراد انڈوں کا شکم ہے، کیوں کہ وہ اندر سے باہر کی نسبت زیادہ صاف و شفاف ہوتے ہیں۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ جھلی ہے جو انڈے کے اوپر کے چھلکے اور سفیدی و زردی کے درمیان ہوتی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بَيَاضُ الْبَيْضِ حِيْنَ يُنْزَعُ قِشْرُهُ" یعنی انڈوں کی سفیدی جبکہ ان کا پوست کھینچا جاتا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے لفظ ﴿ مَّكْنُوْنٌ ﴾ کی وجہ سے اس قول کو اختیار کیا ہے۔ کہا ہے کہ اوپر کے پوست کو پرندوں کے پَر اور گھونسلا چھوتا ہے اور اسے ہاتھ لگتے ہیں بخلاف اندرونی پوست کے، یعنی وہ ان باتوں سے محفوظ رہتا ہے۔[1] واللّٰہ أعلم.

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھے اللہ عزوجل کے قول حور عین کے بارے میں بتائیں۔ فرمایا: "اَلْعِيْنُ ضِخَامُ الْعُيُوْنِ، شَفْرُ الْحَوْرَاءِ مِثْلُ جَنَاحِ النَّسْرِ" یعنی عین بڑی بڑی آنکھوں والیاں ہیں، حور کی پلکیں گدھ کے پر کی طرح ہیں۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھے اللہ عزوجل کے قول: ﴿ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ کے متعلق بتائیں۔ فرمایا: "رِقَّتُهُنَّ كَرِقَّةِ الْجِلْدَةِ الَّتِيْ رَأَيْتَهَا فِيْ دَاخِلِ الْبَيْضَةِ الَّتِيْ تَلِيْ الْقِشْرَ وَهِيَ الْغِرْقِئُ" یعنی ان کی جلد کی باریکی اور نزاکت اس جلد کی باریکی کی طرح ہے جس کا سر انڈے کے اندر ہوتا ہے جو چھلکے سے لگی ہوتی ہے، اس جلد کو غرقئ کہتے ہیں۔[2]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں ان لوگوں میں سب سے پہلا ہوں جب وہ مبعوث ہوں گے نکلنے کے اعتبار سے، اور میں ان کا خطیب ہوں جب وہ آئیں گے اور میں ان کو خوش خبری دینے والا ہوں جب وہ غمگین ہوں گے اور میں ان کا شفیع، یعنی شفاعت کرنے والا ہوں جب وہ روکے جائیں گے، اس دن حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا اور میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے سب سے بزرگ ہوں اور کچھ فخر نہیں ہے، مجھ پر ہزار خادم پھریں گے۔ گویا: وہ ﴿ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ ہیں، یا

[1] تفسير الطبري (٢١/٤٣، ٤٤) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢١٢)

[2] تفسير الطبري (٢١/٤٢) المعجم الكبير (٢٣/٣٢٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه سليمان بن أبي كريمة ضعفه أبو حاتم وابن عدي" (مجمع الزوائد: ٧/٢٥٥)

"لُؤْلُؤٌ مَكْنُونٌ"[1] (اس کا اطلاق مذکر اور مونث دونوں پر ہوتا ہے۔ اسی لیے یہاں پر ﴿ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ فرمایا) واللّٰه تعالیٰ أعلم بالصواب. (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

جمہور نے ﴿ لَذَآئِقُوا ﴾ بہ حذفِ نون وخفض ﴿ الْعَذَابِ ﴾ پڑھا ہے اور ابان بن تغلب نے عاصم سے اور ابو السماک نے بہ حذفِ نون ونصبِ "العذابَ" پڑھا ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے اس جیسی قراءت میں شاعر کا قول پڑھا ہے:

فَأَلْفَيْتُهُ غَيْرَ مُسْتَعْتَبٍ وَلَا ذَاكِرَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا

یعنی میں نے اس کو اس حال میں پایا کہ نہ تو وہ رضا مندی چاہنے والا تھا اور نہ ذکر کرنے والا اللہ کا مگر تھوڑا۔ اسی توجیہ کی بنا پر امام سیبویہ رحمہ اللہ نے "وَالْمُقِيْمِيُ الصَّلَاةِ" کو بھی بہ نصبِ "الصَّلَاةَ" جائز رکھا ہے۔[2] کسی نے بنا بر اصل بہ اثباتِ نون ونصبِ "العذابَ" پڑھا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے غصے کے اظہار کے لیے غائب کے صیغے سے ہٹ کر صیغۂ حاضر استعمال فرمایا، یعنی لوگو! بے شک تم اپنے شرک اور تکذیب کے سبب سے سخت عذاب چکھنے والے ہو۔ پھر یہ بیان کیا کہ جس عذاب کو انھوں نے چکھا وہ صرف ان کے اعمال کے سبب سے ہے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی تم بدلہ نہ دیے جاؤ گے مگر اس کفر اور معاصی کے سبب سے جس کو تم کیا کرتے تھے، یا مگر اس کفر ومعاصی کے بدلے جس کو تم کیا کرتے تھے۔ غرض یہ ہے کہ اصل میں "جَزَاءَ مَا كُنْتُمْ" ہے، یا "بِمَا كُنْتُمْ"۔ پھر مومنین کا استثناء کرکے فرمایا: ﴿ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ اہلِ مدینہ اور کوفہ نے بہ فتحِ لام پڑھا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کو اللہ پاک نے اپنی طاعت اور توحید کے لیے خالص کر لیا ہے۔ باقی قراء نے بہ کسرِ لام پڑھا ہے، یعنی وہ لوگ جنھوں نے اللہ کے واسطے اخلاصِ عبادت وتوحید کیا۔ استثناء یا تو متصل ہے اس بنا پر کہ ﴿ تُجْزَوْنَ ﴾ میں سارے مکلفین کو عام خطاب ہو، یا منقطع ہے اس بنا پر کہ خطاب خاص طور پر کفار کو ہو، یعنی لیکن اللہ کے مخلص بندے عذاب نہ چکھیں گے۔

﴿ اُولٰٓئِكَ ﴾ کا اشارہ مخلصین کی طرف ہے اور مبتداء ہے، اس کی خبر ﴿ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾ ہے، یعنی ایسے مخلص لوگوں کے لیے رزق ہے جو اللہ ان کو عطا فرمائے گا، ایسا رزق جو اپنی خوبصورتی، پاکیزگی، لذت، خوشبو، مزے اور غیر منقطع ہونے میں جانا پہچانا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا وقت معلوم ہے۔ وہ وقت یہ ہے کہ صبح وشام اس میں سے ان کو ملے گا، جس طرح کہ اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴾ [مریم: ٦٢] "ان

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢١٢/١٠) تفسیر ابن کثیر (١٠/٤۔١٢) اس کی سند میں "لیث بن أبی سلیم" ضعیف راوی ہے۔

[2] فتح القدیر (٥١٧/٤)

کے پاس وہاں صبح و شام ان کا رزق ہو گا۔'' اور نفس کو زیادہ سکون ہوتا ہے جب اس کو کھانے کا وقت معلوم ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی خصوصیات معلوم ہیں کہ وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کی لذت خالص ہو گی۔ کسی نے کہا: اس کا اندازہ معلوم ہے جس کے وہ مستحق ہوں گے، یعنی اپنے اعمال کی بدولت وہ اللہ پاک کے جس ثواب کے مستحق ہوں گے وہ معلوم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ﴾ یہی ہے جس کا ذکر اس کے بعد کیا گیا ہے، یعنی ﴿فَوٰكِهُ﴾ کیوں کہ یہ رزق کا بدل ہے یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یعنی "هُوَ فَوَاكَهُ"، ظاہر یہی ہے۔

﴿فَوٰكِهُ﴾ جمع ہے "فَاكِهَةٌ" کی۔ "فَاكِهَةٌ" سارے تر و خشک میوں کو کہتے ہیں۔ ﴿فَوٰكِهُ﴾ کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ اہلِ جنت کے رزق سب کے سب ﴿فَوٰكِهُ﴾ ہیں، اسی طرح کہا گیا ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس طرح کہیں کہ ﴿فَوٰكِهُ﴾ کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ ان سب چیزوں میں سے بہترین ہے جن کو وہ کھائیں گے اور ان چیزوں میں سے سب سے لذیذ ہیں جن کی خواہش ان کے دل کریں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿فَوٰكِهُ﴾ ہر قسم کے کھانوں کے اتباع میں سے ہیں، اس لیے ان کا ذکر کر دینے سے کسی اور کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

جملہ ﴿وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ﴾ حالیہ ہے، یعنی حال یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی طرف سے ان کی یہ بڑی عزت افزائی اس طرح سے ہو گی کہ اس کے پاس ان کے درجے بلند ہوں گے اور اس کا کلام سنیں گے اور جنت میں اس سے ملاقات کریں گے۔ یا وہ ﴿مُّكْرَمُوْنَ﴾ (عزت یافتہ) ہیں ثواب کے پانے میں جو بغیر طلب کیے ہوئے یا محنت کیے ہوئے ان کی طرف پہنچے گا، دنیا کے رزق کے برعکس کہ اس کے لیے محنت و مشقت اور سوال کرنا پڑتا ہے۔ جمہور نے ﴿مُّكْرَمُوْنَ﴾ کہ بہ تخفیفِ راء پڑھا ہے اور ابو مقسم نے بہ تشدید پڑھا ہے۔[1] ﴿فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ﴾ یا تو ﴿مُّكْرَمُوْنَ﴾ سے متعلق ہے یا خبرِ ثانی ہے، یا حال ہے۔ ﴿عَلٰى سُرُرٍ﴾ میں یہی احتمال ہے کہ حال ہو یا خبرِ ثالث ہو۔

﴿مُّتَقٰبِلِيْنَ﴾ حال ہے ﴿مُّكْرَمُوْنَ﴾ کی ضمیر سے، یا ﴿عَلٰى سُرُرٍ﴾ کی ضمیر سے۔ امام عکرمہ اور مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقابل کے یہ معنی ہیں کہ مواصلت و محبت باہمی کی راہ سے ان کا بعض بعض کی قفا (گدی) کی طرف نظر نہ کرے گا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ تخت ان کو لے کر چکر کھائیں گے جس طرح وہ چاہیں گے تو بعض ان کا بعض کی قفا کو نہ دیکھے گا۔ جمہور نے ﴿سُرُرٍ﴾ بہ ضمِ راء پڑھا ہے اور امام ابو السماک رحمہ اللہ نے بہ فتحِ راء پڑھا ہے۔ یہ بعض تمیم کی لغت ہے۔ کہا ہے کہ جنتی لوگ موتی و یاقوت و زبرجد سے جڑے ہوئے تختوں پر ہوں گے اور تخت اتنا بڑا ہو گا جتنا کہ صنعا اور جابیہ کے درمیان اور عدن اور ایلہ کے درمیان فاصلہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تخت ایک گھر والوں کو لے کر دور کریں گے۔ واللہ أعلم۔[3] (ذكره القرطبي)

---

[1] فتح القدير (٥١٧/٤) [2] تفسير القرطبي (٧٧/١٥) [3] تفسير القرطبي (٧٧/١٥)

پھر اللہ پاک نے اہلِ جنت کی اور صفت ذکر فرمائی: ﴿ يُطَافُ عَلَيۡهِمۡ بِكَاۡسٍ ﴾۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ سوالِ مقدر کا جواب۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ وہاں شراب بھی ہوگی یا نہیں؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ ہاں، لوگ ان پر شراب کے پیالے لیے پھرتے ہوں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ بنا بر حال محلِ نصب میں ہو ﴿ مُّتَقٰبِلِيۡنَ ﴾ کی ضمیر سے۔ "كَأْسٌ" اہلِ لغت کے نزدیک وہ شے ہے جو شیشے کی ہو اور یہ ایک اسم ہے، جو ہر اس برتن کو شامل ہے جس میں شراب ہوتی ہے۔ پھر اگر وہ خالی ہو تو "كَأْسٌ" نہیں ہے۔ کبھی خود شراب کا نام "كَأْسٌ" رکھتے ہیں بطور تسمیۂ شے باسم محل، كَمَا قَالَ الشَّاعِرُ:

وَكَأْسًا شَرِبْتُ عَلَى لَذَّةٍ وَأُخْرَى تَدَاوَيْتُ مِنْهَا بِهَا

امام ضحاک اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "كُلُّ كَأْسٍ فِي الْقُرْآنِ فَهِيَ الْخَمْرُ"[1] یعنی قرآن میں "كَأْسٌ" شراب کے معنی میں ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ لغت میں سے جس شخص پر وثوق کیا جاتا ہے اس نے یہ بیان کیا ہے کہ عرب لوگ قدح کو "كَأْسٌ" بولتے ہیں، جبکہ اس میں شراب ہو، پھر جب اس میں شراب نہ ہو تو وہ قدح ہے جس طرح کہ خوان کو مائدہ کہتے ہیں جبکہ اس میں کھانا ہو، پھر جب اس پر کھانا نہ ہو تو اس کو مائدہ نہیں کہتے۔ ﴿ مِّنۡ مَّعِيۡنٍ ﴾ محذوف سے متعلق ہو کر "كَأْسٌ" کی صفت ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی شراب کے پیالے سے جو بہتی ہے جس طرح کہ چشمے روئے زمین پر بہتے ہیں ظاہر جن کو آنکھیں دیکھتی ہیں اور ﴿ مَّعِيۡنٍ ﴾ بہتے پانی کو کہتے ہیں۔

﴿ بَيۡضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ ﴾ دونوں "كَأْسٌ" کی صفتیں ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَذَّةٍ ﴾ بہ معنی "ذَاتِ لَذَّةٍ" ہے، مضاف محذوف ہے، یعنی وہ پینے والوں کے لیے لذت والی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کی لذت ہونے میں بہ قصدِ مبالغہ مصدر کے ساتھ موصوف ہو، یعنی ایسی لذیذ مزے دار ہے کہ مارے لذت کے خود لذت ہوگئی ہے۔ اس صورت میں حذفِ مضاف کی ضرورت نہیں ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جنت کی شراب دودھ سے بھی زیادہ سفید ہے اور اس کی لذت لذیذ ہے، یعنی نہایت درجہ مزے دار ہے جس طرح کہ محاورے میں لذیذ شراب کو "شَرَابٌ لَذٌّ وَلَذِيذٌ" بولتے ہیں، جیسے: ترو تازہ روئیدگی کو "نَبَاتٌ غَضٌّ وَغَضِيضٌ" کہتے ہیں۔[2] لذیذ ہر پسندیدہ چیز ہے، اسی معنی سے شاعر کا قول ہے:

بِحَدِيثِهَا اللَّذِّ الَّذِي لَوْ كَلَّمَتْ أَسْدُ الْفَلَاةِ بِهِ لَأَتَيْنَ سِرَاعًا

معشوق کی مزے دار باتوں کا وصف کرتا ہے کہ اگر وہ اپنی مزیدار بات سے جنگل کے شیروں سے بات کرے تو وہ دوڑتے چلے آئیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بَيۡضَآءَ ﴾ وہ شراب ہے جس کو آدمیوں نے نہیں نچوڑا۔ پھر اللہ پاک

[1] تفسير الطبري (٣٦/٢١) [2] تفسير القرطبي (٧٨،٧٧/١٥) فتح القدير (٥١٨/٤)

نے اس شراب کے پیالے کا اور وصف کیا، فرمایا: ﴿ لَا فِيْهَا غَوْلٌ ﴾ یعنی اس میں وہ بات نہیں جو دنیا کی شراب میں ہوتی ہے کہ عقلوں کو کھو دیتی ہے، یہ ان کی عقلوں کو نہ کھوئے گی، نہ اس سے ان کو مرض لگے گا، نہ دردِ سر ہو گا۔
امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: عرب لوگ بولتے ہیں: "لَيْسَ فِيْهَا غِيْلَةٌ وَّغَائِلَةٌ وَغَوْلٌ" یہ سب برابر ہیں۔ امام ابو عبیدہ نے کہا: "اَلْغَوْلُ أَنْ تَغْتَالَ عُقُوْلَهُمْ" یعنی غول یہ ہے کہ ان کی عقلوں کو کھو دے۔ واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ غول کی حقیقت اہلاک ہے جب کوئی کسی کو ہلاک کر ڈالے تو بولتے ہیں: "غَالَهُ غَوْلًا وَّاغْتَالَهُ أَيْ: أَهْلَكَهُ" اور غول ہر وہ شے ہے جو تجھے ہلاک کرے، اسی معنی سے "غُوْلٌ" بالضم ہے جو ایک شے ہے کہ عرب نے اس کا توہم کر لیا ہے اور اس باب میں مثل عنقاء کے ان کے اشعار ہیں۔
دوسرا وصف اس کا یہ ہے: ﴿ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴾ اور نہ وہ اس سے مست ہوں گے۔ جس وقت کوئی مست ہوتا ہے تو بولتے ہیں: "نَزَفَ الشَّارِبُ فَهُوَ مَنْزُوْفٌ وَنَزِيْفٌ"۔ جمہور نے ﴿ يُنْزَفُوْنَ ﴾ بہ ضمِ یاء و فتحِ زاء بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے بہ ضمِ یاء و کسرِ زاء اس محاورے سے ماخوذ ہے، جب کہ آدمی کی عقل نشے سے جاتی رہتی ہے تو بولتے ہیں: "أَنْزَفَ الرَّجُلُ فَهُوَ نَزِيْفٌ وَمَنْزُوْفٌ وَمُنْزِفٌ" جس طرح کہ جب کھیتی کے کٹنے کا وقت آ جاتا ہے تو کہتے ہیں: "أَحْصَدَ الزَّرْعُ" اور جب انگور توڑنے کا وقت آ جاتا ہے بولتے ہیں: "أَقْطَفَ الْكَرْمُ" امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے بہ کسرِ زاء پڑھا ہے تو اس کے معنی دو ہیں: ایک یہ ہیں کہ جب آدمی کی شراب فنا ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں: "أَنْزَفَ الرَّجُلُ" دوسرے یہ ہیں کہ جب نشے سے اس کی عقل جاتی رہتی ہے، تب بھی بولتے ہیں: "أَنْزَفَ الرَّجُلُ" یہ قراءت اس معنی پر محمول ہو گی کہ ان کی شراب فنا نہ ہو گی، کیوں کہ اس معنی میں فائدہ زیادہ ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلی قراءت معنی میں واضح تر اور صحیح تر ہے، کیوں کہ جمہور مفسرین کے نزدیک ﴿ يُنْزَفُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ان کی عقلیں نہ جائیں گی۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے جنت کی شراب سے ان آفتوں کی نفی کی جو دنیا میں ان کی شراب سے لاحق ہوتی ہیں، جیسے: دردِ سر اور مدہوشی۔
امام زجاج اور ابو علی فارسی نے کہا: "لَا يَنْزِفُوْنَ" بالکسر کے معنی "لَا يَسْكَرُوْنَ" ہیں، یعنی وہ مست نہ ہوں گے۔ مہدوی نے کہا کہ ﴿ يُنْزَفُوْنَ ﴾ کے معنی "يَسْكَرُوْنَ" نہیں ہوتے، کیونکہ اس سے قبل ﴿ لَا فِيْهَا غَوْلٌ ﴾ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی عقلوں کو نہ کھوئے گی، چنانچہ اس کے اور اس کے ایک معنی ہوئے تو تکرار ہو گی۔ یہ بات امام قتادہ رحمہ اللہ کے قول کو قوت دیتی ہے کہ غول دردِ شکم ہے اور اسی طرح امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اور امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ غول دردِ سر ہے۔ اسی کے قائل سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی ہیں۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غول مغص (بہ سکون گسستن رودہ۔ جراح) ہے، چنانچہ آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اس میں کوئی بھی فساد کرنے والی چیزوں میں سے نہ ہو گی جو دنیا میں شراب پینے کے ساتھ لگی رہتی ہیں، یعنی

مغص یا دردِ شکم یا دردِ سر یا بدمستی یا لغو یا تاثیم و گناہ اور نہ وہ اس سے مست ہوں گے۔ اس معنی کی تائید یہ بات کرتی ہے کہ غول کی اصل وہ فساد ہے جو خفا میں لاحق ہوتا ہے، جب کوئی شخص خفیہ خفیہ کسی کا کام بگاڑ دیتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "اِغْتَالَهُ اغْتِيَالًا" اور اسی معنی سے: "غَوْلٌ وَغِيْلَةٌ" خفیہ مار ڈالنے کو کہتے ہیں۔ امام ابن ابی اسحاق ؒ نے "يَنْزِفُوْنَ" بہ فتحِ یاء و کسرِ زاء اور طلحہ بن مصرف نے بہ فتحِ یاء ضمِ زاء پڑھا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس ؓ سے مروی ہے کہ شراب میں چار خصلتیں ہیں: سکر، دردِ سر، قے اور بول، یعنی پیشاب۔[2] چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جنت کی شراب کو ان سے پاک کیا اور فرمایا: ﴿ لَا فِيْهَا غَوْلٌ ﴾ یعنی وہ سکر سے ان کی عقل کو نہ کھوئے گی۔

﴿ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴾ فرمایا وہ اس سے قے نہ کریں گے جس طرح دنیا کی شراب والا اس سے قے کرتا ہے۔ یہ بھی ان سے مروی ہے کہ وہ شراب ہے جس میں دردِ شکم نہیں ہے۔ نہر میں کہا ہے کہ اللہ پاک نے سب سے پہلے تو رزق کا ذکر کیا، رزق وہ شے ہے جس سے جسم لذت لیتے ہیں، پھر اکرام کا ذکر فرمایا، اس سے نفوس مزہ لیتے ہیں، پھر اس محل کا ذکر کیا جس میں وہ ہیں، یعنی جناتِ نعیم، پھر اشرفِ محل کا ذکر فرمایا یہ تخت ہوئے، پھر تانس، یعنی آپس کے انس کی لذت کا ذکر کیا ہے کہ بعض بعض کے مقابل ہوگا، یہ تمام تر اور مکمل سرور ہے، پھر پینے کی شے کا ذکر کیا اور یہ کہ وہ انھیں جا کر خود نہیں لینا پڑے گا، بلکہ لوگ شراب کے پیالے لیے ہوئے ان کے پاس آتے ہوں گے، پھر اس شراب کا وصف کیا جس کو وہ انھیں پیش کریں گے کہ وہ پاک صاف لذیذ اور خوشگوار ہر قسم کے مفاسد سے پاک ہوگی۔

پھر پوری جسمانی نعمت کا ذکر کیا اور اس سے بات کا اختتام کیا جس طرح کہ رزق کے ذکر سے ابتداء کی تھی، وہ جسمانی لذت ہے، وہ پوری جسمانی لذت تمام لذتوں سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے، یعنی عورتوں سے تانس۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ﴾ یعنی ان کے پاس عورتیں ہیں آنکھیں روکنے والی اور نگاہ کو پست کرنے والی جنھوں نے اپنی نگاہ اپنے خاوندوں پر روکی ہے اور خاوندوں کے علاوہ کسی کو نہیں چاہتی ہیں۔ "قصر" کہتے ہیں حبس کو۔ کسی نے کہا: ﴿ قٰصِرٰتُ ﴾ اپنے ازواج (شوہروں) پر محبوسات ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ اس لیے کہ ﴿ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ﴾ فرمایا ہے "مقصورات" نہیں کہا۔ امرئ القیس نے نزاکت و لطافتِ جسم کی صفت میں کیا خوب کہا ہے:

مِنَ الْقَاصِرَاتِ الطَّرْفِ لَوْدَبَّ مُحْوِلٌ　　　مِنَ الذَّرِّ فَوْقَ الْأَتْبِ مِنْهَا لَأَثَّرَا

(محول: چھوٹی چیونٹی اور أتب: کرتا)۔ یعنی وہ محبوبہ نازک بدن، لطیف تن ان نگاہ روکنے والیوں سے ہے کہ اگر

[1] تفسير القرطبي (٧٩/١٥) فتح القدير (٥١٨/٤، ٥١٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢١١/١٠)

ذرا سی چیونٹی اس کے کرتے پر چلے تو اس کے لطیف جسم پر نشان ڈال دے۔ فارسی کے شاعر نے اس سے بھی بڑھ کر مبالغہ کیا ہے۔ ؎

نزاکت آنچناں میریزد از جسم لطیف او — کہ در حمام می آرد خیال سیر مہتابش

''اس کے صاف و شفاف جسم سے ناز و ادا اس طرح سے بکھرتی ہے کہ حمام میں اس کی چمکتی روشنی کی سیر کا خیال آجاتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ عِيْنٌ ﴾ یعنی بڑی بڑی آنکھوں والیاں۔ یہ جمع ہے ''عَيْنَاءُ'' کی۔ ''عَيْنَاءُ'' کہتے ہیں فراخ چشم والی عورت کو اور مرد کو ''أَعْيَنُ'' کہتے ہیں۔ امام زجاج نے کہا: ﴿ عِيْنٌ ﴾ کے معنی ہیں: ''كِبَارُ الْأَعْيُنِ حِسَانُهَا''[1] یعنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں والیاں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ''حِسَانُ الْعُيُوْنِ''[2] یعنی حسین آنکھوں والیاں۔ ''عِظَامُ الْمُقْلَةِ'' (مقلہ پیہ دروں چشم۔ صراح)۔ کسی نے کہا ہے کہ ''نُجْلُ الْعُيُوْنِ'' بہ ضم نون جمع ہے ''نَجْلَاءُ'' کی۔ ''نَجْلَاءُ'' وہ عورت ہے جس کی آنکھ کی پھاڑ فراخ ہو، مگر فراخی کے ساتھ حد سے گزرنے والی نہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ ہیں جن کی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی شدید ہے۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

﴿ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾۔ ﴿ بَيْضٌ ﴾ جمع ہے ''بَيْضَةٌ'' کی۔ ﴿ مَّكْنُوْنٌ ﴾ بہ معنی مصون و مستور ہے، ماخوذ ہے ''كَنَنْتُهُ'' سے ''إِذَا جَعَلْتَهُ فِيْ كِنٍّ''۔ جب تو کسی شے کو مستور جگہ میں رکھے گا تو کہے گا: ''كَنَنْتُهُ''، یعنی میں نے اس کو محفوظ مستور جگہ میں رکھا۔ امام حسن اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ان کو شتر مرغ کے انڈوں سے تشبیہ دی ہے، شتر مرغ ان کو پروں کے ساتھ ہوا اور غبار سے محفوظ اور مستور رکھتا ہے تو ان کا رنگ زردی مائل سفید ہوتا ہے۔ عرب کے نزدیک عورتوں کا یہ حسین ترین رنگ ہے، ورنہ عجم اور روم کے نزدیک سب سے اچھا رنگ سرخی مائل سفید ہے۔ امام سعید بن جبیر اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ان کی تشبیہ انڈے کے بطن سے دی ہے، اس سے قبل کہ ان کا چھلکا نکالا جائے اور ہاتھ ان کو چھوئیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔

امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ جب کسی شے کے حسن اور نظافت کی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: گویا وہ شتر مرغ کے انڈے ہیں جو پروں سے ڈھکے ہوتے ہیں۔[3] کسی نے کہا: ﴿ مَّكْنُوْنٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ محفوظ ہیں کسر سے، یعنی وہ کنواریاں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بَيْضٌ ﴾ سے مراد لؤلؤ ہیں، جس طرح اس آیت میں ہے: ﴿ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ۝ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴾ [الواقعة: ٢٢۔ ٢٣] ''اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں جو چھپے ہوئے موتیوں کی طرح ہیں۔'' لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں

[1] معاني القرآن (٣٠٤/٤) [2] الدر المنثور (٨٩/٧) [3] تفسير القرطبي (٨١،٨٠/١٥) فتح القدير (٥٠٢،٥١٩/٤)

﴿ اللُّؤْلُوِ الْمَكْنُوْنِ ﴾ مروی ہے[1] اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "بَيَاضُ الْبَيْضَةِ"[2] کہ اس کا پوست اور جھلی کھینچی جائے، رہی بات کہ ﴿ بَيْضٌ ﴾ کی صفت میں ﴿ مَكْنُوْنٌ ﴾ کہا، "مَكْنُوْنَاتٌ" نہ فرمایا تو یہ اس لیے کہ لفظ کے اعتبار سے ﴿ بَيْضٌ ﴾ کی صفت بیان کی ہے۔[3] (كذا في فتح البيان)

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝۵۰ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۝۵۱ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ۝۵۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ۝۵۳ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝۵۴ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝۵۵ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ۝۵۶ وَلَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝۵۷ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ۝۵۸ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝۵۹ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۶۰ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ۝۶۱

وہ (جنتی) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باہم پوچھیں گے (50) ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا: بے شک میں (اور دنیا میں) میرا ایک ہم نشین تھا (51) جو کہتا تھا: کیا بھلا تو بھی (قیامت کی) تصدیق کرنے والوں میں سے ہے؟ (52) کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم (اُٹھا کر) بدلہ دیے جائیں گے؟ (53) وہ (جنتی ساتھیوں سے) کہے گا: کیا تم (جہنم میں) جھانک کر دیکھو گے؟ (54) پھر وہ جھانکے گا تو اسے جہنم کے درمیان میں دیکھے گا (55) وہ (اس سے) کہے گا: اللہ کی قسم! یقیناً قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر ڈالتا (56) اور اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں ضرور حاضر کیے ہوؤں (مجرموں) میں سے ہوتا (57) (جنتی ساتھیوں سے کہے گا:) تو کیا پس (اب) ہم مرنے والے نہیں (58) اپنے پہلی بار مرنے کے سوا اور نہ ہمیں عذاب ہی ہوگا (59) بلاشبہ یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے (60) عمل کرنے والوں کو تو ایسی ہی (کامیابی) کے لیے عمل کرنے چاہییں (61)

اہلِ جنت کی باہم میل ملاقات:

تم چاہتے ہو کہ جھانک کر دیکھ لو، یعنی وہ ساتھی دوزخ میں پڑا ہے، اس کو جھانک کر دیکھیں کس حال میں

[1] تفسير الطبري (٢١/٤٣) [2] الدر المنثور (٧/٨٩) [3] فتح البيان (١١/٣٨٣-٣٨٨)

ہے۔ اپنی خوشی سے یہ کہنے لگا ہے کہ پہلی موت کے بعد اب ہمیں مرنا نہیں۔ انتہیٰ.

اللہ پاک اہلِ جنت کے حال کی خبر دیتا ہے کہ ایک دوسرے پر متوجہ ہوں گے اور آپس میں سوال کریں گے کہ دنیا میں کیسے تھے اور اس میں کیا کیا محنت اور مشقت اُٹھاتے تھے۔ یہ اس وقت ہوگا جب اپنی مجلسوں میں اکٹھے ہوں گے اور آپس میں شراب کا دَور چل رہا ہوگا۔ آپس میں بات چیت کریں گے۔ تختوں پر تشریف فرما ہوں گے اور خادم ان کے سامنے آجا رہے ہوں گے اور ہر خیرِ عظیم کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں لا رہے ہوں گے، ایسی چیزیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں اور نہ ہی کسی بشر کے دل میں ان کا خیال گزرا۔ ایسے عیش وعشرت میں اس حال کا ذکر کریں گے جو دنیا میں ان پر گزرا۔ چنانچہ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا: ﴿ اِنِّیۡ کَانَ لِیۡ قَرِیۡنٌ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ قَرِیۡنٌ ﴾ سے مراد شیطان ہے۔

امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ کوئی مردِ مشرک ہے جو دنیا کے اہلِ ایمان میں سے کسی کا کوئی ساتھی ہو۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے کلام میں کوئی تضاد نہیں، اس لیے کہ شیطان جنوں سے ہوتا ہے اور نفس میں وسوسہ ڈالتا ہے اور انسانوں سے ہوتا ہے تو ایسی بات کہتا ہے جس کو کان سنتے ہیں اور دونوں مل کر ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ یُوۡحِیۡ بَعۡضُهُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ؕ ﴾ [الأنعام: ١١٢] ''جن میں سے بعض بعضوں کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے ہیں۔'' اور ان میں سے ہر ایک وسوسہ ڈالتا ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّةِ وَ النَّاسِ ﴾ [الناس: ٤۔ ٦] ''وسوسہ ڈالنے والے پیچھے ہٹ جانے والے کے شر سے جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، خواہ وہ جن میں سے ہو یا انسان میں سے۔''

اسی لیے ان میں کے قائل نے کہا: ﴿ اِنِّیۡ کَانَ لِیۡ قَرِیۡنٌ ﴿ۙ۵۱﴾ یَّقُوۡلُ اَئِنَّکَ لَمِنَ الۡمُصَدِّقِیۡنَ ﴾ یعنی میرا ایک ساتھی تھا جو کہتا تھا: کیا تو بعث، نشور، حساب و جزا کا یقین کرتا ہے!! یعنی وہ یہ بات تعجب اور تکذیب، استبعاد، کفر اور عناد کے طور پر کہتا تھا کہ کیا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہوگئے تو کیا ہم بدلہ دیے جانے والے ہیں۔ امام مجاہد اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ''مُحَاسَبُوْنَ''، یعنی ہم سے محاسبہ ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''لَمَجْزِیُّوْنَ بِأَعْمَالِنَا''[2] یعنی کیا ہم اپنے اعمال کی جزا دیے جائیں گے۔ دونوں قول صحیح ہیں۔ مومن اپنے اصحاب اور ہم نشینوں سے کہے گا جو اہلِ جنت میں سے ہیں: ﴿ هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّطَّلِعُوۡنَ ﴾ یعنی اے ساتھیو! بھلا تم جھانک کر دیکھو گے، پھر جھانکا تو اس کو سوائے جحیم میں دیکھا۔

---

[1] تفسیر الطبري (٤٥/٢١) [2] تفسیر الطبري (٤٦/٢١)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید بن جبیر، خلید عصری، قتادہ، سدی اور عطاء خراسانی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مراد وسطِ جحیم ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ وسطِ جحیم میں گویا وہ ایک انگارا ہے کہ دہک رہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ اس نے جھانکا تو دیکھا کہ قوم کی کھوپڑیاں جوش کھا رہی ہیں اور ہم سے ذکر کیا گیا کہ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت میں طاق ہیں جس وقت جنت والوں میں سے کوئی چاہے گا کہ دوزخ میں اپنے دشمن کو دیکھے تو اس میں جھانکے گا، پس زیادہ شکر کرے گا۔[1]

مومن کافر سے مخاطب ہو کر کہے گا: ﴿ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴾ یعنی واللہ! تو تو لگا تھا مجھے ہلاک کرنے اگر میں تیری اطاعت کر لیتا۔ ﴿ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴾ یعنی اگر مجھ پر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو البتہ میں تیری طرح دوزخ کے بیچوں بیچ اس جگہ میں ہوتا جس جگہ عذاب میں تو حاضر کیا گیا ہے، لیکن اس نے مجھ پر فضل و کرم اور رحم کیا، چنانچہ اس نے مجھے ایمان کی ہدایت کی اور اپنی توحید کی راہ بتائی۔ ﴿ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ﴾ [الأعراف: ٤٣] ''اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی، اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ۝ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴾ یہ کلامِ مومن کے تتمہ سے ہے۔ اللہ پاک نے جو جنت میں اس کو خلود عطا کیا اور عزت والے گھر میں بغیر موت اور عذاب کے ٹھکانا اور روزی عطا فرمائی اس کا اپنی جان پر رشک کر کے کہتا ہے: کیا پھر ہم نہیں ہیں مرنے والے اپنی پہلی موت کے بعد اور نہیں ہیں ہم عذاب کیے گئے۔ اسی لیے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ یعنی بے شک البتہ یہی ہے بڑی کامیابی۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنت سے فرمائے گا: ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [المرسلات: ٤٣] ''(اے جنتیو!) کھاؤ پیو مزے سے اپنے کیے ہوئے اعمال کے بدلے۔'' فرمایا: ﴿ هَنِيْٓـًٔا ﴾ سے یہ مراد ہے کہ وہ جنت میں مریں گے نہیں۔ چنانچہ اس وقت انھوں نے کہا: ﴿ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴾ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''عَلِمُوْا أَنَّ كُلَّ نَعِيْمٍ فَإِنَّ الْمَوْتَ يَقْطَعُهُ'' یعنی انھوں نے جانا کہ کوئی سی نعمت ہو موت اس کو قطع کرتی ہے تو کہا: ﴿ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴾ کہا گیا نہیں، تو وہ بولے: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اہلِ جنت کے کلام سے ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے ہے، معنی یہ ہیں کہ ایسی نعمتوں اور کامیابی کے لیے

---

① تفسیر الطبري (٢١/٤٨، ٤٩) تفسیر ابن کثیر (٤/١٢) ② تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٢١٥) تفسیر ابن کثیر (٤/١٢)

چاہیے کہ عمل کرنے والے دنیا میں عمل کریں، تا کہ آخرت میں وہ اس کی طرف جائیں۔[1] دو مردوں کا قصہ ذکر کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں شریک تھے، چنانچہ وہ قصہ اس آیتِ کریمہ کے عموم میں داخل ہے۔

امام ابوجعفر ابن جریر رحمہ اللہ نے فرات بن ثعلبہ بہرانی سے ﴿ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا ہے کہ دو مرد شریک تھے۔ چنانچہ ان کے لیے آٹھ ہزار دینار جمع ہوئے اور اُن میں سے ایک کے لیے حرفہ (پیشہ، ہنر) تھا اور دوسرے کا کوئی حرفہ نہ تھا۔ جو ہنر مند تھا اس نے دوسرے سے کہا کہ تیرے پاس کوئی حرفہ نہیں ہے، اس لیے میں اپنے آپ کو تجھ سے الگ کرنے والا اور مال کا بٹوارا کرنے والا ہوں، پھر اس نے اس سے مقاسمہ (مال تقسیم) کیا اور علاحدگی اختیار کی۔ پھر اس مرد نے ہزار دینار میں ایک گھر خریدا جو کسی بادشاہ کا تھا جو مر گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے یار کو بلایا اور اس کو وہ گھر دکھایا، پھر کہا تو کیسا دیکھتا ہے؛ میں نے اس کو ایک ہزار دینار میں خریدا ہے۔ وہ بولا: کیا خوب ہے۔ پھر جب وہ نکلا تو کہا: اے اللہ! میرے اس یار نے یہ گھر ہزار دینار سے خریدا ہے اور میں تجھ سے جنت کے گھروں میں سے ایک گھر مانگتا ہوں، چنانچہ ہزار دینار خیرات کر دیے۔ پھر ٹھہرا رہا، جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ٹھہرے۔ پھر اس مرد نے ہزار دینار سے ایک عورت سے شادی کی۔ پھر اس کو بلایا اور اس کے لیے کھانا تیار کیا، پھر جب وہ اس کے پاس آیا تو کہا: میں نے اس عورت سے ایک ہزار دینار میں شادی کی ہے تو وہ بولا: یہ کیا خوب ہے۔ چنانچہ جب واپس آیا تو کہا: اے رب! میرے یار نے ہزار دینار میں ایک عورت سے شادی کی ہے اور میں تجھ سے حور عین میں سے ایک عورت کا سوال کرتا ہوں، پس اس نے ہزار دینار خیرات کر دیے۔

پھر وہ ٹھہرا رہا جس قدر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ٹھہرے۔ پھر اس نے دو ہزار دینار میں دو باغ خریدے۔ پھر اس کو بلایا اور وہ باغ دکھلائے۔ پھر کہا کہ میں نے دو ہزار دینار میں یہ دو باغ خریدے ہیں۔ اس نے کہا: کیا خوب ہیں۔ پھر جب وہ نکلا تو کہا: اے رب! میرے یار نے دو باغ دو ہزار دینار سے خریدے ہیں اور میں تجھ سے جنت میں دو باغ مانگتا ہوں۔ پس دو ہزار دینار خیرات کر دیے۔ پھر ان دونوں کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے ان کو وفات دی۔ پھر اس خیرات کرنے والے کو لے چلا اور اس کو ایک گھر میں داخل کیا، جو اس کو تعجب میں ڈالتا ہے اور اچانک نظر پڑی تو ایک عورت جھانک رہی ہے، جس کے حسن سے اس کے نیچے روشنی ہو رہی ہے، پھر اس کو دو باغوں میں داخل کیا اور ایسی شے میں جس کو اللہ خوب جانتا ہے، پس اس وقت اس نے کہا کہ یہ چیزیں اس شخص کے ساتھ کیسی مشابہت رکھتی ہیں جس کا حال دنیا میں ایسا ایسا تھا؟ فرشتہ بولا کہ یہ وہی ہے اور یہ مکان اور عورت تیرے واسطے ہیں۔ اس نے کہا: بے شک میرا ایک ساتھی کہتا تھا: تو یقین لانے والوں میں سے ہے! اس شخص سے کہا گیا کہ وہ تو دوزخ میں ہے۔ کہا: کیا تم جھانکنے والے ہو۔ پھر جھانکا تو اس کو دوزخ کے درمیان میں دیکھا، اس وقت اس نے کہا: تُو تو مجھے گڑھے میں

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۵۱،۵۲)

گرانے ہی لگا تھا اور اگر میرے رب کا احسان اور نعمت نہ ہوتی تو میں البتہ محضرین میں سے ہوتا۔ (الآیات)۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قصہ اس شخص کی قراءت کو قوت دیتا ہے جس نے ﴿ لَمِنَ الْمُصَّدِّقِیْنَ ﴾ کو بہ تشدید پڑھا ہے،[1] یعنی اس لیے کہ اس میں صدقہ خیرات کا ذکر ہے، کیوں کہ ''مُصَّدِّقِیْنَ'' بہ تشدید صاد تصدق سے ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابوحفص سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے اسماعیل سدی سے اس آیت کے متعلق پوچھا: ﴿ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ﴾ امام ابوحفص رحمہ اللہ نے کہا: سدی رحمہ اللہ نے مجھ سے کہا ہے کہ یہ بات تجھے کس شے نے یاد دلائی؟ میں نے کہا کہ میں نے اس کو ابھی پڑھا تو میں نے یہ پسند کیا کہ تم سے اس کے بارے میں پوچھوں۔ چنانچہ سدی رحمہ اللہ نے کہا: ''أَمَّا فَاحْفَظْ'' یعنی تو نے جو اس کا پوچھا پس یاد رکھ کہ بنی اسرائیل میں دو شریک تھے۔ ان میں سے ایک مومن تھا اور دوسرا کافر تھا، پھر وہ چھے ہزار دینار پر جدا ہوئے، ہر ایک کو تین تین ہزار دینار ملے، پھر وہ ٹھہرے رہے جس قدر اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی کہ وہ ٹھہریں، پھر وہ ملے تو کافر نے مومن سے کہا کہ تو نے اپنے مال کے ساتھ کیا کیا؟ تو نے اس سے کسی شے کو مارا؟ (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''أضربت به شيئا'' معنی اس کے واللہ اعلم یہ ہیں کہ اس روپے کو بڑھانے کے لیے خرید و فروخت کی خاطر چلا۔ پھر جس طرح کہ اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿ وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ [المزمل: ٢٠] ''بعض دوسرے زمین میں چل پھر کر اللہ تعالیٰ کا فضل (یعنی روزی بھی) تلاش کریں گے۔'' اسی وجہ سے فقہاء کی اصطلاح میں ایک قسم کی تجارت کو مضاربت کہتے ہیں۔ از مصحح سلمہ اللہ تعالیٰ)۔

اس سے کسی شے میں تجارت کی؟ مومن نے اس سے کہا: نہیں۔ پھر تو نے کیا کیا؟ تو اس نے کہا: میں نے اس سے زمین اور کھجور کے درخت اور میوے اور نہریں خریدیں ہزار دینار میں۔ کہا: پس مومن نے اس سے کہا: کیا تو نے یہ کیا ہے؟ وہ بولا: ہاں، کہا: پھر مومن لوٹ آیا، یہاں تک کہ جب رات ہوئی تو نماز پڑھی، جس قدر اللہ نے چاہا کہ پڑھے، پھر جب فارغ ہوا تو ہزار دینار لیے اور ان کو اپنے سامنے رکھا۔ پھر کہا: الٰہی! بے شک فلاں یعنی اس کے شریک کافر نے زمین اور کھجور کے درخت اور میوے اور نہریں ہزار دینار میں خریدی ہیں، پھر وہ کل مرے گا اور اُن کو چھوڑ جائے گا۔ الٰہی! میں نے اس ہزار دینار کے عوض زمین اور کھجور کے درخت اور میوے اور نہریں تجھ سے جنت میں خریدیں، پھر صبح کو اٹھا تو ان کو مساکین میں تقسیم کر دیا۔ کہا: پھر وہ ٹھہرے رہے جب تک اللہ نے چاہا کہ وہ ٹھہریں۔ پھر وہ ملے تو کافر نے مومن سے کہا: تو نے اپنے مال میں کیا کیا، کیا تو نے اس سے کچھ مارا یا کسی شے میں تجارت کی؟ مومن نے کہا کہ نہیں اور اس سے پوچھا کہ تو نے کیا کیا؟ اس نے کہا کہ میری زمین کی محنت و مشقت

[1] تفسير الطبري (٢١/٤٥، ٤٦)

مجھے سخت لگی تھی تو میں نے ہزار دینار کے غلام خریدے کہ وہ میرے لیے اس میں کام کاج کریں۔ مومن نے کہا: کیا تو نے یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔

پھر مومن لوٹ آیا یہاں تک کہ جب رات ہوئی تو نماز پڑھی جس قدر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ پڑھے، پھر جب فارغ ہوا تو ہزار دینار لے کر اپنے سامنے رکھے اور کہا: اے اللہ! بے شک فلاں، یعنی اس کے شریک کافر نے غلام خریدے ہیں دنیا کے غلاموں میں سے اور ایک ہزار دینار قیمت ادا کی ہے، وہ کل مرے گی تو ان کو چھوڑ جائے گا، یا وہ مریں گے تو اس کو چھوڑ جائیں گے۔ اے اللہ! میں نے ان ہزار دینار کے عوض تجھ سے جنت میں غلام خریدے۔ کہا: پھر وہ صبح کو اٹھا تو ان کو مساکین میں تقسیم کر دیا۔ کہا: پھر وہ اتنا عرصہ ٹھہرے رہے جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ٹھہریں، پھر وہ ملے تو کافر نے مومن سے کہا کہ تو نے اپنے مال سے کیا کیا؟ کیا تو نے اس سے کسی شے میں کوشش کی یا کوئی تجارت کی؟ مومن نے کہا: نہیں، پھر اس سے پوچھا کہ تو نے کیا کیا؟ اس نے کہا: میرا سب کام تو پورا ہو چکا تھا سوائے ایک چیز کے۔ فلاں عورت کا خاوند مر گیا تھا تو میں نے اس کو ہزار دینار مہر دیا، پھر وہ عورت ہزار دینار اور اس کے ساتھ اتنے ہی اور لے کر میرے پاس آگئی۔ مومن نے اس سے کہا: کیا تو نے ایسا کیا؟ اس نے کہا: ہاں۔

کہا: پھر مومن لوٹ آیا، یہاں تک کہ جب رات ہوئی تو نماز پڑھی جس قدر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ پڑھے، پھر جب فارغ ہوا تو اپنے باقی ہزار دینار لیے اور اپنے سامنے رکھے اور کہا: الٰہی! بے شک فلاں، یعنی اس کے کافر شریک نے دنیا کی عورتوں میں سے ایک عورت کے ساتھ ایک ہزار دینار میں شادی کی ہے، پھر وہ کل مرے گا تو اس کو چھوڑ جائے گا، یا وہ کل مرے گی تو اسے چھوڑ جائے گی۔ اے اللہ! میں تیری طرف نکاح کا پیام بھیجتا ہوں کہ اس ہزار دینار کے عوض جنت میں ایک بڑی آنکھوں والی حور سے میرا نکاح کر دینا۔ پھر وہ صبح کو اٹھا اور انھیں مساکین میں بانٹ دیا۔ کہا: پس مومن کے پاس کوئی شے نہ رہی۔ کہا: پھر اس نے ایک کرتا روئی کا پہنا اور صوف کی ایک کملی لی، پھر اس نے ایک مضبوط رسی لی اور اس کو اپنے گردن پر رکھا، تاکہ کوئی شے بنائے اور کوئی شے اپنی قوت سے کھودے۔ کہا: پھر اس کے پاس ایک شخص آیا اور کہا: اے اللہ کے بندے! کیا تو میرے پاس مزدوری کرتا ہے کہ ماہوار طے شدہ مزدوری پر تو میرے جانوروں کی خدمت کرے، ان کو چارہ کھلائے اور ان کا لید اور گوبر صاف کرے؟ کہا: میں کرتا ہوں۔ کہا: پھر اس نے ماہ بہ ماہ کی تنخواہ پر اپنی جان کو اس کا مزدور بنا دیا کہ اس کے جانوروں کی خدمت کیا کرے۔ کہا اور جانوروں کا مالک ہر روز صبح کو آتا اور اپنے جانوروں کو دیکھتا، پھر جب ان میں سے کسی جانور کو دُبلا دیکھتا تو اس کا سر پکڑتا، پھر اس کی گردن کو مارتا، پھر اس سے کہتا کہ آج کی رات کے جَو تو نے چرا لیے، یعنی تیری آج کی مزدوری نہیں ملے گی۔ کہا: پھر جب مومن نے یہ شدت دیکھی تو کہا کہ البتہ میں اپنے شریک کافر کے پاس جاؤں گا اور اس کی زمین میں کام کروں گا۔ پس وہ روز بہ روز یہ ٹکڑا مجھے کھلائے گا اور یہ دو کپڑے مجھے پہنائے گا جب یہ پرانے پڑ جائیں گے۔

کہا: پھر وہ اس کے ملنے کے ارادے سے چلا اور اس کے دروازے تک پہنچا تو شام ہوگئی تھی، کیا دیکھتا ہے کہ ایک سفید چونا گچ محل ہے بہت بلند اور اس کے گرد دربان ہیں۔ اس نے ان سے کہا کہ میرے لیے اس محل کے مالک سے اجازت مانگو، کیوں کہ جب تم اس سے میرا ذکر کرو گے تو وہ خوش ہوگا، انھوں نے اس سے کہا کہ اگر تو سچا ہے تو چلا جا اور کسی کونے میں سو جا اور جب تو صبح کو اٹھے تو اس کے سامنے آنا۔ کہا کہ مومن چلا اور اپنی آدھی کملی اپنے نیچے بچھائی اور آدھی اوپر ڈال کر سو رہا۔

چنانچہ جب صبح کو اٹھا تو اپنے شریک کے پاس آیا اور اس کے سامنے آیا تو اس کا کافر شریک نکلا اور وہ سوار تھا۔ اس نے جب اسے دیکھا تو پہچان لیا اور اس کے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور سلام اور مصافحہ کیا، پھر اس سے کہا: کیا تو نے اپنے مال سے ویسی چیزیں نہیں لیں جیسی میں نے لیں؟ اس نے کہا کہ ہاں۔ کافر نے کہا اور یہ میرا حال ہے اور یہ تیرا حال ہے۔ کہا: ہاں۔ اس نے کہا کہ مجھے بتا تو نے اپنے مال میں کیا کیا؟ اس نے کہا: تو مجھ سے اس کے متعلق مت پوچھ۔ اس نے کہا ہے کہ پھر تجھے میرے پاس کون سی شے لائی؟ کہا کہ میں اس لیے آیا ہوں کہ تیری اس زمین میں کام کروں اور تو مجھے دو ٹکڑے روزانہ کھانے کو دے اور میرے یہ دو کپڑے جب پرانے ہو جائیں تو اُن کے بدلے دوسرے پہنا دے۔ اس نے کہا: نہیں، میں تیرے لیے وہ کروں گا جو اس سے بہتر ہوگا، لیکن تو مجھ سے کسی بھلائی کی توقع نہ رکھ، جب تک تو مجھے یہ خبر نہ دے کہ تو نے اپنے مال کے ساتھ کیا کیا؟ کہا: میں نے وہ مال کسی کو قرض دے دیا ہے۔ کہا کہ کس کو دیا ہے؟ کہا کہ ملی وفی کو، یعنی ایسے شخص کو قرض دیا ہے جو بڑا غنی اور بڑا قرض ادا کرنے والا ہے۔ کہا: وہ کون ہے؟ کہا: وہ اللہ ہے میرا رب۔ کہا اور وہ اس سے مصافحہ کر رہا تھا، اس نے اس سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر کہا: ﴿ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴾

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ”مُحَاسَبُوْنَ“۔ کہا: پھر وہ کافر چلا گیا اور اس کو چھوڑ دیا۔ کہا: پھر جب مومن نے اسے اس حال میں دیکھا کہ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور واپس نہیں آتا تو لوٹ آیا اور اس کو چھوڑ دیا۔ مومن تو زمانے کی سختی میں گزر بسر کرتا ہے اور کافر زمانے کی فراخی میں زندگی گزارتا ہے۔ کہا: پھر جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ تعالیٰ مومن کو جنت میں داخل کرے گا، وہ گزرے گا تو کیا دیکھے گا کہ وہ زمین اور کھجور اور میووں کے درختوں اور نہروں میں ہوگا، چنانچہ کہے گا کہ یہ کس کے لیے ہیں؟ تو کہا جائے گا کہ یہ تیرے لیے ہیں، پس وہ کہے: اے سبحان اللہ! کیا یہ میرے عمل کی فضیلت ہے کہ میں ایسا ثواب دیا جاؤں۔ کہا: پھر آگے جائے گا تو دیکھے گا کہ ایک قبہ سرخ یاقوت مجوف کا ہے جس میں ایک بڑی بڑی آنکھوں والی حور ہے، کہے گا: یہ کس کے لیے ہے؟ تو کہا جائے گا کہ یہ تیرے لیے ہے۔ چنانچہ کہے گا: کیا یہ میرے عمل کی فضیلت ہے کہ مجھے ایسا اجر دیا جائے۔

کہا: پھر وہ مومن اپنے شریک کافر کو یاد کرے گا: ﴿ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ﴾ کہا: جنت تو عالیہ ہے اور نار ہاویہ۔

کہا: پھر اللہ تعالیٰ اسے اس کا شریک دکھائے گا جو دوزخ میں اہلِ نار کے درمیان میں ہوگا، پھر جب مومن اسے دیکھے گا تو پہچان لے گا اور کہے گا: ﴿ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ... إلىٰ قوله ... لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴾ یعنی ایسی شے کے واسطے جس کا اس پر احسان کیا۔ پس چاہیے کہ عمل کریں عمل کرنے والے۔ کہا: پھر مومن اس سختی کو یاد کرے گا جو دنیا میں اس پر گزر چکی ہے تو وہ یاد کرے گا کہ دنیا کی سختی اس پر موت سے زیادہ سخت نہ تھی۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ ﴿ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴾ معطوف ہے ﴿ يُطَافُ ﴾ پر۔ تقدیر یہ ہے: "فَيُقْبِلُ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ" مستقبل کو ماضی کے پیرائے میں صرف اس لیے ادا کیا ہے کہ تاکید ہو اور اس سے واقع ہونے کی حقیقت پر دلالت کرے۔ معنی یہ ہیں کہ جنت میں جنت والوں پر لوگ شراب کے پیالے لیے پھریں گے، پھر وہ شراب پیتے پیتے ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے اور دنیا میں ان پر جو حالات گزر چکے ہیں اور جو کام انھوں نے کیے ہیں، ان کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ یہ اس سے پوچھے گا اور وہ اس سے کہ کیوں جی فلاں کام کیسا ہوا تھا اور فلاں قصہ کیسے گزرا تھا؟ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ شراب پئیں گے اور شراب پر بات چیت کریں گے جس طرح شراب پینے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ بات چیت کیا کرتے ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: ؎

فَمَا بَقِيَتْ مِنَ اللَّذَّاتِ إِلَّا أَحَادِيْثُ الْكِرَامِ عَلَى الْمَدَامِ

یعنی زمانے کے فساد کی وجہ سے ساری لذتیں جاتی رہیں، اب کوئی لذت باقی نہیں رہی، مگر یہی کرام کے قصے کہانیاں شراب پینے کی حالت میں کہ شراب پیتے جاتے ہیں اور سخی لوگوں کے قصے بیان کر کے لذت لیتے ہیں۔ غرضیکہ جنت میں شراب پیتے وقت دنیا کے حالات کا ذکر کرنا تتمہ نعیم جنت سے ہے، کیوں کہ تکلیف کی حالت کو اَبدی راحت اور آرام میں یاد کرنا سرور کا باعث ہوتا ہے، اسی لیے جنت والے جس وقت ایک ایک دوسرے پر بات چیت کرنے میں متوجہ ہوں گے اور ایک دوسرے سے سوال کریں گے تو اُن میں سے ایک کہنے والا یہ کہے گا کہ میرا ایک قرین تھا، یعنی دنیا میں میرا ایک یار دوست تھا جو دوبارہ جی اٹھنے کا منکر اور کافر تھا۔

چنانچہ ﴿ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴾ اس پر دال ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ قَرِيْنٌ ﴾ سے مراد شیطان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ دو بھائی تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ دو شریک تھے: ایک تو کافر تھا، اس کا نام قطروس تھا اور دوسرا مومن تھا، اس کا نام یہوذا تھا، یہ وہی دونوں ہیں جن کی خبر اللہ پاک نے سورۃ الکہف میں دی ہے: ﴿ وَاضْرِبْ لَهُمْ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۲۱۳_۳۲۱۵) تفسیر ابن کثیر (۴/۱۲_۱۵)

مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴾ [الكهف: ٣٢]

''اور انھیں ان دو شخصوں کی مثال بھی سنا دے جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے باغ دے رکھے تھے اور جنھیں کھجوروں کے درختوں سے ہم نے گھیر رکھا تھا اور دونوں کے درمیان کھیتی لگا رکھی تھی۔'' غرضیکہ کوئی بھی ہو، مومن کہے گا کہ دنیا میں میرا ایک دوست تھا جو مجھ سے یوں کہتا تھا کہ کیا تو دوبارہ جی اٹھنے اور جزا کے یقین کرنے والوں میں سے ہے۔ ساتھی کی طرف سے یہ سوالیہ انداز اس مومن کی ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے کہ اللہ پاک نے جو دوبارہ جی اُٹھنے کا وعدہ دیا، اس نے اس کو مانا اور اس کی تصدیق کی۔

جمہور نے ''مُصَدِّقِيْنَ'' بہ تخفیفِ صاد پڑھا ہے تصدیق سے: ''أَيْ: لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ بِالْبَعْثِ'' اور کسی نے صاد کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس طرح کس نے پڑھا ہے، اس کے معنی بعید ہیں، کیوں کہ یہ تصدق سے ہے تصدیق سے نہیں ہے۔ اس کی تاویل اس طرح سے ہو سکتی ہے کہ مومن نے جو ثواب کی غرض سے اپنا مال خیرات کیا، ''قرین'' نے اس کا اس پر انکار کیا اور اس کی یہ علت بیان کی کہ دوبارہ جی اٹھنا تو بعید از قیاس ہے۔ چنانچہ یوں کہا کہ جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہوگئے تو کیا ہم جزا دیے جائیں گے، یعنی کیا ہم کو ہمارے اعمال کا بدلہ ملے گا اور ان پر ہم سے حساب لیا جائے گا، اس کے بعد کہ ہم مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''مَدِيْنُوْنَ'' کے معنی ''مَسُوْسُوْنَ'' ہیں۔ ''يُقَالُ: دَانَهُ إِذَا سَاسَهُ'' یعنی کیا مٹی ہو جانے کے بعد ہماری سیاست کی جائے گی۔

آیت میں یہ جو تین استفہام ہیں ان میں قراء نے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ نافع نے تو پہلے اور دوسرے کو ایک ہمزۂ استفہام کے ساتھ پڑھا ہے اور تیسرے کو الف کی زیر دے کر بغیر استفہام کے پڑھا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ بھی ان کے موافق ہیں، مگر تیسرے کو بغیر ہمزۂ استفہام پڑھتے ہیں اور امام ابن عامر رحمہ اللہ نے پہلے اور تیسرے کو دو ہمزوں سے اور دوسرے کو الف کی زیر کے ساتھ بغیر استفہام پڑھا ہے۔ اور باقی قراء رحمہم اللہ نے سب میں استفہام کے ساتھ پڑھا ہے، پھر اختلاف کیا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ تو بہ ہمزۂ واحدہ غیر مطولہ استفہام کرتے ہیں اور اس کے بعد ہمزۂ ساکنہ خفیفہ پڑھتے ہیں اور امام ابوعمرو رحمہ اللہ مطولہ پڑھتے ہیں اور امام عاصم اور حمزہ رحمہما اللہ نے دو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔[1]

بالجملہ جب مومن اپنے جنتی ساتھیوں سے وہ قول بیان کر چکا جو اس سے دنیا میں اس کے یار نے کہا تھا تو اس کے بعد ان سے کہا: ﴿ هَلْ أَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴾ یعنی اے میرے بھائیو! کیا تم اہلِ نار کی طرف جھانک کر دیکھنے والے ہو کہ میں تم کو وہ قرین دکھاؤں جس نے مذکورہ قول کہا تھا کہ آگ میں اس کی کیا حالت ہے۔ پس جنت والے کہیں گے کہ تو اس کو ہم سے خوب پہچانتا ہے۔ امام ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استفہام بہ معنی امر ہے: ''أَيْ: اِطَّلِعُوْا''[2]

---

[1] فتح القدير (٥٢٢/٤) [2] تفسير القرطبي (٨٢/١٥)

یعنی تم جھانکو۔ کسی نے کہا ہے کہ اس قول کا قائل اللہ پاک ہے۔ کسی نے کہا: فرشتے ہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

﴿ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴾ یعنی پھر اس مومن نے آگ میں جھانکا تو اپنے قرین کو دوزخ کے وسط میں دیکھا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ سَوَآءِ ﴾ کسی چیز کا وسط ہے۔ جمہور نے ﴿ مُّطَّلِعُوْنَ ﴾ بہ تشدید طائے مفتوحہ وفتح نون اور ﴿ فَاطَّلَعَ ﴾ بہ صیغۂ معروف طلوع سے پڑھا ہے۔ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بہ سکونِ طاء وفتحِ نون اور ''فَأُطْلِعَ'' بہ قطعِ ہمزۂ مضمومہ وکسرِ لام بہ صیغۂ ماضی مجہول پڑھا ہے۔ یہی قراءت امام ابو عمرو رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَاطَّلَعَ ﴾ پر اس قراءت کی بنا پر دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ فعل مضارع متکلم ہو اور بنا بر جواب استفہام منصوب ہو۔ دوسرا یہ ہے کہ فعل ماضی ہو۔ حماد بن ابی عمار نے ''مُطْلِعُوْنَ'' کو بہ تخفیف طا وکسرِ نون اور ''فَأُطْلِعَ'' بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لحن ہے، اس لیے کہ نون اور اضافت کا جمع کرنا جائز نہیں ہے، اگر مضاف ہوتا تو یوں کہتا: ''هَلْ أَنْتُمْ مُطَّلِعِيَّ'' گو امام سیبویہ اور فراء رحمہما اللہ نے اس کی مثل بیان کیا ہے، لیکن شاذ ہے اور کلامِ عرب سے خارج ہے۔

غرضیکہ جب مومن نے اپنے قرین کو جھانکا اور اس کو آگ میں دیکھا تو کہا: ﴿ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ﴾ جو قسم حرفِ تاء سے ہوتی ہے اس میں تعجب کے معنی ہوتے ہیں، یعنی اس نے تعجب کی قسم کھا کر کہا: قسم ہے اللہ کی! بے شک قریب تھا کہ تو مجھے بہکا کر ہلاک کر ڈالے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَتُرْدِیْنِ ﴾ کے معنی ''لَتُهْلِكُنِي'' ''رِدَى'' بہ معنی ہلاکت ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: اگر ''لَتُرْدِيْنِ لَتُوْقِعُنِي فِي النَّارِ'' کہا جاتا تو بھی جائز ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ ''إرداء'' بہ معنی ایقاع آتا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: واللہ! البتہ مقرر تو اس کے قریب ہوا تھا کہ مجھے اغوا کرے تو میں اتارا جاؤں تیری جگہ میں۔ دونوں معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ چنانچہ جس شخص نے کسی انسان کو بہکایا تو مقرر اس نے اس کو ہلاک کیا۔

بالجملہ پھر اس مومن نے کہا: ﴿ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ ﴾ یعنی اگر مجھ پر میرے رب کی رحمت اور انعام نہ ہوتا، یعنی مجھے اسلام اور ہدایتِ حق نہ دی ہوتی اور اس نے مجھ کو گمراہی سے بچایا نہ ہوتا تو میں بھی تیرے ساتھ آگ میں حاضر کیے جانے والوں میں سے ہوتا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: البتہ میں تیرے ساتھ آگ میں حاضر کیا جاتا۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''أحضر'' صرف شر میں استعمال کیا جاتا ہے۔[1] پھر جب مومن اپنی بات پوری کر چکا اس قرین کے ساتھ جو آگ میں ہے تو اپنے جنتی ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا: ﴿ اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ ﴾ ہمزہ استفہام تقریری کا ہے اور اس میں تعجب کے معنی ہیں۔ حرفِ فاء عطف کے لیے ہے، جیسا کہ اس کے نظائر میں

[1] تفسير القرطبي (١٥/٨٢ـ٨٤) فتح القدير (٤/٥٢٢، ٥٢٣)

ہوا کرتا ہے: ”أَيْ: أَنَحْنُ مُخَلَّدُوْنَ مُنَعَّمُوْنَ فَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُوْلٰى“ یعنی کیا ہم ہمیشہ عیش وعشرت میں رہنے والے ہیں اور ہم اپنی دنیا کی پہلی موت کے بعد جو دنیا میں ہو چکی، اب مرنے والے نہیں ہیں۔

یہ بات اس نے اس طور پر کہی کہ اللہ پاک نے جو جنت والوں پر ایسی نعمتوں کا انعام فرمایا جو کبھی منقطع نہ ہوں گی اور وہ وہاں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے اور کبھی نہ مریں گے تو اس نے اس سے خوش ہو کر یہ کہا۔ کسی نے کہا ہے کہ جنت والے یہ سوال فرشتوں سے اس وقت کریں گے جب موت ذبح کی جائے گی۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ بات اہلِ جنت کافروں کی ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے کہیں گے، کیوں کہ کافر لوگ دوبارہ جی اٹھنے کا انکار کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ موت تو صرف دنیا کی موت ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ ﴿ إِلَّا مَوْتَتَنَا ﴾ کا نصب بنا بر مصدریت ہے اور استثناء مفرغ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ منقطع ہو بہ معنی ”لٰكِنْ“۔ امام زید بن علی رحمہ اللہ نے ”بِمَائِتِيْنَ“ پڑھا ہے۔[1] ﴿ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴾ کلامِ مومن کے تتمہ سے ہے، یعنی ہم کو عذاب نہ ہو گا جس طرح کہ کفار معذب ہوں گے۔ پھر اہلِ جنت جس عیش و آرام میں ہیں، اس کی طرف اشارہ کر کے مومن نے یوں کہا: ﴿ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ یعنی بے شک یہ امرِ عظیم اور قائم رہنے والی نعمتیں اور ہمیشگی کی جنت ہے جس میں ہم ہیں البتہ یہ وہ بڑی کامیابی ہے جس کا اندازہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی صفت بیان ہو سکتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴾ تتمہ کلامِ مومن سے ہے، یعنی ایسی بڑی عطا اور فضلِ عظیم پانے کے لیے چاہیے کہ عمل کرنے والے عمل کریں، کیوں کہ نفع دینے والی تجارت یہی ہے، وہ عمل نہیں جو دنیائے فانی کے لیے ہوتا ہے اور اس کے مزے اور فائدے تو تکالیف اور فکروں کے ساتھ ملے ہوتے ہیں اور جلد ہی ختم ہو جاتے ہیں، کیوں کہ یہ صفقۂ خاسرہ (زائل ہونے والی تجارت) ہے، اس کی نعمتیں اور بھلائیاں منقطع اور زائل ہوتے ہیں اور ان کا مالک جلد ہی ان کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے، سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا ہے اور بنجارہ چل دیتا ہے۔

کسی نے کہا کہ ﴿ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ اللہ پاک کے قول سے ہے۔ (قاله ابن عباس) کسی نے کہا ہے کہ فرشتوں کے قول سے ہے، پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جا رہا تھا اور آپ ﷺ کا دستِ مبارک میرے ہاتھ میں تھا کہ آپ ﷺ نے ایک جنازہ دیکھا، آپ جلدی چلے، یہاں تک کہ قبر پر آئے، پھر اپنے دونوں گھٹنوں پر بیٹھے، پھر آپ ﷺ رونے لگے، یہاں تک کہ خاکِ نمناک کو تر کیا۔ پھر فرمایا: ﴿ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴾[2] نیز امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ ایک مریض کے پاس آیا، اس حالت میں کہ اس کی جان کنی ہو رہی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴾[3]

---

[1] فتح القدير (٥٢٣/٤) [2] الدر المنثور (٩٥/٧) [3] فتح القدير (٥٢٥/٤) فتح البيان (٣٨٨/١١۔٣٩١)

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ۝۶۲ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً
لِّلظّٰلِمِيْنَ ۝۶۳ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْۤ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝۶۴
طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ۝۶۵ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ
مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝۶۶ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ۝۶۷ ثُمَّ
اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ۝۶۸ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ۝۶۹ فَهُمْ
عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ۝۷۰

کیا یہ مہمانی بہتر ہے یا (دوزخ میں) تھوہر کا درخت؟ (62) بلاشبہ ہم نے اسے ظالموں کے
لیے آزمائش بنایا ہے (63) بے شک وہ ایک درخت ہے جو دوزخ کی تہ میں اُگتا ہے (64) اس کا
پھل گویا کہ وہ شیطانوں کے سر ہیں (65) تو بلاشبہ وہ (دوزخی) اس میں سے کھائیں گے، پھر
اس سے (اپنے) پیٹ بھریں گے (66) پھر اس پر بے شک ان کے لیے (پینے کو) گرم کھولتے
پانی کا آمیزہ ہوگا (67) پھر یقیناً ان کی واپسی بھڑکتی آگ کی طرف ہوگی (68) بلاشبہ انھوں نے
اپنے باپ دادوں کو گمراہ پایا (69) تو وہ انھی کے نقشِ قدم پر دوڑے جاتے ہیں (70)

جہنمیوں کا کھانا اور پینا تھوہر کا درخت اور کھولتا ہوا پانی:

کیا یہ مہمانی اچھی ہے، یعنی آخرت میں اس کو کھائیں گے اور وہ گلے میں پھنسے گا، ایک عذاب یہ بھی ہوگا، یا خراب کرنا دنیا میں یہ کہ سن کر گمراہ ہوتے ہیں کہ دوزخ میں سبز درخت کیسے اُگا۔ شیطانوں کے سر سانپوں کو کہا۔ اس سے پیٹ بھریں گے، یعنی بہت بھوکے ہوں گے تو آگ سے ہٹا کر یہ کھانا پانی کھلا پلا کر پھر آگ میں ڈالیں گے۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا یہ جنت کی نعمتیں جن کا ذکر کیا اور وہ کھانے پینے، نکاح وغیرہ لذت کی چیزیں جو اس میں ہیں، بہترین مہمانی اور عطا ہے یا زقوم کا درخت جو جہنم میں ہے؟ احتمال ہے کہ اس درخت سے مراد ایک معین درخت ہو، جیسا کہ بعض نے کہا ہے کہ وہ ایک درخت ہے، اس کی شاخیں جہنم کی ساری جگہوں کی طرف دراز ہوں گی، جس طرح کہ طوبیٰ کا درخت ہے کہ جنت میں کوئی گھر ایسا نہیں جس میں اس کی ایک ٹہنی نہ ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد جنسِ شجر ہو جس کو زقوم کہتے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴾ [المؤمنون: ۲۰] ”اور وہ درخت جو طورِ سیناء پہاڑ سے نکلتا ہے جو تیل نکالتا ہے اور کھانے والے کے لیے سالن ہے۔“ اور اسی کی تائید یہ آیت کرتی ہے: ﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ

اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ۝ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴾ [الواقعة: ٥١۔ ٥٢] ”پھر تم اے گمراہو جھٹلانے والو! البتہ کھانے والے ہو تھوہر کا درخت۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شجرۂ زقوم کا ذکر کیا گیا تو اس سے اہلِ ضلالت فتنے میں پڑ گئے اور بولے کہ تمھارا صاحب تم کو خبر دیتا ہے کہ آگ میں ایک درخت ہے، حالاں کہ آگ تو درختوں کو کھا جاتی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴾ وہ درخت آگ سے غذا دیا گیا اور اسی سے مخلوق ہوا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ابوجہل ۔لعنه الله۔ نے کہا کہ زقوم تو یہی خرما و مسکہ ہے، میں اس کے خوب لقمے ماروں گا اور خوب کھاؤں گا۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اے محمد! ہم نے جو تجھے شجرۂ زقوم کی خبر دی ہے تو یہ اس لیے ہے کہ اس سے ہم لوگوں کو جانچیں کہ ان میں سے کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٠] ”جو رویا (عینی رویت) ہم نے آپ کو دکھائی تھی، وہ لوگوں کے لیے صاف آزمایش ہی تھی اور اسی طرح وہ درخت بھی جس سے قرآن میں اظہارِ نفرت کیا گیا ہے۔ ہم انھیں ڈرا رہے ہیں، لیکن یہ انھیں اور بڑی سرکشی میں بڑھا رہا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴾ یعنی اس کے اُگنے کی اصل جگہ آگ کی تہ میں ہے۔ ﴿ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ سے مراد اس کی برائی کرنا ہے اور اس کے ذکر کی کراہت دلانا ہے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیطانوں کے بال آسمان کی طرف کھڑے ہوتے ہیں۔[2] زقوم کے درخت کی تشبیہ جو شیطانوں کے سروں سے دی، گو وہ مخاطب لوگوں کے نزدیک معروف نہیں ہیں، مگر وہ اس لیے کہ یہ بات دلوں میں جمی ہوئی ہے کہ شیطان مکروہ شکل کے ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایک قسم کے سانپ ہیں، ان کے سر بدصورت ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ نبات کی ایک قسم ہے، اس کا خوشہ بہت بدصورت ہوتا ہے۔ ان دونوں احتمالوں میں نظر ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ان کو ذکر کیا ہے۔ پہلا قول زیادہ قوی اور زیادہ مناسب ہے۔[3] والله أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اس درخت سے کھائیں گے کہ جس سے بڑھ کر بدصورت اور بدشکل کوئی درخت نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پیدا ہونے کے اعتبار سے بدمزہ، بدبودار اور بدطبع بھی ہے۔ چنانچہ البتہ وہ اس کو کھانے پر مجبور ہوں گے، کیوں کہ اس کے سوا وہ اور کچھ کھانے کے لیے نہیں پائیں گے، یا اسی جیسی اور کوئی چیز، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ

---

[1] تفسير الطبري (٢١/ ٥٢۔٥٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣٢١٦)
[3] تفسير الطبري (٢١/ ٥٣۔ ٥٤) تفسير ابن كثير (٤/ ١٥۔ ١٦)

ضَرِيْعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴾ [الغاشية: ٦۔ ٧] ''ان کے لیے سوائے کانٹے دار درختوں کے اور کچھ کھانا نہ ہوگا جو نہ موٹا کرے گا نہ بھوک مٹائے گا۔''

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾ [آل عمران: ١٠٢] ''اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنا اس سے ڈرنا چاہیے۔ اگر زقوم کا ایک قطرہ دنیا کے دریاؤں میں ٹپکایا جائے تو وہ زمین والوں پر ان کی زندگی کو تنگ کر دے، پھر اس کا کیا حال ہوگا جس کا کھانا ہی وہ ہوگا۔[1] (ورواه الترمذي والنسائي وابن ماجه من حديث شعبة وقال الترمذي: حسن صحيح)

قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ مراد زقوم کے اوپر حمیم کا پینا ہے۔ ان سے ایک روایت میں ''مَزْجًا مِنْ حَمِيْمٍ'' ہے۔[2] ان کے غیر نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کے لیے غساق اور صدید کے ساتھ وہ چیز ملائی جائے گی جو اُن کی شرم گاہوں اور آنکھوں سے بہے گی۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن ابی امامہ باہلی رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے، کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اہلِ نار کی طرف پانی قریب کیا جائے گا تو وہ اس سے کراہت کرے گا، پھر جب اس سے نزدیک کیا جائے گا تو وہ اس کے مُنہ کو بُھون دے گا اور اس کے سر کا چمڑا اس میں گر جائے گا، پھر جب اس کو پیے گا تو اس کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا، یہاں تک کہ وہ اس کی دُبر سے نکل جائیں گی۔[3]

نیز امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جس وقت اہلِ نار بھوکے ہوں گے تو استغاثہ کریں گے، چنانچہ ان کی فریاد رسی زقوم کے درخت سے کی جائے گی، پھر وہ اس سے کھائیں گے تو وہ اُن کے چہروں کے چمڑوں کو اُچک لے گا، چنانچہ اگر کوئی ایسا شخص جو اُن کو پہچانتا ہوگا، ان پر سے گزرے گا تو البتہ ان کو پہچان لے گا، ان کے چہروں سے جو ان کے چمڑوں میں ہیں۔ پھر ان پر پیاس ڈالی جائے گی تو وہ فریاد رسی چاہیں گے، چنانچہ ان کی فریاد رسی اس پانی سے کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہے، جس کی گرمی انتہا کو پہنچی ہو گی۔ پھر جب اس کو ان کے منہ کے قریب کریں گے تو اس کی گرمی سے ان کے چہروں کے چمڑے بھن جائیں گے، کون سے چہرے جن سے چمڑے پہلے ہی گر پڑے ہوں گے اور وہ پانی اس شے کو گھلا ڈالے گا جو اُن کے پیٹ میں

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٨٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٣١٣/٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٢٥) تفسير ابن أبي حاتم (٧٢٣/٣) اس کی سند میں ''اعمش'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٦٧٨٢)

② تفسير الطبري (٥٥/٢١)

③ سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٨٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢١٧/١٠) اس کی سند میں ''عبیداللہ بن بسر'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٨٩٧)

ہو گی۔ جب وہ چلیں گے تو ان کی انتڑیاں بہہ رہی ہوں گی۔ اور ان کے چمڑے گر پڑیں گے، پھر لوہے کی موگریوں سے ان کو ماریں گے تو ہر عضو اپنے مقابل پر گر پڑے گا، وہ موت اور ہلاکت کو پکاریں گے۔[1]

﴿ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ﴾ یعنی اس قصے کے بعد ان کا لوٹ کر آگ کی طرف آنا ہے جو شعلہ مارتی ہو گی اور جحیم کی طرف جو جل رہی ہو گی اور سعیر کی طرف جو لپٹ مارتی ہو گی۔ چنانچہ کبھی وہ اس میں جائے گا اور کبھی اس میں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ﴾ [الرحمن: ٤٤] ''وہ اس کے اور کھولتے ہوئے گرم پانی کے درمیان چکر کھائیں گے۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر کے وقت یہ آیت اسی طرح پڑھی ہے۔ یہ تفسیر حسن اور قوی ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں اس طرح ہے: "ثُمَّ اِنَّ مَقِيْلَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ" سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! قیامت کے دن دوپہر نہ ہو گی، یہاں تک کہ اہلِ جنت، جنت میں قیلولہ کریں گے اور اہلِ دوزخ، دوزخ میں قیلولہ کریں گے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا﴾[2] [الفرقان: ٢٤] ''البتہ ان جنتیوں کا ٹھکانا بہتر ہو گا اور خواب گاہ بھی عمدہ ہو گی۔'' امام ثوری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے روایت کیا ہے: "لَا يَنْتَصِفُ النَّهَارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يَقِيْلَ هٰؤُلَاءِ وَيَقِيْلَ هٰؤُلَاءِ قَالَ سُفْيَانُ: أُرَاهُ ثُمَّ قَرَأَ: ﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا﴾ ثُمَّ إِنَّ مَقِيْلَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيْمِ" حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس تفسیر کی بنیاد پر حرف ﴿ثُمَّ﴾ عاطفہ ہو گا خبر پر خبر کے لیے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو ان کو یہ جزا دی اس لیے کہ انھوں نے اپنے باپ دادوں کو گمراہی پر پایا اور انھوں نے صرف اس پانے کی وجہ سے اس میں بغیر کسی دلیل کے اور بغیر کسی برہان کے ان کی پیروی کی۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿فَهُمْ عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسی چال ہے جو تیز دوڑنے کے مشابہ ہو۔[3] امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے پیچھے وہ بھی بے وقوف بنے جاتے ہیں۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ذٰلِكَ﴾ کا اشارہ جنت کی نعمتوں کی طرف ہے جس کا ذکر کیا ہے اور یہ مبتداء ہے اس کی خبر ﴿خَيْرٌ﴾ ہے اور ﴿نُّزُلًا﴾ تمیز ہے۔ اصل لغت میں "نُزُلٌ"، فضل وریع کو کہتے ہیں: (''فضل'' بہ معنی

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٢١٧)
② تفسیر الطبري (٢١/٥٦)
③ تفسیر الطبري (٢١/٥٧)
④ تفسیر ابن کثیر (٤/١٥، ١٦)

فزونی ونیکوئی و احسان ہے اور ریع بہ معنی گوالیدن وفزون شدن ہے۔ "نزل" بہ ضم آنچہ پیشِ مہمان فرود آیندہ نہند از طعام و جز آن انزال جمع وفزونی و برکت۔ صراح)۔ پھر اس کا استعارہ اس شے کے لیے کیا گیا جو کسی شے سے حاصل ہوتی ہے اور وہ رزق جو اس قابل ہے کہ اس کے ساتھ نزول کریں اور اس میں مقیم ہوں اور رہیں بسیں۔ خیریت بہ نسبت اس شے کے ہے جس کو کفار نے اس کے علاوہ اختیار کیا، معنی یہ ہیں کہ اے محمد! تو اپنی قوم سے ملامت اور تمسخر کے طور پر یوں کہہ دے کہ کیا وہ رزقِ معلوم بہتر ہے، جس کا حاصل ازروئے مہمانیِ لذت اور سرور ہے، یا زقوم کا درخت جس کا حاصل غم ہے اور تکلیف ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ بہتر ہے انزال کے (جمع نزل) میں جن کے سبب سے ازروئے نزل باقی رہتے ہیں، یا اہلِ نار کا نزل بہتر ہے، یعنی زقوم۔① زقوم وہ شے ہے جس کے کھانے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ یہ مشتق ہے "تزقم" سے۔ "تزقم" کراہت اور بدبو کی وجہ سے مشقت کے ساتھ نگلنے کو کہتے ہیں۔ زقوم میں اختلاف ہے کہ آیا وہ ان درختوں میں سے ہے جن کو عرب لوگ جانتے پہچانتے ہیں یا نہیں۔ اس میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ دنیا کے درختوں میں سے ایک جانا پہچانا درخت ہے، پس امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک کڑوا بدبودار درخت ہے جو تہامہ میں ہوتا ہے اور تمام درختوں سے زیادہ خبیث ہے۔ امام قطرب رحمہ اللہ کے علاوہ لوگوں نے کہا ہے کہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو روئیدگی کا قاتل ہے۔② کسی نے کہا ہے کہ وہ ایک زہریلا درخت ہے، جب وہ کسی کے بدن سے چھو جائے تو ورم کر آئے، پھر مر جائے۔ شجرہ کی اضافت زقوم کی طرف اسم کی مسمی کی طرف اضافت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ دنیا کے درختوں میں غیر معروف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ابن زبعری نے قریش کے سرداروں سے کہا تھا کہ محمد ہم کو زقوم سے ڈراتا ہے، حالاں کہ وہ تو بربری زبان میں مسکہ وخرما (کھجور) ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایسا یمن کی لغت میں ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس درخت کا ذکر فرمایا تو ظالم لوگ اس کی وجہ سے آزمائش میں پڑے، وہ بولے کہ آگ میں کوئی درخت کیسے ہوگا؟! اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جبکہ وہ اس کی وجہ سے فتنے میں پڑے اور اس کے وجود کی تکذیب کی۔③ اور یہ نہ جانا کہ جو ذات پاک حیوان کے پیدا کرنے پر قادر ہے، یعنی سمندل (کیڑا) جو آگ میں جیتا ہے اور اس سے لذت لیتا ہے، وہی اس پر بھی قادر ہے کہ آگ میں درخت پیدا کرے اور اس کو اس سے محفوظ رکھے۔ کسی نے کہا ہے کہ ظالموں کے لیے زقوم کو فتنہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ان کے لیے محنت ہے، اس لیے کہ وہ اس سے عذاب کیے جائیں گے۔ ظالمین سے مراد اس جگہ کفار ہیں، یا وہ اہلِ معاصی جو موجبِ نار ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اس کے منکروں کی تردید کرنے کے لیے اس کے اوصاف بیان کیے، ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ

① معاني القرآن (٣٠٦/٤) ② تفسير القرطبي (٨٥/١٥) ③ تفسير الطبري (٥٢/٢١) فتح القدير (٥٢٤/٤)

الْجَحِيْمِ ﴾ یعنی وہ تو ایک درخت ہے جو جہنم کی گہرائی میں سب سے نیچے اُگتا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کی جڑ تو جہنم کی گہرائی میں ہے اور اس کی ٹہنیاں جہنم کے مختلف طبقات میں بلند ہوتی ہے۔[1]

ابن مردویہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ابوجہل آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے، پھر جب وہ دور ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴾ [القيامة: ٣٤] یعنی تیری خرابی ہو تیرا برا ہو، پھر جب ابوجہل نے سنا تو کہا: اے محمد تو کس کو وعید سناتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھ کو۔ اس نے کہا کہ کس چیز کے ساتھ تو مجھے وعید سناتا ہے؟ فرمایا: "أُوعِدُكَ بِالْعَزِيزِ الْكَرِيمِ" تو ابوجہل بولا: کیا میں عزیز کریم نہیں ہوں؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴾ [الدخان: ٤٣۔ ٤٧] پھر جب ابوجہل کو وہ بات پہنچی جو اس کے بارے میں نازل ہوئی تو اس نے اپنے پیاروں کو جمع کیا، پھر ان کی طرف مسکہ وخرما نکالا، پھر کہا "تَزَقَّمُوا مِنْ هٰذَا، فَوَ اللّٰهِ مَا يَتَوَعَّدُكُمْ مُحَمَّدٌ إِلَّا بِهٰذَا" یعنی تم اس میں سے خوب کھاؤ، پس قسم ہے اللہ کی! محمد تم کو وعید نہیں سناتا مگر اسی کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْۤ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴾۔[2] پھر اللہ تعالیٰ نے زقوم کا دوسرا وصف بیان کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ "طَلْعٌ" حقیقت میں نام ہے ثمرِ نخل کا جو پہلے پہل نکلتا ہے، اس لیے اس درخت کے پھل پر اس کا اطلاق مجاز باستعارہ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ زقوم کا پھل اور وہ شے جس کا وہ حامل ہے گویا اپنی قباحت و ہولناکی اور بدشکلی میں شیطانوں کے سر ہیں۔ گویا ایک خیالی شے کو محسوس شے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ گو وہ دکھائی نہیں دیتی ہے۔ منظور اس بات کا بتانا ہے کہ قباحت اور بدصورتی میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے، جیسے جس شخص کی برائی بیان کرتے ہیں تو اس کی تشبیہ میں کہتے ہیں کہ وہ شیطان ہے اور جس کی خوبی بیان کرتے ہیں تو اس کی تشبیہ میں بولتے ہیں کہ گویا وہ فرشتہ ہے جس طرح اس آیت میں ہے: ﴿ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴾ [يوسف: ٣١] "یہ بشر نہیں، یہ تو نہایت معزز فرشتہ ہے۔" اسی باب سے امرئ القیس کا یہ شعر ہے:

أَيَقْتُلُنِي وَالْمَشْرَفِيُّ مُضَاجِعِيْ وَمَسْنُوْنَةٌ زُرْقٌ كَأَنْيَابِ أَغْوَالِ

یعنی کیا تو مجھے قتل کرے گا اس حال میں کہ مشرفی تلوار میرے ہم بستر ہو اور نیزے بارہ رکھے ہوئے ہیں کبود رنگ مثل دانتوں غولوں کے۔ (مشرفی وہ تلوار ہے جو دیارِ عرب کے گاؤں مشارف کی طرف منسوب ہے۔ سیف مشرفی بولتے ہیں، مشارفی نہیں کہتے۔ جمع جب اس وزن پر ہوتی ہے تو اس کی طرف نسبت نہیں کی جاتی۔ کذا فی الصراح۔ شعر میں جو مسنونۃ آیا ہے وہ فتح القدیر میں اسی طرح ہے اور نزہہ میں مستۃ ہے)

---

[1] تفسير البغوي (٤٢/٧) [2] الدر المنثور (٩٦/٧)

حکایت:

"نزهة الألباء في طبقات الأدباء" میں ذکر کیا ہے کہ امام ابوعبیدہ معمر بن مثنی سے فضل بن ربیع کی مجلس میں کسی نے پوچھا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ حالاں کہ وعدہ اور وعید اسی شے کے ساتھ واقع ہوتی ہے جس کا مثل معروف ہو اور یہ معروف نہیں ہے۔ تو امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جو عرب سے بات کی ہے تو انہیں کے کلام کے انداز پر کی ہے۔ کیا تو نے امرئ القیس کا قول نہیں سنا: "أَيَقْتُلُنِي... الخ" حالاں کہ عرب نے کبھی غول کو نہیں دیکھا، لیکن چونکہ غول کا حال ان کو ہولناک کرتا تھا، اس لیے اس کے ساتھ وعید کیے گئے۔ فضل بن ربیع نے اور سائل نے اس بات کی تعریف کی۔ اس کا پورا قصہ کتاب مذکور میں لکھا ہوا ہے۔[1]

امام زجاج اور فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیاطین ہولناک سانپ ہیں، ان کے سر اور اعراف ہوتے ہیں ("أعراف"، جمع "عُرف" بالضم کی ہے۔ عرف کا ترجمہ صراح میں فش اسپ کیا ہے۔ فرہنگ میں کہا ہے کہ 'فش' بالفتح کا کلِ اسپ وبالضم بال و دُمِ اسپ ہے)۔ یہ سانپ جسمانی لحاظ سے سب سے بڑھ کر بدصورت اور خبیث اور خفیف ہوتے ہیں، جسمانی لحاظ سے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ ایک قبیح روئیدگی کا نام ہے جو یمن میں مشہور و معروف ہے اور اس کو استن و شیطان کہتے ہیں۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ عرب کے نزدیک معروف نہیں ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ وہ درخت ہیں جن کو صرم کہتے ہیں، اس بنیاد پر عرب کو اس شے کے ساتھ خطاب ہوا جس کو وہ جانتے ہیں اور یہ درخت موجود ہے، چنانچہ کلام حقیقت ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کو استعارات سے خطاب کیا جن کے وہ خوگر ہو رہے تھے۔ بالجملہ پھر اگر یہ خیال ہو کہ ایسے بدبودار اور بدشکل درخت کی طرف دیکھیں گے، اسے کھائیں گے نہیں۔ خیر شامہ اور باصرہ ہی کو تکلیف ہوگی کھانا تو نہیں پڑے گا، یعنی صرف اس کی بدبو سونگھنی اور بدشکل دیکھنی پڑھے گی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا ﴾ یعنی وہ تو اس سے کھانے والے ہیں بالضرور کھائیں گے، بھوک کی شدت کے مارے، یا اس کے کھانے کے لیے ان کو زبردستی کریں گے۔ ﴿ مِنْهَا ﴾ کی ضمیر ﴿ شَجَرَةٌ ﴾ کی طرف راجع ہے، یا "طَلْعٌ" کی طرف راجع ہے، چوں کہ وہ ﴿ شَجَرَةٌ ﴾ کی طرف مضاف ہے، اس لیے "طَلْعٌ" نے اس سے تانیث حاصل کر لی ہے۔

پھر اگر یہ وہم ہو کہ ایسے برے درخت سے کھانا پڑے گا تو خیر زبردستی کچھ چکھ لیا جائے گا، اس لیے فرمایا: ﴿ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴾ یعنی چکھنا کیسا اس سے تو ان کو پیٹ بھرنا پڑے گا، اس لیے کہ وہ تو اس کے کھانے پر زبردستی کیے جائیں گے، یہاں تک کہ ان کے پیٹ بھر جائیں گے۔ چنانچہ یہ ان کا کھانا اور میوہ ہے اہلِ جنت کے رزق کے عوض۔ جب کھانا اور میوہ کھا چکے تو پانی چاہیے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴾

---

[1] نزهة الألباء في طبقات الأدباء (١/٤٧۔ ٤٨) [2] تفسير القرطبي (١٥/٨٧)

یعنی پھر اس درخت کو کھانے کے بعد ان کے لیے گرم پانی کی ملونی ہے۔ "شَوْبٌ" بہ معنی خلط ہے، یعنی ملانا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: محاورے میں بولتے ہیں: "شَابَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ إِذَا خَلَطَهُمَا بِشَيْءٍ يَشُوبُهُمَا شَوْبًا وَشِيَابَةً" جمہور نے "شَوْبًا" بہ فتحِ شین پڑھا ہے اور یہ مصدر ہے اور شیبان نحوی نے بالضم پڑھا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ مفتوح تو مصدر ہے اور مضموم اسم ہے بہ معنی "مشوب" جیسے: "نقض" بہ معنی "منقوض" ہے۔[1]

بالجملہ اللہ پاک نے خبر دی کہ ان کا کھانا اس درخت سے ملایا جائے گا گرم پانی کے ساتھ، تاکہ ان کے عذاب کے لیے شدید تر ہو اور ان کے حال کے لیے سخت تر ہو، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴾ [محمد: ١٥] "اور انھیں گرم کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو اُن کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔" پھر اگر یہ خیال ہو کہ زقوم کے کھانے اور حمیم کے پینے کے بعد کچھ چھٹی مل جائے گی تو ایسا نہ ہوگا۔ فرمایا: ﴿ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴾ یعنی اس کے بعد ان کا جحیم کی طرف پھر آنا ہے۔ یہ یوں ہے کہ حمیم جحیم سے باہر ہے، اس کے پینے کے لیے اس پر وارد کیے جائیں گے جس طرح اونٹ وارد کیے جاتے ہیں۔ پھر ان کو جحیم کی طرف پھیر لیا جائے گا، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴾ [الرحمن: ٤٤] "اس کے اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان چکر کھائیں گے۔" یہ قول اقل کا ہے۔ جمہور اس بات پر ہیں کہ حمیم جحیم میں داخل ہے اور وہ اس سے کبھی نہ نکلیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ زقوم اور حمیم وہ نزل (مہمانی، کھانا) ہے، جو اس میں داخل ہونے سے پہلے ان کے سامنے لایا جائے گا۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ثُمَّ ﴾ بہ معنی واو ہے۔

جملہ ﴿ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴾ ماقبل کی تعلیل ہے، یعنی وہ جو زقوم، حمیم اور جحیم کے مستحق ہوئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے باپ دادوں کو دنیا میں گمراہ پایا، پھر تقلید اور ضلالت کی راہ سے بغیر کسی حجت اور دلیل کے ان کی پیروی کی۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے آباء کی تقلید کی، حالاں کہ اس کے لیے نہ ان کے پاس کوئی ایسی شے تھی جس کے ساتھ دلیل پکڑی جائے اور نہ اُن کے آباء کے پاس تھی۔[2]

﴿ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴾ چنانچہ وہ ان کے قدموں پر دوڑتے ہیں بغیر اس کے کہ یہ سوچیں کہ وہ حق پر ہیں یا نہیں، باوجود اس کے کہ ذرا سے تامل سے ان کا باطل پر ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ "إِهْرَاعٌ" بہ معنی "إِسْرَاعٌ شَدِيْدٌ" ہے، یعنی تیز دوڑنا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "إِسْرَاعٌ بِرَعْدَةٍ" ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "يُهْرَعُوْنَ يَسْتَحِثُّوْنَ مِنْ خَلْفِهِمْ" جس وقت سردی کسی کو آگ کی طرف بہت تیز دوڑاتے ہوئے لائے تو اس وقت محاورے میں بولتے ہیں: "جَاءَ فُلَانٌ يُهْرَعُ إِلَى النَّارِ" مفضل نے کہا ہے کہ "يُزْعَجُوْنَ مِنْ شِدَّةِ الْإِسْرَاعِ"

---

[1] فتح القدير (٥٢٤/٤) [2] تفسير أبي السعود (١٩٤/٧)

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هُرِعَ وَأُهْرِعَ إِذَا اسْتُحِثَّ وَأُزْعِجَ"۔[1] معنی یہ ہیں کہ سرعت میں اپنے آباء کی پیروی کرتے ہیں، گویا وہ اپنے آباء کی اتباع کی طرف برانگیختہ کیے جاتے ہیں۔[2]

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٧١﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِم مُّنذِرِينَ ﴿٧٢﴾ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنذَرِينَ ﴿٧٣﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٧٤﴾

اور بلاشبہ ان سے پہلے بہت سے اگلے لوگ گمراہ ہوئے (71) اور یقیناً ہم نے ان میں ڈرانے والے بھیجے تھے (72) پھر دیکھ لیجیے ان کا انجام کیسا ہوا جنھیں ڈرایا گیا تھا؟ (73) سوائے اللہ کے چنے ہوئے بندوں کے (74)

ڈرائے گئے لوگوں کا انجامِ بد:

ڈرانے والے سب کے پاس بھیجتے ہیں، ان میں سے نیک بچتے ہیں اور بد کھپتے ہیں۔ انتہٰی.

اللہ پاک اگلی اُمتوں کی خبر دیتا ہے کہ ان میں سے اکثر گمراہ تھے، وہ اللہ کے ساتھ اور معبود ٹھہراتے تھے اور یہ ذکر کیا کہ اس نے ان میں ڈرانے والے بھیجے کہ اللہ کے عذاب اور پکڑ سے ڈرائیں کہ جو کوئی اس کا منکر ہو گا اور اس کے سوا غیر کو پوجے گا تو اس پر عذابِ الٰہی نازل ہو گا اور انھوں نے اپنے رسولوں کی مخالفت و تکذیب پر اصرار کیا۔ پھر اس نے جھٹلانے والوں کو ہلاک کر ڈالا اور مومنوں کو بچا لیا اور ان کو منصور و مظفر کیا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَانظُرْ كَيْفَ عٰقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٧٣﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قبل ان لوگوں کے جن کا ذکر ہوا گزشتہ اُمتوں میں سے اکثر گمراہ ہوئے اس طرح سے کہ گمراہ آباء و اجداد کی تقلید کی۔ دلیل کو چھوڑا، غور و فکر کو ترک کیا، تاویل اختیار کی۔ اللہ پاک نے اگلی اُمتوں میں رسول بھیجے، جنھوں نے ان کو عذاب سے ڈرایا اور ان کو تقلید کے برے انجام سے خوف دلایا اور ان سے حق بیان کیا، پھر اس نے ان پر کچھ اثر نہ کیا۔ ﴿ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عٰقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴾ کا خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، یا ہر اس شخص کو جس کو ان کے آثار کا مشاہدہ کرنے کی قدرت حاصل ہے۔ یعنی اب دیکھ ان لوگوں کا کیسا انجام ہوا جن کو رسولوں نے ڈرایا، کیوں کہ وہ آگ کی طرف گئے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کا انجام عذاب ہوا۔ کفارِ مکہ کو خوف دلاتا ہے۔[4]

---

[1] تفسير القرطبي (٨٨/١٥) [2] فتح البيان (١١/٣٩١_٣٥٥) [3] تفسير ابن كثير (١٧/٤) [4] فتح القدير (٥٢٥/٤)

پھر اللہ پاک نے ان میں سے اپنے مومن بندوں کو نکال لیا۔ فرمایا: ﴿ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ یعنی مگر وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے خالص کر لیا کہ ان کو ایمان و توحید کی اور دلیل کو اختیار کرنے کی اور تقلید چھوڑ دینے کی توفیق دی۔ کسی نے ﴿ الْمُخْلِصِيْنَ ﴾ کو بکسرِ لام پڑھا ہے، یعنی وہ لوگ جنھوں نے اپنی طاعت اللہ کے لیے خالص کی اور جو چیزیں اس کو متغیر کرتی ہیں، ان میں سے کسی شے کے ساتھ اس کو نہیں ملایا۔ پھر جب اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ اس نے گلی اُمتوں میں ڈرانے والے بھیجے تو اس اجمال کی کچھ تفصیل کی۔ ارشاد فرمایا:[1]

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٦﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿٧٧﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿٧٨﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٩﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨١﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿٨٢﴾

اور یقیناً نوح نے ہمیں پکارا تھا تو (دیکھو!) ہم کیا ہی خوب جواب دینے والے ہیں (75) اور ہم نے اسے اور اس کے اہل کو بہت بڑی پریشانی سے نجات دی (76) اور ہم نے اس کی اولاد کو باقی رہنے والے بنا دیا (77) اور ہم نے اس (کے ذکرِ خیر) کو پیچھے آنے والوں میں باقی رکھا (78) نوح پر تمام جہانوں میں سلام ہو (79) بلاشبہ ہم نیکو کاروں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں (80) بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا (81) پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا (82)

نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر:

کشتی میں اسّی (۸۰) یا تراسی (۸۳) آدمی بچے تھے، ان کی اولاد نہیں چلی، انہیں کے تین بیٹوں سے چلی۔ سام زمین کے درمیان میں بسا۔ اس سے عرب، توران اور ایران پیدا ہوئے۔ یافث شمال میں بسا۔ اس سے ترک، خلج اور یاجوج ماجوج پیدا ہوئے۔ حام جنوب میں بسا۔ اس سے ہند اور حبش پیدا ہوئے۔ نوح علیہ السلام پر سلام ہو، یعنی ہمیشہ خلق ان پر سلام بھیجتی ہے سارے جہاں میں۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ کا یہ حال ذکر کیا کہ وہ راہِ نجات سے بہک گئے تو اس کا مفصل بیان کرنا شروع فرمایا۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کا ذکر کیا اور اس تکذیب کا ذکر کیا جو اُن کی قوم نے کی۔ باوجود طویل مدت کے ان میں سے بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے۔ وہ ان میں پچاس کم ایک ہزار سال رہے۔ پھر جب ان پر یہ زمانہ دراز ہوا اور قوم کی تکذیب ان پر سخت گزری اور جس قدر انھوں نے ان کی دعوت کی اسی قدر

[1] فتح البیان (۱۱/۳۹۵)

ان کی نفرت اور بڑھی تو انھوں نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہوں، لہٰذا تو بدلہ لے۔

چنانچہ اللہ پاک قوم پر ان کی ناراضی کے سبب سے خفا ہوا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴾ یعنی نوح نے ہم کو پکارا تھا تو ہم کیا خوب اس کی پکار پر پہنچنے والے ہیں اور ہم نے اس کو اور اس کے گھر کو کربِ عظیم سے بچا دیا، یعنی ان کی تکذیب اور ایذا دہی سے۔ ﴿ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ باقی نہ رہی مگر نوح علیہ السلام کی اولاد۔ امام سعید بن ابی عروبہ رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے ان الفاظ کو روایت کیا ہے کہ سارے لوگ نوح علیہ السلام کی ذریت سے ہیں۔[1] امام ترمذی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے حدیث سعید بن بشیر عن قتادہ عن الحسن عن سمرہ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ فرمایا کہ سام، حام اور یافث ہیں۔[2] امام احمد رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سام عرب کے باپ ہیں اور حام حبش کے باپ ہیں اور یافث روم کے باپ ہیں۔[3] (ورواه الترمذي عن بشر بن معاذ العقدي عن يزيد بن زريع عن سعيد وهو ابن أبي عروبة عن قتادة به. وقال الحافظ أبوعمر بن عبدالبر وقد روى عن عمران بن حصين رضي الله عنه عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم مثله)

اس جگہ روم سے مراد رومِ اول ہیں، یعنی یونان، جو رومی بن لیطی بن یونان بن یافث بن نوح علیہ السلام کی طرف منتسب ہیں۔ امام سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نوح علیہ السلام کے تین بیٹے ہوئے: سام، یافث اور حام۔ پھر ان تین میں سے ہر ایک کے تین تین بیٹے ہوئے۔ چنانچہ سام کے عرب، فارس اور روم پیدا ہوئے اور یافث کے ترک، صقالبہ اور یاجوج ماجوج پیدا ہوئے اور حام کے قبط، سودان اور بربر پیدا ہوئے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے بھی اسی کے مثل مروی ہے۔[4] واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "يُذْكَرُ بِخَيْرٍ" یعنی ان کا ذکر بھلائی سے کیا جاتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "لِسَانَ صِدْقٍ لِلْأَنْبِيَاءِ كُلِّهِمْ"۔ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے آخرین میں اُن کے لیے ثنائے حسن باقی رکھی۔[5] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ سلام اور ثنائے حسن باقی رکھی۔

---

① تفسير الطبري (٥٩/٢١)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٣٠) تفسير الطبري (٥٩/٢١) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢١٨/١٠) اس کی سند میں حسن بصری مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے، نیز حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے بھی محلِ اختلاف ہے۔

③ مسند أحمد (٦/٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٣١) المعجم الكبير (١٤٥/١٨) حسن بصری رحمہ اللہ مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے، نیز حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے بھی محلِ اختلاف ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٦٨٣)

④ تفسير ابن كثير (١٧/٣) ⑤ تفسير الطبري (٦٠/٢١)

قولہ تعالیٰ: ﴿ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اس ذکرِ جمیل اور ثنائے حسن کی تفسیر ہے جو اللہ نے ان پر باقی رکھی کہ جمیع طوائف اور امتوں میں ان پر سلام بھیجا جاتا ہے۔ ﴿ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ یعنی ہم اس طرح سے بدلہ دیتے ہیں اس شخص کو جو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے اللہ کی اطاعت میں احسان کرتا ہے کہ اس کے لیے لسانِ صدق کرتے ہیں، جس سے وہ اپنے مرتبے کے مطابق ذکر کیا جاتا ہے جو اسے نصیب ہوا۔ فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی بے شک وہ ہمارے ان بندوں میں سے ہے جو تصدیق و توحید و یقین کرتے ہیں۔ ﴿ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے دوسروں کو ہلاک کر ڈالا، پھر نہ ان میں سے کوئی پلک مارتی آنکھ باقی بچی اور نہ ذکر رہا۔ نہ عین و اثر رہا اور ان کو صرف اسی قبیح صفت سے پہچانا جاتا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ لَقَدْ ﴾ میں حرفِ لام توطۂ قسم کا ہے۔ ﴿ نَادٰىنَا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے اپنی قوم پر بد دعا کی جب قوم نے ان کی نافرمانی کی۔ اللہ پاک نے ان کی بد دعا قبول فرمائی اور اُن کی قوم کو طوفان سے ہلاک کر ڈالا۔ چنانچہ ندا اس جگہ ندائے دعا و استغاثہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴾ [نوح: ٢٦] ''اے میرے رب! تو روئے زمین پر کسی کافر کو رہنے سہنے والا نہ چھوڑ۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾ [القمر: ١٠] ''میں بے بس ہوں تو میری مدد کر۔''

قولہ: ﴿ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴾ میں حرفِ لام توطۂ قسم کا ہے: "أَيْ: وَاللّٰهِ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ لَهٗ نَحْنُ"۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ لَهٗ كُنَّا"[2] اور حرفِ واو تعظیم کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے ہم کو پکارا اور ہم نے اس کی پکار سن لی اور اس کی قوم کو ہلاک کر ڈالا اور اس کو اور اس کے اہل کو نجات دی۔ اہل سے مراد ان کے اہلِ دین ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان پر ایمان لائے تھے۔ یہ اسّی (٨٠) آدمی تھے۔ یا مراد ان کی بی بی اور اولاد ہیں، تین بیٹے اور ان کی تین بیبیاں۔ "کرب عظیم" سے مراد غرق ہونا ہے، یا ان کی قوم کی تکذیب اور طرح طرح کی ایذا رسانی جو وہ کرتے تھے۔

﴿ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ صرف انھیں کی اولاد کو باقی رکھا نہ کہ ان کے سوا اور کسی کو۔ چنانچہ ضمیر فصل ﴿ هُمُ ﴾ اسی بات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کی دعا سے کافروں کو ہلاک کر ڈالا، ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا اور مومنین کشتی میں ان کے ساتھ تھے، وہ مر گئے، جیسا کہ کہا گیا ہے اور باقی نہ رہی مگر نوح علیہ السلام کی اولاد۔ امام سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے اور سارے لوگ ان کی اولاد

[1] تفسير ابن كثير (١٨،١٧/٤) [2] تفسير القرطبي (٨٩/١٥)

سے ہیں۔ چنانچہ سام تو عرب، فارس، روم اور یہود و نصاریٰ کا باپ ہے اور حام باپ ہے سوڈان کا مشرق سے مغرب تک سندھ، ہند، نوب، زنج، حبشہ، قبط اور بربر وغیرہم کا اور یافث باپ ہے صقالب، ترک، خزر اور یاجوج ماجوج وغیرہم کا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ جو لوگ نوح علیہ السلام کے ساتھ تھے، ان کی یہی ذریت تھی، چنانچہ یہ دو آیتیں اس پر دال ہیں:

﴿ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ﴾ [بني إسرائيل: ۳] ''ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کر لیا تھا۔''

دوسری یہ آیت: ﴿ قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [هود: ٤٨] ''فرمایا گیا کہ اے نوح! ہماری جانب سے سلامتی اور ان برکتوں کے ساتھ اتر، جو تجھ پر ہیں اور تیرے ساتھ کی بہت سی جماعتوں پر اور بہت سی وہ اُمتیں ہوں گی جنھیں ہم فائدہ تو ضرور پہنچائیں گے، لیکن پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔'' چنانچہ اس بنا پر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ پاک نے ان کی ذریت کو اور اُن کے ہمراہیوں کی ذریت کو باقی رکھا نہ ان کی ذریت کو جو کافر ہوئے، کیوں کہ ان کو تو اللہ پاک نے ڈبو دیا، پھر ان کے لیے کوئی ذریت باقی نہ رکھی۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

(أخرج الترمذي و حسنه وابن جرير وابن أبي حاتم عن سمرة بن جندب عن النبيﷺ في الآية قال: حام وسام و يافث. وأخرج أحمد وابن سعد و الترمذي وحسنه وأبو يعلى وابن المنذر والطبراني والحاكم وصححه عن سمرة أن النبيﷺ قال: « سام أبو العرب وحام أبو الحبش ويافث أبو الروم » والحديثان هما من سماع الحسن عن سمرة وفي سماعه منه مقال معروف وقد قيل: إنه لم يسمع منه إلا حديث العقيقة فقط وما عداه فبواسطة قال ابن عبدالبر: وقد روي عن عمران بن حصين عن النبيﷺ مثله. وأخرج البزار وابن أبي حاتم والخطيب في تالي التلخيص عن أبي هريرةؓ قال رسول اللهﷺ: « ولد نوح ثلاثة: سام وحام ويافث فولد سام العرب والفارس والروم.والخير فيهم وولد يافث ياجوج وماجوج والترك والصقالية ولا خير فيهم وولد حام القبط والبربر والسودان » وهو عن حديث إسماعيل بن عياش عن يحيى بن سعيد عن سعيد بن المسيب عنه)[2]

طوفانِ عام کا بیان:

سیدنا ابو الوفاء الصدیق صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ طوفان عام ہوا جو تمام شہروں اور آدمیوں کو شامل ہوا۔ آدمیوں میں سے کوئی باقی نہ بچا سوائے ان لوگوں کے جو اُن کے ساتھ کشتی میں تھے۔ فارسی اور تمام مجوسی اور کلدانی، اہلِ بابل و ہند، اہلِ چین اور بہت سی مشرقی اُمتیں طوفان کا انکار کرتے ہیں۔ بعض فرس نے اقرار کیا ہے، لیکن یوں کہا ہے کہ طوفان سوائے شام اور مغرب کے نہیں ہوا اور تمام بستیوں کو عام نہیں ہوا اور اس نے نہیں ڈبویا مگر بعض لوگوں کو۔ وہ عقبۂ حلوان سے آگے نہیں بڑھا اور ممالکِ مشرق کی طرف نہیں پہنچا۔ کہا: اور واقع ہوا طہمورث کے زمانے میں اور اہلِ مغرب کو جب ان کے حکیموں نے طوفان سے ڈرایا تو انھوں

[1] تفسیر القرطبي (۸۹/۱٥) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

نے بڑے بڑے مکان بنائے، جیسے کہ مصر میں۔ ہرمین ہیں اور مثل ان کے، تا کہ جب طوفان ہو تو اُن میں داخل ہو جائیں۔ طوفان سے ایک سو اکتیس برس پہلے طہمورث کو طوفان کے بارے میں ڈراوا پہنچا تو اس نے حکم دیا کہ اس کی مملکت میں ایسی جگہیں اختیار کریں جن کی ہوا اور مٹی صحیح ہو تو ایسی جگہیں اصبہان میں پائیں۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ علوم کی تجلید کریں اور وہاں اسلم مواضع میں دفن کریں۔

اس بات کی شہادت یہ امر دیتا ہے کہ سنہ تین سو ہجری کے بعد اصفہان شہر کے کسی قبیلے میں ٹیلے پائے گئے جو شق ہوگئے تھے، ان میں کئی گھر نکلے، جو بہت سے گٹھوں سے بھرے ہوئے تھے، ان میں ان درختوں کے پوست بھرے تھے جن کو کمانوں پر لپیٹا کرتے ہیں، ان کو توز کہتے ہیں، وہ ایک ایسے خط سے لکھے ہوئے تھے، جس کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ مقریزی نے خطط میں اس کا ذکر کیا ہے۔[1] ہنود کے بعض محققین نے کہا ہے کہ سری کشن ہندی نے اپنے مرنے سے سات دن پہلے یہ خبر دی تھی کہ شہر دوار کا عن قریب ڈوب جائے گا، یعنی ہند کی زمین میں طوفان آنے کی طرف اشارہ کیا۔ حق وہی ہے جس پر یہ آیت اور اس کے سوا اور آیتیں دال ہیں کہ عام غرق کرنے والا طوفان ساری زمین اور نوعِ انسانی کی ساری آبادی پر آیا۔ جس کسی نے طوفان کا انکار کیا یا تاویل کی یا اس کو بعض جگہوں کے ساتھ خاص کیا، اس کا قول قابلِ توجہ نہیں ہے، کیوں کہ "إِذَا جَاءَ نَهْرُ اللّٰهِ بَطَلَ نَهْرُ مَعْقِلٍ" (یہ سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، جن کے نام سے ایک نہر بصرے میں منسوب ہے۔) وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے یہ کلام یعنی ﴿ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴾ نوح علیہ السلام پر ان اُمتوں میں چھوڑ رکھا ہے جو اس کے بعد قیامت تک آئیں گی۔ یعنی بعینہٖ یہ کلام ہم نے اس پر چھوڑ رکھا ہے۔ ﴿ سَلٰمٌ ﴾ کا رفع حکایت کی بنا پر ہے، اس سے مراد ثنائے حسن ہے، یعنی پچھلی اُمتیں ان پر ثنائے حسن کریں گی اور ان کے لیے دعا کریں گی اور ان پر رحمت بھیجیں گی۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے اس پر قیامت کے دن تک ذکرِ جمیل چھوڑ رکھا ہے، وہ ذکرِ جمیل یہی ﴿ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ ﴾ ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلام کے رفع میں دو وجہیں ہیں، ایک یہ ہے: ﴿ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴾ [الصافات: ۷۷] "يُقَالُ سَلَامٌ"۔ دوسری یہ ہے کہ معنی یہ ہیں کہ "وَأَبْقَيْنَا عَلَيْهِ" اور کلام پورا ہوگیا۔

پھر ابتداء کی تو کہا: ﴿ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ ﴾ یعنی سلامتی ہے اس کو اس سے کہ آخر کے لوگوں میں برائی سے ذکر کیا جائے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: تَرَكْنَا عَلَيْهِ هٰذِهِ الْكَلِمَةَ بَاقِيَةً" یعنی لوگ ان پر سلام بھیجتے ہیں اور ان کے لیے دعا کرتے ہیں اور یہ من جملہ کلام محکی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا ﴾ [النور: ۱] "یہ ہے وہ سورت جو ہم نے نازل فرمائی ہے۔" کسی نے کہا ہے کہ "قُلْنَا" کے معنی ﴿ تَرَكْنَا ﴾ میں شامل ہیں۔ کوفیوں نے کہا

[1] المواعظ والاعتبار للمقریزي (۲/۲۰)

ہے کہ جملہ ﴿ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے ﴿ تَرَكْنَا ﴾ کا مفعول ہے۔ اس لیے کہ اس میں "قُلْنَا" کے معنی شامل ہیں۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "سَلَاماً" بہ نصب ہے: "أَيْ: تَرَكْنَا عَلَيْهِ ثَنَاءً حَسَناً"۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ سے مراد نبی اکرم ﷺ کی اُمت ہے۔ ﴿ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اس سے متعلق ہے جس سے ﴿ عَلٰى نُوْحٍ ﴾ متعلق ہے، جو خبر واقع ہوا ہے۔ "أَيْ: سَلَامٌ ثَابِتٌ أَوْ مُسْتَمِرٌّ أَوْ مُسْتَقِرٌّ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَالْجِنِّ وَالْإِنْسِ" یہ اس پر دال ہے کہ اس کا اختصاص نبی اکرم ﷺ کی اُمت کے ساتھ نہیں ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے۔

جملہ: ﴿ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ ماقبل کی تعلیل ہے، یعنی نوح علیہ السلام کی یہ جو تعظیم اور تکریم کی گئی ہے کہ ان کی دعا قبول کی اور اُن پر ثنا باقی رکھی اور اُن کی ذریت کو بقا بخشا، یہ اس لیے کہ ہم اس شخص کو اسی طرح جزا دیتے ہیں جو اپنے اقوال و افعال میں محسن ہوتا ہے اور اپنے احسان میں پکا اور معروف ہوتا ہے۔ ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ میں حرفِ کاف مصدر محذوف کی صفت ہے: "أَيْ: نَجْزِيْ جَزَاءً مِثْلَ ذٰلِكَ الْجَزَاءِ"

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ اس کا بیان ہے کہ نوح علیہ السلام من جملہ محسنین ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ پاک کے لیے ایک مومن اور مخلص بندے تھے۔ اس میں ایمان کی عظمت اور شان ہے اور اس بات کی ترغیب ہے کہ اس کو حاصل کریں، اس پر ثابت قدم رہیں اور اس کو بڑھائیں، جیسا کہ اللہ پاک ~~نے ابراہیم~~ ابراہیم علیہ السلام کی تعریف میں فرمایا ﴿ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [البقرۃ: ۱۳۰] "اور آخرت میں بھی وہ نیکوکاروں میں سے ہے۔" اس میں ایمان اور نیکی کی جلالتِ قدر پر جو دلالت ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔ اب یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ رسول کی اس بات سے تعریف کیوں کی، اس کے باوجود کہ رسولوں کا مرتبہ مومنین کے مرتبے سے بلند ہے۔

﴿ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴾ یعنی پھر ڈبو دیا ہم نے ان کافروں کو جو اللہ پر ایمان نہ لائے اور نہ ہی نوح علیہ السلام کی تصدیق کی۔ یہ جملہ معطوف ہے ﴿ نَجَّيْنٰهُ ﴾ پر اور ترتیب حقیقی ہے، کیوں کہ ان کی نجات کشتی میں سوار ہونے سے ہوئی باقیوں کے غرق ہونے سے پہلے۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے یہ سمجھا ہے کہ ﴿ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ ﴾ پر معطوف ہے، چنانچہ ترتیب کو اخباری ٹھہرایا، اس لیے کہ ﴿ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ کا فرق کرنا اس سے پہلے تھا کہ ان کی ذریت کو باقی رکھیں۔

اللہ پاک نے اس سورت میں سات قصے ذکر فرمائے ہیں: پہلا قصہ نوح علیہ السلام کا، چنانچہ اس کا ذکر تو ہو چکا، دوسرا قصہ ابراہیم علیہ السلام کا، تیسرا اسماعیل علیہ السلام کا، چوتھا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا، پانچواں الیاس علیہ السلام کا، چھٹا لوط علیہ السلام کا اور ساتواں یونس علیہ السلام کا۔ پھر اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا اور یہ بات بیان کی کہ وہ ان میں سے ہیں جنھوں نے نوح علیہ السلام کی مشایعت و موافقت کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

[1] تفسير القرطبي (۱۵/۹۰) فتح القدير (۴/۵۶۷) [2] فتح البيان (۱۱/۳۹۶-۳۹۹)

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝۸۳ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝۸۴
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ۝۸۵ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ
تُرِيْدُوْنَ ۝۸۶ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸۷

اور بے شک ابراہیم بھی اسی (نوح) کے گروہ سے ہے (83) جب وہ اپنے رب کے پاس پاک صاف دل کے ساتھ آیا (84) جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ (85) کیا تم اللہ کو چھوڑ کر جھوٹے گھڑے ہوئے معبودوں کو چاہتے ہو؟ (86) پھر رب العالمین کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے؟ (87)

ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر:

دلِ نروگا، یعنی گمراہی وعیب سے پاک۔ انتہیٰ

علی بن ابی طلحہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿مِنْ شِيْعَتِهٖ﴾ کی تفسیر میں "أَهْلِ دِيْنِهٖ" ہیں۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نوح علیہ السلام کے اہلِ دین سے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے الفاظ "عَلٰى مِنْهَاجِهٖ وَسُنَّتِهٖ" ہیں، یعنی نوح علیہ السلام کے طریق پر ہیں۔[1] قلبِ سلیم کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی "شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہے۔ مراد یہ ہے کہ قلبِ سلیم وہ ہے، جو "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کی گواہی دیتا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: وہ ہے جو یہ جانتا ہے کہ اللہ حق ہے اور قیامت آنے والی ہے، اس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے اور اللہ ان کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ "سَلِيْمٌ مِنَ الشِّرْكِ"[2] یعنی شرک سے صحیح وسالم ہو۔ عروہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لعان نہ ہو۔[3] قولہ تعالیٰ: ﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم پر بتوں اور شریکوں کی عبادت کا انکار کیا۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ۝۸۶ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کیا خیال ہے تمھارا اس کے متعلق کہ جو وہ تمھارے ساتھ کرنے والا ہے جس وقت تم اس سے اس حال میں ملو گے کہ تم نے اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجا۔[4] (كذا في ابن كثير)۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں فرمایا ہے کہ بے شک نوح کے اہلِ دین میں سے اور اُن لوگوں میں سے جنھوں نے اس کی تابعداری اور موافقت کی ہے اللہ کی طرف بلانے پر اور اس کی توحید کی طرف اور اس پر ایمان لانے کی طرف دعوت

---

(1) تفسير الطبري (٦١/٢١) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٢٧٨٣/٨)
(3) تفسير الطبري (٦٢/٢١) (4) تفسير الطبري (٦٣/٢١) تفسير ابن كثير (١٨/٤)

دینے میں وہ البتہ ابراہیم علیہ السلام ہے۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَلشِّیْعَةُ" بہ معنی اعوان (معاون) ہے، ماخوذ ہے شیاع سے۔ شیاع وہ ذرا ذرا سی لکڑیاں ہیں جو بڑی لکڑیوں کے ساتھ جلائی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ جلنے لگتی ہیں۔[1]

نوح اور ابراہیم علیہما السلام کے درمیان دو ہزار چھے سو چالیس برس کی مدت ہے اور اُن کے درمیان میں صرف دو نبی ہوئے ہیں: ھود اور صالح علیہما السلام۔ اور نوح علیہ السلام سے پہلے تین نبی ہوئے: ادریس، شیث اور آدم علیہم السلام۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کل چھے نبی ہوئے۔ معنی یہ ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام اصل دین میں نوح علیہ السلام کے متبعین میں سے تھے، گو اُن کی شریعتوں کی فروع مختلف ہوئیں، یا دونوں کی شریعتوں کے درمیان کلی اتفاق تھا یا اکثر اتفاق تھا، اگرچہ زمانہ دراز گزرا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "وَاِنَّ مِنْ شِیْعَةِ مُحَمَّدٍ ﷺ لَاِبْرَاهِیْمَ" چنانچہ اس معنی کی بنا پر ضمیر "شِیْعَتِهٖ" کی نبی اکرم ﷺ کی طرف راجع ہے اور اسی طرح امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے،[2] لیکن اس قول میں جو ضعف اور مخالفتِ سیاق ہے، وہ پوشیدہ نہیں۔

﴿ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ شرک و شک سے خالص کیا ہوا، یا آفاتِ قلوب سے خالص۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی مخلوق میں اللہ کے لیے نصیحت کرنے والا۔ اپنے رب کی طرف آنے کے معنی میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ اس کی توحید اور طاعت کی طرف بلانے کے وقت اپنے رب کی طرف قلبِ سلیم لے کر آئے۔ دوسرا یہ ہے کہ ان کو آگ میں ڈالنے کے وقت آئے۔ ﴿ جَآءَ ﴾ استعارۂ تصریحیہ تبعیہ ہے۔ انھوں نے جو اپنے دل کو خالص کیا، اس کو تشبیہ دی ان کے تحفہ لانے سے۔ گویا وہ اپنے پاس سے دل کا تحفہ لائے اس بات میں کہ ان کو وہ شے مل گئی جس سے رب کی رضا اور خوشی حاصل کی جاتی ہے۔ کلمۂ "إذا" کا ناصب فعل محذوف ہے، یعنی "اُذْكُرْ"۔ کسی نے کہا: معنی متابعت کے ہیں، جو لفظ "شِیْعَه" میں ہیں۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس میں عامل و معمول کے درمیان اجنبی کے ساتھ فصل ہوتی ہے، یعنی کلمۂ "إبراهيم"۔ اولیٰ یہ ہے کہ اس طرح کہیں کہ ابتداء کا لام اپنے ماقبل کو مابعد میں عمل کرنے سے منع کرتا ہے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ بدل ہے جملۂ اول سے، یا ظرف ہے سلیم کا، یا ظرف ہے ﴿ جَآءَ ﴾ کا، یعنی وہ آیا اپنے رب کے پاس قلبِ سلیم لے کر اس وقت کہ اپنے باپ آزر اور اس کی قوم کفار کو کہا کہ تم کیا شے پوجتے ہو؟ ﴿ اَئِفْكًا ﴾ کا نصب بنا بر مفعول لہ ہے۔ اور ﴿ اٰلِهَةً ﴾ کا اس بنا پر کہ ﴿ تُرِیْدُوْنَ ﴾ کا مفعول ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "أَتُرِيْدُوْنَ آلِهَةً مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لِلْإِفْكِ"، یعنی کیا تم چاہتے ہو اور کوئی معبود اللہ کے سوا جھوٹ بنانے کے لیے۔ معمولاتِ فعل کو اس کو اہمیت دینے کے لیے فعل پر مقدم کر دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَئِفْكًا ﴾ ﴿ تُرِیْدُوْنَ ﴾ کا مفعول بہ ہے اور ﴿ اٰلِهَةً ﴾ اس سے بدل ہے۔ مبالغے کے لیے اس کو نفسِ افک قرار دیا ہے۔ یہ وجہ پہلی وجہ سے زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَئِفْكًا ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے فاعلِ ﴿ تُرِیْدُوْنَ ﴾

[1] تفسير القرطبي (١٥/٩١) [2] تفسير القرطبي (١٥/٩١) [3] البحر المحيط (٧/٣٥٠)

سے: ''أَيْ: أَتُرِيْدُوْنَ آلِهَةً آفِكِيْنَ أَوْ ذَوِيْ إِفْكٍ'' امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ افک بدترین جھوٹ ہے، یعنی وہ جھوٹ جو ثابت نہیں ہوتا اور مضطرب ہوتا ہے۔ اسی معنی سے ''اِئْتَفَكَتْ بِهِمُ الْأَرْضُ'' ہے[1] یعنی زمین اُن کو لے کر جھک پڑی۔

﴿ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی پھر تم نے رب العالمین کو کیا خیال کیا ہے جبکہ تم اس سے ملو گے، حالاں کہ تم نے تو اس کے غیر کو پوجا ہے اور کیا گمان کرتے ہو اس کو کہ وہ تمھارے ساتھ کیا کرے گا۔ یہ ان کو اس آیت کی طرح ڈراتا ہے: ﴿ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ﴾ [الانفطار: ٦] ''تجھے اپنے ربِ کریم سے کس چیز نے بہکایا؟'' کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ کیا شے ہے جس کا تم نے اللہ کے ساتھ وہم کیا ہے، یہاں تک کہ تم نے اس کے ساتھ اس کے غیر کو شریک کیا؟[2]

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿٨٨﴾ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿٨٩﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿٩٠﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٩١﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿٩٢﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ﴿٩٣﴾ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿٩٤﴾ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿٩٥﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿٩٧﴾ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿٩٨﴾

تب اس نے ایک نگاہ ستاروں میں ڈالی (88) پھر کہا: بے شک میں تو بیمار ہوں (89) چناں چہ وہ اس سے پیٹھ پھیر کر لوٹ گئے (90) پھر وہ ان کے معبودوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: کیا تم کھاتے نہیں؟ (91) تمھیں کیا ہے کہ تم بولتے نہیں؟ (92) پھر وہ انھیں دائیں ہاتھ سے مارتا ہوا متوجہ ہوا (93) پھر وہ لوگ دوڑتے ہوئے اس کی طرف آئے (94) اس نے کہا: کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جنھیں تم خود تراشتے ہو؟ (95) حالاں کہ اللہ ہی نے تمھیں اور تمھارے اعمال کو پیدا کیا ہے (96) وہ کہنے لگے: اس کے لیے ایک مکان بناؤ (اس میں آگ جلاؤ) اور اسے دہکتی آگ میں ڈال دو (97) پھر انھوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنے کا ارادہ کیا، تو ہم نے انھیں ہی نیچا دکھا دیا (98)

قصہ ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی کا:

وہ لوگ نجومی تھے، ان کے دکھانے کے لیے تاروں کی طرف دیکھ کر کہا کہ میں بیمار ہوں، یعنی بیمار ہوا چاہتا

(1) تفسیر القرطبي (١٥/٩٢) (2) فتح البیان (١١/٣٩٩۔٤٠١)

ہوں۔ وہ شہر سے باہر عید منانے اور بتوں کو پوجنے کے لیے جانا چاہتے تھے۔ یہ اللہ کے راستے میں بولا گیا جھوٹ ہے، اس پر عذاب نہیں بلکہ ثواب ہے۔ وہ لوگ بتوں کے آگے کھانے رکھ گئے تھے۔ انھیں مارنے پر پل پڑے، یعنی زور سے مار مار کر توڑ ڈالا۔ وہ دوڑے بھاگے آپ کی طرف متوجہ ہوئے، یعنی الزام دینے لگے جب ثابت ہو چکا۔ انتہی.

ابراہیم علیہ السلام نے جو ﴿ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴾ کہا تو صرف اس لیے کہ شہر میں مقیم رہیں، جب لوگ اپنی عید کی طرف جائیں، کیوں کہ ان کی عید کی طرف نکلنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کو پسند کیا کہ ان کے بتوں میں تنہا رہیں، تاکہ ان کو توڑ ڈالیں، چنانچہ ان سے ایک ایسی بات کہی جو نفس الامر میں حق تھی، جس سے انھوں نے اپنے اعتقاد کے تقاضے کے مطابق یہ سمجھ لیا کہ وہ بیمار ہیں، پھر وہ ان سے پیٹھ پھیر کر چلے گئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ جو شخص فکر کرتا ہے اس کے لیے عرب لوگ کہتے ہیں کہ "نَظَرَ فِيْ النُّجُوْمِ"[1] امام قتادہ رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے آسمان کی طرف نظر کی، اس حال میں کہ وہ فکر کرنے والے تھے اس شے میں جس سے ان کو بہلا دیں تو بولے: ﴿ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴾ یعنی میں ضعیف ہوں۔

اب رہی وہ حدیث جس کو اس جگہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ نہیں بولا سوائے تین جھوٹ کے: دو اللہ کی ذات میں: قولہ: ﴿ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴾ اور قولہ: ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا ﴾ [الأنبياء: ٦٣] اور تیسرا ان کا بی بی سارہ کے حق میں یہ کہنا کہ وہ میری بہن ہے۔[2] یہ حدیث صحاح اور سنن میں کئی طریقوں سے تخریج کی گئی ہے، لیکن یہ کِذبِ حقیقی کے باب سے نہیں ہے جس کے فاعل کی مذمت کی جاتی ہے۔ حاشا وکلا۔ اس پر جو کذب کا اطلاق ہوا ہے تو وہ صرف مجازاً ہے۔ یہ تو کلام میں شرعی اور دینی مقصد کے لیے معاریض میں سے ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے: « إِنَّ فِيْ الْمَعَارِيْضِ لَمَنْدُوْحَةً عَنِ الْكَذِبِ »[3] یعنی بے شک معاریض میں البتہ کذب کی گنجایش ہے۔

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے تین کلموں کے بارے میں، جو انھوں نے کہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں ہے ان میں سے کوئی کلمہ مگر اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں کید کیا۔ چنانچہ کہا کہ میں بیمار ہوں اور کہا: بلکہ کیا اس کو ان کے اس بڑے نے اور بادشاہ نے جب ان کی بی بی کا ارادہ کیا تو اس سے کہا کہ وہ میری بہن ہے۔[4] (أخرجه ابن أبي حاتم) سفیان نے کہا ہے کہ ﴿ سَقِيْمٌ ﴾ سے مراد طعین، یعنی وہ آدمی

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢١٩/١٠)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣١٧٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٤) تفسیر الطبري (٦٤/٢١)

[3] سنن البیهقي الکبریٰ (١٩٩/١٠) اس کی سند میں "داود بن زبرقان" سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ١٠٩٤)

[4] تفسیر ابن کثیر (١٨/٤) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف راوی ہے۔

جس کو طاعون کی بیماری ہو۔ وہ لوگ مطعون سے بھاگتے تھے، چنانچہ انھوں نے چاہا کہ ان کے معبودوں میں تنہا رہیں۔ اسی طرح عوفی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قوم نے ان سے کہا اور وہ ان کے بت خانے میں تھے کہ نکل تو وہ بولے کہ میں تو مطعون ہوں، پھر وہ طاعون کے خوف سے ان کو چھوڑ گئے۔[1]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے ایک تارا دیکھا کہ طلوع ہوا تو کہا: ﴿ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴾ "كَايَدَ نَبِيُّ اللّٰهِ عَنْ دِيْنِهِ" ﴿ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴾[2] یعنی نبی اللہ نے اپنے دین کی طرف سے کید کیا تو کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں۔ دوسرے لوگوں نے کہا: ﴿ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴾ بہ نسبت زمانۂ آیندہ کہا، مراد مرضِ موت ہے۔ کسی نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ تم جو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہو، اس پوجنے سے میں مریض القلب ہوں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم اپنی عید کی طرف نکلی تو قوم نے چاہا کہ وہ بھی نکلیں۔ چنانچہ وہ اپنی پشت پر لیٹ گئے اور کہا کہ میں بیمار ہوں اور آسمان میں نظر کرنے لگے۔ پھر جب قوم نکل گئی تو وہ ان کے بتوں کی طرف آئے اور ان کو توڑ ڈالا۔[3] (رواه ابن أبي حاتم) اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴾ یعنی پھر وہ پیٹھ پھیر کر اپنی عید کی طرف چلے گئے۔ ﴿ فَرَاغَ اِلٰۤى اٰلِهَتِهِمْ ﴾ یعنی پھر وہ گیا جلدی ان کے بتوں کی طرف چھپتا ہوا، جبکہ وہ نکل گئے تھے۔

﴿ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ پھر کہا: کیوں جی تم کھاتے کیوں نہیں ہو؟! یہ اس لیے کہا کہ وہ بتوں کے سامنے کھانا رکھ گئے تھے، اس میں تقرب چاہنے کے لیے، تاکہ وہ ان کے لیے اس میں برکت کر دیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام بت خانے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ ایک بہوِ عظیم میں ہیں (بہو: خانۂ در پیش سرائے جداگانہ)۔ اور بَہو کے دروازہ کے سامنے ایک بہت بڑا بت ہے، اس کے پہلو کی طرف اس سے چھوٹا بت۔ بعض بت بعض کے پہلو سے لگے ہوئے ہیں، ہر پچھلا بت پہلے سے چھوٹا ہے، یہاں تک کہ وہ بَہو کے دروازے تک پہنچے ہیں۔ انھوں نے کھانا تیار کیا اور اس کو بتوں کے سامنے رکھا تھا اور کہا تھا کہ جس وقت ہم لوٹ کر آئیں گے اور بتوں نے ہمارے کھانے میں برکت کر دی ہوگی تو ہم اسے کھائیں گے، لہٰذا جب ابراہیم علیہ السلام نے وہ کھانا ان کے رُوبرو دیکھا تو کہا: کیوں جی تم کھاتے نہیں ہو، تم کو کیا ہو گیا ہے تم بولتے نہیں ہو؟[4]

﴿ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ﴾ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کو سیدھے ہاتھ سے مارنے کے لیے جھکے۔ امام قتادہ اور جوہری رحمہما اللہ نے کہا: "فَأَقْبَلَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ"۔ سیدھے ہاتھ سے ان کو صرف اس لیے مارا کہ سیدھا ہاتھ زیادہ سخت، قوی اور زور دار ہوتا ہے اور خوب زخم لگاتا ہے اور اسی لیے ان کو ریزہ ریزہ کر چھوڑا،

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢١٩) تفسير ابن كثير (١٩/٣)
[2] تفسير الطبري (٦٣/٢١)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٢٠)
[4] تفسير الطبري (٤٥٨/١٨)

مگر ان کے بڑے بت کو ویسے ہی رہنے دیا، شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں جس طرح کہ اس کی تفسیر سورۃ الانبیاء میں گزر چکی ہے[1] اور یہاں اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَاَقْبَلُوْۤا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ "یَسْرَعُوْنَ"[2] یعنی وہ لوگ اس کی طرف دوڑتے ہوئے آئے۔ یہ قصہ اس جگہ مختصر ہے اور سورۃ الانبیا میں مفصل ہے، کیوں کہ جب وہ لوٹ کر آئے تو پہلے پہل ان کو معلوم نہ ہوا کہ یہ کام کس نے کیا ہے، یہاں تک کہ اس کی تلاش کی اور علم حاصل کیا تو پہچان گئے کہ یہ کام ابراہیم علیہ السلام ہی نے کیا ہے۔

پھر جب قوم آئی کہ ان کو عتاب کرے تو وہ ان کی سرزنش و عیب کرنے لگے اور بولے: ﴿ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴾ یعنی کیا تم اللہ کے سوا بتوں کو پوجتے ہو جن کو تم خود تراشتے ہو اور اپنے ہاتھوں سے بناتے ہو۔ ﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ احتمال ہے کہ کلمہ ﴿ مَا ﴾ مصدریہ ہو تو تقدیر یہ ہوگی: "خَلَقَكُمْ وَعَمَلَكُمْ" یعنی اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے اور تمھارے عمل کو اور احتمال ہے کہ بہ معنی ﴿ اَلَّذِیْ ﴾ ہو۔ تقدیر یہ ہے کہ "وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْ تَعْمَلُوْنَهُ" یعنی اللہ نے تم کو بنایا اور اس شے کو جسے تم کرتے ہو۔ دونوں قول باہم متلازم ہیں، لیکن پہلا قول ظاہر تر ہے، اس لیے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب "أفعال العباد" میں سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: « إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَصْنَعُ كُلَّ صَانِعٍ وَصُنْعَتَهُ »[3] یعنی اللہ تعالیٰ ہر کاریگر کو اور اس کی کاریگری کو بناتا ہے، چنانچہ اس وقت جبکہ ان پر حجت قائم ہو چکی تو اس طرف مائل ہوئے کہ ان پر ہاتھ چلائیں اور ان پر غلبہ پائیں تو بولے: ﴿ ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴾ اور وہ قصہ ہوا جس کا ذکر سورۃ الانبیاء میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو آگ سے نجات دی اور ان کو قوم پر غالب کیا اور ان کی حجت بلند فرمائی اور اس کی مدد کی، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴾[4] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے: امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: مفسرین نے کہا ہے کہ وہ لوگ علم نجوم کا استعمال کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ ان کے بتوں کے بارے میں ان سے تدبیر کریں، تاکہ ان پر یہ حجت قائم ہو جائے کہ بت معبود نہیں ہیں۔ کل ان کی عید کا دن تھا، جس کی طرف وہ نکلا کرتے تھے۔[5] سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے چاہا ہے کہ ان کے پیچھے رہ جائیں، اس لیے بیماری کا بہانہ کیا۔ قوم نے ان کو مجبور کیا تھا کہ ان کے ساتھ عید کی طرف نکلیں، پس انھوں نے نجوم کی طرف نظر کی، یعنی نجوم کے علم میں یا اس کی کتابوں میں نظر کی، وہ ان کو دکھاتے تھے کہ وہ اپنے حال پر نجوم سے استدلال کرنے والے ہیں۔ پھر جب نجوم کی طرف نظر کی تو کہا کہ میں بیمار ہوں، یعنی آیندہ بیمار ہوں گا۔

---

(1) رقم الآية (٥١) (2) تفسير ابن كثير (١٩/٤) (3) خلق أفعال العباد للبخاري (٤٦/١) السلسلة الصحيحة (١٦٣٧)

(4) تفسير ابن كثير (١٨/٤، ١٩) (5) فتح القدير (٥٢٨/٤)

امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: جب قوم نے ان کو اپنے ساتھ نکلنے کی تکلیف دی تو انھوں نے اس شے کے بارے میں سوچا جو وہ کریں، چنانچہ اس بنا پر معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اس رائے میں نظر کی جو اُن کو ظاہر ہوئی تو جانا کہ ہر شے سقیم ہوتی ہے، لہٰذا کہہ دیا کہ میں سقیم ہوں۔ امام خلیل اور مبرد رحمہما اللہ نے کہا: ''يُقَالُ لِلرَّجُلِ إِذَا فَكَّرَ فِي الشَّيْءِ يُدَبِّرُهُ نَظَرَ فِي النُّجُوْمِ'' ''جب کوئی شخص کسی چیز میں فکر وتدبر کرتا ہے تو کہا جاتا ہے: ''نَظَرَ فِي النُّجُوْمِ''۔'' یہی قول امام قتادہ رحمہ اللہ کی روایت سے پہلے گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جس گھڑی میں ان کو اپنے ہمراہ چلنے کے لیے بلایا تھا، یہ وہ ساعت تھی، جس میں ان کو بخار آنے کی عادت تھی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ عن قریب میں بیمار ہو جاؤں گا بیماری موت کی، کیوں کہ جس شخص پر موت لکھی گئی، وہ سقیم ہوتا ہے غالب میں، پھر مرجاتا ہے۔ یہ ایک توریہ اور تعریض (حقیقت کو چھپانا اور اشارے سے بات کرنا) ہے جیسا کہ بادشاہ سے کہا تھا، جب اس نے ان سے بی بی سارہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ میری بہن ہے، اس سے مراد دین کے لحاظ سے بہن ہے۔[1]

''رَاغَ'' جب کوئی مائل ہوتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: ''رَاغَ يَرُوْغُ رَوْغًا وَرَوَغَانًا'' اسی معنی سے راہِ مائل کو ''طَرِيْقٌ رَايِغٌ'' کہتے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فَرَاغَ اِلٰۤى اٰلِهَتِهِمْ ﴾ کے معنی ہیں: ''ذَهَبَ إِلَيْهِمْ''. امام ابو مالک نے کہا ہے کہ ''جَآءَ إِلَيْهِمْ''۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''أَقْبَلَ عَلَيْهِمْ''[2] یہ سب معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ان کے بت پتھر، لکڑی، سونے، چاندی، تانبے، لوہے اور سیسے کے تھے، ان کی تعداد بہتر (۷۲) تھی۔ سب سے بڑا بت سونے کا تھا جواہر سے جڑا ہوا۔ غرض سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے استہزاء اور ٹھٹھا کے طور پر ان بتوں سے کہا: ﴿ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ یعنی کیوں نہیں کھاتے اس کھانے سے جس کو وہ ان کے لیے تیار کیا کرتے تھے۔ بتوں کو عقلاء کا خطاب اس لیے کیا کہ قوم نے ان کو عقلاء کے مرتبے میں نازل کیا تھا۔

اسی طرح ﴿ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴾ کا خطاب بھی عقلاء کا ہے اور استفہام استہزاء کے لیے ہے، کیوں کہ وہ خوب جانتے تھے کہ وہ جمادات ہیں اور بولتے نہیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ لوگ بتوں کے پاس اپنا کھانا چھوڑ گئے تھے، تاکہ وہ ان سے متبرک ہو جائے اور جب اپنی عید سے لوٹ کر آئیں تو اسے کھائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ بتوں کے خادموں کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ (فتح القدیر کے الفاظ ''تَرَكُوْهُ لِلسَّدَنَةِ'' ہیں)۔ کسی نے کہا ہے کہ خود ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کی طرف کھانا قریب کیا تھا ان سے استہزاء کر کے۔

﴿ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ﴾ ''أَيْ: فَمَالَ عَلَيْهِمْ يَضْرِبُهُمْ ضَرْبًا'' یعنی پھر ابراہیم علیہ السلام جھک پڑے بتوں پر ان کو سیدھے ہاتھ سے خوب مارتے تھے۔ اسی بنا پر ﴿ ضَرْبًۢا ﴾ مصدر موکد ہے فعل محذوف کا۔ یا مصدر ہے ''رَاغَ'' کا۔ اس لیے کہ ''رَاغَ'' بہ معنی ''ضَرَبَ'' ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے:

---

[1] تفسير القرطبي (۹۲/۱۵، ۹۳) [2] تفسير القرطبي (۹٤/۱۵)

یعنی اپنے سیدھے ہاتھ سے بتوں کو مارتے تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قوت اور قدرت سے مارتے تھے۔ اس لیے کہ سیدھا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ امام فراء اور ثعلب رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "بِالْيَمِيْنِ أَيْ: بِالْقُوَّةِ" یمین بہ معنی قوت ہے۔

امام ضحاک اور ربیع بن انس رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "یمین" سے مراد وہ قسم ہے جو انھوں نے کھائی تھی، جب کہا تھا: ﴿ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴾[1] [الأنبياء: ٥٧] "اور اللہ کی قسم میں تمھارے ان معبودوں کے ساتھ ایک چال چلوں گا جب تم علاحدہ پیٹھ پھیر کر چل دو گے۔" کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ "یمین" سے مراد عدل ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴾ [الحاقة: ٤٤۔ ٤٥] "اور اگر یہ ہم پر کوئی بھی بات بنا لیتا تو البتہ ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے۔" "أَيْ: بِالْعَدْلِ" یمین کنایہ ہے عدل سے، جیسے: شمال کنایہ ہے جور سے۔ پہلا قول تمام اقوال سے بہتر ہے۔

﴿ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴾ یعنی پھر ان بتوں کے پوجنے والے جلدی کرتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کی طرف آئے جب انھیں اس کام کا علم ہوا جو ابراہیم علیہ السلام نے ان کے بتوں کے ساتھ کیا تھا اور کہا کہ ہم تو ان کو پوجتے ہیں اور تو ان کو توڑتا ہے۔ ﴿ يَزِفُّوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال "أَقْبَلُوْا" کے فاعل سے۔ جمہور نے ﴿ يَزِفُّوْنَ ﴾ کو بہ فتح یائے تحتیہ پڑھا ہے۔ اس محاورے سے ماخوذ کہ "زَفَّ الظَّلِيْمُ يَزِفُّ إِذَا عَدَا بِسُرْعَةٍ" یعنی جس وقت نر شتر مرغ تیزی سے دوڑتا ہے تو اس وقت بولتے ہیں: زَفَّ الظَّلِيْمُ"۔ امام حمزہ نے بہ ضم یاء پڑھا ہے جو "أَزَفَّ يُزِفُّ" سے ماخوذ ہے: "أَيْ: دَخَلَ فِي الزَّفِيْفِ"۔ "زَفِيْف" شتابی کو کہتے ہیں۔ "أَزَفَّ" کے یہ معنی ہوئے کہ داخل ہوا شتابی میں، یا یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے غیر کو "زفیف" پر آمادہ کرتے تھے۔ امام اصمعی نے کہا: "أَزْفَفْتُ الْإِبِلَ" کے یہ معنی ہیں کہ میں نے اونٹوں کو جلدی چلنے پر آمادہ کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ "زَفَّ وَازْفَافَ" دو لغت ہیں، یعنی ایک معنی میں محاورے میں بولتے ہیں: "زَفَّ الْقَوْمُ وَأَزَفُّوْا" یعنی قوم نے جلدی کی۔ "وَزَفَّتِ الْعُرُوْسُ وَأَزْفَفْتُهَا" یعنی بھیجی گئی دلہن دولہا کے پاس اور بھیجا میں نے اس کو، یہ قول خلیل سے حکایت کیا گیا ہے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے زعم کیا ہے کہ یہ لغت معروف نہیں ہے، یعنی "يُزِفُّوْنَ" بہ ضم یاء اور علماء کی ایک جماعت نے اس کو پہچانا ہے، ان میں سے فراء ہیں اور اس کی تشبیہ عرب کے اس قول سے دی ہے: "أَطْرَدْتُ الرَّجُلَ أَيْ: صَيَّرْتُهُ إِلٰى ذٰلِكَ يَعْنِيْ صَيَّرْتُهُ طَرِيْدًا"۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: "زفیف" بہ معنی "إسراع" ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "زفیف": اول عدوِ نعام' ہے، یعنی شتر مرغ کی اول دوڑ۔ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يَزِفُّوْنَ ﴾ بہ معنی "يَمْشُوْنَ" ہے۔ ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: "يَسْعُوْنَ"، یحییٰ بن سلام نے

---

[1] فتح القدير (٥٢٩/٤)

کہا: ”یَدْعُوْنَ غَضَبًا“ یعنی غضب کے مارے کانپتے ہوئے آئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”یَخْتَالُوْنَ أَيْ: یَمْشُوْنَ مَشْيَ الْخُیَلَاءِ“ یعنی اکڑ کر چلتے ہوئے آئے، جیسے: تکبر والے چلتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ”یَتَسَلَّلُوْنَ تَسَلُّلًا بَیْنَ الْمَشْيِ وَالْعَدْوِ“ یعنی درمیانی چال چلتے آئے۔ ﴿ یَزِفُّوْنَ ﴾ کی زیادہ صحیح تفسیر ”یُسْرِعُوْنَ“ کے ساتھ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ”یَزِفُّوْنَ: یَخْرُجُوْنَ“۔ کسی نے ”یُزَفُّوْنَ“ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور کسی نے ”یَزْفُوْنَ“ بر وزن ”یَرْمُوْنَ“ پڑھا ہے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے امام حسن، مجاہد اور ابن سمیفع رحمہم اللہ سے حکایت کیا ہے کہ ان لوگوں نے ”یَرِفُّوْنَ“ بہ رائے مہملہ پڑھا ہے۔ ”رَفَّ“ بہ معنی ”رَکَضَ“ ہے۔ (رکض پائے جنبانیدن) مشی و عدو کے درمیان۔[1]

بالجملہ جب قوم نے ابراہیم علیہ السلام پر اس فعل کا انکار کیا جو انھوں نے بتوں کے ساتھ کیا تو انھوں نے قوم کے لیے وہ دلیل ذکر کی جو بتوں کی عبادت کی خرابی پر دلالت کرتی ہے اور ان کو عاجز کر کے اور ان پر انکار کر کے یوں کہا: ﴿ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴾ یعنی تم پوجتے ہو بتوں کو جن کو تم خود تراشتے ہو۔ ”نَحت“ بہ معنی ”نَجر وَبَرِیٌ“ ہے۔ یعنی تراشنا۔ ”نَحَتَهٗ یَنْحِتُهٗ“ بالکسر ”نَحتاً أَيْ: بَرَاَهٗ“ اور ”نحاة“ بہ معنی ”بُرایة“ یعنی تراشا۔ زجر و توبیخ کی وجہ ظاہر ہے، یعنی لکڑی اور پتھر نحت و اصلاح سے پہلے بالکل معبود نہ تھا، پھر جب اس کو تراشا اور ایک خاص طرز پر اس کی شکل بنائی تو اس میں صرف یہی کچھ آثار واقع ہوئے، جو اس کو اپنی ہیئت سے پھیر دیتے ہیں، پس اگر وہ اس وقت ان کا معبود ہو گیا تو یہ بات لازم آئے گی کہ جو شے معبود نہ تھی جب اس میں آثار حاصل ہوئے تو وہ معبود ہو گئی، حالاں کہ اس بات کا فساد ظاہر ہے۔

جملہ ﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ تَعْبُدُوْنَ ﴾ کے فاعل سے، یا جملہ مستانفہ ہے اور کلمۂ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے، یعنی کیا تم اس شے کو پوجتے ہو جسے تم خود تراشتے ہو، حالاں کہ اللہ نے تم کو پیدا کیا اور اس شے کو جسے تم بناتے ہو علی العموم اور جن بتوں کو وہ تراشتے تھے وہ اس میں بدخولِ اولیٰ داخل ہیں اور اس جگہ عمل کے معنی صورت بنانے اور تراشنے کے ہیں اور اس کے مثل جیسے کہتے ہیں: ”عَمِلَ الصَّائِغُ السِّوَارَ أَيْ: صَاغَهٗ“ یعنی سنار نے کنگن گھڑا۔ مائے موصول کا مرجع ﴿ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴾ ہے، کیوں کہ اس میں ”ما“ موصولہ ہے: ”أَيْ: أَتَعْبُدُوْنَ الَّذِيْ تَنْحِتُوْنَهٗ“۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ میں مائے مصدریہ ہو، یعنی ”خَلَقَكُمْ وَخَلَقَ عَمَلَكُمْ“ اس کے اول قول پر یوں ترجیح دی ہے کہ اس میں حذف نہیں ہے۔ اشعریہ نے اس کو اس بات پر دلیل ٹھہرایا ہے کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور یہی مذہب حق ہے، کیوں کہ بندوں کا فعل ان میں اللہ پاک کی خلق کے ساتھ ہے تو ان کا مفعول جو اُن کے فعل پر متوقف ہے، وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اللہ کی مخلوق ہو۔

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۵/۹۵، ۹۶) فتح القدیر (۴/۵۲۹، ۵۳۰)

یہ بھی جائز ہے کہ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہو: "أَيْ: أَيُّ شَيْءٍ تَعْمَلُوْنَ" یعنی اور تم کیا شے کرتے ہو؟ استفہام کے معنی ملامت اور جھڑکی ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ نافیہ ہو، یعنی عمل حقیقت میں تمھارے لیے نہیں ہے، چنانچہ تم نہیں کرتے ہو کسی شے کو۔ صاحبِ کشاف نے اس شخص کے رد میں طول دیا ہے جو مصدریہ کا قائل ہے، لیکن ایسا رد ہے کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور موصول کو اولیٰ بہ مقام اور سیاقِ کلام کے زیادہ موافق ٹھہرایا ہے۔[1]

جملہ ﴿ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴾ مستانفہ ہے جو سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان پر جو واضح حجت وارد کی، جب وہ اس کے جواب سے عاجز ہوئے تو یہ کہا اور باہم مشورہ کیا کہ ان کے لیے پتھروں کی ایک دیوار بنائیں اور اسے لکڑیوں سے بھریں اور ان کو جلائیں، پھر ان کو اس میں ڈال دیں۔ "جحیم" نہایت جلتی آگ کو کہتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر آگ جس کا بعض بعض کے اوپر ہو وہ "جحیم" ہے۔[2] ﴿ الْجَحِيْمِ ﴾ میں لام مضاف الیہ کا عوض ہے: "أَيْ: فِيْ جَحِيْمِ ذٰلِكَ الْبُنْيَانِ" یعنی اس چنائی کی آگ میں۔ پھر جب خلیل جلیل علیہ السلام کو اس میں ڈالا تو اللہ پاک نے اس سے ان کو نجات دی اور اس کو ان پر ٹھنڈی اور سلامتی والی کر دی۔

یہی معنی ہیں اس قول کے۔ ﴿ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴾ یعنی قوم نے ان کے ساتھ مکر و حیلہ چاہا، ان کو ہلاک کرنے کی تدبیر کی تو اللہ پاک نے قوم ہی کو مقہور اور مغلوب کر دیا، اس طرح سے کہ ان کے مکر و فریب کو باطل کیا اور اس کو ایک روشن برہان ٹھہرایا اس بات پر کہ ابراہیم علیہ السلام کی شان بلند ہے، کیوں کہ اس سے ان پر وہ حجت قائم ہو گئی جس کو دور کرنے کے لیے نہ ان کو قدرت ہے نہ ان کے لیے اس کا انکار ممکن ہے، کیوں کہ انتہا درجے کی بڑی دہکتی ہوئی آگ جس کے انگارے تہ بہ تہ تھے، جب وہ ابراہیم علیہ السلام کو اس میں ڈالنے کے بعد ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی اور اس نے ان پر کوئی اثر نہیں کیا تو یہ حجت کے ایسے درجے میں ہے کہ ہر عاقل اس کو سمجھ جاتا ہے اور اس کا منکر ذلیل اور پست اور ساقط الحجت، ظاہر التعسف واضح التعصب ہو گیا۔ "فسبحان من يجعل المحن لمن يدعو إلى دينه منحا ويسوق إليهم الخير بما هو من صور الضير" پھر جب یہ واقع ہو چکا اور آنکھوں والوں کے واسطے صبح روشن ہو گئی اور اللہ پاک کی حجت خلیل علیہ السلام کے لیے ظاہر ہوئی اور ان کی نبوت کی براہین قائم ہو چکی اور اُن کے معجزات کے انوار چمکے تو یوں کہا:[3]

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۹۹﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ

[1] الكشاف (٥٣/٤، ٥٤) [2] تفسير معاني القرآن (٣١٠/٤) [3] فتح البيان (٤٠١/١١-٤٠٥)

السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ إِنِّيْٓ أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّيْٓ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ
مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ إِنْ
شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾ فَلَمَّآ أَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿١٠٣﴾
وَنَادَيْنٰهُ أَنْ يّٰٓإِبْرٰهِيْمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٠٥﴾ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗؤُا الْمُبِيْنُ ﴿١٠٦﴾ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠٧﴾
وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى إِبْرٰهِيْمَ ﴿١٠٩﴾ كَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٠﴾ إِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١١﴾ وَبَشَّرْنٰهُ بِإِسْحٰقَ نَبِيًّا
مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٢﴾ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى إِسْحٰقَ ۭ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا
مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿١١٣﴾

اور اس نے کہا: بے شک میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں، یقیناً وہ میری راہنمائی فرمائے گا﴿99﴾ اے میرے رب! مجھے (بیٹا) عطا فرما جو صالحین میں سے ہو﴿100﴾ چناں چہ ہم نے اسے بہت حلم والے لڑکے کی بشارت دی﴿101﴾ پھر جب وہ (لڑکا) اس کے ساتھ دوڑنے بھاگنے (کی عمر) کو پہنچا تو اس نے کہا: اے میرے پیارے بیٹے! بے شک میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے یقیناً ذبح کر رہا ہوں، اب تو دیکھ تیری کیا رائے ہے؟ اس (بیٹے) نے کہا: ابا جان! جو آپ کو حکم دیا گیا ہے کر گزریں، اگر اللہ نے چاہا تو عن قریب آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے﴿102﴾ پھر جب دونوں مطیع ہو گئے اور اس (باپ) نے اس (بیٹے) کو پیشانی کی ایک جانب لٹا دیا﴿103﴾ اور ہم نے اسے پکارا: اے ابراہیم!﴿104﴾ تو نے اپنا خواب یقیناً سچ کر دکھایا، بے شک ہم نیکوکاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں﴿105﴾ بلاشبہ یہ تو کھلی آزمائش ہی ہے﴿106﴾ اور ہم نے اس (اسماعیل) کے بدلے میں ایک عظیم القدر (جانور) ذبح کرنے کو دیا﴿107﴾ اور ہم نے اس (کے ذکرِ خیر) کو پیچھے آنے والوں میں باقی رکھا﴿108﴾ ابراہیم پر سلام ہو﴿109﴾ ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں﴿110﴾ بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا﴿111﴾ اور ہم نے اس (ابراہیم) کو اسحاق (بیٹے) کی بشارت دی، جو صالح لوگوں میں سے نبی ہوگا﴿112﴾

اور ہم نے اس پر اور اسحاق پر برکت نازل کی، اور ان دونوں کی اولاد میں سے کوئی نیکی کرنے والا اور کوئی اپنے آپ پر کھلم کھلا ظلم کرنے والا ہے ﴿113﴾

ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت اور آزمائش:

بادشاہ کی خاطر سے جب باپ نے اپنے گھر سے نکالا تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں ہجرت کر کے اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ بُردباری کیا ہوگی کہ آپ کو ذبح کروایا۔ کہتے ہیں کہ آٹھویں شب ذوالحجہ کو خواب دیکھا کہ بیٹے کو ذبح کرتا ہوں، دوسرے دن فکر میں رہے کہ اس کی تعبیر کیا۔ پھر نویں شب کو ذبح کرتے دیکھا تو جان لیا کہ ذبح ہی کرنا ہے، پھر تدبیر کرتے رہے۔ پھر دسویں شب وہی خواب دیکھا، تب بیٹے سے کہا۔ انھوں نے فوراً قبول کر لیا۔ اس باپ اور بیٹے پر ہزار رحمتیں ہوں۔ پیشانی کے بل اس لیے لٹایا کہ منہ نظر نہ آئے، کہیں بیٹے کی محبت جوش نہ مارے۔ کہتے ہیں کہ یہ بات بیٹے نے سکھائی۔ آگے اللہ نے نہیں فرمایا کہ کیا گزرا، یعنی کہنے میں نہیں آیا کہ اس کے دل پر یا فرشتوں پر کیا حال گزرا۔ بے شک ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی جزا دیتے ہیں، یعنی ایسے مشکل حکم دے کر آزماتے ہیں، پھر ان کو قائم رکھتے ہیں، تب درجے بلند کر دیتے ہیں۔ ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے فدیے میں دے دیا، یعنی ایک بڑے درجے کا دُنبہ بہشت سے آیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر زور سے چھری چلائی۔ اللہ کے حکم سے چھری نہ چلی اور گلا نہ کٹا، جبریل علیہ السلام نے بیٹے کو سرکا دیا اور ایک دنبہ رکھ دیا، آنکھیں کھولیں تو دُنبہ ذبح ہوا پڑا تھا۔ ہم نے اس کو اسحاق نبی کی بشارت دی، معلوم ہوا کہ پہلی خوش خبری اسماعیل علیہ السلام کی تھی اور ذبح کا سارا قصہ ان پر تھا۔ یہود کہتے ہیں کہ اسحاق علیہ السلام کو ذبح کیا، لیکن یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کی خبر بھی تھی۔ سورت ہود میں بیان ہو چکا اور ان کے نبی ہونے کی خبر تھی، یہ سن کر ابراہیم علیہ السلام پوچھتے کہ ابھی دونوں باتیں ظاہر نہیں ہوئیں ذبح کیسے ہوگا۔ دونوں کی اولاد ہوگی جو کہا تو اس سے مراد دونوں بیٹے ہیں۔ دونوں سے بہت اولاد پھیلی۔ اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں نبی گزرے بنی اسرائیل کے اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں عرب ہوئے جن میں ہمارے پیغمبر ﷺ ہیں۔ انتھٰی.

اللہ تعالیٰ اپنے خلیل جلیل کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ جب اللہ پاک نے ان کو ان کی قوم پر نصرت دی اور وہ عظیم نشانیوں کے مشاہدے کے باوجود ان کے ایمان سے ناامید ہوئے تو اس کے بعد اپنی قوم کے درمیان سے ہجرت کی اور کہا: میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں وہ مجھے راہ دے گا۔

﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ سے مراد مطیع اور فرماں بردار اولاد ہے کہ وہ ان کی قوم اور کنبے کا بدل ہو جائے جن سے انھوں نے علاحدگی اختیار کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر ہم نے اس کو ایک فرزندِ حلیم کی خوش خبری دی۔ یہ فرزند اسماعیل علیہ السلام ہیں، کیوں کہ پہلے پہل جس فرزند کی بشارت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی وہ یہی ہیں اور اہلِ اسلام اور

اہلِ کتاب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ بڑے ہیں اسحٰق علیہ السلام سے، بلکہ ان کی کتاب میں یہ ہے کہ اسماعیل علیہ السلام اس وقت پیدا ہوئے جب ابراہیم علیہ السلام چھیاسی برس کے تھے اور جب اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی عمر ننانوے برس کی تھی اور ان کے نزدیک یہ بات ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم کیا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کریں۔ دوسرے نسخے میں بکرہ ہے، یعنی اپنے پہلے پہل کے بیٹے کو ذبح کریں۔

ذبیح کون تھے اسحاق علیہ السلام یا اسماعیل علیہ السلام:

پھر اہلِ کتاب نے اس جگہ کلمۂ اسحاق علیہ السلام کو کذب اور بہتان کے طور پر ٹھونس دیا اور یہ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ان کی کتاب کی نص کے خلاف ہے۔ کلمۂ اسحاق علیہ السلام کو صرف اس لیے ٹھونسا کہ وہ ان کے باپ ہیں اور اسماعیل علیہ السلام عرب کے باپ ہیں۔ سو اہلِ کتاب نے عرب پر حسد کیا، اس لیے اس کو زیادہ کیا اور ''وَحِيْدَكَ'' کی ان معنوں میں تحریف کی کہ وہ لڑکا جس کے علاوہ تیرے پاس کوئی نہیں، کیوں کہ اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد کو مکے کی طرف لے گئے تھے، حالاں کہ یہ تاویل و تحریف باطل ہے، اس لیے کہ ''وَحِيْدَكَ'' نہیں کہتے مگر اس شخص کے لیے جس کے لیے اس کا غیر نہ ہو۔ نیز اس واسطے کہ آدمی اپنے پہلے پہل کے بیٹے کو جتنا عزیز رکھتا ہے اتنا اس کے بعد کی اولاد کو عزیز نہیں رکھتا، چنانچہ پہلے بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم کرنا آزمایش اور اختبار و امتحان میں زیادہ موثر ہے۔

اہلِ علم کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ ذبیح اسحاق علیہ السلام ہیں۔ یہ قول سلف کی ایک جماعت سے حکایت کیا گیا ہے، یہاں تک کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہوا ہے اور اس بارے میں نہ کتاب ہے نہ سنت۔ میرا گمان یہی ہے کہ یہ قول احبار اہلِ کتاب سے لیا گیا اور بغیر حجت کے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ دیکھو یہ اللہ کی کتاب اس طرف شاہد و مرشد ہے کہ وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں، کیوں کہ غلام حلیم کی بشارت کا ذکر کیا اور یہ ذکر کیا کہ وہ ذبیح ہے۔ پھر اس کے بعد فرمایا: ﴿ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ اور جب فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی تو کہا: ﴿ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ [الحجر: ۵۳] ''ہم تجھے ایک صاحبِ علم فرزند کی بشارت دیتے ہیں۔'' نیز اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴾ [هود: ۷۱] ''ہم نے اسے اسحاق علیہ السلام کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب علیہ السلام کی خوش خبری دی۔'' یعنی اس کے لیے پیدا کیا جائے گا دونوں کی حیات میں ایک لڑکا جس کا نام یعقوب رکھا جائے گا، پھر اس کی ذریت سے عقب و نسل ہوگی۔

ہم وہاں ذکر کر آئے ہیں کہ اس کے بعد یہ جائز نہیں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم کیا جائے اور وہ صغیر السن ہوں، کیوں کہ اللہ پاک نے دونوں سے یہ وعدہ کیا کہ آیندہ اس کی عقب و نسل ہوگی، پھر اس کے بعد یہ کیوں کر ممکن ہے کہ چھوٹی عمر کی حالت میں اسحاق علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لیے انھیں حکم دیا جائے۔

اسماعیل علیہ السلام کو اس جگہ حلیم کے ساتھ موصوف کیا، اس لیے کہ یہ اس مقام کے مناسب ہے: ﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ ﴾ یعنی پھر جب بڑا ہوا اور جوان ہوا اور اپنے باپ کے ساتھ جانے اور چلنے لگا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہر وقت جاتے اپنے لڑکے اور اس کی ماں کی خبر لیتے اور ان کے حال میں نظر کرتے۔ وہ بلادِ فاران میں تھے۔ ذکر کیا ہے کہ براق پر سوار ہوتے وہاں تک جلد پہنچ جاتے تھے۔ واللّٰه أعلم.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، عطاء خراسانی اور زید بن اسلم رحمہم اللہ وغیرہم سے مروی ہے کہ جوان ہوا، مرد بنا اور جس سعی و عمل کو اس کا باپ کرتا تھا اس کی طاقت رکھی۔[1] پھر جب اس کے ساتھ سعی کو پہنچا تو کہا: ﴿ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ﴾ عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے کہا کہ انبیاء کے خواب وحی ہیں۔ پھر آیتِ مذکور پڑھی۔[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: انبیاء کا رؤیا خواب میں وحی ہے۔[3] اس طریق سے یہ روایت کتبِ ستہ میں بالکل نہیں ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنے فرزندِ ارجمند کو ذبح کا اعلام کیا، یعنی خبر دی تو اس لیے کہ ان پر ذبح سہل و آسان ہو جائے اور ان کے صبر، راستی، چستی اور عزم کو جانچیں کہ وہ بچپن کی حالت میں کس قدر اللہ کی طاعت پر اور اپنے باپ کی طاعت پر ہے۔ اسماعیل علیہ السلام بولے: ﴿ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ﴾ یعنی اے باپ! اللہ تعالیٰ نے جو تجھ کو میرے ذبح کرنے کا حکم فرمایا ہے، پس تو اس کام کو کر ڈال۔

﴿ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ یعنی میں صبر کروں گا اور اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر و ثواب طلب کروں گا۔ اس وعدے میں اسماعیل علیہ السلام سچے ہوئے، اسی لیے اللہ پاک نے ان کی تعریف میں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴾ [مریم: ٥٤۔٥٥] ''اس کتاب میں اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ بھی بیان کرو بڑا ہی وعدے کا سچا تھا اور تھا بھی رسول اور نبی۔ وہ اپنے گھر والوں کو برابر نماز اور زکات کا حکم دیتا تھا اور تھا بھی اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پسندیدہ اور مقبول۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا ﴾ ''أَيْ: فَلَمَّا تَشَهَّدَا وَذَكَرَا اللّٰهَ تَعَالٰى إِبْرَاهِيمُ عَلَى الذِّبْحِ وَالْوَلَدُ عَلٰى شَهَادَةِ الْمَوْتِ'' یعنی شہادت دی دونوں نے اور ذکر کیا اللہ تعالیٰ کا، ابراہیم علیہ السلام نے تو ذبح پر اور فرزند نے موتِ شہادت پر۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَسْلَمَا ﴾ بہ معنی ''اِسْتَسْلَمَا وَانْقَادَا'' ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے تو اللہ تعالیٰ کے حکم

---

[1] تفسیر الطبري (٢١/٧٣) تفسیر ابن کثیر (٤/٢٠) [2] تفسیر الطبري (٢١/٧٥)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٢١) تفسیر ابن کثیر (٤/٢٠، ٢١) اس کی سند میں ''سماک بن حرب عن عکرمہ'' ضعیف راوی ہے۔

کی فرماں برداری کی اور اسماعیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی اور اپنے باپ کی اطاعت کی۔[1] (قاله مجاهد وعكرمة وقتادة والسدي وابن إسحاق وغيرهم)

﴿ وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اس کو اس کی پیشانی کے بل پچھاڑا، تاکہ اسے اس کی گدی کی طرف سے ذبح کرے اور اس کے ذبح کرتے وقت اس کے چہرے کو دیکھ نہ سکے، تاکہ اس کے لیے آسان ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ''أَكَبَّهُ عَلٰى وَجْهِهِ'' یعنی اس کو اس کے منہ کے بل اوندھا ڈالا۔[2] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو مناسک کا حکم ہوا تو شیطان ان کے سامنے سعی کے وقت ظاہر ہوا، پھر اُن کے ساتھ دوڑا، تاکہ ان کے آگے آئے تو ابراہیم علیہ السلام اس سے آگے بڑھ گئے۔ پھر جبریل علیہ السلام ان کو جمرۂ عقبہ کی طرف لے گئے۔ پھر شیطان ان کے لیے ظاہر ہوا تو آپ نے اس کو سات کنکریاں ماریں، یہاں تک کہ وہ چلا گیا۔ پھر جمرۂ وسطیٰ کے پاس اُن کے سامنے ظاہر ہوا تو آپ نے اس کو سات کنکریاں ماریں۔

''ثُمَّ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ'' یعنی پھر اس کو پیشانی کے بل پچھاڑا۔ اسماعیل علیہ السلام کے پاس ایک سفید کُرتا تھا، انھوں نے اپنے باپ سے کہا کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی کپڑا نہیں ہے جس میں آپ مجھے کفنائیں گے۔ چنانچہ آپ اس کو اتاریں، تاکہ آپ مجھے اس میں کفنا دیں۔ ''فَعَالَجَهُ لِيَخْلَعَهُ'' یعنی ابراہیم علیہ السلام اس کو اتارنے لگے، تاکہ اسے علاحدہ کر دیں، ان کے پیچھے سے یہ ندا کی گئی: ﴿ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ ﴾ انھوں نے مڑ کر دیکھا تو ایک کبشِ ابیض اقران اعین، یعنی ایک سفید رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں اور بڑے بڑے سینگوں والا دنبہ پایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''لَقَدْ رَأَيْتُنَا نَتَّبِعُ ذٰلِكَ الضَّرْبَ مِنَ الْكِبَاشِ'' یعنی مقرر ہم نے اپنے آپ کو دیکھا ہے کہ ہم اس قسم کے دنبے کی تلاش کرتے تھے۔[3] (وذكر هشام الحديث في المناسك بطوله ثم رواه أحمد بطوله عن يونس عن حماد بن سلمة عن عطاء بن السائب عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضی اللہ عنہما فذكره إلا أنه قال: إسحاق)۔[4]

پس سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تسمیۂ ذبیح میں دو روایتیں ہیں۔ ان سے زیادہ ظاہر روایت یہ ہے کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام ہیں، اس وجہ کے سبب سے جس کا بیان۔ ان شاء اللہ۔ آیندہ آئے گا۔

محمد بن اسحاق کے الفاظ بہ سندِ خود عن جعفر بن ایاس عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴾ کی تفسیر میں یہ ہیں: ''قَالَ: خَرَجَ عَلَيْهِ كَبْشٌ مِنَ الْجَنَّةِ قَدْ رَعَى قَبْلَ ذٰلِكَ أَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا فَأَرْسَلَ إِبْرَاهِيْمُ علیہ السلام اِبْنَهُ وَاتَّبَعَ الْكَبْشَ فَأَخْرَجَهُ إِلَى الْجَمْرَةِ الْأُوْلٰى (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی اصل روایت میں

[1] تفسير الطبري (٧٥/٢١، ٧٦) [2] تفسير الطبري (٧٦/٢١، ٧٧) [3] مسند أحمد (٢٩٧/١)
[4] مسند أحمد (٣٠٦/١) اس کی سند میں ''عطاء بن سائب'' ضعیف راوی ہے۔

"أخرجه" بہ خائے معجمہ ہے، لیکن ۔والله أعلم۔ بہ خائے مہملہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔أخرجه إليه بمعنى الجاه إليه آتا ہے۔ أي: اضطره إليه) فَرَمَاهُ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ ثُمَّ أَفْلَتَهُ عِنْدَهَا فَجَاءَ إِلَى الْجَمْرَةِ الْوُسْطٰى فَأَخْرَجَهُ عِنْدَهَا فَرَمَاهُ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ ثُمَّ أَفْلَتَهُ فَأَدْرَكَهُ عِنْدَ الْجَمْرَةِ الْكُبْرَى فَرَمَاهُ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ فَأَخْرَجَهُ عِنْدَهَا (یہ جملہ بھی اصل روایت میں اسی طرح ہے لیکن صحیح یوں معلوم ہوتا ہے:"فأدركه عند الجمرة الكبرٰى فأخرجه عندها فرماه بسبع حصيات... الخ والله أعلم"۔ اس اثر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنبہ بھاگا تھا، چنانچہ اسی بات کی تائید وہ قول کرتا ہے جو تفسیر مدارک اور بیضاوی میں بلفظ "رُوِيَ" مذکور ہے۔ إنه هرب من إبراهيم عند الجمرة فرماه سبع حصيات حتى أخذه فبقيت سنة في الرمي.[1] انتهىٰ) ثُمَّ أَخَذَهُ فَأَتَى بِهِ الْمَنْحَرَ مِنْ مِنًى فَذَبَحَهُ فَوَ الَّذِيْ نَفْسُ ابْنِ عَبَّاسٍ بِيَدِهِ لَقَدْ كَانَ أَوَّلُ الْإِسْلَامِ وَإِنَّ رَأْسَ الْكَبْشَةِ لَمُعَلَّقٌ بِقَرْنَيْهِ فِيْ مِيْزَابِ الْكَعْبَةِ حَتّٰى وَحَشَ يَعْنِيْ يَبِسَ"[2]

عبدالرزاق نے بہ سندِ خود قاسم سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور کعب جمع ہوئے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرنے لگے اور کعب رضی اللہ عنہ نے کتابوں سے حدیث بیان کرنا شروع کیا۔ چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بولے کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک ہر نبی کے لیے ایک دعائے مستجاب ہے اور بے شک میں نے اپنی دعا قیامت کے دن اپنی اُمت کی شفاعت کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔ اس پر کعب رحمہ اللہ نے ان سے کہا کہ تو نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ کہا: ہاں۔ کعب رحمہ اللہ بولے: میرے ماں باپ تجھ پر سے قربان ہوں، یا ان پر سے قربان ہوں! کیا پھر میں تجھے ابراہیم علیہ السلام کی خبر نہ دوں جب وہ خواب میں اپنے فرزند اسحاق علیہ السلام کو ذبح کرنا دکھائے گئے تو شیطان بولا کہ اگر میں نے ان لوگوں کو اس حالت کے وقت فتنے میں نہ ڈالا تو پھر کبھی بھی ان کو فتنے میں نہ ڈال سکوں گا۔ پھر ابراہیم اپنے بیٹے کو لے کر نکلے، تاکہ اسے ذبح کریں۔ پس شیطان چلا تو سارہ علیہا السلام کے پاس آیا اور کہا: ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو کہاں لے کر گیا ہے؟ وہ بولیں کہ وہ صبح کے وقت اپنے کسی کام کے لیے اس کو لے گئے ہیں۔ شیطان نے کہا کہ وہ صبح کو اسے کسی کام کے لیے نہیں لے گئے ہیں، وہ تو اسے اس لیے لے گئے ہیں کہ اسے ذبح کریں۔ وہ بولیں: وہ اسے کیوں ذبح کرنا چاہتے ہیں؟ شیطان بولا: اس کا زعم ہے کہ اس کے رب نے اسے اس کا حکم دیا ہے۔ وہ بولیں: تو بے شک انھوں نے خوب کیا ہے کہ اپنے رب کی اطاعت کرتے ہیں۔ پھر شیطان باپ بیٹے کے پیچھے چلا اور بیٹے سے کہا کہ تیرا باپ تجھے کہاں لے جا رہا ہے؟ اس نے کہا کہ اپنے کسی کام کے لیے لے کر جا رہے ہیں۔ شیطان نے کہا: وہ تجھے کسی کام کے لیے نہیں لے جا رہے، بلکہ وہ تو تجھے اس لیے لے کر جا رہے ہیں کہ تجھے ذبح کر دیں۔ اس نے کہا: وہ مجھے کیوں ذبح کرنا چاہتے ہیں؟ شیطان نے کہا: اس کا زعم ہے کہ اس کے رب

[1] تفسير النسفي (٤/٢٥) تفسير البيضاوي (٥/٢٢) [2] تفسير الطبري (٢١/ ٨٩) تفسير ابن كثير (٤/ ٢١)

نے اس کا حکم دیا ہے۔ لڑکے نے کہا کہ اللہ کی قسم! البتہ اگر اللہ ہی نے ان کو اس کا حکم دیا ہے تو وہ ایسا ضرور کریں گے۔ راوی نے کہا: پھر شیطان اس سے ناامید ہوا تو اسے چھوڑ دیا اور ابراہیم علیہ السلام سے جا ملا اور کہا کہ تو صبح صبح اپنے بیٹے کو کہاں لایا ہے؟ وہ بولے: کسی کام کے لیے۔ شیطان بولا: تُو تو اسے صبح کو کسی کام کے لیے نہیں لایا، اس کو تو تُو اس لیے لایا ہے کہ اسے ذبح کرے۔ فرمایا: میں اسے کیوں ذبح کرنا چاہتا ہوں؟ کہا تو یہ زعم کرتا ہے کہ تیرے رب نے تجھے اس کا حکم کیا ہے۔ فرمایا: تو اللہ کی قسم! اگر اللہ ہی نے مجھے اس کا حکم کیا ہے تو میں ضرور کروں گا۔ کہا: پھر ان کو چھوڑ دیا اور اس بات سے ناامید ہوا کہ اس کی بات مانی جائے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اس کو بہ سندِ خود بطولہ ذکر کیا ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسحاق علیہ السلام کی طرف یہ وحی بھیجی کہ میں نے تجھے ایک دعا عطا کی، میں اس کو تیرے لیے قبول کروں گا۔ اسحاق علیہ السلام نے کہا: "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَدْعُوْكَ أَنْ تَسْتَجِيْبَ لِيْ أَيُّمَا عَبْدٍ لَقِيَكَ مِنَ الْأَوَّلِيْنَ وَالْآخِرِيْنَ لَا يُشْرِكُ بِكَ شَيْئًا فَأَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ"[1] یعنی الٰہی! میں تجھے پکارتا ہوں کہ تو میری یہ دعا قبول کر کہ اگلوں اور پچھلوں میں سے جو کوئی بندہ تجھ سے ملے جو تیرے ساتھ شریک نہ کرتا ہو کسی شے کو تو تُو اسے جنت میں داخل کرنا۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ یا میری آدھی اُمت کو بخش دے، یا میری شفاعت کو قبول کر لے، چنانچہ میں نے اس بات کو اختیار کیا ہے کہ میری شفاعت کو قبول کر لے اور اس بات کی امید کی کہ وہ میری اُمت کے لیے عام ہو اور اگر نہ ہوتی وہ شے جس کی طرف بندۂ صالح نے جلدی کی تو البتہ میں اس میں اپنی دعا کے لیے جلدی کرتا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے جب اسحاق علیہ السلام سے ذبح کی تکلیف میں کشایش کی تو اُن سے کہا گیا کہ اے اسحٰق! مانگ تجھے دیا جائے گا تو کہا: خبردار! قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! البتہ میں جلدی کروں گا اس کی شیطان کے نزعات سے پہلے کہ یا الٰہی! جو کوئی اس حال میں مرا کہ تیرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کرتا تو تُو اس کو بخش دے اور اسے جنت میں داخل کر۔[2] یہ حدیث منکر غریب ہے۔ عبدالرحمان بن زید بن اسلم ضعیف الحدیث ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں ڈرتا ہوں اس بات سے کہ حدیث میں زیادتی مدرج ہے، یعنی "إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ لَمَّا فَرَّجَ عَنْ إِسْحَاقَ... الخ والله أعلم" پس یہ اگر محفوظ ہے تو اشبہ یہ ہے کہ سیاق اسماعیل علیہ السلام ہی کی طرف سے ہے، اہلِ کتاب نے حسد کے مارے اسماعیل کی اسحاق کے ساتھ تحریف کر دی ہے۔ چنانچہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ورنہ مناسک اور ذبائح کا مقام جو ہے وہ مکہ کی سرزمین کی جگہ منیٰ میں ہے جہاں

---

① تفسير الصنعاني (٣/١٥٠، ١٥١) تفسير الطبري (٢١/٨١۔ ٨٢)

② تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٢٢) اس کی سند میں "عبدالرحمان بن زید بن اسلم" ضعیف راوی ہے۔

اسماعیل علیہ السلام تھے، اس کے برعکس اسحاق علیہ السلام بلادِ کنعان میں تھے، جو سرزمینِ شام میں سے ہیں۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تونے جو اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے لٹا دیا ہے، اس سے تیرے خواب کا مقصود حاصل ہو چکا۔ امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اسحاق علیہ السلام کی گردن پر چھری چلائی تو اس نے کچھ نہ کاٹا، بلکہ چھری کے اور ان کے درمیان تانبے کی ایک تختی حائل ہوگئی اور اس وقت ابراہیم علیہ السلام کو یہ ندا کی گئی کہ ﴿ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ﴾[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ یعنی جس طرح ہم نے ن سے بلا دور کر دی، اسی طرح ہم اس شخص سے سختیوں اور شدتوں کو دور کر دیتے ہیں جس نے ہماری طاعت کی، اس کے لیے ہم فراخی پیدا کر دیتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴾ [الطلاق: ۲۔ ۳] ''اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا اللہ اسے کافی ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنا پورا کام کر کے ہی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔''

علمائے اصول کی ایک جماعت نے اس آیت و قصے سے اس پر استدلال کیا ہے کہ فعل پر قادر ہونے سے پہلے نسخ صحیح ہے۔ معتزلہ کے ایک گروہ کا اس میں اختلاف ہے، حالاں کہ نسخ کے صحیح ہونے پر اس آیت میں واضح دلالت ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے ان کے فرزند کا ذبح کرنا مشروع فرمایا۔ پھر اس حکم کو ان سے منسوخ کیا اور اس کو فدیہ کی طرف پھیر دیا۔ پہلے جو ذبح کو مشروع کیا تو اس سے مقصود ابراہیم علیہ السلام کو صرف ثواب دینا تھا، اس بات پر کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے صبر وعزم کیا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴾ یعنی بے شک یہ آزمایش البتہ واضح اور کھلی ہوئی آزمایش یہی ہے، اس لیے کہ ان کو اپنے بیٹے کے ذبح کا حکم ہوا تو انھوں نے اللہ کے حکم کا مطیع و فرماں بردار ہو کر اس کی طرف جلدی کی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤي ﴾ [النجم: ۳۷] ''اور وفادار ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں تھا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴾ کی تفسیر میں سفیان کے الفاظ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ وہ ایک بڑی آنکھوں اور بڑے سینگوں والا سفید دنبہ تھا جو ببول کے درخت سے بندھا ہوا تھا۔ ابو الطفیل نے کہا جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ اس کو ببول کے درخت کے ساتھ بندھا پایا جو ثبیر پہاڑ میں تھا۔[3] امام ثوری رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ ایک دنبہ تھا جو جنت میں چالیس برس چر چکا تھا۔[4] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ

[1] تفسير ابن كثير (٤/٢٢) [2] تفسير الطبري (٢١/٧٤، ٧٥) [3] تفسير الطبري (٢١/٨٧) [4] تفسير الطبري (٢١/٩٠)

نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے واسطے سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ وہ پتھر جو منیٰ میں ثبیر کی جڑ میں ہے، یہ وہی پتھر ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند اسحاق علیہ السلام کے فدیہ کو ذبح کیا۔ ثبیر پہاڑ سے ایک بڑی آنکھوں اور بڑے سینگوں والا دنبہ اُن پر اترا تھا، اس کی آواز تھی، چنانچہ انھوں نے اس کو ذبح کر دیا، یہ وہی دنبہ ہے جس کی قربانی آدم علیہ السلام کے بیٹے نے کی تھی، پھر وہ اس سے قبول ہوئی تھی۔ پس وہ دنبہ رکھ چھوڑا گیا تھا، یہاں تک کہ اس سے اسحاق علیہ السلام کا فدیہ ہوا۔[1] یہ بھی امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ دنبہ جنت میں چرتا تھا، یہاں تک کہ ثبیر پہاڑ اس سے شق ہوا اور اس پر سرخ اُون تھی۔[2] امام حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دنبے کا نام جریر تھا۔[3] امام ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں: عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو مقام (مقامِ ابراہیم) میں ذبح کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کو منیٰ میں منحر کے نزدیک ذبح کیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بروایتِ عکرمہ مروی ہے کہ انھوں نے فتویٰ دیا تھا اس شخص کو جس نے اپنے ذمے پر یہ ٹھہرایا تھا کہ اپنے آپ کو نحر کرے (ذبح کرے) تو اس کو سو اونٹوں کا حکم دیا، پھر اس کے بعد فرمایا کہ اگر میں اس کو ایک دنبہ کا فتویٰ دیتا تو اسے کافی ہوتا کہ ایک دنبہ ذبح کر دے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ﴿ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴾[4] صحیح قول جس پر اکثر ہیں، یہ ہے کہ دنبے کا فدیہ دے۔ ﴿ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴾ کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثوری رحمہ اللہ نے یہ الفاظ روایت کیے ہیں کہ وعل، یعنی پہاڑی بکرا۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کے الفاظ حسن رحمہ اللہ سے یہ ہیں: "مَا فُدِيَ إِسْمَاعِيلُ إِلَّا بِتَيْسٍ مِنَ الْأَرْوٰی وَأُهْبِطَ عَلَيْهِ مِنْ ثَبِيْرٍ"[5] یعنی اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ نہیں دیا گیا، مگر ایک نر پہاڑی بکرے سے جو ثبیر پہاڑ سے ان پر اتارا گیا تھا۔

امام احمد رحمہ اللہ نے صفیہ بنت شیبہ سے روایت کیا ہے، کہا: بنی سلیم کی ایک عورت نے خبر دی جس نے ہمارے اہلِ دار کے عامہ کو جنا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرف ایک دفعہ ایک آدمی بھیجا۔ ایک بار اس عورت نے یوں کہا کہ خود اس نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے کیوں بلایا؟ تو عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے یہ فرمایا کہ میں نے دنبے کے دو سینگ دیکھے تھے، جب میں بیت اللہ میں داخل ہوا تو میں بھول گیا کہ تجھے یہ حکم دوں کہ تو ان کو ڈھانک دے، اب تو ان کو ڈھانک دے، کیوں کہ یہ لائق نہیں کہ بیت اللہ میں کوئی ایسی شے ہو جو نماز پڑھنے والوں کو مشغول کرے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے استاد سفیان کہتے ہیں کہ اس دُنبے کے دونوں سینگ بیت اللہ میں لٹکے رہے، یہاں تک کہ جب بیت اللہ جلا تو وہ بھی جل گئے۔[6] یہ اس بات پر ایک مستقل دلیل ہے کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام ہیں، کیوں کہ جس دنبے کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام نے فدیہ کیا تھا، اس کے سینگوں کے قریش

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٢١) [2] تفسير الطبري (٢١/٨٨) [3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٢٤)
[4] تفسير الطبري (٢١/٨٨) [5] تفسير الطبري (٢١/٨٩) [6] مسند أحمد (٤/٦٨)

خلف سلف سے ایک دوسرے کے وارث ہوتے چلے آئے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے بعد یہاں تک کہ اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ واللّٰہ أعلم.

اسماعیل ذبیح ہیں یا اسحاق؟ سلف سے مروی آثار:

یہاں ان آثار کا ذکر کیا جاتا ہے جو سلف سے اس بارے میں وارد ہوئے ہیں کہ ذبیح کون ہے۔ ذکر ان لوگوں کا جو اس بات کے قائل ہیں کہ ذبیح اسحاق علیہ السلام ہیں:

① حمزہ زیات نے ابو میسرہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے اس کے مواجہ میں، یعنی اس کے منہ درمنہ، فرمایا: کیا تو رغبت رکھتا ہے کہ میرے ساتھ کھائے، حالاں کہ میں واللہ! یوسف بن یعقوب نبی اللہ بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ ہوں۔ ② ثوری رحمہ اللہ نے عن ابی سنان عن ابی الہذیل روایت کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے اسی طرح کہا۔ ③ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے عن زید بن اسلم عن عبداللہ بن عبید عن عمیر عن ابیہ روایت کیا ہے: موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے عرض کی: اے اللہ! لوگ یوں کیوں بولتے ہیں: ''اے ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے معبود!'' اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ ابراہیم نے ہمیشہ ہر اس چیز کے مقابلے میں مجھے ہی اختیار کیا ہے جس کا میرے ساتھ تقابل کیا گیا ہے۔ رہے اسحاق تو انھوں نے میرے لیے ذبح ہونا قبول کیا اور وہ اپنی جان کے علاوہ کسی بھی چیز کو میرے لیے بالاولیٰ قربان کرنے والا ہے۔ باقی رہے یعقوب تو میں نے اس کی جتنی بھی آزمایشوں کے ساتھ پرکھ کی تو وہ میرے ساتھ مزید حسنِ ظن کرتا رہا۔ ④ ربیعہ نے عن ابی اسحاق عن ابی الاحوص روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس فخر کیا تو کہا کہ میں فلاں بن اشیاخ کرام ہوں۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تو یوسف بن یعقوب بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ ہیں۔ یہ قول عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح ہے۔

⑤ اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ اسحاق علیہ السلام ہیں۔ ⑥ اور ان کے والدِ ماجد عباس رضی اللہ عنہ اور ⑦ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اس کے مثل مروی ہے اور اسی طرح ⑧ عکرمہ و ⑨ سعید بن جبیر و ⑩ مجاہد و ⑪ شعبی و ⑫ زید بن اسلم و ⑬ عبداللہ بن شقیق و ⑭ زہری و ⑮ قاسم بن ابی ربزہ و ⑯ مکحول و ⑰ عثمان بن حاضر و ⑱ سدی و ⑲ حسن و ⑳ قتادہ و ㉑ ابن سابط نے کہا ہے۔[1]

یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے[2] اور ان کی روایت کعب احبار سے گزر چکی ہے کہ ذبیح اسحاق علیہ السلام ہیں اور اسی طرح ابن اسحاق نے بہ سندِ خود عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ عن کعب الاحبار روایت کیا ہے، کہا کہ وہ اسحاق علیہ السلام ہیں۔ یہ سارے اقوال ۔واللّٰہ أعلم۔ کعب احبار سے ماخوذ ہیں، کیوں کہ کعب جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مسلمان ہوئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی قدیم کتب سے حدیث بیان کرنے لگے، بسا اوقات سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کعب کی

---

① تفسیر الطبري (۲۱/۷۹۔۸۲) ② تفسیر الطبري (۲۱/۸۶)

باتوں کو سنا، اس پر لوگوں نے رخصت سمجھی کہ وہ کعب سے وہ باتیں اور اقوال سنیں جو اُن کے پاس تھے۔ غث وسمین (یعنی لاغر وفربہ، مراد ہیں اچھے اور برے قول) کو ان سے نقل کیا، حالاں کہ کعب کی باتوں میں سے ۔واللّٰہ أعلم، ایک حرف کی طرف بھی اس امت کو کوئی حاجت نہیں ہے۔ یعنی یہ قول کہ ذبیح اسحاق علیہ السلام ہیں۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے اس کو سیدنا عمر، علی، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے حکایت کیا ہے اور من جملہ تابعین کعب احبار، سعید بن جبیر، قتادہ، مسروق، عکرمہ، عطاء، مقاتل، زہری اور سدی رحمہم اللہ سے حکایت کیا ہے۔[1] کہا: یہ قول "إحدی الروایتین" ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس بارے میں ایک اَور حدیث وارد ہوئی ہے۔ اگر وہ ثابت ہوتی تو ہم بہ سروچشم اس کے قائل ہوتے، لیکن اس کی سند صحیح نہیں ہوئی۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود عن العباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں، جس کو ذکر کیا ہے، (وہ حدیث یہ ہے: "عن العباس بن عبد المطلب قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: قال نبي اللّٰه داود: يارب! أسمع الناس يقولون: رب إبراهيم و إسحاق و يعقوب فاجعلني رابعا، قال: إن إبراهيم ألقي في النار فصبر من أجلي و إن إسحاق جاد لي بنفسه و إن يعقوب غاب عنه يوسف وتلك بلية لم تنلك"[2] أخرجه البزار وابن جرير وابن أبي حاتم والحاكم وابن مردوية وفي إسناده الحسن بن دينار البصري و هو متروك عن علي بن زيد بن جدعان و هو ضعيف و أخرج الديلمي عن أبي سعيد الخدري مرفوعاً نحوه كذا في فتح البيان)[3] کہا ہے کہ وہ اسحاق علیہ السلام ہیں۔[4] پس اس کی اسناد میں دو شخص ضعیف ہیں: ایک تو حسن بن دینار بصری "متروک"، دوسرے علی بن زید بن جدعان "منکر الحدیث"۔ (وقد رواه ابن أبي حاتم عن أبيه عن مسلم بن إبراهيم عن حماد بن سلمة عن علي بن زيد بن جدعان به مرفوعاً ثم قال: قد رواه مبارك بن فضالة عن الحسن عن الأحنف عن العباس رضي الله عنه قوله و هذا أشبه و أصح واللّٰه أعلم)

ان آثار کا ذکر جو اس کے بارے میں وارد ہوئے ہیں کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ یہی قول قطعی صحیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پہلے روایت بیان ہو چکی ہے کہ وہ اسحاق علیہ السلام ہیں۔ واللّٰہ أعلم:

① سعید بن جبیر، عامر شعبی، یوسف بن مہران، مجاہد، عطاء اور کئی ایک اہلِ علم نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن عطاء بن ابی رباح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا

---

[1] تفسير البغوي (٤٦/٧)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٢٢/١٠) مستدرك الحاكم (٦٠٦/٢) الدر المنثور (١٠٧/٧) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" سخت ضعیف راوی ہے۔

[3] فتح البيان (٤٠٩/١١) [4] تفسير الطبري (٨٠/٢١) اس کی سند میں "علی بن زید اور حسن بن دینار" سخت ضعیف راوی ہیں۔

ہے، فرمایا کہ جس کا فدیہ دیا گیا وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں اور یہود نے زعم کیا کہ وہ اسحاق علیہ السلام ہیں اور یہود نے جھوٹ کہا۔ ② اسرائیل نے عن ثور عن مجاہد عن ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ ③ امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں اور اسی طرح ④ یوسف بن مہران نے کہا ہے۔

⑤ شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں اور واقعی میں نے اس دنبے کے سینگوں کو کعبے میں دیکھا ہے۔ ⑥ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے عن الحسن بن دینار اور عمرو بن عبید عن الحسن البصری روایت کیا ہے کہ وہ اس میں شک نہیں کرتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے جس کے ذبح کا حکم دیا گیا ہے، وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ ⑦ ابن اسحاق نے کہا اور میں نے سنا محمد بن کعب قرظی کو اس حال میں کہ وہ کہتے تھے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹوں میں سے جس بیٹے کے ذبح کا حکم دیا، وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں اور بے شک ہم اس کو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں پاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اس شخص کے قصے سے فارغ ہوا جو ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے ذبح کیا گیا تو یوں فرمایا: ﴿ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴾ [ھود: ۷۱] ''تو ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی خوش خبری دی۔'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اس کو بیٹے کی اور بیٹے کے بیٹے کی خوش خبری دی، پس وہ ایسا نہیں ہے کہ ان کو اسحاق کے ذبح کرنے کا حکم فرمائے، حالاں کہ اس کے لیے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شے کا وعدہ دیا گیا ہے جس کا اس کو وعدہ دیا ہے اور نہیں ہے وہ جس کے ذبح کا ان کو حکم دیا مگر اسماعیل علیہ السلام۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے محمد بن کعب کو سنا، وہ یہ بات بہت کہتے تھے۔

⑧ ابن اسحاق بریدہ بن سفیان بن بردہ اسلمی سے روای ہیں اور بریدہ محمد بن کعب قرظی سے روایت کرتے ہیں کہ محمد نے لوگوں کو یہ حدیث کی کہ اس نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے اس کا ذکر کیا اس حال میں کہ وہ خلیفہ تھے، جبکہ محمد اُن کے ہمراہ شام میں تھے تو عمر نے محمد سے کہا کہ بے شک یہ البتہ ایک ایسی شے ہے کہ میں اس میں غور وفکر نہیں کرتا تھا اور بے شک میں البتہ اس کو ویسا خیال کرتا ہوں جیسا تو نے کہا۔ پھر عمر رحمہ اللہ نے ایک آدمی کو ایک شخص کی طرف بھیجا، جو اُن کے نزدیک شام میں تھا، یہ شخص یہودی تھا، پھر اسلام لے آیا تھا اور اس کا اسلام اچھا ہوا تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ ان کے علماء میں سے ہے، پس عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس سے اس کے بارے میں پوچھا۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا اور اس نے ہم کو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے پاس خبر دی۔ چنانچہ عمر رحمہ اللہ نے اس سے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے کس کے ذبح کا حکم کیا گیا؟ تو اس نے کہا کہ اسماعیل علیہ السلام کا۔ واللہ یا امیر المومنین! اور بے شک یہود البتہ اس کو جانتے ہیں، لیکن اے عرب کے گروہ! وہ اس پر تمھارا حسد کرتے ہیں کہ وہ تمھارا باپ ہو،

کون باپ جس کے حق میں اللہ کا وہ حکم اور فضیلت ہو جس کا اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف سے ذکر کیا ہے، اس کے اس چیز سے صبر کے سبب سے جس کا اس کو حکم ہوا۔ لہٰذا وہ جان بوجھ کر اس کا انکار کرتے ہیں اور یہ زعم کرتے ہیں کہ وہ اسحاق علیہ السلام ہیں، اس لیے کہ وہ ان کے باپ ہیں۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ ان میں سے کون سا فرزند تھا اور ہر ایک اللہ عز وجل کے لیے طاہر، طیب اور مطیع تھا۔[1]

⑨ عبداللہ بن امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کتاب الزہد میں ذکر کیا ہے کہ میں نے اپنے والد سے ذبیح کے متعلق پوچھا کہ کیا وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں یا اسحاق علیہ السلام؟ تو کہا کہ اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ ⑩ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا: اور میں نے اپنے والد کو سنا، وہ کہتے تھے: صحیح یہ ہے کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ کہا ⑪ اور سیدنا علی و ⑫ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما و ⑬ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ و ⑭ ابو الطفیل رضی اللہ عنہ و ⑮ سعید بن مسیب رحمہ اللہ و ⑯ سعید بن جبیر رحمہ اللہ و ⑰ حسن رحمہ اللہ و ⑱ مجاہد رحمہ اللہ و ⑲ شعبی رحمہ اللہ و ⑳ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ و ㉑ ابو جعفر محمد بن علی رحمہ اللہ و ㉒ ابو صالح رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ان سب نے کہا ہے کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام ہیں۔[2] بغوی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، سعید بن مسیب، سدی، حسن بصری، مجاہد، ربیع بن انس، محمد بن کعب قرظی اور کلبی رحمہم اللہ اسی طرف گئے ہیں اور یہی ایک روایت ہے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابو عمرو بن العلاء سے بھی اس کو حکایت کیا ہے۔[3]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک غریب حدیث صنابحی سے روایت کی ہے، کہا کہ ہم معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے پاس تھے تو لوگوں نے ذکر کیا کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام ہیں یا اسحاق علیہ السلام؟ تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”عَلَى الْخَبِيْرِ سَقَطْتُمْ“ یعنی تم خبر رکھنے والے اور واقف کار کے پاس آپہنچے ہو، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا تو اس نے عرض کی: ”يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! عُدْ عَلَيَّ مِمَّا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ يَا ابْنَ الذَّبِيْحَيْنِ“ یعنی اے دو ذبیحوں کے فرزند! آپ کو جو اللہ نے عطا کیا ہے، اس میں سے آپ مجھے دیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیے۔ پھر معاویہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: اے امیر المومنین! دو ذبیح کیا ہیں؟ تو کہا: عبدالمطلب نے جبکہ چاہِ زمزم کے کھودنے کا حکم دیا تو اللہ کے لیے یہ نذر کی کہ اگر اللہ اس کا کام اس پر آسان کر دے گا تو البتہ اپنے ایک بیٹے کو ذبح کرے گا، کہا: پس عبداللہ پر سہم نکلا تو ان کے ماموں نے ان کو روکا اور کہا کہ تو اپنے بیٹے کے فدیے میں سو اونٹ قربان کر ڈال، چنانچہ عبدالمطلب نے عبداللہ کے فدیے میں سو اونٹ دیے اور دوسرے ذبیح اسماعیل علیہ السلام ہیں۔[4]

(هذا حديث غريب جدا وقد رواه الأرموي في مغازيه حدثنا بعض أصحابنا، أخبرنا إسماعيل بن عبيد بن أبي كريمة، حدثنا عمرو بن عبدالرحمن القرشي، حدثنا عبيد الله بن محمد العتبي من ولد عتبة بن أبي سفيان، حدثنا عبد الله بن سعيد، حدثنا الصنابحي قال: حضرنا مجلس معاوية رضي الله عنه فتذاكر القوم الذبيح إسماعيل أو إسحاق و ذكره كذا كتبته من نسخة مغلوطته)

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٨٢ـ٨٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٢٣) [3] تفسير البغوي (٧/٤٦، ٤٧)

[4] تفسير الطبري (٢١/٨٥، ٨٦) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٣٣١)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے جو یہ اختیار کیا ہے کہ ذبیح اسحاق ہیں تو اس بارے میں اس آیت پر اعتماد کیا ہے:
﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴾ پس اس بشارت کو وہی اسحاق علیہ السلام کی بشارت ٹھہرایا ہے جو اس آیت میں مذکور ہے:
﴿ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ [الذاریات: ٢٨] ''اور انھوں نے اس (ابراہیم علیہ السلام) کو ایک علم والے لڑکے کی بشارت دی۔''
اور یعقوب علیہ السلام کی بشارت کا یوں جواب دیا ہے کہ وہ پہنچا اس کے ساتھ سعی کو، یعنی عمل کو اور یہ ممکن ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے ساتھ ان کی اور اولاد بھی ہوئی ہو۔ کہا: اور وہ دو سینگ جو کعبے میں لٹکے ہوئے تھے، ہو سکتا ہے کہ وہ بلادِ کنعان سے منتقل کیے گئے ہوں۔ کہا: اور پہلے یہ گزر چکا ہے کہ لوگوں میں سے وہ ہیں جو اس طرف گئے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے اسحاق علیہ السلام کو وہاں ذبح کیا۔[1] یہ وہ بات ہے جس پر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اعتماد کیا ہے اور جس طرف وہ گئے ہیں نہ وہ مذہب ہے نہ لازم ہے، بلکہ وہ نہایت بعید ہے۔ اور محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے جس بات کے ساتھ اس پر استدلال کیا ہے کہ وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں، وہ اس سے زیادہ صحیح زیادہ ثابت اور زیادہ قوی ہے۔ والله أعلم.

﴿ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ جب کہ ذبیح کی بشارت یعنی اسماعیل علیہ السلام کی بشارت پہلے گزر چکی تو ان کے بھائی اسحاق علیہ السلام کی بشارت کے ساتھ عطف کیا اور یہ بشارت سورت ہود اور سورۃ الحجر میں گزر چکی ہے۔ ﴿ نَبِيًّا ﴾ حالِ مقدرہ ہے، یعنی عن قریب اس سے نبی صالح ہوگا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ذبیح اسحاق علیہ السلام ہیں، کہا اور قولہ تعالیٰ: ﴿ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ کہا کہ ان کی نبوت کی بشارت دی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴾ [مریم: ٥٣] ''اور اپنی خاص مہربانی سے اس کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر عطا فرمایا۔'' کہا کہ ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے، لیکن مراد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کی نبوت بخشی۔ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے: "قَالَ: إِنَّمَا بُشِّرَ بِهِ نَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِيْنَ، قَالَ: إِنَّمَا بُشِّرَ بِهِ نَبِيًّا حِيْنَ فَدَاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مِنَ الذِّبْحِ"۔[2] ''کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام کے صالحین میں سے نبی بنا کر خوش خبری دی، نیز یہ کہا کہ انھیں اسحاق کو نبی بنا کر خوش خبری دی، جب ان کو ذبح ہونے سے بچا لیا۔'' ان کے پیدا ہونے کے وقت نبوت کی بشارت نہ تھی۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما یوں روایت کیا ہے: "قَالَ: بُشِّرَ بِهِ حِيْنَ وُلِدَ وَحِيْنَ نُبِّیءَ"، یعنی ان کی ولادت و نبوت کے وقت بشارت دی۔ امام سعید بن ابی عروبہ رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: ''جب انھوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تو اللہ عز وجل نے کہا: ﴿ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰۤى اِسْحٰقَ ﴾''[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰۤى اِسْحٰقَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴾ اللہ تعالیٰ کے

---

[1] تفسیر الطبري (٢١/٨٦، ٨٧) [2] تفسیر الطبري (٢١/٩٢) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٢٤)

اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [هود: ٤٨] ”فرما دیا گیا: اے نوح! ہماری جانب سے سلامتی اور ان برکتوں کے ساتھ اتر، جو تجھ پر ہیں اور تیرے ساتھ کی بہت سی جماعتوں پر اور بہت سی وہ امتیں ہوں گی جنھیں ہم فائدہ تو ضرور پہنچائیں گے، لیکن پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔“[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے: ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں، یعنی میں اپنے مولد اور اپنی قوم کے شہر سے ہجرت کرنے والا ہوں۔ کونسی قوم! وہ جنھوں نے اپنے بتوں کے لیے تعصب کر کے اور اللہ پاک کے کافر و منکر ہو کر اور اس کے رسولوں کو جھٹلا کر کیا جو کچھ کیا۔ میں اس طرف ہجرت کرنے والا ہوں جس طرف میرے رب نے ہجرت کرنے کا مجھے حکم دیا ہے، یا اس جگہ کی طرف جہاں میں اس کی عبادت کرنے کی قدرت پاؤں گا۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے زمینِ شام کی طرف جانے کا ان کو حکم کیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ میں اپنے عمل، عبادت، قلب اور نیت کے ساتھ جانے والا ہوں۔ اس قول کی بنا پر ان کا جانا عمل کے ساتھ ہے اور پہلے قول کی بنا پر بدن کے ساتھ جانا ہے۔ ظاہر تر یہی قول ہے۔ یہ آیت ہجرت اور علاحدگی اختیار کرنے کے لیے اصل ہے۔ پہلے پہل یہ کام ابراہیم علیہ السلام نے کیا، جب اللہ پاک نے آگ سے ان کو خلاصی دی۔ اس ہجرت کا بیان پورے طور پر سورۃ الکہف میں گزر چکا ہے۔

﴿ سَيَهْدِيْنِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس کام کی میں نے نیت کی ہے اس میں میرا رب مجھے راہ بتائے گا، اس جگہ کی طرف جس کی طرف مجھے جانے کا حکم دیا ہے۔ یا میرے مقصود و مطلب کی طرف میری راہنمائی فرمائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ بات اس وقت کہی جب انھوں نے ہجرت کی۔[2] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: پھر جب وہ ارضِ مقدس میں آئے تو اپنے رب سے لڑکے کا سوال کیا۔ بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض کی: ﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾[3] یعنی اے میرے رب! تو مجھے نیکوں میں سے ایک نیک لڑکا عطا فرما جو تیری اطاعت پر میری اعانت کرے اور غربت و سفر میں مجھے انس دے۔ مفسرین نے اسی طرح کہا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ہبہ کے معنی ولد میں غالب ہوئے ہیں، چنانچہ جب صرف ہبہ بولا جائے گا تو ولد پر محمول ہوگا اور جب مقید وارد ہوگا تو اسی شے پر محمول ہوگا جس کے ساتھ مقید کیا گیا ہے جس طرح اس آیت میں ہے: ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴾ [مريم: ٥٣] ”اور اسے اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی بخشا۔“ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہبہ طلبِ ولد میں غالب نہیں ہے تو بھی قولہ تعالیٰ: ﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴾ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ سے ابراہیم علیہ السلام کی مراد ولد ہی ہے۔

[1] تفسير ابن كثير (٢٠/٤_٢٦) [2] الدر المنثور (١٠٢/٧) [3] تفسير البغوي (٤٦/٧)

معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس کو فرشتوں کی زبان پر جوان کے پاس مہمانوں کی صورت میں آئے تھے، غلامِ حلیم کی بشارت دی۔ پھر وہ ان کی بستی سے لوط علیہ السلام کی بستی کی طرف منتقل ہو گئے، جیسا کہ سورت ھود میں گزر چکا ہے اور سورۃ الذاریات میں آئے گا۔ ﴿ حَلِيْمٍ ﴾ کے معنی ہیں کہ وہ لڑکا حلیم ہو گا اور اپنے بڑے ہونے کے وقت تو گویا اس لڑکے کے باقی رہنے کی بشارت دی، یہاں تک کہ وہ بڑا ہو گا اور حلیم ہو جائے گا۔ کیوں کہ چھوٹے میں حلم کی صفت نہیں ہوتی۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بشارت اس بات پر دال ہے کہ ان کو ولد مذکر (لڑکے) کی بشارت دی گئی اور اس بات کی کہ وہ باقی رہنے گا، یہاں تک کہ سن میں پہنچے گا اور اس میں حلم کی صفت ہو گی۔[1]

﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ ﴾ میں عبارت محذوف ہے چنانچہ یہ فائے فصیحہ اس کا اشعار (اظہار) کر رہی ہے۔ تقدیرِ کلام یہ ہے: "فَوَهَبْنَا لَهُ الْغُلَامَ فَنَشَأَ حَتّٰى صَارَ إِلَى السِّنِّ الَّتِي يَسْعٰى فِيهَا مَعَ أَبِيهِ فِي أُمُورِ دُنْيَاهُ مُعِينًا لَهُ عَلٰى أَعْمَالِهِ"، یعنی پھر ہم نے اس کو وہ لڑکا عطا کیا، پھر وہ بڑھا، اس نے پرورش پائی، یہاں تک کہ اس عمر کو پہنچا، جس میں اپنے باپ کے ساتھ سعی کرے، اس کے دنیاوی امور میں اس کا معین اور مددگار ہو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: جب وہ جوان ہوا اور اس کی سعی نے ابراہیم علیہ السلام کی سعی کو پایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جوان ہوا، یہاں تک کہ کام کاج میں اس کی سعی اپنے باپ کی سعی کو پہنچی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب وہ اس کے ساتھ چلا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس وقت ان کی عمر تیرہ برس کی تھی۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سعی عقل کی سعی ہے جس کے ساتھ حجت قائم ہوتی ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد سعی فی العبادت ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ مراد احتلام ہے، یعنی جب بالغ ہوا۔

﴿ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ ﴾ "بُنَيَّ" کو بہ فتح وکسر یائے تحتیہ پڑھا ہے اور دونوں سبعیہ ہیں، یعنی جب وہ لڑکا اس عمر کو پہنچا کہ کام کاج میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹائے تو ابرہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے کہا: اے میرے بیٹے! بے شک میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کرتا ہوں۔ ﴿ اَذْبَحُكَ ﴾ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ ہے کہ بہ معنی "أَفْعَلُ الذَّبْحَ" ہے یا "أُومَرُ بِهِ"، یعنی میں فعلِ ذبح کر رہا ہوں، یا مجھے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پہلے احتمال کی طرف تو ﴿ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ﴾ اشارہ کرتا ہے۔ اور دوسرے احتمال کی طرف ﴿ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ﴾ اشارہ کرتا ہے۔ کچھ بھی ہو مطلب یہ ہے کہ میں نے خواب میں یہ رؤیا دیکھا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے تین رات پے در پے یہ خواب دیکھا۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انبیاء کا رؤیا حق ہے جس وقت کہ وہ کسی شے کو دیکھتے ہیں تو اسے کر ڈالتے ہیں۔[4]

---

(1) معاني القرآن (٣١٠/٤) (2) تفسير الطبري (٧٣/٢١) تفسير القرطبي (٩٩/١٥)
(3) تفسير القرطبي (١٠١/١٥) (4) الدر المنثور (١٠٤/٧)

﴿ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ﴾ امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے بہ ضم تائے فوقیہ و کسر راء پڑھا ہے اور دونوں مفعول محذوف ہیں: "أَيْ: اُنْظُرْ مَا ذَا تُرِيْنِيْ إِيَّاهُ مِنْ صَبْرِكَ وَاحْتِمَالِكَ" یعنی دیکھ تو کیا شے ہے جو تو مجھے اپنے صبر و برداشت سے دکھاتا ہے۔ اور ساتوں میں کے باقی قاریوں نے بہ فتح تاء و راء پڑھا ہے "رَأَى" سے۔ یہ "رَأَيْتُ" کا مضارع ہے اور امام ضحاک اور اعمش رحمہما اللہ نے "تُرٰى" بہ ضم تا و فتح راء بہ صیغۂ مجہول "أَيْ: مَا ذَا يُخَيَّلُ إِلَيْكَ وَيُسْنَحُ لِخَاطِرِكَ" یعنی کیا شے تیرے خیال میں ڈالی جاتی ہے اور تیرے دل میں ظاہر ہوتی ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے پہلی قراءت کے معنی بیان کرنے میں یوں کہا ہے: "اُنْظُرْ مَا ذَا تَرٰى مِنْ صَبْرِكَ وَجَزْعِكَ" یعنی دیکھ تو کیا شے دکھاتا ہے، اپنے صبر و بے صبری سے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام فراء رحمہ اللہ کے سوا کسی نے یہ بات نہیں کہی۔

دوسرے علماء نے جو کہا ہے وہ یہی ہے کہ تو کیا مشورہ دیتا ہے، یعنی تیرا دل تجھے کیا رائے دکھاتا ہے؟ ابوعبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جو ہوتا ہے سو خاصتاً رویتِ عین سے ہوتا ہے۔ اسی طرح امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے ان دونوں کے قول کو غلط کہا ہے اور کہا ہے کہ یہ رویتِ عین اور غیر رویتِ عین دونوں سے ہوتا ہے۔ دوسری قراءت کے معنی ظاہر اور واضح ہیں۔[1] غرضیکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے صرف اس لیے مشورہ لیا کہ اللہ کے حکم پر اس کے صبر کو جان لیں ورنہ انبیاء کے خواب تو وحی ہوتے ہیں اور ان کو ماننا ان کے لیے لازمی اور واجب ہوتا ہے۔

﴿ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ﴾ "أَيْ: مَا تُؤْمَرُ بِهِ" حرفِ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے، یعنی باپ سے بیٹے نے کہا: اے میرے باپ! تو وہ کام کر ڈال جس کا تجھے حکم کیا جاتا ہے، یعنی میرا ذبح کیا جانا، جس کی تیری طرف وحی کی گئی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَا ﴾ مصدریہ ہے اس معنی میں کہ "اِفْعَلْ أَمْرَكَ" اور مصدر مضاف ہے طرف مفعول کے اور مامور بہ کا امر نام رکھ دیا ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ اس میں یہ جھگڑا نہیں ہے جو اس میں ہے۔ بالجملہ پھر بیٹے نے اپنے باپ کی تسلی کے لیے یوں کہا: ﴿ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ یعنی عن قریب اگر اللہ نے چاہا تو اس ذبح پر جس کے ساتھ میرا امتحان کیا گیا ہے، مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔

اپنی بات کو جو اللہ پاک کی مشیت کے ساتھ معلق کیا تو یہ تبرک کے لیے ہے۔ ﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا ﴾ "أَيْ: اِسْتَسْلَمَا لِأَمْرِ اللّٰهِ وَأَطَاعَاهُ وَانْقَادَا لَهُ وَخَضَعَا" یعنی پھر جب باپ بیٹے دونوں مطیع اور فرمانبردار ہوئے اور اللہ کے حکم کے لیے تواضع اور فروتنی کی۔ جمہور نے ﴿ اَسْلَمَا ﴾ پڑھا ہے اور سیدنا علی، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے "سَلَّمَا" پڑھا ہے، یعنی دونوں نے اپنے کام کو اللہ کی طرف تفویض کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے "اِسْتَسْلَمَا" پڑھا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "أَسْلَمَ أَحَدُهُمَا نَفْسَهُ لِلّٰهِ وَأَسْلَمَ

[1] تفسير القرطبي (١٥/١٠٣) فتح القدير (٤/٥٣٢، ٥٣٣)

الْآخَرُ ابْنَهُ"[1] یعنی ان میں سے ایک نے تو اپنے نفس کو اللہ کے لیے سونپ دیا اور دوسرے نے اپنے بیٹے کو سونپ دیا۔ "سَلَّمَ لِأَمْرِ اللّٰهِ وَأَسْلَمَ وَاسْتَسْلَمَ" ایک معنی میں بولتے ہیں۔ "لَمَّا" کے جواب میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے۔ کسی نے تو کہا ہے کہ محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "ظَهَرَ صَبْرُهُمَا أَوْ أَجْزَلْنَا لَهُمَا أَجْرَهُمَا أَوْ فَدَيْنَاهُ بِكَبْشٍ"۔ بصریوں نے اسی طرح کہا ہے، یعنی جب باپ بیٹے امرِ الٰہی کے مطیع ہوئے تو ان کا صبر ظاہر ہو گیا، یا ہم نے ان کو ثوابِ جزیل دیا، یا ہم نے دنبے کے ساتھ اس کا فدیہ کیا۔

کوفی کہتے ہیں کہ جواب ﴿ وَنَادَيْنَاهُ ﴾ ہے اور حرفِ واو زائد ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے ان پر یوں اعتراض کیا ہے کہ حرفِ واو حروفِ معانی میں سے ہے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ زیادہ کیا جائے۔ امام اخفش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جواب ﴿ وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ﴾ ہے اور حرفِ واو زاید ہے۔ کوفیوں سے بھی یہ قول مروی ہے۔ وہی امام نحاس رحمہ اللہ کا اعتراض اس پر بھی وارد ہوتا ہے۔ جیسا کہ اول پر وارد ہو چکا۔[2] (مگر نحاس رحمہ اللہ کا یہ اعتراض کچھ قوی اعتراض نہیں ہے۔ یہ قاعدہ کہاں مقرر ہو چکا ہے کہ جو حرف حروفِ معانی سے ہو تو وہ کبھی زاید نہ ہو۔ واللّٰہ أعلم از مصحح سلمہ اللّٰہ تعالیٰ)۔

﴿ وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ﴾ یعنی پچھاڑا اور اس کو اس کے پہلو پر گرا دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ "تَلَّ" قوت سے پھینکنے کو کہتے ہیں۔ اس کی اصل "رَمَاهُ عَلَى التَّلِّ" سے ہے۔ "تل" کہتے ہیں بلند جگہ کو۔ یا ماخوذ ہے "تَلِيْلٌ" سے۔ "تَلِيْلٌ" گردن کو بولتے ہیں، یعنی پھینک دیا اس کو اس کی گردن کے بل۔ پھر ہر گرانے کے لیے "تل" بولا گیا، گو نہ تل پر ہو نہ گردن پر۔ قاموس میں "تَلَّهُ تَلًّا مِنْ بَابِ قَتَلَ فَهُوَ مَتْلُوْلٌ وَتَلِيْلٌ صَرَعَهُ وَأَلْقَاهُ عَلٰى عُنُقِهِ وَخَدِّهِ"[3] یعنی اس کو اس کی گردن اور رخسار پر ڈال دیا۔ محاورے میں بولتے ہیں: "تَلَلْتُ الرَّجُلَ إِذَا أَلْقَيْتَهُ" اور "تَلَّ" بہ معنی صرع و دفع آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو اس کی پیشانی کے بل زمین پر لٹایا۔ جبین وہ ہے جو منکشف ہو، جبہہ (ماتھے) سے۔ (قالہ السمین)

مصباح میں کہا ہے کہ جبین ناحیۂ جبہہ (ماتھے کا کنارا) ہے۔ نزعہ کے محاذاۃ سے صدغ تک (نزعہ: یک موے پیشانی کہ آنرا بحریسہ خوانند و ہما نزعتان۔ وصدغ: میانِ چشم و گوش از مردم۔ كذا في الصراح)۔ جبہہ کے راست و چپ سے دو جبین ہیں۔ (قالہ الأزهري و ابن فارس وغيرهما)۔ پس جبہہ دو جبین کے درمیان ہے جمع "جَبِيْنٌ" کی۔ "جُبُنٌ" بہ ضمتین ہے، جیسے: "بَرِيْدٌ وَبُرُدٌ" اور "أَجْبِنَةٌ" جیسے: "أَسْلِحَةٌ"۔[4] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس کو اوندھا اس کے منہ کے بل ڈالا، تاکہ اس سے وہ شے نہ دیکھیں جو اُن کے دل کی رقت کا باعث ہو۔ اس

---

[1] تفسير القرطبي (١٠٤/١٥) [2] فتح القدير (٥٣٣/٤) [3] القاموس المحيط (٥٢/١) [4] المصباح المنير (٥٢/١)

جگہ کے بارے میں اختلاف ہے، جہاں اس کے ذبح کا ارادہ کیا۔ چنانچہ کسی نے کہا ہے کہ مقام میں وہ جگہ مکہ مکرمہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ منیٰ کے منحر میں جمار کے نزدیک۔ کسی نے کہا ہے کہ اس پتھر پر جو ثبیر پہاڑ کی جڑ میں ہے۔ کسی نے کہا: شام میں۔

مفسرین نے کہا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ذبح کے لیے لٹایا تو پہاڑ کی طرف سے ان کو یہ ندا کی گئی: ﴿ يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ ﴾ یعنی جو بات تو نے خواب میں دیکھی، اس کے کرنے پر تو نے عزم کر لیا۔ صرف عزم کے ساتھ جو اُن کو مصدق ٹھہرایا، اگرچہ انھوں نے بیٹے کو ذبح نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کام اُن کے امکان میں تھا، وہ انھوں نے کر دیا اور مقصود یہی تھا کہ وہ دونوں اللہ کے حکم کی بجا آوری کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اور وہ اس کو کر چکے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علمائے اہلِ سنت نے فرمایا ہے کہ ذبح کا کام واقع نہیں ہوا اور اگر واقع ہو جاتا تو اس کا رفع متصور نہ ہوتا۔ چنانچہ یہ نسخ قبل الفعل کے باب سے تھا۔ کیوں کہ اگر ذبح کے حکم کی فرماں برداری سے فراغت حاصل ہو جاتی تو فدیہ ثابت نہ ہوتا۔ کہا اور ﴿ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جو کام تیرے امکان میں تھا، وہ تو نے کر دیا۔ پھر جب ہم نے تجھے روک دیا تو تو رُک گیا۔ اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، یہ قول اس سب سے زیادہ صحیح ہے۔ ایک گروہ نے یوں کہا ہے کہ یہ اس قبیل سے نہیں ہے جو کسی طرح منسوخ ہو، کیوں کہ "ذَبَحْتُ الشَّيْءَ" کے یہ معنی ہیں کہ میں نے اس شے کو قطع کیا۔ ابراہیم علیہ السلام چھری لیتے، پھر اسے اپنے بیٹے کے گلے پر چلاتے تو وہ لوٹ جاتی تھی، جیسا کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ بعض نے کہا: جب وہ کسی جزء کو قطع کرتے تھے، تبھی وہ مل جاتا تھا۔

ایک گروہ نے یہ کہا من جملہ اس کے سدی رحمہ اللہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بیٹے کی گردن پر تانبے کا ایک صفحہ لگا دیا تھا۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے کاٹنا شروع کیا، حالاں کہ وہ کسی شے کو نہیں کاٹتے تھے۔ قدرتِ الٰہیہ میں یہ سب کچھ جائز ہے لیکن یہ بات نقلِ صحیح کی محتاج ہے، کیوں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ آنکھ سے اس کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا طریقہ تو خبر ہی ہوتی ہے اور اگر یہ بات ہوئی ہوتی تو اللہ پاک ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے رُتبے کی عظمت کے لیے ضرور اس کو بیان فرما دیتا اور اس کا بیان فدا کے بیان سے بھی اولیٰ ہوتا۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو گردن کی رگوں کو کاٹ کر اور خون بہا کر ذبح کرنے کا حکم نہیں ہوا تھا، انھوں نے تو صرف یہ دیکھا تھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کے لیے لٹایا ہے اور یہ وہم کر لیا کہ ان کو حقیقی طور پر ذبح کرنے کا حکم ہوا ہے۔ پھر جس لٹانے کا ان کو حکم ہوا تھا، جب اس کو کر چکے تو ان سے کہا گیا: ﴿ قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ ﴾ یہ سب مفہومِ آیت سے خارج ہے۔ خلیل اور ذبیح علیہما السلام کے ساتھ یہ گمان نہیں کیا سکتا کہ وہ اس حکم سے وہ بات سمجھیں جس کی کوئی حقیقت نہ ہو، یہاں تک کہ ان سے تو ہم

صادر ہو۔ نیز اگر یہ چیزیں صحیح ہوتیں تو فدیہ کی طرف حاجت نہ ہوتی۔[1]

﴿ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴾ یعنی جیسی ہم نے تجھے جزا دی ویسی ہی جزا ہم محسنین کو ان کی حکم برداری کے سبب سے اس طرح دیتے ہیں کہ سختیوں سے ان کو نجات دیتے ہیں اور محنتوں سے ان کو صحیح و سالم رکھتے ہیں۔ پس یہ جملہ ماقبل کے لیے تعلیل کی طرح ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ کے قول کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ پاک کی طاعت میں احسان و اخلاص کیا تو اس نے ان کو یہ جزا دی کہ ان کے بیٹے کے ذبح کرنے سے عفو فرمایا۔[2]

﴿ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِيۡنُ ﴾ ابتلاء اور بلا کے معنی اختبار و امتحان، یعنی آزمانا جانچنا ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ بے شک البتہ یہی ہے کھلا ہوا جانچنا، اس لیے کہ اللہ پاک نے اپنی طاعت میں ان کو اپنے فرزندِ ارجمند کو ذبح کرنے کے حکم سے آزمایا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ بے شک البتہ یہی ظاہر نعمت ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے فرزند کو ذبح سے صحیح سالم رکھا اور دُنبے کے ساتھ اس کا فدیہ کیا۔ جس وقت اللہ پاک کسی پر انعام کرتا ہے تو محاورۂ عرب میں یوں کہتے ہیں کہ ''أَبْلَاهُ اللّٰهُ إِبْلَاءً وَّبَلَاءً''، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ ابتلاء خیر اور شر کے ساتھ آزمانے میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی باب سے یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ وَنَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَةً ‌ؕ وَاِلَيۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴾ [الأنبياء: ٣٥] ''ہم بطریقِ امتحان تم میں سے ہر ایک کو برائی بھلائی میں مبتلا کرتے ہیں اور تم سب ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' لیکن مناسبِ مقام معنی اول ہیں۔ ابن زید نے کہا: یہ اس بلاء کے بارے میں ہے جو اُن پر نازل ہوئی تھی، اس بات میں کہ اپنے بیٹے کو ذبح کریں۔ کہا: اور یہ من جملہ بلائے مکروہ ہے۔[3]

﴿ وَفَدَيۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِيۡمٍ ﴾ ذبح بالکسر مذبوح کا اسم ہے، جیسے: طحن اسم ہے مطحون کا۔ اس کی جمع ذبوح ہے اور بالفتح مصدر ہے۔ ﴿ عَظِيۡمٍ ﴾ کے معنی عظیم القدر ہیں، عظیم الجثہ مراد نہیں ہے۔ اس کی قدر اس لیے عظیم ہوئی کہ اس کے ساتھ ذبیح کا فدیہ کیا گیا، یا اس لیے کہ وہ مقبول ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ عَظِيۡمٍ ﴾ لغت میں کبیر اور شریف کے لیے آتا ہے۔ اہلِ تفسیر اس جگہ اس بات پر ہیں کہ عظیم شریف کے لیے ہے، یعنی قبول کیا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ مقبولیت کی شرافت جو اُسے حاصل ہوئی، اس لیے اس کو عظیم کہا۔ یا اس لیے کہ وہ دنبہ چالیس برس جنت میں چر چکا تھا۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پہلے گزر چکا ہے۔[4] اکثر مفسرین کا قول یہی ہے، دوسرے قول پہلے گزر چکے ہیں۔

من جملہ معلوم و مقرر یہ بات ہے کہ ہر شے جو جنت کی ہے آگ اس پر اثر نہیں کرتی، چنانچہ اس دنبے کا گوشت پکایا نہیں گیا، بلکہ اس کو درندوں اور پرندوں نے کھا لیا۔ فَتَأَمَّلْ۔ (پہلے گزر چکا ہے کہ اس کے سینگ کعبے

[1] تفسیر القرطبي (١٠٢/١٥، ١٠٣) [2] تفسير البغوي (٥٠/٧) [3] تفسير الطبري (٧٩/٢١) [4] تفسير الطبري (٩٠/٢١)

میں معلق تھے، یہاں تک کہ کعبہ جلا تو وہ بھی جل گئے۔ واللہ أعلم)۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس ذبح عظیم کو اس کے لیے فدیہ کر دیا اور ہم نے اس کے سبب سے اس کو ذبح سے بچا لیا۔ امام ابو السعو رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اس دنبے کو ذبح کیا تو جبریل علیہ السلام نے کہا: ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' پھر ذبیح نے کہا: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ'' پھر ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ''۔ چنانچہ یہ سنت باقی رہی۔[1] انتہیٰ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا: میں نے نذر مانی کہ البتہ میں اپنے نفس کو ذبح کروں گا تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ [الأحزاب: ٢١] ''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے۔'' پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴾ چنانچہ اس کو امر فرمایا ایک دنبے کا تو اس نے اس کو ذبح کر دیا۔[2] (أخرجه عبدالرزاق و ابن جرير وابن المنذر و الطبراني و ابن مردويه عنه وأخرج الطبراني من طريق أخرى عنه نحوه)

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس آیت سے استشہاد فرمایا ہے اس شخص کے حق میں جس نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی نذر مانی کہ اس کو ایک بکری ذبح کرنا ضروری ہے۔ انتہیٰ۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ قول نقل کرنے کے بعد یہ کہا: ''وَلَيْسَ فِيْهِ مَا يَدُلُّ عَلَيْهِ''[3] انتہیٰ یعنی آیت میں وہ شے نہیں ہے جو قولِ مذکور پر دال ہو۔ محی الدین شیخ زادہ رحمہ اللہ نے اس پر کہا ہے کہ یہ اس اعتراض کی طرف اشارہ ہے جو صاحبِ تقریب نے اس استدلال پر وارد کیا ہے، یہ کہہ کر کہ اس میں نظر ہے، اس لیے کہ آیت میں نہ تو نذر کا ذکر ہے اور نہ ذبح کے لازم ہونے کا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر فدا کے ساتھ تفضّل فرمایا اور نیز یہ ہم سے پہلے کی شریعت ہے۔ انتہیٰ۔

شارح یمنی نے اس کا یہ جواب دیا ہے، مروی ہے کہ فرشتوں نے جب خلیل علیہ السلام کو غلامِ حلیم کی بشارت دی تو فرمایا کہ وہ اب اللہ کے لیے ذبیح ہے اور یہ نذر بذبح ولد ہے۔ اسی لیے جس وقت وہ لڑکا اس کے ساتھ حدِ سعی کو پہنچا تو ان سے کہا گیا کہ اپنی نذر کو وفا کر، چنانچہ اپنے بیٹے سے کہا: ﴿ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ ﴾ اس معنی میں کہ میں دیکھتا ہوں خواب میں وہ شے جس کی تعبیر تجھے ذبح کرنا ہے۔ رہا ذبح کا لزوم تو اس لیے ہے کہ اگر وہ لازم نہ آتا تو فدیے کی ضرورت نہ ہوتی اور ہم سے پہلی شریعت جبکہ منسوخ نہ ہو تو ہم اس کے ساتھ مکلّف ہیں علی حسب الخلاف۔ انتہیٰ۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴾ پر وقف نہیں ہے، اس لیے کہ قولہ: ﴿ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ﴾ ﴿ تَرَكْنَا ﴾ کا مفعول ہے۔ ﴿ سَلٰمٌ ﴾ سے مراد ثنائے جمیل ہے، یعنی چھوڑ رکھا ہم نے اس پر پچھلی اُمتوں میں جو اس کے بعد آئیں گی، اس قول کو کہ ﴿ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ﴾۔ مطلب یہ ہے کہ پچھلے لوگ ان کا ذکر خیر سے کریں

[1] تفسير أبي السعود (٢٠١/٧) [2] المعجم الأوسط (٧٤/١) الدر المنثور (١١٤/٧) [3] تفسير البيضاوي (٢٣/٥)

گے۔ ان کی ثنا اور صفت کریں گے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلام ہماری طرف سے۔[1] کسی نے کہا کہ آفات سے سلامتی۔ اس میں ویسا ہی کلام ہے جیسا کہ ﴿ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الصافات: ۷۹] میں ہے اور اس کے معنی واعراب کا بیان گزر چکا ہے۔ ﴿ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ یعنی ہم اس جزائے عظیم کی طرح اس شخص کو جزا دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کا مطیع اور فرماں بردار ہوتا ہے۔ یہاں "إِنَّا كَذٰلِكَ" نہیں فرمایا، جیسے کہ اور جگہ پر فرمایا ہے، اس لیے کہ اسی قصے میں پہلے کہا جا چکا ہے، خفت کی خاطر ایک بار کے ذکر پر اکتفا کیا۔

﴿ إِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی بے شک وہ ہمارے ان بندوں میں سے ہے جنھوں نے عبدیت کا حق ادا کر دیا ہے اور اللہ پر ایمان لانے میں اور اس کو یکتا سمجھنے میں راسخ دم اور ثابت قدم ہیں۔ ﴿ وَبَشَّرْنٰهُ بِإِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک لڑکے کی بشارت دی جو اس کے لیے پیدا کیا جائے گا اور نبی ہوگا، جب وہ اس عمر کو پہنچے گا، جب اس کے لائق ہوگا۔ ﴿ نَبِيًّا ﴾ بنا بر حال منصوب ہے اور یہ حالِ مقدرہ ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر ذبیح اسحاق علیہ السلام ہوں تو حال کا مقدرہ ہونا ظاہر ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ یوں کہیں کہ جس نے ذبیح کی تفسیر اسحاق علیہ السلام کے ساتھ کی ہے تو اس نے اس جگہ بشارت کو ان کی نبوت کے ساتھ خاص ٹھہرایا ہے[2] اور نبوت کے بعد صالح ہونے کا ذکر کرنا شانِ صلاح کی تعظیم ہے اور بشارت کے وقت وجودِ مبشر یہ کی حاجت نہیں ہے، کیوں کہ ذوالجلال کا وجود کچھ شرط نہیں ہے، شرط جو ہے وہ فعل کے لیے قریب ہونا ہے۔ جس طرح یہ جائز ہے کہ ﴿ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ ﴿ نَبِيًّا ﴾ کی صفت ہو، اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ اس میں کی ضمیر مستتر سے حال ہو تو اب متداخل حال ہو جائیں گے۔

﴿ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰى إِسْحٰقَ ﴾ یعنی ہم نے ابراہیم اور اسحاق علیہما السلام پر اس طرح سے برکت دی کہ ہم نے ان کو اپنی نعمتیں پے در پے عطا کیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہم نے ان کی اولاد بڑھائی۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عَلَيْهِ ﴾ کی ضمیر اسماعیل علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے، لیکن یہ قول بعید ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ "مبارکہ" سے مراد ان پر قیامت کے دن تک ثنائے حسن ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہم نے اس کی پشت سے ہزار نبی نکالے، ان میں سے پہلے تو یعقوب علیہ السلام ہیں اور آخری عیسی علیہ السلام ہیں۔ یہ قول گویا اولاد کی کثرت کی تفصیل ہے۔ ﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴾ یعنی ان کی اولاد دو قسم کی ہے: ایک تو وہ ہے جو ایمان لا کر توحید اختیار کر کے اپنے عمل میں احسان اور اخلاص کرنے والا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو کفر اور معاصی کر کے اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہے۔

جب اللہ پاک نے اولاد میں برکت اور کثرت کا ذکر کیا تو یہ بھی بیان فرما دیا کہ اس عنصرِ شریف واصلِ مبارک سے ذریت کا ہونا کچھ ان کو فائدہ مند نہیں ہے اور نہ پلیدی اور پاکی کا حکم عرق وعنصر (رگ، جڑ واصل، بنیاد) پر جاری

[1] تفسير القرطبي (١١٢/١٥) [2] فتح القدير (٥٣٤/٤)

ہوتا ہے، کیوں کہ کبھی نیک کے ہاں بد پیدا ہوتا ہے اور کبھی بد کے ہاں نیک پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات اس قبیل سے ہے جو طبائع اور عناصر کی بنا کو منہدم کرتی ہے، بلکہ وہ جو نفع یاب، یعنی کامیاب ہوں گے، وہ اپنے اعمال سے ہوں گے نہ اپنے باپ دادوں سے، کیوں کہ یہود و نصاریٰ اگرچہ اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، لیکن جس کھلی گمراہی کی طرف وہ گئے سو گئے اور عرب لوگ اسماعیل علیہ السلام کی اصلِ ثابت کی اُگنے والی شاخ ہیں، لیکن شرک پر مرے، مگر جس کو اللہ پاک نے اسلام کے سبب سے بچا لیا۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب ز روم ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بو العجبیست

''حسن رحمہ اللہ بصرہ سے، بلال رضی اللہ عنہ حبش سے اور صہیب رضی اللہ عنہ روم سے، لیکن مکہ سے ابوجہل یہ کیسی عجیب بات ہے۔''

اس میں اس بات پر ایک عظیم تنبیہ ہے کہ ان کی اولاد میں جو ظلم ہے، وہ ان پر کوئی عیب و نقصان عائد نہیں کرتا ہے اور آدمی پر جو عیب کیا جاتا ہے، وہ اسی کے برے فعل کے سبب سے اور اس کو اسی کام پر عذاب کیا جاتا ہے جو اس کے ہاتھوں نے کیا، نہ اس شے پر جو اس کی اصل و فرع سے وجود میں آئے۔ ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [الأنعام: ١٦٤] ''اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔'' اس مضمون کی روشن دلیل ہے۔

فتح البیان میں ذبیح کے بارے میں جو دو قول ذکر کیے گئے ہیں، ان کو ہر قول کے دلائل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہر ایک قول کی دلیل کا جواب ممکن ہے اور اس کے لیے مناقشہ (بحث) ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ ان عقائد میں سے نہیں ہے جن کی معرفت حاصل کرنے کے ہم مکلّف ہیں، چنانچہ قیامت کے دن ہم سے اس کے بارے میں سوال نہیں ہوگا تو یہ مسئلہ اس قبیل سے ہوا کہ نہ اس کا جاننا فائدہ دینے والا ہے اور نہ اس کے نہ جاننے سے کوئی نقصان ہے۔ پھر کہا ہے کہ ہم نے جو اختلاف بیان کیا اور اختلاف والوں کے دلائل ذکر کیے اس سے تم جانتے ہو کہ اس مقام میں وہ شے نہیں ہے جو قطع تعلق کا موجب ہو، یا اس کا رجحان بالکل واضح طور پر متعین ہو۔

منصف محققین میں سے ایک گروہ نے ہر قول کو ترجیح دی، جیسے: امام ابن جریر رحمہ اللہ کہ انھوں نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ ذبیح اسحاق علیہ السلام ہیں، لیکن اس پر صرف بعض ان اقوال سے استدلال کیا ہے جن کو ہم نے یہاں بیان کیا ہے اور جیسے: حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہ انھوں نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں اور اس پر جو دلائل ہیں ان کو زیادہ قوی اور زیادہ صحیح ٹھہرایا ہے، حالاں کہ بات ویسی نہیں ہے جو انھوں نے ذکر کی، کیوں کہ یہ دلائل اگر ان لوگوں کی دلیلوں سے کم رتبے کے نہیں ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ ذبیح اسحاق علیہ السلام ہیں تو ان سے فوق بھی نہیں ہیں اور نہ ان سے زیادہ قابلِ ترجیح ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کوئی شے صحیح نہیں ہوئی ہے اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے وہ یا تو موضوع ہے یا سخت ضعیف۔

اب صرف قرآن شریف سے استنباطات باقی رہ گئے ہیں، چنانچہ پہلے ہم نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ محتمل ہیں اور محتمل سے حجت قائم نہیں ہوتی ہے۔ (اگر احتمال سے مراد نفسِ احتمال عقلی ہے تو یہ اکثر جگہ موجود ہوتا ہے تو چاہیے کہ ان سب مواضع میں استدلال باطل ہو جائے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے اور اگر احتمال سے مراد احتمال مساوی ہے تو وہ یہاں موجود نہیں ہے، بلکہ قرآن کے الفاظ کی دلالت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے پر خوب واضح ہے اور ان کو دوسرے معانی پر محمول کرنا خلافِ سیاق ہے اور محض تکلف ہے۔ والله أعلم از مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔ چنانچہ جس بات سے آگے نہ بڑھنا چاہیے اور جس میں ترجیح بلا مرجح اور استدلال بہ محتمل سے سلامتی حاصل ہوتی ہے، وہ بات توقف کرنا اور ٹھہر جانا ہے۔ چنانچہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَللّٰهُ أَعْلَمُ أَيُّهُمَا الذَّبِيْحُ"[1] یعنی اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ دونوں بیٹوں میں سے ذبیح کون ہے۔ یہ تیسرا مذہب ہے یعنی "أحد القولين" کے ساتھ جزم کرنے سے توقف کرنا اور اس کے علم کو اللہ سبحانہ کے سپرد کرنا۔ دراصل دلیلوں کے اختلاف کے وقت یہ طریقہ نہایت سلامتی والا ہے۔ بالجملہ جب اللہ پاک یہ بیان کر چکا کہ اس نے ذبیح کو ذبح سے نجات دی اور اس کے بعد ان پر نبوت کا احسان کیا تو جو مروت اور احسان اس نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر کیا تھا، اس کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد کیا:[2]

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿١١٤﴾ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿١١٥﴾ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿١١٦﴾ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿١١٧﴾ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١١٨﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿١١٩﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿١٢٠﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢١﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٢٢﴾

اور یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون پر بھی احسان کیا ﴿114﴾ اور ہم نے ان دونوں کو اور اُن کی قوم کو بہت بڑی مصیبت سے نجات دی ﴿115﴾ اور ہم نے ان کی مدد کی، چناں چہ وہی غالب آئے ﴿116﴾ اور ہم نے ان دونوں کو انتہائی واضح کتاب دی ﴿117﴾ اور ہم نے ان دونوں کو راہِ راست کی ہدایت دی ﴿118﴾ اور ہم نے ان دونوں (کے ذکرِ خیر) کو پیچھے آنے والوں میں باقی رکھا ﴿119﴾ موسیٰ اور ہارون پر سلام ہو ﴿120﴾ بے شک ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں ﴿121﴾ بلاشبہ وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے ﴿122﴾

---

[1] معاني القرآن (٣١١/٤) [2] فتح البيان (٤٠٥/١١-٤١٦)

موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ذکر:

اللہ پاک اس انعام کا ذکر فرماتا ہے جو اس نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر کیا، وہ یہ ہے کہ دونوں کو نبوت عطا فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کا ذکر کیا جو بنی اسرائیل پر قہر اور زبردستی کرتے تھے اور اُن کے حق میں بڑی برائی کا ارادہ کیا کرتے تھے، ان کے بیٹوں کو مار ڈالتے اور عورتوں کو زندہ رکھ چھوڑتے تھے اور ذلیل سے ذلیل کاموں میں ان کو لگاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اور اُن کو جو اُن پر ایمان لائے تھے، اس بلا سے نجات دی اور اس سب کے بعد ان کو ان پر مظفر و منصور کیا اور ان کی آنکھوں کو ان کی ہلاکت سے ٹھنڈا کیا۔ چنانچہ یہ ان پر غالب ہوئے اور اُن کی زمین اور مال اور انھوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ جمع کیا تھا، وہ سب لے لیا۔ پھر اللہ عزوجل نے موسیٰ علیہ السلام پر واضح، جلی اور ظاہر کتابِ عظیم نازل فرمائی، یعنی تورات شریف، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٤٨] ''یہ بالکل سچ ہے کہ ہم نے موسی ہارون کو فیصلے کرنے والی نورانی اور پرہیزگاروں کے لیے وعظ و نصیحت والی کتاب عطا فرمائی۔'' نیز اس جگہ یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ۝ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ یعنی ہم نے ان کو کھلی کتاب دی اور ان کو سیدھی راہ بتائی اقوال و افعال میں۔ ﴿ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے ان کے بعد ان کے ذکرِ جمیل اور ثنائے حسن کو باقی رکھا، اپنے اس قول سے اس کی تفسیر فرمائی: ﴿ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴾[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ منت و احسان سے مراد نبوت وغیرہ عظیم احسانات ہیں جن کا اللہ پاک نے ان پر انعام فرمایا تھا۔ قوم سے مراد بنی اسرائیل کے مومنین ہیں۔ ﴿ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴾ سے مراد فرعون کا ان کو غلام بنا لینا ہے جس میں وہ مبتلا تھے اور وہ بلاء اور ایذاء ہے جو اُن کو اس کی طرف سے پہنچتی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد غرق ہے جس نے فرعون کو اور اس کی قوم کو ہلاک کر دیا، پہلا قول زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ وہ عام ہے، یہ بھی اس میں داخل ہے۔ ﴿ وَنَصَرْنٰهُمْ ﴾ میں ضمیر جمع کی ذکر فرمائی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اور اُن کی قوم کی طرف پھرتی ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے ﴿ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا ﴾ ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دونوں کی طرف راجع ہے اور جمع کی ضمیر ان کی تعظیم کے لیے ہے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ اس کا قرینہ ماقبل میں موجود ہے۔ ﴿ نَصَرْنٰهُمْ ﴾ سے مراد تائید ہے ان کی اُن کے دشمنوں پر، یعنی ہماری تائید اور مدد کے سبب سے۔ پھر وہی غالب ہو گئے اپنے قبطی دشمنوں پر اس کے بعد کہ ان کے قہر اور قید میں تھے۔ ''ھُم'' کی ضمیر تاکید کی ہے یا بدل ہے یا ضمیرِ فصل ہے ظاہر تر یہی ہے۔

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٢٦) [2] تفسیر القرطبي (١٥/١١٤)

﴿ الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴾ سے مراد تورات شریف ہے، یعنی جن حدود اور احکام کو وہ لائی ہے، ان میں ظاہر اور واضح ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "اِسْتَبَانَ كَذَا أَيْ: صَارَ بَيِّنًا" یعنی فلاں شے ظاہر اور واضح ہوگئی۔ ﴿ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ سے مراد وہ سیدھی راہ ہے جس میں کسی طرح کی کجی نہ ہو، مراد دینِ اسلام ہے، کیوں کہ یہ وہ راہ ہے جو عقلاً وسمعاً حق اور صحیح ہے، وہ اس کی طرف پہنچا دیتی ہے یا مطلوب شے کی طرف پہنچا دیتی ہے جو جنت ہے۔ ﴿ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ یعنی جس طرح ہم نے ان کو جزا دی اسی طرح ہم احسان کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں، پھر اس احسان کی یہ علت بیان کی: ﴿ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی وہ محسنین اس واسطے ہوئے کہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھے، اس میں ایمان کی جلالتِ قدر اور اصالتِ امر کا اظہار ہے، یعنی ایمان جیسی جلیل القدر اور اصل شے ہے کہ محسنین کا درجہ ایمان ہی سے ملتا ہے۔[1] پھر اللہ پاک نے الیاس علیہ السلام کا ذکر فرمایا:

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝١٢٣ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝١٢٤
اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ۝١٢٥ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ
اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٢٦ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝١٢٧ اِلَّا عِبَادَ
اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝١٢٨ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝١٢٩ سَلٰمٌ
عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ۝١٣٠ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝١٣١ اِنَّهٗ مِنْ
عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١٣٢

اور بے شک الیاس بھی یقیناً رسولوں میں سے تھا (123) جب اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں؟ (124) کیا تم بعل (بت) کو پکارتے ہو اور سب سے بہتر پیدا کرنے والے کو چھوڑ دیتے ہو (125) (یعنی) اللہ کو جو تمھارا اور تمھارے اگلے باپ دادوں کا رب ہے؟ (126) پھر انھوں نے اسے جھٹلایا، لہٰذا یقیناً وہ (سب عذاب میں) ضرور حاضر کیے جائیں گے (127) سوائے اللہ کے چنے ہوئے بندوں کے (128) اور ہم نے اس (کے ذکرِ خیر) کو پیچھے آنے والوں میں باقی رکھا (129) الیاسین (الیاس) پر سلام ہو (130) بے شک ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں (131) وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا (132)

الیاس علیہ السلام کا ذکر:

الیاس علیہ السلام ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اللہ نے ان کو بعلبک شہر کی طرف بھیجا۔ وہ لوگ بعل نامی بت کو

---

[1] فتح البیان (۱۱/۴۱۶، ۴۱۷)

پوجتے تھے۔ الیاس کو الیاسین بھی کہتے ہیں، جیسے: طورِ سینا اور طورِ سینین اور آلِ یاسین بھی پڑھا ہے تو یاسین ان کے باپ کا نام ہے۔ انتھی۔

امام قتادہ اور ابن اسحاق رحمہما اللہ نے کہا: کہتے ہیں کہ الیاس وہی ادریس علیہ السلام ہیں۔[1] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ الیاس وہی ادریس علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح امام ضحاک رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[2] امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ الیاس بن نسی بن فخاص بن العزار بن ہارون بن عمران علیہما السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بنی اسرائیل میں حزقیل علیہ السلام کے بعد بھیجا۔ انھوں نے ایک بت کو پوجا تھا جس کو بعل کہتے تھے۔ چنانچہ الیاس علیہ السلام نے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور اللہ کے سوا کو پوجنے سے ان کو منع کیا۔ ان کا بادشاہ الیاس علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا۔ پھر وہ لوگ مرتد ہو گئے اور اپنی گمراہی پر ہی قائم رہے اور ان میں سے کوئی بھی ان پر ایمان نہ لایا۔

پھر الیاس علیہ السلام نے ان پر بد دعا کی تو تین برس ان سے بارش روکی گئی۔ پھر ان سے درخواست کی کہ یہ آزمائش ان سے دور کی جائے اور اُن سے ان پر ایمان لانے کا وعدہ کیا، اگر ان پر پانی برسے۔ چنانچہ الیاس علیہ السلام نے ان کے لیے دعا کی تو پانی برسا، مگر وہ اسی خبیث ترین کفر پر قائم رہے جس پر وہ پہلے تھے۔ چنانچہ الیاس علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ اِن کو اپنی طرف قبض کر لے۔ یسع بن اخطوب نے الیاس علیہ السلام کے ہاتھوں پر پرورش پائی تھی۔ چنانچہ یسع نے الیاس علیہ السلام سے کہا ہے کہ فلاں فلاں جگہ کی طرف جائیں اور جو شے ان کے پاس آئے اس پر سوار ہو جائیں۔ ان کے پاس ایک آگ کا گھوڑا آیا تو وہ اس پر سوار ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کو نور پہنایا اور ان کو پر پہنائے، وہ فرشتوں کے ساتھ ملک انسی سماوی ارضی ہو کر اڑتے تھے۔[3] امام وہب رحمہ اللہ نے اس کو اہلِ کتاب سے اسی طرح بیان کیا ہے۔ واللہ أعلم بصحتہ:

﴿ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ یعنی جب اپنی قوم سے کہا، کیا تم اللہ عزوجل سے اس بات میں ڈرتے نہیں ہو کہ تم اس کے غیر کو پوجتے ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا: ﴿ بَعْلًا ﴾ یعنی "رَبًّا"۔ امام عکرمہ اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ اہلِ یمن کی لغت ہے، یعنی رب کو "بعل" کہتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے ایک روایت میں ہے کہ یہ ازدِشنوءَ کی لغت ہے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: مجھے بعض اہلِ علم نے خبر دی کہ وہ لوگ ایک عورت کی پوجا کرتے تھے جس کا نام "بعل" ہے۔ عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ وہ ایک بت کا نام ہے، اس کو اس شہر والے پوجا کرتے تھے، جس کو "بعلبك" کہتے ہیں جو دمشق کے مغربی جانب ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک بت ہے جس کو وہ پوجتے تھے۔[4] ﴿ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا ﴾ یعنی کیا تم ایک بت کو پوجتے ہو۔

---

① تفسير الطبري (٩٥/٢١) ② تفسير الطبري (٥٠٩/١١) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٢٥/١٠)

③ تفسير الطبري (٩٧/٢١_٩٩) ④ تفسير الطبري (٩٦/٢١، ٩٧)

﴿ وَتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ۝ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یعنی اور چھوڑتے ہو بہتر پیدا کرنے والے کو جو اللہ ہے اور تمھارا اور تمھارے اگلے باپ دادوں کا رب ہے، یعنی عبادت کا مستحق وہی وحدہ لا شریک لہ ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴾ یعنی پھر قوم نے اس کو جھٹلایا، چنانچہ بے شک البتہ وہی روزِ حساب میں عذاب کے لیے حاضر کیے جائیں گے۔ ﴿ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ یعنی مگر وہ اللہ کے چنے ہوئے بندے جو اُن میں سے موحد ہیں۔ یہ کلام مثبت سے استثنائے منقطع ہے۔ ﴿ اِلْ يَاسِيْنَ ﴾ ایسا ہے جیسا کہ "إِسْمَاعِيْلَ" میں "إِسْمٰعِيْن" کہتے ہیں، یہ بنی اسد کی لغت ہے۔ بعض بنی تمیم نے گوہ کے بارے میں جس کو اس نے شکار کیا تھا، یہ شعر پڑھا ہے:

يَقُوْلُ رَبُّ السُّوْقِ لَمَّا جِيْنَا　　　هٰذَا وَرَبِّ الْبَيْتِ إِسْرَائِيْنَا

اور میکال، میکائیل، میکائین، ابراہیم، ابراہام، اسرائیل، اسرائین، طورِ سینا اور طورِ سینین بولتے ہیں۔ یہ ایک موضع ہے اور یہ سب جائز ہے۔ دوسروں نے ﴿ سَلٰمٌ عَلٰۤى اٰلِ يَاسِيْنَ ﴾ پڑھا ہے۔ یہ قراءت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے اور لوگوں نے کہا ہے: "سَلَامٌ عَلٰى آلِ يَاسِيْن" يَعْنِيْ آلَ مُحَمَّدٍ ﷺ[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ الیاس علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی ہیں، ان کا قصہ جو اپنی قوم کے ساتھ گزرا، وہ مشہور ہے۔ کسی نے کہا: یہ الیاس بن یاسین ہیں، ہارون علیہ السلام برادرِ موسیٰ علیہ السلام کی اولاد سے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یوشع علیہ السلام کے بعد یہی الیاس علیہ السلام بنی اسرائیل کے کام کے قیم تھے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ الیاس علیہ السلام یسع علیہ السلام کے چچازاد بھائی ہیں۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "اَلْخَضِرُ هُوَ إِلْيَاسُ" یعنی خضر ہی الیاس ہیں۔[3] (أخرجه ابن مردويه) کسی نے کہا ہے کہ الیاس ہی خضر ہیں۔ کسی نے کہا: نہیں، بلکہ خضر ہی یسع ہیں۔ ایک قوم نے تو یہ وہم کیا کہ یسع ہی الیاس ہیں، حالاں کہ بات یوں نہیں ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے ہر ایک کا علاحدہ ذکر کیا ہے۔

امام وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یسع صاحبِ الیاس ہیں، یہ دونوں زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے پہلے تھے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ الیاس ہی ادریس ہیں، یہ قول صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام کے دادا ہیں اور الیاس علیہ السلام ان کی ذریت سے ہیں۔ الیاس اور خضر علیہما السلام کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ دونوں زندہ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ الیاس علیہ السلام

---

(1) تفسير ابن كثير (٢٧/٤)
(2) تفسير القرطبي (١١٥/١٥)
(3) الدر المنثور (١١٨/٧) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٢٩٤١)
(4) تفسير القرطبي (٣٣/٧)

تو بیابانوں پر مقرر کیے گئے ہیں جس طرح خضر علیہ السلام دریاؤں پر مؤکل ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اتقان میں فرمایا ہے: امام وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ الیاس علیہ السلام عمر دیے گئے جس طرح کہ خضر علیہ السلام کو عمر دی گئی ہے اور وہ آخر دنیا تک باقی رہیں گے:[1]

مزے جو عشق کے عاشق کبھو بیان کرتے مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دونوں یعنی الیاس اور خضر علیہما السلام مر چکے ہیں اور ہم نہیں کہتے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔ ادلہ میں غور کر کے یہی قول راجح ہے۔ واللّٰه أعلم و علمه أتم و أحكم۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ خضر علیہ السلام نبی مرسل تھے یا فقط نبی یا اولیائے کرام میں سے تھے۔ رہے الیاس علیہ السلام تو وہ باتفاق نبی مرسل ہیں۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ الیاس علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کی صفت پر تھے، غضب اور قوت کے لحاظ سے! انھوں نے اچھی طرح نشو و نما پائی تھی، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ پاک نے ان کو نبی رسول کیا اور ان کو نشانیاں عطا کیں اور پہاڑ و شیر وغیرہ ان کے لیے مسخر کر دیے۔ جمہور نے اِلیاس کو بہ ہمزۂ مکسورہ مقطوعہ پڑھا ہے اور ابن ذکوان نے بوصلِ ہمزہ، یہ دونوں سبعیہ ہیں۔ امام ابن عامر رحمہ اللہ سے بھی اخیر کی قراءت مروی ہے۔ دونوں کی توجیہ یہ ہے کہ الیاس اسم اعجمی ہے۔ عرب نے اس کے ساتھ تلاعب کیا۔ کبھی تو اس کے ہمزہ کو قطعی کیا اور کبھی وصلی۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ و اعمش و یحییٰ بن وثاب نے "وَإِنَّ إِدْرِيْسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ" پڑھا ہے (یہ قراءت اس قول کی تائید کرتی ہے کہ الیاس و ادریس علیہما السلام ایک ہیں، واللّٰه أعلم)۔ اُبی رضی اللہ عنہ نے ایلیس پڑھا ہے (یعنی بہ ہمزہ مکسورہ، پھر یائے تحتیہ ساکنہ، پھر لامِ مکسورہ، پھر یائے تحتیہ ساکنہ، پھر سینِ مہملہ مفتوحہ)۔ کلمۂ ﴿ إِذْ ﴾ ظرف ہے ﴿ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ کا۔ یا محذوف سے متعلق ہے: أَيْ: أُذْكُرْ يَا مُحَمَّدُ ﷺ ﴿ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ یعنی اے محمد ﷺ! تو یاد کر اس وقت کو جب الیاس علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں ہو اللہ کے عذاب سے۔ پھر ان کا انکار کر کے یوں کہا: ﴿ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا ﴾ یعنی کیا تم بت کو پکارتے ہو اور اس سے خیر طلب کرتے ہو۔ ثعلب نے کہا: لوگوں نے بعل میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ ایک گروہ نے کہا کہ اس جگہ بعل سے مراد بت ہے۔ شیطان اس کے پیٹ میں گھس جاتا ہے اور گمراہی کے ساتھ کلام کرتا۔ خادم لوگ اس کو یاد کر لیتے اور لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اس کا طول بیس گز کا تھا اور اس کے چار منہ تھے۔ چنانچہ وہ اس کا اعتناء (اہتمام) کرتے اسے اہمیت دیتے اور تعظیم کرتے تھے اور اس کی خدمت میں چار سو خادم رکھے تھے اور ان کو اس کے بیٹے قرار دیا تھا۔ اس کے موضع کو بک کہتے تھے۔ پھر دونوں اسم مرکب کیے گئے اور بعلبک ہوگیا۔ یہ شہر بلادِ شام میں سے ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یہاں بعل سے مراد بادشاہ ہے۔ ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: وہ ایک عورت تھی، اس کی پوجا کیا کرتے تھے۔ واحدی نے کہا: مفسرین کہتے ہیں کہ بعل بہ معنی رب ہے۔ یمن کی لغت میں سید اور رب کو بعل کہتے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: دونوں قول صحیح ہیں، یعنی کیا تم پکارتے ہو بت کو جس کو تم نے رب بنایا ہے۔[2]

---

[1] الإتقان في علوم القرآن (٢/٣٦٩)
[2] تفسير القرطبي (١٥/١١٧) فتح القدير (٤/٥٣٨، ٥٣٩)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ جملہ حالیہ ہے۔ یا معطوف ہے ﴿ تَدْعُوْنَ ﴾ پر اور انکار کے تحت میں داخل ہے، یعنی کیا تم بعل کو اس حال میں پکارتے ہو کہ ﴿ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ کی عبادت کو چھوڑتے ہو۔ یا یہ معنی ہیں: کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور کیا ﴿ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ کی عبادت کو چھوڑتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم دونوں کام برے کرتے ہو۔ نہ تو تم کو یہ حق پہنچتا ہے کہ بعل کو پکارو اور نہ یہ کہ ﴿ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ کی عبادت کو چھوڑو، بلکہ یوں چاہیے کہ بعل کو پکارنا اور پوجنا چھوڑ دو اور ﴿ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ ہی کو پوجو۔ ﴿ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ سے مراد "أَحْسَنُ الْمُقَدِّرِيْنَ" ہے۔ اس لیے کہ خلق اختراعِ اشیاء میں حقیقت ہے اور کبھی تقدیر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہی مراد ہے۔

اب وہ وہم دور ہو گیا کہ غیر اللہ کے لیے خلق کا ثبوت لازم آتا ہے، کیوں کہ "أَفْعَلُ تفضيل" اس شے کا بعض ہوتا ہے جس کی طرف اس کی اضافت کی جاتی ہے، جیسے: "زَيْدٌ أَفْضَلُ الْقَوْمِ" کہ زید بعض ہے قوم سے اور قوم کا بہترین ہے۔ اسی طرح یہاں ہے کہ اللہ کے سوا اور خالق ہیں اور اللہ ان میں کا بہتر خالق ہے، حالاں کہ خالق اللہ ہی ہے اور اس کا ماسوا ہرگز کوئی خالق نہیں ہے اور جب یوں کہو کہ اللہ پاک بہتر ہے سب اندازہ کرنے والوں کا، کیوں کہ جیسا اللہ کا اندازہ ٹھیک ہوتا ہے، ویسا کسی کا اندازہ درست اور صحیح نہیں ہوتا تو اب غیر اللہ کے لیے خلق کا ثبوت نہ ہوگا۔ یا یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف خلق کی اضافت ایجاد کے معنی میں ہوتی ہے اور بندوں کی طرف کسب کے معنی میں، کیوں کہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ احسن ہے اس کا جس پر خالق کا اطلاق کیا جاتا ہے، کسی معنی کے ساتھ ہو، جیسا کہ آمدی نے کہا ہے اور معتزلہ کے قول پر خود ظاہر ہے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک خود بندے اپنے افعال کے خالق ہیں اور اللہ تعالیٰ احسن الخالقین ہے۔ پہلے اس کی بحث گزر چکی ہے۔

امام حمزہ رحمہ اللہ وغیرہ نے (یعنی کسائی، ربیع بن خثیم، ابن ابی اسحاق، یحییٰ بن وثاب اور اعمش) ﴿ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ کو بہ نصبِ اسمائے ثلاثہ پڑھا ہے۔ یہ نصب بنا بر حال ہے ﴿ اَحْسَنَ ﴾ سے۔ کسی نے کہا ہے کہ بنا بر مدح ہے۔ کسی نے کہا بنا بر عطفِ بیان ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اس کا نصب بنا بر نعت حکایت کیا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ یہ جو ہے سو بدل ہے اور نعت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تحلیہ نہیں ہے، یعنی اسم مبارک اللہ اسمِ ذات ہے، ہمیشہ موصوف ہوا کرتا ہے۔ یہ کسی کی صفت نہیں پڑتا۔ نصب کی قراءت کو امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی ابو عمرو، عاصم، ابو جعفر اور شیبہ رحمہم اللہ) نے بہ رفع پڑھا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: بایں معنی کہ "هُوَ اللّٰهُ رَبُّكُمْ" یعنی اسم شریف خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ بہتر قول یہ ہے کہ لفظ اللہ مبتداء ہے اور ﴿ رَبُّكُمْ ﴾ خبر ہے بغیر اضمار اور حذف کے۔

امام اخفش رحمہ اللہ سے حکایت کیا گیا ہے کہ رفع زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے برفع پڑھا ہے یا بہ نصب تو اس نے ﴿ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ پر تمام جہت سے وقف نہیں کیا۔ اس لیے کہ اسم شریف اللہ مترجم ہے ﴿ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ سے، یعنی اس کا مبین (بیان کرنے والا) دونوں وجھوں کی بنیاد پر۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک تمھارا خالق ہے اور تمھارے اگلوں کا خالق ہے، چنانچہ وہی ہے جس کے لیے عبادت لائق ہے۔[1]

﴿ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پھر قوم نے الیاس علیہ السلام کی تکذیب کی۔ لہٰذا بے شک وہ ان کی تکذیب کے سبب سے حاضر کیے جائیں گے عذاب میں یا نار میں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ صرف حاضر کیا جانا شر کے ساتھ مخصوص ہے۔ ﴿ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ یعنی سوائے ان اللہ کے بندوں کے جو الیاس علیہ السلام پر ایمان لانے والے تھے ان کی قوم میں سے۔ استثنائے متصل ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ ان کی قوم میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے ان کی تکذیب نہیں کی۔ چنانچہ اسی لیے ان کا استثناء کیا۔ ﴿ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ کو بہ کسر و فتحِ لام پڑھا ہے۔ فتح کی بنا پر یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک نے اپنے بندوں میں سے ان کو برگزیدہ کیا اور کسر کی بنا پر یہ معنی ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے واسطے اخلاص کیا۔

﴿ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴾ کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ ﴿ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴾ امام نافع، ابن عامر، اعرج اور شیبہ نے باضافتِ آل بہ طرفِ یاسین پڑھا ہے بہ معنی اہلِ یاسین۔ باقی قراء نے بہ کسرِ ہمزہ وسکونِ لام پڑھا ہے، جو یاسین سے ملا ہوا ہے۔ مگر حسن رحمہ اللہ نے "اَلْيَاسِيْنَ" پڑھا ہے۔ "ال تعریف" کو یاسین پر داخل کیا ہے۔ کہا ہے کہ ان تمام قراءتوں پر مراد الیاس ہیں اور انھیں پر تسلیم واقع ہوئی ہے، لیکن یہ ایک اسم اعجمی ہے۔ عرب لوگ عجمی ناموں میں اضطراب کیا کرتے ہیں اور ان کو بہت زیادہ تغیر دیتے ہیں۔ ابن جنی نے کہا کہ عرب لوگ عجمی ناموں کے ساتھ خوب تلاعب کرتے ہیں، چنانچہ یاسین، الیاس اور الیاسین ایک شے ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ ایسا کیا کرتے ہیں کہ قوم میں سے جو جلیل القدر مرد ہوتا ہے، اس کے نام کے ساتھ اس قوم کا نام رکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ مہالبہ اس بنا پر بولتے ہیں کہ ان میں سے ہر شخص کا نام مہلب رکھ دیا۔ کہا: پس اس بنا پر ان میں سے ہر شخص کا نام الیاسین رکھ دیا۔ (واللہ أعلم۔ اس میں خلل معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ ہر شخص کا نام الیاسین کس طرح رکھ دیا؟ غرض تو الیاسین کی توجیہ کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ الیاسین جمع ہے الیاس کی، ہر شخص کا نام الیاس رکھا، پھر اس کی جمع الیاسین بنائی، جیسے: مہلب ایک جلیل القدر نام تھا۔ پھر ہر شخص کا نام مہلب رکھا، پھر اس کی جمع مہالبہ بنائی)۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: ہم الیاسین کو اس طرف لے جاتے ہیں کہ اسے جمع ٹھہراتے ہیں، پھر اس کے نام میں

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/١١٧، ١١٨) فتح القدير (٤/٥٣٩)

اس کے ساتھ اس کے اصحاب کو داخل کرتے ہیں۔ امام ابو علی فارسی رحمہ اللہ نے کہا اس کی تقدیر الیاسین ہے، مگر ہر دو یائے نسبت حذف کر دی گئیں جس طرح کہ اشعرین اور اعجمین میں محذوف ہوئی ہیں۔ (اصل میں الیاسی ہے، جیسے: اشعری، پھر دو یا کی تضعیف کو ثقیل جان کر دو یائے نسبت سے ایک کو حذف کیا، پھر جب اس کی جمع سالم بنائی تو دو ساکن جمع ہوئے: ایک یائے نسبت اور یائے جمع تو اول بہ سبب التقائے ساکنین حذف کر دیا، چنانچہ الیاسین ہو گیا۔ كذا قاله السمين)۔

امام فراء اور ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے جمہور کی قراءت کو ترجیح دی ہے۔ کہا: اس لیے کہ سورتوں میں سے کسی شے میں آلِ فلاں نہیں فرمایا، اسم ہی کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح الیاسین ہے، کیوں کہ یہ بہ معنی الیاس ہے، یا بہ معنی الیاس و اتباعِ الیاس۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آلِ یاسین سے مراد آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول بعید ہے۔ اس لیے کہ اس کے مابعد اور ماقبل جو کلام ہے، وہ اس پر دلالت نہیں کرتا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (یہ قول ۔واللہ أعلم۔ کہاں کا ہے پتا نہیں) کہ ہم آلِ محمد آلِ یاسین ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ آلِ قرآن، اس لیے کہ یاسین من جملہ اسمائے قرآن شریف ہے، اس میں بہت بعد ہے۔ ﴿اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح ہم نے الیاس کو جزا دی، بایں طور کہ اس کی سیرتِ حسنہ کو پچھلوں میں باقی رکھا۔ اسی طرح ہم محسنین کو جزا دیتے ہیں۔[3] پھر اللہ پاک نے لوط علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا۔

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَیْهِمْ مُّصْبِحِیْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّیْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اور بلاشبہ لوط بھی رسولوں میں سے تھا (133) جب ہم نے اسے اور اس کے (سب) اہل کو نجات دی (134) سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی (135) پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا (136) اور بلاشبہ تم صبح کو ان (کی تباہ شدہ بستیوں) پر سے گزرتے ہو (137) اور رات کو بھی، کیا پھر تم عقل نہیں رکھتے؟ (138)

قومِ لوط کی تباہی کا بیان:

شام کے راستے میں قومِ لوط کی بستیاں اُلٹی ہوئی نظر آتی تھیں۔ انتہٰی.

(1) تفسير القرطبي (١١٨/١٥، ١١٩) فتح القدير (٥٣٩/٤، ٥٤٠)

(2) العجم الكبير (٦٧/١١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه موسى بن عمير القرشي وهو كذاب" (مجمع الزوائد: ٢٧٧/٩)

(3) فتح البيان (٤١٧/١١۔٤٢٠)

اللہ تعالیٰ اپنے بندے اور رسول لوط علیہ السلام کے متعلق خبر دیتا ہے کہ اس نے ان کو اُن کی قوم کی طرف بھیجا۔ پھر قوم نے ان کی تکذیب کی تو اللہ پاک نے ان کو اور اُن کے گھر والوں کو قوم کے درمیان میں سے بچا لیا، مگر ان کی عورت کو، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہلاک ہوئی جو اس کی قوم میں سے ہلاک ہوئے۔ اللہ پاک نے طرح طرح کی عقوبت سے ان کو ہلاک کیا۔ جس زمین میں ان کی بستی تھی، اس کی جگہ ایک چھوٹا سا بدبودار، بدشکل اور بدمزہ دریا کر دیا اور اس کو راہ گزر ٹھہرایا کہ مسافر لوگ رات دن اس پر سے گزرتے ہیں۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۝ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی کیا پھر تم ان سے عبرت حاصل نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسا ہلاک کر ڈالا اور کیا جانتے نہیں ہو کہ کافروں کے لیے ایسا ہی قصہ ہوتا ہے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ لوط علیہ السلام کا قصہ پورے طور پر پہلے گزر چکا ہے۔ کلمہ ﴿ اِذْ ﴾ متعلق ہے "اُذْكُرْ" محذوف سے۔ مرسلین کے ساتھ اس کا متعلق ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے کہ اُن کو نجات دینے کے وقت ان کو رسول نہیں بنایا گیا، بلکہ وہ اس سے پہلے ہی رسول تھے۔ ایک مدت تک قوم کو وعظ کیا، جب ان کے وعظ نے کچھ اثر نہ کیا، تب قوم پر عذاب آیا اور ان کو نجات ملی۔ پہلے گزر چکا ہے کہ "غابر" بہ معنی ماضی ہوتا ہے اور کبھی بہ معنی باقی آتا ہے۔ چنانچہ ﴿ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں: مگر بڑھیا کہ عذاب میں باقی رہنے والوں کے ساتھ رہی۔ یا ان گزرنے والوں میں رہی جو ہلاک ہوئے۔ ﴿ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے عذاب کے ساتھ دوسروں کو ہلاک کر ڈالا۔ یہ بات کہ لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو سوائے ایک بڑھیا کے نجات دی اور اس بڑھیا اور اُن کی قوم کے باقی لوگ جو اُن پر ایمان نہیں لائے تھے، ان کو ہلاک کیا، اس میں اس بات کی ایک روشن دلیل ہے کہ وہ مرسلین میں سے تھے، جبھی تو اللہ پاک نے ان کے نہ ماننے پر قوم کو ہلاک کیا اور ان کو بچا لیا۔ اسی قسم کا معاملہ اور رسولوں کے ساتھ بھی ہوا ہے۔

﴿ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴾ کا خطاب عرب کو ہے، یا خاص طور پر مکے والوں کو، یعنی قومِ لوط کے منازل و مکانات جن میں عذاب کے آثار موجود ہیں، ان پر تم گزرتے ہو، اس حال میں کہ تم صبح کے وقت میں داخل ہونے والے ہوتے ہو۔ ﴿ مُّصْبِحِيْنَ ﴾ "أَصْبَحَ" تامہ کے باب سے ہے۔ ﴿ وَبِالَّيْلِ ۭ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم ملکِ شام کی طرف اپنے سفرِ تجارت میں جانے آنے کے وقت رات دن اُن کے منازل پر گزرتے ہو۔ حرفِ باء ملابست کے لیے ہے، یعنی تم اپنے گزرنے میں رات کے ساتھ متلبس (چھپنے والے) ہوتے ہو۔ ﴿ بِالَّيْلِ ﴾ پر وقفِ مطلق ہے۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٢٨/٤)

﴿ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے: کیا پھر تم اللہ پاک کی عقوبت کے آثار کو جن کا تم ان کے گھروں میں مشاہدہ کرتے ہو، سمجھتے نہیں ہو۔ کیوں کہ اس میں عبرت لینے والوں کے لیے ایک بڑی عبرت ہے اور سوچنے سمجھنے والوں کے لیے ایک عظیم نصیحت ہے۔ رہی یہ بات کہ لوط اور یونس علیہما السلام کے قصوں کو سلام کے ساتھ ختم نہ کیا، جس طرح کہ ان کے پہلے کے قصوں کو اس کے ساتھ ختم کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورت کے آخر میں جمیع مرسلین پر سلام بھیجا ہے، چنانچہ اس سے ہر ایک پر علاحدہ سلام بھیجنے سے اکتفا فرمایا۔ پھر اللہ پاک نے یونس علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا:[1]

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٣٩﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿١٤٠﴾
فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿١٤١﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿١٤٢﴾
فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿١٤٣﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ
يُبْعَثُوْنَ ﴿١٤٤﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿١٤٥﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً
مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿١٤٦﴾ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿١٤٧﴾
فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿١٤٨﴾

اور بے شک یونس یقیناً رسولوں میں سے تھا (139) جب وہ ایک بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ کر گیا (140) پھر (کشتی والوں نے) قرعہ ڈالا تو وہ ہارنے والوں میں سے ہوگیا (141) تب اسے مچھلی نے نگل لیا، جبکہ وہ (خود کو) ملامت کرنے والا تھا (142) پھر اگر (یہ بات) نہ ہوتی کہ بے شک وہ تسبیح کرنے والوں میں سے تھا (143) تو وہ لوگوں کے دوبارہ زندہ کر کے اُٹھائے جانے کے دن (روزِ قیامت) تک اسی (مچھلی) کے پیٹ میں رہتا (144) پھر ہم نے اسے چٹیل میدان میں ڈال دیا جب کہ وہ بیمار تھا (145) اور ہم نے اس پر ایک بیل دار درخت (کدو) اُگا دیا (146) اور ہم نے اسے ایک لاکھ (انسانوں) کی طرف بھیجا، یا وہ (اس سے کچھ) زیادہ ہوں گے (147) چناں چہ وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے انھیں ایک (مقرر) وقت تک فائدہ (اُٹھانے کا موقع) دیا (148)

یونس علیہ السلام کا قصہ:

پھر قرعہ اندازی ہوئی۔ کشتی دریا میں چکر کھانے لگی۔ لوگوں نے کہا: اس میں کوئی غلام ہے جو اپنے مالک سے بھاگا ہوا ہے۔ ہر ایک کے نام پر قرعہ ڈالا تو ان کا نام نکلا۔ بیل دار درخت جو اُگایا تو کہتے ہیں کہ وہ کدو کی بیل تھی۔

[1] فتح البیان (۱۱/۴۲۰، ۴۲۱)

ایک لاکھ بلکہ اور زیادہ آدمیوں کی طرف بھیجا، یعنی اگر عاقل اور بالغ گنیے تو لاکھ تھے اور اگر سب کو شامل کر کے گنیے تو زیادہ تھے۔ یہ اللہ کو شک نہیں۔ وہی قوم جن سے بھاگے تھے، ان پر ایمان لا رہی تھی، انھیں ڈھونڈھتی تھی کہ یہ جا پہنچے، ان کو بڑی خوشی ہوئی۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کا قصہ سورۃ الانبیاء میں گزر چکا ہے۔ صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو یہ لائق نہیں ہے کہ کہے: میں یونس بن متّی سے بہتر ہوں اور آپ نے یونس علیہ السلام کو ان کی ماں کی طرف منسوب کیا۔ ایک روایت میں ان کے باپ کی طرف منسوب کیا۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مَشْحُوْن" بہ معنی "مَوْقَرٌ" ہے،[2] یعنی کشتی سامان وغیرہ سے بھری ہوئی تھی۔ ﴿فَسَاهَمَ﴾ "أَيْ: قَارَعَ" یعنی قرعہ ڈالا۔ ﴿الْمُدْحَضِيْنَ﴾ بہ معنی مغلوبین ہے۔ یہ اس طرح ہوا کہ کشتی میں ہر طرف سے موجیں پہنچیں اور کشتی والے ڈوبنے کے قریب ہوئے تو قرعہ ڈالا کہ جس پر قرعہ پڑے وہی دریا میں ڈال دیا جائے، تاکہ ان پر کشتی ہلکی ہو۔ چنانچہ تین بار قرعہ اللہ تعالیٰ کے نبی یونس علیہ السلام پر پڑا اور کشتی والے اس بات سے بخل کرتے تھے کہ وہ ان کے درمیان میں سے دریا میں ڈال دیے جائیں۔ انھوں نے خود اپنے کپڑے اتار دیے اور برہنہ ہوگئے، تاکہ اپنے کو دریا میں ڈال دیں، کشتی والے ان پر اس کا انکار کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے بحرِ اخضر کی ایک مچھلی کو حکم دیا کہ وہ دریاؤں کو پھاڑے اور یونس علیہ السلام کو لقمہ کر لے۔ پھر نہ ان کا گوشت توڑے اور نہ کوئی ہڈی۔ وہ مچھلی آئی اور یونس علیہ السلام نے جب خود کو دریا میں ڈالا تو اس نے ان کو لقمہ کر لیا اور ان کو لے کر سارے دریاؤں میں پھری اور جب یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں قرار پکڑا تو سمجھا کہ بے شک مرگئے، پھر اپنا سر اور دونوں پاؤں اور دونوں ہاتھ ہلائے تو محسوس کیا کہ وہ زندہ ہیں۔ پھر کھڑے ہوئے اور مچھلی کے پیٹ میں نماز پڑھی اور ان کی دعا میں یہ کلمے تھے: میں نے تیرے واسطے ایسی جگہ مسجد بنائی جہاں لوگوں میں سے کوئی نہ پہنچا۔ اس بات میں اختلاف ہے کہ مچھلی کے پیٹ میں کتنا ٹھہرے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: تین دن۔ امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا: سات دن۔ امام ابو مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: چالیس دن۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے شعبی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ چاشت کے وقت ان کو لقمہ کیا اور عشیہ کو انھیں پھینک دیا، یعنی زوال کے بعد۔ واللّٰہ أعلم بمقدار ذلك۔ امیہ بن ابی الصلت کے شعر میں ہے:

وَأَنْتَ بِفَضْلٍ مِنْكَ نَجَّيْتَ يُوْنُسًا وَقَدْ بَاتَ فِيْ أَضْعَافِ حُوْتٍ لَيَالِيًا[3]

یعنی تو نے یونس علیہ السلام کو اپنے فضل سے نجات دی اس حال میں کہ اس نے کئی راتیں مچھلی کی پیچیدگیوں میں بسر کیں۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٧)

② تفسير الطبري (٣٧١/٩١) ③ تفسير ابن كثير (٢٨/٤)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَوۡلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُسَبِّحِيۡنَ ﴾ یعنی اگر نہ ہوتا وہ عمل جو اس کے واسطے گزر چکا ہے راحت میں تو وہ اس کے پیٹ میں اس دن تک ٹھہرتا کہ مر کر جی اُٹھیں۔ یہ قول امام ضحاک بن قیس، ابو العالیہ، وہب بن منبہ، قتادہ اور کئی ایک اہلِ علم کا ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1] اور جس حدیث کو ہم آگے لائیں گے ۔إن شاء الله۔ اس میں وہ شے وارد ہوئی ہے جو اگر صحیح ہو جائے تو اس قول پر دال ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے: «تَعَرَّفْ إِلَى اللّٰهِ فِي الرَّخَاءِ يَعْرِفْكَ فِي الشِّدَّةِ»[2] یعنی تو راحت اور آرام میں اللہ تعالیٰ کی طرف پہچان کر تو وہ تجھے شدت اور تکلیف میں پہچانے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید بن جبیر، ضحاک، عطاء بن سائب، سدی، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ ﴿ الۡمُسَبِّحِيۡنَ ﴾ سے مراد ''مُصَلِّيْنَ'' ہے۔[3] بعض نے یہ تصریح کی ہے کہ وہ اس سے قبل مصلین سے تھے۔ بعض نے کہا کہ وہ حوت کے شکم میں مصلین سے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فَلَوۡلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُسَبِّحِيۡنَ ﴾ سے مراد یہ آیت ہے: ﴿ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ وَنَجَّيۡنٰهُ مِنَ الۡغَمِّ‌ؕ وَكَذٰلِكَ نُـــۨجِى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴾ [الأنبیاء: ۸۷۔ ۸۸] ''بالآخر وہ اندھیروں کے اندر سے پکار اٹھا کہ الٰہی! تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں ظالموں میں ہوگیا۔ تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے غم سے نجات دے دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح بچا لیا کرتے ہیں۔'' یہ قول سعید بن جبیر وغیرہ کا ہے۔[4]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ یونس نبی علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں جب یہ بات ظاہر ہوئی کہ ان کلموں کے ساتھ دعا کریں تو آپ نے کہا: «اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ» تو یہ دعا آئی، (اصل روایت کے الفاظ: "فأقبلت الدعوة تحن بالعرش" ہیں) اس حال میں کہ وہ عرش کے نزدیک آواز کرتے تھے۔ فرشتے بولے: یا رب! یہ ایک کمزور سی جانی پہچانی آواز ہے، جو بہت دور اور اجنبی جگہ سے آ رہی ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم پہچانتے نہیں ہو اس کو؟ عرض کی: یا رب یہ کون ہے؟ اللہ عزوجل نے فرمایا: میرا بندہ یونس ہے۔ عرض کی: تیرا وہ بندہ یونس جس کے لیے ہمیشہ عملِ متقبل و دعوتِ مستجابہ اٹھائے جاتے تھے؟ عرض کی: یا رب! کیا تو رحم نہیں کرتا اس پر جو اس کو راحت میں کیا کرتا کہ تو اس کو بلا سے نجات دے؟ فرمایا: ہاں۔ پھر مچھلی کو حکم دیا تو اس نے ان کو چٹیل میدان میں ڈال دیا۔[5] (ورواه ابن جرير عن يونس عن ابن وهب به)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کیا ہے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے کہ ڈال دیا چٹیل میدان میں

---

[1] تفسير الطبري (۱۰۸/۲۱، ۱۰۹) [2] مسند أحمد (۳۰۷/۱) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (ظلال الجنة: ۱۲۷/۱)

[3] تفسير الطبري (۱۰۸/۲۱، ۱۱۰) [4] تفسير الطبري (۱۱۰/۲۱)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (۳۲۲۸/۱۰) تفسير الطبري (۱۰۹/۱۰) اس کی سند میں ''یزید الرقاشی'' ضعیف راوی ہے۔

اور اللہ عزوجل نے یقطینہ کو اُگا دیا۔ ہم نے کہا: اے ابوہریرہ! یقطینہ کیا ہے؟ کہا: شجرۃ الدباء، یعنی کدو کا درخت۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک پہاڑی جنگلی بکری مقرر کر دی، جو حشاشِ ارض یا ہشاشِ ارض، یعنی زمین کی گھاس یا پتے کھاتی تھی، پھر وہ ان پر اپنے پاؤں کشادہ کرتی اور صبح اور شام اپنے دودھ سے ان کو سیراب کر دیا کرتی تھی۔ امیہ بن ابی الصلت نے اس کے متعلق ایک بیت کہا ہے:

فَأَنْبَتَ يَقْطِينًا عَلَيْهِ بِرَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لَوْ لَا اللّٰهُ أُلْفِيَ ضَاحِيًا[1]

یعنی اُن پر اللہ کی طرف سے اپنی رحمت کے سبب سے کدو کا درخت اُگایا۔ اگر اللہ نہ اُگاتا تو وہ دھوپ کھاتے ہوئے پڑے رہتے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث مسنداً و مرفوعاً سورۃ الانبیاء کی تفسیر میں گزر چکی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ ﴾ یعنی ہم نے اس کو عراء میں ڈال دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے فرمایا: "عَرَاء" وہ زمین ہے جس میں نہ روئیدگی ہو نہ کوئی عمارت۔ کسی نے کہا ہے کہ دجلہ کی جانب پر۔ کسی نے کہا ہے کہ زمینِ یمن میں۔ فالله أعلم۔ ﴿ سَقِيْمٌ ﴾ سے مراد ضعیف البدن ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایسے چوزے کی حالت کی طرح جس پر اس کے پَر نہ ہوں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بچے کی حالت کی طرح جو پیدا ہونے کے وقت ہوتی ہے اور اس کو منفوس کہتے ہیں۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن زید رحمہ اللہ کا بھی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، وہب بن منبہ، ہلال بن یساف، عبداللہ بن طاؤس، سدی، قتادہ، ضحاک، عطاء خراسانی رحمہم اللہ اور کئی ایک اہلِ علم ان سب نے کہا ہے کہ ﴿ يَّقْطِيْنٍ ﴾ قرع ہے، یعنی کدو کا درخت۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ہر وہ درخت جس کی ساق، یعنی تنا نہ ہو تو وہ من جملہ ﴿ يَّقْطِيْنٍ ﴾ ہے۔ سعید کی ایک روایت میں یہ ہے کہ ہر درخت جو اپنے اس برس میں ختم ہو جائے وہ ﴿ يَّقْطِيْنٍ ﴾ سے ہے۔[2] بعض نے قرع میں فائدے ذکر کیے ہیں، ان میں سے یہ ہے کہ جلد اُگ آتا ہے اور اس کے پتے سایہ کرتے ہیں، "لِكِبَرِهٖ وَنُعُوْمَتِهٖ" (یعنی اس کے پتے بڑے بڑے اور نرم نرم ہوتے ہیں۔) مکھیاں اس کے قریب نہیں جاتیں اور اس کے پھلوں میں بہت غذائیت ہوتی ہے اور کچا پکا اس کے لب و قشر (گودے اور چھلکے) کے ساتھ بھی کھاتے ہیں اور ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کدو کو بہت پسند کرتے تھے۔ اور رکابی کے کناروں سے اس کو ڈھونڈتے تھے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴾۔ امام شہر بن حوشب رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲۲۷/۲۱) تفسیر الطبري (۱۱۳/۲۱) [2] تفسیر الطبري (۱۱۱/۲۱-۱۱۴)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۹۸۶) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۰۴۱)

سے روایت کیا ہے، فرمایا: یونس علیہ السلام کی رسالت نہ تھی، مگر اس کے بعد کہ مچھلی نے ان کو ڈالا۔ (رواه ابن جرير حدثني الحارث حدثنا أبو هلال عن شهر به)۔ امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ یونس علیہ السلام ان کی طرف بھیجے گئے، اس سے قبل کہ مچھلی ان کو لقمہ کرے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے کوئی مانع نہیں ہے کہ جن کی طرف وہ پہلے بھیجے گئے تھے، انہیں کی طرف لوٹ جانے کا ان کو حکم ہوا، جب وہ مچھلی کے پیٹ سے نکلے۔ پھر ان سب نے ان کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لائے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے کہ مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد وہ ایک اور اُمت کی طرف بھیجے گئے اور وہ ایک لاکھ تھے یا زیادہ تھے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ﴿ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں "بَلْ يَزِيْدُوْنَ" ہے، یعنی کلمۂ ﴿ اَوْ ﴾ بہ معنی "بل" ہے اور وہ ایک لاکھ تیس ہزار تھے اور اُن کی ایک روایت میں یوں ہے کہ ایک لاکھ اور کچھ اوپر تیس ہزار تھے اور ایک روایت میں ایک لاکھ اور کچھ اوپر چالیس ہزار تھے۔ واللّٰہ أعلم۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ستر ہزار زیادہ تھے۔[3] امام مکحول رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک لاکھ دس ہزار تھے۔ (رواه ابن أبي حاتم) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يَزِيْدُوْنَ عِشْرِيْنَ أَلْفًا » یعنی بیس ہزار زیادہ تھے۔ ترمذی نے اس کو عن علی بن حجر عن الولید بن مسلم عن زہیر عن رجل عن ابی العالیہ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے۔[4] (ورواه ابن أبي حاتم من حديث زهير به)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: بعض اہلِ عربیت اہلِ بصرہ میں سے اس کے بارے میں کہتے تھے: معنی اس کے یہ ہیں کہ ایک لاکھ تک یا وہ زیادہ ہوتے تھے تمھارے نزدیک۔ کہتا ہے کہ وہ اسی طرح تھے تمھارے نزدیک۔[5] اسی لیے ابن جریر رحمہ اللہ اس جگہ وہ چال چلے ہیں جو اس آیت کی تفسیر میں چلے ہیں: ﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ﴾ [البقرة: ٧٤] "پھر اس کے بعد تمھارے دل پتھر جیسے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔" اور اس آیت میں: ﴿ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ﴾ [النساء: ٧٧] "اسی وقت ان کی ایک جماعت لوگوں سے اس قدر ڈرنے لگی جیسے اللہ تعالیٰ کا ڈر ہو۔" اور اس آیت میں: ﴿ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ﴾ [النجم: ٩] "پس وہ دو کمانوں کے بقدر فاصلہ رہ گیا، بلکہ اس سے بھی کم۔" مراد یہ ہے کہ اس سے کم نہیں بلکہ زیادہ۔

---

[1] تفسير الطبري (١١٧/٢١، ١١٦) [2] تفسير ابن كثير (٢٩/٤، ٣٠) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٣١/١٠)

[4] تفسير الطبري (١١٥/٢١، ١١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٢٩) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٣٠/١٠) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا۔

[5] تفسير الطبري (١١٦/٢١)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ پھر یہ سارے لوگ ایمان لے آئے جن کی طرف یونس علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو ان کی اجلیں آ جانے تک مہلت دی کہ وہ فائدہ اٹھائیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ [یونس: ۹۸] ''چنانچہ کوئی بستی ایمان نہ لائی کہ ایمان لانا اس کو نافع ہوتا سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے۔ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی میں ان پر سے ٹال دیا اور ان کو ایک وقت (خاص) کے لیے زندگی سے فائدہ اٹھانے کا (موقع) دیا۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ یونس علیہ السلام بن متی وہی ذوالنون ہیں۔ مفسرین نے کہا ہے کہ انھوں نے قوم سے عذاب کا وعدہ کیا، پھر جب عذاب ان سے متاخر ہوا تو ان کے پاس سے نکلے، دریا کا قصد کیا اور کشتی میں سوار ہوئے، چنانچہ وہ دریا کی طرف جانے کے سبب سے ایسے ہوئے جیسے غلام اپنے مالک سے بھاگتا ہے، اسی لیے ان کو ''إِبَاق'' کے ساتھ موصوف کیا۔ یہی معنی ہیں: ﴿ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴾ کے۔ ''إباق'' کی اصل بھاگنا ہے اپنے سید سے۔ یعنی غلام کے اپنے مالک کے پاس سے بھاگنے کو ''إباق'' کہتے ہیں، لیکن چوں کہ اپنی قوم سے ان کا اپنے رب کے اذن کے بغیر بھاگنا تھا، اس لیے ان کو اباق سے موصوف کیا۔ پس یہ استعارہ تصریحیہ ہے یا مجاز مرسل کہ مقید کا استعمال مطلق میں کیا۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَبَقَ ﴾ کی تاویل ''تَبَاعَدَ'' ہے،[2] یعنی کشتی کی طرف گئے، اسی معنی میں عرب کا قول عبدِ آبق ہے۔ ''مُسَاهَمَة'' کی اصل مغالبہ ہے۔ ''مُسَاهَمَة'' کے معنی ہیں: ''اِقْتِرَاع''۔ ''اِقْتِرَاع'' یہ ہے کہ سہم (تیر) اس شخص پر نکلے جو غالب ہو۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فَسَاهَمَ ﴾ کے معنی ہیں: ''فَقَارَعَ''[3] یعنی کشتی والوں سے مقارعہ کیا۔ اصل اس کی ان سہام سے ہے جو جولان دیے جاتے ہیں۔

﴿ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴾ کے معنی ہیں: ''فَصَارَ مِنَ الْمَغْلُوْبِيْنَ''۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''دَحَضَتْ حُجَّتُهُ وَأَدْحَضَهَا اللّٰهُ'' یعنی اس کی حجت لغزش کھا گئی اور اللہ نے اس کو لغزش دے دی۔ ''دَحَض'' کی اصل ''زَلَق'' ہے مقامِ ظفر سے، یعنی فتح مندی کے مقام سے پھسل جانا۔ حاصلِ الزام کھانا، ہارنا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''اِقْتَرَعَ فَكَانَ مِنَ الْمَقْرُوْعِيْنَ'' یہ بھی ان سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو ان کی بستی والوں کی طرف بھیجا تو جو شے وہ لے کر آئے تھے اس کو ان پر رد کیا، اس سے باز رہے، اس کو نہ مانا۔ پھر جب قوم نے یہ کیا تو اللہ پاک نے یونس علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ میں فلاں فلاں دن ان پر عذاب بھیجنے والا ہوں،

[1] تفسير ابن كثير (٤/٢٨-٣٠) [2] تفسير القرطبي (١٥/١٢٢) [3] تفسير القرطبي (١٥/١٢٣)

چنانچہ تو اُن کے درمیان سے نکل جا۔ چنانچہ اللہ نے جو قوم کے عذاب کا وعدہ کیا تھا یونس علیہ السلام نے قوم کو اس کی خبر کر دی۔ پھر قوم نے کہا ہے کہ اس کا انتظار کرو، اس کو تاکتے رہو، چنانچہ اگر یہ تمھارے درمیان سے نکل جائے تو جس شے کا اس نے تم سے وعدہ کیا ہے، واللہ! وہ ہونے والی ہے۔

پھر جب وہ رات آئی جس کی صبح میں ان کو عذاب کا وعدہ دیا گیا تھا تو یونس علیہ السلام رات کے پہلے حصے میں نکلے، تو قوم نے ان کو دیکھ لیا اور ڈر گئے۔ چنانچہ وہ لوگ بستی سے اپنی زمین کے ایک میدان کی طرف نکلے اور ہر جانور اور اس کے بچے کو الگ الگ کر دیا، پھر اللہ کی طرف فریاد کی۔ چیخے چلائے اور رجوع ہوئے اور درگزر چاہی، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے درگزر فرمائی اور یونس علیہ السلام بستی اور بستی والوں کی خبر کا انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے پاس سے گزرنے والا ایک شخص گزرا تو انھوں نے کہا کہ بستی والوں نے کیا کیا، یعنی ان کی کیا خبر ہے؟ اس نے کہا ہے کہ جب ان کا نبی ان کے درمیان سے نکل گیا تو وہ پہچان گئے کہ اس نے ان کو جو عذاب کا وعدہ دیا تھا وہ اس نے سچ کہا۔ تو وہ لوگ بستی سے اپنی زمین کے ایک میدان کی طرف نکلے اور ہر بچے والے جانور کو اس کے بچے سے جدا کیا، پھر اللہ کی طرف چلائے اور توبہ کی تو اللہ نے ان سے توبہ قبول فرمائی اور عذاب کو ان سے موخر کر دیا۔ چنانچہ یونس علیہ السلام نے اس وقت کہا کہ میں جھوٹا ہو کر ان کی طرف کبھی لوٹ کر نہ جاؤں گا اور سیدھے چل دیے۔[1] (أخرجه ابن جرير وابن أبي حاتم)

اس مساہمت کے معنی یہ ہیں کہ یونس علیہ السلام جب کشتی میں سوار ہوئے تو وہ رک گئی۔ ملاح بولے کہ یہاں کوئی غلام ہے جو اپنے مالک سے بھاگا ہوا ہے۔ یہ اس کشتی کا قاعدہ ہے کہ اس پر جب کوئی بھاگا ہوا سوار ہوتا ہے تو وہ چلتی نہیں۔ پھر انھوں نے قرعہ ڈالا تو یونس علیہ السلام پر قرعہ پڑا، وہ بولے کہ وہ بھاگنے والا میں ہوں اور خود کو پانی میں ڈال دیا۔

﴿ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ ﴾ یعنی ان کو مچھلی نے لقمہ کر لیا۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب انھوں نے قرعہ ڈالا تو کشتی کی طرف ایک مچھلی آئی وہ اپنا منہ کھولے ہوئے اپنے رب کے حکم کا انتظار کرتی تھی، یہاں تک کہ جب یونس علیہ السلام نے اپنے آپ کو پانی میں ڈالا، اسی وقت اس نے ان کو لے لیا، یعنی ان کو نگل گئی۔[2] جب تم لقمے کو نگل جاؤ تو اس وقت محاورے میں ایسے کہو گے کہ "لَقَمْتُ اللُّقْمَةَ وَالْتَقَمْتُهَا"۔ ﴿ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ مچھلی ان کو اس حال میں نگل گئی کہ وہ ملامت کے مستحق تھے۔ محاورۂ عرب میں "رَجُلٌ مُلِيْمٌ" جب بولتے ہیں کہ وہ شخص ایسا کام کرے جس پر اسے ملامت کی جائے۔ رہا ملوم تو وہ وہ شخص ہے جو ملامت کیا جائے۔ برابر ہے کہ وہ ایسا کام کرے جس پر ملامت کا مستحق ہو یا نہ کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مُلِيْمٌ ﴾ بہ معنی معیب ہے۔ "أَلَامَ الرَّجُلُ" بولتے ہیں جب وہ شخص ایسا کام کرے جس کے سبب سے معیب ہو جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ "دَاخِلٌ فِي الْمَلَامَةِ"۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ مُلِيْمٌ ﴾ بہ معنی "مُسِيْءٌ" ہے،[3] یعنی گناہ گار۔

---

[1] تفسير الطبري (١٨/٥١٢) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٢٦)

[2] تفسير البغوي (٤/١٥١، ١٥٢) [3] الدر المنثور (٧/١٢٥)

﴿ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ پھر اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ اللہ کا ذکر کرنے والوں میں، یا اس کے لیے نماز پڑھنے والوں میں سے، یا ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ کہنے والوں میں سے، یا عابدین میں سے تھا تو البتہ وہ اس کے پیٹ میں اس دن تک ٹھہرا رہتا جس دن لوگ زندہ ہو کر اُٹھیں، یعنی اس کے لیے مچھلی کا پیٹ قیامت کے دن تک کے لیے قبر بن جاتا۔ کسی نے کہا ہے کہ البتہ وہ اس پیٹ میں زندہ ٹھہرے رہتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "كُلُّ تَسْبِيحٍ فِي الْقُرْآنِ فَهُوَ صَلَاةٌ"[1] یعنی قرآن شریف میں ہر جگہ تسبیح بہ معنی نماز ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مچھلی کے پیٹ میں اُن کے لیے کوئی نماز نہ تھی، لیکن وہ عملِ صالح آگے بھیج چکے تھے،[2] چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طاعتِ قدیم کی قدر دانی فرمائی۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ کے ذکر کی رغبت دلائی ہے اور ذکر کرنے والوں کو خوش خبری سنائی ہے کہ دیکھو اللہ کا ذکر کیسی نفیس شے ہے کہ اس کی برکت سے کیسی کیسی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ سچ ہے: "وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ"۔

رہی یہ بات کہ مچھلی کے پیٹ میں کتنا رہے؟ تو اس کے بارے میں کئی قول ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ گھڑی بھر رہے۔ تین دن کے قائلوں میں سے امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ ہیں اور سات دن والوں میں سے عطاء رحمہ اللہ اور بیس دن والوں میں سے ضحاک رحمہ اللہ اور چالیس دن والوں میں سے سدی، کلبی اور مقاتل بن سلیمان رحمہم اللہ ہیں۔[3] "نَبَذَ" بہ معنی "طَرَحَ" ہے، یعنی ڈال دینا۔ "عَرَاء" بہ معنی صحراء ہے۔ یہ ابن الاعرابی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: فضا بہ معنی میدان۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَلْوَاسِعُ مِنَ الْأَرْضِ"، یعنی زمینِ فراخ۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خالی مکان۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ "عَرَاء" "وَجْهُ الْأَرْضِ" ہے،[4] یعنی روئے زمین۔ کسی نے کہا ہے کہ زمین جو درخت اور نبات سے خالی ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ساحل[5] یعنی دریا کا کنارہ۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے ان کو مچھلی کے پیٹ سے نکال کر صحرائے فراخ میں ڈال دیا، جس میں کسی طرح کی روئیدگی نہ تھی۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم نے مچھلی کو حکم دیا اس کے ڈالنے کا۔ رہی یہ بات کہ اللہ پاک نے ڈالنے کی نسبت اپنی ذاتِ مقدس کی طرف فرمائی، اگرچہ ڈالنے والی مچھلی ہے؟ تو اس لیے کہ بندوں کے اعمال اللہ کی مخلوق ہیں۔

﴿ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ یونس علیہ السلام مچھلی کے ڈالنے کے وقت ضعیف اور کمزور تھے، اس ضرر کی وجہ سے جو مچھلی کے پیٹ میں ان کو پہنچا تھا۔ کہا ہے کہ ان کا بدن ایسا ہو گیا تھا جیسا کہ بچے کا بدن ہوتا ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کا گوشت بوسیدہ ہو گیا تھا اور ہڈیاں باریک ہو گئی تھیں، ان میں کسی طرح کی قوت

---

[1] تفسير الطبري (١٩١/١٩) [2] تفسير البغوي (٦٠/٧) [3] تفسير القرطبي (١٢٣/١٥)
[4] تفسير القرطبي (١٢٩/١٥) [5] تفسير الطبري (١١١/٢١)

باقی نہ رہی تھی۔ بعض مفسرین نے استشکال کیا ہے کہ یہاں تو ﴿ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴾ فرمایا اور دوسری جگہ یوں ہے: ﴿ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴾ [القلم: ٤٩] ''اگر اسے اس کے رب کی نعمت نہ پا لیتی تو یقیناً وہ برے حالوں میں چٹیل میدان میں ڈال دیا جاتا۔'' پہلی آیت میں تو یہ ذکر ہے کہ وہ عراء پر ڈالے گئے اور یہ اس پر دال ہے کہ عراء پر نہیں ڈالے گئے۔ ان دونوں میں جمع کیسے ہو گی؟ امام نحاس رحمہ اللہ وغیرہ نے یہ جواب دیا ہے کہ اللہ پاک نے اس جگہ یہ خبر دی ہے کہ وہ عراء میں اس حال میں ڈالے گئے کہ وہ غیر مذموم تھے اور دوسری آیت کے یہ معنی ہیں کہ اگر اللہ عزوجل کی رحمت نہ ہوتی تو وہ عراء پر ڈالے جاتے، اس حال میں کہ وہ مذموم ہوتے۔[1]

﴿ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴾ ﴿ عَلَيْهِ ﴾ کے معنی ہیں: ''فَوْقَهٗ''، یعنی ہم نے اس کے اوپر ﴿ يَقْطِيْنٍ ﴾ کا ایک درخت اُگا دیا کہ اس پر سایہ کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عَلَيْهِ ﴾ بہ معنی ''عِنْدَهٗ'' ہے، یعنی اس کے پاس۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی ''لَهٗ'' ہے، یعنی اس کے لیے سایہ کرنے والا ہو۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يَقْطِيْنٍ ﴾ ہر اس درخت کو کہتے ہیں جس کا تنا نہ ہو، بلکہ وہ روئے زمین پر بڑھتا ہو، جیسے: کدو، خربوزہ اور اندراین کا درخت۔ پھر اگر اس کا تنا ہو، جو اسے اٹھائے تو اس کو صرف ﴿ شَجَرَةً ﴾ کہتے ہیں۔ یہ قول امام حسن اور مقاتل رحمہما اللہ وغیرہما کا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يَقْطِيْنٍ ﴾ ہر وہ شے جو اُگتی ہے پھر اسی سال مر جاتی ہے۔ دوسرا ان کا لفظ یہ ہے کہ ہر وہ شے جو روئے زمین پر جاتی ہے۔ جوہری نے کہا کہ ﴿ يَقْطِيْنٍ ﴾ وہ درخت ہے جس کا تنا نہیں جیسے کدو کا درخت اور اس طرح کے درخت۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يَقْطِيْنٍ ﴾ کا اشتقاق ''قَطَنَ بِالْمَكَانِ، أَيْ: أَقَامَ بِهٖ'' سے ہے، چنانچہ یہ یفعیل کا وزن ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اسم اعجمی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يَقْطِيْنٍ ﴾ انجیر کا درخت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کیلے کا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ يَقْطِيْنٍ ﴾ ''اَلْقَرْعُ''[3] یعنی کدو کی بیل۔ جمہور اسی قول پر ہیں۔ فائدہ اس کا یہ ہے کہ مکھیاں اس کے پاس جمع نہیں ہوتی ہیں اور یہ سب درختوں سے اُگنے اور بڑھنے میں زیادہ سریع (تیز) ہے اور جلدی بلند ہوتا ہے۔ امام ابن جزی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے کدو کے درخت کو اس لیے خاص کیا کہ وہ بردِ ظل ولینِ لمس اور کبرِ ورق کا مجموعہ ہے، یعنی اس کا سایہ ٹھنڈا ہوتا ہے اور وہ چھونے میں نرم ہے اور اس کے پتے بڑے بڑے ہوتے ہیں اور مکھیاں اس کے پاس نہیں جاتیں، اس لیے کہ یونس علیہ السلام کا جسم شریف جب کہ وہ ڈالے گئے مکھیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔[4] مفسرین نے کہا ہے کہ سورج سے اس درخت کا سایہ لیتے تھے۔ اور اللہ پاک نے

---

[1] تفسير القرطبي (١٢٩/١٥)
[2] تفسير القرطبي (١٢٩/١٥)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٣٠/١٠)
[4] التسهيل لعلوم التنزيل لابن جزي (١٩٨/٢)

ایک پہاڑی وحشی بکری ان کے لیے مقرر فرما دی تھی جو صبح اور شام ان کے پاس آتی تو وہ اس کا دودھ پیا کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کا گوشت سخت ہو گیا اور بال اُگ آئے، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو بھیجا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یونس علیہ السلام کی رسالت اس کے بعد تھی، جب ان کو مچھلی نے ڈالا۔ اس آیت کے یہی معنی ہیں:

﴿ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴾[1] یہ لوگ وہی ان کی قوم ہے جن سے دریا کی طرف بھاگے تھے اور اُن کے بھاگنے کے بعد جو ماجرا گزرا سو گزرا، جیسا کہ اس سورت میں اللہ پاک نے ہم سے اس کا قصہ بیان کیا ہے۔ یہ لوگ اہلِ نینویٰ ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اہلِ نینویٰ کی طرف بھیجے گئے ہیں جو زمین موصل سے ہے، اس آزمائش کے پہنچنے سے پہلے جو ان کو پہنچی۔[2] کہا ہے کہ ﴿ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴾ میں کلمۂ ﴿ اَوْ ﴾ بہ معنی واؤ ہے معنی "وَیَزِیْدُوْنَ" ہیں۔ امام جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے اسی طرح بغیر الف شک کے پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ بہ معنی "بَلْ" ہے۔ امام مقاتل، کلبی اور ابو عبیدہ رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ امام مبرد، زجاج اور اخفش رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہاں ﴿ اَوْ ﴾ اپنی اصل پر ہے،[3] معنی یہ ہیں یا وہ تمھارے اندازے اور تخمینے میں زیادہ ہوتے، جبکہ دیکھنے والا ان کو دیکھے تو کہے: یہ لوگ ایک لاکھ ہیں یا زیادہ۔ چنانچہ شک جو داخل ہوا ہے تو وہ مخلوق کا قول بیان کرنے پر ہوا ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شک بہ نسبت مخاطبین کے ہے اور ابہام اس نسبت کی وجہ سے ہے کہ اور اللہ پاک نے ان کے حال کا ابہام رکھا ہے اور اباحت بہ نسبت ناظر کے ہے اور اسی طرح تخییر یعنی ناظر مخیّر ہے درمیان اس کے کہ وہ ان کا اندازہ کرے اتنا یا اتنا۔

اس میں اختلاف ہے کہ زیادہ کتنے تھے؟ تو اس بارے میں اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ مختلف مفسرین میں پھر اس میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ یونس علیہ السلام کا یہ بھیجنا وہی ہے جو اس کے قبل تھا کہ مچھلی نے ان کو نگل لیا اور ﴿ وَاَرْسَلْنٰهُ ﴾ میں حرفِ واؤ صرف جمع کے لیے ہو، اس واقعے کے درمیان جو ان کو مچھلی کے ساتھ پیش آیا اور ان کو ان کی قوم کی طرف بھیجنے کے درمیان بغیر اس شے کی تقدیم کے اعتبار سے جو سیاق میں مقدم ہوئی ہے اور اس شے کی تاخیر سے جو متاخر ہوئی ہے۔ یا یہ ارسال (یونس علیہ السلام کو بھیجنا) مچھلی کے واقعے کے بعد ہوا ہے۔ یہ دو قول ہیں: راجح قول یہی ہے کہ وہ دریا کی طرف جانے سے پہلے ہی رسول تھے، چنانچہ جو امر اس پر دال ہے اس کو ہم سورت یونس میں ذکر کر آئے ہیں اور وہ اسی رسالت پر قائم اور مستمر رہے اور یہ ارسال جو یہاں مذکور ہے، یہ ان کی نبوت اور رسالت کے تقدم کے بعد ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ ان کی رسالت مچھلی کے ڈالنے کے بعد تھی۔

پھر مذکورہ آیت تا ﴿ يَزِيْدُوْنَ ﴾ پڑھی۔ حالاں کہ ابھی وہ بات گزر چکی ہے جو اس پر دال ہے کہ ان کی رسالت مچھلی کے واقعے سے پہلے تھی اور آیت میں وہ بات نہیں ہے جو سعید کے مذکور قول پر دال ہو۔ کسی نے کہا ہے

[1] فتح القدير (٥٤٣/٤) [2] تفسير الطبري (١١٦/٢١) [3] فتح القدير (٥٤٢/٤)

کہ یہ جائز ہے کہ ان کا ارسال اور قوم کی طرف ہو سوائے پہلی قوم کے، لیکن اس قول میں بُعد ہے۔ بالجملہ جب قریش
اور عرب کے کئی قبیلے یہ زعم کرتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں تو اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم کیا کہ اس
بارے میں ان سے ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ پوچھیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿١٤٩﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ
اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿١٥٠﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿١٥١﴾
وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٥٢﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿١٥٣﴾
مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿١٥٤﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿١٥٥﴾ اَمْ لَكُمْ
سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥٦﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿١٥٧﴾ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ
الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿١٥٨﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٥٩﴾ اِلَّا
عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿١٦٠﴾ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿١٦١﴾ مَآ اَنْتُمْ
عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿١٦٢﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿١٦٣﴾

پھر ان (اہلِ مکہ) سے پوچھیے: کیا آپ کے رب کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے
بیٹے؟ (149) یا ہم نے فرشتوں کو مؤنث پیدا کیا اور وہ حاضر تھے؟ (150) خبردار! بلاشبہ وہ اپنی
طرف سے جھوٹ گھڑ کر کہتے ہیں (151) کہ "اللہ نے اولاد جنی" اور یقیناً وہ جھوٹے ہیں (152) کیا
اس نے بیٹوں پر بیٹیوں کو پسند کیا (ترجیح دی) ہے؟ (153) کیا ہوگیا ہے تمھیں، تم کیسا فیصلہ
کرتے ہو؟ (154) کیا پھر تم غور نہیں کرتے؟ (155) یا تمھارے پاس کوئی واضح دلیل ہے؟ (156) پھر تم
اپنی کتاب لے آؤ اگر تم سچے ہو (157) اور انھوں نے اس (اللہ) کے اور جنوں کے درمیان رشتہ
ٹھہرایا، حالاں کہ بلاشبہ خود جنّوں نے جان لیا کہ وہ (اللہ کے سامنے) ضرور حاضر کیے
جائیں گے (158) اللہ ان (باتوں) سے پاک ہے جو وہ (اس کے بارے میں) بیان کرتے
ہیں (159) سوائے اللہ کے چنے ہوئے بندوں کے (وہ ایسی باتیں نہیں کرتے) (160) (اے مشرکو!)
بے شک تم اور (وہ) جن کی تم عبادت کرتے ہو (161) تم (ان مخلص بندوں کو) اس (اللہ) کے
خلاف بہکانے والے نہیں (162) مگر اسی کو جو جہنم میں جانے والا ہے (163)

---

[1] فتح البیان (۱۱/۴۲۱-۴۲۷)

اللہ تعالیٰ کی اولاد ثابت کرنے والوں کا رد:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ مشرک لوگ جو اللہ پاک کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، اس بات میں اللہ تعالیٰ ان پر انکار فرماتا ہے: ﴿ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴾ [النحل: ٥٧] یعنی ان کے لیے وہ ہو جس کو وہ چاہتے ہیں، یعنی بیٹے، یعنی مطلب یہ ہے کہ اپنے لیے اچھی شے کو محبوب رکھتے ہیں۔ ﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴾ [النحل: ٥٨] ''ان میں سے جب کسی کو لڑکی ہونے کی خبر دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹنے لگتا ہے۔'' یعنی ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو یہ بات اس کو بری لگتی ہے اور اپنے لیے اختیار نہیں کرتا مگر بیٹوں کو۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: پھر اللہ تعالیٰ کی طرف اس قسم کی نسبت کیوں کی جس کو وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔ اسی لیے یوں فرمایا کہ اب بطور انکار تو ان سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے۔ جیسے اللہ سبحانہ کا قول ہے: ﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾ [النجم: ٢١۔ ٢٢] ''کیا تمھارے لیے لڑکے اور اللہ کے لیے لڑکیاں ہیں؟ یہ تو اب بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴾ یعنی انھوں نے فرشتوں پر کیوں کر یہ حکم لگایا کہ وہ عورتیں ہیں، حالاں کہ ان کو پیدا کرنے کا مشاہدہ نہیں کیا ہے، جیسے اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ﴾ [الزخرف: ١٩] ''اور انھوں نے فرشتوں کو جو رحمان کے عبادت گزار ہیں، عورتیں قرار دے لیا۔ کیا ان کی پیدایش کے موقع پر یہ موجود تھے؟ ان کی یہ گواہی لکھ لی جائے گی اور ان سے (اس چیز کی) باز پرس کی جائے گی۔'' یعنی قیامت کے دن ان سے اس کی پوچھ گچھ ہوگی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے، بے شک وہ اپنے جھوٹ سے ستا ہے، البتہ کہتے ہیں کہ اللہ سے اولاد صادر ہوئی ہے اور بے شک وہ البتہ اس بات میں جھوٹے ہیں۔ چنانچہ اللہ پاک نے کفار کی طرف سے ملائکہ کے حق میں تین باتیں ذکر فرمائی ہیں جو کفر اور جھوٹ میں انتہا درجے کی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں ٹھہرایا تو گویا اللہ کے لیے اولاد قرار دی، تعالیٰ و تقدس۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس اولاد کو مونث ٹھہرایا۔ تیسری بات یہ ہے کہ پھر ان کو اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا۔ تعالیٰ و تقدس۔ ان میں سے ہر بات اس کے لیے کافی ہے کہ اس کو جہنم کی آگ میں ہمیشگی ہو۔

پھر اللہ پاک نے ان پر انکار کر کے یہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک کو اس بات پر کون سی شے باعث ہوئی کہ اس نے بیٹوں کے سوا بیٹیوں کو اختیار کیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٠]

23

’’کیا بیٹوں کے لیے تو اللہ نے تم کو چھانٹ لیا اور خود اپنے لیے فرشتوں کولڑکیاں بنالیا؟ بے شک تم بہت بڑا بول بول رہے ہو‘‘۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴾ یعنی کیا تمھاری عقلیں نہیں ہیں جن سے تم اس بات کو سوچو جسے کہتے ہو، کیا تم دھیان نہیں کرتے ہو!!

﴿ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿156﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کیا تمھارے پاس کوئی روشن حجت ہے اس بات پر جس کو تم کہتے ہو، لہٰذا کوئی دلیل لے آ ؤ جو کتابِ آسمانی کے ساتھ مستند ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل کیا ہو کہ اس نے وہ بات ٹھہرائی ہے جو تم کہتے ہو، کیونکہ جو کچھ تم کہتے ہو اس کو عقل تسلیم نہیں کرتی، بلکہ عقل اس کو بالکل جائز نہیں رکھتی۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ﴾۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: مشرکوں نے کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ پس ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر ان کی مائیں کون ہیں؟ تو کہا کہ دختران سردارانِ جن ہیں۔ اسی طرح قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے۔[1] اسی لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴾ یعنی البتہ یقینی طور پر جنوں نے جان لیا ہے جن کی طرف اس بات کی نسبت کی ہے کہ جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے، وہ البتہ بہ روزِ حساب عذاب میں حاضر کیے جائیں گے، اس لیے کہ انھوں نے اس بارے میں جھوٹ کہا ہے اور بہتان طرازی کی ہے اور بغیر علم کے باطل بات کہی ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اعداء اللہ نے یہ زعم کیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور ابلیس دونوں بھائی ہیں۔ تعالى الله عن ذلك علوًا كبيرا۔ اس قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ بہت بلند، بہت مقدس اور بہت پاک ہے اس سے کہ اس کی اولاد ہو اور اس بات سے جس کے ساتھ ظالم ملحد لوگ اس کا وصف کرتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ استثنائے منقطع کلام مثبت سے ہے، مگر یہ کہ ﴿ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ کی ضمیر ﴿ يَصِفُوْنَ ﴾ کی طرف راجع ہو، پھر ان سے مخلصین کا استثناء کیا جائے۔ مخلصین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اس حق کی پیروی کرنے والے ہیں جو ہر نبی اور رسول پر اتارا گیا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس استثناء کو ﴿ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴾ سے ٹھہرایا ہے۔[3] یہ جو ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے اس میں نظر ہے۔ والله سبحانه و تعالىٰ أعلم بالصواب.

مشرکوں کی بات کو وہی قبول کرتا ہے جو ان سے بڑھ کر گمراہ ہے:

پھر اللہ پاک مشرکوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے: ﴿ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿161﴾ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴾ یعنی جو بات تم کہتے ہو اور جس گمراہی وعبادتِ باطل پر تم جمے ہوئے ہو، اس کا مطیع اور فرماں بردار وہی شخص ہو گا جو تم

[1] تفسير الطبري (١٢١/٢١) [2] تفسير الطبري (١٢١/٢١) [3] تفسير الطبري (١٢٢/٢١)

سے بھی زیادہ تر گمراہ ہے۔ من جملہ ان لوگوں کے جو آگ کے واسطے پیدا کیے گئے ہیں، ان کے دل ہیں جن سے سمجھتے بوجھتے نہیں ہیں اور کان ہیں جن سے سنتے نہیں ہیں اور آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ یہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں، یہ لوگ ہی غافل ہیں۔ پس لوگوں کی یہ قسم وہی قسم ہے جو کفر و شرک و ضلالت کے راستے پر چلنے والی ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ﴾ [الذاريات: ٨۔ ٩] ''یقیناً تم مختلف بات میں پڑے ہوئے ہو۔ اس سے وہی باز رکھا جاتا ہے جو پھیر دیا گیا ہو۔'' یعنی اس سے وہی گمراہ ہوتا ہے جو مافوک (اِفک زدہ) و مبطل ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے: اے محمد! تو ان سے خبر پوچھ! کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے جس طرح کہ انھوں نے زعم کیا ہے؟ وہ اللہ کے لیے کس طرح عورتیں ٹھہراتے ہیں جو دونوں جنسوں میں سے خسیس تر اور ذلیل تر ہیں اور اپنے لیے مذکر ٹھہراتے ہیں جو اعلیٰ اور ارفع قسم ہے۔ یہ اپنی کم عقلی اور کج فہمی کے سبب سے ظالمانہ تقسیم کرتے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے ان کی ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ میں اور زیادتی کی۔ یوں ارشاد فرمایا کہ کیا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا اور وہ دیکھتے تھے۔ اگلے کلام میں وہ انداز اختیار کیا جو اُن کی سرزنش، ملامت اور ٹھٹھا کرنے میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ یعنی فرشتوں کو انھوں نے عورتیں کیسے ٹھہرایا، حالاں کہ جس وقت ہم نے ان کو بنایا، یہ اس وقت حاضر نہ تھے، پھر یہ کیسے جان لیا کہ وہ عورتیں ہیں۔ چنانچہ اللہ پاک نے بیان فرمایا کہ ایسی بات تو مشاہدے ہی سے معلوم ہوتی ہے اور وہ حاضر نہیں ہوئے اور نہ کوئی سمعی دلیل ان کے قول پر دال ہے اور نہ وہ اس قسم سے ہے جس کا ادراک عقل سے کیا جاتا، تا آنکہ اس کے ادراک کی نسبت اپنی عقلوں کی طرف کریں۔

پھر اللہ پاک نے ان کے کذب کی خبر دی کہ سنتا ہے بے شک وہ افتراء پردازی سے البتہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہوئی اور بے شک وہ البتہ جھوٹے ہیں۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اللہ پاک کی طرف سے، امر باستفنا کے تحت میں داخل نہیں ہے، ان کے مذہبِ فاسد کے باطل کرنے کو لایا گیا ہے۔ یہ بات بیان کر کے کہ اُن کے قول کی بنیاد اِفکِ صریح اور افترائے قبیح کے سوا اور کوئی نہیں ہے، جس پر کوئی دلیل بلکہ دلیل کا شائبہ تک نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو وہ ذات پاک ہے کہ نہ تو اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے۔ جمہور نے ﴿ وَلَدَ اللّٰهُ ﴾ کو بہ صیغۂ ماضی پڑھا ہے۔ ﴿ وَلَدَ ﴾ کا فاعل اللہ پاک ہے۔ کسی نے یوں پڑھا ہے کہ ﴿ وَلَدَ ﴾ کی اضافت اللہ کی طرف کی ہے۔ اس بنیاد پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: ''أَيْ: يَقُوْلُوْنَ: اَلْمَلَائِكَةُ وَلَدُ اللّٰهِ'' یعنی کہتے ہیں فرشتے اللہ کی اولاد ہیں۔ کلمۂ ﴿ وَلَدَ ﴾ بہ معنی مفعول ہے، یعنی مولود، اس میں مفرد، مثنی، جمع، مذکر اور مونث برابر ہے۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/ ٣٠۔٣١)

پھر اللہ پاک نے ان کی ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ دوبارہ ذکر فرمائی: ﴿ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴾ یعنی پسند کیں بیٹیاں بیٹوں کے مقابلے میں؟! جمہور نے یہ فتحِ ہمزہ پڑھا ہے اس بنا پر کہ ہمزہ استفہامِ انکاری کا ہے اور اس کے ساتھ ہمزہ وصل حذف کر دیا گیا ہے، اس لیے کہ ہمزہ استفہام کے سبب سے ہمزہ وصل کی ضرورت نہیں اور نافع نے ایک روایت میں اور ابوجعفر، شیبہ، اعمش نے یہ ہمزہ وصل پڑھا ہے۔ ابتدا میں تو ثابت رکھا جاتا ہے اور درج میں ساقط ہو جاتا ہے اور استفہام معنوی ہوتا ہے۔ یہ قول امام فراء رحمہ اللہ کا ہے۔ استفہام کا حرف حذف کیا گیا، اس لیے کہ مقام سے معلوم ہوتا ہے یا اس بنا پر کہ ﴿ اَصْطَفَى ﴾ اور اس کے بعد کا جملہ محکیہ بالقول سے بدل ہے اور بر تقدیرِ عدمِ استفہام اور بدل۔ محققین کی ایک جماعت سے جس میں امام فراء رحمہ اللہ شامل ہیں نقل کیا گیا ہے کہ ملامت استفہام اور اس کے بغیر بھی یعنی دونوں سے ہوتی ہے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا ﴾[1] [الأحقاف: ٢٠] ''(کہا جائے گا) تم نے اپنی نیکیاں دنیا کی زندگی میں ہی برباد کر دیں۔'' کسی نے کہا ہے کہ اضمارِ قول کی بنا پر ہے۔ ﴿ اَصْطَفَى ﴾ صفوۃ شے، یعنی شے کا خلاصہ لینے کو کہتے ہیں۔

﴿ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴾ یہ دونوں جملے استفہامی ہیں۔ اعراب کی حیثیت سے ایک کو دوسرے سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ پہلے ان سے استفہام انکار کے ذریعے اس شے کے بارے میں پوچھا جو اُن کے لیے ثابت اور مستقر ہوئی اور دوبارہ ان سے تعجب کے انداز میں اس حکم کے بارے میں پوچھا جس کے ساتھ انھوں نے حکم کیا۔ معنی یہ ہیں کہ تمھارے لیے کون سی شے ثابت ہوئی، تم اللہ کے لیے بیٹیوں کا حکم کیسے کرتے ہو، حالاں کہ یہ وہ قسم ہے جس کو تم مکروہ سمجھتے ہو اور اپنے لیے بیٹوں کا حکم کرتے ہو اور یہ وہ قسم ہے جس کو تم محبوب رکھتے ہو۔ ﴿ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ اصل میں ''تَتَذَكَّرُوْنَ'' ہے۔ ایک حرفِ ''تاء'' کو حذف کر دیا ہے، یعنی کیا تم عبرت نہیں لیتے ہو اور غور و فکر نہیں کرتے ہو کہ اپنے قول کے بطلان کو معلوم کر لو۔

پھر اللہ پاک نے ایک توبیخ سے دوسری توبیخ اور ایک ملامت سے دوسری ملامت کی طرف اضراب (توجہ) کیا اور ارشاد فرمایا: ﴿ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴾ یعنی یا تمھارے لیے کوئی کھلی سند ہے، یعنی کوئی واضح اور ظاہر حجت اور دلیل ہے اس بات پر جو تم کہتے ہو، کیوں کہ یہ ضروری ہے کہ اس بات کے کہنے کے لیے کوئی حسی یا عقلی دلیل موجود ہو اور جب یہ دونوں نہ ہوں تو کوئی نقل شدہ سند ضرور ہو۔ ﴿ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی تو تم لاؤ اپنی کتاب جو تمھارے لیے حجت ہو اور جس میں نقل شدہ دلیل موجود ہو۔ یا کتاب سے مراد واضح حجت ہے جس طرح کہ ﴿ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴾ سے یہی مراد ہے اپنی بات میں اگر تم سچے ہو تو پیش کرو۔

﴿ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ﴾ اس میں صیغۂ خطاب سے صیغہ غائب کی طرف التفات ہے۔ اس سے

[1] تفسير القرطبي (١٥/١٣٤) فتح القدير (٤/٥٤٥)

اس بات سے آگاہ کرنا منظور ہے کہ وہ اپنی حماقت کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ ان سے براہِ راست خطاب کیا جائے اور ان کی بدحالی کا تقاضا ہے کہ ان سے اعراض کیا جائے اور ان کے گناہ اور برائیاں دوسروں سے نقل کی جائیں۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس جگہ "جِنَّةٌ" سے مراد فرشتے ہیں ان کو "جنة" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ "جِنَّةٌ" بطونِ ملائکہ سے ایک بطن ہیں ان کو "جنة" کہتے ہیں۔ امام ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو "جنة" صرف اس لیے کہتے ہیں کہ وہ جنتوں پر خازن اور داروغہ ہیں۔ "نسب" بہ معنی صہر ہے، یعنی سسرال کا رشتہ۔ امام قتادہ اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اللہ ان پر لعنت کرے، انھوں نے یہ کہا کہ اللہ نے جنوں سے مصاہرت کی تو فرشتے ان کی اولاد سے ہوئے۔ دونوں نے کہا ہے کہ یہ بات کہنے والے یہود ہیں۔ امام مجاہد، سدی اور مقاتل رحمہم اللہ نے کہا اس کے قائل کنانہ و خزاعہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جن کے سرداروں سے پیامِ نکاح کیا تو انھوں نے اپنی سردار بیٹیوں سے اس کا نکاح کر دیا، پس فرشتے جنوں کی سردار بیٹیوں سے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذَلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ انھوں نے اللہ پاک کی عبادت میں شیطان کو شریک کیا، پس یہی وہ نسب ہے جس کو انھوں نے ٹھہرایا۔[1]

پھر اللہ پاک نے ان پر اس بات کا رد کیا، فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴾ یعنی جن اس بات کو جان چکے ہیں کہ یہ کفار جنھوں نے یہ بات کہی ہے، آگ میں حاضر کیے جائیں گے اور اس بات کے سبب سے جو انھوں نے جھوٹ کہی ہے، اس میں عذاب کیے جائیں گے۔ اس سے مراد تکذیب میں مبالغہ کرنا ہے۔ یہ بات بیان کر کے کہ ان کافروں نے جن لوگوں کے لیے اس نسبت کا دعویٰ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کو ان سے بڑھ کر حقیقتِ حال کی خبر ہے، وہ اس بات میں ان کی تکذیب کرتے ہیں اور اس بات کا ابدی حکم لگاتے ہیں کہ وہ اس قول کی وجہ سے عذاب کیے جائیں گے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ جن یہ بات جان چکے ہیں کہ وہ خود حساب کے لیے حاضر کیے جائیں گے، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ جب صرف احضار کہا جاتا ہے تو اس سے مراد عذاب ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ البتہ جنوں نے یقینی طور پر یہ جان لیا ہے کہ وہ جنت کی طرف حاضر کیے جائیں گے، (تفسیر ابن کثیر میں اس جگہ اسی طرح سے لفظ جنت واقع ہوا ہے، لیکن سیاق کے لحاظ سے محلِ تامل ہے۔ از مصحح سلمہ اللہ)۔

پھر اللہ پاک نے مشرکین کے اقوال نقل کرنے کے بعد اپنی ذاتِ کریم کی پاکی بیان فرمائی: ﴿ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بتاتے ہیں۔ یا یہ فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی پاکی کے بارے میں بیان ہے کہ اللہ اس شے سے پاک ہے جس کے ساتھ مشرکوں نے اللہ سبحانہ کا وصف کیا ہے۔ یہ قول عمادی نے ذکر کیا ہے اور امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ﴿ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ میں استثناء منقطع

[1] تفسير القرطبي (١٥/١٣٤، ١٣٥)

ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ لیکن اللہ کے چنے ہوئے بندے اس سے بری ہیں کہ ان باتوں میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ پاک کا وصف کریں۔[1] ﴿الْمُخْلَصِيْنَ﴾ کو بہ فتح وکسرِ لام پڑھا ہے، اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے ابھی بیان کیے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ استثناء محضرین سے ہے، یعنی وہ حاضر کیے جائیں گے نار میں، مگر وہ جس نے اخلاص کیا تو اب استثناء متصل ہوگا نہ منقطع۔ (قاله أبو البقاء) اس قول کی بنیاد پر جملۂ تسبیح معترضہ ٹھہرے گا۔

پھر اللہ پاک نے علی العموم کفار کو مخاطب کیا یا خاص کر کفارِ مکہ کو مخاطب کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ۝ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ﴾ یعنی پس تم اور تمھارے معبود جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو تم اللہ کے بندوں کو فساد و گمراہ کر کے بہکا نہیں سکتے۔ کلمۂ "عَلَى" "فَاتِنِينَ" سے متعلق ہے اور ﴿وَمَا تَعْبُدُوْنَ﴾ میں حرفِ واو یا تو اسم "إِنَّ" پر عطف کے لیے ہے، یا بہ معنی "مَعَ" ہے۔ ﴿مَآ﴾ موصولہ ہے یا مصدریہ۔ "أَيْ: فَإِنَّكُمْ وَالَّذِيْ أَوْ وَعِبَادَتَكُمْ". "فَاتِنِينَ" کے معنی ہیں: "مُضِلِّيْنَ". محاورے میں بولتے ہیں: "فَتَنْتُ الرَّجُلَ وَأَفْتَنْتُهُ" اور کہتے ہیں: "فَتَنَهُ عَلَى الشَّيْءِ وَبِالشَّيْءِ" جس طرح یوں کہتے ہیں: "أَضَلَّهُ عَلَى الشَّيْءِ وَأَضَلَّهُ بِهِ" امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ حجاز تو کہتے ہیں: "فَتَنْتُهُ" اور اہلِ نجد کہتے ہیں ہے کہ "أَفْتَنْتُهُ" اور جب کوئی شخص کسی کی بی بی کو اس پر فاسد کر دے تو اس وقت بولتے ہیں: "فَتَنَ فُلَانٌ عَلٰى فُلَانٍ امْرَأَتَهُ" پس اس جگہ "فتنه" بہ معنی اضلال اور افساد ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: نہیں ہو تم بہکانے والے کسی کو تم اپنے معبودوں سے مگر اس کو جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر کیا ہے کہ وہ جہنم میں بیٹھے۔

﴿مَآ اَنْتُمْ﴾ میں کلمۂ ﴿مَآ﴾ نافیہ ہے اور ﴿اَنْتُمْ﴾ کا خطاب ان کو ہے اور اس کو جسے وہ پوجتے ہیں تغلیب کی بنا پر۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میرے علم میں اہلِ تفسیر کا اس بات پر اجماع ہے کہ معنی یہ ہیں: تم کسی کو گمراہ کرنے والے نہیں ہو، مگر اس کو جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر کر دیا ہے کہ وہ گمراہ ہوگا۔[2] یہ جملہ مخلصین کی براءت کی وجہ اور تحقیق ہے۔ یہ بات بیان کر کے کہ وہ ان کے اغوا اور اضلال سے عاجز ہیں۔ صیغۂ غیب سے جو خطاب کی طرف التفات فرمایا تو اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ کلام کے مضمون کی تحقیق کے لیے کس قدر اہتمام اور خیال کیا گیا ہے۔

﴿اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ﴾ یعنی مگر وہ شخص جس کے لیے اللہ تعالیٰ کے علم میں شقاوت سابق ہو چکی ہے اور یہ کہ وہ آگ میں داخل ہوگا۔ استثناء مفرغ ہے۔ (قاله السمين) اور یہ لفظ کے اعتبار سے ہے۔ رہی معنی کی حیثیت تو وہ مفعول مقدر سے استثناء ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے: بے شک اے مشرکین کے گروہ! اور وہ جس کو تم پوجتے ہو، یعنی تمھارے معبود، نہیں ہو تم اس پر گمراہ کرنے والے مگر وہ جو میرے علم کے مطابق سابق ہو چکا ہے کہ وہ دوزخ میں پڑا رہے گا۔[3] ان سے مروی دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مفتون نہ

---

[1] تفسير أبي السعود (٢٠٩/٧) [2] فتح القدير (٥٤٦/٤) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٣٢/١٠) تفسير الطبري (١٢٣/٢١)

کرو گے تم مگر اس شخص کو کہ وہ دوزخ میں جانے والا ہے۔[1] ان سے مروی تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ بے شک تم گمراہ نہ کرو گے اور نہ ہی میں گمراہ کروں گا تم میں سے مگر اس شخص کو جس کے بارے میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ وہ دوزخ میں داخل ہونے والا ہے۔[2] جمہور نے ﴿ صَالِ ﴾ کو بہ کسرِ لام پڑھا ہے اس لیے کہ منقوص مضاف ہے، بہ سبب التقائے ساکنین حرفِ یاء حذف کر دیا گیا ہے اور لفظ ﴿ مَنْ ﴾ کے لحاظ سے مفرد لایا گیا ہے جس طرح کہ کلمۂ ﴿ هُوَ ﴾ مفرد آیا ہے۔ امام حسن اور ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے بہ ضمِ لام مع واؤ کے پڑھا ہے یعنی "صَالُو" یہ بھی مروی ہے کہ ان دونوں نے بہ ضمِ لام بدون واؤ کے پڑھا ہے، چنانچہ حرفِ واؤ کے ساتھ اس بنا پر ہے کہ ﴿ مَنْ ﴾ کے معنی کا لحاظ کر کے جمع سالم پڑھا ہے اور اضافت کی وجہ سے جمع کے نون کو حذف کر دیا ہے۔ اب رہا بدون واؤ کے تو یہ احتمال ہے کہ جمع ہو اور حرفِ واؤ کو خطاً حذف کر دیا ہے جس طرح کہ لفظاً محذوف ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مفرد ہو، لیکن اس بنا پر حق اس کا کسرِ لام ہے۔ امام نحاس اور اہلِ تفسیر کی جماعت نے کہا ہے کہ یہ لحن ہے یعنی خطا ہے، کیوں کہ "هٰذَا قَاضُ الْمَدِيْنَةِ" بہ ضمِ ضاد کہنا جائز نہیں ہے۔[3] بالجملہ معنی یہ ہیں کہ کفار اور وہ جس کو کفار پوجتے ہیں اللہ کے بندوں میں سے کسی کو گمراہ کرنے پر قادر نہیں ہیں سوائے ان کے جو اہلِ نار سے ہیں اور یہ لوگ اصرار کرنے والے ہیں اور کفر پر وہی اصرار کرتا ہے جس پر یہ قضا سابق ہو چکی ہے کہ وہ بدبخت ہے اور ان میں سے ہے جو نار میں داخل ہوں گے۔ پھر فرشتوں نے نبی اکرم ﷺ کو خبر دی جس طرح کہ اللہ پاک نے ان کی طرف سے بیان فرمایا:[4]

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

(فرشتے کہتے ہیں:) ہم میں سے تو ہر ایک کا مقام مقرر ہے ﴿164﴾ اور بے شک ہم (اللہ کے حضور) یقیناً صف باندھے کھڑے رہنے والے ہیں ﴿165﴾ اور بے شک ہم تو تسبیح کرنے والے ہیں ﴿166﴾ اور بلاشبہ وہ (کفار) کہتے تھے ﴿167﴾ اگر ہمارے پاس اگلوں کی نصیحت (کتاب) ہوتی ﴿168﴾ تو ہم ضرور اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوتے ﴿169﴾ پھر (پیغمبر قرآن لے کر آیا تو) انھوں نے اس (قرآن) کا انکار کر دیا، لہٰذا عن قریب وہ جان لیں گے ﴿170﴾

---

(1) تفسير الصنعاني (١٥٨/٣) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٣٢/١٠) تفسير الطبري (١٢٣/٢١)
(3) تفسير القرطبي (١٣٦/١٥) (4) فتح البيان (٤٣١-٤٦٧/١١)

فرشتوں کا مقام اوران کا صف بستہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا:

فرمایا: جیسی دعائیں فرمائیں ہیں آدمی کی زبان سے ایک ٹھکانا مقرر ہے، یعنی ایک حد سے اس سے آگے بڑھنا نہیں ہے۔ یہ اس پر فرمایا کہ کافر کہتے تھے: فرشتے جنوں کی عورتوں سے اللہ کی بیٹیاں ہیں، پس جنوں کو اپنے بارے میں معلوم ہے اور فرشتے یوں کہتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی اپنی حد پر کھڑا رہتا ہے، یہاں تک فرشتوں کا کلام ہو چکا۔ عرب لوگ انبیاء کا نام سنتے تھے، ان کے علم سے خبر دار تھے تو یہ کہتے تھے کہ اگر ہمارے سامنے اگلے لوگوں کا ذکر ہوتا تو ہم بھی اللہ کے چیدہ بندے بن جاتے، اب جو اپنے اندر نبی پیدا ہوا تو پھر گئے۔ انتھیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کی اس کفر و شرک سے براءت فرماتا ہے جس کو مشرکوں نے ان کی طرف منسوب کیا کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یعنی یہ اللہ کے دشمن تو ان کے حق میں یہ افترا پردازی کرتے ہیں اور وہ اپنی بندگی اور عاجزی یوں بیان کرتے ہیں: ﴿ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾ یعنی ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کے لیے آسمانوں میں اور مقاماتِ عبادت میں ایک مخصوص جگہ نہ ہو جس سے وہ تجاوز نہیں کرتا، نہ اس سے آگے بڑھتا ہے۔ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے ترجمہ محمد بن خالد میں بہ سندِ خود تا عبد الرحمان بن العلاء بن سعد عن ابیہ روایت کیا ہے، یہ علاء ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے فتح مکہ کے روز بیعت کی تھی، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے ہم نشینوں سے فرمایا کہ آسمان چرچرایا اور اسے لائق ہے کہ چرچرائے، اس میں ایک قدم کی بھی جگہ ایسی نہیں ہے جس پر کوئی فرشتہ سجدے یا رکوع کی حالت میں نہ ہو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿164﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿165﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴾۔[1] (وكذا أخرجه محمد بن نصر كما في فتح البيان)

امام ضحاک رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ مسروق رحمہ اللہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آسمانِ دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے مگر اس پر کوئی فرشتہ یا سجدے کی حالت میں ہے یا قیام کی حالت میں۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾ امام اعمش رحمہ اللہ نے عن ابی اسحاق عن مسروق عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ بے شک آسمانوں میں ایک آسمان بھی ایسا نہیں ہے کہ اس میں ایک بالشت کی جگہ ہو مگر اس پر کسی فرشتے کی پیشانی ہے یا اس کے دو قدم ہیں۔ پھر عبداللہ رضی اللہ عنہ نے مذکورہ آیت پڑھی۔ اسی طرح سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مرد اور عورتیں اکٹھے نماز پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾ پس مرد آگے بڑھے اور عورتیں پچھلی صف پر ہو گئیں۔

[1] الدر المنثور (١٣٥/٧) تفسیر ابن کثیر (٣٢،٣١/٣) فتح البیان (٤٣٢/١١) اس کی سند میں "محمد بن خالد دمشقی" ضعیف راوی ہے۔ البتہ آیت کے ذکر کے بغیر یہ روایت صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الصحيحة، رقم الحديث: ١٧٢٢)

﴿ وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم طاعت میں صفیں باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں جس طرح کہ ﴿ وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ﴾ [الصافات:١] کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ امام ابونضرہ رحمہ اللہ نے کہا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جس وقت نماز کھڑی ہو جاتی تو اپنے چہرۂ مبارک سے لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ پھر فرماتے: "أَقِيمُوا صُفُوفَكُمْ وَاسْتَوُوا قِيَامًا يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمْ هُدَى الْمَلَائِكَةِ" پھر فرماتے: "﴿ وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴾ تَقَدَّمْ يَا فُلَانُ، تَأَخَّرْ يَا فُلَانُ" پھر آگے بڑھتے اور تکبیر کہتے۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم وابن جریر) صحیح مسلم میں سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم لوگوں پر تین باتوں کے ساتھ فضیلت دیے گئے: ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح کی گئیں اور ہمارے لیے زمین مسجد کر دی گئی اور اس کی مٹی پاک کر دی گئی۔[2] (الحدیث)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴾ یعنی ہم صف باندھتے ہیں، پھر رب کی تسبیح کرتے ہیں، اس کی تمجید کرتے ہیں اور اس کی تقدیس کرتے ہیں اور نقائص سے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، چنانچہ ہم اس کے غلام ہیں، اس کی طرف محتاج ہیں اور اس کے سامنے ذلیل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾ فرشتے ہیں اور ﴿ وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴾ فرشتے ہیں ﴿ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴾ فرشتے ہیں جو اللہ عزوجل کی تسبیح کرتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴾ سے مراد "مُصَلُّوْنَ" ہے۔ ثابت رہتے ہیں عبادت کے ساتھ اپنے مکان میں،[3] جیسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿26﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿27﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿28﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبیاء: ٢٦۔ ٢٩] "(مشرک لوگ) کہتے ہیں کہ رحمان اولاد والا ہے (غلط ہے) اس کی ذات پاک ہے، بلکہ وہ سب اس کے باعزت بندے ہیں۔ کسی بات میں اللہ پر پیش دستی نہیں کرتے، بلکہ اس کے فرمان پر کاربند ہیں۔ وہ ان کے آگے پیچھے کے تمام امور سے واقف ہے، وہ کسی کی بھی سفارش نہیں کرتے، بجز اُن کے جن سے اللہ خوش ہو، وہ تو ہیبتِ الٰہی سے لرزاں و ترساں ہیں۔ ان میں سے اگر کوئی بھی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں لائق عبادت ہوں تو ہم اسے دوزخ کی سزا دیں، ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔"

کفارِ قریش کا کسی کتابِ نصیحت کے ملنے کی تمنا کرنا:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿167﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ یعنی اے محمد! پہلے وہ یہ تمنا کرتے تھے کہ تو اُن کے پاس آئے، کاش! ان کے پاس وہ شخص ہوتا جو اُن کو اللہ کا حکم یاد دلاتا اور ان سے اگلی

[1] تفسیر الطبري (١٢٧/٢١، ١٢٨) تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢٣٢/١٠، ٣٢٣٣)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٢٢) [3] تفسیر الطبري (١٢٨/٢١)

اُمتوں کے حالات کا ذکر کرتا اور ان کے پاس کتاب لاتا، جیسے اللہ جل جلالہ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴾ [الفاطر: ٤٢] ''اور ان کفار نے بڑی زور دار قسم کھائی تھی کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آئے تو وہ ہر ایک امت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں۔ پھر جب ان کے پاس ایک پیغمبر آ پہنچے تو بس ان کی نفرت ہی میں اضافہ ہوا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِی الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٥٦۔ ١٥٧] ''کہیں تم لوگ یوں نہ کہو کہ کتاب تو صرف ہم سے پہلے جو دو فرقے تھے ان پر نازل ہوئی تھی اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے محض بے خبر تھے۔ یا یوں نہ کہو کہ اگر ہم پر کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان سے بھی زیادہ راہِ راست پر ہوتے۔ سو اب تمھارے پاس تمھارے رب کے پاس سے ایک کتاب واضح اور راہنمائی کا ذریعہ اور رحمت آ چکی ہے۔ اب اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو ہماری ان آیتوں کو جھوٹا بتائے اور ان سے روکے۔ ہم جلد ہی ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں سے روکتے ہیں، ان کے اس روکنے کے سبب سخت سزا دیں گے۔'' اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾ یہ ایک وعیدِ اکید اور تہدید شدید ہے اس بات پر کہ انھوں نے اپنے رب کا انکار کیا اور اس کے رسول ﷺ کو جھٹلایا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ کلام میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''وَمَا مِنَّا أَحَدٌ'' یا ''وَمَا مِنَّا مَلَكٌ إِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ فِيْ عِبَادَةِ اللّٰهِ تعالىٰ''، یعنی نہیں ہے ہم میں سے کوئی، یا نہیں ہے ہم میں سے کوئی فرشتہ مگر اس کے لیے اللہ کی عبادت کے لیے ایک جگہ مقرر ہے۔ کسی نے کہا کہ تقدیر یہ ہے: ''وَمَا مِنَّا إِلَّا مَنْ لَّهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ'' یعنی نہیں ہے ہم میں سے مگر وہ شخص کہ اس کے لیے ایک مقام معلوم ہے۔[2] بصریوں نے پہلی تقدیر کو اور کوفیوں نے دوسری تقدیر کو ترجیح دی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ قول فرشتوں کا ہے اور اس میں کلام مضمر ہے معنی یہ ہیں: نہیں ہے ہم میں سے کوئی فرشتہ مگر اس کے لیے ایک مقام معلوم ہے کہ اس میں اپنے رب کی عبادت کرتا ہے، اس سے تجاوز نہیں کرتا۔ کسی نے کہا ہے کہ قربت اور مشاہدے کے لیے مقام معلوم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مختلف مقامات پر عبادت کرتا ہے، جیسے: خوف، رجائے محبت اور رضا۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت نبی اکرم ﷺ

[1] تفسیر ابن کثیر (٣٦/٤، ٣٢)
[2] معاني القرآن (٣١٦/٤)

اور مومنین کے قول سے ہے، یعنی نہیں ہے ہم میں سے کوئی مگر اس کے لیے روزِ قیامت میں جنت میں، یا اللہ عزوجل کے روبرو ایک مقام معلوم ہے۔ اس قول میں بُعد ہے۔

پھر فرشتوں نے کہا: ﴿ وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴾ یعنی ہم صف باندھنے والے ہیں طاعت کے مقامات میں، یا عرشِ معلی کے گرد اس حال میں کہ مومنوں کے لیے دعا کرنے والے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ فرشتے ہیں جنھوں نے اپنے قدموں کی صف باندھی ہے، یعنی عبادت میں اپنے قدموں پر کھڑے ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمان میں فرشتوں کی صفیں زمین میں دنیا والوں کی صفوں کی طرح ہیں،[1] یا یہ معنی ہیں کہ ہم نماز میں اس کے لیے صف باندھنے والے ہیں۔ یہ معنی قولِ ثانی کی بنا پر ہیں کہ وہ مومنین ہیں، لیکن قولِ اول زیادہ ظاہر ہے۔ پھر کہا: ﴿ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک کے لیے پاکی بیان کرنے والے اور تقدیس کرنے والے ہیں اس شے سے جس کی مشرکوں نے اس کی طرف نسبت کی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "مُسَبِّحُوْنَ" سے مراد "مُصَلُّوْنَ" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد مکمل طور پر تسبیح کرنا ہے زبان کے ساتھ اور نماز کے ساتھ۔ مقصود یہ ہے کہ یہ صفات ملائکہ کی صفات ہیں۔ وہ ویسے نہیں ہیں جیسے کفار نے ان کا وصف کیا ہے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک میں وہ شے دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ شے سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے: « إِنَّ السَّمَاءَ أَطَّتْ وَحُقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ » یعنی آسمان چرچرایا اور وہ اسی لائق ہے کہ چرچرائے، اس میں چار انگلی کے برابر بھی جگہ نہیں ہے، مگر حال یہ ہے کہ اس پر فرشتہ اپنی پیشانی رکھنے والا ہے اور اللہ کے لیے سجدہ کرنے والا ہے۔[2] (أخرجه الترمذي و حسنه و ابن جرير و ابن مردويه) کہا ہے: "أَطِيطٌ" پالانوں کی آوازوں کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اونٹوں کی آواز اور چلانے کو کہتے ہیں۔ صحیح وغیرہ میں ثابت ہوا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ ایسے صف باندھیں جیسے فرشتے اپنے رب کے پاس صفیں باندھتے ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ فرشتے اپنے رب کے پاس کس طرح صف باندھتے ہیں؟ فرمایا کہ اگلی صفوں کو قائم کرتے ہیں اور صف میں خوب مل کر کھڑے ہوتے ہیں، اس میں کوئی دراڑ نہیں چھوڑتے۔[3] امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مقاتل نے کہا ہے کہ یہ تین آیتیں نازل ہوئیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک تھے تو جبرائیل علیہ السلام پیچھے ہٹ گئے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس جگہ مجھ سے جدا ہوتا ہے؟ تو جبرائیل علیہ السلام بولے: میں اپنی جگہ سے آگے بڑھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا قول بیان کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ... اِلٰى اٰخِرِهَا ﴾۔[4] اسی معلوم کو سعدی شیرازی نے ادا کیا ہے:

---

[1] تفسير البغوي (٦٤/٧) [2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣١٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٤٤٩)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣٠) [4] تفسير القرطبي (١٣٧/١٥)

اگر یک سر موئے برتر پرم فروغ تجلی بسوزد پرم

[اگر میں بال برابر بھی اس سے اوپر پرواز کروں گا تو تجلی کا فروغ میرے پر جلا کر رکھ دے گا]

پھر اللہ پاک نے مشرکین کے اقوال کی خبر دینے کی طرف رجوع کیا۔ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ۝ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴾۔ کلمۂ ''اِنْ'' مخففہ ہے مثقلہ سے اور ضمیر شان کی محذوف ہے اور حرفِ لام اس کے اور نافیہ کے درمیان فرق کرنے والا ہے، یعنی بے شک شان یہ ہے کہ کفارِ عرب کو محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے جب جہالت اور نادانی کی عار دلائی جاتی تھی تو یوں کہتے تھے کہ اگر ہمارے پاس اگلوں کی کتابوں کی طرح کوئی کتاب ہوتی، جیسے: تورات اور انجیل تو ہم اللہ کے مخلص بندے ہوتے، یعنی ہم اس کے لیے اپنی عبادت کو خالص کرتے اور اس کے منکر نہ ہوتے جیسے وہ منکر ہوئے۔ پھر ان کے پاس وہ ذکر آیا جو سید الاذکار ہے اور وہ کتاب آئی جو سب کتابوں سے زیادہ معجز ہے۔

﴿ فَكَفَرُوْا بِهٖ ﴾ تو اس کا انکار کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب اہلِ مکہ کے مشرکوں کے پاس ذکرِ اولین اور علمِ آخرین آیا تو کتاب کے منکر ہو گئے۔[1] حرفِ ''فاء'' فصیحہ ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ کلام میں محذوف مقدر ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: ''فَجَاءَهُمْ مُحَمَّدٌ ﷺ بِالذِّكْرِ فَكَفَرُوْا بِهٖ''[2] یعنی پھر محمد ﷺ ان کے پاس ذکر لے کر آئے تو انھوں نے اس کا انکار کیا۔ یہ بات ان سے تعجب کے طور پر ہے۔ اس کی نظیر سورۃ الفاطر میں یہ آیت ہے: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۙ ﴾ [الفاطر: ٤٢] ''اور ان کفار نے بڑی زور دار قسم کھائی تھی کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آئے تو وہ ہر ایک امت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں، پھر جب ان کے پاس ایک پیغمبر آ پہنچے تو بس ان کی نفرت ہی میں اضافہ ہوا۔'' اس آیت میں ﴿ نَذِيْرٌ ﴾ سے مراد رسول ہے اور اس جگہ بھی کہا ہے کہ ﴿ ذِكْرًا ﴾ سے مراد رسول ہے۔ ﴿ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اب وہ عن قریب جان لیں گے اپنے کفر اور تکذیب کا انجام اور اس انتقام کو جو اُن پر نازل ہوگا۔ اس میں ان کے لیے سخت دھمکی ہے۔[3]

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝١٧١ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝١٧٢ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝١٧٣ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝١٧٤ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ۝١٧٥ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝١٧٦ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝١٧٧

[1] تفسیر الطبري (٢١/١٣٠) [2] فتح القدير (٤/٥٤٧) [3] فتح البيان (١١/٤٣١-٤٣٣)

وَ تَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّ اَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ سُبْحٰنَ
رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَ الْحَمْدُ
لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

اور درحقیقت ہمارا وعدہ پہلے ہی اپنے ان بندوں کے لیے صادر ہو چکا ہے جو رسول ہیں ﴿171﴾
کہ یقیناً انھی کی مدد کی جائے گی ﴿172﴾ اور بلاشبہ ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا ﴿173﴾ تو ایک مدت
تک آپ ان سے منہ موڑ لیجیے ﴿174﴾ اور انھیں دیکھتے رہیے، پھر جلد ہی وہ بھی دیکھ لیں گے ﴿175﴾
کیا پھر وہ ہمارا عذاب جلدی مانگتے ہیں؟ ﴿176﴾ پھر جب وہ ان کے صحن میں نازل ہوگا تو ڈرائے
گئے لوگوں کی صبح بہت بری ہوگی ﴿177﴾ اور ان سے ایک مدت تک منہ موڑ لیجیے ﴿178﴾ اور (انھیں)
دیکھتے رہیے، جلد ہی وہ بھی دیکھ لیں گے ﴿179﴾ آپ کا رب، عزت کا مالک، ان باتوں سے پاک
ہے جو وہ (مشرک) بیان کرتے ہیں ﴿180﴾ اور تمام رسولوں پر سلام ہے ﴿181﴾ اور سب تعریفیں اللہ
رب العالمین ہی کے لیے ہیں ﴿182﴾

انبیاء سے نصرت کا وعدہ اور قریش سے اعراض کا حکم:

ہمارا ہی لشکر غالب رہے گا، یہ فتح مکہ کے دن ہوا۔ آپ دیکھتے رہیے یہ بھی عن قریب دیکھ لیں گے، شاید پہلا وعدہ دنیا کے عذاب کا اور دوسرا آخرت کا۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کتابِ اول میں یہ امر پہلے ہو چکا ہے کہ دنیا اور آخرت میں نیک انجام رسولوں اور ان کے اتباع کے لیے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [المجادلة: ۲۱] ''اللہ تعالیٰ لکھ چکا ہے کہ بے شک میں اور میرے پیغمبر غالب رہیں گے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ زور آور اور غالب ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [المؤمن: ۵۱] ''یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔'' اسی لیے اللہ عزوجل نے یوں فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ یعنی دنیا اور آخرت میں رسول ہی منصور و مظفر ہوتے ہیں، جیسا کہ اس کا بیان گزر چکا ہے کہ ان کی قوم میں سے جس نے ان کی تکذیب اور مخالفت کی اس پر ان کی نصرت ہوئی۔ اللہ نے کافروں کو کیسا ہلاک کیا اور اپنے مومن بندوں کو نجات دی۔

﴿ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ نیک انجام خالص اللہ کے لشکر کے لیے ہوتا ہے۔ ﴿ فَتَوَلَّ

﴿عَنۡهُمۡ حَتّٰى حِيۡنٍ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ لوگ جو تجھے ایذا دیتے ہیں تو اس پر صبر کر اور ایک وقت تک انتظار کر جس کی مدت مقرر کی گئی ہے، اس لیے کہ عن قریب ہم تیرے لیے نیک انجام اور مدد اور کامیابی عطا کر دیں گے۔ اسی لیے بعض نے کہا ہے کہ روزِ بدر تک اس کی تاخیر کی۔ اس کے بعد کی آیت بھی اسی معنی میں ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿وَّاَبۡصِرۡهُمۡ فَسَوۡفَ يُبۡصِرُوۡنَ﴾ یعنی تو ان کو مہلت دے اور انتظار کر، پھر دیکھ کہ تیری مخالفت اور تکذیب کے سبب سے ان پر کیا کچھ عذاب اور سزا نازل ہوگی۔ اسی لیے دھمکی اور وعید کے طور پر یوں فرمایا: ﴿فَسَوۡفَ يُبۡصِرُوۡنَ﴾ یعنی وہ عن قریب اپنے کیے کا بدلہ دیکھ لیں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿اَفَبِعَذَابِنَا يَسۡتَعۡجِلُوۡنَ﴾ یعنی وہ جو عذاب کو جلد مانگتے ہیں تو اس لیے کہ تجھے جھٹلاتے ہیں اور انکار کرتے ہیں، تا کہ اللہ تعالیٰ ان پر خفا ہو، اس کفر اور تکذیب کے سبب سے اور جلدی سے ان پر عذاب بھیجے۔ اس کے باوجود بھی اپنے کفر اور عناد کے ذریعے سے عذاب اور عقوبت کی جلدی چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمۡ فَسَآءَ صَبَاحُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ﴾ یعنی پھر جس وقت ان کی جگہ میں عذاب نازل ہوگا تو وہ دن اُن کی ہلاکت کی وجہ سے برا دن ہوگا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿بِسَاحَتِهِمۡ﴾ سے مراد ان کا دار ہے، یعنی گھر یا جگہ ہے۔ ﴿فَسَآءَ صَبَاحُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ﴾ "أَيْ: فَبِئْسَ مَا يُصْبِحُوْنَ"[1] یعنی ان کی صبح بری صبح ہے۔ اسی لیے صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر میں صبح کو پہنچے۔ پھر جب خیبر والے اپنی فؤس اور مساحی لے کر نکلے (فؤس: جمع فاس بہ معنی تبر و مساحی: جمع "مسحاة وهي المجرفة من الحديد وميمه زائدة من السحو وهو الكشف والإزالة"۔ مسحاۃ کی فارسی بیل آہنین وکلند ہے، یعنی کدالی وغیرہ جس سے کھودتے ہیں) اور لشکر دیکھا تو وہ لوٹ گئے اور کہتے جاتے تھے: "مُحَمَّدٌ وَاللّٰهِ مُحَمَّدٌ وَالْخَمِيْسُ" یعنی اللہ کی قسم! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور لشکر آ گیا۔ پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَللّٰهُ أَكْبَرُ خَرِبَتْ خَيْبَرُ إِنَّا إِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ»[2] (ورواه البخاري من حديث مالك عن حميد عن أنس رضی اللہ عنہ) "اللہ بزرگ و برتر ہے، خیبر تباہ و برباد ہو گیا، بلاشبہہ ہم جب کسی قوم کے صحن (علاقے) میں اترتے ہیں تو ڈرائے گئے لوگوں کے لیے بُرا دن ہوتا ہے۔" امام احمد رحمہ اللہ نے عن انس بن مالک عن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا ہے کہ جب صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر میں آئے اور لوگوں نے اپنے مساحی لیے اور صبح کو اپنی کھیتیوں اور زمینوں کی طرف گئے۔ پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو پیٹھ پھیرتے ہوئے پیچھے ہٹے۔ پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّا إِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ... الخ»[3] (لم يخرجوه من هذا الوجه وهو صحيح على شرط الشيخين)۔ قولہ تعالیٰ: ﴿وَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ﴾ تاکید ہے ما تقدم کی۔ واللّٰه سبحانه أعلم.

---

(1) تفسير الطبري (١٣٣/٢١) (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٦٥)

(3) مسند أحمد (٢٨/٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال أحمد رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٢١٧/٦)

اللہ رب العزت کی تسبیح اور رسولوں پر سلام:

قولہ تعالیٰ: ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے نفسِ کریم کی پاکی و تقدیس اور براءت فرماتا ہے ان باتوں سے جن کو ظالم اور جھٹلانے والے اور حد سے بڑھنے والے لوگ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے بالکل مبرا اور پاک ہے اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ یعنی تیرا رب پاک ہے جو صاحب ہے عزت کا، وہ عزت جس کا قصد نہیں کیا جاتا اور وہ ان سرکش اور افتراء کرنے والے لوگوں کی باتوں سے پاک اور بری ہے۔ ﴿ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ یعنی رسولوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا سلام ہے، اس لیے کہ انھوں نے اپنے رب کے حق میں جو بات کہی ہے، وہ سالم و صحیح اور حق ہے۔

﴿ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ یعنی اس کے لیے دنیا اور آخرت میں ہر حال میں حمد ہے، چوں کہ تسبیح میں بدلالتِ مطابقی ہر نقص سے پاکیزگی اور براءت شامل تھی اور اس سے کمال کی پاکیزگی اور براءت لازم آتی تھی جس طرح کہ حمد بدلالتِ مطابقی صفاتِ کمال پر دال ہے اور ہر نقص سے پاکیزگی کو لازم ہے۔ اسی لیے یہاں ان دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر فرمایا اور قرآنِ مجید میں اور بھی بہت جگہوں پر اسی طرح ذکر فرمایا۔ یہاں اس طرح فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ امام سعید بن ابی عروبہ رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس وقت تم مجھ پر سلام بھیجو تو مرسلین پر سلام بھیجو، کیوں کہ میں مرسلین میں سے ایک رسول ہوں۔ (هكذا رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم من حديث سعيد عنه كذلك) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود اس کو مسند کیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے یوں روایت کیا ہے: کہا ہم کو حدیث کی انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «إِذَ سَلَّمْتُمْ عَلَيَّ فَسَلِّمُوْا عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ»[1]

حافظ ابویعلیٰ رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے راوی ہیں کہ آپ ﷺ جب نماز سے سلام پھیرنے کا ارادہ کرتے تو فرماتے: ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ پھر سلام پھیرتے۔[2] اس کی اسناد ضعیف ہیں۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے شعبی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو یہ بات پسند ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنا اجر بھرپور پیمانے سے ماپ کرلے تو اسے چاہیے کہ جب اپنی مجلس سے اُٹھنے کا ارادہ کرے تو یہ کہے: ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾[3] (وروي من وجه آخر متصل موقوف على علي رضي الله عنه)

---

[1] تفسير الطبري (١٣٤/٢١) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٣٤/١٠)

[2] مسند أبي يعلىٰ (٣٦٣/٢) اس کی سند میں "عمارہ بن جوین ابو ہارون" سخت ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٣٤/١٠) یہ روایت مرسل ہے۔

ابو محمد بغوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بہ سندِ خود علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ جو شخص پسند کرے کہ قیامت کے دن اپنا اجر پیمانہ بھر کر لے تو چاہیے کہ اپنی مجلس میں اس کا آخری کلام یہ ہو: ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾[1] طبرانی نے عن عبد اللہ بن زید بن ارقم عن ابیہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے ہر نماز کے بعد تین بار ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کہا تو اس نے ایک جریب اوفیٰ ماپ کر اجر لے لیا۔[2] ("جريب من الطعام ومن الأرض مقدار معلوم" "اوفی" بہ معنی کامل تر) کفارۂ مجلس میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں: « سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ » حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے کفارۂ مجلس سے متعلق ایک مستقل جز (کتاب) کو ترتیب دیا ہے، اسے یہاں پر لکھا جائے گا۔ إن شاء اللہ تعالیٰ آخر تفسير سورة والصافات۔[3] واللہ أعلم

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جملہ ﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ مستانفہ ہے وعید کی تقریر و تثبیت کرتا ہے۔ اس کو قسم کے ساتھ اس لیے شروع کیا ہے کہ اس کے مضمون کی تحقیق کے ساتھ انتہا درجے کا اعتنا (اہتمام) ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَبِاللّٰهِ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ" یعنی اللہ کی قسم! البتہ ہمارا کلمہ ہمارے بندوں کے لیے، جو رسول ہیں، سابق ہو چکا ہے۔ کلمے سے مراد کفار پر وہ نصرت و کامیابی ہے جس کا رسولوں سے وعدہ کیا ہے۔ مقاتل نے کہا: کلمے سے مراد یہ آیت ہے: ﴿ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ﴾ [المجادلة: ٢١] "بے شک میں اور میرے پیغمبر غالب رہیں گے۔" امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارا کلمہ ان کی سعادت کے لیے سابق ہو چکا ہے،[4] یعنی ہم حکم دے چکے ہیں کہ بہرہ مندی اور کامیابی انھیں ہوگی۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس کلمے کی تفسیر اس جملے سے کی جائے جو یہاں مذکور ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴾ چناں چہ یہ وہی کلمہ ہے جس کا ذکر سابقاً ہوا ہے اور یہ جملہ اس کی تفسیر ہے۔

رہی یہ بات کہ اس کا نام کلمہ رکھا، حالاں کہ یہ تو کئی کلمے ہیں؟ تو اس کی یہ وجہ ہے کہ جب وہ ایک معنی میں منتظم ہوئے تو ایک کلمے کے حکم میں ہو گئے۔ چناں چہ یہ جزء کے کل پر اطلاق کی شکل ہے۔ "جُنْدٌ" سے مراد اللہ پاک کا گروہ ہے۔ یہ گروہ رسول اور ان کے پیروکار ہیں۔ "جُنْدٌ" انصار اور اعوان کے معنی میں ہے۔ اس کی جمع

---

① تفسير البغوي (٦٦/٧)

② المعجم الكبير (١١/٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه عبدالمنعم بن بشير وهو ضعيف جدا" (مجمع الزوائد: ١٢٩/١٠)

③ تفسير ابن كثير (٣٣/٤، ٣٤) ④ فتح القدير (٥٤٧/٤)

اجناد وجنود آتی ہے اور واحد کو جندی کہتے ہیں، چنانچہ یاء کا حرف وحدت کے لیے ہے، جیسے روم اور رومی ہے۔ اور "جَنَد" بہ فتحتین ملکِ یمن میں ایک شہر ہے۔ امام شیبانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ میں جمع کا اسناد "جُنْد" کی طرف اس لیے کیا کہ آیت کا سر ہے،[1] یہ نصرت اور غلبہ کا وعدہ جو رسولوں کے لیے ہے وہی اصل ہے۔ اس سے یہ بات مانع نہیں کہ بعض جگہ وہ شکست خوردہ ہوئے اور ان پر کفار کا غلبہ ہو گیا، اس لیے کہ غالباً ہر جگہ دشمنوں پر وہی غالب ومنصور ہوئے۔ چنانچہ یہ کلام مخرجِ غالب میں خارج ہوا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات ہے کہ ہر حال اور ہر جگہ اچھا انجام ان ہی کے واسطے ہے۔ کما قال سبحانہ: ﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾۔ یعنی نیک انجام خاص طور پر متقی لوگوں کے لیے ہے، ان کے فردِ کامل یہی انبیاء علیہم السلام ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ ان کے معاملے کا قاعدہ اور بنیاد کامیابی ونصرت ہے، اگرچہ اس کی پیچیدگیوں میں کچھ آزمایش ومحنت بھی شامل ہو گئی۔ چنانچہ اعتبار غالب کا ہوتا ہے اور اکثر کو کل کا حکم دیا جاتا ہے اور قلیل نہ ہونے کی طرح ہوتا ہے۔ یا ان کی مراد وعدۂ علو سے یہ ہے کہ وہ دشمنوں پر حجت قائم کرنے میں اور جنگ میں دنیا کے اندر برتر ہوں گے اور آخرت میں ان کی سربلندی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: "إِنْ لَّمْ يُنْصَرُوْا فِي الدُّنْيَا نُصِرُوْا فِي الْآخِرَةِ"[2] یعنی اگر وہ دنیا میں منصور نہ ہوں تو آخرت میں منصور ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ بالفرض اگر دنیا میں ان کو نصرت نہ ہوئی تو آخرت میں تو ضرور ہی نصرت ہو گی۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان سے اعراض کریں اور اُن سے جو جہالتیں اور ضلالتیں صادر ہوتی ہیں، ان سے چشم پوشی کریں۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴾ یعنی تو اُن سے ایک مدت تک اعراض کر جو اللہ سبحانہ کے نزدیک معلوم ہے اور مقرر ہے۔ یہ وہی قتال سے باز رہنے کی مدت ہے۔ امام سدی اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا: یہاں تک کہ ہم تجھے قتال کا حکم دیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موت تک۔[3] کسی نے کہا ہے کہ روزِ بدر تک۔ کسی نے کہا ہے کہ روزِ فتح مکہ تک۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولین ذمے داری یہ تھی کہ تبلیغ کریں اور ڈرائیں۔ کفار کو مالوف کرنے کے لیے ان کی ایذا دہی پر صبر کریں۔ پھر ۲ ہجری میں جہاد کا حکم ہوا۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ آپ کے غزوات ستائیس ہیں، ان میں سے آٹھ میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی: بدر، احد، مصطلق، خندق، قریظہ، خیبر، حنین اور طائف۔

﴿ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی دیکھ ان کو جب ان پر قتل اور قید کے ساتھ عذاب نازل ہو گا۔ اب وہ عن قریب اس چیز کو دیکھ لیں گے جو کچھ ہم نے ان کے لیے تیار کر رکھی ہے، جبکہ ان کو دیکھنا کوئی نفع نہ دے گا۔ اس

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/١٣٩) [2] روح المعاني (٢٣/١٣٩) [3] فتح القدير (٤/٥٤٧)

جگہ کلمۂ ﴿ سَوْفَ ﴾ وعید کے لیے ہے تبعید کے لیے نہیں ہے، کیوں کہ یہ مقام تبعید کا مقام نہیں ہے جس طرح کہ تم "سَوُفَ أَنْتَقِمُ مِنْكَ" کہتے ہو، جب تم انتقام کے لیے تیار ہوتے ہو۔ (قاله الكرخي) اور اسی لیے اس معاملے کے قرب کی تعبیر ابصار کے ساتھ کی گئی ہے۔ گویا وہ اس کے روبرو حاضر ہے اور اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ خصوصاً جب یہ کہا جائے کہ امر جلدی کے لیے ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قیامت کے دن عذاب کو دیکھیں گے۔

پھر اللہ پاک نے ان کو تہدید کی۔ ارشاد فرمایا: ﴿ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴾ وہ لوگ اپنی فرطِ تکذیب سے یوں کہتے تھے: یہ عذاب کب ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دھمکی دے کر فرمایا، کیا ہمارے عذاب کی جلدی چاہتے ہیں، پھر جس وقت ان کے میدان میں ان کے لیے اللہ کا عذاب نازل ہوگا تو ان لوگوں کی صبح بری ہوگی جو عذاب کے ساتھ ڈرائے گئے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا عذاب قتل سے ہوا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ کا اُن کے میدان میں اترنا ہے۔ عذاب کی تشبیہ اس لشکر کے ساتھ دی جو اچانک ان پر آ گیا اور آ کر اُن کے میدان میں اونٹ بٹھا دیے اور وہ اپنے گھروں میں تھے۔ پس ﴿ نَزَلَ ﴾ میں ضمیر مستتر استعارہ بالکنایہ ہے اور نزول تخییل ہے۔ "سَاحَةٌ" گھر کا کھلا میدان ہے جو مکانوں سے خالی ہوتا ہے، اس کی جمع "سُوحٌ" آتی ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "نَزَلَ بِهِمُ" اور "نَزَلَ بِسَاحَتِهِمُ" برابر ہے۔ جمہور نے ﴿ نَزَلَ ﴾ بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے[2] اور ﴿ بِسَاحَتِهِمْ ﴾ جار و مجرور قائم مقام فاعل ہے۔ "سَاءَ" فعل ذم بہ معنی "بِئْسَ" ہے۔ "أَيُ: بِئْسَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ" اور مخصوص بالذم محذوف ہے: "أَيُ: صَبَاحُهُمُ"۔ صباح کا ذکر خاص کر کے اس لیے کیا کہ اس میں ان پر عذاب آتا تھا گو اور کسی وقت میں بھی واقع ہوا۔

بیان واضح یہ ہے کہ عذاب کے نزول کے وقت کے لیے صباح کا استعارہ کیا ہے صباحِ جیش سے جو شب خون مارنے والا ہے، چوں کہ ان میں صبح کے وقت ہجوم اور غارت گری بہ کثرت ہوئی ہے، اس لیے اس غارت کا نام صباح رکھ دیا، گو وہ اور وقت میں واقع ہوا۔ ظاہری طور پر مقتضا یہ تھا کہ "صَبَاحُهُمْ" ہوتا، کیوں کہ ان کا ذکر پہلے ہو گیا ہے تو ضمیر لانا کافی تھا، لیکن ضمیر کے بجائے ﴿ الْمُنْذَرِيْنَ ﴾ اسمِ ظاہر رکھا، تاکہ عذاب کی علت معلوم ہو جائے، یعنی ان پر عذاب اس لیے آیا کہ ان کو ڈرایا گیا، مگر انھوں نے نہ مانا تو عذاب نے ان کو آ لیا۔ کہا ہے کہ الف و لام عہدی ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ الف و لام جنسی ہے۔ اس لیے کہ افعالِ مدح و ذم شیوع کے مقتضی ہیں بہ سبب ابہام و تفصیل کے۔ چنانچہ یہ جائز نہیں ہے کہ اس طرح کہو: "بِئْسَ الرَّجُلُ هٰذَا وَنِعْمَ الرَّجُلُ هٰذَا" جب کہ کسی مردِ معین کا ارادہ کرو۔ تو اب یہ جائز نہیں ہے کہ الف و لام عہدی ہو۔

---

[1] معاني القرآن (٣١٧/٤) [2] فتح القدير (٥٤٧/٤)

پھر اللہ پاک نے وعدۂ عذاب کی تاکید کے لیے پہلے کہی ہوئی بات کو دہرایا اور تسلی پر تسلی فرمائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴾ یہاں ﴿ اَبْصِرْ ﴾ کا مفعول حذف کیا اور اول میں ذکر فرمایا۔ یا تو اس لیے کہ اول اس پر دال ہے تو اختصار کے لیے یہاں اس کو متروک کر دیا۔ یا تعمیم کے ارادے سے یہ بات بتانے کے لیے کہ ان کے طرح طرح کے عذابوں میں سے جس شے کو وہ دیکھے گا اس کا وصف بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جملے سے مراد احوالِ قیامت ہیں اور پہلے جملے سے مراد ان کا دنیا میں عذاب ہے۔ اس قول کی بنا پر باب تاکید سے نہ ہوگا، بلکہ تاسیس کی قبیل سے ٹھہرے گا۔ پھر اللہ پاک نے اپنی ذاتِ مقدس کو ان کی قبیح باتوں سے منزہ کیا جو اُن سے صادر ہوتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾

مراد اللہ پاک کی ہر اس شے سے پاکیزگی ہے جس کے ساتھ مشرک لوگ اس کا وصف کرتے ہیں ان باتوں میں سے جو اللہ پاک کی درگاہِ عالی جاہ کے لائق نہیں۔ ﴿ رَبِّ الْعِزَّةِ ﴾ بدل ہے ﴿ رَبِّكَ ﴾ سے۔ ''رَبِّ'' کی اضافت عزت کی طرف اس لیے کی ہے کہ وہ اس کے ساتھ مختص ہے۔ گویا ''ذِي الْعِزَّةِ'' کہا گیا جس طرح کہ ''صَاحِبُ صِدْقٍ'' بولتے ہیں: اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ مختص ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد عزتِ مخلوقہ ہے جو اس کی مخلوق کے درمیان ہوتی ہے۔ چنانچہ پہلے قول کی بنا پر تو اس سے قسم منعقد ہو جائے گی، کیوں کہ وہ اللہ کی صفتوں میں سے ایک صفت ہے۔ اس کے برعکس قولِ ثانی کی بنا پر قسم منعقد نہ ہوگی۔ (قالہ السمین) پھر اس شے کا ذکر کیا جو رسولوں کی عزت اور شرف پر دال ہے۔ ارشاد فرمایا: ﴿ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ یعنی سلام ہے ان لوگوں پر جن کو اس نے اپنے بندوں کی طرف بھیجا اور انھوں نے اس کی رسالتیں پہنچائیں۔ یہ سلام اس سلام سے ہے جو تحیت کے معنی میں ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کے لیے تمام مکروہات سے سلامتی اور امن ہے۔ اس صورت میں پہلے بعض رسولوں کو سلام کے ساتھ خاص کیا، پھر علی العلوم یہاں سب پر سلام بھیجا، اس لیے کہ ہر ایک کو الگ الگ سلام کرنے میں عبارت طویل ہو جاتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اللہ پاک نے اس میں ارشاد فرمایا ہے کہ بندے اس کی حمد کریں اس نعمت پر کہ اس نے اپنے فضل اور رحمت سے ان کی طرف رسول بھیجے جو ان کو خوش خبری سناتے تھے اور ڈراتے تھے اور ان کو اس بات کی تعلیم کی ہے کہ جب وہ ان پر انعام فرمائے تو وہ کیا کریں اور اس پر اس کی تعریف اور ثنا کس طرح کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اس پر حمد ہے کہ مشرکین ہلاک ہوئے اور رسولوں کو ان پر مظفر اور منصور کیا۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ اللہ پاک کی تعریف ہے ہر اس شے پر جس کے ساتھ اس نے اپنی ساری مخلوق پر انعام فرمایا ہے۔ جس طرح کہ محمود علیہ کا حذف اس بات کا فائدہ دیتا ہے، کیوں کہ اس کا حذف مشعرِ تعمیم ہے، چنانچہ علمِ معانی میں ثابت ہو چکا ہے۔ حمد ثنائے جمیل کو کہتے ہیں جو تعظیم کے لیے کی جائے۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جس وقت اپنی نماز میں سلام پھیرنے کا ارادہ کرتے تھے تو فرماتے: ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٨٠﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٨١﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾[1] (أخرجه سعيد بن منصور وابن أبي شيبة وعبد بن حميد وأبو يعلىٰ وابن مردويه)

طبرانی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز سے فارغ ہونا پہچانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کلمات کہتے تھے: ﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٨٠﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٨١﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾[2] (وأخرجه الخطيب نحوه من حديث أبي سعيد)۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ سورت اس شے کے ذکر پر مشتمل ہے جس کو مشرکوں نے اللہ پاک کے حق میں کہا اور اس کی طرف اس کی نسبت کی ان باتوں میں جن سے وہ پاک اور مبرا ہے اور اس محنت اور مشقت کے ذکر پر جو رسولوں نے مشرکوں کی طرف سے اٹھائی اور اس نصرت اور مدد پر جو بالآخر ان کو اپنے دشمنوں پر عطا کی گئی۔ چنانچہ اس کو ان کلمات کے ساتھ ختم کیا جو ان سب امور کے جامع ہیں، وہ یہی ہیں کہ اپنی ذات پاک کی پاکیزگی بیان کی، اس شے سے جس کے ساتھ مشرکوں نے اس کا وصف کیا اور مرسلین پر سلام بھیجا اور اس بات پر اپنی حمد وثنا کی کہ ان کے لیے نیک انجام متعین کیا۔[3]

الحمد للّٰہ و المنة کہ سورۃ الصافات کی تفسیر بتاریخ ۲ ماہ محرم الحرام ۱۳۱۳ ہجری، روز چہار شنبہ (منگل) آدھی رات کے وقت محلہ امیر گنج میں ضعیف البنیان اور اللہ کے عفو وغفران کے امیدوار خاکسار ذوالفقار کے ہاتھ پر تمام ہوئی۔ الٰہی، سیدی، مولائی تو اس کو قبول کر، سہو ونسیان سے تجاوز فرما۔ لا حول ولا قوة إلا بك، اللهم إني ضعيف فقوني في رضاك، ويسرلي تحرير تفسير بقية الكتب، واشرح لي صدري والإدراك التام والبيان الواضح حتى يفقهوا قولي فإنك ميسر لكل عسير و بالإجابة جدير، اللهم فصل وسلم وبارك على سيدنا وسيد المرسلين شفيع المذنبين محمد وعلىٰ آله الطيبين وصحبه الطاهرين، وأحسن عواقبنا في الأمور كلها وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب الآخرة، آمين، والحمد للّٰه أولا و آخرا وظاهراً وباطناً.

---

(1) اس کی تخریج زیر تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

(2) المعجم الكبير (۱۱/۱۱۵) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه محمد بن عبد الله بن عبيد الله بن عمير وهو متروك" (مجمع الزوائد: ۱۰/۱۲۹)

(3) تفسير النسفي (۴/۳۱) فتح البيان (۱۱/۴۳۴_۴۳۸)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ صٓ

اس سورت مبارک کی چھیاسی (۸۶) یا پچاسی (۸۵) یا اٹھاسی (۸۸) آیتیں ہیں اور مکی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورت صٓ مکے میں نازل ہوئی۔[2] (أخرجه ابن الضريس والنحاس وابن مردويه والبيهقي في الدلائل)۔ ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب ابو طالب بیمار ہوئے تو ان پر قریش کا ایک گروہ داخل ہوا جس میں ابو جہل تھا۔ ابو جہل نے کہا کہ تیرا بھتیجا ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے اور یہ کام کرتا ہے، وہ کام کرتا ہے، یہ کہتا ہے، وہ کہتا ہے سو کاش! تو کسی کو اس کی طرف بھیجتا اور اسے منع کر دیتا۔ چنانچہ ابو طالب نے نبی اکرم ﷺ کی طرف آدمی بھیجا، آپ ﷺ تشریف لائے، لوگوں کے پاس اندر آئے۔ ابو طالب کے پاس ایک شخص کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ابو جہل جلدی سے لپک کر اس جگہ پر بیٹھ گیا اس ڈر سے کہ کہیں آپ ابو طالب کے پاس بیٹھ کر اس کے زیادہ قریب نہ ہو جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے چچا کے قریب بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ پائی تو آپ ﷺ دروازے کے نزدیک بیٹھ گئے۔ پھر ابو طالب نے کہا: اے میرے بھتیجے! کیا حال ہے تیری قوم کا، وہ تیری شکایت کرتے ہیں اور یہ زعم کرتے ہیں کہ تو ان کے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے اور یہ کہتا ہے اور وہ کہتا ہے۔

راوی نے کہا کہ آپ ﷺ پر انھوں نے بہت باتیں بنائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کلام فرمایا: اے میرے چچا! میں تو ان کو ایک ایسے کلمے کی طرف بلاتا ہوں کہ اگر وہ اسے کہہ دیں تو اس کے سبب سے عرب ان کے مطیع ہو جائیں اور اس کی وجہ سے عجم لوگ انھیں جزیہ ادا کریں۔ آپ ﷺ کے کلمے اور قول کے سبب سے وہ لوگ گھبرائے۔ پھر قوم نے کہا: ایک کلمہ؟ ہاں قسم ہے تیرے باپ کی! ہم دس کلمے کہیں گے۔ کہا: پھر وہ کلمہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' چنانچہ وہ سب لوگ گھبراتے ہوئے اور اپنے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہنے لگے: ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ [صٓ: ٥] ''کیا اس نے اتنے سارے معبودوں کا ایک ہی معبود کر دیا۔ واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔'' اس پر ان کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿ صٓ

[1] تفسير القرطبي (١٤٢/١٥) [2] الدر المنثور (١٤٢/٧)

﴿وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ؀... بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ﴾ (أخرجه الترمذي وصححه والنسائي وأحمد وابن أبي شيبة وعبد بن حميد والحاكم وصححه وابن مردويه والبيهقي في الدلائل وابن جرير وابن المنذر)۔ [1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ؀۱ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ؀۲

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

صٓ، قسم ہے نصیحت والے قرآن کی ① (یہ تو لا ریب کتاب ہے) بلکہ جن لوگوں نے کفر کیا وہ تکبر اور مخالفت میں (پڑے) ہیں ②

رسولوں کو جھٹلانے والوں کا ذکر:

حروفِ مقطعات کے بارے میں تقریر سورۃ البقرہ میں ایسے طور پر گزر چکی ہے کہ اس جگہ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ﴾ کے یہ معنی ہیں: قسم ہے اس قرآن کی جو اس شے پر مشتمل ہے جس میں بندوں کے لیے ذکر ہے، یعنی ان کو سمجھانا ہے اور اُن کے لیے معاش اور معاد میں نفع ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ﴾ [الأنبياء: ١٠] ''یقیناً ہم نے تمھاری جانب کتاب نازل فرمائی ہے، جس میں تمھارے لیے ذکر ہے۔'' ''أَيْ: تَذْكِيرُكُمْ''، یعنی ذکر سے مراد سمجھانا، وعظ و نصیحت کرنا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید بن جبیر، اسماعیل بن ابی خالد، ابن عیینہ، ابو حصین، ابو صالح اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ذِی الذِّكْرِ﴾ بہ معنی ''ذِي الشَّرَفِ'' ہے۔[2] یعنی قسم ہے اس قرآن کی جو شان اور مرتبے والا ہے۔ ان دونوں قولوں میں کچھ تضاد نہیں، کیوں کہ قرآن ایک ایسی شرف والی کتاب ہے جو تذکیر (نصیحت) واعذار (عذر کو توڑنا) اور انذار (ڈرانا) پر مشتمل ہے۔ اس قسم کے جواب میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے تو یہ کہا کہ اس کا جواب: ﴿اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ﴾ [ص: ١٤] ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ﴾ [ص: ٦٤] ہے۔ ان دونوں کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ اس ثانی میں بڑا بُعد ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا جواب: ﴿بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ﴾ [ص: ٢] ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض اہلِ عربیت

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٣٢) مسند أحمد (٢٢٧/١) الدر المنثور (١٤٢/٧) ② تفسير الطبري (١٣٩/٢١، ١٤٠)

سے یہ بیان کیا ہے کہ اس کا جواب ﴿صٓ﴾ ہے۔ اس کو ان معنوں میں ٹھہرایا ہے: "صَدَقَ حَقٌّ وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ"[1] کسی نے کہا ہے کہ اس کا جواب وہ شے ہے جس میں پوری سورت کا سیاق شامل ہے۔ واللّٰہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ بے شک اس قرآن میں البتہ اس شخص کے لیے نصیحت ہے جو نصیحت پذیر ہو اور اس شخص کے لیے عبرت ہے جو عبرت حاصل کرے۔ کافروں نے جو اس سے نفع نہ لیا تو وہ اس لیے کہ وہ عزت میں ہیں، یعنی اس سے تکبر وحمیت کرتے ہیں اور شقاق میں ہیں، یعنی اس کے مخالف ہیں، دشمن ہیں اور اس سے علاحدہ ہیں۔[2] (كذا في ابن كثير) مطلب یہ ہے کہ تکبر وحمیت و ننگ و عار اور مخالفت کے مارے اس میں غور نہیں کرتے۔ اگر ان باتوں کو چھوڑ کر اس کو سمجھتے تو بے شک نفع پاتے، کیوں کہ وہ تو حقیقت میں محض ہدایت اور نفع ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جمہور نے صاد بہ سکونِ دال پڑھا ہے، جیسے سارے حروف تہجی جو سورتوں کے شروع مین واقع ہوئے ہیں، کیوں کہ وہ سب وقف کی بنا پر ساکنۃ الاواخر ہیں۔ اُبی رضی اللہ عنہ وغیرہ (یعنی حسن رحمہ اللہ، ابن ابی اسحاق، نصر بن عاصم، ابن ابی عبلہ اور ابن السماک) نے "صَادِ" بہ کسرِ دال بدون تنوین بہ سبب التقائے ساکنین پڑھا ہے۔ یہ وجہ کسر کی اقرب ہے۔ کسی نے کہا: کسر کی وجہ یہ ہے کہ "صَادٰی يُصَادِيْ إِذَا عَارَضَ" سے ماخوذ ہے: "أَيْ: صَادِ الْقُرْآنَ بِعَمَلِكَ" یعنی اپنے عمل کے ساتھ قرآن کا معارضہ و مقابلہ کر، چنانچہ اس پر عمل کر، (یعنی اس کے احکام کو بجا لا اور اس کے نواہی سے باز رہ)۔ اس کو امام نحاس رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اور کہا کہ حسن رحمہ اللہ نے اپنی اس قراءت کی تفسیر اسی قول کے ساتھ کی ہے اور ان سے مروی ہے کہ معنی یہ ہیں: "أُتْلُهُ وَتَعَرَّضْ لِقِرَاءَتِهِ" یعنی تو قرآن کو پڑھ اور اس کی قراءت کے لیے متعرض ہو۔ عیسیٰ بن عمر نے "صَادَ" بہ فتحِ دال پڑھا ہے۔ یہ فتحہ التقائے ساکنین کے سبب سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بنا بر اغراء منصوب ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں: "صَادَ مُحَمَّدٌ قُلُوْبَ الْخَلْقِ وَاسْتَمَالَهَا حَتّٰى آمَنُوْا بِهِ" یعنی محمد ﷺ نے خلق کے دلوں کو اور ان کو مائل کر لیا، یہاں تک کہ وہ ان پر ایمان لے آئے۔ یہ قراءت ابو عمرو سے بھی مروی ہے۔

نیز امام ابن ابی اسحاق رحمہ اللہ سے "صَادٍ" بہ کسر و تنوین مروی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حرف کی تشبیہ اس کے ساتھ دی ہے جو اصوات سے غیر متمکن ہے۔ ہارون اعور اور ابن سمیفع رحمہ اللہ نے "صَادُ" بہ ضم بغیر تنوین کے پڑھا ہے بنا بر بنا، جیسے: "مُنْذُ وَ حَيْثُ" جس طرح کہ "قٓ" اور "نٓ" میں اس کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔[3] امام سمین رحمہ اللہ نے اس سب کی توجیہ پر مفصل کلام کیا ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دال کا سکون جائز ہے بنا بر حکایت اور فتح بہ سبب

---

[1] تفسير الطبري (٢١/١٣٩-١٤١) [2] تفسير ابن كثير (٤/٣٥) [3] تفسير القرطبي (١٦/١٤٢، ١٤٣)

غیر منصرف ہونے کے بوجہ علیت اور تانیث کے بایں اعتبار کہ یہ سورت کا اسم علم ہے اور جر مع تنوین بایں نظر کہ سورتِ قرآن ہے، یعنی چوں کہ قرآن، کتاب اور تنزیل منصرف ہیں اور سورت بھی یہی اشیاء ہیں، اس لیے اس کو منصرف کیا۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سورت کو سورت داود علیہ السلام بھی کہتے ہیں،[1] یعنی اس لیے کہ اس میں ان کا قصہ مذکور ہے۔ ﴿صٓ﴾ کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "صَدَقَ اللّٰہُ" امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا: "صَدَقَ مُحَمَّدٌ ﷺ" امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: ﴿صٓ﴾ دو نفخوں کے درمیان ایک دریا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے مردوں کو زندہ کرے گا۔ امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿صٓ﴾ مفتاح اسم اللہ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسمائے الٰہیہ سے ایک اسم ہے۔ ان سے مروی دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اسمائے رحمٰن سے ایک اسم ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ فاتحۂ سورت ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿صٓ﴾ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ﴿صٓ﴾ اس قبیل سے ہے جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ حق یہی قول ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ کے شروع میں ہم اس کو بیان کر آئے ہیں۔ کہا ہے کہ ﴿صٓ﴾ اسمِ حرف کا بطور مسرود بر طرز تعدید یا سورت کا اسم ہے، یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یا منصوب ہے باضمار "اُذْكُرْ" یا "اِقْرَأْ"۔

﴿وَالْقُرْاٰنِ﴾ میں حرفِ واؤ قسم کی واؤ ہے۔ قرآن شریف کی قسم کھانے میں اس کی قدر و علوِ محل و شرف کے بارے میں آگاہ کرنا ہے۔ ﴿ذِی الذِّكْرِ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس ذکر پر مشتمل ہے جس میں ہر شے کا بیان ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ذِي الْبَیَانِ"۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "ذِيْ الشَّرَفِ"۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ذِيْ الشَّرَفِ وَالْعَظَمَةِ"، جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ﴾ [الأنبياء: ١٠] "أَيْ شَرَفُكُمْ" یا بہ معنی "ذِيْ الشُّهْرَةِ" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "ذِيْ الْمَوْعِظَةِ"۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں اس شے کا ذکر ہے جس کی طرف امرِ دین میں حاجت ہوتی ہے۔ کسی نے کہا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کا ذکر ہے اور اس کی تمجید ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں عقائد اور شریعتوں اور مواعید کا ذکر ہے۔ اس قسم کے جواب میں اختلاف ہے۔ امام زجاج، کسائی اور کوفیوں نے سوائے فراء رحمہ اللہ کے کہا ہے کہ جواب ﴿اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ﴾ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم اس کو مستقیم نہیں پاتے ہیں، اس لیے کہ ﴿وَالْقُرْاٰنِ﴾ سے یہ بہت متاخر ہے۔ امام فراء اور ثعلب رحمہما اللہ نے اس کو ترجیح دی ہے کہ ﴿كَمْ اَهْلَكْنَا﴾ کا جواب ہے۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ﴾ جواب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جواب ﴿صٓ﴾ ہے۔ اس لیے کہ اس کے معنی حق ہیں۔ چنانچہ یہ ﴿وَالْقُرْاٰنِ﴾ کا جواب ہے، جیسے تم کہتے ہو: "حَقًّا وَاللّٰهِ"، یعنی "وَجَبَ وَاللّٰهِ"۔ اس قول کو امام ابن انباری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ امام ثعلب اور فراء رحمہما اللہ سے بھی یہ مروی ہے کہ اس قول کی بنا اس پر ہے کہ قسم کا جواب مقدم کرنا جائز ہے، حالاں کہ یہ قول ضعیف ہے۔ کسی نے کہا کہ

[1] تفسير الخازن (٤٠/٦) [2] تفسير القرطبي (١٤٣/١٥) فتح القدير (٥٥٢/٤) [3] الدر المنثور (١٤٤/٧)

جواب محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ لَتُبْعَثُنَّ" اور مثل اس کے۔[1] امام حوفی رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "لَقَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ" اور مثل اس کے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "إِنَّهُ لَمُعْجِزٌ" ہے۔[2] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ" ہے۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "مَا الْأَمْرُ كَمَا يَزْعُمُ الْكُفَّارُ مِنْ تَعَدُّدِ الْآلِهَةِ"[3] یعنی بات ویسی نہیں جیسی کفار خیال کرتے ہیں کہ متعدد معبود ہیں، حذفِ جواب کا قائل ہونا زیادہ مناسب ہے۔ کسی نے کہا کہ مقسم بہ ﴿صٓ﴾ ہے۔ اس قول کی بنا پر ﴿وَالْقُرْاٰنِ﴾ میں حرفِ واو ﴿صٓ﴾ پر عطف کے لیے ہوگا۔ چوں کہ قرآن کی قسم کھانا اس کے صدق پر دال تھا اور اس بات پر کہ وہ حق ہے اور شک وشبہہ کا محل نہیں ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ﴾ چنانچہ اس سے اضراب کیا اور گویا یوں فرمایا کہ اس میں قطعاً کسی طرح کا شک نہیں ہے اور مشرکوں کا اس کو قبول نہ کرنا اس لیے نہیں ہے کہ اس میں کچھ شک ہے، بلکہ وہ حق کے قبول کرنے میں تکبر اور تجبر میں ہیں اور باز رہنے والے ہیں، بلکہ حق کو نہ ماننے کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی سوائے محض حمیت اور جھگڑنے اور آبائی تقلید کے۔

عرب کے نزدیک ﴿عِزَّةٍ﴾ قہر وغلبہ کے معنی میں ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "مَنْ عَزَّ بَزَّ" یعنی جو شخص غالب ہوا اس نے مقتول کا لباس، ہتھیار اور سامان لیا۔ اسی معنی سے یہ آیت ہے: ﴿وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ﴾ [صٓ: ۲۳] "اور وہ مجھ پر بات میں بڑی سختی برتتا ہے۔" یعنی بات کرنے میں وہ مجھ پر غالب ہوگیا ہے۔ ﴿شِقَاقٍ﴾ ماخوذ ہے "شَقٌّ" سے، یعنی مخالفت وعداوت۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ ﴿عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ﴾ کو جو نکرہ ذکر کیا ہے تو اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ دونوں شدید اور کثیر ہیں، گویا یہ تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ کسی نے "فِيْ غِرَّةٍ" بہ غینِ معجمہ پڑھا ہے۔ "غِرَّةٌ" بہ معنی غفلت ہے، یعنی جو نظر وغور اور اتباعِ حق ان پر واجب ہے، اس سے بڑی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ پھر جو اُن سے پہلے کافروں نے حق کا انکار اور تکذیب کی اور اس کی ان کو سزا ملی اللہ پاک نے اس سے ان کافروں کو ڈرایا اور دھمکایا۔ چنانچہ یوں ارشاد فرمایا:[4]

كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ۝۳

ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں تو (عذاب آنے پر) انھوں نے (مدد کو) پکارا جب کہ وہ فرار وخلاصی کا وقت نہ تھا ③

انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرنے والوں کا کیا حال ہوا؟

یعنی بہت سی اُمتیں جنھوں نے ان سے پہلے رسولوں کی مخالفت کی اور آسمانی کتابوں کو جھٹلایا اللہ نے ان کو

[1] فتح القدير (٥٥٢/٤) [2] الكشاف (٧٢٤) [3] فتح القدير (٥٥٢/٤) [4] فتح البيان (١٢/٩-١١)

ہلاک کر دیا۔ جس وقت ان پر عذاب آیا تو اللہ پاک سے استغاثہ کیا، چیخے اور چلائے مگر یہ ان کے کچھ کام نہ آیا اور ان سے عذاب کو دور نہ کیا۔ جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿12﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ١٢۔ ١٣] ''جب انھوں نے ہمارے عذاب کا احساس کر لیا تو لگے اس سے بھاگنے، بھاگ دوڑ نہ کرو اور جہاں تمھیں آسودگی دی گئی تھی وہیں واپس لوٹو اور اپنے مکانات کی طرف جاؤ، تاکہ تم سے سوال تو کر لیا جائے۔

امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے تمیمی سے روایت کیا ہے کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ﴾ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: "لَيْسَ بِحِيْنِ نَزْوٍ، وَلَا فِرَارٍ" یعنی بھاگنے کا وقت نہیں ہے۔ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے یہ الفاظ مروی ہیں: "لَيْسَ بِحِيْنِ مُغَاثٍ" یعنی اب فریاد رسی کا وقت نہیں ہے۔ ان سے امام عکرمہ رحمہ اللہ کے یہ الفاظ مروی ہیں: "نَادَوُا النِّدَاءَ حِيْنَ لَا يَنْفَعُهُمْ" اور یہ پڑھا:

تَذَكَّرَ لَيْلٰى لَاتَ حِيْنَ تَذَكُّرٍ

یعنی انھوں نے اس وقت ندا کی کہ وہ ان کو فائدہ نہیں دیتی ہے۔ امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے توحید کے ساتھ ندا کی، جبکہ دنیا نے ان سے پیٹھ دی اور خلاصی چاہی توبہ کے واسطے سے، جب کہ دنیا نے ان سے اعراض کیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ أَرَادُوا التَّوْبَةَ فِيْ غَيْرِ حِيْنِ النِّدَاءِ". امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لَيْسَ بِحِيْنِ فِرَارٍ وَلَا إِجَابَةٍ" یعنی بھاگنے کا وقت نہیں ہے اور نہ توبہ قبول کرنے کا۔

اسی کے مثل امام عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو مالک، ضحاک، زید بن اسلم، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: "وَلَا نِدَاءَ فِيْ غَيْرِ حِيْنِ النِّدَاءِ"[1] یعنی غیر وقتِ ندا میں ندا نہیں ہے۔ کلمۂ ﴿ لَاتَ ﴾ لائے نفی ہے، اس کے ساتھ حرفِ تاء زیادہ کر دیا گیا ہے، جس طرح کہ "ثُمَّ" اور "رُبَّ" میں زیادہ کرتے ہیں اور "ثُمَّتْ" اور "رُبَّتَ" کہتے ہیں۔ اور ﴿ لَاتَ ﴾ جدا لکھا جاتا ہے اور اس پر وقف ہوتا ہے۔ بعض قراء نے مصحفِ امام سے حکایت کیا ہے کہ ﴿ لَاتَ ﴾ ﴿ حِيْنَ ﴾ کے ساتھ متصل ہے، ایسے: "وَلَا تَحِيْنَ مَنَاصٍ" مشہور قولِ اول ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے۔[2] پھر جمہور نے بہ نصب ﴿ حِيْنَ ﴾ پڑھا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "وَلَيْسَ الْحِيْنُ حِيْنَ مَنَاصٍ"، یعنی نہیں ہے وقت، وقت خلاصی کا۔ بعض نے خود ﴿ لَاتَ ﴾ سے نصب کو جائز رکھا ہے اور اس کی سند میں یہ شعر پڑھا ہے:

تَذَكَّرَ حُبَّ لَيْلٰى لَاتَ حِيْنًا وَأَضْحَى الشَّيْبُ قَدْ قَطَعَ الْقَرِيْنَا

(1) تفسير الطبري (٢١/ ١٤٤) تفسير ابن كثير (٤/ ٣٥) (2) تفسير الطبري (٢١/ ١٤٨)

اور بعض نے اس سے جر کو جائز رکھا ہے اور یہ شعر پیش کیا ہے:

طَلَبُوْا صُلْحَنَا وَلَاتَ أَوَانٍ فَأَجَبْنَا أَنْ لَّيْسَ حِيْنَ بَقَاءٍ

بعض نے اس کی سند میں یہ مصرع گردانا ہے: "وَلَاتَ سَاعَةِ مَنْدَمٍ"۔ بہ جرِ ساعت۔ اہلِ لغت کہتے ہیں کہ "نوص" تاخر ہے اور "بوص" تقدم ہے۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ﴾ یعنی نہیں ہے وقت بھاگنے کا اور نہ وقت جانے کا۔[1] واللّٰه أعلم الموفق للصواب، كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ كَمْ ﴾ خبریہ ہے جو کثرت پر دال ہے اور محلِ نصب میں ہے کہ ﴿ اَهْلَكْنَا ﴾ کا مفعول بہ ہے۔ ﴿ مِّنْ قَرْنٍ ﴾ اس کی تمیز ہے اور ﴿ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ کا کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ ﴿ قَرْنٍ ﴾ سے مراد اگلی امتیں ہیں جو رسولوں کی تکذیب کرنے کے سبب سے ہلاک کر دی گئیں، یعنی ہم نے ان سے پہلے بہت سی اُمتوں کو ہلاک کر ڈالا ہے، جو دنیا کی نعمتوں، شان وشوکت، قوت اور کثرتِ مال میں ان لوگوں سے بہت زیادہ بڑھ کر تھیں، اس جگہ ندا سے مراد ندائے استغاثہ ہے، یعنی نزولِ عذاب کے وقت انھوں نے استغاثہ کیا، حالاں کہ وہ وقت خلاصی کا وقت نہ تھا۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ انھوں نے توبہ کے ساتھ ندا کی، حالاں کہ توبہ کا وقت نہ تھا اور نہ ایسا وقت تھا کہ کوئی عمل نفع دے۔ ﴿ مَنَاصٍ ﴾ مصدر ہے: "نَاصَ يَنُوْصُ نَوْصاً وَمَنَاصًا" کا۔ "نَوْصٌ" بہ معنی فوت وتاخر ہے۔ ﴿ لَاتَ ﴾ اہلِ یمن کی لغت میں بہ معنی "لَيْسَ" ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "نَوْصٌ" بہ معنی تاخر ہے اور امرؤ القیس کا شعر اس کی سند میں پڑھا:

أَمِنْ ذِكْرِ لَيْلَى إِذْ نَأَتْكَ تَنُوْصُ فَتَقْصُرُ عَنْهَا خُطْوَةً وَتَبُوْصُ

کہا ہے کہ محاورے میں یوں بولتے ہیں: "نَاصَ عَنْ قَرْنِهِ يَنُوْصُ نَوْصًا وَمَنَاصًا أَيْ: فَرَّ وَزَاغَ" امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: جس وقت کوئی متقدم ہو، آگے بڑھ جائے تو اس وقت بولتے ہیں: "نَاصَ يَنُوْصُ" اسی طرح امام نحاس رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "نَوْصٌ" بہ نون بہ معنی تاخر وتقدم دونوں طرح آتا ہے تو من جملہ اضداد ٹھہرا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ بعض نے بعض سے کہا: "مَنَاصٌ" یعنی تم فرار اور ہزیمت کو لازم پکڑو، چنانچہ جب ان پر عذاب آیا تو کہا: "مَنَاص" پس اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ﴾۔ امام سیبویہ اور خلیل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَاتَ ﴾ مشابہ "لَيْسَ" ہے۔ اسم اس میں ضمیر مضمر ہے: "أَيْ: لَيْسَ حِيْنُنَا حِيْنَ مَنَاصٍ" یعنی نہیں ہے ہمارا وقت بھاگنے کا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "لَيْسَ أَوَانُنَا" تقدیر ہے۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/٣٥، ٣٦)

امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا: قول سیبویہ رحمہ اللہ ہی کا قول ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ کے نزدیک ﴿ لَاتَ ﴾ پر وقف به ہاء ہے۔ امام مبرد اور اخفش رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَاتَ ﴾ لائے نافیہ ہے واسطے جنس کے، اس پر حرفِ تاء زیادہ کیا گیا ہے اور نفیِ احیان کے ساتھ مخصوص ہے۔ امام کسائی، فراء، خلیل، سیبویہ اور اخفش رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ حرفِ تاء ﴿ حِيْنَ ﴾ سے الگ لکھا جاتا ہے اور اسی طرح مصاحف میں ہے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حِيْنَ ﴾ سے متصل لکھا جاتا ہے تو "لَا تَحِيْنَ" بولتے ہیں اور کبھی "تَحِيْنَ" بولتے ہیں (قال أبو وجرة السعدي: ؎ العاطفون تحين ما من عاطف۔ والمطعمون زمان ما من مطعم) اور کبھی ﴿ حِيْنَ ﴾ کے ساتھ مضاف الیہ سے استغنا کرتے ہیں اور "لَاتَ حِيْنًا" کہتے ہیں (تَذْكُرُ حُبَّ لَيْلَى لَاتَ حِيْنًا)۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے عرب کو نہیں پایا کہ وہ اس حرفِ تاء کو زیادہ کرتے ہوں، مگر لفظ "حِيْن"، "أَوَانَ" اور "اَلْآنَ" میں۔ فتح البیان میں ہے کہ کبھی اس کو ان الفاظ کے سوا اور میں بھی زیادہ کرتے ہیں (فتح القدیر میں اس کا شاہد یہ شعر لکھا ہے: ؎

فلتعرفن خلائقا مشمولة ولتندمن ولات ساعة مندم[1])

ایک روایت میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہے: "لَيْسَ هٰذَا حِيْنَ زَوَالٍ"۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں: "لَا حِيْنَ فِرَارٍ"۔[2] جمہور نے بہ فتحِ تاء پڑھا ہے اور کسی نے "لَاتِ" بہ کسرِ تاء مثل "جَيْرِ" کے۔ جملۂ ﴿ وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال "نَادَوْا" کی ضمیر سے۔[3] پھر اللہ پاک نے کفار کے انواعِ کفر میں سے ایک نوع بہ جملہ مستانفہ ذکر فرمائی۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۚ﴿۴﴾ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴿۵﴾ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۚ﴿۶﴾ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۚ﴿۷﴾

اور انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک ڈرانے والا آ گیا اور کافروں نے کہا: یہ تو ایک جادوگر ہے بڑا جھوٹا ④ کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک کر دیا؟ بے شک یہ تو یقیناً ایک بڑی عجیب و غریب چیز ہے ⑤ اور ان کے سردار (آوازِ حق سن کر یہ کہتے

---

[1] تفسیر القرطبي (١٤٦/١٥، ١٤٧) فتح القدير (٥٥٣/٤، ٥٥٤) [2] الدر المنثور (١٤٤/٧) [3] فتح البيان (١١/١٢، ١٢)

ہوئے) چل دیے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، بے شک یہ چیز ہے جو کسی غرض سے (کہی جا رہی) ہے⑥ ہم نے یہ بات کسی اور دین میں نہیں سنی، یہ تو بس گھڑی ہوئی بات ہے⑦

مشرکوں کے رسالت اور توحید پر تعجب کرنے کا بیان:

پچھلا دین اپنے باپ داداؤں کو کہتے تھے، یعنی آگے تو سنتے ہیں کہ اگلے لوگ ایسی باتیں کہتے تھے، لیکن ہمارے بزرگ تو یوں نہیں کہہ گئے۔ انتھی.

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ اس نے جو رسول ﷺ کو بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا مشرکوں نے اس سے تعجب کیا، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ [یونس: ۲] ''کیا ان لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیج دی کہ سب آدمیوں کو ڈرایئے اور جو ایمان لے آئیں ان کو یہ خوش خبری سنائیے کہ ان کے رب کے پاس ان کو پورا اجر و مرتبہ ملے گا۔ کافروں نے کہا کہ یہ شخص تو بلاشبہہ صریح جادوگر ہے۔'' اور یہاں یوں فرمایا: ﴿ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ؗ ﴾۔ یعنی اس بات سے تعجب کیا کہ ان کے پاس ایک ڈرانے والا آیا ہے جو ان کی طرح ایک بشر ہے۔

﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ ﴾ یعنی کیا اس نے زعم کیا ہے کہ معبود ایک ہے۔ مشرکوں نے اس کا انکار کیا۔ اللہ ان کا برا کرے! اور شرک باللہ سے تعجب کیا، اس لیے کہ وہ تو اپنے باپ داداؤں سے بتوں کی پوجا سیکھ چکے تھے اور ان کی پوجا ان کے دلوں میں پلا دی گئی تھی۔ لہٰذا جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو بلایا کہ اس شرک کو اپنے دلوں سے دور کر دیں اور اکیلے اللہ پاک کو پوجیں تو انھوں نے اس بات کو برا سمجھا اور تعجب کیا اور کہا: ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ ﴾ ﴿ اَلْمَلَاُ ﴾ سے مراد ان کے سردار اور پیشوا ہیں، یعنی ان کے بڑے لوگ یہ کہتے ہوئے چلے کہ تم اپنے دین پر مستمر رہو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو اور جس توحید کی طرف محمد ﷺ تم کو بلاتے ہیں تم اس کو مت مانو۔ ﴿ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ﴾ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ یہ توحید جس کی طرف محمد ﷺ ہم کو بلاتے ہیں، البتہ ایک شے ہے کہ اس کے سبب سے تم پر شرف و علو چاہتے ہیں اور یہ کہ تم ان کی پیروی کرنے لگو، حالاں کہ ہم ان کی اس بات کو قبول نہ کریں گے۔[1]

ان آیاتِ کریمات کا سببِ نزول:

ان آیتوں کا سببِ نزول یہ ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قریش کے کچھ لوگ جمع ہوئے، ان میں یہ لوگ

[1] تفسیر الطبري (۱۵۲/۲۱)

تھے: ابو جہل بن ہشام، عاص بن وائل، اسود بن عبدالمطلب اور اسود بن عبد یغوث۔ یہ لوگ قریش کے بزرگوں کے ایک گروہ کے پاس آئے اور بعض نے بعض سے کہا کہ ہمارے ساتھ ابو طالب کے پاس چلو، تاکہ اس سے اس کے بھتیجے کے بارے میں گفتگو کریں، تاکہ وہ اس سے ہمارا انصاف کرے کہ وہ ہمارے معبودوں کو گالیاں دینے سے باز آجائے اور ہم اس کو اور اس کے معبود کو چھوڑ دیں جس کی وہ پوجا کرتا ہے، کیوں کہ ہمیں ڈر ہے کہ جب یہ شیخ، یعنی ابوطالب مر جائے گا اور ہم سے اس کے حق میں کوئی بات صادر ہو تو قریش کہیں گے کہ جب تک ابو طالب زندہ تھا تو اس کو چھوڑے رکھا اور جب وہ اس کو چھوڑ کر مر گیا تو اس کو ایذا پہنچائی۔

پھر ان لوگوں نے اپنے آدمیوں میں سے ایک شخص مطلب نامی کو بھیجا کہ وہ ابو طالب سے ان کی ملاقات کا اذن طلب کرے۔ اس نے جا کر یوں کہا کہ یہ لوگ تیری قوم کے شیخ اور سردار تیرے پاس آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ ابو طالب نے کہا: تو ان کو اندر لے آ۔ پھر جب وہ اس کے پاس اندر آئے تو بولے: اے ابو طالب! تو ہمارا بڑا اور سردار ہے، تو اپنے بھتیجے کے بارے میں ہم سے فیصلہ کر۔ تو اس کو حکم دے کہ وہ ہمارے معبودوں کو گالیاں دینے سے باز آجائے اور ہم اس کو اور اس کے معبود کو چھوڑ دیں۔ راوی نے کہا: پھر ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کی طرف ایک آدمی بلانے کے لیے بھیجا۔

پھر جب آپ ﷺ ابو طالب پر داخل ہوئے تو کہا: اے میرے بھتیجے! یہ لوگ تیری قوم کے بزرگ اور سردار ہیں اور انھوں نے تجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ تو ان کے معبودوں کو گالیاں دینے سے باز رہے اور وہ تجھے اور تیرے معبود کو چھوڑ دیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے میرے چچا! کیا پھر میں ان کو اس شے کی طرف نہ بلاؤں جو ان کے لیے بہتر ہے؟ ابو طالب نے کہا: تو ان کو کس طرف بلاتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ان کو اس طرف بلاتا ہوں کہ وہ ایک کلمہ کہہ دیں جس کے سبب سے عرب ان کے مطیع ہو جائیں گے اور یہ اس کی وجہ سے عجم کے مالک بن جائیں۔ تو قوم میں سے ابو جہل ۔لعنہ اللّٰہ۔ بولا: وہ کیا کلمہ ہے؟ قسم ہے تیرے باپ کی! البتہ ہم وہ تجھے عطا کریں گے اور اس کے مثل دس اور، یعنی ہم اس کلمے کو کہہ دیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم کہو گے: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' پس وہ نفرت کر گئے اور کہا: تو اس کے علاوہ ہم سے کسی اور چیز کا سوال کر۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم میرے پاس سورج لے آتے، یہاں تک کہ اس کو میرے ہاتھ میں رکھ دیتے تو بھی تم سے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہ مانگتا۔ پھر وہ آپ ﷺ سے خفا ہوتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: واللہ! ہم تجھے گالیاں دیں گے اور تیرے معبود کو جس نے تجھے اس کا حکم دیا ہے: ﴿ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ ۖ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ﴾۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ اور ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور اتنا زیادہ کہا: پھر جب وہ لوگ نکل گئے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا کو ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه'' کہنے کی دعوت دی تو اس نے انکار کیا اور کہا: بلکہ دینِ اشیاخ

پر اور یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ﴾[1] [القصص: ٥٦]
''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہے ہدایت کرتا ہے۔''

اس کے بعد حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما ابو طالب کی بیماری کا قصہ ابن جریر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے جس کا سورت کے شروع میں ذکر ہو چکا ہے۔ قصۂ مذکور کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس موقعے پر یہاں سے لے کر ﴿ بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ ﴾ تک آیات نازل ہوئی تھیں۔ یہ ابی کریب کے الفاظ ہیں جو ابن جریر رحمہ اللہ کے استاد ہیں، ان کے دوسرے استاد ابن وکیع ہیں۔[2] (وهكذا رواه أحمد والنسائي من حديث محمد بن عبد الله بن تميم كلاهما عن أبي أسامة عن الأعمش عن عباد غير منسوب به نحوه، ورواه الترمذي والنسائي وابن أبي حاتم وابن جرير أيضا كلهم في تفاسيرهم من حديث سفيان الثوري عن الأعمش عن يحيىٰ بن عمارة الكوفي عن سعيد بن جبير عن ابن عباس فذكر نحوه وقال الترمذي: حسن)۔ رہا ان کا یہ کہنا: ﴿ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا ﴾ یعنی ہم نے اس توحید کو نہیں سنا جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو بلاتے ہیں۔ ﴿ فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی پچھلے دین میں۔ امام مجاہد، ابن زید اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مراد دینِ قریش ہے۔ امام محمد بن کعب اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد نصرانیت ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مراد نصرانیت ہے۔[3] کفار نے کہا کہ اگر یہ قرآن حق ہوتا تو نصاریٰ ہم کو اس کی خبر دیتے۔ ﴿ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ﴾۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: کذب۔ اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تخرص۔[4] یعنی نہیں ہے یہ قرآن مگر جھوٹ یا اٹکل پچو۔ مطلب یہ ہے کہ خود بنا لیا ہے، اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔[5] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ اَنْ ﴾ مع اپنے ماتحت کے محلِ نصب میں ہے بنا بر نزعِ خافض ''أَيْ: مِنْ أَنْ جَاءَهُمْ'' یعنی جن کافروں کا اللہ پاک نے یہ وصف کیا کہ وہ عزت و شقاق میں ہیں، انھوں نے اس بات پر تعجب کیا ہے کہ ان میں ایک رسول انہی میں سے آیا جو ان کو عذاب سے ڈراتا ہے، اگر وہ کفر پر جمے رہے۔ جب انھوں نے ان معجزوں کا مشاہدہ کیا جو انسانی قوت سے باہر ہیں تو کہا کہ رسالت کا یہ مدعی جن معجزوں کو ظاہر کرتا ہے ان میں جادوگر ہے اور اس دعوے میں جھوٹا ہے کہ اللہ نے اس کو بھیجا ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٢١/١٥٣، ١٥٤)
[2] مسند أحمد (١/٣٦٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٤٢) سنن الترمذي، رقم الحديث ٣٢٣٢) تفسير الطبري ٢١/١٥٠، ١٥١) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٣٥)
[3] تفسير الطبري (٢١/١٥٢، ١٥٣) [4] تفسير الطبري (٢١/١٥٤، ١٥٥) [5] تفسير ابن كثير (٤/٣٦، ٣٧)

نکتہ:

پہلے ﴿ عَجِبُوٓا ﴾ فرمایا، پھر ﴿ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ کہا۔ بجائے ضمیر کے اسم ظاہر رکھا۔ اس سے ان پر غضب کا ظاہر کرنا ہے اور اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ جو بات انھوں نے کہی ایسی بات کہنے کی جرأت وہی کرتے ہیں جو کفر میں غلو کرنے والے اور گمراہی میں منہمک اور سرگرداں رہتے ہیں، کیوں کہ اس سے زیادہ بڑا کوئی کفر نہیں کہ جس کو اللہ پاک نے سچا کہا اس کا نام کاذب اور ساحر رکھیں اور توحید سے تعجب کریں، حالاں کہ توحید حق اور روشن ہے اور شرک سے تعجب نہ کریں، حالاں کہ شرک ایک باطل تاریک ہے۔ پھر جس توحید کو نبی اکرم ﷺ لے کر تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کے واسطے شرکاء ہونے کی نفی کی، کفار نے اس کا انکار کیا، چنانچہ یوں بولے کہ معبودوں کو کیا کر ڈالا، ان کو ایک معبود یعنی اللہ پاک پر مقصور کر دیا۔ بے شک یہ البتہ ایک ایسا امر ہے کہ تعجب میں انتہا کو پہنچنے والا ہے۔ کفار نے اس قصر وحصر پر تعجب کیا اور کہا کہ ایک سے اتنی کثیر مخلوق کا انتظام کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ سوچ سمجھ اور دلیل سے عاری تھے، بلکہ ان کے اوہام محسوسات، یعنی نظر آنے والی چیزوں کے تابع تھے۔ چنانچہ جب ظاہر میں انھوں نے یہ پایا کہ ایک فاعل کی قدرت اور علم تمام مخلوقات کی حفاظت نہیں کر سکتا تو غائب کا شاہد پر قیاس کر بیٹھے اور یہ کہ ان کے پُرکھے (بڑے) باجود اپنی کثرت کے اور اپنی عقلوں کی قوت کے سب کے سب شرک پر متفق تھے تو یہ وہم کر لیا کہ ان کا اس حال پر ہونا مشکل ہے کہ وہ اس میں باطل پر ہوں اور ایک آدمی حق پر ہو۔ قسم ہے کہ اگر تقلید حق ہوتی تو یہ شبہہ لازم ہوتا۔ (قاله الكرخي)

امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا کہ عجیب وہ امر ہے جس سے تعجب کیا جاتا ہے اور اسی طرح ﴿ عُجَابٌ ﴾ بالضم اور "عُجَّاب" بہ تشدید اس سے بھی زیادہ ہے، یعنی اس میں مبالغہ زیادہ ہے۔ جمہور نے ﴿ عُجَابٌ ﴾ بہ تخفیف پڑھا ہے اور علی وغیرہ (یعنی سلمی، عیسیٰ بن عمر اور ابن مقسم) نے بہ تشدید پڑھا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ عُجَابٌ ﴾ بہ تخفیف از دِشنوءہ کی لغت ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عُجَابٌ ﴾ بہ تخفیف وتشدید اس پر دال ہے کہ تعجب میں کبھی حد سے تجاوز کیا جاتا ہے جس طرح کہ طویل اس کو کہتے ہیں جس میں طول ہو اور طوال اس کو بولتے ہیں جو طول کی حد سے تجاوز کر گیا ہو اور امام جوہری رحمہ اللہ کا کلام اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مبالغہ بالخصوص "عُجَّابٌ" مشدد کے ساتھ ہے مخفف کے ساتھ نہیں۔

﴿ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ ﴾ ﴿ اَلْمَلَاُ ﴾ سے مراد اشراف ہیں۔ چنانچہ کتابِ عزیز کی تفسیر میں بہت جگہ یہ امر ثابت ہو چکا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی کہ اشراف قریش ابو طالب کی

---

[1] تفسیر القرطبي (١٥/١٤٩، ١٥٠)

طرف چلے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کے بارے میں اس سے گفتگو کی۔[1] ﴿ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ﴾ یعنی وہ اس مجلس سے چلے جس میں ابو طالب کے پاس تھے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ ایک دوسرے سے یہ بات کہتے ہوئے کہ تم اس شے پر چلتے رہو جس پر تم ہو اور اس کے دین میں داخل مت ہو اور اپنے معبودوں کی عبادت پر ثابت قدم رہو۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان میں سے اشراف چلے تو عوام سے کہا کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو۔

کلمہ ﴿ اَنِ ﴾ مفسرہ ہے قولِ مقدر کا: "أَيْ: وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ قَائِلِيْنَ أَنِ امْشُوْا" یا ﴿ وَانْطَلَقَ ﴾ کا مفسر ہے، اس لیے کہ اس میں قول کے معنی کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ اَنْ ﴾ مصدریہ ہو، معمول ہو مقدر کا، یا مذکور کا: "أَيْ: بِأَنِ امْشُوْا" کسی نے کہا ہے کہ "اِنْطِلَاقٌ" سے مراد اندفاع فی القول ہے، یعنی باتوں میں مشغول ہونا اور ﴿ اَمْشُوْا ﴾ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ جب عورت کی ولادت بہ کثرت ہوتی ہے تو کہتے ہیں: "مَشَتِ الْمَرْأَةُ" "أَيْ: اِجْتَمِعُوْا وَأَكْثِرُوْا" یعنی جمع ہو جاؤ اور بہت ہو جاؤ۔ یہ قول نہایت بعید ہے اور اس شے کے خلاف ہے جس پر "انطلاق" اور "مشي" اپنی حقیقت کے ساتھ دال ہیں اور اس بات کے خلاف ہے جو شانِ نزول میں گزر چکی ہے۔

جملہ ﴿ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ﴾ تعلیل ہے امر بالصبر کی، یعنی تم اپنے معبودوں پر جمے رہو، اس لیے کہ بے شک یہ البتہ ایک ایسی شے ہے جس کا محمد ﷺ ہمارے اور ہمارے معبودوں کے ساتھ ارادہ کرتے ہیں اور اس کا پورا ہونا پسند کرتے ہیں بغیر کسی پھیرنے والے کے کہ ان کو اس ارادے سے پھیرے، تاکہ ان کو ہم پر بلندی ہو اور ہم ان کے تابع ہو جائیں تو جس چیز کے ساتھ چاہیں ہم میں تحکم کریں۔ اس معنی کی بنیاد پر ان کے کلام کی غرض یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے قوم کو ڈراتے ہیں اور نفرت دلاتے ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ یہ ایک امر ہے جس کا اللہ پاک ارادہ کرتا ہے اور جس شے کا وہ ارادہ کرتا ہے اور اس کے جاری کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ ضرور ہی ہو جاتی ہے اور اس میں سوائے صبر کے اور کچھ نفع نہیں دیتا ہے۔ تو تم اپنے معبودوں کی عبادت پر صبر کرو۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ تمھارا دین ایک شے ہے کہ وہ طلب کی جاتی ہے کہ تم سے لے لی جائے اور تم اس پر مغلوب ہو۔ یا یہ معنی ہیں کہ یہ امر حوادثِ روزگار میں سے ایک امر ہے۔ ہمارے ساتھ اس کا ارادہ کیا جاتا ہے، چنانچہ ہم کو اس سے کسی طرح کا چھٹکارا نہیں ہے۔ یا ایک امر ہے کہ زمین والوں کے ساتھ اس کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

﴿ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ﴾ یعنی ہم نے اس توحید کے بارے میں نہیں سنا جس کو محمد ﷺ بیان کرتے ہیں کہ ویسی توحید ملتِ نصرانیت میں ہو۔ اس کو آخر ملت اس لیے کہا ہے کہ ملتِ اسلام سے پہلے آخری ملت یہی ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: معنی یہ ہیں کہ ہم نے نہیں سنا کہ یہ آخری زمانے میں آئے گا۔

---

[1] تفسیر الطبري (٢١/١٥٠)

کسی نے کہا: ہم نے یہود و نصاریٰ سے نہیں سنا کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر کفار اس بات کو ایک نئی بات سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو شرفِ نبوت کے ساتھ خاص کرے اور ان کو نہ کرے۔ چنانچہ یوں کہا:[1]

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا ۭ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝۸ۭ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَاۗىِٕنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۝۹ۚ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۣ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ۝۱۰ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝۱۱ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ۝۱۲ۙ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْــــَٔـيْكَةِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الْاَحْزَابُ ۝۱۳ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ۝۱۴ۧ

کیا ہم میں سے اسی پر ذکر (قرآن) اُتارا گیا ہے؟ بلکہ وہ تو میرے ذکر (وحی) کے متعلق شک میں ہیں، بلکہ ابھی تک انھوں نے میرا عذاب نہیں چکھا⑧ کیا ان کے پاس آپ کے رب کی رحمت کے خزانے ہیں جو نہایت غالب، خوب عطا کرنے والا ہے؟⑨ یا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان ہر چیز کی بادشاہت انھی کے لیے ہے؟ (اگر ایسا ہے) تو چاہیے کہ وہ آسمانی راستوں کے ذریعے سے (آسمان پر) چڑھ جائیں⑩ (یہ تو) یہاں کے شکست خوردہ لشکروں میں سے ایک (معمولی سا) لشکر ہے⑪ ان سے پہلے قومِ نوح اور عاد اور میخوں والے فرعون نے (حق کو) جھٹلایا⑫ اور قومِ ثمود اور قومِ لوط اور اصحابِ اَیکہ نے بھی (جھٹلایا) (واقعی) یہ بہت بڑے (اور طاقتور) لشکر تھے⑬ (ان میں سے) ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا، لہٰذا (ان پر) میرا عذاب ثابت ہو گیا⑭

مشرکین کا رسالت وقرآن سے تعجب:

وہ جو کہتے تھے کہ ہم پر کیوں نہ اترا، بلکہ انھوں نے میرا عذاب اب تک چکھا ہی نہیں۔ تو پھر یہ رسیاں تان کر چڑھ جائیں، یعنی اگلی قومیں برباد ہوئیں اگر چڑھ جائیں تو ان میں ایک یہ بھی برباد ہوں۔ فرعون کا نام میخوں والا اس لیے پڑا کہ وہ ظالم آدمی کو چار میخوں سے مارتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ لشکر کے گھوڑوں کی میخیں سونے اور روپے کی رکھتا تھا۔ انتہی۔[1]

① فتح البیان (۱۲/۱۲۔۱۵)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کافر اس بات کو بعید جانتے ہیں کہ اللہ پاک نے قرآن اُتارنے کے لیے ان میں سے نبی اکرم ﷺ کو خاص کیا جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ [الزخرف: ۳۱] ''یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ ﴾ [الزخرف: ۳۲] ''کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے ہی ان کی زندگانیِ دنیا کی روزی ان میں تقسیم کی ہے اور ایک کو دوسرے سے بلند کیا ہے۔'' اسی لیے جب انھوں نے یہ بات کہی جو ان کی جہالت اور کم عقلی کی دلیل ہے اس بارے میں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر ان سب کو چھوڑ کر قرآن کے نازل کرنے کو بعید سمجھا تو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ﴾ یعنی یہ بات جو وہ کہتے ہیں تو اس لیے کہتے ہیں کہ اس بات کے کہنے تک اللہ تعالیٰ کا عذاب اور انتقام نہیں چکھا۔ اب عن قریب وہ جان لیں گے وہ بات جو انھوں نے کہی اور وہ شے جس کی تکذیب کی۔ ﴿ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴾ [الطور: ۱۳] ''جس دن وہ دھکے دے دے کر آتشِ جہنم کی طرف لائے جائیں گے۔''

پھر اللہ پاک نے یہ بیان کیا ہے کہ وہی اپنے ملک میں تصرف کرنے والا ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے امرِ روح کو نازل کرتا ہے، جس کے دل پر چاہتا ہے مہر کر دیتا ہے۔ پھر اللہ کے علاوہ کوئی اس کو ہدایت کرنے والا نہیں اور بندے امر میں سے کسی شے کے مالک نہیں ہیں اور نہ ملک میں ان کو کسی طرح کا تصرف ہے اور نہ وہ ذرہ برابر چیز کے اور نہ قطمیر (کھجور کی گٹھلی کے چھلکے) کے مالک ہیں۔ اسی لیے اللہ پاک نے ان پر انکار کر کے فرمایا، کیا ان کے پاس تیرے رب کی رحمت کے خزانے ہیں، وہ رب جو عزیز اور وہاب ہے۔ عزیز کے معنی یہ ہیں کہ اس کی بارگاہِ عالی جاہ کا کوئی قصد نہیں کر سکتا ہے۔ وہاب کا مطلب یہ ہے کہ عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے۔ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کے مشابہ ہے: ﴿ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴾ [النساء: ۵۳۔ ۵۵] ''کیا ان کا سلطنت میں کوئی حصہ ہے؟ اگر ایسا ہو تو پھر یہ کسی کو ایک کھجور کی گٹھلی کے شگاف کے برابر بھی کچھ نہ دیں گے۔ یا یہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے، پس ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت بھی دی ہے اور بڑی سلطنت بھی عطا فرمائی ہے۔ پھر ان میں سے بعض نے تو اس کتاب کو مانا اور بعض اس سے رک گئے اور جہنم کا جلانا کافی ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ

کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۰۰] ''کہہ دیجیے کہ اگر بالفرض تم میرے رب کی رحمتوں کے خزانوں کے مالک بن جاتے تو تم اس وقت بھی اس کے خرچ ہو جانے کے خوف سے اس کو روکے رکھتے اور انسان ہے ہی تنگ دل۔'' یہ اس کے بعد فرمایا ہے کہ کفار سے کسی انسان کو رسول بنا کر بھیجنے کا انکار نقل کیا ہے اور جس طرح کہ صالح علیہ السلام کی قوم کے متعلق خبر دی ہے، جب انھوں نے کہا: ﴿ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴾ [القمر: ۲٥۔ ۲٦] ''کیا ہمارے سب کے درمیان صرف اسی پر وحی اتاری گئی؟ نہیں بلکہ وہ جھوٹا شیخی خور ہے۔ اب سب جان لیں گے کل کو کہ کون جھوٹا اور شیخی خور تھا؟''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۫ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ﴾ یعنی اگر اُن کے لیے آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان کی بادشاہت ہے تو چاہیے کہ چڑھ جائیں۔ اس باب میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا کہ اس سے مراد آسمان کے راستے ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: چاہیے کہ ساتویں آسمان کی طرف چڑھ جائیں۔[1] پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ﴾ یعنی یہ جھٹلانے والے لشکر جو عزت اور شقاق میں ہیں عن قریب ہزیمت خوردہ، مغلوب اور ذلیل وخوار ہوں گے جس طرح کہ ان سے پہلے کے لشکر جو تکذیب کرنے والے تھے، وہ ذلیل وخوار ہوئے۔ یہ آیت اس آیت کی مثل ہے: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۝ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾ [القمر: ٤٤۔ ٤٥] ''یا یہ کہتے ہیں کہ ہم غلبہ پانے والی جماعت ہیں۔ عن قریب یہ جماعت شکست دی جائے گی اور پیٹھ دے کر بھاگے گی۔'' یہ قصہ بدر کے دن ہوا۔ ﴿ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ السَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ ﴾ [القمر: ٤٦] ''بلکہ قیامت کی گھڑی ان کے وعدے کا وقت ہے اور قیامت بڑی سخت اور کڑوی چیز ہے۔''

ہلاک شدہ گذشتہ اقوام سے عبرت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ﴾ اللہ پاک اگلی اُمتوں کی خبر دیتا ہے اور اس عذاب اور سزا اور انتقام کی جو رسولوں کی مخالفت کرنے اور نبیوں کی تکذیب کرنے کی وجہ سے ان پر نازل ہوا۔ علیھم الصلاۃ والسلام۔ ان کے قصے پورے طور پر متعدد جگہ گزر چکے ہیں۔ ﴿ اُولٰٓىِٕكَ الْاَحْزَابُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اے مکہ والو! یہ اُمتیں کثرت اور قوت اور اموال و اولاد میں تم سے کہیں بڑھ کر تھیں، پس ان سب باتوں نے ان سے اللہ کے عذاب کو کچھ بھی دور نہ کیا، جب اللہ کا حکم آ گیا۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے یوں فرمایا: ﴿ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴾ ''ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے رسولوں کی تکذیب نہ کی ہو پس میری

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۱۵٦، ۱۵۷)

سزا ان پر ثابت ہوگئی۔'' چنانچہ ان کے ہلاک کرنے کی وجہ یہ ٹھہرائی کہ انھوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو اب مخاطب لوگوں کو چاہیے کہ ایسے کام سے بالکل بچیں، ورنہ ان کی گت بھی وہی ہوگی جو پہلی اُمتوں کی ہوئی۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ ءَاُنْزِلَ ﴾ میں استفہام انکاری ہے؛ یعنی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم سب میں سے قرآن اسی پر اتارا جائے، حالاں کہ ہم تو رؤسا اور اشراف ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: کفار بولے کہ ہم سب میں سے محمد ﷺ پر قرآن کیوں اتارا گیا؟[2] حالاں کہ ہم عمر کے لحاظ سے اس سے زیادہ بزرگ ہیں اور شرف کے لحاظ سے زیادہ عظیم ہیں۔ پس اس بات کا انکار کیا کہ اللہ پاک اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے، جس چیز کے ساتھ چاہے اپنا فضل و کرم فرمائے۔ جب اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ کفار نے ان کو چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ پر قرآن کے نازل ہونے کو ایک نئی بات سمجھا تو وہ سبب بیان کیا جس کی وجہ سے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس شے میں تصدیق کرنے کو ترک کیا جس کو وہ لے کر آئے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ﴾ یعنی بلکہ وہ قرآن یا وحی کے بارے میں شک میں ہیں، اس لیے کہ جو نظر اس کی تصدیق کی موجب ہے اس سے اعراض کرتے ہیں اور ان دلائل کو چھوڑ رکھا ہے جو اس کے حق اور منزل من اللہ ہونے پر دال ہیں۔ ان دلائل میں ذرا بھی غور و فکر نہیں کرتے کہ اس کی حقیقت معلوم ہو جائے۔

پھر اس سبب سے ہٹ کر اور سبب بیان فرمایا: ﴿ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ﴾ یعنی بلکہ سبب یہ ہے کہ انھوں نے ابھی میرا عذاب نہیں چکھا۔ یہ لوگ مہلت کے طویل ہونے کی وجہ سے مغرور ہو رہے ہیں اور جس شرک و شک پر وہ جمے ہوئے ہیں، اس پر میرا عذاب چکھ لیتے تو جس قرآن کو تو لے کر آیا ہے، اس کی تصدیق کر لیتے اور اس میں شک نہ کرتے اور توقع ہے کہ وہ عذاب کو چکھیں گے۔ پس جب چکھ لیں گے تو ان سے شک دور ہو جائے گا اور پھر تصدیق کر لیں گے، مگر اس وقت ان کی تصدیق ان کو کوئی فائدہ نہ دے گی، کیوں کہ مضطر اور مجبور ہو کر تصدیق کی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ﴾ اضراب ہے اضرابِ اول سے بہ خلاف اس کے جو مفہوم کشاف سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق قبل کے دونوں کلام سے ہے۔ کلمہ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ ہے جو یہ ''بَلْ'' وہمزہ مقدر ہوتا ہے: ''أَيْ: بَلْ أَعِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَحْمَةَ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ'' یعنی بلکہ کیا ان کے پاس تیرے رب کی رحمت کی کنجیاں ہیں، مراد نبوت ہے اور وہ نعمتیں جو اس سے کم درجے کی ہیں، تا کہ وہ ان کو عطا کریں جسے چاہیں۔ ہرگز یوں نہیں ہے۔ پھر ان سے اور اس شے کے انکار سے کیا واسطہ کیا تعلق جس کے ساتھ اللہ پاک نے اس نبی پر تفضّل فرمایا

[1] تفسیر ابن کثیر (٣٧/٤۔٣٩) [2] معاني القرآن (٣٢٢/٤)

ہے اور اس کو اس کے واسطے پسند کیا ہے اور اس کو اپنی رسالت کے لیے چن لیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ منصبِ نبوت اللہ پاک کی طرف سے ایک عطیہ ہے۔ وہ تفضّل کرتا ہے اس کا جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے۔ اسے کوئی منع کرنے والا نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو عزیز ہے، یعنی وہ غالب اور قاہر ہے کہ مغلوب نہیں ہوتا۔ وہ وہاب اور معطی ہے کہ اسے یہ حق پہنچتا ہے اور اختیار ہے کہ وہ جس کسی کو چاہے اور جو چاہے بخش دے۔

پھر اس مضمون کو یوں ارشاد فرما کر اَور روشن اور مزین فرما دیا: ﴿ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ یعنی بلکہ کیا ان کے واسطے ان اشیاء کا مِلک ہے کہ جس کو چاہیں دیں جسے چاہیں نہ دیں اور اللہ پاک کے دینے پر اعتراض کریں؟ معنی یہ ہیں کہ اس عالمِ جسمانی کے کام میں جو اس کے خزانوں میں سے ایک ذرا سا ٹکڑا ہے، ان کو کسی طرح کا دخل نہیں ہے۔ پھر ان کو کہاں سے یہ اختیار ہے کہ ان اشیاء میں تصرف کریں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ﴾ جواب ہے شرط محذوف کا، یعنی اگر ان کے واسطے یہ ہے تو چاہیے کہ وہ آسمان تک چڑھ جائیں اور اس کے لیے جو زینے اور راہیں ہیں، ان کو استعمال کر کے عرش تک پہنچ جائیں، یہاں تک کہ اس پر مستوی و مستولی ہو جائیں اور وہاں سے عطا اور منع کا حکم کریں جو چاہیں اور اپنی خواہش کے مطابق دنیا کے کاموں کی تدبیر کریں۔ یا یہ معنی ہیں کہ پس چاہیے کہ چڑھ جائیں اور فرشتوں کو منع کریں کہ وہ محمد ﷺ پر وحی لے کر نہ اُتریں۔ "أَسْبَابٌ" آسمانوں کے دروازے ہیں جن سے فرشتے اترتے ہیں۔ (قاله مجاهد وقتادة) اسی معنی سے زہیر کا قول ہے: "وَلَوْ رَامَ أَسْبَابَ السَّمَاءِ بِسُلَّمٍ"

امام ربیع بن انس نے کہا کہ "أَسْبَابٌ" بال سے زیادہ باریک اور لوہے سے زیادہ سخت ہیں، لیکن دکھائی نہیں دیتے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَسْبَابٌ" سے مراد فضل و دین ہے۔ کسی نے کہا: پس چاہیے کہ عمل کریں اسبابِ قوت میں اگر وہ یہ گمان کریں کہ وہ مانع ہیں۔ یہ قول امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ "أَسْبَابٌ" رسیاں ہیں، یعنی اگر وہ رسیاں پائیں جن میں آسمان کی طرف چڑھیں تو ایسا کریں۔ اہلِ لغت کے نزدیک "أَسْبَابٌ" ہر وہ شے ہے جس سے کسی مطلوبہ شے کی طرف توصل کیا جاتا ہے، وہ کوئی سی چیز ہو۔ اس کلام میں اُن کے ساتھ استہزاء کرنا ہے اور ان کو عاجز کرنا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ "أَسْبَابٌ" آسمان ہے،[2] اس لیے کہ وہ نیچے ہونے والے حوادث کا ذریعہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ﴾ یہ اللہ پاک کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کے لیے اس بات کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو کفار پر مدد دے گا اور کامیابی عطا فرمائے گا۔ کلمۂ ﴿ جُنْدٌ ﴾ مرفوع ہے اس بنیاد پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: هُمْ جُنْدٌ حَقِيرٌ" یعنی یہ کافر ایک بے حقیقت ذلیل و خوار گروہ ہے عنقریب

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/١٥٣) [2] تفسير الطبري (٢١/١٥٧)

مہزوم اور مکسور ہو جائے گا۔ لہٰذا تو اُن کی کچھ پروا مت کر اور یہ خیال نہ کر کہ وہ اپنے کسی مکر سے جس کو وہ اپنے جی میں پوشیدہ رکھتے ہیں، تجھے کچھ نقصان پہنچائیں گے۔ ﴿ مَا هُنَالِكَ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مَا ﴾ ﴿ جُندٌ ﴾ کی تعظیم کی خاطر صفت ہے: ''أَيْ: جُندٌ'' یعنی بڑا لشکر۔ یا تحقیر کے لیے، یعنی ایک حقیر گروہ۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَا ﴾ زائد ہے۔ ''هَزْمٌ'' بہ معنی شکستن ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''هَزَمْتُ الْجَيْشَ، أَيْ: كَسَرْتُهُ'' یعنی میں نے لشکر کو توڑ پھوڑ ڈالا ''وَتَهَزَّمَتِ الْقِرْبَةُ'' یعنی مشک پھٹ پھٹا گئی۔

بالجملہ یہ کلام ما تقدم سے متصل ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ وَّهُمْ جُنْدٌ مِنَ الْأَحْزَابِ مَهْزُوْمُوْنَ'' یعنی بلکہ وہ لوگ جو منکر ہوئے عزت و شقاق میں ہیں اور وہ ایک گروہ ہیں فوجوں سے ہزیمت دیے گئے، لہٰذا تو اُن کی عزت اور شقاق سے رنج مت کر، کیوں کہ میں ان کی عزت چھین لوں گا اور اُن کی جماعت کو ہزیمت دے دوں گا۔ الحمد للہ یہ وعدہ بدر کے دن پورا ہوا اور اس کے بعد اور لڑائیوں میں۔ واقعہ سے پہلے جو اس کی خبر دی تو یہ غیب کی خبر دینا ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس آیت سے نصرتِ اسلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خندق کھودنے کی طرف، یعنی اس کے مقام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسے فتح مکہ کے دن پر محمول کیا جائے، کیوں کہ معنی یہ ہیں کہ وہ ایک لشکر ہیں کہ عن قریب اس جگہ ہزیمت دیے جائیں گے جس میں انھوں نے یہ کلمات ذکر کیے ہیں اور وہ جگہ مکہ ہے اور یہ فتح مکہ کے دن ہی ہوا۔[1] جب اللہ پاک نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر کفار کے حال کا ذکر کیا تو جو اُن سے پہلے تھے اور انھی کی طرح کفر و تکذیب کیا کرتے تھے ان کا حال بیان کیا۔ ارشاد فرمایا: ﴿ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ ﴾ یہ کلام استیناف ہے ماقبل کا مقرر و مثبت ہے: ''أَيْ كَذَّبُوْا رَسُوْلَهُمْ نُوْحًا'' یعنی قومِ نوح نے اپنے رسول نوح علیہ السلام کو جھٹلایا، اسی طرح اس کے مابعد میں بھی تقدیر کی جائے گی۔ قوم کے لیے صیغۂ مونث ﴿ كَذَّبَتْ ﴾ معنی کے اعتبار سے کیا، کیوں کہ قوم بہ معنی اُمت و طائفہ و جماعت ہے۔

مفسرین نے کہا ہے کہ فرعون لوگوں کو میخوں سے عذاب کیا کرتا تھا۔ جب کسی پر خفا ہوتا تو اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں اور سر کو زمین پر میخوں سے ٹھونک دیتا تھا، اس لیے اس کا نام ذوالاتاد ہو گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے روبرو میخوں اور رسیوں سے کھیلتے تھے۔ یہ قول نہایت درجہ بارد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ذُو الْأَوْتَادِ ﴾ کے معنی قوت اور دباؤ والا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''أَوْتَادٌ'' سے مراد بہت بڑے لشکر اور اجتماع ہیں، یعنی بہت سے گروہ اور لشکروں والا۔ یہ لوگ اس کے کام کو قوت دیتے تھے اور اس کی سلطنت کو قوی اور مضبوط کرتے تھے جس طرح کہ میخیں اس شے کو مضبوط کرتی ہیں جس پر وہ ٹھونکی جاتی ہے۔ چنانچہ اس قول کی بنا پر کلام کو استعارہ کے پیرائے میں ادا کیا ہے۔

---

[1] تفسیر الرازی (۲۶/۱۵۸)

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ یوں کہتے ہیں: "هُمْ فِيْ عِزٍّ أَوْ فِيْ مُلْكٍ ثَابِتِ الْأَوْتَادِ" یعنی وہ لوگ عزت یا ملک میں ہیں جس کی میخیں جمی ہوئی ہیں اور اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ ملک دائم و شدید میں ہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ بالوں کا خیمہ میخوں ہی سے ثابت و قائم رہتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ "أَوْتَادٌ" سے مراد مضبوط بنیاد ہے، یعنی فرعون محکم و مضبوط مکانوں والا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنیان کا نام اوتاد رکھتے ہیں۔ "أَوْتَادٌ" جمع ہے "وَتِدٌ" کی۔ افصح لغت بہ فتح واؤ و کسر تاء ہے، اس کے سوا اور لغت بھی ہیں۔ دوسری "وَتَدٌ" بہ فتح واؤ و تاء ہے۔ تیسری "وَدٌّ" (بروزن وج) دال میں تاء کے ادغام کے ساتھ۔ چوتھی لغت "وَدِتٌّ" (یہ لغت نجد والوں کی ہے)۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "وُتُدٌ وَاتِدٌ" بولتے ہیں جیسے "شُغُلٌ شَاغِلٌ" کہتے ہیں۔ "أَيْكَةٌ" بمعنی "غَيْضَةٌ" ہے، یعنی مجتمع اور گنجان درخت۔ اس کی تفسیر مع اختلافِ قراءت سورت شعراء میں گزر چکی ہے۔[1]

﴿ أُولَٰٓئِكَ الْأَحْزَابُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ قوت اور کثرت کے ساتھ موصوف وہی لوگ ہیں، جیسے عرب کا قول ہے کہ "فُلَانٌ هُوَ الرَّجُلُ" یعنی مرد وہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کمال مردانگی کی صفت والا ہے۔ قریش اگرچہ حزب ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سابق میں فرمایا ہے: ﴿ جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ ﴾ لیکن یہ اگلی امتیں جن کا قصہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے بیان فرمایا ہے، یہ قریش سے گنتی میں بہت زیادہ تھیں اور بدنوں میں زیادہ مضبوط اور مالوں میں زیادہ فراخی والی اور عمروں میں زیادہ دراز تھیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ مشرکینِ قریش انہیں احزاب سے ہیں اور یہ وہی ہیں اور ان سے تکذیب پائی گئی ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خبر ہو اور ﴿ عَادٌ ﴾ مبتداء ہو۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے،[2] لیکن یہ قول ضعیف ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ﴿ عَادٌ ﴾ اور اس کا مابعد ﴿ قَوْمُ نُوحٍ ﴾ پر معطوف ہے اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ جملہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے یا امم مذکورہ سے بدل ہے۔

﴿ إِن كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ ﴾ میں کلمۂ ﴿ إِنْ ﴾ نافیہ ہے، معنی یہ ہیں کہ نہیں ہے ہر ایک گروہ ان گروہوں سے مگر اس نے رسولوں کی تکذیب کی، اس لیے کہ ایک گروہ کی اپنے رسول کی تکذیب، جو اس کی طرف بھیجا گیا، گویا سارے رسولوں کی تکذیب ہے، کیونکہ ان سب کی دعوت وہی ایک توحید ہے۔ یا مقابلۂ جمع بہ جمع کے باب سے ہے اور مراد ہر گروہ کا اپنے اپنے رسول کی تکذیب کرنا ہے۔ استثناء مفرغ ہے اعم احوال سے، یعنی احزاب میں سے اپنے سارے حالات میں کوئی ایسا نہیں تھا جس سے رسل کی تکذیب واقع نہ ہوئی ہو۔ یہاں کئی امور کا برتاؤ کیا۔ ایک یہ کہ تکذیب کو بار بار بیان کیا اور اس کا ابہام کیا پھر اس کی توضیح کی۔ دوسرا یہ کہ اس کو مکرر لانے میں تنویع کی اس طرح سے کہ پہلے اس کو بہ جملہ خبریہ ذکر کیا، پھر دوبارہ بہ جملہ استثنائیہ ذکر کیا۔ تیسرا استثنائیہ میں جو وضع بروجہ تاکید

---

[1] تفسیر القرطبي (١٥/١٥٥، ١٥٤) [2] التبیان فی إعراب القرآن (٢/١٠٩٨)

ہے، چنانچہ اس سب میں کئی قسم کا مبالغہ ہے، کیسا مبالغہ جوان پر اَشد اور اَبلغ عقاب واقع ہونے کو یقینی بتاتا ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ فَحَقَّ عِقَابِ ﴾ بہ معنی "ثَبَتَ وَوَجَبَ" ہے، یعنی پس ان پر میرا عقاب ثابت اور واجب ہوا ان کی تکذیب کے سبب سے، اگرچہ وہ متاخر ہو۔ گویا ان پر واقع ہونے والا ہے اور ہر شے جو آنے والی ہے وہ قریب ہے۔ اس آیت میں سامعین کو ڈرانا اور دھمکانا ہے۔ یعقوب نے "عِقَابِيْ" بہ اثباتِ یاء پڑھا ہے[1] اور باقی قراء نے رؤسِ آیات کی مطابقت میں حرفِ یاء کو حذف کیا ہے۔[2] بالجملہ جب اللہ پاک کفارِ مکہ کے امثال اور اشباہ کے عقاب کا ذکر کر چکا تو اب مکہ والوں کے عقاب کا بیان شروع کیا۔ ارشاد فرمایا:

وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴿15﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿16﴾ اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿17﴾

یہ لوگ تو بس ایک (ہولناک) چیخ کا انتظار کر رہے ہیں، جس میں کوئی وقفہ نہیں ہو گا ⑮ اور انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہمیں ہمارا (عذاب کا) حصہ یومِ حساب سے پہلے جلد دے دے ⑯ (اے نبی!) جو کچھ یہ کہتے ہیں آپ اس پر صبر کیجیے اور ہمارے بندے داود کو یاد کیجیے جو صاحبِ قوت تھا، بے شک وہ بہت رجوع کرنے والا تھا ⑰

مشرکوں کے جلد عذاب طلب کرنے کا بیان اور داود علیہ السلام کا تذکرہ:

چیخ یعنی صور کی آواز کا انتظار ہے۔ جب قیامت کا وعدہ سنتے تو کہتے کہ ہمارا حصہ ہمیں ابھی دے دے۔ یہ ان کا ٹھٹھا تھا۔ اس جگہ ان کو یاد دلوایا کہ انھوں نے بھی طالوت کی حکومت میں بہت صبر کیا آخر ان کو حکومت ملی اور مخالفوں کو جہاد سے زیر کیا، یہی نقشہ ہمارے پیغمبر ﷺ کا ہوا کہ ہاتھ میں قوت اور سلطنت آئی، بڑی قوت والا ہاتھ یہ ہے کہ سلطنت کا مال نہ کھاتے تھے، بلکہ اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی ﴿ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ ﴾ [محمد: ۱۸] "تو کیا یہ قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان کے پاس اچانک آ جائے یقیناً اس کی علامتیں تو آ چکی ہیں۔" "أَيْ: فَقَدِ اقْتَرَبَتْ وَدَنَتْ وَأَزِفَتْ"، یعنی قیامت قریب آ گئی۔ ﴿ صَيْحَةً ﴾ سے مراد نفخۂ فزع ہے جس کے طویل کرنے کا اللہ تعالیٰ اسرافیل علیہ السلام کو حکم دے گا، پھر آسمان والوں اور زمین والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں

[1] تفسیر القرطبي (۱۵/۱۵۵) [2] فتح البیان (۱۲/۱۵-۱۹)

رہے گا جو گھبرا نہ جائے گا، مگر وہ جس کا اللہ عزوجل نے استثناء کر لیا ہے۔ مالک نے زید بن اسلم سے ﴿ مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے: ”أَيْ: لَيْسَ لَهَا مَثْنَوِيَّةٌ“، یعنی اس میں کوئی وقفہ نہ ہو گا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴾ یہ اللہ پاک کی طرف سے مشرکوں پر اس بات کا انکار ہے کہ وہ اپنی جانوں پر عذاب کی جلدی کی دعا کرتے ہیں، کیوں کہ ”قِطٌّ“ بہ معنی کتاب ہے۔ کسی نے کہا حظ ونصیب بہ معنی بہرہ و حصہ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ضحاک، حسن اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ انھوں نے جلد عذاب آنے کا سوال کیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کیا، جیسا کہ انھوں نے یوں کہا: ﴿ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾[1] [الأنفال: ٣٢] ”اے اللہ! اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع کر دے۔“ کسی نے کہا: اپنے حصے کی جلدی کا سوال کیا جو جنت سے ہے اگر وہ موجود ہو، تاکہ دنیا میں اس سے ملیں۔ یہ بات جو ان سے صادر ہوئی تو صرف تکذیب اور استبعاد کے طور پر تھی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس شے کی تعجیل کا سوال کیا جس کے دنیا میں وہ مستحق ہیں خیر وشر میں سے۔

یہ بات جو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہی جید ہے اور اسی پر ضحاک واسماعیل بن ابی خالد کا کلام ہے۔[2] واللہ أعلم.

چوں کہ یہ بات ان کی طرف سے استہزاء اور استبعاد کے طور پر تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کا امر فرمایا کہ تم ان کی ایذاء پر صبر کرو اور آپ کے صبر پر آپ کو نیک انجام اور مدد اور کامیابی کی خوش خبری دی۔ ”أيد“ سے مراد علم وعمل میں قوت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، سدی اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ ”أيد“ قوت ہے اور ابن زید نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْيدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ ﴾ [الذاريات: ٤٧] ”آسمان کو ہم نے عظیم قوت سے بنایا ہے اور یقیناً ہم کشادگی کرنے والے ہیں۔“

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”أيد“ طاعت میں قوت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ داود علیہ السلام کو قوت عطا کی گئی تھی، طاعت میں اور اسلام کے سمجھنے میں۔[3] ہم سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ تہائی رات قیام کرتے تھے اور آدھے سال کا روزہ رکھتے تھے۔ یہ بات صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب نماز داود علیہ السلام کی نماز ہے اور سب سے محبوب روزہ داود علیہ السلام کا روزہ ہے، وہ آدھی رات سوتے اور تہائی رات قیام کرتے اور چھٹا حصہ سوتے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے اور جب دشمن سے آمنا سامنا ہوتا تو بھاگتے نہیں تھے[4] اور وہ اواب تھے، یعنی اپنے سارے کاموں میں اللہ عزوجل کی طرف بڑے رجوع کرنے والے تھے۔[5]

---

(1) تفسیر الطبري (١٦٥/٢١) (2) تفسیر الطبري (١٦٥/٢١) تفسیر ابن کثیر (٣٩/٤) (3) تفسیر الطبري (١٦٦/٢١۔ ١٦٨)

(4) صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٠٧٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٥٩) (5) تفسیر ابن کثیر (٣٩/٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ یہ کفار نہیں انتظار کرتے مگر ایک نفخے کا جو قیامِ ساعت کے نزدیک ہونے والا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ صَيْحَةً ﴾ سے مراد نفخۂ ثانیہ ہے۔ پہلے قول کی بنا پر وہ کفار مراد ہیں جو ہمارے نبی اکرم ﷺ کے ہم عصر تھے اور دوسرے قول کی بنیاد پر امم مذکورہ کے کفار مراد ہوں گے، یعنی ان کے اور اس عذابِ نار کے درمیان جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تیار کر رکھا ہے، صرف یہی ہے کہ صور میں دوسرا نفخہ پھونکا جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ صَيْحَةً ﴾ سے مراد وہ عذاب ہے جو اُن پر دنیا میں اچانک آ جائے۔ کلامِ عرب میں دنیوی عذاب پر ﴿ صَيْحَةً ﴾ کا اطلاق آیا ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے: ؎

صَاحَ الزَّمَانُ بِآلِ بَرْمَكَ صَيْحَةً خَرُّوْا لِشِدَّتِهَا عَلَى الْأَذْقَانِ[1]

جملہ ﴿ مَّا لَهَا مِن فَوَاقٍ ﴾ محلِ نصب میں ہے۔ ﴿ صَيْحَةً ﴾ کی صفت ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَوَاقٍ ﴾ بہ فتح و ضمِ فاء دو لغت ایک معنی میں ہیں۔ ﴿ فَوَاقٍ ﴾ وہ زمانہ ہے جو دودھ دوہنے والے اور دودھ پینے والے کے درمیان ہوتا ہے۔[2] مختار میں کہا ہے کہ ﴿ فَوَاقٍ ﴾ وہ زمانہ ہے جو دودھ دوہنے کے درمیان ہوتا ہے، اس لیے کہ اونٹنی کو دوہتے ہیں، پھر گھڑی بھر اسے چھوڑ دیتے ہیں، اس کا بچہ دودھ پیتا ہے، تاکہ اس کا دودھ اترے، پھر اسے دوہتے ہیں۔[3] چنانچہ معنی یہ ہوئے کہ وہ ایسا صیحہ ہے کہ اتنی ذرا سی مدت بھی نہ ٹھہرے گا، بلکہ برابر پھونکا جاتا رہے گا۔ ﴿ فَوَاقٍ ﴾ مشتق ہے "أَفَاقَه" بہ معنی رجوع سے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَفَاقَ الْمَرِيْضُ" جبکہ صحت کی طرف رجوع کرتا ہے اور "أَفَاقَتِ النَّاقَةُ تُفِيْقُ إِفَاقَةً" جبکہ وہ رجوع ہو اور فیقہ اس کے تھن میں جمع ہو جائے۔ فیقہ وہ دودھ ہے جو دودھ دوہنے کے درمیان اس کے تھنوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ اس کی جمع "فِيَقٌ أَفْوَاقٌ" اور جمع الجمع "أَفَاوِيْقُ" ہے۔ پس فواق کو فواق اس لیے کہتے ہیں کہ دودھ دوہنے کے زمانے کے درمیان دودھ رجوع کر آتا ہے۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ مِن فَوَاقٍ ﴾ کی تفسیر "مِنْ رَجْعَةٍ" اور امام مجاہد اور مقاتل رحمہما اللہ نے "مِنْ رُجُوْعٍ" کی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مِنْ إِفَاقَةٍ"۔ کسی نے کہا ہے کہ "مِنْ مَرَدٍّ"۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مِنْ نَظْرَةٍ وَّرَاحَةٍ وَإِفَاقَةٍ".

امام فراء، سدوسی، ابو عبیدہ، ابن زید اور سدی رحمہم اللہ نے کہا: ﴿ فَوَاقٍ ﴾ بہ فتحِ فاء راحت و افاقہ ہے، یعنی اس صیحہ سے افاقہ نہیں پائیں گے جیسے مریض اور وہ شخص افاقہ پاتا ہے جس پر غشی کی گئی ہے اور بالضم بہ معنی انتظار ہے۔ امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے بالضم پڑھا اور باقی قراء نے بالفتح پڑھا ہے۔[3] آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ صیحہ اُن کے

---

① "آلِ برمک پر ایسا عذاب ٹوٹ پڑا جس کی شدت کی وجہ سے وہ ٹھوڑیوں کے بل گر پڑے۔" ② معاني القرآن (٤/٣٢٣)

③ مختار الصحاح (١/٥١٧) ④ تفسير القرطبي (١٥/١٥٦) فتح القدير (٤/٥٥٨)

عذاب کی میعاد ہے، پس جب وہ آئے گا تو نہ رجوع ہو گا نہ ان سے رد کیا جائے گا اور نہ ان سے پھیرا جائے گا اور نہ توقف کرے گا اتنی دیر کے لیے جتنی دیر فواقِ ناقہ کی ہوتی ہے۔ یہ آیت معنی میں اس آیت کے مثل ہے: ﴿ فَإِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٣٤] ''جس وقت ان کی معیاد معین آ جائے گی، اس وقت ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔''

پھر جب عذاب کا سنا جس کی اللہ تعالیٰ نے ان کو وعید سنائی تو استہزاء وٹھٹھا کر کے یوں کہا: ﴿ رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴾۔ ''قِطٌّ'' لغت میں نصیب کے معنی میں ہے، قط سے ماخوذ ہے۔ قط بہ معنی قطع ہے۔ امام قتادہ اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلامِ عرب میں ''قط'' حظ ونصیب ہے، اسی معنی سے ''صلك'' کو قط کہتے ہیں۔ امام ابوعبیدہ اور کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قط کتاب بالجوائز ہے (یعنی چٹھی جو صلہ اور عطا کے لیے امراء لوگ لکھ دیتے ہیں کہ مثلاً فلاں کو اس قدر روپے دے دینا)۔ اس کی جمع ''قُطُوْطٌ'' ہے جس طرح کہ اعشیٰ کے شعر میں واقع ہوئی ہے۔ اس کی اصل ''قط الشيء'' بہ معنی قطعہ سے ہے، اسی معنی سے قط القلم ہے۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اپنے رب سے یہ سوال کیا کہ ان کے عذاب کا حصہ ان کو جلد دے دے۔ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ﴾ [الحج: ٤٧] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے رب سے یہ سوال کیا کہ جنت میں ان کے مکانات ان کے لیے ممثل کر دے، تاکہ ان کو جس شے کا وعدہ دیا جاتا ہے اس کی حقیقت کو جان لیں۔ اسماعیل بن ابی خالد رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ''عَجِّلْ لَنَا أَرْزَاقَنَا'' یعنی ہمارے رزق ہم کو جلدی دے دے۔ امام سعید بن جبیر اور سدی رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے۔ امام ابو العالیہ، کلبی اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ ﴾ [الحاقة: ٢٥] ''اور جسے اس (کے اعمال) کی کتاب اس کے بائیں ہاتھ میں دی جائے گی۔'' تو قریش بولے: اے محمد! تو نے یہ زعم کیا ہے کہ ہم کو ہماری کتاب بائیں ہاتھ میں ملے گی، پس تو جلدی کر ہمارے قط کے لیے یومِ حساب سے پہلے۔[1]

پھر اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو امر فرمایا کہ کفار کی باطل باتیں جن کو وہ سنتے ہیں جن میں سے وہ بات ہے جس کا ذکر ہوا اس پر صبر کریں: ﴿ اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ یعنی تو صبر کر ان کی باتوں پر اور اپنے نفس کو اس بات سے بچا کہ کہیں ان کی باتوں سے تمھیں جو تکلیف دی گئی ہے، اس پر صبر کرنے میں تو پھسل نہ جائے اور ان کی ایذاء کو برداشت کر۔ کسی نے کہا ہے کہ آیتِ سیف سے یہ آیت منسوخ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ محکم ہے۔ یہ قول صحیح ہے۔ جب اللہ پاک قرونِ ضلالت، کفر اور تکذیب کرنے والی اُمتوں کا ذکر کر چکا اور اپنے نبی کو کفار کی باتیں سننے پر صبر کرنے کا حکم دیا تو داود علیہ السلام اور ان کے مابعد کے قصے بیان کر کے آپ کو تسلی اور تشفی میں زیادتی فرمائی۔

[1] تفسیر القرطبي (١٥/١٥٧) فتح القدير (٤/١٥٨، ١٥٩)

ارشاد فرمایا: ﴿ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴾ یعنی داود علیہ السلام کا قصہ یاد کر، کیوں کہ تو اس میں وہ شے پائے گا جس سے تیری تسلی ہو جائے گی۔ "أَيْدٌ" بہ معنی قوت ہے جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا۔[1] اسی معنی سے قوی آدمی کو "رَجُلٌ أَيْدٌ" کہتے ہیں اور "تَأَيَّدَ الشَّيْءُ" بہ معنی "تَقَوّٰی" ہے۔ کلمۂ "أَيْدٌ" مفرد ہے بروزن "بَيْعٌ" اور مصدر ہے۔ "يَدٌ" کی جمع نہیں ہے۔ جب کوئی شخص قوی وسخت زور آور ہوتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "آدَ الرَّجُلُ يَئِيْدُ أَيْدًا وَإِيَادًا" بالکسر "فَهُوَ أَيِّدٌ مِثْلُ سَيِّدٌ وَهَيِّنٌ" اسی معنی سے یہ قول ہے: "أَيَّدَكَ اللّٰهُ تَائِيْدًا"۔

جملہ ﴿ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴾ ان کے قوی ہونے کی تعلیل ہے۔ ﴿ اَوَّابٌ ﴾ وہ ہے جو ہر اس شے سے رجوع کرنے والا ہو جس کو اللہ مکروہ رکھتا ہے اس شے کی طرف جس کو وہ محبوب رکھتا ہے۔ اس کام کی طاقت وہی رکھتا ہے جو اپنے دین میں بڑا قوی ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَوَّابٌ ﴾ وہ ہے جو جب کبھی اپنے گناہ کو یاد کرتا ہے تو اس سے استغفار وتوبہ کرتا ہے۔ یہ معنی پہلے معنی کے تحت داخل ہیں۔ "آبَ يَؤُبُ إِذَا رَجَعَ" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "أَوَّابٌ"، "مُسَبِّحٌ" ہے لغتِ حبشہ میں۔ ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: "اَلْأَوَّابُ"، "اَلْمُوْقِنُ"۔ امام دیلمی رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا میں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ﴿ اَوَّابٌ ﴾ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ اَوَّابٌ ﴾ وہ ہے جو تنہائی میں اپنے گناہوں کو یاد کرتا ہے اور اللہ سے مغفرت مانگتا ہے۔[2] پہلے اللہ پاک نے داود علیہ السلام کی مدح کی، پھر جو نعمتیں ان کو عطا کیں ان کا ذکر فرمایا:

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۙ۝۱۸ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝۱۹ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ۝۲۰

بے شک ہم نے پہاڑ اس کے تابع کر دیے تھے، جبکہ وہ (اس کے ساتھ) صبح وشام تسبیح کرتے رہتے تھے (18) اور پرندے بھی (تابع کر دیے تھے) اکٹھے کیے ہوئے، سب اس کے مطیع وفرماں بردار تھے (19) اور ہم نے اس کی بادشاہی مستحکم کر دی تھی اور ہم نے اسے حکمت اور فیصلہ کن بات (کی صلاحیت) دی تھی (20)

داود علیہ السلام پر انعاماتِ الٰہیہ کا تذکرہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا، وہ داود علیہ السلام کے ساتھ تسبیح کرتے تھے،

---

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۱۶۶) [2] الدر المنثور (۷/۱۴۹، ۱۵۰) فتح البیان (۱۲/۱۹-۲۲)

سورج نکلنے کے وقت اور دن کے آخر میں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ﴾ [سبا: ۱۰] ''اے پہاڑو! اس کے ساتھ رغبت سے تسبیح پڑھا کرو اور پرندوں کو بھی (یہی حکم ہے)۔'' اسی طرح ان کی تسبیح کے ساتھ پرندے تسبیح کرتے اور ان کی ترجیع کے ساتھ ترجیع کرتے جس وقت پرندے ان پر گزرتے اور وہ ہوا میں پھرتے ہوتے۔ پھر وہ داود علیہ السلام کو ترنم کے ساتھ زبور کی قراءت کرتے ہوئے سنتے تو انھیں جانے کی طاقت نہ رہتی، وہ ہوا میں ٹھہر جاتے اور ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور اونچے اونچے پہاڑ اُن کو جواب دیتے ان کے ساتھ ترجیع کرتے اور ان کے تابع ہو کر تسبیح کرتے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ ام ہانی رضی اللہ عنہا نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتحِ مکہ کے دن آٹھ رکعت نماز پڑھی۔ پس سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں نے واقعی یہ گمان کیا کہ بے شک اس گھڑی کے لیے ایک نماز ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: ﴿ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴾

پھر ابن جریر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن حارث بن نوفل سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ضحیٰ کی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ عبداللہ نے کہا: میں ان کو ام ہانی رضی اللہ عنہا کے پاس لے گیا۔ پھر میں نے کہا کہ تم ان کو وہ بات بتاؤ جو تم نے مجھے بتائی ہے۔ ام ہانی رضی اللہ عنہا نے کہا کہ فتحِ مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر پر تشریف لائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی مانگا، وہ ایک پیالے میں ڈال کر ان کو دیا گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کپڑا طلب فرمایا تو وہ میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان پکڑا گیا، یعنی پردہ کیا گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل فرمایا، پھر گھر کے کونے پر پانی چھڑکا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعت نماز پڑھی یہ ضحیٰ کا وقت تھا۔ ان رکعتوں کا قیام، رکوع، سجود اور جلوس تقریباً برابر تھا۔ پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نکلے اور یہ کہتے تھے کہ البتہ میں نے دو لوح کے درمیان جو ہے اس کو اچھی طرح پڑھا، مگر میں نے نمازِ ضحیٰ کو نہیں پہچانا، مگر اس وقت ﴿ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴾ میں کہتا تھا کہ نمازِ اشراق کہاں ہے؟ اس کے بعد صلاۃِ اشراق کہتے تھے۔[1] اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ﴾ یعنی اور پرندے رکے ہوئے ہوا میں۔ ﴿ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴾ یعنی سب کے سب ان کے مطیع تھے، ان کے تابع ہو کر تسبیح کرتے تھے۔

سعید بن جبیر، قتادہ، مالک عن زید بن اسلم اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَوَّابٌ ﴾ کے معنی مطیع ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ ﴾ یعنی ہم نے اس کے لیے ملک کو ان ساری چیزوں کے ساتھ کامل کر دیا جن کی بادشاہوں کو حاجت ہوتی ہے۔ امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: ''كَانَ أَشَدَّ أَهْلِ الدُّنْيَا سُلْطَانًا'' یعنی ساری دنیا والوں سے بڑھ کر ان کی سلطنت قوی تھی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر دن چار ہزار لوگ ان کی حراست کرتے تھے۔[2] بعض سلف نے کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ ہر رات تیس ہزار لوگ ان کی حراست

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۱۶۸، ۱۶۹) [2] تفسیر الطبري (۲۱/۱۶۹، ۱۷۰) تفسیر ابن کثیر (۴/۴۰)

کرتے تھے آیندہ سال تک ان کی باری دور نہ ہوتی۔ کسی اور نے کہا ہے کہ چالیس ہزار ہتھیار بند لوگ حراست کرتے تھے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل کے دو شخص تھے، ان میں سے ایک نے دوسرے کے خلاف داود علیہ السلام کے پاس اس بات کی شکایت کی کہ اس نے اس کا بیل غصب کر لیا ہے اور مدعی کے گواہ کوئی نہیں تھے۔ داود علیہ السلام نے ان کے معاملے کو مؤخر کر دیا، پھر جب رات ہوئی تو داود علیہ السلام کو خواب میں مدعی کے قتل کا حکم ہوا جب دن ہوا تو انھوں نے دونوں کو بلایا اور مدعی کے قتل کا حکم دیا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! آپ کس بات پر مجھے قتل کرتے ہیں، حالاں کہ اس شخص نے مجھ سے میرا بیل غصب کیا ہے۔ انھوں نے اس سے فرمایا کہ اللہ نے مجھے تیرے قتل کا حکم دیا ہے، پس میں تجھے ضرور قتل کرنے والا ہوں۔ وہ بولا: واللہ! اے اللہ کے نبی! اللہ نے آپ کو اس معاملے کی وجہ سے میرے قتل کا حکم نہیں دیا جس کا میں نے اس پر دعویٰ کیا ہے اور بے شک البتہ میں اپنے دعوے میں سچا ہوں، لیکن میں نے اس کے باپ کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور اس کو مار ڈالا تھا اور کسی کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ پھر داود علیہ السلام نے حکم دیا تو وہ مار ڈالا گیا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پھر بنی اسرائیل میں ان کی بہت شدید ہیبت ہوگئی۔ یہ وہی ہے جو اللہ عزوجل فرماتا ہے: ﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ﴾[1] (ذكره ابن جرير وابن أبي حاتم من رواية علباء بن أحمر عن عكرمة عنه)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حکمت سے مراد فہم و عقل اور فطانت ہے، یعنی زیرکی اور دانائی۔ ایک دفعہ یہ کہا کہ حکمت عدل ہے۔ ایک دفعہ یہ کہا کہ صواب ہے، یعنی خطا کے برعکس۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کتاب اللہ ہے اور اس شے کا اتباع ہے جو اس میں ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حکمت نبوت ہے۔ قاضی شریح اور شعبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ فصل الخطاب شہود و ایمان ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو گواہ پیش کرنا مدعی کے لیے ہے یا مدعا علیہ کی قسم۔ یہ وہ فصلِ خطاب ہے جس کے ساتھ انبیاء اور رسول یا یہ کہا کہ مومنین اور صالحین نے فیصلہ کیا ہے۔ یہ روزِ قیامت تک اس اُمت کی قضا، یعنی فیصلہ کرنے کا طریقہ ہے۔ اسی طرح ابو عبدالرحمان سلمی نے بھی کہا ہے۔ امام مجاہد اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اصابتِ قضا و فہمِ قضا ہے۔ نیز امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فصل ہے کلام میں اور حکم میں۔ یہ قول اس سب کو شامل ہے اور یہی مراد ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ (وكذا أخرجه الديلمي كذا في الفتح) کہ سب سے پہلے جس شخص نے اما بعد کہا وہ داود علیہ السلام ہیں اور یہ فصل الخطاب ہے۔ اسی طرح امام شعبی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ ﴿وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾ "أَمَّا بَعْدُ" ہے۔ (أخرج سعيد بن منصور عن الشعبي أنه سمع زياد بن أبيه يقول: فصل الخطاب الذي أوتيه داود رحمه الله أما بعد. كذا في فتح البيان)۔

[1] تفسير الطبري (٢١/١٧٠، ١٧١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ ﴾ کلامِ مستانف ہے، اس سے مقصود دو امر کی تعلیل ہے: ایک یہ کہ وہ دین میں قوی تھے، دوسرا یہ کہ رضائے الٰہی کی طرف بہت رجوع ہونے والے تھے۔ کلمہ ﴿ مَعَهٗ ﴾ ﴿ سَخَّرْنَا ﴾ سے متعلق ہے یہاں کلمہ "مع" کو لام پر اختیار کیا، "له" نہ فرمایا، چنانچہ اس کی وجہ وہ ہے جس کی طرف سورۃ الانبیاء میں اشارہ کیا گیا ہے، تسخیرِ جبال اس طرح سے نہ تھی کہ ان میں ان کو کلی اختیار دیا گیا ہو، جس طرح کہ سلیمان علیہ السلام کے لیے تسخیرِ ہوا تھی، بلکہ یہ تسخیرِ اتباع و اقتداء کے طور پر تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ تسخیرِ جبال یہ تھی کہ وہ ان کے ساتھ چلتے، جبکہ وہ ان کے چلنے کا ارادہ کرتے جہاں چاہتے۔

جملہ ﴿ يُسَبِّحْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے، بنا بر حال ﴿ اَلْجِبَالَ ﴾ سے۔ "مسبحات" نہ فرمایا، بلکہ جملہ فعلیہ کہا، تاکہ اس بات پر دال ہو کہ جبال سے تسبیح "شَيْئًا فَشَيْئًا وَحَالًا بَعْدَ حَالٍ" واقع ہوتی تھی۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے پہاڑوں کو اس طرح تابع کیا کہ وہ ان کے ساتھ تسبیح و تقدیس و تنزیہ کرتے تھے اللہ پاک کی اس شے سے جو اس کے لائق نہیں ہے۔ یہ اس برہان اور معجزے کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیا تھا کہ پہاڑ اُن کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت داود علیہ السلام اللہ کا ذکر کرتے تو پہاڑ بھی ان کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور وہ پہاڑوں کی تسبیح کو سمجھتے تھے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ داود علیہ السلام کو خوش الحانی میں سے وہ شے ملی تھی جس کی پہاڑوں میں ایک گونج ہوتی تھی لہٰذا تسبیحِ جبال کے یہ معنی ہیں،[1] لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يُسَبِّحْنَ ﴾ کے معنی "يُصَلِّيْنَ" ہیں۔

﴿ بِالْعَشِيِّ ﴾ سے مراد نمازِ عشاء کا وقت ہے اور ﴿ وَالْاِشْرَاقِ ﴾ سے مراد نمازِ ضحیٰ کا وقت ہے۔ ضحیٰ یہ ہے کہ سورج روشن ہو اور اس کی روشنی پوری ہو۔ معنی یہ ہیں کہ داود علیہ السلام اپنے نماز کے بعد سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے وقت تسبیح کرتے تھے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: "غُدْوَةً وَّعَشِيَّةً"[2] یعنی صبح و شام۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَشْرَقَتِ الشَّمْسُ إِذَا أَضَاءَتْ" اور یہ ضحیٰ کا وقت ہے اور شروقِ شمس سورج کا طلوع ہونا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "شَرَقَتِ الشَّمْسُ" اس وقت کہتے ہیں جب سورج طلوع ہوتا ہے اور "أَشْرَقَتْ إِذَا أَضَاءَتْ"[3] یعنی "أَشْرَقَتْ" اس وقت بولتے ہیں جب وہ خوب روشن ہو جائے۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں، فرمایا: میرے جی میں ضحیٰ کی نماز کے متعلق ہمیشہ شبہہ رہا، یہاں تک کہ میں نے یہ آیت پڑھی۔ ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: البتہ مقرر مجھ پر ایک ایسا وقت تھا کہ میں اس آیت کی وجہ نہ جانتا تھا،

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/١٥٩) [2] تفسير البغوي (٧/٧٦) [3] معاني القرآن (٤/٣٢٤)

یہاں تک کہ میں نے لوگوں کو ضحیٰ کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ (أخرجه ابن المنذر وابن مردويه)۔ ان کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں: میں اس آیت پر گزرتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ یہ کیا ہے، یہاں تک کہ مجھے ام ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا نے حدیث بیان کی کہ فتحِ مکہ کے دن ان کے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کے لیے پانی منگوایا اور وضو کیا، پھر ضحیٰ کی نماز پڑھی، پھر فرمایا: اے اُم ہانی! یہ صلاۃ الاشراق ہے۔[1] صلاتِ ضحیٰ میں بہت سی حدیثیں ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے "شرح منتقی" میں ان کو ذکر کیا ہے۔[2]

﴿ وَالطَّيْرَ ﴾ معطوف ہے ﴿ الْجِبَالَ ﴾ پر اور ﴿ مَحْشُورَةً ﴾ منصوب ہے بنا بر حال ﴿ الطَّيْرَ ﴾ سے۔ "أَيْ: وَسَخَّرْنَا الطَّيْرَ حَالَ كَوْنِهَا مَحْشُورَةً أَيْ: مَجْمُوعَةً إِلَيْهِ" یعنی ہم نے اس کے لیے پرندے مسخر کیے اس حال میں کہ وہ ہر طرف سے تسبیح کرتے ہوئے اس کے پاس جمع ہو جاتے۔ کہا ہے کہ فرشتے ان کو جمع کر دیتے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہوا جمع کر دیتی تھی۔ ﴿ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴾ ﴿ كُلٌّ ﴾ کی تنوین عوض ہے مضاف الیہ سے۔ "أَيْ: كُلُّ وَاحِدٍ مِنْ دَاوُدَ وَالْجِبَالِ وَالطَّيْرِ" یعنی ہر ایک داود علیہ السلام اور پہاڑوں اور پرندوں سے رجوع کرنے والا ہے اللہ کے امر اور اطاعت کی طرف۔ ﴿ لَّهٗٓ ﴾ کی ضمیر اللہ سبحانہٗ کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ داود علیہ السلام کی طرف راجع ہے، یعنی ہر ایک داود علیہ السلام کی تسبیح کے واسطے تسبیح کرنے والا ہے۔ پس ﴿ اَوَّابٌ ﴾ مسبح کی جگہ میں رکھا گیا ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ ﴿ اَوَّابٌ ﴾ کے معنی اللہ پاک کی طرف کثرت سے رجوع کرنے والا ہے۔

﴿ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے اس کے ملک کو اس طرح مضبوط اور ثابت کیا کہ لڑائی کے معرکوں میں ہم نے اس کی مدد کی اور اسے کامیاب کیا اور اس کی طرف سے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ہم نے لشکروں کی کثرت سے اس کو قوت دی۔ ہر رات ان کی محراب کے گرد تینتیس یا چھتیس ہزار آدمی ان کی حراست کرتے تھے۔ وہ دنیا کے بادشاہوں سے اپنی بادشاہت میں بڑھے ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل کے دو آدمیوں کا قصہ جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے پہلے گزر چکا ہے۔ اسے یہاں بھی عبد بن حمید کی تخریج سے ذکر کیا ہے، لیکن اس میں الفاظ اور عبارت کا فرق ہے۔[3]

حکمت سے مراد نبوت ہے اور اس شے کی معرفت ہے جس کا حکم دیا جاتا تھا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فہم اور علم۔ کسی نے کہا ہے کہ زبور اور شریعتوں کا علم۔ کسی نے کہا ہے کہ معاملہ فہمی میں اصابت۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر کلام جو حق کے مطابق ہو، وہ حکمت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عدل۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کتاب اللہ کا علم۔ شریح نے کہا ہے کہ سنت۔ بعض اقوال پہلے گزر چکے ہیں، ان سب معانی پر آیت کو محمول کرنے میں کوئی ممانعت

---

[1] الدر المنثور (۱۵۰/۷) [2] نيل الأوطار (۷۳/۳) [3] الدر المنثور (۱۵۳/۷، ۱۵٤)

نہیں ہے۔ ''فصلِ خطاب'' سے مراد ''فصل فی القضاء'' ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ، کلبی اور مقاتل رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے اکثر سے حکایت کیا ہے کہ ''فصلِ خطاب'' ''شہود و ایمان'' ہیں، اس لیے کہ خصومت انہی سے منقطع ہوتی ہے۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ گواہ مدعی پر اور قسم اس شخص پر جس نے انکار کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ حق و باطل کے درمیان فصل ہے۔ امام شریح، شعبی اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ مراد ایجاز ہے۔ ایجاز تھوڑے الفاظ میں کثیر معنی ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ بیان کلام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حکم کا علم ہے اور قضا کا تبصّر ہے، یعنی فیصلے کی بصارت حاصل کرنا۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ جب اللہ پاک نے داود علیہ السلام کی مذکورہ اوصاف کے ساتھ مدح فرمائی تو اس کے بعد ایک قصہ بیان کیا جو اُن کے ساتھ پیش آیا، اس لیے کہ اس میں عجیب و غریب خبریں ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿٢١﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿٢٢﴾ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿٢٣﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ۭ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۩ ﴿٢٤﴾ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ۭ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٢٥﴾ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿٢٦﴾

اور کیا آپ کے پاس جھگڑنے والوں کی خبر آئی جب وہ دیوار پھاند کر کمرے میں آ گئے (21)

[1] تفسير القرطبي (١٦٢/١٥) فتح القدير (٥٦٠/٤) [2] فتح البيان (٢٢/١٢-٢٤)

جب وہ داود کے پاس پہنچے تو وہ ان سے ڈر گئے، انھوں نے کہا: آپ مت ڈریں! (ہم) دو جھگڑنے والے ہیں، ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے، لہٰذا آپ ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ فرمائیں اور بے انصافی نہ کریں اور سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کریں ﴿22﴾ بے شک یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے، تو یہ کہتا ہے کہ وہ بھی میرے سپرد کر دے، اور اس نے بات چیت میں مجھے دبا لیا ہے ﴿23﴾ آپ نے فرمایا: تیری دنبی اپنی دنبیوں میں ملانے کا کہہ کر اس نے یقیناً تجھ پر ظلم کیا ہے اور بلاشبہ مل جل کر کام کرنے والوں میں سے بہت سے ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور ایسے لوگ تھوڑے ہی ہیں اور داود نے جان لیا کہ ہم نے اسے آزمایا ہے، لہٰذا اس نے اپنے رب سے بخشش مانگی اور وہ جھک کر گر پڑا اور (اللہ کی طرف) رجوع کیا ﴿24﴾ پھر ہم نے اس کی یہ غلطی بخش دی اور بے شک اس کے لیے ہمارے پاس بڑا قرب اور اچھا ٹھکانا ہے ﴿25﴾ (ہم نے کہا:) اے داود! بے شک ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرنا اور نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی، بلاشبہ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں، ان کے لیے شدید عذاب ہے، اس لیے کہ وہ یوم حساب کو بھول گئے ﴿26﴾

قصہ دو جھگڑنے والوں کا:

داود علیہ السلام نے باری مقرر کر رکھی تھی، ایک دن دربار کا، ایک دن اپنی عورتوں کے پاس اور ایک دن عبادت کا۔ اس دن آپ خلوت میں رہتے تھے، دربان کسی کو اندر نہ آنے دیتے۔ کئی شخص دیوار سے کود کر ان کے پاس آ گئے۔ جھگڑا کرنے والے جو اُن کے پاس آ گئے، وہ فرشتے تھے، پردے میں ان کو انہی کا ماجرا سنا گئے۔ گھر میں ننانوے عورتیں تھیں، ایک ہمسایہ عورت پر نظر پڑ گئی، چاہا کہ ان کو اپنے گھر میں رکھیں۔ اس کا خاوند موجود تھا جو اُن کے لشکر میں تھا، اس کو تابوتِ سکینہ کے آگے متعین کیا، جہاں بڑے بہادر لوگ لڑائی میں آگے بڑھتے تھے، وہ شخص شہید ہو گیا، بعد میں اس کی عورت کے ساتھ نکاح کیا، اس میں کسی کا خوف نہیں کیا، نہ ہی یہ کوئی معیوب بات تھی، یہ تو تدبیر کے ساتھ کسی کی چیز کو لینا تھا، پیغمبروں کی صفائی کے لیے اتنا داغ بھی عیب تھا، اس لیے اس پر مطلع کیا گیا۔ انتہی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے اس جگہ ایک ایسا قصہ ذکر کیا ہے جو زیادہ تر اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔ اس قصے کے بارے میں جناب معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت نہیں ہوئی جس کا اتباع واجب ہو، لیکن

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک حدیث روایت کی ہے جس کی سند صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وہ بروایتِ یزید رقاشی عن انس رضی اللہ عنہ ہے۔ یزید تو صالحین میں سے ہیں، لیکن ائمہ کے نزدیک ضعیف الحدیث ہیں۔ لہٰذا زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس قصے کی صرف تلاوت پر اکتفا کیا جائے اور اس کا علم اللہ عزوجل کے حوالے کریں، اس لیے کہ قرآن شریف حق اور جو شے اس میں شامل ہے، وہ بھی حق ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَفَزِعَ مِنْهُمْ ﴾ یعنی داود علیہ السلام آنے والوں سے گھبرائے۔ گھبرانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ محراب میں تھے۔ یہ مکان ان کے گھر میں شریف تر تھا اور وہ حکم دے چکے تھے کہ اس دن ان پر کوئی داخل نہ ہو۔ پھر انھیں پتا بھی نہ چلا اور دو شخص دیوار پھاند کر محراب میں ان کے پاس آ گئے۔ ان سے اپنے معاملے میں فیصلہ کروانے لگے۔ ﴿ وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ بات میں وہ مجھ پر غالب ہوا۔ جب کوئی شخص کسی پر قاہر و غالب ہو تو محاورے میں بولتے ہیں: "عَزَّ یَعَزُّ"۔ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے ﴿ فَتَنّٰهُ ﴾ کی تفسیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں روایت کی ہے۔ "اِخْتَبَرْنَاهُ"[1] یعنی ہم نے اس کو جانچا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴾ "أَيْ: سَاجِدًا" یعنی وہ سجدہ کرتے ہوئے گرے، مطلب یہ کہ رکوع سجدہ کے معنی میں ہے، یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے رکوع کیا، پھر اس کے بعد سجدہ کیا۔ یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ وہ چالیس صبح سجدہ کرتے رہے۔ ﴿ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ﴾ یعنی پھر ہم نے اس کو وہ بات بخش دی جو اس سے ہو گئی، وہ ان امور میں سے تھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے: "إِنَّ حَسَنَاتِ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ"

ائمہ نے سجدۂ ص میں اختلاف کیا ہے کہ یہ عزائم سجود سے ہے یا نہیں۔ اس میں دو قول ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب میں قولِ جدید یہ ہے کہ یہ عزائمِ سجود سے نہیں ہے، بلکہ سجدۂ شکر ہے، اس کی دلیل وہ قول ہے جو امام احمد رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ سجدۂ صٓ عزائمِ سجود سے نہیں ہے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سجدہ کرتے تھے۔[2] (ورواه البخاري وأبو داود والترمذي والنسائي في تفسيره من حديث أيوب به، وقال الترمذي: حسن صحيح) نیز امام نسائی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صٓ میں سجدہ کیا اور فرمایا کہ داود علیہ السلام نے ازروئے توبہ اس کا سجدہ کیا اور ہم ازروئے شکر اس کا سجدہ کرتے ہیں۔[3] "تفرد بروايته النسائي ورجال إسناده كلهم ثقات"۔

---

[1] تفسير الطبري (۲۱/۱۸۱)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۰۱۹) سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۴۰۹) سنن الترمذي، رقم الحديث (۵۷۷) مسند أحمد (۱/۳۵۹)

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (۹۵۷) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح أبي داود: ۵/۱۵۴)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنے شیخ حافظ ابو الحجاج مزی سے بہ سندِ خود تا حسن بن محمد بن عبید اللہ بن ابی یزید روایت کیا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ ابن جریج رحمہ اللہ نے مجھ سے کہا: اے حسن! تیرے دادا عبید اللہ بن ابی یزید نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مجھے یہ حدیث بیان کی ہے کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّيْ رَأَيْتُ فِيْمَا يَرَى النَّائِمُ" یعنی میں نے خواب میں دیکھا، گویا میں ایک درخت کی اوٹ میں نماز پڑھ رہا ہوں، پھر میں نے سجدہ پڑھا۔ پھر میں نے سجدہ کیا تو میرے سجدے کے سبب سے اس درخت نے سجدہ کیا۔ پھر میں نے سنا کہ وہ درخت سجدہ کرنے میں یہ کہتا تھا: "اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيْ بِهَا عِنْدَكَ أَجْرًا، وَاجْعَلْهَا لِيْ عِنْدَكَ ذُخْرًا، وَضَعْ بِهَا عَنِّيْ وِزْرًا، وَاقْبَلْهَا مِنِّيْ كَمَا قَبِلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗدَ" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: پھر میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے، پھر سجدہ کیا، پھر میں نے سنا کہ سجدے کی حالت میں ویسا ہی کہتے تھے جیسا کہ اس شخص نے اس درخت کا قول بیان کیا تھا۔[1] (رواه الترمذي عن قتيبة وابن ماجه عن أبي بكر بن خلاد كلاهما عن محمد بن يزيد بن خنيس نحوه وقال الترمذي: غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه)

نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں عوام سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے مجاہد سے سورت صٓ کا پوچھا تو کہا کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ تم نے کہاں سے سجدہ کیا، یعنی اس سجدے کی دلیل کیا ہے؟ فرمایا: کیا تو یہ آیت نہیں پڑھتا: ﴿ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ [الأنعام: ٨٤۔ ٩٠] "اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اور اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں۔ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو، یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو، اور ان سب کو جہانوں پر فضیلت دی۔ اور ان کے باپ دادا اور ان کی اولادوں اور ان کے بھائیوں میں سے بعض کو بھی اور ہم نے انھیں چنا اور انھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے، وہ اس پر اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے چلاتا ہے اور اگر یہ لوگ شریک بناتے تو یقیناً ان سے ضائع ہو جاتا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہم نے کتاب اور

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٧٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٥٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧١٠)

حکم اور نبوت عطا کی، پھر اگر یہ لوگ ان باتوں کا انکار کریں تو ہم نے ان کے لیے ایسے لوگ مقرر کیے ہیں جو کسی صورت ان کا انکار کرنے والے نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، سوتو ان کی ہدایت کی پیروی کر۔'' پس داود علیہ السلام ان لوگوں میں سے ہیں جن کی اقتداء کرنے کا تمھارے نبی ﷺ کو حکم ہوا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے یہ سجدہ کیا ہے۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے بکر بن عبد اللہ مزنی سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ سورت صٓ لکھ رہے ہیں اور جب وہ اس آیت تک پہنچے جس میں سجدہ کیا جاتا ہے تو دوات اور قلم اور ہر شے جو اُن کے روبرو ہے، وہ سجدہ کرتے ہوئے اوندھی گری۔ کہا: پھر یہ خواب نبی اکرم ﷺ سے بیان کیا تو آپ ﷺ اس کے بعد ہمیشہ اس میں سجدہ کرتے رہے۔[2] (تفرد به أحمد) امام ابو داود رحمہ اللہ نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورت صٓ پڑھی اور آپ ﷺ منبر پر تھے، پھر جب سجدے کی آیت پر پہنچے تو آپ اترے اور سجدہ کیا اور لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کیا، پھر جب اور دن ہوا تو آپ ﷺ نے اس کو پڑھا اور جب سجدے کو پہنچے تو لوگ سجدہ کے لیے منتظر اور متوقع ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ تو صرف ایک نبی کی توبہ ہے، لیکن میں نے تم کو دیکھا کہ تم منتظر ہوئے، پھر آپ ﷺ اترے اور سجدہ کیا۔[3] (تفرد به أبو داود وإسناده على شرط الصحيح)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴾ یعنی بے شک اس کے لیے قیامت کے دن البتہ قربت اور مرتبہ ہے کہ اللہ عزوجل اس کے سبب سے اس کو قریب کرے گا اور حسن مرجع ہے، یعنی اس کے مکمل عدل اور نبوت کے سبب سے، وہ عدل جو اس نے اپنے ملک میں کیا، اس کے لیے جنت میں بلند درجات ہیں، جیسا کہ صحیح میں آیا ہے کہ عدل کرنے والے نور کے منبروں پر رحمان کی سیدھی طرف ہوں گے اور اس کے دونوں ہاتھ سیدھے ہیں، یعنی وہ لوگ جو اپنے گھر والوں میں اور اس میں جس کے وہ والی ہوئے عدل کرتے ہیں۔[4] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور اس سے سب سے زیادہ قریب امامِ عادل ہے اور لوگوں میں سب سے زیادہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جس پر ناراض ہوگا اور جس پر سب سے سخت عذاب ہوگا، وہ امامِ جائر، یعنی ظالم حکمران ہوگا۔[5] (ورواه الترمذي من حديث فضيل وهو ابن مرزوق الأغر عن عطية به، وقال: لا نعرفه مرفوعا إلا من هذا الوجه)

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٢٩)

② مسند أحمد (٧٨/٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٥٧٤/٢)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤١٠) دیکھیں: (صحيح أبي داود: ١٥٤/٥) ④ صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢٧)

⑤ مسند أحمد (٢٢/٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢٩) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١١٥٧)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے جعفر بن سلیمان سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے مالک بن دینار کو سنا کہ وہ آیتِ مذکور کی تفسیر میں یوں کہتے تھے کہ قیامت کے دن داود علیہ السلام ساقِ عرش (عرش کے پائے) کے نزدیک کھڑے کیے جائیں گے۔ پھر اللہ پاک فرمائے گا: اے داود! آج کے دن تو میری اس حسین اور نرم آواز سے میری تمجید کر جس سے تو دنیا میں میری تمجید کرتا تھا تو داود علیہ السلام عرض کریں گے، میں کیسے تیری تمجید کروں، وہ آواز تو مجھ سے سلب کر لی گئی ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں آج وہ آواز تجھے لوٹا دوں گا، کہا: پھر داود علیہ السلام وہ آواز اٹھائیں گے، جس سے اہلِ جنت کو تمام نعمتوں سے فارغ کر دیں گے،[1] یعنی سارے جنت والے اس آواز کے سننے میں ایسے مصروف ہوں گے کہ اس وقت جنت کی اَور نعمتوں کا کچھ خیال نہ رہے گا۔

حکام وسلاطین کو وصیت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے والیانِ امور کو ایک وصیت ہے کہ لوگوں کے درمیان اس حق کے ساتھ فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ کے پاس سے اتارا گیا ہے اور اس سے مائل نہ ہوں کہ اللہ کی راہ سے بہک جائیں اور جو شخص اللہ پاک کی راہ سے بہکا اور حساب کے دن کو بھلا بیٹھا اللہ پاک نے اس کو سخت وعید اور عذاب کی وعید سنائی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے مروان بن جناح سے روایت کیا ہے، کہا: مجھے ابراہیم ابو زرعہ رضی اللہ عنہ نے حدیث کی اور بے شک انھوں نے اس بات کی کتاب پڑھی تھی کہ ولید بن عبدالملک نے ان سے کہا: کیا خلیفہ سے حساب لیا جائے گا، کیوں کہ تو واقعی پہلی کتاب پڑھ چکا ہے اور تو نے قرآن پڑھا ہے اور سمجھا ہے؟ تو میں نے کہا: اے امیر المومنین! کیا میں کچھ کہوں؟ کہا: ہاں! تو کہہ! تو امن میں ہے، میں نے کہا: اے امیر المومنین! کیا اللہ کے نزدیک آپ کی زیادہ عزت ہے یا داود علیہ السلام کی۔ اللہ تعالیٰ نے تو اُن کے لیے نبوت اور خلافت دونوں جمع کر دی تھیں، پھر ان کو اپنی کتاب میں وعید سنائی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا ... الآية ﴾[2] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴾ مقدم و موخر کے باب سے ہے۔ اصل یوں ہے: "لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ يَوْمَ الْحِسَابِ بِمَا نَسُوْا" امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا تَرَكُوْا أَنْ يَّعْمَلُوْا لِيَوْمِ الْحِسَابِ"[3] یعنی ان کے لیے اس سبب سے سخت عذاب ہے کہ انھوں نے اس بات کو ترک کیا کہ روزِ حساب کے لیے عمل کریں۔ یہ قول ظاہر آیت پر زیادہ چلتا ہے۔[4] واللہ سبحانہ و تعالیٰ الموفق للصواب.

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲٤۰/۱۰)
[2] تفسیر ابن کثیر (٤۳/٤)
[3] تفسیر الطبري (۱۸۹/۲۱)
[4] تفسیر ابن کثیر (٤۱/٤۔٤۳)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اس جگہ ﴿ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ﴾ کے استفہام کے معنی تعجب کے ہیں اور اس شے کا شوق دلانا ہے جو اس کے بعد آتی ہے، کیوں کہ وہ ایک عجیب وغریب بات ہے، جس طرح تم اپنے مخاطب سے کہتے ہو کہ ''کیا تو جانتا ہے جو آج واقع ہوا، پھر جو واقع ہوا ہے اس کا اس سے بیان کرو۔'' امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داود علیہ السلام کی طرف دو فرشتے بھیجے جرائیل اور میکائیل علیہما السلام، تاکہ ان کو توبہ کے بارے میں احساس دلائیں۔ چنانچہ وہ دونوں ان کے پاس آئے، جب وہ اپنی محراب میں تھے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بارے میں اہلِ تفسیر کے درمیان کسی طرح کا اختلاف نہیں کہ اس جگہ ''خصم'' سے مراد دو فرشتے ہیں۔ خصم مصدر ہے جو واحد، تثنیہ اور جمع کے لیے آتا ہے۔ ﴿ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴾ کے وہ فرشتے اُن کی دیوار کے اوپر سے پھلانگ کر ان کی طرف اترے۔ ''سور'' اونچی دیوار ہے۔

﴿ تَسَوَّرُوا ﴾ میں جو جمع کا لفظ آیا ہے، حالاں کہ وہ دو تھے تو یہ جمع کے لیے ہے جس کا لفظ ''خصم'' سے احتمال ہوتا ہے۔ محراب سے مراد غرفہ ہے، یعنی بالا خانہ، اس لیے کہ وہ فرشتے ان پر چڑھ آئے اور وہ اس میں تھے۔ یحییٰ بن سلام نے اسی طرح کہا ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محراب صدر مجلس ہے، اسی معنی سے محرابِ مسجد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ دونوں انسان تھے، فرشتے نہ تھے۔ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ کے متعلق کئی قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس میں عامل ﴿ نَبَؤُا ﴾ ہے۔ ''أَيْ: هَلْ أَتَاكَ الْخَبَرُ الْوَاقِعُ فِيْ وَقْتِ تَسَوُّرِهِمْ'' امام ابن عطیہ، مکی اور ابو البقا رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں عامل ﴿ اَتٰىكَ ﴾ ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ ﴿ الْخَصْمِ ﴾ کا معمول ہے۔ چوتھا یہ ہے کہ محذوف کا معمول ہے۔ ''أَيْ: هَلْ أَتَاكَ نَبَأُ تَحَاكُمِ الْخَصْمِ''۔[1] امام زمخشری رحمہ اللہ نے ﴿ اَتٰىكَ ﴾ اور ﴿ نَبَؤُا ﴾ کے ساتھ متعلق ہونے کو ناجائز رکھا ہے اور محذوف کے ساتھ متعلق ہونے کو اختیار کیا ہے اور ﴿ اِذْ دَخَلُوْا ﴾ کا ﴿ اِذْ ﴾ پہلے ﴿ اِذْ ﴾ سے بدل ہے، یا ﴿ تَسَوَّرُوا ﴾ کا معمول ہے۔[2] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظرفین مذکورین میں سے ایک بہ معنی ''لَمَّا'' ہے۔

بالجملہ جب وہ فرشتے داود علیہ السلام پر داخل ہوئے تو وہ گھبرائے۔ گھبرانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ رات کو آئے جو خصوم کے آنے کا وقت نہیں تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ان کے اذن کے بغیر آئے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس دروازے سے نہ آئے جس سے لوگ آتے تھے۔ امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا: ''کَانَ مِحْرَابُ دَاوٗدَ مِنَ الْاِمْتِنَاعِ بِالْاِرْتِفَاعِ بِحَيْثُ لَا يَرْتَقِيْ إِلَيْهِ آدَمِيٌّ بِحِيْلَتِهِ''[3] یعنی داود علیہ السلام کا عبادت خانہ اپنی بلندی کی وجہ سے محفوظ تھا، اتنا بلند تھا

[1] فتح القدير (٥٦٠/٤) [2] الكشاف (٨٤/٤، ٨٥) [3] تفسير القرطبي (١٧٠/١٥) فتح القدير (٥٦٠/٤)

کہ کوئی آدمی کسی حیلے اور تدبیر سے اس کی طرف چڑھ نہیں سکتا تھا۔ جب ایسی محفوظ جگہ میں رات کے وقت دو شخص آ گئے تو یہ اُن کے گھبرا جانے کا سبب ہوا۔

جملہٴ ﴿ قَالُوْا لَا تَخَفْ ﴾ مستانفہ ہے۔ سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا کہ جب داود علیہ السلام فرشتوں سے ڈرے تو فرشتوں نے ان سے کیا کہا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ انھوں نے ان سے یہ کہا کہ تو مت ڈر۔ ﴿ خَصْمٰنِ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ "أَيْ: نَحْنُ خَصْمَانِ" یعنی ہم دو جھگڑنے والے ہیں۔ اول "خَصْم" کی طرف جمع کی ضمیر راجع کی ﴿ تَسَوَّرُوا ﴾ اور ﴿ دَخَلُوْا ﴾ کہا تھا اور یہاں ﴿ خَصْمٰنِ ﴾ تثنیہ کے طور پر آیا تو اس کی وہی وجہ مذکور ہے کہ لفظ "خَصْم" میں واحد، تثنیہ اور جمع کا احتمال ہے۔ چنانچہ ان سب میں اس کا استعمال جائز ہے۔ خلیل نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہ اس طرح ہے جیسے تم کہتے ہو: "نَحْنُ فَعَلْنَا كَذَا" جبکہ تم دو ہوتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ استعمالِ عرب میں دو پر جمع کا اطلاق کرتے ہیں۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "خَصْم" کے ساتھ جمع کا برتاؤ کیا گیا جبکہ خبر تھی، پھر جب خبر پوری ہو چکی اور مخاطبہ آیا تو دو نے اپنی طرف سے خبر دی تو ﴿ خَصْمٰنِ ﴾ کہا۔

﴿ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ ﴾ یہ قول بطور فرض و تقدیر کے ہے، یا تعریض کے طور پر، کیوں کہ یہ بات معلوم ہے کہ فرشتے بغی اور زیادتی نہیں کرتے۔ پھر دونوں نے داود علیہ السلام سے یہ چاہا کہ ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور ان کو ظلم سے منع کیا۔ چنانچہ یوں کہا: ﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ ﴾ یعنی تو ہمارے درمیان حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کر اور اپنے فیصلے میں ظلم اور زیادتی نہ کر۔ جب کوئی شخص اپنے فیصلے میں ظلم کرتا ہے اور حد سے بڑھ جاتا ہے تو محاورہٴ عرب میں یوں بولتے ہیں: "شَطَّ الرَّجُلُ وَأَشَطَّ شَطَطًا وَأَشْطَاطًا" امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "شَطَطْتُ عَلَيْهِ وَأَشْطَطْتُ فِيهِ" کے معنی ہیں: "جُرْتُ"[1] یعنی میں نے ظلم کیا۔ پس یہ اس قسم سے ہے جس میں "فَعَلَ"، "أَفْعَلَ"، متفق ہیں۔ کسی نے کہا: ﴿ وَلَا تُشْطِطْ ﴾ کے معنی ہیں: "وَلَا تُسْرِفْ"۔ کسی نے کہا ہے کہ "لَا تُفْرِطْ" ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "لَا تَمِلْ" ہیں۔ یہ سب معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں، اس میں اصل چیز بعد ہے جو "شَطَّتِ الدَّارُ إِذَا بَعُدَتْ" سے ماخوذ ہے۔ امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "شَطَطَ" ہر شے میں مجاوزتِ قدر ہے۔

﴿ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴾ ﴿ سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴾ بہ معنی وسطِ صراط ہے اور میانہ راہ، یعنی عدل و صواب۔ معنی یہ ہیں کہ ہم کو حق کی راہ بتا اور اس پر ہمیں آمادہ کر۔ پھر جب دونوں نے داود علیہ السلام کو بالاجمال اپنے جھگڑے کی خبر دی تو اب اس کی تفصیل بتانے لگے اور یوں کہا: ﴿ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ لَهٗ ... الخ ﴾ اخوت سے اس جگہ اخوتِ دین مراد ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔[2] یا یہ اخوت صحبت اور اُلفت کی ہے، یا شرکت و خلطت کی اخوت

---

[1] فتح القدير (٥٦١/٤)
[2] فتح القدير (٥٦١/٤)

ہے۔ ﴿ نَعْجَةً ﴾ بھیڑ کی مادہ کو کہتے ہیں اور کبھی جنگلی گائے کو ﴿ نَعْجَةً ﴾ بولتے ہیں۔ یا عورت کی ﴿ نَعْجَةً ﴾ کے ساتھ تعبیر کی جاتی ہے، (امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کتاب الکنایہ میں اس کی تصریح کی ہے) کیوں کہ اس میں بھی عجز وضعف جانب ہے جس پر وہ مخلوق ہوئی ہے۔ اور کبھی عورت کا بقرہ، حجر اور ناقہ کے ساتھ کنایہ کیا جاتا ہے، اس لیے کہ ان سب پر سواری کی جاتی ہے۔ (بقرہ گائے کو کہتے ہیں، حجر گھوڑے کی مادہ کو اور ناقہ اونٹنی کو)۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ نَعْجَةً ﴾ وحشی گائے ہے۔ عرب لوگ اس کے ساتھ عورت کا کنایہ کرتے ہیں اور نعاج کے ساتھ عورتوں کو تشبیہ دیتے ہیں۔ (''نِعَاجٌ'' جمع ''نَعْجَةٌ'' بہ معنی وحشی گائے۔)

جمہور نے ﴿ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ ﴾ کو بہ کسرِ فوقیہ پڑھا ہے اور حسن اور زید بن علی رحمہ اللہ نے بہ فتحِ تاء پڑھا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لغت شاذ ہے، اس سے مراد داود علیہ السلام ہیں، اس لیے کہ ان کی ننانوے بیویاں تھیں اور ﴿ وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴾ سے مراد اس عورت کا خاوند ہے جس سے داود علیہ السلام نے نکاح کا ارادہ کیا تھا۔ ﴿ اَكْفِلْنِيْهَا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تو اس کو میری طرف ملا دے اور میرے لیے تو اس سے علاحدہ ہو جا، یہاں تک کہ میں اس کا کفیل ہو جاؤں اور خاوند بن جاؤں۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو اس کو میرا کفل ونصیب کر دے، یعنی مجھے دے دے۔

﴿ وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ بات چیت کرنے میں وہ مجھ پر غالب ہوا ہے۔ جب کوئی شخص کسی پر غالب ہوتا ہے تو بولتے ہیں: ''عَزَّهُ يَعِزُّهُ، عِزًّا'' عرب کی مثل میں کہتے ہیں: ''مَنْ عَزَّ بَزَّ أَيْ: مَنْ غَلَبَ أَخَذَ السَّلَبَ'' یعنی جو شخص غالب ہوتا ہے وہی مغلوب کا ساز و سامان وسلاح لیتا ہے۔ ''عِزَّةٌ'' اسم مصدر ہے اور ''عِزَّة'' بہ معنی قوت ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر وہ بات کرے تو مجھ سے زیادہ فصیح ہوگا اور اگر لڑے تو مجھ سے بڑھ کر دباؤ ڈالنے والا ہوگا، اس لیے کہ اس کو ملک کی قوت ہے، لہٰذا مجھ پر اس کا غلبہ ہے، اس لیے کہ میں اس کے ہاتھ میں ضعیف اور کمزور ہوں، اگرچہ حق میرے ساتھ ہے۔ یہ سب باتیں تمثیل کے طور پر ہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبید بن عمر رحمہ اللہ نے ''عَازَّنِيْ'' پڑھا ہے بہ معنی ''غَالَبَنِيْ'' جو ''مُعَازَّةً'' بہ معنی ''مغالبہ'' سے ماخوذ ہے۔[1]

﴿ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تو نے بیان کیا، اگر یہ حق ہے تو اس نے واقعی تجھ پر ظلم کیا ہے کہ تجھ سے تیری ایک دنبی کو مانگا ہے، تاکہ اسے اپنی ننانوے دنبیوں کے ساتھ ملائے۔ ﴿ لَقَدْ ﴾ میں حرفِ لام توطیۂ قسم کا ہے اور یہ اپنے مابعد کے ساتھ قسمِ مقدر کا جواب ہے۔ ''أَيْ: وَاللّٰهِ لَقَدْ... الخ'' داود علیہ السلام جو اپنے کلام میں قسم لائے تو اس میں اس شے کے انکار میں مبالغہ ہے جو انھوں نے سنی کہ ننانوے دُنبیوں والا یہ چاہتا ہے کہ اپنے ساتھی کے پاس جو ایک دنبی ہے اور اس کے علاوہ اس کے پاس اور کچھ نہیں ہے،

[1] تفسیر القرطبي (١٧٤/١٥، ١٧٥) فتح القدير (٥٦١/٤)

اسے اپنی طرف ملا لے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بات جو انھوں نے کہی، وہ دوسرے شخص سے اس کی تصدیق کرنے کے بعد کہی۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کہتے ہیں کہ داود علیہ السلام کی غلطی ان کا یہی کہنا ہے: ﴿ لَقَدْ ظَلَمَكَ ﴾ کیوں کہ انھوں نے مدعی کے دعوے پر تثبت اور پختگی سے پہلے یہ بات کہہ دی۔[1]

قولہ: ﴿ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ یعنی ''شرکاء''۔ خلطاء کا واحد خلیط ہے۔ ''خَلِيطٌ'' وہ ہے جو مال میں مخالط اور مشارک، یعنی شراکت دار ہوتا ہے۔ ﴿ لَيَبْغِيْ ﴾ میں حرفِ لام تاکید کا ہے۔ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر میں واقع ہوا ہے، یعنی بے شک بہت سے شریک ہیں، البتہ ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں اور اس کے حق کا خیال نہیں کرتے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیکیاں کیں، کیوں کہ وہ اس سے بچتے ہیں اور اپنے ساتھی پر ظلم نہیں کرتے اور نہ کسی دوسرے پر کرتے ہیں۔ یہاں استثناء متصل ہے۔ ﴿ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ﴾ میں کلمہ ﴿ مَا ﴾ زائد ہے جو قلت کی تاکید کے لیے اور تعجب کے طور پر آیا ہے، یعنی وہ قلیل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے اور ﴿ هُمْ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ قَلِيْلٌ ﴾ اس کی خبر ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس تفسیر میں مروی ہے ''أَيْ: قَلِيلٌ الَّذِيْ هُمْ فِيهِ''

﴿ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ ﴾ امام ابو عمرو اور فراء رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَظَنَّ ﴾ بہ معنی ''أَيْقَنَ'' ہے اور ﴿ فَتَنّٰهُ ﴾ کے معنی ''اِبْتَلَيْنَاهُ'' ہیں۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اِخْتَبَرْنَاهُ''[3] یعنی جبکہ خصمین داود علیہ السلام کے پاس اپنا جھگڑا لائے اور انھوں نے جو کچھ کہنا تھا کہا تو اس وقت انھوں نے یقین کر لیا کہ خود وہی مراد ہیں اور دونوں جھگڑنے والوں کا مقصد ان کو اشارتاً وہ بات بتانا ہے جو انھوں نے چاہی تھی، یعنی ان کا ساتھی ان کی خاطر اپنی عورت کو چھوڑ دے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے کہ پھر جب داود علیہ السلام نے ان کے درمیان فیصلہ کیا تو ان جھگڑنے والوں میں سے ایک نے دوسرے کی طرف نظر کی، پھر ہنسا تو اس وقت انھوں نے ان کی مراد جان لی۔

جمہور نے ﴿ فَتَنّٰهُ ﴾ کو بہ تخفیفِ تاء و تشدیدِ نون پڑھا ہے اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، امام حسن اور ابو رجاء رحمہما اللہ نے بہ تشدید ہر دو پڑھا ہے۔ اس قراءت میں فتنے میں مبالغہ ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''اِفْتَنَّاهُ'' اور امام قتادہ، عبید بن عمیر اور ابن سمیفع رحمہم اللہ نے ''فَتَنَاهُ'' بہ تخفیفِ ہر دو پڑھا ہے۔ اس میں فعل کی نسبت ملکین کی طرف کی ہے۔ یہ قراءت ابو عمرو سے بھی مروی ہے۔ ﴿ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴾ یعنی پھر اپنے رب سے اپنے گناہ کی بخشش مانگی اور سجدہ کرتا ہوا گرا۔ یہاں سجدے کی تعبیر رکوع کے ساتھ کی اس لیے کہ ان دونوں میں جھکنا ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ وہ رکوع میں تھے تو سجدہ کرتے ہوئے گرے۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں علماء کا کچھ اختلاف نہیں کہ یہاں رکوع سے مراد سجدہ ہے، کیوں کہ رکوع انحنا (جھکنا) ہے اور سجدہ میل (مائل ہونا)

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۷۵/۱۵) [2] فتح القدیر (۵۶۱/۴، ۵۶۲) [3] تفسیر الطبري (۱۸۱/۲۱)

ہے اور ایک دوسرے میں داخل ہوتا ہے، لیکن ان میں سے ہر ایک کی ایک خاص ہیئت ہے۔[1] پھر یہ اس بنا پر آیا کہ ایک کا نام دوسرے کے ساتھ رکھ دیا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ''خَرَّ لِلسُّجُوْدِ رَاكِعًا أَيْ: مُصَلِّيًا''یعنی سجدے کے لیے گرے رکوع کرتے ہوئے، یعنی نماز پڑھتے ہوئے۔ کسی نے کہا ہے کہ بلکہ ان لوگوں کا رکوع سجدہ تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ بلکہ ان کا سجود رکوع تھا۔ واللّٰه أعلم.

﴿ وَاَنَابَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہوئے رجوع ہوئے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ﴾ یعنی ہم نے اس کا وہ گناہ بخش دیا جس سے اس نے مغفرت مانگی۔ مفسرین نے کہا ہے کہ داود علیہ السلام نے چالیس دن سجدہ کیا۔ وہ سوائے حاجت اور فرض نماز کے اپنا سر نہیں اٹھاتے تھے، اس کے بعد پھر سجدہ کرنے لگتے تھے۔ چالیس دن پورے ہونے تک اسی طرح کیا۔ نہ کھاتے تھے، نہ پیتے تھے اور روتے تھے، یہاں تک کہ ان کے سر کے اردگرد گھاس اُگ آئی اور وہ اپنے رب عزوجل کو پکارتے اور اس سے توبہ کا سوال کرتے رہے۔ پھر اللہ پاک نے ان کے لیے توبہ اور مغفرت نازل فرمائی۔ (امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ وغیرہ کے الفاظ یہ ہیں: ''إن داود بقي ساجدا أربعين يوما حتى نبت الرعى حول وجهه و غمر رأسه، وكذا في الفتح'')۔
امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ پر وقف تام ہے۔

پھر قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴾ سے کلام کی ابتداء ہوتی ہے۔ ''زُلْفٰی'' سے مراد وہ قربت و کرامت ہے جو مغفرتِ ذنب کے بعد ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''زُلْفٰی'' قیامت کے دن اللہ عزوجل کے قریب ہونا ہے۔[2] اور ﴿ وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴾ سے مراد حسنِ مرجع، یعنی جنت ہے۔ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ نے قیامت کا ذکر کیا، پھر اس کی شان و شدت کی عظمت بیان فرمائی اور فرمایا کہ رحمان عزوجل داود علیہ السلام سے فرمائے گا کہ میرے روبرو گزر تو داود علیہ السلام عرض کریں گے: اے رب! مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ میرا خطیہ (غلطی) مجھے پھسلا دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرا قدم پکڑ لے۔ پھر وہ اللہ عزوجل کا قدم پکڑ لیں گے تو گزر جائیں گے۔ فرمایا: چنانچہ یہ وہ زلفی ہے جس کا اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴾[3] (أخرجه ابن مردويه)

ذکرِ ابتلاء:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ داود علیہ السلام نے اپنے جی سے بات کی کہ جس وقت وہ مبتلا ہوں گے تو بچیں گے۔ (اصل میں ''یعتصم'' کا لفظ ہے) پھر ان سے کہا گیا کہ بے شک تو عن قریب مبتلا ہوگا اور عن قریب اس شے کو جان لے گا جس میں تو مبتلا ہوگا، لہٰذا تو اپنا بچاؤ اختیار کر۔ پھر ان سے کہا گیا: یہ وہ دن ہے جس میں تو مبتلا

[1] تفسير القرطبي (١٧٩/١٥) فتح القدير (٥٦٢/٤) [2] فتح القدير (٥٦٢/٤) تفسير القرطبي (١٨٧/١٥)
[3] الدر المنثور (١٦٨/٧)

ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے زبور لی اور عبادت خانے میں داخل ہوئے اور اس کا دروازہ بند کر دیا، زبور اپنی گود میں لی اور ایک خادم کو دروازے پر بٹھایا اور کہا: آج تو کسی کو میرے پاس آنے کا اذن نہ دینا۔ پس اس اثنا میں کہ وہ زبور پڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک سنہرہ پرندہ حسین ترین پرندوں کی طرح کا آیا، اس میں ہر طرح کا رنگ تھا، پھر وہ ان کے روبرو پھرنے لگا، پھر وہ ان کے قریب آیا تو ان کو اس کے پکڑنے کی قدرت ہوئی تو اس کو اپنے ہاتھ سے پکڑنے لگے، لیکن وہ ان کے پیچھے سے جلدی سے نکل گیا، پھر تو انھوں نے زبور بند کر دی اور اس کی طرف اُٹھ کھڑے ہوئے، تاکہ اسے پکڑ لیں وہ اڑا اور محراب کے طاق پر جا بیٹھا۔

پھر وہ اس سے قریب ہوئے تو وہ فضا کی طرف نکل گیا اور ایک چھپر پر جا بیٹھا، پھر اس کو جھانکا تاکہ دیکھیں کہ کہاں گرا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت ہے جو اپنے حوض میں غسلِ حیض کر رہی ہے۔ پھر جب اس عورت نے ان کا سایہ دیکھا تو اپنے سر کو حرکت دی، پھر اپنے سارے جسم کو اپنے بالوں سے ڈھانک لیا۔ اس عورت کا خاوند غازی فی سبیل اللہ تھا۔ انھوں نے غازیوں کے سردار کو یہ لکھ بھیجا کہ تو اوریا کو دیکھ اور اس کو تابوت اٹھانے والوں میں تعین کر دے اور تابوت اٹھانے والوں کا حال یہ تھا کہ یا تو ان پر فتح کی جاتی یا وہ مارے جاتے، (یعنی وہ بڑے بہادر مردانے لوگ ہوتے تھے۔) چنانچہ اس سردار نے اوریا کو حاملینِ تابوت میں آگے بھیجا، پھر وہ مارا گیا۔ جب اس عورت کی عدت پوری ہوگئی تو داود علیہ السلام نے اس کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ اس نے ان سے یہ شرط کی کہ اگر وہ لڑکا جنے تو ان کے بعد وہی خلیفہ ہو اور اس شرط پر بنی اسرائیل کے پچاس آدمیوں کو گواہ کیا۔ (اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: "وأشهدت عليه خمسين من بني إسرائيل و كتب عليه بذلك كتابا"۔ اگر بجائے "کتب" کے "کتبت" ہوتا تو "أشهدت" کے مطابق ہو جاتا، واللہ أعلم)۔ اور خود پر اس شرط کا ایک خط لکھا، پھر داود علیہ السلام کو فتنہ کی سمجھ نہ آئی کہ انھیں فتنے میں ڈالا گیا ہے، یہاں تک کہ سلیمان علیہ السلام پیدا ہو گئے اور جوان ہو گئے۔ پھر دو فرشتے محراب کی دیوار پھلانگ کر ان کے پاس آئے اور ان کا وہ حال تھا جس کا قصہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے اور داود علیہ السلام سجدہ کرتے ہوئے گرے، پھر اللہ نے ان کی مغفرت کی اور ان پر رجوع ہوا۔[1] (أخرجه ابن أبي شيبة في المصنف وابن أبي حاتم وأخرج الحاكم وصححه والبيهقي في الشعب)۔ کہا کہ داود علیہ السلام کو جو کچھ پہنچا وہ تقدیر سے پہنچا، مگر تعجب یا فخر کی وجہ سے انھوں نے اپنے نفس کے ساتھ عجب کیا، یہ اس طرح ہوا کہ انھوں نے کہا: یا رب! رات اور دن میں کوئی گھڑی ایسی نہیں ہے جس میں آلِ داود کا کوئی عابد تیری عبادت نہ کرتا ہو، تیرے لیے نماز نہ پڑھتا ہو، یا تسبیح نہ کرتا ہو، یا تکبیر نہ کہتا ہو اور کئی چیزوں کا ذکر کیا۔ چنانچہ اللہ پاک نے اس بات کو ناپسند فرمایا تو فرمایا: اے داود! یہ نہیں

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٣٤٢/٦) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٣٨/١٠، ٣٢٣٩) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" سخت ضعیف راوی ہے۔

ہوا، مگر میری وجہ سے اگر میری مدد نہ ہوتی تو تُو اس پر قوی نہ ہوتا، مجھے قسم ہے اپنی عزت اور جلال کی! البتہ ایک دن میں تجھ کو تیرے نفس کی طرف سونپ دوں گا۔ عرض کی: اے رب! پھر تو مجھے اس کی خبر کر دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر کر دی تو اس دن ان کو فتنہ پہنچا۔[1] (وأخرج أصل القصة الحكيم الترمذي في نوادر الأصول وابن جرير وابن أبي حاتم عن أنس ﷺ مرفوعا بإسناد ضعيف وأخرجها ابن جرير من وجه آخر عن ابن عباس ﷺ مطولة وأخرجها جماعة عن جماعة من التابعين)

تضعیفِ قصہ مذکور:

امام عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے خود عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ أَكْفِلْنِيهَا ﴾ کی تفسیر میں اس قصے کے مخالف روایت کیا ہے۔ کہا کہ داود علیہ السلام نے اس سے زیادہ نہیں کیا کہ فرمایا: "تَحَوَّلْ لِي عَنْهَا"[2] یعنی تو میرے لیے اس عورت کو چھوڑ دے۔ اسی کی تفسیر میں امام عبدالرزاق، فریابی اور امام احمد رحمہ اللہ نے زہد میں اور امام ابن جریر اور طبرانی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ داود علیہ السلام نے اس سے زیادہ نہیں کیا کہ فرمایا: ﴿ أَكْفِلْنِيهَا ﴾[3] یعنی تو مجھے اس کا کفیل کر دے۔ صاحبِ کشاف نے قصہ مذکور کے بعد کہا ہے کہ یہ اور اس جیسے قصے اس قسم سے ہیں کہ اس کو بیان کرنا قبیح ہے بعض متسمین بصلاح سے جو افنائے مسلمین سے ہیں۔ چہ جائے کہ بعض برگزیدہ انبیاء کے بارے میں ایسی بات کی جائے۔[4] انتہیٰ۔ (يقال هو من أفناء الناس إذا لم يعلم ممن هو۔ افناء سے مراد مجہول اور گمنام لوگ ہیں)۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس شے کو اہلِ کتاب کے اخباریوں نے لکھا ہے، جنھوں نے تبدیلی اور تغیر کی ہے، اس کی طرف توجہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اور اس کو بعض مفسرین نے نقل کیا ہے۔ اللہ پاک نے اس میں سے کسی شے پر نص نہیں فرمائی اور نہ کسی صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے اور داود علیہ السلام کے قصے میں سے جس شے پر اللہ تعالیٰ نے نص فرمائی، وہ یہ ہے کہ ﴿ وَظَنَّ دَاوُدُ أَنَّمَا فَتَنَّٰهُ ﴾۔[5] داود علیہ السلام اور اوریا کے قصے میں کوئی خبر ثابت نہیں ہے۔ یہ وہی شے ہے کہ چاہیے داود علیہ السلام کے امر سے اس پر اعتماد کیا جائے۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قصے کا حاصل اس طرف لے کر جاتا ہے کہ ایک مسلمان مرد کو اس کی بیوی حاصل کرنے کے طمع میں ناحق قتل کی کوشش کی جائے، یہ دونوں ایک منکرِ عظیم ہیں۔ کسی عقل مند شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ داود علیہ السلام کے بارے میں اس قسم کا گمان کرے۔ ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے داود علیہ السلام کی تعریف کی ہے اور صفت فرمائی ہے اس قصے سے قبل اور بعد۔[6]

[1] مستدرك الحاكم (٤٧٠/٢) شعب الإيمان (٤٥٣/٥) الدر المنثور (١٥٦/٧)

[2] تفسير الطبري (١٧٨/٢١) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٤٠/١٠)

[3] تفسير الطبري (١٧٨/٢١) المعجم الكبير (٢١٤/٩)

[4] الكشاف (٨٣/٤)

[5] الشفاء للقاضي عياض (١٣٦/٢)

[6] تفسير الرازي (١٦٥/٢٦)

یہ اس پر دال ہے کہ جو قصہ لوگوں نے نقل کیا ہے وہ محال ہے۔ چنانچہ کوئی عقل مند یہ وہم کیوں کرے گا کہ دو دفعہ تعریف کرنے کے درمیان یہ مذمت والا کام واقع ہو۔ اگر ایسی بات بعض لوگوں سے صادر ہوتی تو اس کو عقلاً مکروہ سمجھتے اور کہتے کہ تو تو ایک شخص کی تعریف کرتا ہے، پھر تو اپنی تعریف کے دوران میں اس کی مذمت کس طرح جاری کرتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتابِ قدیم میں اس قسم کی بات بیان کرنے سے منزّہ ومبرّا ہے۔

سعید بن مسیب اور حارث اعور نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: تم میں سے اگر کوئی شخص داود علیہ السلام کا قصہ اس طرح سے بیان کرے جس طرح کہ (قصہ بیان کرنے والے) روایت کرتے ہیں تو میں اس کو ایک سو ساٹھ دُرے ماروں گا۔ یہ انبیاء پر بہتان لگانے کی حد ہے۔ مروی ہے کہ کسی شخص نے عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سے یہ قصہ بیان کیا اور ان کے پاس اہلِ حق میں سے ایک شخص تھا تو اس نے اس کو بیان کرنے والے کی تکذیب کی اور کہا کہ اگر قصہ اس طرح سے ہے جو کتاب اللہ میں ہے تو اس کے خلاف نہیں ڈھونڈنا چاہیے اور یہ نہایت بڑی بات ہے کہ اس کے سوا اور قصہ کہا جائے اور اگر اس طرح سے ہے جیسے تو نے ذکر کیا اور اللہ اپنے نبی پر ستر کرنے سے باز رہا تو اس کا ان پر ظاہر نہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ بولے: "سِمَاعِيْ هٰذَا الْكَلَامَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ" یعنی اس کلام کو سننا مجھے اس شے سے زیادہ محبوب ہے جس پر سورج نکلا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات مجھے ساری دنیا سے زیادہ پسند ہے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ کے قول کا حاصل یہ ہے کہ وہ بات جس کی دلالت وہ مثل کرتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے داود علیہ السلام کے قصے کے ساتھ بیان فرمایا ہے، وہ صرف یہی ہے کہ اس عورت کے خاوند سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لیے اسے چھوڑ دے اور بس۔ یہ قصہ جو آیا ہے وہ تمثیل اور اشارے کے طور پر ہے نہ کہ صراحت کے طور پر۔ اس لیے کہ یہ دونوں توبیخ کے لیے زیادہ مؤثر ہوتے ہیں، اس لحاظ سے کہ جس شے کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے، جس وقت اس کو سمجھنے کے لیے غور کیا جائے گا تو وہ اُن کے جی میں اچھی طرح آ جائے گی اور ان کے دل میں خوب جم جائے گی اور اس میں حسنِ ادب کی رعایت کرتے ہوئے بڑی مؤثر ہو گی، اس طرح سے کہ مجاہرت (باہم لڑنے جھگڑنے) کو ترک کیا، یعنی اس سے بڑھ کر اثر ہوا۔[1] امام ابو السعود رحمہ اللہ کا حاصل یہ ہے کہ وہ بات جو ذکر کرتے ہیں کہ داود علیہ السلام نے اوریا کی بی بی سے نکاح کیا، تو یہ ایک بہتان گھڑا ہوا اور مکروہ ہے اور اختراع کیا ہوا مکر وفریب ہے جس کو کان پھینکتے ہیں اور طبیعتیں اس سے نفرت کرتی ہیں۔ اس کی خرابی ہو جس نے یہ نئی بات نکالی اور اس کی اشاعت کی اور ہلاک ہو وہ جس نے اس کا اختراع کیا اور اسے پھیلایا۔[2]

غرض یہ کہ ان سب لوگوں نے قصۂ مذکور کو بے اصل ٹھہرایا۔ اب رہا وہ گناہ جس سے داود علیہ السلام نے استغفار اور

---

[1] تفسير النسفي (٣٦/٤) [2] تفسير أبي السعود (٢٢٢/٧)

توبہ کی تو اس میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ انھوں نے اس شخص کی عورت کی طرف نظر کی اور چاہا کہ وہ ان کی بیوی ہو۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ داود علیہ السلام نے اس عورت کی طرف نظر کا قصد نہیں کیا، لیکن اس کی طرف نظر کی معاودت کی (لوٹائی)۔ پہلی نگاہ تو ان کے واسطے ہوئی اور دوسری ان پر۔[1] دوسرا قول یہ ہے کہ انھوں نے اس کے خاوند کو غازیوں کی جماعت میں بھیجا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ انھوں نے یہ نیت کی کہ اگر وہ مر جائے گا تو اس کی عورت سے نکاح کر لیں گے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اوریا بن حنان نے اس عورت سے پیغامِ نکاح کیا تھا، پھر جب وہ غائب ہو گیا تو داود علیہ السلام نے اس کو نکاح کا پیغام دیا۔ پھر وہ ان کی جلالت اور بزرگی کے سبب سے ان سے بیاہ دی گئی تو اوریا اس سے غمگین ہوا۔ اللہ پاک نے ان پر اس لحاظ سے عتاب فرمایا کہ انھوں نے اس کو اس کے پیغام کرنے والے کے لیے چھوڑ نہ رکھا۔ پانچواں قول یہ ہے کہ اوریا کے قتل ہو جانے پر انھوں نے جزع نہ کیا، جیسا کہ وہ اس شخص پر جزع کرتے تھے جو لشکر میں سے مر جاتا تھا، پھر اس کی عورت سے نکاح کر لیا۔ لہٰذا اللہ پاک نے ان پر عتاب کیا، اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کے گناہ گو چھوٹے ہوں، لیکن ان کی قربتِ منزلت کی وجہ سے وہ عظیم ہوتے ہیں۔

نزدیکاں را بیش بود حیرانی ایشاں دانند سیاستِ سلطانی

''مقربین کو حیرانی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ بادشاہی سیاست کو خوب جانتے ہیں۔''

چھٹا قول یہ ہے کہ انھوں نے دو جھگڑنے والوں میں سے ایک کی بات سن کر ہی فیصلہ کر دیا اس سے پہلے کہ دوسرے کی بات سنیں۔ چنانچہ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔ صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ داود علیہ السلام کو اشارتاً بتانے کے لیے جو جھگڑا دو فرشتوں کے درمیان واقع ہوا اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ انھوں نے ایک عورت کے خاوند سے یہ چاہا کہ وہ ان کے لیے اسے چھوڑ دے اور وہ اس کو اپنی بیویوں کے ساتھ ملا لیں۔ یہ بات اس عصمت کے منافی نہیں ہے جو انبیاء علیہم السلام کے لیے ہوتی ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے اس پر ان کو تنبیہ کی اور اپنے فرشتے ان کی طرف بھیج کر ان کے لیے تعریض فرمائی، تا کہ وہ ان کی مثل قصہ میں جھگڑیں، یہاں تک کہ وہ اپنے گناہ کی بخشش مانگیں اور اس سے توبہ کریں۔ چنانچہ انھوں نے مغفرت چاہی اور اس سے تائب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے حق میں فرمایا ہے: ﴿ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴾ [طٰہٰ: ۱۲۱] حالاں کہ وہ ابو البشر اور پہلے نبی ہیں اور ان کے سوا اور انبیاء کے لیے جو واقع ہوا ہے، اس کا قصہ اللہ پاک نے ہم سے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔ اس آیت میں وہ شے ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان سے گناہ صادر ہوا، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ ﴾ اور فرمایا ﴿ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ ﴾ اور فرمایا: ﴿ وَاَنَابَ ﴾ اور فرمایا: ﴿ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ﴾ اور اس کا یہ جواب مناسب نہیں ہے کہ

[1] فتح القدير (٥٦٢/٤)

"حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ"۔ زیادہ مناسب وہ ہے جو ہم ذکر کر آئے ہیں، واللہ أعلم۔[1]

پھر جب اللہ پاک داود علیہ السلام کا قصہ پورا فرما چکے تو یہ بیان کیا کہ زمین کی خلافت ان کو تفویض کی۔ ارشاد فرمایا: ﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ ﴾۔ یہ جملہ قولِ مقدر کا مقولہ ہے اور "غَفَرْنَا" پر معطوف ہے۔ "أَيْ: فَغَفَرْنَا لَهُ ذٰلِكَ وَقُلْنَا لَهُ يَا دَاوٗدُ... الخ" یعنی اور ہم نے اس سے کہا: اے داود! ہم نے تجھ کو زمین پر خلیفہ بنایا۔ یا ان نبیوں کے لیے خلیفہ کیا جو تجھ سے پہلے تھے، تاکہ تو نیک بات کا امر کرے اور بری بات سے روکے اور لوگوں کے کام کی تدبیر کرے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ توبہ کے بعد ان کا حال اسی حالت پر باقی رہا جس پر پہلے تھا، اس میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی پس تو لوگوں کے درمیان اس عدل کے ساتھ فیصلہ کر جو اللہ کا اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ ہے، اس لیے کہ جب فیصلے شریعتِ حقہ الٰہیہ کے مطابق ہوں گے تو دنیا کی بھلائی کا انتظام ہوگا اور بھلائی کے دروازوں میں وسعت ہوگی اور جب فیصلے خواہشات کے مطابق ہوں گے اور نفسانی مقاصد حاصل کرنے کے لیے ہوں گے تو یہ بات دنیا میں خرابی اور بربادی کی طرف لے جانے والی ہوگی اور اس میں قتل و غارت گری واقع ہوگی اور لوگوں کے کام خلط ملط ہو جائیں گے اور یہ سب باتیں عالم کی ہلاکت کی طرف لے جائیں گی۔

﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى ﴾ اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں خواہشِ نفس کی پیروی مت کر۔ اس میں داود علیہ السلام کو اس بات کی تنبیہ ہے جس پر ان کو عتاب کیا گیا۔ وہ عدل نہ تھی اور اس میں خواہشِ نفس کی پیروی کا شائبہ تھا۔

﴿ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ بہ نصب ہے اس بنا پر کہ نہی کا جواب ہے اور فاعل ﴿ الْهَوٰى ﴾ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ فعل مجزوم ہو اس بنیاد پر کہ نہی پر معطوف ہو۔ متحرک جو ہوا ہے تو وہ التقائے ساکنین کے سبب سے۔ پس پہلی وجہ پر تو منہی عنہ دونوں امر کے درمیان جمع کرنا ہوگا۔ اور دوسری وجہ پر ہر واحد سے الگ نہی ہوگی۔

﴿ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد طریقِ حق ہے یا طریقِ جنت، یا اللہ تعالیٰ کے دلائلِ تشریعی و تکوینی جن کو اس نے حق پر قائم کیا ہے۔ پھر جو اتباعِ ہوا سے اور گمراہی میں واقع ہونے سے نہی کی تو اس کی یہ وجہ ذکر فرمائی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴾ ﴿ بِمَا نَسُوْا ﴾ میں حرفِ باء سببیہ ہے، یعنی اس لیے کہ جو لوگ اللہ کی راہ سے بہکتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ حساب کے دن کو بھولے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ان کے اس دن کے لیے عمل کو چھوڑ دینے کی وجہ سے بھولنے والوں کی طرح ہو گئے،[2] اگرچہ وہ دیکھتے ہیں اور ذکر کرتے ہیں اور اگر وہ روزِ حساب کا یقین رکھتے تو دنیا میں ایمان لاتے۔[3] بالجملہ جب کہ یہاں بعث اور حساب کا ذکر آ گیا تو اس مضمون کی یوں تقریر و تاکید فرمائی:

---

[1] فتح البیان (۱۲/۳۲، ۳۳) [2] معاني القرآن (۴/۳۲۹) [3] فتح البیان (۱۲/۲۵_۳۵)

27

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بیکار پیدا نہیں کیا، یہ ان لوگوں کا خیال ہے جنھوں نے کفر کیا، تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کی ہلاکت ہے ㉗ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان لوگوں کے مانند کر دیں گے جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں؟ یا ہم متقین کو بدکاروں کے مانند کر دیں گے؟ ㉘ (یہ قرآن) ایک کتاب ہے، ہم نے اسے آپ کی طرف نازل کیا، بڑی برکت والی ہے، تاکہ وہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور عقل منداس سے نصیحت حاصل کریں ㉙

دنیا کی پیدایش میں حکمتِ الٰہی:

ناحق یعنی جس کا اثر کچھ نہ نکلے، بلکہ اس دنیا کا آخرت میں اثر ہے۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ اس نے مخلوق کو عبث اور بے فائدہ نہیں بنایا، ان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس کی عبادت کریں، اس کی توحید کریں، پھر محشر کے دن ان کو جمع کرے گا، پھر مطیع اور فرماں بردار کو ثواب دے گا اور کافر کو عذاب کرے گا، اسی لیے یوں فرمایا کہ ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے بے فائدہ نہیں بنایا۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو دوبارہ جی اٹھنے اور قیامت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ صرف اسی گھر یعنی دنیا کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کی خرابی ہے جو قیامت اور نشور کے منکر ہیں، ان کی خرابی اس آگ سے ہے جو ان کے لیے تیار کر رکھی ہے۔

پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ وہ اپنے عدل و حکمت سے مومنوں اور کافروں میں برابری نہ کرے گا۔ چنانچہ فرمایا کیا ہم ایمان والوں کو ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو زمین میں فساد مچاتے رہے۔ یعنی ہم ایسا نہ کریں گے اور وہ اللہ کے نزدیک برابر نہ ہوں گے اور جب بات یوں ٹھہری تو لازمی ہے کہ ایک اور گھر ہو جس میں مطیع اور فرماں بردار کو تو ثواب دیا جائے اور فاجر کو اس میں عتاب ہو۔ جو عقلیں سلیم ہیں اور جو فطرتیں مستقیم ہیں ان کو اللہ پاک کا یہ ارشاد اس بات کی راہ بتاتا ہے کہ معاد و جزا کا ہونا ضروری ہے، کیوں کہ اس دنیائے فانی میں ہم دیکھتے ہیں کہ

ظالم اور باغی کی اولاد و دولت اور نعمتیں اور راحتیں بڑھتی ہیں اور وہ اسی طرح مر جاتا ہے اور مطیع مظلوم کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے رنج و غم میں مرتا ہے۔ پس حکیم و علیم و عادل کی حکمت میں، جو ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا، یہ ضروری ہے کہ اس کا انصاف اس سے کرے اور جب یہ انصاف اس دنیا میں واقع نہ ہوا تو یہ بات متعین ہو گئی کہ اس جزا اور مواسات (غمخواری) کے لیے وہاں کوئی اور گھر ہے۔ اور جبکہ قرآن شریف مقاصدِ صحیحہ و ماخذِ عقلیہ صریحہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے تو یوں فرمایا: ﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ "اَلْبَابٌ" جمع ہے "لُبٌّ" کی اور "لُبٌّ" کا معنی عقل ہے، یعنی یہ ایک کتاب ہے برکت والی جس کو ہم نے تیری طرف اتارا ہے، تاکہ عقل والے اس کی آیتوں کو سوچیں اور ان میں غور کریں۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: واللہ! تدبر یہ نہیں کہ اس کے حروف کو یاد کر لیا جائے اور اس کی حدود کو ضائع کر دیا جائے یہاں تک کہ کوئی یہ کہے کہ میں نے سارا قرآن پڑھا، مگر نہ اس کے جسم میں اور نہ اس کے عمل میں قرآن نظر آتا ہے۔ امام ابن ابی حاتم نے اس کو روایت کیا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا فاتح بیان یہ ہے کہ جملہ ﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ ﴾ مستانفہ ہے۔ اس سے پہلے جو بعث اور حساب کا ذکر ہے، اس کی تقریر کرتا ہے۔ یعنی ہم نے ان چیزوں کو باطل پیدا نہیں کیا، یعنی اس لیے کہ حکمتِ باہرہ سے خارج ہو، بلکہ ہم نے ان کو اس لیے بنایا ہے کہ ہماری قدرت پر دلالت کریں۔ ﴿ بَاطِلًا ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ مفعول مطلق محذوف کی صفت ہے یا بنا بر حال یا بنا بر مفعول لہ۔ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ اس شے کی طرف ہے جس کی نفی کی گئی ہے اور مبتداء ہے۔ اس کی خبر ﴿ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ ﴾ ہے۔ ﴿ ظَنُّ ﴾ بہ معنی مظنون ہے۔ یعنی آسمان و زمین وغیرہ کا بے کار بنانا کفار کا مظنون ہے، کیوں کہ ان کا یہ ظن ہے کہ یہ چیزیں کسی غرض کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں اور کہتے ہیں کہ نہ قیامت ہے نہ بعث و حساب ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس مخلوقات کی پیدائش باطل ہو۔

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴾ حرفِ فاء اس لیے ہے کہ اس سے ان کے ظنِ باطل پر ویل کے ہونے کا ثبوت ظاہر کرے، یعنی پس ان کے لیے آگ کے سبب سے ویل ثابت ہے، جو ان کے ظن اور کفر پر ترتیب دی گئی ہے، جس طرح کہ موصول کو "هُمْ" کی ضمیر کے بجائے یہ بتانے کے لیے رکھا ہے کہ صلہ ان کے ویل کے مستحق ہونے کی وجہ ہے۔ پھر انھیں دھمکی دی اور ملامت کی تو یوں ارشاد فرمایا: ﴿ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... الآیۃ ﴾ امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کفارِ قریش نے مومنوں سے کہا کہ ہم کو آخرت میں وہ کچھ دیا جائے گا جو تمھیں دیا جائے گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2] کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ بہ معنی "بل" اور ہمزہ ہے جو اضراب انتقالی کے لیے ہے، یعنی

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٤٣، ٤٤) [2] تفسیر البغوي (٧/٨٧)

پہلے بعث، حساب اور جزا کو اس طرح ثابت کیا کہ خلق عالم کی حکم و مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ پھر اس سے ہمزۂ انکاری کے ذریعے اس کی تقریر و تحقیق کی طرف اضراب کیا جس میں فریقین کے درمیان برابری کا انکار کیا اور اس برابری کی بڑی مؤثر اور موکد نفی کی، یعنی کیا ہم ان کو جو اللہ پر ایمان لائے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی اور اس کے فرائض پر عمل کیا ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو معصیت کے کام کر کے زمین کے اطراف میں فساد کرتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ﴿ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ تو سیدنا علی، حمزہ، عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم ہیں اور "مفسدین في الأرض" عتبہ، شیبہ اور ولید ہیں۔[1] پھر اللہ پاک نے پہلے کلام سے بھی اس شے کی طرف اضراب و انتقال کیا جو اس سے بھی زیادہ محال نظر آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴾ یعنی کیا ہم مومن متقین کو بدبخت کافروں، منافقوں اور فاجروں کی طرح کر دیں گے۔ اس جگہ "فجار" سے مراد خاص طور پر کافر ہیں، کیوں کہ یہ مقام ایسا نہیں کہ اس سے مسلمانوں میں سے وہ لوگ مراد لیے جائیں جو اللہ پاک کی نافرمانیوں میں منہمک ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ متقین سے مراد صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، حالاں کہ یہ تخصیص بغیر مخصص کے ہے اور بلا وجہ ہے اور لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا اور جائز ہے کہ ان دو فریق سے بعینہ وہی پہلے والے دو فریق مراد لیے جائیں اور ان کو دوبارہ دوسری دو صفتوں کی وجہ سے ذکر کیا گیا ہو۔

ان کے برابر ہونے سے انکار میں پہلے دو وصفوں کی نسبت ان دو وصفوں کو زیادہ دخل ہے۔ ﴿ كِتٰبٌ ﴾ مرفوع ہے، کیوں کہ یہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور ﴿ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ ﴾ اس کی صفت ہے اور ﴿ مُبٰرَكٌ ﴾ خبرِ ثانی ہے اور یہ صحیح نہیں ہے کہ کتاب کی دوسری صفت ہو، کیوں کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ غیر صریح سے وصفِ صریح کی تاخیر نہیں ہو سکتی۔ بعض نحویوں نے اس کو جائز رکھا ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ "اَلْقُرْآنُ كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ كَثِيْرَ الْخَيْرِ وَالْبَرَكَةِ" یعنی قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ ہم نے اس کو تیری طرف اتارا ہے بڑی خیر و برکت والی ہے۔ کسی نے "مُبَارَكًا" بہ نصب پڑھا ہے بنا بر حال۔ ﴿ لِّيَدَّبَّرُوْٓا ﴾ اصل میں "لِيَتَدَبَّرُوا" ہے۔ حرفِ تاء کو دال میں ادغام کر دیا ہے۔ حرفِ لام کا تعلق ﴿ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ سے ہے، یعنی ہم نے اس کو نازل کیا ہے، تا کہ اس کی آیتوں میں غور کریں جن میں سے یہ آیتیں ہیں جو تکوین اور تشریع کے اسرار کو ظاہر کرتی ہیں۔

یہ آیتِ کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ پاک نے قرآن شریف کو اسی واسطے نازل کیا ہے کہ اس کے معانی میں غور و فکر کریں، نہ اس لیے کہ بغیر تدبّر کے اس کی تلاوت کریں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس قرآن کو بہت سے غلاموں اور بچوں نے پڑھا اور ان کو اس کی تاویل کا کچھ علم نہیں ہے، اس کے حرفوں کو حفظ کیا اور اس کی حدوں کو ضائع کیا۔[2] جمہور نے ﴿ لِّيَدَّبَّرُوْٓا ﴾ بالادغام پڑھا ہے اور ابو جعفر نے "لِتَدَبَّرُوا" پڑھا ہے بتائے فوقیہ بنا بر خطاب۔

[1] الدر المنثور (۱۷۴/۷، ۱۷۵) [2] تفسیر النسفي (۳۸/٤)

یہ قراءت امام عاصم اور کسائی رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے اور یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے۔[1] اصل میں ''لِتَتَدَبَّرُوْا'' دو تاء کے ساتھ ہے، ایک کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا ہے۔ ﴿وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ ''أَيْ: لِيَتَّعِظَ أَهْلُ الْعُقُولِ'' یعنی تاکہ عقل والے نصیحت پذیر ہوں۔[2] بالجملہ اللہ پاک نے داود علیہ السلام کو نعمتیں عطا کی، ان میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ ان کو سلیمان علیہ السلام جیسا جلیل القدر، رفیع الشان فرزندِ ارجمند بخشا۔ چنانچہ یوں ارشاد فرمایا:

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ ۚ نِعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿٣٠﴾ إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصَّافِنَاتُ الْجِيَادُ ﴿٣١﴾ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي حَتَّىٰ تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿٣٢﴾ رُدُّوهَا عَلَيَّ ۖ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ ﴿٣٣﴾

اور ہم نے داود کو سلیمان عطا کیا، (وہ) اچھا بندہ تھا، بلاشبہ وہ (اللہ کی طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا (30) جب شام کے وقت اس کے سامنے اصیل تیز رو گھوڑے پیش کیے گئے (31) تب اس نے کہا: بلاشبہ میں نے مال کی محبت کو اپنے رب کی یاد سے محبوب جانا (ترجیح دی) ہے، حتی کہ وہ (سورج) پردے میں چھپ گیا (32) (کہا:) انھیں میرے پاس واپس لاؤ، پھر وہ (ان کی) پنڈلیوں اور گردنوں پر (ہاتھ) پھیرنے لگے (33)

سلیمان بن داود علیہما السلام کا تذکرہ:

سلیمان علیہ السلام نے سنا کہ سمندر کے کنارے پر دریائی گھوڑے نکلتے ہیں۔ خاصی گھوڑیاں وہاں باندھ رکھیں، وہ ان سے جفت ہوئے، بچے ہوئے ان کا تحفہ، ان کے قدم ایسے تھے جیسے پیرنا، یعنی تیرنے والے، وہ تیار ہو کر آئے، یہ ان کو دیکھنے میں ایسے منہمک ہوئے کہ وظیفہ کا وقت گزر گیا، عصر کا سورج اوٹ میں آ گیا، پھر غصے ہوئے ان گھوڑوں کو منگوا کر کاٹ ڈالا۔ یہ اللہ کی محبت کا جوش تھا۔ ان کی تعریف فرمائی۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ اس نے داود علیہ السلام کو سلیمان بخشا، یعنی نبی۔ جیسا کے اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾ [النمل: ١٦] ''اور سلیمان علیہ السلام داود علیہ السلام کے وارث ہوئے۔'' یعنی سلیمان علیہ السلام داود علیہ السلام کی نبوت میں وارث ہوئے، ورنہ داود علیہ السلام کے سلیمان علیہ السلام کے سوا اور بیٹے بھی تھے، کیوں کہ ان کے پاس سو آزاد عورتیں تھیں۔ ﴿نِعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک سلیمان علیہ السلام کی تعریف کرتا ہے کہ وہ بڑی اطاعت، عبادت اور انابت والے تھے۔ اللہ عزوجل کی طرف بڑے رجوع کرنے والے تھے۔

[1] فتح القدير (٥٢٧/٤) [2] فتح البيان (٣٥/١٢_٣٧)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے مکحول رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے داود علیہ السلام کو سلیمان علیہ السلام عطا کیا تو داود علیہ السلام نے ان سے کہا: اے میرے بیٹے! کیا شے سب سے حسین ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ اللہ کی سکینت اور ایمان۔ کہا: پھر کیا شے سب سے قبیح ہے؟ کہا کہ ایمان کے بعد کفر۔ کہا: پھر کیا شے سب سے شیریں ہے؟ کہا: روح اللہ اس کے بندوں کے درمیان۔ کہا: پھر کیا شے سب سے زیادہ ٹھنڈی ہے؟ کہا: اللہ کا لوگوں سے عفو کرنا اور لوگوں کا ایک دوسرے سے عفو کرنا۔ داود علیہ السلام نے فرمایا: پس تو نبی ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ ﴾ یعنی جب سلیمان علیہ السلام کو ان کی حکومت اور سلطنت کے وقت میں خیلِ صافنات پیش کیے گئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صافنات وہ گھوڑے ہیں جو تین پاؤں اور چوتھے پاؤں کی ٹاپ کی نوک پر کھڑے رہتے ہیں۔ اور جیاد سے مراد سراع ہیں، یعنی تیز چلنے والے۔ اسی طرح سلف میں سے غیر واحد نے کہا ہے۔ ابن جریر نے ابراہیم تیمی سے روایت کیا ہے کہ وہ بیس گھوڑے پر والے تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی طرح روایت کیا ہے[2] اور امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابراہیم تیمی سے جو الفاظ روایت کیے ہیں، وہ یہ ہیں کہ جن گھوڑوں نے سلیمان علیہ السلام کو مشغول کیا، وہ بیس ہزار تھے، پھر انھوں نے ان کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔[3] یہ قول زیادہ مشابہ ہے۔ واللّٰه أعلم.

امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک یا خیبر سے تشریف لائے اور ان کے سہوہ میں، یعنی طاق یا تہہ خانہ میں پردہ تھا۔ چنانچہ ہوا چلی تو اس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے کھیلنے کی گڑیوں سے پردے کا کنارہ کھول دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! یہ کیا ہے؟ عرض کی کہ میری بنات ہیں، یعنی گڑیاں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں ایک گھوڑا دیکھا کہ کپڑوں کے ٹکڑوں کے دو پر اس پر لگے ہوئے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا ہے جس کو میں دیکھ رہا ہوں ان کے وسط میں؟ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ یہ گھوڑا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا ہے جو اس کے اوپر ہے؟ عرض کی کہ دو پَر ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھوڑا اور اس کے دو پَر؟ عرض کی کہ کیا آپ نے نہیں سنا کہ سلیمان علیہ السلام کے گھوڑے تھے جن کے پَر تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے، یہاں تک کہ میں نے آپ کی کچلیاں دیکھ لیں۔[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ ﴾ سلف و مفسرین میں سے کئی ایک اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ وہ ان کے عرض کرنے میں مشغول ہوئے، یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت فوت ہو گیا۔ جو بات قطعی اور یقینی طور پر کہی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کو عمداً ترک نہیں کیا، بلکہ بھول کر جس طرح کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خندق کے دن نمازِ عصر سے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۲٤۰) [2] تفسیر الطبري (۲۱/۱۹۲، ۱۹۳) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۲٤۰، ۳۲٤۱)

[4] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤۹۳۲) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (آداب الزفاف: ۱/۲۰۳)

مشغول ہو گئے تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اس کو غروبِ آفتاب کے بعد پڑھا۔ یہ بات صحیحین میں کئی وجہ سے ثابت ہے۔ اس میں سے ایک یہ ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سورج غروب ہونے کے بعد آئے تو کفارِ قریش کو برا کہنا شروع کیا اور کہنے لگے: یا رسول اللہ! واللہ! میں عصر کی نماز نہیں پڑھ سکا، یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: واللہ! میں نے بھی اس کو نہیں پڑھا۔ کہا: پھر ہم بطحان کی طرف گئے (بطحان جگہ کا نام ہے، جہاں سنگریزے ہوتے ہیں)۔ آپ نے نماز کے لیے وضو کیا اور ہم نے بھی اس کے لیے وضو کیا، پھر سورج غروب ہو جانے کے بعد عصر پڑھی۔ اس کے بعد مغرب پڑھی۔[1] یہ بھی احتمال ہے کہ ان کی ملت میں لڑائی اور قتال کے سبب سے نماز میں تاخیر جائز ہو اور گھوڑے قتال کی غرض سے رکھے جاتے ہیں۔

علماء میں سے ایک گروہ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ مشروع تھا، پھر یہ حکم صلاتِ خوف سے منسوخ ہو گیا۔ ان میں سے وہ ہے جو اس طرف گیا ہے کہ اس حال میں کہ دونوں طرف باہم تلواریں چلتی ہوں اور گھمسان ہو، یہاں تک کہ نہ نماز کا امکان ہو نہ رکوع اور نہ سجود کا تو نماز کا مؤخر کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فتحِ تستر میں کیا۔ یہ قول امام مکحول اور اوزاعی رحمہ اللہ وغیرہما سے منقول ہے اور پہلا قول حق کے زیادہ قریب ہے، کیوں کہ اس کے بعد یوں کہا: ﴿ رُدُّوْهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ ﴾۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ''لَا وَاللّٰهِ! لَا تَشْغَلِيْنِيْ عَنْ عِبَادَةِ رَبِّيْ آخِرَ مَا عَلَيْكَ'' پھر انھوں نے حکم دیا تو ان کی کونچیں کاٹی گئیں۔ اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی گردنیں اور کونچیں تلواروں سے ماری گئیں۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ گھوڑوں کی ایال کو اور ان کی کونچوں کو ان کی محبت کی وجہ سے چھونے لگے۔ اس قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور کہا کہ وہ ایسے نہ تھے کہ کسی حیوان کو اس کی کونچیں کاٹ کر عذاب کریں اور اپنے مال میں سے کسی مال کو بلاوجہ ہلاک کریں سوا اس کے کہ وہ ان کی طرف نظر کرنے کے سبب سے اپنی نماز سے مشغول ہو گئے اور گھوڑوں کا کچھ قصور نہیں ہے۔[2]

یہ قول جس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے، اس میں نظر ہے۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ ان کی شریعت میں کبھی ایسی بات کا جواز ہو، خصوصاً جبکہ خاص اللہ تعالیٰ کی خاطر غصہ کر کے ایسا کیا ہو کہ ان کی وجہ سے وہ مشغول ہوئے ہوں، یہاں تک کہ نماز کا وقت نکل گیا اور اسی لیے جب وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ان سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلے میں ان کو وہ شے عطا فرمائی، جو اُن سے بہتر اور برتر ہے، یعنی ہوا، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴾ [ص: ٣٦] ''وہ آپ کے حکم سے جہاں آپ چاہتے نرمی سے پہنچا دیا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٣١)
[2] تفسير الطبري (٢١/١٩٥، ١٩٦)

کرتی تھی۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ﴾ [سبا: ١٢] ''اس کی صبح کی منزل مہینا بھر کی ہوتی تھی اور شام کی منزل بھی۔'' چنانچہ یہ ہوا گھوڑوں سے زیادہ تیز رفتار اور نیکوتر ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ابو قتادہ اور ابو الدہما رحمہما اللہ سے روایت کیا ہے، یہ دونوں بیت اللہ کی طرف بہت سفر کیا کرتے تھے، دونوں کہتے ہیں کہ ہم ایک ایسے شخص کے پاس آئے جو جنگل والوں میں سے تھا، ہم سے اس بدوی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا، پھر مجھے اس شے میں سے سے سکھانے لگے جو اللہ پاک نے ان کو سکھائی تھی اور فرمایا: ''إِنَّكَ لَا تَدَعُ شَيْئًا اِتِّقَاءَ اللّٰهِ تَعَالٰى إِلَّا أَعْطَاكَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ خَيْرًا مِنْهُ'' یعنی بے شک تو کوئی شے اللہ کے ڈر سے نہیں چھوڑے گا مگر اللہ عزوجل تجھ کو اس سے بہتر عطا کرے گا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داود علیہ السلام کو سلیمان علیہ السلام بخشا۔ پھر سلیمان علیہ السلام کی تعریف کی۔ فرمایا: ﴿ نِعْمَ الْعَبْدُ ﴾ یعنی سلیمان اچھا بندہ ہے۔ مخصوص بالمدح محذوف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ نِعْمَ الْعَبْدُ ﴾ داود علیہ السلام کی مدح ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ جملہ ﴿ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴾ مدح کی وجہ ہے، یعنی سلیمان اچھا بندہ ہے، اس لیے کہ اللہ پاک، کی طرف توبہ کے ساتھ بڑا رجوع ہونے والا ہے۔ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ ''اُذْكُرْ'' محذوف سے متعلق ہے، یعنی اس شے کو یاد کر جو اس سے اس وقت صادر ہوئی جب اس پر صافناتِ جیاد شام کے وقت پیش کیے گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ نِعْمَ ﴾ سے متعلق ہے، حالاں کہ ﴿ نِعْمَ ﴾ کو اس وقت کے ساتھ مقید کرنے کی کوئی وجہ نہیں باوجود اس کے کہ غیر متصرف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَوَّابٌ ﴾ سے متعلق ہے، حالاں کہ اس وقت کے ساتھ ان کے اواب ہونے کی تقیید کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ''عشي'' ظہر یا عصر سے آخر دن تک ہے۔ ''صافنات'' ''صافن'' کی جمع ہے۔ اہلِ لغت نے اس کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔

امام قتیبی اور فراء رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ کلامِ عرب میں ''صافن'' واقف کو کہتے ہیں گھوڑا ہو یا کوئی اور۔ امام قتادہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] اسی معنی سے یہ حدیث شریف ہے: «مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَتَمَثَّلَ لَهُ النَّاسُ صُفُوْنًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ[3]» أَيْ: يَدِيْمُوْنَ الْقِيَامَ لَهُ. امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ جو اگلے دو پاؤں میں سے ایک پر وقوف کرتا ہے اور دوسرے پاؤں کو اٹھا کر اس کے سم کے کنارے کو زمین پر رکھتا ہے۔ گویا وہ تین پاؤں پر کھڑا

---

① مسند أحمد (٧٨/٥) تفسیر ابن کثیر (٤٤/٤، ٤٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله رجال الصحیح'' (مجمع الزوائد: ٥٣١/١٠)

② تفسیر القرطبي (١٩٣/١٥)

③ ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے، البتہ اس کے ہم معنی روایت سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥٢٢٩) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٧٥٥) میں مروی ہے۔ (صحیح الجامع، رقم الحدیث: ٥٩٥٧)

رہتا ہے دو پچھلے پاؤں اور ایک اگلا پاؤں اور کبھی پچھلے دو پاؤں میں سے ایک کے ساتھ ایسا کرتا ہے۔ یہ فراہت یعنی زیرکی کی نشانی ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ (فتح القدیر میں ابوعبید کہا ہے) نے کہا "صافن" وہ ہے جو اگلے دو پاؤں کو جمع کرتا ہے اور ان کو برابر رکھتا ہے۔ رہا وہ گھوڑا جو اپنے سم پر وقوف کرتا ہے تو اس کا نام مخیم ہے۔[1]

"جیاد" جمع ہے "جواد" کی۔ جو گھوڑا خوب دوڑتا ہے اس کو "جواد" بولتے ہیں نر ہو یا مادہ۔ کسی نے کہا کہ لمبی گردن والے گھوڑے کو "جیاد" کہتے ہیں، ماخوذ ہے "جید" سے بمعنی گردن۔ کسی نے کہا "اَلَّذِيْ يَجُوْدُ فِيْ الرِّكُضِ" یعنی جواد وہ گھوڑا ہے جو خوب دوڑتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ گھوڑے سو تھے۔ دو قول پہلے گزر چکے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ دریا میں سے ان کے لیے نکلے تھے اور ان کے پَر تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اہلِ دمشق و نصیبین پر چڑھائی کی تھی تو اُن کو ہزار گھوڑے ملے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے والد سے ان کے وارث ہوئے تھے اور ان کے والد نے عمالقہ سے پائے تھے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ﴿ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴾ "خَيْلٌ خُلِقَتْ عَلٰى مَا شَاءَ"[2] یعنی وہ گھوڑے اس صفت پر پیدا کیے گئے تھے جو انھوں نے چاہی۔

امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ صفونِ فرس اگلے دو پاؤں میں سے ایک پاؤں کو اٹھانا ہے، یہاں تک کہ وہ سم کے اطراف پر ہو جائے اور "جیاد" بہ معنی "سراع" ہے۔[3] "لِأَنَّهُ يَجُوْدُ بِالرِّكُضِ" یعنی اس لیے کہ دوڑنے کے ساتھ جود (تیزی) کرتا ہے۔ "خیل" کا وصف "صفون" کے ساتھ اس لیے کیا ہے کہ یہ ہجان میں نہیں ہوتا، یہ عربی گھوڑوں میں ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "خیل" کا وصف صفون اور جودت کے ساتھ کیا، تاکہ ان میں دو اچھی صفتوں کو جمع کیا جائے۔ اس حال میں کہ وہ کھڑے ہونے والے ہوں اور چلنے والے ہوں، یعنی جب وہ ٹھہریں تو اپنے ٹھہرنے کی جگہوں میں ساکن اور مطمئن ہوں اور جس وقت وہ چلیں تو اپنے چلنے میں تیز رفتار اور خفیف ہوں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ﴾ ﴿ حُبَّ ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ ﴿ اَحْبَبْتُ ﴾ کا مفعول ہے بعد اس کے کہ اس کو "آثَرْتُ" کے معنی میں شامل کیا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "آثَرْتُ حُبَّ الْخَيْرِ" یعنی میں نے حب خیر کو اختیار کیا اور ہر وہ شخص جس نے کسی شے کو محبوب رکھا تو یقینی طور پر اس نے اس کو اختیار کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ حُبَّ ﴾ کا نصب بنا بر مفعول مطلق ہے بحذف زوائد اور ناصب اس کا ﴿ اَحْبَبْتُ ﴾ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مصدر تشبیہی ہے۔ "أَيْ: حُبًّا مِثْلَ حُبِّ الْخَيْرِ"۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

اس جگہ خیر سے مراد خیل، یعنی گھوڑے ہیں۔ یہ قول امام زجاج رحمہ اللہ کا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلامِ عرب میں خیر اور خیل ایک معنی میں ہیں اور عرب لوگ راء و لام کے درمیان تعاقب کرتے ہیں۔ چنانچہ "اِنْهَمَلَتِ الْعَيْنُ وَانْهَمَرَتْ، وَخَتَلَتْ وَخَتَرَتْ" بولتے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حدیث شریف میں ہے:

---

[1] فتح القدير (٥٦٧/٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٤١/١٠) [3] تفسير الطبري (١٩٢/٢١، ١٩٣)

«اَلْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ فِيْ نَوَاصِيهَا الْخَيْرُ»[1] یعنی گھوڑوں کی پیشانیوں میں خیر باندھی گئی ہے۔ گویا گھوڑوں کا نام خیر اسی وجہ سے رکھا گیا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ان کا نام خیر اس لیے رکھا گیا کہ ان میں فوائد ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ "خیر" مال ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَحْبَبْتُ ﴾ بہ معنی "لَزِمْتُ" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی "أَرَدْتُ" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی "قَعَدْتُ" ہے "أَحَبَّ الْبَعِيرُ" سے ماخوذ ہے جبکہ اونٹ گر پڑتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے تھکنے کی وجہ سے تو اس وقت بولتے ہیں: "أَحَبَّ الْبَعِيرُ" یعنی اونٹ بیٹھ گیا۔

کلمۂ ﴿ عَنْ ﴾ بہ معنی "عَلٰی" ہے۔ "أَيْ: آثَرْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَلٰی ذِكْرِ رَبِّيْ" یعنی میں نے حبِ خیر اپنے رب کی یاد پر اختیار کی۔ ﴿ ذِكْرِ ﴾ سے مراد نمازِ عصر ہے۔ علی رضی اللہ عنہ اسی کے قائل ہیں۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام سے کوئی ان کی تعظیم کے مارے بات نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ واقعی ان سے نمازِ عصر فوت ہو گئی اور کسی کو یہ حوصلہ نہ ہوا کہ ان سے بات کرے۔[5] ﴿ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴾ میں ضمیر سورج کی طرف راجع ہے۔ پہلے اس کا ذکر نہیں گزرا، لیکن مقام اس پر دلالت کرتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اضمار (صرف ضمیر کا ذکر کرنا) اسی وقت جائز ہوتا ہے کہ شے کا ذکر گزرا ہو یا دلیل ذکر کی ہو اور یہاں دلیل گزر چکی ہے وہ دلیل ﴿ بِالْعَشِيِّ ﴾ کا کلمہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر خیل کی طرف راجع ہے، یعنی یہاں تک کہ گھوڑے دوڑ میں آنکھوں سے چھپ گئے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

"تَوَارِي" آنکھوں سے چھپنے کو کہتے ہیں۔ حجاب وہ شے ہے جو اُس کو آنکھوں سے چھپا دے۔ امام قتادہ اور کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حجاب سبز پہاڑ ہے جو خلائق کو گھیرے ہوئے ہے اور وہ جبلِ قاف ہے۔[6] لیل کو حجاب اس لیے کہتے ہیں کہ جو کچھ اس میں ہوتا ہے، اسے چھپا لیتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حجاب ایک پہاڑ ہے جو قاف سے سال بھر کے فاصلے پر پرے ہے۔ سورج اس کے پرے غروب ہوتا ہے۔ یہ قول بعید و بارد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "تَوَارَتْ مِنْ وَرَاءِ يَاقُوْتَةٍ خَضْرَاءَ، فَخُضْرَةُ السَّمَاءِ مِنْهَا"[7] یہ قول بھی امام قتادہ رحمہ اللہ کے قول کی طرح ہے۔

﴿ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ﴾ سلیمان علیہ السلام کے تتمۂ کلام سے ہے، یعنی انھیں میرے پاس دوبارہ پیش کرو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب سلیمان علیہ السلام کو گھوڑوں کے پیش کیے جانے نے مشغول کیا، یہاں تک کہ ان سے نمازِ عصر فوت ہو گئی تو اللہ کے لیے خفا ہوئے اور کہا: ﴿ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ﴾ "أَيْ: أَعِيْدُوْهَا"[8] یعنی ان کو مجھ پر دوبارہ پیش کرو۔ سید

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٧١) (2) فتح القدير (٥٦٨/٤)
(3) تفسير الطبري (٣٩٣/٣) (4) تفسير الطبري (١٩٤/٢١) (5) الدر المنثور (١٧٨/٧)
(6) تفسير القرطبي (١٩٥/١٥) (7) تفسير الطبري (١٩٤/٢١) (8) فتح القدير (٥٦٨/٤)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''رُدُّوْهَا أَيْ: اَلْخَيْلَ'' [1] یعنی ضمیر گھوڑوں کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ رُدُّوْهَا ﴾ کی ضمیر سورج کی طرف راجع ہے اور سورج کا اس کے غروب ہونے کے بعد پھیر لانا ان کا معجزہ ہے۔ اسی لیے حکم کیا کہ عصر کی نماز پڑھ لیں۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

﴿ فَطَفِقَ مَسْحًاۢ بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴾ میں حرفِ فاء فصیحہ ہے جو اس پر دال ہے کہ کلام میں محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''فَرُدُّوْهَا فَطَفِقَ''۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ معمول کے مطابق کرنے لگے اور مثل ''ظَلَّ وَبَاتَ'' کے ہے۔ [2] ﴿ مَسْحًا ﴾ کا نصب بنا بر مفعول مطلق ہے فعل مقدر سے: ''أَيْ: يَمْسَحُ مَسْحًا'' اس لیے کہ ''طَفِقَ'' کی خبر نہیں ہوتی ہے مگر فعل مضارع۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَسْحًا ﴾ مصدر ہے موضع حال میں ''أَيْ: مَاسِحًا'' جب کہ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ ''سُوْقٌ'' ''سَاقٌ'' کی جمع ہے۔ ''سَاقٌ'' پنڈلی کو کہتے ہیں۔

''أَعْنَاقٌ'' جمع ''عُنُقٌ'' بہ معنی گردن ہے۔ معنی یہ ہیں کہ سلیمان علیہ السلام نے لوگوں کو حکم دیا کہ گھوڑوں کو پھیر لاؤ، پھر وہ پھیر کر لائے تو انھوں نے تلوار کے ساتھ ان کی گردنوں اور پنڈلیوں کو مارنا شروع کیا۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''مَسَحَ عَلَاوَتَهُ'' یعنی اس کی گردن کو مارا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مسح'' بہ معنی ''قطع'' ہے، معنی یہ ہیں کہ وہ متوجہ ہوئے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں کو مارتے تھے، اس لیے کہ وہ ان کی نماز کے فوت ہو جانے کا سبب ہوئے۔ اسی طرح امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایسے نہ تھے کہ یہ کام کریں، مگر اسی صورت میں کہ اللہ نے یہ ان کے لیے جائز کر دیا ہو اور یہ ہو سکتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے لیے مباح ہو اور اس وقت میں ممنوع۔ مفسرین نے اس آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے کہ مسح کے وہی معنی ہیں جو پہلے مذکور ہوئے۔ دوسرے لوگوں نے جن میں امام قتادہ اور زہری رحمہما اللہ ہیں؛ یہ کہا ہے کہ ''مسح'' سے مراد ان کی محبت کی وجہ سے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں سے غبار دور کرنے کے لیے ہاتھ پھیرنا ہے۔ [3] پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ سیاقِ کلام یہی ہے، کیوں کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنا حال اس طرح ذکر کیا کہ انھوں نے اس بات کو اپنے رب کے ذکر پر اختیار کیا، یہاں تک کہ ان کی نمازِ عصر فوت ہو گئی، پھر لوگوں کو حکم دیا کہ گھوڑوں کو دوبارہ ان کے پاس لائیں، تاکہ اس شے کو بگاڑ کر اپنی جان کو تکلیف پہنچائیں جس نے ان کو ذکرِ الٰہی سے باز رکھا اور اپنے رب کی عبادت سے روکا اور جس شے کو اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیا تھا، اس کو قائم کرنے سے ان کو غافل کر دیا۔

یہ سب امور اس بات کے مناسب حال نہیں ہیں کہ گھوڑوں کو پھیر لانے سے یہ غرض ہو کہ اپنے ہاتھ یا اپنے کپڑے سے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں سے گرد و غبار کو پونچھیں۔ جس کسی نے یہ کہا ہے کہ نبی سے مال کی خرابی کا کام نہیں ہوتا، اس کی دلیل کوئی نہیں ہے، کیوں کہ یہ اس شے کے اعتبار سے جو ہماری شریعت میں ثابت ہے صرف استبعاد

[1] الدر المنثور (۱۷۷/۷) [2] فتح القدیر (۵۶۸/٤)۔ [3] فتح القدیر (٥٦٨/٤، ٥٦٩)

ہے، باوجود اس بات کے جواز کے کہ سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں ایسی بات مباح ہو۔ مزید برآں مال کا برباد کرنا جس سے ہماری شریعت میں نہی کی گئی ہے، وہ یہی ہے کہ اس کا کسی صحیح غرض کے بغیر ضائع کرنا ہو۔ رہا صحیح غرض کے لیے ضائع کرنا تو ایسا ہماری شریعت میں جائز ہے، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے واقع ہوا ہے کہ جو ہانڈیاں غنیمت کے مال سے اس کی تقسیم کرنے سے پہلے پکا لی گئی تھیں، آپ نے ان کو اُلٹا دینے کا حکم دیا۔[1] اس شریعتِ غرا میں اس کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ اسی باب سے وہ ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے واقع ہوا کہ طعامِ محتکر (غلہ کو روکنے والا) کو جلا دیا۔

ترجمانِ قرآن اور حبرِ اُمتِ رسولِ انس وجان سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: "مَسْحًا عَقْرًا بِالسَّيْفِ"[2] یعنی ان کی پنڈلیوں اور گردنوں کو تلوار سے کاٹنا۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کے مطابق تفسیرِ حق یہ ہے کہ یوں کہو کہ ان کے دین میں گھوڑوں کا باندھنا مستحب تھا، جس طرح کہ ہمارے دین میں بھی ایسا ہی ہے۔ پھر یہ بات ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے جب چڑھائی کرنا چاہی تو وہ بیٹھے اور گھوڑوں کو حاضر کرنے اور دوڑانے کا حکم دیا اور یہ ذکر کیا کہ میں انھیں دنیا اور حظِ نفس (لذتِ نفس) کے لیے دوست نہیں رکھتا، میں تو ان کو صرف اللہ کی خاطر اور اس کے دین کی تقویت کے لیے دوست رکھتا ہوں اور ان کے قول ﴿عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ﴾ سے یہی مراد ہے۔

پھر ان کے دوڑانے کا حکم دیا، یہاں تک کہ وہ حجاب میں چھپ گئے، پھر حکم دیا کہ گھوڑوں کو ان کی طرف پھیر لائیں، پھر جب وہ ان کی طرف لوٹ کر آئے تو ان پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اس "مسح" سے غرض کئی امر ہیں: ایک تو گھوڑوں کی عزت اس لیے کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے اور اسے دور کرنے میں بہترین مددگاروں میں سے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ بات ظاہر کرنا چاہی کہ وہ سیاست ومملکت کے نظم وضبط میں اس حد کو پہنچے ہیں کہ خود کام کرتے ہیں۔ تیسرے یہ ہے کہ وہ گھوڑوں کے احوال و امراض وعیوب کو دوسروں سے بڑھ کر جانتے تھے۔ چنانچہ وہ ہاتھ پھیرتے تھے، تاکہ معلوم کریں کہ آیا اُن میں وہ شے ہے جو مرض کو ظاہر کرتی ہے۔ لہٰذا یہ تفسیر جو ہم نے ذکر کی قرآن کے الفاظ اس پر منطبق ہوتے ہیں اور ان منکرات ومحظورات (حرام کی ہوئی) سے کوئی شے ہم پر لازم نہیں آتی ہے۔[3] انتھیٰ۔

فتح البیان میں فرمایا ہے کہ امام رازی رحمہ اللہ کی یہ تفسیر کتنی اَبرد ہے اور نظم قرآنی سے کس قدر بعید ہے۔ حق بات وہی ہے جو ہم ذکر کر آئے ہیں، کیوں کہ لغت پنڈلیوں اور گردنوں کو مارنے کی شہادت دیتی ہے۔ اس سے ہٹنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کی عصمت کو بنیاد بنا کر ایسی رکیک تاویل اور توجیہ بعید کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[4] بالجملہ جب اللہ پاک سلیمان علیہ السلام کی مدح کر چکا تو ایک آزمایش کا ذکر کیا جو اُن کو پیش آئی تھی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۹۱۰) [2] الدر المنثور (۱۷۷/۷)
[3] تفسیر الرازي (۱۸۰/۲٦) [4] فتح البیان (۳۷/۱۲۔٤١)

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾
قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ
بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ
رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِيْنَ
مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ
حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾

اور بلاشبہ ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ہم نے اس کی کرسی پر ایک دھڑ ڈال دیا، پھر اس نے (اللہ کی طرف) رجوع کیا﴿34﴾ اس نے کہا: اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا کر کہ وہ میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو، بلاشبہ تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے﴿35﴾ چناں چہ ہم نے ہوا اس کے تابع کر دی تھی، وہ اس کے حکم سے نرمی سے چلتی تھی جہاں کا وہ ارادہ کرتا تھا﴿36﴾ اور شیاطین (جنات) کو (بھی تابع کر دیا) ہر عمارت بنانے والے اور غوطہ لگانے والے کو﴿37﴾ اور دوسروں کو (جو) زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے﴿38﴾ یہ ہماری بخشش ہے، لہٰذا (لوگوں پر) احسان کر یا روک رکھ، کوئی حساب نہیں ہو گا﴿39﴾ اور بے شک اس کے لیے ہمارے پاس بڑا قرب اور اچھا ٹھکانا ہے﴿40﴾

سلیمان علیہ السلام کی آزمایش کا ذکر:

سلیمان علیہ السلام استنجا کرنے کے لیے جاتے تھے تو انگشتری ایک خادمہ کے سپرد کر جاتے، اس میں اسم اعظم لکھا ہوا تھا۔ ایک جن تھا جس کا نام صخر تھا، وہ اس خادمہ کو بھگا کر انگشتری لے گیا اور اپنی شکل سلیمان علیہ السلام جیسی بنائی اور تخت پر بیٹھ کر حکم چلانے لگا۔ سلیمان علیہ السلام یہ معلوم کر کے وہاں سے نکل گئے کہ کہیں مجھے مروا نہ ڈالے۔ ایک گاؤں میں چھپ کر رہے۔ چھ ماہ کے بعد صخر شراب کی مستی میں تھا، اس سے انگشتری دریا میں گر پڑی جسے ایک مچھلی نے نگل لیا، اس مچھلی کا سلیمان علیہ السلام نے شکار کیا، اس کے پیٹ میں سے انگشتری نکلی۔ پھر آپ اپنے تختِ سلطنت پر آئے۔ ان کی یہ آزمایش اس بات پر ہوئی کہ ان کے گھر میں ایک عورت تھی جو اپنے مرے ہوئے باپ کو یاد کر کے بہت رویا کرتی تھی، جنوں نے اس کو اس کے ماں باپ کی تصویر بنا دی، تاکہ وہ چین پکڑے، وہ اس کو پوجنے لگی۔

سلیمان علیہ السلام نے اس کی خبر نہ لی یا خبر پا کر غفلت کی۔ بعض کہتے ہیں کہ آزمایش اس لیے ہوئی کہ اپنے

امیروں سے خفا ہوئے، وہ جہاد میں کمی کرتے تھے۔ چاہا کہ ایک رات اپنی ستر عورتوں کے پاس جائیں ہر ایک سے ایک ایک بیٹا ہو اور وہ خاطر خواہ جہاد کریں۔ فرشتے نے دل میں ان شاء اللہ ڈالا۔ انھوں نے تغافل کیا، ستر عورتوں میں سے ایک کو حمل ہوا وہ وقت پر آدھا آدمی جنی، وہ لا کر ان کے تخت پر رکھ دیا۔ یہ ان شاء اللہ نہ کہنے پر نادم ہوئے۔ ایسا ملک جو میرے سوا کسی کے لائق نہ ہو۔ یعنی کسی کا حوصلہ نہ ہو کہ وہ لے سکے۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے سے مراد جن ہیں۔ ساری دنیا میں جہاں معلوم کرتے کہ کوئی جن آدمیوں کو ستاتا ہے تو اس کو قید کر لیتے یا دریا میں ڈال دیتے، بند کر کے یا زمین میں گاڑ دیتے۔ بعض اب تک بند ہیں۔ ان کے لیے ہمارے پاس بڑا تقرب ہے، یعنی ان پر مہربانی کی کہ اتنی دنیا دی اور حساب معاف کر کے مختار کر دیا۔ لیکن وہ اپنے ہاتھ کی محنت سے ٹوکری بنا کر کھاتے تھے۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ ہم نے سلیمان علیہ السلام کی اس طرح سے آزمایش کی کہ اس سے ملک سلب کر لیا اور اس کی کرسی پر ایک جسم ڈال دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ جسم سے مراد شیطان ہے۔[1] ﴿ ثُمَّ اَنَابَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ پھر اپنے ملک و سلطنت و ابہت کی طرف لوٹا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس شیطان کا نام صخر تھا۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا نام آصف تھا۔ (قاله مجاهد) کسی نے کہا ہے کہ صرد تھا۔ (قاله مجاهد أيضاً) کسی نے کہا ہے کہ حبقیق تھا۔[2] (قاله السدي) اس قصے کا مفسرین نے تفصیل کے ساتھ اور مختصر دونوں طرح ذکر کیا ہے۔ امام سعید بن عروبہ رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو بیت المقدس بنانے کا حکم ہوا تو اُن سے کہا گیا کہ تو اس کو بنا اور اس میں لوہے کی آواز سنائی نہ دے۔ کہا: چنانچہ انھوں نے ایسا کرنا چاہا مگر اس پر ان کو قدرت نہ ہوئی، پھر ان سے کہا گیا کہ دریا میں ایک شیطان ہے، اس کو صخر کہتے ہیں جو مارد کے مشابہ ہے۔ کہا: پھر اس کو بلایا، دریا میں ایک چشمہ تھا جس پر ہر ہفتے میں وہ ایک بار وارد ہوتا تھا، چنانچہ اس کا پانی کھینچا گیا اور اس میں شراب بھر دی گئی۔

پھر وہ اپنے وارد ہونے کے دن آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس میں شراب ہے۔ پس کہا: "إِنَّكِ لَشَرَابٌ طَيِّبٌ إِلَّا أَنَّكِ تُصْبِيْنَ الْحَلِيْمَ وَتُزِيْدِيْنَ الْجَاهِلَ جَهْلًا" یعنی بے شک تو البتہ ایک اچھی پینے کی شے ہے مگر اتنی بات ہے کہ تو بردبار اور دانش مند آدمی کو صبی (بچہ) بنا دیتی ہے اور جاہل کی جہالت کو اور بڑھا دیتی ہے۔ کہا: پھر وہ لوٹ گیا، یہاں تک کہ خوب پیاسا ہوا۔ پھر اس پر آیا، پھر اس کو پی لیا، یہاں تک کہ اس کی عقل پر غالب ہو گئی۔ کہا: پھر اس کو خاتم دکھائی یا اس سے ان کے دونوں مونڈھوں کے درمیان مہر کر دی، پھر وہ تابع ہو گیا۔ کہا: اور سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت ان کی انگشتری میں تھی۔ پھر صخر کو سلیمان علیہ السلام کے پاس لائے، فرمایا کہ ہم کو اس گھر کے بنانے کا حکم ہوا

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۱۹۶، ۱۹۷) [2] تفسیر الطبري (۲۱/۱۹۶-۱۹۹)

ہے اور ہم سے کہا گیا ہے کہ اس میں لوہے کی آواز ہرگز نہ سنائی جائے۔ کہا: پھر صخر ہدہد کے انڈے لایا اور اُن پر شیشہ لگا دیا۔ ہدہد آیا تو اُن کے آس پاس پھر کر اپنے انڈوں کو دیکھنے لگا، مگر ان کے پاس پہنچ نہیں سکتا تھا۔ پھر وہ الماس لایا اور اس کو شیشے پر رکھا، پھر اس سے شیشے کو کاٹا، یہاں تک کہ اپنے انڈوں کے پاس پہنچ گیا، پھر وہ الماس لے لیا اور اس سے پتھروں کو کاٹتے تھے۔

سلیمان علیہ السلام جب بیت الخلاء میں یا حمام میں داخل ہونا چاہتے تو انگشتری لے کر داخل نہ ہوتے تھے۔ پھر ایک دن وہ حمام کی طرف چلے اور یہ صخر شیطان ان کے ساتھ تھا اور یہ اس وقت تھا کہ انھوں نے اپنی بعض بیویوں سے صحبت کی تھی، پھر وہ حمام کے اندر گئے تو اپنی انگشتری اس شیطان کو دی تو اس نے دریا میں ڈال دی جس کو ایک مچھلی نے نگل لیا اور سلیمان علیہ السلام کا ملک ان سے چھین لیا گیا اور اس شیطان پر سلیمان علیہ السلام کا شبہہ ڈال دیا گیا، یعنی اس کی شکل و شباہت ان جیسی بنا دی گئی، پھر وہ آیا اور اُن کی کرسی اور تخت پر بیٹھ گیا اور اُن کے سارے ملک پر سوائے ان کی بیویوں کے مسلط کیا گیا۔ پھر اس نے لوگوں میں حکم جاری کرنا شروع کیا اور لوگ اس سے کئی چیزوں کا انکار کرنے لگے۔

ان میں ایک مرد تھا جس کو قوت کے لحاظ سے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اس نے کہا: واللہ! میں ضرور اس کا تجربہ کروں گا۔ کہا: پھر اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! اور وہ یہی خیال کرتا تھا کہ وہ اللہ کا نبی ہے، ہم میں سے کسی کو سرد رات میں جنابت پہنچتی ہے تو وہ غسل کو عملاً چھوڑ دے، یہاں تک کہ سورج نکل آئے تو کیا تو اس سے کوئی حرج دیکھتا ہے، یعنی اس پر کچھ حرج ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ پھر وہ اس دوران میں چالیس رات تک اسی حال میں رہا کہ اچانک اللہ کے نبی نے اپنی انگوٹھی ایک مچھلی کے پیٹ میں پائی، پھر وہ متوجہ ہوئے تو اُن کے سامنے کوئی جن اور پرندہ نہیں آتا تھا، مگر ان کو سجدہ کرنے لگا، یہاں تک کہ لوگوں کی طرف پہنچے۔ ﴿ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ﴾ کہا: یہ وہی شیطان صخر ہے۔[1]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴾ یعنی ہم نے سلیمان کو مبتلا کیا اور اس کی کرسی پر ایک شیطان کو ڈال دیا، وہ ان کے تخت پر چالیس دن بیٹھا۔ کہا کہ سلیمان علیہ السلام کی سو عورتیں تھیں، ان میں سے ایک عورت تھی اس کو جرادہ کہتے تھے۔ یہ عورت ان کے نزدیک سب عورتوں سے بڑھ کر مختار، پسندیدہ اور امانت دار تھی۔ جس وقت وہ جنبی ہوتے یا حاجت کو آتے تو اپنی انگوٹھی اتار لیتے اور اس کے سوا کسی کو اس پر امانت دار نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن اپنی انگوٹھی اسے دی اور بیت الخلاء کے اندر گئے۔ شیطان ان کی صورت میں نکلا اور انگوٹھی مانگی، اس نے اس کو وہ دے دی، پھر وہ آ کر سلیمان علیہ السلام کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ سلیمان علیہ السلام بعد کو نکلے اور اس عورت سے کہا کہ میری انگوٹھی دے دے؟ وہ بولی: کیا اس سے پہلے آپ نے وہ نہیں لے لی؟ انھوں نے

---

[1] تفسير الطبري (٢١/١٩٧، ١٩٨)

کہا: نہیں اور وہ نکلے اس حال میں گویا حیران ہیں اور شیطان چالیس دن تک ٹھہرا رہا اور لوگوں پر حکومت کرتا رہا۔ کہا: پھر لوگوں نے اس کے احکام کو اوپرا سمجھا تو بنی اسرائیل کے علماء اور قاری جمع ہوئے، پھر وہ آئے یہاں تک کہ سلیمان علیہ السلام کی عورت کے پاس داخل ہوئے تو ان سے کہا کہ ہم نے واقعی اس کو اوپرا سمجھا ہے اور اگر یہ سلیمان ہے تو یقیناً اس کی عقل جاتی رہی ہے اور ہم نے اس کے حکموں کو اوپرا سمجھا ہے۔ کہا: پھر اس وقت وہ عورتیں روئیں۔ کہا: پھر وہ لوگ چلتے ہوئے آئے، یہاں تک کہ اس کے پاس پہنچے تو اس کو گھیر کر بیٹھے، پھر وہ تورات کھول کر پڑھنے لگے۔ کہا: پس وہ ان کے درمیان سے اڑا، یہاں تک کہ ایک کنگرے پر جا پڑا اور انگوٹھی اس کے پاس تھی، پھر اڑا، یہاں تک کہ دریا کی طرف چلا اور انگوٹھی اس سے دریا میں گر پڑی تو دریا کی ایک مچھلی نے اس کو نگل لیا۔ کہا اور سلیمان علیہ السلام اپنے اسی حال میں جس میں تھے، دریا کی طرف متوجہ ہوئے اور دریا کے شکاریوں میں سے ان کے شکار میں سے سوال کیا اور کہا: میں سلیمان ہوں۔ پس ان میں سے ایک شکاری کھڑا ہوا اور اپنی لاٹھی سے ان کو مارا اور ان کے سر کو زخمی کیا۔ کہا: پھر ان کو ان مچھلیوں میں سے جو اُن کے پاس تھیں دو مچھلیاں دیں۔ سلیمان علیہ السلام کو جو مار پڑی تھی، اس نے ان کو مشغول نہ کیا، یعنی اس کا انھوں نے کچھ خیال نہ کیا، یہاں تک کہ دریا کے کنارے پر کھڑے ہوئے اور دونوں مچھلیوں کا پیٹ چاک کیا، پھر انھیں دھونے لگے تو اُن میں سے ایک مچھلی کے پیٹ میں اپنی انگوٹھی پائی اور اس کو لے کر پہن لیا، پھر اللہ پاک نے ان کی رونق اور مملکت کو ان کو لوٹا دیا۔ پس پرندے آئے، یہاں تک کہ ان پر گھر گئے تو قوم نے پہچان لیا کہ وہ سلیمان علیہ السلام ہیں۔

پھر ان کے ساتھ جو قوم نے کیا تھا، اس سے کھڑے ہو کر معذرت کرنے لگے۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمھارے عذر کرنے پر نہ تمھاری تعریف کرتا ہوں اور نہ تم کو ملامت کرتا ہوں، اس کام پر جو تم سے ہو گیا، اس امر کا ہونا تو ضروری تھا۔ پھر سلیمان علیہ السلام اپنے ملک میں آئے اور اس شیطان کی طرف لوگ بھیجے تو وہ اُن کے پاس لایا گیا، پھر حکم دیا تو اس کو لوہے کے ایک صندوق میں رکھ کر بند کر دیا اور اس پر قفل لگایا اور اپنی مہر لگائی اور حکم دیا کہ اس کو دریا میں ڈال دیا جائے، پس وہ اس میں قیامت کے قائم ہونے تک ہے، اس کا نام حبقیق تھا۔[1] کہا اور اللہ پاک نے ان کے لیے ہوا مسخر کی، اس سے پہلے ان کے لیے مسخر نہیں کی گئی تھی۔ وہ اللہ سبحانہٗ کا یہ قول ہے: ﴿ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴾

امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿ جَسَدًا ﴾ سے شیطان مراد ہے، اس کو آصف کہتے تھے۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام نے اس سے فرمایا، تم کس طرح لوگوں کو فتنے میں ڈالتے ہو؟ اس نے کہا: تم مجھے اپنی

[1] تفسير الطبري (٢١/١٩٨، ١٩٩)

انگوٹھی دکھاؤ تو میں بتاؤں، پھر جب اس کو دے دی تو آصف نے اس کو دریا میں ڈال دیا۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام نے سیاحت کی اور اُن کی بادشاہت جاتی رہی اور آصف ان کے تخت پر بیٹھ گیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کی عورتوں سے اس کو منع کیا، چنانچہ نہ وہ اُن کے قریب ہوا اور نہ ہی وہ اس کے قریب ہوئیں اور اس کو اُوپرا سمجھا۔ پھر سلیمان علیہ السلام کھانا مانگتے تو کہتے تھے: کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟ مجھے کھانا دو، میں سلیمان ہوں، چنانچہ وہ ان کو جھٹلاتی تھیں، یہاں تک کہ ان کی بیوی نے ایک دن ان کو مچھلی دی اور انھوں نے اس کا پیٹ پھاڑا تو اس کے پیٹ میں انگوٹھی پائی، پھر اُن کی مملکت اُن کی طرف لوٹ آئی اور آصف بھاگا اور دریا میں گھس گیا۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں خیال کرتا ہوں کہ یہ سب قصے اسرائیلی قصوں سے لیے گئے ہیں اور اُن سے بڑھ کر منکر وہ قصہ ہے جس کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے۔ کہا سلیمان علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ بیت الخلاء میں داخل ہوں تو جرادہ کو اپنی انگوٹھی دی، یہ عورت ان کی بیوی تھی اور سب عورتوں سے زیادہ انھیں محبوب تھی۔ پھر سلیمان علیہ السلام کی صورت میں شیطان آیا اور اس سے کہا کہ لا میری انگوٹھی، چنانچہ اس نے وہ اس کو دے دی، پھر جب اس نے اس کو پہن لیا تو جن اور انسان اور شیطان اس کے تابع ہو گئے۔ پھر جب سلیمان علیہ السلام بیت الخلاء سے نکلے اور اس سے اپنی انگوٹھی طلب کی تو وہ بولی کہ میں تو وہ سلیمان کو دے چکی۔ فرمایا: میں سلیمان ہوں، اس نے کہا تو جھوٹا ہے تو سلیمان نہیں ہے۔ پھر انھوں نے شروع کیا اور جس کسی کے پاس آتے، اسے کہتے کہ میں سلیمان ہوں، مگر وہ ان کو جھٹلاتا تھا، یہاں تک کہ لڑکے پتھروں سے ان کو مارنے لگے۔

پھر جب سلیمان علیہ السلام نے یہ معاملہ دیکھا تو پہچان گئے کہ یہ اللہ عزوجل کے حکم سے ہے اور شیطان قائم ہوا اور لوگوں پر حکومت کرنے لگا۔ پھر اللہ سبحانہ نے چاہا کہ سلیمان علیہ السلام کو ان کی سلطنت لوٹائے تو لوگوں کے دلوں میں اس شیطان کا انکار ڈال دیا۔ کہا: پھر لوگوں نے ان کی عورتوں کی طرف آدمی بھیجا اور ان سے کہا: کیا تم سلیمان کی کسی شے کو اوپرا سمجھتی ہو؟ وہ بولیں: ہاں وہ ہمارے پاس اس حال میں آتا ہے کہ ہم حیض سے ہوتی ہیں اور اس سے پہلے وہ اس طرح ہمارے پاس نہیں آتا تھا۔ پھر جب شیطان نے دیکھا کہ لوگ اس کو پہچان گئے تو سمجھ گیا کہ اس کا کام منقطع ہو چکا، پھر شیطانوں نے کتابیں لکھیں، ان میں جادو اور کفر تھا، پھر ان کو سلیمان علیہ السلام کے تخت کے نیچے دفن کر دیا۔ پھر ان کو اُکھاڑا اور لوگوں پر پڑھا اور کہا کہ سلیمان اس کی وجہ سے لوگوں پر غالب ہوتا تھا۔

لہٰذا لوگوں نے سلیمان علیہ السلام کو کفر کی طرف منسوب کیا، چنانچہ ان کی تکفیر کرتے رہے اور اس شیطان نے انگوٹھی بھیجی اور اس کو دریا میں ڈال دیا۔ ایک مچھلی اس کے سامنے آئی اور اس کو لے لیا۔ سلیمان علیہ السلام دریا کے کنارے اینٹیں اٹھایا کرتے تھے، چنانچہ ایک شخص آیا اس نے مچھلیاں خریدیں، اس میں وہ مچھلی تھی جس کے پیٹ میں انگوٹھی تھی۔ اس

[1] تفسیر الطبري (۱۹۷/۲۱)

شخص نے سلیمان علیہ السلام کو بلایا اور کہا تو میرے لیے یہ مچھلیاں اٹھا کر لے چلتا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں! اس نے کہا: کتنی اُجرت پر؟ انھوں نے کہا: ان مچھلیوں میں سے ایک مچھلی پر۔

کہا: پھر سلیمان علیہ السلام نے وہ مچھلیاں اٹھائیں اور اُن کو لے کر اس کے گھر کی طرف چلے، جب وہ اپنے دروازے تک پہنچا تو وہ مچھلی جس کے پیٹ میں انگوٹھی تھی، وہ ان کو دی تو سلیمان علیہ السلام نے وہ مچھلی لے لی اور اس کا پیٹ چاک کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے پیٹ میں سے وہ انگوٹھی نکلی۔ آپ نے وہ لے کر پہن لی، جب آپ نے اس کو پہن لیا تو جن و انس اور شیاطین آپ کے تابع ہو گئے اور اپنے حال کی طرف رجوع کر آئے اور وہ شیطان بھاگا، یہاں تک کہ سمندر کے بعض جزیروں میں سے کسی جزیرے میں چلا گیا۔ سلیمان علیہ السلام نے اس کی طلب میں لوگ بھیجے اور وہ ایک سرکش شیطان تھا، لوگ اس کو ڈھونڈنے لگے اور اس پر قابو نہیں پاتے تھے، یہاں تک کہ اس کو ایک دن سوتے ہوئے پایا تو آ کر اس پر سیسے کا ایک مکان بنا دیا۔ پھر وہ جاگا تو اس نے جست کی۔ چنانچہ اس نے گھر کے اندر جست لگانا شروع کیا، وہ جب بھی جست لگاتا تو "إِلَّا أَنْمَاطَ مَعَهُ الرَّصَاصُ" (تفسیر ابن کثیر میں اسی طرح ہے اور فتح البیان وفتح القدیر میں "إِلَّا أَنْبَاطَ مَعَهُ الرَّصَاصُ" ہے۔[1] میط بہ معنی دور شدن و دور کردن ورفتن ودفع کردن واندن ہے اور نبوط بہ معنی برآمدن آب از زمین و چاہ۔ واللّٰہ أعلم)۔ کہا: پھر اس کو پکڑا، پھر اس کو جکڑ کر بند کیا اور اس کو سلیمان علیہ السلام کے پاس لائے، چنانچہ آپ نے حکم کیا تو اس کے لیے زم پتھر کا ایک تخت کھولا گیا، پھر اس کے جوف (پیٹ) میں داخل کیا گیا، پھر تانبے سے مضبوط کیا گیا، پھر آپ نے حکم دیا تو اسے دریا میں ڈال دیا گیا۔

چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَلَقَدْ فَتَنَّا ﴾۔ کہا: ﴿ جَسَدًا ﴾ سے مراد وہ شیطان ہے جو اُن پر مسلط کیا گیا تھا۔[2] اس کی اسناد سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تک قوی ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ اگر ان سے یہ اثر (روایت) صحیح ہے تو انھوں نے اس کو اہلِ کتاب ہی سے لیا ہے۔ ان میں ایک گروہ ہے جو سلیمان علیہ السلام کی نبوت کا اعتقاد نہیں رکھتا۔ چنانچہ ظاہر یہ ہے کہ وہ ان پر جھوٹ بناتے ہیں، اسی لیے اس سیاق میں کئی منکرات ہیں۔ ان میں سے سب سے سخت عورتوں کا ذکر ہے، کیوں کہ مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم و ائمۂ سلف سے مشہور یہ ہے کہ وہ شیطان سلیمان علیہ السلام کی عورتوں پر مسلط نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اللہ پاک نے اپنے نبی کی تعظیم اور تکریم کی خاطر ان کو اس سے محفوظ رکھا۔ یہ قصہ سلف کی ایک جماعت سے مطول روایت کیا گیا ہے، جیسے: سعید بن مسیّب، زید بن اسلم اور ایک جماعت۔ یہ سب قصے اہلِ کتاب کے قصوں سے لیے گئے ہیں۔ واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم بالصواب۔

یحییٰ بن ابی عروبہ شیبانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنی انگوٹھی عسقلان میں پائی۔ "فَمَشَى فِيْ جَرَّتِهِ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤٧/٤) فتح البیان (٤٥/١٢) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٤١، ٣٢٤٢)

إِلٰی بَیْتِ الْمَقْدَسِ تُوَاضُعًا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ" یعنی پھر وہ اپنی نعمت وعیش کی فراخی میں بیت المقدس کی طرف پیدل چلے تواضع اور فروتنی کے واسطے۔ (رواہ ابن أبي حاتم)[1] (تفسیر ابن کثیر میں "جرتہ" ہے، مگر یہ لفظ "حبرتہ" معلوم ہوتا ہے "حبرہ" بالفتح بہ معنی "نعمت وسعة العیش" ہے۔ والله أعلم)۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کعب احبار سے سلیمان علیہ السلام کی صفت میں ایک عجیب خبر روایت کی ہے۔ ابو اسحاق مصری کہتے ہیں کہ جب کعب احبار حدیثِ ﴿ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴾ [الفجر: ١٩] سے فارغ ہوئے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: اے ابو اسحاق! تو مجھے سلیمان بن داود کی کرسی کے بارے میں بتا کہ وہ کیسی تھی اور کس شے کی تھی؟ تو کعب نے کہا کہ وہ ہاتھی دانت کی تھی اور اس پر گوہر، یاقوت اور زبرجد جڑے ہوئے تھے اور اس کا زینہ بھی ہاتھی دانت کا تھا، جس پر دُر و یاقوت و زبرجد جڑے ہوئے تھے، پھر کرسی کو حکم دیا تو وہ اپنی دونوں طرف سے کھجور کے درختوں کے ساتھ گھیری گئی۔

مطلب یہ ہے کہ اس کے گرد دو طرفہ کھجور کے درخت لگائے گئے، یہ درخت سونے کے تھے، ان کی ٹہنیاں یاقوت، زبرجد اور گوہر کی تھیں اور جو درخت کرسی کے دائیں طرف تھے ان کے سروں پر سونے کے مور بنائے گئے تھے اور بائیں طرف کے درختوں کے سروں پر موروں کے مقابل میں سونے کے گِدھ بنائے گئے اور درجۂ اول کے سیدھی جانب پر سونے کے دو درخت صنوبر کے اور اس کے بائیں جانب دو شیر سونے کے اور شیروں کے سروں پر زبرجد کے دو ستون تھے اور کرسی کے دونوں جانب انگور کے دو درخت سونے کے جو کرسی پر سایہ کیے ہوئے تھے اور ان کے خوشے دُر اور سرخ یاقوت کے تھے۔ پھر کرسی کے زینے پر مجوف سونے کے دو بڑے شیر بنائے گئے جن میں مشک اور عنبر بھرا ہوا تھا۔

جب سلیمان علیہ السلام اپنی کرسی پر چڑھنے کا ارادہ کرتے تو وہ دونوں شیر گھڑی بھر کے لیے چکر کھاتے، پھر گر پڑتے اور اُن کے پیٹ میں جو مشک تھا، اسے سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے آس پاس چھڑک دیتے تھے۔ پھر سونے کے دو منبر رکھے جاتے، ایک ان کے خلیفہ کے لیے اور دوسرا اس وقت کے بنی اسرائیل کے رئیس احبار کے لیے۔ پھر کرسی کے آگے سونے کے ستر منبر رکھے جاتے، ان پر ستر قاضی علماء اور بنی اسرائیل کے بڑے بڑے شرفاء بیٹھتے اور ان سب منبروں کے پیچھے سونے کے پینتیس منبر اَور ہوتے جن پر کوئی نہ ہوتا۔

جب سلیمان علیہ السلام اپنی کرسی پر چڑھنے کا ارادہ کرتے تو اپنے دونوں قدم نیچے کے زینے پر رکھتے تو ساری کرسی مع اس شے کے جو اس میں یا اس پر تھی چکر کھاتی اور شیر اپنا ہاتھ بچھاتا اور گدھ اپنا بایاں بازو پھیلاتا، پھر سلیمان علیہ السلام دوسرے درجے پر چڑھتے تو شیر اپنا بایاں ہاتھ بچھاتا اور گدھ اپنا سیدھا بازو پھیلاتا اور جب وہ تیسرے درجے پر مستوی ہوتے اور اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے تو ان گدھوں سے بڑا گدھ سلیمان علیہ السلام کا تاج لے کر اُن کے سر پر رکھتا،

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٤٨)

جب وہ اس کو ان کے سر پر رکھ دیتا تو کرسی ہر اس شے کے ساتھ جو اس میں تھی اس طرح چکر کھاتی جس طرح کہ تیز چکی چکر کھاتی ہے۔

چنانچہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے ابو اسحاق! اس کو کون سی شے چکر دیتی تھی؟ کہا کہ سونے کا ایک اژدہا تھا جس پر وہ کرسی تھی، یہ ایک بڑی شے تھی جس کو صخر جنی نے بنایا تھا۔ پھر وہ شیر اور گدھ اور مور جو کرسی کے نیچے تھے، اس کے چکر کھانے کی آہٹ پاتے تو وہ اس کے اعلیٰ کی طرف چکر کھاتے اور جب وہ ٹھہرتی تو وہ سب ٹھہر جاتے، اس حال میں کہ اپنے سر سلیمان علیہ السلام کے سر پر جھکائے ہوتے اور وہ بیٹھے ہوئے ہوتے۔ پھر وہ سب سلیمان علیہ السلام کے سر پر وہ مشک وعنبر چھڑکتے جو اُن کے پیٹ میں تھا۔ چنانچہ سونے کی ایک کبوتری جو جوہر کے ایک ستون پر ٹھہری ہوئی تھی، وہ تورات کو لے کر سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر رکھتی اور وہ اس کو لوگوں پر پڑھتے۔[1] (وذكر تمام الخبر وهو غريب جدا)

قولہ تعالیٰ: ﴿ رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ﴾ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ تو مجھے ایسا ملک بخش کہ کسی کو وہ مجھ سے سلب کرنے کی صلاحیت نہ ہو، جس طرح کہ جسد کا قصہ ہوا جو اُن کی کرسی پر ڈالا گیا تھا، یہ نہیں کہ وہ ان کے بعد کے لوگوں کے لیے ممنوع اور محجور ہو۔ صحیح یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے ایسے ملک کا سوال کیا کہ ویسا ان کے بعد کسی بشر کے لیے نہ ہو۔ آیت سے یہی سیاق ظاہر ہوتا ہے اور اسی بارے میں صحیح حدیثیں وارد ہوئی ہیں، جن میں سے چند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق سے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے آیتِ مذکور کی تفسیر کے تحت عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ روایت کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کی رات ایک عفریت جن مجھ پر جھپٹ آیا، یا ایسا ہی کوئی کلمہ فرمایا، تاکہ مجھ پر نماز کو قطع کرے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس پر قدرت دی اور میں نے ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون کے ساتھ باندھ دوں، تاکہ تم صبح کو اٹھ کر اسے دیکھ لو، پھر میں نے اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کا قول یاد کیا: ﴿ رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ﴾۔ روح راوی نے کہا "فَرَدَّهُ خَاسِئًا" یعنی پھر اس کو رد کر دیا راندا ہوا۔[2] "وكذا رواه مسلم والنسائي من حديث شعبة به"۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے: "پناہ مانگتا ہوں میں ساتھ اللہ کے تجھ سے۔" پھر فرمایا: "لعنت کرتا ہوں میں تجھ کو اللہ کی لعنت کے ساتھ۔" ایسا تین بار فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک پھیلایا، گویا کسی شے کو لیتے ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم نے آپ کو نماز میں ایک ایسی شے کہتے ہوئے سنا جو آپ کو اس سے پہلے کہتے ہوئے نہیں سنا اور ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے اپنا

[1] تفسير ابن كثير (٤/٤٨، ٤٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٤١) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٤٣)

ہاتھ پھیلایا۔ فرمایا: بے شک اللہ کا دشمن ابلیس آگ کا ایک شعلہ لایا، تا کہ اس کو میرے منہ میں ڈالے تو میں نے تین بار «أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ» کہا، پھر میں نے تین بار «أَلْعَنُكَ بِلَعْنَةِ اللّٰهِ التَّامَّةِ» کہا تو وہ پیچھے نہ ہٹا۔ پھر میں نے ارادہ کیا کہ اس کو پکڑ لوں، واللہ! اگر ہمارے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا نہ ہوتی تو البتہ وہ صبح کو بندھا ہوا ملتا اور مدینے کے لڑکے اس سے کھیلتے۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے ابو عبید حاجب سلیمان سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عطاء بن یزید لیثی کو دیکھا کہ کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا تھا۔ میں چلا اور اس کے آگے سے گزرنے لگا تو اس نے مجھے روکا۔ پھر کہا: مجھے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے صبح کی نماز پڑھ رہے تھے اور ابو سعید رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا تو قراءت آپ پر ملتبس ہوگئی، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: اگر تم مجھ کو دیکھتے اور ابلیس کو، میں نے اپنا ہاتھ جھکایا، پھر میں اس کا گلا گھونٹتا رہا، یہاں تک کہ میں نے اس کے لعاب کی سردی اپنی دو انگلیوں، یعنی انگوٹھے اور اس کے پاس والی انگلی کے درمیان پائی۔ اگر میرے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا نہ ہوتی تو وہ صبح کو مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ بندھا ہوا ملتا اور مدینے کے بچے اس سے کھیلتے ہوتے۔ چنانچہ جو شخص تم میں سے طاقت رکھے کہ کوئی اس کے قبلے کے درمیان حائل نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ کرے۔[2] (وقد روى أبو داود منه "من استطاع منكم أن لا يحول بينه و بين القبلة أحد فليفعل" عن أحمد بن أبي شريح عن أبي أحمد الزبيري به)

امام احمد رحمہ اللہ نے ربیعہ بن یزید بن عبد اللہ دیلمی سے روایت کیا ہے، کہا: میں عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور وہ اپنے ایک باغ میں تھے جو طائف میں تھا، اس کو رہیط کہتے تھے اور وہ قریش کے ایک جوان کو روکنے والے تھے جو زنا کرتا اور شراب پیتا تھا۔ میں نے کہا: مجھے تم سے ایک حدیث پہنچی ہے کہ جس شخص نے شراب کا ایک گھونٹ پیا تو اللہ عزوجل چالیس دن اس کی توبہ قبول نہ کرے گا اور بے شک بد بخت وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ میں بد بخت ہوا اور بے شک جو شخص بیت المقدس میں صرف اس میں نماز ادا کرنے کی غرض سے آیا، وہ اپنی خطاؤں سے نکل کر ایسے ہوگا جیسے اس دن اس کو اس کی ماں نے جنا۔

پھر جب اس جوان نے شراب کا ذکر سنا تو اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ سے کھینچا، پھر چلا گیا۔ پس عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا: بے شک میں کسی کے لیے یہ حلال نہیں کرتا کہ وہ مجھ پر وہ شے کہے جو میں نے نہیں کہی، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے، جس شخص نے شراب کا ایک گھونٹ پیا تو اس کے لیے چالیس دن تک نماز قبول نہ کی جائے گی اور اگر اس نے توبہ کی تو اللہ اس پر رجوع کرے گا، پھر اگر اس نے عود کیا (یعنی پھر وہی کیا) تو اس کی

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٤٢)

[2] مسند أحمد (٨٢/٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٩٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٥١)

توبہ چالیس صبح تک قبول نہ کی جائے گی، پھر اگر اس نے توبہ کی تو اللہ اس پر رجوع کرے گا۔ کہا: پس میں نہیں جانتا کہ تیسری بار میں یا چوتھی بار میں فرمایا: پھر اگر اس نے عود کیا تو اللہ پر حق ہے کہ اسے قیامت کے دن طینۃ الخبال سے پلائے۔ کہا اور میں نے سنا رسول اللہ ﷺ کو کہ فرماتے تھے: بے شک اللہ عزوجل نے اپنی خلق کو تاریکی میں پیدا کیا، پھر اُن پر اپنا نور ڈالا۔ چنانچہ جس شخص کو اس دن اس کے نور میں سے پہنچا تو اس نے راہ پائی اور جو شخص کہ اس کو چوک گیا تو وہ گمراہ ہوا، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اللہ عزوجل کے علم پر قلم خشک ہو گیا۔ کہا: اور سنا میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہ فرماتے تھے: بے شک سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے تین خصلتوں کا سوال کیا جن میں سے دو ان کو عطا کیں اور ہم امید رکھتے ہیں کہ تیسری ہمارے لیے ہو۔

اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ فیصلہ اس کے حکم کے مطابق ہو، چنانچہ یہ ان کو عطا کیا اور اس سے ایسے ملک کا سوال کیا جو اُن کے بعد کسی اور کے لائق نہ ہو، چنانچہ یہ اُن کو عطا کیا اور اس سے سوال کیا کہ جو شخص اپنے گھر سے نکلے اور وہ صرف اس مسجد میں نماز کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ اپنی خطاؤں سے اس طرح نکلے جیسے اسے اس کی ماں نے اس دن جنا ہو، چنانچہ ہم اُمید رکھتے ہیں کہ اللہ عزوجل ہم کو یہ چیز ضرور عطا کرے گا۔[1] (وقد روى هذا الفصل الأخير من هذا الحديث النسائي وابن ماجه من طرق عن عبدالله بن فيروز الديلمي عن عبد الله بن عمر رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: إن سليمان عليه السلام لما بنى بيت المقدس سأل ربه عزوجل خلالا ثلاثا، وذكره.[2] وقد روي من حديث رافع بن عمير رضي الله عنه بإسناد وسياق غريبين)

امام طبرانی رحمہ اللہ نے رافع بن عمیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ عزوجل نے داود علیہ السلام سے فرمایا کہ میرے لیے زمین میں ایک گھر بنا، چنانچہ داود علیہ السلام نے اس گھر سے پہلے اپنے لیے ایک گھر بنایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی: اے داود! "نَصَبْتَ بَيْتَكَ قَبْلَ بَيْتِيْ"، یعنی تو نے میرے گھر سے پہلے اپنا گھر کھڑا کیا۔ داود علیہ السلام نے عرض کی: اے رب! اسی طرح فیصلہ کیا گیا تھا۔ پھر مسجد بنانے لگے۔ جب دیوار مکمل ہوئی تو اس کا تہائی حصہ گر پڑا تو اللہ عزوجل سے اس کی شکایت کی۔ فرمایا: اے داود! بے شک تو صلاحیت نہیں رکھتا اس بات کی کہ میرے لیے گھر بنائے۔ عرض کی: یا رب! کیوں؟ فرمایا: ان خونوں کے سبب سے جو تیرے ہاتھ پر جاری ہوئے۔ عرض کی: یا رب! کیا یہ تیری خواہش اور محبت میں نہ تھا؟ فرمایا: ہاں لیکن وہ میرے بندے ہیں اور میں ان پر رحم کرتا ہوں۔ پس یہ بات ان پر شاق ہوئی تو اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ تو رنج مت کر، میں عن قریب اس کی تعمیر تیرے بیٹے سلیمان کے ہاتھوں پر جاری کروں گا۔

---

[1] مسند أحمد (١٧٦/٢) صحيح الجامع (٦٣١٢)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (٦٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٠٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠٩٠)

پھر جب داود علیہ السلام نے وفات پائی تو سلیمان علیہ السلام نے اس کی تعمیر شروع کی۔ پھر جب وہ مکمل ہو گئی تو قرابین قربان کیے اور ذبائح ذبح کیے اور بنی اسرائیل کو جمع کیا۔ اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ میرا گھر بنانے میں جو تجھے خوشی ہوئی، وہ میں دیکھتا ہوں، لہٰذا تو مجھ سے مانگ میں تجھے دوں گا۔ عرض کی کہ میں تجھ سے تین خصلتیں مانگتا ہوں، ایک یہ کہ میرا فیصلہ تیرے فیصلے کے مطابق ہو اور دوسرے مجھے ایسی حکومت دے جو میرے بعد اور کسی کو لائق نہ ہو اور تیسری یہ کہ جو شخص اس گھر میں صرف نماز پڑھنے کے ارادے سے آئے تو وہ جب اس میں سے نکلے تو گناہوں سے ایسا پاک ہو جیسا کہ اس دن اس کو اس کی ماں نے جنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو خصلتیں تو واقعی ان کو عطا کی گئیں اور میں اُمید کرتا ہوں کہ تیسری خصلت یقیناً مجھے دی جائے۔[1] امام احمد رحمہ اللہ نے سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے کبھی نہیں سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی، مگر اس کو یوں شروع فرمایا: « سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَلِيِّ الْأَعْلَى الْوَهَّابِ »[2]

امام ابو عبید رحمہ اللہ نے صالح بن مسمار سے روایت کیا ہے، کہا: جب اللہ کے نبی داود علیہ السلام نے وفات پائی تو اللہ پاک تبارک و تعالیٰ نے ان کے فرزند سلیمان علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ تو مجھ سے اپنی حاجت مانگ۔ انھوں نے عرض کی: میں تجھ سے یہ مانگتا ہوں کہ تو میرا دل ایسا کر دے جو تجھ سے ڈرے، جیسا کہ میرے باپ کا دل تھا اور میرے دل کو ایسا کر دے کہ تجھے دوست رکھے، جیسا کہ میرے باپ کا دل تھا۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا کہ میں نے اپنے بندے کی طرف بھیجا اور اس سے اس کی حاجت کا سوال کیا تو اس کی حاجت یہ ہوئی کہ میں اس کے دل کو ایسا کر دوں جو مجھ سے ڈرے اور اس کے دل کو ایسا کر دوں کہ مجھ کو دوست رکھے۔ البتہ میں اس کو ایسا ملک بخشوں گا جو کسی اور کے لائق نہ ہو گا۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ﴾ اور وہ آیت جو اس کے بعد ہے۔ کہا: پس عطا کیا ان کو جو کچھ عطا کیا اور آخرت میں ان پر کچھ حساب نہیں ہے۔[3] (هكذا أورده أبو القاسم ابن عساكر في ترجمة سليمان عليه السلام في تاريخه) بعض سلف سے مروی ہے کہ کہا: مجھے داود علیہ السلام سے یہ بات پہنچی ہے کہ انھوں نے عرض کی: الٰہی! تو سلیمان کے لیے ایسا ہو جا، جیسا کہ تو میرے واسطے تھا۔ پس اللہ عزوجل نے ان کی طرف وحی کی کہ تو سلیمان سے کہہ دے کہ وہ میرے لیے ایسا ہو جائے جیسا کہ تو میرے واسطے تھا تو میں اس کے لیے ایسا ہوں جاؤں گا جیسا کہ میں تیرے لیے تھا۔

---

[1] المعجم الكبير (٢٤/٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه محمد بن أيوب بن سويد الدملي وهو متهم بالوضع" (مجمع الزوائد: ٦٧٦/٣)

[2] مسند أحمد (٥٤/٤) اس کی سند میں "عمر بن راشد یمامی" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٤٥٥٧)

[3] تاريخ دمشق (٣٨/٢٢)

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے ﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ جب سلیمان علیہ السلام نے اللہ عزوجل کی خاطر خفا ہو کر گھوڑوں کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے عوض میں ان کو وہ شے دی جو گھوڑوں سے بہتر ہے اور زیادہ تیز ہے، یعنی ہوا جس کا صبح کو جانا ایک ماہ کی راہ اور شام کو جانا ایک ماہ کی راہ۔[1] ﴿حَيْثُ اَصَابَ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ شہروں میں سے جس شہر کا ارادہ کرتے تھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان میں سے بعض تو وہ تھے جن سے بڑے بڑے ہولناک مکانوں کے بنانے کا کام لیا جاتا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ﴾ [سبا: ۱۳] ''مثلاً قلعے اور مجسمے اور حوضوں کے برابر لگن اور چولہوں پر جمی ہوئی مضبوط دیگیں۔'' ان کے علاوہ اور مشقت کے کام ان سے لیے جاتے تھے جن پر بشر کو قدرت نہیں اور اُن میں سے ایک گروہ دریا میں غوطہ لگانے والا تھا۔ دریاؤں میں جو موتی جواہر اور نفیس چیزیں ہوتی ہیں اور اُن کے سوا اور کہیں نہیں ملتی ہیں ان کو نکالتے ہیں۔ ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے وہ شیاطین تھے جو طوقوں اور بیڑیوں میں جکڑ بند کیے تھے۔ یہ وہ ہیں جنھوں نے تمرد و سرکشی اور نافرمانی کی اور کام کرنے سے باز رہے، یا اپنے کام میں بُرائی کی اور حد سے بڑھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ یعنی یہ پورا ملک اور کامل سلطنت جو ہم نے تجھے عطا کی، جیسی کہ تو نے ہم سے مانگی، پس تو عطا کر جس کو چاہے اور محروم رکھ جس کو چاہے، تجھ پر حساب نہیں ہے، یعنی جو کچھ تو کرے تجھے جائز ہے، جو چاہے حکم کر وہ صواب ہے۔ صحیحین میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب اختیار دیا اس کے درمیان کہ آپ عبد رسول ہوں، وہ یہ ہے کہ جس بات کا اسے حکم دیا جائے وہ کرے، وہ یہی ایک قاسم ہے کہ لوگوں کے درمیان بانٹے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو امر کیا، اور اس کے درمیان کہ آپ نبی ملک (بادشاہ) ہوں، عطا کریں جس کو چاہیں اور منع کریں جس کو چاہیں بغیر کسی حساب اور گناہ کے، تو آپ ﷺ نے پہلے مرتبے کو اختیار فرمایا۔ اس کے بعد جبرائیل علیہ السلام سے مشورہ لیا تو انھوں نے آپ سے کہا ہے کہ تواضع کرو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے پہلے مرتبے کو اختیار کیا،[2] اس لیے کہ اللہ عزوجل کے نزدیک وہ زیادہ بلند ہے، قدر و منزلت میں اور عالی تر مرتبہ ہے قیامت کے دن، گو دوسرا مرتبہ یعنی نبوت مع ملک بھی عظیم ہے دنیا اور آخرت میں اور اسی لیے جب اللہ پاک نے اس شے کا ذکر کیا جو سلیمان علیہ السلام کو دنیا میں عطا کی تھی تو اس بات سے آگاہ فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت کے دن بھی صاحبِ بہرۂ عظیم ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ﴾ یعنی دارِ آخرت میں۔[3]

---

(1) تفسير الطبري (۲۱/۲۰۱، ۲۰۲) تفسير ابن كثير (۵۱/٤)

(2) صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ مسند أحمد (۲۳۱/۲) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۰۰۲)

(3) تفسير ابن كثير (٤/٤٥۔ ٥١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اللہ پاک نے سلیمان علیہ السلام کی ان کے ملک کو سلب کر کے آزمایش کی۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے دخترانِ ملوک میں سے ایک عورت کے ساتھ نکاح کیا تو اس نے ان کے گھر میں بت پوجا اور اُن کو اس کی خبر نہ ہوئی تو اس غفلت کی وجہ سے ان کی آزمایش ہوئی۔ کسی نے کہا کہ آزمایش کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے ایک عورت سے نکاح کیا جس کو ''جرادہ'' کہتے تھے اور وہ اس سے انتہائی محبت کرتے تھے۔ پھر دو فریق ان کے پاس جھگڑا لائے، ان میں سے ایک فریق جرادہ کے گروہ والوں میں سے تھا۔ انھوں نے یہ چاہا کہ فیصلہ اُن کے حق میں ہو، پھر ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا۔ کسی نے کہا سبب یہ ہے کہ انھوں نے تین دن لوگوں سے حجاب کیا، کسی کے درمیان فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ انھوں نے اسی جرادہ سے نکاح کیا، حالاں کہ وہ مشرکہ تھی، کیوں کہ انھوں نے اس پر اسلام پیش کیا تو وہ بولی: تم مجھے مار ڈالو، مگر میں مسلمان نہیں ہوں گی۔

کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا: جب انھوں نے گھوڑوں پر قتل کے ساتھ ظلم کیا تو اُن کا ملک سلب کر لیا گیا۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے اپنی بعض عورتوں سے حیض میں قربت کی یا اس کے غیر سے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ان کو یہ حکم کیا گیا تھا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کے سوا کسی عورت سے نکاح نہ کریں اور انھوں نے کسی ایسی عورت سے نکاح کیا جو بنی اسرائیل کی نہیں تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی آزمایش کا سبب وہ ہے جو صحیح حدیث میں ثابت ہوا ہے کہ انھوں نے کہا ہے کہ میں آج رات نوے (۹۰) عورتوں پر طواف کروں گا، ان میں سے ہر ایک لڑکا جنے گی جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور ان شاء اللہ نہ کہا۔[2] اس کے سوا اور قول بھی ہیں۔ حدیث شریف کی طرف جانا متعین ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ جو قصہ خاتم و شیطان اور سلیمان علیہ السلام کے گھر میں بت کی عبادت کے بارے میں روایت کیا جاتا ہے تو یہ یہود کے باطل قصوں میں سے ہے۔ انتہیٰ. صاحب فتح البیان رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ حدیثِ خاتم کو نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور سیوطی رحمہ اللہ نے اس کو قوی کہا ہے۔[3] لہٰذا اس کا اباطیلِ یہود سے ہونا جیسے لائق ہے ویسا نہیں ہے، چنانچہ اس کا بیان آیندہ آتا ہے۔

بالجملہ پھر اللہ پاک نے وہ شے بیان کی جس کے ساتھ سلیمان علیہ السلام کی آزمایش کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَأَلْقَيْنَا عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ﴾ ﴿ جَسَدًا ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ ﴿ وَأَلْقَيْنَا ﴾ کا مفعول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نصب بنا بر حال ہے اس طور پر کہ اس کی تاویل مشتق کے ساتھ کریں گے: "أَيْ: ضَعِيفًا أَوْ فَارِغًا" جب کہ پہلی صورت

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/١٩٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٦٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٥٤)

[3] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٢٨٧) الدر المنثور (٧/١٧٩)

زیادہ مناسب ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ جسد جس کو اللہ پاک نے سلیمان علیہ السلام کی کرسی پر ڈالا، وہ صخر نام کا شیطان تھا اور وہ اُن کا باغی اور سرکش تھا اور اُن کی اطاعت میں داخل نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر سلیمان علیہ السلام کا شبہہ ڈال دیا، وہ ہمیشہ حیلہ گری کرتا رہا، یہاں تک کہ ان کی انگوٹھی پر قبضہ کرلیا، جب کہ وہ بیت الخلاء میں داخل ہوئے، اس لیے کہ جس وقت وہ اس میں داخل ہوتے تو اسے اتار ڈالتے تھے۔ چنانچہ صخر سلیمان علیہ السلام کی شکل میں آیا اور ان کی بیوی سے انگوٹھی لے لی، پھر تختِ سلیمانی پر بیٹھا اور چالیس دن تک ان کے ملک میں قائم رہا اور وہ بھاگے پھرتے تھے۔ ان کا ملک اس انگوٹھی کے پہننے کی وجہ سے قائم تھا، چنانچہ جب اس کو پہن لیتے تو جن وانس و ہوا وغیرہ ان کے لیے مسخر ہو جاتے اور جب اسے اتار دیتے تو ملک ان سے زائل ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ان کی انگوٹھی جنت سے تھی، آدم علیہ السلام اسے لے کر اترے تھے جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور حجرِ اسود، عود بخور اور اوراقِ انجیر کو لے کر نازل ہوئے تھے۔ بعض نے ان پانچوں کو اپنے شعر میں نظم کیا ہے:

وَآدَمُ مَعَهُ أُنْزِلَ الْعُوْدُ وَالْعَصَا لِمُوْسىٰ مِنَ الآسِ النَّبَاتِ الْمُكَرَّمِ
وَأَوْرَاقُ تِيْنٍ وَالْيَمِيْنُ بِمَكَّةَ وَخَتْمُ سُلَيْمَانَ النَّبِيِّ الْمُعَظَّمِ

لیکن یہ بات اس کی نیاز مند ہے کہ اس پر کوئی صحیح مرفوع حدیث دلالت کرے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے فتنے اور جسد کی تفسیر میں مروی ہے، وہ شیطان ہے جو اُن کی کرسی پر فیصلہ کرتا تھا لوگوں کے درمیان چالیس دن تک اور سلیمان علیہ السلام کی ایک بیوی تھی، جس کو جرادہ کہتے تھے، ان کے بعض اہل کے اور ایک قوم کے درمیان جھگڑا تھا تو سلیمان علیہ السلام نے ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا تھا، مگر اتنا ہوا کہ انھوں نے یہ چاہا کہ حق اہلِ جرادہ کے ساتھ ہوتا، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ عن قریب تجھے ایک آزمایش پہنچے گی۔ چنانچہ انھیں معلوم نہیں تھا کہ وہ آسمان سے آئے گی یا زمین سے۔[1] (أخرجه الحاكم وصححه والفريابي والحكيم الترمذي عنه وأخرج النسائي وابن جرير وابن أبي حاتم بسند قال السيوطي: قوي عن ابن عباس رضی اللہ عنہما) فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ بیت الخلاء میں داخل ہوں تو اپنی انگوٹھی جرادہ کو دی... الخ۔ یہ قصہ پورا پہلے گزر چکا ہے۔ پہلے چوں کہ اس کا حوالہ دیا تھا، اس لیے اس کی طرف اس قدر اشارہ کر دیا، لیکن یہ وہی قصہ ہے جس کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سخت منکر کہا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ اَنَابَ ﴾ میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ چالیس دن کے بعد اپنے ملک کی طرف رجوع ہوئے۔ دوسرا یہ ہے کہ اللہ کی طرف اپنے گناہ سے توبہ کے ساتھ رجوع ہوئے۔ صحیح یہی قول ہے اور جملہ: ﴿ قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَهَبْ ﴾ ﴿ ثُمَّ اَنَابَ ﴾ سے بدل ہوگا اور اس کی تفسیر ٹھہرے گا، یعنی سلیمان علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! تو میرے واسطے وہ گناہ بخش دے جو مجھ سے صادر ہوا اور جس کی وجہ سے تو نے مجھے مبتلا کیا۔ مغفرت کا طلب

---

[1] مستدرك الحاكم (٤٧١/٢) الدر المنثور (١٧٨/٧) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کرنا انبیاء اور صلحاء کا طریقہ ہے، اپنی کسرِ نفسی کے لیے اپنی ذلت اور خشوع کے اظہار کے لیے اور اپنے مقام کی ترقی طلب کرنے کے لیے۔

پھر جب توبہ واستغفار پیش کی تو اس کو اپنی طلب کے قبول ہونے کے لیے وسیلہ ٹھہرایا۔ چنانچہ یوں کہا: ﴿وَهَبْ لِيْ مُلْكًا﴾۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں: "لَا يَكُوْنُ لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِيْ"[1] یعنی تو مجھے ایسا ملک بخش، جیسا میرے بعد اور کسی کے لیے نہ ہو۔ یا معنی یہ ہیں کہ میرے بعد کسی کے واسطے صحیح نہ ہو، اس کی عظمت کے سبب سے۔ اس سوال سے سلیمان علیہ السلام کو کچھ دنیا اور دنیا کی بادشاہت اور دنیا والوں کے درمیان عزت اور بزرگی منظور نہ تھی، بلکہ ملک مانگنے سے ان کی مراد یہ تھی کہ اس کی وجہ سے اللہ پاک کے حکم جاری کرنے پر قادر ہوں اور جن وانس میں جو باغی اور سرکش ہیں ان کو اللہ کے بندوں کو ایذا دینے سے باز رکھیں۔ اس سوال کے لیے جو امور مقتضی ہیں اگر ان میں سے اور کوئی بات نہ ہوتی مگر صرف وہی شیطانی احکام جو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں جاری تھے جن کو انھوں نے دیکھا جب شیطان ان کے تخت پر بیٹھا تو البتہ کافی ہوتا۔

جملہ ﴿إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ ما قبل کی تعلیل ہے۔ اول دو امر مذکور ہیں: ایک تو طلبِ مغفرت۔ دوسرا طلبِ ملک۔ چنانچہ یہ جملہ دونوں کی علت ہے۔ یہ نہیں کہ فقط آخری امر کی ہو، کیوں کہ مغفرت بھی من جملہ اللہ کے وصفِ وہابیت سے ہے قطعاً۔[2] (كما قاله أبو السعود) یعنی میں تجھ سے مغفرت کا طالب اور ملک کا سوال کرنے والا اس لیے ہوں کہ تو تو بڑا بخشنے والا اور بڑا عطا کرنے والا ہے۔ تیری عطائے کثیر اور عظیم موہوبات کے روبرو اس طلب کی کیا ہستی ہے۔

پھر اللہ پاک نے ذکر کیا کہ اس نے ان کی دعا قبول کی اور اُن کا مطلوب ان کو عطا کیا۔ ارشاد فرمایا: ﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ﴾ یعنی پھر ہم نے ہوا اس کے حکم کی مطیع اور فرماں بردار کر دی۔ پھر اس کے تابع کرنے کی کیفیت یہ بیان فرمائی کہ ﴿تَجْرِيْ بِأَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ أَصَابَ﴾ یعنی وہ اس کے حکم سے چلتی تھی نرم نرم، سخت اور تیز نہ تھی۔ ﴿رُخَآءً﴾ ماخوذ ہے "رُخَاوَةٌ" سے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی نرم ہوا تھی کہ نہ تو درخت اُکھاڑتی تھی اور نہ تندی کرتی تھی، باوجود اس کے کہ اپنے چلنے میں قوی اور تیز رفتار تھی۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِأَمْرِهٖ﴾ [الأنبياء: ٨١] "ہم نے تند وتیز ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا جو اس کے فرمان کے مطابق چلتی تھی۔" ان دونوں میں کچھ تضاد نہیں ہے، کیوں کہ مراد یہ ہے کہ وہ عاصفہ کی قوت میں تھی اور تندی نہیں کرتی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ کبھی تو وہ نرم چلتی اور کبھی تند، جس طرح سلیمان علیہ السلام کا ارادہ اور خواہش ہوتی۔ جمع بین الآیتین میں یہ قول زیادہ مناسب ہے۔

---

[1] فتح القدير (٥٧٠/٤) [2] تفسير أبي السعود (٢٢٧/٧)

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر اہل لغت ومفسرین کا اجماع ہے کہ ﴿ حَيْثُ أَصَابَ ﴾ کے معنی ہیں: "حَيْثُ أَرَادَ" اور حقیقت اس کی "حَيْثُ قَصَدَ" ہے۔[1] امام اصمعی اور ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب بولتے ہیں: "أَصَابَ الصَّوَابَ وَأَخْطَأَ الْجَوَابَ" کسی نے کہا ہے کہ حمیر کی لغت میں ﴿ أَصَابَ ﴾ کے معنی "أَرَادَ" ہیں اور یہ لغتِ عرب سے نہیں ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ہجر کی زبان میں ہے، جب کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ﴿ أَصَابَ ﴾ ماخوذ ہے "إصابة السهم للغرض" سے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالشَّيٰطِيْنَ ﴾ معطوف ہے ﴿ الرِّيْحَ ﴾ پر، یعنی اور مسخر کیا ہم نے اس کے لیے شیاطین کو اور ﴿ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴾ بدل ہے ﴿ الشَّيٰطِيْنَ ﴾ سے، یعنی ہم نے اس کے لیے ان میں سے ہر بنانے والے کو اور ہر غوطہ لگانے والے کو مسخر کیا، وہ ان کے لیے وہ مکانات بناتے تھے جو وہ چاہتے تھے اور دریا میں غوطہ لگاتے تھے اور اس میں سے ان کے لیے موتی نکالتے تھے۔ پہلے پہل جس نے دریا سے موتی نکالے وہ سلیمان علیہ السلام ہیں۔

﴿ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴾ معطوف ہے ﴿ كُلَّ ﴾ پر، حکمِ بدل میں داخل ہے۔ یہ جن اور شیاطین کے سرکش لوگ ہیں، ان کے لیے مسخر کیے گئے تھے، یہاں تک کہ اصفاد میں ان کو قرین کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ رسیوں میں ان کو قرین کیا تھا، اس لیے کہ وہ ایک کثیر جماعت تھی۔ ﴿ الْاَصْفَادِ ﴾ بہ معنی اغلال ہے، "صَفَدٌ" کی جمع ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ الْاَصْفَادِ ﴾ سے مراد سلاسل ہیں، یعنی زنجیریں۔ جس شے کو تم نے لوہے وغیرہ سے خوب باندھا تو واقعی تم نے اس کا صفد کیا یعنی اس کو جکڑ کر بند کیا۔[3] امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: "صَفَدْتُ الرَّجُلَ فَهُوَ مَصْفُوْدٌ وَصَفَّدْتُهُ مُصَفَّدٌ". یحییٰ بن سلام نے کہا ہے کہ ﴿ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴾ انہیں کو کرتے تھے جو اُن میں سے کافر ہوتے، پھر جب وہ ایمان لے آتے تو اُن کو چھوڑ دیتے تھے اور ان کو مسخر نہ کرتے۔[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ هٰذَا عَطَآؤُنَا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس سے کہا کہ یہ ہوا اور شیاطین کی تسخیر یا ملک ومال اور فراخی جس کا ذکر ہوا ہماری عطا ہے جو ہم نے تجھے دی، یعنی ملکِ عظیم جو تو نے طلب کیا، سو تو دے جس کو چاہے اور روک جس سے چاہے۔ یہ قول امام حسن اور ضحاک رحمہ اللہ وغیرہما کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آزاد کر جنوں میں سے جس کو چاہے اور روک ان میں سے جس کو چاہے بغیر حساب کے،[5] یعنی اس دینے اور روکنے میں تجھ پر کسی طرح کا حساب نہیں ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ تیرے لیے ہماری عطا بغیر حساب ہے، اس کی کثرت وعظمت کے سبب سے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هٰذَا عَطَآؤُنَا ﴾ قوتِ جماع کی طرف اشارہ ہے جو اُن کو عطا کی گئی تھی۔[6] اس کی کوئی وجہ نہیں کہ آیت سے صرف یہی مطلب لیا جائے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ اس کا ذکر من جملہ مذکورات گزر

---

[1] معاني القرآن (٤/٣٣٣) [2] فتح القدير (٤/٥٧١) [3] معاني القرآن (٤/٣٣٣)
[4] فتح القدير (٤/٥٧١) [5] تفسير الطبري (٢١/٢٠٦، ٢٠٧) [6] تفسير القرطبي (١٥/٥٠٦)

چکا ہے۔ پھر باوجود اس کے اس کا ذکر نہ کر کے یہ دعویٰ کیسے ہو سکتا ہے کہ آیت اس کے ساتھ خاص ہے۔ ﴿ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ بے شک ہمارے پاس آخرت میں اس کے لیے قربت اور حسنِ مرجع ہے، یعنی جنت۔[1]

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۭ﴿41﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿42﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿43﴾ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ۭ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿44﴾

اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کیجیے، جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بلاشبہ مجھے شیطان نے تکلیف اور ایذا پہنچائی ہے ﴿41﴾ (ہم نے کہا:) اپنا پیر زمین پر مار، یہ غسل کرنے اور پینے کو (ٹھنڈا پانی) ہے ﴿42﴾ اور ہم نے اسے اس کا پورا کنبہ اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور عطا کیے، اپنی طرف سے بطور رحمت اور یہ عقل مندوں کے لیے ایک نصیحت ہے ﴿43﴾ اور (ہم نے کہا:) اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مٹھا (جھاڑو) پکڑ، اور اس کے ساتھ (قسم پوری کرنے کے لیے اپنی بیوی کو) مار، اور قسم نہ توڑ، بے شک ہم نے اسے صابر پایا، (وہ) اچھا بندہ تھا، بلاشبہ وہ (اللہ کی طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا ﴿44﴾

ایوب علیہ السلام کا تذکرہ:

جب اللہ نے چاہا کہ ایوب علیہ السلام کو تندرست کر دے تو اُن کے لات مارنے سے ایک چشمہ نکالا، اسی سے نہایا کرتے اور اسی سے پیتے تھے، وہی ان کی شفا ہوئی اور اُن کے بیٹے اور بیٹیاں چھت کے نیچے دب مرے تھے، ان کو زندہ کیا اور اتنی ہی اولاد اور دی۔ مرض میں خفا ہو کر قسم کھائی تھی کہ اپنی عورت کو سو لکڑیاں ماریں گے، اگر تندرست ہوں گے۔ وہ بیوی اس حال کی ساتھی تھی اور بے قصور تھی۔ اللہ نے اس طرح قسم سچی کروا دی۔ انتہیٰ

اللہ پاک اپنے بندے اور رسول ایوب علیہ السلام کا اور اس ایذا اور تکلیف کا ذکر فرماتا ہے جس کے ساتھ ان کے جسم اور مال اور اولاد میں ان کی آزمایش کی، یہاں تک کہ ان کے جسم میں سوائے ان کے دل کے ایک سوئی چبھونے کی جگہ بھی سالم نہ رہی تھی اور دنیا میں سے ان کے واسطے کوئی شے باقی نہ رہی تھی کہ جس سے اپنے مرض میں اور جس حال میں وہ تھے، اس میں مدد لیں سوائے اس کے کہ ان کی بیوی نے ان کی دوستی اور نگرانی رکھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ

[1] فتح البیان (۱۲/۴۲۔۴۸)

پر اور اس کے رسول پر ایمان لائی تھی۔ چنانچہ وہ اُجرت لے کر لوگوں کی خدمت کرتی تھی اور ان کو کھلاتی تھی اور اُن کی خدمت اٹھارہ برس تک کرتی رہی۔ اس سے پہلے ایوب علیہ السلام دنیا کی کثرت اور مال و اولاد کے لحاظ سے بڑے آسودہ حال تھے۔ پھر یہ سب کچھ ان سے چھین لیا گیا، یہاں تک ان کا انجام ہوا کہ اس پوری مدت تک شہروں کے گھوروں (کوڑا کرکٹ کی جگہ) میں سے ایک گھورے پر ڈال دیے گئے۔ قریبی اور دور کے سب رشتے داروں نے ان کو چھوڑ دیا سوائے ان کی بیوی کے۔

اللہ پاک اس سے راضی ہو، وہ صبح شام ان سے جدا نہ ہوتی تھی، مگر لوگوں کے کام کاج کے لیے جاتی تھی اور جلد اُن کے پاس لوٹ آتی تھی۔ چنانچہ جب مدتِ دراز گزری اور حالت سخت ہوئی اور قدر کا انتہا ہوا اور تکلیف کی مقررہ مدت ختم ہوئی تو جو ذات پاک کہ رب العالمین اور معبودِ مرسلین ہے، اس سے انھوں نے تضرع و زاری کی اور گڑگڑا کر دعا کی: ﴿ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴾ [الأنبياء: ٨٣] ''مجھے یہ بیماری لگ گئی ہے اور تو رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔'' اور اس آیتِ کریمہ میں یوں فرمایا: ﴿ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴾ یعنی شیطان نے مجھ کو میرے بدن میں نصب لگا دی اور میرے مال و اولاد میں عذاب دیا۔ اس وقت ارحم الراحمین نے ان کی دعا قبول کی اور اُن کو یہ حکم دیا کہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور اپنے پاؤں سے زمین کو ماریں۔ وہ نہائے تو اُن کے بدن میں جو کچھ ایذا تھی وہ سب اس نے دور کر دی۔ پھر ان کو حکم دیا تو اور جگہ پر لات ماری تو اُن کے لیے ایک اور چشمہ نکالا اور اُن کو حکم دیا کہ اس میں سے پئیں تو جو کچھ خرابی ان کے باطن میں تھی اس نے اس سب کو دور کر دیا اور ظاہر و باطن میں پوری عافیت ہو گئی، اسی لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ﴾

امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نبی ایوب علیہ السلام کی آزمایش اٹھارہ برس اُن کے ساتھ ٹھہری رہی تو ان کے قریبی اور دور کے لوگوں نے اُن کو چھوڑ دیا، مگر دو شخص جو اُن کے خاص بھائیوں میں سے تھے، وہ صبح و شام ان کے پاس آتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے اپنے یار سے کہا: تو جانتا ہے، واللہ! البتہ واقعی ایوب نے کوئی ایسا گناہ کیا ہے کہ جہان میں سے کسی نے اس کو نہیں کیا۔ اس کے یار نے اس سے کہا: یہ کیا بات ہے؟ وہ بولا کہ اٹھارہ برس سے اللہ نے اس پر رحم نہیں کیا کہ اس کو جو تکلیف ہے اسے دور کر دے، پھر جب وہ دونوں شام کو اُن کے پاس آئے تو اس شخص نے صبر نہ کیا، یہاں تک کہ ان سے اس کا ذکر کیا۔ چنانچہ ایوب علیہ السلام بولے: میں نہیں جانتا ہوں جو تو کہتا ہے، سوائے اس کے کہ اللہ عزوجل جانتا ہے کہ میں دو شخصوں پر گزرتا تھا، وہ باہم جھگڑتے تھے، پھر وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تو میں اپنے گھر لوٹ آتا، پھر میں ان کی طرف سے کفارہ دیتا، اس بات کی کراہت کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے مگر حق میں۔

کہا: اور وہ اپنی حاجت کے لیے نکلتے، پھر جب اس کو پورا کر چکتے تو ان کی بیوی ان کا ہاتھ پکڑتیں، یہاں

تک کہ اپنی جگہ پر پہنچتے۔ پھر جب ایک دن ہوا تو انھوں نے اپنی بیوی پر دیر لگائی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی:
﴿ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ﴾ پھر ان کی بیوی نے ان کے آنے میں دیر سمجھی تو پھر کر دیکھنے لگیں تو وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوئے اور اللہ نے ان کی آزمائش کو دور کر دیا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین صورت والے تھے۔ جب ان کی بیوی نے ان کو دیکھا تو کہا: اے شخص! اللہ تجھ میں برکتیں دے، کیا تو نے اللہ کے نبی کو دیکھا ہے جو آزمائش میں مبتلا تھے؟ اللہ کی قسم! میں نے کوئی شخص تم سے زیادہ ان کے ساتھ مشابہت رکھنے والا نہیں دیکھا، جبکہ وہ تندرست تھے۔ ایوب علیہ السلام بولے: بے شک میں وہی ہوں، کہا: اور ان کے لیے دو خرمن تھے، ایک گیہوں کا اور ایک جو کا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دو بادل بھیجے، جب ان میں سے ایک بادل گیہوں کے خرمن پر آیا تو اس نے اس میں سونا ڈالا، یہاں تک کہ وہ بھر گیا اور دوسرے بادل نے جو کے خرمن میں ڈالا، یہاں تک کہ وہ بھر گیا۔[1] (هذا لفظ ابن جرير)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایوب علیہ السلام برہنہ ہو کر غسل کر رہے تھے تو اُن پر سونے کی ٹڈیاں گریں۔ ایوب علیہ السلام لپ بھر کر اپنے کپڑے میں ڈالنے لگے، ان کے رب عزوجل نے ان کو ندا کی: اے ایوب! کیا میں نے تجھ کو اس سے غنی نہیں کیا جو تو دیکھتا ہے؟ وہ بولے: کیوں نہیں یا رب! لیکن مجھ کو تیری برکت سے غنا نہیں ہے۔[2] (انفرد بإخراجه البخاري من حديث عبد الرزاق به) اور اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ ﴾ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے گھر والوں کو بعینہٖ ان کے لیے زندہ کر دیا اور ان کے ساتھ ان کے مثل اور ان کو زیادہ دیے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ رَحْمَةً مِّنَّا ﴾ "أَيْ: بِهِ" یعنی یہ سب ہم نے اس کو اپنی طرف سے رحمت کے طور پر دیا، اس لیے کہ اس نے صبر کیا اور ثابت قدم رہا اور رجوع ہوا اور تواضع و عاجزی کی۔ ﴿ وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ یعنی اور عقل والوں کے یاد رہنے کے لیے، تاکہ وہ یہ جان لیں کہ صبر کا انجام تنگی سے آسودگی کی طرف آنا اور سختی سے راحت اور آرام کی طرف نکلنا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ایوب علیہ السلام اپنی بیوی پر کسی کام پر خفا ہوئے تھے جو اس نے کیا تھا۔ کہا ہے کہ اس نے روٹی کے عوض اپنی چوٹی فروخت کی تھی اور وہ روٹی ان کو کھلائی تھی، اس پر انھوں نے اس کو ملامت کی اور قسم کھائی کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کو شفا دے تو البتہ وہ اس کو قمچی کی سو چوٹ لگائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی سبب تھا۔ پھر اللہ عزوجل نے ان کو شفا دی اور عافیت عطا کی تو اس کی پوری خدمت، رحمت، شفقت اور احسان کا یہ بدلہ نہ تھا کہ اس کا مقابلہ مارنے کے ساتھ کیا جائے۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے ان کو یہ

---

[1] تفسير الطبري (٢١١/٢١، ٢١٢) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٥) مسند أحمد (٣١٤/٢)
[3] تفسير الطبري (٢١٢/٢١)

فتویٰ دیا کہ ایک ضغث لیں۔ ضغث شمراخ کو کہتے کہ اس میں سوٹھنیاں ہوں، پھر اس کو اس کے ساتھ ایک ضرب لگا دیں اور ان کی قسم سچی ہو گئی اور اس کو توڑنے سے بچ گئے، اپنی نذر پوری کی۔ یہ سہولت اور نکاسی اس شخص کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور اس کی طرف رجوع ہوا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴾

ان کی یہ مدح و ثنا کی کہ وہ اچھا بندہ ہے بڑا رجوع ہونے والا ہے اور اسی لیے اللہ جل جلالہ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴾ [الطلاق: ۲۔ ۳] ''اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اُسے گمان بھی نہ ہو اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا اور اللہ اسے کافی ہو گا اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کر کے ہی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔'' فقہاء میں سے بعض نے اس آیتِ کریمہ سے بابِ ایمان وغیرہ میں کئی مسئلوں پر استدلال کیا ہے اور ان کو اس کے مقتضا کے ساتھ اَخذ کیا ہے۔ واللّٰه أعلم بالصواب۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ﴾ معطوف ہے ﴿ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ﴾ پر۔ سلیمان علیہ السلام کے قصے کو اس طرز پر شروع نہ کیا، اس لیے کہ ان کے اور داود علیہ السلام کے قصے کے درمیان کمال اتصال ہے، یہاں تک کہ دونوں کا قصہ ایک ہی ہے۔ کلمۂ ﴿ اَيُّوْبَ ﴾ ﴿ عَبْدَنَآ ﴾ کا عطفِ بیان ہے اور ﴿ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ ﴾ ﴿ عَبْدَنَآ ﴾ سے بدلِ اشتمال ہے۔ ایوب علیہ السلام عیصو بن اسحاق علیہ السلام کے فرزند ہیں۔ ﴿ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ ﴾ کو جمہور نے بہ فتحِ ہمزہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ان کے کلام کی حکایت ہے جس کے ساتھ انھوں نے اپنے رب کو پکارا اور اگر اللہ پاک اس کی حکایت نہ کرتا تو یوں فرماتا: ''إِنَّهُ مَسَّهُ''۔ عیسیٰ بن عمر رحمہ اللہ نے بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ قول مقدر ہے، یعنی ''قَالَ: إِنِّيْ''۔ ایوب علیہ السلام کا قصہ ذکر کرنے میں نبی اکرم ﷺ کو اس بات کا ارشاد ہے کہ تکلیفوں میں صبر کرنے میں ان کی پیروی فرمائیں۔

جمہور نے ﴿ بِنُصْبٍ ﴾ کو بہ ضمِ نون وسکونِ صاد پڑھا ہے۔ کہا ہے کہ یہ ''نَصَبٌ'' کی جمع ہے، جیسے: ''أَسَدٌ'' کی جمع ''أُسْدٌ'' ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ایک لغت ہے ''نَصَبٌ'' میں جیسے: ''رَشَدٌ وَرُشْدٌ''۔ امام ابوجعفر رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی ابوجعفر یزید بن القعقاع و شیبہ وحفص و نافع فی رویتہ عنہ) نے بہ ضمتین پڑھا ہے اور یہ حسن رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے اور امام ابو حیوہ رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی یعقوب اور حفص فی روایتہ عنہ) نے بہ فتح وسکون پڑھا

[1] تفسير ابن كثير (٥١/٤-٥٣)

ہے۔ یہ سب قراءتیں ایک معنی میں ہیں، یہ مختلف جو ہوئی ہیں تو لغات کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فتحتین کے ساتھ "نَصَبٌ"، کے معنی "تَعَبٌ وَإِعْيَاءٌ" ہے، یعنی تھکنا اور باقی قراءتوں پر اس کے معنی شر اور بلا ہیں۔ ﴿عَذَابٍ﴾ بہ معنی الم ہے، یعنی درد۔ امام قتادہ اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "نُصُب"، جسم میں اور عذاب مال میں ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں بُعد ہے۔ اس نے اسی طرح کہا ہے اور پہلے "نصب" کی تفسیر لغوی معنی کے ساتھ کی ہے، یعنی "تَعَبٌ وَإِعْيَاءٌ" اور عذاب کی تفسیر اس شے کے ساتھ کی ہے جس پر عذاب کا نام صادق آتا ہے، یعنی الم اور یہ دونوں بدن کی طرف راجع ہیں۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے زہد میں اور امام ابن ابی حاتم اور ابن عساکر رحمہما اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل خبر ایوب علیہ السلام کے قصے میں روایت کی ہے جس کا اول یہ ہے کہ شیطان آسمان کی طرف چڑھا اور عرض کی: اے رب! تو مجھے ایوب پر مسلط کر دے۔ اللہ پاک نے فرمایا: البتہ واقعی میں نے تجھ کو اس کے مال اور اولاد پر مسلط کر دیا اور اس کے جسم پر تجھ کو مسلط نہیں کیا۔[2] (الحديث بطوله) اس حدیث میں شدید نکارت ہے۔ اس لیے کہ اللہ پاک اپنے انبیاء میں سے کسی نبی پر شیطان کو ایسا عظیم قابو اور تسلط نہیں دیتا۔

"مَسَّ" کی نسبت جو شیطان کی طرف کی، باوجود اس کے کہ نصب و عذاب کا مس کرنے والا اللہ پاک ہی ہے تو یا تو اس لیے نسبت کی کہ جب ایوب علیہ السلام نے شیطان کے وسوسے پر عمل کیا تو اس پر ان کو عتاب کیا گیا، اس نصب و عذاب کے ساتھ۔ لہٰذا کسی نے تو یہ کہا کہ انھوں نے اپنی کثرتِ مال کے ساتھ فخر کیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ کسی مظلوم نے ان سے فریاد رسی چاہی تھی تو انھوں نے اس کی فریاد رسی نہ کی۔ کسی نے کہا ہے کہ ادب کے طور پر مس کی نسبت شیطان کی طرف کی۔ کسی نے کہا ہے کہ شیطان نے ان کے تابعداروں کے دل میں وسوسہ ڈالا تو انھوں نے ان کو چھوڑ دیا اور اپنے گھروں سے نکال دیا، اس لیے اس کی طرف نسبت کی۔ کسی نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ حالتِ مرض میں اور آزمایش کے وقت میں شیطان ان کے دل میں مصیبت پر صبر نہ کرنے اور بے صبری کی خوبی کا وسوسہ ڈالتا تھا۔ ان کے سوا اور قول ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ارْكُضْ بِرِجْلِكَ﴾ سے اول "قول" مقدر ہے: "أَيْ: قُلْنَا لَهُ: ارْكُضْ" امام کسائی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے، یعنی ہم نے اس سے کہا کہ اپنے پاؤں سے لات مار۔ "رَكَضَ" پاؤں سے دفع کرنے کو کہتے ہیں۔ جب کوئی اپنے پاؤں سے سواری کے جانور کو مارتا ہے تو محاورۂ عرب میں بولتے ہیں "رَكَضَ الدَّابَّةَ"۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "رکض" بہ معنی تحریک ہے۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "رَكَضْتُ الدَّابَّةَ" بولتے ہیں اور "رَكَضَتْ هِيَ" نہیں کہتے۔ اس لیے کہ "رکض" جو ہے وہ سوار کا اپنے دونوں پاؤں کو حرکت دینا ہے۔

[1] فتح القدير (٥٧٣/٤، ٥٧٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٤٤/١٠) الدر المنثور (١٩٢/٧)

سواری کا اس میں کوئی فعل نہیں ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے یہ حکایت کیا ہے کہ "رَکَضۡتُ الدَّابَّةَ فَرَکَضَتْ"، یعنی میں نے سواری کو حرکت دی تو اس نے حرکت کی، جیسے یوں بولتے ہیں کہ "جَبَرۡتُ الۡعَظۡمَ فَجَبَرَ"[1] یعنی میں نے ہڈی کو جوڑا تو وہ جڑ گئی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ هٰذَا مُغۡتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴾ بھی قولِ مقدر کا مقولہ ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَرَکَضَ بِرِجۡلِهٖ فَنَبَعَتۡ عَيۡنٌ فَقُلۡنَا لَهٗ: هٰذَا مُغۡتَسِلٌ". ﴿ مُغۡتَسَلٌ ﴾ وہ پانی ہے جس سے غسل کیا جاتا ہے اور شراب وہ پانی ہے جس سے پیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مُغۡتَسَلٌ ﴾ وہ جگہ ہے جس میں نہاتے ہیں۔ آیتِ کریمہ کا ظاہر نظم یہ ہے کہ نہانا اور پینا ایک چشمے سے تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شام کی سرزمین میں دو چشمین ہیں، اس جگہ کو جابیہ کہتے ہیں۔ چنانچہ ایوب علیہ السلام ایک چشمے سے نہائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ظاہری بیماری دور کر دی۔ اسی طرح امام حسن رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک بہتا ہوا چشمہ پھوٹ نکلا تو اس میں نہائے اور صحیح و تندرست ہو کر نکل آئے۔ پھر دوسرا چشمہ پھوٹ نکلا تو اس سے شیریں ٹھنڈا پانی پیا۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ ﴾ معطوف ہے مقدر پر۔ گویا یوں کہا گیا: "فَاغۡتَسَلَ وَشَرِبَ فَكَشَفۡنَا عَنۡهُ بِذٰلِكَ مَا بِهٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّوَهَبۡنَا لَهٗۤ اَهۡلَهٗ" حاصل معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس سے کہا کہ اپنے پاؤں سے لات مار، پھر اس نے لات ماری تو ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ پھر ہم نے اس سے کہا: یہ نہانے کے لیے ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کے لیے۔ پھر اس نے غسل کیا اور پیا تو اس میں جو ضرر اور تکلیف تھی، وہ ہم نے اس سے دور کر دی اور بخشا ہم نے اس کو گھر اور آل اس کے۔ کہا ہے کہ اللہ پاک نے اس کو زندہ کر دیا بعد اس کے کہ ہم نے ان کو مار ڈالا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے متفرق ہو جانے کے بعد اُن کو جمع کر دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی طرح کے ان کے علاوہ دیے۔ پھر ان کے ساتھ اُن جیسے اور دیے۔ اس قول کے یہی معنی ہیں: ﴿ وَمِثۡلَهُمۡ مَّعَهُمۡ ﴾ پس ان کے گھر والے جو ابتلاء سے پہلے تھے، اب ان کے دُوگنے ہو گئے۔

﴿ رَحۡمَةً مِّنَّا وَذِكۡرٰى لِاُولِى الۡاَلۡبَابِ ﴾ مفعول لہ ہے ﴿ وَهَبۡنَا ﴾ کا۔ یعنی ہم نے اس کے گھر والے اسے بخشے اور اتنے ہی ان کے ساتھ اُور۔ یہ اس کے ساتھ ہمارے رحم کرنے کے واسطے ہے اور اس لیے کہ عقل والے اس کے حال سے نصیحت پکڑیں اور سختیوں پر صبر کریں جیسا اس نے صبر کیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف پناہ پکڑیں جیسے اس نے پناہ پکڑی، تاکہ وہ ان کا انجام نیک کرے جیسا کہ اس کا کیا۔ اس کی تفسیر پورے طور پر سورۃ الانبیاء میں گزر چکی ہے، دوبارہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَخُذۡ بِيَدِكَ ضِغۡثًا ﴾ معطوف ہے: "اُرۡكُضۡ" پر یا ﴿ وَهَبۡنَا ﴾ پر۔ یا تقدیر یہ ہے: "وَقُلۡنَا

---

[1] تفسير القرطبي (٢١١/١٥) فتح القدير (٥٧٤/٤) [2] تفسير القرطبي (٥١١/١٥)

لَهٗ: خُذْ“۔ ضغث عشکالِ نخل ہے مع اس کی شماریخ کے، یعنی کھجور کا خوشہ اس کی شاخ کے ساتھ۔ کسی نے کہا ہے کہ گھاس کا ایک مُٹھا ہے جس میں گیلی اور خشک گھاس ملی ہوئی ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ ٹہنیوں کا ایک بڑا گٹھا ہے۔ اصل مادہ جمع مختلطات پر دلالت کرتا ہے، یعنی جس کلمے میں ض غ ث ہوں گے تو اس میں جمع مختلط کے معنی ہوں گے۔ امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اَلضِّغْثُ مِلْءُ الْكَفِّ مِنَ الشَّجَرِ وَالْحَشِيْشِ وَالشَّمَارِيْخِ“[1] (یعنی مٹھی بھر درختوں سے اور گھاس سے اور کھجور کی ٹہنیوں سے)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس میں تین الفاظ ہیں: ایک یہ ہے کہ ”اَلضِّغْثُ هُوَ الْأَسَلُ“، (”أَسَلٌ“: بفتحتین بلند کانٹے دار درخت اور ”أَشَلٌ“: بشینِ معجمہ گزی ست کہ در بصرہ شہرت دارد و ”أَثَلٌ“: بثاءِ مثلثہ شور گز وگز بالفتح ایک درخت ہے جو پانی اور ندیوں کے کنارے پر اُگتا ہے جس کو عربی میں طرفاء کہتے ہیں۔ یہ درخت جھاؤ ہے یا اس جیسا کوئی اور درخت ہے۔ واللہ أعلم)۔

دوسرا یہ ہے: ”اَلْقَبْضَةُ مِنَ الْمَرْعَى الرَّطْبِ“[2] (یعنی تر چارے کا مٹھا) اور تیسرا یہ ہے: ”اَلْحُزْمَةُ“[3] (بالضم بہ معنی بند ہیزم وکاغذ وعلف وجز آن، یعنی لکڑیوں کا گٹھا یا کاغذ کا اور گھاس کا)۔ ”حِنْثٌ“ بہ معنی ”إِثْمٌ“ ہے، اس کا اطلاق اس شے کے کرنے پر ہوتا ہے جس کے ترک کرنے پر قسم کھائی گئی ہے۔ یا اس شے کو ترک کرنے پر جس کو کرنے کی قسم کھائی گئی ہے، اس لیے کہ یہ دونوں اثم کا سبب ہوتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ ہم نے کہا کہ اے ایوب! اپنے ہاتھ میں کھجور کی ٹہنیوں کا یا گھاس کا ایک گٹھا لے اور پھر اس سے مار لے اور حانث مت ہو اپنی قسم میں۔ انھوں نے اپنی بیماری میں قسم کھائی تھی کہ اپنی بیوی کو سو مار ماریں گے۔ اس کے سبب میں اختلاف ہے۔

چنانچہ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قسم کا سبب یہ ہے کہ ان کی بیوی اُن کے پاس جو روٹی لایا کرتی تھیں، اس سے زیادہ لائیں تو وہ اُن کی خیانت سے ڈرے۔ اس پر قسم کھائی کہ ان کو ماریں گے۔ یحییٰ بن سلام وغیرہ نے کہا ہے کہ شیطان نے ان کی بیوی کو یہ اغوا کیا کہ وہ ایوب علیہ السلام کو اس پر آمادہ کرے کہ وہ شیطان کی قربت چاہنے کے لیے بکری کا ایک بچہ ذبح کریں، کیوں کہ جب وہ یہ کام کریں گے تو اچھے ہو جائیں گے۔ اس پر قسم کھائی کہ جب ان کو عافیت ملے گی تو اس کو سو مار ماریں گے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ان کی بیوی نے دو روٹی کے بدلے اپنے بال فروخت کیے تھے، جب اس کو اور کوئی شے نہ ملی اور ایوب علیہ السلام جب کھڑے ہونے کا ارادہ کرتے تو ان بالوں سے لٹکتے تھے، اس لیے قسم کھائی کہ اسے ماریں گے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے زہد میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ابلیس راستے میں ایک صندوق لے کر بیٹھ گیا کہ لوگوں کا علاج کرتا ہے۔ ایوب علیہ السلام کی بیوی نے کہا: اے اللہ کے بندے! یہاں ایک مبتلا ہے تو کیا تو

---

[1] فتح القدير (٥٧٥/٤) [2] فتح القدير (٥٧٩/٤) [3] تفسير الطبري (٢١٣/٢١) [4] تفسير القرطبي (٢١٢/١٥)

اس کا علاج کرے گا؟ اس نے کہا: مگر اس شرط پر کہ اگر میں اس کو شفا دے دوں تو وہ یوں کہے کہ تو نے ہی مجھے شفا دی، اس کے سوا میں اس سے کوئی اور اُجرت نہیں چاہتا۔ پھر وہ ایوب علیہ السلام کے پاس آئیں اور اُن سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولے: تیری خرابی ہو یہ تو شیطان ہے۔ اللہ کے واسطے مجھ پر یہ بات لازم ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے شفا دے تو میں تجھے سو مار ماروں گا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا دی، تو ان کو حکم دیا کہ ایک مُٹھا لیں اور اس سے اس کو ماریں۔ چنانچہ انھوں نے کھجور کا ایک خوشہ لیا اس میں سوٹہنیاں تھیں اور اس سے اس کو ایک ہی دفعہ مارا۔[1]

امام احمد اور طبرانی رحمہما اللہ نے ابو امامہ بن سہل بن حنیف رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ بنی ساعدہ میں ایک لونڈی زنا سے حاملہ ہوئی تو اس سے کہا گیا کہ تیرا حمل کس سے ہوا؟ وہ بولی کہ فلاں مقعد سے (مقعد کہتے ہیں: برجا ماندہ اپاہج کو) پھر مقعد سے پوچھا گیا تو بولا کہ اس نے سچ کہا۔ یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھجور کا ایک خوشہ لو جس میں سوٹہنیاں ہوں، پھر اس کو اس سے ایک دفعہ مارو۔[2] اس حدیث کے اور طریق بھی ہیں۔ علماء رحمہم اللہ نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ کیا یہ ایوب علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے یا سب لوگوں کے لیے عام ہے اور جو شخص یوں قسم کھائے تو ایسا کر کے اپنی قسم سے خارج ہو جائے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جس وقت کوئی شخص یوں قسم کھائے کہ "لَيَضْرِبَنَّ فُلَانًا مِائَةَ جَلْدَةٍ أَوْ ضَرْبًا"، مگر وہ "ضَرْبًا شَدِيدًا" نہ کہے اور نہ اپنے دل میں نیت کرے تو اس کو ایسی ضرب کافی ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ امام ابن منذر رحمہ اللہ نے ان سے اور ابو ثور اور اصحاب الرائے سے اس کو حکایت کیا ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ایوب علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے اور ابن قاسم نے اس کو امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔[3]

پھر اللہ پاک نے ایوب علیہ السلام کی تعریف کی۔ چنانچہ یوں ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ ﴾ یعنی بے شک ہم نے اس کو صبر کرنے والا جانا اس آزمایش پر جس کے ساتھ ہم نے اس کو مبتلا کیا، کیوں کہ ان کو ان کے جسم میں مرضِ عظیم کے ساتھ اور اُن کے مال و اولاد اور اہل کے جانے کے ساتھ آزمایا گیا تھا، پھر انھوں نے صبر کیا۔ رہی یہ بات کہ انھوں نے جو اللہ کی طرف شکایت کی، جیسے: عافیت کی تمنا اور شفا کی طلب تو یہ چیزیں صبر میں خلل انداز نہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہ جزع اور بے صبری نہیں ہے۔ مذموم شکایت وہی ہوتی ہے جو مخلوق سے ہو۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "أَيُّوبُ رَأْسُ الصَّابِرِينَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"[4] یعنی ایوب علیہ السلام قیامت کے دن صابروں کے سردار ہوں گے۔ ﴿ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴾ یعنی ایوب اچھا بندہ ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف استغفار و توبہ کے ساتھ

---

[1] الدر المنثور (۱۹۳/۷) [2] الدر المنثور (۱۹۶/۷) امام احمد اور طبرانی رحمہما اللہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔
[3] تفسیر القرطبي (۲۱۴/۱۵، ۲۱۳) [4] تاريخ دمشق (۶۶/۱۰)

بڑا رجوع کرنے والا ہے۔[1] بالجملہ جب اللہ پاک ایوب علیہ السلام کے صبر کا ذکر کر چکے تو ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے صبر کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿45﴾
اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿46﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ
الْاَخْيَارِ ﴿47﴾ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ
الْاَخْيَارِ ﴿48﴾ هٰذَا ذِكْرٌ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿49﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ
مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴿50﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ
وَّشَرَابٍ ﴿51﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿52﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ
الْحِسَابِ ﴿53﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿54﴾

اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کیجیے جو قوت و بصیرت والے تھے (45) بے شک ہم نے انھیں ایک خاص وصف، آخرت کی یاد کے ساتھ چن لیا تھا (46) اور وہ ہمارے نزدیک یقیناً برگزیدہ، نیکوکاروں میں سے تھے (47) اور اسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو یاد کیجیے اور (ان میں سے) ہر ایک نیکوکاروں میں سے تھا (48) یہ ایک نصیحت ہے اور بے شک متقین کے لیے بہت اچھا ٹھکانا ہے (49) ہمیشہ رہنے کے باغ جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے (50) جب کہ وہ ان میں تکیے لگائے (بیٹھے) ہوں گے، اور وہاں طرح طرح کے پھلوں اور مشروبات کی فرمائشیں کریں گے (51) اور اُن کے پاس نیچی نگاہ والی، ہم عمر (بیویاں) ہوں گی (52) (کہا جائے گا:) یہ ہے (وہ جزا) جس کا یومِ حساب کے لیے تم سے وعدہ کیا جاتا تھا (53) بے شک یہ ہمارا رزق (عطیہ) ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوگا (54)

چند انبیائے کرام علیہم السلام کا تذکرہ:

ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے، یعنی ہاتھوں سے بندگی کرتے اور آنکھوں سے قدرتیں دیکھ کر یقین زیادہ کرتے۔ الیسع الیاس علیہ السلام کے خلیفہ تھے اور نبی ہوئے۔ بہشت میں داخل ہوں گے ہر کوئی بن بتائے اپنے گھر میں چلا جائے گا۔ انتھی۔[1]

---

[1] فتح البیان (۱۲/۴۸۔۵۶)

اللہ پاک اپنے عبادِ مرسلین اور انبیائے عابدین کے فضائل کی خبر دیتا ہے اور نبی ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کو یاد کر جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے۔ اس سے مراد عملِ صالح، علم نافع اور عبادت میں قوت اور بصیرتِ نافذہ ہے۔ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں روایت کی ہے کہ ﴿ أُولِي الْأَيْدِي ﴾ سے مراد ''أُولِي الْقُوَّةِ'' ہے اور ﴿ وَالْأَبْصَارِ ﴾ سے مراد دین میں سمجھ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ أُولِي الْأَيْدِي ﴾ یعنی اللہ کی طاعت میں صاحبِ قوت اور ﴿ وَالْأَبْصَارِ ﴾ یعنی حق میں صاحبِ بصر اور بینائی۔ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ وہ عبادت میں قوت دیے گئے اور دین میں بصر۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِنَّا أَخْلَصْنَاهُم بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴾۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ہم نے ان کو ایسا کر دیا تھا کہ وہ آخرت کے لیے عمل کرتے تھے اور اُن کو اس کے سوا اور کوئی غم و فکر نہ تھا۔[2]

غم دین خور کہ غم غمِ دین ست ہمہ غمہا فروتر زین ست

''دین کی فکر کر کہ اصل فکر دین کی فکر ہے۔ دوسرے تمام افکار اس سے کم ہیں۔''

اسی طرح امام سدی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ ان کا ذکر اور عمل آخرت کے لیے تھا۔[3] مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی حب و ذکر کو ان کے دلوں سے کھینچ لیا تھا اور ان کو آخرت کے حُب اور ذکر کے ساتھ خالص کر لیا تھا۔ اسی طرح امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[4] یہ مالک بن دینار رحمہ اللہ بڑے زاہد و عابد ہیں، ان کا زہد ضرب المثل ہے، چنانچہ سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا:

ترا کہ مالک دینار نیستی سعدی علاج نیست بجز زہد مالک دینار

''اے سعدی! تو چونکہ دینار کا مالک نہیں ہے، تیرے لیے دنیا کی لذتوں سے کنارہ کرنے کے لیے مالک بن دینار رحمہ اللہ جیسے زہد کے سوا چارہ نہیں۔''

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''دَار'' سے مراد جنت ہے۔ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کے اس کو ذکر کرنے کے سبب سے اس کو ان کے لیے خاص کر دیا ہے۔ دوسری روایت میں ہے ﴿ ذِكْرَى الدَّارِ ﴾ سے مراد ''عُقْبَى الدَّارِ'' ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ یاد دلاتے تھے دارِ آخرت اور اس کے واسطے عمل کرنا۔ ابن زید نے کہا: ''جَعَلَ لَهُمْ خَاصَّةً أَفْضَلَ الشَّيْءِ فِي الدَّارِ الْآخِرَةِ''[5] یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے دارِ آخرت میں خاص بہترین شے رکھی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَإِنَّهُمْ عِندَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ ﴾ یعنی بے شک وہ ہمارے پاس البتہ منتخب اور برگزیدہ اور نیک لوگوں میں سے ہیں، چنانچہ وہ اخیار اور پسندیدہ ہیں۔ ﴿ هَٰذَا ذِكْرٌ ﴾ یعنی یہ فضل ہے اس شخص کے لیے کہ

(1) تفسیر الطبري (۲۱/۲۱۵، ۲۱۶) (2) تفسیر الطبري (۲۱/۲۱۷، ۲۱۸) (3) تفسیر الطبري (۲۱/۲۱۷، ۲۱۸)
(4) تفسیر ابن کثیر (۵۳/٤) (5) تفسیر ابن کثیر (۵۳/٤)

جس میں وہ ہے۔ (اصل کے الفاظ یہ ہیں: "أي: هذا فصل لمن فيه ذكر لمن يتذكر" غالباً اس میں ناسخ سے کچھ خلل واقع ہوا ہے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم از مصحح سلمه اللّٰه تعالیٰ)۔ ذکر ہے اس شخص کے لیے جو نصیحت پذیر ہو۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ذِكْرٌ ﴾ سے قرآنِ عظیم مراد ہے۔[1]

نیک بختوں کا اچھا ٹھکانا:

اللہ پاک اپنے مومن اور نیک بخت بندوں کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ ان کے لیے دارِ آخرت میں حسنِ مآب ہے۔ مآب کے معنی مرجع ومنقلب ہے، یعنی رجوع ہونے کی اچھی جگہ۔ پھر اس کی یہ تفسیر فرمائی: ﴿ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴾۔ الف لام مضاف الیہ کا عوض ہے۔ "أَيْ: أَبْوَابُهَا" یعنی اقامت کے لیے اور رہنے بسنے کے لیے باغات ہیں جس وقت وہ ان کے پاس آئیں گے تو اُن کے لیے ان کے دروازے کھولے جائیں گے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''بے شک جنت میں ایک محل ہے۔ اس کو عدن کہتے ہیں۔ اس کے گرد بروج ومروج ہیں (بروج بلند ومحکم مکانوں کو کہتے ہیں اور مروج مرغزار وچمن کو کہتے ہیں) اس کے پانچ ہزار دروازے ہیں، ہر دروازے کے نزدیک پانچ ہزار حبرہ ہیں (یعنی منقش ومخطط چادر)، اس میں کوئی داخل یا سکونت پذیر نہیں ہوگا، سوائے نبی یا صدیق یا شہید یا امام عادل کے۔''[2] جنت کے آٹھ دروازوں کے ذکر میں بہت سی حدیثیں بوجوہِ عدیدہ وارد ہوئی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا ﴾ کہا ہے کہ چار زانو چھپر کھٹوں پر بیٹھے ہوں گے۔ ﴿ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴾ یعنی بہت میوے منگواتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جب طلب کریں گے تو پائیں گے اور جب ارادہ کریں گے تو حاضر ہو جائیں گے۔ ﴿ وَّشَرَابٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ شراب کی قسموں میں سے جس کو چاہیں گے خادم آب خوروں میں اس کو لے کر ان کے پاس حاضر ہو جائیں گے۔ ﴿ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴾ [الواقعة: ١٨] اور پیالہ نتھری ہوئی شراب کا۔ ﴿ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ﴾ یعنی ان کے پاس ایسی عورتیں ہیں جو اپنے خاوندوں کے سوا غیر سے اپنی نگاہ کو روکنے والیاں ہیں۔ خاوندوں کے سوا کسی کی طرف التفات نہیں کرتیں۔ ﴿ اَتْرَابٌ ﴾ یعنی سن وعمر برابر ہیں۔ یہ معنی ہیں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر، محمد بن کعب اور سدی رحمہم اللہ کے قول کے۔[3] ﴿ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴾ یعنی جنت کی یہ صفت جس کا ذکر ہوا وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں سے وعدہ کیا ہے، جس کی طرف وہ اپنی قبروں میں قیام کے بعد اٹھنے پر اور آگ سے سلامت ہونے کے بعد جائیں گے۔

پھر اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس کو نہ کسی طرح کا زوال ہے نہ اس کی انقضاء

[1] تفسیر الطبري (٢٢٠/٢١)   [2] تفسیر ابن کثیر (٥٤/٤) اس کی سند میں ''عبداللہ بن مسلم'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر الطبري (٢٢٣/٢١) تفسیر ابن کثیر (٥٤/٤)

اور انتہاء ہے۔ فرمایا: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴾ جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ﴾ [النحل: ۹٦] ''تمھارے پاس جو کچھ ہے سب فانی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے باقی ہے۔'' ﴿ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ [هود: ۱۰۸] ''یہ بے انتہا بخشش ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴾ [الانشقاق: ۲۵] ''ان کے لیے بے شمار اور نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴾ [الرعد: ۳۵] ''اس کا میوہ ہمیشہ (رہنے) والا ہے اور اس کا سایہ بھی۔ یہ انجام ہے پرہیز گاروں کا اور کافروں کا انجام کار دوزخ ہے۔'' اس بارے میں بہت سی آیتیں ہیں۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام نے جو صبر کیا ان مصیبتوں پر جو ان کو پہنچیں تو ان کے صبر کو یاد کر اور اُن کی پیروی کر۔ جمہور نے ﴿ عِبٰدَنَآ ﴾ بہ جمع پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ (یعنی امام مجاہد، حمید، ابن محیصن اور ابن کثیر) نے ''عَبْدَنا'' صیغۂ واحد سے پڑھا ہے۔ جمہور کی قراءت پر ﴿ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ﴾ ﴿ عِبٰدَنَآ ﴾ کا عطفِ بیان ہوگا اور دوسری قراءت کی بنیاد پر ﴿ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ عطفِ بیان ہوگا اور اس کا مابعد ''عَبْدَنا'' پر معطوف ہوگا نہ کہ ﴿ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ پر۔ کبھی یوں کہا جاتا ہے کہ جب ''عَبْدَنا'' سے مراد جنس ہو تو اس سے جمع کا بدل کرنا جائز ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ اور اس کا مابعد بدل ہے۔ یا نصب باضمار ''أَعْنِيْ'' ہے، لیکن عطفِ بیان ظاہر تر ہے اور جمہور کی قراءت واضح تر۔ امام ابو حاتم اور ابو عبید رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔

''أَيْدِيْ'' یا تو جمع ہے ''يَدٌ'' بہ معنی ہاتھ کی۔ ہاتھ سے اعمال کا کنایہ کیا ہے، اس لیے کہ اکثر اعمال کو ہاتھ سے ہی کیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ''ید'' بہ معنی قوت وقدرت کی جمع ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو عبادت میں قوت اور دین میں بصیرت عطا کی گئی تھی۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام مجاہد، سعید بن جبیر اور مفسرین رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابصار پر تو اتفاق کیا گیا ہے کہ اس سے مراد دین وعلم میں بصیرتیں ہیں۔

رہا ''أيدي'' تو اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ پس اہلِ تفسیر تو یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد دین میں قوت ہے اور ایک قوم یہ کہتی ہے کہ ''أيدي'' جمع ہے ''ید'' بہ معنی نعمت کی، یعنی وہ نعمتوں والے ہیں جن پر اللہ عزوجل نے انعام فرمایا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے اصحابِ نعم ہیں اور اصحابِ احسان ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے احسان کیا اور خیر آگے بھیجی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ جمہور نے ﴿ الْاَيْدِيْ ﴾ بہ اثباتِ حرفِ یاء پڑھا ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ (یعنی اعمش، حسن اور عیسیٰ) نے بغیر ''یاء'' پڑھا ہے۔[2] چنانچہ کہا ہے کہ اس

---

[1] تفسير ابن كثير (٥٣/٤، ٥٤) [2] تفسير القرطبي (٢١٧/١٥) فتح القدير (٥٧٥/٤)

کے معنی وہی پہلی قراءت کے معنی ہیں۔ حرفِ ''یاء'' صرف اس لیے حذف کیا ہے کہ کسرہ اس پر دال ہے۔ کسی نے کہا کہ ''أید'' بہ معنی قوت ہے۔ مگر امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: ''وَتَفْسِيْرُهُ بِالْأَيْدِ مِنَ التَّأْيِيْدِ قَلَقٌ غَيْرُ مُتَمَكِّنٍ''[1] انتھٰی. یعنی ''أید'' کو تائید سے لینا ایک مضطرب تفسیر ہے جو جمتی نہیں ہے۔

گویا امام زمخشری رحمہ اللہ کے نزدیک قلق صرف اس لیے ہے کہ ''أبصار'' کا عطف ''أید'' پر ہے۔ لہٰذا ''أبصار'' اس ''أید'' کے مناسب نہیں ہے، جو تائید سے ماخوذ ہے، لیکن یہ شبہہ اس طرح دور ہوسکتا ہے کہ ''أید و أبصار'' سے ان اعضاء کی حقیقت مراد نہیں ہے، کیوں کہ ہاتھوں والا اور آنکھوں والا تو ہر کوئی ہے، پھر اس میں تعریف کی کیا بات ہوئی؟ بلکہ مراد یہی ہے کہ ''أید'' عملِ صالح سے کنایہ ہے اور ''أبصار'' اس بات پر کنایہ ہے کہ اپنی بصیرت سے غور وفکر کرے اور اللہ پاک کی قدرتوں کو سوچے اور سمجھے۔ چنانچہ اب کسی طرح کا قلق اور اضطراب نہیں ہے۔ گویا یوں کہا کہ ''أُوْلِيْ الْقُوَّةِ وَالتَّفَكُّرِ بِالْبَصِيْرَةِ''۔ امام زمخشری رحمہ اللہ بھی اس سے قبل کچھ اسی طرف مائل ہوئے ہیں۔ یہ حاصل ہیں سمین کا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ صاحبِ اعمالِ جلیلہ وعلومِ شریفہ ہیں، پس اعمال کی تعبیر تو ''أیدي'' کے ساتھ کی، اس لیے کہ اکثر کام تو ہاتھوں ہی سے ہوتے ہیں اور معارف کی تعبیر ''أبصار'' سے کی، کیونکہ آنکھیں معرفت کا ابتدائی ذریعہ ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ ﴿ الْأَيْدِي ﴾ ''الْقُوَّةِ فِي الْعِبَادَةِ'' ﴿ وَالْأَبْصَارِ ﴾ ''الْفِقْهُ فِي الدِّيْنِ''[2] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿ الْأَيْدِي ﴾ ''اَلنِّعْمَةُ''[3] غرضیکہ جب ان کا یہ وصف ہوا کہ ان کو عبودیت کا شرف اور علم وعمل میں بلند مرتبہ حاصل ہے تو اس کی یہ علت ذکر فرمائی: ﴿ إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴾ یعنی ان کو علم وعمل میں شرفِ عبودیت اور بلند مرتبہ اس لیے حاصل ہوا تھا کہ اللہ پاک نے ان کو ایک چنی ہوئی بات کے ساتھ امتیاز بخشا تھا، وہ یہی دارِ آخرت کی یاد ہے، بے شک جو کوئی دارِ آخرت کی یاد کے ساتھ مخصوص ہوگا، اسی کو علم وعمل میں بلند مرتبہ نصیب ہوگا۔

جمہور نے ﴿ بِخَالِصَةٍ ﴾ کو تنوین کے ساتھ بغیر اضافت کے پڑھا، اس بنا پر کہ مصدر بہ معنی اخلاص ہے، پس ﴿ ذِكْرَى ﴾ اس سے منصوب ہوگا۔ یا بہ معنی خلوص ہے تو اب اس سے مرفوع ہوگا۔ یا ''خالصة'' اسم فاعل اپنے باب پر ہے اور ﴿ ذِكْرَى ﴾ اس کا بدل ہے یا بیان۔ یا منصوب ہے باضمار ''أَعْنِيْ''، یا مرفوع باضمار مبتداء اور ''دار'' یا تو ﴿ ذِكْرَى ﴾ کا مفعول بہ ہے، یا ظرف ہے بنا بر اتساع، یا بنا بر اسقاطِ خافض۔ بر ہر تقدیر ''خالصة'' صفت ہے موصوف محذوف کی اور حرفِ باء سببیہ ہے، یعنی بہ سبب خصلت کے۔ ایسی خصلت کہ خالص ہے، اس میں کسی طرح کی ملونی نہیں ہے۔

---

[1] الکشاف (۱۰۱/٤) [2] تفسیر الطبري (۲۱۵/۲۱) [3] فتح القدیر (۵۷۹/٤)

امام نافع، شیبہ، ابو جعفر اور ہشام رحمہم اللہ نے ابن عامر رحمہ اللہ سے بہ اضافت "خالصة" طرف ﴿ ذِكْرَى ﴾ کے اس بنا پر کہ اضافت بیان کے لیے ہے، اس لیے کہ "خالصة" کبھی "ذکری" ہوتا ہے اور کبھی "غیر ذکری"[1] جس طرح کہ "شہابِ قبس" میں ہے، اس لیے کہ شہاب قبس اور غیر قبس ہوتا ہے۔ یا اس بنا پر کہ "خالصة" مصدر مضاف ہے اپنے مفعول کی طرف اور فاعل محذوف ہے: "أَيْ: بِأَنْ أَخْلَصُوْا ذِكْرَ الدَّارِ وَتَنَاسَوْا عِنْدَ ذِكْرِهَا ذِكْرَ الدُّنْيَا" یعنی بایں طور کہ انھوں نے خالص کیا ذکر دار کا اور بھلا دیا اس کے ذکر کا وقت، یعنی دنیا کے ذکر کا، یا مصدر بہ معنی خلوص مضاف ہے اپنے فاعل کی طرف۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں: "اِسْتَصْفَيْنَاهُمْ بِذِكْرِ الْآخِرَةِ فَأَخْلَصْنَاهُمْ بِذِكْرِهَا" امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ آخرت کی طرف اور اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ آخرت کے خوف کے ساتھ خالص کیے گئے۔[2] امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: جس شخص نے "خالصة" کو بہ تنوین پڑھا ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے ان کو ہمارے لیے خالص کیا، بایں طور کہ ان کے لیے ﴿ الدَّارِ ﴾ کا ذکر خالص ہوا اور "خالصة" مصدر بہ معنی خلوص ہے اور ﴿ ذِكْرَى ﴾ بمعنی "تذکر" یعنی خالص ہوا واسطے ان کے تذکر دار کا، اور وہ یہ ہے کہ وہ اس کے لیے تیار ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور دنیا میں بے رغبتی کرتے ہیں اور یہ امر انبیاء علیہم السلام کی شان سے ہے۔[3]

رہا وہ شخص جس نے "خالصة" کو ﴿ ذِكْرَى الدَّارِ ﴾ کی طرف مضاف کیا ہے تو اس کے نزدیک معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کو خالص کیا، اس طرح سے کہ ان کے لیے اس گھر کی یاد خالص ہو گئی اور "خالصة" مصدر مضاف ہے فاعل کی طرف اور ﴿ ذِكْرَى ﴾ اس معنی کی بنا پر ذکر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ذِكْرَى الدَّارِ ﴾ سے مراد دنیا میں ثنائے جمیل ہے اور یہ ایک ایسی شے ہے کہ اللہ پاک نے اس کے ساتھ ان کو خالص کیا ہے۔ چنانچہ ان کا غیر دنیا میں ذکر نہیں کیا جاتا ہے، اس شے کی طرح جس کے ساتھ وہ ذکر کیے جاتے ہیں۔ اس کو تقویت اس آیت سے ملتی ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴾[4] [مریم: ۵۰] "اور ہم نے ان کے ذکرِ جمیل کو بلند درجے کا کر دیا ہے۔" (قاله النسفي) لیکن اس قول میں بُعد ہے۔ امام ابن جزی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَخْلَصْنٰهُمْ ﴾ کے معنی ہیں: "جَعَلْنَاهُمْ خَالِصِيْنَ لَنَا أَوْ أَخْلَصْنَاهُمْ دُوْنَ غَيْرِهِمْ" اور "خالصة" صفت ہے موصوف محذوف کی: "أَيْ: بِخَصْلَةٍ خَالِصَةٍ". رہا حرفِ باء تو پہلے قول کی بنا پر تو تعلیل کے لیے ہے اور دوسرے قول کی بنیاد پر تعدیتِ فعل کے لیے ہے۔[5]

پھر اللہ پاک نے ان کا اور وصف بیان فرمایا: ﴿ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴾ "اصطفاء" بہ معنی اختیار ہے، یعنی برگزیدہ کرنا۔ "أخیار" جمع ہے "خَیِّر" بہ تشدید کی اور "خَیْر" بہ تخفیف کی جس طرح کہ "أَمْوَاتٌ"

[1] تفسیر القرطبي (۲۱۸/۱۵) فتح القدیر (۵۷٦/٤) [2] تفسیر البغوي (۹۷/۷) [3] فتح القدیر (۵۷٦/٤)
[4] تفسیر النسفي (٤۲/٤) [5] التسھیل لعلوم التنزیل لابن جزي (۲۱۱/۲)

جمع ہے ''مَيِّتٌ''، مشدد اور ''مَيْتٌ''، مخفف کی۔ معنی یہ ہیں: ''إِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُخْتَارِيْنَ مِنْ أَبْنَاءِ جِنْسِهِمْ مِنَ الْأَخْيَارِ'' یعنی ان کے ابنائے جنس جو نیک لوگ ہیں، ان میں سے وہ ہمارے نزدیک چنے ہوئے ہیں۔ پہلے اللہ پاک نے اسماعیل علیہ السلام کے والد اور اُن کے بھائی کا اور اُن کے برادر زادے کا ذکر کیا، اس کے بعد علاحدہ کر کے اُن کا ذکر کیا۔ یوں فرمایا: ﴿ وَاذْكُرْ إِسْمٰعِيْلَ ﴾ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات سے آگاہ کیا جائے کہ جس صبر کو یاد دلانا اس جگہ مقصود ہے، اس میں وہ درجۂ انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے، اس لیے خاص طور پر ان کا علاحدہ ذکر کیا۔

﴿ وَالْيَسَعَ ﴾ ابن اخطوب بن عجوز ہیں۔ الیاس علیہ السلام نے ان کو بنی اسرائیل پر خلیفہ کیا، بعد میں نبی ہوئے۔ ذوالکفل کی نبوت و لقب میں اختلاف ہے، یہ الیسع کے چچا زاد بھائی ہیں یا ایوب علیہ السلام کے فرزند ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے والد کے بعد ان کو مبعوث کیا اور اُن کا نام ذوالکفل رکھا۔ شام میں مقیم رہے، یہاں تک کہ انتقال کیا، ان کی عمر پچھتر (۷۵) برس کی تھی۔ الیسع کا ذکر سورت انعام میں[1] اور ذوالکفل کا ذکر سورت انبیاء میں گزر چکا ہے۔[2] ان لوگوں کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ یہ ان نبیوں میں سے ہیں جنھوں نے صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کے دین میں سختیوں کی برداشت کی۔ اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم فرمایا کہ ان کو یاد کریں، تاکہ صبر و تحمل میں ان کی راہ پر چلیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ ﴾ یعنی داود علیہ السلام سے لے کر یہاں تک جن کا ذکر ہوا، یہ سب ان نیک بندوں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نبوت کے لیے پسند کیا اور ان کو اپنی مخلوق میں برگزیدہ فرمایا۔ پھر اللہ پاک نے ان اوصاف کی طرف اشارہ کر کے، جو ان کی خوبیوں کو ظاہر کرتے ہیں، فرمایا: ﴿ هٰذَا ذِكْرٌ ﴾ یعنی یہ ان کا ذکرِ جمیل، شرف اور بزرگی ہے جس کے ساتھ وہ دنیا میں ہمیشہ ذکر کیے جاتے ہیں۔ اس جملے کے لانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قصہ پورا ہو گیا اور دوسرا قصہ شروع ہوا۔ یہ تو دنیا میں ان کی مدح و ثنا کا ذکر تھا، اب ان کے اجرِ جزیل کا بیان شروع کیا جو اُن کے لیے آخرت میں ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴾ یعنی بے شک پرہیز گاروں کے لیے اس ذکرِ جمیل و ثنائے حسن کے ساتھ آخرت میں حسنِ مرجع ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ آخرت میں اللہ پاک کی مغفرت و رضوان اور نعیم جنت کی طرف رجوع کریں گے۔ پھر یہ بیان کیا کہ حسنِ مرجع کیا ہے۔ وہ یہ ہے: ﴿ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْأَبْوَابُ ﴾ اصل میں ﴿ عَدْنٍ ﴾ اقامت کے معنی میں ہے۔ جب کوئی شخص مکان میں مقیم ہو تو محاورے میں یوں بولتے ہیں: ''عَدَنَ بِالْمَكَانِ''۔ یعنی رہنے بسنے کے باغ ہیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عَدْنٍ ﴾ ایک محل کا نام ہے جو جنت میں ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ دروازوں سے کہا جائے گا کہ کھل جاؤ تو کھل جائیں گے اور جب کہا جائے گا: بند ہو جاؤ تو بند ہو جائیں گے۔[3] کسی نے کہا کہ ان کے لیے فرشتے دروازے کھولیں گے۔ جمہور نے

---

[1] رقم الآية (٨٦) [2] رقم الآية (٨٥) [3] تفسير القرطبي (١٥/٢١٩)

﴿ جَنّٰتِ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴾ سے بدل ہے۔ برابر ہے کہ ﴿ جَنّٰتِ عَدْنٍ ﴾ معرفہ ہو یا نکرہ، کیوں کہ معرفہ نکرہ سے اور نکرہ معرفہ سے بدل بن جاتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ جَنّٰتِ ﴾ عطف بیان ہو، اگر وہ نکرہ ہو اور اگر معرفہ ہو تو جائز نہیں ہے جمہور نحویوں کے نزدیک اور بعض نے اس کو جائز رکھا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ جَنّٰتِ ﴾ کا نصب باضمارِ فعل ہو۔ کسی نے ﴿ جَنّٰتِ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مبتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ مُّفَتَّحَةً ﴾ ہے۔ یا اس بنا پر کہ ﴿ جَنّٰتِ عَدْنٍ ﴾ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: هِيَ جَنّٰتُ عَدْنٍ"

قولہ تعالیٰ: ﴿ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴾ حال ہے ﴿ جَنّٰتِ ﴾ سے اور اس میں عامل فعل کے معنی ہیں جو متقین میں ہیں اور ﴿ الْاَبْوَابُ ﴾ نائب فاعل ہے ﴿ مُّفَتَّحَةً ﴾ کا، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا ﴾ [الزمر: ۷۳] ''اور اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔'' اور حال اور ذوالحال کے درمیان رابط ضمیر مقدر ہے۔ یعنی "مِنْهَا" یا الف و لام رابط ہے، اس لیے کہ وہ ضمیر کے قائم مقام ہوتا ہے، کیوں کہ اصل یہ ہے: "مُفَتَّحَةٌ لَهُمْ أَبْوَابُهَا" کسی نے کہا ہے کہ "أبواب" کا رفع بنا بر بدل ہے ﴿ مُّفَتَّحَةً ﴾ کی ضمیر سے، جو ﴿ جَنّٰتِ ﴾ کی طرف راجع ہے۔ امام ابوعلی فارسی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ "أَيْ: مُفَتَّحَةٌ هِيَ الْأَبْوَابُ". امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: "مُفَتَّحَةٌ لَهُمْ أَبْوَابُهَا". عرب لوگ الف و لام کو اضافت کا خلیفہ کرتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ معنی یہ ہیں: "مُفَتَّحَةٌ لَهُمُ الْأَبْوَابُ مِنْهَا"[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا ﴾ منصوب ہے بنا بر حال ﴿ لَهُمْ ﴾ کی ضمیر سے اور ﴿ مُّفَتَّحَةً ﴾ اس میں عامل ہے۔ کسی نے کہا کہ حال ہے ﴿ يَدْعُوْنَ ﴾ سے، اس کو عامل پر مقدم کر دیا ہے۔ ﴿ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴾ یعنی جنتوں میں وہ منگائیں گے، اس حال میں کہ وہ تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، ان میں میوے کے بہت سے انواع و اقسام ہوں گے: "﴿ وَشَرَابٍ ﴾ أَيْ: وَشَرَابٍ كَثِيْرٍ". یہاں سے لفظ کثیر کو حذف کر دیا ہے، اس لیے کہ پہلے جملے سے معلوم ہوتا ہے، یعنی اور بہت سی شراب منگوائیں گے۔ یہاں میوے منگانے پر قصر کیا۔ اس کا مقصد یہ بات بتانا ہے کہ جنت والوں کے کھانے کی چیزیں محض مزہ اور لذت لینے کے لیے ہیں، نہ اس لیے کہ ان کو غذا بنائیں۔ جبکہ ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ ﴾ کو ﴿ لَهُمْ ﴾ کی ضمیر سے حال ٹھہرائیں اور ﴿ مُّفَتَّحَةً ﴾ کو اس میں عامل کہیں تو اس صورت میں جملہ ﴿ يَدْعُوْنَ ﴾ کا مستانفہ ٹھہرے گا، ان کے حال کے بیان کے لیے۔ کسی نے کہا ہے کہ جملہ ﴿ يَدْعُوْنَ ﴾ ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ ﴾ کی ضمیر سے حال ہے۔

بالجملہ جب اللہ پاک نے اہلِ جنت کے میووں اور شراب کا ذکر کیا تو اس کے بعد اس شے کا بیان کیا جو مایۂ عیش اور راسِ لذت ہے، یعنی حسین عورتیں اور بیویاں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ﴾ یعنی ان

---

[1] تفسير القرطبي (۲۱۹/۱۵) فتح القدير (۵۷۷/٤)

کے پاس ایسی عورتیں ہیں جو نگاہ کو اپنے خاوندوں پر روکنے والی ہیں، ان کے سوا غیر کی طرف نظر نہیں کرتیں۔ اس کا بیان سورت صافات میں ہو چکا ہے۔[1] پھر فرمایا: ﴿ اَتۡرَابٌ ﴾ یعنی وہ سب عمر اور شباب میں یا حسن و جمال میں برابر ہوں گی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''مُتَوَاخِیَاتٌ'' یعنی ان کا آپس میں برتاؤ ایسا ہوگا جیسا بہنوں میں ہوتا ہے۔ آپس میں بغض، غیرت اور حسد نہ کریں گی۔[2] تینتیس برس کی عمر والیاں ہوں گی۔ کسی نے کہا ہے کہ ''لِدَاتٌ لَهُمْ''، یعنی مردوں کی ہم عمر ہوں گی، اس لیے کہ ہمسروں میں محبت زیادہ پکی ہوتی ہے۔ یا آدھی عمر کی ہوں گی، ان میں نہ کوئی بڑھیا ہوگی نہ کمسن بچی۔ ﴿ اَتۡرَابٌ ﴾ جمع ہے ''تِرْبٌ'' کی، اس کا اشتقاق ''تُرَابٌ'' سے ہے، اس لیے کہ ان کے مولد کے اتحاد کے سبب سے ایک وقت میں ان کو مٹی چھوتی ہے۔

﴿ هٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ لِیَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴾ یعنی یہ جزا جس کا تم کو وعدہ دیا گیا روزِ حساب کے لیے ہے، کیوں کہ حساب جزا کی طرف پہنچنے کی علت ہے، معنی ''فِيْ يَوْمِ الْحِسَابِ'' ہیں۔ جمہور نے ﴿ تُوۡعَدُوۡنَ ﴾ کو بہ تائے خطاب پڑھا ہے بنا بر التفات اور ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی امام ابو عمر و ابن محیصن اور یعقوب رحمہم اللہ) نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے بنا بر خبر (تفسیر بیضاوی اور ابو السعود میں ''لیوافق ما قبله'' کہا ہے۔[3] ''وهو ظاهر وهاهنا غير ظاهر'')۔ اس کو امام ابو عبیدہ اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اختیار کیا ہے بہ سبب ﴿ وَاِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴾ کے، اس لیے کہ یہ خبر ہے۔[4] ﴿ اِنَّ هٰذَا لَرِزۡقُنَا مَا لَهٗ مِنۡ نَّفَادٍ ﴾ یعنی یہ نعمتیں کرامتیں، جنتیں اور اُن کے اوصاف جن کا ذکر ہوا، البتہ ہمارا رزق ہے جس کا ہم نے تم پر انعام کیا اور تم کو عطا فرمایا، وہ کبھی منقطع اور فنا نہ ہوگا۔ سبحان اللہ! بہشت عنبر سرشت کیا خوب شے ہے، جو اپنے اہل سے منقطع نہ ہوگی۔ اللهم ارزقنا بفضلك وكرمك، وإن لم نكن لها أهلا بأعمالنا، ولكنك يا سيدنا ومولانا أنت له أهل، فإنك أهل التقوى وأهل المغفرة.

هٰذَا ؕ وَ اِنَّ لِلطّٰغِیۡنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿ۙ۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ یَصۡلَوۡنَهَا ۚ فَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۵۶﴾
هٰذَا ۙ فَلۡیَذُوۡقُوۡهُ حَمِیۡمٌ وَّ غَسَّاقٌ ﴿ۙ۵۷﴾ وَّ اٰخَرُ مِنۡ شَکۡلِهٖۤ اَزۡوَاجٌ ﴿ؕ۵۸﴾
هٰذَا فَوۡجٌ مُّقۡتَحِمٌ مَّعَکُمۡ ۚ لَا مَرۡحَبًۢا بِهِمۡ ؕ اِنَّهُمۡ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾
قَالُوۡا بَلۡ اَنۡتُمۡ ۟ لَا مَرۡحَبًۢا بِکُمۡ ؕ اَنۡتُمۡ قَدَّمۡتُمُوۡهُ لَنَا ۚ فَبِئۡسَ
الۡقَرَارُ ﴿۶۰﴾ قَالُوۡا رَبَّنَا مَنۡ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدۡهُ عَذَابًا ضِعۡفًا
فِی النَّارِ ﴿۶۱﴾ وَ قَالُوۡا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا کُنَّا نَعُدُّهُمۡ مِّنَ

[1] رقم الآية (٤٨)
[2] تفسير البغوي (٩٨/٧)
[3] تفسير البيضاوي (٥١/٥) تفسير أبي السعود (٢٣١/٧)
[4] تفسير القرطبي (٢٢٠/١٥)

الْاَشْرَارِ ﴿۶۲﴾ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿۶۳﴾ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾

یہ (معاملہ اہلِ خیر کا) ہے اور بلاشبہ سرکشوں کے لیے بہت برا ٹھکانا ہے (55) (یعنی) جہنم، وہ اس میں داخل ہوں گے، چناں چہ وہ آرام کرنے کی بری جگہ ہے (56) یہ ہے کھولتا ہوا پانی اور پیپ، اب وہ اس کو چکھیں (57) اور ان کے مانند کئی قسم کے دوسرے (عذاب) ہوں گے (58) یہ (تمھارے پیروکاروں کا) ایک گروہ ہے جو تمھارے ساتھ گھسا چلا آتا ہے، ان کے لیے خوش آمدید نہیں، بے شک یہ آگ میں داخل ہونے والے ہیں (59) وہ کہیں گے: بلکہ تم ہی (اس لائق) ہو کہ تمھارے لیے خوش آمدید نہیں، تم ہی اسے ہمارے سامنے لائے ہو، تو (یہ) بہت بری قرار گاہ ہے (60) وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! جو شخص ہمارے سامنے یہ (انجام) لایا ہے، اس کے لیے جہنم میں عذاب دوگنا زیادہ کر دے (61) اور وہ کہیں گے: ہمیں کیا ہے کہ ہم ان لوگوں کو (جہنم میں) نہیں دیکھتے جنھیں ہم برے لوگوں میں شمار کرتے تھے (62) کیا ہم نے انھیں (دنیا میں یونہی) مذاق (کا نشانہ) بنائے رکھا یا ہماری نگاہیں ان سے ہٹ گئی ہیں؟ (63) بلاشبہ یہ اہلِ دوزخ کا باہم جھگڑنا حق ہے (64)

بدبختوں کے انجام بد کا بیان:

دوزخ کے کنارے پر دوزخیوں کو فرشتے لا کر جمع کرتے ہیں۔ اس تنگی اور بے قراری میں اگلے لوگ پچھلوں کو کوسنے لگے اور اگلے وہ تھے جو دنیا میں سردار تھے، پچھلے وہ جو ادنیٰ تھے، آپس میں یہ لعنت ملامت کریں گے۔ وہاں دیکھیں گے کہ سب جان پہچان والے لوگ ادنیٰ اور اعلیٰ دوزخ کے لیے جمع ہوتے ہیں اور جن مسلمانوں کو پہچانتے تھے اور سب سے برا سمجھتے تھے وہ نظر نہیں آتے تو حیران ہو کر کہیں گے کہ ہم نے ان کو غلط پکڑا تھا ٹھٹھے میں، وہ اس قابل نہ تھے کہ آج دوزخ کے نزدیک نہیں، یا اس جگہ ہیں لیکن ہماری آنکھیں چوک گئی ہیں ہمیں نظر نہیں آتے۔ انتھیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ نے نیک بخت لوگوں کے انجام کا ذکر کیا تو اس کے بعد بدبخت لوگوں کے انجام اور مرجع کا ذکر کیا جو قیامت میں اور حساب کے وقت ہوگا۔ چنانچہ فرمایا: یہ سن چکے اور طاغین کے لیے بری جگہ ہے جہاں وہ لوٹ کر جائیں گے۔ "طاغین" وہ ہیں جو اللہ عزوجل کی طاعت سے نکلنے والے اور اس کے رسولوں کے مخالف ہیں۔ علیہم الصلاۃ والسلام۔ پھر ﴿لَشَرَّ مَاٰبٍ﴾ کی یہ تفسیر فرمائی کہ وہ جہنم ہے جس

میں داخل ہوں گے، پھر وہ سب طرف سے ان کو ڈھانک لے گا تو کیا بری تیاری ہے، اب اس کو چکھیں۔ ﴿ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴾۔ ﴿ حَمِيْمٌ ﴾ وہ گرم پانی ہے جس کی گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو اور ﴿ غَسَّاقٌ ﴾ اس کی ضد ہے، یعنی وہ سرد جس کی طاقت نہ رکھی جائے اس کی شدتِ سردی کی وجہ سے۔ اور وہ درد دینے والی ہو۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴾ یعنی اور اسی قبیل کی اور چیزیں۔ شے اور اس کی ضد اُن سے اُن کو عذاب کیا جائے گا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر غساق کا ایک ڈول دنیا میں ڈال دیا جائے تو دنیا والے بدبودار ہو جائیں۔[1] (ورواه الترمذي بإسناده ثم قال: لا نعرفه إلا من حديث رشدين كذا قال، وقد تقدم من غير حديثه ورواه ابن جرير عن يونس بن عبد الأعلىٰ عن ابن وهب عن عمرو بن الحارث به)

(فتح البیان میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس کے مخرج یہ لکھتے ہیں: "أخرجه الترمذي وأحمد وابن جرير وابن أبي حاتم وابن حبان والحاكم وصححه وابن مردويه والبيهقي في البعث" پھر بعد میں کہا ہے: "ورشدين فيه مقال معروف")

کعب احبار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ غَسَّاقٌ ﴾ جہنم میں ایک چشمہ ہے جس کی طرف ہر زہریلے سانپ اور بچھو کا زہر بہہ کر آتا ہے۔ پھر وہ جمع کیا جاتا ہے، چنانچہ آدمی کو لائیں گے اور اس میں ایک ڈبکی دیں گے، پھر وہ اس میں سے ایسے نکلے گا کہ اس کی کھال اور گوشت ہڈیوں سے الگ ہو کر گر پڑا ہو گا اور اس کی کھال اور گوشت اس کے دونوں ٹخنوں اور ایڑیوں سے لٹک پڑا ہو گا اور وہ اپنے سارے گوشت کو کھینچتا ہو گا، جس طرح کہ آدمی اپنے کپڑے کو کھینچتا ہے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم) امام حسن بصری رحمہ اللہ نے ﴿ اَزْوَاجٌ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے: "أَلْوَانٌ مِنَ الْعَذَابِ"[3] یعنی انواع واقسام کے عذاب ہوں گے۔ ان کے غیر نے کہا، جیسے: زمہریر، یعنی انتہاء کی سردی اور سموم، یعنی بادِ گرم اور گرم پانی کا پینا اور زقوم کا کھانا اور صعود و ہویٰ، یعنی بلندی پر چڑھنا اور وہاں سے نیچے گرنا، ان کے سوا اور مختلف ومتضاد چیزیں۔ یہ سب اس قبیل سے ہیں جس کے ساتھ عذاب کیے جائیں گے اور اس کے سبب سے ان کی توہین کی جائے گی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ﴾ اللہ پاک اہلِ نار کی باتوں کی خبر دیتا ہے جو وہ ایک دوسرے سے کریں گے۔ (مگر اکثر تفاسیر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ حکایت ملائکہ کے قول کی ہے جو وہ رؤسائے کفار سے کریں گے۔ وقولہ تعالیٰ: ﴿ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ﴾۔ یہ قول رؤسائے کفار کا ہے اور قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ﴾ غربائے کفار کا قول ہے۔ از مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔

---

[1] مسند أحمد (٢٨/٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٨٤) تفسير الطبري (٢٢٨/٢١) مستدرك الحاكم (٦٤٤/٤) فتح البيان (٥٩/١٢) اس کی سند میں "دراج عن أبي الهيثم" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٤٨٠٣)

[2] تفسير ابن كثير (٥٥/٤) [3] تفسير الطبري (٢٣٠/٢١)

قال تعالیٰ: ﴿ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ﴾ [الأعراف: ۳۸] ''جس وقت بھی کوئی جماعت داخل ہو گی اپنی دوسری جماعت کو لعنت کرے گی۔'' یعنی سلام کے بدلے ایک دوسرے کو لعنت کریں گے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کی تکذیب کرے گا اور بعض بعض کے منکر ہوں گے۔ وہ گروہ جو دوسرے سے پہلے داخل ہو گا، جبکہ اس کے بعد کا گروہ دوزخ کے داروغہ کے ساتھ آئے گا جو زبانیہ فرشتوں سے ہیں تو پہلا گروہ ہر پچھلے گروہ سے کہے گا: ﴿ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ﴾ یعنی یہ گروہ ہے کہ تمھارے ساتھ داخل ہونے والا ہے، ان کے لیے کوئی خوش آمدید نہیں ہے۔ بے شک یہ آگ میں جانے والے ہیں، یعنی اس لیے کہ یہ دوزخیوں سے ہیں، تو پچھلے کہیں گے کہ تم کو بھی خوش آمدید نہیں ہے۔

﴿ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ﴾ یعنی تمہیں نے ہم کو اس شے کی طرف بلایا جس نے ہم کو اس جگہ پہنچایا۔ ﴿ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴾ یعنی سو کیا برا مستقر، مصیر اور منزل ہے۔ بولے: اے ہمارے رب! جس نے ہمارے لیے یہ پیش کیا پس تو اس کو آگ کا دوگنا عذاب دے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۳۸] ''پچھلے لوگ پہلے لوگوں کی نسبت کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا سو ان کو دوزخ کا عذاب دوگنا دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''سب ہی کا دوگنا ہے، لیکن تم کو خبر نہیں۔'' یعنی تم میں سے ہر ایک کے لیے اس کے موافق عذاب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا ﴾ اللہ تعالیٰ کافروں کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ وہ آگ میں بہت سے ان لوگوں کو گم پائیں گے جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ گمراہی پر ہیں۔ یہ لوگ مومنین ہیں کفار کے زعم میں۔ کہا کہ ہمیں کیا ہے کہ ہم ان لوگوں کو اپنے ہمراہ آگ میں نہیں دیکھتے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ابوجہل کا قول ہے: وہ کہتا ہے کہ مجھے کیا ہے کہ بلال، عمار، صہیب، فلاں اور فلاں رضی اللہ عنہم کو نہیں دیکھتا۔[1] یہ ایک مثال ہے ورنہ سارے کفار کا یہی حال ہے۔ وہ یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ مومنین آگ میں داخل ہوں گے۔ پھر جب کفار آگ میں داخل ہوں گے تو مومنین کو تلاش کریں گے، پھر جب ان کو نہ پائیں گے تو کہیں گے: ﴿ مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ۝ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴾۔ اپنی جانوں کو محال کے ساتھ تسلی دیں گے، کہیں گے: یا شاید وہ ہمارے ساتھ جہنم میں ہیں، لیکن ہماری نظر ان پر نہیں پڑی، اس وقت جان لیں گے کہ وہ تو بلند درجات میں ہیں۔ وہ اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوْا نَعَمْ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۝ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰىهُمْ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ

[1] تفسير الطبري (۲۱/۲۳۲)

يَطْمَعُوْنَ ۞ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۞ وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۞ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٤٤۔ ٤٩]

”اور اہلِ جنت اہلِ دوزخ کو پکاریں گے کہ ہم سے جو ہمارے رب نے وعدہ فرمایا تھا ہم نے اس کو واقعہ کے مطابق پایا، تو تم سے جو تمھارے رب نے وعدہ کیا تھا، تم نے بھی اس کو واقعے کے مطابق پایا؟ وہ کہیں گے ہاں! پھر ایک پکارنے والا دونوں کے درمیان پکارے گا کہ اللہ کی مار ہو ان ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے اعراض کرتے تھے اور اس میں کجی تلاش کرتے تھے اور وہ لوگ آخرت کے بھی منکر تھے۔ اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہو گی اور اعراف کے اوپر بہت سے آدمی ہوں گے، وہ لوگ ہر ایک کو ان کے قیافہ سے پہچانیں گے اور اہلِ جنت کو پکار کر کہیں گے: السلام علیکم! ابھی یہ اہلِ اعراف جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور اس کے امیدوار ہوں گے اور جب ان کی نگاہیں اہلِ دوزخ کی طرف پھریں گی تو کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم کو ان ظالم لوگوں کے ساتھ شامل نہ کر۔ اور اہلِ اعراف بہت سے آدمیوں کو جن کو، کہ ان کے قیافہ سے پہچانیں گے، پکاریں گے، کہیں گے کہ تمھاری جماعت اور تمھارا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا تمھارے کچھ کام نہ آیا۔ کیا یہ وہی ہیں جن کی نسبت تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہ کرے گا، ان کو یوں حکم ہو گا کہ جاؤ جنت میں تم پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ تم مغموم ہو گے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴾ یعنی اے محمد! یہ خبر جو ہم نے تجھے دی کہ دوزخی آپس میں جھگڑیں گے، ایک دوسرے کو لعنت کریں گے، البتہ اس میں شک وشبہہ نہیں ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا واضح بیان یہ ہے: قولہ تعالیٰ: ﴿ هٰذَا ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: خبر ہے مبتدائے محذوف کی: ”أَيْ: الْأَمْرُ هٰذَا“ یعنی بات یہ ہے۔ یا ﴿ هٰذَا ﴾ مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ ”أَيْ: هٰذَا كَمَا ذُكِرَ أَوْ هٰذَا ذِكْرٌ“ پس ﴿ هٰذَا ﴾ پر وقف کیا جائے گا۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا: یہ وقف حسن ہے۔[2] پھر ﴿ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ ﴾ سے ابتدائے کلام ہوگی۔ بالجملہ اول اللہ پاک نے اہلِ خیر کی جزا کا ذکر کیا ہے اس کے بعد اہلِ شر کی جزا کا ذکر فرمایا۔[3]

ان لوگوں کے لیے جنھوں نے طغیان اور سرکشی کی اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں کو جھٹلایا، البتہ بری جگہ ہے لوٹ کر جانے کی جس کی طرف وہ رجوع ہوں گے۔ پھر اس کا بیان کیا، فرمایا: ﴿ جَهَنَّمَ ﴾ اس کا نصب بنا بر بدل ہے ﴿ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴾ سے، یا منصوب ہے ”أَعْنِيْ“ مقدر سے، یا عطفِ بیان ہے بنا بر قول بعض۔ یا منصوب ہے بنا بر اشتغال

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/ ٥٤، ٥٥). [2] تفسیر القرطبي (١٥/ ٢٢٠) [3] فتح البیان (١٢/ ٥٣۔ ٥٨).

30

"أَيْ: يَصْلَوْنَ جَهَنَّمَ". ﴿ يَصْلَوْنَهَا ﴾ یہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی اس حال میں کہ وہ جہنم میں داخل ہوں گے۔

﴿ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ پس بری ہے وہ شے جس کو انھوں نے اپنے لیے تیار کیا ہے۔ "مِهَادٌ" بہ معنی "فراش" ہے، یعنی بستر۔ ماخوذ ہے "مهد صبي" سے۔ یا "مهاد" سے مراد موضع ہے اور مخصوص بالذم محذوف "أَيْ: بِئْسَ الْمِهَادُ هِيَ"، یعنی برا بچھونا جہنم ہے، جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ ﴾ [الأعراف: ٤١] "ان کے لیے آتشِ دوزخ کا بچھونا ہے۔" ان کے نیچے جو جہنم کی آگ ہے، اللہ پاک نے اس کی تشبیہ بچھونے سے دی ہے۔ ﴿ هٰذَا ﴾ موضع رفع میں ہے بنا بر ابتداء اور اس کی خبر ﴿ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴾ ہے بنا بر تقدیم و تاخیر۔ اصل عبارت یوں ہے: "هَذَا حَمِيمٌ وَّغَسَّاقٌ فَلْيَذُوقُوهُ"

امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے اسی طرح تقدیر کی ہے، یعنی اس دن ان سے یوں کہا جائے گا کہ یہ حمیم اور غساق ہے، چنانچہ انھیں چاہیے کہ اسے چکھیں۔ ﴿ حَمِيْمٌ ﴾ وہ گرم پانی ہے جس کی حرارت انتہاء کو پہنچی ہو اور ﴿ غَسَّاقٌ ﴾ وہ پیپ اور لہو ہے جو دوزخیوں کے چمڑوں سے بہے گا۔ یہ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: "غَسَقَتْ عَيْنُهُ إِذَا انْصَبَّتْ" (یعنی اس کی آنکھ میں زرد آب بھر آیا۔ غسقان زخم سے زرد پانی کے نکلنے کو کہتے ہیں) اور غسقان بہ معنی انصباب ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ معنی یہ ہوں: "اَلْأَمْرُ هٰذَا" یعنی بات یہ ہے جس کا ذکر ہوا۔ اور ﴿ حَمِيْمٌ ﴾ اور ﴿ غَسَّاقٌ ﴾ کا رفع اس بنا پر ہو کہ دونوں مبتدائے محذوف کی خبر ہوں۔ "أَيْ: هُوَ حَمِيمٌ وَّغَسَّاقٌ" یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ هٰذَا ﴾ کو موضع نصب میں کہیں باضمارِ فعل جس کی تفسیر ما بعد کا فعل کر رہا ہے۔ "أَيْ: لِيَذُوقُوهُ هَذَا فَلْيَذُوقُوهُ" یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴾ کو مرفوع بہ ابتداء کہیں اور خبر ان سے قبل مقدر نکالیں۔ "أَيْ: مِنْهُ حَمِيمٌ وَمِنْهُ غَسَّاقٌ"[1] یعنی اس عذاب میں سے ایک تو حمیم ہے اور اس میں سے غساق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ غَسَّاقٌ ﴾ وہ شے ہے جو اپنی سردی سے قتل کرے۔ اسی معنی سے رات کو غاسق کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ دن سے زیادہ سرد ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ غَسَّاقٌ ﴾ زمہریر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "مُنْتِنٌ" ہے، یعنی بدبو۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہے جو بدکار عورتوں کی شرم گاہ سے اور کافروں کے گوشت اور چمڑے سے بدبودار پیپ اور خون بہے گا۔ امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ دوزخیوں کا نچوڑ ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دوزخیوں کے آنسو ہیں جو بہیں گے، گرم پانی کے ساتھ ان کو پلائیں گے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام مجاہد اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ سرد برف ہے جس کی سردی انتہا کو پہنچی ہو گی۔ ﴿ غَسَّاقٌ ﴾ کی تفسیر بارد کے ساتھ زیادہ مناسب ہے، اس شے کے ساتھ جس کی کہ عرب کا لغت مقتضی ہے اور نیز زیادہ مناسب ہے کہ

[1] فتح القدير (٥٨٠/٤)

﴿ حَمِيْمٌ ﴾ کے مقابلے میں کی جائے۔ اہلِ مدینہ، اہلِ بصرہ اور بعض کوفیوں نے ﴿ غَسَّاقٌ ﴾ کو بہ تخفیفِ سین پڑھا ہے اور امام یحییٰ، اعمش اور حمزہ رحمہم اللہ نے بہ تشدید پڑھا ہے۔ یہ دو لغت ہیں ایک معنی میں جیسا کہ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دونوں کے معنی مختلف ہیں، پس مخفف تو ایک اسم ہے، جیسے: عذاب، جواب، صواب اور مشدد اسم فاعل ہے مبالغے کے لیے، جیسے: ضراب اور قتال۔

جمہور نے ﴿ اٰخَرُ ﴾ کو مفرد مذکر پڑھا ہے اور ابو عمرو نے "أُخَرُ" بہ ضمِ ہمزہ بنا بر جمع پڑھا ہے اور جمہور کی قراءت کا انکار کیا ہے، اس لیے کہ اس کے بعد ﴿ اَزْوٰجٌ ﴾ فرمایا ہے۔ عاصم جحدری نے ابو عمرو کی قراءت کا انکار کیا ہے اور کہا: اگر ویسا ہوتا جیسا ابو عمرو نے پڑھا ہے تو اللہ پاک "مِنْ شَكْلِهَا" فرماتا۔[1] بالجملہ ﴿ وَّاٰخَرُ ﴾ کا رفع بنا بر مبتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ اَزْوٰجٌ ﴾ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ مِنْ شَكْلِهٖٓ ﴾ خبر مقدم ہو اور ﴿ اَزْوٰجٌ ﴾ مبتداء مؤخر۔ اور جملہ مل کر ﴿ اٰخَرُ ﴾ کی خبر ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ اٰخَرُ ﴾ کی خبر مقدر ہو: "أَيْ: وَلَهُمْ آخَرُ" اور ﴿ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوٰجٌ ﴾ کا جملہ مستقل جملہ ٹھہرے۔ پہلی قراءت کی بنا پر آیت کے معنی یہ ہیں: "وَعَذَابٌ آخَرُ أَوْ مَذُوْقٌ آخَرُ أَوْ نَوْعٌ آخَرُ مِنْ شَكْلِ ذٰلِكَ الْعَذَابِ أَوِ الْمَذُوْقِ أَوِ النَّوْعِ الْأَوَّلِ" "شَكْلٌ" کے معنی مثل ہیں۔ دوسری قراءت کی بنیاد پر یہ معنی ہیں: "وَمَذُوْقَاتٌ آخَرُ وَأَنْوَاعٌ آخَرُ مِنْ شَكْلِ ذٰلِكَ الْمَذُوْقِ أَوِ النَّوْعِ الْمُتَقَدِّمِ" ﴿ شَكْلِهٖٓ ﴾ میں جو ضمیر مفرد آئی ہے تو وہ تاویل مذکور کی بنا پر ہے، یعنی "مِنْ شَكْلِ الْمَذْكُوْرِ"۔

﴿ اَزْوٰجٌ ﴾ کے معنی ہیں اجناس، انواع اور اشباہ۔ آیت کے حاصل معنی یہ ہیں کہ دوزخ والوں کے لیے حمیم اور غساق ہے اور عذاب کی کئی قسمیں ہیں جو حمیم اور غساق کی مثل ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا ہے کہ وہ زمہریر ہے۔ یہ بات جو امام واحدی رحمہ اللہ نے کہی تمام نہ ہوگی، مگر اس تقدیر پر کہ زمہریر کے انواع مختلف اور اجناس متفاوت ہوں تاکہ ﴿ اَزْوٰجٌ ﴾ کے معنی کے مطابق ہو جائے۔ یا اس تقدیر پر کہ معنی اس طرح ہوں کہ اہلِ نار کے ہر فرد کے لیے ایک زمہریر ہے۔[2] (امام واحدی رحمہ اللہ پر یہ اعتراض اس وقت وارد ہوگا کہ زمہریر کو ﴿ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوٰجٌ ﴾ کی تفسیر ٹھہرایا ہو اور جب ﴿ غَسَّاقٌ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہو تو اس ایراد کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کی اصل عبارت دیکھنی چاہیے۔ واللّٰه أعلم)۔

﴿ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ﴾ یہ ملائکہ کے قول کو بیان کیا ہے جو دوزخ کے داروغہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت کفار کے سردار اور پیشوا دوزخ میں داخل ہوں گے اور اُن کے بعد ان کے اتباع داخل ہوں گے تو اس وقت دوزخ کے خزانچی اتباع کی طرف اشارہ کر کے سرداروں سے کہیں گے: یہ ایک گروہ ہے جو تمھارے ساتھ آگ میں اس شدت اور سختی کے ساتھ داخل ہونے والا ہے۔ "اقتحام" کہتے ہیں: کسی شے کو سختی کے ساتھ کسی شے میں ڈالنا۔

[1] تفسير القرطبي (١٥/٢٢١، ٢٢٢) [2] فتح القدير (٤/٥٨١)

اس لیے کہ فرشتے لوہے کی موگریوں سے ماریں گے، یہاں تک کہ ان موگریوں کے خوف کے مارے وہ خود اپنے آپ کو آگ میں گھسا دیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ اقتحام رکوبِ شدت کو اور شدت میں داخل ہونے کو کہتے ہیں۔ مختار میں ہے: "قَحَمَ فِيْ الْأَمْرِ" یعنی اس نے اپنی جان کو اس امر میں پھینک دیا بغیر سوچے سمجھے، یعنی بے دھڑک اس میں ڈال دیا۔ باب اس کا "خضع" ہے۔ "أَقْحَمَ فَرَسَهُ النَّهْرَ فَانْقَحَمَ" کے یہ معنی ہیں کہ فلاں نے اپنا گھوڑا نہر میں داخل کیا تو وہ داخل ہو گیا۔ "وَاقْتَحَمَ الْفَرَسُ النَّهْرَ"[1] یعنی گھوڑا نہر میں داخل ہو گیا۔

بالجملہ جب فرشتے سرداروں سے قولِ مذکور کہیں گے تو وہ اس کا یہ جواب دیں گے: ﴿ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ﴾ یعنی اپنے اتباع کو بد دعا دیں گے کہ آگ میں ان کے منازل فراخ نہ ہوں۔ رحب بہ معنی فراخی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ان کی کچھ تعظیم اور تکریم نہ ہو۔ اس بیان سے اللہ پاک کا مقصد اس بات کی خبر دینا ہے کہ کافروں میں باہم محبت اور دوستی منقطع ہو جائے گی اور ان میں جو دوستی تھی، وہ عداوت اور دشمنی بن جائے گی۔ جملہ ﴿ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ﴾ دعائیہ ہے اس کا کوئی محل اعرابی نہیں ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَرْحَبًا ﴾ میں دو وجوہات ہیں، دونوں میں سے زیادہ ظاہر یہ ہے کہ فعل مقدر کا مفعول ہے: "أَيْ: لَا أَتَيْتُمْ مَرْحَبًا" یا "لَا سَمِعْتُمْ مَرْحَبًا" یعنی تم نہ آؤ جائے فراخ کو، یا نہ سنو تم مرحبا کو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ منصوب ہے بنا بر مصدر۔

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: لَا رَحِبَتْكُمْ دَارُكُمْ مَرْحَبًا بَلْ ضَيِّقًا"[2] یعنی تم کو تمھارا گھر بالکل بھی فراخ نہ ہو بلکہ تنگ ہو۔ جملہ منفیہ یا تو مستانفہ ہے تنگیِ مکان کی بد دعا کرنے کے لیے لایا گیا ہے اور ﴿ بِهِمْ ﴾ کا کلمہ بیان ہے ان کا جن پر بد دعا کی گئی، یا حالیہ ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ تو دعا ہے، حالاں کہ دعا حال نہیں پڑتی ہے؟ اس کا جواب یوں دیا کہ یہاں قول مقدر ہے: "أَيْ: مَقُوْلًا فِيْ حَقِّهِمْ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ" کسی نے کہا ہے کہ کلامِ خازنین کے تتمہ سے ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، جس طرح کہ اتباع کا کلام جو آگے آتا ہے اس پر دال ہے۔ غرضیکہ سرداروں نے جو اپنے اتباع کے حق میں ﴿ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ﴾ کہا تو اس کی یہ علت ذکر کی کہ ﴿ إِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴾ یعنی ان کو مرحبا نہ ہو، اس لیے کہ ان کو تو آگ میں ضرور ہی داخل ہونا ہے جس طرح کہ ہم اس میں داخل ہوئے ہیں اور وہ اس کے مستحق ہیں جیسے ہم اس کے مستحق ہوئے۔

پھر مثلاً کسی نے کہا ہے کہ جب سرداروں نے قولِ مذکور کہا تو اتباع نے ان کو کیا جواب دیا؟ تو ﴿ قَالُوْا بَلْ أَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ﴾ جملہ مستانفہ اس سوال کا جواب ہے، یعنی جب اتباع نے رؤسا کی بات سنی تو اُن سے یہ کہا، بلکہ تمھی اس بات کے زیادہ مستحق ہو جو تم نے ہم سے کہی، پھر اس کی یہ علت بیان کی کہ ﴿ أَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ﴾ یعنی تم کو مرحبا نہ ہو، اس لیے کہ تم ہی نے ہم کو اس میں ڈالا اور ہم کو اس کی طرف بلایا، اس لیے کہ تم ہم سے یہ کہتے

[1] مختار الصحاح (١/٥٦٠) [2] اللباب في علوم الكتاب (١٦/٤٤٤)

تھے کہ حق وہی ہے جس پر تم قائم ہو اور جس شے کو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں، وہ اس میں سچے نہیں ہیں۔

﴿ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴾ یعنی پس ہمارے اور تمھارے لیے جہنم بری قرارگاہ ہے۔ پھر اللہ پاک نے اتباع کی طرف سے حکایت کی کہ انھوں نے قولِ مذکور کے بعد ایک اور بات کہی، وہ یہ ہے: ﴿ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا ﴾ یعنی بولے: اے ہمارے رب! جس نے ہم کو اس کی طرف بلایا اور اس کو ہمارے لیے جائز رکھا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: جس نے ہمارے لیے اس کو جائز رکھا اور اس کا طریقہ نکالا۔[1] کسی نے کہا یہ معنی ہیں: جس نے ہم کو کفر کی طرف بلا کر ہمارے لیے یہ عذاب پیش کیا تو اس کو آگ میں اور زیادہ دوگنا عذاب کر، یعنی ایک عذاب تو ان کے کفر کے سبب سے اور ایک عذاب اس وجہ سے کہ انھوں نے ہمیں کفر کی طرف بلایا۔ اب یہ عذاب دوگنا ہو گیا۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ ﴾ [الأحزاب: ٦٨] ''پروردگار! تو انھیں دگنا عذاب دے۔'' ضعف یہ ہے کہ ایک شے پر اس جیسی اور زیادہ ہو جائے۔ عذابِ ضعف کے یہ معنی ہیں کہ عذاب صاحبِ ضعف۔ کسی نے کہا: اس جگہ ضعف سے مراد سانپ اور بچھو ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "أَيْ: أَفَاعِيْ وَحَيَّاتٌ"[2]

﴿ وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴾ من جملہ روسائے کفار کا قول ہے، یا طاغین کے قول سے ہے جن کا ذکر ہو چکا ہے، یعنی کفارِ مکہ، جیسے: ابوجہل، امیہ بن خلف اور اصحابِ قلیبِ بدر کہیں گے اس حال میں کہ وہ دوزخ میں ہوں گے: کیا ہے ہم کو کہ ہم بہت سے ان مردوں کو نہیں دیکھتے ہیں جن کو ہم رذیلوں میں شمار کرتے تھے کہ جن کے لیے نہ کوئی خیر و خوبی ہے نہ کسی طرح کا نفع ہے۔ مومنین کا نام اشرار اس لیے رکھا کہ وہ ان کے دین کے مخالف تھے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ نار میں نظر کریں گے تو مومنین کو جو اُن کے مخالف تھے اپنے ساتھ نہ دیکھیں گے، اس وقت یہ بات کہیں گے۔[3] کسی نے کہا کہ ان کی مراد رجال سے فقرائے مومنین ہیں، جیسے: عمار، خباب، صہیب، بلال، سالم اور سلمان رضی اللہ عنہم۔ کسی نے کہا ہے کہ اصحابِ کرام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم علی العموم مراد ہیں۔

﴿ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کیا ہم نے دنیا میں ان کو ٹھٹھے میں پکڑا، چنانچہ ہم نے خطا کی، یا ان سے آنکھیں چوک گئیں، چنانچہ ہم نے ان کی جگہ نہ جانی۔ یہ انکار جو استفہام سے سمجھا جاتا ہے، ان دو امر سے ہر ایک کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ہر ایک امر کے مرتکب ہوئے، پکڑا ان کو ٹھٹھے میں اور ان سے ان کی آنکھیں چوک گئیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ استفہام ڈانٹ، ملامت اور تعجب کے معنی میں ہے۔

امام ابو عمرو وغیرہ (یعنی حمزہ، کسائی، ابن کثیر اور اعمش رحمہم اللہ) نے بہ حذفِ ہمزہ "اِتَّخَذْنَاهُمْ" پڑھا ہے۔ وصل میں اس قراءت میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ کلام محض خبر ہو اور جملہ محلِ نصب میں اور ﴿ رِجَالًا ﴾ کی

[1] تفسير القرطبي (٢٢٤/١٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٤٧/١٠) [3] فتح القدير (٥٨٢/٤)

صفتِ ثانیہ ٹھہرے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ مراد استفہام ہو اور اس کا ہمزہ حذف کیا گیا، اس لیے کہ کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ اس پر دال ہے۔ چنانچہ پہلی وجہ پر تو ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ بہ معنی بل و ہمزہ ہوگا، یعنی بلکہ کیا ان سے آنکھیں چوک گئیں، اس معنی میں کہ وہ اپنی جانوں کو توبیخ کرتے ہیں ٹھٹھا کرنے پر۔ پھر اس سے اس طرف اضراب اور انتقال کیا کہ ان کے حقیر جاننے پر اپنی جانوں کو سرزنش کرتے ہیں۔ اور دوسری وجہ پر ﴿ اَمْ ﴾ متصلہ ہوگا۔ باقی قراء نے بہ ہمزۂ استفہام پڑھا ہے، اس کی وجہ سے ہمزہ وصلی گر گیا، اس صورت میں جملہ کا کوئی محل اعرابی نہیں ہے۔ اور اس میں وہ توبیخ کرتے ہیں۔ اپنی جانوں کو دونوں باتوں پر ایک ساتھ ملامت کرتے ہیں، کیوں کہ اس قراءت کی بنا پر ﴿ اَمْ ﴾ تسویہ کے لیے ہے۔ امام ابو جعفر رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی نافع، شیبہ، مفضل، ہبیرہ، یحییٰ بن وثّاب، اعمش، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ) نے "سُخْرِيًّا" بہ ضمِ سین پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ کسرِ سین پڑھا ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے مکسور پڑھا ہے تو اس نے اس کو "هَزْءٍ" سے ٹھہرایا ہے اور جس نے مضموم پڑھا ہے اس نے اس کو تسخیر سے قرار دیا ہے۔[1]

﴿ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴾ یعنی یہ حکایت ان کے حال کی جس کا ذکر ہوا البتہ واقع اور ثابت ہے دارِ آخرت میں ہرگز مختلف نہ ہوگی ﴿ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی اور جملہ بیان ہے ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا، یا بیان ہے حق کا، یا بدل ہے اس سے، یا بدل ہے ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کے محل سے، یہ بھی جائز ہے کہ خبر بعد خبر ہو۔ یہ سب تقریر جمہور کی قراءت پر ہے جو بہ ضمِ ﴿ تَخَاصُمُ ﴾ ہے، یعنی یہ امر جس کی اللہ تعالیٰ نے ان کو حکایت کی ہے البتہ حق ہے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ اس کے ساتھ کلام کریں گے اور اہلِ نار کا آگ میں آپس میں جھگڑنا ہے اور جو بات رؤسا اتباع سے کہیں گے۔ مطلب تو صرف اتنا ہے کہ اہلِ نار کا تخاصم صحیح ہے، لیکن اس مضمون کو اس طرح ادا کیا کہ پہلے ابہام کیا ﴿ ذٰلِكَ لَحَقٌّ ﴾ فرمایا۔ پھر دوبارہ اس کا بیان کیا کہ ﴿ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴾ چنانچہ اس میں زیادت تقریر ہے ﴿ تَخَاصُمُ ﴾ کی۔

امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے بہ نصب "تَخَاصُمَ" پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ سے بدل ہے، یا "أَعْنِيْ" مقدر کا مفعول ہے۔ امام ابن سمیفع رحمہ اللہ نے "تَخَاصَمَ" بہ صیغۂ فعل ماضی پڑھا ہے، اس بنیاد پر جملہ مستانفہ ہوگا۔[2] اب رہی یہ بات کہ رؤسا و اتباع کی آپس میں جو بات چیت ہے، اس کا نام تخاصم رکھا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ رؤسا کا اتباع سے ﴿ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ﴾ کہنا اور اتباع کا رؤسا سے ﴿ بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ﴾ کہنا بابِ خصومت سے ہے۔ بالجملہ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو یہ امر کیا کہ ایک ایسی بات کہہ دیں جو تخویف اور توحید کی طرف بلانے کے درمیان ہو۔ چنانچہ فرمایا:[3]

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/٢٢٤، ٢٢٥) فتح القدير (٥٨٢/٤) [2] فتح القدير (٥٨٢/٤) [3] فتح البيان (٥٨/١٢ـ٦٣)

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٦٥﴾
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿٦٦﴾ قُلْ
هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿٦٧﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿٦٨﴾ مَا كَانَ لِيَ مِنْ
عِلْمٍۢ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٦٩﴾ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا
نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٠﴾

آپ کہہ دیجیے: بس میں تو صرف ایک ڈرانے والا ہوں اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو ایک ہے، بڑا زبردست ﴿65﴾ آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کا رب ہے، نہایت غالب، بہت معاف کرنے والا ﴿66﴾ کہہ دیجیے: وہ ایک بہت بڑی خبر ہے ﴿67﴾ تم اس سے اعراض کرنے والے ہو ﴿68﴾ مجھے (فرشتوں کی) بلند پایہ جماعت کا کوئی علم نہیں تھا جب وہ باہم جھگڑ رہے تھے ﴿69﴾ میری طرف تو یہی وحی کی جاتی ہے کہ بس میں تو صرف ایک واضح (طور پر) ڈرانے والا ہوں ﴿70﴾

رسول اللہ ﷺ کی رسالت ایک عظیم الشان خبر:

بڑی خبر ہے، یعنی قیامت کے احوال یا اس دین کا نازل ہونا۔ یعنی اعلیٰ فرشتے جو تدبیریں کرتے ہیں مجھے اس کی خبر نہیں تھی کہ تمھارے پاس بیان کرتا، میں تو اللہ کی وحی سے کہتا ہوں۔ اس مجلس میں جھگڑا نہیں مگر ہر کوئی اپنے کام کی تکرار کرتا ہے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو حکم فرماتا ہے کہ جو لوگ اس کے منکر ہیں، اس کے ساتھ شرک کرنے والے ہیں، اس کے رسول ﷺ کو جھٹلانے والے ہیں، ان سے کہہ دیں کہ میں تو یہی ایک ڈرانے والا ہوں، ویسا نہیں ہوں جیسا تم خیال کرتے ہو۔ اور نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ واحد قہار، یعنی اسی اکیلے نے ہر شے کو مقہور اور مغلوب کیا ہے، وہ آسمانوں اور زمین کا اور اس شے کا جو اُن کے بیچ میں ہے رب ہے، یعنی وہ اس سب کا مالک ہے اور اس میں تصرف کرنے والا ہے۔ عزیز وغفار ہے، یعنی باوجود اپنی عظمت وعزت کے بڑا بخشنے والا ہے۔ ﴿ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴾ تو کہہ دے: یہ ایک عظیم خبر اور شانِ بلیغ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا مجھے تمھاری طرف بھیجنا، پھر تم اس سے غافل ہو۔ امام مجاہد، قاضی شریح اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴾ سے مراد قرآن شریف ہے۔[1]

[1] تفسیر الطبري (٢٣٥/٢١، ٢٣٦)

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر وحی نہ ہوتی تو میں کہاں سے جانتا! ملائے اعلیٰ کا اختلاف آدم علیہ السلام کی شان میں اور ابلیس کا ان کو سجدہ کرنے سے باز رہنا اور اپنے رب سے ان (آدم علیہ السلام) کو فضیلت دینے کے بارے میں جھگڑنا ہے۔ اب رہی وہ حدیث جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم پر ایک صبح نمازِ فجر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رک رہے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ ہم سورج کے کنارے کو دیکھ لیتے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی سے نکلے تو نماز کی تکبیر کہی گئی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور نماز میں اختصار فرمایا، پھر جب سلام پھیرا تو فرمایا: « كَمَا أَنْتُمْ » یعنی جیسے بیٹھے ہو ویسے ہی بیٹھے رہو۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: بے شک میں کھڑا ہوا رات کو تو میں نے نماز پڑھی جتنی میرے لیے مقدر کی گئی تھی، پھر میں اپنی نماز میں اونگھ گیا، یہاں تک کہ میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ میرا رب عزوجل ہے خوبصورت ترین شکل میں۔ چنانچہ فرمایا: اے محمد! کیا تو جانتا ہے کہ ملائے اعلیٰ کس بات میں جھگڑتے ہیں؟ میں نے عرض کی: یا ربّ! میں نہیں جانتا، اس کو تین بار دُہرایا، پھر میں نے اسے دیکھا کہ اس نے اپنی ہتھیلی میرے دونوں شانوں کے درمیان رکھ دی، یہاں تک کہ میں نے اس کے پوروں کی ٹھنڈک محسوس کی اپنے سینے میں، چنانچہ میرے واسطے ہر شے ظاہر ہوگئی اور میں نے پہچان لیا۔

پھر فرمایا: اے محمد! ملائے اعلیٰ کس شے میں جھگڑتے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ کفارات میں۔ فرمایا: اور کیا ہیں کفارات؟ میں نے عرض کی کہ قدموں کا جماعتوں کی طرف اُٹھنا اور مسجدوں میں نمازوں کے بعد بیٹھنا اور کریہات (شدید سردی) کے وقت وضو کا کامل کرنا۔ فرمایا: اور درجات کیا ہیں؟ میں نے عرض کی کہ کھانا کھلانا اور بات کو نرم کرنا اور نماز پڑھنا اس حال میں کہ لوگ سوتے ہوں۔ فرمایا: سوال کر۔ میں نے عرض کی: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنِ وَأَنْ تَغْفِرَ لِيْ وَتَرْحَمَنِيْ وَإِذَا أَرَدْتَّ فِتْنَةً بِقَوْمٍ فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ وَأَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُّقَرِّبُنِيْ إِلٰى حُبِّكَ » ''اے اللہ! میں تجھ سے نیک اعمال بجا لانے، برے کام چھوڑنے اور مساکین سے محبت کرنے کی توفیق مانگتا ہوں اور یہ کہ تو مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما اور جب تو کسی قوم کو فتنے سے دو چار کرنا چاہے تو مجھے اس میں مبتلا کیے بغیر فوت کر دینا، میں تجھ سے تیری محبت، تجھ سے محبت کرنے والوں کی محبت اور ایسے عمل کی محبت کا سوال کرتا ہوں جو مجھے تیری محبت کے قریب کر دے۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک یہ حق ہے پس تم اس کا درس کرو اور اس کو سیکھو۔[1] چنانچہ یہ حدیثِ منام مشہور ہے اور جس نے اس کو بیداری میں ٹھہرایا اس نے واقعی غلطی کی اور یہ حدیث سنن میں کئی طریق سے ہے۔ (وهذا الحديث بعينه قد رواه الترمذي من حديث جهضم بن عبد الله اليمامي به وقال: حسن صحيح)

(فتح البیان میں فرمایا: "وأخرج عبد الرزاق و أحمد وعبد بن حميد والترمذي وحسنه، وابن نصر في

---

[1] مسند أحمد (٥/٢٤٣) سنن الترمذي (٣٢٣٥) المعجم الكبير (٢٠/١٤١) فتح البيان (١٢/٦٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (إرواء الغليل: ٣/١٤٧، ١٤٨)

كتاب الصلاة قال: قال رسول اللهﷺ: أتاني الليلة ربي في أحسن صورة، أحسبه، قال: في المنام، قال: يا محمد! هل تدري فيم يختصم الملأ الأعلى؟ قلت: لا، فوضع يده بين كتفي حتى وجدت بردها بين ثديي أو في نحري فعلمت ما في السموت والأرض، ثم قال لي: يا محمد! هل تدري في ما يختصم الملأ الأعلى؟ قلت: نعم، في الكفارات، والكفارات المكث في المساجد بعد الصلوات والمشي على الأقدام إلى الجماعات وإبلاغ الوضوء في المكاره" الحديث (وأخرجه الترمذي وصححه ومحمد بن نصر والطبراني والحاكم وابن مردويه من حديث معاذ بن جبل نحوه بأطول منه وقال: وإسباغ الوضوء في السبرات وأخرج الطبراني وابن مردويه من حديث جابر بن سمرة نحوه بأخصر منه و أخرجا أيضا من حديث أبي هريره نحوه وفي الباب أحاديث))۔

یہ اختصام وہ اختصام نہیں ہے جو قرآن شریف میں مذکور ہے، کیوں کہ اس کی تو تفسیر کی گئی ہے، وہ تفسیر یہ ہے:
﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [1] [البقرة: ٣٠] ”اور (یاد کرو) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا: بے شک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انھوں نے کہا: کیا تو زمین میں اس کو بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا؟ اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا: بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے: تو کہہ دے کہ میں تو صرف تم کو اللہ کے عذاب اور عقاب سے ڈرانے والا ہوں۔ انذار پر صرف اسی لیے اکتفا کیا کہ آپ کی گفتگو کفار کے ساتھ ہے اور ان کو اس طرح سے ڈرانا مناسب ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود عبادت کا مستحق نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ ہر شے کا جو اس کے سوا قہار ہے، وہ آسمانوں اور زمین کا اور جو مخلوقات ان کے درمیان ہیں، ان سب کا رب ہے۔ وہ عزیز ہے اور کوئی غلبہ کرنے والا اس پر غلبہ نہیں پا سکتا، وہ بڑا بخشنے والا ہے اس کو جو اس کی اطاعت کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْعَزِیْزُ ﴾ کے معنی منیع ہیں، یعنی وہ ایسا ہے کہ اس کا کوئی مثل نہیں ہے۔ ﴿ اَلْغَفَّارُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اپنی مخلوق کے گناہوں کا بڑا چھپانے والا ہے۔

پھر اللہ پاک نے آپ ﷺ کو امر کیا کہ ان کے ڈرانے میں مبالغہ کریں اور ان کے لیے اس بات کی عظمت اور جلالت بیان کریں، اس طرح کہیں کہ ﴿ هُوَ نَبَؤٌا عَظِیْمٌ ﴾ یعنی جس عذاب و عقاب سے میں نے تم کو ڈرایا اور جو توحید میں نے تمھارے لیے کھول کر بیان کر دی، یہ ایک عظیم اور جلیل خبر ہے جس کی شان یہ ہے کہ اس کی تعظیم و تکریم اور اہتمام اور خیال کیا جائے، اس کے امر کرنے میں اور اس کے امر کی بجا آوری میں اور اس کو خفیف اور ہلکا نہ سمجھا

[1] تفسير ابن كثير (٥٦/٤)

جائے۔ اسی جیسی یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ﴾ [النبأ: ١۔ ٢] ''یہ لوگ کس چیز کے بارے میں سوال کر رہے ہیں، اس بڑی خبر کے متعلق۔'' امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴾ قرآن کریم ہے،[1] کیوں کہ یہ ایک بڑی خبر ہے، اس لیے کہ اللہ عزوجل کا کلام ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تو کہہ کہ وہ خبر جس کی میں نے تم کو خبر دی ایک خبرِ عظیم ہے، مراد اگلوں کے قصے ہیں جن کی آپ ﷺ نے ان کو خبر دی۔ یہ آپ ﷺ کے صدق اور نبوت پر دلیل ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے اس کو اللہ تعالیٰ کی وحی ہی سے جانا ہے۔[2]

جملہ ﴿ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴾ ﴿ نَبَؤٌا ﴾ کی صفتِ ثانی ہے، یعنی ایسی خبرِ عظیم ہے کہ اس سے تم اعراض کرنے والے ہو۔ یا جملۂ مستانفہ ہے۔ یہ جملہ کفار کی سرزنش اور ملامت کے لیے ہے، کیوں کہ انھوں نے اس سے اعراض کیا اور اس میں غور وفکر نہ کیا کہ اس کے صدق اور راستی کو جان جائیں اور جس بعث کا انکار کیا ہے اس پر اس سے استدلال کریں۔ جملہ ﴿ مَا كَانَ لِیَ ﴾ استیناف ہے، اس بات کو ثابت کرنے کے لیے لایا گیا ہے کہ وہ ﴿ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴾ ہے جو اللہ پاک کی طرف سے وارد ہوئی ہے۔

اللہ پاک اپنی خبروں میں سے ایک خبر کو تفصیل سے ذکر فرماتا ہے، اس کے بغیر کہ اس کو جاننے کے لیے کوئی سابقہ ذریعہ ہو، یا معرفت کے جانے ہوئے اسباب میں سے کوئی سبب ہو جس کو سامنے رکھا ہو، اس لیے کہ یہ ایک کھلی حجت ہے اور اس پر دال ہے کہ یہ خبر اللہ تعالیٰ کے پاس سے وحی کے ذریعے سے آئی ہے اور اس کی باقی خبریں بھی ایسی ہی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اصلاً غیب نہیں جانتے تھے، مگر وہ شے جس کی وحی اللہ پاک کی طرف سے کی جاتی ہے۔ ملائے اعلیٰ سے مراد فرشتے ہیں۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کہا ہے: اور آدم علیہ السلام اور ابلیس ـ عليه لعنة الملك العلام ـ ہیں۔[3] ﴿ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰى ﴾ ﴿ عِلْمٍ ﴾ سے متعلق ہے، اس لیے کہ علم کو احاطہ کے معنی میں شامل کیا ہے۔ ﴿ اِذْ ﴾ متعلق ہے محذوف سے اور ﴿ يَخْتَصِمُوْنَ ﴾ کی ضمیر ملائے اعلیٰ کی طرف راجع ہے۔ "أَيْ: مَا كَانَ لِيْ فِيْمَا سَبَقَ عِلْمٌ بِوَجْهٍ مِنَ الْوُجُوْهِ بِحَالِ الْمَلَأِ الْأَعْلٰى وَقْتَ اخْتِصَامِهِمْ" یعنی مجھ کو زمانۂ سابق میں ملائے اعلیٰ کا کسی طرح کا علم نہیں تھا ان کے جھگڑے کے وقت کا اور ان کے درمیان جو جھگڑا تھا وہ آدم علیہ السلام کے بارے میں تھا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جس وقت فرشتوں سے آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں مشورہ کیا گیا تو وہ اس میں جھگڑے اور کہا کہ زمین میں کوئی خلیفہ نہ بنا۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ یہ جھگڑا آدم علیہ السلام کی شان کے متعلق تھا، جب کہ وہ بولے: کیا تو اس میں ایسے شخص کو کرتا ہے جو اس میں فساد کرے گا۔[4] کسی نے کہا ہے کہ

[1] تفسير الطبري (٢٣٥/٢١) تفسير القرطبي (٢٢٦/١٥) [2] معاني القرآن (٣٤٠/٤)
[3] تفسير أبي السعود (٢٣٤/٧) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٤٧/١٠)

﴿ يَخْتَصِمُوْنَ ﴾ میں ضمیر قریش کی طرف راجع ہے، یعنی قریش فرشتوں کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور بعض کچھ اور کہتے ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ (معنی یہ ہیں کہ نہیں تھا مجھ کو علم ساتھ فرشتوں کے جبکہ جھگڑتے تھے ان میں قریش)۔

جملہ ﴿ اِنْ يُّوْحٰۤى اِلَيَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ معترضہ ہے۔ ملائے اعلیٰ کے اختصام مجمل اور اس کی تفصیل کے درمیان جو اس قول میں ہے: ﴿ اِذْ قَالَ رَبُّكَ ﴾ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: نہیں وحی کی جاتی ہے میری طرف، مگر اس بات کی کہ میں ایک ڈرانے والا ہوں اور تمھارے لیے وہ فرائض وسنن بیان کرتا ہوں جن کو تم کرو اور وہ حرام اور معصیت کے کام جن کو تم چھوڑ دو، گویا تم نے یوں کہا کہ نہیں وحی کی جاتی میری طرف مگر ڈرانا۔ جمہور نے ﴿ اَنَّمَاۤ ﴾ کو بہ فتح ہمزہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ وہ اور جو اس کے تحت میں ہے محلِ رفع میں ہے، اس لیے کہ نائب فاعل ہے۔ "أَيْ: مَا يُوحَى إِلَيَّ إِلَّا الْإِنْذَارُ" یا "إِلَّا كَوْنِيْ نَذِيْرًا مُبِيْنًا" یا محلِ نصب میں ہے۔ (بایں معنی: "ما يوحى إلي إلا لانهما أنا نذير مبين"۔ قاله النحاس)۔ یا جر میں بعد اسقاطِ لامِ علت کے اور نائب فاعل اس بنا پر جار ومجرور ہے۔ امام ابو جعفر رحمہ اللہ نے بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے، اس لیے کہ وحی میں معنی قول کے ہیں اور وہ یہ فاعل کے قائم مقام ہے برطریقِ حکایت،[1] گویا یوں کہا گیا: "مَا يُوحَى إِلَيَّ إِلَّا هٰذِهِ الْجُمْلَةُ الْمُتَضَمِّنَةُ لِهٰذَا الْأَخْبَارِ وَهُوَ أَنْ أَقُوْلَ لَكُمْ إِنَّمَا أَنَا نَذِيْرٌ مُبِيْنٌ" اس جگہ قصر اضافی ہے، یعنی نہ ساحر ہوں اور نہ کاذب ہوں، جیسا تم نے زعم کیا ہے۔ انذار کو خاص کر کے اس لیے ذکر کیا ہے کہ کلام مشرکوں کے ساتھ ہے اور آپ کا حال ان کے ساتھ انذار پر مقصور ہے۔ چنانچہ پہلے گزر چکا ہے۔ بالجملہ جب اللہ پاک نے فرشتوں کا جھگڑنا پہلے اجمالاً ذکر کیا تو یہاں اس کی تفصیل ذکر فرمائی۔[2]

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿71﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿72﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿73﴾ اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿74﴾ قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿75﴾ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿76﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿77﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْۤ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿78﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ

[1] تفسير القرطبي (١٥/٢٢٧) فتح القدير (٤/٥٨٣) [2] فتح البيان (١٢/٦٣-٦٥)

يُبْعَثُوْنَ ﴿٧٩﴾ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿٨٠﴾ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿٨١﴾
قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٨٣﴾
قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُوْلُ ﴿٨٤﴾ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ
مِنْهُمْ أَجْمَعِيْنَ ﴿٨٥﴾

(یاد کیجیے) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا: بے شک میں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں ⑦① چناں چہ جب میں اسے ٹھیک ٹھیک بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑنا ⑦② تب تمام فرشتوں نے (بیک وقت) اکٹھے سجدہ کیا ⑦③ سوائے ابلیس کے، اس نے تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہوگیا ⑦④ اللہ نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے کس چیز نے اس (آدم) کو سجدہ کرنے سے منع کیا، جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا؟ کیا تو نے تکبر کیا یا تو اونچے درجے والوں میں سے ہے؟ ⑦⑤ اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ⑦⑥ اللہ نے فرمایا: اب تو یہاں سے نکل جا، بے شک تو مردود ہے ⑦⑦ اور بلاشبہ تجھ پر روزِ جزا تک میری لعنت ہے ⑦⑧ ابلیس نے کہا: اے میرے رب! اب تو مجھے اس دن تک مہلت دے جب لوگ (دوبارہ) اُٹھائے جائیں گے ⑦⑨ اللہ نے فرمایا: پس بلاشبہ تو مہلت دیے گئے لوگوں میں سے ہے ⑧⓪ اس دن تک جس کا وقت (میرے ہاں) مقرر ہے ⑧① اس نے کہا: تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو ضرور گمراہ کروں گا ⑧② سوائے تیرے ان بندوں کے جو اُن میں سے مخلص و برگزیدہ ہوں ⑧③ فرمایا: تو حق یہی ہے اور میں حق بات ہی کہتا ہوں ⑧④ میں تجھ سے اور ان سب سے جنھوں نے تیری پیروی کی، جہنم کو ضرور بھر دوں گا ⑧⑤

قصہ آدم علیہ السلام اور ابلیس لعین کا:

ایک یہ بھی فرشتوں کی تکرار تھی جو بیان فرمایا۔ اپنی روح پھونک دوں یعنی آب و خاک کی نہیں بنی، غیب سے آئی۔ ابلیس جنوں سے تھا، وہ اکثر اللہ کے حکم سے منکر تھے، لیکن ابلیس اب فرشتوں میں رہنے لگا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے بنایا، یعنی بدن کو ظاہر کے ہاتھ سے اور روح کو غیب کے ہاتھ سے۔ اللہ غیب کی چیزیں ایک طرح کی قدرت سے بناتا ہے اور ظاہر کی چیزیں ایک طرح کی قدرت سے۔ انسان میں دونوں طرح کی قدرت خرچ کی۔

آ گ گرم ہے پر جوش اور مٹی سرد ہے خاموش۔ ابلیس نے آ گ کو اچھا سمجھا، اللہ نے مٹی کو پسند کیا۔ وقت معلوم کے دن تک تیرے اعمال سے پھٹکار بڑھتی جائے گی، یہاں سے نکل، یعنی فرشتوں کی صحبت سے نکالا گیا۔ انتھی[1]۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قصے کو سورۃ البقرہ میں اور سورۃ الاعراف کے شروع میں اور سورۃ الحجر و سورت سبحان الذی اور سورۃ الکھف میں اور یہاں ذکر فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرشتوں کو اس بات کے بارے میں بتلایا کہ وہ کھنکھناتے اور سنے ہوئے گارے سے ایک بشر پیدا کرے گا۔ جس وقت وہ اس کو پیدا کرنے اور ٹھیک ٹھاک کرنے سے فارغ ہو چکے تو چاہیے کہ اس کی عزت و احترام اور تعظیم کے لیے اس کو سجدہ کریں اور اللہ عزوجل کے حکم کی تعمیل کے لیے ایسا کریں۔ چنانچہ سارے فرشتوں نے اس حکم کی تعمیل کی، مگر ابلیس نے نہ کی اور وہ اُن کی جنس میں سے نہ تھا، (بلکہ) جنوں میں سے تھا۔ چنانچہ اس کی طبیعت اور جبلت نے اس کی خیانت کی، اس حال میں کہ سب حالتوں سے بڑھ کر اس کی طرف محتاج تھا۔ چنانچہ اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے عار کیا اور اُن کے بارے میں اپنے رب عزوجل سے جھگڑا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ آدم علیہ السلام سے بہتر ہے، کیوں کہ وہ تو آگ سے بنایا گیا اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے اور آگ اس کے زعم میں مٹی سے بہتر ہے، حالاں کہ اس نے اس بات میں خطا کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کا مخالف اور منکر ہو گیا۔

چنانچہ اللہ عزوجل نے اس کو دور کیا اور اس کی ناک کو خاک آلودہ کیا اور اس کو اپنے بابِ رحمت و محلِ انس اور اپنی مقدس ذات کے پاس سے دور ہٹا دیا اور اس کا نام ابلیس رکھا یہ بتانے کے لیے کہ وہ رحمت سے ناامید کیا گیا اور اسے مذموم اور راندۂ درگاہ کر کے آسمان سے زمین کی طرف اُتار دیا۔ پھر اس نے روزِ بعث، یعنی قیامت کے دن تک مہلت مانگی تو حلیم نے اس کو مہلت دی، کون سا حلیم جو اپنے گناہ گاروں پر جلدی نہیں کرتا، پھر جب وہ قیامت کے دن تک ہلاک ہونے سے بے خوف ہو گیا تو سرکشی کی اور کہا: ﴿ فَبِعِزَّتِكَ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٢] ''اچھا دیکھ لے اسے تو نے مجھ پر بزرگی تو دی ہے، لیکن اگر مجھے بھی قیامت تک تو نے ڈھیل دی تو میں اس کی اولاد کو بجز بہت تھوڑے لوگوں کے، اپنے بس میں کرلوں گا۔'' یہ قلیل وہی ہیں جن کا اس آیت میں استثناء کیا ہے: ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٥] ''میرے سچے بندوں پر تیرا کوئی قابو اور بس نہیں، تیرا رب کارسازی کرنے والا کافی ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ﴾ ایک جماعت نے جن میں سے مجاہد رحمہ اللہ ہیں پہلے ''حق'' کو بہ رفع پڑھا ہے اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ ''أَنَا الْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُوْلُ''، یعنی میں حق ہوں اور حق کہتا ہوں۔ ان سے ایک روایت میں یہ ہے: ''اَلْحَقُّ مِنِّيْ وَأَقُوْلُ الْحَقَّ''، یعنی حق مجھ سے ہے اور میں حق ہوں اور حق

کہتا ہوں۔ دوسروں نے ہر دو حق کو بہ نصب پڑھا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک قسم ہے کہ اللہ پاک نے اس کے ساتھ قسم کھائی ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [السجدة: ١٣] ''لیکن میری یہ بات بالکل حق ہو چکی ہے کہ میں ضرور ضرور جہنم کو انسانوں اور جنوں سے بھر دوں گا۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴾[2] [بني إسرائيل: ٦٣] ''جا ان میں سے جو بھی تیرا تابع دار ہو جائے گا تو تم سب کی سزا جہنم ہے جو پورا پورا بدلہ ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ بدل ہے ﴿ يَخْتَصِمُوْنَ ﴾ سے، کیوں کہ اس کے تحت میں جو قصہ ہے وہ خصومت پر مشتمل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''اُذْکُرْ'' محذوف کا ظرف ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے، جبکہ فرشتوں کی خصومت اس شخص کے بارے میں ٹھہری جو زمین میں خلیفہ بنایا جائے گا اور جب ان کی خصومت جن اقوال کا ذکر ہو چکا ہے، ان میں سے کسی اور قول کے بارے میں ہو تو دوسرا قول زیادہ مناسب ہوگا۔ ﴿ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ میں آیندہ زمانے میں ایک بشر کو پیدا کرنے والا ہوں، یعنی جنسِ بشر سے ایک جسم، مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ بشر ماخوذ ہے مباشرت سے۔ آدم علیہ السلام کو بشر اس لیے کہا کہ زمین سے ان کو مباشرت ہے، یعنی رہنا بسنا سب کچھ اسی میں ہے، یا اس لیے کہ ان کا بشرہ ظاہر ہے، یعنی ان کا جسم بالوں سے صاف پاک ہے اور حیوانات کی جلد بالوں سے چھپی ہوتی ہے۔ ﴿ مِّنْ طِيْنٍ ﴾ محذوف سے متعلق ہے جو بشر کی صفت ہے، یعنی ایسا بشر جو مٹی سے ہونے والا ہے۔ یا ﴿ خَالِقٌۢ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی میں مٹی سے بنانے والا ہوں۔

﴿ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ پھر جب میں اس کی صورت بشر کی طرح بناؤں اور اس کے اجزاء برابر ہو جائیں اور میں اس کو پورا کر دوں۔ ﴿ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ﴾ اور اس میں اس روح میں سے جاری کر دوں جس کا میں مالک ہوں اور میرے سوا کوئی مالک نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نفخِ روح تمثیل ہے، نہ کوئی نفخ اور نہ کوئی منفوخ فیہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس کے جماد کے بعد اس کو زندہ کر دیا، جبکہ اس میں کسی طرح کی حیات نہ تھی۔ اس معنی سے آیت کا ظاہرِ نظم کریم انکار کرتا ہے۔ لہٰذا پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ سورۃ النساء میں اس بات پر گفتگو گزر چکی ہے۔ فی الجملہ نفخِ روح کا بیان یہ ہے کہ نفخِ روح اس جسم کی طرف روح کا جاری کرنا ہے جو اس کو تھامنے کے قابل اور لائق ہو۔ اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کے شرف اور عزت کی خاطر روح کی اضافت اپنی طرف فرمائی۔ روح ایک لطیف جسم ہے جس کے

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٢٤٢) [2] تفسير ابن كثير (٤/٥٧)

اپنے اندر اس کے سرایت کر جانے سے انسان زندہ ہو جاتا ہے۔ جمہور متکلمین اسی کے قائل ہیں۔ (کما ذکرہ الکرخي)

امام نووی رحمہ اللہ نے مسلم شریف کی شرح میں فرمایا ہے کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح یہی قول ہے کہ روح بدن میں مشتبک ہوتی ہے، جس طرح کہ سبز لکڑی میں پانی مشتبک ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے ہر جز میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ ان میں سے بہت نے یہ کہا ہے کہ روح عرض ہے اور یہ وہی حیات ہے جس کے وجود سے بدن زندہ ہو جاتا ہے۔ بہت سے فلسفی اور صوفیائے کرام یہ کہتے ہیں کہ نہ وہ جسم ہے نہ عرض ہے، بلکہ ایک جوہر مجرد قائم بنفسہ غیر متحیز بدن سے متعلق ہے تدبیر اور تحریک کے واسطے، نہ اس سے خارج ہے نہ داخل ہے۔ امام غزالی و راغب رحمہما اللہ نے اس پر ان کی موافقت کی ہے۔ پہلے قول والوں کی یہ دلیل ہے کہ اخبار میں روح کا یہ وصف آیا ہے کہ وہ اترتی ہے، چڑھتی ہے، عالمِ برزخ میں تردد کرتی ہے۔ انتہیٰ. یعنی آمد و رفت کرتی ہے اور یہ جسم کے اوصاف ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ انسان کے بدن میں ایک شریف قدسی جوہر ہے جو بدن میں سرایت کرتا ہے جس طرح کہ روشنی میدان میں سرایت کرتی ہے، یا جس طرح کہ آگ کوئلے میں سرایت کرتی ہے۔[1] (ذکرہ الخازن)

صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ روح کا علم ان اشیاء میں سے ہے جن کے علم کے ساتھ اللہ پاک مستاثر ہے اس کی مخلوق میں سے کوئی اس کو نہیں جانتا (یعنی خود اللہ تعالیٰ ان کے علم کے ساتھ مستقل ہے۔ کسی اور کو ان کا علم نہیں ہے)۔ اس کی معرفت میں غور و خوض کرنا فضول اعمال اور لغو کلام میں سے ہے۔ اللہ پاک نے خود فرمایا ہے: ﴿ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾[2] [بني إسرائيل: ٨٥] ''آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔'' سیدنا ابو الوفاء صاحبِ فتح البیان مرحوم نے ''ثمار التنكيت في شرح أبيات التثبيت'' اور دیگر مولفات میں اور خاکسار۔عفاء اللّٰه عنه۔ نے ''طي الفراسخ'' میں روح کے بارے میں اقوال ذکر کیے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴾ امر ہے ''وَقَعَ يَقَعُ'' سے۔ اس جگہ سجود سے مراد سجودِ تحیت ہے سجودِ عبادت مراد نہیں ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ فرشتوں کو جس بات کا حکم ہوا تھا وہ صرف انحنا نہیں ہے، یعنی جھکنا نہیں ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑو۔ اس کی تحقیق سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ ﴿ فَسَجَدَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ﴾ میں عبارت محذوف ہے جس پر فائے فصیحہ دلالت کرتی ہے ''أَيْ: فَخَلَقَهٗ فَسَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ فَسَجَدَ لَهُ الْمَلَائِكَةُ'' یعنی پس اللہ تعالیٰ نے آدم کو بنایا، پھر ان کو ٹھیک کیا اور اُن میں روح پھونکی، پھر ان کو فرشتوں نے سجدہ کیا۔ ﴿ كُلُّهُمْ ﴾ کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ ان سب نے سجدہ کیا، ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا اور ﴿ اَجْمَعُوْنَ ﴾ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک وقت میں ان سب نے جمع ہو کر سجدہ کیا۔ چنانچہ

---

[1] تفسير الخازن (٤/٤٨۔ ط: دار الكتب العربية، بيروت)
[2] فتح البيان (١٢/٦٦، ٦٧)

﴿ كُلُّهُمْ ﴾ تو احاطہ کرنے کے لیے ہے اور ﴿ اَجْمَعُوْنَ ﴾ اجتماع کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ تفسیر کشاف میں کہا ہے کہ دونوں کلموں نے اکٹھے یہ ظاہر کیا کہ ان سب نے سجدہ کیا اور ان میں سے کوئی فرشتہ باقی نہ رہا جس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ سب نے اکٹھے ہو کر ایک وقت میں سجدہ کیا نہ کہ علاحدہ علاحدہ کئی وقتوں میں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ عمومیت میں مبالغے کے لیے دو تاکید کے ساتھ تاکید کی۔

اب رہی یہ بات کہ یہ سجدہ آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے تھا یا داخل ہونے کے بعد۔ اس میں دو قول ہیں: ﴿ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ﴾ استثنائے متصل ہے، اس تقدیر پر کہ ابلیس میں ملائکہ کی صفات تھیں، وہ ان کے شمار میں داخل تھا، چنانچہ فرشتوں کو اس پر غلبہ دیا گیا۔ یا منقطع ہے بنا پر اس کے کہ ظاہر یہی ہے کہ وہ ان میں داخل نہیں ہے۔ یعنی ابلیس نے جاہل ہو کر سجدے سے عار کیا۔ اس نے یہ نہ سمجھا کہ وہ اللہ پاک کی اطاعت ہے اور اس کا استکبار کفر کا استکبار تھا، لہٰذا وہ کافروں سے ہو گیا، اس لیے کہ اس نے اللہ پاک کے حکم کی مخالفت کی اور اس کی اطاعت سے تکبر کیا۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ اللہ پاک کے علم میں کافروں سے تھا۔ سورۃ البقرہ، اعراف، بنی اسرائیل، کہف اور طٰہٰ میں اس کا بیان پورے طور پر گزر چکا ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس کو جس سجدے کا حکم دیا تھا اس کو ترک کرنے کا سبب اس سے پوچھا۔ فرمایا: ﴿ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ﴾ یعنی اے ابلیس! جس شے کے پیدا کرنے کا بغیر باپ اور ماں کے واسطہ کے میں خود متولی ہوا اسے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟ اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کی نسبت ان کی عزت اور شرف کے لیے اپنی ذاتِ مقدس کی طرف فرمائی، اس کے باوجود کہ وہ تو ہر شے کا خالق ہے جس طرح کہ روح کی اور بیت اللہ اور ناقۃ اللہ اور مساجد اللہ کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ید" اس جگہ مجازاً تاکید و صلہ کے معنی میں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ﴾[2] [الرحمن: ۲۷] "صرف تیرے رب کی ذات باقی رہ جائے گی۔" کسی نے کہا ہے کہ "ید" سے مراد قوت ہے۔ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "مَا لِيْ بِهٰذَا الْأَمْرِ يَدٌ وَمَالِيْ بِهِ يَدَانِ أَيْ: قُدْرَةٌ" یعنی مجھ کو اس کام کی قدرت نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ "يَدَيَّ" بہ صیغۂ تثنیہ فرمایا، مقصود اس سے یہ بات بتانا ہے کہ "ید" بہ معنی قوت اور قدرت نہیں ہے۔ بلکہ اس لیے کہ اس پر دلیل ہو کہ "یدان" اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے دو صفتیں ہیں۔ اور یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تثنیہ آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے میں کمال اہتمام اور اعتناء کو ظاہر کرنے کے لیے ہے جو اُن کے اجلال اور تعظیم کا مستدعی ہے، ملامت میں سختی اور ابلیس کے طرزِ عمل پر سخت انکار کرنے کے لیے۔

[1] الكشاف (١٠٧/٤) [2] فتح القدير (٥٤٥/٤)

مطلب یہ ہے کہ شیطان کو سخت ملامت کرنا اور اس کے انکار کی تاکید کرنا منظور ہے کہ جس شے کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تو نے اس کو سجدہ کرنے سے انکار کیوں کیا!

﴿ لِمَا خَلَقْتُ ﴾ میں کلمۂ "ما" مصدریہ ہے یا موصولہ۔ امام جحدری نے "لَمَّا" بہ تشدیدِ میم مع فتحِ لام پڑھا ہے اس بنا پر کہ ظرف ہے بہ معنی "حین" جیسا کہ امام ابوعلی فارسی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ کسی نے ﴿ بِيَدَيَّ ﴾ کو بافراد پڑھا ہے۔[1] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا: عرشِ معلیٰ، جنتِ عدن، قلم اور آدم۔[2] (أخرجه ابن جرير و أبو الشيخ في العظمة والبيهقي) عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں اپنے ہاتھ سے پیدا فرمائی ہیں: آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور تورات کو اپنے ہاتھ سے لکھا اور فردوس کو اپنے ہاتھ سے لگایا۔[3] (أخرجه ابن أبي الدنيا في صفة الجنة وأبوالشيخ في العظمة والبيهقي في الأسماء والصفات)

جمہور نے ﴿ أَسْتَكْبَرْتَ ﴾ کو بہ ہمزۂ استفہام پڑھا ہے اور یہ استفہام ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کے لیے ہے۔ پس ﴿ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ ﴾ میں کلمۂ ﴿ أَمْ ﴾ متصلہ ہوگا، یعنی یا تو نے اپنے استکبار کی وجہ سے سجدہ نہیں کیا، وہ استکبار جو قدیم اور مستمر ہے۔ اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہ الفِ وصل پڑھا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ استفہام مراد ہو تو اب پہلی قراءت کے مطابق ہو جائے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ استفہام کے ارادے کے بغیر محض خبر ہو تو اس صورت میں کلمۂ ﴿ أَمْ ﴾ منقطعہ ہوگا۔ معنی یہ ہیں کہ تو نے اس سجدہ کرنے سے تکبر کیا جس کا تجھے حکم کیا گیا، بلکہ کیا تو عالین سے تھا، یعنی ان میں سے تھا جو اللہ کے حکم کی اطاعت کرنے سے بلند ہونے کے مستحق ہیں اور اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھنے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ تو نے سجدے سے اس وقت تکبر کیا یا تو ہمیشہ اس قوم میں رہا جو تکبر کرتی ہے۔

جملہ ﴿ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ﴾ مستانفہ ہے اور سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا کہ شیطان نے اللہ پاک کو کیا جواب دیا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ اس نے یہ جواب دیا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ لعین نے اپنے نفس کے لیے یہ دعویٰ کیا کہ وہ آدم علیہ السلام سے بہتر ہے، یعنی اگر میں شرف میں اس کے برابر ہوتا تو بھی یہ بات قبیح ہوتی کہ میں اسے سجدہ کروں، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس سے بہتر ہوتے ہوئے بھی اس کو سجدہ کروں! اس کے اس کلام کے ضمن میں یہ بات ہے کہ فاضل کا اپنے مفضول کو سجدہ کرنا خوب نہیں ہے۔ پھر اپنے دعوے کی وجہ یہ پیش کی کہ تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اس کو مٹی سے بنایا۔ اس لعین کے زعم میں یہ بات تھی کہ آگ کا عنصر مٹی کے عنصر سے اشرف اور افضل ہے، کیوں کہ اجرامِ فلکیہ اجرامِ عنصریہ سے افضل ہیں اور نار فلک کا زیادہ قریبی عنصر ہے اور زمین ایک ایسا عنصر

---

[1] فتح القدير (٥٨٦/٤) [2] تفسير الطبري (٢٣٩/٢١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (مختصر العلو: ٧٥/١)

[3] الدر المنثور (٢٠٧/٧)

31

ہے جو فلک سے بعید ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ نار نورانی اور لطیف ہے اور زمین کثیف اور ظلمانی ہے اور لطافت ونورانیت، کثافت اور ظلمت سے بہتر ہیں۔ اس لعین کے خیال سے یہ بات جاتی رہی کہ عنصر طین کے لیے آگ بہ منزلہ خادم ہے۔ آگ کی جب حاجت ہوئی تو بلا لی گئی جیسے خادم بلا لیا جاتا ہے اور اگر اس سے استغنا ہوا، یعنی اس کی ضرورت نہ رہی تو بھگا دی گئی اور نیز مٹی نار پر غالب ہوتی ہے اور اس کو بجھا دیتی ہے اور نیز آگ صرف اس شے میں پائی جاتی ہے جس کی اصل زمین کے عنصر سے ہے اور آگ کا انجام راکھ کی طرف ہوتا ہے جس سے کوئی نفع نہیں لیا جاتا اور مٹی اصل ہے ہر اس شے کی جو نامی و نابت (اُگنے والی) ہے، جیسے: انسان و درخت اور یہ بات معلوم ہے کہ انسان اور میوہ دار درخت راکھ سے بہتر اور افضل ہیں۔

بہرحال آدم علیہ السلام کو ایسے شرف و کرم کے ساتھ شرافت و کرامت دی گئی ہے کہ شرفِ عناصر میں سے کوئی شے اس کی برابری نہیں کرتی، کیوں کہ اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا اور ان میں اپنی روح سے پھونکا اور اُن کے لیے سجدہ کرنے کا حکم فرمایا۔ جواہر اپنی ذات میں باہم ایک دوسرے کے ہم جنس ہیں اور اُن کو جو شرف حاصل ہوا ہے وہ ان کے عوارض میں سے کسی عارض (پیش آنے والی چیز) کے سبب سے ہے۔

جملہ ﴿ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا ﴾ مستانفہ ہے مثل اول کے، مثلاً: کسی نے کہا کہ شیطان کے جواب دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس سے کیا فرمایا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تو جنت سے نکل جا، یا ملائکہ کے زمرے سے، یا اس خلقت سے جس پر تو ہے اس سے نکل جا، کیوں کہ وہ اپنی خلقت کے ساتھ فخر کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اللہ پاک نے اس کی خلقت کو تبدیل کر دیا اور وہ سیاہ پڑ گیا، اس کے بعد کہ پہلے خوبصورت تھا اور تاریک ہو گیا اس کے بعد کہ نورانی تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب وہ فرشتوں کے درمیان تھا تو کافر نہ تھا اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جو منتقل کیا ہے تو وہ سجدے سے استکبار پر کیا ہے۔ چنانچہ یہ اس پر دلیل ہے کہ جب اس نے سجدہ نہ کیا تو کافر ہو گیا۔[1] (ذکرہ الطیبي) پھر اللہ پاک نے اس کے نکلنے کی یہ وجہ ذکر فرمائی کہ ﴿ فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴾ یعنی تو نکل اس لیے کہ تو مارا گیا ہے تاروں کے ساتھ اور راندۂ درگاہ ہے اور ہر خیر و خوبی سے محروم ہے اور اللہ کے حکم کو ترک کرنے کی وجہ سے ملعون ہے۔

﴿ وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ یعنی اور بے شک میں نے تجھے روزِ جزا تک اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ چنانچہ اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ یہ لعنت ہمیشہ کے لیے اس پر مستمر رہے گی جب تک دنیا ہے، پھر آخرت میں اللہ کے طرح طرح کے عذاب، عقوبت، غصے اور غضب میں سے اس شے کو ملے گا جو اس کے لائق ہے۔ یہ مراد نہیں کہ آخرت میں لعنت اس سے دور ہو جائے گی، بلکہ وہ تو ہمیشہ ملعون ہے، لیکن چوں کہ آخرت میں اس کے لیے وہ

[1] فتوح الغیب (۱۳/۳۲۶)

عذاب اور سزا ہے جس کے سامنے لعنت کو بھول جائے گا اور اس میں پڑنے کے وقت اس سے غافل ہو گا تو اس کے مقابلے میں گویا وہ نہیں ہے۔ ﴿ قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ ﴾ کا جملہ مستانفہ ہے مثل سابق کے۔ یعنی اے میرے رب! تو مجھے مہلت اور تاخیر دے اور مجھ پر جلدی مت کر۔ ﴿ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴾ یعنی اس دن تک کہ آدم اور اس کی اولاد فنا ہونے کے بعد جزا کے لیے اٹھائیں جائیں۔ لعین کی اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے اغوا کرنے کی گنجائش پائے اور ان سے اپنا بدلہ لے۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ﴿۸۰﴾ اِلٰی یَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ﴾ یعنی بے شک تمھیں وقتِ معلوم کے دن تک مہلت دی گئی، یعنی وہ دن جس کو اللہ پاک نے خلائق کے فنا کرنے کے لیے مقدر فرمایا ہے۔ یہ دن نفخۂ آخرہ کے نزدیک ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نفخۂ اولیٰ۔ کہا ہے کہ ابلیس نے جو روزِ بعث تک مہلت طلب کی تو صرف اس لیے کہ موت سے خلاصی پائے، کیوں کہ جب اسے روزِ بعث تک مہلت ملی تو بعث سے پہلے نہ مرے گا اور روزِ بعث کے آنے کے وقت بھی نہ مرے گا تو اب موت سے چھٹکارا پالے گا۔ لہٰذا اسے وہ جواب ملا جو اُس کی مراد کو باطل کرتا ہے اور اس کے مقصد کو اس پر توڑتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ اسے روزِ وقتِ معلوم تک مہلت دی گئی اور وقتِ معلوم وہی ہے جس کو اللہ پاک جانتا ہے اور اس کے علاوہ اسے کوئی نہیں جانتا۔

پھر جب ابلیس لعین نے سنا کہ اللہ پاک نے اس وقت تک اسے مہلت دی تو بولا: ﴿ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغۡوِیَنَّہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴾ پس لعین نے اللہ پاک کی عزت کی قسم کھا کر کہا کہ وہ بنی آدم کو بہکائے گا، اس طرح سے کہ ان کے لیے خواہشات کو اور گناہوں کو حسین وجمیل پیرائے میں پیش کر کے ان پر شکوک وشبہات کو داخل کرے گا، یہاں تک کہ وہ سب گمراہ ہو جائیں گے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَبِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ ﴾ [الأعراف: ١٦] اس قول کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا اس کو اغواء کرنا اللہ تعالیٰ کے آثارِ قدرت وعزت سے ایک اثر ہے اور اس کے احکامِ قہر وسلطنت میں سے ایک حکم ہے۔ چنانچہ اس کا اغوا اور عزت کے ساتھ قسم کھانے کا انجام ایک ہے۔ شاید لعین نے ان دونوں کے ساتھ قسم کھائی ہے۔ پھر جب لعین کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کا مکر وفریب مؤثر نہ ہو گا، مگر صرف اس کے تابعداروں اور احزاب میں جو اہلِ کفر اور معاصی ہیں تو ان لوگوں کا استثناء کیا جن کو وہ گمراہ نہ کر سکے گا اور ان کو اغوا کرنے کا کوئی راستہ نہ پائے گا، چنانچہ خود کہہ دیا: ﴿ اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡہُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴾ یعنی مگر تیرے وہ بندے جن کو ان میں سے تو نے اپنی اطاعت کے لیے خالص کیا ہے اور مجھ سے ان کو محفوظ اور معصوم رکھا ہے۔ ان آیتوں کی تفسیر سورۃ الحجر وغیرہ میں گزر چکی ہے۔

جملہ ﴿ قَالَ فَالۡحَقُّ ۫ وَ الۡحَقَّ اَقُوۡلُ ﴾ مستانفہ ہے جملہ ہائے ما تقدم کی طرح۔ جمہور نے دونوں ''الحق'' کو بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مقسم بہ ہے، حرفِ قسم اس سے حذف کیا گیا ہے تو دونوں منصوب ہو گئے۔ یا دونوں منصوب ہیں بنا بر اغراء ''أَيْ: اِلْزَمُوا الْحَقَّ'' یا دونوں مصدر موکد ہیں جملہ ﴿ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ ﴾ کے مضمون کے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ (یعنی امام مجاہد، اعمش، عاصم اور حمزہ رحمہم اللہ) نے بہ رفعِ اول ونصبِ ثانی پڑھا ہے، اس

بنا پر کہ پہلا "الحق" مبتداء ہے اور اس کی خبر مقدر ہے۔ "أَيْ: فَالْحَقُّ مِنِّيْ" یا "فَالْحَقُّ أَنَا" یا اس کی خبر ﴿ لَاَمْلَـَٔنَّ ﴾ ہے۔ یا خبر ہے مبتدائے محذوف کی اور ثانی کا نصب فعل ما بعد سے ہے۔ "أَيْ: وَأَنَا أَقُوْلُ الْحَقَّ"۔ امام فراء اور ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ منصوب ہو بہ معنی "حَقًّا" ہو کر ﴿ لَاَمْلَـَٔنَّ ﴾ سے۔ ان دونوں پر کسی نے یوں اعتراض کیا ہے کہ لام کا ما بعد ما قبل سے مقطوع ہوتا ہے۔

امام فراء اور سیبویہ رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ معنی یہ ہیں: "فَالْحَقُّ أَنْ أَمْلَأَ جَهَنَّمَ"۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ بہ رفع ہر دو پڑھا ہے۔ رفع اول تو بنا بر وجہ مذکور اور ثانی کا رفع بنا بر ابتداء اور خبر اس کی جملہ مذکورہ جو اس کے بعد ہے اور عائد محذوف ہے۔ امام ابن سمیفع اور طلحہ بن مصرف نے دونوں کو بہ جر پڑھا ہے بنا بر تقدیرِ حرفِ قسم۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: جیسے تم بولتے ہو: "اَللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ لَأَفْعَلَنَّ كَذَا" ابو العباس ثعلب نے اس کو غلط کہا ہے اور کہا ہے کہ حذفِ مضمر سے خفض جائز نہیں ہے۔ جملہ ﴿ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ ﴾ جمہور کی قراءت پر قسم کا جواب ہے اور جملہ ﴿ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ﴾ معترضہ ہے قسم اور اس کے جواب کے درمیان۔[1]

﴿ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ البتہ میں جہنم کو تیری جنس سے جو شیاطین ہیں اور اولادِ آدم میں سے جس نے تیری پیروی کی ان سے بھر دوں گا۔ وہ اولادِ آدم جن کو تو نے ضلال اور غوایت کی طرف بلایا اور انھوں نے تیری بات مان لی۔ کلمۂ ﴿ اَجْمَعِيْنَ ﴾ تاکید ہے معطوف و معطوف علیہ کی، یعنی میں اس کو شیاطین سے اور ان کے اتباع سے سب سے بھر دوں گا۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے جائز رکھا ہے کہ خاص ضمیر ﴿ مِنْهُمْ ﴾ کی تاکید ہو، یعنی البتہ میں بھروں گا جہنم کو شیاطین سے اور اس سے جو تمام لوگوں میں سے اس کا تابع ہوا۔ اس میں لوگوں کے درمیان کسی طرح کا فرق نہ ہوگا۔[2] اس سے امام زمخشری رحمہ اللہ کی غرض اپنے باطل مذہب کی تائید ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہے۔ چنانچہ بہتر وہی وجہِ اول ہے کہ ﴿ اَجْمَعِيْنَ ﴾ معطوف اور معطوف علیہ کی تاکید ہے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿86﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿87﴾ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿88﴾

(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تم سے اس (تبلیغِ دین) پر کوئی اجر نہیں مانگتا اور میں تکلف (بناوٹی کام) کرنے والوں میں سے نہیں (86) یہ (قرآن) جہانوں کے لیے نصیحت ہی تو ہے (87) اور تم اس کی حقیقت کچھ مدت کے بعد ضرور جان لو گے (88)

تکلفات سے ہمارا کیا لینا دینا:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! تو ان مشرکوں سے کہہ دے کہ میں اس رسالت کے پہنچانے پر اور اس خیر خواہی

---

(1) تفسیر القرطبي (١٥/٢٢٩، ٢٣٠) فتح القدير (٤/٥٨٧) (2) الكشاف (٤/١١٠)

پر تم سے مزدوری نہیں مانگتا ہوں کہ تم دنیا کے مال و اسباب سے مجھے دو اور میں متکلفین میں سے نہیں ہوں، یعنی میں اس شے پر جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے اور زیادہ نہیں کرتا اور نہ ہی میں اس پر زیادتی چاہتا ہوں، بلکہ جس شے کا مجھے حکم دیا گیا میں نے اس کو ادا کر دیا۔ میں نہ اس پر زیادہ کرتا ہوں نہ اس سے کم، میں تو اس سے صرف اللہ عزوجل کی ذات کی خوشنودی اور دارِ آخرت کو چاہتا ہوں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی کسی شے کا علم رکھتا ہو تو چاہیے اسے بیان کرے اور جو کوئی علم نہ رکھتا ہو تو چاہیے کہ کہہ دے: اللّٰہ أعلم۔ اس لیے کہ اللہ عزوجل نے تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں فرمایا ہے: ﴿ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴾[1]
(قاله سفيان الثوري عن الأعمش و منصور عن أبي الضحي عن مسروق أخرجاه من حديث الأعمش به)

قرآنِ مجید ایک نصیحت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی قرآن شریف جن و انس میں سے سارے مکلفین کے لیے ایک نصیحت ہے۔ (قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ "عَالَمِيْنَ" سے مراد جن و انس ہیں۔[2] یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الأنعام: ١٩] "تاکہ میں اس کے ذریعے سے تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو ڈراؤں۔" اور جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [هود: ١٧] "اور تمام فرقوں میں سے جو بھی اس کا منکر ہو اس کے آخری وعدے کی جگہ جہنم ہے۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴾ "اور البتہ تم اس کی خبر اور راستی کو عن قریب جان لو گے۔" امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موت کے بعد۔[3] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی قیامت کے دن۔ ان دونوں قولوں میں کچھ تضاد نہیں ہے، کیوں کہ جو مرا تو وہ واقعی قیامت کے حکم میں داخل ہوا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا: "اے ابن آدم! موت کے وقت تجھ کو یقینی خبر آئے گی۔"[4] آخر سورة صٓ، ولله الحمد والمنة والله سبحانه وتعالیٰ أعلم كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان کو یہ خبر دیں کہ امرِ الٰہی کی اطاعت کی طرف بلانے سے اللہ کی مراد دنیائے فانی کا ساز و سامان نہیں۔ ﴿ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ﴾ میں ﴿ عَلَيْهِ ﴾ کی ضمیر تبلیغِ وحی کی طرف راجع ہے، حالاں کہ پہلے اس کا ذکر نہیں گزرا، لیکن یہ سیاق سے معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩٨)
[2] تفسير ابن كثير (٥٨/٤) [3] تفسير الطبري (٢٤٤/٢١) [4] تفسير ابن كثير (٥٧/٤، ٥٨)

کسی نے کہا ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا﴾ کی طرف راجع ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآن شریف کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "دَعَا إِلَى اللّٰهِ" کی طرف علی العموم۔ چنانچہ قرآن وغیرہ وحی کو شامل ہے اور رسول اللہ ﷺ کے قول کو۔ معنی یہ ہیں کہ تم سے طلب نہیں کرتا کہ تم اس پر مجھے کچھ مزدوری دو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿قُلْ﴾ "يَا مُحَمَّدُ" ﴿مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ﴾ "عَلٰى مَا أَدْعُوْكُمْ إِلَيْهِ" ﴿مِنْ اَجْرٍ﴾ "عَرَضِ الدُّنْيَا"[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿وَّمَاۤ اَنَاۡ مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ﴾ یعنی میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں کہ وہ شے کہوں جس کو جانتا نہیں ہوں۔ یا تم کو کسی ایسی چیز کی طرف بلاؤں جس کی طرف بلانے کا اللہ نے مجھے امر نہیں فرمایا۔ تکلف کہتے ہیں تصنع کو، یعنی میں ان میں سے نہیں ہوں جو بناوٹ کرتے ہیں، اس شے کے ساتھ جس کے وہ اہل نہیں ہیں، یہاں تک کہ نبوت کو اپنے اوپر باندھ لوں اور قرآن کو اپنی طرف سے بنا لوں۔

بخاری اور مسلم وغیرھما میں مسروق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شخص مسجد میں باتیں کر رہا تھا، اس اثنا میں اس نے اپنی باتوں میں کہا: ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ﴾ [الدخان: ۱۰] ''جبکہ آسمان ظاہر دھواں لائے گا۔'' کہ قیامت کے دن ایک دھواں ہوگا جو منافقوں کے کانوں کو اور آنکھوں کو پکڑ لے گا اور مومنوں کو زکام کی طرح پکڑے گا۔ کہا ہم کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ پر داخل ہوئے اور وہ اپنے گھر میں تھے اور تکیہ لگائے ہوئے تھے، وہ بیٹھ کر سیدھے ہو گئے۔ پھر فرمایا: لوگو! تم میں سے جو کوئی علم جانے تو اسے چاہیے کہ اسے بیان کرے اور جو نہ جانے تو چاہیے کہ کہے: "اَللّٰهُ أَعْلَمُ" بے شک یہ بات علم سے ہے کہ عالم جس شے کو نہ جانے تو کہے: "اَللّٰهُ أَعْلَمُ"۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا ہے: ﴿قُلْ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ﴾۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت فرمایا ہے: ہم تکلف سے منع کیے گئے۔[3] سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو منع کیا ہے کہ ہم مہمان کے لیے تکلف کریں۔[4] (أخرجه الطبراني و الحاكم والبيهقي)

قولہ تعالیٰ: ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ یعنی نہیں ہے یہ قرآن یا وحی یا وہ شے جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں مگر ذکر ہے اللہ عزوجل کی طرف سے جن و انس کے لیے جو عقلاء ہیں۔ ملائکہ نہیں، کیوں کہ ذکر سے مراد موعظت، تذکیرِ عواقب اور تخویف ہے اور یہ امور متکلفین ہی کے لیے مناسب ہیں۔ یہ لوگ فقط جن و انس ہیں، لہٰذا غور کرو۔ ﴿وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ﴾ یعنی اے کافرو! تم وعد و وعید وغیرہ کو جان لو گے جس کی خبر دی ہے۔ یا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۲٤۷) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤۹٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۷۹۸)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦۸٦۳)

[4] المعجم الكبير (۶/۲۳۵) مستدرك الحاكم (٤/۱۳۷) شعب الإيمان (۷/۹٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۳۹۲)

"دَعاَ إِلَى اللّٰهِ" کی خبر اور اس کی توحید کی اور جنت کی ترغیب اور نار سے تحذیر کی خبر ایک مدت کے بعد۔ امام قتادہ، زجاج اور فراء رحمہم اللہ نے کہا: موت کے بعد جان لو گے۔ امام عکرمہ اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا کہ روزِ قیامت کو۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کوئی باقی رہے گا تو اس کو جان لے گا، جب کہ اس کا امر غالب و عالی ہو گا اور جو مر جائے گا تو موت کے بعد اس کو جان لے گا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدر کے دن۔[1] کسی نے کہا کہ اسلام کے ظاہر ہونے اور پھیلنے کے وقت۔ اس آیت میں جو تہدید تھی وہ مخفی نہیں ہے۔[2] واللّٰہ سبحانه أعلم وعلمه أتم وأحكم.

الحمد لله والمنة کہ اس سورت کی تفسیر ظہر کے وقت بروز شنبہ (ہفتہ) ۴ ماہ صفر الخیر ۱۳۱۳ ہجری کو محلہ امیر گنج میں تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہٗ قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی توفیق دے اور ظاہری و باطنی صحت و عافیت عطا فرمائے۔ بلیاتِ ظاہری اور باطنی کو دفع فرمائے، مریضوں کو شفا دے، اسلام کا بول بالا کرے، حسنِ عواقب فرمائے۔

اللهم إنا نسألك العفو والعافية في الدين والدنيا، واغفرلنا وارحمنا و أنت خير الراحمين، وصلى الله على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه وأشياعه إلى يوم الدين، آمين، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين ظاهراً وباطناً.

---

[1] تفسير القرطبي (٢٣١/١٥) فتح القدير (٥٨٨/٤) [2] فتح البيان (٦٦/١٢_٧٣)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سُوْرَةُ الزُّمَرِ

اس کو سورۃ الغرف بھی کہتے ہیں۔ اس کی بہتر (۷۲) یا پچھتر (۷۵) آیتیں ہیں۔ امام حسن، عکرمہ اور جابر بن زید رحمہ اللہ کے قول میں یہ سورت مکی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۃ الزمر مکے میں نازل کی گئی۔ (أخرجه ابن الضريس وابن مردويه والبيهقي في الدلائل)۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اپنی ناسخ میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سورۃ الزمر مکے میں نازل ہوئی سوائے تین آیتوں کے کہ وہ مدینے میں اتریں جو سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کے بارے میں ہیں: ﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ﴾ سے لے کر ﴿ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ تک۔[2] دوسروں نے کہا: مگر سات آیتیں ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ ﴾ سے لے کر سات آیتوں تک۔

سورۃ الزمر کی فضیلت:

امام نسائی رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ ہم کہتے کہ آپ افطار کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم افطار کرتے، یہاں تک کہ ہم کہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھنے کا ارادہ نہیں رکھتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات سورت بنی اسرائیل اور سورۃ الزمر پڑھتے تھے۔[3] ترمذی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان الفاظ میں روایت کی ہے کہ « كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَنَامُ حَتّٰى يَقْرَأَ الزُّمَرَ وَبَنِيْ إِسْرَائِيْلَ » یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام نہ فرماتے یہاں تک کہ سورۃ الزمر اور سورت بنی اسرائیل کو نہ پڑھ لیتے۔[4] (كذا في فتح البيان وفتح القدير) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے صرف نسائی کی روایت ذکر کی ہے۔[5]

---

[1] تفسير القرطبي (۲۳۲/۱۵) [2] الدر المنثور (۲۱۱/۷)

[3] سنن النسائي الكبرىٰ، رقم الحديث (۱۰۵۴۸) مسند أحمد (٦٨/٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ۵۵۵/۲)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۲۰) فتح البيان (۷۵/۱۲) فتح القدير (٥٧٩/٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٤١)

[5] تفسير ابن كثير (٥٨/٤)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿1﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿2﴾ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ وَالَّذِيْنَ
اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى اِنَّ اللّٰهَ
يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ
كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿3﴾ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا
يَشَآءُ سُبْحٰنَهٗ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿4﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(یہ) اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے جو نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے ① بے شک ہم نے یہ کتاب آپ کی طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے، لہٰذا آپ اللہ کے لیے بندگی کو خالص کرتے ہوئے اسی کی عبادت کیجیے ② سنو! خالص اطاعت و بندگی اللہ ہی کے لیے ہے، اور جن لوگوں نے اس کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں، (وہ کہتے ہیں:) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں، یقیناً اللہ ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں، بے شک اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا، ناشکرا ہو ③ اگر اللہ چاہتا کہ کسی کو بیٹا بنائے تو ان میں سے جنھیں وہ پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا چن لیتا، لیکن وہ تو (ان باتوں سے) پاک ہے، وہ اللہ واحد ہے، بڑا زبردست ④

اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کا حکم اور شرک کا رد:

وہ بیٹیاں کیوں لیتا۔ چنی چیز لیتا، یعنی بیٹے۔ انتھیٰ۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ اس کتاب کا، یعنی قرآنِ عظیم کا اتارنا اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاس سے ہے، چنانچہ یہ وہ حق ہے جس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہے، جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿192﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿193﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿194﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ [الشعراء: ۱۹۲۔ ۱۹۵] ''اور بے شک وشبہہ یہ (قرآن) رب العالمین کا نازل فرمایا ہوا ہے۔ اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ آپ کے دل پر اترا ہے کہ آپ آگاہ کر دینے والوں میں سے ہو جائیں، صاف عربی زبان میں ہے۔'' نیز

فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴾ [حم السجدة: ٤١۔ ٤٢] ''یہ بڑی باوقعت کتاب ہے۔ جس کے پاس باطل پھٹک بھی نہیں سکتا نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، یہ ہے نازل کردہ حکمتوں والے خوبیوں والے (اللہ) کی طرف سے۔'' اِس جگہ اللہ جل و علا نے یوں فرمایا ہے: ﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴾ یعنی اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے، ایسا اللہ جس کی بارگاہِ عالی جاہ ہے، وہاں تک کسی کی گزر نہیں اور وہ اپنے اقوال وافعال وشرع وقدر میں حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اسی اکیلے کی عبادت کرو جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اسی طرف خلق کو بلاؤ اور ان کو بتا دو کہ عبادت صرف اسی اکیلے کے لیے لائق ہے اور اس کا نہ کوئی شریک ہے نہ کوئی مثل اور ضد ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ ﴾ یعنی وہ اعمال میں سے صرف اسی عمل کو قبول کرتا ہے جس میں اس کے عامل نے اللہ وحدہ لاشریک لہ کے لیے اخلاص کیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: گواہی دینا ہے لا الہ الا اللہ کی۔[1]

پھر اللہ عزوجل نے بتوں کے عابدین کی طرف سے خبر دی ہے جو مشرکوں میں سے ہیں کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ ہم کو اللہ پاک کے نزدیک والے درجے میں پہنچا دیں، یعنی ان کو یہی بات بتوں کے پوجنے کا باعث ہوتی ہے کہ انھوں نے بتوں کو فرشتوں کی صورتوں پر بنایا اپنے خیال کے مطابق، پھر ان صورتوں کو پوجا، اس لیے کہ اس پوجنے کو اس کے قائم مقام ٹھہرایا کہ وہ فرشتوں کو اس لیے پوجتے ہیں، تاکہ وہ ان کے لیے اللہ کے پاس سفارش کریں، ان کی مدد کرنے میں، روزی دینے میں اور دنیا کے کاموں میں جو اُن کو پیش آتے ہیں۔ رہی قیامت تو اس کے تو وہ منکر تھے۔

امام قتادہ، سدی اور مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم اور ابن زید رحمہ اللہ سے: ﴿ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے: تاکہ وہ ہمارے لیے سفارش کریں اور ہم کو اس کے پاس درجے کے لحاظ سے قریب کر دیں۔[2] اسی لیے جاہلیت کے دور میں وہ جب حج کرتے تو لبیک پکارنے میں یوں کہا کرتے تھے: "لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ" یہ وہی شبہہ ہے جس پر مشرکوں نے پرانے اور نئے زمانے میں اعتماد کیا ہے اور اللہ کے رسول ۔علیہم الصلاۃ و السلام۔ اس کی تردید لے کر آئے اور اس سے منع کیا اور اس طرف دعوت دی کہ عبادت اکیلے اللہ وحدہ لاشریک لہ کے لیے کی جائے۔ یہ ایک ایسی شے ہے جس کو مشرکوں نے اپنے جی سے نکالا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ تو اس کی اجازت دی ہے اور نہ اس سے راضی ہے، بلکہ اس کو مبغوض رکھا ہے اور اس سے منع فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ ﴾ [النحل: ٣٦] ''ہم

[1] تفسیر الطبري (٢١/٢٥١) [2] تفسیر الطبري (٢١/٢٥١، ٢٥٢)

نے ہر اُمت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو۔'' اسی طرح اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبیاء: ۲۵] ''تجھ سے پہلے بھی جو رسول ہم نے بھیجا اس کی طرف یہی وحی نازل فرمائی کہ میرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں پس تم سب میری ہی عبادت کرو۔'' اور یہ خبر دی ہے کہ جو فرشتے آسمانوں میں مقربین اور غیر مقربین ہیں وہ سب کے سب غلام ہیں، اللہ پاک کے لیے خضوع و عاجزی کرتے ہیں، اس کے پاس سفارش نہیں کرتے مگر اس کے اذن سے اور اس شخص کے لیے جس کو اس نے پسند کیا اور وہ اللہ سبحانہ کے پاس ایسے نہیں ہیں جیسے کہ بادشاہوں کے پاس ان کے امیر لوگ ہوتے ہیں، جو اُن کے پاس بغیر ان کے اذن کے سفارش کرتے ہیں، ایسے معاملے میں جس کو بادشاہ پسند کریں اور جس کا وہ انکار کریں، لہٰذا تم اللہ کے لیے مثالیں مت بیان کرو۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان باتوں سے نہایت درجہ بلند اور برتر ہے۔ کہاں وہ اور کہاں یہ کہاوتیں!

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴾ یعنی اللہ پاک خلائق کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا جس دن وہ لوٹ کر اس کے پاس جائیں گے اور ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴾ [سبا: ۴۰۔ ۴۱] ''اور ان سب کو اللہ اس دن جمع کر کے فرشتوں سے دریافت فرمائے گا کہ کیا یہ لوگ تمھاری عبادت کرتے تھے۔ وہ کہیں گے: تیری ذات پاک ہے اور ہمارا ولی تو تو ہے نہ کہ یہ، بلکہ یہ لوگ جنوں کی عبادت کرتے تھے، ان میں کے اکثر کا انھی پر ایمان تھا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴾ یعنی اللہ پاک اس شخص کو ہدایت کی طرف راہ نہیں بتاتا جس کا مقصد اللہ تعالیٰ پر جھوٹ اور افترا باندھنا ہے اور اس کا دل اس کی آیتوں اور حجتوں اور برہانوں کا انکاری ہے۔

پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان فرمائی کہ اس کی اولاد نہیں ہے، جیسا کہ جاہل مشرک لوگ ملائکہ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں اور یہود ونصاریٰ میں سے اللہ کے دشمن عزیر اور عیسیٰ علیہما السلام کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ﴾ یعنی اگر اللہ پاک اس کا ارادہ فرماتا تو بات ان کے زعم اور دعویٰ کے خلاف ہوتی۔ یہ ایک شرط ہے کہ نہ جس کا وقوع لازم آتا ہے نہ اس کا جواز، بلکہ وہ تو محال ہے، اس سے مقصود صرف ان کو ان کے زعم ودعویٰ میں جاہل بنانا ہے، جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ [الأنبیاء: ۱۷] ''اگر ہم یوں ہی کھیل تماشے کا ارادہ کرتے تو اسے اپنے پاس سے ہی بنا لیتے، اگر ہم کرنے والے ہی ہوتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴾ [الزخرف: ۸۱] ''آپ کہہ دیجیے! کہ اگر بالفرض رحمان کی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے عبادت کرنے والا

ہوتا۔“ یہ سب کچھ شرط کے قبیل سے ہے اور متکلم کے مقصد کے پیشِ نظر امرِ محال کے ساتھ مشروط قرار دینا بھی پر جائز ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ بلند وبالا اور پاک اور مقدس ہے اس بات سے کہ اس کی اولاد ہو، کیوں کہ وہ تو واحد، اَحد، فرد اور صمد ہے جس کے سامنے ہر شے غلام اور اس کی نیاز مند ہے اور وہ اپنے ماسوا سے بے نیاز ہے جس نے کہ اشیاء کو مغلوب کیا ہے تو وہ اس کے مطیع و فرماں بردار اور اس کے سامنے پست اور خاضع اور متواضع ہوئیں۔ تبارك و تعالیٰ عما يقول الظالمون والجاحدون علوا كبيرا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ ﴾ مرفوع ہے اس بنا پر کہ مبتداء محذوف کی خبر ہے جو اسم اشارہ ہے: ”أَيْ: هٰذَا تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ“ (امام فراء رحمہ اللہ نے بھی اس کو جائز رکھا ہے)۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مبتدائے مقدر لفظ ”هُوَ“ ہے، تا کہ ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰٤] کی طرف راجع ہو۔ گویا کسی نے کہا کہ یہ ذکر کیا شے ہے؟ تو اس کا یہ جواب دیا کہ ”هُوَ تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ... الخ“ کسی نے کہا کہ ﴿ تَنْزِيْلُ ﴾ مبتداء ہے اور اس کی خبر جار و مجرور ہے جو اس کے بعد ہے: ”أَيْ: تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ كَائِنٌ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ“ امام زجاج اور فراء رحمہما اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ امام فراء اور کسائی رحمہما اللہ نے یہ بھی جائز رکھا ہے کہ منصوب ہو بنا بر مفعول بہ واسطہ فعل مقدر کے۔ ”أَيْ: اِتَّبِعُوْا وَاقْرَءُوْا تَنْزِيْلَ الْكِتَابِ“ یعنی ﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ ﴾ کی پیروی کرو یا اس کو پڑھو۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نصب بنا بر اغرا بھی جائز ہے۔ ”أَيْ: اِلْزَمُوْا“ یعنی لازم پکڑو تنزیلِ کتاب کو۔ کتاب سے مراد قرآن شریف ہے۔[2] ﴿ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴾ پہلی وجہ کی بنا پر ﴿ تَنْزِيْلُ ﴾ کا صلہ ہے، یا خبر بعد خبر ہے، یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یا محذوف سے متعلق ہے اس بنا پر کہ وہ حال ہے۔ اسمِ اشارہ مقدر نے اس میں عمل کیا ہے: ”أَيْ: هٰذَا تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ كَائِنًا مِّنَ اللّٰهِ... الآية“ یعنی یہ کتاب کا اتارنا ہے درآں حالیکہ ہونے والا ہے اللہ کی طرف سے جو عزیز اور حکیم ہے۔ ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ﴾ حرفِ باء سببیہ ہے، انزال سے متعلق ہے، یعنی ہم نے تیری طرف کتاب اتاری بہ سبب حق کے اور اثبات اور اظہارِ حق کے سبب سے، یا بہ سبب داعیہ اور اقتضائے حق کے واسطے انزال کے، یا محذوف سے متعلق ہے جو فاعل سے حال ہے: ”أَيْ: مُتَلَبِّسِيْنَ بِالْحَقِّ“۔ یا حال ہے مفعول سے: ”أَيْ: مُتَلَبِّسًا بِالْحَقِّ“. حق سے مراد ہر وہ شے ہے جو کتاب میں ہے، یعنی اثباتِ توحید، نبوت، معاد اور انواعِ تکالیف۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”لَمْ نُنَزِّلْهُ بَاطِلًا لِغَيْرِ شَيْءٍ“[3] یعنی ہم نے اس کو بے کار اور بے فائدہ نہیں اتارا ہے، بلکہ اس میں دین و دنیا کے بے شمار فوائد ہیں۔

[1] تفسير ابن كثير (٥٨/٤، ٥٩) [2] تفسير القرطبي (٢٣٢/١٥) فتح القدير (٥٨٩/٤، ٥٩٠) [3] تفسير البغوي (١٠٤/٧)

اب رہی یہ بات کہ کتاب نازل کرنے کے مضمون کو دو جملوں میں ادا کیا اور کتاب کو دوبار ذکر کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تو کتاب منزل کی شان بیان کی کہ وہ اللہ پاک کی طرف سے اتاری گئی ہے، جو اپنے ملک میں عزت اور غلبے والا ہے اور اپنے کام میں حکیم ہے۔ اس کے بعد اس شخص کا بیان کیا جس پر وہ اتاری گئی اور اس شے کا جو اس پر واجب ہے۔ یا یوں کہو کہ اول تو کتاب کے لیے عنوان کی مثل ہے اور ثانیاً اس شے کے بیان کے لیے ہے جو کتاب میں ہے تو اب کچھ تکرار نہیں ہے۔ یا یوں کہو کہ کتاب ثانی سے مراد بعینہٖ وہی کتاب اول ہے۔ ضمیر کے بجائے جو اظہار کیا تو اس سے کتاب کی تعظیم کرنا اور اس کی شان کا مزید اعتنا و اہتمام کرنا ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے: ﴿ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ ﴾ میں تعظیم کی تکریر ہے، اس وجہ سے کہ اس کو ایک اور جملے میں ظاہر کیا ہے کہ اس کے انزال کی نسبت اس بات کی طرف کی جو اپنے نفس کی تعظیم کرنے والا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ ﴾ میں حرفِ فاء ماقبل پر مابعد کی ترتیب کے لیے ہے اور ﴿ مُخۡلِصًا ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے "اعبد" کے فاعل سے۔ اخلاص یہ ہے کہ بندہ اپنے عمل سے اللہ پاک کی ذات کا قصد کرے۔ دین بہ معنی عبادت و طاعت ہے اور عبادت کا بھید اللہ کی توحید ہے اور یہ کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے، یعنی جب کہ اللہ عزیز و حکیم کی طرف سے کتاب تیرے اوپر حق کے ساتھ اتاری گئی ہے، کون سا حق جو توحید کا اقرار ہے تو تو اللہ کی عبادت اس حال میں کر کہ تو عبادت کو شرک و ریا سے توحید کے ساتھ خالص اور پاک کرنے والا ہے اور اپنے دل کے سر، یعنی اندرونی حصے کو پاک کرنے والا ہے۔

آیت کریمہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ نیت واجب ہے اور اس کو ہر قسم کی ملونیوں سے خالص رکھنا چاہیے، کیوں کہ اخلاص کا تعلق امورِ قلبی سے ہے جو صرف اعمالِ قلب کے ساتھ ہوتے ہیں۔ سنتِ صحیحہ میں آیا ہے کہ کام کی اصل اقوال و افعال میں نیت ہے جس طرح کہ اس حدیث شریف میں ہے کہ « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ »[1] اور اس حدیث پاک میں ہے: « لَا قَوْلَ وَلَا عَمَلَ إِلَّا بِالنِّيَّةِ » جمہور نے ﴿ الدِّيۡنَ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿ مُخۡلِصًا ﴾ کا مفعول ہے اور امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے اس کے رفع سے پڑھا ہے، اس بنا پر کہ بطریقِ مجاز ﴿ مُخۡلِصًا ﴾ دین کی طرف مسند ہے۔[2] کسی نے کہا: امام ابن عبلہ رحمہ اللہ پر یہ بات لازم تھی کہ ﴿ مُخۡلِصًا ﴾ کو بہ فتحِ لام پڑھتے۔

جملہ ﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيۡنُ الۡخَالِصُ ؕ ﴾ مستانفہ ہے اپنے ماقبل کی تقریر و تاکید کرتا ہے، ماقبل میں یہی امر باخلاص کا ذکر ہے، یعنی جو دین شرک وغیرہ کی ملاوٹ سے خالص ہے، وہ اللہ پاک کے لیے ہے اور اس کے علاوہ جو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١)، صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧) [2] فتح القدير (٤/ ٥١٥)

دین ہیں وہ اللہ کے خالص دین نہیں ہیں، جس کا اس نے حکم دیا ہے۔ یزید رقاشی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم اپنے مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے تو کیا اس میں ہمارے لیے کوئی اجر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ صرف اسی شے کو قبول کرتا ہے جو خالص اس کے لیے کی گئی، پھر یہ آیت پڑھی۔[1] (أخرجه ابن مردويه) امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دین سے مراد اسلام ہے۔

جب اللہ پاک نے اخلاص کے ساتھ اپنی عبادت کا امر فرمایا اور دین خالص اس کے لیے ہے نہ کہ اس کے غیر کے لیے، تو شرک کا بطلان بیان کیا جو اخلاص کے مخالف ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ﴾ موصول سے مراد مشرکین ہیں اور اس کا محل رفع ہے مبتداء ہونے کی بنا پر، اس کی خبر ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ﴾ ہے اور جملہ ﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال بہ تقدیرِ قول اور استثناء مفرغ ہے اعم علل سے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ مشرک جنھوں نے خالص اللہ کے لیے عبادت نہیں کی، بلکہ اس کو غیر اللہ کی عبادت کے ساتھ ملایا، اس حال میں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کو تو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔ چنانچہ ﴿ زُلْفٰى ﴾ اسم ہے جو مقامِ مصدر میں لایا گیا ہے۔

﴿ نَعْبُدُهُمْ ﴾ میں ضمیر ان چیزوں کی طرف راجع ہے جن کو وہ پوجا کرتے تھے، یعنی ملائکہ، عیسیٰ اور عزیر علیہم السلام اور بت۔ ﴿ اَوْلِيَآءَ ﴾ سے یہی مراد ہیں۔ ﴿ زُلْفٰى ﴾ سے مراد شفاعت ہے، جیسا کہ امام واحدی رحمہ اللہ نے مفسرین سے نقل کیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت ان سے کہا جاتا کہ تمھارا رب و خالق کون ہے اور کس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور کس نے آسمان سے پانی اتارا؟ تو وہ کہتے کہ اللہ نے۔ پھر ان سے کہا جاتا کہ تم جو بتوں کو پوجتے ہو تو اس کا کیا مطلب ہے؟ تو وہ کہتے کہ ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں حقیقی طور پر اور ہمارے لیے اس کے پاس شفاعت کریں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کلام کا جواب سورۃ الاحقاف میں ہے: ﴿ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ﴾ [الأحقاف: ٢٨] ”پس قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے اللہ کے سوا جن جن کو اپنا معبود بنا رکھا تھا انھوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی۔“ سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام مجاہد رحمہ اللہ کی قراءت میں ”قَالُوْا مَا نَعْبُدُهُمْ“ ہے۔[2]

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مختلف دین والوں کے درمیان اس دین کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ توحید اور شرک کے ساتھ اختلاف کر رہے ہیں، کیوں کہ ہر گروہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حق اس کے پاس ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ہر ایک کو وہ جزا دے گا جس کا وہ مستحق ہے،

[1] الدر المنثور (٢١١/٧) [2] تفسير القرطبي (٢٣٣/١٥)

چنانچہ مومنوں کو تو جنت میں داخل کرے گا اور کافروں کو آگ میں ڈالے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بَيْنَهُمْ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ فیصلہ کرے گا دین کو خالص کرنے والوں اور ان لوگوں کے درمیان جنھوں نے دین کو خالص نہیں کیا۔ اول کو اس لیے حذف کیا کہ حال اس پر دال ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دونوں فریقوں کے باہم جھگڑنے والوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کو اپنے دین کی راہ نہیں بتاتا جو شخص اپنے اس دعوے میں جھوٹا ہے کہ الٰہ اس کو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں گے اور اس نے کفر کیا ہے اور نہ ہی ایسے شخص کو حق کی طرف راہ پانے کی توفیق دیتا ہے، کیوں کہ اس نے ان کو معبود ٹھہرایا ہے اور اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیا ہے، اس لیے کہ اس نے بصیرت کو گم کر دیا ہے اور وہ راہ یاب ہونے کے قابل نہیں، کیوں کہ گمراہی پر جمے رہنے سے اس نے اصل فطرت کو بگاڑ ڈالا ہے۔ ﴿ كَفَّارٌ ﴾ صیغۂ مبالغہ ہے اور اس بات پر دال ہے کہ ان لوگوں کا کفر انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ امام حسن اور اعرج رحمہ اللہ نے "كَذَّاب" کو ﴿ كَفَّارٌ ﴾ کی طرح صیغۂ مبالغہ سے پڑھا ہے۔ یہ قراءت سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[1] یہ جملہ حکم مذکور کی تعلیل ہے۔

جملہ ﴿ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ﴾ مشرکین کے اس قول کو باطل قرار دینے کی تاکید کرتا ہے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، اس لیے کہ یہ جملہ اس بات کو متضمن ہے کہ اللہ پاک کے لیے اولاد کا ہونا علی الاطلاق محال ہے۔ اگر اللہ چاہتا کہ اپنی اولاد کرے تو البتہ اولاد کا کر لینا حقیقتاً ممنوع ہوتا اور صرف اس طرح سے ممکن ہوتا کہ وہ اس شے میں سے چن لے جس کو پیدا کرتا ہے، یعنی اپنی تمام مخلوق میں سے جس شے کو چاہتا اسے پسند اور اختیار کر لیتا، کیوں کہ اس کے سوا کوئی موجود نہیں ہے مگر وہ اس کی مخلوق ہے اور یہ صحیح نہیں ہے کہ مخلوق خالق کی اولاد ہو، کیوں کہ وہ باہم ایک جنس کے نہیں ہیں۔ اب کچھ باقی نہیں رہا، مگر یہ کہ اس کو غلام کر کے چن لے جس طرح کہ اتخاذ کے بجائے "اصطفیٰ" سے تعبیر کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اگر وہ چاہتا کہ اپنی اولاد کر لے تو اس سے ایک شے واقع ہوتی جو اتخاذِ ولد سے نہ ہوتی، بلکہ وہ اپنی بعض مخلوقات میں سے چن لینا ہوتی۔

اسی لیے اللہ پاک نے اتخاذِ ولد سے علی الاطلاق اپنے نفسِ مقدس کو منزہ فرمایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَهٗ ﴾ یعنی اولاد کر لینے سے اس کی تنزیہ و تقدیس ہے۔ یہ تو ذاتی طور پر اپنی تنزیہ فرمائی۔ پھر صفاتی طور پر اپنی تنزیہ فرمائی تو فرمایا: ﴿ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ یعنی اس میں ساری صفاتِ کمال جمع ہیں اور وہ اپنی ذات میں اکیلا ہے، اس کا کوئی مماثل نہیں ہے، وہ اپنی ساری مخلوقات کا قاہر ہے اور جو ذات پاک ان صفات کی حامل ہے، اس کے لیے اولاد

---

[1] فتح القدير (٥٩١/٤)

کا وجود محال ہے، کیوں کہ اولاد اپنے والد کی مماثل ہوتی ہے، حالاں کہ اللہ پاک کا کوئی مماثل نہیں ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں قیاس استثنائی کی طرف اشارہ ہے، اس کا صغریٰ اور نتیجہ دونوں محذوف ہیں، دونوں کی تقریر یہ ہے: "لٰکِنَّهٗ لَمْ یَصْطَفِ فَلَمْ یُرِدِ اتِّخَاذَ الْوَلَدِ" یعنی اللہ پاک نے اتخاذِ ولد نہیں کیا۔ وہ غیر اللہ جن کے بارے میں مشرکوں نے کہا ہے کہ وہ ابن اللہ ہیں، وہ تین ہیں: ایک تو ملائکہ، دوسرے عیسیٰ علیہ السلام اور تیسرے عزیر علیہ السلام۔ اور ان کے ولد ہونے کے اقرار کی یہ نفی باقی تمام خلائق کو شامل ہے، چنانچہ اس نے اتخاذِ ولد نہیں کیا، اس پر غور کرو۔ پھر جب اللہ پاک نے یہ بات ذکر کی کہ وہ اولاد سے منزہ ہے، اس طرح کہ وہ الٰہ واحد قہار ہے تو اس کے بعد اپنی ان صفات کا ذکر کیا جو اس پر دال ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَى النَّهَارِ وَیُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ ۝۵ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶

اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا ہے، ہر ایک مقرر وقت تک چل رہا ہے، سنو! وہ نہایت غالب، بہت بخشنے والا ہے ⑤ اس نے تمھیں ایک ہی جان سے پیدا کیا، پھر اس نے اس سے اس کا جوڑا بنایا اور اس نے تمھارے لیے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے (نر اور مادہ) اتارے (پیدا کیے)، وہ تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے، ایک پیدایش (مرحلے) کے بعد دوسری پیدایش میں، تین قسم کے اندھیروں (پردوں) میں، یہ ہے اللہ تمھارا رب، اسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر تم کہاں پھرے (بہکے) جاتے ہو؟ ⑥

قدرتِ الٰہی اور توحیدِ باری تعالیٰ کے دلائل:

لپیٹتا ہے، یعنی ایک پر دوسرا چلا آتا ہے، کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ تین اندھیرے: ایک پیٹ، ایک رِحم اور ایک جھلّی۔ وہ جھلّی بچے کے ساتھ نکلتی ہے۔ انتھیٰ.

[1] فتح البیان (۸۱۔۷۷/۱۲)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ وہ ان چیزوں کا خالق ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو اُن کے درمیان ہیں اور وہ ملک کا مالک ہے، اس میں تصرف کرنے والا ہے، اس کی رات کو اور دن کو بدلتا رہتا ہے۔ تکویرِ لیل و نہار کے یہ معنی ہیں کہ ان کو کام میں لگا رکھا ہے، ایک دوسرے کے پیچھے چلتے رہتے ہیں، سستی نہیں کرتے، ان میں سے ہر ایک دوسرے کو تیز طلب کرتا رہتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''وہ شب سے دن کو ایسے طور پر چھپا دیتا ہے کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آلیتی ہے۔'' یہ اس قول کے معنی ہیں جس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم نے روایت کیا ہے۔[1] ﴿ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ایک مدت تک جو اللہ کے نزدیک معلوم ہے، پھر وہ قیامت کے دن پوری ہو جائے گی۔ ﴿ هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی عزت، عظمت اور کبریائی کے باوجود بڑا بخشنے والا ہے، اس شخص کو جس نے اس کی نافرمانی کی، پھر توبہ کی اور اس کی طرف رجوع ہوا۔

﴿ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ تمھاری جنسیں، صنفیں، زبانیں اور رنگ مختلف ہیں تم کو ایک نفس سے پیدا کیا، یعنی آدم علیہ السلام سے، پھر اسی سے اس کا جوڑ بنایا، یعنی حوا علیہا السلام، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ﴾ [النساء: ١] ''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ﴾ یعنی تمھارے لیے چوپایوں کی پشت سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ یہ وہی ہیں جو سورۃ الانعام میں مذکور ہیں: ﴿ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ مِّنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ﴾ [الأنعام: ١٤٣۔ ١٤٤] ''(پیدا کیے) آٹھ نر و مادہ، یعنی بھیڑ میں دو قسم اور بکری میں دو قسم آپ کہیے کہ کیا اللہ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو؟ یا اس کو جس کو دونوں مادہ پیٹ میں لیے ہوئے ہیں؟ تم مجھ کو کسی دلیل سے تو بتاؤ اگر سچے ہو۔ اور اونٹ میں دو قسم اور گائے میں دو قسم۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ ﴾ یعنی تم کو تمھاری ماں کے پیٹ میں ایک خلق کے بعد دوسری خلق میں مقدر کیا۔ تم میں سے جب کوئی پیدا ہوتا ہے تو پہلے نطفہ ہوتا ہے، پھر جما ہوا خون ہوتا ہے، پھر گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے، پھر پیدا کیا جاتا ہے تو گوشت اور ہڈیاں اور پٹھے اور رگیں ہو جاتی ہیں، پھر اس

[1] تفسیر الطبري (٢١/٢٥٣، ٢٥٤)

میں روح ڈالی جاتی ہے تو ایک اور خلق ہو جاتا ہے۔ ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ [المؤمنون: ١٤] ''برکتوں والا ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ﴾ یعنی رحم کے اندھیرے میں اور مشیمہ کی تاریکی میں۔ مشیمہ وہ جھلی ہے جو بچے پر لپٹی ہوتی ہے، اس کے پردے اور بچاؤ کے لیے اور پیٹ کے اندھیرے میں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مجاہد، عکرمہ، ابو مالک، ضحاک، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] ﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ﴾ یعنی یہ ذات جس نے آسمانوں کو اور زمین کو اور ما بینہما کو پیدا کیا اور تم کو اور تمھارے باپ دادوں کو بنایا، یہی رب ہے۔ اس کے واسطے ملک ہے اور غلبہ ہے، ان سب میں ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾، یعنی وہ ہے کہ لائق نہیں ہے عبادت مگر اسی وحدہ لا شریک لہ کے لیے۔ ﴿ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴾ یعنی پھر تم اس کے ساتھ اس کے غیر کو کیوں پوجتے ہو۔ تم اپنی عقلوں کو کہاں لے جاتے ہو؟![2]

لبیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اسی نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، یعنی ان کو باطل و بے کار اور بے فائدہ نہیں بنایا اور جس ذات پاک کی خلق ایسی عظیم ہو تو محال ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو یا اس کی جورو یا اولاد ہو۔ پھر آسمان و زمین میں اپنے تصرف کرنے کی کیفیت بیان کی۔ ارشاد فرمایا: ﴿ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ ﴾ لغت میں تکویر یہ ہے کہ بعض شے کا بعض پر ڈال دینا۔ جب کوئی شخص متاع وسامان کو ایک دوسرے پر ڈال دے تو محاورۂ عرب میں اس طرح کہیں گے کہ ''كَوَّرَ الْمَتَاعَ''۔ اسی معنی میں ''كَوَّرَ الْعِمَامَةَ'' ہے پس ''تکویر لیل علی النهار'' کے معنی رات کا ڈھانکنا ہے دن کو یہاں تک کہ اس کی روشنی جاتی رہے اور ''تکویر نهار علی الیل'' کے معنی دن کا رات کو ڈھانکنا ہے یہاں تک کہ اس کی تاریکی چلی جائے اور اس آیت کے یہی معنی ہیں: ﴿ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ﴾ [الأعراف: ٥٤]۔ قتادہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔[3]

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ڈالتا ہے رات کو دن پر اور دن کو رات پر۔[4] یہ معنی قولِ اول کے قریب ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ رات سے جو کم ہوا، وہ دن میں داخل ہوا اور جو دن سے کم ہوا وہ رات میں داخل ہوا۔ یہی معنی اس آیت کے ہیں: ﴿ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ﴾ [الفاطر: ١٣] ''وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔'' زیادہ سے زیادہ نو گھڑیاں کم ہوتی ہیں اور انتہائی اضافہ پندرہ گھڑی کا ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: ''هٰذَا يَكُرُّ عَلٰى هٰذَا وَهٰذَا يَكُرُّ عَلٰى هٰذَا كُرُوْرًا مُتَتَابِعَةً'' یعنی رات حملہ کرتی ہے دن پر اور دن حملہ کرتا ہے رات پر پے در پے حملہ کرنا۔ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تکویرِ شے اسی کی ادارت ہے،

---

① تفسير الطبري (٢١/٢٥٨، ٢٥٩) ② تفسير ابن كثير (٤/٦٠)
③ تفسير الطبري (٢١/٢٥٣) ④ تفسير القرطبي (١٥/١٣٤)

یعنی اس کا گردش دینا اور اس کے بعض کو بعض پر کور العمامہ کی طرح ملانا۔[1] انتھیٰ. یعنی جس طرح پگڑی کے پیچ ایک دوسرے پر ملائے جاتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "تکویر"، "لف و لیّ" ہے یعنی لپیٹنا اور موڑنا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ يُكَوِّرُ ﴾ کی تفسیر "يَحْمِلُ" کی ہے۔[2] بالجملہ یہ تکویر جو اس آیت میں مذکور ہے اس سے سورج کے اپنے مطلعوں میں چلنے کا اشارہ کیا ہے اور رات اور دن کا گھٹنا اور بڑھنا۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نور اور ظلمت دو بڑے لشکر ہیں اور ہر دن ایک دوسرے پر غالب ہوتا ہے۔[3]

پھر اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ اس نے سلطانِ نہار اور سلطانِ لیل کو مسخر کیا ہے، مراد سورج اور چاند ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ﴾ یعنی اس نے دونوں کو اپنے حکم کا مطیع و فرماں بردار کیا ہے اور وہ بندوں کے فائدے کے لیے طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ پھر اس مسخر کرنے کی کیفیت بیان فرمائی کہ ان کو کس طرح مسخر کیا، فرمایا: ﴿ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ یعنی ہر ایک اپنے فلک میں چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ دن تمام ہو جائے اور یہ قیامت کا دن ہے۔ ﴿ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ پر پوری طرح سے گفتگو سورت یٰسین میں گزر چکی ہے۔[4] ﴿ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴾ کلمۂ ﴿ اَلَا ﴾ حرفِ تنبیہ ہے بہ معنی آگاہ و ہوشیار باش۔ اس جملے کو اس کے ساتھ اس لیے شروع کیا ہے کہ منظور جملۂ مذکورہ کے مضمون کا کمال اہتمام اور خیال کرنا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اے بندو! ہوشیار ہو جاؤ، خوابِ غفلت سے جاگو۔ چنانچہ اللہ وہی ہے غالب اور اپنی خلق کے گناہوں کو اپنی مغفرت کے ساتھ چھپانے والا ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنی عجیب و غریب قدرت اور صنعت سے ایک اور قسم بیان کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا ﴾ نفس سے مراد آدم علیہ السلام اور زوج سے مراد حوا علیہا السلام ہیں۔ کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ ذکر فرمایا، تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ حوا کا پیدا کرنا مترتب ہے آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے پر اور وہ اس سے متراخی ہے، یعنی بعد میں آئی ہیں، کیوں کہ وہ آدم علیہ السلام سے پیدا کی گئی ہیں اور عطف یا تو مقدر پر ہے اور وہ نفس کی صفت ہے۔ امام فراء اور زجاج رحمہما اللہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: "خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ، خَلَقَهَا وَاحِدَةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا"[5] یعنی تم کو ایک نفس سے پیدا کیا ایسا نفس کہ اس کو ایک پیدا کیا، پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ وَّاحِدَةٍ ﴾ کے معنی پر عطف ہو۔ "أَيْ: مِنْ نَفْسٍ اِنْفَرَدَتْ بِالْإِيْجَادِ ثُمَّ جَعَلَ... الخ"

رہی یہ بات کہ ﴿ ثُمَّ ﴾ کے عطف کے ساتھ "خَلَقَ" کو لفظ ﴿ جَعَلَ ﴾ سے ادا کیا اور لفظ "خَلَقَ" نہ فرمایا؟ تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ حوا علیہا السلام کو پیدا کرنے کے لیے آدم علیہ السلام کی پسلی سے زیادہ تر اس میں دخل ہے کہ

---

(1) مفردات ألفاظ القرآن (٣٢٤/٢) (2) تفسیر الطبري (٣٢٤٨/٢١) (3) تفسیر الرازي (٢١٣/٢٦)
(4) رقم الآية (٣٨) (5) فتح القدير (٥٩٢/٤)

کمالِ قدرت پر ایک واضح ظاہر نشانی ہو، کیوں کہ آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا تو اللہ پاک کی عادت پر ہے جو اس مخلوق میں مستمر ہے اور بی بی حوا کا صفتِ مذکور پر پیدا کرنا ایسا نہیں ہے کہ اس کے ساتھ عادت جاری ہو، اس لیے کہ اللہ پاک نے ان کے سوا کسی عورت کو کسی مرد کی پسلی سے پیدا نہیں کیا۔ اس کی تفسیر سورۃ الاعراف میں پورے طور پر گزر چکی ہے۔[1] پھر اللہ پاک نے اپنی قدرتِ باہرہ اور افعالِ قاہرہ، جو اس پر دال ہیں اور جن کا ذکر ہوا، میں سے ایک اور نوع بیان کی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ﴾

یہ جملہ ﴿ خَلَقَكُمْ ﴾ پر معطوف ہے۔ ﴿ الْاَنْعَامِ ﴾ کے پیدا کرنے کو ﴿ اَنْزَلَ ﴾ کے پیرائے میں اس لیے ادا فرمایا کہ اس طرح مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انعام کو جنت میں پیدا کیا، پھر ان کو زمین کی طرف اتارا۔ چنانچہ اس صورت میں انزال حقیقتاً ہوگا جس طرح کہ اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ ﴾ [الحدید: ۲۵] ''اور ہم نے لوہے کو اتارا جس میں سخت ہیبت وقوت ہے۔'' اس لیے کہ آدم علیہ السلام جس وقت زمین کی طرف اتارے گئے تو لوہا اُن کے ساتھ نازل کیا گیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انعام کی طرف انزال کی نسبت مجازاً ہو، اس لیے کہ چوپائے چونکہ نبات کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور نبات کی زندگی اسی پانی سے ہوتی ہے اور پانی آسمان سے اتارا جاتا ہے تو چوپائے گویا آسمان سے اتارے گئے، کیوں کہ ان کے ہونے کا سبب آسمان سے اتارا گیا ہے۔ اس قسم کی تعبیر کو تدریج کہتے ہیں۔ اسی باب سے یہ آیت ہے: ﴿ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا ﴾ [الأعراف: ۲٦] ''ہم نے تمھارے لیے لباس پیدا کیا۔'' اور جس طرح اس شعر میں سبب پر اطلاق کیا ہے:

إِذَا نَزَلَ السَّمَاءُ بِأَرْضِ قَوْمٍ   رَعَيْنَاهُ وَإِنْ كَانُوا غِضَابًا

چونکہ نبات کا سبب پانی ہے، اس لیے رعی کی نسبت پانی کی طرف کر دی ہے، حالاں کہ مراد گھاس کا چرانا ہے نہ کہ پانی کا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَنْزَلَ ﴾ بہ معنی ''أَنْشَأَ وَجَعَلَ'' ہے۔ یا بہ معنی ''أَعْطٰی'' ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خلق کو انزال قرار دیا، اس لیے کہ خلق جو ہوتی ہے تو ایک امر کے سبب سے ہوتی ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ ﴿ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ﴾ وہی ہیں جو آیتِ انعام میں مذکور ہیں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اثنین سے مراد چاروں جگہ نر اور مادہ ہیں۔ ''زوج'' وہ شے ہے جس کے ساتھ دوسرا اسی جنس کا ہو جو اس کے ساتھ مزاوجت کرے اور دونوں سے نسل آگے چلے۔ چنانچہ لفظ زوج مفرد پر بولا جاتا ہے، جبکہ اس کے ساتھ دوسرا اسی جنس کا ہو جو اس سے جدا ہونے والا نہ ہو اور ان سے نسل حاصل ہو اور اسی طرح لفظ ''زوج'' اثنین پر بھی بولا جاتا ہے، چنانچہ وہ مشترک ہے اور اس جگہ مراد اطلاقِ اول ہے۔ اس آیت کی تفسیر سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے اپنی قدرتِ تخلیق سے ایک اور قسم کا ذکر کیا۔ ارشاد فرمایا: ﴿ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ﴾

[1] رقم الآیة (۱۸۹)   [2] رقم الآیة (۱٤۳)

حمزہ نے اس کو بہ کسرِ ہمزہ ومیم پڑھا ہے اور کسائی رحمہ اللہ نے بہ کسرِ ہمزہ وفتحِ میم پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ ضمِ ہمزہ و فتحِ میم پڑھا ہے۔[1] یعنی اللہ پاک تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے، اس پیدایش کو انسان کے ساتھ خاص کیوں کیا، حالاں کہ اس میں تو انسان وحیوان دونوں مشترک ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عاقل کو غیر عاقل پر تغلیب دی ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ انسان کو باقی خلق پر شرف حاصل ہے۔ ﴿ خَلْقًا ﴾ فعل مذکور کا مصدر مؤکد ہے۔ ﴿ مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ ﴾ اس کی صفت ہے: ''أَيْ: خَلْقًا كَائِنًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ'' یعنی پیدا کرتا ہے تم کو ایسا پیدا کرنا کہ وہ ایک مرحلے کے بعد دوسرے مرحلے کو پیدا کرنا ہے۔ امام قتادہ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نطفہ پھر علقہ پھر مضغہ پھر عظم پھر لحم۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم کو تمھاری ماؤں کے شکموں میں پیدا کیا، تمھیں آدم علیہ السلام کی پشت میں پیدا کرنے کے بعد۔[2]

﴿ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ﴾ یعنی تین تاریکیوں میں۔ امام مجاہد وغیرہ کا قول گزر چکا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشیمہ کی تاریکی اور رحم کی تاریکی اور رات کی تاریکی۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مرد کی پشت کی تاریکی اور عورت کے شکم کی تاریکی اور رِحم کی تاریکی۔[3] رِحم تو بدن کے اندر ہے اور مشیمہ رحم کے اندر ہے۔ امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شے میں بچہ ہوتا ہے اس کو مشیمہ، غلاف اور کیس کہتے ہیں۔ مشیمہ کی جمع مشیم بہ خدفِ ہاء و مشایم آتی ہے۔ غیرِ انسان کی مشیمہ کو سلی کہتے ہیں۔ جملہ ﴿ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ﴾ مستانفہ ہے، اس سے مقصد انسان کی پیدایش کے مختلف مراحل کا بیان کرنا ہے جو اس پیدایش کے عمل میں شامل ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ ﴾ اللہ پاک کی طرف اس کے افعالِ سابقہ کے اعتبار سے اشارہ ہے اور اسم شریف ﴿ اللّٰهُ ﴾ اس کی پہلی خبر ہے اور ﴿ رَبُّكُمْ ﴾ دوسری خبر اور ﴿ لَهُ الْمُلْكُ ۭ ﴾ تیسری خبر اور ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ ﴾ چوتھی خبر۔ یعنی یہ ذات پاک جس کے افعالِ بدیعہ کا ذکر ہوا اللہ ہی ہے جو تمھارا پروردگار ہے۔ دنیا اور آخرت میں حقیقی بادشاہت اسی کی ہے، اس میں کسی طرح بھی اس کا غیر شریک نہیں ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

﴿ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴾ یعنی جب وہ ان صفات کے ساتھ موصوف ہے تو پھر تم اس کی عبادت سے کیوں پھرتے ہو اور اس کے غیر کی عبادت کی طرف رجوع کیوں ہوتے ہو۔ یا یہ معنی ہیں کہ پھر تم ایسے شافی وکافی بیان کے بعد راہِ حق سے کیوں پھیرے جاتے ہو۔ جب کہ اللہ پاک نے ان نعمتوں کا ذکر کیا جن کا اس نے اپنے بندوں پر انعام فرمایا اور اپنی بدیع تخلیق اور عجیب فعل سے ان کے لیے وہ کام بیان کیے جو ہر عاقل پر اس بات کو واجب کرتے ہیں کہ اس پر ایمان ہی لے آئے تو اس کے بعد یہ دھمکی دی اور اپنی بے نیازی بیان فرمائی:[4]

[1] تفسير القرطبي (١٥/٢٣٦) [2] تفسير الطبري (٢١/٢٥٧، ١٥٨) [3] تفسير القرطبي (١٥/٢٣٦) [4] فتح البيان (١٢/٨١-٨٤)

إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنكُمْ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۞ وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِن قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَندَادًا لِّيُضِلَّ عَن سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ۞

اگر تم کفر کرو گے تو اللہ یقیناً تم سے بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو گے تو وہ اسے تمھارے لیے پسند کرتا ہے اور کوئی بوجھ اُٹھانے والی (جان) دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گی، پھر تمھیں اپنے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے، تو وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے، بلاشبہ وہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے⑦ اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہوئے اسے پکارتا ہے، پھر جب وہ اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو وہ اس سے پہلے جو دعا کیا کرتے تھے اسے بھول جاتا ہے اور اللہ کے لیے شریک ٹھہراتا ہے، تاکہ اس کے راستے سے (لوگوں کو) بہکائے، آپ کہہ دیجیے: تو اپنے کفر کے ساتھ کچھ (دنیاوی) فائدہ اُٹھالے، بلاشبہ تو دوزخیوں میں سے ہے⑧

اللہ تعالیٰ کفر سے ناراض اور شکر سے راضی ہوتا ہے:

اللہ پاک اپنی ذاتِ مقدس کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ وہ اپنے ماسوا مخلوقات سے غنی اور بے نیاز ہے، جیسے موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ إِن تَكْفُرُوا أَنتُمْ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴾ [إبراهيم: ٨] ''اگر تم سب اور روئے زمین کے تمام انسان اللہ کی ناشکری کریں تو بھی اللہ بے نیاز اور تعریفوں والا ہے۔'' صحیح مسلم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندو! اگر تمھارے پہلے اور تمھارے آخری اور تمھارے سب انسان اور تمھارے جن تم میں سے سب سے زیادہ فاجر شخص کی طرح ہو جاتے تو یہ میرے مُلک میں سے ذرہ برابر کسی شے کو کم نہ کرتا۔[1]

﴿ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے لیے نہ تو کفر کو پسند کرتا ہے اور نہ ہی اس کا امر فرماتا ہے۔ ﴿ وَإِن تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ ﴾ یعنی اگر تم شکر کرو گے تو اس کو وہ تمھارے لیے پسند کرے گا اور

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧)

تمھیں اپنے فضل وکرم سے زیادہ دے گا۔ ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ یعنی کوئی نفس کسی اور نفس کے بوجھ میں سے کچھ نہ اٹھائے گا، بلکہ ہر کوئی اپنے نفس کے کام کے بارے میں ہی پوچھا جائے گا۔ ﴿ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس سے کوئی پوشیدہ شے بھی مخفی نہیں ہے۔

﴿ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ انسان حاجت کے وقت تضرع و زاری کرتا ہے اور اللہ وحدہ لا شریک لہ سے فریاد رسی چاہتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٧] ''اور سمندروں میں مصیبت پہنچتے ہی جنھیں تم پکارتے تھے سب گم ہو جاتے ہیں صرف وہی اللہ باقی رہ جاتا ہے۔ پھر جب وہ تمھیں خشکی کی طرف بچالاتا ہے تو تم منہ پھیر لیتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔'' اسی لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ ﴾ یعنی راحت و آسودگی کی حالت میں اس دعا اور تضرع کو بھول جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَاۗىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ ﴾ [يونس: ١٢] ''اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے لیٹے ہوئے بھی، بیٹھے، کھڑے بھی۔ پھر جب ہم اس کی تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے اپنی تکلیف کے لیے جو اسے پہنچی تھی کبھی ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ﴾ یعنی عافیت کی حالت میں اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے اور اس کے لیے انداد (شریک) ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ جس شخص کا یہ حال اور طریقہ ہے اس سے یوں کہہ دے کہ ﴿ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ڰ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ﴾ یہ ایک سخت قسم کی ڈانٹ اور وعید ہے، جیسا کہ اللہ سبحانہ نے فرمایا: ﴿ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴾ [إبراهيم: ٣٠] ''آپ کہہ دیجیے کہ خیر مزے کر لو تمھاری بازگشت تو آخر جہنم ہی ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴾ [لقمان: ٢٤] ''ہم انھیں گو کچھ یونہی سا فائدہ دے دیں لیکن (بالآخر) ہم انھیں نہایت بے چارگی کی حالت میں سخت عذاب کی طرف ہنکا لے جائیں گے۔''[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اگر تم کفر کرو گے تو بے شک اللہ تم سے غنی ہے، یعنی وہ تمھارا محتاج نہیں ہے، نہ تمھارے ایمان کا اور نہ اس بات کا کہ تم اس کی عبادت کرو، اس لیے کہ وہ تو غنیِ مطلق ہے۔ باوجود اس کے کہ کافر کا

---

[1] تفسير ابن كثير (٦١/٤)

کفر اسے ضرر نہیں دیتا جس طرح کہ مومن کا ایمان اسے نفع نہیں دیتا، پھر بھی وہ اپنے بندوں میں سے کسی کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا اور نہ اس کو محبوب رکھتا ہے اور نہ اس کا حکم دیتا ہے اور نہ اس کے ساتھ راضی ہوتا ہے، اس طرح سے کہ اس بات کی اجازت دے اور اس پر قرار پذیر رکھے اور اس کے کرنے والے کو ثواب دے اور اس کی تعریف کرے، بلکہ اس کے ساتھ ناراضی اختیار کرنے والے کی طرح سلوک کرتا ہے، اس طرح سے کہ اس سے منع فرماتا ہے اور اس پر مذمت کرتا ہے اور اس کے کرنے والے کو سزا دیتا ہے، اگرچہ وہ اس کے ارادے سے ہے، کیوں کہ کوئی شے اس کے ارادے سے خارج نہیں ہوتی۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے کفر کو جو ناپسند فرمایا ہے تو وہ اُن کے فائدے کے لیے اور اپنی رحمت سے ان سے ضرر کو دور کرنے کے لیے ہے، نہ کہ اس لیے کہ اس سے اسے کوئی ضرر پہنچتا ہے۔[1] انتھی. مفسرین نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ آیت عام ہے اور کفر اللہ پاک کو کسی حال میں پسند نہیں ہے، چنانچہ ظاہر یہی ہے۔ یا آیت خاص ہے اور معنی یہ ہیں کہ اپنے مومن بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حبرِ اُمت تخصیص کی طرف گئے ہیں اور امام عکرمہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہما نے اس پر ان کی متابعت کی ہے۔[2]

پھر اس آیت میں ایک اور اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ ایک قوم نے کہا ہے کہ اللہ پاک کافر کے کفر کا ارادہ کرتا ہے اور اس کو پسند نہیں کرتا ہے۔ دوسروں نے کہا ہے کہ نہ اس کا ارادہ کرتا ہے نہ اس کو پسند فرماتا ہے۔ اس قسم کے امر کی تحقیق کے بارے میں بہت طویل گفتگو ہے۔ جو لوگ اس آیت کی تخصیص کے قائل ہیں اور عدمِ رضا کے ساتھ ارادے کو ثابت کہتے ہیں، انھوں نے اس بات سے استدلال کیا ہے جو قرآن شریف کی بہت سی آیتوں میں ثابت ہوئی ہے کہ اللہ پاک گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ [التكوير: ٢٩] ''اور تم بغیر پروردگارِ عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔'' اور اس جیسی بہت سے آیتیں قرآن شریف میں ہیں جو اس کے معنی کی تائید کرتی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے، یعنی وہ کفار جن کے بارے میں اللہ پاک نے یہ ارادہ نہیں کیا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے کہ وہ ''لا إله إلا الله'' کہیں۔

پھر فرمایا: ﴿ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ﴾ یہ اس کے مخلص بندے ہیں جن کے حق میں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ﴾ [الحجر: ٤٢] ''میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ نہیں۔'' پس ان کو ''لا إله إلا الله'' کی گواہی دینا لازم کر دیا اور اس کو ان کی طرف محبوب کر دیا۔[3] (أخرجه ابن جرير) پس کلمۂ ''عباد'' لفظ میں عام اور

---

(1) تفسير أبي السعود (٧/٢٤٤) (2) تفسير الطبري (٢١/٢٦٠) (3) تفسير الطبري (٢١/٢٦٠)

معنی میں خاص ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ ﴾ [الدھر: ٦] ''وہ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پئیں گے۔'' مراد بعض بندے ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: اپنے مسلمان بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: واللہ! نہیں پسند کیا اللہ نے اپنے کسی بندے کے لیے اس کی نماز کو اور نہ اس کو اس کے ساتھ امر کیا اور نہ اس کی طرف بلایا، لیکن تمھارے لیے اپنی اطاعت کو پسند کیا اور تم کو اپنی معصیت سے منع کیا۔[1]

پھر جب اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا تو یہ بیان کیا کہ وہ ان کے لیے شکر کو پسند کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ﴾ یعنی اگر تم شکر کروگے تو تمھارے شکر کو پسند کرے گا جس پر ﴿ وَاِنْ تَشْكُرُوْا ﴾ سے دلالت کی گئی ہے، یعنی وہ شکر کرنے پر تم کو ثواب دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے شکر کو صرف اس لیے پسند فرمایا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت میں ان کی سعادت کا سبب ہے، جیسے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ﴾ [إبراھیم: ٧] ''اگر تم شکر گزاری کروگے تو بے شک میں تمھیں زیادہ دوں گا۔'' نہ اس لیے کہ اس میں اس کا کچھ فائدہ ہے۔ امام ابو جعفر وغیرہ (یعنی ابو عمرو، شیبہ اور ہبیرہ عن عاصم)، نے بہ اسکانِ ہاء ﴿ يَرْضَهْ ﴾ پڑھا ہے اور ابن ذکوان وغیرہ (یعنی ابن کثیر، کسائی، ابن محیصن، ورش عن نافع) نے ہاء پر اشباعِ ضمہ کیا ہے اور باقی قراء نے اختلاس کیا ہے۔[2] یہ سب قراءتیں سبعیہ ہیں۔

پھر یہ بات بیان فرمائی کہ کافر کا کفر کسی اور میں بالکل سرایت نہیں کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ یعنی کوئی اٹھانے والا نفس کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اس آیت کی تفسیر پورے طور پر پہلے گزر چکی ہے۔ پھر تہدیدِ شدید فرمائی: ﴿ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی پھر تمھارا لوٹنا تمھارے رب کی طرف ہے اور وہ تم کو اس خیر و شر کی خبر دے گا جو تم کرتے تھے۔ پھر اس خبر دینے کی وجہ یہ ذکر فرمائی کہ ﴿ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ یعنی وہ تم کو تمھارے اعمال کی خبر دے گا، اس لیے کہ وہ تو اس شے کو جانتا ہے جس کو دل چھپاتے ہیں، پھر وہ اس کو کس طرح نہ جانے گا جس کو ظاہر کرتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ اس کے نزدیک ظاہر اور مخفی برابر ہے۔

پھر اللہ پاک نے کافر کے تذبذب کا ذکر فرمایا: ﴿ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ﴾ انسان سے مراد کافر ہے اور ﴿ ضُرٌّ ﴾ سے مراد کوئی سی ایذا اور تکلیف ہے، کیوں کہ لفظ ﴿ ضُرٌّ ﴾ مطلق، یعنی نکرہ ہے، اس کو کسی خاص چیز کے ساتھ مقید کرنا صحیح نہیں۔ ﴿ مَسَّ ﴾ اعراض میں مجاز ہے اور ﴿ اِذَا ﴾ کا جواب ﴿ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ﴾ ہے، یعنی جس وقت کافر آدمی کو کوئی ضرر پہنچے، اس کے جسم میں یا مال میں یا اہل میں یا

---

[1] الدر المنثور (٢١٣/٧) [2] تفسیر القرطبي (٢٣٧/١٥)

اولاد میں، وہ کوئی آزمائش ہو یا مرض ہو یا فقر یا خوف یا شدت اور سختی ہو تو اپنے رب کی طرف رجوع ہو کر اسے پکارتا ہے اور اس بلا کو دور کرنے میں جو اس پر نازل ہوئی، اسی سے فریاد رسی چاہتا ہے اور جس مردے یا زندے یا بت وغیرہ کو پہلے پکارتا تھا اور راحت و آرام کی حالت میں اس سے فریاد رسی چاہتا تھا، اس کو چھوڑ دیتا ہے، اس لیے کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ یہ سب اس کے ''ضُرّ'' کو دور نہیں کر سکتے۔

﴿ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ ﴾ جب کوئی شخص کسی شخص کو کسی شے کا مالک کر دے تو محاورے میں اس طرح بولتے ہیں: ''خَوَّلَهُ الشَّيْءَ'' یعنی اس نے اس کو اس شے کا مالک کر دیا۔ تخویل کا استعمال جزاء میں نہیں کیا جاتا، بلکہ ابتدائے عطیہ میں کیا جاتا ہے، یعنی پھر جب اس کو اپنی کوئی نعمت عطا کرے اور اس کو اس کا مالک بنائے تو پھر اس ضر کو بھول جائے جس کو دور کرنے کے لیے اس سے پہلے اللہ کو پکارتا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس دعا کو بھول جائے جس کے ساتھ تضرع وزاری کیا کرتا تھا، یا اپنے رب کو بھول جائے جس کی طرف تضرع کرتا تھا۔ پھر اس سے شرک باللہ کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ یہ معنی ہیں اس قول کے: ﴿ وَجَعَلَ لِلّٰهِ أَنْدَادًا ﴾ یعنی بتوں یا غیر بتوں میں سے اللہ کے لیے شریک بنائے اور ان کو پوجے اور ان سے فریاد رسی چاہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگوں میں سے انداد مراد ہیں[1] کہ اپنے سارے کاموں میں ان پر بھروسا کرے۔

﴿ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ﴾ یعنی تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ یعنی اسلام اور توحید سے بہکائے۔ جمہور نے بہ ضمِ یاء اور ابن کثیر و ابو عمرو رحمہما اللہ نے بہ فتحِ یاء پڑھا ہے۔[2] یہ دونوں قراءتِ سبعیہ میں سے ہیں اور حرفِ لام عاقبت کے لیے ہے۔ یعنی چوں کہ خود گمراہ ہونا یا دوسروں کو گمراہ کرنا دونوں اس کے انداد ٹھہرانے کا نتیجہ تھے، اس لیے اس کی تعلیل ان دونوں کے ساتھ ٹھیک ہوگئی، اگرچہ غرض وہ نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کام کے انجام کی تشبیہ علتِ غائی سے دی گئی جو فعل کے لیے ہوتی ہے، اس بات میں کہ علتِ غائی فعل پر ترتیب دی جاتی ہے۔ چنانچہ فعل کے انجام میں لامِ علت کا استعمال کیا گیا استعارۂ تبعیہ کے طور پر، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ﴾ [القصص: ۸] ''آخر فرعون کے لوگوں نے اس بچے کا اٹھا لیا کہ آخر کار یہی بچہ ان کا دشمن ہوا اور ان کے رنج کا باعث بنا۔'' اسی طرح یہاں پر ہے کہ بت پوجنے والوں نے بتوں کو اللہ پاک کا شریک اس لیے نہیں ٹھہرایا تھا کہ خود گمراہ ہوں یا دوسروں کو گمراہ کریں، لیکن چوں کہ اس کام کا انجام یہی ہوا تو گویا ان کو اسی لیے شریک ٹھہرایا تھا۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ جس شخص کی یہ صفت ہے اس کو یہ دھمکی سنائیں: ﴿ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ﴾ ''أَيْ: تَمَتُّعًا قَلِيْلًا أَوْ زَمَانًا قَلِيْلًا'' یعنی برت لے (فائدہ اٹھا لے) اپنے کفر کے ساتھ تھوڑے

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۲٦٤) [2] فتح القدير (٤/٥٩٥)

دنوں کا فائدہ، کیوں کہ دنیا کا فائدہ تو قلیل ہی ہے، گو ہزار برس ہی کی عمر کیوں نہ ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ الفاظ تو امر کے ہیں اور اس کے معنے دھمکی اور وعید کے ہیں۔[1] اس میں اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ کفر ایک طرح کی تشہی (چاہت) ہے جس کی کوئی سند نہیں ہے۔ اس لیے کہ کفر میں مشغول رہنے کو جب تمتع کے پیرائے میں ادا کیا اور تمتع اس شے کے ساتھ نفع لینے کو کہتے ہیں جس کو نفس چاہتا ہے تو معلوم ہوا کہ کفر صرف ایک دل کی چاہت ہے اور کچھ نہیں۔

اس آیت کا ایک مقصد کافروں کو آخرت میں کسی قسم کا تمتع اٹھانے سے نا امید کرنا ہے، اسی لیے اس کی یہ علت بیان فرمائی: ﴿ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ﴾ بر طریقِ استیناف مبالغے کے لیے، یعنی تیرا جانا اور لوٹنا تو عن قریب آگ کی طرف ہونے والا ہے اور تو اس میں لازمی طور پر داخل ہوگا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے لوگوں میں شامل ہوگا۔ یہ تھوڑے سے تمتع کی علت ہے اور اس میں ایک عظیم الشان تہدید ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت عتبہ بن ربیعہ کے حق میں نازل ہوئی۔ کسی نے کہا ہے کہ ابو حذیفہ مخزومی کے بارے میں نازل ہوئی۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر کافر کے بارے میں عام ہے۔ یہی شریعتِ غرا کے قواعد کے زیادہ موافق ہے۔

بالجملہ جب اللہ پاک نے اپنے لیے عبادت کو خالص کرنے کا حکم دیا اور بیان فرمایا کہ دین خالص نہیں ہے مگر اسی کے لیے اور جنھوں نے اس کو چھوڑ کر اور حمایتی بنا لیے ہیں، ان کو یہ تہدید کی کہ وہ ان کے اور توحید والوں کے درمیان فیصلہ کرے گا اور اپنی اُلوہیت کی دلیلیں ذکر کیں، یہاں تک کہ یوں فرمایا: ﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ﴾ اور اس کے ساتھ اُلوہیت، یعنی استحقاقِ عبادت کو اور ربوبیت بہ معنی مالکیہ کو مبدأ پر قصر کیا۔ یہ وہی ذات ہے جس کے یہ افعال ہیں تو یہاں یہ بات بیان کی کہ کفار کے طریقے باہم متضاد ہیں، اس لیے کہ جب ان کو سختی پہنچتی ہے تو اللہ پاک سے اس کو دور کرنے کی استدعا کرتے ہیں، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ سختی کو وہی دور کرتا ہے اور بت نہ نقصان دے سکتے ہیں نہ نفع اور تمام چیزوں کا مبدأ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اور جب اللہ ان سے اس سختی کو دور کر دیتا ہے تو بتوں کو پوجنے کی طرف رجوع کرتے ہیں، بہ سبب اس کے کہ باطل وہم اور فاسد خیال کی کشمکش ان کی عقلوں کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ مقتضائے عقل یہی ہے کہ سب حالات میں اللہ ہی کی طرف التجا کی جائے، پس وہ تذبذب میں ہیں، ایک شے پر جمتے نہیں ہیں۔ پھر جب اللہ پاک مشرکوں کی صفتیں بیان کر چکا اور یہ بات ذکر کر چکا کہ مکروہات کے دور ہونے کے وقت اپنے اختیار سے غیر اللہ کو پکڑتے ہیں تو اس کے بعد حقیقی مومنین کے احوال کی تشریح کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

---

[1] معاني القرآن (٣٤٦/٤)

[2] فتح البيان (٨٤/١٢ـ٨٧)

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآىِٕمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۹

کیا (یہ مشرک بہتر ہے یا وہ) جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتے اور قیام کرتے ہوئے عبادت وفرماں برداری کرتا ہے، جبکہ وہ آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی اُمید بھی رکھتا ہے؟ کہہ دیجیے: کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں ⑨

اطاعت گزار اور نافرمان برابر نہیں ہیں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: کیا وہ شخص جس کی یہ صفت ہے اس شخص کی طرح ہے جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اور اس کے لیے انداد (شریک) ٹھہرائے، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر نہیں ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۱۳] ''یہ سارے کے سارے یکساں نہیں بلکہ ان اہلِ کتاب میں ایک جماعت (حق پر) قائم رہنے والی بھی ہے جو راتوں کے وقت بھی کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے بھی کرتے ہیں۔''

نیز اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ اَمَّنْ هُوَ قٰنِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآىِٕمًا ﴾ یعنی وہ اپنے حالِ سجود میں ہیں اور اپنے حالِ قیام میں ہیں، اسی لیے اس آیت سے اس شخص نے استدلال کیا ہے جو اس طرف گیا ہے کہ قنوت صرف خشوع ہے، نماز میں تنہا قیام نہیں ہے جس طرح کہ اَور لوگ اس طرف گئے ہیں، یعنی صرف قیام کو بغیر خشوع کا لحاظ کیے ہوئے قنوت کہتے ہیں۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے "عن فراس عن الشعبي عن مسروق عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ" روایت کیا ہے کہ ﴿ قٰنِتٌ ﴾ اللہ عزوجل کا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام حسن، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اٰنَآءَ الَّيْلِ ﴾ جوف اللیل ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے عن منصور روایت کیا ہے کہ یہ مغرب اور عشاء کے درمیان قنوت ہے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اٰنَآءَ الَّيْلِ ﴾ اول، اوسط اور آخر شب ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ ﴾ یعنی اپنی عبادت کے حال میں ڈرنے والا اور رحمت کا امیدوار رہتا ہے۔ عبادت میں خوف اور امید کا ہونا ضروری ہے اور زندگی میں خوف ہی غالب ہو، اسی لیے اللہ پاک نے ضدِ آخرت کو پہلے ذکر کیا ہے اور اس کے بعد رحمت کی امید کو، پھر جب موت کے حاضر ہونے کا وقت ہو تو چاہیے

[1] تفسیر ابن کثیر (٦١/٤)

کہ خوف پر اُمید ہی غالب ہو، جیسا کہ امام عبد بن حمید رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک شخص کے پاس آئے اور وہ موت کی حالت میں تھا، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: تو اپنے آپ کو کیسا پاتا ہے؟ تو اس نے عرض کی: میں اُمید رکھتا ہوں اور ڈرتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں جمع ہوتی یعنی امید اور خوف کسی بندے کے دل میں اس موطن میں، یعنی موت کے وقت، مگر اللہ عزوجل اس کو وہ شے عطا فرماتا ہے جس کی وہ امید رکھتا ہے اور اس کو اس شے سے امن دیتا ہے جس سے وہ ڈرتا ہے۔[1] (ورواه الترمذي والنسائي في اليوم والليلة وابن ماجه من حديث سيار بن حاتم عن جعفر بن سليمان به وقال الترمذي: غريب، وقد رواه بعضهم عن ثابت عن أنس عن النبي ﷺ مرسلا) (مگر اس روایت میں امید کے غالب ہونے پر کوئی شے دال نہیں ہے۔ كما هو الظاهر از مصحح سلمه الله تعالى)۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یحییٰ بکاء سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سنا کہ پڑھتے تھے: ﴿ أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا ﴾ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جو یہ فرمایا تو یہ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کی کثرتِ نماز کی وجہ سے فرمایا اور ان کی قراءت کی وجہ سے، یہاں تک کہ انھوں نے بہت وقت قرآن شریف ایک رکعت میں پڑھا ہے جس طرح کہ ابو عبید رحمہ اللہ نے اس کو ان سے روایت کیا ہے اور شاعر نے کہا ہے:

ضَحَّوْا بِأَشْمَطَ عُنْوَانُ السُّجُودِ بِهِ ... يُقَطِّعُ اللَّيْلَ تَسْبِيحًا وَّقُرْآنًا[2]

(یعنی ایسے شخص کی قربانی کر ڈالی جس کے سیاہ و سفید بال ملے ہوئے تھے، اور اس میں سجدے کی علامت تھی اور وہ تسبیح کہہ کر اور قرآن شریف پڑھ کر رات قطع کیا کرتا تھا۔ یہ شعر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے مرثیہ کا ہے۔)

امام احمد رحمہ اللہ نے تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے ایک رات میں سو آیتیں پڑھیں تو اس کے لیے رات کا قنوت لکھا جائے گا۔[3] (وكذا رواه النسائي في اليوم والليلة) قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ یعنی کیا برابر ہو گا یہ شخص اور وہ شخص جو اس سے پہلے مذکور ہوا، ان لوگوں میں سے جنھوں نے اللہ کے لیے شریک ٹھہرائے، تاکہ اللہ کی راہ سے گمراہ کریں۔ ﴿ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴾ یعنی ان دونوں میں فرق وہی شخص جانتا ہے جس کو عقل ہے۔[4] والله أعلم.

---

① مسند أحمد عن عبد بن حميد (٤٠٤/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٨٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٥١)

② تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٤٨، ٣٢٤٩) اس کی سند میں "یحییٰ بکاء اور عبداللہ بن عیسیٰ" ضعیف راوی ہیں۔

③ مسند أحمد (١٠٣/٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/١٨٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٤٦٨)

④ تفسير ابن كثير (٦١/٤، ٦٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ اَمَّنْ هُوَ قٰنِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا ﴾ اس کلام کے تتمہ سے ہے جس کو کہنے کا رسول اللہ ﷺ کو حکم کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کیا اس کافر کا حال اور انجام بہتر ہے یا اس شخص کا جو راحت اور تکلیف میں رات کی گھڑیوں میں اللہ کی طاعات بجا لانے کے لیے قیام کرنے والا ہے اور اس پر ہمیشگی کرنے والا ہے اور جب تکلیف اور سختی پہنچتی ہے تو بھی اس عمل میں کمی نہیں کرتا۔ امام حسن رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی امام ابوعمرو، عاصم اور کسائی رحمہم اللہ) نے ﴿ اَمَّنْ ﴾ بہ تشدید پڑھا ہے اور نافع وغیرہ (یعنی ابن کثیر، حمزہ، یحییٰ بن وثاب اور اعمش رحمہم اللہ) نے بہ تخفیف پڑھا ہے۔[1] پہلی قراءت کی بنا پر کلمۂ "أَمْ" "مَنْ" موصولہ پر داخل ہے اور پہلی میم کا دوسری میم میں ادغام کیا گیا ہے اور "أَمْ" متصلہ ہے اور اس کا معادل محذوف ہے: "أَيْ: اَلْكَافِرُ خَيْرٌ أَمِ الَّذِيْ هُوَ قَانِتٌ" کسی نے کہا ہے کہ منقطعہ مقدر بہ بل و ہمزہ ہے۔ "أَيْ: بَلْ أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ كَالْكَافِرِ" اور دوسرے کی بنیاد پر ہمزہ استفہام کے لیے ہے اور استفہام تقریری ہے اور اس کا مقابل محذوف ہے۔ "أَيْ: أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ كَمَنْ كَفَرَ"

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قراءت میں ہمزہ نداء کا ہے اور کلمۂ "مَنْ" منادیٰ ہے، اس سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں، جن کو ﴿ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ﴾ کہنے کا حکم ہوا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "يَا مَنْ هُوَ قَانِتٌ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا"۔ کسی نے کہا: تقدیر یہ ہے: "يَا مَنْ هُوَ قَانِتٌ إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْجَنَّةِ"۔ جو لوگ ہمزے کو نداء کا ہمزہ کہتے ہیں ان میں سے امام فراء رحمہ اللہ ہیں۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے اس کو ضعیف کہا ہے اور کہا ہے کہ یہ بات اپنے ماقبل اور مابعد سے اجنبی ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ سے پہلے ابو علی فارسی اس تضعیف کی طرف جا چکے ہیں اور امام ابو حاتم اور اخفش رحمہما اللہ نے اس قراءت پر اصل ہی سے اعتراض کیا ہے، حالاں کہ یہ اعتراض بے وجہ ہے، کیوں کہ جب روایت ثابت ہو چکی تو درایت باطل ہو گئی۔[2] اس جگہ ﴿ قٰنِتٌ ﴾ کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ کسی نے تو کہا ہے کہ مطیع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خشوع کرنے والا، یا اپنی نماز میں قیام کرنے والا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے رب کی طرف دعوت دینے والا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قنوت کی اصل طاعت ہے۔ چنانچہ جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے وہ سب طاعت میں داخل ہے۔[3]

﴿ اٰنَآءَ الَّيْلِ ﴾ ﴿ اٰنَآءَ ﴾ جمع ہے "إِنًى" بالکسر و بالقصر کی، جیسے "مِعًى" کی جمع "أَمْعَاء" آتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا واحد "أَنْوٌ" ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "مَضَى مِنَ اللَّيْلِ أَنْيَانِ وَأَنْوَانِ" یعنی رات کی دو گھڑیاں گزر گئیں۔ ﴿ اٰنَآءَ الَّيْلِ ﴾ سے مراد رات کی ساعات اور اوقات ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ رات کا جوف، کیوں کہ یہ مقبول وقت ہے:

---

[1] تفسير القرطبي (١٣٨/١٥) [2] فتح القدير (٥٩٥/٤) [3] تفسير القرطبي (٢٣٩/١٥)

دلا بسوز کہ سوزِ تو کارہا بکند نیاز نیم شبی دفعِ صد بلا بکند

''اے دل! محبوب کی محبت میں تکالیف کو برداشت کر کہ تیرا یہ ہنر بہت سے کام بنا دے گا۔ آدھی رات کی آرزو مندی اور رغبت سیکڑوں بلاؤں کو دور کر دیتی ہے۔''

(یہ شعر حافظ شیراز۔قدس سرہ۔کا ہے۔) کسی نے کہا ہے کہ مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ رات کا پہلا، درمیانی اور آخری حصہ ہے۔ ان میں سے بعض قول پہلے گزر چکے ہیں۔ ﴿ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا ﴾ منصوب ہیں بنا بر حال، یعنی ﴿ قٰنِتٌ ﴾ ہے رات کی گھڑیوں میں اس طرح سے کہ نماز میں سجدے اور قیام کو جمع کرنے والا ہے۔ سجود کو قیام پر اس لیے مقدم کیا کہ عبادت میں اس کو زیادہ تر دخل ہے۔ یہ آیت اس پر دال ہے کہ قیامِ لیل کو دن پر ترجیح ہے اور وہ اس سے افضل ہے، اس لیے کہ رات زیادہ ستر پوشی کرنے والی ہے۔ اس لیے ریا سے زیادہ دور ہو گی اور اس لیے کہ رات کی تاریکی فکر کو ایک جگہ اکٹھا کرتی ہے اور نگاہ کو چیزوں کی طرف نظر کرنے سے باز رکھتی ہے اور جب دل اشیائے خارجیہ میں مشغول نہیں ہو گا تو وہ اصل مقصد کی طرف آئے گا اور وہ یہی نماز میں خشوع ہے اور اس کو پہچاننا ہے جس کے لیے نماز پڑھتا ہے۔ کسی نے کہا ہے: اس لیے کہ رات کو سونے کا وقت ہوتا ہے اور راحت حاصل کرنے کا وقت ہوتا ہے تو اس میں جاگ کر قیام کرنا نفس پر زیادہ بوجھل ہوتا ہے، اس لیے اس میں ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اللہ اس پر قیامت کے دن کا وقوف آسان کر دے تو اس کو چاہیے کہ اللہ اس کو رات کی تاریکی میں دیکھے۔

﴿ يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی اس حال میں کہ عذابِ آخرت سے ڈرتا ہے۔ یہ قول امام سعید بن جبیر اور مقاتل رحمہما اللہ کا ہے۔[1] ﴿ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ﴾ یعنی خوف اور امید کو جمع کرتا ہے۔ یہ دونوں جس شخص کے دل میں جمع ہو جائیں، اس نے مراد پائی۔ کہا ہے کہ یہاں عبارت محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "كَمَنْ لَّا يَفْعَلُ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ"، جس طرح کہ سیاقِ کلام اس پر دال ہے، یعنی کیا وہ شخص جو یہ کام کرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جو ان میں سے کچھ نہیں کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ رحمت سے مراد مغفرت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جنت ہے۔ یہ آیت اس پر دال ہے کہ یہ بات اکمل اور اولیٰ ہے کہ امید کی نسبت اللہ پاک کی طرف کی جائے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی اور کہا کہ یہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان سے ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ آیت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی شان میں نازل ہوئی ہے۔[2]

---

① تفسير القرطبي (١٥/٢٣٩) ② تفسير القرطبي (١٥/٢٣٩)

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم فرمایا کہ ان سے ایک اور بات کہیں جس کی وجہ سے حق باطل سے ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ یعنی تو کہہ کہ کیا وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ اللہ نے جس بعث، ثواب اور عذاب کا وعدہ کیا ہے، وہ حق ہے اور وہ لوگ جو اس کو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟ یا یہ معنی ہیں کہ جو لوگ اس شے کو جانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر نازل فرمائی ہے اور وہ لوگ جو اس کو نہیں جانتے برابر ہیں؟ یا ان سے علماء اور جاہل مراد ہیں۔ ہر شخص جس کے پاس عقل ہے، وہ یہ بات جانتا ہے کہ علم وجہالت اور عالم وجاہل کے درمیان برابری نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جس طرح وہ لوگ برابر نہیں ہو سکتے جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرماں بردار اور نافرمان برابر نہیں ہو سکتے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ الَّذِينَ يَعْلَمُونَ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں، کیوں کہ اس سے نفع اٹھانے والے وہی ہیں۔ اس لیے کہ جس نے عمل نہ کیا تو وہ جاہل کی طرح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے آیت کو عمل سے شروع کیا اور علم سے ختم فرمایا، اس لیے کہ عمل مجاہدات کے باب سے ہے اور علم مکاشفات کے باب سے اور یہ انتہا ہے۔ لہٰذا جب انسان کو یہ حاصل ہو گیا تو اس نے اس کے کمال اور فضیلت پر دلالت کی۔

﴿ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴾ یہ جملہ من جملہ کلام مامور بہ نہیں ہے، بلکہ اللہ پاک کی طرف سے ہے، ان قوارع مذکورہ (کھٹکھٹانے والی باتوں) کا حکم کرنے کے بعد جو کفر اور نافرمانیوں سے منع کرنے والی ہیں۔ اس سے مقصود یہ بات بتانا ہے کہ وہ قوارع اور جھڑکیاں کافروں کے دلوں میں اثر نہیں کرتیں ہیں، اس لیے کہ ان کی عقلیں خلل والی ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ کے وعظ اور نصیحت سے وہی نصیحت حاصل کرتے ہیں جو صاف ستھری عقلوں اور منور دلوں والے ہیں اور وہی اس میں تدبر اور غور وفکر کرتے ہیں، یہ لوگ مومن ہیں نہ کہ کافر، کیوں کہ اگرچہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی عقلیں ہیں، لیکن وہ کالعدم ہیں۔ پھر جب اللہ پاک نے عالم و جاہل کے درمیان مساوات کی نفی کی اور یہ بات فرما دی کہ نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں تو اپنے رسول ﷺ کو امر فرمایا کہ اس کے مومن بندوں کو یہ حکم دیں کہ اس کے تقویٰ اور ایمان پر جمے رہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿١٠﴾ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿١١﴾ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٢﴾

[1] معاني القرآن (٤/٣٤٧) [2] فتح البيان (١٢/٨٧-٩٠)

کہہ دیجیے: اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب سے ڈرو، جنھوں نے اس دنیا میں اچھے عمل کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، بلاشبہہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا⑩ آپ کہہ دیجیے: بے شک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کے لیے بندگی کو خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کروں⑪ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا مسلمان بن جاؤں⑫

تقویٰ، ہجرت اور اخلاصِ عمل کا حکم:

اللہ پاک اپنے بندوں کو امر کرتا ہے کہ اس کی اطاعت پر اور تقویٰ پر ہمیشہ قائم رہیں۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک عمل کیا، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں بھلائی ہے۔ ﴿ وَاَرْضُ اللّٰهِ وٰسِعَةٌ ﴾ کی تفسیر میں امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: پس تم اس میں ہجرت کرو اور جہاد کرو اور بتوں سے الگ ہو جاؤ۔[1] شریک نے "عن منصور عن عطاء" روایت کیا ہے کہ جس وقت تم اس کی معصیت کی طرف بلائے جاؤ تو بھاگ جاؤ۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وٰسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ﴾ [النساء: ٩٧] [2] "فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے؟" امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صابروں کے اعمال کو نہ تولا جائے گا نہ ماپا جائے گا۔ "إِنَّمَا يُغْرَفُ لَهُمْ غَرْفًا" یعنی ان کو تو لپ بھر بھر کر اجر دیں گے، ماپ تول کا کیا ذکر ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ ہرگز ان کے عمل کا ثواب ان پر حساب نہ کیا جائے گا، لیکن وہ تو اس پر زیادہ دیے جائیں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ یعنی جنت میں دیے جائیں گے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تو یہی حکم ہے کہ اللہ وحدہ لا شریک لہ کے لیے اخلاصِ عبادت کروں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "يَعْنِي مِنْ أُمَّتِهِ ﷺ"[3] "یعنی میں آپ ﷺ کی امت سے ہو جاؤں۔" (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ یعنی اے وہ لوگو جنھوں نے اللہ کی توحید سچی کی! اپنے رب سے ڈرو، اس طرح سے کہ اس کی اطاعت کرو، اس کی نافرمانی سے بچو، اس کے حکموں کی تابعداری کرو، اس کے لیے ایمان خالص کرو اور اس سے شرکاء کی نفی کرو اور مراد یہ ہے کہ تو اُن سے میرا یہ قول بعینہٖ کہہ دے۔ پھر جب اللہ پاک نے مومنوں کو تقویٰ کا حکم کیا تو ان کے لیے وہ فائدے بیان کیے جو اس تقوے میں ہیں۔ ارشاد فرمایا: ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ

[1] تفسير الطبري (٢٦٩/٢١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٠٧٥/٩) [3] تفسير ابن كثير (٦٢/٤)

33

الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ﴾ یعنی جن لوگوں نے اس دنیا میں اخلاص کے ساتھ نیک عمل کیے، ان کے لیے ایک عظیم نیکی ہے، یعنی جنت۔ ﴿ فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا ﴾ ﴿ أَحْسَنُوا ﴾ سے متعلق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ حَسَنَةٌ ﴾ سے اس بنا پر متعلق ہے کہ وہ ﴿ حَسَنَةٌ ﴾ کی جگہ کا بیان ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ جنھوں نے عمل میں نیکی کی، اُن کے لیے دنیا میں صحت، عافیت، کامیابی اور غنیمت کے ساتھ حَسَنَہ ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

پھر جب کہ بعض بندوں کے لیے یہ مشکل تھا کہ اپنے وطن میں طاعات اور احسان کریں تو ان کے لیے اللہ پاک نے ہجرت کا ارشاد کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَأَرْضُ اللّٰهِ وٰسِعَةٌ ﴾ یعنی اللہ کی زمین کشادہ ہے اور اس کے بہت سے شہر ہیں۔ چنانچہ چاہیے کہ جس جگہ اس کے لیے ممکن ہو کہ اللہ کی اطاعت کر سکے اور اس کے احکام پر عمل کر سکے اور اس کی ممنوعہ چیزوں سے بچ سکے تو وہاں ہجرت کر جائے، جیسا کہ انبیاء اور صالحین کا طریقہ ہے، کیوں کہ تفریط میں اصلاً اس کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔ سورت نساء میں ہجرت پر پورے طور پر کلام گزر چکا ہے۔[1] کسی نے کہا کہ اس جگہ ارض سے مراد جنت کی زمین ہے۔

اللہ پاک نے اس کی کشادگی میں اور اس کی نعیم کی فراخی میں ان کو رغبت دلائی ہے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ ﴾ [آلِ عمران: ۱۳۳] ''اس جنت کی طرف دوڑو، جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔'' کبھی جنت کا نام ''أَرضٌ'' رکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ﴾ [الزمر: ۷۴] ''یہ کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہمیں اس زمین کا وارث بنا دیا کہ جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں۔'' پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ مکے سے کوچ کر جاؤ اور دوسرے شہروں میں چلے جاؤ اور جس طرح انبیاء اور صالحین نے دوسرے شہروں کی طرف ہجرت کی، تم بھی ان کی پیروی کرو، تاکہ اپنی نیکی پر اَور نیکی اور اپنی طاعت پر اَور طاعت زیادہ کریں، اس میں اس شہر سے کسی اَور شہر کی طرف ہجرت کرنے پر آمادہ کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر کسی شخص کو کسی شہر میں گناہ کا حکم دیا جائے تو اسے چاہیے کہ وہاں سے بھاگ جائے۔

پھر جب اللہ پاک نے وہ ثواب بیان کیا جو نیکی کرنے والوں کے لیے ہے اور اس میں یہ بات ضروری تھی کہ اطاعت کے بجا لانے پر اور شہواتِ نفس کے روکنے پر صبر واستقلال ہو تو صبر کی فضیلت اور اس کی عظیم قدرت کی طرف اشارہ کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ یعنی جو لوگ اپنا وطن چھوڑنے پر اور اپنے کنبے قبیلے کی جدائی پر صبر کرتے ہیں اور اللہ کی اطاعت میں اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرنے میں آزمائشوں

---

[1] رقم الآية (۹۷)

کو برداشت کرتے ہیں اور محنت و مشقت اٹھاتے ہیں انہیں کو ان کے صبر کے مقابلے میں اور تنگی برداشت کرنے میں بھرپور اور بے حساب ثواب دیا جائے گا۔ یعنی کوئی احاطہ کرنے والا اس کے احاطہ کرنے پر قادر نہ ہو اور نہ ہی کوئی حساب کرنے والا اس کے حساب کی طاقت رکھے گا، اگرچہ وہ اللہ پاک کے نزدیک معلوم ہے اور شمار کیا ہوا ہے۔

امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہ عقل اس کی طرف راہ پائے گی اور نہ ہی اس کا وصف بیان ہو سکے گا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا اجر جنت ہے اور اُن کے لیے اس میں بے حساب رزق ہیں۔[1] سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ہر مطیع کو اجر ناپ تول کر دیا جائے گا سوائے صابرین کے۔ "فَإِنَّهُ يَحْثِي لَهُمْ حَثْيًا"[2] یعنی ان کو لپیں بھر بھر کر دیا جائے گا۔ مروی ہے کہ آزمائش والے لائے جائیں گے تو ان کے لیے نہ تو ترازو قائم کی جائے گی اور نہ اُن کے لیے دفتر کھولا جائے گا اور ان کو اجر عطا کیا جائے گا، یہاں تک کہ دنیا میں عافیت والے لوگ اس بات کی تمنا کریں گے کہ کاش ان کے جسم قینچیوں سے کترے جاتے۔ اس فضل کی وجہ سے وہ یہ تمنا کریں گے جس کو اہلِ بلا لے جائیں گے۔

نکتہ:

جملہ ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا﴾ علت ہے امر بتقویٰ کی، یعنی اس امر کی اطاعت واجب ہے، اس لیے کہ جنھوں نے احسان کیا، ان کے لیے ایک بڑا حسنہ ہے۔ رہی یہ بات کہ ﴿اَحْسَنُوْا﴾ فرمایا، "اِتَّقُوْا" نہ کہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات سے آگاہ کرنا منظور ہے کہ تقویٰ احسان کے باب سے ہے اور دونوں باہم ایک دوسرے کے لیے لازم ہیں۔ پھر اسی تقوی مامور بہ میں رغبت دلانے کے لیے ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ﴾ فرمایا اور "إِنَّمَا يُوَفَّى الْمُتَّقُوْنَ" نہ کہا، اس لیے کہ مقصود اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ متقی لوگ صبر کی فضیلت کو جمع کرنے والے ہیں جس طرح کہ وہ احسان کی فضیلت کے جامع ہیں، کیوں کہ تقویٰ کے لیے احسان اور صبر لازمی ہیں، باوجود اس کے کہ صبر میں مصابرت و مجاہدہ پر اور مہاجرت کی مشقتوں پر تحمل کرنے پر زیادہ آمادہ کرنا ہے۔

بہر حال آیتِ کریمہ اس بات پر دال ہے کہ صابرین کے اجر اور ثواب کی کوئی انتہا نہیں ہے، کیوں کہ جو شے حساب کے تحت میں آتی ہے تو وہ متناہی ہوتی ہے، یعنی اس کی کوئی آخری حد ہوتی ہے اور جو چیز حساب کے تحت داخل نہیں ہوتی تو وہ غیر متناہی ہوتی ہے اور یہ ایک عظیم فضیلت اور جلیل القدر ثواب ہے۔ جو شخص کہ اللہ پاک کے ثواب کی رغبت رکھتا ہے اور اس کے پاس کی خیر کا طمع رکھتا ہے، یہ فضیلت اس سے تقاضا کرتی ہے کہ اس میں صبر کا بہت زیادہ حصہ ہو اور وہ اپنے نفس کو اس کی مہار سے باندھے اور اس کی قید سے مقید کرے، کیوں کہ جزع فزع اور بے صبری

---

[1] فتح القدير (٥٩٧/٤) [2] تفسير البغوي (١١١/٧)

کرنے سے وہ قضا تو دور نہیں ہو سکتی جو نازل ہو چکی ہے اور نہ ہی اس سے وہ خیر واپس آ سکتی ہے جو مسلوب ہو چکی ہے اور نہ ہی ناپسندیدہ چیز اس سے دور ہو سکتی ہے جو واقع ہو چکی ہے۔ جس وقت ایک عقل مند شخص اس بات کو خوب اچھی طرح اپنے تصور میں لے آئے گا اور خوب سمجھ لے گا جس طرح کہ اس کو سمجھنے کا حق ہے تو وہ یہ جان لے گا کہ اس شخص کو جس نے اس بلا پر صبر کر لیا جو اس پر نازل ہوئی اجرِ عظیم مل چکا اور وہ اس خیرِ خطیر سے بہرہ مند ہو گیا اور اس شخص پر جو صبر نہیں کرتا، قضا نازل ہو چکی ہے، خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے اور اس کے باوجود اس سے وہ عظیم اجر جاتا رہا جس کا نہ اندازہ کیا جاتا ہے نہ اس کی انتہا معلوم ہو سکتی ہے تو ایسے شخص نے اپنی مصیبت کے ساتھ ایک اور مصیبت ملائی اور سوائے جزع فزع کے اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

أَرَى الصَّبْرَ مَحْمُوْدًا عَنْهُ مَذاهِبُ فَكَيْفَ إِذَا مَا لَمْ يَكُنْ عَنْهُ مَذْهَبُ
هُنَاكَ يَحِقُّ الصَّبْرُ وَالصَّبْرُ وَاجِبٌ وَمَا كَانَ مِنْهُ لِلضُّرُوْرَةِ أَوْجَبُ

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول (ﷺ) کو امر کیا کہ پہلے ان کو توحید اور اخلاص کی خبر دیں جس کا خود اُن کو امر کیا گیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ﴾ یعنی مجھے یہ حکم ہے کہ اللہ کی عبادت کروں ایسی عبادت جو شرک اور ریا وغیرہ سے خالص ہو۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفارِ قریش نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی کہ تجھے کون سی شے باعث ہوتی ہے کہ تو ہمارے پاس یہ دین لے کر آئے، کیا تو اپنے باپ، دادا اور سردارانِ قوم کی ملت کی طرف نظر نہیں کرتا کہ وہ لات وعزیٰ کو پوجتے ہیں کہ تو اس ملت کو اَخذ کرے۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی،[1] اس آیت کے معنی سورت کے شروع میں گزر چکے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول (ﷺ) کو امر کیا کہ ان کو اس کی دوبارہ خبر دیں کہ ان کو اس بات کا حکم کیا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے اول ہوں جنھوں نے اطاعت اور فرماں برداری اور گرویدگی اختیار کی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴾ یعنی مجھے اس بات کا حکم ہے کہ میں اس امت میں سب سے پہلا اسلام لانے والا ہوں اور آپ ﷺ ایسے ہی تھے، کیوں کہ آپ ﷺ ہی نے پہلے پہل اپنے آباء کے دین کی مخالفت کی اور توحید کی طرف دعوت دی۔ اولیت کے معنی زمانے کے لحاظ سے سبقت ہے۔ چنانچہ سبقت سے مراد سبقت بہ حسبِ دعوت ہے، کیوں کہ افضل یہ بات ہے کہ جو شخص کسی اور کو نیک عادت کی طرف بلائے تو پہلے خود اپنے نفس کو اس کی طرف دعوت کرے اور اس کا عادی ہو، تاکہ غیر میں اثر کرے، جیسا کہ انبیاء اور صالحین کا طریقہ ہے، بہ خلاف بادشاہ اور جابر لوگوں کے، وہ دوسروں کو اس بات کا حکم دیتے ہیں جس کو خود نہیں کرتے، اس لیے باطن میں اس کا اثر نہیں ہوتا، ہاں ظاہر میں اس کے جور وظلم کے خوف کی وجہ سے فی الجملہ اثر ہوتا ہے۔ حرفِ لام تعلیل کا ہے: "أَيْ: أُمِرْتُ بِمَا

[1] فتح القدير (٥٩٧/٤)

أُمِرْتُ بِهِ لِأَجْلِ أَنْ أَكُوْنَ" کسی نے کہا کہ زائدہ ہے اور تاکید کے لیے ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ پھر اللہ پاک نے آپ ﷺ کو تیسری بار امر کیا کہ نافرمانی پر عذاب سے اپنے ڈرنے کی ان کو خبر دیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳﴾ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ﴿۱۴﴾ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۵﴾ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴿۱۶﴾

کہہ دیجیے: اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو یقیناً مجھے بڑے دن (قیامت) کے عذاب سے ڈر لگتا ہے ⑬ کہہ دیجیے: میں اللہ کے لیے اپنی بندگی کو خالص کرتے ہوئے اسی کی عبادت کرتا ہوں ⑭ تو تم اس کے سوا جس کی چاہو عبادت کرو، کہہ دیجیے: بلاشبہ خسارہ اُٹھانے والے تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے روزِ قیامت اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں ڈالا، خبردار! یہی کھلا خسارہ ہے ⑮ ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں گے اور ان کے نیچے (بھی آگ کے) سائبان ہوں گے، یہی وہ (عذاب) ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، لہٰذا میرے بندو! تم مجھ ہی سے ڈرتے رہو ⑯

عذابِ الٰہی کا ڈر اور خوف:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! تو کہہ حالاں کہ تو اللہ کا رسول ہے کہ بے شک میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں، مراد روزِ قیامت ہے۔ یہ ایک شرط ہے اور اس کے معنی دوسروں کو زیادہ موثر طریقے سے بات بتانا ہے۔ ﴿قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ﴾ بھی تہدید ہے اور ان سے بری ہونا ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پورا خسارہ پانے والے وہی ہیں جنھوں نے اپنی جان کا اور اپنے گھر والوں کا قیامت کے دن نقصان کیا، یعنی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، پھر وہ کبھی نہ مل سکیں گے، خواہ ان کے گھر والے جنت کی طرف جائیں اور وہ خود آگ کی طرف جائیں۔ یا یہ سب کے سب آگ میں بسائے جائیں، لیکن ان کو نہ اکٹھا ہونا ہے اور نہ ہی کسی

[1] فتح البیان (۱۲/۹۰۔۹۳)

طرح کا سکون اور سرور ملنا ہے۔ ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ یعنی ظاہر و واضح نقصان یہی ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان کا حال بیان کیا جو دوزخ میں ہو گا۔ فرمایا: ﴿ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ﴾ جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٤١] ''ان کے لیے آتشِ دوزخ کا بچھونا ہو گا اور ان کے اوپر (اسی) کا اوڑھنا ہو گا اور ہم ایسے ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [العنكبوت: ٥٥] ''اس دن ان کے اوپر تلے سے انھیں عذاب ڈھانپ رہا ہو گا اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اب اپنے (بد) اعمال کا مزہ چکھو۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ﴾ یعنی یہ امر جو لازمی ہونے والا ہے اس کو صرف اس لیے بیان فرمایا ہے کہ اپنے بندوں کو اس سے ڈرائے، تاکہ وہ حرام کی ہوئی چیزوں اور گناہوں سے باز رہیں۔ ﴿ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴾ یعنی اے میرے بندو! میرے عذاب، انتقام اور میری پکڑ سے ڈرو۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ تو کہہ کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں، اس طرح سے کہ میں اس کے لیے اپنی عبادت کو اور اس کی توحید کو خالص نہ کروں اور شرک کو ترک کرنے کی طرف دعوت کرنے کو چھوڑوں اور شرک والوں کو گمراہی کی طرف منسوب کرنا چھوڑ دوں، یعنی یہ سب کچھ کر کے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں روزِ قیامت کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں اس طرح سے کہ مشرکین نے جو مجھے غیر اللہ کی پرستش کی طرف بلایا ہے، اس میں ان کا کہنا مان لوں تو میں ڈرتا ہوں۔ امام ابوحمزہ ثمالی اور ابن مسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے: ﴿ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾[2] [الفتح: ٢] ''تاکہ جو کچھ تیرے گناہ آگے ہوئے اور جو پیچھے سب کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔'' اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ امر وجوب کے لیے ہے، کیوں کہ اس سے پہلے یہ ہے کہ ﴿ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ ﴾ پس مراد اسی حکم کی نافرمانی ہے اور اس میں دوسروں کو گناہوں پر دھمکی ہے، کیوں کہ جب خود نبی کریم ﷺ اپنی جلالتِ قدر اور شرفِ طہارت اور پاکیزگی اور منصبِ نبوت کے باوجود اللہ کی معصیت سے پرہیز کرنے والے ہوں تو دوسرے لوگ تو اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ معصیت سے پرہیز کریں۔

پھر اللہ پاک نے چوتھی بار اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ کفار اور مشرکین کو یہ خبر دیں کہ انھوں نے امر مان لیا

[1] تفسیر ابن کثیر (٦٣/٤) [2] تفسیر القرطبي (٢٤٢/١٥)

اور اس کے حکم کے مطیع اور فرماں بردار ہوئے اور اس کی عبادت کی اور دین کو اس کے لیے خالص کیا بہت زیادہ موکد اور موثر طریقے سے، تاکہ دین میں اپنی پختگی کو ظاہر کریں ان کی خالی طمع کو قطع کرنے کے لیے اور ان کو تہدید کرنے کی تمہید کے طور پر۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ﴾ اللہ کے مبارک نام کو پہلے ذکر کرنے سے اختصاص کو ظاہر کرنا ہے، یعنی تو کہہ کہ میں اللہ ہی کو پوجتا ہوں اور اس کے غیر کو استقلال یا شرکت کے طور پر نہیں پوجتا اس حال میں کہ میں اپنے دین وعبادت کو اللہ ہی کے لیے خالص کرنے والا ہوں۔ میرا دین اللہ ہی کے لیے ہے، اس میں شرک وریا وغیرہ کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔ اس کی تحقیق سورت کے شروع میں گزر چکی ہے۔[1]

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پھر اگر کوئی کہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾ اور قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ﴾ میں تکرار کے کیا معنی ہیں تو ہم کہیں گے کہ یہ تکرار نہیں ہے، کیوں کہ پہلے میں تو یہ خبر دی ہے کہ انھیں اللہ پاک کی طرف سے حکم دیا گیا ہے ایمان اور عبادت کا اور دوسرے میں یہ خبر دی ہے کہ انھیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ کسی کو اللہ پاک کے سوا نہ پوجیں۔[2] قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ﴾ یہ حکم ڈانٹ ڈپٹ، دھمکی اور سرزنش کے لیے ہے، یعنی تم اس کے سوا جس شے کو پوجنا چاہو پوجو، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ﴾ [حم السجدة: ٤٠] ''تم جو چاہے کرتے چلے جاؤ۔'' اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں پوجتے۔ کسی نے کہا کہ یہ امر اپنی حقیقت پر ہے اور آیتِ سیف سے منسوخ ہو گیا ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کامل ہار بیٹھنے میں وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن کامل ہار بیٹھے، اس طرح سے کہ اپنی جانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگ میں بسایا اور ان کو وہ حوریں نہ ملیں جو اگر ایمان لاتے تو ان کے لیے تیار کی گئی تھیں، اس لیے کہ جو کوئی آگ میں داخل ہوا اس نے اپنا نقصان کیا اور اپنے گھر والوں کا۔ ''أَهْلِيْ'' جمع ہے ''أَهْلٌ'' کی، اصل میں ''أَهْلُوْنَ'' ہے یا ''أَهْلِيْنَ''۔

﴿ وَاَهْلِيْهِمْ ﴾ سے مراد آخرت کے گھر والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی بیویاں اور خادم ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے گھر والے ہیں جو دنیا میں تھے، کیوں کہ اگر وہ اہلِ نار سے تھے تو یقیناً ان کو ہار بیٹھے، جیسے اپنی جان ہار بیٹھے اور اگر وہ اہلِ جنت سے تھے تو بھی وہ ان سے ایسے جاتے رہے کہ اس کے بعد کسی طرح کا رجوع نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے کفار مراد ہیں، کیوں کہ انھوں نے اپنی جانوں کا نقصان کیا جہنم کی آگ میں ہمیشہ کے لیے بس جانے میں اور اپنے اہل کا نقصان کیا، اس لیے کہ مومنین کے داخل ہونے کی جگہ میں داخل نہیں

[1] رقم الآية (٢) [2] تفسير الرازي (٢٦/٢٢٣)

ہوئے جن کے لیے جنت میں گھر والے ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ لوگ کفار ہیں جن کو آگ کے لیے پیدا کیا گیا۔ دنیا ان سے زائل ہوگئی اور جنت ان پر حرام کی گئی۔[2] ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ "أَهْلِيهِمْ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، كَانُوا أُعِدُّوا لَهُمْ لَوْ أَطَاعُوا اللّٰهَ فَغَيَّبُوهُمْ"[3] "یعنی ان کے جنتی اہل جو ان کے تیار کیے گئے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے (مگر انھوں نے اطاعت نہ کرکے) ان کو کھو دیا۔"

جملہ ﴿ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ مستانفہ ہے جو ماقبل کی تاکید کے لیے ہے۔ اس کو جو حرفِ تنبیہ سے شروع کیا تو اس سے اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ ان پر جو یہ خسران اور نقصان نازل ہوا، یہ عظیم اور زیادہ ہونے میں اس انتہا کو پہنچا ہے کہ اس سے اوپر کوئی انتہا نہیں ہے، اسی طرح خسران کو جو الف و لام کے ساتھ معرفہ ذکر فرمایا اور اس کو موصوف بہ مبین کیا تو یہ بھی اس پر دال ہے کہ ان کا خسران بھی بھرپور ہے نہ کوئی خسران اس کے برابر ہے نہ کوئی اور سزا اس کے لگ بھگ ہو سکتی ہے۔

پہلے تو اللہ پاک نے ابہام کے طریقے سے اس خسران کو ہولناک کیا، اس کے بعد یہ خسران اور ایسی بلا جو نہ ٹلے اور اُن پر نازل ہوئی، اس کو بیان فرمایا کہ وہ یہ ہے: ﴿ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ﴾۔ ﴿ ظُلَلٌ ﴾ سے مراد آگ کے اطباق ہیں، یعنی ان کے لیے ان کے اوپر سے آگ کے طبق اور خیمے اور بڑے بڑے ٹکڑے ہیں کہ ان پر دھک رہے ہیں۔ ﴿ ظُلَلٌ ﴾ جمع ہے "ظُلَّة" کی۔ "ظُلَّة" وہ ہے جو سایہ کرے، یعنی ابر یا چھتری یا اور کوئی چیز۔ آگ پر جو ﴿ ظُلَلٌ ﴾ کا اطلاق کیا تو اس سے منظور ٹھٹھا کرنا ہے، ورنہ وہ تو جلانے والے ہیں اور ظلہ گرمی سے بچاتا ہے۔ غرضیکہ ان کے اوپر اور نیچے آگ کے طبق ہیں۔ اوپر کے طبق تو چھتری کی طرح ہیں اور نیچے کے طبق بچھونے کی طرح ہیں۔ نیچے کے اطباق کا نام ﴿ ظُلَلٌ ﴾ یا تو اس لیے رکھا کہ "أحد الضدين" کے نام کا دوسرے پر اطلاق کر دیا۔ یا نیچے والا طبق چوں کہ ایذا اور حرارت میں اوپر والے طبق کے مشابہ تھا، اس لیے اس کی مماثلت اور مشابہت کی وجہ سے اس کو بھی "ظُلَّةٌ" کہہ دیا۔ یا اس لیے کہ نیچے والا طبقہ ان دوزخیوں پر سایہ کرتا ہے جو اس کے نیچے ہیں، کیوں کہ نار کے کئی طبقے ہیں، ہر طبقے میں کفار کے طوائف میں سے ایک طائفہ ہے۔

﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ﴾ خبر ہے، یعنی کفار کے عذابِ نار کا یہ بیان جس کا ذکر ہوا، اس سے اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو ڈراتا ہے کہ اس سے ڈریں اور اس سے بچیں۔ یہ معنی ہیں: ﴿ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴾ کے، یعنی اے میرے بندو! ان گناہوں سے بچو جن کی وجہ سے کفار کو ایسے عذاب ملے۔ "عِبادِ" کے مومنین کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ غالباً قرآن شریف میں "عِباد" کا اطلاق ان پر آتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد کفار اور گناہ گار لوگ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مسلمین اور کفار کو عام ہے۔[4]

---

[1] معاني القرآن (٤/٣٤٨) [2] تفسير الطبري (٢١/٢٧١) [3] الدر المنثور (٧/٢١٦) [4] فتح البيان (١٢/٩٣-٩٥)

وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾

اور جو لوگ طاغوت کی عبادت کرنے سے بچے رہے اور انھوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا، ان کے لیے بشارت ہے، لہٰذا آپ میرے (ان) بندوں کو بشارت دے دیں (17) جو غور سے بات سنتے ہیں اور اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں، وہی لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی اور وہی لوگ عقل والے ہیں (18)

نیکو کار لوگوں کے لیے بشارت:

بہترین بات کی اتباع کرتے ہیں، یعنی جو حکم دیا جاتا ہے اس کو کرتے ہیں اور جس سے منع کیا جاتا ہے اس کو نہیں کرتے۔ اس کا کرنا نیکی ہے اور اس کا نہ کرنا نیکی ہے۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت زید بن عمرو بن نفیل، ابو ذر اور سلیمان فارسی رضی اللہ عنہم کی شان میں نازل ہوئی ہے۔[1] صحیح یہ ہے کہ آیت ان کے لیے اور اُن کے علاوہ ان لوگوں کے لیے ہے جو بتوں کے پوجنے سے بچے اور رحمان کے پوجنے کی طرف رجوع ہوئے۔ چنانچہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو دنیا کی زندگی میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی۔ پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ﴾ یعنی خوش خبری دے ان کو جو بات کو اچھی طرح سے سنتے ہیں، یعنی اس کو سمجھتے ہیں اور جو شے اس میں ہوتی ہے اس پر عمل کرتے ہیں، جس طرح کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جب ان کو تورات دی: ﴿ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ﴾ [الأعراف: ١٤٥] "تم ان کو پوری طاقت سے پکڑ لو اور اپنی قوم کو حکم کرو کہ ان کے اچھے اچھے احکام پر عمل کریں۔" ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ یعنی جو لوگ اس صفت کے حامل ہیں وہی ہیں جن کو اللہ نے دنیا اور آخرت میں ہدایت کی اور وہی عقلِ سلیم اور فطرتِ مستقیم والے ہیں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

موصول اپنے ماتحت کے ساتھ مبتداء ہے اور ﴿ لَهُمُ الْبُشْرٰى ﴾ خبر ہے۔ "طَاغُوْتٌ" مصدر میں مبالغے کے لیے ہے، جیسے: "رَحَمُوْتٌ" و "عَظَمُوْتٌ"۔ اس سے مراد اوثان (بت) اور شیطان ہیں۔ امام مجاہد اور ابن زید رحمہما اللہ

---

[1] تفسیر الطبري (٢٧٤/٢١) [2] تفسیر ابن کثیر (٦٣/٤)

نے کہا ہے کہ طاغوت شیطان ہے۔① امام ضحاک اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اوثان۔② کسی نے کہا کہ کاہن۔ کسی نے کہا کہ اسم اعجمی ہے مثل طالوت اور جالوت۔ کسی نے کہا عربی اسم ہے اور طغیان سے مشتق ہے، مگر اس میں قلب ہے بہ تقدیمِ لام برعین۔ مختار میں کہا ہے کہ طاغوت کا اطلاق واحد اور جمع پر کیا جاتا ہے اور مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ مصباح میں ہے۔③ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طاغوت جمع ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ واحد مونث ہو۔④

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طاغوت سے مراد شیاطین ہیں، طغیان سے فعلوت کا وزن ہے، مثل ملکوت و رحموت کے، مگر اس میں قلب ہے بہ تقدیمِ لام برعین، اطلاق کیا گیا ہے شیطان پر یا شیاطین پر، اس لیے کہ طاغوت مصدر ہے اور اس میں مبالغات ہیں، وہ یہ ہیں کہ ایک تو مصدر کے ساتھ نام رکھنا ہے، گویا عین شیطان طغیان ہے۔ دوسرے اس کی بنا بنائے مبالغہ ہے، کیوں کہ رحموت کے معنی رحمتِ واسعہ ہیں اور ملکوت کے معنی ملکِ مبسوط ہیں۔ تیسرے قلب ہے اور وہ خاص کرنے کے لیے ہے، اس لیے کہ غیر شیطان پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس جگہ اس سے مراد جمع ہے اور کسی نے ''الطواغیت'' پڑھا ہے۔⑤ انتہیٰ. طاغوت کی تفسیر سورۃ البقرہ میں پورے طور پر گزر چکی ہے۔⑥ معنی یہ ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے طاغوت کی عبادت سے اعراض کیا اور اللہ عزوجل کے ساتھ اپنی عبادت کو خاص کیا۔ ﴿ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر بدلِ اشتمال طاغوت سے۔ گویا یوں فرمایا کہ ''اِجْتَنَبُوْا عِبَادَةَ الطَّاغُوْتِ'' یعنی طاغوت کی عبادت سے اجتناب کیا۔

﴿ وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ﴾ معطوف ہے ﴿ اجْتَنَبُوا ﴾ پر، یعنی اور اللہ کے سوا سے اعراض کر کے بالکل اللہ کی طرف رجوع ہوئے اور اس کی عبادت پر متوجہ ہوئے۔ ﴿ لَهُمُ الْبُشْرٰى ﴾ یعنی ان کے لیے ثوابِ جزیل کی خوش خبری ہے جو بہشتِ عنبر سرشت ہے۔ یہ خوش خبری یا تو رسولوں کی زبان پر ہے، یا موت کے وقت فرشتوں کی زبان پر ملتی ہے، یا دوبارہ جی اُٹھنے کے وقت اللہ پاک کی طرف سے ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ﴾ [الأحزاب: ٤٤] ''جس دن یہ (اللہ سے) ملاقات کریں گے ان کا تحفہ سلام ہوگا۔'' اس سے کوئی مانع نہیں کہ سلام اللہ کی طرف سے ہو یا فرشتوں کی طرف سے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل بہت وسیع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے لیے دنیا میں اس طرح سے خوش خبری ہے کہ ان کے اعمالِ صالح کی ان اوقات میں تعریف کی جاتی ہے: قبر میں رکھتے وقت، آخرت میں قبر سے نکلتے وقت اور حساب کے لیے کھڑے ہونے کے وقت اور پل صراط پر سے گزرنے کے وقت، جنت میں داخل ہونے کے وقت اور جنت کے اندر۔ چنانچہ ان جگہوں میں سے ہر جگہ پر اُن کو بشارت حاصل ہوگی جو خیر، راحت، روح اور ریحان کی ایک قسم ہوگی۔

---

① تفسیر الطبري (٢٧٣/٢١) ② تفسیر القرطبي (٢٤٣/١٥) ③ مختار الصحاح (٤٠٣/١) المصباح المنير (١٩٤/١)
④ تفسیر القرطبي (٢٤٣/١٥) ⑤ تفسیر النسفي (٥١/٤) ⑥ رقم الآية (٢٥٦)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ﴾ میں ﴿ عِبَادِ ﴾ سے مراد عموم ہے، لہٰذا جو لوگ اجتنابِ طاغوت اور انابتِ الی اللہ کے ساتھ موصوف ہیں وہ بدخولِ اولیٰ اس میں داخل ہیں۔ کسی نے کہا کہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جن میں اجتنابِ طاغوت و اوثان اور انابتِ الی اللہ کی صفت ہے۔ یہ مقام تو ضمیر کا تھا، مگر مابعد کی صفت کو شامل کرنے کے لیے ضمیر کے بجائے اسم ظاہر رکھا ہے۔ معنی یہ ہیں، پس خوش خبری سنا میرے بندوں کو جو قولِ حق کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ سے سنتے ہیں، پھر اس میں سے احسن کی پیروی کرتے ہیں، یعنی محکم کی اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اس شے میں سے جس کا انھیں حکم کیا جاتا ہے بہتر کا اتباع کرتے ہیں، پھر اس شے کے ساتھ عمل کرتے ہیں جو اس میں ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو اچھی اور قبیح چیز کو سنتا ہے، پھر حسن کو تو بیان کرتا ہے اور قبیح سے باز رہتا ہے اور اس کو بیان نہیں کرتا۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآن کو اور غیر قرآن کو سنتے ہیں، پھر قرآن کا اتباع کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ رخصتوں اور عزیمتوں کو سنتے ہیں اور عزیمتوں کا تو اتباع کرتے ہیں اور رخصتوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ عفو کو لے لیتے ہیں اور عقوبت کو چھوڑ دیتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سعید بن زید، ابو ذر اور سلمان رضی اللہ عنہم جاہلیت میں احسن القول و الکلام "لا إله إلا الله" کا اتباع کرتے تھے، اس کے بارے میں کہا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی۔[2]

پھر اللہ پاک نے ان لوگوں کی یہ تعریف کی: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾، یعنی یہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حق کی طرف پہنچایا ہے اور یہی صحیح عقل والے ہیں، کیوں کہ انھوں نے اپنی عقلوں سے فائدہ اٹھایا اور اُن کے علاوہ دوسرے لوگوں نے اپنی عقلوں سے فائدہ نہ اٹھایا۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا ہے کہ جب ﴿ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ... الآية ﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ایک منادی بھیجا اور اس نے یہ ندا کی کہ جو کوئی اس حال میں مرا کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کرتا تو وہ جنت میں داخل ہوا، چنانچہ وہ قاصد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا تو انھوں نے اس کو واپس بھیج دیا۔ پھر عرض کی: یا رسول اللہ! میں اس سے ڈرا کہ لوگ بھروسا کر لیں گے اور عمل نہیں کریں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر لوگ میرے رب کی رحمت کی قدر جان لیتے تو البتہ بھروسا کر لیتے اور اگر میرے رب کے غصے اور اس کی سزا کی قدر جان لیتے تو اپنے اعمال کو بہت چھوٹا سمجھتے۔[3] اس حدیث کی اصل صحیح میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے۔[4]

---

[1] فتح القدير (٤/٦٠٠) [2] الدر المنثور (٢١٧/٧)
[3] الدر المنثور (٢١٨/٧) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣١)

اس آیتِ کریمہ میں ایثارِ اتباع اور ترکِ تقلید کی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے متبعین کی تعریف یوں فرمائی ہے کہ وہ مہدیین ہیں اور ان کا نام اولی الالباب رکھا اور قرآنِ کریم میں کسی جگہ پر نہ تقلید کی تعریف کی نہ اس کے اہل کی، بلکہ اس کی اور اس کے اہل کی کئی جگہ مذمت کی ہے، چنانچہ بارہا اس کا ذکر کیا گیا ہے۔[1] (كذا في فتح البيان)

غرضیکہ یہ ذکر تو اُن لوگوں کا تھا جن کے حق میں نیک بختی سابق ہو چکی تھی۔ پھر اللہ پاک نے ان کا ذکر کیا جن کے لیے بدبختی سابق ہو چکی اور وہ سعادت سے محروم ہوئے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۝ 19

کیا پھر جس شخص پر عذاب کی بات ثابت ہو چکی ہو تو (اے نبی!) کیا آپ اسے چھڑا لیں گے جو آگ (دوزخ) میں ہے؟ ⑲

بدبختوں کا انجامِ بد:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا وہ شخص جس کو اللہ لکھ چکا ہے کہ وہ شقی اور بدبخت ہے، تو کیا تو اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ اس شخص کو اس گمراہی اور ہلاکت سے، جس میں وہ ہے، چھڑا لے، یعنی اللہ کے گمراہ کرنے کے بعد کوئی اس کو ہدایت نہیں دے سکتا، اس لیے کہ "مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ"، یعنی جس کو اللہ گمراہ کرے تو اس کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور جس کو وہ ہدایت کرے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ موصولہ ہے محلِ رفع میں بنا بر ابتداء اور خبر محذوف ہے۔ "أَيْ: كَمَنْ يَّخَافُ، أَوْ فَأَنْتَ تُخَلِّصُهٗ أَوْ تَتَأَسَّفُ عَلَيْهِ"، یعنی کیا وہ شخص جس پر عذاب کا کلمہ ثابت ہوا اس شخص کی طرح ہے جو ڈرتا ہے یا پھر تو اسے چھڑائے گا یا تو اس پر افسوس کرے گا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ﴿ مَنْ ﴾ شرطیہ ہو اور اس کا جواب ﴿ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴾ ہو، چنانچہ حرفِ فاء فائے جواب ہے جو جملہ جزا پر داخل ہوا ہے اور ہمزۂ انکار کو دوبارہ اس لیے لایا گیا ہے کہ انکار کے معنی کی تاکید ہو جائے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طولِ کلام کی وجہ سے استفہام کو دوبارہ لایا گیا ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کیا پھر تو اس شخص کو چھڑائے گا جس پر عذاب کا کلمہ ثابت ہو گیا۔ اس جگہ کلمۂ عذاب سے یہ آیت مراد ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے خطاب کیا ہے: ﴿ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ

---

[1] فتح البیان (١٢/٩٦-٩٨) [2] تفسیر ابن کثیر (٤/٦٣)

تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [ص: ٨٥] ''تجھ سے اور تیرے تمام ماننے والوں سے میں (بھی) جہنم کو بھر دوں گا۔'' اور یہ آیت: ﴿ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١٨] ''جو شخص ان میں سے تیرا کہا مانے گا میں ضرور تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔''[1] کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک کا یہ قول ہے: «هٰؤُلَآءِ فِي النَّارِ وَلَا اُبَالِيْ»[2] آیت کے معنی رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا ہے، اس لیے کہ آپ کو اپنی قوم کے ایمان لانے کی حرص تھی۔ چنانچہ اللہ پاک نے آپ کو بتلا دیا کہ جس شخص پر قضا ثابت ہو چکی ہے اور اس پر اللہ کا کلمہ ثابت ہو چکا ہے اللہ کا رسول ﷺ یہ قدرت نہیں رکھتا کہ اس کو آگ سے خلاصی دے، اس طرح سے کہ اس کو مومن کر دے۔

امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ابو لہب اور اس کا بیٹا اور آپ ﷺ کے کنبے کے وہ لوگ ہیں جو ایمان سے متخلف (دور) رہے۔[3] آیت میں مجاز ہے باطلاقِ سبب و ارادۂ مسبب، اور اس بات سے آگاہ کیا گیا ہے کہ جس شخص پر عذاب کا حکم کیا گیا ہے، وہ اس شخص کی طرح ہے جو آگ میں پڑا ہے اور آپ کا اس کو ایمان کی طرف بلانا اس کو آگ سے چھڑانے کی طرح ہے۔ اصل کلام یہ ہے: ''أَفَأَنْتَ تَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُنْغَمِسٌ فِي الضَّلَالِ'' یعنی کیا تو اس کو ہدایت کرے گا جو گمراہی میں ڈوبا ہوا ہے۔ چنانچہ نار کو ضلال کی جگہ رکھا مسبب کو موضعِ سبب میں رکھنے کے لیے اس کے امر کی قوت کے سبب سے، پھر مجاز کے عقب میں وہ شے لائی گئی جو اس کے لیے مناسب ہے۔ یعنی لفظ ﴿ تُنْقِذُ ﴾ بعوض ''تَهْدِيْ'' کے تو یہ مجاز کی ترشیح ہوئی یا مختصر طور پر یوں کہو کہ جو شخص عذاب کا مستحق ہے، اس کو اس شخص کی طرح ٹھہرایا جو عذاب میں ہے اور اس شخص کے ایمان کی طرف بلانے کو عذاب سے نکالنے کے قائم مقام کیا۔ بالجملہ جب اللہ پاک نے پہلے یہ ذکر کیا کہ اہلِ شقاوت کے لیے اوپر اور نیچے آگ کے طبق ہیں تو استدراک کیا ان سے ان لوگوں کا جو اہلِ سعادت سے ہیں، یعنی ان کا مقابلہ کیا۔ چنانچہ فرمایا:[4]

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴿۲۰﴾

لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈر گئے، ان کے لیے بالا خانے ہیں، ان کے اوپر (اور) بالا خانے بنے ہوئے ہیں، جبکہ ان کے نیچے نہریں جاری ہیں، (یہ) اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا ⑳

متقیوں کے لیے جنت کے بالا خانے:

یہ وہی لوگ ہیں جن کو ﴿ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴾ کا خطاب کیا گیا اور اُن کی صفاتِ فاضلہ بیان کی گئیں، وہ صفات

[1] فتح القدير (٤/٦٠٠)
[2] مسند أحمد (٤/١٨٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٨)
[3] فتح القدير (٤/٦٠٠)
[4] فتح البيان (١٢/٩٨)

جن کا شمار کیا گیا۔ اور پہلے جو ﴿ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ﴾ مذکور ہے اس کے مخاطب بھی یہی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لٰكِنِ ﴾ استدراک کے لیے نہیں ہے، کیوں کہ اس سے پہلے نفی نہیں آئی ہے۔ بلکہ یہ ایک قصے سے دوسرے قصے کی طرف پھرنا ہے جو پہلے قصے کے مخالف ہے، معنی یہ ہیں: لیکن وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے رہے، ان کے لیے جنت میں بلند منازل ہیں، ان کے اوپر اور منازل ہیں جو اُن سے بھی زیادہ بلند ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ جنت کے درجے ہیں بعض درجے بعض کے اوپر اور وہ درجے چنے ہوئے ہیں مکانوں کی چنائی کی طرح اپنی بنیاد کی اور چنائی کی پختگی میں۔ اگرچہ دنیا کی منازل ان کی نسبت کچھ کم نہیں ہیں۔ ان اوپر نیچے والے بالا خانوں کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔ اس میں ان کی رونق اور تازگی کا کمال ہے اور ان کی رونق کی زیادتی ہے۔

﴿ وَعْدَ اللّٰهِ ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ مضمونِ جملہ کا مفعول مطلق مؤکد ہے، اس لیے کہ ﴿ لَهُمْ غُرَفٌ ﴾ اس معنی میں ہے کہ "وَعَدَهُمُ اللّٰهُ ذٰلِكَ"، یعنی اللہ پاک نے بالاخانوں کا ان سے وعدہ کیا ہے، جیسا وعدہ کرنے کا حق ہے، مطلب یہ ہے کہ پکا وعدہ ہے۔ پھر ﴿ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴾ کے جملہ سے اس وعدے کی اور تقریر و تثبیت فرمائی، یعنی اللہ تعالیٰ اس خیر وشر کا خلاف نہیں کرے گا جس کا اس نے دونوں فریق سے وعدہ کیا ہے۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اہلِ جنت اپنے اوپر کے بالاخانوں والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح کوکب درّی غابر کو دیکھتے ہیں، یعنی چمکتے تارے باقی کو (غابر کے ایک معنی یہ ہیں کہ ذاہب و ماضی، یعنی جانے والا ڈوبنے کے قریب ہوا اور آنکھوں سے دور ہو گیا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ افق میں فجر کی روشنی پھیلنے کے بعد باقی ہے، کیوں کہ وہ اس جانب میں چھپتا ہے۔ ایک روایت میں غائرغور سے ہے مراد غربی جانب میں اس کا انحطاط ہے، یہاں تک کہ دیکھنے سے دور ہوتا ہے، اس سے غرض غرفوں کی دوری کا بیان ہے)۔ یعنی جس طرح کہ چمکتے تارے باقی کو مشرقی یا مغربی اُفق میں دیکھتے ہیں، اس شے کے تفاضل (مقابلے) کے لیے جو اُن کے درمیان ہے۔ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! وہ تو انبیاء کے منازل ہیں، وہاں ان کے علاوہ کوئی اور نہ پہنچ سکے گا۔ فرمایا: کیوں نہیں، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ مرد جو ایمان لائے اللہ پر اور رسولوں کی تصدیق کی، یعنی یہ لوگ وہاں پہنچیں گے۔[1] (متفق عليه كذا في فتح البيان)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پھر اللہ پاک نے اپنے نیک بندوں کے بارے میں خبر دی کہ ان کے لیے جنت میں غرفے ہیں، یعنی اونچے اونچے محل، ان کے اوپر سے اور غرفے چنے ہوئے، طبق پر طبق چنے ہوئے، محکم و مضبوط اور مزین و بلند۔ عبداللہ بن امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک جنت میں البتہ غرفے ہیں، ان کا اندر کا حصہ باہر سے نظر آتا ہے اور باہر کی چیزیں اندر سے نظر آتی ہیں۔ پس ایک

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣١) فتح البيان (١٢/ ٩٩، ١٠٠)

اعرابی نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! وہ کس کے لیے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:« لِمَنْ أَطَابَ الْكَلَامَ وَأَطْعَمَ الطَّعَامَ وَصَلَّى بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ » یعنی اس شخص کے لیے ہیں جس نے اچھی بات کی اور کھانا کھلایا اور رات کو جب لوگ سوتے ہیں اس نے نماز پڑھی۔[1] (رواه الترمذي من حديث عبدالرحمن بن إسحاق وقال: حسن غريب وقد تكلم بعض أهل العلم فيه من قبل حفظه)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک جنت میں البتہ غرفے ہیں کہ ان کا ظاہر ان کے باطن سے دکھائی دیتا ہے اور ان کا باطن ان کے ظاہر سے دکھائی دیتا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے تیار کیا ہے جس نے کھانا کھلایا اور نرم بات کی اور پے در پے روزے رکھے اور اس حال میں نماز پڑھی کہ لوگ سو رہے ہیں۔[2] (تفرد به أحمد من حديث عبدالله نن معانق الأشعري عن أبي مالك الأشعري رضي الله عنه به) امام احمد رحمہ اللہ نے سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک اہلِ جنت البتہ جنت میں غرفے کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح کہ تم آسمان میں تارے کو دیکھتے ہو۔ امام ابو حازم رحمہ اللہ کہتے ہیں جو سہل سے راوی ہیں۔ پھر میں نے یہ حدیث نعمان بن ابی عیاش سے بیان کی تو نعمان نے کہا: میں نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو سنا کہ وہ یوں کہتے تھے: جیسے تم تارے کو دیکھتے ہو جو شرقی اُفق میں ہے، یا غربی اُفق میں۔[3] (أخرجاه في الصحيحين من حديث أبي حازم وأخرجاه أيضا في الصحيحين من حديث مالك عن صفوان بن سليمان عن عطاء بن يسار عن أبي سعيد رضي الله عنه عن النبي ﷺ)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک اہلِ جنت البتہ دیکھیں گے جنت میں اہلِ غرف کو، جس طرح تم دیکھتے ہو کوکب دری غارب فی الافق طالع کو (كما تراءون الكوكب الدري الغارب في الأفق الطالع۔ معلوم ہوتا ہے غارب و طالع دونوں کوکب کی صفتیں ہیں، یعنی ایسا چمکتا ہوا تارا جو اُفق میں غروب ہونے والا ہے اور ابھی اُفق پر طالع ہے غروب نہیں ہو چکا۔ والله أعلم)۔ یعنی اہلِ درجات کی فضیلت اس طرح ہو گی۔ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! وہ تو نبی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اور وہ قومیں ہیں جو اللہ پر ایمان لائیں اور رسولوں کی تصدیق کی۔[4] (و رواه الترمذي عن سويد عن ابن المبارك عن فليح به وقال: حسن صحيح)

---

① مسند أحمد (١٥٥/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٨٤)

② مسند أحمد (٣٤٣/٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٤٤١/٣)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٠) مسند أحمد (٣٤٠/٥)

④ مسند أحمد (٣٣٩/٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٥٦) صحيح الترغيب والترهيب (٢٥٨/٣)

امام احمد رحمہ اللہ نے ابو المدلہ مولی ام المومنین رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ ابو المدلہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو سنا کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! جس وقت ہم آپ کو دیکھتے ہیں تو ہمارے دل نرم ہو جاتے ہیں اور ہم اہلِ آخرت میں سے ہوتے ہیں، پھر جس وقت ہم آپ سے جدا ہوتے ہیں تو دنیا ہم کو پسند آتی ہے اور ہم عورتوں کو اور اولاد کو سونگھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ہر وقت تمھارا وہی حال ہوتا جو میرے پاس ہوتا ہے تو البتہ فرشتے تم سے اپنی ہتھیلیوں کے ساتھ مصافحہ کرتے اور تمھارے گھروں میں جا کر تمھاری زیارت کرتے اور اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ عزوجل ایک ایسی قوم کو لاتا جو گناہ کرتی، تاکہ ان کو بخشے۔ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ ہم سے جنت کا حال بیان فرمائیں کہ اس کی بنیاد کیسی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی۔ اس کا گارا مشکِ اذفر ہے، (یعنی تیز خوشبو) اور اس کی کنکریاں موتی اور یاقوت اور اس کی مٹی زعفران ہے۔ جو شخص اس میں داخل ہوگا وہ نعمت میں رہے گا محتاج نہ ہوگا۔ وہ ہمیشہ جیے گا اور مرے گا نہیں، اس کے کپڑے پرانے نہ ہوں گے اور اس کی جوانی فنا نہ ہوگی۔ تین آدمی ہیں جن کی دعا رد نہیں کی جاتی: امامِ عادل اور روزہ دار یہاں تک کہ افطار کرے اور مظلوم کی دعا ابر پر اٹھائی جاتی ہے اور اس کے لیے آسمانوں کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: قسم ہے مجھے اپنی عزت کی! البتہ میں تیری مدد کروں گا، اگرچہ ایک وقت کے بعد ہو۔[1]

(وروى الترمذي و ابن ماجه بعضه من حديث سعد أبي مجاهد الطائي وكان ثقة عن أبي المدلة وكان ثقة به)

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ یعنی غرفوں کے درمیان نہریں چلیں گی جس طرح چاہیں گے اور جہاں چاہیں گے۔ ﴿ وَعْدَ اللّٰهِ ﴾ یعنی یہ جو ہم نے ذکر کیا ایک وعدہ ہے کہ اللہ نے اپنے مومن بندوں سے اس کا وعدہ فرمایا ہے۔ ﴿ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِیْعَادَ ﴾[2] بالجملہ جب اللہ پاک نے جنت کا ذکر کیا اور اس کی ایسی صفت کی جو اس کی طرف رغبت اور شوق کا موجب ہوتی ہے تو اس کے بعد دنیا کا ذکر کیا اور اس کی ایسی صفت کی جو اس سے نفرت اور بے رغبتی کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ چنانچہ دنیا کے جلد زوال پذیر ہونے اور اس کے تیزی سے متغیر ہونے میں ایک مثال بیان کی اور اس کے ساتھ اللہ پاک کی واضح قدرت کی قسموں میں سے ایک قسم کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ ۝۲۱

[1] مسند أحمد (٣٠٤/٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٩٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٥٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢٥٩/٣)

[2] تفسير ابن كثير (٦٣/٤، ٦٤)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر اسے زمینی چشموں سے جاری کیا، پھر وہ اس کے ذریعے سے کھیتی نکالتا ہے، جبکہ اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، پھر وہ (پک کر) خشک ہو جاتی ہے، آپ اسے زرد ہوئی دیکھتے ہیں، پھر وہ اسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے، بلاشبہہ اس میں عقل والوں کے لیے نصیحت ہے﴿21﴾

دنیا کی زندگی کی ایک مثال:

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ زمین میں پانی کی اصل آسمان سے ہے، جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٤٨] ''اور ہم آسمان سے پاک پانی برساتے ہیں۔'' چنانچہ جب آسمان سے پانی اتارا تو اس کو زمین میں مستور کیا، پھر اس کو زمین کے اجزاء میں گردش دیتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس کو چھوٹے بڑے چشمے بنا کر نکالتا ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی پھر وہ پانی زمین کے چشموں میں چلایا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ زمین میں نہیں ہے کوئی پانی، مگر وہ آسمان سے نازل ہوا ہے، لیکن زمین میں رگیں ہیں، وہ اس کو گہرا اور عمیق کر دیتی ہے (اصل روایت کے الفاظ: ''ولکن عروق في الأرض تغیرہ'' ہیں۔ یا تو یہ غور سے ہے، یعنی زمین کی رگیں پانی کو غائر کر دیتی ہیں اور جلد اس کو لے جاتی ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ اصل پانی آسمان سے ہے اور شیریں ہے، لیکن زمین کی یہ رگیں اس کو پی کر متغیر کر دیتی ہیں، ان کی وجہ سے اس میں تلخی آجاتی ہے، پھر کوئی تلخ کو شیریں کرنا چاہے تو اس کو چڑھالے۔ واللّٰہ أعلم)۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ﴾ پس جس کسی کو یہ بات پسند ہو کہ وہ میٹھا ہو جائے تو چاہیے کہ اس کو چڑھالے۔[1] اسی طرح امام سعید بن جبیر اور عامر شعبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ جو پانی زمین میں ہے اس کی اصل آسمان سے ہے۔[2] امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اس کی اصل ثلج سے ہے، یعنی برف سے جو تہہ بر تہہ پہاڑوں پر جمع ہو جاتی ہے، پھر ان کی تہہ میں ٹھہرتا ہے، پھر ان کے نیچے سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ یعنی پھر اس پانی سے جو آسمان سے اترا ہے اور اس پانی سے جو زمین سے نکلا ہے اللہ تعالیٰ کھیتی نکالتا ہے، جس کی شکلیں اور مزے اور خوشبو اور فائدے مختلف ہیں۔ ﴿ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ﴾ پھر وہ کھیتی اپنی تر و تازگی اور جوانی کے بعد کہول (ادھیڑ) ہو جاتی ہے تو تُو دیکھے گا کہ اس کا رنگ زرد کہ اس میں خشکی ہوتی ہے۔ ﴿ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطٰمًا ﴾ یعنی پھر وہ خشک ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ ﴿ اِنَّ فِيْ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٤٩)
[2] تفسیر الطبري (٢١/٢٨٦)

﴿ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ﴾ یعنی اس میں ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو نصیحت پذیر ہوتے ہیں۔ وہ عبرت لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا بھی اسی طرح سبز وتر وتازہ ہوتی ہے، پھر بڑھیا کی طرح بدصورت ہو جاتی ہے اور جوان حسین و جوان آدمی بڑا بوڑھا اور کمزور ہو جاتا ہے، اس کے بعد موت ہے۔ چنانچہ نیک بخت وہ شخص ہے کہ اس کا حال اس کے بعد، یعنی موت کے بعد خیر کی طرف ہو۔

اللہ پاک اکثر حیاتِ دنیا کی مثال پانی کے ساتھ بیان فرماتا ہے جس کو آسمان سے نازل کرتا ہے، پھر اس سے کھیتیاں اور میوے اُگاتا ہے، پھر اس کے بعد وہ ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴾ [الكهف: ٤٥] ''ان کے سامنے دنیا کی (بھی) مثال بیان کرو جیسے پانی جسے ہم آسمان سے اتارتے ہیں اس سے زمین کا سبزہ ملا جلا (نکلا) ہے، پھر آخر کار وہ چوراچورا ہو جاتا ہے جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''[1] (كذا في ابن كثير)

بر زمینے کہ ہمی ے گزری ساکن رو   کہ عیون ست وخطوط ست وقدود ست وخدود
اینہمہ چشمۂ خورشید جہان افروز ست   کہ ہمیں تافت بر آرامگہ عاد وثمود

''وہ زمین جس پر سے تو گزر رہا ہے اس کے باشندے چشمے، نرم زمین اور کوڑا کرکٹ وغیرہ اشیاء ہیں۔
یہ تمام جہان کو روشن کرنے والے سورج کے منبع ہیں کہ یہی عاد وثمود کی آرام گاہوں پر غضبناک ہوا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ السَّمَآءِ ﴾ سے مراد سحاب اور ﴿ مَآءً ﴾ سے مراد بارش، یعنی آبِ باراں ہے۔ ''سَلَكَهٗ'' کے معنی ہیں: ''أَدْخَلَهٗ وَ أَسْكَنَهٗ''۔ ﴿ يَنَابِيْعَ ﴾ سے مراد ''عیون و مسالک ومجاری ورکایا'' یعنی چشمے اور راہیں اور کنویں ہیں۔ ﴿ يَنَابِيْعَ ﴾ جمع ہے ''يَنْبُوْعٌ'' کی، ماخوذ ہے ''نَبَعَ الْمَاءُ يَنْبَعُ'' سے اور ''يَنْبُوْعٌ'' پانی کے چشمے کو کہتے ہیں اور زمین کی وہ دراڑیں جن سے پانی اُبلتا ہے یا خود جاری پانی کو کہتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابر سے یا آسمان سے پانی اتارا، پھر اس کو زمین میں داخل کیا اور ٹھہرایا اور اس کو بہتے ہوئے چشمے کر دیا، یا اس کو ﴿ يَنَابِيْعَ ﴾ میں کر دیا، یعنی ان جگہوں میں جن سے پانی ابلتا ہے۔ چنانچہ دوسرے معنی کی بنا پر ﴿ يَنَابِيْعَ ﴾ منصوب ہے بہ بنزعِ خافض، یعنی اصل میں ''فِيْ يَنَابِيْعَ'' تھا، پھر کلمۂ ''فِيْ'' کو حذف کر دیا تو منصوب ہو گیا، یا اس کو زمین میں بہتا ہوا پانی کر دیا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ پھر کر دیا اس کو زمین میں کنویں اور چشمے۔[2]

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/٦٤، ٦٥) [2] فتح القدير (٤/٦٠٢)

﴿ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ مضارع کا صیغہ نکالنے کے عمل کو زمانہ حال میں بیان کرنے کے لیے ہے، یعنی پھر اس پانی کے ذریعے سے زمین میں سے کھیتی نکالتا رہتا ہے، جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، کوئی زرد، کوئی سبز، کوئی سفید اور کوئی سرخ۔ یا "أَلْوَان" سے مراد قسمیں ہیں، یعنی کوئی گیہوں ہے، کوئی جو ہے، کوئی چنا ہے اور کوئی جوار ہے، ان کے سوا اور قسموں کے دانے وغیرہ۔

"زَرْعٌ" کے لفظ میں وہ سب اشیاء شامل ہیں جو اُگائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ جانوروں کا گیلا چارا بھی اس میں شامل ہے۔ "هَيْج" خشک ہونے اور سوکھنے کو کہتے ہیں۔ جب روئیدگی کا سوکھنا پورا ہو جائے اور اپنے اُگنے کی جگہ سے اس کے منتشر ہونے کا وقت آ جائے تو اس وقت محاورے میں یوں بولتے ہیں کہ "هَاجَتِ النَّبْتُ يَهِيْجُ هَيْجًا".

امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "هَاجَ النَّبْتُ هِيَاجًا" بولتے ہیں، جب روئیدگی خشک ہو جائے اور جس زمین کی روئیدگی سوکھ گئی یا زرد پڑ گئی تو اس کو "أَرْضٌ هَائِجَةٌ" کہتے ہیں۔ "أَهَاجَتِ الرِّيْحُ النَّبْتَ" یعنی ہوا نے روئیدگی کو سکھا دیا۔

امام مبرد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هَاجَتِ الْأَرْضُ تَهِيْجُ" اس وقت بولتے ہیں جب روئیدگی پشت پھیرے، یعنی جاتی رہے۔ کہا اور اسی طرح "هَاجَتِ النَّبْتُ" ہے۔[1] "حُطَامٌ" کہتے ہیں: شے متفتت ومتکسر کو، یعنی ریزہ ریزہ ہو جانے والی کو۔ یہ اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ جب لکڑی خشکی کے مارے ریزہ ریزہ ہو جائے تو کہتے ہیں: "تَحَطَّمَ الْعُوْدُ" اور جب جانور بڑی عمر کا ہو جائے تو اس کو "حُطَمَةٌ" کہتے ہیں۔ "حطم" متعدی بہ حرکت ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں: "حَطَمْتُهٗ حَطْمًا مِنْ بَابِ ضَرَبَ فَانْحَطَمَ" اور "حَطَّمْتُهٗ" بہ تشدید مبالغہ ہے۔ جمہور نے ﴿ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے، ماقبل پر معطوف کیا ہے اور ابو بشر نے بہ نصب بہ اضمار "أَنْ" پڑھا ہے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ معنی یہ ہیں: پھر وہ سوکھ جاتی ہے تو تُو اس کو اس کی سبزی وتر وتازگی اور حسن ورونق کے بعد دیکھے کہ اس کی سبزی جاتی رہی اور تازگی زائل ہو گئی۔ پھر اس کو ریزے ریزے کر ڈالتا ہے۔

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ یعنی یہ پانچ باتیں جن کا ذکر ہوا ان میں صحیح عقل والوں کے لیے البتہ نصیحت ہے، کیوں کہ یہی لوگ اشیاء کی حقیقت کو سمجھتے ہیں، پھر غور وفکر کرتے ہیں اور عبرت حاصل کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ حیاتِ دنیا کا حال سرعتِ انقطاع (جلدی ختم ہو جانا) اور قرب التمام ہونے میں اور اس کی تر وتازگی اور رونق ونضارت کے چلے جانے میں اس کھیتی کی طرح ہے۔ چنانچہ جب ان کا غور وفکر کرنا اور عبرت حاصل کرنا، ان کو یہ بات جاننے کا فائدہ دے گا تو وہ اس سے دھوکا نہ کھائیں گے اور نہ اس کی طرف مائل ہوں گے اور نہ ہی اس دارِ فانی کو دارِ آخرت، یعنی ہمیشہ کی نعمتوں اور لذتِ خالصہ کے گھر پر اس کو اختیار کریں گے اور اس بات میں ان کو کوئی شک باقی نہ رہے گا کہ اللہ پاک دوبارہ زندہ کرنے اور حشر کرنے پر قادر ہے، کیوں کہ جو اس پر قادر ہوا، وہ اُس پر بھی

[1] تفسير القرطبي (١٥/ ٢٤٦)

قادر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ایک مثال ہے جس کو اللہ پاک نے بیان فرمایا قرآن شریف کے لیے اور سینوں کے لیے۔
﴿ مَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے قرآن اتارا، پھر اس کو مومنوں کے دلوں میں داخل کیا۔ پھر اس سے دین کو نکالتا ہے جس کا بعض بعض سے افضل ہے۔ لہٰذا مومن تو ایمان اور یقین کو زیادہ کرتا ہے اور جس کے دل میں مرض ہے تو وہ خشک ہوتا ہے جس طرح کھیتی خشک ہوتی ہے۔ بہ نسبت تفسیر کے اس کو تغیر سے زیادہ مشابہت ہے۔ پھر جب اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ اس میں عقل والوں کے لیے نصیحت ہے تو اسلام کے لیے شرح صدر کا ذکر کیا، اس لیے کہ کامل نفع اسی شرح صدر سے حاصل ہوتا ہے۔[1] چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٢﴾ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٢٣﴾

کیا پھر جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پر ہے، (وہ سخت اور تنگ دل کافر کے برابر ہوسکتا ہے؟) چناں چہ ہلاکت ہے ان کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد کے معاملے میں سخت ہیں، وہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں (22) اللہ نے بہترین کلام نازل کیا جو ایک کتاب ہے باہم ملتی جلتی، بار بار دہرائی جانے والی، جس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی جلدیں اور ان کے دل اللہ کی یاد کی طرف نرم (ہو کر مائل) ہو جاتے ہیں، یہی اللہ کی ہدایت ہے، وہ اس کے ذریعے سے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں (23)

حق والے اور باطل پرست برابر نہیں ہیں:

آپس میں ملتی جلتی کتاب، یعنی خوبی میں کوئی آیت کم نہیں۔ دہرائی ہوئی، یعنی ایک مدعا کئی کئی طرح سے بیان کیا۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلٰمِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾ یعنی کیا وہ

[1] فتح البیان (۱۲/۱۰۰، ۱۰۱)

شخص جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پر ہے، اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جو سخت دل ہے اور حق سے دور پڑا ہوا ہے؟ ہرگز نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ﴾ [الأنعام: ١٢٢] ''ایسا شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور دے دیا کہ وہ اس کو لیے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیا ایسا شخص اس کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں سے نکل ہی نہیں پاتا؟'' اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ یعنی ذکر اللہ کے وقت ان کے دل نرم نہیں ہوتے، نہ ہی خشوع و عاجزی کرتے ہیں، نہ یاد رکھتے ہیں نہ سمجھتے ہیں، وہ صریح گمراہی میں ہیں۔

کلام الٰہی قرآنِ مجید کی مدح سرائی:

قولہ تعالیٰ: ﴿ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ﴾ یہ اللہ عزوجل کی طرف سے اپنی کتاب قرآنِ عظیم کی مدح ہے جو اس کے رسولِ کریم ﷺ پر نازل کی گئی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی سارا قرآن متشابہ ﴿ مَّثَانِيَ ﴾ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کے مشابہ ہوتی ہے اور ایک حرف دوسرے حرف کے مشابہ ہوتا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک بات بار بار کہی، تاکہ اپنے رب تبارک و تعالیٰ سے سمجھیں۔ امام عکرمہ اور حسن رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس میں قضا کو دہرایا۔ حسن نے اتنا زیادہ کہا ہے کہ ایک سورت میں ایک آیت ہوتی ہے اور دوسری سورت میں ایک آیت ہوتی ہے جو اس کے مشابہ ہوتی ہے۔ عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَّثَانِيَ ﴾ سے مراد ''مُرَدَّدٌ'' ہے، یعنی بار بار دہرایا ہوا۔ موسیٰ، صالح اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر قرآن میں بہت جگہ بار بار کیا ہے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے لفظ ﴿ مَّثَانِيَ ﴾ کی تفسیر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ سے روایت کی ہے کہ قرآن کا بعض حصہ بعض کے مشابہ ہوتا ہے اور اس کا بعض بعض پر رد کیا جاتا ہے،[1] یعنی ایک آیت دوسری آیت پر محمول ہوتی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے اور سفیان بن عیینہ سے بھی مروی ہے کہ ﴿ مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ کبھی تو قرآن شریف کے سیاقات ایک معنی میں ہوتے ہیں، چنانچہ یہ تو متشابہ سے ہیں اور کبھی اس طرح سے ہوتے ہیں کہ کسی شے کا ذکر اس کی ضد کے ساتھ کیا جاتا ہے، جیسے: مومنین کا ذکر، پھر کافرین کا ذکر اور جیسے جنت کی صفت پھر نار کی صفت، یا جو اس کے مشابہ ہے، چنانچہ یہ مثانی سے ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴾ [الإنفطار: ١٣۔ ١٤] ''یقیناً نیک لوگ (جنت کے عیش و آرام اور) نعمتوں

[1] تفسیر الطبري (٢١/٢٨٩، ٢٨٠) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٥)

میں ہوں گے اور یقیناً بدکار لوگ دوزخ میں ہوں گے۔'' نیز جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ﴾ [المطففين: ٧] ''یقیناً بدکاروں کا نامۂ اعمال سجین میں ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴾ [المطففين: ١٨] ''یقیناً نیکوکاروں کا نامۂ اعمال علیین میں ہے۔'' نیز جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هٰذَا ذِكْرٌ ؕ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴾ [صٓ: ٤٩] ''یہ نصیحت ہے اور یقین مانو کہ پرہیزگاروں کی بڑی اچھی جگہ ہے۔'' نیز جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴾ [صٓ: ٥٥] ''(یاد رکھو) کہ سرکشوں کے لیے بڑی بری جگہ ہے۔'' اس جیسے اور سیاقات۔ یہ سب مثانی سے ہیں، یعنی دو معنوں میں اور جب سارا سیاق ایک ہی معنی میں ہو، بعض بعض کے مشابہ ہو تو یہ متشابہ ہے اور یہ متشابہ اس متشابہ سے نہیں ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ ﴿ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ ﴾ [آل عمران: ٧] ''اس میں واضح مضبوط آیتیں ہیں جو اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ آیتیں ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ﴾ یہ ابرار کی صفت ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ جبار، مہیمن، عزیز اور غفار کے کلام کو سنتے ہیں تو اس کے وعد و وعید اور تخویف و تہدید کے سبب سے جس کو وہ اس کلام سے سمجھتے ہیں، ان کے چمڑے اور دل خوف و خشیت کے مارے نرم ہوتے ہیں اور اللہ کی یاد کرتے ہیں، اس رحمت اور لطف کے سبب سے جس کی انھیں اُمید اور آرزو ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ کئی وجہ سے اپنے غیر کے مخالف ہیں، ان کے غیر یہی فجار لوگ ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ان کا سننا، یعنی نیک لوگوں کا سننا تو تلاوتِ آیات کا ہے اور ان کا، یعنی ان کے غیر لوگوں کا سننا شعر و شاعری کا سننا اور ''أصوات القينات'' یعنی گانے والی عورتوں کو سننا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب ان پر رحمان کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ ادب، خشیت، رجا، محبت، فہم اور علم سے سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر پڑتے ہیں، جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ [الأنفال: ٢۔ ٤] ''بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ سچے ایمان والے یہ لوگ ہیں ان کے لیے بڑے درجے ہیں ان کے رب کے پاس اور مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴾ [الفرقان: ٧٣] ''اور جب انھیں اُن کے رب کے کلام کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ اندھے بہرے ہو کر اُن پر نہیں

گرتے۔'' یعنی ان کے سننے کے وقت وہ کسی اور کام میں مشغول نہیں ہوتے، نہ کھیل کود کرتے ہیں اور نہ غافل ہوتے ہیں، بلکہ ان کی طرف کان لگائے ہوتے ہیں اور ان کے معانی کو سمجھتے اور جانتے ہوتے ہیں۔ اسی لیے جو ان کے ساتھ عمل کرتے ہیں اور ان کے پڑھتے وقت سجدہ کرتے ہیں تو وہ بصیرت سے کرتے ہیں نہ کہ جہالت اور نادانی سے اور نہ ہی اپنے غیر کی تابعداری کرتے ہوئے سجدہ کرتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ آیات کے سننے کے وقت ادب کو لازمی طور پر ملحوظ رکھے ہوتے ہیں، جس طرح کہ صحابہ رضی اللہ عنہم تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اللہ کا کلام سننے کے وقت اُن کے بال ان کے چمڑوں پر کھڑے ہو جاتے تھے، پھر ان کے دلوں کے ساتھ اللہ کے ذکر کے لیے نرم ہو جاتے۔ وہ زبردستی چیختے چلاتے نہ تھے اور نہ تکلف کرتے تھے اس شے کے ساتھ جو اُن میں نہ تھی، بلکہ ان کے پاس ثبات، سکون، ادب اور خشیت اس قدر تھا جو کسی اور کے پاس نہیں تھا، اسی لیے ان کو یہ بلند مرتبہ نصیب ہوا کہ ربِ اعلیٰ نے دنیا و آخرت میں ان کی تعریف فرمائی۔

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے کہا: ہم کو حدیث بیان کی معمر نے، کہا کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ﴾ کہا: یہ اولیاء اللہ کی تعریف ہے۔ اللہ عزوجل نے ان کی صفت یہ بیان کی ہے کہ ان کی کھالوں پر بال کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کی آنکھیں روتی ہیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے چین پکڑتے ہیں۔ ان کی یہ صفت نہیں کی کہ ان کی عقلیں جاتی رہتی ہیں اور ان پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی کیفیت اہلِ بدعت میں پیدا ہوتی ہے اور یہ شیطان کی طرف سے ہے۔[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ "أَيْ: إِلٰى وَعْدِ اللّٰهِ"۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یعنی یہ اس شخص کی صفت ہے جس کو اللہ نے ہدایت کی اور جو شخص اس کے برخلاف ہے تو وہ اُن میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کیا۔ ﴿ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴾[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ شارح صدر یہ ہے: کیا پھر وہ شخص جس کے سینے کو اللہ نے قبولِ حق کے لیے وسیع اور فراخ کر دیا ہے اور اس کو راہِ خیر پانے کے لیے کھول دیا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: اس کے سینے کو اسلام کے لیے اور اسلام کے ساتھ خوش ہونے اور اس کی طرف چین پکڑنے کے لیے وسیع کر دیا۔[3] اسلام کے لیے شرح صدر عبارت ہے: اسلام کے لیے استعداد کو کامل کرنے سے، اس لیے کہ سینہ قلب کی جگہ ہے، کون سا قلب جو روح کا منبع ہے، کون سی روح جس سے نفس کا تعلق ہوتا ہے، جو اسلام کے قابل ہے۔ چنانچہ سینے کا کھلنا دل کے کھلنے کا باعث ہے۔ ہمزہ اور فاء میں کلام ایسا ہے، جیسا کہ ﴿ اَفَمَنْ حَقَّ ﴾ میں گزر چکا ہے۔

[1] تفسير الصنعاني (١٧٢/٣) [2] تفسير ابن كثير (٦٥/٤، ٦٦) [3] تفسير القرطبي (٢٤٧/١٥)

کلمہ ﴿ مَنْ ﴾ اپنے ماتحت کے ساتھ مبتداء ہے، اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "كَمَنْ قَسٰى قَلْبُهٗ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَجَرَحَ صَدْرَهٗ فَلَمْ يَهْتَدِ"۔ اس خبر محذوف پر یہ قول دال ہے: ﴿ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ﴾ معنی یہ ہیں: کیا پھر وہ شخص جس کے سینے کو اللہ نے اسلام کے لیے وسیع کر دیا ہے، چنانچہ اس نے اس کو قبول کر لیا اور اس کی چال چلا، چنانچہ وہ اپنے رب کی طرف سے اس وسیع کرنے کے سبب بیان، بصیرت، یقین اور ہدایت پر ہے، وہ اس پر اس کا افاضہ کرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جس کا دل سخت پڑ گیا ہے اور اللہ نے اس پر مہر لگا دی اور اس کے سوئے اختیار کی وجہ سے اس کا سینہ تنگ ہو گیا ہے، چنانچہ وہ گمراہی کے اندھیروں اور جہالت کی بلاؤں میں ہو گیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نور اللہ کی کتاب ہے، اسی کے ساتھ تمسک کیا جاتا ہے اور اسی کی طرف انتہا کیا جاتا ہے۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ آیت کی تقدیر یہ ہے: "أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ كَمَنْ طَبَعَ عَلٰى قَلْبِهٖ فَلَمْ يَهْتَدِ لِقَسْوَتِهٖ"[2] یعنی کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے کھول دیا اس شخص کی طرح ہے جس کے دل پر مہر کی گئی؟ چنانچہ اس نے دل کی سختی کے سبب سے راہ نہ پائی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ" سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔ ہم نے عرض کی: یا نبی اللہ! اس کے سینے کا کھلنا کیسے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت نور دل میں داخل ہو گیا تو وہ کھل گیا اور فراخ ہو گیا۔ ہم نے کہا: پھر اس کی علامت کیا ہے اے اللہ کے رسول؟! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَلْإِنَابَةُ إِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ، وَالتَّجَافِيْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ، وَالتَّأَهُّبِ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِ الْمَوْتِ» یعنی ہمیشگی کے گھر کی طرف رجوع ہونا اور دھوکے کے گھر سے جدا ہونا اور موت کے نازل ہونے سے پہلے اس کے لیے تیار ہونا۔ (وأخرج ابن مردويه عن محمد بن كعب القرظي مرفوعا مرسلا)

حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: یا نبی اللہ! "أَيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ أَكْيَسُ؟" یعنی مومنوں میں سے کون سا شخص زیادہ دانش مند ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جو اُن میں سے موت کو سب سے زیادہ یاد کرتا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ تیاری کرتا ہے۔ اور جس وقت نور دل میں داخل ہوا تو وہ فراخ اور وسیع ہو گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! اس کی نشانی کیا ہے؟ فرمایا: «اَلْإِنَابَةُ إِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ، وَالتَّجَافِيْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ، وَالْإِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِ الْمَوْتِ»[3]

(وأخرجه عن أبي جعفر عبدالله بن المسور عن رسول الله ﷺ بنحوه و زاد فيه ثم قرأ ﴿ أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ ﴾)

---

[1] تفسير الطبري (٢٧٨/٢١) [2] معاني القرآن (٣٥١/٤) [3] الدر المنثور (٢١٩/٧، ٢٢٠)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَوَيۡلٞ لِّلۡقَٰسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكۡرِ ٱللَّهِۚ ﴾ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ كَمَا تَقُوْلُ: أُتْخِمْتُ عَنْ طَعَامٍ أَكَلْتُهُ، وَمِنْ طَعَامٍ أَكَلْتُهُ"[1] معنی یہ ہیں کہ ان کے دل غلیظ ہو گئے ہیں اور ذکر اللہ کو قبول کرنے کے لیے سخت ہو گئے ہیں۔ "قَسْوَةٌ" وہ جمود اور سختی ہے جو دل میں حاصل ہوتی ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "قَسَى الْقَلْبُ" جبکہ دل سخت ہو جائے۔ قلبِ قاسی وہ ہے جو سخت دل ہے اور نرم نہیں ہوتا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں: "مِنْ أَجْلِ ذِكْرِهِ الَّذِي مِنْ حَقِّهِ أَنْ تَنْشَرِحَ لَهُ الصُّدُوْرُ وَتَطْمَئِنَّ بِهِ الْقُلُوْبُ" یعنی ان کے دل سخت ہیں بہ سبب ذکر اللہ کے جس کے حق سے یہ بات ہے کہ اس کے لیے سینے کھل جائیں اور اس سے دل چین پکڑیں۔ معنی یہ ہیں کہ جس وقت اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو منقبض ہو جاتے ہیں۔ جب کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

جس شخص نے "عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ" پڑھا ہے، یہ قراءت اس کی تائید کرتی ہے، یعنی جس وقت ان کے نزدیک اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، یا اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے دلوں کی سختی اور بڑھ جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَزَادَتۡهُمۡ رِجۡسًا إِلَىٰ رِجۡسِهِمۡ ﴾ [التوبة: ١٢٥] "ان کی گندگی کے ساتھ اور گندگی بڑھا دی۔" کسی نے کہا کہ نفس جب "خبيثة الجواهر" اور "كدرة العنصر" (جب اس کے عنصر ناپاک اور مکدر ہوں) تو حق کو قبول کرنے سے دور ہوتا ہے تو اللہ کے ذکر کا سننا اس کی سختی اور کدورت کو اور زیادہ کرتا ہے، جیسے: سورج کی گرمی کہ وہ موم کو تو نرم کرتی ہے اور نمک کو سخت کر دیتی ہے۔ اسی طرح سے قرآنِ مجید اس کے سننے کے وقت مومنوں کے دلوں کو نرم کرتا ہے اور کافروں کے دلوں کو سوائے سختی کے اور کچھ نہیں بڑھاتا۔

مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی بندے کی سزا اس سے بڑھ کر اور کوئی نہیں کہ اس کا دل زیادہ سخت ہو جائے اور اللہ نہیں خفا ہوا کسی قوم پر مگر ان سے اپنی رحمت کھینچ لی۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ذکر کے بغیر کلام کی کثرت مت کرو، اس لیے کہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام کرنا دل کی سختی ہے اور لوگوں سے سب سے زیادہ دور سخت اور درشت دل ہے۔[3] (أخرجه الترمذي وابن مردويه وابن شاهين في الترغيب في الذكر والبيهقي في الشعب) قولہ تعالیٰ: ﴿ أُوْلَٰٓئِكَ فِي ضَلَٰلٖ مُّبِينٍ ﴾ یعنی یہ لوگ جن کے دل سخت ہیں ظاہر اور واضح گمراہی میں ہیں۔

پھر اللہ پاک نے اپنی کتابِ عزیز کی بعض صفات ذکر فرمائیں: ﴿ ٱللَّهُ نَزَّلَ أَحۡسَنَ ٱلۡحَدِيثِ ﴾ یعنی اللہ نے بہترین حدیث نازل کی، مراد قرآن شریف ہے، جو باقی احادیث سے کفایت کرتا ہے۔ قرآن شریف کا نام حدیث اس لیے رکھا کہ نبی اکرم ﷺ اپنی قوم کو اس کے ساتھ حدیث کیا کرتے تھے اور ان کو اس بات کی خبر دیتے تھے جو اس

[1] فتح القدير (٦٠٢/٤) [2] تفسير القرطبي (٢٤٨/١٥)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤١١) شعب الإيمان (٢٤٥/٤) اس کی سند میں "ابراہیم بن عبداللہ" مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٩٢٠)

میں سے ان پر نازل ہوتی تھی۔ اس میں اس کا بیان ہے کہ احسن قول جس کا پہلے ذکر ہوا ہے وہ قرآن شریف ہے۔ اسم مبارک ﴿ اَللّٰهُ ﴾ کو مبتداء ٹھہرایا اور ﴿ نَزَّلَ ﴾ اس کی خبر قرار دی، چنانچہ اس میں احسن الحدیث کی شان کی بڑائی ہے، یعنی اللہ پاک جس میں تمام صفاتِ کمال موجود ہیں، اس نے اس احسن الحدیث کو نازل کیا ہے تو معلوم ہوا کہ احسن الحدیث بڑی عظمت والی اور عزت والی شے ہے۔

قرآن شریف کو جو احسن حدیث کے ساتھ موصوف فرمایا تو یہ دو وجہ سے ہے: ایک تو لفظ کی جہت سے ہے، کیوں کہ قرآن سب سے زیادہ فصیح، بلیغ اور اچھا کلام ہے اور شعر کی قسم سے نہیں ہے اور جنسِ خطب اور رسائل سے بھی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسی قسم ہے کہ اپنے اسلوب اور طرز میں سب کی مخالف ہے۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ احسن حدیث ہے، کیوں کہ قرآن ایک ایسی مبارک کتاب ہے کہ یہ تضاد اور اختلاف سے بالکل پاک صاف ہے اور یہ ماضی کی خبروں، پہلے زمانے کے قصوں اور بہت سی غیب کی خبروں پر مشتمل ہے اور اس میں وعدے اور وعید اور جنت و نارِ جہنم وغیرہ کا ذکر ہے۔

﴿ كِتٰبًا ﴾ ﴿ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ ﴾ سے بدل ہے، یا اس سے حال ہے۔ ﴿ مُّتَشَابِهًا ﴾ ﴿ كِتٰبًا ﴾ کی صفت ہے، یعنی اللہ نے خوب ترین حدیث نازل کی، وہ کون ہے؟ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا بعض حصہ بعض کے مشابہ ہے، حسن، احکام، صحتِ معانی اور قوتِ مبانی میں اور اعلیٰ درجۂ بلاغت کا حامل ہونے میں اور عام لوگوں کے منافع پر دلالت کرنے میں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا بعض حصہ آیتوں اور حرفوں میں بعض کے مشابہ ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اللہ کی ان کتابوں کے مشابہ ہے جو انبیاء اللہ پر نازل کی گئی ہیں۔ ﴿ مَّثَانِيَ ﴾ دوسری صفت ہے ﴿ كِتٰبًا ﴾ کی، جمع ہے "مُثَنًّى" بہ ضم میم و فتح ثائے مثلثہ و نونِ مشددہ کی۔ یا "مَثْنَى" بہ فتحِ میم اور تخفیفِ نون کی برخلاف قیاس، کیوں کہ قیاس مثنیات ہے جو ماخوذ ہے تثنیہ بہ معنی تکریر سے، یعنی ایسی کتاب کہ اس میں قصے دہرائے جاتے ہیں اور اس میں مواعظ اور احکام بار بار ذکر کیے جاتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآن تلاوت میں دہرایا جاتا ہے، چنانچہ اس کو سننے والا ملول نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی قراءت کرنے والا اس کے پڑھنے سے اُکتاتا ہے۔

جمہور نے ﴿ مَّثَانِيَ ﴾ بہ فتح یائے تحتیہ پڑھا ہے اور ہشام نے ابن عامر سے اور بشر نے بہ سکونِ یاء پڑھا ہے، تخفیف کے لیے یا اس کی حرکت کو ثقیل جانتے ہوئے، یا اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: هُوَ مَثَانِيْ" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قرآن سارا مثانی ہے، ان کا ایک قول پہلے گزر چکا ہے۔[2] ان کا تیسرا قول یہ ہے کہ کتاب اللہ مثانی ہے، "ثُنِّيَ فِيْهِ الْأَمْرُ مِرَارًا"[3] یعنی اس میں امر بار بار دہرایا گیا۔ امام رازی رحمہ اللہ نے ﴿ مَّثَانِيَ ﴾ کے معنی بیان کرنے میں فرمایا ہے کہ اکثر چیزیں جو قرآن میں مذکور ہیں، وہ متکرر ہیں

[1] تفسير الطبري (٢٧٩/٢١) [2] الدر المنثور (٢٢١/٧) [3] تفسير الطبري (٢٨٠/٢١)

جوڑے جوڑے، جیسے: امر و نہی، عام و خاص، مجمل و مفصل۔ احوالِ سموات و ارض، جنت و نار، نور و ظلمت، لوح و قلم، ملائکہ و شیاطین، عرش و کرسی، وعد و وعید اور رجا و خوف۔ اس بات کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا ہر چیز زوج ہے اور فردِ واحد حق اللہ ہی ہے۔[1] اس کلام میں جو تکلف اور مقصودِ تنزیل سے جو بُعد ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ﴿ كِتٰبًا ﴾ تو واحد ہے، اس کی صفت ﴿ مَّثَانِيَ ﴾ جمع کیوں آئی؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب ایک جملہ ہے جس میں تمام تفاصیل ہیں اور شے کی تفاصیل وہی جملہ شے ہے وگرنہ کچھ نہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ تم کہتے ہو کہ قرآن اسباع، اخماس، سور اور آیات ہے، چنانچہ اسی طرح کہتے ہو کہ احکام، اقاصیص اور مواعظ مکررات ہے۔ اس کی نظیر تمھارا یہ قول ہے کہ انسان عروق، عظام اور اعصاب ہے۔ یا یوں کہو کہ منصوب ہے بنا بر تمیز ﴿ مُّتَشٰبِهًا ﴾ سے جس طرح کہتے ہو کہ "رَأَيْتُ رَجُلًا حَسَنًا شَمَائِلَ أَيْ: مُتَشَابِهَةً مَثَانِيَةً" یعنی ایسی کتاب کہ اس کے ﴿ مَّثَانِيَ ﴾ متشابہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں بار بار قرآن میں مذکور ہیں، وہ باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشٰبِهًا مَّثَانِيَ ﴾ کا شانِ نزول یہ ہے کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کاش! آپ ہم سے حدیث بیان فرماتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[2] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا: مروی ہے کہ "إِنَّ الصَّحَابَةَ مَلُّوا مَلَّةً فَقَالُوا لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: حَدِّثْنَا حَدِيثًا فَنَزَلَتْ، وَالْمَعْنَى أَنَّ فِيهِ مَنْدُوحَةً عَنْ سَائِرِ الْأَحَادِيثِ"[3] انتہیٰ۔

جملہ ﴿ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ﴾ کتاب کی صفت ہے، یا اس سے حال ہے، اگرچہ وہ نکرہ ہے، لیکن صفت سے اس کو تخصیص حاصل ہوگئی ہے۔ یا مستانفہ ہے۔ اس کا مقصد اس تاثر کو بیان کرنا ہے جو اس کے سننے والوں کو اس کے سننے سے حاصل ہوتا ہے۔ اقشعرار، تقبض کو کہتے ہیں، یعنی سکڑنے کو۔ جب کسی کا چمڑہ خوف کے مارے سکڑ جائے اور اکٹھا ہو جائے اور اس کے بال کھڑے ہو جائیں تو اس وقت محاورے میں یوں کہتے ہیں: "اِقْشَعَرَّ جِلْدُهُ" یعنی اس کی کھال سکڑ گئی۔ اسی معنی سے قشعریرہ ہے، معنی یہ ہیں: ایسی کتاب ہے کہ اس کے سننے سے چمڑے مضطرب ہوتے ہیں، حرکت کرتے ہیں اور ان لوگوں کی کھالیں سکڑتی ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور ان کو کپکپی پکڑ لیتی ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جب عذاب کی آیتیں ذکر کی جاتی ہیں تو اس سے ان لوگوں کے بال

---

[1] تفسير الرازي (٢٦/٢٣٧) [2] تفسير الطبري (٢١/٢٨٠) [3] تفسير أبي السعود (٧/٢٥١)

کھالوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں اور جب رحمت کی آیتیں ذکر کی جاتی ہیں تو اُن کی کھالیں اور دل نرم ہو جاتے ہیں۔① "قشعریرة" ایک تغیر ہے جو وعید، خوف اور دہشت کے وقت انسان کی کھال میں پیدا ہو جاتا ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: یہ سارے مفسرین کا قول ہے۔② کسی نے کہا ہے کہ جلود سے مراد قلوب ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ قلوب کا ذکر تو ما بعد میں موجود ہے۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہیں: جب قرآن انتہائی طور پر موثر اور جلیل القدر ہے، پھر وہ جس وقت اس کے مقابلے میں اپنی عاجزی کو دیکھتے تو اس کی عظمت کی خاطر اور اس کے حسن و بلاغت پر تعجب کے طور پر ان کے بدن پر بال کھڑے ہو جاتے۔ ﴿ تَلِيْنُ ﴾ کو ﴿ اِلٰى ﴾ کے ساتھ متعدی کیا ہے، اس لیے کہ اس میں ایک فعل شامل ہے جو متعدی بہ الیٰ ہوتا ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ "تَسۡكُنُ وَتَطۡمَئِنُّ إِلىٰ ذِكۡرِ اللّٰهِ لَيِّنَةً غَيۡرَ مُنۡقَبِضَةٍ" یعنی پھر ساکن ہوتے ہیں، چین پکڑتے ہیں اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو کر۔ ﴿ ذِكۡرِ اللّٰهِ ﴾ کا مفعول محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "إِلَى ذِكۡرِ اللّٰهِ رَحۡمَتِهٖ وَثَوَابِهٖ وَجَنَّتِهٖ" اس کے معلوم ہونے کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔

عبداللہ بن عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اپنی دادی سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جب قرآن پڑھتے تو کس طرح کرتے تھے؟ کہا کہ وہ ویسے تھے جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کی صفت بیان کی ہے۔ ان کی آنکھیں بہتی تھیں اور اُن کے بال چمڑوں پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ میں نے کہا: کچھ لوگ یہاں ایسے ہیں کہ جب وہ اس کو سنتے ہیں تو ان پر غشی طاری ہو جاتی ہے؟ تو بی بی اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "أَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطَانِ الرَّجِيۡمِ"③ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ اہلِ عراق کے ایک شخص کے پاس سے گزرے، وہ گر پڑا تھا۔ آپ نے پوچھا: اس کو کیا ہو گیا ہے؟ لوگوں نے کہا ہے کہ جس وقت اس پر قرآن پڑھا جاتا ہے، یا اللہ کا ذکر سنتا ہے تو یہ گر پڑتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بے شک ہم البتہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں مگر گر نہیں پڑتے۔ یہ بھی ان سے مروی ہے کہ ان میں سے کسی کے پیٹ میں شیطان داخل ہو جاتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم کا یہ کام نہ تھا۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ کے پاس ان لوگوں کا ذکر کیا گیا جو پچھاڑے جاتے ہیں جب اُن پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو فرمایا کہ ہمارے اور اُن کے درمیان یہ شرط ہے کہ ان میں سے کوئی گھر کی چھت پر اپنے دونوں پاؤں پھیلا کر پڑا ہو، پھر اس پر قرآن شروع سے آخر تک پڑھا جائے تو اگر وہ اپنی جان کو نیچے پھینک دے تو سچا ہے۔④

نکتہ:

پہلے تو اکیلے جلود کا ذکر کیا، پھر دوبارہ اس کے ساتھ قلوب کو شامل کیا، اس لیے کہ خشیت کی جگہ دل ہے تو ان

---

① معاني القرآن (٣٥٢/٤) ② فتح القدير (٦٠٣/٤)
③ تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٤٩/١٠) ④ تفسير القرطبي (٢٤٩/١٥)

کے ذکر میں قلوب کا ذکر شامل ہوگیا۔ کسی نے کہا ہے کہ مکاشفہ مقامِ رجا میں مقامِ خوف کی نسبت زیادہ کامل ہوتا ہے، اس لیے کہ خیر تو مطلوب ہے اور خوف مطلوب نہیں ہے اور جس وقت خوف حاصل ہوا تو اس سے چمڑے پر بال کھڑے ہو گئے اور جب رجا حاصل ہوگئی تو قلب نے اس سے چین پکڑا اور چمڑا نرم پڑ گیا۔ بعض عارفین نے فرمایا ہے: "إِذَا نَظَرُوْا إِلَى عَالَمِ الْجَلَالِ طَاشُوْا، وَإِذَا لَاحَ لَهُمْ عَالَمُ الْجَمَالِ عَاشُوْا" "جب وہ عالمِ جلال کو دیکھتے ہیں تو بے خود ہو جاتے ہیں اور جب وہ عالمِ جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہوش میں آ جاتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یعنی یہ کتاب جو مذکورہ صفات کی حامل ہے اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے۔ وہ اس کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی خشیت اور اللہ کے ثواب کی اُمید کی طرف ہے جو اللہ نے ان کو بخشی ہیں۔ ﴿ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴾ یعنی وہ شخص جس کے دل کو اللہ حق قبول کرنے کے لیے تاریک اور سخت اور غیر قابل کر دے تو اس کے لیے کوئی ہادی نہیں جو اس کو حق کی طرف ہدایت کرے اور اس کو گمراہی سے چھڑائے۔ جمہور نے ﴿ مِنْ هَادٍ ﴾ بغیر یاء پڑھا ہے اور امام ابن کثیر اور ابن محیصن رحمہ اللہ نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔[1] پھر جب اللہ پاک نے سخت دل والوں پر دنیا میں ایک حکم لگایا، یعنی گمراہی کا تو ان پر آخرت میں ایک اور حکم لگایا، یعنی عذاب کا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝۲۴ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۲۵ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶

کیا پھر جو شخص روزِ قیامت برے عذاب سے اپنے چہرے (کی ڈھال) کے ذریعے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے (وہ جنتی کے برابر ہوسکتا ہے؟) اور ظالموں سے کہا جائے گا: تم (اس کا مزہ) چکھو جو تم کماتے تھے (24) جو لوگ ان سے پہلے تھے انھوں نے (دینِ حق کو) جھٹلایا تو ان پر ایسی جگہ سے عذاب آیا جس کا انھیں گمان تک نہ تھا (25) چناں چہ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیاوی زندگی میں رسوائی چکھائی اور آخرت کا عذاب تو یقیناً بہت بڑا ہے، کاش! وہ جانتے ہوتے (26)

جھٹلانے والے ظالموں کا انجام:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا وہ شخص جو اپنے منہ پر برا عذاب روکتا ہے اور زجر و توبیخ

[1] تفسير القرطبي (۱۵/۲۵۰) [2] فتح البيان (۱۲/۱۰۲-۱۰۷)

کیا جاتا ہے، پھر اس سے اور اس جیسے اُور ظالموں سے یہ کہا جائے گا کہ چکھو جو تم کماتے تھے، اس شخص کی طرح ہے جو قیامت کے دن بے خوف ہو کر آئے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الملك: ٢٢] ''اچھا وہ شخص زیادہ ہدایت والا ہے جو اپنے منہ کے بل اوندھا ہو کر چلے یا وہ جو سیدھا (پیروں کے بل) راہِ راست پر چلا ہو؟'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴾ [القمر: ٤٨] ''جس دن وہ اپنے منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا) دوزخ کی آگ لگنے کے مزے چکھو۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْۤ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ [حم السجدة: ٤٠] ''(بتلاؤ تو) جو آگ میں ڈالا جائے وہ اچھا ہے یا وہ جو امن وامان کے ساتھ قیامت کے دن آئے گا؟'' اس آیت میں احد القسمین کے ساتھ دوسری قسم سے اکتفا کیا ہے، اس شعر کی طرح:

فَمَا أَدْرِيْ إِذَا يَمَّمْتُ أَرْضًا أُرِيْدُ الْخَيْرَ أَيُّهُمَا يَلِيْنِيْ

''جب میں خیر وبھلائی کا ارادہ لیے ہوئے کسی سرزمین کا قصد کرتا ہوں تو میں نہیں جانتا ہوتا کہ ان (خیروشر) میں سے مجھے کسی کا سامنا ہوگا۔''

یعنی "الخير أو الشر". قولہ تعالیٰ: ﴿ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پہلی اُمتیں جو رسولوں کو جھٹلانے والی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب سے ہلاک کر ڈالا اور ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے اس عذاب اور سزا کے سبب سے جو ان پر نازل کیا، ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی چکھائی اور مومنین کی ان سے تشفی کر دی۔ لہٰذا چاہیے کہ مخاطب لوگ اس سے بچتے رہیں، کیوں کہ انھوں نے تو اشرف الرسل وخاتم الانبیاء ﷺ کی تکذیب کی ہے اور وہ سخت عذاب جو اللہ عزوجل نے ان کے لیے آخرت میں تیار کر رکھا ہے، وہ اس عذاب سے بہت زیادہ بڑا ہے جو دنیا میں ان کو پہنچا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ استفہام انکاری ہے، اس کا بیان اور اس حرفِ فاء کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ مبتداء ہے اور خبر محذوف ہے، اس لیے کہ مقام سے معلوم ہوتی ہے۔ معنی یہ ہیں: کیا یہ شخص جس کا یہ حال ہے کہ اپنے نفس کو اپنے منہ کے ساتھ قیامت کے دن بڑے عذاب سے بچاتا ہے۔ کون سا منہ؟ جو تمام اعضاء

[1] تفسیر ابن کثیر (٦٦/٤، ٦٧)

سے اشرف ہے، کیوں کہ اس کے ہاتھ تو گردن کے ساتھ بندھے ہوئے ہوں گے، اس شخص کی طرح ہے جو ان باتوں سے بے خوف ہے، اس کو کوئی بات پیش نہیں آتی اور نہ اس کو اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کیا وہ شخص جو اپنے منہ سے برے عذاب کو دور کرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جو جنت میں داخل ہوتا ہے۔[1] امام عطاء اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ آگ میں اس طرح پھینکا جائے گا کہ اس کی مشکیں بندھی ہوئی ہوں گی، چنانچہ اس کے بدن میں سے سب سے پہلے جس کو آگ چھوئے گی وہ اس کا منہ ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کو مشکیں بندھا ہوا آگ کی طرف لے جائیں گے، پھر اس کو اس میں پھینک دیں گے، چنانچہ سب سے پہلے اس میں جس شے کو آگ چھوئے گی، وہ اس کا منہ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ منہ کے بل آگ میں کھینچا جائے گا۔[3] امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کیا وہ شخص جو اپنے منہ سے برے عذاب کو بچائے گا افضل ہے یا وہ شخص جو سعید اور نیک بخت ہو۔[4]

پھر اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی جو دوزخ کے داروغے کفار سے کہیں گے: ﴿ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴾ یہ جملہ ﴿ يَتَّقِيْ ﴾ پر معطوف ہے: "أَيْ: وَيُقَالُ لَهُمْ" ماضی کا صیغہ اس لیے ہے کہ تحقیق پر دلالت کرے۔ ضمیر کے بجائے اسمِ ظاہر اس لیے رکھا کہ ان پر ظلم کی طومار ظاہر ہو اور اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ﴿ ذُوْقُوْا ﴾ کے حکم کی وجہ یہی ظلم ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ تم اس چیز کا بدلہ چکھو جس کو تم کماتے تھے۔[5] اس جیسی یہ آیت ہے: ﴿ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴾ [التوبة: ٣٥] ''یہ ہے جسے تم نے اپنے لیے خزانہ بنا کر رکھا تھا۔ چنانچہ اپنے خزانوں کا مزہ چکھو۔'' ذوق کے معنی کئی جگہ گزر چکے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے ان سے پہلے کے کفار کی خبر دی، فرمایا: ﴿ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ یعنی ان کافروں نے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر کفار سے پہلے تھے، اپنے رسولوں کو جھٹلایا، پھر ان کو عذاب اس جہت سے آگیا جس سے عذاب کے آنے کا خیال نہیں کرتے تھے، یعنی ایسے وقت میں آیا کہ وہ بے خوف اور غافل تھے، یعنی اپنی تکذیب کے سبب سے جو سزا اللہ کی طرف سے ملنے والی تھی، اس سے غافل تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی زندگی میں ان کی صورتوں کو مسخ کر کے یا ان کو زمین میں دھنسا کر یا اہلِ حق کے ساتھ لڑائی میں قتل اور قید کر کے اور جلا وطن کر کے ان کو ذلت و رسوائی کا مزہ چکھایا اور البتہ آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے ہمیشہ رہنے کے ساتھ ساتھ انتہائی سخت ہے۔ اگر وہ ان لوگوں میں سے ہوتے جو اشیاء کو جانتے ہیں اور ان میں غور و فکر

---

[1] معاني القرآن (٣٥٢/٤) [2] تفسير القرطبي (٢٥١/١٥) [3] تفسير الطبري (٢٨١/٢١)
[4] تفسير القرطبي (٢٥١/١٥) [5] فتح القدير (٦٠٤/٤)

کرتے ہیں اور اپنے علم کے مقتضا پر عمل کرتے ہیں تو البتہ وہ ایمان لاتے اور کفر یا تکذیب نہ کرتے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: ”يُقَالُ لِكُلِّ مَا نَالَ الْجَارِحَةَ مِنْ شَيْءٍ قَدْ ذَاقَتْهُ، أَيْ: وَصَلَ إِلَيْهَا كَمَا تَصِلُ الْحَلَاوَةُ وَالْمَرَارَةُ إِلَى الذَّائِقِ لَهُمَا“ اور کہا ”خزي“ مکروہ کو کہتے ہیں۔[1] یعنی ہر وہ شے جو عضو کو پہنچتی ہے تو اس کو یوں کہتے ہیں کہ اس عضو نے اس شے کو چکھا، یعنی وہ شے اس کو پہنچنے لگی، جس طرح کہ شیرینی اور تلخی اس کے چکھنے والے کی طرف پہنچتی ہیں۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٧﴾ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٢٨﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿٣١﴾

اور بلاشبہ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثال بیان کی ہے، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں ﴿27﴾ قرآن عربی (زبان) میں ہے، کجی والا نہیں، شاید وہ ڈریں ﴿28﴾ اللہ نے ایک آدمی (غلام) کی مثال بیان کی جس میں کئی باہم اختلاف رکھنے والے شریک ہیں اور ایک دوسرا آدمی جو خالص ایک ہی شخص کا (غلام) ہے، کیا (ان) دونوں کی حالت یکساں ہوسکتی ہے؟ (نہیں) الحمد للہ! بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿29﴾ (اے نبی!) بلاشبہ آپ بھی مرنے والے ہیں اور وہ بھی یقیناً مرنے والے ہیں ﴿30﴾ پھر بلاشبہ تم قیامت کے دن اپنے رب کے پاس جھگڑو گے ﴿31﴾

بطلانِ شرک کی ایک مثال:

ایک ایسا غلام جو کئی شخص کا غلام ہو، کوئی اس کو اپنا نہ سمجھے اور اس کی خبر گیری نہ کرے اور ایک ایسا غلام جو پوری طرح پر صرف ایک ہی شخص کا غلام ہو، وہ اس کو اپنا سمجھے اور اس کی خبر گیری کرے۔ یہ ان کی مثال ہے جو ایک رب کے بندے ہیں اور جو کئی رب کے بندے۔ کافر منکر ہوں گے کہ ہم کو کسی نے حکم نہیں پہنچایا، پھر فرشتوں کی گواہی سے اور آسمان و زمین کی گواہی سے اور اُن کے ہاتھ پاؤں کی گواہی سے ثابت ہوگا۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی البتہ مقرر بیان کیا ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں مثالوں کے بیان کرنے

[1] تفسیر القرطبي (١٥/٢٥١) فتح البيان (١٢/١٠٨، ١٠٩)

کے ساتھ، شاید وہ سوچیں، اس لیے کہ مثالیں معنوں کو ذہنوں کے قریب کر دیتی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ﴾ [الروم: ۲۸] ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ایک مثال خود تمھاری ہی بیان فرمائی۔'' یعنی تمھارے لیے مثال بیان کی کہ تم اس کو اپنی جانوں سے جانتے ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾ [العنکبوت: ۴۳] ''ہم ان مثالوں کو لوگوں کے لیے بیان فرما رہے ہیں۔ انھیں صرف علم والے ہی سمجھتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ ﴾ یعنی یہ ایک قرآن ہے کھلی ہوئی عرب زبان میں جس میں کسی طرح کی کجی اور انحراف نہیں ہے اور نہ کسی طرح کا التباس ہے، بلکہ وہ ایک بیان ہے اور وضوح اور برہان ہے۔ اللہ پاک نے جو اس کو ایسا کیا اور نازل فرمایا تو اسی لیے کہ شاید وہ اس وعید سے، جو اس میں ہے، بچ کر چلیں اور جو وعدہ اس میں ہے اس پر عمل کریں۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ﴾ یعنی اللہ پاک نے ایک مثال بیان کی کہ ایک غلام ہے جو کئی شریکوں میں مشترک ہے، وہ اس میں جھگڑتے ہیں اور ایک غلام سالم و خالص ایک ہی شخص کا ہے، اس کے سوا اس کا کوئی مالک نہیں ہے، کیا وہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ یعنی یہ اس کے برابر نہیں ہے۔ اسی طرح وہ مشرک ہے جو اللہ پاک کے ساتھ اور معبودوں کو پوجتا ہے اور مومن مخلص جو نہیں پوجتا مگر اللہ وحدہ لا شریک لہ کو، چنانچہ یہ کہاں اور وہ کہاں! سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس آیت میں مشرک اور مخلص کے لیے مثال بیان کی گئی ہے،[1] چوں کہ یہ مثال نہایت ظاہر و باہر و جلی اور واضح تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ یعنی سب تعریف اللہ کے لیے ہے اس بات پر کہ ان پر حجت قائم ہو گئی۔ ﴿ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ اکثر اُن کے جانتے نہیں ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ یہ آیت ان آیتوں میں سے ہے جن کے ساتھ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف کے وقت استشہاد کیا، یہاں تک کہ لوگوں نے آپ کی وفات مبارک کا یقین کر لیا مع اس آیت کے: ﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۴۴] ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے ہیں، کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو

[1] تفسير الطبري (۲۱/۲۸۵)

جائیں، تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں پر پھر جائے تو ہرگز اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑے گا، عن قریب اللہ تعالیٰ شکرگزاروں کو نیک بدلہ دے گا۔''

آیت کے معنی یہ ہیں کہ عن قریب تم اس دارِ فانی سے منتقل ہو جاؤ گے اور آخرت میں انسانوں اور جنوں کے خالق کے پاس جمع ہو گے اور دنیا میں تم جس توحید اور شرک پر ہو اس کے بارے میں اللہ عزوجل کے سامنے جھگڑو گے، پھر وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا اور حق کو کھول دے گا، وہ بڑا فیصلہ کرنے والا جاننے والا ہے۔ چنانچہ وہ مخلص و موحد مومنین کو تو نجات دے گا اور کافرین، مشرکین اور حق کا انکار کرنے والوں کو عذاب کرے گا۔ پھر یہ بات ہے کہ اگرچہ اس آیت کا سیاق مومنوں اور کافروں کے حق میں ہے اور اس میں دارِ آخرت میں ان کی باہمی خصومت کا ذکر ہے، لیکن یہ آیت دنیا میں ہر دو جھگڑنے والوں کے بارے میں ہے، کیوں کہ آخرت میں ان پر خصومت کا اعادہ کیا جائے گا۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا جب آیت: ﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴾ نازل ہوئی تو سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا مکرر کی جائے گی ہم پر خصومت؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اب تو معاملہ واقعی سخت ہے۔[1] اسی طرح امام احمد رحمہ اللہ نے سفیان رضی اللہ عنہ سے اس کو روایت کیا ہے، ان کے نزدیک اتنا زیادہ ہے: جب آیت: ﴿ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴾[التکاثر: ۸] ''پھر اس دن تم سے ضرور بالضرور نعمتوں کا سوال ہو گا۔'' نازل ہوئی تو سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم سے کون سی نعیم کا سوال ہو گا، حالاں کہ ہماری نعیم تو یہی اَسْوَدَان ہیں، یعنی کھجور اور پانی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار! بے شک یہ عن قریب ہو گا۔ اس اضافے کو ترمذی اور ابن ماجہ نے سفیان سے مروی حدیث سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ حسن ہے۔[2]

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے عن عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما عن ابیہ روایت کیا ہے، کہا: جب آیت ﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تو سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا ہم پر وہ شے مکرر کی جائے گی جو دنیا میں ہمارے درمیان تھی خواص ذنوب کے ساتھ؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، البتہ مکرر کی جائے گی تم پر، یہاں تک کہ ہر صاحبِ حق کا حق ادا کیا جائے گا۔ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: واللہ! بے شک معاملہ بہت سخت ہے۔[3] (ورواه الترمذي من حديث محمد بن عمرو به وقال: حسن صحيح) امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ

① تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۲۵۰)

② مسند أحمد (۱/۱٦٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۳۵٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤۱۵۸) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۳٤۰)

③ مسند أحمد (۱/۱۲۷) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲۳٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۳٤۰)

سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن پہلے دو جھگڑنے والے دو پڑوسی ہیں۔[1] (تفرد به أحمد)

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! البتہ جھگڑیں گے حتی کہ دو بکریاں جن میں سے ایک نے دوسری کو سینگ مارا۔[2] (تفرد به أحمد) مسند میں ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا دو بکریوں کو کہ ایک دوسری کو سینگ مارتی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ابو ذر! کیا تو جانتا ہے کہ کس شے میں ایک دوسری کو سینگ مارتی ہے؟ میں نے عرض کی: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لیکن اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور عن قریب ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔[3] حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ظالم اور خائن امام لایا جائے گا، پھر اس سے رعیت جھگڑے گی، پھر وہ اس پر فتح دیے جائیں گے تو اس سے کہا جائے گا کہ ارکانِ جہنم میں سے ایک رکن، یعنی جانب کو بند کر۔ پھر کہا ہے کہ اغلب بن تمیم راوی حافظ نہیں ہے۔[4]

امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ صادق کاذب سے جھگڑے گا اور ظالم مظلوم سے اور مھتدی ضال سے اور ضعیف اور کمزور شخص متکبر سے جھگڑے گا۔[5] ابن مندہ سے مروی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کتاب الروح میں یہ ہے کہ لوگ قیامت کے دن جھگڑیں گے، یہاں تک کہ روح جسم کے ساتھ جھگڑے گی۔ چنانچہ روح جسم سے کہے گی کہ یہ کام تو نے کیا اور جسم روح سے کہے گا کہ تو نے حکم دیا تھا اور تو نے زینت دی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجے گا کہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان سے کہے گا کہ بے شک تمھاری مثال ایسی ہے، جیسے کہ ایک آدمی اپاہج ہے اور آنکھوں والا ہے اور دوسرا آدمی ضریر ہے، یعنی ضعیف البصر نابینا ہے۔ دونوں ایک باغ میں داخل ہوئے۔ چنانچہ اپاہج نے اندھے سے کہا ہے کہ میں یہاں میوے دیکھ رہا ہوں، لیکن میں ان تک پہنچ نہیں سکتا تو اندھے نے اس سے کہا ہے کہ تو مجھ پر سوار ہو جا، پھر تو ان کو لے لے۔ چنانچہ وہ اپاہج اس پر سوار ہو گیا، پھر اس نے میوے لیے۔ ان میں سے کون زیادتی کرنے والا اور ظالم ہے؟ تو روح اور جسم کہیں گے کہ دونوں۔ چنانچہ فرشتہ اُن سے کہے گا کہ واقعی تم نے خود ہی اپنی جانوں پر فیصلہ دیا، یعنی جسم روح کے لیے سواری کی طرح ہے اور روح اس پر سوار ہے۔[6]

---

(1) مسند أحمد (١٥١/٤) صحيح الترغيب والترهيب (٣٤٤/٢)

(2) مسند أحمد (٢٩/٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده حسن" (مجمع الزوائد: ٦٣٢/١٠)

(3) مسند أحمد (١٦٢/٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٨٨)

(4) كشف الأستار عن زوائد البزار (٢٥٥/٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه أغلب بن تميم وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٣٧١/٥)

(5) تفسير الطبري (٢٨٧/٢١) (6) الدر المنثور (٢٢٧/٧)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا کہ یہ آیت نازل ہوئی تو ہم نہیں جانتے تھے کہ کس شے کے بارے میں نازل ہوئی، یعنی یہ آیت: ﴿ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴾ ہم نے کہا ہے کہ ہم کس سے جھگڑیں گے ہمارے اور اہلِ کتاب کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے، پھر ہم کس سے جھگڑیں گے، یہاں تک کہ فتنہ واقع ہوا تو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ وہ شے ہے جس کا ہمارے رب عزوجل نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم اس میں جھگڑیں گے۔[1] (ورواه النسائي عن محمد بن عامر عن منصور بن سلمة به)

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے ﴿ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴾ کے بارے میں کہا ہے، یعنی اہلِ قبلہ۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اہلِ اسلام اور اہلِ کفر۔[2] ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ آیت عام ہے۔[3] واللہ سبحانه أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ لَقَدْ ﴾ میں حرفِ لام توطیہ قسم کا ہے: "أَيْ: وَاللّٰهِ لَقَدْ" اور ﴿ ضَرَبْنَا ﴾ بہ معنی "وَجَعَلْنَا وَأَوْجَدْنَا وَبَيَّنَّا" ہے۔ مثل کی تحقیق اور اس کے بیان کی کیفیت کئی جگہ گزر چکی ہے۔ ﴿ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک نے قرآن شریف میں وہ تمام مثلیں بیان کی ہیں جن کے اپنے دینی معاملے میں لوگ محتاج ہیں۔ یہ مراد نہیں ہے کہ ساری مثلیں بیان کی ہیں۔ چنانچہ اس جگہ ﴿ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ﴾ ایسے ہے جیسے کہ اس آیت میں کلمۂ "مِنْ شَيْءٍ" ہے: ﴿ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ٣٨] یعنی وہ شے جس کی طرف لوگ اپنے امرِ دین میں حاجت مند ہیں۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہم نے جو گزشتہ اُمتوں کے ہلاک کرنے کا ذکر کیا ہے وہ ان لوگوں کے لیے مثل ہے۔ ﴿ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی شاید وہ نصیحت پذیر ہوں تو عبرت لیں۔

﴿ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ منصوب ہے بنا بر حال کلمۂ ﴿ هٰذَا ﴾ سے اور یہ حالِ مؤکدہ ہے، اس کو حالِ موطئہ بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ حقیقت میں حال ﴿ عَرَبِيًّا ﴾ ہے اور ﴿ قُرْاٰنًا ﴾ اس کا توطیہ ہے، جیسے: "جَاءَنِي زَيْدٌ رَجُلًا صَالِحًا"، امام اخفش رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ بنا بر مدح منصوب ہو۔ "أَيْ: اِمْدَحْ قُرْآنًا عَرَبِيًّا" امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ عَرَبِيًّا ﴾ منصوب بنا بر حال ہے اور ﴿ قُرْاٰنًا ﴾ تاکید ہے۔ ﴿ غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ ﴾ یعنی ایسا قرآنِ عربی ہے کہ اس میں کسی بھی وجہ سے کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ غیر مختلف ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: جو کچھ اس کے معنی میں کہا گیا ہے، اس میں سے بہترین قول امام ضحاک رحمہ اللہ

---

① تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٥٠، ٣٢٥١) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٤٥)

② تفسير الطبري (٢١/٢٨٨، ٢٨٧) ③ تفسير ابن كثير (٤/٦٧-٦٩)

کا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ غیر متضاد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "غَیْرَ ذِيْ لِبْسٍ" ہے، یعنی اس میں کسی طرح کا التباس وشبہہ نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "غَیْرَ ذِيْ لَحْنٍ" ہے، یعنی اس میں کسی طرح کی غلطی اور خطا نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "غَیْرَ ذِيْ شَكٍّ" کما قال الشاعر:

وَقَدْ أَتَاكَ يَقِيْنٌ غَيْرُ ذِيْ عِوَجٍ ... مِنَ الْإِلٰهِ وَقَوْلٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ

(کسی نے یہ شعر قرآن شریف کی مدح میں کہا ہے کہ تیرے پاس معبود کی طرف سے ایک یقین آیا ہے، اس میں کسی طرح کی کجی نہیں ہے اور سچی بات ہے، جھوٹ نہیں ہے۔ اس شعر سے یہ بات نکالی کہ یقین کا مقابلہ ﴿غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ﴾ سے کیا ہے اور یقین کا عکس شک ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ﴿عِوَجٍ﴾ شک پر بولا جاتا ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس قول کو پسند نہیں کیا، اس لیے کہ اس میں بعض مدلول ﴿عِوَجٍ﴾ کے ساتھ ﴿عِوَجٍ﴾ کی تخصیص ہے، کیوں کہ ﴿عِوَجٍ﴾ یقین کا شک ہے اور ﴿عِوَجٍ﴾ بالکسر بہ معنی اختلال ہے جو معانی کے ساتھ مختص ہے اور اس کا مدلول مطلق ہے۔)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ غیر مخلوق ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی صحیح، مستقیم، درست اور راست ہیں۔ سمجھے جاتے ہیں اور ملتبس نہیں ہوتے، بہ خلاف اس کے جو باطل ہے۔ ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ پہلی علت کے بعد دوسری علت ہے۔ پہلی علت ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ ہے، یعنی تاکہ وہ کفر وکذب سے بچیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ کی علت ہے، چنانچہ اول سبب ہے ثانی میں۔ پھر اللہ پاک نے قرآنی امثال میں سے ایک اور مثال نصیحت اور یاد دلانے کی غرض سے ذکر کی، فرمایا: ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا﴾ یعنی اللہ نے ایک تمثیل بیان کی، جو اس جیسی دوسری مثال کی طرح ایک حالتِ عجیب کے ساتھ ہے۔ پھر اس مثال کا بیان کیا، فرمایا: ﴿رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ﴾ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿رَّجُلًا﴾ کا نصب اس لیے ہے کہ ﴿مَثَلًا﴾ کی تفسیر ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ منصوب بہ نزعِ خافض ہے۔ "أَيْ: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا بِرَجُلٍ" کسی نے کہا ہے کہ ﴿رَّجُلًا﴾ پہلا مفعول ہے اور ﴿مَثَلًا﴾ دوسرا مفعول۔ پہلے مفعول کو بعد میں اس لیے رکھا کہ جو اس کا تتمہ ہے، اس سے وہ متصل ہو جائے۔ سورت یٰسٓ میں اس کی تحقیق گزر چکی ہے۔

جملۂ ﴿فِيْهِ شُرَكَآءُ﴾ محلِ نصب میں ہے ﴿رَّجُلًا﴾ کی صفت ہے۔ "تشاکس" کہتے ہیں "تخالف" کو، اصل اس کی سوء وعسرِ خلق ہے، یعنی بدخلقی۔ یہی باہم اختلاف اور جھگڑے کا سبب ہوتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿مُتَشٰكِسُوْنَ﴾ بہ معنی "مُخْتَلِفُوْنَ" ہے۔ کسی نے کہا "مُتَنَازِعُوْنَ" کے معنی میں ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مُتَعَاسِرُوْنَ" ہے۔ ماخوذ ہے "شَكِسَ يَشْكُسُ شَكْسًا فَهُوَ شَكِسٌ" سے، جیسے: "عَسُرَ يَعْسُرُ

---

[1] تفسير القرطبي (۲٥۲/۱٥) فتح القدير (٦٠٦/٤) [2] الدر المنثور (۲۳۳/۷) [3] تفسير القرطبي (۲٥۲/۱٥)

عُسُرًا فَهُوَ عَسِرٌ". "شَكِسٌ" بکسر کاف ہی قیاس ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "تشاکس" اختلاف ہے۔ کہا: اور "رَجُلٌ شَكْسٌ" بہ تسکین کاف بھی بولتے ہیں: "أَيْ: صَعْبُ الْخُلُقِ" یعنی مردِ سخت خلق۔ یہ مثل ہے اس کی جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اور بہت سے معبودوں کو پوجا۔

پھر فرمایا: ﴿ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ﴾ یعنی اور ایک مرد خالص ہے ایک مرد کے لیے۔ یہ مثل ہے اس کی جو اللہ وحدہ لا شریک لہ کو پوجتا ہے۔ جمہور نے ﴿ سَلَمًا ﴾ کو بہ فتحِ سین و لام پڑھا ہے اور سعید بن جبیر، عکرمہ اور ابو العالیہ نے بہ کسرِ سین وسکونِ لام اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ (یعنی مجاہد، جحدری، ابو عمرو، ابن کثیر اور یعقوب رحمہم اللہ) نے "سَالِمًا" بہ الف وکسرِ لام پڑھا ہے "سَلِمٌ" کا اسم فاعل "فَهُوَ سَالِمٌ"۔ اس قراءت کو امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ کہا: اس لیے کہ "سَالِمٌ" بہ معنی خالص، مشترک کی ضد ہے اور "سلم" حرب کی ضد ہے۔ "حرب" کا یہاں کوئی موقع نہیں ہے۔ اس کا جواب یوں دیا ہے کہ حرف کے جب دو معنی ہوں تو وہ اسی پر محمول کیا جائے گا جو اولیٰ یعنی زیادہ مناسب ہوگا۔ پس "سلم" گو حرب کی ضد ہے، لیکن اس کے ایک اور معنی ہیں وہ "سَلَمَ لَهُ" سے بہ معنی "سالم" آتا ہے، جب کوئی شے کسی کے لیے خالص ہوتی ہے تو بولتے ہیں: "سَلَمَ لَهُ كَذَا"

دوسرے یہ ہے کہ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے جس بات کے ساتھ اس کو لازم کیا ہے، وہی "سالم" میں بھی اس کو لازم آئے گی۔ اس لیے کہ محاورے میں یوں بولتے ہیں: "شَيْءٌ سَالِمٌ" یعنی اس میں کوئی آفت و بیماری نہیں ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے قراءتِ اولیٰ کو اختیار کیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جمہور کی قراءت مبالغے کی خاطر وصف بالمصدر پر ہے، یا حذفِ مضاف کی بنا پر "أَيْ: ذَا سَلَمٍ" اور اسی کی طرح سعید بن جبیر وغیرہ کی قراءت ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "رَجُلًا سَالِمًا لِرَجُلٍ" کے یہ معنی ہیں کہ اس میں کسی کا کچھ نہیں ہے، یعنی پورے کا پورا ایک ہی شخص کا ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے وہ بات بیان کی جو اس بات پر دال ہے کہ دونوں مردوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ﴾ یہ انکار و استبعاد کا استفہام ہے، معنی یہ ہیں کہ بھلا برابر ہوسکتا ہے یہ شخص جو شرکاء کی ایک جماعت کی خدمت کرتا ہے جن کی عادتیں اور مقاصد مختلف ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اس سے خدمت لیتا ہے اور یہ شخص تھکتا ہے اور رنج و مشقت میں پڑتا ہے، ہر طرح کی ایذا اُٹھاتا ہے، اس پر طرہ یہ کہ ان شرکاء میں سے کوئی بھی اس کی خدمت سے راضی نہیں ہے۔ کیا یہ شخص اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جو صرف ایک کی خدمت کرتا ہے، اس کے سوا کوئی اس سے نزاع نہیں کرتا۔ جب وہ اس کی اطاعت کرتا ہے تو اس سے خوش ہوتا ہے اور جب اس کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کو معاف کر دیتا ہے۔ بے شک ان دونوں کے درمیان ایسا ظاہر و باہر اختلاف ہے کہ اس کی

[1] تفسير القرطبي (١٥/٢٥٢، ٢٥٣) فتح القدير (٦٠٦، ٦٠٧) [2] تفسير الطبري (٢١/٢٨٤)

موجودگی میں کوئی عقل مند اپنے منہ سے ان کو ایک دوسرے کے مساوی نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ ان میں سے ایک تو بلند سے بلند مقام پر ہے اور دوسرا ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں پڑا ہوا ہے۔ ﴿ مَثَلًا ﴾ کا نصب بنا بر تمیز ہے جو فاعل سے محول ہے، اس لیے کہ اصل یہ ہے "هَلْ يَسْتَوِيْ مَثَلُهُمَا"، یعنی کیا ان کی حالت اور صفت برابر ہے؟ ہرگز نہیں۔

رہی یہ بات کہ تمیز کو مفرد ذکر کیا نہ کہ تثنیہ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل تمیز میں افراد ہے، اس لیے کہ وہ جنس کو بیان کرتا ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمیز اس لیے مفرد لایا گیا ہے کہ ﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا ﴾ میں اول اس پر اقتصار کیا گیا ہے۔ کسی نے "مَثَلَيْنِ" پڑھا ہے تو اب "رَجُلَيْنِ" کے حالین سے مطابق ہوگا۔ جملہ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ معترضہ ہے، (اس لیے کہ ﴿ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ اضراب انتقالی ہے، ﴿ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ﴾ سے مرتبط ہے۔) اس کا مقصد اس نفی کی تقریر و تاکید ہے جو ماقبل میں استواء استفہام انکاری سے سمجھی جاتی ہے اور موحدوں کو اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ ان کو جو شرف اور فضیلت حاصل ہے وہ صرف اللہ کی توفیق سے ہے اور اس بات سے ہے کہ یہ توحید ایک بہت بڑی اور عظیم نعمت اور عطا ہے، یہ ان پر اس بات کو واجب کرتی ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور عبادت کرتے رہیں۔

بالجملہ پہلے تو اللہ پاک نے ان دو مذکور اشخاص کے درمیان برابری کا نہ ہونا بروجہ مذکور بیان کیا، پھر جملہ معترضہ سے اس کی تقریر کی۔ اس کے بعد اس سے دوسری طرف اضراب و انتقال کر کے فرمایا: ﴿ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ اکثر لوگ (مراد مشرک ہیں) اس کو نہیں جانتے، باوجود اس بات کے کہ اچھی طرح ظاہر کر دی گئی ہے اور وضاحت کر دی گئی ہے۔ پھر وہ ورطۂ شرک میں اور گمراہی میں گرتے ہیں۔ امام واحدی اور بغوی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اکثر سے مراد کل ہے۔ انتہیٰ [1]

فتح البیان اور فتح القدیر میں کہا ہے کہ ظاہر اس بات کے خلاف ہے جو ان دونوں نے کہی ہے، اس لیے کہ مومنین باللہ توحید کی بلند شان کو جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی وجہ سے اور کسی بھی وصف میں شرک اس کے مساوی نہیں ہے اور جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ اس نعمت پر حمد کا مستحق ہے اور حمد اس کے ساتھ مختص ہے۔ [2] انتہیٰ۔ کاتبِ حروف ۔عفا اللّٰه عنه۔ عرض کرتے ہیں کہ امام واحدی اور بغوی رحمہما اللہ کی غرض یہ ہے کہ ﴿ اَكْثَرُهُمْ ﴾ کی ضمیر مشرکین کی طرف راجع ہے تو معنی یہ ہوئے کہ اکثر مشرک امورِ مذکورہ کو نہیں جانتے اور بعض جانتے ہیں، حالاں کہ سب کے سب مشرکین نہیں جانتے، اگر جانتے تو شرک کیوں کرتے، چنانچہ اس لیے یہاں کلمۂ ﴿ اَكْثَرُ ﴾ بہ معنی کل ہے، جیسا کہ محاورۂ عرب میں آیا کرتا ہے۔ اور فتح البیان اور فتح القدیر کے اعتراض کا منشا یہ ہے کہ ﴿ اَكْثَرُهُمْ ﴾ کی ضمیر عام

[1] تفسير البغوي (١١٨/٧) [2] فتح القدير (٦٠٧/٤) فتح البيان (١١٢/١٢)

لوگوں کی طرف راجع ہے اور اکثر سے مراد کل مشرکین ہیں تو معنی یہ ہوئے کہ آدمیوں میں سے جو مشرک ہیں وہ امورِ مذکورہ کو نہیں جانتے اور جو مومنین باللہ و بالرسل ہیں، وہ ان کو جانتے ہیں۔ واللّٰہ أعلم وعلمه أتم.

بالجملہ پھر اللہ پاک نے رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر دی کہ لامحالہ ان کو موت آئے گی اور مشرکین کو، چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ کافر لوگ نبی ﷺ کی وفات کا انتظار کرتے تھے تو اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ موت ان سب کو عام ہو گی تو انتظار کرنے اور ایک فانی کے دوسرے فانی کے ساتھ شماتت (بدحالی پر خوش ہونا) کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اپنی ذاتِ مبارک کی موت کی خبر دی گئی۔ اور ان لوگوں کو بھی ان کے مرنے کی اطلاع دی گئی۔ یا یہ خبر دینے کی وجہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بتانا ہے کہ نبی اکرم ﷺ وفات پا جائیں گے۔[1] بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ اعتقاد تھا کہ آپ ﷺ انتقال نہ فرمائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ اس کے بعد جو قیامت کے دن کے جھگڑے کا ذکر آتا ہے، اس کی تمہید و توطیہ ہو جائے، یعنی قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴾ معنی یہ ہیں کہ اے لوگو! تم سب یعنی تم میں سے مومن اور کافر قیامت کے دن اپنے رب کے پاس جھگڑو گے ان مظالم کے بارے میں جو تمھارے آپس میں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ جھگڑنا حق والے اور باطل والے کا ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اے محمد! تو ان سے جھگڑے کا اور اُن پر حجت قائم کرے گا، اس بات کی کہ تو نے ان کو رسالت پہنچا دی اور ان کو ڈرایا اور وہ تجھ سے جھگڑیں گے۔ یا مومن کافر سے اور مظلوم ظالم سے جھگڑے گا۔ امام نسائی رحمہ اللہ وغیرہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: البتہ واقعی ہم اپنے زمانے میں ایک مدت تک ٹھہرے اور ہم خیال کرتے تھے کہ یہ آیت ہمارے اور ہم سے پہلے کی نازل شدہ کتابوں کو ماننے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ ہم میں بعض، بعض کے وجوہ کو تلوار سے مارتے ہیں تو میں جان گیا کہ یہ ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کے پاس اپنے بھائی کی آبرو یا مال کے بارے میں کسی ظلم و زیادتی کا گناہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ گناہ آج کے دن معاف کرا لے، اس سے پہلے کہ اس کے پاس دینار اور درہم نہ ہو گا اور اگر اس کے پاس کوئی عملِ صالح ہو گا تو اس سے اس گناہ کے مطابق لے لیا جائے گا اور اگر اس کی نیکیاں نہیں ہوں گی تو اس کے بھائی کے گناہ لیے جائیں گے اور اس پر لاد دیے جائیں گے۔[3] امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ہم میں سے مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس نہ کوئی درہم ہے نہ کوئی اور

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/٢٥٤) [2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٤٥) الدر المنثور (٧/٢٢٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١٧)

مال و متاع تو آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک مفلس وہ ہے کہ جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکات لے کر آئے گا اور آئے گا کہ اس نے گالی دی ہوگی اس کو، اور بہتان لگایا ہوگا اس کو، اور مال کھایا ہوگا اس کا، اور خون بہایا ہوگا اس کا، اور مارا ہوگا اس کو۔ پھر ان مظلوموں کو اس کی حسنات میں سے دیا جائے گا اور اگر اس کی حسنات حق داروں کو ادا کرنے سے پہلے ختم ہو جائیں گی تو ان کی خطائیں لے کر اس پر ڈال دی جائیں گی، پھر وہ آگ میں ڈال دیا جائے گا۔[1]

سعید بن منصور نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم کہتے تھے کہ ہمارا رب ایک ہے اور ہمارا دین ایک ہے اور ہمارا نبی ایک ہے، پھر یہ جھگڑا کیا ہے؟ پھر جب صفین کا دن ہوا اور ہم میں سے بعض نے بعض پر تلواروں سے حملہ کیا تو ہم نے کہا: ہاں، وہ یہ ہے۔[2] ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا: ہم کیسے جھگڑیں گے، حالاں کہ ہم تو بھائی بھائی ہیں، پھر جب عثمان رضی اللہ عنہ قتل کیے گئے تو کہا: یہ ہمارا جھگڑا ہے۔[3]

جمہور نے ﴿ مَيِّتٌ ﴾ اور ﴿ مَّيِّتُوْنَ ﴾ کو بہ تشدید پڑھا ہے اور ابن محیصن وغیرہ (یعنی امام ابن ابی عبلہ، عیسی بن عمرو، ابن ابی اسحاق اور یمانی رحمہم اللہ) نے "مَائِتٌ وَمَائِتُوْنَ" پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی ایسے ہی پڑھا ہے۔ بعض مفسرین نے اس قراءت کو مستحسن کہا ہے، اس لیے کہ آپ کی اور اُن کی موت زمانہ مستقبل میں ہے، حالاں کہ مستحسن کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ جمہور کی قراءت کے معنی بھی یہی ہیں۔ امام فراء اور کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَيِّتٌ ﴾ بہ تشدید وہ ہے جو مرا نہیں اور آیندہ مرے گا، اور "مَيْتٌ" بہ تخفیف وہ ہے جو مر چکا اور روح اس سے جدا ہوگئی۔[4] خلیل نے کہا کہ امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے یہ شعر پڑھا:

وَتَسْأَلُنِي تَفْسِيْرَ مَيْتٍ وَمَيِّتٍ فَدُوْنَكَ قَدْ فَسَّرْتُ إِنْ كُنْتَ تَعْقِلُ
فَمَنْ كَانَ ذَا رُوْحٍ فَذَلِكَ مَيِّتٌ وَمَا الْمَيْتُ إِلَّا مَنْ إِلَى الْقَبْرِ يُحْمَلُ

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی مثل کی تثقیل میں قراء کے درمیان کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے۔ بالجملہ پھر اللہ پاک نے جھگڑنے والوں میں سے ہر فریق کا حال بیان کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:[5]

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۳۳ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨١) (2) الدر المنثور (٢٢٦/٧، ٢٢٧) (3) تفسير الطبري (٢٨٨/٢١)
(4) تفسير القرطبي (٢٥٤/١٥) (5) فتح البيان (١٠٩/١٢-١١٤)

رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ۳۴ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ۳۵

پھر اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ بولا اور سچائی کو جھٹلایا، جبکہ وہ اس کے پاس آ گئی، کیا کافروں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں؟ (32) اور جو شخص سچائی (دینِ حق) لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی، وہی لوگ متقی ہیں (33) ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ (سب کچھ) ہے جو وہ چاہیں گے، نیکی کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے (34) تاکہ اللہ ان سے وہ برائیاں دور کر دے جو انھوں نے کیں اور انھیں ان کا اجر بہترین اعمال کے مطابق دے جو وہ کرتے رہے تھے (35)

جھوٹے اور سچے لوگوں کی جزا و بدلہ:

یعنی اگر نبی نے جھوٹ اللہ کا نام لیا تو اس سے بُرا کون اور اگر وہ سچا تھا اور تم نے جھٹلایا تو تم سے برا کون۔ جو سچ لایا وہ نبی اور جس نے سچ مانا وہ مومن۔ انتہیٰ۔

مشرکوں نے جو اللہ تعالیٰ پر افتراء کیا اور اس کے ساتھ اور معبود ٹھہرائے اور دعویٰ کیا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اس کی اولاد ٹھہرائی۔ تعالی اللّٰہ عن قولھم علوا کبیرا۔ اور اس کے باوجود اس کی سچی بات کو جھٹلایا جو ان کے پاس رسل۔ علیھم الصلاۃ والسلام۔ کی زبان پر آئی تو اللہ پاک ان کو مخاطب کر کے یوں فرماتا ہے: ﴿ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَاۗءَهٗ ۭ ﴾ یعنی پھر اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ بولا اور حق بات جب اس کے پاس آئی تو اس کو جھٹلایا۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہے، کیوں کہ اس نے دونوں طرفوں کے باطل کو جمع کیا: اللہ پر جھوٹ بولا اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی۔ باطل کے قائل ہوئے اور حق کو جھٹلایا۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے ان کو یہ وعید سنائی: ﴿ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴾ یعنی کیا دوزخ میں منکرین اور کافرین اور مکذبین کا ٹھکانا نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے یہ اوصاف ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ نعوذ باللّٰہ منھا۔

سچائی لانے والا اور اس کی تصدیق کرنے والے کون لوگ ہیں:

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْ جَاۗءَ بِالصِّدْقِ ﴾ یعنی اور جو شخص سچی بات لایا۔ امام مجاہد، قتادہ، ربیع بن انس اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد رسول ﷺ ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبریل علیہ السلام ہیں

اور ﴿ وَصَدَّقَ بِهٖٓ ﴾ سے مراد جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ علی بن طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ان الفاظ سے بیان کیا ہے کہ ﴿ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ ﴾ وہ شخص ہے جو ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' لایا اور ﴿ وَصَدَّقَ بِهٖٓ ﴾ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے ''وَالَّذِیْنَ جَاءُوْا بِالصِّدْقِ'' پڑھا ہے، یعنی انبیاء ''وَصَدَّقُوْا بِهٖ'' یعنی ان کی اتباع کرنے والے۔ لیث بن ابی سلیم نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: ﴿ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ ﴾ کہا کہ اصحابِ قرآن مومنین قیامت کے دن آئیں گے، کہیں گے: یہ وہ شے ہے جو تم نے ہم کو دی اور ہم نے اس میں سے اس شے پر عمل کیا جس کا تم نے ہم کو حکم کیا۔[1]

یہ قول جو مجاہد سے مروی ہے سب مومنین کے لیے ہے، کیوں کہ مومنین حق کہتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس تفسیر کی بنا پر رسول اللہ ﷺ اس بات کے سب سے بڑھ کر مستحق ہیں کہ اس آیت میں داخل ہوں، اس لیے کہ آپ صدق کو لائے اور رسولوں کی تصدیق کی اور اس شے پر ایمان لائے جو اُن پر اُن کے رب کی طرف سے نازل کی گئی اور مومنین سب کے سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ ﴾ رسول اللہ ﷺ ہیں اور ﴿ وَصَدَّقَ بِهٖٓ ﴾ مسلمان ہیں۔[2] ﴿ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ وہی لوگ ہیں جو شرک سے بچے۔[3]

﴿ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ یعنی ان کے لیے اپنے رب کے پاس، یعنی جنت میں وہ شے ہے جس کو وہ چاہیں گے۔ وہ جب طلب کریں گے تو پائیں گے: ﴿ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ جیسا کہ اللہ عزوجل نے دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ١٦] ''یہی وہ لوگ ہیں جن کے نیک اعمال تو ہم قبول فرما لیتے ہیں اور جن کے بداعمال سے درگزر کر لیتے ہیں، (یہ) جنتی لوگوں میں ہیں۔ اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا تھا۔''[4] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا، اس طرح سے کہ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اللہ کی اولاد ہے، یا اس کا شریک ہے، یا اس کی جورو ہے، اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہے۔ تعالى الله عن ذلك۔ اور اس

[1] تفسير الطبري (٢١/٢٨٩-٢٩١) تفسير ابن كثير (٤/٦٩)
[2] تفسير الطبري (٢١/٢٩٠)
[3] تفسير الطبري (٢١/٢٩٢)
[4] تفسير ابن كثير (٤/٦٩)

شخص نے حق کی تکذیب کی، جبکہ اس کے پاس آیا۔ کلمہ ﴿ إِذْ ﴾ ظرف ہے ﴿ كَذَّبَ بِالصِّدْقِ ﴾ کا، یعنی قرآن کو اس کے آنے کے وقت جھٹلایا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو سنتے ہی بغیر توقف کے اور بغیر غور و فکر کے جھٹلانے لگا، اس نے سوچ سمجھ کر حق و باطل میں فرق کرنے کی کوشش ہی نہ کی، جیسا کہ اہلِ انصاف کا طریقہ ہے کہ جس بات کو سنتے ہیں، اس میں فکر کرتے ہیں نہ یہ کہ سنتے ہی بغیر غور کے تکذیب کرنے لگے۔ "صِدْقٌ" سے مراد وہ شے ہے جس کو رسول اللہ ﷺ لے کر تشریف لائے، یعنی توحید کی طرف بلانا، شرعی فرائض کو قائم کرنے کا حکم کرنا اور شریعت میں حرام کردہ چیزوں سے منع کرنا۔ بعث و نشر کی خبر دینا اور اس ثواب کے بارے میں بتانا جو اللہ تعالیٰ نے مطیع کے لیے تیار کر رکھا ہے اور اس عذاب کے متعلق بتانا جو گناہ گاروں کے لیے مہیا کیا ہے۔ قرآن شریف ان سب اُمور کا جامع ہے۔ چنانچہ قرآن شریف کا جھٹلانا ان سب کو جھٹلانا ہے۔

پھر اللہ پاک نے ان افتراء کرنے والوں کو اور سچ اور راستی کو جھٹلانے والوں کو بہ استفہام تقریری یہ دھمکی دی: ﴿ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ﴾ ﴿ مَثْوًى ﴾ مقام کو کہتے ہیں، ماخوذ ہے: "ثَوَى بِالْمَكَانِ إِذَا أَقَامَ بِهِ يَثْوِي ثَوَاءً وَثُوِيًّا" سے مثل "مَضَى يَمْضِي مَضَاءً وَمَضِيًّا" کے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَثْوَى" بھی بولتے ہیں۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا اور کہا: ہم "أَثْوَى" کو نہیں پہچانتے۔ بالجملہ پھر اللہ پاک نے مومنین مصدقین کے فریق کا ذکر فرمایا۔ ﴿ وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ ﴾ موصول مبتداء ہے اور ﴿ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴾ خبر ہے۔ اس سے مراد نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے متبعین ہیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ﴿ وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ ﴾ رسول اللہ ﷺ اور ﴿ وَصَدَّقَ بِهِ ﴾ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ ﴾ رسول اللہ ﷺ ہیں اور ﴿ وَصَدَّقَ بِهِ ﴾ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں۔[1] بعض قول پہلے گزر چکے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ عام ہے، ہر اس شخص کے لیے جس نے اللہ کی توحید کی طرف دعوت دی اور اس شے کی راہ بتائی جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے مشروع فرمائی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔[2] اور فتح البیان اور فتح القدیر میں بھی اسی قول کو پسند فرمایا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت "وَالَّذِينَ جَاءُوا بِالصِّدْقِ وَصَدَّقُوا بِهِ" اسی کی تائید کرتی ہے[3] اور لفظ ﴿ الَّذِي ﴾ جیسا کہ جمہور کی قراءت میں واقع ہوا ہے، اگرچہ مفرد ہے، لیکن اس کے معنی جمع ہیں، اس لیے کہ اس سے مراد جنس ہے، چنانچہ ﴿ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴾ سے یہی معلوم ہوتا ہے، یعنی جو لوگ مذکورہ اوصاف کے حامل ہیں، وہی تقویٰ کے ساتھ متصف ہیں جو نجات کا عنوان ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبي (۲٥٦/۱٥) [2] تفسیر الطبري (۲۹۱/۲۱) [3] فتح القدیر (٦۰۸/٤) فتح البیان (۱۱٥/۱۲)

امام ابو صالح رحمہ اللہ نے "صَدَقَ" بہ تخفیف پڑھا ہے: "أَيْ صَدَقَ بِهِ النَّاسَ"[1] یعنی لوگوں کو سچے طور پر پہنچایا، جیسا کہ نازل ہوا۔ یا "صَدَقَ بِهِ" کے یہ معنی ہیں کہ آپ ﷺ نزولِ قرآن کے سبب سے صادق ہوئے، آپ ﷺ کا صدق اس کے سبب سے ظاہر ہوا، اس لیے کہ قرآن آپ کا معجزہ ہے اور معجزہ اللہ کی طرف سے نبیوں کی تصدیق ہوتا ہے۔ فتح البیان میں تمام قولوں کو نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ سب صحیح ہیں۔ علماء نے کہا ہے کہ عربیت میں بہتر یہ ہے کہ ﴿ جَآءَ ﴾ اور ﴿ صَدَّقَ ﴾ دونوں ایک ہی فاعل کے فعل ہوں، اس لیے کہ اگر وہ غیر ہوں گے تو اس کا تقاضا ہوگا کہ ﴿ الَّذِیْ ﴾ کو مضمر مانیں، حالاں کہ یہ جائز نہیں ہے (اس میں بصری اور کوفی کا اختلاف ہے) اور اس بات کا کہ فاعل کو مضمر کریں بغیر تقدمِ ذکر کے اور یہ بعید ہے۔[2]

غرضیکہ ان صادقین اور مصدقین کے لیے آخرت میں جو ثواب ہے، اللہ پاک نے اس کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ یعنی ان کے لیے ہر وہ شے ہے جس کو وہ چاہیں گے، ان کے درجے بلند کیے جائیں گے، ان کی تکالیف دور ہوں گی، گناہ مٹا دیے جائیں گے، منافع ان کو ملیں گے اور جو شے وہ چاہیں گے وہ فوراً ان کے پاس آجائے گی۔ یہ جو فرمایا اس میں بہت زیادہ ترغیب ہے اور شوق دلایا گیا ہے۔ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتداء ہے ﴿ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ خبر۔ یعنی یہ جزا جس کا ذکر ہوا ان لوگوں کی جزا ہے جنھوں نے اپنے اعمال میں احسان کا برتاؤ کیا۔ صحیح میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح سے کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، پھر اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔[3]

بالجملہ متقیوں کے لیے جو ثواب اُن کے رب کے پاس ہے، اس میں سے جو شے انتہا ہے، اللہ پاک نے اس کا ذکر کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا ﴾ یعنی تاکہ اللہ ان کے اعمال میں سے جو کیے تھے ان سے بدتر عمل کو اتارے، کیوں کہ ان سے ضرر کا دور کرنا ان امور میں سے بہت بڑا امر تھا جن کی وہ اُمید رکھتے ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے واسطے وہ عمل بخش دیا جو ان کے اعمال سے بدتر تھا تو جو اس سے کم درجے کا ہے، اس کو تو بطریقِ اولیٰ بخشا۔ حرفِ لام ﴿ يَشَآءُوْنَ ﴾ سے متعلق ہے، یا محسنین سے متعلق ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ انھوں نے احسان اور اخلاص کیا تکفیر کے لیے، یعنی گناہ مٹانے کے لیے۔ یا محذوف سے متعلق ہے: "أَيْ: يَسَّرَ لَهُمْ ذٰلِكَ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ" یعنی ان کے لیے یہ ثواب سہل اور آسان کر دیا، تاکہ مٹا دے اللہ تعالیٰ ان سے۔ جمہور نے ﴿ اَسْوَاَ ﴾ بہ صیغۂ اسم تفضیل پڑھا ہے اور تفضیل اپنے باب پر ہے، معنی وہی ہیں کہ جب بدتر کو بخش دیا تو کمتر کو بہ طریقۂ اولیٰ بخشا، غرضیکہ بڑے چھوٹے سب گناہ بخش دیے۔ کسی نے کہا ہے کہ تفضیل اپنے باب پر نہیں

[1] فتح القدير (٤/٦٠٨) [2] فتح البيان (١٢/١١٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨)

ہے، بلکہ ﴿ اَسْوَاَ ﴾ بہ معنی "سیِّئٌ" ہے تو اس اعتبار سے ﴿ اَسْوَاَ ﴾ ان کے سارے معاصی کو اور "أحسن" ان کے سارے حسنات کے لیے عام اور شامل ہو گیا۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک روایت میں "أَسْوَاءٌ" بروزن "أَحْمَالٌ" پڑھا ہے، یہ "سَوْءٌ" کی جمع ہے۔[1] پھر جب اللہ پاک نے اس شے کا ذکر کیا جو اس پر دال ہے کہ ان سے مضرتین دور کر دیں تو وہ شے ذکر فرمائی جو اس پر دال ہے کہ سب سے بڑا منافع ان کو عطا فرمایا، چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ "أَحْسَنُ" کی اضافت ما بعد کی طرف مفضل کی اضافت الی المفضل کے باب سے نہیں ہے، بلکہ اضافتِ شے الی بعضہ کے باب سے ہے، توضیح کے قصد کے لیے بغیر تفضیل کے اعتبار کے اور جس طرح ﴿ اَسْوَاَ ﴾ ان کے سارے معاصی کو عام ہے اسی طرح "أَحْسَنَ" ان کے تمام حسنات کو شامل ہے اور اگر یہ تاویل نہ ہو تو نظم قرآنی اس کی مقتضی ہو گی کہ صرف ان کے بہت زیادہ قبیح سیئات کو مٹا دے گا اور صرف افضل حسنات پر ان کو جزا دے گا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو ان کے اعمال کے محاسن کی جزا دے گا اور ان کو مساوی کا بدلہ نہ دے گا[2] (محاسن نیک اعمال اور مساوی بد اعمال)۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٣٦﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ﴿٣٧﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٣٨﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٩﴾ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٤٠﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٤١﴾

[1] فتح القدير (٦٠٩/٤) [2] تفسير البغوي (١٢٠/٧) فتح البيان (١١٤/١٢-١١٦)

کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟ اور وہ آپ کو ان (معبودوں) سے ڈراتے ہیں جو (انھوں نے) اللہ کے سوا (بنا رکھے) ہیں اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ﴿36﴾ اور جسے اللہ ہدایت دے تو اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، کیا اللہ نہایت غالب، انتقام لینے والا نہیں؟ ﴿37﴾ اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے! کہہ دیجیے: بھلا دیکھو تو! جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا وہ (تمھارے باطل معبود) اس کی (پہنچائی ہوئی) تکلیف دور کر سکتے ہیں؟ یا وہ مجھ پر رحمت کرنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟ کہہ دیجیے: مجھے اللہ کافی ہے، بھروسا کرنے والے اسی پر بھروسا کرتے ہیں ﴿38﴾ کہہ دیجیے: اے میری قوم! تم اپنے طریقے (اور حالت) پر عمل کرو، بے شک میں (اپنے طریقے پر) عمل کرنے والا ہوں، چناں چہ جلد تم جان لو گے ﴿39﴾ کہ کس پر ایسا عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے، اور کس پر ہمیشہ رہنے والا عذاب اترتا ہے ﴿40﴾ بلاشبہ ہم نے لوگوں کے لیے آپ پر (یہ) کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، پھر جس نے ہدایت پائی تو اپنے ہی بھلے کے لیے اور جو گمراہ ہوا، تو بس اس کی گمراہی (کا وبال) اسی پر ہے اور آپ ان کے ذمے دار نہیں ﴿41﴾

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کافی ہے:

تجھ کو ڈراتے ہیں، یعنی تو بتوں کو نہیں مانتا تو وہ تجھ پر غصے ہوں گے، تیرا کچھ برا کر دیں گے، پس جس کی مدد پر اللہ ہو اس کا برا کون کر سکے؟! اس پر ہمیشگی کی مار ہے، یعنی وہ دنیا میں یہ آخرت میں۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے۔ بعض نے "عِبَادَهُ" پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو کفایت کرتا ہے جس نے اس کو پوجا اور اس پر توکل کیا۔ سیدنا فضالہ بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ فرماتے تھے: اس شخص نے فلاح پائی جو اسلام کی طرف ہدایت کیا گیا اور اس کی گزران کفاف ہوئی، یعنی بقدرِ حاجت اور اس پر قناعت کی۔[1] (رواه ابن أبي حاتم ورواه الترمذي والنسائي من حديث حيوة بن شريح عن أبي هانئ الخولاني به وقال الترمذي: صحيح)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ ﴾ یعنی مشرکین جہالت وگمراہی کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٤٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٠٦)

کو اپنے بتوں سے ڈراتے اور دھمکاتے ہیں جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ ﴾ اِلٰی قَوْلِهٖ ﴿ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ﴾ یعنی اللہ پاک بڑا غالب اور منیع الجناب ہے۔ جس نے اس کی بارگاہِ عالی جاہ پر تکیہ کیا اور اس کے بابِ عالی کی طرف پناہ پکڑی، اس پر کوئی ظلم نہیں کر سکتا، کیوں کہ وہ تو ایسا عزیز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی عزیز، یعنی غالب نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اس سے زیادہ سخت انتقام لینے والا ہے، ان لوگوں سے جنھوں نے اللہ کے ساتھ کفر و شرک کیا اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ عناد و دشمنی کی۔

مشرکین کا توحیدِ ربوبیت کا اعتراف:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ سے مراد وہ مشرکین ہیں جو یہ اقرار کرتے تھے کہ ساری اشیاء کا خالق اللہ ہی ہے اور اس اقرار کے باوجود اس کے غیر کی اس کے ساتھ عبادت کرتے تھے، ایسے غیر جو نہ اُن کا برا کر سکیں نہ بھلا۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ﴾ یعنی وہ ضرر اور نفع میں سے کچھ بھی طاقت نہیں رکھتے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے: تو نگاہ رکھ اللہ کو تو وہ تجھ کو نگاہ رکھے گا، تو نگاہ رکھ اللہ کو تو تُو اسے اپنے رُوبرُو پائے گا، تو اللہ کو راحت و آرام میں پہچان تو وہ تجھے سختی میں پہچانے گا۔ جب تو سوال کرے تو اللہ سے سوال کر، اور جس وقت تو مدد مانگے تو اللہ سے مدد مانگ، اور یہ جان لے کہ اگر ساری امت اکٹھی ہو کر تجھے کوئی ایسی تکلیف پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے تیرے مقدر میں نہیں لکھی تو وہ تجھے تکلیف نہ پہنچا سکیں گے اور اگر وہ سب کے سب جمع ہو کر تجھے کسی ایسی شے کے ساتھ نفع پہنچانا چاہیں جو اللہ نے تیرے مقدر میں نہیں لکھا تو وہ تجھے نفع نہ پہنچا سکیں گے۔ صحیفے سوکھ گئے اور قلم اٹھا لیے گئے اور اللہ کے لیے ایمان کے ساتھ اور اس کا شکر بجا لاتے ہوئے عمل کر اور اس بات کو جان لے کہ اس شے پر جو تجھے بری لگتی ہے صبر کرنے میں بہت زیادہ بہتری ہے اور بے شک صبر کرنے سے اللہ کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے اور کرب (تکلیف) کے ساتھ کشایش (آسودگی) ہے اور بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴾ یعنی تو کہہ دے کہ مجھ کو اللہ کافی ہے اور اسی پر میں نے توکل کیا اور اسی پر توکل کرنے والوں کو توکل کرنا چاہیے، جیسا کہ ہود علیہ السلام نے کہا: جب ان کی قوم نے یہ کہا: ﴿ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢٥١/١٠) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٥١٦) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٧٩٥٧)

بِنَاصِيَتِهَا ۚ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [هُوْد: ٥٤۔ ٥٦] ''بلکہ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تو ہمارے کسی معبود کے برے جھپٹے میں آ گیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں تو اللہ کے سوا ان سب سے بیزار ہوں، جنھیں تم شریک بنا رہے ہو۔ اچھا تم سب مل کر میرے خلاف چالیں چل لو اور مجھے بالکل مہلت بھی نہ دو۔ میرا بھروسا صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ہے، جو میرا اور تم سب کا پروردگار ہے جتنے بھی پاؤں دھرنے والے ہیں سب کی پیشانی وہی تھامے ہوئے ہے۔ یقیناً میرا رب بالکل صحیح راہ پر ہے۔'' امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ سب لوگوں سے زیادہ قوی ہو تو چاہیے کہ اللہ پر توکل کرے اور جو یہ چاہے کہ وہ سب لوگوں سے زیادہ غنی ہو تو چاہیے کہ وہ اس شے پر زیادہ بھروسا کرنے والا ہو جو اللہ عزوجل کے ہاتھ میں ہے، بہ نسبت اس شے کے جو اس کے ہاتھوں میں ہے۔ اور جو شخص یہ چاہے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ عزت والا ہو تو چاہیے کہ اللہ عزوجل کا تقویٰ رکھے۔ ①

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ ﴾ یعنی اے قوم! تم اپنے طریقے پر عمل کرو میں اپنے طریقے اور راہ پر عمل کرنے والا ہوں۔ یہ دھمکی ہے اور ڈانٹ ہے۔ ﴿ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴾ یعنی تم عن قریب اس کا انجام اور وبال جان لوگے کہ کس کو دنیا میں عذاب آئے گا جو اسے ذلیل وخوار کرے اور اس پر دائمی عذاب نازل ہوگا جس سے اس کو کوئی مفر نہیں ہوگا۔ یہ عذاب قیامت کے دن میں ہے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ ہم نے تجھ پر قرآن حق کے ساتھ اتارا، تمام جنوں اور انسانوں کی خاطر، تاکہ اس کے ساتھ تو ان کو ڈرائے۔ پھر جو سیدھی راہ پر آ گیا تو اس کا فائدہ اسی کی جان کے لیے ہوگا اور جو بہکا تو وہ اپنی بری حالت کے لیے بہکا، یعنی اس کا وبال اسی کی جان پر پڑے گا اور تو اُن پر وکیل نہیں ہے، یعنی تو اس پر مقرر نہیں کیا گیا کہ وہ راہ پائیں۔ تیری ذمے داری تو صرف پہنچا دینا ہے اور ہماری ذمے داری حساب لینا ہے۔ ②

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جمہور نے ﴿ عَبْدَهٗ ﴾ بہ افراد پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے ''عِبَادَهُ'' بہ جمع پڑھا ہے۔ پہلے کی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں، یا جنسِ عبد مراد ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدخولِ اولی اس

① تفسیر ابن أبي حاتم (٣٢٥٢/١٠) اس کی سند میں ''ابوالمقدام ہشام بن زیاد'' سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٤٢١)

② تفسیر ابن کثیر (٧٠/٤، ٧١)

میں داخل ہیں اور دوسرے کی بنا پر انبیاء علیہم السلام یا مومنین یا دونوں مراد ہیں۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے پہلے کو اختیار کیا ہے، اس لیے کہ بعد میں ﴿ وَيُخَوِّفُوْنَكَ ﴾ میں نبی اکرم ﷺ کو خطاب ہے، "اَللّٰهُ كَافٍ" یا "يَكْفِيْ عَبْدَهٗ" نہ فرمایا، حالاں کہ منظور اس بات کی خبر دینا ہے کہ اللہ کافی ہے۔ بلکہ اس مضمون کو استفہام انکاری کے پیرائے میں ادا کیا، چنانچہ اس کا مقصد اللہ کی کفایت کو بڑے مبالغے کے ساتھ ثابت کرنا ہے، گویا وہ کفایت ایسی کھلی ہوئی ہے کہ کسی سے اس کا انکار ہو نہیں سکتا۔ کسی نے کہا ہے کہ "عبد و عباد" سے مراد بالعموم مسلم اور کافر ہیں۔ امام جرجانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ اپنے بندۂ مومن کو اور بندۂ کافر کو کافی ہے۔ مومن کو تو ثواب کے ساتھ اور کافر کو عِقاب کے ساتھ۔[1] کسی نے "بِكَافٍ عِبَادِهٖ" باضافت پڑھا ہے اور کسی نے "يُكَافِيْ" بہ صیغۂ مضارع پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُخَوِّفُوْنَكَ ﴾ جائز ہے کہ محلِ نصب میں ہو بنا بر حال، اس لیے کہ معنی یہ ہیں: کیا اللہ تجھ کو اس حال میں کافی نہیں ہے کہ وہ تجھے اپنے معبودوں سے ڈراتے ہیں جن کو پوجتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ البتہ تو ہمارے معبودوں کو برا کہنے سے باز رہے، ورنہ تجھے ان کی طرف سے فسادِ عقل یا جنون پہنچے گا۔ گویا معنی یہ ہیں کہ وہ تجھے ہر حال میں کافی ہے، یہاں تک کہ اس حال میں بھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مستانفہ ہو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص پر اس کی گمراہی کے ساتھ قضا ثابت ہو چکی، یہاں تک کہ وہ اس بات سے غافل ہو گیا کہ اللہ اپنے بندۂ مکرم محمد ﷺ کے لیے کافی ہے اور اس کو ایسی شے سے ڈرایا جو نہ نفع پہنچا سکتی ہے اور نہ ضرر تو اس کے لیے کوئی ہادی نہیں ہے کہ اسے ہدایت کی راہ بتائے اور اس کو گمراہی سے چھڑائے اور جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کرے، اس کو گمراہ کرنے والا کوئی نہیں کہ اس کو ہدایت سے نکالے اور گمراہی میں ڈالے۔ ﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ﴾ یعنی کیا اللہ ہر شے پر غالب اور قاہر نہیں ہے ایسا بدلہ لینے والا جو اپنے نافرمانوں سے اپنے عذاب اور سزا کے ساتھ بدلہ لیتا ہے۔ ضمیر کے بجائے جو اسم جلیل کو رکھا تو اس سے مضمونِ کلام کی حقیقت ظاہر کرنا اور ہیبت اور خوف کا پیدا کرنا مقصود ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ اللہ پاک نے ذکر فرمایا کہ جب مشرکوں سے کوئی پوچھے کہ خالق کون ہے تو اقرار کریں گے اور کہیں گے کہ وہ اللہ سبحانہ ہے، اس لیے کہ اس بات پر واضح، ظاہر برہان اور دلیل موجود ہے کہ وہ اکیلا ہی خالق ہے، اس کے باوجود کہ وہ بتوں کو پوجتے ہیں اور اللہ کے سوا اور معبود ٹھہراتے ہیں۔ اس میں اس بات پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ ایک سخت غفلت اور عظیم جہالت میں تھے۔ اس لیے کہ جب ان کو اس بات کا پتا چل چکا کہ ان کا خالق اور جن کو اللہ کے سوا پوجتے ہیں، ان کا خالق اللہ پاک ہی ہے تو ان کی عقلوں نے اس بات کو کیسے مستحسن جانا کہ خالقِ کل کے غیر کو پوجیں اور غیر کو اپنے خالق کے

[1] تفسير القرطبي (۱۵/۲۵۷)

ساتھ عبادت میں شریک کریں، حالاں کہ ان کے بارے میں میں کہا جاتا تھا کہ وہ بڑے عقل مند ہیں اور ان کا ادراک اور فطنت، یعنی ذہن کامل اور مکمل ہے۔ لیکن انھوں نے جب اپنے آباء واجداد کی یا علماء کی تقلید کی اور اُن کے ساتھ حسنِ ظن کیا تو مقتضائے عقل کو چھوڑ دیا اور محض جہالت کی بات پر عمل کیا۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ اس اعتراف اور اقرار کے بعد ان کو ملامت کریں اور ڈرائیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ ﴾۔ "ضر" سے مراد سختی اور بلا ہے۔ "رحمة" سے مراد نعمت اور آسایش ہے۔ جمہور نے ﴿ كٰشِفٰتُ ﴾ اور ﴿ مُمْسِكٰتُ ﴾ کو دونوں جگہ باضافت پڑھا ہے اور ابو عمرو رحمہ اللہ نے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے ابو عمرو رحمہ اللہ کی قراءت کو اختیار کیا ہے کہ ﴿ كٰشِفٰتُ ﴾ اسم فاعل مستقبل کے معنی میں ہے اور جو ایسا ہوتا ہے اس کی تنوین بہت اچھی ہوتی ہے۔

امام حسن اور عاصم رحمہما اللہ نے بھی اسی طرح پڑھا ہے، معنی یہ ہیں: تو کہہ کہ تم مجھے اپنے معبودوں کے متعلق بتاؤ، کیا ان میں قدرت ہے کہ وہ اس ضرر کو دور کریں جس کا اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ ارادہ کیا، یا اس رحمت کو روکنے پر قادر ہیں جس کا اللہ نے میرے ساتھ ارادہ کیا، اس طرح سے کہ وہ خیر مجھ تک نہ پہنچے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی اکرم ﷺ نے ان سے سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئے۔[1] کسی نے کہا کہ جواب دیا کہ وہ اللہ کی قدر سے کسی شے کو دور نہیں کر سکتے، لیکن شفاعت کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۭ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴾ یعنی تو کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے سارے کاموں میں کافی ہے، وہی نفع پہنچا سکتا ہے اور ضرر کو دور کر سکتا ہے اعتماد کرنے والے صرف اسی پر اعتماد کرتے ہیں نہ کہ اس کے غیر پر۔

پھر اللہ پاک نے اپنے نبیِ کریم ﷺ کو حکم دیا کہ ان کو خوف دلائیں اور یہ وعید سنائیں: ﴿ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی تو کہہ کہ اے قوم! تم عمل کرو اپنی حالت پر جس پر تم جمے ہوئے ہو اور میں اپنی حالت پر جس پر میں ہوں عمل کرتا ہوں۔ چوں کہ پہلے حصے سے اپنی حالت پر عمل کرنے کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں، اس لیے دوسرے حصے سے ان کو حذف کر دیا۔ "مکانت" بہ معنی مکان ہے۔ چنانچہ عین سے معنی کا استعارہ کیا گیا ہے، جس طرح کہ زمان کے لیے کلمۂ "هنا و حيث" کا استعارہ کیا جاتا ہے، حالاں کہ دونوں مکان کے لیے ہیں۔

﴿ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ ﴾ یعنی عن قریب تم جان لو گے کہ کس پر عذاب آتا ہے جس سے وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو جائے گا، پھر اس وقت ظاہر ہو جائے گا کہ وہ باطل پر ہے اور اس کا خصم یعنی مدِمقابل حق پر۔ اس سے مراد دنیا کا عذاب ہے اور وہ قتل، قید، قہر اور ذلت جو اُن پر نازل ہوئی۔ پھر آخرت کے

[1] تفسير القرطبي (١٥/٢٥٩)

عذاب کا ذکر فرمایا۔ ﴿ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴾ یعنی اور اس پر دارِ آخرت میں دائمی عذاب نازل ہوگا، یہ وہی آگ کا عذاب ہے۔ عذاب کی جو مقیم کی طرف نسبت کی تو یہ یا تو ظرف میں مجاز ہے یا اسناد میں۔ اس کی اصل "مُقِيمٌ فِيهِ صَاحِبُهُ" ہے، یعنی ایسا عذاب کہ اس میں اس کا صاحب ہمیشہ رہے گا۔

بالجملہ جب رسول اللہ ﷺ پر مشرکین کا کفر پر ڈٹے رہنا گراں گزرتا تھا تو اللہ پاک نے آپ ﷺ کو خبر دی کہ ان کو صرف بیان کی تکلیف دی گئی ہے نہ اس بات کی کہ جو گمراہ ہوا ہے اس کو ہدایت کر دیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ ﴾ یعنی ہم نے تجھ پر کتاب لوگوں کے واسطے نازل کی اور اس لیے کہ وہ جس کے ساتھ مکلّف کیے گئے ہیں اس کا بیان ہو، اس لیے کہ وہ دنیا اور آخرت میں ان کی بھلائی کے لیے اصل چیز ہے، چنانچہ وہ تمام کے تمام لوگوں کے لیے ہے، اس لیے کہ تیری رسالت بھی ایسی ہی ہے۔ ﴿ بِالْحَقِّ ﴾ حال ہے فاعل سے، "أَيْ: مُحِقِّينَ" یا مفعول سے "أَيْ: مُتَلَبِّسًا بِالْحَقِّ"، ﴿ وَمَآ أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ﴾ یعنی تو ان کی ہدایت کا ذمے دار نہیں اور نہ ہی تجھے یہ منصب سونپا گیا ہے، بلکہ تو صرف ان کو پہنچا دینے کا ذمے دار ہے اور تو اس کو کر چکا ہے۔ یہ آیتیں آیتِ سیف سے منسوخ ہیں، اس کے بعد اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو امر فرمایا کہ ان سے جنگ کریں، یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں اور احکامِ اسلام کے عامل ہوں۔ پھر اللہ پاک نے اپنی قدرتِ بالغہ اور عجیب اور غریب صنعت کی قسموں میں سے ایک قسم کا ذکر کیا، چنانچہ فرمایا:[1]

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾ أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٤٣﴾ قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۖ لَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٤٤﴾ وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٤٥﴾

اللہ ہی موت کے وقت جانیں قبض کرتا ہے اور جس کی موت نہیں آئی ہوتی، اسے اس کی نیند

[1] فتح البیان (۱۵/۱۱۷۔۱۲۰)

میں (قبض کرتا ہے) پھر وہ اس (روح) کو روک لیتا ہے جس پر اس نے موت کا فیصلہ کر دیا ہو اور دوسری کو ایک مقرر وقت تک (واپس) بھیج دیتا ہے، بلاشبہہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں(42) کیا انھوں نے اللہ کے سوا سفارشی بنا رکھے ہیں؟ کہہ دیجیے: خواہ وہ کسی چیز کے بھی مالک نہ ہوں اور نہ (کچھ) سمجھتے ہوں (پھر بھی وہ سفارشی ہیں؟)(43) کہہ دیجیے: ساری سفارش اللہ ہی کے اختیار میں ہے، آسمانوں اور زمین میں اسی کی بادشاہی ہے، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے(44) اور جب تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ ہوتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جب اللہ کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس وقت وہ بڑے خوش ہوتے ہیں(45)

اللہ تعالیٰ ہی مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے:

یعنی نیند میں ہر روز جان کھینچ لیتا ہے، پھر بھیجتا ہے، یہی آخرت کا نشان ہے، معلوم ہوا کہ نیند میں بھی جان کھچتی ہے جیسے موت میں کھچتی ہے۔ اگر نیند میں کھچ کر رہ گئی، وہی موت ہے، مگر یہ جان وہ ہے جس کو ہوش کہتے ہیں اور ایک جان جس سے دم چلتا ہے اور نبضیں اُچھلتی ہیں اور کھانا ہضم ہوتا ہے، وہ دوسری ہے، وہ موت سے پہلے نہیں کھچتی۔ یعنی اللہ کے روبرو سفارش ہے، پر اللہ کے حکم سے نہ تمھارے کہے سے، موت آوے کسی کے کہے سے۔ عزرائیل نہیں چھوڑتا۔ انتہی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات پاک کی خبر دیتا ہے کہ وہ وجود میں ہر طرح کا اختیار رکھتا ہے، وہ انسانی جسم میں جو چاہتا ہے کرتا ہے اور وہی جانوں کو ان نگہبان فرشتوں کی ذریعے سے وفات دیتا ہے جن کو بھیجتا ہے۔ وہ ان کو جسموں سے قبض کر لیتے ہیں اور وفاتِ صغریٰ سونے کے وقت ہے، جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٦٠﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ ۖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ ﴾ [الأنعام: ٦٠۔ ٦١] ''اور وہ ایسا ہے کہ رات میں تمھاری روح کو (ایک گونہ) قبض کر دیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس کو جانتا ہے پھر تم کو جگا اٹھاتا ہے تا کہ معاد معین تمام کر دی جائے، پھر اسی کی طرف تم کو جانا ہے، پھر تم کو بتلائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ اور وہی اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے، برتر ہے اور تم پر نگہداشت رکھنے والے بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچتی ہے، اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے قبض کر لیتے ہیں اور وہ ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔''

اللہ پاک نے مذکورہ آیت میں دونوں وفات کا ذکر فرمایا: وفاتِ صغریٰ کا، پھر وفاتِ کبریٰ کا اور یہاں کی آیت میں کبریٰ کا ذکر کیا ہے پھر صغریٰ کا اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ... الآية ﴾ اس میں اس پر دلالت ہے کہ روحیں ملائے اعلیٰ میں جمع ہوتی ہیں، چنانچہ اس بارے میں مرفوع حدیث وارد ہوئی ہے جس کو امام ابن مندہ رحمہ اللہ وغیرہ نے روایت کیا ہے اور صحیح بخاری و مسلم میں حدیث عبیداللہ بن عمر عن سعید بن ابی سعید عن ابیہ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جس وقت تم میں سے کوئی اپنے بستر پر جائے تو چاہیے کہ اس کو اپنے تہہ بند کے پلو سے جھاڑے، بے شک وہ نہیں جانتا کہ اس کے بستر پر کون سی شے اس کا خلیفہ ہوئی ہے، یعنی لیٹی رہی ہے، پھر چاہیے کہ کہے: « بِاسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ وَبِكَ أَرْفَعُهُ، إِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَارْحَمْهَا، وَإِنْ أَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ »[1] یعنی میں نے اپنی کروٹ تیرے نام کے ساتھ رکھی اور تیرے ساتھ اس کو اٹھاؤں گا، اگر تو میری جان کو روک رکھے تو تو اس پر رحم کرنا اور اگر تو چھوڑے اس کو تو تو نگاہ رکھنا اس شے کے ساتھ جس کے ساتھ تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔

بعض سلف نے کہا ہے کہ قبض کرتا ہے مردوں کی روحوں کو جب وہ مرتے ہیں اور زندوں کی روحوں کو جب وہ سوتے ہیں۔ چنانچہ زندوں اور مُردوں کی روحیں ایک دوسری کو پہچانتی ہیں، اتنا پہچاننا جتنا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ پھر روک رکھتا ہے ان روحوں کو جن پر موت جاری کی، جو مر چکیں اور بھیجتا ہے دوسری روحوں کو ایک مدتِ مقرر تک۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: اپنی بقیہ اَجل تک۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: روک رکھتا ہے مردوں کی جانوں کو اور بھیجتا ہے زندوں کی روحوں کو اور غلطی نہیں کرتا۔ ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾[3]

سفارش صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ﴾ اللہ پاک مشرکوں کی مذمت فرماتا ہے، اس بات میں کہ انھوں نے اللہ کے سوا سفارشی ٹھہرائے ہیں۔ یہ سفارشی بت ہیں جن کو انھوں نے بغیر کسی دلیل اور برہان کے اپنی طرف سے ٹھہرا لیا ہے، حالاں کہ ان کے پاس کسی قسم کا اختیار و ملکیت نہیں ہے، بلکہ ان کے پاس تو عقل نہیں ہے جس سے سمجھیں اور نہ کان ہیں جن سے سنیں اور نہ آنکھ ہے جس سے دیکھیں، بلکہ وہ تو جماد ہیں، یعنی پتھر ہیں، ان کا حال تو حیوان سے بھی کہیں بدتر ہے۔ پھر فرمایا: اے محمد! تو ان لوگوں سے کہہ دے جنھوں نے زعم کیا ہے کہ جن کو انھوں نے پکڑا ہے وہ ان کے لیے اللہ کے نزدیک سفارشی ہیں، اور ان کو خبر دے کہ اللہ کے پاس تو سفارش صرف اس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧١٤)

[2] تفسير الطبري (٢٩٨/٢١، ٢٩٩) [3] تفسير ابن كثير (٧١/٤)

کو فائدہ دے گی جس کو وہ پسند کرے اور اس کے لیے سفارش کا اذن دے۔ اسی کے لیے آسمان و زمین کی بادشاہت ہے، یعنی اس سب میں وہی متصرف، یعنی قابض ہے اور اسی کی طرف تم قیامت کے دن پھیرے جاؤ گے، پھر وہ اپنے عدل سے تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دے گا۔

پھر اللہ پاک نے دوسرے طریقے پر مشرکوں کی مذمت فرمائی: ﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ ﴾ یعنی جس وقت لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہا جاتا ہے تو ﴿ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "اِنْقَبَضَتْ"، یعنی جو آخرت کو نہیں مانتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: نفرت کرتے ہیں۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "كَفَرَتْ وَاسْتَكْبَرَتْ" امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: "اِسْتَكْبَرَتْ"، یعنی ان کے دل کفر اور تکبر کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ [الصافات: ۳۵] "یہ وہ (لوگ) ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو یہ سرکشی کرتے تھے۔" یعنی جب ان سے لا الہ الا اللہ کہا جاتا ہے تو اس کو تسلیم کرنے اور اس کے مطیع و تابعدار ہونے سے تکبر کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے دل خیر کو قبول نہیں کرتے تو جو کوئی خیر کو قبول نہیں کرتا وہ شر کو قبول کرتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ ﴾ یعنی اور جس وقت ان کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس کے سوا ہیں، یعنی اصنام اور بتوں کا۔ (قاله مجاهد) ﴿ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ تب وہ خوش ہوتے ہیں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روحوں کو ان کی اَجل آجانے کے وقت قبض کرتا ہے اور ان کو بدنوں سے نکالتا ہے۔ اور ان نفسوں کو جن کی اَجل ابھی نہیں آئی، ان کو اپنی نیند میں وفات دیتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ کسی نے یوں کہا کہ ان کو روح کے جسم میں باقی رہنے کے ساتھ تصرف سے قبض کرتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں اور قبض کرتا ہے ان نفوس کو جو اپنی اَجل پوری ہونے کے وقت تک نہیں پہنچے اور کبھی ان کی توفی ان کی نیند ہوتی ہے، چنانچہ اس بنا پر تقدیر یہ ہوگی: "وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ وَفَاتُهَا نَوْمُهَا"، یعنی جو نفوس مرے نہیں، ان کی وفات ان کی نیند ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ہر انسان کے دو نفس ہیں: ایک تو تمیز کا نفس ہے، یہ وہ ہے جو اس کے سونے کے وقت اس سے الگ ہو جاتا ہے تو وہ بے عقل ہو جاتا ہے۔ دوسرا نفسِ حیات ہے، یہ جب زائل ہوتا ہے تو اس کے ساتھ نفس زائل ہو جاتا ہے اور سونے والا سانس لیتا ہے۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا: اس قول میں بعد ہے، اس لیے کہ آیت سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ نفسِ مقبوضہ دونوں حال میں ایک شے ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے:

---

[1] تفسیر الطبري (۳۰۱/۲۱) [2] تفسیر ابن کثیر (۷۱/۴، ۷۲)

﴿ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ ﴾ چنانچہ اس کو بدن کی طرف نہیں پھیرتا۔

﴿ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى ﴾ اورنفسِ نائم (نیند والے نفس) کو اس کے بیدار ہونے کے وقت اس کے بدن کی طرف بھیجتا ہے۔ ﴿ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ یعنی اس وقت تک جو اس کی موت کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ یہ ارسال کا انتہائی مفہوم ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ کے قول کی طرح ابن انباری رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: "إِنَّ اللّٰهَ يَقْبِضُ أَرْوَاحَ الْأَمْوَاتِ إِذَا مَاتُوْا وَأَرْوَاحَ الْأَحْيَاءِ إِذَا نَامُوْا فَتَتَعَارَفُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَتَعَارَفَ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضَى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرٰى فَيُعِيْدُهَا"[1] یہ قول بعینہ وہی ہے جو بعض سلف کے عنوان سے پہلے گزر چکا ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یوں کہیں کہ نفوس کا نیند کی حالت میں وفات دینا اس طرح سے ہے کہ احساس کو زائل کر دیتی ہے اور احساس پر محلِ حس میں آفت حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر ان نفوس کو روک رکھتا ہے جن پر موت جاری کی اور اُن کو ان کے جسموں کی طرف نہیں پھیرتا جن میں وہ تھے اور دوسرے نفوس کو اس طرح سے چھوڑ دیتا ہے کہ ان کے احساس (حس کی خاصیت) کو ان پر لوٹا دیتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ﴾ کے معنی بنا بر حذف مضاف ہیں: "أَيْ: عِنْدَ مَوْتِ أَجْسَادِهَا"

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ایک نفس ہے اور ایک روح ہے جو ان کے درمیان شعاعِ شمس کی طرح ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نفس کو اس کی نیند میں وفات دیتا ہے اور اس کی روح کو اس کے قالب میں چھوڑے رکھتا ہے، وہ اس میں پھرتی رہتی ہے اور وہ زندہ رہتا ہے، پھر اگر اس کو یہ ظاہر ہوا کہ اس کو قبض کرے تو روح کو قبض کر لیتا ہے تو وہ مر جاتا ہے اور اگر اس کی اجل کو تاخیر دیتا ہے تو نفس کو اس کی جگہ کی طرف پھیر دیتا ہے جو اس کے جوف سے ہے۔[2] (أخرجه ابن المنذر وابن أبي حاتم)

ان کے قول کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ زندوں کی روحیں اور مردوں کی روحیں خواب میں ملتی ہیں، پھر وہ آپس میں ایک دوسرے سے سوال جواب کرتی ہیں جو اللہ چاہتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ مردوں کی روحوں کو روک رکھتا ہے اور زندوں کی روحوں کو ان کے جسموں کی طرف ایک مدتِ مقررہ تک چھوڑ دیتا ہے اور اس میں کسی قسم کی غلطی نہیں کرتا ہے۔ (أخرجه عبد بن حميد) ان کا تیسرا قول یہ ہے کہ ہر نفس کے لیے ایک سبب ہے جس میں وہ جاری ہوتا ہے، پھر جب اس پر موت جاری کی تو وہ سو گیا، یہاں تک کہ وہ سبب منقطع ہو جاتا ہے اور وہ نفس اپنی نیند میں اگر مرا نہیں تو وہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔[3] (أخرجه عبد بن حميد)

عقلاء نے نفس و روح کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آیا وہ ایک شے ہے یا دو شے۔ اس بارے میں گفتگو انتہائی طویل ہے جو اس کے متعلق تالیف کی گئی کتابوں میں معروف و مشہور ہے۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ دونوں ایک ہی شے ہیں۔ آثارِ صحیحہ اسی پر دال ہیں۔ جمہور نے ﴿ قَضٰى ﴾ کو بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ "أَيْ: قَضَى اللّٰهُ عَلَيْهَا الْمَوْتَ".

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/٢٦٠، ٢٦١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٥٢) [3] الدر المنثور (٧/٢٣٠، ٢٣١)

حمزہ وغیرہ نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے پہلی قراءت کو اختیار کیا ہے،[1] اس لیے کہ ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ ﴾ کے مطابق ہے۔ ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ ﴾ یعنی یہ نفوس کو فوت کرنا، ان کو روک کے رکھنا اور ان کو لوٹانا جس کا ذکر ہوا، بے شک اس میں ﴿ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ البتہ عجیب وغریب نشانیاں ہیں جو اللہ پاک کی قدرتِ باہرہ پر دلالت کرتی ہیں، لیکن ان نشانیوں کے ایسا ہونے کو ہر کوئی نہیں سمجھتا، بلکہ اس میں عجیب وغریب نشانیاں ان لوگوں کے لیے ہیں جو اس میں غور وفکر کرتے ہیں، سوچتے سمجھتے ہیں اور اس سے اللہ سبحانہ کی توحید اور قدرت کے کمال پر استدلال کرتے ہیں۔ بے شک اس توفی، امساک اور ارسال میں ایک عظیم نصیحت ہے اور موثر ترین تذکرہ ہے، ان لوگوں کے لیے جو نصیحت حاصل کرنا چاہیں۔

اس آیت سے پہلے جو بیان ہوا، اس کی مناسبت سے یہ ہے کہ جب اللہ پاک نے پہلے یہ بات بیان کی کہ ہدایت اور گمراہی کا فائدہ اور نقصان اسی کے لیے جو ہدایت پائے اور گمراہ ہو تو یہ بات بیان کی کہ ہدایت اور گمراہی نہیں حاصل ہوتے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ﴾ ہدایت کو حیات اور بیداری کے مثل ٹھہرایا اور ضلال وگمراہی کو موت اور نیند کے مثل ٹھہرایا، چنانچہ جس طرح حیات و بیداری اور موت و نیند صرف اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور ایجاد سے حاصل ہوتی ہیں، اسی طرح ہدایت اور گمراہی بھی صرف اللہ پاک کی طرف سے حاصل ہوتی ہیں۔ یا یوں کہو کہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ایک اور حجت ذکر فرمائی کہ وہ تمام عالم کا معبود ہے، تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ وہ ان بتوں کی نسبت جو جماد ہیں، عبادت کا زیادہ حق دار ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ﴾ کلمۂ ﴿ اَمِ ﴾ منقطعہ مقدر بہ بَل و ہمزہ ہے، یعنی بلکہ کیا کفار وقریش نے اللہ کے سوا اور معبود سفارشی ٹھہرائے ہیں جو اللہ کے پاس ان کی سفارش کریں گے۔ اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ تم ان سے یوں کہو: ﴿ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ ہمزہ انکار اور توبیخ کے لیے ہے اور حرفِ واؤ محذوف مقدر پر عطف کے لیے ہے: "أَيْ: أَيَشْفَعُوْنَ وَلَوْ كَانُوْا ... الخ" اور ﴿ لَوْ ﴾ کا جواب محذوف ہے۔ "وَإِنْ كَانُوْا بِهٰذِهِ الصِّفَةِ تَتَّخِذُوْنَهُمْ شُفَعَاءَ" یعنی کیا وہ سفارش کریں گے اور اگر ان میں یہ صفت ہو کہ وہ نہ تو کسی شے کے مالک ہوں، نہ وہ اشیاء میں سے کسی شے کو سمجھتے ہوں، کیوں کہ وہ تو جماد ہیں اور نہ ان کو کسی طرح کی عقل ہے تو پھر بھی تم ان کو شفیع ٹھہراؤ گے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ کسی شے کے مالک نہیں ہیں اور شفاعت تو بہ دخولِ اولیٰ اس میں داخل ہو گی۔ بتوں کے لیے واو نون کی جمع ذکر فرمائی، حالاں کہ ایسی جمع تو عقلاء کے لیے آتی ہے؟ یہ اس لیے کہ کفار ان کے بارے میں اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ عقل رکھتے ہیں۔ ماقبل سے ان کا تعلق یہ ہے کہ اس سے قبل یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

---

[1] تفسیر القرطبي (١٥/٢٦٣)

﴿ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی توفی، امساک اور ارسال جو مذکور ہوا، اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں، پس کفار کے بارے میں تم اس بات کا طمع چھوڑ دو کہ وہ ان میں غور و فکر کریں گے اور اللہ کی کمال قدرت اور حکمت پر استدلال کر کے اس کے حکم کے فرماں بردار اور مطیع ہوں گے۔ تم ان کی فرطِ جہالت کی طرف نظر کرو کہ کہاں تک پہنچی ہے! انھوں نے تو اپنی جہالت اور نادانی کے مارے ایسوں کو اللہ کے نزدیک سفارشی ٹھہرایا ہے جو کسی شے کے مالک نہیں اور نہ ہی عقل رکھتے ہیں۔ وہ تو محض جماد (پتھر) ہیں۔

چنانچہ جب ان کی حماقت اس درجے کی ہے تو ان سے کیا خاک اس بات کی امید ہو گی کہ اللہ کی آیات میں فکر کریں گے۔ اگر ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ﴾ کو یوں قرار دیں کہ اس میں اس بات پر استدلال ہے کہ عاقل پر یہ واجب ہے کہ وہ ایسے معبود کی عبادت کرے جو اس قدرت اور حکمت کا حامل ہو اور بتوں کو نہ پوجے جو محض پتھر اور بے شعور چیزیں ہیں، ان کی قدرت اور حکمت کا کیا ذکر! تو ﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ﴾ کا ماقبل سے تعلق اس طرح ہو گا کہ یہ کفار کے اس اعتراض کا جواب ٹھہرے گا جو انھوں نے سابق دلیل پر اس طرح وارد کیا تھا کہ ہم بتوں کو اس اعتقاد سے نہیں پوجتے کہ وہ نفع اور نقصان دے سکتے ہیں، ہم تو ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ان شخصوں کی مورتیں ہیں جو اللہ کے نزدیک مقربوں میں سے ہیں، چنانچہ ہم ان کو اس غرض سے پوجتے ہیں کہ وہ اکابر اللہ تعالیٰ کے پاس ہمارے سفارشی ہو جائیں۔ اللہ پاک نے اس کا یہ جواب دیا: ﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ﴾۔

جواب کا بیان یہ ہے کہ یہ کفار یا تو ان بتوں کے پوجنے سے ان کی شفاعت میں طمع کرتے ہیں، یا ان شخصوں سے شفاعت کی اُمید رکھتے ہیں جن کی یہ مورتیں ہیں۔ پہلی بات تو ظاہری طور پر باطل ہے، کیوں کہ جماد، یعنی پتھر سے شفاعت کا ہونا تصور نہیں کیا جا سکتا، وہ پتھر جو کسی شے کا مالک نہیں، نہ عقل رکھتا ہے۔ اور دوسری شق بھی باطل ہے، اس لیے کہ قیامت کا دن ایک ایسا دن ہے کہ اس میں کوئی بھی کسی شے کا مالک نہیں ہو گا۔ شفاعت پر کوئی قادر نہ ہو گا مگر اللہ کے اذن سے۔ چنانچہ حقیقت میں شفیع اللہ ہی ہو گا جو اس شفاعت کا اذن دے گا۔ لہٰذا کسی غیر کی عبادت میں مشغول ہونے سے بہتر یہی ہے کہ اس اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جائے۔

چنانچہ اس آیت سے یہی مراد ہے: ﴿ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ﴾ یعنی تو کہہ دے کہ ساری شفاعت اللہ ہی کے لیے ہے۔ چنانچہ اس میں سے کسی کے لیے کچھ بھی نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے اذن سے ہو اور اس کے لیے ہو جس کو وہ پسند کرے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۵] ''کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾ [الأنبیاء: ۲۸] ''وہ کسی کی بھی سفارش نہیں کرتے بجز ان کے جن سے اللہ خوش ہو۔'' ﴿ جَمِيْعًا ﴾ کا نصب بنا بر حال

ہے۔ شفاعت کی تاکید جو اس کلمے کے ساتھ کی جس کے ساتھ دو اور دو سے زیادہ کی تاکید کی جاتی ہے تو اس لیے کہ شفاعت مصدر ہے، واحد، تثنیہ اور جمع پر بولا جاتا ہے۔

پھر اللہ پاک نے ماقبل کی تقریر و تاکید فرمائی اور اپنی بادشاہت کی وسعت کا وصف کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ ﴾ یعنی اسی کا ہے ملک آسمانوں اور زمین کا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا اور جو کچھ ان میں ہے اس کا وہی مالک ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے ان سب میں تصرف کرتا ہے اور جو کچھ ارادہ کرتا ہے وہ کر ڈالتا ہے۔ چنانچہ وہ سارے ملک کا مالک ہے، کسی کو یہ قدرت نہیں کہ اس کے اذن اور رضا کے بغیر بول سکے۔ ﴿ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ یعنی پھر قبروں سے اُٹھنے کے بعد اسی کی طرف پھیرے جاؤ گے نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔ اس وقت بھی بادشاہت اسی کی ہو گی۔

پھر اللہ پاک نے ان کے اعمالِ قبیحہ کی ایک اور قسم کا ذکر فرمایا: ﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ ﴾ یعنی جس وقت اکیلے اللہ کا ذکر کیا جائے اس طرح سے کہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ"، تو ان کے دلوں اور چہروں میں نفرت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں اور جب بتوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دلوں اور چہروں میں فرحت اور بشارت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ بات ان کی مکمل جہالت اور حماقت کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا اور اس کی توحید کا ذکر ہر خیر کا سر ہے اور ہر سعادت کی کنجی ہے اور بتوں کا ذکر، جو ردی اور خسیس جمادات ہیں، ساری حماقتوں اور جہالتوں کا سر ہے۔ چنانچہ اللہ وحدہ کے ذکر سے ان کی نفرت اور ان بتوں کے ذکر سے ان کی خوشی، ان کی بڑی جہالت اور سخت حماقت کی مضبوط ترین دلیل ہے۔ امام یونس رحمہ اللہ کے نزدیک ﴿ وَحْدَهُ ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے اور امام خلیل اور سیبویہ رحمہما اللہ کے نزدیک بنا بر مصدر ہے۔ لغت میں "اشمئزاز" کے معنی نفور ہیں۔

امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اِشْمَأَزَّتْ نَفَرَتْ". امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اِنْقَبَضَتْ".اول کے قائل امام قتادہ رحمہ اللہ ہیں اور ثانی کے قائل امام مجاہد رحمہ اللہ ہیں۔ دونوں معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ مؤرج نے کہا ہے کہ "أَنْكَرَتْ". امام ابو زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اِشْمَأَزَّ الرَّجُلُ ذُعِرَ مِنَ الْفَزَعِ"۔[1] ﴿ اشْمَاَزَّتْ ﴾ کی تفسیر کا مناسب مقام "اِنْقَبَضَتْ" کے ساتھ ہے۔ "اِشْمِئْزَازٌ" اصل میں "إِزْوِرَارٌ" ہے (برگشتن از چیزے)۔ مشرکوں سے جب "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہا جاتا تو منقبض ہو جاتے تھے، جیسا کہ اللہ پاک نے ان سے نقل فرمایا ہے: ﴿ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٦] ''اور جب تو صرف اللہ ہی کا ذکر اس کی توحید کے ساتھ اس قرآن میں کرتا ہے تو وہ روگردانی کرتے، پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے: "اِشْمَأَزَّتْ: قَسَتْ وَنَفَرَتْ"، یعنی سخت ہوتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں، ان

[1] تفسير القرطبي (٢٦٤/١٥) فتح القدير (٦١٣/٤)

چار آدمیوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے: ابوجہل بن ہشام، ولید بن عقبہ، صفوان اور ابی بن خلف۔ اور جب ان کا ذکر کیا جاتا ہے جو اللہ کے سوا ہیں، یعنی لات وعزیٰ وغیرہما بت تو ﴿ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ یعنی تب وہ خوش ہو جاتے ہیں۔[1]

یہ دو امر کے سبب سے ہے: ایک تو ان کا بتوں سے فرطِ افتتان (بڑی آزمائش)، دوسرے ان کا اللہ کے حق کو بھول جانا۔ اللہ پاک نے ان دونوں میں خوب ہی مبالغہ کیا کہ انتہاء کو پہنچا دیا، اس لیے کہ "اِسْتِبْشَار" یہ ہے کہ آدمی کا دل خوشی سے بھر جائے، یہاں تک کہ اس کا چہرہ کھل اُٹھے اور "اِشْمِئْزَاز" یہ ہے کہ غضب اور غم سے بھر جائے، یہاں تک کہ اس کے چہرے کا چمڑہ منقبض ہو جائے۔ ﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ ﴾ میں کلمہ ﴿ اِذَا ﴾ میں عامل ما بعد کا فعل ہے، یعنی ﴿ اشْمَاَزَّتْ ﴾ اور ﴿ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ ﴾ کے ﴿ اِذَا ﴾ میں وہ فعل عامل ہے جو ﴿ اِذَا ﴾ فجائیہ میں عامل ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَاجَئُوْا الْاِسْتِبْشَارَ وَقْتَ ذِكْرِ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ" بالجملہ جب کفار کے متمردون نے دعوتِ الی الخیر کو قبول نہ کیا جس کو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس لے کر آئے اور وہ لوگ کفر پر جمے رہے تو اللہ پاک نے اپنے رسول کو یہ حکم کیا کہ اپنے کام کو اللہ پاک کے حوالے کریں اور اس سے دعا کے ساتھ التجا کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾
وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ
لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ
مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا
وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۸﴾

آپ کہیے: اے اللہ! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، چھپے اور ظاہر کے جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے (46) اور اگر ان ظالموں کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو، تو وہ روزِ قیامت برے عذاب سے (بچنے کے لیے) اسے ضرور فدیے میں دے دیں اور ان کے لیے اللہ کی طرف سے وہ (عذاب) ظاہر ہو جائے گا جس کا وہ گمان بھی نہیں

(1) الدر المنثور (۷/۲۳۳) (2) فتح البیان (۱۲/۱۲۰۔۱۲۴)

کرتے تھے ﴿47﴾ اور ان کے لیے ان کے عملوں کی برائیاں ظاہر ہو جائیں گی اور انھیں وہ (عذاب) گھیر لے گا جس کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے ﴿48﴾

اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا طریقہ:

اللہ پاک نے پہلے تو مشرکوں کی یہ مذمت کی کہ وہ شرک کو دوست رکھتے ہیں اور توحید سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے رسول کو حکم فرمایا کہ تو اللہ وحدہ سے دعا کر جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور اُن کو ایسی ہیئت پر بنایا، جس کی پہلے کوئی مثال نہ تھی، تو عالم الغیب والشہادۃ ہے، یعنی چھپے اور کھلے کا جاننے والا ہے۔ ﴿ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴾ یعنی تو ہی اپنے بندوں کے درمیان عن قریب فیصلہ کرے گا جس دن کہ ان کا معاد ونشور ہو گا اور وہ اپنی قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ فیصلہ اس بات کا کرے گا جس کے بارے میں وہ دنیا میں جھگڑتے تھے۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ابوسلمہ بن عبدالرحمان سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اپنی نماز میں قیام فرماتے تھے تو کس شے کے ساتھ شروع فرماتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت اپنی نماز میں قیام کرتے تھے تو یوں فرماتے تھے: ’’اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ. أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ، اِهْدِنِيْ لِمَ اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ، أَنْتَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ‘‘[1] ’’اے اللہ! جبرائیل و میکائیل و اسرافیل کے رب! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے اور حق کے بارے میں جو اختلاف (دنیا میں) ہو رہا ہے، اس میں اپنے حکم کے ساتھ میری راہنمائی فرما، بے شک تو جسے چاہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت عطا فرما دیتا ہے۔‘‘

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص یہ الفاظ کہے: «اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، إِنِّيْ أَعْهَدُ إِلَيْكَ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا إِنِّيْ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ، فَإِنَّكَ إِنْ تَكِلْنِيْ إِلٰى نَفْسِيْ تُقَرِّبْنِيْ مِنَ الشَّرِّ وَتُبَاعِدْنِيْ مِنَ الْخَيْرِ، وَإِنِّيْ لَا أَثِقُ إِلَّا بِرَحْمَتِكَ، فَاجْعَلْ لِيْ عِنْدَكَ عَهْدًا تُوَفِّيْنِيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ» ’’اے اللہ! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! پوشیدہ اور

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۷۰)

ظاہر کے جاننے والے! میں تجھ سے اس دنیا میں یہ عہد کرتا ہوں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو اکیلا ہے تیرا کوئی شریک نہیں ہے اور محمد ﷺ تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں، اگر تو مجھے میرے ہی سپرد کر دے گا تو گویا تو مجھے شر کے قریب اور بھلائی سے دور کر دے گا۔ مجھے تیری رحمت ہی کا بھروسا ہے، تو میرا یہ عہد اپنے ہاں رکھ لے جسے تو قیامت کے دن پورا کرے گا، یقیناً تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا ہے۔'' تو اللہ عزوجل اپنے فرشتوں سے قیامت کے دن فرمائے گا کہ بے شک میرے بندے نے واقعی مجھ سے ایک عہد کیا ہے تو تم اس کا وہ عہد پورا کرو، پھر اللہ اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔ (انفرد به الإمام أحمد) (سہیل راوی نے کہا: "فأخبرت القاسم ابن عبد الرحمن أن عونا أخبر بكذا وكذا فقال: ما فينا جارية إلا وهي تقول هذا في خدرها"[1] سہیل کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن عبدالرحمان سے ذکر کیا کہ عون نے اس طرح کی حدیث بیان کی ہے تو قاسم بولے کہ ہم لوگوں میں تو کوئی لڑکی بھی ایسی نہیں ہے کہ اپنی پردہ نشینی میں اس دعا کو نہ پڑھتی ہو، یعنی یہ بہت مشہور دعا ہے کہ لڑکیاں تک باوجود پردہ نشینی کے اس کو جانتی ہیں)۔

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے ابوعبدالرحمان سے روایت کیا ہے، کہا کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے ہمارے لیے ایک کاغذ نکالا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ ہم کو سکھاتے تھے کہ ہم یوں کہیں: « اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ، وَإِلٰهُ كُلِّ شَيْءٍ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ، وَالْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُوْنَ، أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ وَشِرْكِهِ، وَأَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَقْتَرِفَ عَلٰى نَفْسِيْ إِثْمًا أَوْ أَجُرَّهُ إِلٰى مُسْلِمٍ » ابوعبدالرحمان نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو یہ دعا سکھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہ اس کو پڑھیں جب سونے کا ارادہ کریں۔[2] (تفرد به أحمد أيضاً)

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے ابوراشد حبرانی سے روایت کیا ہے، کہا میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا کہ آپ ہم سے وہ شے بیان کریں جو آپ نے نبی ﷺ سے سنی۔ تو انھوں نے میرے آگے ایک صحیفہ ڈال دیا، پھر کہا: یہ وہ شے ہے جو میرے لیے رسول اللہ ﷺ نے لکھی، چنانچہ میں نے اس میں نظر کی تو اس میں یہ تھا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ مجھے وہ شے سکھائیں جس کو میں صبح اور شام میں پڑھا کروں تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: اے ابوبکر! تو کہہ: « اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ وَمَلِيْكَهُ، أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَشَرِّ الشَّيْطَانِ وَشِرْكِهِ أَوْ أَقْتَرِفَ عَلٰى نَفْسِيْ سُوْءًا

---

[1] مسند أحمد (٤١٢/١) اس کی سند میں انقطاع ہے، عون بن عبداللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (مجمع الزوائد: ٢٧٤/١٠)

[2] مسند أحمد (١٧١/٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤٤٣)

أَوْ أَجُرُّهُ إِلَىٰ مُسْلِمٍ »[1] (ورواه الترمذي عن الحسن بن عرفة عن إسماعيل بن عياش به وقال: حسن غريب من هذا الوجه)

''اے اللہ! آسمانوں وزمین کے پیدا کرنے والے! پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے! تیرے سوا کوئی معبود نہیں، اے ہر چیز کے رب اور مالک! میں اپنے نفس کے شر سے تیری پناہ پکڑتا ہوں، نیز شیطان کے شر اور اس کے شرک سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ اور اس سے کہ میں اپنے نفس پر کسی گناہ کا مرتکب ہوں، یا اسے کسی مسلمان کے ذمے لگا دوں۔'' نیز امام احمد رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے امر کیا ہے کہ جب میں صبح کروں اور جب میں شام کروں اور جب رات کو اپنے بستر پر آؤں تو یہ کہوں: ''اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ...[2] الخ''

قیامت کے دن کوئی فدیہ قبول نہیں ہوگا:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر مشرکوں کے لیے ہو جائے، وہ ساری شے جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنی ہی اور ہو تو البتہ وہ اسے اس برے عذاب کے فدیے میں دے دے جس کو اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن ان کے واسطے واجب کیا ہے، اس کے باوجود ان سے فدیہ قبول نہ کیا جائے گا، اگرچہ وہ زمین بھر سونا ہو، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: ﴿ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴾ یعنی ان کے لیے اللہ کی طرف سے وہ عذاب اور سزا ظاہر ہوئی جو نہ اُن کے دل میں تھی نہ ان کے حساب میں۔ ﴿ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ﴾ اور اُن کے لیے ان گناہوں اور حرام کردہ چیزوں کے ارتکاب کی جزا ظاہر ہوئی جو انھوں نے دارِ دنیا میں کمائی تھی۔ ﴿ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ یعنی ان کو اس عذاب اور سزا نے گھیر لیا جس کے ساتھ دنیا میں ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ اَللّٰهُمَّ ﴾ کی اصل ''يَا اَللّٰهُ'' ہے۔ حرفِ یاء حذف کیا گیا اور اس کے عوض میں حرفِ میم لایا گیا حروفِ علت کے قریب ہونے کے سبب سے اور مشدد کیا گیا، تاکہ معوض عنہ کی مثل دو حرف پر ہو جائے، اسی لیے حرفِ یاء اور ﴿ اَللّٰهُمَّ ﴾ دونوں جمع نہیں کیے جاتے، چنانچہ کلامِ فصیح میں ﴿يا اَللّٰهُمَّ﴾ نہیں بولتے، رہا یہ قول:

---

1. مسند أحمد (١٩٦/٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٢٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨١٣)
2. مسند أحمد (١٤/١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے، البتہ گذشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔
3. تفسير ابن كثير (٧٢/٤، ٧٣)

إِنِّيْ إِذَا مَا حَدَثَ أَلَمَّا أَقُوْلُ يَا اَللّٰهُمَّ يَا اَللّٰهُمَّا

''جب بھی مجھ پر کوئی مصیبت اترتی ہے تو میں پکار اٹھتا ہوں: اے اللہ! اے اللہ!''

جو مسموع ہوا ہے تو یہ ضرورتِ شعری ہے۔ (كما قاله الكرخي)۔ ﴿ فَاطِرَ ﴾ کے معنی ہیں: ''مُبْدِعٌ'' یعنی بغیر کسی پہلی مثال کے پیدا کرنے والا۔ ﴿ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ﴾ وہ شے ہے جو غائب ہے اور وہ شے جو مشاہدہ کی ہوئی ہے۔ ﴿ فَاطِرَ ﴾ و ﴿ عٰلِمَ ﴾ کا نصب بنا بر ندا ہے، یعنی ''يَا فَاطِرَ'' و ''يَا عَالِمَ''۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تو نیک کو اس کی نیکی کی جزا دے گا اور بد کو اس کی بدی کی جزا دے گا، چنانچہ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے اور اس کے نزدیک اختلاف کرنے والوں کا اختلاف اور جھگڑا کرنے والوں کا جھگڑا دور ہو جائے گا۔ حاصل یہ ہے کہ جس ہدایت اور گمراہی کے بارے میں بندے اختلاف کر رہے ہیں تو ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے کر فیصلہ کر دے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے پاس مشرکوں کے لیے محاکمہ ہے، یعنی ان کے بارے میں فیصلہ طلب کرنا ہے۔ امام ابن مسیب رحمہ اللہ نے کہا: میں اس آیت کے سوا کوئی اور ایسی آیت نہیں جانتا جو پڑھی جائے اور اس کے ساتھ دعا کی جائے اور وہ قبول ہو جائے۔

ربیع بن خثیم قلیل الکلام تھے، یعنی بہت ہی کم بات کرتے تھے، ان کو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر دی گئی۔ لوگوں نے کہا کہ اب وہ کلام کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے اس سے زیادہ نہ کہا کہ آہ! ''وَقَدْ فَعَلُوْا'' اور یہ آیت پڑھی: ﴿ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ ﴾۔ یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے اس کے بعد یہ کہا کہ وہ شخص قتل کیا گیا جس کو رسول اللہ ﷺ اپنی گود میں بٹھاتے تھے اور اس کا منہ اپنے منہ پر رکھتے تھے۔[1] بالجملہ جب اللہ پاک نے کفار کی طرف سے یہ بات نقل فرمائی کہ اللہ کے ذکر کے وقت تو منقبض ہوتے ہیں اور بتوں کے ذکر کے وقت خوش ہوتے ہیں تو اس کے بعد اس شے کا ذکر کیا جو اُن کے عذاب اور عقوبت کی شدت اور عظمت پر دال ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾ اس آیت کی تفسیر سورت آلِ عمران میں گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے سخت غصے اور شدید عذاب کی قسموں میں سے ان کے لیے وہ شے ظاہر ہوئی جو اُن کے حساب میں نہ تھی اور نہ وہ اپنے دل میں اس کی بات کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے ایسے سخت عذاب میں مبتلا ہوئے جس کا خیال تک ان کے دل میں نہیں گزرا تھا۔ نعوذ باللّٰه الرحیم الرحمن من عذابه و عقابه۔ اس میں ان کے لیے ایسی بڑی وعید اور موثر دھمکی ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے ایسے کام کیے جن کو خیال کیا کہ وہ نیکیاں ہیں، لیکن

[1] تفسير النسفي (٤/٤٧، ٥٨)

وہ سیئات (برائیاں) تھے۔ اسی طرح امام سدی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وَيْلٌ لِأَهْلِ الرِّيَاءِ، وَيْلٌ لِأَهْلِ الرِّيَاءِ، وَيْلٌ لِأَهْلِ الرِّيَاءِ هٰذِهِ آيَتُهُمْ وَقِصَّتُهُمْ'' یعنی اہلِ ریا کے لیے خرابی ہے، یہ ان کی آیت ہے اور ان کا قصہ ہے۔

حکایت:

امام عکرمہ بن عمار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ محمد بن منکدر رحمہ اللہ اپنی موت کے وقت سخت گھبرائے تو اُن سے کہا گیا کہ یہ کیا گھبراہٹ ہے؟ کہا کہ میں کتاب اللہ کی ایک آیت سے ڈرتا ہوں: ﴿ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴾ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ میرے لیے وہ شے ظاہر ہو جس کا مجھے خیال تک نہ تھا۔[1] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ﴾ یعنی ان کے لیے ان کے بد اعمال، ان کے شرک اور اللہ کے دوستوں پر ظلم کرنا، ظاہر ہوئے۔ احتمال ہے کہ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ مصدریہ ہو۔ ''أَيْ: سَيِّئَاتُ كَسْبِهِمْ'' یعنی ان کے کسب کی برائیاں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ موصولہ ہو: ''أَيْ: سَيِّئَاتُ الَّذِيْ كَسَبُوْهُ'' یعنی اس شے کی برائیاں جس کو کمایا جب ان پر ان کے نامۂ اعمال پیش کیے جائیں گے اور وہ اُن پر مخفی تھے، یا اس کا عقاب انھیں پہنچا۔ ﴿ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ یعنی ان کو اس شے نے گھیر لیا اور اُن پر وہ شے نازل ہوئی جس سے ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔ مراد رسول اللہ ﷺ کا انذار ہے جس کے ساتھ آپ ﷺ ان کو ڈرایا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جس عذاب کا آپ ﷺ ان کو خوف دلایا کرتے تھے، وہ ان پر نازل ہو گیا۔[2]

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ؗ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ ؕ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَاۤ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے اور جب ہم اپنی طرف سے اسے کوئی نعمت عطا کر دیتے ہیں تو وہ کہتا ہے: بس مجھے تو یہ (میرے) علم کی بدولت دی گئی ہے،

[1] تفسیر القرطبي (١٥/٢٦٥، ٢٦٦)　[2] فتح البیان (١٢/١٢٤۔١٢٦)

37

(نہیں) بلکہ وہ تو ایک آزمائش ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ﴿49﴾ تحقیق یہی بات ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو اُن سے پہلے ہوئے، پھر ان کے کام نہ آیا جو وہ کماتے تھے ﴿50﴾ چناں چہ انھیں ان کے عملوں کی سزا ملی اور ان میں سے جن لوگوں نے ظلم کیا، جلد انھیں بھی ان کے عملوں کی سزا ملے گی اور وہ (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے ﴿51﴾ کیا اُنھیں معلوم نہیں کہ بے شک اللہ ہی جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور تنگ کرتا ہے، بلاشبہہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہیں ﴿52﴾

حضرتِ انسان کی مختلف حالتوں کا بیان:

اپنے علم کی وجہ سے دیا گیا ہوں، یعنی قیاس یہی چاہتا تھا کہ اس طرح سے ہو اللہ کی قدرت کا قائل نہ ہو۔ یہ آزمائش ہے۔ اس کی عقل دوڑنے لگتی ہے، تاکہ اپنی عقل پر بہکے، وہی عقل رہتی ہے اور آفت آ پہنچتی ہے۔ کوئی شخص اپنی عقل دوڑانے میں اور تدبیر کرنے میں کمی نہیں کرتا، پھر بھی ایک کو روزی کشادہ ملتی ہے اور ایک کو تنگ۔ تو جان لو کہ عقل کام نہیں کرتی۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک انسان کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ تکلیف کی حالت میں اللہ عزوجل سے تضرع و زاری کرتا ہے، اس کی طرف رجوع ہوتا ہے اور اس کو پکارتا ہے اور جس وقت اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت بخشی تو باغی اور سرکش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: ﴿ إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلْمٍۭ ﴾ یعنی وہ تو مجھے صرف اس لیے ملی ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں اس کا حق دار ہوں۔ اگر میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک خصیص ہوتا، یعنی برگزیدہ اور پسندیدہ نہ ہوتا تو وہ مجھے یہ نعمت نہ بخشا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ عَلَىٰ عِلْمٍۭ ﴾ یعنی ”عَلٰی خَيْرٍ عِنْدِيْ“[1]

اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ ﴾ یعنی بات وہ نہیں ہے جو اس نے خیال کی، بلکہ ہم نے تو اس پر اس نعمت کا انعام اس لیے کیا ہے کہ اس کو آزمائیں اس شے میں جس کا ہم نے اس پر انعام کیا اور دیکھیں کہ ہماری اطاعت کرتا ہے یا نافرمانی کرتا ہے، باوجود ہمارے علم کے جو اس کے بارے میں ہمیں پہلے ہو چکا ہے، چنانچہ یہ نعمت تو ایک طرح کی آزمائش ہے، لیکن اُن میں سے اکثر اس بات کو نہیں جانتے، اسی لیے وہ کہتے ہیں جو کچھ کہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں۔ ان سے پہلے اگلی اُمتوں میں سے بہت سے لوگ یہی بات کہہ چکے ہیں اور یہی زعم اور دعویٰ کر چکے ہیں۔ ﴿ فَمَآ أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ﴾ یعنی ان کی بات ٹھیک نہ ہوئی اور اُن کو اس شے نے جس کو کماتے تھے اور اس کو جمع کر کے رکھنے نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا۔ چنانچہ ان کو اس شے کی برائیاں پہنچیں جو انھوں نے کمائی تھی۔

[1] تفسير الطبري (٢١/٣٠٣)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴾ یعنی ان مخاطب لوگوں میں سے وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا ان کو عن قریب اس شے کی برائیاں پہنچیں گی جو انھوں نے کمائی ہے، جس طرح کہ پہلے لوگوں کو پہنچیں اور نہیں ہیں وہ تھکانے والے، جس طرح کہ اللہ پاک نے قارون کے بارے میں خبر دی ہے کہ اس کی قوم نے اس سے کہا: ﴿ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ [القصص: ۷۶۔ ۷۸] ''تو اترا مت! اللہ تعالیٰ اترانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھے دے رکھا ہے اس میں سے آخرت کے گھر کی تلاش بھی رکھ اور اپنے دنیوی حصے کو بھی نہ بھول اور جیسے کہ اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی اچھا سلوک کر اور ملک میں فساد کا خواہاں نہ ہو، یقین مان کہ اللہ مفسدوں کو ناپسند رکھتا ہے۔ قارون نے کہا یہ سب کچھ مجھے میری اپنی سمجھ کی بنا پر ہی دیا گیا ہے، کیا اسے اب تک یہ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے بہت سے بستی والوں کو غارت کر دیا جو اس سے بہت زیادہ قوت والے اور بہت بڑی جمع پونجی والے تھے۔ اور گناہ گاروں سے ان کے گناہوں کی باز پرس ایسے وقت نہیں کی جاتی۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴾ [سبا: ۳۵] ''اور انھوں نے کہا: ہم مال و اولاد میں بہت بڑھے ہوئے ہیں یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم عذاب دیے جائیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ﴾ کیا وہ یہ بات نہیں جانتے کہ اللہ ایک قوم پر روزی کی فراخی کرتا ہے اور دوسروں پر اس کی تنگی کرتا ہے۔ بے شک اس میں البتہ ان لوگوں کے لیے جو مانتے ہیں عبرتیں اور حجتیں ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اس جگہ انسان سے بہ اعتبار اس کے بعض افراد یا غالب افراد کے جنسِ انسان ہی مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے صرف کفار مراد ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ انسان کی جنس پر محمول کرنے سے اس کا خصوصِ سبب مانع نہیں، اس لیے کہ عمومِ لفظ کا اعتبار بہ لحاظِ نظمِ قرآنی و فرقانی ہوتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ زیادہ تر انسانوں کی حالت یہ ہے کہ جس وقت اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے، خواہ وہ بیماری ہو یا فقر ہو یا کچھ اور تو اس کو دور کرنے کے لیے اللہ پاک کو پکارتا ہے، اس کی طرف آہ و زاری کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۷۳/۴، ۷۴)

پھر جب اس نے اس کو کوئی نعمت عطا کی جو اس کے پاس سے ہوتی ہے تو کہتا ہے: ﴿ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ ﴾ یعنی "مِنِّيْ بِوُجُوْهِ الْمَكَاسِبِ" یعنی یہ نعمت مجھے صرف اس لیے ملی ہے کہ میں کمائیوں کے طریقے خوب جانتا ہوں یا "عَلٰى خَيْرٍ عِنْدِيْ" یعنی یہ کسی خیر و خوبی کے سبب سے ملی ہے جو میرے پاس ہے۔ یا "عَلٰى عِلْمٍ مِنَ اللّٰهِ بِفَضْلِيْ" یعنی اس لیے کہ اللہ میری فضیلت کو جانتا ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: "عَلٰى عِلْمٍ عَلَّمَنِيَ اللّٰهُ إِيَّاهُ"[1] یعنی اس علم کے سبب سے جو اللہ نے مجھے سکھایا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جب دنیا میں مجھے یہ دیا گیا تو واقعی میں نے جان لیا کہ اللہ کے نزدیک میرا کوئی مرتبہ ہے۔ کسی نے کہا کہ اگر یہ نعمت مال میں بہرہ مندی ہے تو اس طرح کہتا ہے کہ یہ میری سعی و کوشش سے حاصل ہوا ہے اور اگر صحت اور عافیت ہے تو کہتا ہے کہ یہ فلاں علاج کے سبب سے ہوئی ہے۔ ان باتوں میں تضاد ہے جو برا ہے، اس لیے کہ جب عاجز اور محتاج تھا تو سب امور کی نسبت اللہ پاک کی طرف کی تھی اور سلامتی اور صحت کی حالت میں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہٹا کر اپنی جان کی کمائی کی طرف منسوب کیا۔

چنانچہ اللہ پاک نے اس کے قول کو رد کیا، فرمایا: ﴿ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ ﴾ یعنی وہ شے جو ہم نے تجھے عطا کی، اس سبب سے نہیں ہے جو تو نے بیان کیا، بلکہ وہ تو تیرے لیے آزمائش ہے کہ آیا تو شکر کرتا ہے یا ناشکری کرتا ہے، لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے کہ یہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس چیز پر جو اُن کے پاس ہے، اس کا شکر یا ناشکری کرنے کا امتحان ہے۔

﴿ اُوْتِيْتُهٗ ﴾ میں جو مذکر کی ضمیر آئی، باجود اس کے کہ نعمت کی طرف راجع ہے، اس لیے ہے کہ نعمت بہ معنی انعام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ضمیر ﴿ مَا ﴾ کی طرف راجع ہے جو ﴿ اِنَّمَآ ﴾ میں ہے اور وہ موصولہ ہے۔ پہلی بات زیادہ موزوں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هِيَ ﴾ کی ضمیر مؤنث لائی گئی بہ سبب تانیث ﴿ فِتْنَةٌ ﴾ کے، اور اگر "بَلْ هُوَ" فرماتا تو بھی جائز ہوتا۔ نحاس رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ﴿ هِيَ ﴾ کی ضمیر عطیہ کی طرف راجع ہے: "أَيْ: عَطِيَّةٌ فِتْنَةٌ"۔ ﴿ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ یعنی یہ کلمہ جو انھوں نے کہا، مراد ﴿ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ ﴾ ہے، وہی کلمہ ان لوگوں نے کہا جو اُن سے پہلے تھے، جیسے: قارون وغیرہ، اس لیے کہ قارون نے یوں کہا تھا: ﴿ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِيْ ﴾ [القصص: ۷۸]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ پہلا کلمہ ﴿ مَا ﴾ نافیہ ہے اور دوسرا موصولہ، یعنی اُن کی متاعِ دنیا نے جو انھوں نے کمائی، ان سے کچھ کفایت نہ کی۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں سے کچھ بھی ان کے کام نہ آیا۔ یا کلمۂ ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہے، یعنی کیا ان سے اس شے نے کفایت کی جو وہ کماتے تھے؟ مطلب یہ ہے کہ کچھ

[1] تفسير القرطبي (۲٦٦/۱۵)

کام نہ آئی۔ ﴿ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ﴾ "أَيْ: جَزَاءُ سَيِّئَاتِ كَسْبِهِمْ"، یعنی پھر ان کو ان کے کسب کی برائیوں کی جزا پہنچی۔ یا یہ معنی ہیں کہ ان کو برائیاں پہنچیں کہ وہ ان کے کسب کی جزا ہیں۔ کسب کی جزا کا نام سیئات اس لیے رکھا کہ وہ ان کے سیئات کے مقابلے میں واقع ہے۔ چنانچہ یہ ازدواج اور مشاکلت کے باب سے ہو گی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾ [الشوریٰ: ٤٠] ''اور برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے۔'' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے سارے اعمال ایسے ہی ہیں۔

پھر اللہ پاک نے ان کافروں کو وعید سنائی جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ﴾ حرفِ سین تاکید کے لیے ہے، یعنی ان موجودہ کفار میں سے جن لوگوں نے ظلم کیا ہے، ان کو اس شے کی برائیاں ضرور پہنچیں گی جو انھوں نے کمائیں۔ دنیا میں ان کو قحط، قتل، قید اور قہر پہنچا۔ ﴿ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴾ یعنی وہ اللہ کو ہرا دینے والے نہیں ہیں، بلکہ ان کا مرجع اسی کی طرف ہے، وہ جو سزا چاہے گا ان کو دے گا۔

﴿ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا ﴾ میں ضمیر ان لوگوں کی طرف راجع ہے جو ﴿ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ ﴾ کے قائل ہیں۔ ہمزہ استفہام کا ہے اور واو عطف کے لیے ہے محذوف پر "أَيْ: أَ قَالُوهَا وَلَمْ يَعْلَمُوا، أَوْ أَغْفَلُوا وَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ"، یعنی کیا یہ کلمہ کہا، یا کیا غافل ہو گئے اور اس بات کو نہ جانا کہ اللہ پاک جس کے لیے چاہتا ہے آزمایش کے لیے رزق کی فراخی کرتا ہے اور جس پر چاہتا ہے امتحان کے لیے رزق تنگ کرتا ہے، اگرچہ پہلی قسم کے لوگوں کے پاس رزق حاصل کرنے کا کوئی حیلہ، تدبیر اور قوت نہ ہو اور دوسری قسم کے لوگ بہت قوی، ہوشیار اور مدبر ہوں۔ کسی نے کہا کہ ﴿ يَقْدِرُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اس کی روزی بہ قدر قوت (یعنی صرف گزارے کے لیے) کرتا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ نے ان کو وعظ کیا تاکہ اس کی توحید کے بارے میں عبرت حاصل کریں۔ یہ اس وقت ہوا جب سات برس بعد اُن پر پانی برسا۔[1]

چنانچہ فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ﴾ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قابض اور باسط نہیں ہے۔ اس بات پر یہ دلیل ہے کہ ہم لوگوں کو رزق کی فراخی اور تنگی میں مختلف دیکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس کی کوئی حکمت اور سبب ہو۔ یہ سبب آدمی کی عقل اور جہالت نہیں ہے، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شخص جو عقل مند اور صحیح سالم ہے اور طاقت رکھتا ہے، وہ سخت تنگی میں ہے اور جاہل اور کمزور آدمی انتہا درجے کی فراخی میں ہے۔ ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی بے شک رزق کی اس فراخی اور تنگی میں جس کا ذکر ہوا، البتہ

[1] فتح القدير (٦١٦/٤)

بہت بڑی بڑی دلیلیں اور نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں۔ مومنین کو اس لیے خاص کیا
کہ آیات سے فائدہ حاصل کرنے والے اور ان میں غور وفکر کرنے والے وہی ہیں۔ پھر جب اللہ نے وعید ذکر کی تو
اس کے بعد اپنی وسیع اور بے پایاں رحمت اور عظیم مغفرت کا ذکر کیا اور اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ بندوں کو اس کی
خوش خبری دیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ
اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۵۳
وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ
ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝۵۴ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ
مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۵۵ اَنْ
تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ
لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ۝۵۶ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ
مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۵۷ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ
كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۸ بَلٰى قَدْ جَاۗءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ
بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۹

آپ کہہ دیجیے: (اللہ فرماتا ہے:) اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی کی
ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہ معاف کر دیتا ہے، یقیناً وہی بڑا
بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے(53) اور تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرماں
بردار ہو جاؤ اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے، پھر تمھاری مدد نہ کی جائے گی(54) اور تم اس
بہترین چیز کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تمھاری طرف نازل کی گئی ہے، اس
سے پہلے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے جبکہ تمھیں اس کی خبر تک نہ ہو(55) (ایسا نہ ہو) کہ کوئی
شخص کہے: ہائے افسوس! اس پر جو میں نے اللہ کے حق (اطاعت) میں کوتاہی کی اور بلاشبہہ
میں مذاق اُڑانے والوں میں رہا(56) یا وہ کہے: اگر بے شک اللہ مجھے ہدایت دیتا تو میں ضرور

[1] فتح البیان (۱۲/۱۲۷۔ ۱۲۹)

متقیوں میں سے ہو جاتا⑸⑺ یا وہ جس وقت عذاب دیکھے تو یہ کہے: کاش کہ میرے لیے ایک بار لوٹنا ہو تو میں نیکو کاروں میں سے ہو جاؤں⑸⑻ کیوں نہیں! تیرے پاس میری آیات آئیں تو تو نے انھیں جھٹلایا اور تو نے تکبر کیا اور تو کافروں میں سے تھا⑸⑼

عذاب سے پہلے توبہ کی دعوت:

جب اللہ تعالیٰ نے اسلام غالب کیا تو کافر دشمنی میں لگے تھے، سمجھے کہ برحق اللہ اس طرف ہے اور پچھتائے، لیکن شرمندگی سے مسلمان نہ ہوتے کہ اب ہمارا مسلمان ہونا کیا قبول ہوگا، جبکہ پہلے ہم نے دشمنی کی لڑائی لڑی اور جانیں ماریں۔ تب اللہ نے یہ فرمایا کہ ایسا کوئی گناہ نہیں جس کی توبہ اللہ قبول نہ کرے نا امید نہ ہو، توبہ کرو اس کی طرف رجوع کرو بخشے جاؤ گے، مگر جب سر پر عذاب آ گیا یا موت نظر آنے لگی، اس وقت کی توبہ قبول نہیں۔ انتہی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ سارے گناہ گاروں کو، وہ کافر ہوں یا غیر کافر، توبہ اور انابت کی طرف بلاتی ہے اور اس بات کی خبر دیتی ہے کہ اللہ پاک سارے گناہوں کو اس شخص کے لیے بخش دے گا جس نے ان سے توبہ کی اور ان سے رجوع کر لیا، گو وہ کبھی ہوئے ہوں اور کثیر ہوں اور اگرچہ دریا کی جھاگ کی طرح ہوں۔ اس آیت کو توبہ کے بغیر بخشش پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ جس مشرک نے توبہ نہیں کی اس کو بخشا نہیں جاتا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اہلِ شرک میں سے کچھ لوگ کثرت سے زنا اور قتل کر چکے تھے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ بے شک جو بات آپ کہتے ہیں اور جس کی طرف آپ ہم کو بلاتے ہیں، البتہ وہ خوب ہے، اگر آپ ہم کو یہ خبر دیں کہ ہم جو کچھ پہلے کر چکے ہیں اس کے لیے کوئی کفارہ ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ﴾ [الفرقان: ٦٨] ''اور وہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور کسی ایسے شخص کو جسے قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا ہو، وہ بجز حق کے قتل نہیں کرتے، نہ وہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔'' نیز یہ آیت اتری: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾[1]

(وهكذا رواه مسلم وأبو داود والنسائي من حديث ابن جريج عن يعلى بن مسلم المكي عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضي الله عنهما به)

پہلی آیت سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صٰلِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٧٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٠٢)

اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الفرقان: ۷۰] ''سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کریں اور ایمان لائیں اور نیک کام کریں، ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دیتا ہے، اللہ بخشنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔''

مایوسی سے ممانعت کے بارے میں احادیث:

امام احمد رحمہ اللہ نے ثوبان رضی اللہ عنہ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے: میں دوست نہیں رکھتا کہ اس آیت: ﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ کے عوض میرے لیے دنیا و ما فیہا ہو۔ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! پھر وہ شخص جس نے شرک کیا؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ پھر فرمایا: «أَلَا وَمَنْ أَشْرَكَ» اس کلمے کو تین بار دہرایا۔[1] (تفرد به الإمام أحمد) یعنی شرک توبہ سے معاف ہو جاتا ہے۔

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک بوڑھا شخص اپنے عصا کا سہارا لیے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آیا۔ پھر عرض کی: یا رسول اللہ! بے شک میرے لیے غدرات و فجرات ہیں تو کیا میرے لیے مغفرت کی جائے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو گواہی نہیں دیتا اس کی کہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه''؟ اس نے عرض کی: کیوں نہیں اور میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یقیناً تیرے غدرات و فجرات بخشے گئے۔[2] (تفرد به أحمد)

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے: ﴿ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ﴾ [هود: ٤٦] ''ان کے کام ناکارہ ہیں۔'' اور میں نے آپ کو سنا کہ فرماتے تھے: «﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ... الآيه﴾ وَلَا يُبَالِي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ»[3] (ورواه أبو داود والترمذي من حديث ثابت به)

چنانچہ یہ سب حدیثیں اس پر دال ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ سے یہ سارے گناہ بخش دیتا ہے اور کوئی بندہ اللہ کی رحمت سے آس نہ توڑے، اگرچہ اس کے گناہ عظیم اور کثیر ہوں، اس لیے کہ رحمت اور توبہ کا دروازہ بہت واسع، یعنی فراخ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ ﴾ [التوبة: ١٠٤] ''کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔'' نیز اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ١١٠] ''جو شخص کوئی برائی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ سے استغفار کرے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، مہربانی کرنے والا پائے گا۔'' نیز اللہ جل وعلا نے منافقوں کے

---

[1] مسند أحمد (٢٧٥/٥) اس کی سند میں ''ابو عبدالرحمان جبلانی اور ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٤٠٩)

[2] مسند أحمد (٣٨٥/٤)

[3] مسند أحمد (٤٥٤/٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٨٢) سنن الترمذي (٢٩٣١)

بارے میں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا ﴾ [النساء: ١٤٥۔ ١٤٦] ''منافق تو یقیناً جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں جائیں گے، ناممکن ہے کہ تو ان کا کوئی مددگار پالے، ہاں جو توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں۔'' اور اللہ جل جلالہ نے فرمایا: ﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [المائدة: ٧٣] ''وہ لوگ بھی قطعاً کافر ہو گئے، جنھوں نے کہا: اللہ تین میں کا تیسرا ہے، دراصل سوا اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے اس قول سے باز نہ رہے تو ان میں سے جو کفر پر رہیں گے، انھیں المناک عذاب ضرور پہنچے گا۔'' پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [المائدة: ٧٤] ''یہ لوگ کیوں اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں جھکتے اور کیوں استغفار نہیں کرتے؟ اللہ تعالیٰ تو بہت ہی بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا ﴾ [البروج: ١٠] ''بے شک جن لوگوں نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو ستایا پھر توبہ (بھی) نہ کی۔''

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کرم و عطا کو تو دیکھو کہ انھوں نے تو اللہ کے اولیاء کو قتل کر ڈالا اور وہ اُن کو توبہ اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔[1] اس بارے میں آیتیں بہت سی ہیں۔ صحیحین میں سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ ایک شخص نے ننانوے لوگوں کو مار ڈالا تھا، پھر وہ نادم ہوا اور بنی اسرائیل کے عابدین میں سے ایک عابد سے پوچھا کہ کیا اس کے لیے توبہ ہے؟ تو اس نے کہا: وہ کون ہے جو تیرے اور توبہ کے درمیان حائل ہو۔ پھر اس کو کہا کہ ایک گاؤں کی طرف جائے اور اس میں اللہ کی عبادت کرے، چنانچہ اس نے اسی گاؤں کا قصد کیا تو راستے میں اس کو موت آ گئی، پھر رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے اس کے بارے میں آپس میں جھگڑے تو اللہ عزوجل نے حکم دیا کہ اس فاصلے کو ناپیں جو دونوں جگہوں کے درمیان ہے، ان میں سے جس جگہ کے وہ زیادہ قریب ہو تو وہ اسی سے ہے۔ چنانچہ اس کو انھوں نے ایک بالشت کے برابر اس زمین کے زیادہ قریب پایا، جس کی طرف اس نے ہجرت کی، پھر اس کو رحمت کے فرشتوں نے قبض کیا۔ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ موت کے وقت اپنے سینے سے دور ہو گیا تھا اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے نیک شہر کو حکم دیا کہ قریب ہو جائے اور دوسرے شہر کو حکم دیا کہ دور ہو جائے۔[2] یہ حدیث کے معنی ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس حدیث کو بہ لفظہ دوسری جگہ لکھا ہے۔

علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو اپنی مغفرت کی طرف بلایا ہے جس نے یہ زعم کیا ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ ہی ہے اور جس کا یہ زعم ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے فرزند ہیں اور جس کا یہ زعم ہے کہ عزیر علیہ السلام

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٧٥/٤) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٨٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٦٦)

اللہ کے فرزند ہیں اور جس نے یہ زعم کیا ہے کہ اللہ فقیر ہے اور جس نے یہ زعم کیا ہے کہ اللہ کا ہاتھ مغلول ہے اور جس کا یہ زعم ہے کہ اللہ ثالث ثلاثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے فرماتا ہے: ﴿ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [المائدة: ٧٤] ''یہ لوگ کیوں اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں جھکتے اور کیوں استغفار نہیں کرتے؟ اللہ تعالیٰ تو بہت ہی بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔'' پھر اس شخص کو توبہ کی طرف بلایا جو بات میں ان سب سے بڑھ کر ہے، جس نے اس طرح کہا: ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ [النازعات: ٢٤] ''تم سب کا رب میں ہی ہوں۔'' نیز فرمایا: ﴿ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ ﴾ [القصص: ٣٨] ''میں تو اپنے سوا کسی کو تمھارا معبود نہیں جانتا۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اللہ کے بندوں کو اس کے بعد توبہ سے نا امید کیا تو یقیناً اس نے اللہ عزوجل کی کتاب کا انکار کیا، لیکن بندہ اس وقت تک توبہ کرنے پر قادر نہیں ہوتا، جب تک اللہ تعالیٰ اس پر رجوع نہ فرمائے۔[1] طبرانی نے بہ طریق شعبی شتیر بن شکل سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سنا، وہ فرماتے تھے کہ کتاب اللہ میں عظیم تر آیت یہ ہے: ﴿ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴾ [البقرة: ٢٥٥] ''اللہ تعالیٰ ہی معبودِ برحق ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو زندہ اور سب کا تھامنے والا ہے جسے نہ اونگھ آئے نہ نیند، اس کی ملکیت میں زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں ہیں۔ کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے، وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے، اس کی کرسی کی وسعت نے زمین و آسمان کو گھیر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت سے تھکتا ہے اور نہ اکتاتا ہے، وہ تو بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔''

قرآن میں خیر و شر کو سب سے زیادہ جمع کرنے والی آیت یہ ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ﴾ [النحل: ٩٠] ''اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، بھلائی کا۔'' نیز قرآن میں سب سے زیادہ فرحت دینے والی آیت سورت غرف میں یہ ہے: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ ﴾ اور کتاب اللہ میں ازروئے تصریف سب سے سخت آیت یہ ہے: ﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ ﴾ [الطلاق: ٢] ''اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو۔'' چنانچہ مسروق نے سیند سے کہا کہ تو نے سچ کہا۔[2]

---

① تفسیر ابن کثیر (٤/٧٥، ٧٦) ② المعجم الکبیر (١٣٣/٩)

امام اعمش رحمہ اللہ نے عن ابی سعید عن ابی الکنود روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک واعظ پر گزرے اور وہ لوگوں کو وعظ اور نصیحت کر رہا تھا تو فرمایا: اے وعظ کرنے والے! تو کیوں لوگوں کو ناامید کرتا ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾[1] (رواہ ابن أبي حاتم)

قنوط (مایوسی) کی نفی پر احادیث:

1. امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اگر تم خطا کرتے، یہاں تک کہ تمھاری خطاؤں سے آسمان وزمین کے درمیان کی جگہ بھر جاتی، پھر تم اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے تو البتہ وہ تمھیں بخش دیتا۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اگر تم خطا نہ کرتے تو البتہ اللہ عزوجل ایک اور قوم کو لاتا، وہ خطا کرتی، پھر مغفرت مانگتی اللہ سے، پھر وہ ان کو بخشتا۔[2]

2. امام احمد رحمہ اللہ نے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا جب ان کو وفات حاضر ہوئی کہ میں تم سے واقعی ایک شے کو چھپاتا تھا جس کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ فرماتے تھے: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم گناہ کرتے ہو تو البتہ اللہ عزوجل ایک قوم کو پیدا کرتا، وہ گناہ کرتی، پھر وہ ان کو بخش دیتا۔[3] (هكذا رواه الإمام أحمد وأخرجه مسلم في صحيحه والترمذي جميعاً عن قتيبة عن الليث بن سعد به ورواه مسلم من وجه آخر عن محمد بن كعب القرظي عن أبي صرمة وهو الأنصاري صحابي عن أبي أيوب رضی اللہ عنہ به)

3. امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ گناہ کا کفارہ ندامت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم گناہ نہ کرتے تو البتہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو لاتا کہ وہ گناہ کرتی، پھر وہ ان کی مغفرت فرماتا۔[4] (تفرد به أحمد)

4. عبداللہ بن امام احمد نے عن ابی جعفر محمد بن علی عن محمد بن حنفیہ عن ابیہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُحِبُّ الْعَبْدَ الْمُفْتِنَ التَّوَّابَ »[5] (ولم يخرجوه من هذا الوجه) یعنی بے شک اللہ تعالیٰ اس بندے کو دوست رکھتا ہے جو گناہ کے سبب سے فتنے میں ڈالا گیا ہے اور بہت توبہ کرنے والا ہے۔

---

1. تفسير ابن كثير (٤/٢٦)
2. مسند أحمد (٣/ ٢٣٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٩٥١)
3. صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٤٨) مسند أحمد (٥/٤١٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٣٩)
4. مسند أحمد (١/٢٨٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٧٠)
5. مسند أحمد (١/٨٠) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٩٦)

5 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عبید بن عمیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ابلیس ۔لعنه الله۔ نے عرض کی: یارب! تو نے تو مجھے آدم علیہ السلام کی وجہ سے جنت سے نکال دیا اور میں تیرے سلطان کے بغیر اس کی طاقت نہیں رکھتا ہوں۔ فرمایا: پس تو مسلط ہے۔ عرض کی: یا رب! مجھے زیادہ کر، فرمایا: نہیں پیدا کیا جائے گا اس کے لیے کوئی بچہ مگر تیرے لیے اس کے مثل پیدا کیا جائے گا۔ عرض کی: یا رب! مجھے زیادہ کر، فرمایا: میں ان کے سینے کو تیرے لیے مسکن کر دوں گا اور تم اُن کے اندر اس طرح جاری ہو گا جس طرح خون جاری ہوتا ہے۔ عرض کی: یا رب! مجھے زیادہ کر۔ فرمایا: ﴿ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٤] ''اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا اور ان کے مال اور اولاد میں سے اپنا بھی ساجھا لگا اور انھیں (جھوٹے) وعدے دے لے۔ ان سے جتنے بھی وعدے شیطان کے ہوتے ہیں سب کے سب سراسر فریب ہیں۔'' پھر آدم علیہ السلام نے عرض کی: اے رب! تو نے بے شک اس کو مجھ پر مسلط کر دیا اور میں اس سے بچ نہیں سکوں گا مگر تیری مدد کے ساتھ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ تیرا کوئی بچہ پیدا نہیں کیا جائے گا مگر اس پر میں ایک ایسے شخص کو متعین کر دوں گا جو اسے برے ساتھیوں سے محفوظ رکھے گا۔ عرض کی: اے رب! مجھے زیادہ کر، فرمایا: ایک نیکی کی دس یا اس سے زیادہ نیکیاں دوں گا اور بدی کا بدلہ ایک ہی دوں گا یا اس کو مٹا دوں گا۔ عرض کی: اے رب! مجھے اور زیادہ دے۔ فرمایا: ﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾[1]

6 محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ نافع نے عن عبداللہ بن عمر عن عمر رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا: ہم کہتے تھے کہ اللہ اس شخص سے قبول کرنے والا نہیں ہے جو فتنے میں ڈالا گیا، نہ صرف کو نہ عدل کو، یعنی نہ فرض کو نہ نفل کو اور نہ توبہ کو۔ انھوں نے اللہ کو پہچانا، پھر کسی آزمایش کے سبب سے جو اُن کو پہنچی کفر کی طرف لوٹ گئے۔ کہا اور وہ اس کو اپنی جانوں کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اور ہمارے قول کے بارے میں جو اُن کے متعلق اور ہمارے اپنے متعلق تھا، یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا... تا... وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: چنانچہ میں نے اس کو اپنے ہاتھ سے ایک صحیفے میں لکھا اور اس کو ہشام بن العاص کی طرف بھیجا۔ کہا: پھر ہشام نے کہا کہ جب وہ میرے پاس آئے تو میں اس کو لے کر ذی طویٰ میں پڑھنے لگا۔ میں اس کو لے کر اوپر چڑھتا تھا اور

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳۲۵۳/۱۰)

آواز کرتا تھا اور اس کو سمجھتا نہ تھا، یہاں تک کہ میں نے کہا: الٰہی تو مجھے وہ سمجھا دے۔ کہا: پھر اللہ عزوجل نے میرے دل میں یہ القا کیا کہ وہ جو نازل کی گئی ہے تو ہمارے بارے میں ہے اور اس بات کے متعلق ہے جو ہم اپنی جانوں کے بارے میں کہتے تھے اور ہمارے بارے میں کہی جاتی تھی۔ کہا: پھر میں اپنے اونٹ کی طرف لوٹ کر آیا اور اس پر بیٹھا، پھر میں رسول اللہ ﷺ سے مدینے میں جا ملا۔[1]

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو توبہ کی طرف مسارعت (جلدی کرنا) پر آمادہ کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ ﴾ یعنی تم اللہ کی طرف رجوع ہو جاؤ اور اس کے مطیع اور فرمانبردار ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آ جائے اور تم مدد نہ کیے جاؤ، یعنی توبہ اور عمل کے لیے جلدی کرو، سزا کے حلول (پہنچنے) سے پہلے اور اس میں سے بہترین شے کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تمھاری طرف اتاری گئی۔ یعنی یہ قرآنِ عظیم، اس سے قبل کہ تم کو اچانک عذاب آ لے اور تمھیں شعور ہی نہ ہو۔ یعنی ایسی جگہ سے آ جائے جس کا تم کو علم اور شعور نہ ہو۔ پھر اللہ عزوجل نے فرمایا ﴿ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ ﴾ یعنی قیامت کے دن مجرم جس نے توبہ اور انابت الی اللہ میں کمی کی ہے حسرت کرے گا اور تمنا کرے گا کہ کاش وہ اللہ عزوجل کے مطیعین، محسنین اور مخلصین میں سے ہوتا۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴾ یعنی دنیا میں جو میرا عمل تھا وہ ٹھٹھا کرنے والوں کا تھا، ایمان لانے والوں اور تصدیق کرنے والوں کا نہ تھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿57﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ یعنی وہ تمنا کرے گا اس کی کہ کاش دنیا کی طرف لوٹایا جائے، تاکہ نیک عمل کرے۔ علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی جس کو کہ بندے کہنے والے ہیں، اس سے پہلے کہ وہ کہیں اور اُن کے عمل کی اس سے پہلے کہ وہ کریں۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴾ [الفاطر: ١٤] ''آپ کو کوئی بھی حق تعالیٰ جیسا خبردار خبریں نہ دے گا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿56﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿57﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ چنانچہ اللہ عزوجل نے خبر دی ہے کہ اگر وہ دوبارہ لائے جاتے تو بھی ہدایت پر قادر نہ ہوتے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾[2] [الأنعام: ٢٨] ''اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھیج دیے جائیں، تب بھی یہ وہی کام کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمام اہلِ نار جنت میں

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٢/٣٢٣)
[2] تفسير الطبري (١٢/٤٤، ٤٥)

اپنے ٹھکانے کو دیکھیں گے تو کہیں گے: ﴿ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ ﴾ چنانچہ ان کو حسرت ہوگی۔ فرمایا: اور تمام اہلِ جنت نار میں اپنے ٹھکانے کو دیکھیں گے اور کہیں گے: ''لَوْ لَا أَنَّ اللّٰهَ هَدٰنِيْ'' فرمایا: پس ان کے لیے شکر ہوگا۔[1] (ورواہ النسائي من حدیث أبي بکر بن عیاش به) جب مجرموں نے دنیا کی طرف لوٹ آنے کی تمنا کی اور اللہ کی آیات کی تصدیق نہ کرنے اور اتباعِ رسل نہ کرنے پر حسرت و افسوس کیا تو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ یعنی اے اپنے کیے پر ندامت کرنے والے بندے! میری آیتیں دنیا میں یقینی طور پر تیرے پاس آئیں اور تجھ پر میری حجتیں قائم ہوئیں، مگر تو نے ان کو جھٹلایا اور اُن کی پیروی کرنے سے تو نے تکبر کیا اور تو اُن کے منکروں سے تھا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جمہور نے ﴿ يٰعِبَادِيَ ﴾ کو وصل و وقف میں بہ اثباتِ یاء پڑھا ہے اور ابوبکر نے عاصم سے روایت کیا ہے کہ وہ بغیر یاء وقف کرتے تھے۔ اور دونوں سبعیہ ہیں۔ ﴿ لَا تَقْنَطُوْا ﴾ کو جمہور نے بہ فتحِ نون پڑھا ہے اور امام ابوعمرو اور کسائی رحمہما اللہ نے بہ کسرِ نون پڑھا ہے۔[3] رحمت سے مراد مغفرت ہے، معنی یہ ہیں: اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر کفر اور معاصی کے ساتھ افراط کیا، یعنی ان میں کثرت کی، تم اللہ کی مغفرت سے ناامید مت ہو۔ اس آیتِ کریمہ میں معانی اور بیان کے لحاظ سے کئی باتیں بہت اچھی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں کی طرف متوجہ ہوا اور انھیں یاء کے حرف کے ساتھ پکارا۔ دوسرے یہ ہے کہ بہ اضافتِ تشریف ان کو اپنی طرف مضاف کیا۔ تیسرے یہ ہے کہ صیغۂ حاضر و مخاطب سے صیغۂ غائب کی طرف التفات کیا ﴿ مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾ فرمایا۔ چوتھے یہ ہے کہ اسمائے حسنیٰ میں سے سب سے جلیل القدر اور بزرگ اسم کی طرف رحمت کی اضافت فرمائی۔ پانچویں یہ ہے کہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ ﴾ میں بہ لفظہ اسمِ ظاہر کا اعادہ کیا۔ (کذا ذکرہ السمین)

عبداللہ رضی اللہ عنہ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہ کی کتاب میں سب سے زیادہ مغفرت کی امید دلانے والی یہ آیت ہے،[4] اس لیے کہ یہ سب سے بڑی بشارت پر مشتمل ہے، کیوں کہ پہلے تو بندوں کو ان کی عزت کے لیے اپنی ذاتِ مقدس کی طرف منسوب کیا، ایسا انھیں خوش کرنے کے لیے کیا۔ پھر اُن کی یہ صفت بیان کی کہ معصیت میں مسرف اور ذنوب کے مستکثر ہیں، یعنی بہت زیادہ معصیت اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والے ہیں۔ پھر ان کثرت سے گناہ کرنے والوں کو کہا کہ رحمت سے نااُمید نہ ہوں۔ چنانچہ جو گناہ گار مسرف نہیں ہیں، یعنی زیادہ گناہ نہیں کرتے تو ان کے لیے تو اللہ کی رحمت سے ناامیدی کی ممانعت بہ طریقِ اولیٰ اور خطاب کے انداز میں ہوگی۔ کسی نے کہا: یہ آیت ہر

[1] مسند أحمد (٥١٢/٢) سنن النسائي الکبریٰ (٤٤٧/٦) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٠٣٤)

[2] تفسیر ابن کثیر (٧٤/٤۔٧٨) [3] فتح القدیر (٦١٧/٤) [4] الدر المنثور (٧/٢)

کافر کے حق میں عام ہے جو توبہ کرتا ہے اور گناہ گار مومن کے حق میں جو توبہ کرتا ہے، اس کی توبہ اس کے گناہ کو مٹا دیتی ہے۔ اس سے مراد اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ گناہ گار کو یہ لائق نہیں ہے کہ یہ گمان کرے کہ عذاب سے اس کی کوئی خلاصی نہیں ہے، کیوں کہ جو کوئی یہ اعتقاد کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید ہوگا، اس لیے کہ گناہ گاروں میں سے جب کوئی توبہ کرے گا تو اس کا عقاب زائل ہو جائے گا اور وہ مغفرت اور رحمت والوں سے ہو جائے گا۔ حق یہ ہے کہ یہ آیت توبہ کے ساتھ مقید نہیں ہے، بلکہ اپنے اطلاق پر ہے۔

بالجملہ جب گناہ گار بندوں کو نا امیدی سے منع کیا تو ان کو اس شے کی خبر دی جو قنوط اور نا امیدی کو رفع کر دے اور قنوط کی جگہ رجا اور اُمید کو رکھ دے اور وہ بات بیان کی جس کے بعد کوئی شک باقی نہ رہے اور نہ ہی اس کو سن کر دل میں کوئی گمان چبھے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ ﴾ یہ الف و لام جو جمع پر داخل ہوا ہے، اس نے اس کو جنس کے لیے کر دیا، کون سی جنس؟ جو مستلزم ہے اپنے افراد کے استغراق کو، چنانچہ یہ اس قوت میں ہے کہ بے شک اللہ ہر گناہ کو بخش دے گا، وہ کوئی سا ہو، مگر وہ گناہ جس کو نصِ قرآنی نے خارج کر دیا، یعنی شرک جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ٤٨]، پھر ہر گناہ کی یہ مغفرت جو جمع معرف بہ لام جنسی سے معلوم ہوئی اور جس کی خبر اپنے بندوں کو دی، اس پر ہی کفایت نہ کی، بلکہ صریحاً اپنے قول مبارک سے اس کی تاکید فرمائی۔

﴿ جَمِيْعًا ﴾ یعنی سارے گناہوں کو بخش دے گا۔ کیا کہنا ہے اس بشارتِ پُر نضارت کا، جس کے لیے ان مومنوں کے دلوں کی کلیاں کھلتی ہیں، وہ مومن جو اپنے پروردگار سے نیک گمان رکھنے والے ہیں، اپنی رجا اور امید میں سچے اور راست باز ہیں۔ قنوط اور نا امیدی کے لباس کو اُتارنے والے ہیں، بدگمانی کو چھوڑنے والے ہیں۔ اس ذات پاک کے ساتھ بدگمانی نہیں کرتے جس کے نزدیک کوئی گناہ کچھ بڑی شے نہیں اور نہ وہ اپنی مغفرت و رحمت کے ساتھ بخل کرتا ہے، اپنے بندوں پر جو عفو و درگزر کے طلب کرنے میں اس کی طرف متوجہ ہونے والے ہیں، اپنے گناہوں کی مغفرت میں اس کی پناہ پکڑنے والے ہیں اور کیا اچھی اس مضمون کی عَلت بیان فرمائی ہے یہ کہہ کر کہ ﴿ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ یعنی وہ سارے گناہوں کو بخش دے گا، اس لیے کہ وہ تو بہت زیادہ بخشش والا اور عظیم، بلیغ اور واسع المغفرة والرحمة ہے، نہ اس کی بخشش کی کوئی حد ہے، نہ اس کی رحمت کی کوئی انتہاء۔ شیخ سعدی شیرازی رحمہ اللہ نے فی الجملہ اسی جگہ کے سمجھانے کے لیے یوں فرمایا ہے:

اگر دردہد یک صلائے کرم عزازیل گوید نصیبے برم

''اگر وہ (اللہ) مہربانی و بخشش کی ایک بار دعوتِ عام دیتا ہے تو شیطان کہتا ہے کچھ حصہ میرے لیے بھی ہے۔''

دیکھو اپنی کثرتِ مغفرت اور رحمت کو اس مختصر جملے میں کیسی دھوم دھام سے بیان فرمایا ہے۔ اول تو غفور و رحیم

دونوں مبالغے کے صیغے ہیں جن سے مغفرت اور رحمت کا موسلا دھار مینہ برس رہا ہے۔ پھر جملۂ اسمیہ جو دوام، ثبات اور استمرار پر دال ہے، اس کی تاکید کلمۂ ﴿ إِنَّ ﴾ سے کی جو جملے کے مضمون کی تایید کر رہا ہے۔ پھر ضمیرِ فصل سے اس کی تاکید کی اور اُن دو صفتوں کا اعادہ کیا جو پہلی آیت میں بھی شامل ہیں۔ اب جو کوئی اس عظیم فضل و کرم اور بڑی عطا اور وسیع رحمت کا انکار کرے اور یہ خیال میں لائے کہ اللہ کے بندوں کا اس کی رحمت سے نا امید کرنا اس شے سے زیادہ مناسب ہے جس کی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو بشارت دی تو واقعی اس نے بڑے سے بڑے شطط، یعنی ظلم کا ارتکاب کیا اور قبیح سے قبیح غلطی کی، کیوں کہ اللہ پاک کی کتابِ عزیز میں اسی بات کو لے کر مواعیدِ الٰہی آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری دیں اور نا امید نہ کریں اور یہی طریقہ رسول اللہ ﷺ نے اختیار فرمایا ہے۔ دیکھو آپ ﷺ کا فرمان ہے: « يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا »[1] یعنی آسانی کرنا مشکل میں مت ڈالنا، خوش خبری سنانا نفرت مت دلانا۔

جبکہ تمھارے لیے یہ بات قرار پا چکی تو اب یہ سمجھ لو اس آیت میں اور اس آیتِ کریمہ میں: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٤٨] ''یقیناً اللہ تعالیٰ اُپنے ساتھ شریک کیے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک مقرر کرے اس نے بہت بڑا گناہ اور بہتان باندھا۔'' جمع یہ ہے کہ ہر گناہ وہ کوئی سا ہو سوائے شرک باللہ کے، اس شخص کے لیے بخشا ہوا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بخشنا چاہے۔ اس کے علاوہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ پاک کا ہم کو یہ خبر دینا کہ وہ سارے گناہوں کو بخش دے گا، اس پر دال ہے کہ وہ ان سب کو بخشنا چاہتا ہے اور یہ اس کو مستلزم ہے کہ وہ مسلمانوں میں سے سب گناہ گاروں کے لیے مغفرت چاہتا ہے۔ اب بایں حیثیت دونوں آیتوں میں کچھ تعارض باقی نہ رہا۔

رہا اس آیت کو توبہ کے ساتھ مقید کرنا اور یہ کہ صرف توبہ کرنے والوں کے گناہ ہی بخشے جائیں گے جس طرح کہ مفسروں کی ایک جماعت نے زعم کیا ہے اور اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے یہ اس لیے کہا ہے کہ آیتوں کے درمیان جمع ہو جائے تو یہ جمع ہے ضب اور نون کے درمیان اور ملاح اور حادی کے درمیان "وَعَلٰى نَفْسِهَا بَرَاقِشُ تُجْنَى" (ضب گوہ کو کہتے ہیں، یہ ایک جنگلی جانور ہے اور نون مچھلی ہے اور ملاح کشتی چلانے والا اور حادی اونٹ ہانکنے والا۔ براقش ایک کتیا کا نام ہے، وہ گاؤں میں تھی، رات کو بھونکی تو دشمنوں نے اس کی آواز سے معلوم کیا، پھر وہ سارے قبیلے کو لوٹ مار کر چلے گئے، یہ مثال ہوگئی کہ "عَلٰى أَهْلِهَا دَلَّتْ بَرَاقِشُ"۔ جو شخص اپنے نقصان کا آپ باعث ہو اس کے حق میں یہ مثل بولی جاتی ہے۔ چونکہ تاویل مذکور میں اپنا ضرر ہے، اس لیے گویا اس مثل کا مصداق ہوا)۔

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٧٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٣٢)

اگر یہ عظیم بشارت توبہ کے ساتھ مشروط ہوتی تو اس کے لیے کوئی ایسا عمدہ موقع نہ ہوتا، اس لیے کہ توبہ کی وجہ سے تو اللہ تعالیٰ مشرک کے شرک کو بھی بخش دیتا ہے بہ اجماعِ مسلمین اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴾ پس اگر توبہ مغفرت میں قید ہوتی تو شرک پر نص کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا، حالانکہ اللہ پاک نے تو یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ﴾ [الرعد: ٦] ”اور بے شک تیرا رب البتہ بخشنے والا ہے لوگوں کے بے جا ظلم پر بھی۔“

امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سارے مفسروں نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک ایسی قوم کے حق میں نازل ہوئی ہے جو اس بات سے ڈرے کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو اُن کے وہ بڑے بڑے گناہ نہ بخشے جائیں جو وہ کر چکے ہیں، جیسے: شرک، قتلِ نفس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے مانا کہ آیت انہیں کی شان میں اتری ہے، پھر کیا ہوا، اس لیے کہ اعتبار تو عموم کا ہے جس پر وہ مشتمل ہے نہ کہ خصوصِ سبب کا۔ چنانچہ اہلِ علم کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے۔ اگر آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی اپنے اسبابِ نزول و ورود کے ساتھ مقید ہوتیں اور ان سے آگے نہ بڑھتیں تو اکثر تکالیف اور احکامِ شرعی امت سے مرتفع ہو جاتے گو سب کے سب نہ ہوتے، حالاں کہ لازم بالاجماع باطل ہے تو ملزوم بھی اس کی مثل باطل ہے۔ نیز امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ سنتِ مطہرہ میں اس باب میں صحیحین وغیرہ میں احادیث ثابت ہیں کہ ان پر مطلع ہونے والا اگر ان کی معرفت حاصل کر لیتا جیسے ان کی معرفت کا حق ہے اور ان کی قدر کرتا جیسا ان کا حق ہے تو وہ ہماری ذکر کردہ باتوں کی صحت کو جان جاتا اور ہماری تحریر کردہ چیزوں کی حیثیت کو پہچان جاتا۔[1] (قاله الشوكاني)

امام ابن ابی حاتم، ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وحشی جس وقت اسلام لایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٨] ”اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور کسی ایسے شخص کو جسے قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا ہو وہ بجز حق کے قتل نہیں کرتے، نہ وہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور جو کوئی یہ کام کرے وہ اپنے اوپر سخت وبال لائے گا۔“ وحشی اور اس کے ساتھیوں نے کہا کہ مقرر ہم نے ان سب چیزوں کا ارتکاب کیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ ... الآية ﴾[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے ”الأدب المفرد“ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ایک گروہ پر نکلے اور وہ ہنس رہے تھے اور بات چیت کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس کی

---

[1] فتح القدير (٦١٧/٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٥٣/١٠) الدر المنثور (٢٣٥/٧)

جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم جانتے جو میں جانتا ہوں تو البتہ تم تھوڑا ہنستے اور زیادہ روتے، پھر آپ ﷺ تشریف لے گئے اور لوگوں کو رلایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طرف وحی بھیجی کہ اے محمد! تو میرے بندوں کو کیوں ناامید کرتا ہے؟ تو نبی ﷺ لوٹ کر تشریف لائے اور فرمایا: «أَبْشِرُوْا وَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا»[1] ''(اللہ تعالیٰ کی رحمت کی) خوش خبری (کی امید) رکھو، صحیح عمل کرو اور (اعلیٰ ترین معیار کے) قریب تر رہو۔''

امام ابن مردویہ اور بیہقی نے اپنی سنن میں عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اس شخص کے حق میں نازل ہوئی جو مفتون ہوا۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن سیرین رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کون سی آیت زیادہ وسیع ہے؟ تو لوگ قرآنِ مجید میں سے آیتوں کا ذکر کرنے لگے، یعنی: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ١١٠] ''جو شخص کوئی برائی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ سے استغفار کرے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، مہربانی کرنے والا پائے گا'' اور اس جیسی اور آیتوں کا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن شریف میں اس آیت سے زیادہ وسیع اور کوئی آیت نہیں ہے: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ ... الآية ﴾[3]

صحیحین میں یہ روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک طویل حدیث ہے اس شخص کے بارے میں جس نے کہا تھا کہ میری راکھ کو ہوا میں بکھیر دینا۔[4] اور سنن ابی داود میں دو باہم اللہ کے لیے محبت کرنے والوں کے بارے میں حدیث ہے۔ ترمذی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: اللہ عزوجل نے فرمایا: اے ابن آدم! بے شک تو جب تک مجھے پکارے گا اور مجھ سے اُمید رکھے گا تو میں تیرے لیے وہ گناہ بخش دوں گا جو تجھ سے سرزد ہوگئے اور اے ابن آدم! مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ تیرے گناہ عنانِ آسمان تک پہنچ جائیں، پھر تو مجھ سے بخشش مانگے تو میں تجھے بخش دوں۔ اے ابن آدم! میں پروا نہیں کرتا کہ تو میرے پاس آئے قرابِ زمین بھر کر گناہ لے کر، پھر تو مجھے اس حال میں ملے کہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا تو البتہ میں آؤں تیرے پاس قرابِ زمین بھر کر مغفرت لے کر۔[5]

عنان بہ معنی سحاب، یعنی بادل ہے اور ''قُرَابُ الْاَرْضِ'' قاف کے ضمے سے جو زمین کے بھرنے کے قریب ہو۔

بالجملہ جب اللہ پاک نے بندوں کو یہ بشارت دی کہ وہ سارے گناہ بخش دے گا تو ان کو حکم کیا کہ اس کی طرف رجوع ہوں، اس طرح سے کہ طاعات بجا لائیں اور گناہوں سے بچیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ ﴾ یعنی اپنے رب کی طرف رجوع ہو۔ اس میں وہ شے نہیں ہے جو اس پر دال ہو کہ اول آیت کو توبہ کے ساتھ مقید کریں نہ تو بہ مطابقت، نہ بہ تضمن اور نہ بہ التزام۔ جو بات اس میں ہے اس کی انتہاء یہ ہے کہ بندوں کو وہ بشارتِ عظمیٰ سنائی، پھر ان کو خیر کی طرف بلایا اور شر سے ان کو ڈرایا۔ اس کے علاوہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ ان

[1] الأدب المفرد (٩٨/١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣١٩٤) [2] الدر المنثور (٢٣٦/٧) [3] تفسير الطبري (٣٠٩/٢١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٦)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٤٠) صحيح الجامع (٤٣٣٨)

کفار کو خطاب کیا ہے جو اسلام نہیں لائے ہیں بہ دلیل اس قول کے: ﴿ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ ﴾ اول تو مسلمانوں کو اول آیت سے ترغیب دی اور ان کو خوش خبری دی، اس کے بعد کفار کو ڈرایا، گو یہ بات بعید ہے، لیکن ممکن ہے کہ اس کے قائل ہوں۔ ظاہر کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے اپنے بندوں کے لیے ان باتوں کو جمع کیا کہ ان کو بشارتِ عظیم دی اور اپنی طرف رجوع ہونے کا امر فرمایا اور اپنے لیے اخلاص کرنے کا حکم دیا اور اپنے امر کے لیے مطیع اور فرماں بردار اور فروتن ہونے کا حکم دیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ﴾ یعنی اس سے پہلے کہ تم کو دنیا کا عذاب آئے۔ چنانچہ قولہ تعالیٰ: ﴿ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ ﴾ اسی عذابِ دنیا کو ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں وہ شے نہیں ہے جو اس بات پر دال ہو، جس کا زعم کرنے والوں نے زعم کیا اور جس کے ساتھ نا امید ہونے والوں اور نا امید کرنے والوں نے تمسک فرمایا ہے: وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. ﴿ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴾ تم بچائے نہ جاؤ گے اس عذاب سے، اگر تم اس کے نازل ہونے سے پہلے توبہ نہ کرو۔

﴿ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ ﴿ اَحْسَنَ ﴾ سے مراد قرآن شریف ہے، یعنی اس کے حلال کو حلال جانو اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔ قرآن سارا احسن ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کی اطاعت کو لازم پکڑو اور اس کے معاصی سے بچو۔[1] امام خازن رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ لازم کرو اللہ کی اطاعت کو اور بچو اس کی معصیت سے، اس لیے کہ قرآن میں قبیح چیزوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ ان سے بچو اور احسن چیزوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کو اختیار کرو اور انھیں لے لو۔[2] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَحْسَنَ ﴾ وہ ہے جس کا اللہ نے اپنی کتاب میں حکم دیا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد آیاتِ محکمات ہیں اور متشابہات کا علم اس کے عالم کی طرف سونپو۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ناسخ کی پیروی کرو نہ کہ منسوخ کی۔ کسی نے کہا ہے کہ عفو کی پیروی کرو نہ کہ انتقام کی، اس شے کے ساتھ جس میں انتقام لائق ہے۔ کسی نے کہا کہ پہلی اُمتوں کی خبروں میں سے جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہیں ان میں سے احسن شے کی پیروی کرو۔ اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ﴾ [الزمر: ۱۸] ”جو بات کو کان لگا کر سنتے ہیں۔ پھر جو بہترین بات ہو اس کی اتباع کرتے ہیں۔“

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ ﴾ قرآن ہے، اس لیے کہ ہمارے رب کی طرف سے بہت کتابیں نازل کی گئی ہیں، ان کا احسن قرآن ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: ”اَلْقُرْآنَ أَوِ الْمَأْمُوْرَ بِهِ دُوْنَ الْمَنْهِيِّ عَنْهُ أَوِ الْعَزَائِمَ دُوْنَ الرُّخَصِ أَوِ النَّاسِخَ دُوْنَ الْمَنْسُوْخِ وَلَعَلَّهُ مَا هُوَ أَنْجَى وَأَسْلَمَ كَالْإِنَابَةِ وَالْمُوَاظَبَةِ عَلَى الطَّاعَةِ“[4] انتھیٰ. اس کا بیان یہ ہے کہ ﴿ اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ ﴾ سے مراد اس شے کا

[1] تفسير القرطبي (۱۵/۲۷۰) [2] تفسير الخازن (۶/۸۲) [3] تفسير القرطبي (۱۵/۲۷۰) [4] تفسير البيضاوي (۵/۷۳)

احسن ہے جو بنی آدم پر اتاری گئی، اس بنیاد پر کہ خطاب بنی آدم کو ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اتباع کرو احسن وحی کا یا احسن کتاب کا جو تمھاری طرف نازل کی گئی اور یہ کل قرآن ہے، یہ ایک معنی ہوئے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ احسن قرآن سے مراد وہ مامور بہ ہے جو اس کے ضمن میں ہے۔ اس لیے کہ مامور بہ اس سے احسن ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ ﴿ اَحْسَنَ ﴾ سے مراد عزیمتیں ہیں اس لیے کہ وہ رخصتوں سے احسن ہیں۔ چوتھے معنی یہ ہیں ﴿ اَحْسَنَ ﴾ سے مراد ناسخ ہیں، کیوں کہ ناسخ ہمارے حق میں احسن ہے، پھر اس احتمال کو ترجیح دی کہ احسن قرآن سے مراد وہ شے ہے جو نجات اور سلامتی کی طرف پہنچانے میں زیادہ ظاہر ہے، کیوں کہ یہ شے فائدے میں بہت زیادہ ہے، جیسے: انابت اور اطاعت پر ہمیشگی اختیار کرنا۔ (كذا في شيخ زاده)

قولہ تعالیٰ: ﴿ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ یعنی جو تم پر نازل کیا گیا اس میں سے احسن کی طرف رجوع کرو، اس کو تسلیم کرو اور اس کی اتباع کرو اس سے پہلے کہ تم پر اچانک اس حال میں عذاب آجائے کہ تم اس سے غافل ہو اور تمھیں اس کا شعور نہ ہو۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم اچانک مرجاؤ تو عذاب میں پڑو، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ جو عذاب ان کو اچانک آئے گا، وہ عذاب دنیا کا ہے جو قتل، قید، خوف، قہر اور قحط سالی کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ آخرت کا عذاب ہے اور نہ ہی موت ہے، کیوں کہ آنے کی نسبت اس کی طرف نہیں کی گئی۔

پھر اللہ پاک نے کفار سے تین قول نقل فرمائے: پہلا قول یہ ہے: ﴿ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ ﴾ بصریوں نے کہا: تقدیر یہ ہے: "حَذراً أَنْ تَقُوْلَ"۔ کوفیوں کی تقدیر یہ ہے: "لِئَلَّا تَقُوْلَ"، امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: "بَادِرُوْا خَوْفَ أَنْ تَقُوْلَ أَوْ حَذِرًا مِنْ أَنْ تَقُوْلَ"[1] امام زمخشری رحمہ اللہ کی تقدیر یہ ہے: "كَرَاهِيَةَ أَنْ تَقُوْلَ"، امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: "وَأَنِيْبُوْا مِنْ أَجْلِ أَنْ تَقُوْلَ"، امام ابو البقاء اور حوفی رحمہما اللہ نے کہا: "أَنْذَرْنَاكُمْ مَخَافَةَ أَنْ تَقُوْلَ"[2] حلبی نے مذکور تقدیروں میں سے بعض نقل کر کے کہا کہ ﴿ اَنِيْبُوْٓا ﴾ کے ہوتے ہوئے اس عامل کے اضمار کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "خَوْفَ أَنْ تَصِيْرُوْا إِلَى حَالٍ تَقُوْلُوْنَ فِيْهَا يَا حَسْرَتَى"۔[3] ﴿ نَفْسٌ ﴾ کو اس لیے نکرہ لایا گیا کہ اس سے مراد بعض انفس ہیں، یعنی نفسِ کافرہ جو کفر میں شدید یا عذابِ الیم کے ساتھ متمیز ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد تکثیر ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴾ [التکویر: ١٤] "تو اس دن ہر شخص جان لے گا جو کچھ لے کر آیا ہوگا۔" یعنی نفوسِ کثیرہ، مراد کفار اور گناہ گار مومنین ہیں۔ جمہور نے "يَا حَسْرَتَا" بہ الف پڑھا ہے، یائے متکلم مضاف الیہ کو الف سے بدل لیا ہے۔ اصل میں ﴿ يّٰحَسْرَتٰى ﴾ ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے وقف "يَا حَسْرَتَاهُ"، بہ ہائے سکتہ پڑھا ہے اور ابو جعفر

[1] فتح القدير (٧١٨/٤) [2] اللباب في علوم الكتاب (٥٣١/١٦) [3] فتح القدير (٦١٨/٤)

نے ﴿ يٰحَسْرَتٰى ﴾ بہ یاء بنا بر اصل پڑھا ہے۔ ”حَسْرَةٌ“ کہتے ہیں: نادم، پشیمان، غمگین اور محزون ہونے کو اس شے پر جو فوت ہوئی۔ ﴿ عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مَا ﴾ مصدریہ ہے: ”أَيْ: عَلٰى تَفْرِيْطِيْ وَتَقْصِيْرِيْ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ أَيْ: فِيْ طَاعَتِهٖ“[1] (قاله الحسن) معنی یہ ہیں کہ ناگہاں عذاب آنے سے پہلے اپنے رب کی طرف رجوع ہو جاؤ، اس بات کے خوف سے کہ کافر لوگ اور عاصی مومن کہیں: اے ہماری حسرت و ندامت! جو اللہ کی اطاعت میں ہماری کمی اور تقصیر کرنے پر ہے۔ وہ رنج وغم کے مارے حسرت و ندامت کو پکاریں گے کہ اے کم بخت ندامت! تو کدھر گئی ہے یہ تو تیرے حاضر ہونے کا وقت ہے۔ اس سے بڑھ کر حسرت کا کون سا وقت ہوگا کہ کام کا وقت نکل گیا اور تدارک مشکل ہو گیا، اب تو تو ہی مونس اور ہمدم ہے۔ ہم ہیں اور تو ہے، تیرے سوا نہ کوئی یار ہے نہ ساتھی اور غمخوار ہے اور حسرت و ندامت بہ زبانِ حال یوں کہے گی: ؎

چہچہے بلبلِ نالاں کے سنے ہنس ہنس کر   اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

نعوذ باللّٰه من جميع ما كرهه اللّٰه. اللهم اغفرلنا و تب علينا و وفقنا الصالح الأعمال قبل الموت وارزقنا التدارك قبل الفوت آمين يا مجيب الداعين، آمين. ”جَنْبٌ“ اور ”جَانِبٌ“ دونوں کسی شے کی جہت کے معنی میں ہیں جو محسوس ہو۔ ”جَنْبٌ“ کا اطلاق طاعت پر مجاز بہ استعارہ ہے، اس طرح سے کہ طاعت کو جہت سے تشبیہ دی۔ وجہ تشبیہ یہ ہے کہ طاعت و جہت کو اپنے اپنے صاحب سے تعلق ہوتا ہے، چنانچہ طاعت کو اللہ کے ساتھ تعلق ہے جس طرح کہ جہت کو اپنے صاحب سے تعلق ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ”فِيْ ذِكْرِ اللّٰهِ“ ہے۔ ذکر سے مراد قرآن شریف ہے اور اس پر عمل کرنا ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: ”فِيْ ثَوَابِ اللّٰهِ“[2] ہے۔ کسی نے کہا: ”فِيْ حَقِّ اللّٰهِ“ یا ”فِيْ أَمْرِ اللّٰهِ“ یا ”فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ“ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ جَنْۢبِ ﴾ قرب و جوار کے معنی میں ہے، یعنی ”فِيْ قُرْبِ اللّٰهِ وَجَوَارِهٖ“ اسی معنی سے ﴿ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ ﴾ [النساء: ٣٦] ”اور پہلو کے ساتھی سے“ ہے۔

اس قول کی بنا پر معنی یہ ہیں: اے میری حسرت! اس شے پر کہ میں نے اللہ کا قرب و جوار طلب کرنے میں کمی و قصور کیا، مراد بہشتِ عنبر سرشت ہے۔ امام ابن اعرابی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اس طریق میں جو اللہ کا طریق ہے، اس کی توحید سے اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا اقرار کرنے سے۔ اس قول کی بنا پر ﴿ جَنْۢبِ ﴾ بہ معنی جانب ہے۔[3] یعنی میں نے اس جانب میں کمی و تقصیر کی جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی طرف پہنچا دے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ”أَنَا فِيْ جَنْبِ فُلَانٍ“ یعنی میں فلاں کی رضا میں ہوں اور فلاں لین الجانب و الجنب ہے، یعنی راضی ہے۔ پھر کہا ہے کہ ”فَرَطَ فِيْ جَنْبِهٖ وَجَانِبِهٖ“ یعنی فلاں نے فلاں کے حق میں تقصیر کی۔ یہ باب کنایہ سے ہے۔

[1] تفسير البغوي (١٢٩/٧) [2] تفسير القرطبي (٢٧١/١٥) [3] فتح القدير (٦١٨/٤، ٦١٩)

جملہ ﴿ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے ﴿ فَرَّطْتُّ ﴾ کی ضمیر کی بنا پر، یعنی میں نے اللہ کے حق میں تقصیر کی اس حال میں کہ میں نہیں تھا، مگر ان میں سے جو دنیا میں اللہ کے دین سے اور اس کی کتاب اور رسول اور مومنین سے ٹھٹھا کرتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو اس بات نے کفایت نہ کی کہ اللہ کی طاعت کو ضائع کیا، یہاں تک کہ اہلِ طاعت سے ٹھٹھا کیا۔[1] پھر دوسرا قول نقل کیا: ﴿ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ یعنی اگر اللہ مجھے اپنے دین کی راہ بتاتا تو البتہ میں ان میں سے ہوتا جو شرک و معاصی سے بچتے ہیں۔ یہ قول ان کھوٹی حجتوں میں سے ہے جن کے ساتھ مشرک لوگ حجت پکڑتے ہیں اور ان باطل بہانوں میں سے ہے جن کے ساتھ وہ بہانہ کرتے ہیں، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا ﴾ [الأنعام: ١٤٨] ''یہ مشرکین (یوں) کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا۔'' چنانچہ یہ ایک حق کلمہ ہے جس سے باطل مراد لیتے ہیں۔ ان کا مادہ ہی ناقابل تھا، ورنہ ان سے کیا دشمنی تھی۔ اگر قولِ مذکور کے بجائے یوں کہتے تو بجا تھا۔

ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست   ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

جو کچھ ہے وہ ہمارے بے جوڑ ناموافق قد کی وجہ سے ہے، ورنہ تیری خلعت تو کسی بھی قد و قامت کے لیے چھوٹی نہیں ہے۔ ابو منصور نے کہا ہے کہ یہ کافر معتزلہ سے اللہ کی ہدایت کو زیادہ پہچاننے والا ہے اور اسی طرح سے یہ کفار ہیں جنھوں نے اپنے اتباع سے یوں کہا: ﴿ لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ﴾ [إبراهيم: ٢١][2] لیکن اس نے ہم سے اختیارِ ضلالت وغوایت جانا تو ہم کو مخذول (رسوا) اور بے یار و مددگار چھوڑ دیا اور ہدایت کی توفیق نہیں دی۔ معتزلہ کہتے ہیں: بلکہ ان کو ہدایت کی اور توفیق عطا فرمائی، لیکن وہ راہ یاب نہ ہوئے۔

پھر اللہ پاک نے ان کا تیسرا قول نقل فرمایا: ﴿ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ یعنی یا کہے جبکہ عذاب کو دیکھے کہ اگر میرے لیے دنیا کی طرف پھر جانا ممکن ہوتا تو میں ان لوگوں میں سے ہو جاتا جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں، اس کی توحید کرتے ہیں اور اپنے اعمال میں احسان و اخلاص کا برتاؤ رکھتے ہیں۔ ﴿ فَاَكُوْنَ ﴾ کا نصب یا تو اس لیے ہے کہ ﴿ كَرَّةً ﴾ پر معطوف ہے، اس لیے کہ وہ مصدر ہے، یا اس سبب سے ہے کہ اس تمنی کا جواب ہے جو ﴿ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً ﴾ سے سمجھی جاتی ہے۔ کلمۂ ﴿ اَوْ ﴾ کے ساتھ تعبیر کی، اس لیے کہ یہ بات بتانا منظور ہے کہ حسرت و حیرت کے مارے اور اس بات کی علت اور بہانہ جوئی سے جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، نفس ان قولوں سے خالی ہوگا۔ تو اب کلمۂ ﴿ اَوْ ﴾ تنویع کے لیے ہوگا، یعنی اس دن نفس جو باتیں کرے گا،

[1] تفسير الطبري (٢١/٣١٥)   [2] تفسير النسفي (٤/٦٠)

چنانچہ اس سے ان کی قسمیں بتانا منظور ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ﴿ أَوْ ﴾ مانعۃ الخلو ہو تو اب جمع جائز ہو گی، یعنی ان باتوں میں سے کوئی بات ضرور کہے گا یا سب کہے گا۔

پھر اللہ پاک نے اپنا جواب ذکر کیا جو اس نفسِ متمنی کو دے گا، کون سا نفس جو بغیر کسی وجہ سے زبردستی بہانہ جوئی کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ ﴾ یعنی پھر اللہ کی طرف سے اس کو کہا جائے گا: ﴿ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ ﴾ گویا نفسِ کافرہ نے کہا کہ اللہ نے مجھے ہدایت نہیں کی تو کہا جائے گا: کیوں نہیں؟ تیرے پاس تو واقعی میری آیتیں آئی تھیں جو تجھ کو راہ بتاتی تھیں۔ آیات سے مراد اتاری ہوئی آیتیں ہیں، یعنی قرآن شریف، پھر تو نے ان کو جھٹلایا، وہ اس کا یہ قول ہے کہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں ہیں اور تو نے ان پر ایمان لانے سے تکبر کیا اور اس تکذیب اور تکبر کے باوجود تو اُن میں سے تھا جو اللہ کا انکار کرنے والے ہیں۔

اللہ پاک نے ﴿ جَآءَتْكَ ﴾، ﴿ فَكَذَّبْتَ ﴾، ﴿ وَاسْتَكْبَرْتَ ﴾، ﴿ وَكُنْتَ ﴾ میں مذکر کا خطاب ذکر فرمایا، اس لیے کہ نفس کا اطلاق مذکر اور مونث پر ہوتا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: عرب لوگ کہتے ہیں: نفسِ واحد، یعنی انسانِ واحد۔ یا اس کو مذکر اس لیے کہا کہ وہ کافر شخص کو خطاب ہے۔ جمہور نے ان جگہوں میں بہ فتحِ تاء پڑھا ہے اور امام جحدری، ابوحیوہ اور یحییٰ بن یعمر رحمہم اللہ نے سب میں بہ کسرِ تاء پڑھا ہے۔ یہ قراءت امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کی صاحبزادی ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ (1)

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿60﴾ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۡ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْۗءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿61﴾ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۡ وَّهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿62﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿63﴾

اور آپ روزِ قیامت انھیں دیکھیں گے جنھوں نے (دنیا میں) اللہ پر جھوٹ باندھا کہ ان کے منہ کالے ہوں گے، کیا تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں؟ (60) اور جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا، اللہ انھیں ان کی کامیابی کے سبب نجات دے گا۔ انھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ

(1) فتح القدير (٦١٩/٤) فتح البيان (١٢٩/١٠۔١٣٧)

وہ غمگین ہوں گے 61 اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے 62 اسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی چابیاں ہیں، اور جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، وہی لوگ خسارہ اُٹھانے والے ہیں 63

اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے والوں اور ماننے والوں کا انجام:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک روزِ قیامت کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ اس میں کتنے چہرے تو سیاہ ہوں گے اور کتنے چہرے سفید ہوں گے۔ فرقہ والوں اور اختلاف کرنے والوں کے منہ تو سیاہ پڑ جائیں گے اور اہلِ سنت والجماعت کے چہرے سفید ہوں گے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

﴿ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ﴾ یعنی قیامت کے دن تو دیکھے گا ان لوگوں کو جو اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں کہ اللہ کے لیے شریک اور اولاد ہے، ان کے منہ اُن کے جھوٹ اور بہتان بازی کی وجہ سے سیاہ ہوں گے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾ یعنی کیا دوزخ از روئے قید خانہ اور لوٹ کر جانے کی جگہ غرور والوں کے لیے کافی نہیں ہے۔ ان کے لیے اس میں ذلت، رسوائی اور خواری ہے جو ان کے تکبر اور تجبر کے سبب سے ہے اور حق کے مطیع ہونے سے انکار کرنے کی وجہ سے ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک قیامت کے دن متکبر لوگ آدمیوں کی صورتوں میں چھوٹی چیونٹیوں کے مشابہ حشر کیے جائیں گے، ان پر ہر قسم کی ذلت اور خواری چڑھی ہوگی، یہاں تک کہ ایک آگ کی وادی میں ایک قید خانے میں داخل کیے جائیں گے، جس کو بولس کہتے ہیں، آگوں کی آگ سے اور اہلِ نار کے نچوڑ سے پلائے جائیں گے، یعنی طینۃ الخبال سے[1] (خبال کی اصل فساد ہے اور یہ افعال میں، بدنوں میں اور عقلوں میں ہوتا ہے۔ طینۃ الخبال کی تفسیر عصارۂ اہلِ نار سے کی گئی ہے، یعنی دوزخیوں کا نچوڑ پیپ، خون وغیرہ۔[2] كذا في مجمع البحار)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُنَجِّى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ یعنی اللہ ان لوگوں کو نجات دے گا جو ڈرتے رہے، اس سعادت اور کامیابی کے سبب سے جو اُن کے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی، اللہ کے نزدیک ان کو قیامت کے دن نہ کوئی برائی لگے گی اور نہ ہی وہ غم کھائیں گے۔ یعنی فزعِ اکبر ان کو غمگین نہ کرے گا، بلکہ وہ ہر خوف و گھبراہٹ سے دور اور بے خوف ہوں گے، ہر شر سے دور ہوں گے اور ہر خیر کو پانے والے ہوں گے۔

---

1. سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٩٢) مسند أحمد (١٧٩/٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٠٤٠)
2. مجمع بحار الأنوار (٨٠٧/٢)

اللہ تعالیٰ ہی خالق ومتصرف ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۙ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴾ یعنی اللہ پاک ساری اشیاء کا خالق اور رب اور مالک ہے اور ان میں تصرف کرنے والا ہے اور ہر شے اس کی تدبیر، غلبے اور حفاظت میں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَقَالِيْدُ ﴾ فارسی میں مفاتیح کو کہتے ہیں، یعنی کنجیاں۔[1] اسی طرح امام قتادہ، ابن زید اور سفیان بن عیینہ رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے واسطے آسمانوں اور زمین کے خزانے ہیں۔[2] دونوں قول کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ کاموں کی باگ ڈور اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اسی کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے حمد ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ اسی لیے اللہ جل وعلا نے یوں فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ یعنی اور وہ لوگ جو اللہ پاک کی حجتوں اور برہانوں کے منکر ہوئے، وہی خسارہ پانے والے ہیں۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک نہایت غریب حدیث روایت کی ہے، حالاں کہ اس کی صحت میں نظر ہے، لیکن ہم اس کو ذکر کرتے ہیں جیسے انھوں نے ذکر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ﴿ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ کی تفسیر پوچھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عثمان! کسی نے تجھ سے پہلے اس کے بارے میں مجھ سے نہیں پوچھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی تفسیر یہ ہے: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْأَوَّلِ وَالْآخِرِ وَالظَّاهِرِ وَالْبَاطِنِ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ يُحْيِي وَيُمِيتُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ» اے عثمان! جو اس کو دس بار کہے، جب وہ صبح کرے تو وہ چھ خصلتیں دیا جائے گا، ان میں سے پہلی یہ ہے کہ ابلیس اور اس کے لشکروں محفوظ کیا جائے گا۔

دوسری یہ ہے کہ اسے ایک قنطار اجر دیا جائے گا (''قنطار'' گیارہ سو اوقیہ کا ہوتا ہے اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ چار ہزار دینار کا ہوتا ہے اور ''قناطیر مقنطرة'' بارہ ہزار دینار ہوئے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک بیل کی کھال بھر کر سونا۔ ایک قول یہ ہے کہ قنطار مالِ کثیر ہے۔[3] كذا في مجمع البحار) تیسری یہ ہے کہ انھیں کے لیے جنت میں ایک درجہ بلند کیا جائے گا۔ چوتھی یہ ہے کہ حورِ عین سے اس کا نکاح کیا جائے گا۔ پانچویں یہ ہے کہ اس کے پاس بارہ فرشتے حاضر ہوں گے۔ چھٹی یہ ہے کہ اس شخص کی مثل اجر دیا جائے گا جس نے

[1] تفسیر الطبري (٥١١/٢١) [2] تفسیر الطبري (٣٢١/٢١) [3] مجمع بحار الأنوار (٣٢٥/٤)

قرآن وتورات، انجیل اور زبور کو پڑھا اور اس کے لیے اتنا ہی اَور۔ اے عثمان! اس کا اجر اس شخص جتنا ہے جس نے حج کیا اور اس کا حج قبول کیا گیا اور عمرہ کیا پھر اس کا عمرہ قبول کیا گیا، پھر اگر اسی دن مر گیا تو اس پر شہداء کی طابع (علامات) کی مہر کی جائے گی۔[1] (ورواه أبو يعلىٰ الموصلي من حديث يحيى بن حماد به مثله وهو غريب وفيه نكارة شديدة) والله أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ قیامت کے دن تو ان لوگوں کو دیکھے گا جنھوں نے اللہ پر جھوٹ بولا، اس طرح سے کہ اس کے لیے شریک ہے اور بیوی ہے اور اولاد ہے، ان کے منہ سیاہ ہوں گے، اس لیے کہ عذاب نے ان کو گھیر رکھا ہو گا اور اللہ کے غضب اور انتقام کے سبب سے جس کا وہ مشاہدہ کریں گے۔ جملہ ﴿ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَرَى ﴾ ﴿ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ﴾ میں عامل نہیں ہے یہ تو مبتداء اور خبر ہے۔[2] زیادہ بہتر یہ ہے کہ ﴿ تَرَى ﴾ اگر بصری رویت سے ہے تو جملہ ﴿ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ﴾ حالیہ ہو گا اور اگر قلبی رویت سے ہے تو ﴿ تَرَى ﴾ کا مفعولِ ثانی ٹھہرے گا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾ میں استفہام ان کے چہروں کے سیاہ ہونے کی تقریر اور اس کی تعلیل ہے۔ گویا یوں کہا ہے کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، اس لیے کہ ان کے لیے جہنم میں قرار گاہ اور جائے قیام ہے۔ "کبر" کہتے ہیں بطرِحق اور غمطِ ناس کو، جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہوا ہے۔[3] (بطرِحق یہ ہے کہ اللہ پاک نے جو اپنی توحید وعبادت کو حق ٹھہرایا ہے وہ اس کو باطل ٹھہراتا ہے۔ کسی نے کہا کہ حق کے وقت تجبر کرتا ہے، اس کو حق نہیں سمجھتا اور نہ اس کو قبول کرتا ہے[4] اور "غمط": استہانت اور استحقار (حقیر سمجھنا) کو۔[5] كذا في مجمع البحار)۔ غرضیکہ جو لوگ اللہ پاک کی طاعت وعبادت سے تکبر کرتے ہیں اور حق کو نہیں مانتے اور لوگوں کو حقیر جانتے ہیں، ان کی قیام گاہ جہنم ہے۔ اور اللہ ان لوگوں کو نجات دے گا جو شرک سے اور گناہوں سے بچے۔

﴿ بِمَفَازَتِهِمْ ﴾ میں حرفِ باء محذوف سے متعلق ہے اور وہ حال ہے موصول سے "أَيْ: مَتَلَبِّسِيْنَ بِمَفَازَتِهِمْ" یعنی اللہ ان کو جہنم سے نجات دے گا، اس حال میں کہ وہ اپنی کامیابی کی جگہ میں پہنچ جائیں گے، جو جنت ہے، اس طرح سے کہ اس میں رکھے جائیں گے۔ جمہور نے ﴿ بِمَفَازَتِهِمْ ﴾ کو واحد پڑھا ہے مصدر میمی کی

---

① تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣٢٥٤، ٣٢٥٥) تفسير ابن كثير (٤/ ٧٨، ٧٩) اس کی سند میں "اغلب بن تمیم" سخت ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١/ ١٠١)

② تفسير القرطبي (١٥/ ٢٧٤) ③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١)

④ مجمع بحار الأنوار (١/ ١٨٢) ⑤ مجمع بحار الأنوار (٤/ ٦٥)

بنا پر۔ "فَوْز" بھلائی کے ساتھ کامیاب ہو جانے اور شر سے نجات پا جانے کو کہتے ہیں۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مَفَازَةٌ" بروزن "مَفْعَلَةٌ" ہے "فوز" سے اور "فوز" بہ معنی سعادت ہے اور اگر "مفازة" جمع کیا جائے تو بہتر ہے، جیسے: سعادت و سعادات کہتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ ان کو "فوز" کے ساتھ نجات دے گا، یعنی ان کے آگ سے نجات اور جنت میں فائز ہونے کے ساتھ۔ امام حمزہ، کسائی اور ابوبکر رحمہم اللہ نے ﴿ بِمَفَازَتِهِمْ ﴾ جمع کے ساتھ پڑھا ہے، "مفازة" کو جمع کیا باوجود اس کے مصدر ہونے کے بہ سبب اختلافِ انواع کے۔[1]

کسی نے کہا یہاں مضاف محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "بِدَوَاعِي مَفَازَتِهِمْ أَوْ بِأَسْبَابِهَا"۔ "مَفَازَةٌ" بہ معنی "مَنْجَاةٌ" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی کچھ حاجت نہیں ہے، اس لیے "مَفَازَةٌ" سے مراد فلاح ہے اور ﴿ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ ﴾ اور ﴿ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ کے جملے ﴿ بِمَفَازَتِهِمْ ﴾ کی تفسیر کرتے ہیں۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ ان کا "مفازة" کیا ہے؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ ان کا "مفازة" یہ ہے کہ نہ ان کو برائی چھوئے گی اور نہ وہ غم کھائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ دونوں جملے محلِ نصب میں ہیں بنا برحال ﴿ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ﴾ سے، یعنی اللہ ان کو نجات دے گا، اس حال میں کہ ان سے برائی اور غم دور کیے جائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بِمَفَازَتِهِمْ ﴾ میں حرفِ باء سببیہ ہے، یعنی اللہ ان کی فوز کے سبب سے ان کو نجات دے گا مع اس کے کہ ان کو برائی نہ لگے گی اور نہ اُن کے دلوں کو غم پہنچے گا، اس لیے کہ وہ اللہ کے ثواب سے راضی ہو گئے اور اس کے عقاب سے امن میں ہو گئے۔

پھر جب اللہ پاک نے وعد و وعید میں کلام کو طول دیا تو الوہیت اور توحید کے دلائل کی طرف متوجہ ہوا تو فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۙ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴾ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان اشیاء میں سے جو دنیا اور آخرت میں موجود ہیں ہر شے کا، وہ کوئی سی شے ہو، بغیر کسی فرق کے پیدا کرنے والا ہے۔ اس میں معتزلہ وثنویہ پر رد ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ شر کا اور بندوں کے افعال کا خالق نہیں ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ کہا ہے، جس میں خیر وشر اور کفر وایمان شامل ہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ ہر شے پر ﴿ وَّكِيْلٌ ﴾ ہے، یعنی ہر شے میں تصرف کا متولی وہی ہے، ساری اشیاء اسی کی طرف سپرد کی گئی ہیں، چنانچہ وہ بغیر کسی شریک کے ان کی حفاظت اور تدبیر کے ساتھ قائم ہے۔

جملہ ﴿ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ مستانفہ ہے۔ مثلاً کسی نے کہا ہے کہ وہ ہر شے پر وکیل کیوں کر ہے؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں۔ یہ کلام بابِ کنایہ سے ہے، اس لیے کہ خزانوں کا حافظ اور مدبّر وہی شخص ہوتا ہے جو ان کی کنجیوں کا مالک ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ وہ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا پورے طور پر مالک ہے اور ان پر با اختیار ہے۔ اور ظاہر پر محمول کرنا

[1] فتح القدير (٦٢٠/٤)

زیادہ مناسب ہے۔ اس جگہ ﴿ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ سے مراد آسمان و زمین کی کنجیاں اور رزق و رحمت کی کنجیاں ہیں، جیسا کہ امام مقاتل اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہما نے کہا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ "مَفَاتِيْحُهَا" لیث نے کہا ہے کہ "مِقْلَادٌ" بہ معنی خزانہ ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کے خزانے ہیں۔ امام ضحاک اور سدی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ آسمانوں کے خزائن مطر، یعنی بارش ہے اور زمین کے خزائن نبات ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ یہ کلمے ہیں: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ"

امام ابویعلیٰ اور یوسف قاضی رحمہ اللہ کے الفاظ ان کی سنن میں اور ابوالحسن القطان، ابن السنی، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہ اللہ نے عثمان رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مرفوعاً روایت کیے گئے ہیں: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ، يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"[2] اس کے اور کئی طریق ہیں۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے اس کے سوا اور کئی قول مروی ہیں۔ اس قول کی بنیاد پر معنی یہ ہیں کہ یہ کلمے اللہ کے لیے ہیں، ان کے ساتھ اس کی توحید وتمجید کی جاتی ہے اور یہ خیر سماوات وارض کی کنجیاں ہیں، جو کوئی ان کلمات کو کہے گا تو وہ اس خیر کو پہنچے گا۔ ﴿ مَقَالِيْدُ ﴾ کا واحد "مِقْلَدٌ وَمِقْلَادٌ" ہے۔ یا اس کے لفظ سے اس کا کوئی واحد نہیں ہے مثل "أَسَاطِيْرُ" کے اور "إِقْلِيْدٌ وَأَقَالِيْدُ" بھی کہتے ہیں۔ یا اس کلمے کی اصل فارسی ہے، اس قول کی بنا پر کہ جمع ہے "إِقْلِيْدٌ" کی جو "إِكْلِيْدٌ" کا معرب ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أقليد" مفتاح ہے۔ پھر کہا ہے کہ جمع ﴿ مَقَالِيْدُ ﴾ ہے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ یعنی جن لوگوں نے قرآن کے ساتھ اور باقی آیتوں کے ساتھ کفر کیا، حالاں کہ وہ اللہ پاک پر اور اس کی توحید پر دال ہیں تو ایسے لوگ ہی خسارے اور نقصان میں ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس کفر کے سبب سے آگ کی طرف گئے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جملہ ﴿ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ﴾ سے متصل ہے اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے، وہ کلامِ معترضہ ہے۔[4]

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی یہ اس پر معطوف ہے۔ احد المتقابلین کے عطف بر دیگر کی طرح۔ اگرچہ معطوف جملہ اسمیہ ہے اور معطوف علیہ جملہ فعلیہ، چنانچہ یہ اختلاف عطف کے صحیح ہونے کو مانع نہیں ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ حسنِ عطف سے خالی ہے۔ انتہی۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ اصل کلام یوں ہوا: "يُنَجِّي اللّٰهُ

[1] تفسير الطبري (٣٢١/٢١) فتح القدير (٦٢٢/٤)
[2] الدر المنثور (٢٤٣/٧، ٢٤٤)
[3] الصحاح للجوهري (٩٠/٣)
[4] تفسير الجلالين (٦١٥/١)

الْمُتَّقِيْنَ بِمَفَازَتِهِمْ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا أُولٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ" یہ عطف ہے احد المتقابلین کا دوسرے پر، اس لیے کہ احدالجملتین کی مفردات معنی کے لحاظ سے دوسری کے مقابل ہیں۔

یہ جملے جب کہ یہ بات بیان کرنے کے لیے لائے گئے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ تقوی اور اہلِ کفر میں سے ہر ایک کو اُن کے افعال کے مطابق جزا دے گا تو اُن کے درمیان وہ جملہ معترضہ لایا گیا جو اس بات کی تاکید کرتا ہے، کیوں کہ جب اللہ تعالیٰ ہر شے کا خالق ہوا مالک ہوا تو اس سے یہ لازم آیا کہ اللہ تعالیٰ مکلفین کے اعمال وافعال سے پوری طرح باخبر ہے اور ان کو جزا دینے والا ہے۔ یہ بات کہ ﴿ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ﴾ جملہ فعلیہ ہے اور ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ جملہ اسمیہ، اور اسمیہ کا فعلیہ پر عطف حسین نہیں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ظاہر کا مقتضا یوں تھا کہ "وَيُهْلِكُ الْكَافِرِيْنَ" کہا جاتا، مگر ایسا نہ کہا اور طرزِ کلام کو دو نکتوں کے لیے بدلا:

پہلا نقطہ یہ ہے کہ یہ بات بتانا مقصود ہے کہ متقیوں کو جو بھلائی پہنچی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اس کے فضل اور رحمت کے سبب سے اور کافروں کو جو برائی پہنچی وہ ان کی اپنی جانوں کی طرف سے ہے، اس لیے کہ انھوں نے اپنے حصے اور نصیب کا خود نقصان وخسران کیا، اپنے سوئے اختیار (برا راستہ اختیار کرنے) کے سبب سے۔ اور دوسرے نکتے کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں کرم سے متقین کے ساتھ جو وعدہ ہے اس کی تصریح فرمائی اور اس کی نسبت اپنی ذاتِ مقدس کی طرف کی اور کفار کی وعید کی تصریح نہ فرمائی، اسے اپنی طرف نسبت کرنے کا کیا ذکر! دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ قولہ تعالیٰ: ﴿ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴾ سے متصل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا کمالِ قدرت وحکمت ایسا ہے کہ آسمان وزمین میں اسی اکیلے کا تصرف ہے اور وہی ان کا حافظ اور نگہبان ہے اور جو لوگ اس کے منکر ہوئے تو وہی مکمل طور پر زیاں کار ہیں۔

پھر اگر ﴿ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ اللہ پاک کی قدرت سے کنایہ ہو گا تو ﴿ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد قدرتِ الٰہی کے دلائل ہوں گے اور اگر ﴿ مَقَالِيْدُ ﴾ کی تفسیر حدیثِ مذکور کے ساتھ کی جائے تو ﴿ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد توحید اور تمجید باری تعالیٰ کے کلمات ٹھہریں گے۔ بالجملہ جب کہ کفار نے نبی اکرم ﷺ کو بتوں کی پرستش کی طرف بلایا، جس پر وہ قائم تھے تو اللہ پاک نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے کہہ دیں:[1]

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ

[1] فتح البیان (۱۲/۱۳۸-۱۴۰)

يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطۡوِيّٰتٌۢ بِيَمِيۡنِهٖ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۶۷﴾

کہہ دیجیے: اے جاہلو! کیا تم مجھے غیر اللہ کے بارے میں حکم دیتے ہو کہ میں (ان کی) عبادت کروں؟ 64 اور بلاشبہ آپ کی طرف اور ان لوگوں (نبیوں) کی طرف، جو آپ سے پہلے ہوئے، (یہ) وحی کی گئی کہ اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے اعمال ضرور ضائع ہو جائیں گے اور آپ ضرور خسارہ اُٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے 65 بلکہ آپ اللہ ہی کی عبادت کریں اور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں 66 اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی، جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے، اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہو گی اور آسمان بھی اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوں گے، وہ پاک ہے اور اس شرک سے بالا تر ہے جو وہ کرتے ہیں 67

شرک سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، لہٰذا اکیلے اللہ کی عبادت بجا لاؤ:

اللہ کے فرمان کے مطابق اللہ کا دایاں ہاتھ کہنا چاہیے اور بایاں نہیں کہنا چاہیے۔ انتہٰی. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿ قُلۡ اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ تَاۡمُرُوۡٓنِّىۡۤ اَعۡبُدُ اَيُّهَا الۡجٰهِلُوۡنَ ﴾ کے سببِ نزول میں وہ روایت ذکر کی گئی ہے جو ابن ابی حاتم رحمہ اللہ وغیرہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ مشرکوں نے اپنی جہالت اور نادانی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معبودوں کو پوجیں اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معبود کو پوجیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلَقَدۡ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ وَاِلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴾[1] یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلَوۡ اَشۡرَكُوۡا لَحَبِطَ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴾ [الأنعام: ۸۸] ''اور اگر فرضاً یہ حضرات بھی شرک کرتے تو جو کچھ اعمال یہ کرتے تھے، وہ سب اکارت ہو جاتے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ بَلِ اللّٰهَ فَاعۡبُدۡ وَكُنۡ مِّنَ الشّٰكِرِيۡنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی اور وہ لوگ جنھوں نے تیری پیروی کی ہے اور تجھے سچا مانا ہے، اللہ وحدہ لا شریک لہ کے لیے اخلاصِ عبادت کرو۔

مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر شناسی نہیں کی:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖ ۖ وَالۡاَرۡضُ جَمِيۡعًا قَبۡضَتُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ﴾ یعنی مشرکوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے، جبکہ اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجا، حالاں کہ وہ ایسا عظیم ہے

[1] تفسیر ابن کثیر (۷۹/٤)

کہ اس سے بڑھ کر کوئی عظیم نہیں اور وہ ہر شے پر قادر ہے اور ہر شے کا مالک ہے اور ہر شے اس کے قہر اور قدرت کے ماتحت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قریش کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تعظیم نہ کی اس کی جیسا کہ اس کی تعظیم کرنے کا حق ہے۔ امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر وہ اس کی قدر کرتے جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے تو اس کی تکذیب نہ کرتے۔

امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں روایت کی ہے کہ ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ کفار ہیں جو اس کی قدرت پر ایمان لائے کہ اس کو ان پر قدرت ہے۔ چنانچہ جو کوئی اس پر ایمان لائے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے تو یقیناً اس نے اللہ کی قدر کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے اور جو اس پر ایمان نہ لائے تو اس نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔[2] اس آیتِ کریمہ کے متعلق بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، طریق اس میں اور اس کے مثل اَور آیتوں میں مذہب سلف کا ہے، وہ یہی ان کا امرار ہے، جیسے وہ آئی ہیں، بغیر تکییف وتحریف کے:

① امام بخاری رحمہ اللہ نے ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ کی تفسیر میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ احبار میں سے ایک حبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے محمد! بے شک ہم اپنی کتاب میں پاتے ہیں کہ اللہ عزوجل آسمانوں کو ایک انگلی پر رکھے گا اور زمینوں کو ایک انگلی پر رکھے گا اور درختوں کو ایک انگلی پر رکھے گا اور ماء وثریٰ کو ایک انگلی پر رکھے گا اور باقی خلق کو ایک انگلی پر رکھے گا، پھر کہے گا: میں بادشاہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے یہاں تک کہ حبر کے قول کی تصدیق کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچلیاں ظاہر ہوگئیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ... الآية ﴾[3]

(ورواه البخاري أيضا في هذا الموضع من صحيحه، والإمام أحمد ومسلم، والترمذي والنسائي في التفسير من سننيهما كلهم من حديث سليمان بن مهران الأعمش عن إبراهيم عن عبيدة عن ابن مسعود رضي الله عنه بنحوها)

② امام احمد رحمہ اللہ نے عن علقمہ عن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: اے ابو القاسم! کیا آپ کو یہ بات پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ خلائق کو ایک انگلی پر اٹھائے گا اور آسمانوں کو ایک انگلی پر اٹھائے گا اور زمینوں کو ایک انگلی پر اور درختوں کو ایک انگلی پر اور آب وثریٰ کو ایک انگلی پر؟ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچلیاں ظاہر ہوگئیں اور اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ

---

① تفسير الطبري (١١/٥٢٤) ② تفسير الطبري (٢١/٣٢٣، ٣٢٤)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٦) مسند أحمد (١/٤٢٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٣٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٤٦)

حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ... الآية ﴾[1] (وهكذا رواه البخاري ومسلم والنسائي من طرق عن الأعمش به)

③ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا: اے ابو القاسم! تو کس طرح کہتا ہے جس دن کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آسمان کو اس پر رکھے گا اور انگشتِ سبابہ سے اشارہ کیا اور زمین کو اس پر اور پہاڑوں کو اس پر اور باقی خلائق کو اس پر اور ہر ایک میں اپنی انگلیوں سے اشارہ کرتا تھا، کہا: اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ... الآية ﴾[2] (فكذا رواه الترمذي في التفسير عن عبد الله ابن عبد الرحمن الدارمي عن محمد بن الصلت عن أبي جعفر عن أبي كدينة يحيىٰ بن المهلب عن عطاء بن السائب عن أبي الضحىٰ مسلم بن صبيح به وقال: حسن صحيح غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه)

④ پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ زمین کو قبض کرے گا اور آسمان کو اپنے داہنے ہاتھ میں لپیٹے گا۔ پھر فرمائے گا کہ میں ہوں بادشاہ، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ؟[3] (تفرد به من هذا الوجه ورواه مسلم من وجه آخر)

⑤ امام بخاری رحمہ اللہ نے دوسری جگہ عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبي ﷺ روایت کیا ہے کہ بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن زمینوں کو ایک انگلی پر قبض کرے گا اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں ہوں گے۔ پھر فرمائے گا: میں ہوں بادشاہ۔[4] (تفرد به أيضا من هذا الوجه ورواه مسلم من وجه آخر، ورواه الإمام أحمد من طريق أخرى بلفظ آخر أبسط من هذا السياق وأطول عن ابن عمر رضی اللہ عنہما)

⑥ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن منبر پر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ اور آپ ﷺ اپنے ہاتھ سے یوں اشارہ فرماتے تھے: اس کو کبھی آگے لے جاتے تھے اور کبھی پیچھے لاتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ اپنے نفس کی تمجید کرتا ہے کہ میں جبار ہوں، میں متکبر ہوں، میں بادشاہ ہوں، میں عزیز ہوں، میں کریم ہوں۔ منبر رسول اللہ ﷺ کو لیے ہوئے کانپا، یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ البتہ وہ آپ ﷺ کو گرا

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٦) مسند أحمد (٣٧٨/١) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٤٧/٦)

② مسند أحمد (٣٢٤/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٤٠)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٧)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٨)

دے گا۔[1] (وقد رواه مسلم والنسائي وابن ماجه من حديث عبدالعزيز بن أبي حازم، زاد مسلم ويعقوب بن عبد الرحمن كلاهما عن أبي حازم عن عبيد الله بن مقسم عن ابن عمر رضی اللہ عنہما به نحوه)

اس حدیث کے بارے میں عبید اللہ بن مقسم سے مسلم کی روایت ان الفاظ میں ہے کہ اس نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف نظر کی کہ نبی اکرم ﷺ کی کیسی حکایت کرتے تھے، کہا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے آسمانوں اور اپنی زمینوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑے گا اور فرمائے گا: میں بادشاہ ہوں اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں کی کبھی بند کرتے تھے اور کبھی کھولتے ہے۔ میں بادشاہ ہوں، یہاں تک کہ میں نے منبر کی طرف دیکھا تو وہ اپنے نچلے حصے کی شے سے ہلتا تھا، یہاں تک کہ البتہ میں کہتا تھا: کیا وہ رسول اللہ ﷺ کو لے کر گرنے والا ہے۔[2]

7 امام بزار رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ یہاں تک کہ ﴿سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ تک پہنچے۔ "فَقَالَ: اَلْمِنْبَرُ هٰكَذَا فَجَاءَ وَذَهَبَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ. والله أعلم"۔ یعنی پس منبر یوں ہوگیا، پھر آیا اور گیا تین بار۔ مطلب یہ ہے کہ تین بار منبر آگے کو آیا، پھر پیچھے ہوگیا۔[3] (وقد رواه الإمام الحافظ أبو القاسم الطبراني من حديث عبيد بن عمير عن عبدالله بن عمرو رضی اللہ عنہما وقال: صحيح)

8 امام طبرانی رحمہ اللہ نے معجم کبیر میں سیدنا جریر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ سے فرمایا: میں تم پر سورۃ الزمر کی آیتیں پڑھنے والا ہوں، چنانچہ پس جو کوئی تم میں سے روئے گا تو اس کے لیے جنت واجب ہوگی۔ پھر آپ ﷺ نے ان کو پڑھا: ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ سے لے کر آخر سورت تک۔ چنانچہ ہم میں سے بعض تو روئے اور بعض نہیں روئے۔ پھر جو نہ روئے انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! البتہ ہم نے بہت کوشش کی ہم روئیں، مگر رو نہ سکے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لو اب میں ان کو تم پر پڑھتا ہوں۔ "فَمَنْ لَّمْ يَبْكِ فَلْيَتَبَاكَ"، یعنی اب جس کو رونا نہ آئے تو چاہیے کہ رونے کی صورت بنالے۔[4] (هذا حديث غريب جدا)

9 اس سے بڑھ کر غریب وہ حدیث ہے جس کو امام طبرانی رحمہ اللہ نے معجم کبیر میں ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تین خصلتیں ہیں جن کو میں نے اپنے بندوں سے غائب کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ان کو دیکھ لیتا تو کوئی برائی نہ کرتا۔ اگر میں اپنا پردہ کھول دیتا اور وہ مجھے دیکھ لیتا، یہاں تک کہ یقین کر لیتا اور جان لیتا کہ میں اپنی خلق کے ساتھ کس طرح کروں گا، جب کہ میں ان کے پاس

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٨) مسند أحمد (٧٢/٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٠٠/٤) سنن ابن ماجه (٤٢٧٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٨)

[3] مسند البزار (٢٢١/٢) المعجم الكبير (٣٥٢/١٢) اس کی سند میں "عباد بن میسرہ" متکلم فیہ راوی ہے۔

[4] المعجم الكبير (٣٤٨/٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه بكر بن خنيس وهو متروك" (مجمع الزوائد: ٢٢٥/٧)

آؤں گا اور آسمانوں کو اور زمینوں کو اپنے ہاتھ میں قبض کرلوں گا، پھر کہوں گا: میں بادشاہ ہوں۔کون ہے وہ جس کے واسطے میرے سوا بادشاہی ہے۔ پھر میں ان کو دکھاؤں گا جنت اور وہ شے جو میں نے اس میں ہر قسم کی خیر سے ان کے لیے تیار کر رکھی ہے۔ پھر وہ اس کا یقین کرلیں گے اور میں ان کو نار دکھاؤں گا اور وہ شے جو میں نے اس میں اُن کے لیے ہر قسم کے شر سے تیار کر رکھی ہے، پھر وہ اس کا یقین کرلیں گے،لیکن عمداً میں نے اس کو ان سے غائب کر دیا، تا کہ میں جانوں کہ وہ مجھے کیسا جانتے ہیں اور یقیناً میں نے اس کو ان کے لیے بیان کر دیا ہے۔[1] (وهذا إسناد متقارب وهي نسخة تروى بها أحاديث جمة والله أعلم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ ہمزۂ استفہام انکار توبیخی کے لیے ہیں اور حرفِ فاء مقدر پر عطف کے لیے ہے جس طرح کہ اس کے نظائر میں ہوتا ہے اور ﴿ أَعْبُدُ ﴾ سے ﴿ أَفَغَيْرَ ﴾ منصوب ہے اور ﴿ أَعْبُدُ ﴾ ﴿ تَأْمُرُوٓنِّيٓ ﴾ کا معمول ہے بر تقدیر ''أن'' مصدریہ کے۔ پھر جب وہ حذف کیا گیا تو اس کا عمل باطل ہوگیا، اصل یہ ہے: ''أَفَتَأْمُرُونِّي أَنْ أَعْبُدَ غَيْرَ اللّٰهِ'' (قاله الكسائي وغيره) یعنی کیا پھر تم مجھے امر کرتے ہو ان نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد جو اللہ تعالیٰ کے انفراد اور توحید پر دال ہیں کہ میں اللہ کے غیر کو پوجوں۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ تَأْمُرُوٓنِّيٓ ﴾ سے ﴿ أَفَغَيْرَ ﴾ منصوب ہو اور ﴿ أَعْبُدُ ﴾ اس سے بدلِ اشتمال ہو اور ''أنْ'' بھی اس کے ساتھ مضمر ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ فعل مقدر سے ﴿ أَفَغَيْرَ ﴾ منصوب ہو۔ ''أَيْ: أَفَتُلْزِمُونِي غَيْرَ اللّٰهِ أَيْ: عِبَادَةَ غَيْرِ اللّٰهِ أَوْ أَعْبُدَ غَيْرَ اللّٰهِ''

جمہور نے ﴿ تَأْمُرُوٓنِّيٓ ﴾ پڑھا ہے، اس طرح سے کہ نونِ رفع کو نونِ وقایہ میں ادغام کیا ہے، اس اختلاف کے ساتھ جو اُن کے درمیان ہے، حرفِ یاء کے فتح میں اور اس کے ساکن کرنے میں۔ اور نافع نے ''تَأْمُرُوْنِيَ'' بہ نون خفیفہ و فتحِ یاء اور ابن عامر نے ''تَأْمُرُوْنَنِيْ'' بہ فکِ ادغام وسکونِ یاء پڑھا ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرف بلایا کہ ان کو مال عطا کریں تو وہ مکے میں سب سے بڑھ کر غنی، یعنی مالدار ہو جائیں اور وہ جس عورت سے چاہیں اس کے ساتھ ان کا نکاح کر دیں اور وہ اُن کی ایڑی کو روندیں، یعنی سب ان کے فرماں بردار ہو کر اُن کے پیچھے اردلی میں چلیں۔ پھر قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے محمد! یہ سب تیرے لیے ہے، تا کہ تو ہمارے معبودوں کو برا کہنے سے باز رہے اور تو اُن کا

---

[1] المعجم الكبير (٢٩٤/٣) تفسير ابن كثير (٧٩/٤-٨١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔''محمد بن اسماعیل بن عیاش'' کا اپنے باپ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسير القرطبي (٢٧٦/١٥) فتح القدير (٦٢٢/٤)

ذکر برائی سے نہ کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہاں تک کہ میں دیکھوں کہ میرے رب کی طرف سے میرے پاس کیا آتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ وحی کی: ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ إلى آخر السورة اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ ﴾ تا ﴿ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾[1] (أخرجه ابن مردويه)

﴿ لَقَدْ ﴾ میں اور ﴿ لَىِٕنْ ﴾ میں حرفِ لام قسم مقدر پر دال ہے۔ "أَيْ: وَاللّٰهِ لَقَدْ" اور "وَاللّٰهِ لَئِنْ" اور ﴿ اُوْحِيَ ﴾ کا نائب فاعل ﴿ اِلَيْكَ ﴾ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا نائب فاعل جملہ قسم ثانی مع اپنے جواب کے ہے: "أَيْ: أُوْحِيَ إِلَيْكَ هٰذَا الْكَلَامُ" یعنی ﴿ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾۔ کسی نے کہا ہے کہ نائب فاعل محذوف ہے اور سیاق اس پر دال ہے۔ "أَيْ: أُوْحِيَ إِلَيْكَ التَّوْحِيْدُ" اور ﴿ لَيَحْبَطَنَّ ﴾ اور ﴿ وَلَتَكُوْنَنَّ ﴾ کا حرفِ لام قسمِ ثانی کے جواب میں واقع ہے۔ اور قسمِ ثانی مع اپنے جواب کے قسمِ اول کا جواب ہے اور جواب شرط کا محذوف ہے، اس لیے کہ قسم کا جواب اس پر دال ہے۔ معنی یہ ہیں: قسم ہے اللہ کی! البتہ واقعی وحی کی گئی تیری طرف اور اُن رسولوں کی طرف جو تجھ سے پہلے تھے، قسم ہے اللہ کی! البتہ اگر تو اے محمد! بالفرض شرک کرے گا تو البتہ تیرا عمل ضائع جائے گا اور تو خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائے گا۔

اب رہی یہ بات کہ جن کی طرف ﴿ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ وحی کی گئی ہے، وہ ایک جماعت ہیں، یعنی نبی ﷺ اور آپ سے پہلے کے پیغمبر تو ﴿ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ ﴾ صیغۂ مفرد کے ساتھ کیسے درست ہوگا، بلکہ ظاہر یہ تھا کہ صیغۂ جمع کے ساتھ "لَئِنْ أَشْرَكْتُمْ" کہا جاتا؟ تو اس کا جواب یوں دیا ہے کہ یہاں تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل عبارت یہ ہے: "أُوْحِيَ إِلَيْكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ... الخ وَإِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ مِثْلُهُ" یعنی تیری طرف وحی کی گئی ہے کہ اگر تو شرک کرے گا تو تیرا عمل اکارت جائے گا اور تو خاسرین سے ہو جائے گا اور ان میں سے ہر ایک کی طرف وحی کی گئی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا... الخ جس طرح کہ ایک جماعت یوں کہے کہ "كَسَانَا الْأَمِيْرُ حُلَّةً"، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ امیر نے ہم میں سے ہر ایک کو جوڑا پہنایا، اسی طرح یہاں بھی ہے تو اب معنی ٹھیک ہوگئے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تیری طرف اور تجھ سے پہلے کے نبیوں کی طرف توحید کی وحی کی گئی۔ اور بہ دلالتِ سیاق توحید یہاں سے محذوف ہے۔[2]

پھر کہا: "لَئِنْ أَشْرَكْتَ يَا مُحَمَّدُ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ" یہ خطاب خاص نبی اکرم ﷺ کو ہے۔ غرضیکہ اللہ پاک کو شرک کی مذمت اور شدت بیان کرنا منظور ہے، چنانچہ اس کو تعریض کے پیرائے میں ادا کیا۔ خطاب تو پیغمبروں کو فرمایا اور مراد اُن کے سوا اور لوگ ہیں، اس لیے کہ اللہ پاک نے پیغمبروں کو شرک سے محفوظ و معصوم رکھا ہے۔ اس

[1] تفسير الطبري (٦٦٢/٢٤) الدر المنثور (٢٤٥/٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو "صحیح" کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح السيرة النبوية: ٢٠٥/١)

[2] تفسير القرطبي (٢٧٦/١٥)

طرزِ خاص پر بیان کرنے کا مقصد بندوں کو شرک سے ڈرانا ہے، کیوں کہ جب شرک فرض اور تقدیر کے طور پر انبیاء کے اعمال کو ضائع کرنے کا موجب ہے تو ان کے سوا ان کی اُمتوں کے اعمال کو تو بہ طریقِ اولیٰ ضائع کر دے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے، اس لیے کہ ان سے شرک کا ہو جانا، دوسرے لوگوں کی نسبت بہت بڑا گناہ ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، یعنی انبیاء کو خطاب تعریض کے طور پر ہے اور مراد اُن کی اُمتیں ہیں۔ جو کوئی ان میں سے شرک کرے گا، اس کے عمل باطل ہو جائیں گے، مگر یہ آیت شرک پر مرنے کے ساتھ مقید ہے، جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة: ٢١٧] ''اور تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے پلٹ جائیں اور اسی کفر کی حالت میں مریں، ان کے اعمالِ دنیوی اور اخروی سب غارت ہو جائیں گے۔ یہ لوگ جہنمی ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں ہی رہیں گے۔''

پھر اللہ پاک نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی توحید کا حکم کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ﴾ اس میں اس لحاظ سے مشرکوں کا رد ہے کہ انھوں نے آپ ﷺ کو بت پوجنے کا حکم کیا تھا۔ رد کی وجہ وہ قصر و حصر ہے جس کو اللہ کا اسمِ مبارک پہلے رکھنا ظاہر کرتا ہے، یعنی تو ان کی ایک بھی نہ سن اور اکیلے اللہ ہی کو پوج۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسمِ مبارک ﴿اللّٰهَ﴾ ﴿فَاعْبُدْ﴾ ''أعبُدْ'' سے منصوب ہے، یعنی اس کا مفعول مقدم ہے۔ کہا: اس میں بصریوں اور کوفیوں کے درمیان کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یہ اضمارِ فعل منصوب ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے، یعنی اس کا فعلِ ناصب ''أُعبُدْ'' محذوف ہے جس کی تفسیر ﴿فَاعْبُدْ﴾ مذکور کر رہا ہے، پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿فَاعْبُدْ﴾ کا حرف مجازاۃ کے لیے ہے (رد لما أمروه به من عبادة آلهتهم كأنه قال: لا تعبد ما أمروك بعبادته بل إن عبدت فاعبد الله فحذف الشرط وجعل تقديم المفعول عوضا عنه.[1] ذكره النسفي)۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زائد ہے۔[2] (ابو البقاء بھی کلیات میں اسی کے قائل ہیں)[3]

امام عطاء اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿فَاعْبُدْ﴾ کے معنی ''وَحِّدْ'' ہیں،[4] یعنی تو اللہ کی توحید کر اس لیے کہ اللہ کی عبادت صرف اس کی توحید کے ساتھ ہی درست ہوتی ہے۔ خطیب نے کہا ہے کہ ﴿بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ﴾ معطوف ہے مقدر پر جس پر سیاقِ کلام دال ہے۔ ''أَيْ: فَلَا تُشْرِكْ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ''، یعنی تو شرک مت کر، بلکہ اللہ ہی کو پوج۔ ﴿وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے جو تجھ پر یہ انعام فرمایا ہے کہ توحید کی طرف

[1] تفسير النسفي (٤/٦٢) [2] تفسير القرطبي (١٥/٢٧٧) [3] كتاب الكليات (١/٦٧٨) [4] فتح القدير (٤/٦٢٣)

اور اپنے دین کی طرف بلانے کی تجھے ہدایت کی اور تجھے اپنی رسالت کے لیے خاص کیا تو تُو اس انعام کا شکر ادا کر۔

﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ ("أَيْ: مَاقَدَرُوْا عَظْمَتَهُ فِيْ أَنْفُسِهِمْ حَقَّ تَعْظِيْمِهِ"[1] كذا قال البيضاوي۔

"قدر" مخفف و مشدد ایک ہی معنی میں ہے، لیکن تقدیر کے معنی چوں کہ معرفت اور علم کی طرف راجع ہیں، اس لیے تقدیرِ مضاف کی ضرورت ہوئی، یعنی اپنے جی میں اللہ کی عظمت کا اندازہ نہ کیا، جیسا کہ اس کی عظمت کا حق ہے) یعنی مشرکوں نے اللہ کو نہیں پہچانا، جیسا اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی تعظیم نہ کی، جیسا کہ اس کی عظمت کا حق ہے، جبکہ اس کے پاس اس کے غیر کو شریک کیا۔ یہ اس قول سے ماخوذ ہے کہ "فُلَانٌ عَظِيْمُ الْقَدْرِ" اللہ پاک نے مشرکوں کو جو اس صفت کے ساتھ موصوف کیا تو وہ اس لیے کہ انھوں نے غیر اللہ کو پوجا اور اس کے رسول ﷺ سے کہا کہ وہ بھی شرک میں ان کی طرح ہو جائیں۔ امام حسن، ابو حیوہ اور عیسی بن عمر رحمہم اللہ نے "قَدَّرُوْا" بہ تشدید دال پڑھا ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے اپنی عظیم قدرت اور جلالتِ شان سے آگاہ کیا۔ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ لغت میں ﴿ قَبْضَتُهٗ ﴾ وہ شے ہے جس پر آدمی اپنی ساری ہتھیلی سے قبضہ کرے، یعنی مٹھی بھر۔ اللہ سبحانہ اپنی قدرتِ عظیم کے متعلق بتاتا ہے کہ ساری زمین اپنی عظمت و کثافت وطول وعرض کے باوجود اس کے مقدور میں ہے اس شے کی طرح جس پر قبضہ کرنے والا اپنی ہتھیلی سے قبضہ کرتا ہے۔ یہ اس طرح سمجھو کہ مثلاً کسی شے پر کسی شخص کا قبضہ آسان ہو، اگرچہ وہ اس شے پر اس طرح سے قبضہ نہ کرے کہ مٹھی میں پکڑے۔ اس کے بارے میں تم کہو کہ وہ شے اس کے ہاتھ میں ہے، اس کے قبضے میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں تصرف کرنا اس پر آسان ہے، اس کے نزدیک اس کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح ﴿ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ﴾ کو سمجھو۔ کلمۂ ﴿ وَالْاَرْضُ ﴾ گو بظاہر مفرد ہے، مگر اس سے مراد ساتوں زمینیں ہیں۔ ﴿ جَمِيْعًا ﴾ کا کلمہ اس کی گواہی دیتا ہے، کیوں کہ اس تاکید کا صرف جمع پر داخل کرنا ہی اچھا لگتا ہے۔

اسی طرح ﴿ وَالسَّمٰوٰتُ ﴾ کا لفظ بھی اس کا شاہد ہے اور اس لیے کہ یہ جگہ جائے تعظیم ہے تو تعظیم مبالغے کی متقضی ہوتی ہے۔ "قَبْضَة" کے دو معنی آتے ہیں: ایک معنی تو یہ ہیں کہ ایک بار مٹھی بھرنا، یہ معنی مصدری ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ مٹھی بھر شے کو کہتے ہیں۔ یہاں دونوں معنی کا احتمال ہے۔ پہلے معنی کی بنا پر ﴿ قَبْضَتُهٗ ﴾ کے معنی ذوات ﴿ قَبْضَتُهٗ ﴾ ہیں، یعنی ساتوں زمینیں اس کے ایک ہی دفعہ مٹھی بھرنے کی چیزیں ہیں کہ ان کو ایک ہی بار مٹھی بھرنے میں قبض کر لے گا۔

---

[1] تفسير البيضاوي (٧٧/٥) [2] فتح القدير (٦٢٣/٤)

مطلب یہ ہے کہ ساری زمینیں اپنی عظمت اور فراخی کے باوجود اس کے قبضات میں سے ایک ہی قبضے کو پہنچیں گی، گویا ایک ہتھیلی سے ایک ہی بار ان کی مٹھی بھر لے گا۔ اور دوسرے معنی کی بنا پر معنی ظاہر ہیں، یعنی ساری زمینیں سب کی سب اس شے جتنی ہیں جس کو ایک ہتھیلی سے قبض کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ سب مٹھی بھر کی مقدار کی ہیں۔ زمینوں کو آسمانوں سے پہلے اس لیے رکھا کہ اس پر رہتے بستے ہیں، اس کی حقیقت کو جانتے پہچانتے ہیں۔ روزِ قیامت کا ذکر خاص کر فرمایا، گو اس کی قدرت دارِ دنیا کو بھی عام اور شامل ہے، یہ صرف اس لیے کہ اس دن دعوے منقطع ہو جائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ ﴾ [الانفطار: ۱۹] ''اور تمام تر احکام اس دن اللہ کے ہی ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ [الفاتحة: ۲] ''بدلے کے دن (یعنی قیامت) کا مالک ہے۔'' اسی لیے حدیث شریف میں یوں فرمایا ہے: «ثُمَّ يَقُوْلُ: أَنَا الْمَلِكُ أَيْنَ مُلُوْكُ الْأَرْضِ؟»[1] یعنی پھر فرمائے گا: میں ہوں بادشاہ، زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟'' ﴿ مَطْوِيّٰتٌ ﴾ ''طي'' سے ماخوذ ہے۔ ''طي'' ''نشر'' کی ضد ہے۔ ''طي'' لپیٹنا ہے اور ''نشر'' پھیلانا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ﴾ [الأنبياء: ۱۰۴] ''جس دن ہم آسمان کو یوں لپیٹ لیں گے، جیسے طومار میں اوراق لپیٹے جاتے ہیں۔'' ''یمین'' کا ذکر کمال قدرت میں مبالغے کے لیے ہے جس طرح کہ آدمیوں میں سے کوئی شخص اپنے سیدھے ہاتھ سے اس کو لپیٹتا ہے جس شے کو لپیٹنا اس کے اختیار میں ہوتا ہے۔ ''یمین'' کا لفظ کلامِ عرب میں کبھی قدرت اور ملکیت کے معنی میں آتا ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بِيَمِيْنِهٖ ﴾ کے معنی ''فِيْ قُدْرَتِهٖ'' ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمٰنُكُمْ ﴾ [النساء: ۳] ''یا تمھاری ملکیت کی لونڈی۔'' ''أَيْ: مَا كَانَتْ لَكُمْ قُدْرَةٌ عَلَيْهِ'' یہ معنی نہیں ہیں کہ مِلک سیدھے ہاتھ کے لیے ہے بائیں ہاتھ اور باقی جسم کے لیے نہیں ہے۔[2] اس معنی سے یہ آیت ہے: ﴿ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴾ [الحاقة: ۴۵] ''تو البتہ ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے۔'' ''أَيْ: بِالْقُوَّةِ وَالْقُدْرَةِ''۔ ''طي'' سے مراد یہ نہیں ہے کہ کھڑے ہیں، کھینچا تانی ہو رہی ہے، محنت و مشقت اٹھا رہے ہیں۔ اس سے تو مراد یہی ان کا فنا و ذہاب، یعنی ختم ہو کر چلے جانا ہے۔ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: ''قَدِ انْطَوٰى عَنَّا مَا كُنَّا فِيْهِ وَجَاءَنَا غَيْرُهٗ'' یعنی جس حال میں ہم تھے، وہ جاتا رہا اور اس کے سوا ہم پر اور حال آ گیا۔

جملہ ﴿ وَالْأَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ ﴾ بنا بر حال محلِ نصب میں ہے، یعنی تعظیم نہیں کی اس کی جیسا کہ اس کی تعظیم کا حق ہے، حالاں کہ اس میں ایسی صفات موجود ہیں جو اس کی کھلی قدرت کی دلیل ہیں۔ جمہور نے ﴿ قَبْضَتُهٗ ﴾

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۵۳۴) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۷۸۷)
[2] فتح القدیر (۶۲۳/۴)

بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مبتداء کی خبر ہے اور حسن رحمہ اللہ نے بہ نصب پڑھا ہے۔ امام ابن خالویہ رحمہ اللہ نے اس کی یوں توجیہ کی ہے کہ ظرفیت کی بنا پر منصوب ہے: "أَيْ: فِيْ قَبْضَتِهِ"۔ جمہور نے ﴿ مَطْوِيّٰتٌۢ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مبتداء کی خبر ہے اور جملہ بنا بر حال محلِ نصب میں ہے ماقبل جملے کی طرح۔

کلمۂ ﴿ بِيَمِيْنِهٖ ﴾ ﴿ مَطْوِيّٰتٌۢ ﴾ سے متعلق ہے، یا حال ہے ﴿ مَطْوِيّٰتٌۢ ﴾ کی ضمیر سے، یا خبرِ ثانی ہے۔ عیسیٰ اور جحدری نے بہ نصبِ ﴿ مَطْوِيّٰتٌۢ ﴾ پڑھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ السَّمٰوٰتُ ﴾ ﴿ الْاَرْضُ ﴾ پر معطوف ہے اور ﴿ قَبْضَتُهٗ ﴾ "اَلْأَرْضُ وَالسَّمٰوٰتُ" کی خبر ہے اور ﴿ مَطْوِيّٰتٌۢ ﴾ حال ہے۔ یا ﴿ مَطْوِيّٰتٌۢ ﴾ فعلِ مقدر سے منصوب ہے اور ﴿ بِيَمِيْنِهٖ ﴾ خبر ہے۔[1] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "یمین" ہمارے نزدیک بہ معنی جارحہ نہیں ہے، وہ تو صرف ایک صفت ہے کہ اس کے ساتھ توقیف آئی ہے۔ چنانچہ ہم اس طور پر اس کا اطلاق کرتے ہیں جس طور پر وہ آئی ہے اور ہم اس کی کیفیت بیان نہیں کرتے اور ہم باز رہتے ہیں وہاں تک، جہاں ہم کو کتاب اللہ اور اخبارِ ماثورہ صحیحہ نے باز رکھا ہے۔ یہ اہلِ سنت والجماعت کا مذہب ہے۔ کثر اللّٰه سوادهم۔ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر وہ شے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس کا وصف اپنی کتاب میں کیا ہے، اس کی تفسیر اس کی تلاوت ہے اور اس سے سکوت ہے۔[2] انتھیٰ.

اس آیت سے مقصود اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جو اس دنیا میں آسمان و زمین کو باقی رکھنے کا متولی اور ذمے دار ہے، وہی قیامت کے دن ان کی تخریب کا متولی ہے۔ یہ امر اس پر دال ہے کہ کسی چیز کو ایجاد کرنے پر اور اس کو ختم کرنے پر اس کو پوری قدرت ہے اور اس پر دال ہے کہ وہ غنی ہے علی الاطلاق، کیوں کہ جس وقت وہ زمین کو خراب کرنے کا ارادہ کرے گا تو اس کو قبض کر لے گا اور اس کو زائل کر دے گا اور آسمانوں کو خراب کرنے کا ارادہ کرے گا تو اُن کو لپٹے ہوئے کاغذ کی طرح جمع کر دے گا۔ اس بارے میں کچھ حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔ اس کے بارے میں مزید بہت سی احادیث وآثار مروی ہیں جو اس آیتِ کریمہ کو تاویل کا تکلف اور قیل وقال کا تعسف کیے بغیر اس کے ظاہر پر محمول کرنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اپنے نفسِ مقدس کی پاکیزگی بیان فرمائی: ﴿ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی وہ ان معبودوں سے پاک اور برتر ہے جن کو باوجود اس کی اس عظیم قدرت وحکمتِ باہرہ کے مشرک لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔[3] بالجملہ جبکہ اللہ پاک نے آسمان وزمین کے فنا ہونے کا ذکر کیا تو نفخِ صور کا ذکر فرمایا:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي
الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ

[1] فتح القدير (٦٢٤/٤) [2] تفسير الخازن (٨٤/٦) [3] فتح البيان (١٤٠/١٢۔١٤٤)

يَنْظُرُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ
بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٩﴾
وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٠﴾

اور صور میں پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے بے ہوش ہو جائے گا، سوائے اس کے جسے اللہ چاہے، پھر اس میں دوسری بار پھونکا جائے گا تو وہ یکا یک کھڑے (ہو کر) دیکھنے لگیں گے ⑥⑧ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اُٹھے گی، اور (عملوں کی) کتاب رکھی جائے گی اور انبیاء اور گواہ لائے جائیں گے اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ⑥⑨ اور ہر شخص نے جو عمل کیا ہو گا اسے اس کا پورا پورا اجر دیا جائے گا اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے ⑦⓪

صور میں پھونکنے اور فیصلے اور بدلے کا دن:

پہلی بار صور کا پھونکنا دنیا کے فنا ہونے کے لیے ہے۔ دوسرا زندہ ہونے کا ہے۔ پھر تیسرا بے ہوشی کا ہے حشر کے بعد اور چوتھا خبردار ہونے کا ہے۔ اس کے بعد اللہ کے سامنے آجائیں گے۔ گواہوں کو لائیں گے جو ہر وقت کے نیک لوگ ہوں گے، وہ سب احوال بتا دیں گے، بروں کی برائی اور بھلوں کی بھلائی جو دیکھتے تھے اس کی گواہی دیں گے۔ گواہ اس لیے آتے ہیں کہ لوگوں کو الزام دیں، وگرنہ اللہ پر کیا چیز مخفی ہے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ روزِ قیامت کی خبر دیتا ہے اور ان بڑی بڑی نشانیوں اور ہولناک زلزلوں کے متعلق بتاتا ہے جو اس میں ہوں گے۔ چنانچہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ﴾ سے مراد دوسرا نفخہ ہے اور یہی نفخۂ صعق ہے اور اسی سے آسمان و زمین والوں میں سے زندہ لوگ مر جائیں گے، سوائے ان کے جن کو اللہ چاہے گا جیسا کہ مشہور حدیث، حدیثِ صور میں یہ بات صراحت اور تفسیر کے ساتھ ہے۔ پھر باقی لوگوں کی روح قبض کی جائے گی یہاں تک کہ سب مرنے والوں کے پیچھے ملک الموت مریں گے اور حی قیوم تنہا رہ جائے گا جو اول تھا اور دوام اور بقا کے ساتھ وہ باقی رہے گا اور تین بار یہ فرمائے گا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ﴾ [المؤمن: ١٦] ''آج کس کی بادشاہی ہے؟'' پھر آپ ہی خود جواب دے گا اور فرمائے گا: ﴿ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [المؤمن: ١٦] ''فقط اللہ واحد و قہار کی۔'' میں وہ ہوں جو اکیلا تھا اور یقیناً میں نے ہر شے کو مقہور کیا اور ہر چیز کو فنا ہو جانے کا حکم کیا، پھر سب سے پہلے اسرافیل علیہ السلام کو زندہ کرے گا اور اُن کو حکم دے گا کہ صور میں دوسری پھونک ماریں۔

یہ تیسرا نفخہ "نفخة البعث" ہے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ ﴾ یعنی وہ اس کے بعد کہ ہڈیاں اور ریزے ریزے ہو گئے تھے، زندہ ہو جائیں گے۔ قیامت کے دن کی ہولنا کیوں کو دیکھ رہے ہوں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴾ [النازعات: ١٣۔ ١٤] ''(معلوم ہونا چاہیے) وہ تو صرف ایک (خوفناک) ڈانٹ ہے کہ (جس کے ظاہر ہوتے ہی) وہ ایک دم میدان میں جمع ہو جائیں گے۔'' نیز اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ﴾ [بني إسرائیل: ٥٢] ''جس دن وہ تمھیں بلائے گا تم اس کی تعریف کرتے ہوئے تعمیلِ ارشاد کرو گے اور گمان کرو گے کہ تمھارا رہنا بہت ہی تھوڑا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِنَ الْأَرْضِ إِذَا أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ ﴾ [الروم: ٢٥] ''اس کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ آسمان و زمین اسی کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جب وہ تمھیں آواز دے گا صرف ایک بار کی آواز کے ساتھ ہی تم سب زمین سے نکل آؤ گے۔''

امام احمد رحمہ اللہ نے یعقوب بن عاصم بن عروہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ میں نے ایک شخص کو سنا، اس نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے کہا کہ تم کہتے ہو: فلاں فلاں مدت تک قیامت قائم ہو گی؟ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: البتہ میں نے یقیناً قصد کر لیا کہ تم سے کسی شے کی حدیث نہ کروں۔ میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ ذرا سی مدت کے بعد تم ایک امرِ عظیم کو دیکھو گے۔ پھر عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت میں دجال نکلے گا، پھر وہ ان میں چالیس ٹھہرے گا۔ میں نہیں جانتا کہ چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس برس یا چالیس رات۔

پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو بھیجے گا، گویا وہ عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ ہیں، پھر وہ غالب ہوں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ اس (دجال) کو ہلاک کر دے گا۔ پھر لوگ اس کے بعد سات برس ٹھہریں گے۔ اس مدت میں دو آدمیوں کے درمیان عداوت نہیں ہو گی۔ پھر اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ایک سرد ہوا بھیجے گا اور جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہو گا اس کو وہ ہوا قبض کر لے گی، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی کسی پہاڑ کے جگر میں ہو گا تو البتہ وہ اس پر بھی داخل ہو جائے گی۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ بد لوگ باقی رہ جائیں گے جو پرندوں کی طرح ہلکے ہوں گے اور ان کی عقلیں درندوں کی طرح ہوں گی، نہ تو کسی نیک بات کو اچھا سمجھیں گے اور نہ بری بات کو برا جانیں گے، پھر ان کے لیے شیطان متمثل ہو گا، یعنی انسانی شکل میں ظاہر ہو گا اور کہے گا: "أَلَا تَسْتَجِيبُونَ" یعنی تم کہا کیوں نہیں مانتے؟ پھر وہ ان کو بت پوجنے کا حکم دے گا تو وہ ان کو پوجیں گے۔ "وَهُمْ فِي ذٰلِكَ دَارَّةٌ أَرْزَاقُهُمْ حَسَنٌ عَيْشُهُمْ" یعنی اس حال میں ان کی روزی اچھی فراخ ہو گی اور گزران اچھی ہو گی۔

پھر صور میں پھونکا جائے گا تو نہ سنے گا اس کو کوئی "إِلَّا أَصْغَى لِيتًا وَيَرْفَعُ لِيتًا" یعنی مگر جھکائے گا گردن کو ایک طرف کو اور اٹھائے گا دوسری طرف کو ("لیت": بالکسر صفحۂ عنق کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ سننے والا

خوف و دہشت کے مارے بے ہوش ہو جائے گا اور اس کے قویٰ ساقط ہو جائیں گے، چنانچہ گردن کی ایک طرف کو جھکائے گا اور دوسری طرف کو اٹھائے گا۔ جس کو چنگھاڑ پہنچتی ہے، اس کا یہی حال ہوتا ہے، اس کا دل پھٹ جاتا ہے، پہلی بات جو اس سے ظاہر ہوتی ہے، وہ یہی ہے کہ اس کا سر ایک جانب کو گر پڑتا ہے۔ اس کی طرف "أصغی" کی نسبت مثل فعل اختیاری کے کی گئی ہے)۔

پہلے پہل جو اس کو سنے گا، وہ ایک شخص ہوگا جو اپنے حوض کو درست کر رہا ہوگا تو وہ بے ہوش ہو جائے گا، پھر کوئی باقی نہ رہے گا، مگر وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک باران بھیجے گا یا نازل کرے گا، گویا وہ طل ہے، یعنی شبنم یا ظل، نعمان راوی نے شک کیا ہے (زیادہ صحیح طل بطائے مہملہ ہے، اس لیے کہ اور حدیث میں "کمني الرجال" آیا ہے۔[1] كما في مجمع البحار) اس سے لوگوں کے جسم اُگیں گے، پھر اس میں پھونک پھونکی جائے گی تو ایک دم وہ کھڑے ہو کر دیکھتے ہوں گے۔ پھر کہا جائے گا: اے لوگو! اپنے رب کی طرف آؤ۔ ﴿ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴾ [الصافات: ٢٤] "اور انھیں ٹھہرالو (اس لیے) کہ ان سے (ضروری) سوال کیے جانے والے ہیں۔"

کہا پھر کہا جائے گا کہ نکالو بعث نار کا، یعنی ان لوگوں کو الگ کرو جو دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔ پوچھا جائے گا کہ کتنا حصہ؟ تو کہا جائے گا کہ ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ "فَيَوْمَئِذٍ تُبْعَثُ الْوِلْدَانُ شِيْبًا" (یعنی شدتِ ہول کے مارے جوان بوڑھے ہو جائیں گے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴾ [المزمل: ١٧] "وہ دن بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔") ﴿ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ ﴾ [القلم: ٤٢] یعنی اس دن پنڈلی کھولی جائے گی۔ ("کشف ساق" شدت کی مثال ہے، اس کی اصل یہ ہے کہ جو شخص کسی سختی میں واقع ہوتا ہے تو کہتے ہیں: "شمر ساعده وكشف عن ساقه" یعنی اپنی کلائی سے آستین چڑھائی اور اپنی پنڈلی سے تہبند کھولا، مطلب یہ ہے کہ بڑا اہتمام کیا ہے اور مستعد ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد نورِ عظیم ہے۔ کسی نے کہا: ملائکہ کی جماعت۔ یہ تو تاویل ہے، جب کہ سلف کے نزدیک اس میں توقف واجب ہے۔)[2] (انفرد بإخراجه مسلم في صحيحه)۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ نبی ﷺ سے حدیث بیان کرتے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "نفخوں کے درمیان چالیس ہیں۔" لوگوں نے کہا: اے ابو ہریرہ! چالیس دن؟ کہا: میں انکار کرتا ہوں۔ کہا: چالیس برس؟ کہا: میں انکار کرتا ہوں۔ کہا چالیس مہینے؟ کہا: میں انکار کرتا ہوں اور انسان کی ہر شے بوسیدہ ہو جائے گی، سوائے اس کی عجبِ ذنب کے (بہ فتحِ عین وسکونِ جیم، پشت کے نچلے حصے میں ایک ہڈی ہے جو سرین کے نزدیک ہوتی ہے۔ امام مظہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اس کا طولِ بقا ہے، یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اصلاً بوسیدہ ہی نہیں

[1] مجمع بحار الأنوار (٣/٤٥٧)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٤٠) مسند أحمد (٢/١٦٦)

ہوتی، کیوں کہ یہ بات خلافِ محسوس ہے۔[1] واللہ أعلم کذا في مجمع البحار) اسی میں مخلوق کو کھڑا کیا جائے گا۔[2]

امام ابو یعلیٰ نے عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے اس آیت کے بارے میں پوچھا: ﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ... الآية ﴾ وہ کون لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ ان کو بے ہوش کرے؟ کہا: وہ شہداء ہیں، اس کے عرش کے گرد اپنی تلواریں گردن میں لٹکائے ہوں گے۔ ان کو فرشتے قیامت کے دن لینے کے لیے آئیں گے، ان کے پاس عمدہ اونٹنیاں ہوں گی جن کے نمار ریشم سے بھی زیادہ نرم ہوں گے (''النمرة'' ''بفتح النون وکسر المیم کساء فیه خطوط بیض وسود تلبسه الأعراب''، قال ابن الأثیر: والجمع نمار)۔[3] ان کے قدموں کی درازی ابصارِ رجال کی ہوگی، (یعنی جتنی دور آدمی کی نگاہ جاتی ہے، اتنی ہی دور پر اُن کا قدم پڑے گا، ان کی رفتار اتنی تیز ہوگی۔) وہ جنت میں سیر کریں گے اور سیر کے دراز ہونے کے وقت وہ کہیں گے: ہم کو ہمارے رب کی طرف لے چلو، تاکہ ہم دیکھیں کہ وہ اپنی خلق کے درمیان کس طرح فیصلہ کرتا ہے تو اُن کی طرف سے میرا معبود ہنسے گا اور جس وقت اللہ کسی بندے کی طرف ہنسا کسی مقام میں تو اس پر کچھ حساب نہیں ہے۔[4] (رجاله کلهم ثقات إلا شیخ إسماعیل بن عیاش فإنه غیر معروف واللّٰه سبحانه وتعالیٰ أعلم)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ﴾ یعنی زمین روشن ہو جائے گی جس وقت کہ حق تعالیٰ جل وعلا اپنی مخلوق کے درمیان فیصلوں کے لیے تجلی فرمائے گا۔ ﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ ﴾ یعنی اور رکھی جائے گی کتاب۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اعمال کی کتاب رکھی جائے گی۔[5] ﴿ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ ﴾ یعنی اور نبی لائے جائیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اپنی اُمتوں پر اس بات کی گواہی دیں گے کہ انھوں نے اللہ کی رسالتیں ان کو پہنچا دیں۔[6] ﴿ وَالشُّهَدَآءِ ﴾ یعنی اور فرشتوں میں سے گواہ لائے جائیں گے جو بندوں کے ان کے خیر وشر کے اعمال پر نگہبان تھے۔ ﴿ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ یعنی ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور اُن پر ظلم نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴾ [الأنبیاء: ٤٧] قیامت کے دن ہم درمیان میں لا رکھیں گے ٹھیک تولنے والی ترازو کو پھر کسی پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہوگا ہم اسے لا حاضر کریں گے، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٤٠] ''بے شک

---

[1] مجمع بحار الأنوار (٣/٥٢٢)
[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٥٣٦)
[3] النهاية في غريب الحديث (٥/٢٤٩)
[4] اتحاف الخيرة المهرة (٦/٢٦٢)
[5] تفسير الطبري (٢١/٣٣٥)
[6] تفسير الطبري (٢١/٣٣٦)

اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا اور اگر نیکی ہو تو اسے دوگنی کر دیتا ہے اور خاص اپنے پاس سے بہت بڑا ثواب دیتا ہے۔‘‘
اسی لیے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ یعنی ہر نفس کو اس کے خیر وشر کا جو اس نے کیا پورا بدلہ دیا جائے گا اور وہ خوب جانتا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ آیت میں ﴿ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ ﴾ سے پہلا نفخہ مراد ہے اور صور وہ نرسنگا ہے جس میں اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے، اس کا بیان کئی بار گزر چکا ہے۔ کہا ہے کہ اسرافیل علیہ السلام کے ساتھ جبرائیل بھی ہوں گے، اس لیے کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « إِنَّ صَاحِبَيِ الصُّوْرِ بِأَيْدِيْهِمَا أَوْ فِيْ أَيْدِيْهِمَا قَرْنَانِ يُلَاحِظَانِ النَّظَرَ حَتّٰى يُؤْمَرَانِ »[2] (أخرجه ابن ماجه) یعنی بے شک دو صاحب جن کے ہاتھوں میں دو قرن ہیں ملاحظہ کر رہے ہیں نظر کا یہاں تک کہ امر کیے جائیں۔ ابو داود میں سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبِ صور کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اس کے سیدھی جانب جبرائیل علیہ السلام اور اس کے بائیں طرف میکائیل علیہ السلام ہوں گے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے۔[3] ’’صعق‘‘ کے یہ معنی ہیں کہ آسمان و زمین والوں کی عقلیں زائل ہو جائیں گی، پھر وہ غش کھا کر گر پڑیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ مر جائیں گے۔

امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا ہے کہ اہلِ سمٰوٰت و ارض خوف و گھبراہٹ اور شدتِ آواز سے مر جائیں گے۔ جمہور نے ’’صُوْر‘‘ بہ سکونِ واوَ پڑھا ہے اور قتادہ و زید بن علی رحمہما اللہ نے بہ فتحِ واو جمع ’’صورۃ‘‘ کے پڑھا ہے۔[4] ﴿ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ﴾ میں استثناء متصل ہے اور مستثنیٰ جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ رضوان، حاملینِ عرشِ معلیٰ، خازنینِ جنت و نار اور حورِ عین مستثنیٰ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ تنہا باری تعالیٰ ہیں۔ یہ قول امام حسن رحمہ اللہ کا ہے۔[5] اس میں نظر ہے اس لحاظ سے کہ ﴿ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کا استثنا کیا، وہ آسمان و زمین والوں سے ہیں، کیوں کہ استثناء متصل ہے اور باری تعالیٰ حیز و مکان سے پاک ہے۔ ہاں امام حسن رحمہ اللہ کے قول کی بنا پر یہ بات متعین ہوگی کہ استثناء منقطع ہو۔ کسی نے کہا ہے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٨١/٤-٨٣)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٧٣) اس کی سند میں ’’عطیہ عوفی‘‘ ضعیف اور ’’حجاج‘‘ متکلم فیہ راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١٨٧٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٩٩) تفسير القرطبي (٢٧٩/١٥) اس کی سند میں ’’عطیہ عوفی‘‘ ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٣٤٦٢)

[4] فتح القدير (٦٢٤/٤) [5] تفسير القرطبي (٢٨٠/١٥)

کہ مستثنیٰ زبانیہ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ عقارب وحیاتِ اہلِ نار ہیں، یعنی آگ کے بچھو اور سانپ ہیں، یہ دونوں قول اس میں آ گئے ہیں جو پہلے مذکور ہوا ہے۔

امام بخاری اور مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہود کے ایک شخص نے مدینے کے بازار میں کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو بشر پر برگزیدہ کیا! اس پر انصار کے ایک شخص نے اپنا ہاتھ اُٹھایا، پھر اس کو طمانچہ مارا اور کہا: کیا تو یہ کہتا ہے، حالاں کہ ہم میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پھر میں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ... الخ﴾ چنانچہ میں ان لوگوں میں سے سب سے پہلا ہوں گا جو اپنے سر اٹھائیں گے تو اچانک میں کیا دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کے پایوں میں سے ایک پایہ پکڑے ہوئے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ انھوں نے مجھ سے پہلے اپنا سر اٹھا لیا یا وہ اُن میں سے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے استثناء کیا ہے[1] اور شہداء کی حدیث پہلے گزر چکی ہے جس کو امام ابو یعلیٰ اور دار قطنی رحمہ اللہ نے افراد میں اور ابن منذر اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا اور امام ابن مردویہ اور بیہقی رحمہ اللہ نے شعب میں مرفوعاً روایت کیا اور امام سعید بن منصور اور عبد بن حمید رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول سے، یعنی موقوفاً روایت کیا ہے۔[2] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ﴿إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرائیل، میکائیل، ملک الموت، اسرافیل علیہم السلام اور حملۃ العرش ہیں۔[3] (أخرجه الفريابي وابن جرير وأبو نصر السجزي في الإبانة)

امام ابن منذر رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام ہیں، اس لیے کہ وہ اس سے پہلے بے ہوش ہو چکے تھے۔[4] یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے جس کو بعض سلف نے وارد کیا ہے، وہ یہ ہے کہ نصِ قرآنی تو اس پر دال ہے کہ یہ استثناء نفخۂ صعق کے بعد ہے، یعنی نفخۂ اولیٰ، جس میں وہ لوگ مر جائیں گے جو روئے زمین پر باقی رہے ہوں گے اور حدیثِ متقدم اس پر دال ہے کہ وہ نفخۂ بعث ہے۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اس بات کا احتمال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ان میں سے ہوں جو من جملہ انبیاء نہیں مرے تو یہ احتمال ان کی وفات کے صحیح ہونے کے سبب سے باطل ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا: احتمال ہے کہ یہ نشور کے بعد صعقۂ فزع ہو، جب کہ زمین و آسمان شق ہو جائیں گے، چنانچہ آیتیں اور حدیثیں باہم ایک دوسرے کے موافق ہو جائیں گی۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو وہ بات رد کرتی ہے جو حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑے ہوئے ہوں گے تو یہ جو ہوگا تو نفخۂ بعث کے وقت ہوگا اور نیز یہ ہے کہ چار نفخے ہو جائیں گے، حالاں کہ

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٤)

② مستدرك الحاكم (٢٧٧/٢) الدر المنثور (٢٤٩/٧، ٢٥٠)

③ تفسير الطبري (٣٣١/٢١، ٣٣٢) الدر المنثور (٢٥٠/٧) ④ الدر المنثور (٢٥١/٧)

ثقات نے اس کو نقل نہیں کیا۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا: جس شخص نے صعق کو اس غشی پر محمول کیا ہے جو نفخۂ بعث کے بعد ڈرانے اور رُعب ڈالنے کے لیے ایک نفخے سے ہو گی تو اس کا کلام مردود ہے، اس بات کی وجہ سے جس کو تم پہچان چکے ہو۔

من جملہ امرِ غریب یہ بات ہے کہ بعض نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے سبب سے نفخوں کو پانچ ٹھہرایا ہے۔ "وَقَدْ سَمِعْنَا بِمَنْ زَادَ فِي الطَّنْبُوْرِ نَغْمَةً وَلَمْ نَسْمَعْ بِمَنْ زَادَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةً" یہ ایک مثال ہے، یعنی یہ تو سنا ہے کہ کسی نے طنبور میں نغمہ زیادہ کیا اور اس شخص کو نہیں سنا جس نے صور میں نفخہ زیادہ کیا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: جو بات اشکال کو دور کرتی ہے، وہ ہے جو ہمارے بعض مشائخ نے کہی ہے کہ موت انبیاء اور شہداء کی نسبت سے عدمِ محض نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو زندہ موجود ہیں، گو ہم ان کو نہیں دیکھتے اور جس وقت نفخۂ صعق پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمان و زمین میں ہیں وہ سب بے ہوش ہو جائیں گے اور انبیاء کے علاوہ لوگوں کا صعق تو موت ہے اور انبیاء کا صعق غشی ہے اور جب نفخہ بعث کا ہو گا تو جو مر گئے ہیں وہ زندہ ہو جائیں گے اور جن پر غشی طاری ہوئی تھی وہ افاقہ پا جائیں گے۔ اسی لیے صحیحین میں واقع ہوا ہے:[1] میں ان لوگوں میں سب سے پہلا ہوں گا جو افاقہ پائیں گے۔[2]

نفخِ صور کی کیفیت کے متعلق جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ بہت سی ہیں۔ اس مقام میں سلیمان جمل نے ابن الوردی وغیرہ سے وہ اقوال ذکر کیے ہیں جو صور کی شکل، صورت، کیفیت اور نفخات کی تعداد کے بارے میں آئے ہیں۔ تفسیر سے ان کو کچھ تعلق نہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى﴾ جائز ہے کہ ﴿اُخْرٰى﴾ محلِ رفع میں ہو۔ اس بنا پر کہ ﴿نُفِخَ﴾ کا نائب فاعل ہو اور وہ مصدر محذوف کی صفت ہے: "أَيْ: نُفِخَ فِيْهِ نَفْخَةٌ أُخْرىٰ". یہ بھی جائز ہے کہ محلِ نصب میں ہو اور کلمۂ ﴿فِيْهِ﴾ نائب فاعل ہو۔

﴿فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ﴾ یعنی پھر صور میں ایک دوسری پھونک پھونکی جائے گی تو اچانک ساری مخلوق اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر اس شے کو دیکھتی ہو گی جو اس سے کہی جائے گی، یا اس کا انتظار کرتی ہو گی۔ اس میں بھی استثناء کا لحاظ کیا گیا ہے، اس لیے کہ جو مرے نہیں، جیسے: حورِ عین تو اُن کے لیے یہ نہیں کہا جائے گا۔ آیتِ کریمہ اس پر دال ہے کہ نفخے دو ہیں: ایک موت کا اور دوسرا بعث کا۔ جمہور اس پر ہیں کہ تین نفخے ہیں۔ پہلا فزع کا، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ﴾ [النمل: ۸۷] "جس دن صور پھونکا جائے گا تو سب کے سب گھبرا اُٹھیں گے۔" دوسرا نفخہ موت کا ہے، تیسرا اعادے کا۔ جمہور نے ﴿قِيَامٌ﴾ بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ خبر ہے اور ﴿يَّنْظُرُوْنَ﴾ بنا بر حال محلِ نصب میں ہے۔ زید بن علی رحمہ اللہ نے "قِيَامًا" بنا بر حال بہ نصب پڑھا ہے اور خبر ﴿يَّنْظُرُوْنَ﴾ ہے۔ اور حال میں عامل وہ شے ہے جس نے "إِذَا" فجائیہ میں عمل کیا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: جیسے تم کہتے ہو: "خَرَجْتُ فَإِذَا زَيْدٌ جَالِسًا"[3]

---

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٣٥١/٧) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] فتح القدير (٦٢٤/٤)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ﴾ "إِشْرَاقٌ" بہ معنی اضاءت ہے، یعنی روشن ہونا۔ جس وقت سورج روشن ہوتا ہے تو بولتے ہیں: "أَشْرَقَتِ الشَّمْسُ" اور جب طلوع ہوتا ہے تو کہتے ہیں: "شَرَقَتْ" اور ﴿ الْاَرْضُ ﴾ سے مراد عرصاتِ قیامت ہے، یعنی وہ جدید زمین جس کو اللہ تعالیٰ اس وقت ایجاد کرے گا، تا کہ لوگ اس پر حشر کیے جائیں۔ دنیا کی زمین اس سے مراد نہیں ہے۔ ﴿ بِنُوْرِ رَبِّهَا ﴾ امام حسن رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا: "بِعَدْلِ رَبِّهَا" امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: "بِحُكْمِ رَبِّهَا"[1] معنی یہ ہیں کہ زمین اس عدل کے سبب سے روشن ہو جائے گی جس کو اللہ تعالیٰ زمین والوں کے درمیان قائم کرے گا اور اس حق کے سبب سے جس کے ساتھ ان میں فیصلہ فرمائے گا۔

چنانچہ عدل تو نور ہے اور ظلم تاریکیاں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اس وقت ہو گا جب رب تبارک و تعالیٰ فصلِ قضا، یعنی اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے تجلی فرمائے گا، چنانچہ اس کے نور میں باہم ایک دوسرے کی مخالفت نہ کریں گے اور نہ جھگڑیں گے جس طرح کہ لوگ سورج کے بارے میں جھگڑا نہیں کرتے، جس دن کوئی ابر نہ ہو اور دن خوب روشن ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک قیامت کے دن ایک نور پیدا فرمائے گا، اس سے روئے زمین کو ڈھانک دے گا جس سے وہ روشن ہو جائے گی۔ یہ نور نورِ آفتاب و مہتاب کے سوا ہو گا، اس سے کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ نور کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کیا جائے، اس لیے کہ اللہ سبحانہ تو نور السمٰوٰت و الارض ہے۔ (اس کی تفصیل سورۃ النور میں گزر چکی ہے۔[2] نور کے معنی منور کیے ہیں اور اہلِ حقائق نے نور سے مراد وجود لیا ہے۔ واللّٰه أعلم) جمہور نے ﴿ اَشْرَقَتِ ﴾ بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابوالجوزاء، عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ ﴾ کسی نے کہا ہے کہ کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ کتابیں اور صحیفے ہیں جن میں بنی آدم کے اعمال ہیں، چنانچہ کوئی تو اپنے دائیں ہاتھ میں لینے والا ہے اور کوئی بائیں ہاتھ میں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ یہ ﴿ وُضِعَ ﴾ اس باب سے ہے کہ حساب کرنے والا محاسبے کی کتاب کو اپنے سامنے رکھتا ہے، یعنی کتاب حساب کے لیے رکھی جائے گی۔

﴿ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام موقف کی طرف لائے جائیں گے، پھر ان سے اس شے کے بارے میں پوچھا جائے گا جس کے ساتھ ان کی اُمتوں نے ان کو جواب دیا۔ ﴿ وَالشُّهَدَآءِ ﴾ یعنی اور گواہ لائے جائیں گے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ہوں گے اور وہ دوسری اُمتوں پر گواہی دیں گے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ [البقرۃ: ١٤٣] "ہم نے اسی طرح تمھیں اُمتِ عادل بنایا ہے، تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ۔" کسی نے کہا ہے کہ شہداء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید کیے گئے ہیں، چنانچہ وہ قیامت کے دن اس شخص کے لیے گواہی دیں گے جس نے اللہ کے دین سے

---

[1] تفسير القرطبي (٢٨٢/١٥) [2] رقم الآية (٣٥) [3] تفسير القرطبي (٢٨٢/١٥) فتح القدير (٦٢٥/٤)

دفع کیا ہے۔ یہ امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو اعمال کی حفاظت کے لیے مامور کیے گئے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴾[ق:٢١] ''اور ہر شخص اس طرح آئے گا کہ اس کے ساتھ ایک لانے والا ہوگا اور ایک گواہی دینے والا۔'' یہ امام ابن زید رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿ اَلنَّبِيّٖنَ ﴾ سے مراد رسول ہیں اور ﴿ اَلشُّهَدَآءِ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کی رسالت کو پہنچا دینے کی گواہی دیں گے۔ ان میں کوئی لعن وطعن کرنے والے گواہ نہیں ہوں گے۔[2] ﴿ اَلشُّهَدَآءِ ﴾ کی تفسیر میں اُن کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ وہ اُن کی رسالت پہنچانے کی اور اُمتوں کے ان کو جھٹلانے کی گواہی دیں گے۔[3]

جب اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ وہ ہر حق والے کو اس کا حق پہنچائے گا تو اس مضمون کو چار عبارتوں میں ادا فرمایا: پہلی عبارت یہ ہے: ﴿ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی بندوں کے درمیان عدل وصدق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ دوسری عبارت یہ ہے: ﴿ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اس حال میں کہ ان کے ثواب سے کچھ کم نہ کیا جائے گا اور نہ ہی اس عقاب میں زیادہ کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں، آیت کو ظلم کی نفی کے ساتھ ختم کیا، جس طرح کہ اس کو عدل کے اثبات کے ساتھ شروع فرمایا تھا۔ تیسری عبارت یہ ہے: ﴿ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ﴾ یعنی ہر نفس اس خیر وشر کی پوری پوری جزا دیا جائے گا جو اس نے کیا ہے۔

چوتھی عبارت یہ ہے: ﴿ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ یعنی وہ اس شے کو خوب جانتا ہے جو وہ دنیا میں کر رہے ہیں۔ وہ نہ کسی کاتب وحاسب کا محتاج ہے نہ ہی کسی گواہ اور شاہد کا نیاز مند ہے، اس لیے کہ وہ تو اُن کے افعال واعمال کی مقداروں اور کیفیتوں کا عالم ہے، اس پر بھول چوک داخل نہیں ہوسکتیں۔ (كذا قال الكرخي) امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: اور اس کے باوجود نامۂ اعمال اور گواہ اتمامِ حجت کے لیے گواہی دیں گے۔[4] انتہیٰ۔ یعنی کتاب جو رکھی جائے گی اور انبیاء اور شہداء کو جو لایا جائے گا تو صرف حجت کے کامل کرنے اور عذر اور معذرت کو دور کرنے کے لیے لایا جائے گا۔ غرضیکہ اس سبب سے اجمالاً یہ معلوم ہوا کہ ہر نفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ پھر اللہ پاک نے اس کی تفصیل بیان کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[5]

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا
فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ

[1] تفسير القرطبي (٢٨٣/١٥) [2] الدر المنثور (٢٦٢/٧) [3] تفسير الطبري (٣٣٦/٢١)
[4] تفسير القرطبي (٢٨٣/١٥) [5] فتح البيان (١٤٥/١٢ـ١٤٩)

يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ
قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾
قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى
الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾

اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے دربان ان سے کہیں گے: کیا تمھارے پاس تمھی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم پر تمھارے رب کی آیتیں پڑھتے تھے اور تمھیں تمھاری اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں! لیکن کافروں پر عذاب کا فیصلہ ثابت ہو چکا (71) (انھیں) کہا جائے گا: تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں تم ہمیشہ رہو گے، چناں چہ تکبر کرنے والوں کا (یہ) ٹھکانا بہت برا ہے (72)

کفار کو جہنم کی طرف ہانکا جائے گا:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں اللہ پاک بد بخت کافروں کے حال کی خبر دیتا ہے کہ وہ آگ کی طرف کیسے ہانکے جائیں گے اور ان کو بہت سخت ڈانٹ ڈپٹ، دھمکیوں اور وعید کے ساتھ ہانکا جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴾ [الطور: ١٣] ''جس دن وہ دھکے دے دے کر آتشِ جہنم کی طرف لائے جائیں گے۔'' یعنی انھیں بہت دھکے دے دے کر لے جایا جائے گا، اس کے باوجود کہ وہ پیاسے ہوں گے، جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴾ [مريم: ٨٥۔ ٨٦] ''جس دن ہم پرہیز گاروں کو اللہ رحمان کی طرف بطور مہمان کے جمع کریں گے اور گناہ گاروں کو سخت پیاس کی حالت میں جہنم کی طرف ہانک لے جائیں گے۔'' اور وہ اس حال میں اندھے، بہرے اور گونگے ہوں گے۔ ان میں سے بعض اپنے منہ کے بل چلیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٧] ''ایسے لوگوں کو ہم قیامت کے دن اوندھے منہ حشر کریں گے درآنحالیکہ وہ اندھے گونگے اور بہرے ہوں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔ جب کبھی وہ بجھنے لگے گی ہم ان پر اسے اور بھڑکا دیں گے۔''

40

قولہ تعالیٰ: ﴿حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ یعنی یہاں تک کہ جب وہ اس پر پہنچے تو صرف ان کے جہنم کے پاس پہنچنے پر اُن کے لیے اس کے دروازے جلدی سے کھولے جائیں گے، تاکہ ان کے لیے عذاب اور عقاب کی جلدی کی جائے۔ پھر اس کے داروغے، جو زبانیہ فرشتوں میں سے ہیں اور سخت خو اور مضبوط قویٰ کے مالک ہیں، ان کو ڈانٹنے اور دھمکانے کے لیے ان سے کہیں گے: ﴿اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ﴾ یعنی کیا تمھارے پاس تمھاری ہی جنس میں سے رسول نہیں آئے جن سے بات چیت کرنے پر اور اُن سے احکام کو سمجھنے اور لینے پر تم قادر تھے۔ ﴿یَتْلُوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ رَبِّكُمْ﴾ تم پر تمھارے رب کی آیتیں پڑھتے، یعنی تم پر اس شے کی سچائی کی حجتیں اور دلیلیں قائم کرتے جس کی طرف انھوں نے تم کو بلایا۔

﴿وَیُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا﴾ یعنی اور تم کو اس دن کی برائی سے ڈراتے۔ چنانچہ کفار ان کو جواب دیں گے ﴿بَلٰی﴾ یعنی واقعی وہ ہمارے پاس آئے اور ہم کو ڈرایا اور ہم پر دلیلیں اور حجتیں قائم کیں۔ ﴿وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ﴾ یعنی ہم نے ان کو جھٹلایا اور اُن کی مخالفت کی، اپنی اس بدبختی کے سبب سے جس کے ہم مستحق تھے، جبھی تو ہم نے حق کی طرف سے باطل کی طرف میلان کیا، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں ان کے بارے میں خبر دی ہے: ﴿كُلَّمَاۤ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ۝ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْۤ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ﴾ [الملك: ۸۔ ۱۱] ''جب کبھی اس میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا اس کے جہنم کے داروغے پوچھیں گے کہ کیا تمھارے پاس ڈرانے والا کوئی نہیں آیا تھا؟ وہ جواب دیں گے کہ بے شک آیا تھا لیکن ہم نے اسے جھٹلایا اور ہم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ بھی نازل نہیں فرمایا۔ تم بہت بڑی گمراہی میں ہو۔ اور کہیں گے کہ اگر ہم سنتے ہوتے یا عقل رکھتے ہوتے تو دوزخیوں میں (شریک) نہ ہوتے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ اب یہ دوزخی دفع ہوں (دور ہوں)۔''

مطلب یہ ہے کہ دوزخی اپنی جانوں کو ملامت کرنے لگ گئے اور پشیمان ہوئے اور اپنے گناہ کا اقرار کر لیا، اب دفع دور ہوں دوزخ والے اور زیادہ نقصان میں پڑیں۔ اس جگہ اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿قِیْلَ ادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ یعنی ہر شخص جو اُن کو دیکھے گا اور اُن کے حال کو جانے گا تو وہ اُن پر اس بات کی گواہی دے گا کہ وہ عذاب کے مستحق ہیں۔ اسی لیے اس قول کی نسبت کسی قائلِ معین کی طرف نہیں کی، بلکہ اس کو مطلق چھوڑا، تاکہ اس سے یہ بات ثابت ہو کہ وہ اس عذاب کے کہ جس میں وہ ہیں، اس حکم کے سبب سے مستحق ہوئے ہیں جو عادل اور خبیر نے دیا ہے۔ اسی لیے اللہ جل جلالہ نے یوں فرمایا: ﴿قِیْلَ ادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ یعنی ان سے کہہ دیا گیا کہ تم دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، درآنحالیکہ تم ہمیشہ ہمیشہ اس

میں رہنے بسنے والے ہو۔ تمھارے لیے نہ تو اس سے کسی طرح کا نکلنا ہے، نہ تم کو وہاں سے کسی طرح کا زوال ہے۔ ﴿ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾ پس تمھارا کیا برا ٹھکانا ہے اور کیا بری آرام کرنے کی جگہ ہے! یعنی دوزخ نہایت درجے بری، پھر آنے کی جگہ اور لیٹنے کی جگہ ہے۔ اس وجہ سے کہ دنیا میں تم نے تکبر کیا اور حق کی پیروی کرنے سے باز رہے، چنانچہ اسی نے تم کو اس عذاب کی طرف پہنچایا جس میں تم ہو، پھر یہ کیا برا حال ہے اور کیا برا انجام ہے![1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحت کے ساتھ بیان یہ ہے کہ کافر لوگ جہنم کی طرف درشتی و سختی سے ہانکے جائیں گے، اس حال میں کہ وہ بعض بعض کے پیچھے متفرق جماعتیں ہوں گی۔ امام ابو عبیدہ اور اخفش رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ زُمَرًا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جماعتیں متفرق ہوں گی، ایک جماعت کے پیچھے دوسری جماعت۔[2] "زُمَر" کا واحد "زمرة" ہے۔ "زمرة" مشتق سے "زَمْر" سے۔ "زمر" آواز کو کہتے ہیں، کیوں کہ جماعت غالباً آواز سے خالی نہیں ہوتی، اس لیے جماعت اور گروہ کا نام "زمرة" رکھ دیا۔ یہ کلمۂ ﴿ حَتّٰى ﴾ وہ ہے جس کے بعد جملے بیان کیے جاتے ہیں۔ ﴿ اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا ﴾ یعنی کفار گروہ گروہ کر کے سختی سے جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے، تاکہ اس میں داخل ہو جائیں۔ یہ سات دروازے ہیں، اس سے پہلے بند تھے۔ سورۃ الحجر میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔[3]

﴿ وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ ... الآية ﴾ "خَزَنَةٌ" "خَازِنٌ" کی جمع ہے، جیسے: "سَادِنٌ" کی جمع "سَدَنَةٌ" ہے "سَادِنٌ" بہ معنی خادم ہے۔ ﴿ مِّنْكُمْ ﴾ سے مراد "مِنْ أَنْفُسِكُمْ وَمِنْ جِنْسِكُمْ" ہے۔ ﴿ يَوْمِكُمْ ﴾ سے مراد شدت کا وقت ہے، پورا قیامت کا دن مراد نہیں ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا کہ محاورۂ عرب میں سختی کے اوقات میں یوم و ایام کا استعمال مشہور و معروف ہے۔[4] مطلب یہ ہے کہ دوزخ میں داخل ہونے کے وقت فرشتے ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کرنے کے لیے کہیں گے، کیوں جی! کیا تمھارے پاس تمھاری ہی جنس کے رسول نہیں آئے تھے کہ تم پر تمھارے رب کی آیتیں پڑھتے جن کو اس نے تم پر نازل کیا اور اس وقت کے آنے سے پہلے تمھیں اس کی شدت سے ڈراتے؟ تو کفار جواب دیں گے، جس میں اعتراف اور اقرار کریں گے اور ویسا جھگڑا اور بہانہ جوئی نہ کر سکیں گے جو دنیا میں کیا کرتے تھے، کیوں کہ حال کھل گیا، جہالت اور باطل کی رات گزر گئی، حق و یقین کا دن روشن ہو گیا۔ اسی لیے یوں کہا: ﴿ بَلٰى ﴾ یعنی بے شک اللہ کے رسول ہمارے پاس اس کی آیتیں لے کر آئے اور اس عذاب سے ہم کو ڈرایا جس کی ہم ملاقات کریں گے، لیکن کافروں پر عذاب کا کلمہ ثابت ہوا۔ کلمے سے مراد یہ آیت ہے: ﴿ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [هود: ١١٩] "میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے پُر کروں گا۔"

---

[1] تفسیر ابن كثير (٨٣/٤) [2] تفسير القرطبي (٢٨٣/١٥) [3] رقم الآية (٤٤) [4] الكشاف (١٤٩/٤)

رہی یہ بات کے "عَلَيْنَا" نہ فرمایا، ﴿ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ کہا، اسم ظاہر کو ضمیر کی جگہ رکھا، اس سے اس بات کو بیان کرنا منظور ہے کہ وہ جو عذاب کے مستحق ہوئے تو اس کا سبب کفر ہے۔ پھر جب انھوں نے یہ اقرار کیا تو ان کو ان فرشتوں کی طرف سے کہا گیا جو اُن کے عذاب کے لیے موکل اور مقرر ہیں: ﴿ ادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾ یعنی جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ جو تمھارے لیے کھولے گئے ہیں، تا کہ تم اس میں اس طرح داخل ہو کہ اس میں تمھارا ہمیشہ رہنا مقدر کیا گیا ہے۔ ﴿ خٰلِدِيْنَ ﴾ حالِ مقدرہ ہے۔ ﴿ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾ مخصوص بالذم محذوف ہے "أَيْ: بِئْسَ مَثْوَاهُمْ جَهَنَّمُ" اور الف و لام جنسی ہے اور یہاں بھی اسمِ ظاہر، یعنی ﴿ الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾ کو "مَثْوَاكُمْ" کے بجائے رکھا تو اس سے مقصود اُن کے کفر کا سبب بیان کرنا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ عذاب کے مستحق ہوئے۔ وہ کفر کا سبب یہی ان کا حق کے اتباع سے تکبر کرنا ہے۔ "ثَوٰی" بہ معنی "أَقَامَ" ہے اور ﴿ مَثْوٰى ﴾ بہ معنی جائے اقامت، اس کی تحقیق کئی جگہ پر گزر چکی ہے۔ جب اللہ پاک نے کافروں کا اور اُن کے جہنم کی طرف ہانکنے کا حال بیان کیا تو اس کے بعد متقی لوگوں کا حال اور اُن کے جنت کی طرف جانے کی کیفیت بیان کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝۷۳ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝۷۴ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۷۵

اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے ہوں گے، وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے دربان ان سے کہیں گے: تم پر سلام ہو، تم پاکیزہ رہے، اب تم اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ (73) اور وہ کہیں گے: سب تعریف اس اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہم سے (کیا ہوا) اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اور ہمیں اس سرزمین (بہشت) کا وارث بنا دیا، ہم جنت

[1] فتح البیان (۱۲/۱۴۹، ۱۵۰)

میں جہاں چاہیں اپنا ٹھکانا بنائیں، چناں چہ عمل کرنے والوں کا (یہ) اجر وثواب بہت اچھا ہے (74)
اور آپ فرشتوں کو عرش کے اردگرد حلقہ بنائے دیکھیں گے جب کہ وہ اپنے رب کی حمد کے
ساتھ تسبیح بیان کر رہے ہوں گے اور ان (لوگوں) کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا
اور کہا جائے گا: سب تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے (75)

پرہیز گاروں کو گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا:

جنت میں جہاں چاہیں قیام کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو حکم ہے جہاں چاہیں رہیں، لیکن ہر کوئی وہ جگہ چاہے گا جو اس کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ فرشتوں میں فیصلہ یہ کہ ہر ایک اپنے قاعدے پر ایک تدبیر بولتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک کی بات جاری کرتا ہے، وہی حکمت کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ ماجرا اب بھی ہے اور قیامت میں بھی۔ انتہیٰ.

اللہ پاک نیک بخت مومنین کے حال کی خبر دیتا ہے جب کہ وہ نفیس اور عمدہ اونٹنیوں پر وفد کی صورت میں جنت کی طرف ہانکے جائیں گے، ایک جماعت ایک جماعت کے بعد، پہلے مقرب لوگ ہوں گے، پھر ابرار نیک لوگ، پھر وہ جو اُن سے قریب ہیں، پھر وہ جو اُن سے متصل ہیں۔ ہر گروہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جو اس کے لیے مناسب ہیں، انبیاء، انبیاء کے ہمراہ اور صدیق لوگ اپنے جیسوں کے ساتھ اور شہداء اپنے مشابہ لوگوں کے ہمراہ اور علماء اپنے ہمسروں کے ساتھ، ہر قسم اپنی قسم کے ساتھ، ہر گروہ اس کا بعض بعض کے مناسب ہوگا۔ (وفد وہ قوم ہے جو جمع ہو کر شہروں میں وارد ہوتی ہے۔ یہ وافد کی جمع ہے اور وافد وہ ہے جو بادشاہوں اور امیروں کے پاس ملاقات کے لیے اور عطا طلب کرنے کے لیے آتا ہے اور وافد رسول اور ایلچی کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں یہ مراد ہے کہ وہ تعظیم اور اکرام کے ساتھ آئیں گے، جس طرح کہ معزز لوگ بادشاہوں کے پاس اعزاز واکرام کے ساتھ آتے ہیں۔)

یہاں تک کہ جب وہ مجاوزتِ صراط کے بعد جنت کے دروازوں کے پاس پہنچیں گے تو ایک پل پر روکے جائیں گے جو جنت و نار کے درمیان ہے، یہاں تک کہ جب پاک صاف کر دیے جائیں گے تو اُن کو جنت میں داخل ہونے کا اذن دیا جائے گا۔

قیامت کے روز نبیِ مکرم ﷺ کا شرف وفضل:

(1) حدیثِ صور میں وارد ہوا ہے کہ مومنین جس وقت جنت کے دروازوں کے پاس پہنچیں گے تو اس شخص کے بارے میں مشورہ کریں گے جو ان کے لیے جنت میں داخل ہونے کا اذن مانگے۔ چنانچہ وہ آدم علیہ السلام کا قصد کریں گے، پھر نوح علیہ السلام کا، پھر ابراہیم علیہ السلام کا، پھر موسیٰ علیہ السلام کا، پھر عیسیٰ علیہ السلام کا اور پھر محمد ﷺ کا، جس طرح کہ انھوں نے عرصاتِ قیامت میں شفاعت طلب کرتے وقت کیا تھا، جب اللہ تعالیٰ فصلِ قضا کے لیے آئے گا،

تا کہ نبی ﷺ کا شرف سارے بشر پر سارے مقامات میں ظاہر ہو جائے۔[1] (اس جگہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یوں ہیں: "عند استشفاعهم إلى الله عزوجل أن يأتي لفصل القضاء" پس ممکن ہے کہ "یأتي" کی ضمیر تمام مذکور رسولوں ۔علیهم الصلاة و السلام۔ میں سے ہر ایک کی طرف راجع ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح پہلے وہلہ میں فصلِ قضا کے لیے ہر ہر رسول کے پاس جائیں گے کہ وہ اس کام کے لیے آگے بڑھیں اور سب سے آخر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں گے کہ آپ آئیں اور فصلِ قضا کے بارے میں شفاعت فرمائیں، اسی طرح کا واقعہ جنت میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنے کے بارے میں بھی ہو گا۔ والله سبحانه أعلم از مصحح سلمه الله تعالىٰ)۔

2 صحیح مسلم میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں جنت میں سب سے پہلا شفیع ہوں۔[2] مسلم کی ایک روایت میں اس طرح ہے: «أَنَا أَوَّلُ مَنْ يَّقْرَعُ بَابَ الْجَنَّةِ»[3] امام احمد رحمہ اللہ نے عن ثابت عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن میں جنت کے دروازے پر آؤں گا اور دروازہ کھولنے کی درخواست کروں گا تو خازن کہے گا: تو کون ہے؟ میں کہوں گا: محمد۔ کہا: پھر وہ کہے گا کہ مجھے تیرے ہی متعلق حکم ہوا تھا کہ تجھ سے پہلے کسی اور کے لیے دروازہ نہ کھولوں ﷺ۔[4]

3 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہو گی، اس کی صورت چودھویں رات کے چاند کی طرح ہو گی، وہ نہ اس میں تھوکیں گے، نہ ناک سنکیں گے، نہ اس میں پاخانہ پھریں گے (حدیث شریف کے الفاظ: "ولا يمتخطون فيها" ہیں۔ مخاط بالضم "ما يسيل من الفم"[5] كذا في مجمع البحار. وفي القاموس "ما يسيل من الأنف"۔[6] صراح میں کہا ہے: "المخاط": بالضم آبِ بینی وامتخاط: بینی فشاندن)۔ ان کے برتن اور کنگھیاں سونا اور روپا (چاندی) ہے اور عود (خوشبو) ان کی "اُلُوّہ" ہے ("اُلُوّہ" بضمتین و التشدید یا لفتح و بالضم ایضاً چوبِ عود۔ كذا في الصراح)۔ اور پسینہ ان کا مشک ہے اور اُن میں سے ہر ایک کے لیے دو بیبیاں ہیں جن کی پنڈلی کا گودا ان کے حسن کے مارے گوشت کے پیچھے سے دکھائی دے گا، ان کے آپس میں نہ کسی طرح کا اختلاف ہو گا اور نہ کسی طرح کا بغض، ان کے دل ایک جیسے ہوں گے، صبح وشام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کریں گے۔[7] (ورواه البخاري ومسلم بأسانيدهما وكذا رواه أبو الزناد عن الأعرج عن أبي هريرة رضي الله عنه عن رسول ﷺ)

---

1. صحیح مسلم، (۱۹۵) تفسیر ابن کثیر (۸٤/٤)
2. صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹٦)
3. صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹٦)
4. صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۷) مسند أحمد (۱۳٦/۳)
5. مجمع بحار الأنوار (٥٥١/٤)
6. القاموس المحیط (۸۸۷/۱)
7. صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۰۷۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۳٤) مسند أحمد (۳۱٦/۲)

4 حافظ ابو یعلیٰ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پہلا زمرہ جو جنت میں داخل ہوں گے، وہ بدر کی رات میں چاند کی صورت پر ہوں گے اور جو لوگ ان سے متصل ہیں، وہ روشنی میں اس تارے کی طرح ہوں گے جو آسمان میں انتہائی روشن ہو۔ وہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ پھریں گے اور تھوکیں گے اور نہ ناک سنکیں گے، ان کی کنگھیاں سونے کی ہیں اور ان کا پسینہ مشک ہے اور خوشبو ان کی اُلُوّ ہے اور ان کی بیبیاں حورِ عین ہیں، یعنی بڑی آنکھوں والی عورتیں جن کی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی گہری ہو گی، ان کے خلائق اپنے باپ آدم علیہ السلام کی صورت پر لمبائی میں ساٹھ گز ہوں گے۔[1] (وأخرجاه أيضا من حديث جرير)

5 امام زہری رحمہ اللہ نے عن سعید عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے، فرمایا کہ جنت میں میری اُمت سے ایک زمرہ داخل ہوگا، وہ ستر ہزار ہوں گے، ان کے چہرے ایسے روشن ہوں گے جیسے چودھویں رات کا چاند روشن ہوتا ہے۔ چنانچہ عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ وہ مجھے اُن میں سے کر دے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! تو اس کو اُن میں سے کر دے۔ پھر انصار کا ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے اُن میں سے کر دے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «سَبَقَكَ بِهَا عُكَاشَةُ» یعنی عکاشہ اس کلمے کے ساتھ تجھ سے سبقت کر گیا۔[2]
(أخرجاه. وقد روى هذا الحديث في السبعين ألفا يدخلون الجنة بغير حساب البخاري ومسلم عن ابن عباس رضي الله عنهما وجابر بن عبدالله وعمران بن حصين وابن مسعود ورفاعة بن عرابة الجهني وأم قيس بنت محصن رضي الله عنهم)

6 امام بخاری و مسلم نے عن ابی حازم عن سہل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جنت میں میری امت سے ستر ہزار یا سات لاکھ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، ان میں سے ایک نے دوسرے کو پکڑا ہو گا، یہاں تک کہ ان کا پہلا اور آخری بھی جنت میں داخل ہوگا۔ ان کے چہرے ایسے ہوں گے جیسے چودھویں رات کا چاند۔[3]

7 امام ابوبکر بن ابی شیبہ نے ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے کہ میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میری امت میں سے ستر ہزار لوگ جنت میں داخل کرے گا جن پر کسی طرح کا حساب ہے اور نہ عذاب، ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اَور ہوں گے اور میرے رب عزوجل کی لپوں میں سے تین لپیں۔[4] (وكذا رواه الوليد بن مسلم بسنده عن أبي أمامة رضي الله عنه ورواه الطبراني عن عيينة بن عبد السلمي

---

1 صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٤) مسند أبي يعلىٰ (١٠/٤٧٠)

2 صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٦)

3 صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٧٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٩)

4 سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٢٨٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٣٧) مصنف ابن أبي شيبة (٦/٣١٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧١١١)

ثم مع كل ألف سبعين ألفا و يُروى مثله عن ثوبان و أبي سعيد الأنماري وله شوا هد من وجوه كثيرة) (مصحح مصر نے حاشیہ ابن کثیر پر لکھا ہے: "قوله: عيينة في نسخة عن عتبة و قوله ثم مع كل ألف الخ: في نسخة ثم يشفع كل ألف في سبعين ألفا")۔

قولہ تعالیٰ: ﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ یہاں ﴿اِذَا﴾ کا جواب مذکور نہیں ہوا۔ تقدیرِ جواب یہ ہے: "سَعِدُوْا وَطَابُوْا وَسُرُّوْا وَفَرِحُوْا بِقَدَرِ كُلِّ مَا يَكُوْنُ لَهُمْ فِيْهِ نَعِيْمٌ" معنی یہ ہیں کہ جس وقت متقی لوگ جنت کے پاس آئیں گے اور یہ امور ہوں گے، یعنی ان کی تکریم و تعظیم کے لیے جنت کے دروازوں کا کھولنا اور جنت کے خازنینِ ملائکہ کا بشارت وسلام اور تعریف کے ساتھ اُن کا استقبال کرنا جس طرح کہ جہنم کے داروغے کفار کا استقبال ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش و ملامت کے ساتھ کریں گے، پس جب یہ سب امور ہوں گے تو متقی لوگ نیک بخت، بہرہ مند اور شادان و فرحان ہوں گے بہ قدر ہر اس شے کے جس میں ان کے لیے نعیم، راحت اور عیش ہو گا۔ جب اس جگہ ﴿اِذَا﴾ کا جواب حذف کیا جائے گا تو رجا اور اُمید میں ذہن ہر طرف جائے گا۔

جس کسی نے یہ خیال کیا کہ ﴿وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ میں واوِ ثمانیہ ہے اور اس سے اس پر استدلال کیا کہ جنت کے دروازے آٹھ ہیں تو مقرر اس نے ابعادِ نُجعہ کیا اور نزاع میں ڈوبا رہا۔ (واوِ ثمانیہ کو ادباء میں سے ایک جماعت نے، جیسے: حریری اور ضعفائے نحویین سے، جیسے: ابن خالویہ اور مفسرین میں سے، جیسے: ثعلبی ہیں، ان لوگوں کا زعم یہ ہے کہ عرب لوگ جب شمار کرتے ہیں تو کہتے ہیں: "ستة، سبعة و ثمانية" غرض اس واو سے یہ بات بتانا ہوتا ہے کہ سبعہ عددِ تام ہے اور اس کا ما بعد عددِ مستانف ہے، اس پر ﴿سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ [الكهف: ٢٢] سے استدلال کیا ہے۔ مغنی وغیرہ میں اس کی خوب بحث ہے۔ کوفیوں اور امام اخفش رحمہ اللہ نے ﴿وَفُتِحَتْ﴾ کے واو کو زاید ٹھہرایا ہے۔ ابعادِ نُجعہ ایک مثل ہے، جس کو قریب کی شے کو چھوڑ کر دور کی شے کو اختیار کرنے میں بولتے ہیں)۔

جنت کے دروازے آٹھ ہیں:

رہا جنت کے آٹھ دروازے ہونا تو یہ صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو کوئی اپنے مال میں سے اللہ کی راہ میں زوجین (زوجین یعنی دو گھوڑے یا دو اونٹ یا دو روپے یا دو اشرفیاں یا دو کپڑے۔ وعلى هذا القياس) خرچ کرے تو وہ جنت کے دروازوں سے بلایا جائے گا اور جنت کے لیے دروازے ہیں۔ لہٰذا جو شخص نماز والوں میں سے ہو گا، وہ نماز کے دروازے سے بلایا جائے گا اور جو کوئی صدقہ و خیرات کرنے والوں میں سے ہو گا تو وہ صدقے کے دروازے سے بلایا جائے گا اور جو کوئی جہاد والوں میں سے ہو گا تو وہ جہاد کے دروازے سے بلایا جائے گا اور جو کوئی روزے والوں سے

ہوگا تو اسے بابِ ریان سے بلایا جائے گا۔ پس سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا عَلٰى أَحَدٍ مِنْ ضُرُوْرَةٍ دُعِيَ مِنْ أَيِّهَا دُعِيَ فَهَلْ يُدْعٰى مِنْهَا كُلِّهَا أَحَدٌ'' یعنی اس شخص کو کوئی ضرورت و حاجت نہیں جو سارے دروازوں سے بلایا جائے، اس کی کہ اگر وہ ایک دروازے سے بلایا گیا تو اس کا جنت میں داخل ہونے کا مقصود حاصل ہوگیا اور اس کے باوجود کہ اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ سب دروازوں سے بلایا جائے۔ پھر کیا کوئی ایسا شخص ہے کہ وہ سب دروازوں سے بلایا جائے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اور میں اُمید کرتا ہوں اس کی کہ تو ان میں سے ہو۔[1] (ورواه البخاري ومسلم من حديث الزهري نحوه) (مترجم سلمہ تعالیٰ نے اس جگہ ضرورت کو احتیاج کے معنی میں لیا ہے اور یہ ان دوقولوں میں سے ایک ہے جو اس جگہ کہے گئے ہیں۔ اس جگہ دوسرا قول یہ ہے کہ اس جگہ ضرورت ضرر ونقصان کے معنی میں ہے۔ یہ قول انسب ہے، کہا: ''هو الظاهر على المتدبر'')۔

صحیحین میں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک جنت کے آٹھ دروازے ہیں، ان میں سے ایک دروازہ ہے جس کا نام ریان ہے، اس میں صرف روزہ دار لوگ داخل ہوں گے۔[2] صحیح مسلم میں عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے جو کوئی وضو کرے اور اس میں مبالغہ کرے، یا اپنے وضو کو کامل کرے، پھر کہے: ''أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھولے جائیں گے، وہ جس دروازے میں سے چاہے داخل ہو۔[3] حسن بن عرفہ نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جنت کی کنجی ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه'' ہے۔[4]

جنت کے دروازوں کی فراخی کا ذکر:

1. صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے شفاعت کی طویل حدیث میں مروی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے محمد! اپنی اُمت میں سے اس شخص کو جس پر کسی طرح کا حساب نہیں ہے، دروازۂ راست میں سے جنت میں داخل کر۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! جنت کے دوکواڑوں میں، یعنی دروازے کے دو بازوؤں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا مکہ وہجر یا ہجر و مکہ کے درمیان ہے، ایک روایت میں مکہ و بُصریٰ ہے۔[5]
2. صحیح مسلم میں عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے لوگوں کو خطبہ سنایا تو اس میں کہا: اور البتہ مقرر ہم

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٢٧) مسند أحمد (٢٦٨/٢)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٢) ③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٤)

④ مسند أحمد (٢٤٢/٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ''شہر بن حوشب'' کا سماع سیدنا معاذ سے ثابت نہیں ہے۔ نیز اس سند میں ''اسماعیل بن عیاش'' ضعیف راوی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٣١١)

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٤)

سے ذکر کیا گیا ہے کہ جنت کے کواڑوں میں سے دو کواڑوں کے درمیان چالیس برس کا راستہ ہے اور البتہ اس پر ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ بھیڑ کی وجہ سے پُر ہو گا۔[1]

[3] مسند میں عن حکیم بن معاویہ عن ابیہ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثلہ، یعنی ایسا ہی مروی ہے۔[2]

[4] عبد بن حمید نے عن ابی سعید رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ جنت کے دو کواڑوں کے درمیان چالیس برس کی راہ ہے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ ﴾ یعنی پاک ہوئے تمھارے اعمال واقوال اور پاکیزہ ہوئی تمھاری سعی وکوشش اور پاک ہوئی تمھاری جزا جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بعض غزوات میں مسلمانوں کے درمیان ندا کی جائے کہ بے شک جنت میں داخل نہ ہو گا مگر نفسِ مسلمہ۔ ایک روایت میں نفسِ مومنہ ہے۔[4] قولہ تعالیٰ: ﴿ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴾ یعنی جنت میں داخل ہو جاؤ، درآنحالیکہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو۔ مومنین وہاں سے منتقل ہونا نہیں چاہیں گے۔ جب وہ اپنے بہت زیادہ ثواب اور اللہ تعالیٰ کی عطائے عظیم اور نعیم مقیم اور ملکِ کبیر کو دیکھیں گے تو اس وقت یوں کہیں گے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ ﴾ یعنی تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہم سے اپنے رسولوں کی زبانی کیا ہوا وعدہ سچا کیا، جس طرح کہ دنیا میں انھوں نے یہ دعا کی تھی: ﴿ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴾ [آل عمران: ١٩٤] ''اے ہمارے پالنے والے معبود! ہمیں وہ دے جس کا وعدہ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کی زبانی کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر، یقیناً تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ ﴾ [الأعراف: ٤٣] ''اور یہ لوگ کہیں گے کہ اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتا۔ واقعی ہمارے رب کے پیغمبر سچی باتیں لے کر آئے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ﴿34﴾ الَّذِيْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴾ [الفاطر: ٣٤۔ ٣٥] ''اور کہیں گے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا۔ بے شک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا قدر دان ہے۔ جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں اتارا جہاں نہ ہم کو کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہنچے گی۔''

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٦٧) [2] مسند أحمد (٣/٥) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٥٩٠)

[3] مسند أحمد (٢٩/٣) مسند عبد بن حمید (٢٨٩/١) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٦٩٨)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٨٩٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١١) مصنف عبدالرزاق (٢٦٩/٥)

قولہ: ﴿ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ ... الآیۃ ﴾ ابو العالیہ، ابو صالح، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد "أرض" سے ارضِ جنت ہے۔[1] چنانچہ یہ آیت مثل اس آیت کے ہے ﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴾ [الأنبیاء: ۱۰۵] "اور البتہ تحقیق ہم نے زبور میں بھی لکھ دیا ہے اس بات کے ذکر کے بعد کہ اس زمین کے وارث صرف صالحین ہی ہوں گے۔" اسی لیے انھوں نے یوں کہا۔ ﴿ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ﴾ یعنی ہم جہاں چاہتے ہیں نزول کرتے ہیں، چنانچہ اپنے عمل پر ہمارا اجر کیا خوب اجر ہے!

1 صحیحین میں من حدیث زہری عن انس رضی اللہ عنہ معراج شریف کے قصے میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جنت میں داخل کیا گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں موتیوں کے گنبد ہیں اور اس کی مٹی مشک ہے۔[2]

2 عبد بن حمید نے سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صائد سے جنت کی مٹی کا پوچھا تو اس نے کہا: "درمکہ بیضاء مسک خالص" یعنی سفیدی اور نرمی میں تو سفید میدہ ہے اور خوشبو میں خالص مشک ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس نے سچ کہا۔[3] (وكذا رواه مسلم بسنده عن أبي سعيد رضی اللہ عنہ به)

3 نیز امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ابن صائد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت کی مٹی کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "درمکہ بیضاء مسک خالص"[4]

4 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ﴿ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ﴾ کی تفسیر میں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہانکے گئے یہاں تک کہ جنت کے دروازوں کے پاس پہنچے تو ان کے نزدیک ایک درخت کو پایا جس کے تنے کے نیچے سے دو چشمے نکل رہے ہیں، پھر ان میں سے ایک کی طرف گئے اور اس سے طہارت کی تو ان پر نعیم کی تازگی جاری ہوئی، اس کے بعد نہ کبھی ان کی چمڑی غبار آلود ہوئی اور نہ ان کے بال کبھی پریشان ہوئے، گویا انھوں نے تیل لگایا۔

پھر دوسرے چشمے کا قصد کیا، گویا ان کو اس کا حکم کیا گیا تو اس سے پیا تو اُن کے پیٹوں میں رنجش اور خس و خاشاک میں سے جو کچھ تھا، اس کو دور کر دیا اور جنت کے دروازوں پر فرشتوں نے یہ کہتے ہوئے ان کا استقبال کیا کہ ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴾ اور ہر غلمان نے اپنے صاحب کا استقبال کیا، اس کے گرد پھر رہے ہیں، جس طرح کہ بچے اپنے کسی قریبی رشتے دار کے ساتھ کرتے ہیں جو سفر سے آیا ہو۔ تو خوش ہو جا، تیرے لیے یقیناً اللہ نے ایسی ایسی کرامت تیار اور مہیا کر رکھی ہے! اس کے غلمان میں سے ایک غلمان اس کی بیبیوں کی طرف جا رہا ہے، جو حورِ عین میں سے ہیں، اور کہہ رہا ہے کہ یہ فلاں شخص ہے، یعنی اس کا وہ نام لے کر، جو نام دنیا میں تھا، وہ

[1] تفسير الطبري (٣٤٢/٢١) تفسير ابن كثير (٨٦/٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٤) صحيح مسلم (١٦٣)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٢٨) مسند عبد بن حميد (٢٧٧/١) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٢٨)

بیبیاں اس سے پوچھتی ہیں کہ کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟ تو وہ کہتا ہے: ہاں، پھر خوشی اُن کو برانگیختہ کرے گی، یہاں تک کہ وہ دروازے کی دہلیز تک نکل آئیں گی۔ کہا: پھر وہ آئے گا تو کیا دیکھتا ہے کہ صف بہ صف تکیے لگے ہوئے ہیں اور آبخورے رکھے ہوئے ہیں، مسندیں بچھی ہوئی ہیں۔ کہا: پھر وہ اپنے مکان کی دیواروں کی بناوٹ کو دیکھے گا تو کیا دیکھتا ہے۔ ”قَدْ أُسِّسَ عَلٰی جَنْدَلِ اللُّؤْلُؤِ بَیْنَ أَحْمَرَ وَأَخْضَرَ وَأَصْفَرَ وَأَبْیَضَ وَمِنْ کُلِّ لَوْنٍ“ (یعنی اس کی دیواروں کو یوں اٹھایا ہے کہ موتیوں کے تختے سرخ، سبز، زرد اور سفید ایک دوسرے پر رکھے ہیں، کوئی تہہ تو سرخ موتی کا ہے کوئی سبز کا، کوئی زرد کا، کوئی سفید کا، اسی طرح ہر تہہ ہر قسم کے رنگ کا ہے۔ واللّٰہ أعلم بالصواب۔) پھر اپنی نظر اس کی چھت کی طرف اٹھائے گا تو اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ اس کو اس کے لیے مقدر کیا ہے تو قریب تھا کہ اس کی بینائی کو لے جائے، وہ تو البتہ بجلی کی طرح ہے۔ پھر اپنی بیبیوں کی طرف نظر کرے گا جو حورِعین میں سے ہیں، جن کی بڑی بڑی آنکھیں حد درجہ گہری سیاہی اور سفیدی والی ہیں، پھر اپنے چھپرکٹوں میں سے کسی چھپرکھٹ پر تکیہ لگا کر بیٹھے گا، پھر کہے گا: ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾[1] [الأعراف: ٤٣]

پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے مسلمہ بن جعفر بَجلی سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے ابو معاذ بصری کو سنا کہ وہ کہتے تھے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جس وقت وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے تو ان کا استقبال کیا جائے گا، یا اونٹنیاں لائی جائیں گی جن کے پَر ہوں گے اور اُن پر سونے کے کجاوے ہوں گے، ان کی جوتیوں کے تسمے نور ہوگا جو چمک دمک رہا ہوگا، ان کا ہر قدم حدِ نگاہ تک ہوگا، پھر وہ ایک درخت کے پاس پہنچیں گے، جس کی جڑ سے دو چشمے اُبل رہے ہوں گے، ان میں سے ایک چشمے سے تو پئیں گے تو وہ اس میل کچیل کو دھوڈالے گا جو اُن کے پیٹوں میں ہوگا اور دوسرے چشمے سے نہائیں گے، پھر اس کے بعد اُن کے چہرے کبھی غبار آلود نہ ہوں گے اور نہ ہی بال اور اُن پر نعیم کی تازگی جاری ہوگی۔

پھر وہ جنت کے دروازے پر آئیں گے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سونے کے پتّروں پر ایک سرخ یاقوت کا حلقہ ہے، پھر وہ اس حلقے سے اس چھوٹے پتّر پر ضرب لگائیں گے تو اس کی ایک جھنکار سنائی دے گی۔ اے علی! پھر ہر حور کو یہ خبر پہنچ جائے گی کہ اس کا خاوند آ گیا ہے، پھر وہ اپنے قیم، یعنی داروغہ کارکن کو بھیجے گی تو وہ اس کے لیے دروازہ کھولے گا، پھر یہ جب اس کو دیکھے گا تو اس کے لیے گر پڑے گا۔ مسلمہ کہتے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں کہ ابو معاذ نے کہا ”سَاجِداً“، یعنی یہ مومن اس داروغہ کو دیکھ کر سجدے میں گر پڑے گا۔ پھر وہ اس سے کہے گا کہ تو اپنا سر اٹھالے، کیوں کہ میں تو تیرا قیم ہوں، تیرے کام پر مقرر کیا گیا ہوں، پھر وہ اس کے ساتھ ہو جائے گا اور اس کے پیچھے پیچھے چلے گا۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٨٠)

پھر اس حور کو عجلت برانگیختہ کرے گی تو وہ موتی و یاقوت کے خیموں سے نکل آئے گی، یہاں تک کہ اس سے معانقہ کرے گی اور کہے گی: تو میرا دوست ہے اور میں تیری دوست ہوں اور میں وہ ہمیشہ رہنے والی ہوں کہ نہیں مروں گی اور وہ آسودہ ہوں کہ مفلس نہ ہوں گی اور وہ خوش رہنے والی ہوں کہ خفا نہ ہوں گی اور وہ اقامت گزیں ہوں کہ کوچ نہ کروں گی۔ پھر وہ ایک ایسے گھر میں داخل ہوگا جس کی بنیاد سے لے کر چھت تک کا فاصلہ ایک لاکھ گز ہے، اس کی بنیاد موتیوں کے تختے ہیں جو زرد و سبز و سرخ رنگ کے تہہ سے پُر ہیں، کوئی تہہ اپنے ساتھی کا ہم شکل نہیں ہے، اس گھر میں ستر تخت ہیں، ہر تخت پر ستر گدیلے ہیں، ہر گدیلے پر ستر بیبیاں ہیں، ہر بی بی پر ستر حُلّے ہیں، حُلّوں کے اندر سے اس کی پنڈلی کا گودا دکھائی دے رہا ہے۔ ان سب سے ایک رات میں جماع کرے گا، اس رات کی مقدار تمھاری راتوں کے برابر ہے۔ یہ نہر میں ہیں، یعنی ان کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں، نہریں ہیں ﴿ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ﴾ [محمد: ١٥] کی۔ کہا: صاف پانی کی، جس میں کچھ کدورت نہیں ہے۔ دودھ کی نہریں ہیں، جس کا مزا نہیں بگڑا، جو ماشیہ (چلنے والے جانور) کے تھنوں سے نہیں نکلا اور شراب کی نہریں ہیں، پینے والوں کے لیے لذت ہیں جس کو آدمیوں نے اپنے قدموں سے نہیں نچوڑا (اس جگہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ: "بأقداحهم" ہیں۔ صحیح "بأقدامهم" معلوم ہوتے ہیں۔ واللہ أعلم) اور عسلِ مصفّٰی کی نہریں ہیں جو مہوک کے شکموں سے نہیں نکلا۔ وہ میوے چنے گا، اگر چاہے گا تو کھڑے ہو کر اور اگر چاہے گا تو بیٹھ کر اور اگر چاہے گا تو تکیہ لگا کر، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴾ [الدھر: ١٤] ''ان جنتوں کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے اور اُن کے (میوے اور) گچھے نیچے لٹکائے گئے ہوں گے۔''

پھر وہ کھانا چاہے گا تو اس کے پاس سفید پرندے آئیں گے، اور کبھی کہا کہ سبز پرندے، کہا: پھر وہ اپنا بازو اُٹھائیں گے تو اُن کے پہلو سے جس قسم کا کھانا چاہے گا کھائے گا، پھر وہ اُڑے گا اور چلا جائے گا، پھر فرشتہ داخل ہوگا اور کہے گا: ﴿ اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٤٣] ''اور ان سے پکار کر کہا جائے گا کہ اس جنت کے تم وارث بنائے گئے ہو اپنے اعمال کے بدلے۔'' اگر حُور کے بالوں میں سے ایک بال زمین پر گر پڑے تو البتہ روشن کر دے، سورج اس کے ساتھ سیاہی ہو نور میں۔① یہ حدیث غریب ہے اور گویا مرسل ہے۔ واللہ أعلم.

حمد ہی سے آغاز اور اسی پر اختتام:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾

جب اللہ پاک نے اہلِ جنت و نار میں اپنے حکم کا ذکر کیا اور یہ بات بیان کی کہ اُس نے ہر ایک کو اس جگہ میں اتارا جو

① تفسیر ابن کثیر (٨٧/٤) اس کی سند میں انقطاع اور ضعف ہے۔ ''ابو معاذ بصری سلیمان بن ارقم'' ضعیف راوی ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

اس کے لائق، صالح اور مناسب ہے اور وہ اس میں ایسا عادل ہے کہ ظلم نہیں کرتا، پھر اپنے فرشتوں کی خبر دی کہ وہ عرشِ مجید کے اردگرد گھرنے والے ہیں، اپنے رب کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس کی تمجید، تعظیم، تنزیہ اور تقدیس کرتے ہیں ہر قسم کے نقص اور ظلم سے۔ اور قضیہ کا فیصلہ ہو چکا اور امر جاری کیا گیا اور عدل کے ساتھ حکم ہو چکا۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے یوں فرمایا: ﴿ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی خلائق کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا۔

پھر فرمایا: ﴿ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی ساری کائنات بولی، اس کے ناطق، یعنی بولنے والے اور جانور۔ سب نے اللہ رب العالمین کی اس کے حکم اور عدل میں تعریف کی۔ اسی لیے قول کی نسبت کسی قائل کی طرف نہیں کی، بلکہ اس کو مطلق چھوڑا تو اس نے اس پر دلالت کی کہ ساری مخلوق نے حمد کے ساتھ اس کے لیے شہادت دی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے خلق کو حمد کے ساتھ شروع کیا اپنے اس قول میں: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ﴾ اور حمد ہی کے ساتھ اختتام کیا اپنے اس قول میں: ﴿ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ متقی لوگوں کو فرشتے عزت و اکرام اور احترام کے ساتھ ہانک لائے۔ اس "سُوق" سے مراد ان کو عزت اور رضوان کے گھر کی طرف جلد لانا ہے، جس طرح اس شخص کو لاتے ہیں جس کا اکرام و اعزاز کیا جاتا اور جو بعض بادشاہوں کے پاس زیارت اور طلبِ عطا کے لیے آتے ہیں۔ پہلا "سوق" جو دوزخیوں کے بارے میں گزر چکا ہے، اس کا مطلب ان کو ذلت وخواری کے ساتھ عذاب کی طرف ہانکنا ہے، جس طرح کہ قیدی کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، جب اس کو قید کی طرف یا قتل کی طرف ہانک کر لے جاتے ہیں۔ ان دونوں طرح کے ہانکنے ہیں بڑا فرق ہے، وہ کہاں اور یہ کہاں!! وہ تو آگ کے عذاب کی طرف ہے اور یہ روضۂ رضوان کی طرف۔

یہ "سوق" جو دونوں جگہ لایا گیا ہے، یہ انواعِ بدیع سے ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ پاک ایک کلمہ کفار کے حق میں لاتا ہے تو وہ اُن کی ذلت اور سزا و عذاب پر دلالت کرتا ہے اور وہی کلمہ مومنوں کے حق میں لاتا ہے تو وہ اُن کی عزت وعظمت پر اور اچھے بدلے پر دلالت کرتا ہے۔ فسبحان من أنزله معجز المباني متمكن المعاني، عذب الموارد و المثاني" کسی نے کہا ہے کہ کلام بنا بر حذفِ مضاف ہے۔ "أَيْ: سِيْقَتْ مَرَاكِبُهُمْ" یعنی ان کی سواریاں ہانکی گئیں، کیوں کہ وہ سواریوں پر سوار کر کے لائے جائیں گے، جیسا کہ حدیثوں میں وارد ہوا ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٣٤٤) تفسير ابن كثير (٤/٨٤۔٨٨)

"زمر" کے معنی پہلے گزر چکے ہیں، یعنی گروہ گروہ لائے جائیں گے، مثلاً: اہلِ نماز علاحدہ اور اہلِ صوم جدا اور اہلِ صدقہ الگ، اسی طرح اور اعمالِ صالحہ والے۔ ﴿ اِذَا ﴾ کا جواب محذوف ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "سَعِدُوْا وَفُتِحَتْ" یعنی یہاں تک کہ جس وقت وہ جنت کے پاس آئیں گے تو بہرہ مند کیے جائیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: میرے نزدیک قول یہ ہے کہ جواب محذوف ہے اس تقدیر پر کہ "حَتّٰى إِذَا جَاءُوْهَا وَكَانَتْ هٰذِهِ الْأَشْيَاءُ الَّتِيْ ذُكِرَتْ دَخَلُوْهَا" یعنی یہاں تک کہ جب وہ جنت کے پاس آئیں اور یہ چیزیں ہوں گی جن کا ذکر ہوا تو وہ اس میں داخل ہوں گے۔ پس جواب "دَخَلُوْهَا" ہے اور اس لیے حذف کیا گیا کہ کلام میں اس پر دلیل ہے۔

امام اخفش رحمہ اللہ اور کوفی اس بات کے قائل ہیں کہ جواب ﴿ فُتِحَتْ ﴾ ہے اور حرفِ واوٗ زاید ہے۔ بصریوں کے نزدیک یہ قول خطا ہے، اس لیے کہ واوٗ حروفِ معانی سے ہے تو وہ زیادہ نہ ٹھہرایا جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ واوٗ کی زیادتی اس بات پر دلیل ہے کہ دروازے اللہ کے ہاں اُن کی کرامت اور عزت کی وجہ سے اُن کے آنے سے پہلے ہی کھول دیے گئے۔ تقدیر یہ ہے: "حَتّٰى إِذَا جَاءُوْهَا وَأَبْوَابُهَا مُفَتَّحَةٌ" یعنی یہاں تک کہ وہ اس کے پاس آئے اور اس کے دروازے کھلے ہوئے تھے، اس کی دلیل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴾ [صٓ: ٥٠] "ہمیشگی والی جنتیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔" اہلِ نار کے قصے میں واوٗ اس لیے حذف کیا گیا کہ وہ نار پر ٹھہرائے گئے اور اُن کے ٹھہرنے کے بعد دروازے کھولے گئے، تاکہ انھیں ذلیل کیا جائے اور ڈرایا جائے۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے اس کے معنی بعض اہلِ علم کی طرف منسوب کر کے ذکر کیے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: میں نہیں جانتا کہ اس سے پہلے کسی نے اس کی طرف سبقت کی ہو، یعنی یہ معنی بیان کیے ہوں۔ اس قول کی بنا پر واوٗ حالیہ ہوگا بہ تقدیر "قَدْ" کے: "أَيْ: جَاءُوْهَا وَقَدْ فُتِحَتْ لَهُمُ الْأَبْوَابُ" کسی نے کہا ہے کہ واوٗ ثمانیہ ہے۔ عرب کی یہ عادت تھی کہ عدد میں اس طرح کہا کرتے تھے: "خَمْسَةٌ سِتَّةٌ سَبْعَةٌ وَثَمَانِيَةٌ" اس کا بیان پوری تفصیل کے ساتھ سورت براءت میں اور سورۃ الکہف میں گزر چکا ہے۔[1] جنت کے آٹھ دروازے ہونے کے متعلق صحیحین وغیرہما میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔[2] کتاب "مثير ساكن الغرام إلىٰ روضات دار السلام" تالیف: سیدنا ابو الوفاء الصدیق صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ جنت کے احوال کے متعلق بہت حسین اور جامع کتاب ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور طبع ہو کر طلبائے علم کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔ اس کے بعد عام لوگوں کے فائدے کے لیے ایک کتاب اردو میں "هادي القلب السليم" کے نام سے اسی بارے میں تالیف فرمائی، یہ بھی عجیب منور کتاب ہے، یہ بھی طبع ہو کر خاص و عام کے ہاتھوں میں پہنچی۔ جزاه الله تعالىٰ خير الجزاء.

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/٢٨٥) فتح القدير (٤/٦٢٧، ٦٢٨) [2] ان کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

بالجملہ پھر اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ جنت کے خزانچی مومنوں پر سلام کریں گے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ﴾ یعنی تم کو ہر آفت سے سلامتی ہے، اس کے بعد اب کوئی مکروہ چیز تم کو پیش نہ آئے گی۔ ﴿ طِبْتُمْ ﴾ تم دنیا میں شرک و معاصی کی گندگی سے پاک رہے، میلے کچیلے نہ ہوئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "طِبتُم بِطَاعَةِ اللّٰهِ"[1] کسی نے کہا: "بِالْعَمَلِ الصَّالِحِ" معنی ایک ہیں۔ کسی نے کہا: "طَابَ لَكُمُ الْمَقَامُ" یعنی تمھارے لیے مقام پاکیزہ ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ "طَابَتْ حَالُكُمْ وَحَسُنَتْ" یعنی تمھارا حال اچھا ہوا۔

جنت میں داخل ہونے کا سبب طیب اور طہارت کو ٹھہرایا، اس لیے کہ وہ طیبین کا گھر ہے اور طاہرین کی جائے قیام ہے۔ اللہ سبحانہ نے اس کو ہر میل کچیل سے مطہر کیا ہے اور ہر گندگی سے اس کو پاک صاف کیا ہے، چنانچہ اس میں صرف وہی داخل ہو سکے گا جو اس کے مناسب حال ہو اور اس کی صفت کی ساتھ موصوف ہو گا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ جب جہنم کے پل کو عبور کر لیں گے تو ایک اور پل پر روکے جائیں گے جو جنت و نار کے درمیان ہے۔[2] پھر بعض کے لیے بعض سے ان مظالم کا بدلہ لیا جائے گا جو اُن کے آپس میں تھے، یہاں تک کہ جب پاک صاف کر دیے جائیں گے تو رضوان اور رضوان کے اصحاب اُن سے یوں کہیں گے: ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ﴾ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیثِ قنطرہ کو اپنی جامع صحیح میں بہ روایتِ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے۔[3] یہ حدیث نہایت طویل ہے۔ ﴿ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴾ یعنی اب تم جنت میں داخل ہو جاؤ، درآنحالیکہ اس میں تمھارا ہمیشہ رہنا مقدر کیا گیا ہے۔

چنانچہ اس وقت اہلِ جنت کہیں گے: ﴿ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ ﴾ یعنی سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا، یعنی بعث کا اور جنت کے ساتھ ثواب دینے کا جو اس قول میں کیا تھا: ﴿ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴾ [مریم: ٦٣] "یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے انھیں بناتے ہیں جو متقی ہوں۔" اور جس نے ہم کو ارض، یعنی زمینِ جنت کا وارث کیا۔ یہ قول امام قتادہ اور ابو العالیہ رحمہما اللہ کا ہے۔[4] گویا وہ ان کے غیر سے ان کی طرف آ گئے، پس وہ اس کے مالک ہو گئے اور اس میں تصرف کیا جس طرح کہ وارث تصرف کرتا ہے اس شے میں جس کا وہ وارث ہوتا ہے، چنانچہ اس معنی کی بنا پر کلام میں مجاز ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ اس زمین کے وارث ہوئے جو اہلِ نار کے لیے تھی، اگر وہ مومن ہوتے۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔ اس قول کی بنا پر وراثت اپنے حقیقی معنوں میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "أَرْضٌ" سے مراد ارضِ دنیا ہے اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔

جملہ ﴿ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ﴾ حال ہے ﴿ اَوْرَثَنَا ﴾ کی ضمیر سے، یعنی وارث کیا ہم کو

---

[1] تفسیر الطبري (٢١/٣٤١، ٣٤٢) [2] تفسیر القرطبي (١٥/٢٨٦)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٣٠٨) [4] تفسیر القرطبي (١٥/٢٨٧)

جنت کی زمین کا در آنحالیکہ ہم اس میں منازل اور مقامات ٹھہراتے ہیں جس طرح اور جہاں چاہتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کوئی شخص اپنے غیر کے مکان کو پسند کرے گا، اس لیے کہ جنت میں تو ہر ایک کو ایسی فراخ و حسین اور ضرورت سے زیادہ جنت ملے گی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ہی جنت میں سے جہاں چاہے گا ٹھکانا پکڑے گا، اپنے غیر کی جنت کی طرف اسے حاجت نہ ہوگی۔ کسی نے کہا ہے کہ امتِ محمدی سب اُمتوں سے پہلے جنت میں داخل ہوگی تو یہ لوگ جہاں چاہیں گے اتریں گے، یعنی ان میں سے ہر ایک کو اختیار دیا جائے گا اس کی تکریم کے لیے کہ جہاں چاہے اترے، اگر چہ وہ صرف اسی شے کو اختیار کرے گا جو اس کی قسمت میں رکھی گئی ہے۔ رہیں دوسری اُمتیں تو وہ امتِ محمدی کے بعد داخل ہوں گی اور وہ ان مکانوں میں اتریں گے جو امتِ محمدی سے بچے ہوں گے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت دو قسم کی ہے: ایک تو جسمانی جنتیں، ان میں کسی کی شرکت کا احتمال نہیں ہے۔ دوسری روحانی جنتیں ایک کے واسطے ان کا حصول اس سے مانع نہیں ہے کہ دوسرے ان کو حاصل کر سکیں۔

﴿ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴾ مخصوص بالمدح محذوف ہے: ''أَيْ: فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِيْنَ اَلْجَنَّةُ'' یہ قول اہلِ جنت کے قول کے تتمہ سے ہے، یعنی وہی جنت والے کہتے ہیں کہ جب ہماری عیش کا یہ حال ہے کہ ہم جہاں چاہتے ہیں اترتے ہیں، جس مکان میں چاہتے ہیں اترتے ہیں، جس مکان میں چاہتے ہیں رہتے بستے ہیں، کسی طرح کی روک ٹوک نہیں ہے، کیا اچھی مزدوری ہے یہ جنت ان کی جنھوں نے دنیا میں نیک کام کیے! کسی نے کہا کہ یہ قول اللہ پاک کے قول سے ہے۔

جب اللہ سبحانہ نے مومنین کے بلند درجات کا ذکر کر لیا جو اُن کو عطا ہوئے تو اس کے بعد ان اہلِ کرامات کا بیان کیا جن کو کوئی شے عبادات سے باز رکھنے والی نہیں ہے۔ چنانچہ خطاب کو اشرفِ خلق کی طرف پھیر دیا اور ارشاد فرمایا: ﴿ وَتَرَى الْمَلٰٓىِٕكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ ﴾ اس لیے کہ اس رویت کا حق سوائے آپ ﷺ کے اور کسی سے ادا نہیں ہو سکتا، یعنی اے محمد! تو اس دن فرشتوں کو دیکھے گا اس حال میں کہ وہ احاطہ کرنے والے، گھیرنے والے اور قیام کرنے والے ہوں گے تمام حقوق کے ساتھ جو عرش کی جوانب سے ان پر ہیں جن کا احاطہ کرنا ممکن ہوگا۔ پھر اُن کے احاطہ کرنے کے سبب سے تسبیح، تمجید اور تقدیس کی آواز سنائی دے گی۔

کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ نے یہ بات سمجھائی کہ باوجود اپنی اس کثرت کے جس کا شمار اللہ عزوجل کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا، فرشتے عرش کے گرد کو بھر نہ سکیں گے۔ یہ قول امام بیضاوی رحمہ اللہ کے اس قول سے اولیٰ ہے کہ کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ زیادہ ہے۔[1] امام اخفش رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ زاید ہے۔ یا کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کا ہے، یعنی عرش کے گرد فرشتوں کے احاطہ کرنے کی ابتداء وہاں تک ہے، جہاں تک اللہ پاک نے چاہا۔ معنی یہ ہیں کہ اس دن دیکھنے

[1] تفسير البيضاوي (٥/٨٠)

41

والا اُن کو اس صفت میں دیکھے گا۔ ﴿ حَآفِّیْنَ ﴾ جمع ہے "حَافٌّ" کی۔[1] (قاله الأعمش) "حاف" کہتے ہیں: "مُحْدِقٌ بِالشَّيْءِ" کو، یعنی جو کوئی کسی شے کا احاطہ کرنے والا ہو تو وہ اس کا "حاف" ہے۔ یہ "حَفَفْتُ بِالشَّيْءِ" سے ماخوذ ہے۔ یہ اس وقت کہو گے: جب تم اس شے کا احاطہ کرو گے اور یہ "حفاف" سے ماخوذ ہے۔ "حفاف" بہ معنی جانب ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَآفِّیْنَ ﴾ کا اس کے لفظ سے واحد نہیں ہے۔[2] امام زمخشری نے بھی فراء رحمہ اللہ کی پیروی کی ہے۔[3] گویا ان دونوں نے یہ خیال کیا کہ واحد "حاف" نہیں ہو سکتا ہے، اس لیے کہ "حفوف" "إحداق و إحاطة بشيء" ہے اور یہ محقق نہیں ہوتا ہے، مگر جمع میں۔

جملہ ﴿ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ بنا بر حال ﴿ حَآفِّیْنَ ﴾ کی ضمیر سے محلِ نصب میں ہے، یعنی وہ گھیرنے والے ہیں گردِ عرش سے، اس حال میں کہ تسبیح کرنے والے ہیں، اس کی حمد کے ساتھ ملا کر۔ مطلب یہ ہے کہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ" کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ یُسَبِّحُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے رب کا شکر ادا کرنے کے لیے عرش کے گرد نماز پڑھتے ہیں۔ یہ تسبیح تلذذ کی ہے، تعبد کی نہیں ہے، کیوں کہ اس دن تکلیف زایل ہو جائے گی، یعنی وہ دار العمل نہیں ہے اور اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا ثواب بعینہ یہی تسبیح ہے اور اس نے یہ بات بھی سمجھا دی کہ علیین کے درجات اور لذتوں کا منتہیٰ اللہ سبحانہ کی صفات میں مستغرق ہونا ہے۔ اللهم ارزقنا، آمین.

﴿ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی سارے بندوں اور مخلوقات کے درمیان اس طرح سے عدل کے ساتھ فیصلہ کیا گیا کہ اُن میں سے بعض جنت میں اور بعض دوزخ میں داخل کیے گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ انبیاء کے درمیان جو شہداء کے ساتھ لائے گئے تھے اور اُن کی اُمتوں کے درمیان فیصلہ کیا گیا۔ کسی نے کہا کہ فرشتوں کے درمیان فیصلہ کیا گیا اس طرح سے کہ ان کو ان کے درجوں کے مطابق ان کے منازل میں قائم کیا گیا۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

﴿ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ اس کے قائل مومنین ہیں، انھوں نے اللہ کی حمد کی اس بات پر کہ اس نے اُن کے اور اہلِ نار کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا، جیسا کہ اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ [یونس: ١٠] "اور اُن کی آخری بات یہ ہو گی کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہاں کا رب ہے۔ کسی نے کہا کہ اس کے قائل فرشتے ہیں، انھوں نے اس پر اللہ پاک کی حمد کی کہ اس نے حکم میں عدل کیا اور اس پر کہ اس نے اپنے بندوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا۔ اللہ سبحانہ نے اس آیت کو حمد کے ساتھ شروع کیا اور اسی کے ساتھ ختم فرمایا، اس سے اس بات پر آگاہ کرنا مقصود ہے کہ ہر کام کی ابتداء اور انتہاء میں اس کی حمد کرنا چاہیے، جبکہ پہلی حمد تو وعدے کی سچائی اور جنت کا وارث کرنے پر ہے اور یہ حمد حق کے ساتھ فیصلہ کرنے پر

[1] تفسير القرطبي (٢٨٧/١٥) [2] تفسير القرطبي (٢٨٧/١٥) [3] الكشاف (١٥٠/٤)

ہے۔ تو اب اس میں کسی طرح کی تکرار نہیں ہوئی۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر سورۃ الزمر کا آخری حصہ پڑھا تو منبر نے دو بار حرکت کی۔[1] (ذکرہ القرطبي)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ ﴾ میں دو احتمال ہیں: یا تو یہ قول ثواب میں ملائکہ کے احوال کی تشریح کے لیے ہے اور اس بات کے بیان کے لیے ہے کہ ان کے ثواب کی جگہ عرشِ معلیٰ کے اطراف اور جوانب ہے، جبکہ بشر کے ثواب کی تفصیل اور یہ بات بیان ہو چکی کہ ان کے ثواب کی جگہ جنت ہے۔ لہٰذا قولہ تعالیٰ: ﴿ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ یہی بات ظاہر کرے گا کہ ان کا ثواب بعینہ یہی تحمید و تسبیح ہے اور ثواب کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ بندوں کی عقلیں اللہ کی پاکیزگی اور تقدیس کی منازل میں مستغرق رہیں، یعنی ان میں غور کرتی رہیں۔ اور قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ کے یہ معنی ہوں گے کہ فرشتوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا، یہ بات بتانے کے لیے کہ وہ معرفت اور طاعت میں مختلف درجات اور مراتب پر ہیں اور اُن میں سے ہر ایک اپنے اس مرتبے سے آگے نہیں بڑھتا جو اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے، پھر جب ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا تو انھوں نے کہا: ﴿ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں، اس بات پر کہ اس نے ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا۔

یہاں ایک نفیس نکتہ ہے، وہ یہ کہ جب فرشتوں نے متقی لوگوں کو اس قول سے خطاب کیا: ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴾ تو متقیوں نے اس وقت یہ کہا: ﴿ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ ﴾ یعنی اللہ کی تعریف ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا، جو ان الفاظ کے ساتھ کیا تھا: ﴿ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ ﴾ [حم السجدة: ۳۰] اس کے برعکس جب فرشتوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا تو انھوں نے کہا: ﴿ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی انھوں نے اس فیصلے کی وجہ سے حمد نہ کی، بلکہ اس لیے اس کی حمد کی کہ وہ رب العالمین ہے اور یہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ معرفت میں اُن کا طبقہ زیادہ بلند ہے، کیوں کہ جس شخص نے منعم کی حمد اس کے انعام کی وجہ سے کی، جو اس کی طرف پہنچنے والا ہے تو حقیقت میں اس نے منعم کی حمد نہیں کی اس نے تو صرف انعام کی حمد کی۔ رہا وہ شخص جس نے اس کی صفتِ کمال اور علوِ شان اور کبریائی کے سبب سے اس کی حمد کی تو بے شک معرفت میں اس کا استغراق زیادہ ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ﴿ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ ﴾ متقین کے ثواب کی تشریح کا تتمہ ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اس طرح کہیں کہ جب متقیوں نے ﴿ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا

---

[1] المعجم الأوسط (۸/۱۷۱) تفسیر القرطبي (۱۵/۲۸۷) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رواه الطبراني فی الأوسط من رواية أبي بحر البكراوي عن عباد بن ميسرة المنقري وكلاهما ضعيف'' (مجمع الزوائد: ۲/۴۱۷)

الْأَرْضَ ﴾ کہا اور اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ وہ جنت میں اللہ کی حمد کے ساتھ مشغول ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان کی کہ جس طرح متقیوں کا کام جنت میں اللہ کی حمد میں مشغول ہونا ہے، اسی طرح ملائکہ حافین حول العرش کا کام تسبیح اور تحمید میں مشغول رہنا ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی بشر کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا۔[1] (كذا أفاده العلامة محي الدين شيخ زاده رزقه الله حسنىٰ وزيادة)

الحمد للّٰه وحده، والصلاة و السلام على من لا نبي بعده کہ سورۃ الزمر کی تفسیر محلہ امیر گنج میں سیوم ماہ ربیع الاول قریب نصف شب یک شنبہ (اتوار) تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی توفیق عطا کرے۔ اللهم اغفرلنا وتب علينا وارحمنا وأحسن عواقبنا في الأمور كلها، وصلى الله علىٰ سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وأصحابه وأشياعه ملأ ما علمت وزنة ما علمت وعدد ما علمت، والحمد للّٰه أولا وآخرا وظاهرا وباطنا.

---

[1] فتح البيان (١٢/١٥١۔١٥٤)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سُوْرَةُ غَافِرٍ

اس سورت کو سورۃ المؤمن اور سورۃ الطول بھی کہتے ہیں۔ اس کی پچاسی (۸۵) آیتیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ بیاسی (۸۲) آیتیں ہیں۔ (قاله القرطبي) امام حسن، عطاء، جابر اور عکرمہ رحمہ اللہ کے قول میں یہ سورت مکی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سوائے قوله تعالیٰ: ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ﴾، اس لیے کہ نمازیں مدینے میں نازل ہوئی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: مگر دو آیتیں مدینے میں نازل ہوئی ہیں اور وہ یہ ہیں: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ اور وہ آیت جو اس کے بعد ہے۔[1] (وكذا نص عليه السيوطي في الإتقان وفي لب الأصول في أسباب النزول). سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۃ المومن مکے میں اتاری گئی۔ (أخرجه ابن مردويه وأخرج أيضاً عن ابن الزبير مثله) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ساتوں حوامیم مکے میں نازل کی گئیں۔ (أخرجه ابن الضريس و النحاس والبيهقي في الدلائل) سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ساری حوامیم مکے میں نازل ہوئیں۔[2] (أخرجه ابن مردويه و الديلمي)

حوامیم کی فضیلت:

① سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ فرماتے تھے: بے شک اللہ نے مجھ کو تورات کے بجائے سات حوامیم عطا کیں اور مجھ کو الرٰٓ آت طواسین تک بجائے انجیل کے عطا کیں اور جو طواسین کے درمیان ہیں حوامیم تک، وہ مجھ کو زبور کی جگہ عطا کیں۔ اور مجھ کو حوامیم اور مفصل کے ساتھ فضیلت دی۔ ان کو مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں پڑھا۔ (أخرجه محمد بن نصر و ابن مردويه)

② سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بے شک ہر شے کے لیے ایک لباب ہے اور بے شک قرآن کا لُباب آل حم ہے۔[3] (أخرجه أبو عبيد في فضائله)

③ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حوامیم دیباجِ قرآن ہیں۔[4] (دیباج: بالکسر ریشمی کپڑوں کو کہتے ہیں،

---

① تفسير القرطبي (۲۸۸/۱۵) ② الدر المنثور (۲٦۸/۷)

③ الدر المنثور (۲٦۸/۷) ④ مستدرك الحاكم (٤٧٤/۲) شعب الإيمان (٤٨٣/۲)

یہاں مراد زینت ہے)۔ (أخرجه أبو عبيد وابن الضريس وابن المنذر والحاكم والبيهقي في الشعب)

④ ان کا دوسرا قول یہ ہے: "إِذَا وَقَعْتُ فِي آل حم وَقَعْتُ فِي رَوْضَاتٍ دَمِثَاتٍ أَتَأَنَّقُ فِيهِنَّ"[1] (أخرجه أبو عبيد و محمد بن نصر و ابن المنذر) یعنی جس وقت میں ان سورتوں میں واقع ہوں جن کے شروع میں حٰم ہے تو میں نرم زمین کے چمنوں میں واقع ہوتا ہوں ان سے خوش ہوتا ہوں اور اُن کے محاسن اور خوبیوں سے لذت لیتا ہوں۔

⑤ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حوامیم دیباجِ قرآن ہیں۔[2] (أخرجه أبو نعيم وأبو الشيخ والديلمي)

⑥ خلیل بن مُرہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ حوامیم سات ہیں اور دوزخ کے دروازے سات ہیں، ان میں سے ہر حٰم آئے گی اور ان دروازوں میں سے ایک دروازے پر ٹھہرے گی اور کہے گی: اے اللہ! اس دروازے سے اس شخص کو مت داخل کر جو مجھ پر ایمان لاتا تھا اور مجھ کو پڑھتا تھا۔[3] (أخرجه البيهقي في الشعب)

⑦ سعد بن ابراہیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حوامیم کا نام عرائس رکھا جاتا ہے، یعنی دُلہنیں۔[4] (رواه الدارمي في مسنده) (مسعر بن کدام کے الفاظ یہ ہیں: "كان يقال لهن العرائس"[5] على ما رواه أبو عبيد القاسم بن سلّام في فضائل القرآن كذا في ابن كثير)۔

⑧ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص صبح کے وقت ﴿حٰمٓ ... إِلَيْهِ الْمَصِيرُ﴾ تک اور آیت الکرسی پڑھے تو وہ اُن کی وجہ سے شام تک محفوظ رہے گا اور جو کوئی ان کو شام کے وقت پڑھے تو اُن کی وجہ سے صبح تک محفوظ رہے گا۔[6] (أخرجه أبو عبيد وابن سعد ومحمد بن نصر وابن مردويه والبيهقي في الشعب)

⑨ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "إِنَّ مَثَلَ الْقُرْآنِ (خازن میں "إن مثل صاحب القرآن" ہے) كَمَثَلِ رَجُلٍ اِنْطَلَقَ يَرْتَادُ لِأَهْلِهِ مَنْزِلًا فَمَرَّ بِأَثَرِ غَيْثٍ (شاید اثرِ غیث سے مراد روئیدگی ہے)

---

① مصنف ابن أبي شيبة (٦/١٥٣) الدر المنثور (٧/٢٦٨)

② الدر المنثور (٧/٢٦٩) اس کی سند میں ''عبدالقدوس بن حبیب'' سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٥٣٧)

③ شعب الإيمان (٢/٤٨٥) اس کی سند میں ''خلیل بن مرہ'' ضعیف راوی ہے، نیز یہ سند معضل ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦١٨٣)

④ سنن الدارمي (٢/٥٥٠) ⑤ تفسير ابن كثير (٤/٨٨)

⑥ سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٧٩) الدر المنثور (٧/٢٦٩) اس کی سند میں ''عبدالرحمان بن ابی بکیر'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٥٧٦٩)

فَبَيْنَمَا هُوَ يَسِيرُ فِيهِ وَيَتَعَجَّبُ مِنْهُ إِذْ هَبَطَ عَلَىٰ رَوْضَاتٍ دَمِثَاتٍ فَقَالَ: عَجِبْتُ مِنَ الْغَيْثِ الْأَوَّلِ فَهَذَا أَعْجَبُ وَأَعْجَبُ فَقِيلَ لَهُ: إِنَّ مَثَلَ الْغَيْثِ الْأَوَّلِ مَثَلُ عُظْمِ الْقُرْآنِ ("عُظْمٌ": بہ ضم عین وسکون ظاء بہ معنی معظم ہے) وَإِنَّ مَثَلَ هٰؤُلَاءِ الرَّوْضَاتِ الدَّمِثَاتِ (خازن میں "هٰؤلاء" کے بجائے "هذه" ہے) مَثَلُ آل حَم فِي الْقُرْآنِ"۔[1] (رواه حميد بن زنجويه و أورده البغوي) یعنی قرآن کی مثل اس شخص کی مثل کی طرح ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے کسی منزل کی تلاش کے لیے چلا اور وہ بارش کے اثر پر سے گزرا۔ اس اثنا میں کہ وہ اس میں تعجب کرتا ہوا جا رہا تھا کہ نرم زمین کے چمنوں پر اُترا تو بولا کہ میں نے تو پہلے بارش پر تعجب کیا تھا تو یہ جگہ تو اس سے بھی بہت زیادہ خوب ہے، پس اس سے کہا گیا کہ اوّل بارش کی مثل تو اکثر قرآن کی مثل ہے اور ان نرم زمین کے چمنوں کی مثل قرآن میں حٰم کی مثل ہے۔

10 امام ابو عبید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا اشجعی رحمہ اللہ نے، کہا: ہم سے بیان کیا مسعر بن کدام نے اس شخص سے جس نے ان سے بیان کیا کہ ایک شخص نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ ایک مسجد بنا رہے ہیں، اُن سے کہا: یہ کیا ہے؟ فرمایا: "أَبْنِيهِ مِنْ أَجْلِ آل حٰمٓ" یعنی میں اس کو آلِ حٰم کے لیے بنا رہا ہوں۔[2] شاید مسجد جو ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے بنائی، وہی مسجد ہو جو قلعہ دمشق کے اندر ان کی طرف منسوب ہے اور شاید اس کی حفاظت اور نگہبانی انہیں کی برکت سے اور اس شے کی برکت سے ہو جس کے لیے وہ بنائی گئی، کیوں کہ ان کا یہ کلام دشمنوں پر نصرت پر دلالت کرتا ہے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی غزوے کے موقع پر اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اگر تم رات کے وقت شب خون مارے جاؤ تو کہنا: « حٰمٓ لَا يُنْصَرُوْنَ ». ایک روایت میں « لَا تُنْصَرُوْنَ » ہے۔[3] (کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں: "اللهم لا ينصرون". اس سے مراد خبر ہے دعا نہیں ہے۔ اگر دعا ہوتی تو "لا ينصروا" بہ جزم فرماتے۔ (اس کا یوں جواب دیا ہے کہ یہ نہی کے معنی میں خبر ہے۔) گویا یوں فرمایا: "والله لا ينصرون". کسی نے کہا ہے کہ وہ سورت جس کے شروع میں حٰم ہے، اس کی ایک بڑی شان ہے۔ چنانچہ اس بات سے متنبہ فرمایا کہ اس کا ذکر اس کے نازل کرنے والے کے شرف کے سبب سے اس قسم سے ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے نصرت کے نازل ہونے کی طلب میں قوت چاہی جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "لا ينصرون" کلامِ مستانف ہے، گویا جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہو ﴿ حٰمٓ ﴾ تو کسی نے کہا کہ جب ہم کہیں گے تو کیا ہوگا؟ چنانچہ فرمایا کہ "لا ينصرون" یعنی ان کو مدد نہ دی جائے گی۔ كذا في المجمع)

11 امام بزار رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی آیت الکرسی،

---

[1] تفسير البغوي (١٣٤/٧) تفسير الخازن (٨٧/٦) [2] الدر المنثور (٢٦٩/٧)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٩٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٩٧)

اور پہلی حم المؤمن پڑھے تو وہ اس دن ہر برائی سے بچایا جائے گا۔[1] پھر امام بزار رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم ان روایت کو صرف اسی اسناد سے جانتے ہیں۔ (ورواہ الترمذي من حدیث الملیکي، وقال: تکلم فیه بعض أهل العلم من قبل حفظه)

بعض سلف نے، جن میں سے امام ابن سیرین رحمہ اللہ ہیں، اس بات کو مکروہ رکھا ہے کہ حوامیم کہا جائے اور یہ کہا ہے کہ آل حم کہا جائے۔ (کما رواہ أبو عبید علی ما ذکرہ الحافظ ابن کثیر) امام جوہری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آل حم قرآن شریف میں کئی سورتیں ہیں۔ اب رہا یہ قول عامہ کا الحوامیم تو یہ کلام عرب سے نہیں ہے۔ حریری بھی "درة الغواص" میں اسی کے قائل ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ الحوامیم علی غیر قیاس ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ ذوات حم جمع کی جائے۔[2] انتھیٰ. پس مجموعی طور پر اخبار، آثار اور اقوال سے معلوم ہوا کہ ان سات سورتوں کا نام حوامیم رکھا جاتا ہے اور آلِ حم بھی اور ذواتِ حم بھی کہتے ہیں تو اُن کے تین استعمال ثابت ہوئے، بخلاف اس شخص کے جس نے پہلے نام کا انکار کیا ہے، لیکن یہ انکار صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ جب نبی اکرم ﷺ کے کلام میں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے کلام میں وارد ہوا تو اب انکار کی کیا وجہ ہے، گو خلافِ قیاس ہو اور اس کو عوام کی زبان ٹھہرانا تو نہایت درجے کی بے ادبی ہے، بلکہ اخص الخواص کا لفظ زیادہ صحیح ہے۔ واللّٰہ أعلم.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۲ غَافِرِ الذَّنْۢبِ
وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۳

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

حٰمٓ ① اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو نہایت غالب، خوب جاننے والا ہے ② گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت سزا (دینے) والا، بڑا فضل والا ہے، اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ③

﴿حٰمٓ﴾ کی فضیلت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہا ہے کہ ﴿حٰمٓ﴾ ایک اسم ہے اللہ عزوجل کے اسماء سے۔ اس کے متعلق

① سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۸۷۹) مسند البزار (۲/۴٤٥) اس کی سند میں "عبدالرحمان بن ابی بکیر" ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ۵۷۶۹)

② تفسیر القرطبي (۱۵/۲۸۸)

ایک بیت پڑھا، وہ یہ ہے:

يُذَكِّرُنِي حٰمٓ وَالرُّمْحُ شَاجِرٌ فَهَلَّا تَلَا حٰمٓ قَبْلَ التَّقَدُّمِ

اور ﴿حٰمٓ﴾ اس حدیث میں وارد ہوا ہے جس کو امام ابو داود اور ترمذی نے "من حديث الثوري عن أبي إسحاق عن المهلب بن أبي صفرة" روایت کیا ہے، کہا: مجھے اس شخص نے حدیث بیان کی جس نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ فرماتے تھے: « إِنْ بُيِّتُّمُ اللَّيْلَةَ فَقُولُوْا حٰمٓ لَا يُنْصَرُوْنَ »[1] یہ اسناد صحیح ہے۔ امام ابوعبید رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے کہ یوں روایت کی جائے: « فَقُولُوْا حٰمٓ لَا يُنْصَرُوْا » یعنی اگر تم اُس کو کہو گے تو وہ مدد نہ دیے جائیں گے۔ « لَا يُنْصَرُوْا » کو "فَقُولُوْا" کی جزاء ٹھہرائی ہے۔[2] (اوپر ذکر کیے گئے بیت کا قصہ یہ ہے کہ جنگِ جمل کے دن جب کوئی شخص محمد بن طلحہ پر حملہ کرتا تو وہ کہتا: "نَشَدْتُكَ بِحٰمٓ"۔ [حاشیہ مجمع البحار میں لکھا ہے: "وقيل: حم من أسماء الله تعالى ونسب إلى ابن عباس رضی اللہ عنہما فإن صح يأول بمنزل حم وهو الله تعالى فهو اسمه بحذف مضاف"][3] یعنی میں تجھ کو حم کی قسم دیتا ہوں، یہاں تک کہ شریح نے اس پر حملہ کیا، پھر اسے قتل کر ڈالا اور یہ شعر انشاء کیا کہ تو مجھے حٰم یاد دلاتا ہے، اس حال میں کہ نیزہ مختلف ہو رہا ہے، پھر کیوں نہ پڑھے پیش قدمی کرنے سے پہلے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی مراد یہ آیت ہے: ﴿قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ [الشوریٰ: ۲۳] استدلال کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ﴿حٰمٓ﴾ کو اعراب دیا ہے، اگر وہ حروفِ تہجی ہوتے تو ایسے نہ ہوتے۔[4] كذا في مجمع البحار)۔

کتاب اتارنے والا اللہ بخشنے اور عذاب دینے میں بے مثل ولا ثانی ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ﴾ یعنی اس قرآن کا نازل کرنا اللہ کی طرف سے ہے جو عزت اور علم والا ہے۔ چنانچہ اس کی بارگاہِ عالی جاہ کا کوئی قصد نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی ذرہ اس سے مخفی رہ سکتا ہے، اگرچہ اس کا حجاب گاڑھا ہو۔ ﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ﴾ یعنی اس گناہ کو جو گزر چکا ہے بخش دیتا ہے اور جب کوئی اس کی طرف رجوع ہو اور اس کے سامنے عاجزی اور فروتنی کرے آیندہ میں توبہ قبول کرتا ہے۔ ﴿شَدِيْدِ الْعِقَابِ﴾ یعنی سخت مار مارنے والا ہے اس کو جس نے تمرد وسرکشی کی اور دنیا کو اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکموں سے بغاوت اور سرکشی کی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ﴾ [الحجر: ۴۹] "میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت ہی بخشنے والا ہوں اور بڑا ہی مہربان ہوں

---

1. سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٩٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٨٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٩٧)
2. تفسير ابن كثير (٨٩/٤)
3. مجمع بحار الأنوار (٣٩٠/٥)
4. مجمع بحار الأنوار (٥٨٧/١، ٥٨٨)

اور ساتھ ہی میرے عذاب بھی نہایت دردناک ہیں۔'' اللہ پاک قرآن شریف میں اکثر جگہ ان دو صفتوں کو ایک جگہ ذکر فرمایا کرتا ہے، تاکہ بندہ خوف اور امید کے درمیان رہے۔

اللہ تعالیٰ کی وسعت وغنا کا بیان:

﴿ ذِی الطَّوْلِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ﴿ اَلطَّوْلِ ﴾ سے مراد وسعت وغنا ہے، یعنی فراخیٔ غنا والا ہے۔ اسی طرح امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ یزید بن الاصم نے کہا ہے کہ مراد خیرِ کثیر ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: "ذِيُ الْمَنِّ" ہے، یعنی منت واحسان والا ہے۔ نیز امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "ذِيُ النِّعَمِ وَالْفَوَاضِلِ" ہے۔[1] معنی یہ ہیں کہ اپنے بندوں پر فضل وکرم اور مہربانی کرنے والا ہے، ان پر منت رکھنے والا ہے، ان منتوں اور انعامات کے ساتھ کہ جن میں وہ ہیں جن میں سے وہ ایک کا شکر کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتے۔ ﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [النحل: ۱۸] ''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو تم اسے نہیں کر سکتے۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔'' ؎

از دست و زبان کہ بر آید — کز عہدۂ شکرش بدر آید
بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش — عذر بدرگاہ خدا آورد

''وہ کون ہے جو اپنے ہاتھوں اور زبان سے اس (اللہ) کے شکر سے عہدہ برا ہو سکے؟ آدمی وہی بہتر ہے جو اپنی خطا پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معذرت کرتا ہے۔''

قولہ: ﴿ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی اس کی ساری صفات میں کوئی اس کا نظیر نہیں ہے، پس نہ اس کے سوا کوئی معبود ہے اور نہ کوئی رب ہے، اسی کی طرف مرجع اور مآب ہے۔ سب کے سب اسی کے پاس پھر کر جائیں گے تو وہ ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔ امام ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو اسحاق سبیعی کو سنا، وہ کہتے تھے کہ ایک شخص سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور عرض کی: اے امیر المومنین! میں نے قتل کیا ہے، پھر کیا میرے لیے کوئی توبہ ہے؟ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھا: ﴿ حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ﴾ اور فرمایا کہ عمل کر اور نا اُمید مت ہو۔[2] (رواه ابن أبي حاتم و اللفظ له و ابن جرير)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یزید بن الاصم سے روایت کیا ہے کہ اہلِ شام میں سے ایک شخص لڑائی کرنے والا تھا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا کرتا تھا، پھر انھوں نے اس کو گم پایا تو فرمایا: "مَا فَعَلَ فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ" یعنی اُس کا

---

[1] تفسير الطبري (۳۵۱/۲۱) تفسير ابن كثير (۸۹/٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (۳۲٦٤/۱۰) تفسير الطبري (۳۵۰/۲۱)

کیا حال ہے؟ چنانچہ لوگوں نے عرض کی: ''يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِيْنِ تَتَابَعَ فِي هٰذَا الشَّرَابِ'' یعنی وہ شراب بہت پینے لگا ہے۔ کہا پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے منشی کو بلایا اور فرمایا: لکھ: ''مِنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ إِلٰى فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ، سَلَامٌ عَلَيْكَ فَإِنِّي أَحْمَدُ إِلَيْكَ اللّٰهَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، ﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾'' (''إِلَيكَ'' میں کلمۂ ''إِلٰى'' بہ معنی ''مع'' ہے یعنی ''أحمد معك الله الذی'' الخ)۔ پھر اپنے اصحاب سے فرمایا: اللہ سے اپنے بھائی کے لیے اس بات کی دعا کرو کہ وہ اس کے دل کو متوجہ کر دے اور اللہ اس پر رجوع ہو۔ پھر جب اس شخص کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان پہنچا تو وہ اس کو بار بار پڑھتا تھا اور کہتا تھا: ﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ﴾ یقیناً اس نے اپنی عقوبت سے ڈرایا اور مجھ سے وعدہ کیا کہ میری مغفرت کرے گا۔[1] اور حافظ ابونعیم نے جعفر بن برقان سے مروی حدیث سے اس کو روایت کیا ہے اور اتنا زیادہ کہا: پس وہ اپنے آپ پر اس کی تکرار کرتا رہا، پھر رویا، پھر باز رہا تو اچھی طرح سے باز رہا۔

پھر جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر پہنچی تو فرمایا کہ اب تم اسی طرح کیا کرو کہ جب اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ اس نے کوئی لغزش کی تو ''فَسَدِّدُوْهُ وَوَثِّقُوْهُ وَادْعُوا اللّٰهَ لَهُ أَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِ وَلَا تَكُوْنُوْا أَعْوَانًا لِلشَّيْطَانِ عَلَيْهِ''[2] یعنی اس کو راہِ صواب بتاؤ، اس کو راست و درست کرو اور اس کو مضبوط اور پختہ کرو اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ اس پر رجوع ہو اور اس پر شیطان کے مددگار مت بنو۔ مطلب یہ ہے کہ وعظ و نصیحت میں میانہ روی کریں، افراط و تفریط سے بچیں، سرزنش و ملامت اور سخت کلامی سے پیش نہ آئیں، ورنہ بجائے نفع کے نقصان ہوگا۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ثابت بُنانی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں مُصعب بن زبیر رحمہ اللہ کے ساتھ سوادِ کوفہ میں تھا تو میں دو رکعت نماز پڑھنے کے لیے ایک باغ میں داخل ہوا۔ پھر میں نے حم المومن کی تلاوت شروع کی، یہاں تک کہ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ تک پہنچا کہ اچانک میرے پیچھے ایک شخص سفید خچر پر سوار ظاہر ہوا، جس پر عمدہ یمنی لباس تھا، اس نے آکر کہا کہ جب تو کہے: ﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ﴾ تو یوں کہہ ''يَا غَافِرَ الذَّنْبِ اِغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ'' یعنی اے گناہوں کو بخشنے والے! تو میرا گناہ بخش دے اور جب تو کہے: ﴿وَقَابِلِ التَّوْبِ﴾ تو یوں کہہ: ''يَا قَابِلَ التَّوْبِ اِقْبَلْ تَوْبَتِيْ'' یعنی اے توبہ قبول کرنے والے! تو میری توبہ قبول کر اور جب تو کہے: ﴿شَدِيْدِ الْعِقَابِ﴾ تو یوں کہہ: ''يَا شَدِيْدَ الْعِقَابِ لَا تُعَاقِبْنِيْ'' یعنی اے سخت عقاب والے! تو مجھ کو عقاب مت کر۔ کہا پھر میں نے مڑ کر دیکھا تو کسی کو نہ دیکھا، پھر میں دروازے کی طرف گیا تو میں نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص عمدہ یمنی لباس پہنے ہوئے تمھارے پاس سے گزرا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہم نے کسی کو نہیں دیکھا، چنانچہ لوگ خیال کرتے تھے کہ وہ الیاس تھے۔[3] (ثم رواه من طريق أخرى عن ثابت بنحوه وليس فيه ذكر إلياس والله سبحانه وتعالى أعلم)

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٦٣/١٠) [2] حلية الأولياء (٩٧/٤، ٩٨)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٦٣/١٠، ٣٢٦٤) تفسير ابن كثير (٨٩/٤، ٩٠)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ جمہور نے ﴿ حٰمٓ ﴾ کو بہ اشباعِ فتحِ حاء پڑھا ہے اور امام حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے بہ امالۂ محضہ اور ابو عمرو نے بہ امالۂ بین بین پڑھا ہے۔ جمہور نے بہ سکونِ میم دوسرے حروفِ مقطعہ کی طرح پڑھا ہے اور امام زہری رحمہ اللہ نے بہ ضمِ میم اس بنا پر پڑھا ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ یا ﴿ حٰمٓ ﴾ مبتداء اور اس کا مابعد خبر ہے۔ عیسیٰ بن عمر ثقفی نے بہ فتحِ میم پڑھا ہے۔ اس قراءت میں دو احتمال ہیں: ایک یہ ہے کہ فعل مقدر سے منصوب ہے: "أَيْ: إِقْرَأْ حٰم" یعنی پڑھ تو ﴿ حٰمٓ ﴾ کو اور غیر منصرف جو ہوا تو بہ سبب علمیت و تانیث کے، یا بہ سبب علمیت و شبہ عجمہ کے، اس لیے کہ عربی زبان میں فاعیل کا وزن نہیں ہے بہ خلاف عجمی زبان کے کہ اس میں یہ وزن موجود ہے، جیسے: قابیل و ہابیل۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا فتح تخفیف کے لیے بنائی حرکت ہے، جیسے: "أَيْنَ وَكَيْفَ". امام ابن ابی اسحاق اور ابو السماک رحمہ اللہ نے بہ کسرِ میم پڑھا ہے بہ سبب التقائے ساکنین کے، یا بہ تقدیرِ قسم کے۔ جمہور نے حرفِ حاء کا میم سے وصل کیا ہے اور ابو جعفر نے بہ قطع (الگ الگ) پڑھا ہے۔ ﴿ حٰمٓ ﴾ کے معنی میں اختلاف ہے۔ کسی نے تو کہا ہے کہ اسمائے الٰہی سے ایک اسم ہے۔ (قاله أبو أمامة) یا اسمائے قرآن شریف سے ایک اسم ہے۔ (قاله قتادة) امام ضحاک اور کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی "قُضِيَ" ہیں اور اس کو بہ معنی "حُمَّ" ٹھہرایا ہے۔ یعنی "قُضِيَ وَوَقَعَ"۔[1] کسی نے کہا ہے کہ "مَفَاتِيحُ خَزَائِنِهِ" یعنی ﴿ حٰمٓ ﴾ اللہ پاک کے خزانوں کی کنجیاں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم الاعظم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسمائے الٰہی کی ابتداء ہے، جیسے: حمید، حکیم، حلیم، حنان اور جیسے: مالک، مجید، منّان، متکبر، مصور، مومن اور مہیمن۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں: "حَمَّ أَمْرُ اللّٰهِ" یعنی قریب ہوئی اللہ کی نصرت اپنے دوستوں کے اور اس کا انتقام اپنے دشمنوں کے قریب ہوا۔ یہ سب ایسا تکلف ہے جس کی کوئی وجہ نہیں اور نہ ہی اس کی طرف کوئی مضطر کرنے والا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس سورت کا شروع کا کلمہ اور اسی طرح کے اور شروع کے کلمے اس متشابہ میں سے ہیں جس کے معنی کا علم اللہ ہی کو ہے، چناں چہ سورۃ البقرہ کی ابتداء میں اس کی خوب تحقیق ہو چکی ہے۔ مہلب بن ابی صفرہ سے مروی ہے کہ مجھے حدیث کی اس شخص نے جس نے سنا کہ نبی اکرم ﷺ نے خندق کی رات کو فرمایا: « إِنْ أُتِيتُمْ (پہلے جو روایت گزر چکی ہے اس میں « إِنْ بُيِّتُّمْ » ہے، یعنی اگر تم شب خون مارے جاؤ اور یہاں « أُتِيتُمْ » ہے، یعنی اگر تمھارے پاس دشمن آئیں، واللہ أعلم) اللَّيْلَةَ فَقُوْلُوْا حٰمٓ لَا يُنْصَرُوْنَ »[2] (أخرجه الترمذي و الحاكم وصححه وأبو داود وابن مردويه وأبو عبيد وابن سعد وابن أبي شيبة وعبدالرزاق في المصنف) سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/٢٨٩، ٢٩٠) فتح القدير (٤/٦٣١) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تم اپنے دشمن سے ملو گے تو چاہیے کہ تمھارا شعار، (یعنی وہ علامت جس سے باہم ایک دوسرے کو لڑائی میں پہچانیں، جیسے: فوج میں پَرول ہوتا ہے۔ ''حٰمٓ لَا ینصرُونَ'' ہو۔[1] (أخرجه ابن أبي شيبة والنسائي و الحاكم و ابن مردويه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ ﴾ ﴿ حٰمٓ ﴾ کی خبر ہے۔ اس تقدیر پر کہ وہ مبتداء ہو یا یہ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ ''أَيْ: هٰذَا تَنْزِيلٌ'' یا مبتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ مِنَ اللّٰهِ ﴾ ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَنْزِيْلُ ﴾ سے مراد ''مُنَزَّلٌ'' ہے۔[2] یعنی بے شک قرآن شریف اللہ کے پاس سے اتارا گیا ہے، اس پر جھوٹ نہیں باندھا گیا۔ ﴿ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ ایسا اللہ کہ اپنے سلطان اور غلبے کے سبب سے روکنے والا ہے، یعنی منیع ہے اور اپنے ملک میں غالب اور قاہر ہے۔ اپنی خلق کو اور جو وہ کہتے ہیں اور کرتے ہیں، اسے اچھی طرح سے جاننے والا ہے، چنانچہ یہ مشرکوں کے لیے تو ایک دھمکی ہے اور مومنوں کے لیے خوش خبری ہے۔

﴿ غَافِرِ الذَّنْۢبِ ﴾ یعنی مومنوں کے گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس شخص کے گناہ کو معاف کرنے والا ہے، جو ''لا إله إلا اللّٰه'' کہتا ہے۔ ﴿ وَقَابِلِ التَّوْبِ ﴾ اور رجوع کرنے والوں کی توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس شخص سے توبہ قبول کرنے والا ہے جو ''لا إله إلا اللّٰه'' کہتا ہے۔[3] ''تَوْب و ثَوْب وأَوْب'' رجوع کے معنی میں مصدر ہیں، باہم ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: ''تَوْبٌ'' جمع ہے ''تَوْبَةٌ'' کی، جیسے: ''دَوْمٌ'' جمع ہے ''دَوْمَةٌ'' کی کہ حرفِ واو اس وصف میں اس لیے داخل کیا ہے کہ اس بات کا فائدہ دے کہ توبہ کرنے والے گناہ گار کے لیے دو باتیں جمع کی جاتی ہیں: اس کی توبہ قبول کرنا اور اس کے گناہ کا مٹانا۔ (قاله العمادي) یا دونوں وصفوں کو علاحدہ رکھنے کے لیے واو لایا گیا، اس لیے کہ کبھی اُن کے ایک ہونے کا وہم کیا جائے۔[4] (قاله البيضاوي)

﴿ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ سخت عقاب والا ہے، اس شخص کے لیے جو ''لا إله إلا اللّٰه'' نہیں کہتا۔[5] یا اس شخص کے لیے جو مخالف ہے اور کافر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے دوستوں کی توبہ قبول کرنے والا ہے اور اپنے دشمنوں کے لیے ﴿ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ﴾ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ شرک سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتا ہے اور جو شخص اس کی توحید نہیں کرتا، اس کے لیے ﴿ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ﴾ ہے۔ ﴿ ذِي الطَّوْلِ ﴾ یعنی عارفوں پر صاحبِ فضل ہے، یا غنی اور بے نیاز ہے سارے عالموں (جہانوں) سے۔ ''طول'' کی

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٥٢٩/٦) سنن النسائي الكبرىٰ (١٥٧/٦) مستدرك الحاكم (١١٨/٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٠٨)

[2] تفسير الرازي (٢٤/٢٧) [3] المعجم الأوسط (١٨١/٩)

[4] تفسير البيضاوي (٨٢/٥) [5] المعجم الأوسط (١٨١/٩)

اصل انعام اور فضل وکرم ہے، یعنی اپنے بندوں پر صاحب انعام اور تفضّل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ کا یہ قول گزر چکا ہے کہ ''ذِي الْغِنَا وَالسَّعَةِ'' ہے۔[1] اسی معنی سے یہ آیت ہے: ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا ﴾ [النساء: ٢٥] ''اور تم میں سے جس کسی کو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی پوری وسعت و طاقت نہ ہو۔'' ''أَيْ: غِنًى وَسَعَةً'' امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''طَول'' بالفتح ''مَنّ'' ہے، اسی معنی سے ہے۔ جب کوئی شخص کسی پر منت اور احسان رکھتا ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: ''طَالَ عَلَيْهِ وَيَطُوْلُ عَلَيْهِ'' محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا: ''ذِي التَّفَضُّلِ''۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''ذِي الْغِنَا''[3] امام ماوردی نے کہا ہے کہ ''مَنّ'' اور ''تَفَضُّل'' میں فرق یہ ہے کہ ''مَنّ'' تو گناہ سے عفو ہے اور تفضّل احسان ہے جو غیر مستحق ہے۔[4] اللہ سبحانہ میں ان صفات میں سے ہر ایک صفت علی الدوام ہے، چنانچہ ان میں سے مشتق کی اضافت تعریف کے لیے ہے مثل صفتِ اخیرہ کے۔

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان صفتوں میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ تمام صفات اسم پاک اللہ کے لیے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سب اس کے لیے بدل ہیں کہ ان کی اضافت غیر محضہ ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ غَافِرِ ﴾ اور ﴿ قَابِلِ ﴾ تو صفت ہیں اور ﴿ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ﴾ اس کا بدل ہے۔ انتہیٰ. اس کا بیان یہ ہے کہ امام فَرَّاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ غَافِرِ ﴾، ﴿ قَابِلِ ﴾ اور ﴿ شَدِيْدِ ﴾ کو معرفہ کے لیے صفت کی مثل ٹھہرایا، حالاں کہ وہ نکرہ ہیں، یعنی ان کی اضافت لفظی ہے، لیکن یہ جائز ہے کہ ان کی اضافت معنوی ٹھہرائی جائے، جیسا کہ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر وہ شے جس کی اضافت غیر محضہ ہے، جائز ہے کہ وہ محضہ قرار دی جائے اور اس سے معرفوں کی صفت کی جائے مگر صفتِ مشبہ۔

رہے کوفی لوگ تو انھوں نے کسی شے کا استثنا نہیں کیا، بلکہ صفتِ مشبہ کو اسم فاعل کی طرح ٹھہرایا ہے اس بات میں کہ اس کی اضافت محضہ ٹھہرانا جائز ہے اور یہ وہاں ہے کہ اس سے کوئی مخصوص زمانہ مراد نہ ہو۔ چنانچہ اس جگہ جائز رکھتے ہیں کہ ﴿ شَدِيْدِ ﴾ کی اضافت محضہ ہو اور امام سیبویہ رحمہ اللہ کے قول کی بنا پر اس کی تاویل مشدد کے ساتھ کرنا ضروری ہوگا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تینوں صفات بنا بر بدل مجرور ہیں۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے ﴿ غَافِرِ ﴾ اور ﴿ قَابِلِ ﴾ کو تو صفت کی بنا پر مجرور ٹھہرایا ہے اور ﴿ شَدِيْدِ ﴾ کو بنا بر بدل مجرور ٹھہرایا ہے۔[5]

بالجملہ پھر اللہ پاک نے وہ شے ذکر فرمائی جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ واحد ہے اور وہی عبادت کا مستحق ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور آخرت کے دن میں

---

[1] تفسير الطبري (٣٥١/٢١) [2] تفسير القرطبي (٢٩٢/١٥) [3] المعجم الأوسط (١٨١/٩)

[4] تفسير القرطبي (٢٩٢/١٥) [5] فتح القدير (٦٣١/٤)

اسی کی طرف پھر جانا ہے نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کفارِ قریش اللہ تعالیٰ کی توحید نہیں کرتے تھے، اس لیے اس نے اپنے نفس کی توحید کی۔ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اس شخص نے جو "لا إله إلا الله" کہتا ہے۔ چنانچہ وہ جنت میں داخل ہوگا اور اس شخص کا بھی جو "لا إله إلا الله" نہیں کہتا تو وہ نار میں داخل ہوگا۔[1]

جملہ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ مستانفہ ہے یا حالِ لازمہ ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صفت ہے۔[2] ابن عادل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول اپنے ظاہر کی بنا پر فاسد ہے، اس لیے کہ جملہ معرفوں کی صفت نہیں ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ وہ ﴿شَدِيْدِ الْعِقَابِ﴾ کی صفت ہے، کیوں کہ وہ ان کے نزدیک اضافت سے معرفہ نہیں ہوتا ہے۔[3] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ میں بھی وہی احتمال ہے جو جملۂ ماقبل میں تھا اور یہ بھی جائز ہے کہ جملۂ ماقبل سے حال ہو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا کہ قرآن شریف اللہ کی کتاب ہے، اس کو اس لیے نازل کیا ہے کہ اس سے راہ پائیں تو ان لوگوں کا حال ذکر فرمایا جو اس بارے میں جھگڑتے ہیں، مقصد اس کا باطل کرنا ہے، چنانچہ ارشاد کیا:[4]

مَا يُجَادِلُ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ
فِي الْبِلَادِ ۝۴ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ
وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ
لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝۵
وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۝۶ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ
بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ
كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ
عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝۷ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ
وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۸ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ
فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۹

[1] المعجم الأوسط (۹/۱۸۱) [2] التبيان في إعراب القرآن (۲/۱۱۱۵)

[3] اللباب في علوم الكتاب (۱۷/۱۰) [4] فتح البيان (۱۲/۱۵۷۔۱۵۹)

اللہ کی آیات میں صرف کافر لوگ ہی جھگڑا کرتے ہیں، لہٰذا آپ کو ان کا شہروں میں چلنا پھرنا دھوکے میں نہ ڈالے④ ان سے پہلے قومِ نوح نے اور ان کے بعد (دوسرے) گروہوں نے بھی (انبیاء کو) جھٹلایا اور ہر امت نے اپنے رسول کے بارے میں ارادہ کیا کہ اسے گرفتار کر لیں اور انھوں نے ناحق جھگڑا کیا، تاکہ اس (باطل) کے ذریعے سے حق کو پھسلا دیں، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا، (تو دیکھ لو!) میری سزا کیسی تھی!⑤ اور اسی طرح ان لوگوں پر آپ کے رب کا فیصلہ ثابت ہو گیا جنھوں نے کفر کیا کہ بلاشبہ یہ دوزخی ہیں⑥ جو (فرشتے) عرش کو اُٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے ارد گرد ہیں، وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنوں کے لیے بخشش مانگتے ہیں، (وہ کہتے ہیں:) اے ہمارے رب! تو (اپنی) رحمت اور (اپنے) علم سے ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، لہٰذا تو ان لوگوں کو بخش دے جنھوں نے توبہ کی اور تیرے راستے کی پیروی کی، اور انھیں دوزخ کے عذاب سے بچا⑦ اے ہمارے رب! اور انھیں ان ابدی باغوں میں داخل فرما جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کو بھی جو ان کے باپ دادوں اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے نیک ہوں، بے شک تو (ہر چیز پر) غالب، نہایت حکمت والا ہے⑧ اور انھیں برائیوں سے بچا اور جسے تو نے اس دن برائیوں (کی سزا) سے بچا لیا تو درحقیقت تو نے اس پر رحم کیا اور یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے⑨

اللہ تعالیٰ کی آیات میں جھگڑنا، کفار کی ایک نشانی ہے:

شہروں میں ان لوگوں کا چلنا پھرنا تجھے دھوکے میں نہ ڈالے، یعنی تو اس بات کا فکر نہ کر کہ وہ سرداروں سے آشنائیاں رکھتے ہیں۔ تو انھیں ہیشگی والی جنتوں میں لے جا اور اُن کے باپ دادوں اور بیویوں اور اولاد میں سے نیک عمل والوں کو بھی۔ یعنی اگرچہ بہشت ہر کسی کو اس کے عمل سے ملتی ہے، بیوی، بیٹا اور ماں باپ کام نہیں آتے، لیکن تیری حکمتیں ایسی بھی ہیں کہ ایک کے سبب سے کتنوں کو ان کے عمل سے زیادہ بدلہ دے کر اعلیٰ درجے پر پہنچا دے اور وہ بدلہ اپنے ہی نیک عمل کا ہو اور وہ عمل یہ کہ وہ آرزو رکھتے ہوں کہ ہم بھی اسی کی چال چلیں۔ یہ نیت قبول ہو جائے۔ اس دن کی رحمت اس طرح سے کہ تیری ہی مہربانی ہوئی کہ وہ برائیوں سے بچے۔ اپنے عمل سے کوئی نہیں بچ سکتا، تھوڑی بہت برائی کس میں نہیں ہوتی۔ انتہیٰ[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حق کو دور نہیں کرتے اور اس کے بیان کیے جانے کے بعد اور برہان کے ظاہر ہونے کے بعد اس میں جھگڑتے نہیں، مگر وہی لوگ جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور اس کی برہانوں اور

حجتوں کا انکار کرنے والے ہیں، چنانچہ تجھے ان کا شہروں میں چلنا پھرنا دھوکا نہ دے، یعنی شہروں کے اموال، نعمتوں، تازگی اور رونق کی فراوانی میں ان کا مستغرق ہونا تجھے دھوکا نہ دے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴾ [آل عمران: ١٩٦۔١٩٧] ''تجھے کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا فریب میں نہ ڈال دے، یہ تو بہت ہی تھوڑا فائدہ ہے، اس کے بعد ان کا ٹھکانا تو جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴾ [لقمان: ٢٤] ''ہم انھیں گو کچھ یونہی سا فائدہ دے دیں، لیکن (بالآخر) ہم انھیں نہایت بے چارگی کی حالت میں سخت عذاب کی طرف ہنکا لے جائیں گے۔''

پھر جن لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کی قوم میں سے ان کو جھٹلایا تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی تسلی کی کہ تجھے پہلے انبیاء کی پیروی کرنی چاہیے، کیوں کہ ان کو اُن کی اُمتوں نے جھٹلایا اور اُن کی مخالفت کی اور اُن میں سے بہت تھوڑے ایمان لائے۔ چنانچہ فرمایا کہ ان سے پہلے قومِ نوح نے جھٹلایا۔ یہ پہلے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا۔ وہ بتوں کے پوجنے سے منع کرتے تھے اور ان کے بعد کتنے فرقوں نے رسولوں کی تکذیب کی اور ہر اُمت نے اپنے اپنے رسول کو قتل کرنے پر حرص کی اور ہر قسم کی تدابیر کیں اور بعض نے تو اپنے رسول کو قتل ہی کر ڈالا اور شبہے ڈال کر مکر وفریب کیا، تاکہ اس سے واضح اور روشن حق کو رد کریں۔

امام ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ روایت کیا ہے کہ جو کوئی کسی باطل کی اعانت کرے، تاکہ اس سے کسی حق کو پھسلا دے تو یقیناً اس سے اللہ تعالیٰ کا ذمہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذمہ بری ہوا۔[1] قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَخَذْتُهُمْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴾ یعنی پھر میں نے ان کو ان کے بڑے بڑے گناہوں پر، جو انھوں نے کیے تھے، ہلاک کر ڈالا تو تجھے ان کو میرا عذاب کرنا اور اُن پر میری سزا کیسی لگی، وہ عذاب یقیناً نہایت سخت اور دردناک تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''كَانَ شَدِيْدًا وَاللّٰهِ''[2] یعنی اللہ کی قسم! وہ نہایت سخت تھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴾ یعنی جیسا اگلی اُمتوں کے کافروں پر عذاب کا کلمہ ثابت ہوا، ویسا ہی ان لوگوں میں سے جھٹلانے والوں پر بہ طریقِ اولیٰ ثابت ہوگا، جنھوں نے اے محمد! تیری تکذیب کی ہے، کیوں کہ جنھوں نے تجھے جھٹلایا، ان پر کوئی اعتماد نہیں کہ وہ کسی اور کی تصدیق کرتے۔ واللّٰه أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ ... الآية ﴾ اللہ پاک ملائکہ مقربین کی خبر دیتا ہے جو

---

[1] المعجم الكبير (١١/١٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٢٠) [2] تفسير الطبري (٢١/٣٥٣)

چار فرشتے عرش کو اٹھانے والے ہیں اور ان کے آس پاس کے ملائکہ کروبین' کہ وہ تسبیح اور تحمید کو اکٹھا ادا کرتے ہیں۔ تسبیح تو اللہ کے لیے ہر قسم کے نقص کی نفی پر دال ہے اور تحمید صفتِ مدح کے اثبات کی مقتضی ہے۔ ﴿ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کے لیے عاجزی اور فروتنی کرتے ہیں اور اس کے روبرو ذلیل اور فرماں بردار رہتے ہیں اور اہلِ زمین کے مومنوں کے لیے بخشش مانگتے ہیں، وہ مومن جو غیب پر ایمان لائے۔

چنانچہ اللہ پاک نے اپنے مقرب فرشتوں کو اس کام پر مقرر کیا ہے کہ وہ مومنوں کے لیے ان کی پیٹھ پیچھے دعا مانگیں اور چوں کہ پسِ پشت دعا مانگنا ملائکہ ۔علیھم الصلاۃ والسلام۔ کے خصائل سے ہے، اس لیے جو مومن اپنے مومن بھائی کے لیے پسِ پشت دعا مانگتا ہے تو فرشتے اس کی دعا پر آمین کہتے ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم میں ثابت ہوا ہے کہ جس وقت مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لیے پسِ پشت دعا کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے: آمین اور تیرے لیے بھی اس کے مثل ہو۔[1] امام احمد رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « صَدَقَ أُمَيَّةُ بْنُ أَبِي الصَّلْتِ فِي شَيْءٍ مِنْ شِعْرِهِ » فَقَالَ: ؎

زُحَلٌ وَثَوْرٌ تَحْتَ رِجْلِ يَمِيْنِهِ　　وَالنَّسْرُ لِلْأُخْرٰى وَلَيْثٌ مُرْصَدُ

(ابن کثیر میں "زُحَلٌ" اسی طرح بہ زائے معجمہ و حائے مہملہ ہے، لیکن صحیح "رَخِلٌ" بہ رائے مہملہ و خائے معجمہ معلوم ہوتا ہے۔ رَخِل بہ کسرِ خائے معجمہ "الأنثی من سخال الضان" یعنی بھیڑ کے مادہ کو رخل کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش کے حاملین چار فرشتے ہیں: ایک تو بھیڑ کی صورت، دوسرا بیل کی صورت، یہ دائیں جانب ہوئے۔ تیسرا گِدھ کی شکل پر اور چوتھا شیر کی صورت پر، یہ دو بائیں جانب پر ہوئے۔ تفسیر خازن میں کہا ہے کہ حاملینِ عرش اوعال کی شکل کے ہیں، یعنی پہاڑی بکرے اور حدیث میں مروی ہے کہ ان میں سے ہر ایک فرشتے کی ایک شکل ہے جو رجل ہے (یہ بھی وہی رَخِل ہے۔ واللّٰہ أعلم) اور ایک شیر کی شکل پر ہے اور ایک ثور، یعنی بیل کی شکل پر ہے اور ایک نسر یعنی گِدھ کی شکل پر ہے۔[2] إلی آخر الحدیث۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے کے چار چہرے ہیں: بھیڑ کا چہرہ، شیر کا چہرہ، بیل کا چہرہ اور گِدھ کا چہرہ۔ واللّٰہ أعلم)۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: « صَدَقَ » فَقَالَ: ؎

وَالشَّمْسُ تَطْلُعُ كُلَّ آخِرِ لَيْلَةٍ　　حَمْرَاءَ يُصْبِحُ لَوْنُهَا يَتَوَرَّدُ
تَأْبٰى فَمَا تَطْلُعُ لَنَا فِيْ رِسْلِهَا　　إِلَّا مُعَذَّبَةً وَإِلَّا تُجْلَدُ

(یعنی سورج طلوع ہوتا ہے ہر رات کے اخیر میں سرخ صبح کو، اس کا رنگ گلابی ہو جاتا ہے۔ بنی آدم کی خطاؤں کے مارے طلوع ہونے سے انکار کرتا ہے، پھر وہ نہیں طلوع ہوتا، ہمارے واسطے اپنی نرم چال میں، مگر عذاب کیا ہوا اور مارا ہوا، یعنی زبردستی اس کو طلوع کرتے ہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حرکت قسری ہے طبعی نہیں ہے، جیسا

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٣٢)　[2] تفسیر الخازن (٨٨/٦)

کہ حکماء کا مذہب ہے۔ واللہ أعلم و علمه أتم.) فقال رسول الله ﷺ! «صَدَقَ». وهذا إسناد جيد.[1]

حدیث اس کی مقتضی ہے کہ آج عرشِ معلّٰی کے حاملین کل چار ہیں، پھر جب قیامت کا دن ہوگا تو وہ آٹھ ہو جائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَيَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّكَ فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴾ [الحاقة: ١٧] ''اور تیرے پروردگار کا عرش اس دن آٹھ (فرشتے) اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔'' یہاں ایک سوال ہے، وہ یہ ہے کہ کیسے جمع ہے اس شے میں جو اس آیت سے اور اس حدیث کی دلالت سے سمجھی جاتی اور اس حدیث میں جس کو ابو داود نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: میں بطحاء میں تھا (بطحاء ایک جگہ کا نام ہے اصل میں بطحاء وہ جگہ ہے جس میں سنگ ریزے ہوں یہ جگہ مکہ مکرمہ میں ہے۔

مجمع البحار میں ہے کہ عباس اس وقت مسلمان نہ تھے اور نہ وہ جماعت مسلمان تھی۔ لفظ بطحاء اس پر دال ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے چاہا کہ ان کو سفلیات سے مشغول کریں علویات کی طرف، تاکہ وہ ملکوتِ سمٰوٰت و ارض میں غور و فکر کریں، پھر اپنے خالق کی معرفت حاصل کریں اور بتوں کو پوجنے سے عار کریں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے بات شروع فرمائی بادل سے، پھر آسمانوں سے، دریا سے، اوعال (یعنی پہاڑی بکرے) سے، عرش سے صاحبِ عرش کی طرف، پس یہ فوقیت، ترقی عظمت کے حساب سے ہے، مکان یا جگہ کے اعتبار سے نہیں ہے اور ستر ۷۰ سے مراد کثرت ہے حد بندی نہیں، کیوں کہ یہ بات وارد ہو چکی ہے کہ آسمان اور زمین کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے[2])۔

میں بطحاء میں ایک جماعت میں تھا، جس میں رسول اللہ ﷺ تھے، چنانچہ ان پر سے ایک بدلی گزری تو آپ ﷺ نے اس کی طرف نظر کی اور فرمایا تم اس کا کیا نام رکھتے ہو؟ لوگوں نے عرض کی کہ سحاب۔ آپ ﷺ نے فرمایا اور مُزن؟ عرض کی: اور مزن۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اور عنان؟ عرض کی: اور عنان۔

امام ابو داود رحمہ اللہ نے کہا: "وَلَمْ أُتقِنِ الْعِنَانَ جَيِّدًا" فرمایا: کیا تم آسمان اور زمین کے درمیان کا فاصلہ جانتے ہو؟ عرض کی: ہم نہیں جانتے۔ فرمایا کہ ان کے درمیان فاصلہ اکہتر (۷۱) یا بہتر (۷۲) یا تہتر (۷۳) برس کا ہے، پھر آسمان اس کے اوپر ہے، اسی طرح یہاں تک کہ سات آسمانوں کا شمار کیا، پھر ساتویں آسمان کے اوپر ایک دریا ہے، اس کے نچلے اور اوپر والے حصے کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جو ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ہے، پھر ان کے اوپر آٹھ اوعال ہیں، یعنی پہاڑی بکرے، ان کے کھروں اور گھٹنوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے، جتنا ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ہے، پھر ان کی پُشت پر عرش ہے، اس کے نیچے اور اوپر والے حصے کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ہے۔ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے اوپر ہے۔[3] (ثم رواه أبو داود والترمذي وابن ماجه من حديث سماك بن حرب به وقال الترمذي: حسن غريب)

---

[1] مسند أحمد (٢٥٦/١) اس کی سند میں ''محمد بن اسحاق'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ [2] مجمع بحار الأنوار (٨٣/٥)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٣) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجۂ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٢٤٧)

یہ حدیث شریف اس کی مقتضی ہے کہ حاملینِ عرش آٹھ ہیں، جیسا کہ شہر بن حوشب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرش کو اٹھانے والے آٹھ ہیں، ان میں سے چار یوں کہتے ہیں: "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰی حِلْمِكَ بَعْدَ عِلْمِكَ" اور چار یہ کہتے ہیں: "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰی عَفْوِكَ بَعْدَ قُدْرَتِكَ"[1] اور اسی لیے وہ یہ کہتے ہیں جب مومنین کے لیے بخشش مانگتے ہیں: ﴿ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ﴾ یعنی اے ہمارے رب! تیری رحمت ان کے گناہوں اور خطاؤں کو سما لیتی ہے اور تیرا علم اُن کے سارے اعمال، اقوال، حرکات اور سکنات کو محیط ہے۔

﴿ فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ ﴾ یعنی پس تو گناہ گاروں سے درگزر فرما، جب وہ توبہ اور انابت کریں اور اس کام سے باز رہیں جس میں وہ تھے اور اس شے کی پیروی کریں جس کا تو نے ان کو حکم دیا ہے، یعنی نیکیوں کا کرنا اور برائیوں کا چھوڑنا۔ ﴿ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴾ اور ان کو عذابِ جحیم سے دور رکھ، یہ وہی دردناک عذاب ہے۔ ﴿ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ﹰالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ الٰہی تو اُن کو اور اُن کے ماں باپ کو اور بیبیوں اور اولاد کو اکٹھا کر دے، تاکہ اس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، ان کے ایسے مکانوں میں جمع ہونے کے سبب سے جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾ [الطور: ۲۱] "اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی ہم ان کی اولاد کو ان تک پہنچا دیں گے اور ان کے عمل سے ہم کچھ کم نہ کریں گے۔" یعنی ہم نے ان سب کے درمیان منزلت اور درجے میں برابری کر دی، تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ہم نے بلند مرتبے والے کو کم نہیں کیا کہ وہ کم درجے والے کے برابر ہو، بلکہ کم درجے والے کو ہم نے بلند کر دیا، چنانچہ ہم نے اس کو اپنی طرف سے بطور احسان، فضل اور کرم کے زیادہ عمل والے کے برابر کر دیا۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس وقت مومن جنت میں داخل کیا جائے گا تو وہ اپنے باپ، بیٹے اور بھائی کے متعلق پوچھے گا کہ وہ کہاں ہیں؟ تو کہا جائے گا کہ وہ عمل کے لحاظ سے تیرے طبقے کو نہیں پہنچے تو وہ کہے گا کہ میں نے جو عمل کیا تھا تو وہ اپنے اور اُن کے لیے تھا، پھر وہ درجے میں اس کے ساتھ ملا دیے جائیں گے۔ پھر سعید رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی۔ مطرف بن عبداللہ بن الشخیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے بندوں کے لیے ناصح ترین ملائکہ ۔علیہم الصلاۃ والسلام۔ ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی اور اللہ کے بندوں کے لیے اغش (یعنی سب سے بڑھ کر خیانت کرنے والے) شیاطین ہیں۔[2]

---

[1] تفسیر الطبري (۲٦۱/۱۹) [2] تفسیر الطبري (۲۱/۳۵۷، ۳۵۸) تفسیر ابن کثیر (۹۲/٤)

﴿ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی بے شک تُو تو بڑا غالب ہے، نہ کوئی تیری ممانعت کرسکتا ہے نہ تجھ پر غالب ہوسکتا ہے، تو نے جو چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا نہ ہوا اور تو اپنے شرعی وقدری افعال اور اقوال میں بڑی حکمت والا ہے۔ ﴿ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ﴾ یعنی تو ان کو برائیاں کرنے سے بچالے، یا ان کے وبال سے بچالے جن میں وہ واقع ہو گئے ہیں۔ ﴿ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ﴾ اور جس کو تو قیامت کے دن برائیوں سے بچالے گا تو واقعی تو نے اس پر کرم کیا اور اسے عذاب سے نجات دی۔ ﴿ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ اور یہی ہے بڑی کامیابی۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ اللہ کی آیتوں کے دفع کرنے میں اور اُن کے جھٹلانے میں ان میں طعن کر کے صرف کفار ہی جھگڑتے ہیں، مراد یہ ہے کہ باطل کے ساتھ اور حق سے پھسلانے کا ارادہ کر کے جھگڑتے ہیں، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ﴾

تنبیہ:

رہا اس لیے جھگڑنا کہ حق ظاہر کریں، ملتبس اور مشتبہ شے کو واضح کریں، مشکل کو حل فرمائیں، دشوار بات کو کھول کر بیان کریں، معانی کا استنباط کریں اور جو لوگ حق سے دور ہو رہے ہیں ان کی تردید کریں اور شکوک وشبہات کو دور کریں اور راجح ومرجوح اور محکم ومتشابہ کے بارے میں بحث کریں اور متشابہاتِ قرآن میں سے جن کے ساتھ اہلِ باطل دلیل پکڑتے ہیں، ان کو دفع کریں اور جھگڑ کر اُن کو محکم کی طرف پھیر لائیں تو یہ امور تو اعلیٰ ترین عبادات میں سے ہیں، جن کے ساتھ قربت چاہنے والے قربت چاہا کرتے ہیں اور اِن امور میں سے بہترین وہ ہیں جن میں مجاہدہ وکوشش کرنے والے مجاہدہ کیا کرتے ہیں اور اسی بات پر اللہ پاک نے اہلِ کتاب سے پکا عہد لیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے: ﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ﴾ [آل عمران: ۱۸۷] ''اور اللہ تعالیٰ نے جب اہلِ کتاب سے عہد لیا کہ تم اسے سب لوگوں سے ضرور بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ اُولٰٓىِٕكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ [البقرة: ۱۵۹] ''جو لوگ ہماری اتاری ہوئی دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم اسے اپنی کتاب میں لوگوں کے لیے بیان کر چکے ہیں، ان لوگوں پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔'' نیز ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [العنکبوت: ٤٦] ''اور اہلِ کتاب کے ساتھ بحث مباحثہ نہ کرو، مگر اس طریقے پر جو عمدہ ہو۔''

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٩١، ٩٢)

خلاصہ یہ نکلا کہ جدال کی دو قسمیں ہیں: ایک جدال تو حق کو غالب کرنے میں ہے اور ایک جدال باطل کو غالب کرنے میں ہے۔ پہلا جدال تو انبیاء علیہم السلام کا پیشہ ہے، اسی باب سے وہ جدال ہے جس کو اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کی قوم کی زبان سے نقل فرمایا ہے: ﴿ يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا ﴾ [ھود: ۳۲] ''اے نوح! تو نے ہم سے بحث کر لی اور خوب بحث کر لی۔'' رہا دوسرا جدال تو وہ مذموم ہے، اس آیت میں وہی مراد ہے۔ چنانچہ کافروں کا اللہ پاک کی آیتوں میں جدال یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی شان میں کبھی تو کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ یہ شعر ہے، کبھی کہتے ہیں کہ کاہنوں کا قول ہے، کبھی کہتے ہیں کہ اگلوں کی کہانیاں ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ اس کو تو کوئی بشر سکھاتا ہے۔ اس جیسی اور بے ہودہ باتیں کہا کرتے تھے۔ (كما ذكره الخطيب)

عبد بن حمید اور ابو داود رحمہما اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بے شک قرآن میں جدال کرنا کفر ہے۔[1] نیز ان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مراء، یعنی قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔[2] (أخرجه أبو داود وغيره) عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دن دوپہر کے وقت میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ نے دو آدمیوں کی آوازیں سنیں جو کسی آیت کے بارے میں اختلاف کر رہے تھے۔ آپ ﷺ باہر نکلے، آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک میں غصہ معلوم ہوتا تھا۔ پھر فرمایا: « إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِاخْتِلَافِهِمْ فِي الْكِتَابِ »[3] (أخرجه مسلم) یعنی تم سے پہلے لوگ جو ہلاک ہوئے، وہ کتاب میں اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان لوگوں پر دو آیتیں سخت ترین ہیں جو قرآن کے بارے میں جھگڑتے ہیں: ایک تو یہی آیت ہے اور دوسری یہ آیت ہے: ﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴾[4] [البقرة: ۱۷۶] ''اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا ہے یقیناً وہ بہت دور کی مخالفت میں (پڑے) ہیں۔''

تنبیہ:

مجمع البحار میں ''اَلْمِرَاءُ فِي الْقُرْاٰنِ كُفْرٌ'' کی شرح میں کہا ہے کہ ''مراء'' یہ ہے کہ قرآن کی تکذیب قرآن کے ساتھ کرنے کا قصد کرے، تاکہ بعض کو بعض کے ساتھ مسترد کرے، چنانچہ صحیح تو یہ ہے کہ کوشش کرے کہ سلف کے عقیدے کے مطابق دو متخالف آیات کو موافق کرے اور اگر وہ یہ نہ کر سکے تو چاہیے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے۔[5] اس کے سوا اور قول بھی لکھے ہیں: ''والتوفيق بيد الله سبحانه، اللهم وفقنا لما تحب وترضى'' آمین۔

بالجملہ جب ان لوگوں پر کفر کا حکم لگایا جو اللہ کی آیتوں کے بارے میں باطل طریقے سے جھگڑتے ہیں تو اپنے رسول ﷺ کو اس سے منع کیا کہ کفار کو جو دنیا کے فوائد حاصل ہیں، ان میں سے کسی شے کے ساتھ دھوکا کھائیں۔

---

① الدر المنثور (۲۷۳/۷) ② سنن أبي داود، رقم الحديث (۴۶۰۳) صحيح الجامع، رقم الحديث (۶۶۸۷)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۶۶۶) ④ تفسير البغوي (۱۳۸/۷) ⑤ مجمع بحار الأنوار (۵۶۸/۴)

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ﴾ یعنی یہ کافر جو شام اور یمن کے شہروں میں چلتے ہوئے تجارتیں کرتے ہیں اور کمائیاں اور منافع حاصل کرتے ہیں اور مال و دولت جمع کرتے ہیں اور سالم و غانم جاتے آتے ہیں تو یہ بات تجھ کو دھوکا نہ دے، کیوں کہ یہ تو عن قریب عذاب کیے جائیں گے۔ اگرچہ ان کو مہلت دی گئی ہے، لیکن وہ چھوڑ نہیں دیے جائیں گے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے کفر کرنے کے بعد اُن کا صحیح سالم رہنا تجھے دھوکا نہ دے، کیوں کہ ان کا انجام ہلاکت ہے۔[1] امام ابوالسعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے اور کفار کے لیے وعید ہے۔ حرفِ فاء ترتیب نہی کے لیے ہے، یا ماقبل پر وجوبِ انتہاء کے لیے، وہ یہی ان پر کفر کا حکم لگانا ہے، وہ کفر جس سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی مبغوض (بری) چیز نہیں ہے اور نہ ہی اس سے زیادہ کوئی شے دنیا اور آخرت کے نقصان میں ڈالنے والی ہے۔[2]

شیخ زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شرطِ مقدر کا جواب ہے: "أَيْ: إِذَا تَقَرَّرَ عِنْدَكَ إِنَّ الْمُجَادِلِيْنَ فِيْ آيَاتِ اللّٰهِ كُفَّارٌ فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ" یعنی جبکہ تیرے نزدیک یہ بات قرار پا چکی ہے کہ اللہ کی آیتوں میں جھگڑنے والے کافر ہیں تو اب تجھے ان کا مہلت دیا جانا اور بلادِ شام و یمن سے نفع مند تجارتوں کے ساتھ چلنا پھرنا دھوکا نہ دے، کیوں کہ وہ عن قریب اس طرح پکڑے جائیں گے جیسے ان سے پہلے کے لوگ پکڑے گئے۔ جمہور نے ﴿فَلَا يَغْرُرْكَ﴾ کو بہ فکِ ادغام پڑھا ہے اور زید بن علی اور عبید بن عمیر نے بہ ادغام پڑھا ہے۔[3]

پھر اللہ پاک نے ان سے پہلے لوگوں کا حال بیان کیا اور ذکر کیا کہ یہ لوگ تکذیب میں انہیں کی چال چلے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ﴾ یعنی مکے والوں سے پہلے نوح کی قوم نے نوح علیہ السلام کو جھٹلایا۔ ﴿وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ اور ان گروہوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا جو قومِ نوح کے بعد جتھے بن گئے تھے، جیسے: عاد و ثمود وغیرہ۔ ﴿وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ﴾ یعنی صرف جھٹلانے پر ہی بس نہ کیا، بلکہ ان جھٹلانے والی اُمتوں میں سے ہر اُمت نے یہ قصد کیا کہ اپنے اپنے رسول کو، جو ان کی طرف بھیجا گیا تھا، قابو کریں تو اسے قید کریں اور اس کو عذاب اور ایذاء اور نقصان پہنچائیں اور جو چاہیں اس کے ساتھ کریں۔ امام قتادہ اور سُدی رحمہما اللہ نے کہا: "لِيَقْتُلُوْهُ" یعنی تاکہ اسے مار ڈالیں۔ "أخذ" کبھی ہلاک کرنے کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ﴾ [الحج: ٤٤] "پھر میں نے ان کو پکڑا، پھر میرا عذاب کیسا ہوا؟!" عرب لوگ اسیر، یعنی قیدی کا نام أخید رکھتے ہیں[4] اور "أَخْذ" بہ معنی "أَسْر" آتا ہے۔

---

[1] معاني القرآن (٣٦٦/٤) [2] تفسير أبي السعود (٢٦٦/٧) [3] فتح القدير (٦٣٢/٤)
[4] تفسير الطبري (٣٥٣/٢١) تفسير القرطبي (٢٩٣/١٥)

﴿ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ﴾ یعنی اور اپنے رسول سے باطل بات کے ساتھ جھگڑے، تا کہ اس سے حق کو زائل کریں۔ اسی معنی سے مکانِ دحض ہے۔ "أَيْ: مَزْلَقَةٌ وَمَزَلَّةُ الْأَقْدَامِ" یعنی وہ جگہ جہاں پاؤں پھسلتے ہیں اور باطل کو داحض کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ زائل ہو جاتا ہے، پھسل جاتا ہے، جمتا نہیں ہے۔ یحییٰ بن سلاّم نے کہا ہے کہ نبیوں سے شرک کے ساتھ جدال کیا، تا کہ اس سے ایمان کو باطل کریں۔ ﴿ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴾ یعنی پھر میں نے ان باطل کے ساتھ جھگڑنے والوں کو پکڑا تو میرا عقاب کیسا ہوا جس کے ساتھ میں نے ان کو عذاب کیا؟! ﴿ عِقَابِ ﴾ اصل میں "عِقَابِيْ" ہے۔ وصل ووقف میں کسرے پر کفایت کر کے یائے متکلم حذف کی گئی اس لیے کہ راسِ آیت ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ﴾۔ ﴿ حَقَّتْ ﴾ کے معنی ہیں "وَجَبَتْ وَثَبَتَتْ وَلَزِمَتْ" جب کوئی شے لازم و ثابت ہو جاتی ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "حَقَّ الشَّيْءُ"

جمہور نے ﴿ كَلِمَتُ ﴾ مفرد پڑھا ہے اور امام نافع اور ابن عامر رحمہ اللہ نے "كَلِمَاتُ" بہ جمع پڑھا ہے۔[1] ﴿ كَلِمَتُ ﴾ سے مراد وعید ہے، معنی یہ ہیں کہ جس طرح اگلی امتوں پر عذاب کی وعید واجب و ثابت و لازم ہوئی، اسی طرح تیرے رب کی وعید اُن لوگوں پر ثابت ہوئی جنھوں نے تیرا انکار کیا اور تجھ سے باطل کے ساتھ جھگڑے اور اس شے کا قصد کیا جس کو نہ پہنچے۔ چنانچہ اسمِ رب کی اضافت نبی اکرم ﷺ کی ضمیر کی طرف اس بات کی خبر دیتی ہے اس لیے کہ یہ اضافت یہ بات بتانے کے لیے لائی گئی ہے کہ کفار پر کلمۂ عذاب کا وجوب من جملۂ احکام تربیتِ الٰہی ہے جس میں سے نبی اکرم ﷺ کی ان کے دشمنوں پر مدد کرنا ہے اور ان کو عذاب کرنا ہے، جیسا کہ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا اور جملۂ ﴿ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴾ تعلیل ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: "لِأَنَّهُمْ أَوْ بِأَنَّهُمْ"[2] یعنی ان پر کلمۂ عذاب اس لیے ثابت ہوا کہ وہ نار کے مستحق ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ كَلِمَتُ ﴾ سے بنا بر بدل محلِ رفع میں ہو۔ امام محلی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں[3] یا تو بدل الکل من الکل ہے بہ نظرِ لفظ ﴿ كَلِمَتُ رَبِّكَ ﴾ کے اور بہ نظرِ اتحاد اس کے مدلول کے ساتھ مدلول بدل کے صدق میں، یا بدل اشتمال ہے بہ نظر اس کے کہ معنی اس کے اللہ تعالیٰ کا ان کو اپنے اس قول سے وعید کرنا ہے: ﴿ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ ﴾ یا اللہ کا ان کی ازلی شقاوت کا حکم ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کا مختار بھی یہی قول ہے۔[4]

پھر جو لوگ اللہ پاک کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں، جب کہ ان پر کفر کا حکم لگایا اور اس بات کا کہ اللہ کا کلمہ ان پر ثابت ہوا جو ان کے کفر کے سبب سے ان کے عذاب کا موجب ہے تو اس کے بعد اُن لوگوں کی فضیلت بیان کی جو آیاتِ الٰہی کو مانتے ہیں، اس طرح سے کہ تمام مخلوقات میں سے اشرف جو حاملینِ عرشِ معلّٰی اور اس کے گرد حافین ہیں، یہ لوگ اللہ سے اُن کی شفاعت کرنے والے ہیں اور اُس سے اُن کے لیے بہت چیزیں طلب کرتے ہیں جن کا

[1] تفسير القرطبي (۱۵/۲۹۳) [2] تفسير القرطبي (۱۵/۲۹۴)
[3] تفسير الجلالين (۱/۶۱۸) [4] تفسير البيضاوي (۵/۸۴)

بیان آتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ ﴾ مبتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ ہے اور جملہ مستانفہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی تسلی کے لیے لایا گیا ہے، یہ بات بیان کر کے کہ فرشتوں کی یہ جنس جو ان کے طبقات میں اعلیٰ ہے اور جو اُن سب سے پہلے وجود میں آئے ہیں، وہ اپنی تسبیح اور ایمان کے ساتھ ساتھ اُن لوگوں کے لیے مغفرت مانگنے کے عمل کو بھی شامل کرتی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور اُن کی تصدیق کی ہے۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان میں مشترک ہونا واجب ہے کہ نصیحت اور شفقت کی طرف سب سے بڑھ کر داعی ہو، اگرچہ جنسیں مختلف ہوں اور ان کے مکان دُور دور ہوں۔ غور کرو کہ انسان خاک کا پتلا اور فرشتے نوری مخلوق، پھر ان کا مکان یہ ارضِ فانی اور ان کا مکان رب رحمان کا عرشِ بریں، یہ کہاں اور وہ کہاں! لیکن چوں کہ ایمان ان میں باہم مشترک ہے، اس لیے اللہ پاک کی تسبیح وتحمید کے ساتھ خیر خواہی اور ایمانی شفقت کے طور پر مومنون کے لیے رب العرش العظیم سے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

شہر بن حوشب نے کہا: گویا فرشتے بنی آدم کے گناہ دیکھتے ہیں اور اُن کے لیے مغفرت مانگتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ استغفار ان کے اس قول کے مقابلے میں ہے: ﴿ اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ﴾ [البقرة: ۳۰] ''کیا تو کرے گا ایسے شخص کو جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے۔'' لہٰذا جب پہلے ان سے یہ بات صادر ہو چکی ہے تو انھوں نے اس کا یہ تدارک کیا، ان کے لیے مغفرت مانگتے ہیں اور یہ دوسروں کے لیے ایک قسم کی تنبیہ ہے۔ چنانچہ جو شخص کسی کے حق میں ایسی کوئی بات کہے جسے وہ مکروہ سمجھتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اس کے لیے استغفار کرے۔[1] (ذکرہ الخازن)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ حَوْلَهٗ ﴾ محلِ رفع میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اَلَّذِیْنَ ﴾ پر معطوف ہے۔ اس سے وہ فرشتے مراد ہیں جو تہلیل وتکبیر کہتے ہوئے عرش کا طواف کرتے ہیں، یہ کروبین ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ محلِ نصب میں ہے، اس بنیاد پر کہ عرش پر معطوف ہے، لیکن ظاہر اور زیادہ مناسب پہلا قول ہی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتے جو عرشِ معلیٰ کو اٹھائے ہوئے ہیں اور اسی طرح وہ فرشتے جو عرش کے گرد ہیں، اللہ کی تسبیح وتقدیس کرتے ہیں، اس کی حمد کے ساتھ ملا کر جو اس کی نعمتوں پر کرتے ہیں اور اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ سے اس کے مومن بندوں کے لیے بخشش مانگتے ہیں۔ غرضیکہ اللہ پاک نے دونوں فریقوں کی طرف سے یہ خبر دی ہے کہ وہ مذکورہ افعال کرتے ہیں۔ تسبیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کی جائے اس شے سے جو اس کے لائق نہیں ہے اور تحمید اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ وہ علی الاطلاق منعمِ حقیقی ہے، چنانچہ تسبیح عبارت ہے جلال کی تعریف سے جو دراصل اس کی ذات کی پاکیزگی ہے اس شے سے جو کسی

[1] تفسیر الخازن (٦٩/٤۔ ط: دار الکتب العلمیة، بیروت)

حاجت ونقصان کی موجب ہو اور تحمید عبارت ہے صفاتِ اکرام سے اور یہ صفاتِ ثبوتیہ ہیں جن کی بنا پر وہ حمد کا مستحق ہے۔

چنانچہ ﴿ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ اس آیتِ کریمہ کے قریب ہے: ﴿ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴾ [الرحمن: ۷۸] ''تیرے پروردگار کا نام بابرکت ہے جو عزت وجلال والا ہے۔'' تسبیح کو اصل اور حمد کو حال ٹھہرایا، اس لیے کہ حمد تو ان کے حال کا مقتضا ہے نہ کہ تسبیح، کیوں کہ حمد صفاتِ اکرام کے ساتھ اس کی ثنا کرنا ہے اور یہ اس کی صفاتِ ثبوتیہ ہیں اور فرشتے تمام حالات میں ان صفات کے ساتھ اس کا وصف کرتے ہیں اور اس کی حمد کرتے ہیں۔ اور اس کی جلالتِ قدر کی صفت کے ساتھ جب اس کا ذکر کرتے ہیں جو اس کی ذات کی پاکی ہے، ہر اس چیز سے جو اس کے لائق نہیں تو یہ اس وقت کرتے ہیں جب ان کو ضرورت ہوتی ہے کہ اس شخص کی تردید کریں جو اس کا وصف کسی ایسی چیز کے ساتھ کرتا ہے جو اس چیز کو ظاہر کرتی ہے جو اس کے شایانِ شان نہیں ہوتی۔ یا ان کو وہ شے ظاہر ہوتی ہے جو اس کی کمالِ عظمت پر دال ہوتی ہے۔

پھر اگر کوئی یہ کہے کہ ﴿ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ﴾ کا کیا فائدہ ہے، باوجود اس کے کہ کسی پر ان کا ایمان باللہ چھپا ہوا نہیں، خاص طور پر جبکہ اُن کی طرف سے یہ خبر دی ہے کہ ﴿ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ کیوں کہ تسبیح وتحمید میں تو ایمان باللہ کے بعد ہی مشغول ہوا جاتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ خبر یہ کلام صرف لازمی حکم کو ہی ظاہر کرتا ہے، بلکہ وہ کبھی اور مقصد کے لیے بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ یہاں پر ایمان کے شرف وفضیلت کی حکمت ظاہر کرنا اور اس میں رغبت دلانا مقصود ہے جس طرح کہ قرآن شریف میں کئی جگہ انبیاء علیہم السلام کی صفتِ ایمان وصلاح بیان کی ہے، حالاں کہ ان کا ایمان اور صلاح کسی پر مخفی نہیں ہے۔

اللہ پاک نے ہر نبی کے ذکر کے بعد یوں فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾، ﴿ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ یہ ان کا شرف ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اظہار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی صفاتِ جمیلہ میں سے خاص طور پر مدح کے مقام پر ایمان کا ذکر کرنا، ان کے باقی اوصاف کی نسبت ان کے شرف وفضل کی واضح دلیل ہے، باوجود اس کے کہ ان کے سارے اوصاف اچھے ہیں، جیسا کہ کہا ہے: ''أَوْصَافُ الْأَشْرَافِ أَشْرَافُ الْأَوْصَافِ'' اور جب مقامِ مدح میں خاص کر اس کے ذکر نے ان کے شرف پر دلالت کی تو اہلِ ایمان کے وصف کرنے نے ساتھ ایمان کے ان کی تعظیم پر دلالت کی، حالاں کہ اس آیت کا لانا اہلِ ایمان کی تعظیم کے لیے ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے، اس انداز سے کہ تمام طبقوں کی مخلوقات سے افضل واشرف مخلوق، ان کی محبت ونصرت میں مبالغہ کرتی ہے اور ان کی مغفرت اور عذابِ جہنم سے خلاصی کے لیے اُن کے لیے بہت زیادہ دعائیں کرتی ہے۔

ان کے ایمان کی خبر دینے میں دوسری حکمت یہ ہے کہ اس بات سے آگاہ کیا جائے کہ حاملینِ عرش اور

حافین حولِ عرش جو اپنے رب کو پہچانتے ہیں تو صرف نظر و استدلال سے، نہ کہ معائنے اور مشاہدے کے طور پر، جیسا کہ فرقۂ مجسمہ نے زعم کیا جو اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہے، کیوں کہ جب اللہ پاک نے ان کی مدح اور تعریف کے طور پر ان کی طرف سے یہ خبر دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر دل سے ایمان لاتے ہیں تو اس سے یہ بات سمجھی گئی کہ اللہ تعالیٰ پر ان کا جو ایمان ہے تو وہ برہان کی رو سے ہے نہ کہ مشاہدے اور دیکھ لینے سے اور وہ اس سے حجاب میں ہیں کہ اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ سکیں اور اگر بات ویسی ہوتی جیسی مجسمہ نے خیال کیا ہے تو حاملینِ عرش اور حافین حولِ عرش اس کا مشاہدہ و معائنہ کرتے، چنانچہ یہ کہنا ٹھیک نہ ہوتا کہ وہ اس پر اپنے دل سے ایمان لاتے ہیں، بلکہ یہ جائز نہ ہوتا کہ ان کا وصف کیا جائے، مگر مشاہدہ وعیان کے ساتھ اور اگر ان کا ایمان اس تصدیق پر محمول ہوتا جو مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے تو بھی ان کا اللہ پر ایمان ایسا نہ ہوتا کہ ان کی مدح و ثنا کی جائے، اس لیے کہ کسی حاضر اور نظر آنے والی شے کے وجود کا اقرار کرنا تعریف کا موجب نہیں ہے۔

چنانچہ جب اللہ پاک نے ان کے ایمان باللہ کو تعریف اور تعظیم کے طور پر ذکر کیا تو اس نے اس بات پر دلالت کی کہ وہ اللہ تعالیٰ پر برہان سے ایمان لائے نہ یہ کہ انھوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہے، اس حال میں کہ وہ وہاں پر حاضر اور بیٹھا ہوا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اس قول کو صاحبِ کشاف سے نقل کیا۔ پھر فرمایا: اللہ صاحبِ کشاف پر رحم کرے اگر حاصل نہ ہوتا اس کی کتاب میں مگر یہ نکتہ تو البتہ شرف و فخر کے لیے اس کو یہی کافی ہوتا[1] (اگرچہ امام رازی رحمہ اللہ نے اس نکتے کو بہت پسند فرمایا، مگر یہ نکتہ مذہبِ اعتزال پر مبنی ہے۔ اصل غرض اس کی رویت کا انکار ہے، چنانچہ اس وجہ سے یہ نکتہ قابلِ تسلیم نہیں۔ از مصحح سلمہ اللہ تعالیٰ)۔ اس کے بعد کہا ہے کہ یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوئی کہ سعادت کا کمال دو امر کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کے امر کی تعظیم اور دوسرا اللہ کی خلق پر شفقت۔ اور یہ واجب ہے کہ پہلی بات دوسری پر مقدم ہو۔ چنانچہ ﴿ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ﴾ اللہ تعالیٰ کے امر کی تعظیم کو ظاہر کرتا ہے اور ﴿ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ اللہ کی مخلوق پر شفقت کو ظاہر کرتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے بہت سے علماء نے اس بات پر حجت پکڑی ہے کہ فرشتہ انسان سے افضل ہے، کیوں کہ یہ آیت اس پر دال ہے کہ جب فرشتے اللہ تعالیٰ کے تقدیس کے ساتھ ذکر سے فارغ ہوئے تو مومنوں کے لیے مغفرت مانگنے میں مشغول ہوئے اس کے بغیر کہ پہلے اپنی جانوں کے لیے مغفرت مانگیں۔ یہ اس پر دال ہے کہ وہ اپنے لیے مغفرت مانگنے سے بے نیاز ہیں، کیوں کہ اگر وہ اس کے محتاج ہوتے تو پہلے اپنی جانوں کے لیے مغفرت مانگتے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «اِبْدَأْ بِنَفْسِكَ»[2] یعنی تو اپنے نفس سے شروع کر اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو یوں فرمایا: ﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ﴾ [محمد: ١٩] ''اور آپ اپنے گناہوں کی بخشش مانگا

---

[1] تفسير الرازي (٢٧/٢٩) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٩٧)

کریں اور مومن مردوں اور عورتوں کے حق میں بھی۔'' اور جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے استغفار کا اپنے نفوس کے لیے ذکر نہیں فرمایا، باوجود اس کے کہ عام لوگوں کا کیا ذکر، افضل البشر استغفار کے نیاز مند ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ ﴾ تو ظاہر ہوا کہ فرشتے انسانوں سے افضل ہیں۔ والله أعلم. ہمارے نزدیک مختار یہ ہے کہ بنی آدم کے خواص، یعنی مرسلین جملہ ملائکہ سے افضل ہیں اور بنی آدم کے عوام سوائے انبیاء علیہم السلام کے عام ملائکہ سے افضل ہیں اور ملائکہ کے خواص بنی آدم کے عوام سے افضل ہیں۔

پھر یہ آیتِ کریمہ ملائکہ کی طرف سے گناہ گار مومنوں کے لیے حصولِ شفاعت پر دال ہے، اس لیے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا ﴾ اس پر دال ہے کہ وہ کل مومنین کے لیے استغفار کرتے ہیں اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کبیرہ گناہ کرنے والا بھی مومن ہوتا ہے، چنانچہ اس کا ملائکہ کی شفاعت اور استغفار میں داخل ہونا واجب ہوا۔ استغفار طلبِ مغفرت ہے اور مغفرت گناہ گار مومن کے عذاب کو ساقط کرنے کے لیے ہی ذکر کی جاتی ہے۔ اور فرشتوں کے قول: ﴿ فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا ﴾ کے معنی ۔ والله أعلم۔ یہ ہیں کہ ان لوگوں کے لیے مغفرت کر جنھوں نے کفر سے توبہ کی اور راہِ ایمان کی پیروی کی۔ (کذا أفاده شیخ زاده) حاملینِ عرش کی صورت وعظمت، ان کی تسبیح کے الفاظ اور عرش کی صفت اور اس کی دوری وغیرہ کے متعلق احادیث و آثار وارد ہوئے ہیں، ان میں سے بعض گزر چکے ہیں، ان میں سے قابلِ اعتماد وہی ہیں جو صحیح میں وارد ہوئے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے ان کے استغفار کی کیفیت بیان کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ﴾ یہاں قول مقدر ہے اور وہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال فاعل ﴿ يَسْتَغْفِرُونَ ﴾ سے۔ "أَيْ: يَقُولُونَ" یا "فَائِلِينَ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَحْمَةً وَّعِلْمًا" اور ﴿ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ﴾ کا نصب تمیز کی بنا پر ہے جو فاعل سے منقول ہے۔ اصل یہ ہے: "وَسِعَتْ رَحْمَتُكَ وَعِلْمُكَ كُلَّ شَيْءٍ" پھر یہ ترکیب اللہ پاک کی صفتِ رحمت وعلم کے مبالغے کے لیے اپنی اصل سے زائل کی گئی۔ رحمت کو علم سے پہلے اس لیے رکھا کہ اس جگہ رحمت مقصود بالذات ہے۔[1] (کما قاله البیضاوي) یعنی اس لیے کہ یہ مقام مقامِ استغفار ہے، ورنہ علم تو از روئے ذات کے متقدم ہے۔ معنی یہ ہیں کہ عرش بریں کے حاملان وغیرہم مومنوں کے لیے مغفرت مانگتے ہیں، اس حال میں کہ کہتے ہیں یا کہنے والے ہیں کہ اے رب! تیری رحمت اور علم نے ہر شے کو سما لیا ہے۔

﴿ فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴾ یعنی جبکہ تیری رحمت اور علم ہر شے کو سمائے ہوئے ہے تو علم اس کا متقضی ہے کہ تجھے اپنے بندوں کے اعمال کی خوب خبر ہے اور رحمت، عفو اور درگزر کی مقتضی ہے، چنانچہ تو اپنی رحمت سے ان لوگوں کو بخش دے جنھوں نے اپنے گناہوں سے یا شرک سے توبہ کر لی ہے،

---

[1] تفسیر البیضاوي (۵/۸۵)

گو ان کے اور گناہ ہوں۔ اور انھوں نے تیری راہ کی پیروی کی، یعنی برائیاں چھوڑ کر نیکیاں کیں، یا شرک کو ترک کر کے دینِ اسلام اختیار کیا اور موحد و مخلص ہوئے۔ اور ان کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ اور اُن کے اور اس عذاب کے درمیان آڑ کر دے، اس طرح سے کہ تو ان کو استقامت عطا فرما اور ان پر اپنی نعمت پوری کر، کیوں کہ تو نے اس کا وعدہ کیا ہے کہ جو کوئی ایسا ہوگا تو اس کو دوزخ کے عذاب سے بچائے گا اور تیرے نزدیک بات بدلی نہیں جاتی، اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ تو جو چاہے کرے اور ساری مخلوق تیری غلام اور ملکیت ہے۔ کسی کا تجھ پر کچھ زور نہیں ہے اور نہ کسی طرح کا حق ہے۔

چونکہ ضرر کا دور کرنا نفع حاصل کرنے پر مقدم ہے۔ اس لیے پہلے ان کے لیے عذابِ جہنم سے بچانے کی دعا کی، پھر جنت میں داخل کرنے کی دعا مانگی۔ چنانچہ کہا: ﴿ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ ﴾ یعنی اے ہمارے رب! ان کو رہنے بسنے کے باغوں میں داخل کر جن کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے۔ یہ جملہ ﴿ وَقِهِمْ ﴾ پر معطوف ہے اور جملۂ دعائیہ ﴿ رَبَّنَا ﴾ کو دوبارہ لا کر مبالغہ کے لیے معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان میں ذکر کیا ہے۔ پہلے مومنین کے لیے دعا کی، پھر ان کے اقارب کے لیے دعا مانگی، اس لیے کہ آدمی کو پورا سرور اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے عزیز و اقارب بھی اس عیش و آرام میں ہوں جس میں وہ ہے، اس لیے کہا: ﴿ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَاَزْوٰجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ ﴾ صلاح سے اس جگہ مراد اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور ایسے عمل کرنا ہے جن کو اس نے مشروع کیا ہے۔ لہٰذا جس کسی نے ایسا کیا تو یقیناً وہ جنت میں داخلے کے لائق ہوا۔

﴿ وَمَنْ صَلَحَ ﴾ معطوف ہے ﴿ اَدْخِلْهُمْ ﴾ کی ضمیر منصوب پر، یعنی اور داخل کر اس کو جو اُن کے باپوں اور بیبیوں اور اولاد میں سے نیک ہوا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ وَعَدْتَّهُمْ ﴾ کی ضمیر منصوب پر معطوف ہو، یعنی ان کو جناتِ عدن میں داخل کر جن کا تو نے اُن سے وعدہ کیا ہے اور ان کے باپوں، بیبیوں اور اولاد میں سے جو نیک ہوا ان سے وعدہ کیا ہے۔ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَمَنْ صَلَحَ ﴾ کا عطف دو جگہ سے ہے: اگر چاہے تو عطف ﴿ اَدْخِلْهُمْ ﴾ کی ضمیر پر کر اور چاہے تو ﴿ وَعَدْتَّهُمْ ﴾ کی ضمیر پر کر۔[1] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا: زیادہ مناسب پہلا قول ہے، اس لیے کہ اس کی بنا پر ان کے لیے داخل کرنے کی دعا کرنا صریح ہے اور دوسرے قول کی بنا پر ضمنی ہے اور صریح ضمنی سے بہتر ہوتا ہے۔[2] کچھ بھی ہو مطلب یہ ہے کہ ان کے اور ان کے باپوں وغیرہ کے درمیان مساوات کر دے، تا کہ ان کا سرور پورا ہو۔ جمہور نے ﴿ صَلَحَ ﴾ بہ فتحِ لام "صَلَحَ یَصْلُحُ فَهُوَ صَالِحٌ" باب "دَخَلَ وَنَصَرَ" سے پڑھا ہے اور ﴿ ذُرِّیّٰتِهِمْ ﴾ بہ جمع، اور امام ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے بہ ضمِ لام "صَلُحَ فَهُوَ صَلِیْحٌ" سے پڑھا ہے اور عیسی نے "ذُرِّیَّتِهِمْ" بافراد پڑھا ہے۔[2]

---

① تفسير أبي السعود (٧/٢٦٨) ② فتح القدير (٤/٦٣٣، ٦٣٤)

بالجملہ پھر فرشتوں نے اپنی دعا کی یہ علت ذکر کی: ﴿ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی ہم نے جو تجھ سے مذکورہ امور کی دعا کی، تیرے نزدیک ان کی کچھ بھی ہستی نہیں ہے، اس لیے کہ بے شک تُو تو بڑا ہی غالب، قاہر، زبردست اور بڑا حکمتوں والا ہے۔ تیرے قبضے سے کوئی شے باہر نہیں ہے اور تو جو کچھ کرتا ہے حکمت کے مطابق کرتا ہے اور ان صفات میں وعدے کو پورا کرنا ہے۔ پھر اور دعا کی: ﴿ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ﴾ وقایہ کے معنی محفوظ رکھنا اور بچانا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کی نگرانی کرے تو محاورے میں یوں کہتے ہیں: "وَقَاهُ يَقِيهِ وِقَايَةً أَيْ حَفِظَهُ" امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "وَقِهِمْ مَا يَسُوْءُهُمْ مِنَ الْعَذَابِ"[1] یعنی بچا ان کو اس عذاب سے جو ان کو برا لگتا ہے۔ ﴿ السَّيِّاٰتِ ﴾ کے معنی عقوبات ہیں، یا مضاف مقدر ہے: "أَيْ: جَزَاءُ السَّيِّئَاتِ" پس مطلب یہ ہوا کہ ان کو ان کے اعمالِ بد کی جزا سے بچا۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ اس معنی میں اور ﴿ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴾ کے معنی میں کچھ فرق نہیں تو یہ تکرار بے فائدہ ہوگی؟ تو کہیں گے کہ ﴿ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴾ تو ان کو عذابِ جحیم سے محفوظ رکھنے کی خاص دعا ہے۔ اور ﴿ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ﴾ ان کو سارے عذابوں سے محفوظ رکھنے کی دعا ہے، یعنی عذابِ جہنم، عذابِ قہر، مواقفِ قیامت، حساب، پل صراط اور سوال وغیرہ تو یہ تعمیم تخصیص کے بعد ہے۔ دوسرا یہ جواب ہے کہ ﴿ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴾ تو اصول کے لیے دعا ہے، یعنی وہ لوگ جنھوں نے شرک سے توبہ کی اور راہِ اسلام کی اتباع کی ان کے لیے ہے۔ اور ﴿ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ﴾ ان کے اتباع کے لیے دعا ہے، یہ لوگ آباء، ازواج اور ذریات ہیں۔ یا ﴿ السَّيِّاٰتِ ﴾ سے مراد دنیا میں معاصی ہیں۔ چنانچہ فرشتوں نے پہلے تو اللہ پاک سے یہ بات طلب کی کہ ان کو عذابِ جحیم سے بچائے، پھر یہ درخواست کی کہ ان پر ثواب کا تفضّل فرمائے تو یوں کہا: ﴿ وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ﴾

پھر یہ بات چاہی کہ دنیا میں ان کو اعمالِ فاسد اور باطل عقائد سے محفوظ رکھے، پھر اس کے طلب کرنے کی یہ علت ذکر کی کہ دنیا میں ان سے محفوظ رکھنا آخرت میں رحمت کا سبب ہے، اس طرح سے کہ عذابِ جحیم سے بچانا اور جنت کی نعمتوں میں پہنچانا۔ چنانچہ کہا: ﴿ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ﴾ چنانچہ سیئات سے بچانے کو اس رحمت پر فائز ہونے کے لیے شرط ٹھہرایا، وہ رحمت جو غیر منقطع ہے اعمالِ منقطع کے مقابلے میں اور اعمالِ حقیر کے مقابلے میں ملکِ عظیم ہے۔ ﴿ يَوْمَىِٕذٍ ﴾ میں تنوین اس جملے کے عوض ہے جو عبارت میں موجود نہیں ہے، بلکہ سیاق سے نکلتا ہے۔ تقدیر یہ ہے: "يَوْمَ إِذْ تُدْخِلُ مَنْ تَشَاءُ الْجَنَّةَ وَمَنْ تَشَاءُ النَّارَ وَالْمُسَبِّبَةُ عَنِ السَّيِّئَاتِ، وَهُوَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ" کسی نے کہا: تقدیر یہ ہے: "يَوْمَ إِذْ تُؤَاخِذُ بِهَا" اور ﴿ مَنْ ﴾ کا جواب ﴿ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ﴾

[1] فتح القدير (٤/٦٣٤)

ہے۔ معنی یہ ہیں اور جس کو تو سیئات سے بچائے جس دن تو جنت میں داخل کرے جس کو چاہے اور نار میں داخل کرے جس کو چاہے، کون سی نار، جس کا جانے کا سبب سیئات ہیں، یا جس دن تو سیئات پر مواخذہ کرے، تو واقعی تو نے اس پر رحم کیا، اپنے عذاب سے بچایا اور اس کو جنت میں داخل کیا۔

﴿وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ یعنی یہ جناتِ عدن میں داخل کرنا اور سیئات سے بچانا، جس کا ذکر ہوا، یہی وہ کامیابی ہے جس طرح کی اور کوئی کامیابی نہیں اور وہ نجات ہے جس کے برابر کوئی نجات نہیں، کیوں کہ منقطع اعمال کے بدلے وہ عیش و آرام پایا جو کبھی منقطع نہ ہو اور حقیر اور بے حقیقت اعمال کے بدلے میں وہ ملکِ عظیم ملا جس کی جلالت و بزرگی کی حقیقت تک عقل نہیں پہنچ سکتی ہے۔[1] بالجملہ جو بات ایمان کی فضیلت اور اہلِ ایمان کی تعظیم پر دلالت کرتی ہے وہ یہاں مکمل ہوئی، چوں کہ اس کے ذکر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کفر کی رذالت اور اہلِ کفر کی ذلت و خواری کو بیان کر کے ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کی جائے جو اللہ کی آیتوں میں جھگڑا کرتے ہیں، اس لیے ان کے احوال کی تفصیل بیان کرنے کی طرف رجوع کیا اور فرمایا کہ وہ قیامت میں اپنے گناہوں کا اقرار کریں گے اور اس بات کا کہ وہ عذاب کے مستحق ہیں، پھر سوال کریں گے کہ دنیا کی طرف واپس بھیجے جائیں، تاکہ جو کچھ ان سے ہو چکا اس کی تلافی کریں، حالاں کہ یہ ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ
مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰﴾
قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا
بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۱۱﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا
دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ فَالْحُكْمُ
لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿۱۲﴾ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ
مِّنَ السَّمَاۗءِ رِزْقًا ۭ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ فَادْعُوا اللّٰهَ
مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کیا، ان سے پکار کر کہا جائے گا: اللہ کی ناراضی و بیزاری (آج) تمھاری اپنے آپ پر ناراضی و بیزاری سے بڑھ کر تھی، جب (دنیا میں) تمھیں ایمان کی طرف

[1] فتح البیان (۱۲/۱۶۰۔۱٦٦)

بلایا جاتا تھا تو تم انکار کر دیتے تھے ⑩ وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور تو نے ہمیں دو بار زندہ کیا، تو ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، پھر کیا (اس عذاب) سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟ ⑪ (فرمایا جائے گا:) تمھیں یہ عذاب اس وجہ سے ہے کہ بلاشبہہ جب تنہا اللہ کو پکارا جاتا تھا تو تم (اس کی توحید کا) انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جاتا تو تم (اس شرک کو) مان لیتے تھے، اب حکم تو اللہ ہی کا ہے جو نہایت برتر اور بہت بڑا ہے ⑫ وہی تو ہے جو تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے رزق نازل کرتا ہے اور نصیحت تو وہی پکڑتا ہے جو (اللہ کی طرف) رجوع کرتا ہو ⑬ لہٰذا تم اللہ کے لیے بندگی خالص کرتے ہوئے اسی کو پکارو، اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں ⑭

کافروں کا داخلِ دوزخ ہونے پر نادم ہونا:

آج تم اپنے جی کو پھٹکارتے ہو۔ دنیا میں جب تم کفر کرتے تھے تو اللہ اس سے زیادہ تم کو پھٹکارتا تھا، اسی کا بدلہ تمھیں آج ملے گا۔ دو دفعہ مارا اور دو دفعہ زندہ کیا، اس طرح سے کہ پہلے مٹی تھے یا نطفہ تو مردے ہی تھے، پھر جان پڑی تو زندہ ہوئے۔ پھر مرے اور پھر جیے۔ انتھی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک کافروں کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ قیامت کے دن وہ اس وقت پکارے جائیں گے، جب وہ آگ کی گہرائیوں اور شدتوں میں جلتے اور تپتے ہوں گے اور یہ پکارنا اس وقت کے بعد ہوگا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کا عذاب پہنچ چکا ہوگا جس کی کسی کو طاقت نہیں ہے تو اس وقت اپنی جانوں پر بہت غصہ کریں گے اور ان سے بے زار ہوں گے، ان بدعملوں کی وجہ سے جو پہلے کر چکے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ آگ میں داخل ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت فرشتے ان کو بلند آواز سے خبر دیں گے اور کہیں گے کہ اے وہ لوگو جو عذاب میں ہو! جب دنیا میں تم پر ایمان پیش کیا جاتا تھا اور تم اس سے منکر ہوتے تھے تو اللہ کا غصہ اور اس کا بے زار ہونا بہت سخت ہوتا تھا، اس غصے اور بے زاری کی نسبت جو آج کے دن تم اپنی جانوں سے کر رہے ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ البتہ اللہ کا غصہ اہلِ ضلالت پر جب دنیا میں ان کو ایمان کی طرف بلایا گیا اور انھوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا، اس سے زیادہ تھا جو انھوں نے اپنی جانوں پر کیا، جب قیامت کے دن اللہ کے عذاب کا معائنہ کیا۔ اسی طرح امام حسن بصری، مجاہد، سدی، زر بن عبیداللہ ہمدانی، عبدالرحمان بن زید بن اسلم اور ابن جریر طبری رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔[1]

① تفسیر الطبري (٣٥٩،٣٥٨/٢١) تفسیر ابن کثیر (٩٣/٤)

کفار کی دنیا میں لوٹائے جانے کی خواہش:

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾

امام ثوری رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [البقرة: ۲۸] ''تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو؟ حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمھیں زندہ کیا، پھر تمھیں مار ڈالے گا، پھر زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' اسی طرح عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ضحاک، قتادہ اور ابو مالک رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے[1] اور یہی صواب ہے، یعنی صحیح ہے جس میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہیں ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دنیا میں موت دیے گئے، پھر اپنی قبروں میں زندہ کیے گئے اور خطاب کیے گئے، پھر مارے گئے، پھر قیامت میں زندہ کیے گئے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زندہ کیے گئے جب آدم علیہ السلام کی پشت سے نکال کر ان سے میثاق لیا گیا، پھر ان کو ماں کے رحم میں پیدا کیا، پھر ان کو مارا، پھر ان کو قیامت کے دن زندہ کیا۔[2] امام سدی اور ابن زید رحمہما اللہ کے یہ قول ضعیف ہیں، اس لیے کہ ان قولوں کی بنا پر ان کا تین بار زندہ کرنا اور تین بار مارنا لازم آئے گا۔ صحیح قول سیدنا عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور اُن کے تابعین کا ہے۔

اس سب سے مقصود یہ ہے کہ کفار جب اللہ عزوجل کے روبرو عرصاتِ قیامت میں ٹھہرے ہوئے ہوں گے تو دنیا کی طرف لوٹ جانے کا سوال کریں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴾ [السجدة: ۱۲] ''کاش کہ آپ دیکھتے جب کہ گناہ گار لوگ اپنے رب تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں گے، کہیں گے اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب تو ہمیں واپس لوٹا دے ہم نیک اعمال کریں گے ہم یقین کرنے والے ہیں۔'' چنانچہ ان کی استدعاء قبول نہ ہوگی، اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۷ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۲۷۔ ۲۸] اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جب کہ یہ دوزخ کے پاس کھڑے کیے جائیں تو کہیں گے: ہائے! کیا اچھی بات ہو کہ ہم پھر واپس بھیج دیے جائیں اور اگر ایسا ہو جائے تو ہم اپنے رب کی آیات کو جھوٹا نہ بتلائیں اور ہم ایمان والوں میں سے ہو جائیں بلکہ جس چیز کو اس کے قبل چھپایا کرتے تھے وہ ان کے سامنے آ گئی ہے اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھیج دیے جائیں تب بھی یہ وہی کام کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

پھر جس وقت وہ آگ میں داخل ہوں گے اور اس کا چھونا اور اس کی آواز سنیں گے اور اس کو موگریاں اور

---

[1] تفسير الطبري (۲۱/۳۶۰) [2] تفسير الطبري (۲۱/۳۶۱)

طوق و بیڑیاں اور سزا کے اسی قسم کے ساز و سامان مہیا پائیں گے اور آگ کا مزہ چکھیں گے تو واپس لوٹائے جانے کا اور بھی زیادہ سوال کریں گے، اس حال میں کہ اس میں چیختے چلاتے ہوں گے، کہیں گے: ﴿ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صٰلِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاۗءَكُمُ النَّذِيْرُ ۭ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴾ [الفاطر: ۳۷] ''اے ہمارے پروردگار! ہم کو نکال لے ہم اچھے کام کریں گے برخلاف ان کاموں کے جو کیا کرتے تھے، (اللہ کہے گا:) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی کہ جس کو سمجھنا ہوتا وہ سمجھ سکتا اور تمھارے پاس ڈرانے والا بھی پہنچا تھا، سو مزہ چکھو کہ (ایسے) ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔'' ﴿ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ۝ قَالَ اخْسَـُٔـوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴾ [المؤمنون: ۱۰۷، ۱۰۸] ''اے ہمارے پروردگار! ہم کو نکال لے اگر ہم دوبارہ لوٹے تو یقیناً ہم ظالموں میں سے ہوں گے، اللہ عزوجل نے فرمایا: پھٹکارے ہوئے یہیں پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو۔''

اس آیتِ کریمہ میں تلطف کیا سوال میں اور مطلب سے پہلے بطور تمہید ایک مقدمہ پیش کیا، وہ یہ کہ ﴿ رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ ﴾ یعنی اے ہمارے پروردگار! تیری قدرت انتہائی بڑی ہے، کیوں کہ تو نے تو ہم کو زندہ کیا اس کے بعد کہ ہم مردہ تھے، پھر ہم کو مارا، پھر زندہ کیا اس لیے تو اس شے پر قادر ہے جس کو تو چاہے اور اب واقعی ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں اپنی جانوں کا برا کرنے والے تھے۔ اب کیا ہمارے نکلنے کی کوئی راہ ہے، یعنی کیا اب تو ہماری یہ بات ماننے والا ہے کہ ہم کو دنیا کی طرف پھیر لے جائے، کیونکہ تُو تو اس پر قادر ہے، تاکہ ہم عمل کریں اس عمل کے علاوہ جو ہم دنیا میں کرتے تھے۔ اب اگر ہم پھر وہی کریں جس میں ہم تھے تو واقعی ہم ظالم ہیں۔ چنانچہ ان کو یہ جواب ملے گا کہ تمھیں دنیا کی طرف لوٹنے کی راہ نہیں ہے۔

پھر اس انکار کی وجہ یہ بیان کی کہ تمھاری خصلتیں حق کو نہیں مانتی ہیں اور نہ ہی وہ اس کی مقتضی ہیں، بلکہ وہ تو حق کو دور ہٹاتی ہیں۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ ﴾ یعنی تم تو ایسے ہی رہو گے اگرچہ تمھیں دارِ دنیا کی طرف لوٹا بھی دیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۲۸] ''اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴾ یعنی اللہ ہی اپنی مخلوق میں حاکم ہے۔ ایسا عادل ہے کہ بالکل ظلم نہیں کرتا ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے راہ بتاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بہکاتا ہے، جس پر چاہتا ہے رحم کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے مار دیتا ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ.

قولہ تعالیٰ: ﴿ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خلق کے لیے وہی اپنی قدرت کو ظاہر کرتا ہے ان بڑی بڑی نشانیوں کے ساتھ جو اپنے خالق اور مبدع و منشی کے کمال پر دلالت کرتی ہیں، وہ نشانیاں جن کا وہ اس کی علوی و سفلی مخلوق میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ ﴿ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ رِزْقًا ۭ ﴾ یعنی اور وہی تمھارے لیے آسمان سے پانی اتارتا ہے جس سے وہ کھیتیاں اور میوے نکالتا ہے جن کے مختلف رنگ، بو، مزہ اور شکل کو واضح طور پر

محسوس کیا جاتا ہے، حالاں کہ جس پانی کے سبب سے وہ سب چیزیں پیدا ہوئی ہیں، وہ ایک ہی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی عظیم قدرت سے ان چیزوں کے درمیان فرق پیدا کر دیا ہے۔ ﴿ وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ﴾ یعنی عبرت نہیں لیتا ان چیزوں سے اور ان میں فکر نہیں کرتا اور ان سے اپنے خالق کی عظمت پر استدلال نہیں کرتا مگر وہی جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہوتا ہے۔

ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو:

پھر مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ یعنی مشرکوں کا تو وہ حال ہے جو سن چکے اور اللہ پاک کی وہ قدرت اور احسان ہے جس کا ذکر کیا گیا، پس اے مسلمانو! تم اللہ وحدہٗ کے لیے دعا اور عبادت خالص کرو، اسی کو پوجو اور اسی کو پکارو اور مشرکوں کی راہ و روش میں ان کی مخالفت کرو۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ابو زبیر محمد بن مسلم بن مدرس مکی سے روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ہر نماز کا سلام پھیرنے کے بعد کہا کرتے تھے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَا نَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ، لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَالثَّنَاءُ الْحَسَنُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ" ''ایک اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ اکیلا اور یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، حکومت اور فرمانروائی اسی کی ہے اور وہی شکر وستایش کا حق دار ہے اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ گناہوں سے بچنے کی توفیق اور نیکی کرنے کی قوت اللہ ہی سے ملتی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرتے، ہر طرح کی نعمت اور سارا فضل وکرم اس کا ہے، خوبصورت تعریف کا سزاوار بھی وہی ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، ہم اس کے لیے دین میں اخلاص رکھنے والے ہیں، چاہے کافر اسے کتنا ہی ناپسند کریں۔'' کہا: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد ان کلمات سے تہلیل کرتے تھے۔[1] (ورواه مسلم وأبو داود والنسائي من طرق عن هشام بن عروة وحجاج بن أبي عثمان وموسى بن عقبة ثلاثتهم عن أبي الزبير عن عبد الله بن الزبير قال: كان رسول الله ﷺ يقول في دبر كل صلاة: لا إله إلا الله وحده لا شريك له وذكر تمامه)

صحیح میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرض نمازوں کے بعد فرمایا کرتے تھے: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ... الخ »[2]. امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن سیرین رحمہ اللہ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور تم اجابت کا یقین کرنے والے ہو۔ یعنی دعا کی قبولیت کا یقین رکھ کر دعا کیا کرو اور جان رکھو کہ اللہ غافل اور بے پروا دل سے کی گئی دعا کو قبول نہیں کرتا ہے۔[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٤) مسند أحمد (٤/٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٠٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٣٩٨/١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٤)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٧٩) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٦٥/١٠) تفسير ابن كثير (٩٣/٤، ٩٤) السلسلة الصحيحة، (٥٩٤)

فتح البیان کا بیان

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ پھر جب اللہ پاک نے اصحابِ نار کا ذکر کیا اور اس بات کا بیان کیا کہ عذاب کا کلمہ ان پر واجب اور ثابت ہوا تو آگ میں داخل ہونے کے بعد ان کی جو حالت ہو گی اس کا بیان کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ ﴾۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے کہ جب کفار اپنے اعمال کو دیکھیں گے اور اپنے نامۂ اعمال میں نظر کریں گے اور دوزخ میں داخل کر دیے جائیں گے اور اپنے بد اعمال کے سبب سے اپنی جانوں پر قہر اور غضب کریں گے اور جس وقت اللہ کے عذاب کو دیکھ لیں گے تو ایک پکارنے والا ان کو پکار کر یوں کہے گا کہ اللہ کا تم کو دنیا میں مبغوض رکھنا، اس سے زیادہ تھا، جتنا تم نے یا تم میں سے بعض نے آج کے دن اپنی جانوں کو مبغوض رکھا ہے۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَمَقْتُ ﴾ کا لام ﴿ يُنَادَوْنَ ﴾ کے بعد ابتداء ہی میں واقع ہوا ہے، اس لیے کہ اس کے معنی "يُقَالُ لَهُمْ" ہیں اور ندا قول ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ نار میں ہر انسان اپنے نفس سے کہے گا: "مَقَتُّكِ يَا نَفْسِيْ" یعنی میں نے تجھ کو مبغوض رکھا اور اے میرے نفس! میں تجھ سے بے زار ہوا۔ اس پر فرشتے ان سے کہیں گے اور وہ آگ میں ہوں گے کہ البتہ اللہ کا غصہ تم پر جب تم دنیا میں تھے اس سے زیادہ سخت تھا، جتنا تمھیں آج اپنی جانوں پر ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ اپنی کتاب، یعنی اعمال نامہ دیے جائیں گے، پھر جب اپنے گناہوں کی طرف نظر کریں گے تو اپنی جانوں پر غصہ کریں گے۔ چنانچہ اس وقت پکارے جائیں گے کہ دنیا میں جب تم ایمان کی طرف بلائے جاتے تھے اور تم کفر کرتے تھے تو البتہ اللہ کا غصہ تم پر اس وقت اس غصے سے بہت زیادہ سخت ہوتا تھا، جتنا آج کے دن آگ کا عذاب دیکھ کر تمھیں اپنی جانوں پر آ رہا ہے۔[1]

کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ ظرف منصوب ہے مقدر محذوف سے جس پر "مقت" مذکور دال ہے۔ "أَيْ: مَقْتُهُ تَعَالٰى إِيَّاكُمْ وَقْتَ دُعَائِكُمْ" کسی نے کہا ہے کہ محذوف "اُذْكُرُوْا" ہے۔ کسی نے کہا اسی "مَقت" کا ظرف ہے جو پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ "مقت" سخت ترین بغض کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اس کا لازم ہے، وہ لازم یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان پر غیظ و غضب ہے اور ان پر عذاب ہے۔[2] (قاله أبو السعود)۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ اس سے مراد شدید ترین انکار اور ملامت ہے۔ ﴿ فَتَكْفُرُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ پھر تم نے کفر پر جمے رہنے کے لیے اپنے نفسِ امارہ کی پیروی کرنے کو اور ان کی خواہشوں کی طرف دوڑنے کو اور اپنے دوستوں کو گمراہ کرنے والوں کی پیروی کرنے کو اور اپنے بڑوں کی پیروی کرنے اور ان کی رایوں کو محبوب سمجھنے کو اختیار کیے رکھا۔

[1] تفسير القرطبي (١٥/٢٩٦، ٢٩٧) فتح القدير (٤/٦٣٥)
[2] تفسير أبي السعود (٧/٢٦٩)

پھر اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی جو وہ دوزخ میں کہیں گے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ ﴾ دونوں ﴿ اثْنَتَيْنِ ﴾ مصدر محذوف کی صفت ہیں۔ "أَيْ: أَمَتَّنَا إِمَاتَتَيْنِ اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا إِحْيَاءَتَيْنِ اثْنَتَيْنِ" اس کی تفسیر میں جو تین قول ہیں، وہ پہلے گزر چکے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تم مٹی تھے، اس سے قبل کہ تم کو پیدا کرے، چنانچہ یہ ایک مرنا ہے۔ پھر تم کو دنیا میں زندہ کیا، چنانچہ یہ ایک حیات ہے۔ پھر تم کو مارے گا تو تم قبروں کی طرف لوٹائے جاؤ گے، چنانچہ یہ دوسرا مرنا ہے۔ پھر تم کو قیامت کے دن اٹھا کھڑا کرے گا، چنانچہ یہ دوسری حیات ہے تو یہ دو موتیں اور دو حیاتیں ہوئیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾[1] [البقرة: ۲۸] "تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو؟ حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمھیں زندہ کیا' پھر تمھیں مار ڈالے گا' پھر زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

پھر اللہ پاک نے ان کا اعتراف بیان کیا، اس کے بعد کہ وہ دنیا میں اللہ کے رسولوں کی تکذیب کرنے کی بنا پر آگ کے عذاب میں پہنچ گئے، چنانچہ ان کی طرف سے حکایت کر کے ارشاد فرمایا: ﴿ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا ﴾ یعنی اب ہم نے اپنے ان گناہوں کا اقرار کیا جو ہم دنیا میں کر آئے ہیں، مراد رسولوں کا جھٹلانا، اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور اس کی توحید کو چھوڑنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے وہاں اقرار کیا جہاں پر اقرار کرنا ان کو کوئی فائدہ نہ دے گا اور اس جگہ پر نادم ہوئے جس جگہ ندامت ان کو نفع نہ دے گی۔ مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے دیکھا کہ ان پر مارنا اور زندہ کرنا دو دو بار واقع ہو چکا ہے تو جان لیا کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے جس طرح کہ پہلی بار پیدا کرنے پر قادر ہے۔

چنانچہ اب اقرار کر لیا اور اپنے اس اقرار کو اس بات کے کہنے کا مقدمہ ٹھہرایا، یعنی اس درخواست کو پیش کرنے کا ذریعہ بنایا: ﴿ فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾ یعنی پھر کیا ہمارے آگ سے نکلنے اور دنیا کی طرف لوٹ جانے کی کوئی راہ ہے، تاکہ ہم اپنے رب کی اطاعت کریں اور اس عذاب سے خلاصی پا جائیں؟ یا اس کے ورے ناامیدی واقع ہے تو نہ نکلنا ہے نہ اس کی طرف کوئی راہ ہے؟ یہ اس شخص کی بات ہے جس پر یاس و ناامیدی غالب ہو گئی اور وہ جو یہ بات کہیں گے تو حیران ہو کر کہیں گے۔ اسی کے مثل وہ قول ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے اور جگہ نقل فرمایا ہے: ﴿ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾ [الشورىٰ: ٤٤] "کیا واپس جانے کی کوئی راہ ہے؟"

چونکہ ان کا یہ کہنا حیران ہو کر ہے، اسی لیے اس کے موافق اللہ پاک نے ان کو یہ جواب دیا: ﴿ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۚ ﴾ ﴿ ذٰلِكُمْ ﴾ مرفوع ہے اس بنا پر کے مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ "أَيْ: الْأَمْرُ ذٰلِكُمْ" یا مبتداء اور اس کی خبر ﴿ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۚ ﴾

[1] تفسیر الطبري (۱/۴۱۹)

ہے۔ "أَيْ: ذٰلِكُمُ الْعَذَابُ الَّذِيْ أَنْتُمْ فِيْهِ كَائِنٌ بِسَبَبِ أَنَّهُ أَيْ: اَلشَّانُ" یعنی یہ عذاب جس میں تم پڑے ہو، وہ اس وجہ سے ہے کہ جس وقت دنیا میں اللہ صرف اکیلا ہی اس کے غیر کے سوا پکارا جاتا تو تم اس کے منکر ہوتے اور اس کی توحید کو چھوڑ دیتے اور اگر اس کے ساتھ بتوں میں سے یا بتوں کے علاوہ کسی اَور کو اس کے ساتھ شریک کیا جاتا تو تم شریک کرنے پر ایمان لاتے اور اس کی تصدیق کرتے اور اس کی طرف دعوت دینے والے کا کہا مانتے۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان سے وہ سبب بیان کر دیا جو اُن کی آگ سے نکلنے کی درخواست کے قبول نہ ہونے کا سبب بنا، وہ سبب یہی ہے کہ عبادت میں اللہ کے ساتھ اس کے غیر کو شریک کرتے تھے، وہ عبادت جس کا سر دعا ہے اور اللہ کی توحید کو چھوڑ دیتے تھے۔ یہاں عبارت میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَأُجِيْبُوْا بِأَنْ لَّا سَبِيْلَ إِلَى الرَّدِّ ذٰلِكَ لِأَنَّكُمْ كُنْتُمْ إِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهُ... الخ" یعنی انھوں نے جو دنیا کی طرف لوٹ جانے کا سوال کیا تھا تو ان کو یہ جواب دیا گیا کہ لوٹ جانے کی طرف کوئی راہ نہیں ہے، اس لیے کہ تمھارا تو یہ حال تھا کہ جس وقت اللہ اکیلا پکارا جاتا تھا... الخ۔

﴿ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴾ یعنی پس حکم اللہ اکیلے کے لیے ہے نہ کہ اس کے غیر کے لیے اور اسی نے تم پر ہمیشہ آگ میں رہنے کا اور اس سے نہ نکلنے کا حکم کیا ہے۔ چنانچہ اس کا تم کو عذاب کرنا عدل نافذ ہے اور اس کا غلبہ اس سے بہت برتر ہے کہ کوئی اس کی ذات اور صفات میں اس کے برابر ہو۔ چنانچہ اس کا فیصلہ رد نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ اس سے بہت بڑا ہے کہ کوئی اس جیسا ہو، یا اس کی کوئی بیوی ہو یا بیٹا یا شریک، چنانچہ اس کی جزا کی کوئی حد نہیں کی جاتی ہے۔ کہا ہے کہ فرقۂ حروریہ نے اپنا قول "لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ" اسی آیت سے لیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب حروراء والے نکلے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ کون ہیں؟ عرض کی گئی کہ محکمین ہیں، یعنی یوں کہتے ہیں کہ نہیں ہے حکم مگر اللہ کے لیے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "كَلِمَةُ حَقٍّ أُرِيْدَ بِهَا الْبَاطِلُ" یعنی یہ ایک حق بات ہے اور اس سے باطل کا ارادہ کیا گیا ہے۔[1]

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ﴾ یعنی جس ذات پاک نے اپنے عدل سے کفار پر یہ حکم لگایا ہے کہ ہمیشہ آگ میں رہیں اور جس کی صفت ﴿ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴾ ہے، وہی ہے جو تم کو اپنی توحید کی دلیلیں اور قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے، وہ یہی ہوا، بادل، رعد اور برق ہیں اور اس جیسی اَور نشانیاں اور تمھارے لیے روزی اُتارتا ہے۔ روزی سے مراد پانی ہے، اس لیے کہ وہ ہی تمام روزیوں کا سبب ہے۔ اس جگہ اللہ پاک نے آیات کے ظاہر کرنے اور رزق کے اتارنے کو اکٹھا ذکر کیا، اس لیے کہ اظہارِ آیات سے تو دینوں کی مضبوطی ہے اور روزیوں سے بدنوں کی مضبوطی ہے۔ یہ آیات وہی تکوینی نشانیاں ہیں جن کو اللہ پاک نے اپنے آسمانوں اور زمین میں اور ان اشیاء میں رکھا ہے جو اُن میں ہیں اور جو اُن کے درمیان میں ہیں۔ جمہور نے ﴿ يُنَزِّلُ ﴾ کو بہ تشدید پڑھا ہے اور امام ابو عمرو اور ابن کثیر رحمہما اللہ نے بہ تخفیف پڑھا ہے۔[2]

---

[1] تفسير النسفي (٦٩/٤) [2] فتح القدير (٦٣٦/٤)

نکتہ:

چونکہ آیاتِ مذکورہ کا دکھانا اور پانی کا آسمان سے نازل کرنا متجدد اور مستمر رہتا ہے، یعنی نئی نئی نشانیاں اور مستقل نشانیاں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں، اسی لیے دونوں جگہ صیغۂ مضارع کا ذکر فرمایا جو تجدد و استمرار پر دال ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَن يُنِيبُ ﴾ یعنی وہ کھلی کھلی نشانیاں جن کا ذکر ہوا، ان سے نصیحت پذیر نہیں ہوتا اور ان سے اللہ کی توحید، صدق اور وعد و وعید پر استدلال نہیں کرتا، مگر وہی شخص جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف رجوع کرتا ہے، اس شے کے سبب سے جس کو وہ اللہ کی آیتوں میں غور وفکر کرنے سے حاصل کرتا ہے اور وہ شخص جو شرک سے توبہ کرتا ہے اور اپنے سارے کاموں میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، اس لیے کہ جو شخص عناد رکھتا ہے، وہ نہ ان آیات میں غور وفکر کرتا ہے اور نہ ہی نصیحت پذیر ہوتا ہے۔

پھر جب اللہ پاک نے وہ دلیلیں بیان کیں جن کو اپنی توحید اور تفرید (اکیلا ہونے) پر قائم کیا تو اپنے بندوں کو حکم کیا کہ اس کو پکاریں اور اس کے لیے دین کو خالص کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴾ یعنی جب دلائل سے یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے تو اب تم اس کے لیے دین کو خالص کر کے اس کو پکارو۔ یا جبکہ یہ بات ثابت ہوگئی، جیسا کہ ذکر کی گئی کہ صرف وہی نصیحت پذیر ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرف انابت کرتا ہے اور اس کی اطاعت کی طرف رجوع کرتا ہے تو تم اس اکیلے ہی کو پکارو، اس حال میں کہ اس کے لیے عبادت کو خالص کرنے والے ہو جس کا اس نے تم کو حکم دیا ہے، گو کافر لوگ اس کو برا سمجھیں۔ لہٰذا تم ان کی کراہت کی طرف کچھ بھی توجہ نہ کرو اور ان کو چھوڑ دو کہ وہ اپنے غیظ وغضب میں مر جائیں اور اپنی حسرت و افسوس میں ہلاک ہو جائیں، تم ان کا ہرگز کچھ خیال نہ کرو۔ تم اسی اللہ کو خالص کر کے پوجو، کیوں کہ عبادت کا مستحق وہی یکتا اور اکیلا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے اوصاف ذکر فرمائے:[1]

رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن
يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿١٥﴾ يَوْمَ هُم بَارِزُونَ ۖ
لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۚ لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ
الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿١٦﴾ الْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۚ
لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٧﴾ وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ
الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِينَ ۚ مَا لِلظَّالِمِينَ

[1] فتح البیان (۱۶۶/۱۲۔۱۶۹)

مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴿۱۸﴾ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا
تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴿۱۹﴾ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا
يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۲۰﴾

وہ بہت بلند درجوں والا، عرش کا مالک ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنے حکم سے وحی نازل کرتا ہے، تاکہ وہ (لوگوں کو) ملاقات کے دن سے ڈرائے ⑮ جس دن وہ (قبروں سے) ظاہر و باہر ہوں گے، اللہ پر ان کی کوئی چیز چھپی نہ ہوگی۔ (اللہ پوچھے گا:) آج کس کی بادشاہی ہے؟ (پھر خود ہی فرمائے گا:) صرف اللہ واحد وقہار کی ⑯ آج ہر نفس کو اس کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا۔ آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، بلاشبہ اللہ جلد حساب لینے والا ہے ⑰ اور آپ انھیں قریب آنے والے دن (قیامت) سے ڈرائیں، جبکہ غم سے بھرے کلیجے حلقوں کو آ رہے ہوں گے، ظالموں کے لیے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی کہ جس کی بات مانی جائے ⑱ وہ جانتا ہے خیانت کرنے والی آنکھوں کو اور اسے بھی جو سینے چھپاتے ہیں ⑲ اور اللہ ہی حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور وہ اس کے سوا جنھیں پکارتے ہیں، وہ کسی بھی چیز کا فیصلہ نہیں کر سکتے، بلاشبہ اللہ ہی خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے ⑳

صفاتِ الٰہی کا بیان اور وحیِ الٰہی کا مقصد:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عظمت اور کبریائی کی اور اپنے عرشِ عظیم کی بلندی کی خبر دیتا ہے جو چھت کی طرح اس کی ساری مخلوقات کے اوپر ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۝ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ [المعارج: ۳۔۴] ''اس اللہ کی طرف سے جو سیڑھیوں والا ہے۔ جس کی طرف فرشتے اور روح چڑھتے ہیں ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہے۔'' ان شاء اللہ تعالیٰ آیندہ اس کا بیان آئے گا کہ سلف و خلف کی ایک جماعت کے قول کے مطابق یہ فاصلہ ساتویں زمین سے لے کر عرش تک کے درمیان ہے اور۔ إن شاء اللہ۔ زیادہ راجح یہی قول ہوگا۔ کئی ایک اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ عرش سرخ یاقوت کا ہے، دو قطر کے مابین اس کی وسعت پچاس ہزار برس کی راہ ہے اور ساتویں زمین سے لے کر اس کی اونچائی تک پچاس ہزار برس کی راہ ہے۔ حدیثِ اوعال میں وہ بات گزر چکی ہے جو اس پر دال ہے کہ اس کی بلندی ساتوں آسمانوں سے بہت کچھ ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ... الآية ﴾ مثل اس آیت کے ہے ﴿ يُنَزِّلُ الْمَلَٰئِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ أَنْ أَنذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ ﴾ [النحل: ٢] ''وہی فرشتوں کو اپنی وحی دے کر اپنے حکم سے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے کہ تم لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں، پس تم مجھ سے ڈرو۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴾ [الشعراء: ١٩٢۔ ١٩٤] ''اور بے شک و شبہہ یہ (قرآن) رب العالمین کا نازل فرمایا ہوا ہے۔ اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ آپ کے دل پر اترا ہے کہ آپ آگاہ کر دینے والوں میں سے ہو جائیں۔'' اسی لیے اللہ عزوجل نے یہاں یوں فرمایا ہے: ﴿ لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴾۔

امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴾ روزِ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ڈرایا ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس میں آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد میں سے آخری لڑکا آپس میں ملیں گے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں بندے ملیں گے۔ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ نے اور بلال بن سعید اور سفیان بن عیینہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس میں آسمان اور زمین والے ملیں گے۔ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس دن آسمان والے اور زمین والے اور خالق و مخلوق ملیں گے۔ میمون بن مہران رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظالم و مظلوم ملے گا[1] اور کبھی یوں کہا جاتا ہے کہ ﴿ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴾ اس سب کو شامل ہے اور اس بات کو شامل ہے کہ ہر عامل عن قریب اس اچھے اور برے عمل سے ملے گا جو اس نے کیا ہے، جیسا کہ دوسروں نے کہا ہے۔

قولہ جل جلالہ: ﴿ يَوْمَ هُم بَارِزُونَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب ظاہر اور کھلے ہوئے ہوں گے، ان کو کوئی شے نہ چھپائے گی، نہ ہی ان پر سایہ کرے گی۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ يَوْمَ هُم بَارِزُونَ ۖ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ﴾ یعنی سب کے سب اس کے علم میں برابر ہوں گے۔

قولہ تبارک وتعالیٰ: ﴿ لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کو اور زمین کو اپنے ہاتھ میں لپیٹ لے گا۔ پھر فرمائے گا: میں بادشاہ ہوں، میں جبار ہوں، میں متکبر ہوں۔ کہاں ہیں زمین کے بادشاہ اور جبار و متکبر؟[2] حدیثِ صور میں ہے کہ جس وقت اللہ عزوجل اپنی ساری مخلوق کی روحوں کو قبض کر لے گا، پھر کوئی بھی سوائے اس وحدہ لاشریک لہ کے باقی نہ رہے گا تو اس وقت فرمائے گا: ﴿ لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ﴾ یعنی آج کس کی بادشاہت ہے؟ ایسا تین دفعہ کہے گا۔ پھر خود ہی اپنے آپ کو جواب دے گا: ﴿ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾[3] یعنی اسی اکیلے نے ہر شے کو مقہور کر لیا ہے اور اس پر غالب ہوا ہے۔

[1] تفسير الطبري (٢١/٣٦٤، ٣٦٥) تفسير ابن كثير (٤/٩٥) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٨)

[3] مسند إسحاق بن راهويه (١/٨٤) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٥٦، ٣٢٥٧) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہِ ضعف ہیں۔

امام محمد بن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قیامت سے پہلے ایک ندا کرنے والا یہ ندا کرے گا: ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ“ یعنی لوگو! تم کو قیامت آ گئی، چنانچہ اس کو زندے اور مردے سن لیں گے۔ کہا: اور اللہ عزوجل آسمانِ دنیا کی طرف نازل ہوگا اور فرمائے گا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ﴾۔[1]

قولہ جل عظمتہ: ﴿ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ﴾ اللہ تعالیٰ اپنے عدل کی خبر دیتا ہے جو وہ اپنی خلق کے فیصلوں میں کرے گا کہ وہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرے گا، نہ خیر سے نہ شر سے، یعنی نہ خیر کے اجر میں سے کچھ کم کر کے اور نہ شر کی جزا میں اضافہ کر کے، بلکہ وہ تو ایک نیکی کے عوض دس گنا اجر دے گا اور بدی کا بدلہ صرف اس جتنا ہی دے گا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ﴾ یعنی آج کسی طرح کا ظلم نہیں، جیسا کہ صحیح مسلم میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب عزوجل سے حکایت کرتے ہیں کہ اس نے فرمایا: اے میرے بندو! بے شک میں نے اپنے نفس پر ظلم حرام کر لیا ہے اور تمھارے درمیان بھی میں نے اس کو حرام ٹھہرایا ہے، اس لیے تم باہم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ فرمایا: اے میرے بندو! جو تمھارے اعمال ہیں، میں ان کا شمار کر کے رکھتا ہوں، پھر میں تم کو ان کا بھرپور بدلہ دوں گا۔ لہٰذا جو کوئی کسی بھلائی کو پائے تو چاہیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد کرے اور جو کوئی اس کے برعکس پائے تو وہ صرف اپنی جان کو ملامت کرے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ یعنی وہ سارے خلائق سے اسی طرح حساب لے گا جس طرح ایک نفس سے حساب لے گا، جیسا کہ اللہ جل وعلا نے فرمایا: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾[القمان: ۲۸] ”تم سب کی پیدائش اور مرنے کے بعد زندہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک جی کا۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴾[القمر: ۵۰] ”اور ہمارا حکم صرف ایک دفعہ (کا ایک کلمہ) ہی ہوتا ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا۔“

فکرِ آخرت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ ﴾ ﴿ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ ﴾ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس کے قریب ہونے کے سبب سے یہ نام رکھا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴾ [النجم: ۵۷۔ ۵۸] ”آنے والی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ اللہ کے سوا اس کا (وقت معین پر کھول) دکھانے والا اور کوئی نہیں۔“ نیز فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ [القمر: ۱] ”قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔“ نیز فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ ﴾[الأنبياء: ۱] ”لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا۔“ نیز فرمایا: ﴿ اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾[النحل: ۱] ”اللہ تعالیٰ کا حکم آ پہنچا، اب اس کی جلدی مت مچاؤ۔“

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳۲٦٥/۱۰) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۵۷۷)

نیز فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴾ [الملك: ٢٧] ”جب یہ لوگ اس وعدے کو قریب تر پالیں گے اس وقت کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے اور کہہ دیا جائے گا کہ یہی ہے جسے تم طلب کیا کرتے تھے۔“

قولہ تبارک وتعالیٰ: ﴿ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ﴾۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: خوف کے مارے دل گلوں میں آ اٹکیں گے، چنانچہ نہ تو وہ باہر نکلیں گے اور نہ واپس اپنی جگہ پر جائیں گے۔ امام عکرمہ، سدی اور کئی ایک اہل علم رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[1] ﴿ كٰظِمِيْنَ ﴾ کے معنی ہیں "سَاكِتِيْنَ"، یعنی وہ خاموش ہوں گے، کوئی بات نہ کرے گا مگر اس کے اذن سے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ [النبا: ٣٨] ”جس دن روح اور فرشتے صفیں باندھ کر کھڑے ہوں گے تو کوئی کلام نہ کر سکے گا، مگر جسے رحمان اجازت دے دے اور وہ ٹھیک بات زبان سے نکالے۔“ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بَاكِيْنَ"[2] یعنی وہ روتے ہوں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴾ یعنی جنھوں نے شرک کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، ان کے لیے نہ ان کا کوئی ناتے والا ہے کہ ان کو نفع پہنچائے اور نہ کوئی سفارشی کہ ان کے بارے میں سفارش کرے، بلکہ ہر بھلائی سے ان کے سارے رشتے اور تعلقات ٹوٹ چکے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴾ اللہ تعالیٰ اپنے کامل اور پورے علم کی خبر دیتا ہے جو ساری چیزوں کو گھیرے ہوئے ہیں، وہ چیزیں چھوٹے درجے کی ہوں یا بڑے درجے کی، باریک ہوں یا باریک سے باریک تر ہوں، اس کے علم سے کچھ بھی باہر نہیں ہے۔ یہ اس لیے بتایا ہے تاکہ لوگ اس کے علم سے ڈریں اور اللہ تعالیٰ سے ڈریں اور شرمائیں جیسا کہ شرمانے کا حق ہے، اور اس کا تقویٰ رکھیں جیسا کہ تقویٰ رکھنے کا حق ہے، اور اس کا لحاظ و پاس کریں اس شخص کے پاس لحاظ رکھنے کی طرح جو یہ جانتا ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے، کیوں کہ وہ تو چور آنکھ کو بھی جانتا ہے، گو وہ آنکھ امانت کو ظاہر کرے اور ان چھپی باتوں کو جانتا ہے جن کو سینوں کی پوشیدگیوں نے چھپایا ہوا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ یہ وہ شخص ہے کہ کسی کے گھر میں داخل ہوتا ہے جس میں خوبصورت عورت ہوتی ہے، یا اس کے پاس سے اور اُن گھر والوں کے پاس سے خوبصورت عورت گزرتی ہے اور جب گھر والے غافل ہوتے ہیں تو وہ شخص اس عورت کی طرف دیکھتا ہے، پھر جب وہ ہوشیار ہو جاتے ہیں تو اپنی نگاہ اس سے نیچی کر لیتا ہے، پھر جب وہ غافل ہوتے ہیں تو دیکھتا ہے، پھر جس وقت وہ ہوشیار ہوتے ہیں تو نگاہ پست کر لیتا ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل سے یہ بات جان چکا ہے کہ اس نے یہ چاہا ہے کہ کاش وہ اس عورت کی شرم گاہ

[1] تفسير الطبري (٢١/٣٦٨)   [2] الدر المنثور (٧/٢٨١، ٢٨٢)

پر مطلع ہوتا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا ہے۔[1] (فتح القدیر اور فتح البیان میں ان الفاظ میں مذکور ہے:
"الرجل يكون في القوم فتمر بهم المرأة فيريهم أنه يغض بصره عنها وإذا غضوا لحظ إليها وإذا نظروا غض بصره عنها وقد اطلع الله من قلبه إنه ود أن ينظر إلى عورتها"[2] (أخرجه سعيد بن منصور وابن أبي شيبة وابن المنذر وابن أبي حاتم))

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ﴾ غمز ہے، یعنی آنکھ سے اشارہ کرنا ہے اور آدمی کا یہ کہنا کہ میں نے فلاں شے دیکھی ہے، حالاں کہ اس نے نہیں دیکھی یا یہ کہنا کہ میں نے نہیں دیکھی، حالاں کہ دیکھی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھ کے دیکھنے کو جانتا ہے کہ آیا وہ خیانت کا ارادہ کرتی ہے یا نہیں۔ اسی طرح امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے بھی کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اللہ اس بات کو جانتا ہے کہ جب تو اس عورت پر قادر ہوگا تو آیا تو اس سے زنا کرے گا یا نہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ اس وسوسے کو جانتا ہے جسے سینے چھپاتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ﴾ یعنی اللہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ نیکی کا بدلہ نیکی سے دے اور بدی کا بدلہ بدی سے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾۔[3] جس شے کے ساتھ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر کی ہے، وہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى﴾ [النجم: ٣١]
''تاکہ اللہ تعالیٰ برے عمل کرنے والوں کو ان کے عمال کا بدلہ دے اور نیک اعمال کرنے والوں کو اچھا بدلہ عنایت فرمائے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جن اصنام، اوثان اور انداد کو وہ پکارتے ہیں، وہ اللہ کے سوا کسی شے کے مالک نہیں ہیں اور نہ ہی وہ کسی شے کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں، بیشک اللہ اپنی خلق کی باتیں سننے والا ہے اور ان کو دیکھنے والا ہے۔ چنانچہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، ان سب میں حاکم و عادل وہی ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ ﴿رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ﴾ مرفوع ہے، اس بنا پر کہ مبتدائے مقدم کی دوسری خبر ہے۔ "أَيْ: هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ آيَاتِهِ وَهُوَ رَفِيْعُ الدَّرَجَاتِ" اسی طرح ﴿ذُو الْعَرْشِ﴾ تیسری خبر ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں مبتدائے محذوف کی خبریں ہوں۔ ﴿رَفِيْعُ﴾ صیغۂ صفتِ مشبہ بہ معنی مرتفع ہے۔ اس بنا پر

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٦٥) تفسير ابن كثير (٤/٩٦) [2] الدر المنثور (٧/٢٨٢) فتح القدير (٤/٦٣٩) فتح البيان (١٠/١٧٥)
[3] تفسير الطبري (٢١/٣٦٩، ٣٧٠) تفسير ابن كثير (٤/٩٦) [4] تفسير ابن كثير (٤/٩٤-٩٦)

درجات سے مراد اللہ پاک کی صفاتِ جلال اور کمال ہوں گی۔ یعنی اپنی وحدانیت اور جلال و اکرام کی صفات کی عظمت کے سبب سے اس کی صفتیں عظیم ہیں اور وہ مرتفع ہے۔ اپنے علاوہ ہر شے سے بے نیاز و مستغنیٰ ہے اور ساری مخلوق اس کی محتاج ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ﴿ رَفِيْعُ ﴾ بہ معنی "رافع" یعنی بلند کرنے والا ہو، اس بنیاد پر کہ درجات سے مراد فرشتوں کے درجات، یعنی ان کے چڑھنے کی جگہیں اور انبیاء اور اولیاء کے جنت میں درجات ہوں اور تمام مخلوقات کے ان کے علوم و اخلاقِ فاضلہ میں اور ان کے رزقوں اور اجلوں کے مراتب ہوں۔ امام کلبی اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "رَفِيعُ السَّمَاوَاتِ السَّبعِ"[1] یعنی درجات سے مراد ساتوں آسمان ہیں۔

﴿ ذُو الْعَرْشِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش کا مالک و خالق ہے اور اس میں تصرف کرنے والا ہے، اس کو فرشتوں کے لیے مطاف، یعنی طواف کی جگہ بنایا ہے اور اس کو اپنے آسمانوں کے اوپر رکھا ہے۔ بالجملہ ﴿ رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ﴾ سے مقصود اللہ پاک کا علوِ صمدیت بتانا ہے، وہ علو جو الوہیت میں اس کے متفرد ہونے پر دال ہے، اس لیے کہ ﴿ رَفِيْعُ ﴾ بہ معنی "مرتفع" ہے اور درجات سے مراد اس کے صفاتِ کمال ہیں جو جملہ معقولات سے ہیں۔ لہٰذا جس ذات پاک کے صفاتِ کمال و جلال ایسے مرتفع اور بلند ہیں کہ ان کے آگے پیچھے کوئی کمال ظاہر نہیں ہوتا تو ٹھیک نہیں ہے کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

اسی طرح ﴿ ذُو الْعَرْشِ ﴾ سے اس کی علوِ صمدیت پر بطور محسوس کے آگاہ کرنا مقصود ہے، اس لیے کہ عرش اجسامِ محسوسہ کی جنس سے ہے اور عالمِ جسمانی کا اصل ہے۔ لہٰذا جو ذات پاک ایسی خلقِ عظیم کا خالق، مالک اور مدبر ہے، لائق نہیں ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک کریں۔ ان دونوں صفتوں سے معلوم ہوا کہ ان کا حامل اعلیٰ شان اور عظیم سلطان والا ہے، پس اسی کے لیے عبادت واخلاص لائق اور واجب ہے۔ اور اگر ''درجات'' سے مراد مخلوقات کے مراتب ہوں تو ﴿ رَفِيْعُ ﴾ سے مراد "رافع" یعنی بلند کرنے والا ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور اولیاء کے درجے جنت میں بلند کیے ہیں اور مخلوق کے درجے علوم و اخلاقِ فاضلہ میں اور رزقوں اور اجلوں میں بلند فرمائے ہیں اور فرشتوں میں سے ہر ایک کے لیے ایک مقررہ درجہ ٹھہرایا ہے، جیسا کہ ملائکہ کی زبانی بیان فرمایا ہے: ﴿ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴾ [الصافات: ١٦٤] ''(فرشتوں کا قول ہے کہ) ہم میں سے تو ہر ایک کی جگہ مقرر ہے۔''

علماء میں سے ہر ایک کے لیے ایک درجہ معین قرار دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ﴾ [المجادلة: ١١] ''اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور جو علم دیے گئے ہیں درجے بلند کر دے گا۔'' اور اجسام میں سے ہر قسم کے لیے ایک درجہ معین کیا ہے، بعض کو تو ارضی سفلی کدر کیا اور بعض کو فلکی علوی روشن بنایا اور بعض کو عرش و کرسی کے جواہر میں سے کر دیا اور اگر

[1] تفسیر القرطبي (٢٩٩/١٥)

درجات سے ملائکہ کے مصاعد (اوپر چڑھنے کی جگہیں) مراد لیے جائیں، یہاں تک کہ عرش کو پہنچیں تو ﴿ رَفِيْعُ ﴾ کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں، یعنی رافع اور مرتفع، یعنی وہ جاہائے صعودِ ملائکہ کو بلند کرنے والا ہے، یا اس کے ملائکہ کے صعود کی جگہیں بلند ہیں۔ اسی طرح اگر ''درجات'' سے مراد ''سماوات'' لیں تو بھی ﴿ رَفِيْعُ ﴾ کے معنی رافع اور مرتفع ہو سکتے ہیں، یعنی اس نے آسمانوں کو بلند کیا ہے، یا اس کے آسمان بلند ہیں، جیسا کہ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ آسمان ایک کے اوپر ایک ہیں اور عرش ان کے اوپر ہے۔ غرضیکہ جو ایسے عظیم الشان اور باہر البرہان کام کرنے والا ہے، وہی عبادت اور اخلاص کا مستحق ہے۔

جملۂ ﴿ يُلْقِي الرُّوْحَ ﴾ محلِ رفع میں ہے، اس بنا پر کہ مبتدائے متقدم کی چوتھی خبر ہے یا مبتدائے مقدر کی خبر ہے۔ اس سے مقصود یہ بات بتانا ہے کہ جس طرح جسمانیات اس کے زیرِ تسخیر ہیں، اسی طرح روحانیات بھی اس کے امر کے مسخر ہیں، اس لیے کہ اللہ پاک کے علاوہ جو بھی ہے وہ یا تو جسمانی ہے یا روحانی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرما دیا کہ یہ دونوں قسمیں اس کے زیرِ تسخیر ہیں۔ جسمانی میں تو سب سے بڑا عرشِ معلیٰ ہے، چنانچہ ﴿ ذُو الْعَرْشِ ﴾ فرما کر یہ بتا دیا کہ وہ کل عالمِ اجسام پر مستولی، یعنی غالب ہے اور ﴿ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴾ سے یہ واضح کر دیا کہ جسمانیات کی طرح روحانیات بھی اس کے امر کے مسخر ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ توحید کے ثابت کرنے کے بعد نبوت کی تمہید شروع فرمائی۔ روح سے مراد وحی ہے۔ وحی کا نام روح اس لیے رکھا ہے کہ لوگ وحی کے سبب سے ہی کفر سے، جو ایک طرح کی موت ہے، زندہ ہوتے ہیں جس طرح کہ بدن روح کے ساتھ زندہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿١٩٣﴾ عَلٰى قَلْبِكَ ﴾ [الشعراء: ١٩٣۔ ١٩٤] ''اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے، آپ کے دل پر اترا ہے۔'' نیز جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ﴾ [النحل: ١٠٢] ''اسے آپ کے رب کی طرف سے جبرائیل علیہ السلام حق کے ساتھ لے کر آئے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ مِنْ اَمْرِهٖ ﴾ ﴿ يُلْقِي ﴾ سے متعلق ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ محذوف سے متعلق ہو کر حال ہو۔ ''أَيْ: كَائِنًا مِنْ أَمْرِهِ أَوْ نَاشِئًا'' اور ''مُبْتَدِأً مِنْ أَمْرِهِ''۔ اور حرف ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ یا روح کا بیان ہے، جس کے معنی وحی کے ہیں یا روح کی صفت ہے۔ '' أَيْ: يُلْقِي الرُّوحَ الْكَائِنَ مِنْ أَمْرِهِ'' یا حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ سببیہ ہے۔ ''أَيْ: مِنْ أَجْلِ أَمْرِهِ وَبِسَبَبِ أَمْرِهِ'' اور ''أمر'' سے مراد قول ہے جیسا کہ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[1] یا مراد اس سے قضاء ہے جس پر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔[2] (كما في الخازن) ﴿ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ﴾ سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں۔ ﴿ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴾ جمہور نے بہ صیغۂ معروف ونصبِ ﴿ يَوْمَ ﴾ پڑھا ہے

① تفسير الجلالين (٦١٩/١) ② تفسير الخازن (٩١/٦)

اور فاعل اللہ تعالیٰ ہے، یا رسول، یا ﴿ مَنۡ یَّشَآءُ ﴾ اور منذر بہ، یعنی جس شے سے ڈرایا وہ محذوف ہے۔ "أَيْ: لِیُنْذِرَ الْعَذَابَ یَوْمَ التَّلَاقِ" یعنی وہی اللہ پاک جس کی قدرت، عظمت، منت اور توحید مذکور ہوئی، وحی ڈالتا ہے، ایسی وحی جو اس کے قول یا قضا سے ہے جس طرح اپنے بندوں میں چاہتا ہے، تاکہ ڈرا دے اللہ یا رسول اس عذاب سے جو ملاقات کے دن ہوگا۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ اور ایک جماعت نے بہ صیغۂ معروف و رفع ﴿ یَوۡمَ ﴾ پڑھا ہے، بنا بر فاعلیت مجازاً، یعنی تاکہ ڈرائے ﴿ یَوۡمَ التَّلَاقِ ﴾ سے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حسن اور ابن سمیفع رحمہ اللہ نے بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ فاعل ضمیر مخاطب ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ، یا اس بنا پر کہ ضمیر روح کی طرف راجع ہو، اس لیے کہ روح کی تانیث جائز ہے۔ اور یمانی نے بہ یائے تحتیہ بہ صیغۂ مجہول اور رفع "یَوْمٌ" بنا بر نیابتِ فاعل پڑھا ہے اور ﴿ یَوۡمَ التَّلَاقِ ﴾ کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہ اثباتِ یاء وقف و وصل میں پڑھا ہے۔ اور قالون نے بہ اثباتِ وصل میں پڑھا ہے بہ خلاف عنہ اور ورش نے وصل میں بہ اثبات پڑھا ہے اور باقی قراء نے وقف و وصل میں بہ حذفِ یاء پڑھا ہے۔ فاسی نے "شرح شاطبیہ" میں اس کی توجیہ ذکر کی ہے، اس کی طرف مراجعت کی جائے۔ (كذا ذكر الكرخي) ﴿ یَوۡمَ التَّلَاقِ ﴾ کی وجہِ تسمیہ میں جو اقوال ہیں وہ پہلے گزر چکے ہیں، ایک یہ ہے کہ اس میں عابدین اور معبودین ملیں گے۔[1] (قاله أبو العالية و مقاتل)۔ کسی نے کہا ہے کہ اولین اور آخرین ملیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ اعمال کی جزا اور عمل کرنے والے ملیں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ یَوۡمَ ہُمۡ بٰرِزُوۡنَ ۬ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس دن وہ اپنی قبروں سے نکلنے والے ہوں گے ان کو کوئی شے نہ چھپائے گی، نہ پہاڑ نہ کوئی ٹیلہ، نہ کوئی عمارت اس لیے کہ زمین تو اس دن ایک برابر میدان ہوگی۔ ان پر کچھ کپڑے نہ ہوں گے، وہ تو ننگے کھلے ہوئے ہوں گے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ ننگے بدن، ننگے پاؤں اور بے ختنہ حشر کیے جائیں گے۔[2] ﴿ یَوۡمَ ﴾ بدل ہے ﴿ یَوۡمَ التَّلَاقِ ﴾ سے بدل الکل من الکل اور ﴿ یَوۡمَ ﴾ ظرف مستقبل ہے مثل "إذ" کے مضاف ہے طرف جملہ اسمیہ کے امام اخفش رحمہ اللہ کے طریقے پر۔ اور ﴿ یَوۡمَ ﴾ کی حرکت حرکتِ اعراب ہے بنا بر مشہور۔ کسی نے کہا ہے کہ حرکتِ بنا ہے، چناں چہ کوفی اسی طرف گئے ہیں۔ کلمۂ ﴿ یَوۡمَ ﴾ یہاں اور سورۃ الذاریات میں علاحدہ لکھا جاتا ہے۔ اصل یہی ہے، جیسا کہ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے اور اسی طرح شرح جزریہ شیخ الاسلام میں بھی ہے، اس لیے کہ کلمۂ "ھم" تو مرفوع بہ ابتداء ہے تو مناسب ہے کہ علاحدہ ہو اور ان دو کے ماسوائے، جیسے: ﴿ مِنۡ یَّوۡمِہِمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ﴾ [الذاريات: ٦٠] "اپنے اس دن سے جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں۔" اور ﴿ حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَہُمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ﴾ [الزخرف: ٨٣] "یہاں تک کہ انھیں اس دن سے سابقہ پڑ جائے جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں۔" موصول ہے اس لیے کہ ان میں "ھم" مجرور ہے تو وصل مناسب ہے۔

[1] فتح القدير (٦٣٧/٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٠)

امام ابن عطیہ نے کہا کہ ﴿ یَوْمَ ﴾ ﴿ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰہِ ﴾ سے منصوب ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ منصوب بہ اضمارِ "اُذْکُرْ" ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور جملہ ﴿ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنْهُمْ شَیْءٌ ﴾ میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ مستانفہ ہے، ان کے خروج کے بیان کو لایا گیا ہے، یعنی ان کی ذات، احوال اور اعمال سے کوئی شے اللہ سے مخفی نہیں رہے گی، کون سے اعمال؟ وہ جو دنیا میں کر چکے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ بٰرِزُوْنَ ﴾ کی ضمیر سے حال ہے، یعنی وہ قبروں سے اس حال میں نکلیں گے کہ اللہ پر ان سے کوئی شے مخفی نہ ہوگی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ کلمۂ "ھم" کی دوسری خبر ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِمَنِ ﴾ خبر مقدم ہے اور ﴿ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ﴾ مبتدائے مؤخر ہے۔ اور جملہ مستانفہ ہے، سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا کہ اس دن جو خلائق خارج ہوگی تو اس سے اس وقت کیا کہا جائے گا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ یوں کہیں گے کہ آج کس کا ملک ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ جب سارے آسمان اور زمین والے ہلاک ہو جائیں گے تو رب تبارک وتعالیٰ یہ فرمائے گا، پھر اسے کوئی جواب نہ دے گا تو وہ ہی خود کو جواب دے گا، فرمائے گا: ﴿ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ یہ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ "أَيْ: هُوَ اللّٰهُ"، حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: وہی سائل اور وہی مجیب۔ جب کوئی اسے جواب نہ دے گا تو خود ہی جواب دے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک ایک منادی کو حکم دے گا کہ اس کی ندا کرے تو اہلِ محشر کے مومن اور کافر کہیں گے: ﴿ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾۔[2]

کسی نے کہا کہ اس منادی کو یہ جواب اہلِ جنت دیں گے، اہلِ نار نہ دیں گے۔ (أفاده الزمخشري) کسی نے کہا ہے کہ یہ اس بات کی حکایت ہے جس کے ساتھ زبانِ حال اس دن بولے گی، کیوں کہ مبطلین کے تمام دعوے منقطع ہو جائیں گے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۝ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۝ یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا ۭ وَالْاَمْرُ یَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰہِ ﴾ [الإنفطار: ١٧۔ ١٩] "تجھے کچھ خبر بھی ہے کہ بدلے کا دن کیا ہے، پھر (کہتا ہوں کہ) تجھے کیا معلوم کہ جزا (اور سزا) کا دن کیا ہے۔ (وہ ہے) جس دن کوئی شخص کسی شخص کے لیے کسی چیز کا مختار نہ ہوگا اور (تمام تر) احکام اس روز اللہ کے ہی ہوں گے۔" امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول خلق کے فنا ہونے کے وقت ہوگا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دو نفخوں کے درمیان فرمائے گا اور چالیس برس کے بعد خود کو جواب دے گا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلْیَوْمَ تُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴾ جواب کے تتمے سے ہے اس قول کی بنا پر کہ جواب دینے والا خود اللہ پاک ہے۔ رہا وہ قول کہ جواب دینے والے سارے بندے ہیں، یا بعض بندے ہیں؟ تو اس کی بنیاد پر کلامِ مستانف ٹھہرے گا اس بات کے بیان کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ

[1] فتح القدير (٦٣٧/٤) [2] تفسير القرطبي (٣٠٠/١٥) [3] تفسير القرطبي (٣٠١/١٥)

ان کے جواب کے بعد فرمائے گا، یعنی آج ہر نفس اس شے کے ساتھ بدلہ دیا جائے گا جو اس نے دنیا میں بھلائی یا برائی میں سے کی ہے۔ آج ان میں سے کسی پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہے، اس طرح سے کہ اس کے ثواب سے کچھ کم کیا جائے، یا اس کی سزا میں کچھ زیادتی کی جائے۔ بے شک اللہ ﴿سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ﴾ ہے، یعنی اس کا حساب تیز ہے، کیوں کہ اس کو اس میں غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے جس طرح کہ اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کے علم نے ہر شے کو گھیر رکھا ہے، اس سے ذرہ بھر بھی غائب نہیں ہوتا۔ سرعتِ حساب کے بارے میں کہا ہے کہ دنیا کے دنوں کے اندازے کے مطابق آدھے دن میں ساری مخلوق کا حساب لے لے گا، اس لیے کہ اللہ پاک کو ایک حساب دوسرے حساب سے روک نہیں سکتا۔ وہ تو ایک وقت میں ساری مخلوق سے حساب لے لے گا۔ اس حدیث کے مطابق جو اس بارے میں وارد ہوئی ہے۔

امام عبد بن حمید رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سفید زمین کے ایک میدان میں جو چاندی کی ٹکیا کی طرح ہوگی، جس میں کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی گئی، ساری مخلوق کو جمع کرے گا، چنانچہ پہلی بات جو کرے گا، وہ یہ ہے کہ ایک منادی ندا کرے گا: ﴿لِمَنِ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ ؕ لِلّٰہِ الۡوَاحِدِ الۡقَہَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلۡیَوۡمَ تُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ ؕ لَا ظُلۡمَ الۡیَوۡمَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ﴾ پھر جھگڑوں میں سے سب سے پہلے جھگڑے جن کا فیصلہ کیا جائے گا وہ خون ہیں۔[1] یہ اثر اس قول کی تائید کرتا ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ اس کے بندوں کو ڈرائیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَ اَنۡذِرۡہُمۡ یَوۡمَ الۡاٰزِفَۃِ﴾ مراد روزِ قیامت ہے، اس کے قرب کی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "أَزِفَ فُلَانٌ أَوِ الرَّجُلُ، أَيْ: قَرُبَ يَأْزَفُ أَزِفًا مِنْ بَابِ تَعِبَ وَأُزُوْفًا دَنَا وَقَرُبَ" کسی نے کہا ہے کہ ﴿یَوۡمَ الۡاٰزِفَۃِ﴾ موت کے حاضر ہونے کا دن ہے، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قیامت کو "آزفۃ" اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ قریب ہے، اگرچہ لوگوں نے اس کے امر کو بعید سمجھا ہے۔[2] جو شے ہونے والی ہے تو وہ قریب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَی الۡحَنَاجِرِ﴾ یعنی جبکہ دل خوف کے مارے اپنی جگہ سے نکل آئیں گے اور اوپر کو چڑھ آئیں گے، یہاں تک کہ حنجرہ (گلے) تک پہنچ جائیں گے اور اُن کے حلق سے مل جائیں گے، پھر نہ تو وہ نیچے کی طرف لوٹیں گے کہ سانس لینے سے راحت پائیں اور نہ ہی وہ نکل پائیں گے کہ مر کر راحت پا جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ بَلَغَتِ الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ﴾ [الأحزاب: ۱۰] "اور کلیجے منہ کو آ گئے۔" کلمۂ "حناجر"

---

[1] تفسير الطبري (۴۶/۱۷، ۴۷) الدر المنثور (۲۸۰/۷) [2] معاني القرآن (۳۶۹/٤)

"حنجور" کی جمع ہے۔ "حنجور" وزن و معنی میں مثل "حلقوم" کے ہے یا "حنجرة" کی جمع ہے۔ "حنجرة" بھی "حلقوم" کے معنی میں ہے۔

﴿ كٰظِمِيْنَ ﴾ کے معنی ہیں: "مَغْمُوْمِيْنَ مَكْرُوْبِيْنَ مُمْتَلِئِيْنَ غَمًّا" یعنی غم و بے قراری سے بھرے ہوں گے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جس وقت لوگوں کے دل غم کی وجہ سے اورغم کی حالت میں حناجر میں ہوں گے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مارے خوف کے ان کے دل حناجر میں واقع ہوں گے، پھر وہ نہ تو نکلیں گے اور نہ اپنی جگہ میں واپس جائیں گے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ یہ تو نہایت گھبراہٹ کی خبر دی ہے، یعنی یہ بات حقیقت نہیں ہے، مجاز کے طور پر انتہا درجے کی گھبراہٹ کو اس عبارت میں ادا کیا ہے، جس طرح کہ ہندی محاورے میں بولتے ہیں کہ کلیجہ منہ کو چلا آتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اگر ﴿ كٰظِمِيْنَ ﴾ حال ہے ﴿ الْقُلُوْبُ ﴾ سے تو کاظمہ ہوتا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ كٰظِمِيْنَ ﴾ اہلِ قلوب کے اعتبار سے کہا ہے، اس لیے کہ معنی یہ ہیں: "إِذْ قُلُوْبُ النَّاسِ لَدَي حَنَاجِرِهِمْ" یعنی جبکہ لوگوں کے دل ان کے حلق کے نزدیک ہوں گے، چنانچہ ﴿ كٰظِمِيْنَ ﴾ حال ہوگا ناس سے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ حال ہے "قلوب" سے۔ اس حال کو بہ صیغۂ جمع مذکر سالم جو عقلاء کے ساتھ خاص ہے، اس لیے اس طرح سے ادا کیا ہے کہ "قلوب" کی طرف وہ شے نسبت کی گئی ہے جو عقلاء کی طرف منسوب ہوتی ہے تو اس کو عقلاء ہی کی جمع میں ادا کیا۔

پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ اس دن کافروں کو کوئی نفع نہ پہنچائے گا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ ﴾ یعنی ظالموں کے لیے کوئی قریبی یا محبت کرنے والا نہیں ہوگا جو ان کو نفع پہنچائے۔ ﴿ حَمِيْمٍ ﴾ تیرا وہ قریبی اور رشتے دار ہے جس کے کام کا تو اہتمام کرتا ہے۔ ﴿ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴾ اور نہ کوئی سفارشی کہ ان کے لیے شفاعت کرنے میں اس کی بات مانی جائے۔ کلمۂ ﴿ يُّطَاعُ ﴾ محلِ جر میں ہے، اس بنا پر کہ ﴿ شَفِيْعٍ ﴾ کی صفت ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں اطاعت کی حقیقت نہیں بن سکتی، اس لیے کہ مطاع رتبے میں مطیع سے اوپر ہوتا ہے تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ شفاعت کرنے والا اس شخص سے اوپر ہو جس کے پاس شفاعت کی جاتی ہے، حالاں کہ یہاں یہ بات محال ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے اوپر کوئی شے نہیں ہے تو اب یہ مجاز ہوگا اور معنی یہ ہوں گے: "وَلَا شَفِيْعٍ يُشَفَّعُ" یعنی نہ کوئی ایسا سفارشی ہوگا جس کو شفاعت کی اجازت دی جائے، یا اس کی شفاعت قبول کی جائے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی مفہوم اس وصف کے مخالف نہیں ہے، اس لیے کہ ان کے لیے تو اصلاً کوئی شفیع نہیں ہے،[3] یعنی نہ مطاع نہ غیر مطاع۔

---

[1] معاني القرآن (٣٦٩/٤) [2] تفسير الطبري (٣٦٨/٢١) [3] تفسير الجلالين (٦٢٠/١)

پھر اللہ پاک نے اپنے علم کے شاملِ حال ہونے کا ذکر کیا کہ وہ ہر شے کو عام و شامل ہے، گو وہ شے انتہائی درجے کی پوشیدہ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا: ﴿يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ ٱلۡأَعۡيُنِ﴾۔ یہ جملہ ﴿هُوَ ٱلَّذِي يُرِيكُمۡ﴾ کی ایک اور خبر ہے یا اس مبتداء کی چوتھی خبر ہے جس کی خبر رفیع و ما بعدِ رفیع ہے۔ اس کے سوا اور قول بھی ہیں، لیکن ظاہر قول پہلا ہے۔ ﴿خَآئِنَةَ﴾ مصدر ہے "عافیہ" و "عاقبہ" کی طرح، یعنی وہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کو، وہ خیانت یہی ہے کہ اس شے کی طرف چور نظر سے دیکھا جائے جس کی طرف نظر کرنا آدمی کے لیے حلال نہیں ہے۔ مؤرج نے کہا ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے: "أَيْ: يَعْلَمُ الْأَعْيُنَ الْخَائِنَةَ" یعنی موصوف کی طرف صفت کی اضافت ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک خیانت کرنے والی آنکھوں کو جانتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اضافت بہ معنی ﴿مِنۡ﴾ ہے۔ "أَيْ: الْخَائِنَةُ مِنَ الْأَعْيُنِ" یعنی آنکھوں میں سے جو آنکھ خیانت کرنے والی ہے، اس کو جانتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿خَآئِنَةَ ٱلۡأَعۡيُنِ﴾ "اَلْهَمْزُ بِالْأَعْيُنِ فِيمَا لَا يُحِبُّ اللّٰهُ" یعنی آنکھ سے اس شے میں اشارہ کرنا جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں: "إِنَّهُ الرَّمْزُ بِالْعَيْنِ" "وہ آنکھ کا اشارہ ہے۔" امام سفیان نے کہا ہے کہ نظر بعد نظر ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ (امام فراء رحمہ اللہ کا اصل قول یہ ہے کہ ﴿خَآئِنَةَ ٱلۡأَعۡيُنِ﴾ "اَلنَّظْرَةُ الثَّانِيَةُ"، ﴿وَمَا تُخۡفِي ٱلصُّدُورُ﴾ "اَلنَّظْرَةُ الْأُولٰى") پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1]

امام ابو داود، نسائی اور ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب فتح مکہ کا دن ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار مردوں اور دو عورتوں کے سوا سب کو امن دیا اور فرمایا کہ ان کو قتل کر دو اگرچہ تم انھیں کعبے کے پردوں سے لٹکتے ہوئے پاؤ۔ ان میں سے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ہے، چنانچہ وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس چھپ گیا، پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا تو عثمان رضی اللہ عنہ اس کو لے کر آئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! آپ عبداللہ سے بیعت لیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر مبارک اٹھایا، پھر تین بار اس کی طرف نظر کی، ہر بار اس کی بیعت سے انکار فرماتے تھے، پھر اس سے بیعت لی، پھر اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ کیا تم میں کوئی ایسا رشید (سمجھ دار) آدمی نہیں تھا جو اس کی طرف بڑھتا، جب اس نے دیکھا تھا کہ میں نے اپنا ہاتھ اس کی بیعت سے روک لیا تھا اور اسے قتل کر ڈالتا؟ تو صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہمیں کیسے معلوم ہو کہ آپ کے جی میں کیا ہے، آپ نے ہماری طرف اپنی آنکھ کے اشارے سے کیوں نہ کہہ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک یہ کسی نبی کے شایانِ شان نہیں کہ اس کے لیے خائنۃ العین ہو۔[2]

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/٣٠٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٨٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٦٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٢٣)

﴿ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ان چھپی باتوں کو جانتا ہے جن کو دل چھپاتے ہیں اور ان اللہ کی نافرمانیوں کو جن کو وہ پوشیدہ رکھتے ہیں، یا امانت وخیانت کو۔ ﴿ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے، وہ ہر ایک کو وہ جزا دے گا جس کا وہ مستحق ہے خیر اور شر سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ ﴾ فرمایا، جبکہ اس نے اس عورت کی طرف نظر کی تو اس کا ارادہ خیانت کا ہے یا نہیں۔ ﴿ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴾ فرمایا کہ جب وہ اس پر قادر ہوگا تو آیا اس سے زنا کرے گا یا نہیں۔ کیا میں تم کو اس آیت کی خبر نہ دوں جو اس کے بعد ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ﴾ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ نیکی کی نیک جزا دے اور بدی کی جزا بدی کے ساتھ دے۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم والطبراني في الأوسط وأبو نعيم في الحلية والبيهقي في الشعب)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ﴾ یعنی وہ لوگ جن کو مشرکین اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کسی شے کا فیصلہ نہیں کر سکتے، کیوں کہ وہ نہ تو کسی شے کو جانتے ہیں اور نہ ہی کسی شے پر قدرت رکھتے ہیں، پھر وہ اللہ پاک کے شریک کس طرح ہو سکتے ہیں، وہ اللہ پاک جو حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور جس کا علم وسیع ہے اور جسے مکمل طور پر ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔ یہ مذاق کے طور پر فرمایا ہے کہ ﴿ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ﴾ اس لیے کہ جس شے کی صفت قدرت نہیں ہوتی، جیسے: جمادات، اس کے بارے میں یوں نہیں کہتے: "لَا يَقْضِيْ" یا "يَقْضِيْ"

جمہور نے ﴿ يَدْعُوْنَ ﴾ بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے۔ ضمیر "ظٰلِمِيْنَ" کی طرف راجع ہے۔ امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ نافع، شیبہ اور ہشام رحمہم اللہ نے بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے،[2] اس بنا پر کہ "ظٰلِمِيْنَ" کو خطاب کیا ہے۔ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اپنے علم تام اور قضائے بالحق کی تقریر، تاکید اور تعلیل ذکر فرمائی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ یعنی اللہ پاک جو آنکھوں کی خیانت کو اور دلوں کی چھپی باتوں کو جانتا ہے اور حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے، اس لیے کہ وہ تو بڑا سننے والا اور بڑا دیکھنے والا ہے۔ کوئی پوشیدہ سے پوشیدہ شے بھی اس کے سننے اور دیکھنے سے مخفی نہیں ہے۔ اس میں ظالمین اور مشرکین کو وعید اور ملامت بھی ہے کہ وہ ان کے اقوال اور افعال کو سنتا اور دیکھتا ہے اور اُن پر اُن کو سزا دے گا اور اُن کے معبودوں کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں۔ وہ بالکل بے حس وحرکت جماد ہیں۔ ایسوں کا پوجنا کیا!!

آں بت کہ گہ از چوب و گہ از سنگ تراشی   بگذار خدائے کہ بصد رنگ تراشی

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٦٥) المعجم الأوسط (٢/٧١) حلية الأولياء (١/٣٢٣) شعب الإيمان (٤/٣٧٠)

[2] تفسیر القرطبي (١٥/٣٠٣)

’’تو کب تک کبھی لکڑی اور کبھی پتھر تراشتا رہے گا، ایک اللہ کے لیے سب کچھ چھوڑ دے تو سیکڑوں رنگ میں نفع حاصل کرے گا۔‘‘

بالجملہ جب کہ اللہ پاک نے ان کو احوالِ آخرت سے ڈرایا تو اس کے بعد احوالِ دنیا سے ان کو ڈرانا شروع کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾

کیا وہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، پھر وہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے تھے؟ وہ ان سے قدرت و طاقت میں اور زمین میں (چھوڑی ہوئی) نشانیوں کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے، پھر اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث انھیں پکڑ لیا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا ﴿21﴾ یہ اس لیے کہ بے شک ان کے رسول ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے تو انھوں نے انکار کیا، لہٰذا اللہ نے انھیں پکڑ لیا، یقیناً اللہ بڑی قوت والا، سخت سزا دینے والا ہے ﴿22﴾

جھٹلانے والوں کے انجام بد کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک فرماتا ہے: اے محمد! کیا یہ لوگ جو تیری رسالت کو جھٹلانے والے ہیں، ملک میں پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ آخر ان کا حال کیا ہوا جو اُن سے پہلے تھا، یعنی انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے والی اُمتوں پر جو عذاب اور سزا نازل ہوئی باوجود اس کے کہ وہ زور میں ان سے زیادہ سخت اور طاقت ور تھے اور نشانیاں چھوڑنے میں بھی وہ ان سے زیادہ تھے۔ وہ بڑے بڑے مکانات اور محل اور گھر زمین میں اپنی نشانیوں کے طور چھوڑ گئے جن پر ان کو اب کوئی قدرت نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ ﴾ [الأحقاف: ٢٦] ’’اور بالیقین ہم نے (قومِ عاد) کو وہ مقدور دیے تھے جو تمھیں تو دیے بھی نہیں۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿ اَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَاۤ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا ﴾ [الروم: ٩] ’’اور انھوں نے (بھی) زمین بوئی جوتی تھی اور ان سے زیادہ آباد کی تھی۔‘‘ یعنی باوجود اس عظیم قوت اور شان و شوکت کے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب سے پکڑا،

[1] فتح البیان (١٢/١٧٠-١٧٧)

ان کا گناہ یہی اپنے رسولوں کا انکار کرنا تھا۔

﴿ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴾ یعنی کسی نے اللہ کے عذاب کو ان سے ہٹایا نہ کسی پھیرنے والے نے اس کو پھیرا اور نہ کسی بچانے والے نے ان کو بچایا۔ پھر ان کے پکڑنے کی وجہ بیان کی اور ان کے گناہ ذکر کیے جن کے وہ مرتکب ہوئے تھے، چنانچہ فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ﴾ یعنی یہ پکڑ اس پر ہوئی کہ ان کے رسول کھلی کھلی دلیلیں اور پکی پکی برہانیں لے کر اُن کے پاس آتے تھے، مگر انھوں نے باوجود اس بیان و برہان کے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر ڈالا اور ملیا میٹ کر دیا۔ ﴿ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴾ [محمد: ١٠] یعنی جو موجودہ کافر اور منکر ہیں ان کی بھی یہی گت ہونی ہے۔ ﴿ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ ''بے شک اللہ بڑی قوت والا اور سخت دباؤ والا ہے اور اس کا عتاب نہایت سخت درد دینے والا ہے۔'' أعاذنا اللّٰه تبارك وتعالٰى منه، آمین۔[1]

فتح البیان کا بیان:

﴿ اَوَلَمْ ﴾ میں ہمزہ استفہام کا ہے اور حرفِ واؤ فعل محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ ''أَيْ: أَغفَلُوْا وَلَمْ يَسِيْرُوْا'' اور ﴿ فَيَنْظُرُوْا ﴾ یا اس بنا پر مجزوم ہے کہ ﴿ يَسِيْرُوْا ﴾ پر معطوف ہے، یا منصوب ہے بہ جوابِ استفہام۔ ﴿ كَيْفَ ﴾ خبر ﴿ كَانَ ﴾ کی مقدم ہے اور ﴿ عَاقِبَةُ ﴾ اس کا اسم ہے اور جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر مفعولیت ''ینظروا'' سے۔ عاقبت بہ معنی حال وصفت ہے، یا بہ معنی مآل وانجام کار۔ ﴿ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا ﴾ اس فرق کا بیان ہے جو کفارِ مکہ اور اگلی اُمتوں کے کفار کے درمیان ہے۔ ﴿ وَاٰثَارًا ﴾ ﴿ قُوَّةً ﴾ پر معطوف ہے۔ ''آثَارَ'' جمع ہے ''أثر'' کی۔ ''أثر'' نقشِ قدم کو کہتے ہیں، مراد وہ نشانیاں ہیں جو آدمی اپنے بعد چھوڑ جاتا ہے، جیسے: مکانات وغیرہ۔ جمہور نے ﴿ مِنْهُمْ ﴾ پڑھا ہے اور امام ابن عامر رحمہ اللہ نے ''مِنْكُمْ'' پڑھا ہے، اس بنا پر کہ صیغۂ غائب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔[2]

جملۂ ﴿ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ﴾ ﴿ كَيْفَ ﴾ کا جواب ہے۔ حرفِ واؤ اس کا اسم ہے اور ﴿ اَشَدَّ ﴾ خبر ہے اور کلمۂ ''ھم'' ضمیرِ فصل ہے۔ یہاں ضمیرِ فصل معرفہ اور نکرہ کے درمیان واقع ہوئی ہے، حالاں کہ وہ صرف دو معرفوں کے درمیان واقع ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ﴿ اَشَدَّ ﴾ نکرہ مشابہ معرفہ ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس پر الف و لام کا داخل ہونا ممنوع ہے، اس لیے کہ جو افعل تفضیل مقرون بہ ''من'' ہوتا ہے، اس پر الف و لام داخل نہیں ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک مکے والوں کو اپنے غیر سے عبرت لینے کا ارشاد کرتا ہے، کیوں کہ عقل مند

[1] تفسیر ابن کثیر (٩٦/٤، ٩٧) [2] فتح القدیر (٦٤١/٤)

وہی ہے جو دوسروں کے حال سے عبرت حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: کیا غافل ہو گئے اور زمین میں پھرے نہیں کہ اپنے سے پہلی امتوں کا حال اور انجام دیکھتے، جنھوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی، جیسے: عاد وثمود اور ان جیسی اُور اُمتیں، وہ لوگ ان موجودہ کفار سے قوت اور زور کے لحاظ سے اور زمین میں اپنے آثار ونشانات کے لحاظ سے زیادہ سخت تھے۔ انھوں نے مضبوط مضبوط قلعے بنائے، بلند بلند محفوظ مکانات اور پختہ پختہ محل تعمیر کیے اور آدمیوں کی گنتی اور دنیا کے ساز وسامان میں ان سے حد درجہ بڑھ کر تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا اور ان کے گناہوں کے سبب سے اور اپنے رسولوں کو جھٹلانے کے سبب سے ان کو ہلاک کر ڈالا اور کوئی بھی ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہیں تھا اور نہ ہی کوئی عذاب کو ان سے دور کر سکا۔ ان کا پکڑنا اور ہلاک کرنا اس وجہ سے تھا کہ ان کے پاس اللہ کے رسول کھلی کھلی حجتیں اور ظاہر ظاہر معجزے لے کر آئے، مگر انھوں نے ان سب کا انکار کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑا۔ بے شک اللہ زبردست ہے، وہ جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے۔ کوئی شے اس کو عاجز نہیں کر سکتی۔ وہ اس شخص کے لیے سخت عقاب والا ہے جس نے اس کی نافرمانی کی اور اس کی طرف رجوع نہ ہوا۔[1] (كذا في فتح البيان)۔ یہ تو اجمالاً ہلاک شدہ اُمتوں کا ذکر تھا۔ پھر اللہ پاک نے موسیٰ کا قصہ بیان کیا، تاکہ اس سے عبرت لیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٣﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ
وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿٢٤﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا
قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ
وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿٢٥﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ
اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ
اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿٢٦﴾ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ
عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٢٧﴾

اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور واضح دلیل کے ساتھ بھیجا ﴿23﴾ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف، تو انھوں نے کہا: (یہ تو) جادوگر ہے بڑا جھوٹا ﴿24﴾ پھر جب وہ ہماری طرف سے ان کے پاس حق لے کر آیا تو انھوں نے کہا: جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کے بیٹوں کو قتل کر دو اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھو اور کافروں کی چال تو نری تباہی و بربادی تھی ﴿25﴾

[1] فتح البیان (١٢/١٧٧)۔

اور فرعون نے کہا: مجھے چھوڑ دو، میں موسیٰ کو قتل کر دوں، اور اسے چاہیے کہ وہ اپنے رب کو بلا لے، بلاشبہہ میں تو ڈرتا ہوں کہ وہ تمھارے دین کو بدل ڈالے گا، یا یہ کہ وہ زمین میں فساد پھیلائے گا⑳ اور موسیٰ نے کہا: بے شک میں اپنے اور تمھارے رب کی پناہ میں آچکا ہوں، ہر اس متکبر سے جو یوم حساب پر ایمان نہیں رکھتا㉗

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ:

قارون بنی اسرائیل میں سے تھا، لیکن فرعون والوں کی مرضی کے مطابق تھا اور انہی کی دولت سے مال کماتا تھا۔ فرعون نے کہا: مجھے چھوڑ دو۔ شاید اس کے ارکان موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزے کو دیکھ کر ڈر گئے کہ کہیں اس کا رب بدلہ نہ لے، اس لیے وہ فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا مشورہ نہ دیتے ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے جو کہا کہ ہر تکبر کرنے والے اور روزِ حساب پر ایمان نہ لانے والے شخص سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ جس کو حساب کا یقین ہو، وہ ظلم کیوں کر کرے گا۔ انتھی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو قوم نے جھٹلایا تو اس بارے میں اللہ پاک اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرماتا ہے اور ان کو خوش خبری دیتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں نیک انجام اور نصرت انھیں کے لیے ہو گی، جس طرح کہ موسیٰ بن عمران علیہ السلام کا ماجرا گزرا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کھلی کھلی نشانیاں اور واضح واضح دلیلیں دے کر بھیجا، اس لیے یوں فرمایا: ﴿ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾۔ ﴿ سُلْطٰنٍ ﴾ سے مراد حجت اور برہان ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا، یہ دیارِ مصر میں قبطیوں کا بادشاہ تھا اور ہامان کی طرف، یہ شخص اس کی مملکت میں اس کا وزیر تھا اور قارون کی طرف، یہ اس وقت مال اور تجارت میں سب لوگوں سے بڑھ کر تھا۔

پھر ان سب نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام جادوگر، یعنی جھوٹا ہے، یعنی ان کی تکذیب کی اور اس بات میں ان کو ساحر، مجنون، ملمع کار اور کذاب ٹھہرایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھیجا ہے۔ یہ آیت اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿٥٢﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴾ [الذاریات:٥٢۔٥٣] ”اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ان کے پاس جو بھی رسول آیا انھوں نے کہہ دیا کہ یا تو یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ کیا یہ اس بات کی ایک دوسرے کو وصیت کرتے گئے ہیں (نہیں)، بلکہ یہ سب کے سب سرکش ہیں۔“

پھر جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے پاس سے برہانِ قاطع لے کر آئے جو اس پر دال تھی کہ اللہ عزوجل نے ہی ان کو ان کی طرف بھیجا ہے تو انھوں نے کہا ہے کہ جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، ان کے بیٹوں کو مار ڈالو اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھو۔ فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کا یہ دوسرا حکم ہے۔ رہا پہلا حکم تو

وہ اس لیے تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے وجود سے بچا جائے۔ یا اس قبیلۂ بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے کے لیے تھا، یا ان کی تعداد کم کرنے کے لیے تھا، یا ان دونوں کاموں کے لیے تھا۔ قتل کا دوسرا حکم دوسری وجہ کے لیے ہے اور اس قبیلے کو ذلیل کرنے کے لیے ہے اور اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام کو نامبارک سمجھیں اور اسی لیے انھوں نے یوں کہا: ﴿ اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۲۹] ''ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے، آپ کی تشریف آوری سے قبل بھی اور آپ کی تشریف آوری کے بعد بھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بہت جلد اللہ تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا خلیفہ کر دے گا پھر تمھارا طرزِ عمل دیکھے گا۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ امر ہے بعد امر کے۔[1] اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴾ یعنی ان کا یہ مکر وفریب اور ارادہ کہ بنی اسرائیل کی تعداد کم ہو، تاکہ وہ ان پر غالب نہ ہوسکیں، جانے والا ہے اور غلط ہے۔ ﴿ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰى ﴾ یہ فرعون ملعون کا موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا عزم ہے۔ یعنی اپنی قوم سے کہا کہ تم مجھے چھوڑ دو، یہاں تک کہ میں تمھاری خاطر اس کو مار ڈالوں۔ ﴿ وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ﴾ یعنی چاہیے کہ وہ اپنے رب کو پکارے، میں اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ یہ بات انتہائی جحد، تجہرم اور دشمنی میں ہے (جحد، انکارعناد، دشمنی اور حق والے کے حق کو سمجھ کر پھر اس کو نہ ماننا اور اس سے دشمنی کرنا)۔

فرعون ـقبحه الله۔ کا قول: ﴿ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴾ یعنی فرعون اس بات سے ڈرتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام لوگوں کو گمراہ کر دیں گے اور اُن کی رسوم اور عادات کو بگاڑ دیں گے۔ یہ ویسی بات ہے جو مثال کے طور پر کہتے ہیں: ''صَارَ فِرْعَوْنُ مُذَكِّرًا'' یعنی فرعون واعظ بن گیا کہ موسیٰ علیہ السلام سے لوگوں پر خوف کرتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی یہ بات پہنچی کہ ﴿ ذَرُوْنِيْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰى ﴾ تو انھوں نے کہا کہ میں نے اس کے شر سے اور اس جیسے دوسرے لوگوں کے شر سے اللہ کی پناہ لی۔ اسی لیے یہ کہا: ﴿ اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴾ یعنی اے مخاطب لوگو! میں اپنے رب کی اور تمھارے رب کی پناہ لے چکا ہوں، ہر تکبر کرنے والے سے جو حق سے تکبر کرتا ہے اور مجرم ہے کہ روزِ حساب پر ایمان نہیں لاتا۔ اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی قوم سے خوف کرتے تو فرماتے: «اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ وَنَدْرَأُ بِكَ فِيْ نُحُوْرِهِمْ»[2] یعنی الٰہی! ہم ان کی بدیوں سے تیری پناہ چاہتے ہیں اور ہم تیرے ساتھ ان کے سینوں میں دفع کرتے ہیں۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٩٧/٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٣٧) سنن النسائي الكبرىٰ (١٨٨/٥) تفسير ابن كثير (٩٨،٩٧/٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٧٠٦)

فتح البیان کا بیان:

﴿ بِاٰيٰتِنَا ﴾ اعتبار کے لحاظ سے موسیٰ علیہ السلام کے حال سے متعلق ہے۔ "أَيْ: مُتَلَبِّسًا بِهَا" اور آیات سے مراد وہی نو نشانیاں ہیں جن کا ذکر کئی جگہ گزر چکا ہے۔ ﴿ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی واضح اور روشن حجت، یعنی تورات شریف۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد خود وہی نشانیاں ہیں اور عطف عنوانوں کے مختلف ہونے کی بنا پر ہے، یا اس سے مراد ان میں سے بعض مشہور نشانیاں ہیں، جیسے: ید بیضا اور عصا۔ ان کے اعتنا اور اہتمام کے لیے ان کو علاحدہ کر کے ذکر کیا ہے، اس کے باوجود کہ وہ آیات کے تحت میں داخل ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ البتہ یقیناً ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف اس حال میں بھیجا کہ وہ ہماری نشانیوں اور حجتِ واضح کو لیے ہوئے تھے۔ ان تینوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی عداوت میں مکر و فریب اور تدبیروں کا دار و مدار انھی پر تھا، اس لیے کے موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلانے والوں کے سردار یہی تھے۔ فرعون تو بادشاہ تھا اور ہامان وزیر تھا اور قارون خزانوں اور اموال کا مالک تھا، یعنی کثرتِ مال اور خزانے کی وجہ سے وہ بھی بادشاہ کی مثل تھا۔

﴿ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴾ پس بولے کہ یہ (موسیٰ علیہ السلام) اس شے میں جادوگر جھوٹا ہے جس کو ان کے پاس لے کر آیا ہے۔ اس قول کو کہنے والا فرعون اور اس کی قوم ہے۔ رہا قارون تو اس نے یہ بات نہیں کہی تو اب کلام میں تغلیب ہوگی۔ اسی طرح ﴿ قَالُوا اقْتُلُوْٓا ﴾ میں بھی کہیں گے۔ (كما قال الحفناوي) خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرعون، ہامان، قارون اور ان کے ساتھیوں نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا کہ ساحر ہیں، اس لیے کہ ان پر غلبہ پانے سے عاجز ہو گئے۔ قارون کے سوا جو لوگ تھے، انھوں نے تو اول و آخر اور زبانی و عملی لحاظ سے یہ بات کہی۔ رہا قارون تو اس نے یہ بات آخر میں کہی۔ بیان کیا گیا ہے کہ وہ کفر ہی پر مطبوع و مخلوق، یعنی پیدا ہوا تھا، اگرچہ پہلے ایمان لے آیا اور یہ قول اس کا تھا، اگرچہ اس وقت اس نے بالفعل نہیں کہا۔ چنانچہ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ ہمیشہ اسی کا قائل رہا، کیوں کہ اس نے اس سے توبہ نہیں کی۔ پھر فرعون والوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کذاب کہا، یعنی ان میں کذب کی صفت بیان کی، اس خوف سے کہ کہیں لوگ ان کو سچا نہ سمجھنا شروع کر دیں۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا کہ ساحر اور کذاب کے یہ معنی ہیں کہ اس نے جو معجزے ظاہر کیے اس میں تو جادوگر ہے اور اس دعوے میں کہ اسے آسمانوں کے رب نے بھیجا ہے، وہ جھوٹا ہے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ﴾ یعنی پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق لے کر آیا۔ اس سے مراد ظاہر اور واضح معجزے ہیں تو بولے کہ ان لوگوں کے بیٹے

[1] تفسير أبي السعود (٢٧٣/٧)

مار ڈالو جو اس کے ساتھ ایمان لائے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قتل پہلے قتل کے علاوہ ہے،[1] اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہو جانے کے بعد فرعون لڑکوں کے قتل سے رک گیا تھا۔ پھر جب اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا اور فرعون نے جان لیا کہ جو بات واقع ہونی تھی وہ ہو چکی تو غیظ و غضب کے مارے بنی اسرائیل کو دوبارہ قتل کرانا شروع کیا، چنانچہ وہ حکم دیتا تھا کہ لڑکوں کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو چھوڑ دیا جائے، اسی کے مثل فرعون کا یہ قول ہے: ﴿ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ﴾ [الأعراف: ۱۲۷] ''ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے اور عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے۔''

معنی یہ ہیں کہ تم ان پر پھر ویسے ہی کرنا شروع کرو، جیسے تم پہلے کیا کرتے تھے، یہ خیال کر کے کہ اس قتل کے سبب سے فرعون بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام کی مدد کرنے سے باز رکھے گا اور یہ گمان کر کے کہ یہ وہی لڑکا ہے جس کے ہاتھ پر ان کے ملک جانے کے بارے میں نجومیوں اور کاہنوں نے حکم لگایا ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان پر طرح طرح کے عذاب نازل کر کے ان کو اس سے مشغول کر دیا۔ یہ عذاب یہی مینڈک، چیچڑیاں، خون اور طوفان تھا، یہاں تک کہ مصر سے نکلے، پھر ان کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔ ﴿ وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَهُمْ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ان کی بیٹیوں کو خدمت کے لیے باقی رکھا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴾ یعنی کافروں کا مکر نہیں ہے مگر زیان و نقصان میں اور ضائع ہونے اور وبالِ جان ہونے میں، اس لیے کہ وہ بے کار جائے گا اور اُن سے کسی شے کو دور نہ کر سکے گا، اور جس عذاب کا اللہ عزوجل نے ارادہ کیا ہے وہ ان پر نازل ہو کر رہے گا اور لوگ ایمان لانے سے باز نہ رہیں گے، گو اُن کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے، بلکہ لامحالہ طور پر قدر مقدور، یعنی تقدیر اور حتمی فیصلہ ان پر نافذ ہوگا۔

﴿ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ کا الف لام یا تو عہد کے لیے ہے، یعنی وہی کفار مذکورین، یا جنسی ہے، یعنی کافر کی جنس سے ہوں، یا ان کے مثل اور کفار مذکورین اس میں بہ دخولِ اولیٰ داخل ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ ''كَيْدُهُمْ'' نہ کہا، بلکہ ضمیر کے بجائے اسمِ ظاہر رکھا تو اس سے اُن کی کفر کے ساتھ مذمت کرنا منظور ہے اور حکم کی وجہ کے بارے میں بتانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان پر جو یہ حکم لگایا کہ ان کا مکر نقصان میں ہے تو اس کی وجہ یہی ان کا کفر ہے۔ جملۂ مذکورہ معترضہ ہے جس کو فرعون والوں کی باتوں کے نقل کرنے کے دوران میں اس لیے لائے ہیں کہ جس بات کو انھوں نے ظاہر کیا ہے، اس کے بالکل باطل اور مضمحل ہونے کا بیان جلدی سے ہو جائے۔ اگر یہ ارادہ نہ ہوتا تو جب ان کی ساری باتوں کو نقل کر دیا جاتا تو اُن کے آخر میں یہ جملہ نقل کیا جاتا۔

پھر اللہ پاک نے فرعون لعین کی اَور باطل بات نقل فرمائی: ﴿ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰى ﴾ یعنی فرعون

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۳۷۳)

بولا: مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ (علیہ السلام) کو مار ڈالوں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کو لوگ موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے منع کرتے تھے، جبھی تو اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو۔ چنانچہ بعض نے کہا ہے کہ فرعون کے خاص لوگوں میں سے کچھ لوگ تھے کہ اس کو قتل سے روکتے تھے۔ اس روکنے کی تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ شاید اُن میں وہ شخص ہو جو موسیٰ علیہ السلام کے سچا ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو اور وہ ان کے قتل سے فرعون کو منع کرنے میں حیلہ گری کرتا ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ فرعون کے مصاحبوں نے اس سے کہا کہ تو اس کو مت قتل کر، وہ تو یہی ایک کمزور جادوگر ہے اور وہ ہمارے جادو پر غالب نہیں ہوسکتا ہے۔ پھر اگر تو اسے مار ڈالے گا تو لوگوں کو شبہے میں ڈال دے گا، وہ کہیں گے کہ وہ حق پر تھا اور یہ لوگ اس کا جواب دینے سے عاجز ہوئے تو اسے مار ڈالا۔[1] تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے روکنے میں حیلہ گری کرتے تھے، تاکہ فرعون کا دل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مشغول رہے اور وہ قبطی لوگوں کی تادیب اور تنبیہ کے لیے فارغ نہ ہو، کیوں کہ امراء کی شان سے یہ بات ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کے دل کو کسی خارجی دشمن کے ساتھ مشغول رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اس بادشاہ کے ان کی طرف متوجہ ہونے سے امن میں ہو جائیں۔ (کذا ذکر الخطیب)

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے دوسری وجہ کے ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ لعین کا ظاہری حال یہ ہے کہ اس نے اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نبی ہیں اور جو کچھ وہ لائے ہیں وہ حق ہے، لیکن وہ اس سے ڈرتا تھا کہ اگر ان کے قتل کا ارادہ کرے گا تو خود جلدی ہلاک کر دیا جائے گا۔[2] اور یہ جو اس نے کہا کہ ﴿ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى ﴾ تو یہ صرف اس بات کا وہم ڈالنے اور ملمع کرنے کے لیے کہ موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے اس کو وہی لوگ منع کرتے ہیں، اگر وہ نہ ہوتے تو وہ ضرور ہی اس کو قتل کر ڈالتا، باوجود اس کے کہ اس کو صرف اسی ہولناک خوف نے منع کیا جو اس کے جی میں بسا ہوا تھا۔ اور یہ جو کہا: ﴿ وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ﴾ تو اس لیے کہ بہ تکلف دلیر بنے اور بے پروائی ظاہر کرے، حالاں کہ سب لوگوں سے بڑھ کر موسیٰ علیہ السلام سے خائف ہے۔ یعنی چاہیے کہ موسیٰ اس شخص کو پکارے جس کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اس کو ہماری طرف بھیجا ہے تو چاہیے کہ وہ اگر اس پر قادر ہے کہ اس کو قتل سے منع کرے تو اسے روک لے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ بات تم کو خوف میں مبتلا نہ کرے، کیوں کہ حقیقتاً اس کا کوئی رب نہیں ہے، بلکہ ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ [النازعات: ٢٤] یعنی میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔ پھر لعین نے وہ وجہ ذکر کی جس کے لیے موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا، چنانچہ یہ جھک ماری: ﴿ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ ﴾ یعنی بے شک میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اگر اس کو قتل نہ کروں تو وہ تمھارے اس دین کو بدل دے جس پر تم ہو، وہ یہی غیر اللہ کا پوجنا ہے، اور تم کو اپنے دین میں داخل کر لے، جو اللہ وحدہ کا پوجنا ہے۔[3]

---

[1] تفسیر الرازي (٢٧/٤٨) [2] تفسیر أبي السعود (٧/٢٧٣) [3] فتح القدیر (٤/٦٤١)

﴿ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴾ یا زمین میں لوگوں کے درمیان فساد، یعنی مخالفت اور فتنہ ڈال دے۔ جس شے کی طرف موسیٰ علیہ السلام نے دعوت دی، لعین نے اس کے ظاہر ہونے اور زمین میں پھیلنے اور لوگوں کے اس طرف راہ پانے کو فساد قرار دیا، حالاں کہ فساد تو درحقیقت وہ ہے جس پر وہ اور اس کے تابعین ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ ان دو امر میں سے ایک کا یا دونوں کا واقع ہونا ضروری ہے۔ پہلے معنی کی بنا تو کوفیوں اور یعقوب کی قراءت پر ہے، انھوں نے ﴿ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ ﴾ کو بہ "اَوْ" پڑھا ہے جو ابہام کے لیے ہے اور دوسرے معنی کی بنیاد باقی قراء کی قراءت پر ہے۔ انھوں نے ﴿ اَنْ يُّظْهِرَ ﴾ بغیر الف پڑھا ہے۔ امام نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہ اللہ نے ﴿ اِنِّيْ ﴾ کو بہ فتحِ یاء اور نافع، ابو عمرو اور حفص رحمہ اللہ نے ﴿ يُّظْهِرَ ﴾ بہ ضمِ یاء وکسرِ ہاء بابِ افعال سے پڑھا ہے اور اس میں ضمیر موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے۔ اور ﴿ الْفَسَادَ ﴾ کو منصوب بنا بر مفعول بہ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے بہ فتحِ یاء وہاء ورفعِ "الفسادُ" بنا بر فاعلیت پڑھا ہے۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے قراءتِ ضمِ یاء ونصبِ دال کو زیادہ بہتر کہا ہے ﴿ يُّبَدِّلَ ﴾ کی موافقت کے لیے۔[2] ابن کثیر رحمہ اللہ نے تین قراءتیں ذکر کی ہیں: ایک تو ﴿ اَوْ ﴾ کی، دوسری واؤ کی اور تیسری بہ ضمِ دالِ فساد کی۔

جب فرعون لعین نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کی دھمکی دی تو انھوں نے کہا: ﴿ اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴾ یعنی اس ملعون کی شدت کو دور کرنے میں اور کچھ نہ کیا صرف اللہ عزوجل کے ساتھ پناہ چاہی، ہر اس شخص سے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والا ہے، یعنی ایمان لانے سے تکبر کرنے والا ہے اور وہ بعث اور نشور یعنی آخرت پر ایمان نہیں لاتا۔ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیا، تو بالضرور اللہ پاک نے ان کو ہر بلا سے محفوظ اور مامون رکھا۔ ﴿ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ ﴾ کے عموم میں فرعون تو لازمی طور پر داخل ہے فرعون کا نام نہ لیا، بلکہ اس کا ذکر ایسی صفتوں کے ساتھ کیا جو اس کے لیے اور اس کے غیر کے لیے عام ہیں جو جبارون میں سے ہیں۔ چنانچہ ذو اس لیے کہ ایک تو استعاذہ (پناہ طلب کرنا) کا عام کرنا مقصود ہے۔ دوسری اللہ تعالیٰ پر جرأت اور سخت دلی کی وجہ بتانا منظور ہے، اس کی وجہ یہی ایمان سے تکبر اور دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان نہ لانا ہے۔ امام نافع وغیرہ، (یعنی امام ابو عمرو، حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ) نے ﴿ عُذْتُ ﴾ کو بہ ادغامِ ذال پڑھا ہے اور باقی قراء نے باظہارِ ذال پڑھا ہے۔[3]

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ
اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ
رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا
يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ

[1] فتح القدير (٤/٦٤١) [2] تفسير النسفي (٤/٧٢) [3] فتح القدير (٤/٦٤١) فتح البيان (١٢/١٧٨-١٨٠)

هُوَ مُسۡرِفٌ كَذَّابٌ ﴿٢٨﴾ يٰقَوۡمِ لَكُمُ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ ظٰهِرِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ فَمَنۡ يَّنۡصُرُنَا مِنۡۢ بَاۡسِ اللّٰهِ اِنۡ جَآءَنَا‌ؕ قَالَ فِرۡعَوۡنُ مَاۤ اُرِيۡكُمۡ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَمَاۤ اَهۡدِيۡكُمۡ اِلَّا سَبِيۡلَ الرَّشَادِ ﴿٢٩﴾

اور آلِ فرعون میں سے ایک مردِ مومن، جو اپنا ایمان چھپاتا تھا، کہنے لگا: کیا تم ایک شخص کو اس بات پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے جب کہ وہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے کھلی نشانیاں لے کر آیا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر ہے اور اگر وہ سچا ہے تو تمھیں (اس عذاب کا) کچھ حصہ ملے گا، جس کا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے یقیناً اللہ اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے بڑھنے والا، بہت جھوٹا ہو ﴿28﴾ اے میری قوم! آج تمھاری ہی حکومت ہے، زمین میں (تم ہی) غالب ہو، پر ہمیں اللہ کے عذاب سے کون بچائے گا، اگر اس نے ہمیں آلیا؟ فرعون نے کہا: میں تمھیں وہی (راہ) دکھاتا ہوں جو میں (خود) دیکھتا ہوں اور میں خیر و بھلائی ہی کے راستے کی طرف تمھاری راہنمائی کرتا ہوں ﴿29﴾

آلِ فرعون کے ایک مردِ مومن کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کی تائید:

یعنی اگر وہ جھوٹا ہے تو جس (اللہ) پر وہ جھوٹ بولتا ہے، وہ سزا دے کر رہے گا۔ شاید سچا ہو تو اس صورت میں تم اپنی فکر کرو۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: مشہور ہے کہ یہ مومن مرد فرعون کے لوگوں میں سے تھا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ فرعون کے چچا کا بیٹا تھا اور کہتے ہیں کہ یہ وہی ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ نجات پائی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور جو شخص اس طرف گیا ہے کہ وہ اسرائیلی تھا تو اس کے قول کو رد کیا ہے،[1] اس لیے کہ فرعون اس کی بات سے منفعل ہوا، یعنی شرمندہ ہوا اور اس کو سنا اور موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے رک گیا اور اگر وہ اسرائیلی ہوتا تو قریب تھا کہ اس پر جلد عقوبت کی جاتی، اس سبب سے کہ وہ ان میں سے تھا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ فرعون کے لوگوں میں سے سوائے اس مرد کے اور فرعون کی بیوی اور اس شخص کے کوئی ایمان نہ لائے جس نے یہ کہا: ﴿ يٰمُوۡسٰٓى اِنَّ الۡمَلَاَ يَاۡتَمِرُوۡنَ بِكَ لِيَقۡتُلُوۡكَ ﴾ [القصص: ٢٠] (رواه ابن أبي حاتم)[2]

[1] تفسير الطبري (١٢/٣٧٥، ٣٧٦)　[2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٦٦)

یہ شخص اپنی قوم قبط سے اپنا ایمان چھپاتا تھا، چنانچہ اس نے اپنا ایمان ظاہر نہ کیا، مگر اس دن جب کہ فرعون نے کہا: ﴿ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى ﴾ چنانچہ اس شخص کو اللہ عزوجل کے لیے غصے نے پکڑا۔ افضل جہاد سلطانِ جائر، یعنی ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہنا ہے، چنانچہ یہ بات حدیث شریف میں ثابت ہوئی ہے کہ فرعون کے نزدیک اس کلمے سے زیادہ عظیم کوئی اور کلمہ نہیں ہے۔ وہ کلمہ اس شخص کا یہی کہنا ہے: ''﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا ... الآیۃ﴾ اَللّٰهُمَّ مگر وہ جس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں عروہ بن زبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ کہا: میں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے کہا: تو مجھے خبر دے کہ مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ سے سب سے زیادہ سخت کیا شے کی؟ عبداللہ نے کہا: اس اثنا میں کہ رسول اللہ ﷺ کعبے کے صحن میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک عقبہ بن معیط آیا تو اس نے رسول اللہ ﷺ کا مونڈھا پکڑا، پھر آپ ﷺ کا کپڑا آپ کی گردن مبارک میں مروڑا، پھر زور سے آپ کا گلا گھونٹا۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے تو اس کا مونڈھا پکڑا اور اس کو نبی ﷺ سے دور ہٹایا۔ پھر فرمایا: ﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾[1] (انفرد به البخاري من حديث الأوزاعي قال: وتابعه محمد بن إسحاق عن إبراهيم بن عروة عن أبيه به)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، ان سے کسی نے پوچھا کہ اس شے میں سخت تر چیز کیا ہے جسے تو نے دیکھا کہ قریش سے رسول اللہ ﷺ کو پہنچی، یعنی وہ تکلیف بتاؤ جو سب سے بڑھ کر انھوں نے آپ ﷺ کو پہنچائی؟ تو عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ قریش کے پاس سے گزرے تو انھوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ تو ہم کو اس شے کے پوجنے سے منع کرتا ہے جسے ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں وہی ہوں۔ پھر آپ ﷺ کی طرف کھڑے ہوئے اور آپ کے مجامع ثیاب کو پکڑا، یعنی وہ جگہ جس کے پکڑنے سے آدمی مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ ﷺ کو پیچھے سے گود میں لیے ہوئے تھے اور وہ اپنی بلند تر آواز سے چلاتے تھے اور اُن کی آنکھیں بہہ رہی تھیں اور کہہ رہے تھے: ''يَا قَوْمِ ﴿أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَّقُولَ رَبِّيَ اللّٰهُ...﴾'' یہاں تک ساری آیت سے فارغ ہوئے۔[2] (وهكذا رواه النسائي من حديث عبدة فجعله من مسند عمرو بن العاص)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾ یعنی تم ایک مرد کو کیوں کر مارے ڈالتے ہو، اس وجہ سے کہ وہ یوں کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، حالاں کہ وہ تمھارے لیے اس بات کی سچائی کی دلیل قائم کر چکا ہے جس کو حق سے لے کر وہ تمھارے پاس آیا ہے۔ پھر اس نے ان کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے: ﴿ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣٧) [2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٤٩) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٦٦)

﴿ فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ ﴾ یعنی اگر تمھیں اس بات کی صحت پر یقین نہ ہو جو وہ تمھارے پاس لے کر آیا ہے تو عقل اور احتیاط اور دور اندیشی کی بات یہ ہے کہ تم اسے اور اس کی جان کو چھوڑ دو اسے ایذا نہ دو، کیوں کہ اگر وہ جھوٹا ہو گا تو اللہ پاک عن قریب اس کے جھوٹ کی سزا اسے دنیا اور آخرت کے عذاب سے دے گا اور اگر وہ سچا ہو گا اور تم نے اسے ایذا دی تو تمھیں اس شے (عذاب) کا کچھ حصہ پہنچے گا جس کا وہ تم کو وعدہ دیتا ہے، کیوں کہ وہ تو تم کو وعید سناتا ہے کہ اگر تم نے اس کی مخالفت کی تو دنیا اور آخرت میں تمھیں عذاب پہنچے گا۔ پس من جملہ جائز تمھارے نزدیک یہ بات ہے کہ وہ سچا ہو تو اس بنا پر لائق یہ ہے کہ تم اس کو مت چھیڑو، بلکہ تم تو اس کو اور اس کی قوم کو چھوڑ دو، وہ ان کو دعوت دے اور وہ اس کی پیروی کریں۔

اسی طرح اللہ عزوجل نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے خبر دی ہے کہ انھوں نے فرعون سے اور اس کی قوم سے موادعت طلب کی کہ تم ہم سے تعرض مت کرو، ہم کو چھوڑ دو۔ ﴿ وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ۝ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَي اللّٰهِ ۚ اِنِّىْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَاِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴾ [الدخان: ١٧۔ ٢١] ''یقیناً ان سے پہلے ہم قومِ فرعون کو (بھی) آزما چکے ہیں جن کے پاس (اللہ کا) باعزت رسول آیا کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو، یقین مانو کہ میں تمھارے لیے امانت دار رسول ہوں اور تم اللہ تعالیٰ کے سامنے سرکشی نہ کرو، میں تمھارے پاس کھلی دلیل لانے والا ہوں اور میں اپنے اور تمھارے رب کی پناہ میں آتا ہوں اس سے کہ تم مجھے سنگسار کر دو، اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ ہی رہو۔''

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے فرمایا تھا کہ وہ ان کو چھوڑ دیں کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ اور وہ ان کو کچھ ایذا نہ پہنچائیں اور ان کے اور ان کے درمیان جو ناتا ہے اس کو ملائیں، اس بات میں کہ ان کو ایذا نہ پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ ﴾ [الشوریٰ: ٢٣] ''آپ کہہ دیجیے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبتِ رشتہ داری کی۔'' یعنی تم مجھے ایذا مت پہنچاؤ اس قرابت میں جو میرے اور تمھارے درمیان میں ہے۔ چنانچہ تم مجھے مت ستاؤ اور میرے اور لوگوں کے درمیان چھوڑ دو اور اسی بنیاد پر صلح حدیبیہ واقع ہوئی اور وہ ایک فتح مبین تھی، یعنی اس کا انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ فتح کر دیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴾ یعنی اگر یہ شخص جو دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمھاری طرف بھیجا ہے جھوٹا ہوتا جیسا تم خیال کرتے ہو تو اس کا حال کھلا ہوا ہوتا، اس کے اقوال و احوال میں ہر ایک کو ظاہر ہو جاتا۔ چنانچہ وہ حد درجے کے اختلاف اور اضطراب میں ہوتے، حالاں کہ ہم اس کے حال کو درست اور اس کی راہ کو سیدھا دیکھتے ہیں اور اگر وہ مسرفین اور کذابین میں سے ہوتا تو تم جو اس کے حال اور کام کو

درست دیکھ رہے ہو، اللہ تعالیٰ اس کو اس کی طرف کبھی راہ نہ بتاتا۔

پھر اس مردِ مومن نے اپنی قوم کو اس بات سے ڈرایا کہ اللہ کی نعمت ان سے زائل ہو جائے گی اور اس کا عذاب ان پر نازل ہوگا۔ چنانچہ کہا: ﴿ یٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ظٰهِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ انعام کیا ہے کہ تم کو اس ملک میں حکومت اور بادشاہت اور بڑی شان و شوکت دی ہے، تمھارا حکم سب پر خوب غلبے سے چلتا ہے۔ چنانچہ تم اللہ تعالیٰ کا شکر اور اس کے رسول ﷺ کی تصدیق کر کے اس نعمت کو نگاہ میں رکھو اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو۔ اگر تم نے اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کی تو ﴿ فَمَنْ یَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ﴾ یعنی یہ لشکر اور فوجیں تمھارے کچھ کام نہ آئیں گی اور نہ یہ کسی شے کو ہم سے دور کریں گی، اگر اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کرے گا۔

غرضیکہ اس مردِ صالح، نیک، راہ یاب اور دانشمند نے جو فرعون سے زیادہ بادشاہی کا مستحق تھا، جس بات کا مشورہ دیا، فرعون نے اس کو رد کر کے اپنی قوم سے کہا: ﴿ مَاۤ اُرِیْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰی ﴾ یعنی میں تم کو وہی بات کہتا ہوں اور اسی بات کا مشورہ دیتا ہوں جس کو اپنی جان کے لیے پسند کرتا ہوں۔ یہ بات فرعون نے جھوٹ کہی، کیوں کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی سچائی اور راستی کو اس رسالت میں خوب جانتا تھا جس کو وہ لے کر آئے تھے، انھوں نے یوں کہا تھا: ﴿ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ ﴾ [بني إسرائيل: ١٠٢] ''یہ تو تجھے علم ہو چکا کہ آسمان و زمین کے پروردگار ہی نے یہ معجزے دکھانے، سمجھانے کو نازل فرمائے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ﴾ [النمل: ١٤] ''انھوں نے انکار کر دیا، حالاں کہ ان کے دل یقین کر چکے تھے، صرف ظلم اور تکبر کی بنا پر۔'' چنانچہ اس نے اپنے اس قول میں کہ ﴿ مَاۤ اُرِیْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰی ﴾ جھوٹ بولا اور افتراء کیا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی اور اس کے رسول ﷺ کی اور اپنی رعیت کی خیانت کی اور ان سے فریب کیا اور ان کی خیر خواہی نہیں کی۔

اسی طرح اس کا یہ قول ہے: ﴿ وَ مَاۤ اَهْدِیْكُمْ اِلَّا سَبِیْلَ الرَّشَادِ ﴾ یعنی نہیں بلاتا ہوں میں تم کو مگر راہِ حق، صدق اور ہدایت کی طرف۔ اس میں بھی اس نے جھوٹ بولا، اگرچہ اس کی قوم نے اس کی اطاعت و پیروی کی۔ اللہ سبحانہ نے فرمایا: ﴿ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۠ىِٕهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ﴾ [هود: ٩٧] ''پھر بھی ان لوگوں نے فرعون کے احکام کی پیروی کی اور فرعون کا کوئی بھی حکم درست تھا ہی نہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰی ﴾ [طٰهٰ: ٧٩] ''فرعون نے اپنی قوم کو گمراہی میں ڈال دیا اور سیدھا راستہ نہ دکھایا۔'' حدیث شریف میں مروی ہے کہ نہیں ہے کوئی امام کہ جس دن وہ مرے، اس حال میں کہ وہ اپنی رعیت کی خیانت کرنے والا ہے، مگر وہ جنت کی خوشبو کو نہ سونگھے گا، حالانکہ اس کی خوشبو پانچ سو برس کی راہ سے پائی جاتی

45

ہے۔[1] واللّٰہ سبحانہٗ و تعالی هو الموفق الصواب.

فتح البیان کا بیان:

﴿ رَجُلٌ ﴾ کو جمہور نے بہ ضمِ جیم اور اعمش اور عبد الوارث نے بہ سکونِ جیم پڑھا ہے، یہ تمیم ونجد کی لغت ہے اور کسی نے بہ کسرِ جیم پڑھا ہے، لیکن پہلی لغت فصیح ہے۔ امام حسن، مقاتل اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شخص قبطی تھا، فرعون کے چچا کا بیٹا، اسی نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نجات پائی اور یہی اس آیت میں مراد ہے: ﴿ وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴾[2] [القصص:٢٠] ''شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا: اے موسیٰ! یہاں کے سردار تیرے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں، پس تو بہت جلد چلا جا، مجھے اپنا خیر خواہ مان۔'' کسی نے کہا کہ وہ شخص بنی اسرائیل میں سے تھا اور آلِ فرعون سے نہ تھا۔

یہ قول اس آیت کے خلاف ہے، کیوں کہ اس میں صریح ﴿ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ﴾ موجود ہے، اس پر طرہ یہ ہے کہ اس قول کے بنانے میں یوں تکلف کیا ہے کہ آیت میں تقدیم اور تاخیر ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''وَقَالَ رَجُلٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ'' امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے اس شخص کو اسرائیلی ٹھہرایا، اس کے قول میں بُعد ہے، اس لیے کہ محاورۂ عرب میں '' كَتَمَهُ أَمْرَ كَذَا'' بولتے ہیں اور ''كَتَمَهُ مِنْهُ'' نہیں کہتے، جیسا کہ اللہ سبحانہٗ نے فرمایا: ﴿ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴾ [النساء: ٤٢] ''اور اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔'' دوسری بات یہ ہے کہ فرعون ایسا نہ تھا کہ بنی اسرائیل سے ایسی بات برداشت کرے۔[3]

اس شخص کے نام میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حبیب تھا۔ امام ابو اسحاق رحمہ اللہ سے بھی یہی مروی ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ شمعون۔ زیادہ صحیح یہی ہے، جیسا کہ ''مبہمات القرآن'' میں ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ حزقیل تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما[6] اور اکثر علماء اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے۔[7] امام وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبریل نام تھا۔ ان کے سوا اور اقوال بھی ہیں۔

بالجملہ ﴿ مُّؤْمِنٌ ﴾ ﴿ رَجُلٌ ﴾ کی پہلی صفت ہے اور دوسری صفت ﴿ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ﴾ ہے اور تیسری صفت ﴿ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ ﴾ ہے اور ﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا ﴾ میں استفہام انکار کے لیے ہے اور ﴿ اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ ﴾ بہ نزعِ خافض موضعِ نصب میں ہے۔ ''أَيْ: لِأَنْ يَّقُوْلَ أَوْ كَرَاهَةَ أَنْ يَّقُوْلَ'' امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: ''أَيْ:

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے، البتہ اس کے ہم معنی روایت صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٧٣١، ٦٧٣٢) اور صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٢) میں مروی ہے، نیز حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر (٤/ ٩٨۔١٠٠) میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

[2] تفسیر القرطبي (١٥/ ٣٠٦) فتح القدیر (٤/ ٦٤١، ٦٤٢) [3] تفسیر القرطبي (١٥/ ٣٠٧) [4] الدر المنثور (٧/ ٢٨٥)

[5] مفحمات الأقران في مبهمات القرآن (١/ ٨١) [6] الدر المنثور (٧/ ٥٣) [7] الدر المنثور (٧/ ٢٨٤، ٢٨٥)

وَقْتَ أَنْ يَّقُوْلَ"[1] اس کو اس طرح رد کیا ہے کہ نحویوں کی نص اس کے خلاف پر ہے۔ امام تاج الدین بن مکتوم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن جنی نے اس کو جائز رکھا ہے۔ لو اب تو ایک بڑے نحوی نے اس کو جائز کہا ہے، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ ﴿ رَبِّيَ اللّٰهُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ تمھارا بھی رب ہے نہ کہ صرف اسی کا رب ہے۔ اس میں توحید کی طرف اشارہ ہے اور یہ اس مومن کی طرف سے ایک انکارِ عظیم ہے۔ گویا یوں کہا ہے کہ کیا تم ایسے قبیح فعل کے مرتکب ہوتے ہو جو ایک نفسِ محرم کا قتل کرنا ہے، بغیر اس کے کہ اس کے حال میں غور وفکر کرو اور بغیر اس کے کہ تمھیں کوئی ایسا سبب معلوم ہو جائے جس سے اس کا قتل کرنا ضروری ہو۔ تمھارے لیے اس برے فعل کی کوئی علت اور وجہ نہیں ہے، سوائے اس کلمۂ حق کے جو وہ کہتا ہے، یعنی ﴿ رَبِّيَ اللّٰهُ ﴾

جملہ ﴿ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾ بنا بر حال محلِ نصب میں ہے (یا تو مفعول، یعنی ﴿ رَجُلًا ﴾ سے ہے، گو نکرہ ہے مگر استفہام کے تحت میں واقع ہوا ہے، یا فاعل ﴿ يَقُوْلَ ﴾ سے ہے۔ كذا في السمين)۔ یعنی اور حال یہ ہے کہ وہ شخص تمھارے پاس واضح واضح معجزے اور اپنی نبوت اور رسالت کے صحیح ہونے پر ظاہر ظاہر دلیلیں لا چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایک بینہ حاضر نہیں کیا، لیکن وہ تو بینات لایا ہے، اس کے پاس سے جس کی طرف ربوبیت منسوب ہوتی ہے۔ یہ کہنے سے اس کی غرض یہ ہے کہ اپنی قوم کو آہستہ آہستہ اس بات کی طرف لانا ہے کہ رب العلمین کا اقرار کر لیں۔ امام بزار اور ابو نعیم رحمہما اللہ نے فضائلِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: لوگو! تم مجھے بتاؤ کہ لوگوں میں سے سب سے شجاع (بہادر) کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ آپ ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک میں نے کسی سے مبارزہ (مقابلہ) نہیں کیا، مگر میں نے اس سے بدلہ لیا، لیکن تم تو مجھے سب سے شجاع آدمی کی خبر دو۔ عرض کی: ہم نہیں جانتے، پھر کون ہے؟ فرمایا: ابو بکر رضی اللہ عنہ۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش نے پکڑا، کوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو مبارک میں مار رہا ہے اور کوئی جھنجھوڑ رہا ہے اور وہ کہہ رہے ہیں کہ تو نے ہی معبودوں کو ایک معبود کر ڈالا ہے؟

فرمایا: پس قسم ہے اللہ کی! ہم میں کوئی بھی ان کے قریب نہیں ہوا مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ، یہ مار رہا ہے اور یہ آ رہا ہے اور جھنجھوڑ رہا ہے اور ہلا رہا ہے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کہہ رہے ہیں: تمھارا برا ہو، کیا تم اس شخص کو اس لیے مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ پھر انھوں نے ایک چادر بلند کی جو اُن پر تھی اور روئے یہاں تک کہ ان کی ڈاڑھی تر ہو گئی۔ پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ کیا آلِ فرعون کا مومن بہتر ہے یا ابو بکر رضی اللہ عنہ؟ لوگ چپ ہو گئے تو فرمایا کہ تم کیوں نہیں جواب دیتے؟ اللہ کی قسم! ابو بکر رضی اللہ عنہ کی ایک گھڑی آلِ فرعون کے مومن کی مثل سے بہتر ہے۔ وہ تو ایک مرد تھا جو اپنے ایمان کو چھپاتا تھا اور یہ ایسے مرد ہیں کہ اپنے ایمان کو ظاہر کیا۔[2]

[1] الكشاف (١٦٧/٤) [2] مسند البزار (١٤٥/١)

بالجملہ پھر اس مردِ مومن نے اپنی قوم کے لیے نرمی کی، تاکہ ان کو موسیٰ علیہ السلام سے دور کرے اور بہ طریقِ تقسیم ان پر حجت قائم کی، چنانچہ کہا: ﴿ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ ﴾ یہ ایک ایسا کلام ہے جو انتہائی انصاف سے اور کسی قسم کے تعصب کے بغیر صادر ہوا ہے، اسی لیے تردید کی دوشقوں، یعنی دلیلوں سے۔ ان کے کاذب ہونے کی شق کو پہلے ذکر کیا۔ معنی یہ ہیں کہ اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس کے جھوٹ کا نقصان اسی کو ہوگا اور اگر وہ سچا ہوگا تو تمھیں جلد ہی اس عذاب کا بعض پہنچے گا جس کا وہ تمھیں وعدہ دیتا ہے۔ مراد دنیا کا عذاب ہے۔ یہ عذاب مطلق عذاب کا بعض ہے جو عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت کو شامل ہے۔ اس عذاب سے جو ان کو ڈرایا تو صرف اس عذاب تک محدود کرنے کے لیے جس کا ان کے نزدیک زیادہ ظاہر طور پر احتمال تھا۔ یہ قول اس کی طرف سے شک کا اظہار نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو مومن تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کے ساتھ موصوف کیا ہے اور مومن شک نہیں کرتا۔ یا یوں کہیں کہ اس نے جو بعض کا لفظ کہا تو وہ اُن کی نصیحت میں مبالغہ کرنے کے لیے بہ طور تنزل وتلطف (نرمی) کے کہا، تاکہ اسے موسیٰ علیہ السلام کی طرف مائل ہونے کی تہمت نہ لگائیں۔ مطلب یہ ہے کہ سچے ہونے کی صورت میں اگر کُل عذاب نہ پہنچا تو کم از کم بعض تو پہنچے گا خاص کر جب کہ تم اس کے ساتھ کسی برائی سے پیش آ ؤ گے۔ امام ابوعبیدہ اور ابوالہیثم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بَعْضُ ﴾ اس جگہ کُل کے معنی میں ہے، یعنی تم کو وہ کل شے پہنچے گی جس کا تم کو وعدہ دیتا ہے۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے اس کی سند میں لبید کا یہ شعر پڑھا:

تَرَّاكُ أَمْكِنَةٍ إِذَا لَمْ أَرْضَهَا أَوْ يَرْتَبِطَ بَعْضَ النُّفُوْسِ حِمَامُهَا

یعنی "كُلَّ النُّفُوْسِ". کسی نے اس قول پر اعتراض کیا، دوسرے نے اس کا یہ جواب دیا کہ لغتِ عرب میں بعض کل کے معنی میں مستعمل ہے جس طرح کہ شاعر کے قول میں ہے:

وَقَدْ يُدْرِكُ الْمُتَأَنِّيْ بَعْضَ حَاجَتِهِ وَقَدْ يَكُوْنُ مَعَ الْمُسْتَعْجِلِ الزَّلَلُ

کسی اور نے کہا ہے:

إِنَّ الْأُمُوْرَ إِذَا الْأَحْدَاثُ دَبَّرَهَا دُوْنَ الشُّيُوْخِ تَرَى فِيْ بَعْضِهَا خَلَلًا

ان دونوں شعروں میں دعوائے مدعی پر دلیل نہیں ہے، بلکہ کلمۂ ﴿ بَعْضُ ﴾ اپنے معنی پر ہے۔ رہا لبید کا شعر تو "بعض النفوس" سے مراد خود اس کا نفس ہے۔[1] علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "تَفْسِيْرُ الْبَعْضِ بِالْكُلِّ مُزَيَّفٌ.[2] انتھیٰ"، یعنی ﴿ بَعْضُ ﴾ کی تفسیر "کُل" کے ساتھ کھوٹی ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ آیت میں جو ﴿ بَعْضُ ﴾ کا کلمہ ہے، اس کو کُل پر محمول کریں، کیوں کہ اس مومن کی مراد تو قوم کے ساتھ تنزل (نرمی) ہے اور ان کے وہم میں یہ بات ڈالنا ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی صحت کا اعتقاد نہیں رکھتا، چناں چہ ﴿ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ ﴾ یہی بات ظاہر کرتا ہے۔

---

[1] فتح القدير (٤/٦٤٢) [2] تفسير النسفي (٤/٧٣)

اہلِ معانی نے کہا ہے کہ مومن کا قول مظاہرت فی الحجاج کی بنا پر ہے۔ گویا اس نے یوں کہا ہے کہ اس کے صدق میں کم سے کم جو شے ہو گی وہ یہ ہے کہ تم کو جس عذاب کا وعدہ دیتا ہے، اس کا بعض تم کو پہنچے گا اور اس کے بعض میں تمھاری ہلاکت ہے۔ تو گویا جو ﴿ بَعْضُ ﴾ سے حاصل ہے، وہی کل سے حاصل ہے۔ امام لیث نے کہا کہ اس جگہ ﴿ بَعْضُ ﴾ زاید ہے، یعنی تم کو وہ شے پہنچے گی جس کا تم کو وعدہ دیتا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ثواب اور عقاب کا وعدہ دیا تھا۔ چنانچہ جب انھوں نے کفر کیا تو ان کو عذاب پہنچے گا اور یہ بعض ہے اس شے کا جس کا ان کو وعدہ دیا۔ دونوں جگہ کلمہ "یَكُ"، اصل میں "یَكُنْ" ہے۔ نون کو کثرتِ استعمال کے سبب سے تخفیف کے لیے حذف کر دیا ہے، جیسا کہ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴾ مومن مرد کے تتمۂ کلام سے ہے۔ اس نے یہ دو وجہوں سے ان پر حجت قائم کی ہے: ایک وجہ تو یہ ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام مسرف اور کذاب ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کو بینات کی طرف راہ نہ بتاتا اور نہ ہی معجزوں سے ان کی تایید فرماتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب وہ ایسے ہوتے تو ان کو اللہ تعالیٰ بے یار و مددگار چھوڑ دیتا اور ہلاک کر ڈالتا۔ لہٰذا تم کو ان کے قتل کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ ﴿ مُسْرِفٌ ﴾ وہ ہے جو معاصی پر قائم رہتا ہے اور کثرت سے گناہ کرتا ہے۔ ﴿ كَذَّابٌ ﴾ سے مراد مفتری ہے، پھر اس مومن نے اپنی قوم کو وہ بادشاہت اور سلطنت یاد دلائی جس میں وہ تھے۔ چنانچہ کہا: ﴿ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ﴾ تاکہ اللہ پاک کا شکر ادا کریں اور اپنے کفر میں نہ بڑھتے جائیں، یعنی اے میری قوم! تم کو آج بادشاہت حاصل ہے، اس حالت میں کہ تم لوگوں پر غالب ہو اور تم کو ان پر غلبہ اور علو حاصل ہے۔ تم سرزمینِ مصر میں بادشاہی کر رہے ہو۔

﴿ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ﴾ اس بات سے اس کی غرض یہ تھی کہ قوم کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے، یعنی اگر وہ تمھارے کفر کی وجہ سے تم پر عذاب اتارے تو پھر کون ہے جو ہمیں اس کے عذاب سے بچائے اور اس کے آنے کے وقت ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہو جائے۔ یہ جو اس کے ملک اور غلبے کی نسبت ان کی طرف کی جس سے ان کو خوشی ہوتی ہے اور اللہ کے عذاب کے آنے کا خطرہ جو بیان کیا جو اُن کو مغموم کرتا ہے، اس میں اپنے آپ کو ان میں شامل کیا تو اس سے ان کے دلوں کو خوش کرنا منظور ہے اور ان کو یہ بتانا منظور ہے کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے اور وہ اس شے کے حاصل کرنے کے لیے سعی و کوشش کرنے والا ہے جو ان کو نفع دے اور اس شے کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُن کو ضرر پہنچائے اور ہلاک کر دے۔ یہ سب کچھ وہ اس لیے کر رہا ہے کہ وہ اس کی نصیحت، خیر خواہی اور دل سوزی سے اثر پذیر ہوں۔

---

[1] فتح القدير (٦٤٢/٤)

پھر جب فرعون نے اس مردِ مومن کی صحیح نصیحت اور خیر خواہی کی تقریر سنی تو ایک مراوغہ لایا، یعنی ایک مکر و فریب کی چال چلی جس سے اپنی قوم کے دل میں یہ وہم ڈالا کہ وہ ان کے لیے نہایت درجہ کا ناصح اور رعایت دینے والا ہے اور ان کو اسی راہ پر چلاتا ہے جس میں ان کے لیے فائدہ ہے اور اس سے ان کے ضرر کو دور کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے یوں کہا: ﴿مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى﴾ "أي: مَا أُشِيرُ عَلَيْكُمْ إِلَّا بِمَا أَرَى لِنَفْسِي"[1] (قاله ابن زید) یعنی میں تم کو اس بات کا مشورہ دیتا ہوں جس کو اپنے نفس کے لیے پسند کرتا ہوں۔ یہ تفسیر مآلِ معنی کی ہے اور وہ تفسیر جو وہ ہر لفظ کے مطابق ہے وہ ہے جو ضحاک رحمہ اللہ نے کہی ہے "مَا أُعَلِّمُكُمْ إِلَّا مَا أَعْلَمُ مِنَ الصَّوَابِ"[2] یعنی میں تم کو بتاتا ہوں، مگر وہی صواب (صحیح بات) جس کو میں جانتا ہوں۔ مراد موسیٰ علیہ السلام کا قتل ہے۔ رؤیہ اس جگہ قلبی و اعتقادی ہے، بصری اور عینی نہیں ہے۔ چنانچہ دو مفعول کی طرف متعدی ہے۔ دوسرا مفعول ﴿اِلَّا مَآ اَرٰى﴾ ہے۔ قولہ: ﴿وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ﴾ یعنی میں تم کو اس رائے سے صرف راہِ حق اور ہدایت کی طرف بلاتا ہوں۔ جمہور نے "رشاد" کو بہ تخفیفِ شین پڑھا ہے اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بہ تشدیدِ شین پڑھا ہے، اس بنا پر کہ صیغۂ مبالغہ ہے، مثل "ضَرَّاب" کے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراءت لحن ہے، یعنی خطا ہے، اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[3] پھر مردِ مومن نے اپنی قوم کو دوبارہ وعظ و نصیحت کی اور ان کو ڈرایا کہ کہیں ان پر وہ عذاب نازل نہ ہو جو اُن سے پہلے لوگوں پر اتر چکا ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے اس کی طرف سے بیان فرمایا:[4]

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ
الْاَحْزَابِ ۝٣٠ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ
مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝٣١ وَيٰقَوْمِ
اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝٣٢ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا
لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ
هَادٍ ۝٣٣ وَلَقَدْ جَاۗءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ
فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَاۗءَكُمْ بِهٖ ۭ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ
لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ
مُسْرِفٌ مُّرْتَابُۨ ۝٣٤ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ

[1] تفسیر القرطبي (۱۵/۳۱۰) [2] تفسیر البغوي (۷/۱۴۷) [3] فتح القدیر (۴/۶۴۳) [4] فتح البیان (۱۲/۱۸۱-۱۸۵)

سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ
كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿٣٥﴾
وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَبْلُغُ
الْاَسْبَابَ ﴿٣٦﴾ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ
لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ
عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿٣٧﴾

اور جو شخص ایمان لایا تھا اس نے کہا: اے میری قوم! بلاشبہ مجھے تمھاری نسبت دوسرے گروہوں (سابقہ امتوں) جیسے دن (کے عذاب) کا ڈر ہے (30) جیسے قومِ نوح کا حال (ہوا)، اور عاد اور ثمود اور ان لوگوں کا جو ان کے بعد ہوئے اور اللہ (اپنے) بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا (31) اور اے میری قوم! بے شک مجھے تم پر باہمی پکار کے دن (قیامت) کا ڈر ہے (32) جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے تو کوئی تمھیں اللہ (کے عذاب) سے بچانے والا نہ ہوگا اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں (33) اور بلاشبہ اس سے پہلے یوسف بھی تمھارے پاس کھلی (نشانیاں) لے کر آیا تھا، پھر تم ہمیشہ اس کے متعلق شک میں رہے جو وہ تمھارے پاس لایا، حتی کہ جب وہ فوت ہوگیا، تو تم نے کہا: اس کے بعد اللہ ہرگز کوئی رسول نہیں بھیجے گا، اللہ اس شخص کو اسی طرح گمراہ کرتا ہے، جو حد سے بڑھنے والا، شک کرنے والا ہو (34) جو لوگ اللہ کی آیات میں کسی دلیل کے بغیر جھگڑتے ہیں جو ان کے پاس آئی ہو، (یہ رویہ) اللہ کے نزدیک اور ان لوگوں کے نزدیک، جو ایمان لائے بڑی ناراضی و بیزاری کا باعث ہے، اللہ ہر متکبر، سرکش کے دل پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے (35) اور فرعون نے کہا: اے ہامان! تو میرے لیے ایک بلند عمارت بنا، تاکہ میں راستوں تک پہنچوں (36) یعنی آسمانوں کے راستوں تک، پھر میں موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں، اور بے شک میں تو اسے جھوٹا خیال کرتا ہوں اور اسی طرح فرعون کے لیے اس کا برا عمل پر کشش بنا دیا گیا اور اسے (سیدھے) راستے سے روک دیا گیا اور فرعون کی چال تو بس تباہ و برباد ہو کر رہی (37)

آلِ فرعون کا دردِ دل رکھنے والا ایک مومن شخص:

ہانک پکار کا دن ان پر آیا جس دن قلزم میں غرق ہوئے اور ڈوبتے ہوئے ایک دوسرے کو پکارنے لگے۔ یہ

اس کو کشف سے معلوم ہوا ہو گا یا قیاس سے جان لیا ہو گا کہ ہر قوم پر عذاب اسی طرح آتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کی زندگی میں ان کے قائل نہ ہوئے۔ ان کی موت کے بعد جب سلطنتِ مصر کا بندوبست بگڑ گیا تو کہنے لگے کہ اس شہر پر یوسف علیہ السلام کا قدم کیسا مبارک تھا، ایسا نبی کوئی نہ ہو گا۔ یا وہ انکار یا یہ اقرار، یہ ہی حد سے بڑھ جانا ہے۔ انتھی

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ عزوجل اس مردِ صالح مومن کے بارے میں خبر دیتا ہے جو فرعون والوں میں سے تھا کہ اس نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا جو دنیا اور آخرت میں ہو گا۔ چنانچہ کہا: اے میری قوم! میں تم پر یومِ احزاب کی مثل تم پر عذاب آنے سے ڈرتا ہوں، یعنی وہ لوگ جنھوں نے زمانۂ قدیم میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب کی، جیسے قومِ نوح علیہ السلام اور عاد و ثمود اور ان کے بعد جو جھٹلانے والی اُمتیں ہوئیں، ان پر اللہ کا کیسا عذاب نازل ہوا اور اس عذاب کو کسی پھیرنے والے نے ان سے نہیں پھیرا اور نہ کسی روکنے والے نے اس کو ان سے روکا اور اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں کرتا، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو ان کو ہلاک کیا تو ان کے گناہوں کے سبب سے اور اس کے رسولوں کو جھٹلانے کے سبب سے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کے سبب سے ہلاک کیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی قدر ان پر نافذ کر دی۔ پھر کہا: اے میری قوم! میں تم پر یومِ تناد سے ڈرتا ہوں، یعنی روزِ قیامت سے۔ اس کی وجہِ تسمیہ میں کئی قول ہیں:

1. بعض نے کہا: اس کا نام یوم التناد اس لیے رکھا کہ حدیثِ صور میں آیا ہے کہ جس وقت زمین ہلائی جائے گی اور ایک قطر سے دوسرے قطر تک شق ہو جائے گی اور موج مارے گی اور کانپے گی اور لوگ اس کی طرف نظر کریں گے اور ایک دوسرے کو پکارتے ہوئے بھاگیں گے۔[1]
2. دوسروں نے کہا جن میں امام ضحاک رحمہ اللہ ہیں: بلکہ یہ اس وقت ہو گا جب جہنم لائی جائے گی تو لوگ اس سے بھاگتے ہوئے جائیں گے۔ پھر فرشتے ان کے سامنے آئیں گے اور مقامِ محشر کی طرف ان کو پھیر لائیں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآىِٕهَا ﴾ [الحاقة: ١٧] ''اس کے کناروں پر فرشتے ہوں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴾ [الرحمن: ٣٣] ''اے گروہِ جنات و انسان! اگر تم میں آسمانوں اور زمین کے کناروں سے باہر نکل جانے کی طاقت ہے تو نکل بھاگو! بغیر غلبہ اور طاقت کے تم نہیں نکل سکتے۔''
3. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن اور ضحاک رحمہما اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ''يَوْمَ التَّنَادِّ'' بہ تشدید دال پڑھا ہے ماخوذ ہے ''نَدَّ الْبَعِيْرُ إِذَا تَرَدّٰى وَذَهَبَ''[2] سے (''رَدّٰى'' ایک قسم کی چال کا نام ہے۔ اونٹ جب

---

[1] مسند إسحاق بن راهويه (٨٤/١) تفسير الطبري (٥٥٨/١٨) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہِ ضعف ہیں۔

[2] تفسير ابن كثير (١٠٠/٤)

وحشت کرتا ہے اور بدکتا ہے تو اس وقت بولتے ہیں کہ ''نَدَّ الْبَعِيرُ''۔ چونکہ قیامت کے دن لوگ وحشت ناک ہو کر چلیں گے، اس لیے اس کا نام ﴿ يَوْمَ التَّنَادِ ﴾ رکھا ہے)۔

4 کسی نے کہا کہ میزان کے پاس ایک فرشتہ ہوگا جس وقت بندے کا عمل تولا جائے گا اور وہ بھاری ہوگا تو فرشتہ بلند آواز سے کہے گا: خبردار! فلاں فلاں کا بیٹا واقعی ایسا سعید اور نیک بخت ہوا کہ اس کے بعد کبھی شقی اور بد بخت نہ ہوگا۔ اور اگر اس کا عمل ہلکا ہوگا تو آواز کرے گا کہ فلاں بن فلاں واقعی شقی ہوا۔ اس ندا کی وجہ سے روزِ قیامت کا نام ﴿ يَوْمَ التَّنَادِ ﴾ رکھا ہے۔

5 امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر قوم اپنے اعمال کے ساتھ بلائی جائے گی، اہلِ جنت اہلِ جنت کو ندا کریں گے اور اہلِ نار اہلِ نار کو ندا کریں گے۔[1] (یہ ﴿ يَوْمَ التَّنَادِ ﴾ کہنے کی مستقل وجہ ہے۔ ماقبل سے متعلق نہیں ہے۔ اگر یہاں حرفِ واؤ ہوتا تو بہتر تھا)۔

6 کسی نے کہا ہے کہ اس لیے ﴿ يَوْمَ التَّنَادِ ﴾ نام رکھا ہے کہ اہلِ جنت اہلِ نار کو اس طرح ندا کریں گے: ﴿ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۖ قَالُوْا نَعَمْ ۚ ﴾ [الأعراف: ٤٤] ''ہم سے جو ہمارے رب نے وعدہ فرمایا تھا، ہم نے تو اس کو واقعہ کے مطابق پایا، سو تم سے جو تمھارے رب نے وعدہ کیا تھا تم نے بھی اس کو واقعہ کے مطابق پایا؟ وہ کہیں گے: ہاں۔'' اور اہلِ نار اہلِ جنت کو اس طرح پکاریں گے: ﴿ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۚ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٠] ''ہمارے اوپر تھوڑا پانی ہی ڈال دو یا اور ہی کچھ دو جو اللہ نے تم کو دے رکھا ہے۔ جنت والے کہیں گے کہ اللہ نے دونوں چیزوں کی کافروں کے لیے بندش کر دی ہے۔'' اور اعراف والے اہلِ جنت و اہلِ نار کو ندا کریں گے، جیسا کہ سورۃ الاعراف میں مذکور ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ وغیرہ نے یہ بات پسند کی ہے[2] کہ اس کا نام ﴿ يَوْمَ التَّنَادِ ﴾ اس سبب کی وجہ سے رکھا ہے، یہ قول حسن و جید ہے۔ واللّٰه أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ﴾ یعنی جس دن تم چلتے بھاگتے ہوئے پیٹھ پھیرو گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ ﴾ [القيامة: ١١۔ ١٢] ''نہیں نہیں کوئی پناہ گاہ نہیں، آج تو تیرے پروردگار کی طرف ہی قرار گاہ ہے۔'' اسی لیے اللہ عزوجل نے یوں فرمایا ہے: ﴿ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ ﴾ ''یعنی نہیں ہے تمھارے لیے کوئی منع کرنے والا کہ اللہ کے پاس و عذاب سے تم کو بچا لے۔'' ﴿ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴾ یعنی جس کو اللہ گمراہ کرے تو اس کو سوائے اللہ کے کوئی ہدایت کرنے والا نہیں ہے۔

---

1 تفسير ابن كثير (١٠٠/٤)
2 تفسير البغوي (١٤٨،١٤٧/٧)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے پہلے مصر والوں میں ایک رسول بھیجا تھا، یعنی یوسف علیہ السلام۔ یہ اہلِ مصر کے عزیز اور رسول تھے، اپنی امت کو عدل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے تھے۔ مصر والوں نے ان کی اطاعت نہ کی، مگر ان کی وزارت اور دنیوی وجاہت کی وجہ سے، اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ ﴾ یعنی تم ناامید ہو گئے تو تم نے طمع کر کے کہا کہ اللہ اس کے بعد ہرگز کوئی رسول نہ بھیجے گا۔ یہ بات انھوں نے اپنے کفر اور تکذیب کی وجہ سے کہی تھی۔ ﴿ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۙ ﴾ یعنی تمھاری اس حالت کی طرح اس شخص کا حال ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں حد سے بڑھنے اور اس کے دل کے شک کرنے کے سبب سے گمراہ کرتا ہے۔

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ ﴾ یعنی جو لوگ حق کو باطل سے دفع کرتے ہیں اور حجتوں سے بغیر کسی دلیل و حجت کے لڑتے جھگڑتے ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ اس بات پر بہت سخت بغض رکھتا ہے، اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ ﴾ یعنی اور مومنین بھی اس شخص کے ساتھ بغض رکھتے ہیں جس کی یہ صفت ہے، کیوں کہ جس کی یہ حالت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے، چنانچہ اس کے بعد وہ نہ کسی نیک بات کو پہچانتا ہے اور نہ کسی بری بات کو برا سمجھتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: ﴿ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴾ یعنی اسی طرح اللہ ہر اس شخص کے دل پر مہر کرتا ہے جو حق کی پیروی کرنے سے تکبر اور سرکشی کرتا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عکرمہ سے روایت کیا ہے اور امام شعبی رحمہ اللہ سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ انسان اس وقت تک جبار نہیں ہوتا، جب تک دو جانوں کو قتل نہ کرے۔ ابو عمران جونی اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ جباروں کی نشانی بغیر حق کے قتل کرنا ہے۔[1] والله تعالیٰ أعلم.

﴿ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴾ اللہ تعالیٰ فرعون کے تمرد و سرکشی اور افتراء کی خبر دیتا ہے جو اس نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب میں کیا، وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ اس کے لیے ایک صَرح بنائے، یعنی ایک اونچا محل بنائے۔ یہ محل پکی ہوئی اینٹوں سے بنایا تھا، جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا ﴾ [القصص: ۳۸] ''سن اے ہامان! تو میرے لیے مٹی کو آگ میں پکوا، پھر میرے لیے ایک محل تعمیر کر۔'' اسی لیے امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ سلف صالح پکی اینٹوں سے گھر بنانے کو مکروہ رکھتے تھے اور اس بات کو کہ اس کو اپنی قبروں میں لگائیں۔ (رواہ ابن أبي حاتم)

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۲۹۵۸/۹، ۲۹۵۹)

سعید بن جبیر اور ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ ﴾ سے مراد آسمانوں کے دروازے ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ آسمانوں کی راہیں ہیں۔

یہ جو کہا: ﴿ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ﴾ چنانچہ یہ اس کے کفر کی اور سرکشی کی باتوں میں سے ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی اس بات میں تکذیب کی کہ اللہ عزوجل نے ان کو اس کی طرف بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ زُیِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِیْلِ ﴾ یعنی اسی طرح فرعون کو اس کے برے اعمال بھلے کر کے دکھائے گئے اور وہ راہ سے روکا گیا، یعنی بہ سبب اس کام کے کرنے سے جس سے اس نے یہ چاہا کہ اپنی رعیت کے جی میں یہ وہم ڈالے کہ وہ ایسی شے بناتا ہے جس سے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر سکے گا۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَا كَیْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "إِلَّا فِي خَسَارٍ"[2] یعنی نہیں ہے فرعون کا مکر، مگر نقصان اور زیان میں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ ﴿ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴾ سے "مِثْلَ یَوْمِ عَذَابِ الْأَحْزَابِ" ہے۔ یعنی وہی مردِ مومن اپنی قوم سے کہتا ہے کہ میں تم پر اگلی اُمتوں کے روزِ عذاب سے ڈرتا ہوں جو اپنے نبیوں پر جمع ہو گئی تھیں کہ کہیں ویسا عذاب کا دن تم پر نہ آ جائے۔ ﴿ یَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴾ فرمایا، "أَیَّامِ الْأَحْزَاب" نہ فرمایا، باوجود اس کے کہ احزاب جمع ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "أحزاب" کی جمع لانے نے "یوم" کی جمع لانے سے بے نیاز کر دیا اور احزاب پر جو عذاب نازل ہوا وہ کچھ ایک دن میں سب پر نازل نہیں ہوا، بلکہ دنیا کے مختلف و مترتب دنوں میں اترا۔ پھر مردِ مومن نے احزاب کی تفسیر کی تو کہا: ﴿ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ﴾ یعنی قومِ نوح وغیرہ کے حال کی طرح، یا تکذیب پر رہنے کی ان کی عادت کی طرح، یا اس کفر اور تکذیب کی جزا کی طرح جس پر وہ تھے۔

﴿ وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک بغیر گناہ کے بندوں کو عذاب اور عقاب نہیں کرتا اور نہ ان میں سے ظالم کو بغیر عذاب کے چھوڑتا ہے۔ یا وہ جتنے عذاب کے مستحق ہیں اس سے زیادہ عذاب نہیں کرتا۔ یا ان کو ہلاک نہیں کرتا مگر ان پر حجت قائم کرنے کے بعد۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا ہلاک کرنا عدل تھا، اس لیے کہ وہ اپنے اعمالِ بد کے سبب سے ہلاکت کے مستحق ہو چکے تھے۔ اس آیت میں بہ نسبت آیت: ﴿ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴾ [حم السجدة: ٤٦] ''اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔'' کے مبالغہ زیادہ ہے، اس لحاظ سے کہ اس میں ظلم کے ارادے کی نفی کی ہے اور کلمۂ ﴿ ظُلْمًا ﴾ کو نکرہ ذکر کیا ہے، لہٰذا جو ذات پاک کسی قسم کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱۰۱/٤) [2] تفسیر الطبري (۳۸۸/۱۲)

ظلم کے ارادے سے مبرّا ہے تو وہ ظلم کرنے سے تو بالکل ہی مبرّا اور منزہ ہوگا۔ معتزلہ نے جو یہ تفسیر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے لیے یہ ارادہ نہیں کرتا کہ وہ ظلم کریں تو یہ بعید ہے، کیوں کہ اہلِ لغت نے کہا ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے سے کہے: ''لَا أُرِيْدُ ظُلْمًا لَكَ'' تو اس کے یہ معنی ہیں کہ میں ارادہ نہیں کرتا کہ تجھ پر ظلم کروں۔

بالجملہ پہلے تو مردِ مومن نے دنیا کے عذاب سے ڈرایا، پھر اپنے وعظ ونصیحت میں زیادتی کی اور عذابِ آخرت کا خوف دلایا۔ چنانچہ کہا: ﴿ وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴾۔ جمہور نے بہ تخفیفِ دال وحذفِ یاء پڑھا ہے اصل میں ''تَنَادِی'' ہے بروزن تفاعل ''ندا'' سے۔ محاورے میں بولتے ہیں: ''تَنَادَى الْقَوْمُ'' یعنی بعض نے بعض کو پکارا۔ حسن رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی ابن سمیفع، یعقوب، ابن کثیر اور مجاہد رحمہم اللہ) نے بنا بر اصل بہ اثباتِ یاء پڑھا ہے، اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ضحاک اور عکرمہ رحمہما اللہ نے بہ تشدیدِ دال پڑھا ہے۔ بعض اہلِ لغت نے کہا ہے کہ یہ لحن ہے، یعنی خطا ہے، اس لیے کہ ماخوذ ہے: ''نَدَّ يَنِدُّ'' سے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص اپنے منہ پر بھاگتا ہوا گزرے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات غلط ہے اور بنا بر معنی تنافی قراءت حسن ہے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے اس کے معنی کے بارے میں کہا ہے کہ جس وقت جہنم کا چنگھاڑنا سنیں گے تو ''نَدُّوْا هَرَبًا''[1] یعنی بدکیں گے اور بے تک بھاگیں گے، پھر اطرافِ زمین سے کسی طرف نہ آئیں گے، مگر وہاں فرشتوں کی صفوں کو پائیں گے تو اس جگہ کی طرف لوٹ جائیں گے جس میں تھے۔ چنانچہ وہ یہ اللہ کا قول ہے: ﴿ يَوْمَ التَّنَادِ ﴾ جمہور کی قراءت پر معنی یہ ہیں کہ بعض بعض کو پکاریں گے۔ ﴿ يَوْمَ التَّنَادِ ﴾ میں جو اقوال ہیں وہ پہلے گزر چکے ہیں۔ ایک اور قول یہ ہے کہ اس میں ہر قسم کے لوگ اپنے اپنے امام اور پیشوا کے ساتھ پکارے جائیں گے۔ دوسرا یہ ہے کہ ندا کی جائے گی جس وقت کہ موت ذبح کی جائے گی۔ اے اہلِ جنت! اب بغیر موت کے ہمیشہ کی زندگی ہے اور اے اہلِ نار! اب بغیر موت کے ہمیشہ کی زندگی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مومن ندا کرے گا: ﴿ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴾ [الحاقة: ١٩] ''لو میرا نامۂ اعمال پڑھو'' یعنی آؤ جی! میرا نامۂ اعمال پڑھو اور کافر ندا کرے گا: ﴿ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ﴾ [الحاقة: ٢٥] ''کاش مجھے میری کتاب دی ہی نہ جاتی۔'' یعنی اے کاش! میں اپنی کتاب نہ دیا جاتا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ﴾ ﴿ يَوْمَ التَّنَادِ ﴾ سے بدل ہے۔ یا منصوب ہے بہ تقدیر ''أَعْنِيْ'' اور عطفِ بیان نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ وہ معرفہ اور یہ نکرہ ہے، یعنی ﴿ يَوْمَ التَّنَادِ ﴾ وہ دن ہے جس دن تم پیٹھ پھیرو گے، اس حال میں کہ تم موقف سے نار کی طرف رجوع ہونے والے ہو گے، یا نار سے بھاگنے والے ہو گے اس حال میں کہ عاجز کرنے والے نہ ہو گے۔ امام قتادہ اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ حساب کے بعد نار کی طرف رجوع ہونے والے ہو گے۔[2] پھر اس مومن نے اپنی ملامت کی یہ تاکید کی کہ ﴿ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ﴾ یہ جملہ بنا بر حال

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/٣١١) فتح القدير (٤/٦٤٤، ٦٤٥) [2] فتح القدير (٤/٦٤٥)

محلِ نصب میں ہے، یعنی تم نار کی طرف جاؤ گے، اس حال میں کہ اللہ کے عذاب سے کوئی تمھارا بچانے والا نہیں ہو گا جو تم کو اس سے بچائے۔ پھر اپنی قوم کی ضلالت اور جہالت کی شدت پر آگاہ کیا تو یوں کہا: ﴿ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴾ یعنی جس کو اللہ گمراہ کرے تو اس کے لیے کوئی ہادی نہیں ہے کہ اسے ہدایت کی راہ بتائے۔ وقف میں ﴿ هَادٍ ﴾ کو بہ اثبات وحذفِ یاء پڑھا ہے اور وصل میں بہ حذفِ یاء، خط میں بھی اس کے حذف کے ساتھ۔ كما في الجمل.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ... الآية ﴾ مومنِ آلِ فرعون کے تتمۂ وعظ سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ من جملہ موسیٰ علیہ السلام کے قول سے ہے، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ مردِ مومن ان کو ان کی پرانی سرکشی یاد دلاتا ہے جس کو وہ شروع سے انبیاء پر کرتے چلے آئے ہیں۔ کہتا ہے کہ تم تو پرانے متمرد اور سرکش ہو۔ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے یوسف علیہ السلام تمھارے پاس ظاہر ظاہر معجزے اور واضح واضح نشانیاں لے کر آئے، یعنی تمھارے باپ داداؤں کے پاس، کیوں کہ سرکشی میں ابناء اپنے آباء کی طرح تھے، اس لیے یوسف علیہ السلام کا ان کے آباء کی طرف آنے کو ان کی طرف آنا ٹھہرایا اور کہا: پس تم، یعنی تمھارے باپ دادا ان نشانیوں کے بارے میں ہمیشہ شک میں رہے جن کو وہ لے کر تمھارے پاس آئے اور ان پر ایمان نہ لائے، یہاں تک کہ جب یوسف علیہ السلام فوت ہو گئے تو تم نے، یعنی تمھارے اسلاف نے کہا ہے کہ اللہ ان کے بعد ہرگز کوئی رسول نہ بھیجے گا۔

چنانچہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کی زندگی میں کفر کیا اور اُن کی موت کے بعد ان رسولوں کے ساتھ کفر کیا جو اُن کے بعد ہوں گے اور یہ خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ ان پر حجت کی تجدید نہ کرے گا۔ یہ بات بغیر کسی حجت اور دلیل کے صرف اپنی تمناؤں اور خواہشات کے طور پر کہی، تاکہ یہ ان کے بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے رسولوں کی تکذیب کی بنیاد بن جائے۔ یہ بات ان کی طرف سے یوسف علیہ السلام کی رسالت کا کچھ اقرار نہیں، بلکہ ان کی رسالت میں جو ان کو شک تھا، اس کے ساتھ ان کے بعد کے رسولوں کی رسالت کی تکذیب کو ملانا ہے۔[1] (هذا حاصل ما أفاده الخطيب والخازن)

یوسف علیہ السلام کے بارے میں تین قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یوسف بن یعقوب علیہما السلام ہیں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: "عَمَرَ إِلٰى زَمَنِ مُوسٰى"[2] انتھٰی. یعنی یوسف بن یعقوب علیہما السلام موسیٰ کلیم اللہ کے زمانے تک زندہ رہتے چلے آئے۔ سلیمان جمل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات محلی رحمہ اللہ کے سوا کسی اور مفسر نے نہیں کہی۔ انتہائی جستجو کے بعد جو بات معلوم ہوئی وہ یہی ہے جو شہاب رحمہ اللہ نے اس قول کے ساتھ نقل کی ہے کہ بعض تاریخوں میں یوسف علیہ السلام کی وفات موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے چونسٹھ برس پہلے ہوئی۔[3] قاری نے کہا: صحیح یہ ہے کہ جس کی عمر بڑی ہوئی، وہ فرعونِ موسیٰ علیہ السلام ہے، اس نے یوسف علیہ السلام کو پایا اور زندہ رہا، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام اس کی طرف بھیجے گئے، اس کی عمر چار سو چالیس برس ہوئی۔ انتھیٰ.

---

[1] تفسير الخازن (٦/٩٤، ٩٥) [2] تفسير الجلالين (٦٢٢/١) [3] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٣٧٠/٧)

امام سیوطی رحمہ اللہ نے تحبیر میں کہا ہے کہ یوسف بن یعقوب علیہما السلام ایک سو بیس برس زندہ رہے، ان کے اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان چار سو بیس برس کی مدت ہے۔ انتہیٰ۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ کوئی اور فرعون ہے۔ بالجملہ اس قول کی بنا پر کہ یوسف سے مراد یوسف بن یعقوب علیہما السلام ہیں۔ "بینات" سے مراد یوسف علیہ السلام کی رؤیا ہوگا۔[1] (کما قاله ابن جریج)

کسی نے کہا ہے کہ ان کا یہ قول مراد ہے: ﴿ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ [يوسف: ٣٩] ''کیا متفرق کئی ایک پروردگار بہتر ہیں؟ یا ایک اللہ زبردست طاقتور؟'' دوسرا قول یہ ہے کے یوسف سے مراد یوسف بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب علیہم السلام ہیں۔ یہ یوسف، یوسف علیہ السلام کے پوتے ہوئے جو قبطیوں میں بیس برس نبی رہے۔[2] (كذا في فتح البيان و فتح القدير۔ جلالین مطبوع مصر میں ابراہیم ہے۔ والله أعلم)۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نقاش نے ضحاک رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف جنوں سے ایک رسول بھیجا جس کو یوسف کہتے تھے (یہ قول نہایت غریب ہے رسول بنی آدم سے ہوتے ہیں نہ کہ جنوں سے)۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔[3]

بالجملہ مردِ مومن کے کلامِ مذکور سے اپنی قوم کو عرضِ وعظ اور نصیحت کرنا ہے کہ دیکھو! کیا کھلی گمراہی ہے کہ جب یوسف علیہ السلام رسول ہو کر آئے تو تمھارے آباء واجداد ان کے منکر ہوئے اور جب انھوں نے وفات پائی تو بے دلیل صرف تمنا کر کے کہہ دیا کہ ان کے بعد کوئی رسول نہ آئے گا۔ اسی لیے یوں کہا: ﴿ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ﴾ یعنی تمھارے اس گمراہ کرنے کی طرح جو ظاہر و باہر ہے، اللہ تعالیٰ اس شخص کو گمراہ کرتا ہے جو معصیت میں حد سے بڑھنے والا ہے اور گناہوں میں کثرت کرنے والا ہے، یا شرک کرنے والا ہے اور اللہ کے دین میں، اس کی وحدانیت اور وعد و وعید میں شک کرنے والا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ﴾ میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ بھی کلامِ مردِ مومن میں سے ہے، اس بنا پر محلِ نصب میں ہوگا بنا بر بدل کلمۂ ﴿ مَنْ ﴾ سے اور جمع لانا بہ اعتبار معنی ﴿ مَنْ ﴾ کے اور ضمیر ﴿ هُوَ ﴾ کا مفرد لانا لفظ ﴿ مَنْ ﴾ کے اعتبار سے ٹھہرے گا، یا اس بنا پر کہ لفظ ﴿ مَنْ ﴾ کا بیان ہے، یا اس کی صفت ہے، یا بہ اضمار "أَعْنِيْ" منصوب ہے۔ یا محلِ رفع میں ہے، اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ "أَيْ: هُمُ الَّذِيْنَ" اور ﴿ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ ﴾ ﴿ يُجَادِلُوْنَ ﴾ سے متعلق ہے اور ﴿ اَتٰىهُمْ ﴾ ﴿ سُلْطٰنٍ ﴾ کی صفت ہے۔ معنی یہ ہیں کہ مردِ مومن کہتا ہے کہ ﴿ مُسْرِفٌ ﴾ اور ﴿ مُّرْتَابٌ ﴾ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیتوں کو بغیر کسی واضح حجت اور قطعی برہان کے باطل کرنے میں جھگڑتے ہیں۔ یہ صفت فرعون اور اس کی قوم میں موجود تھی۔ تو

[1] الدر المنثور (٢٨٨/٧) [2] فتح القدير (٦٤٥/٤) فتح البيان (١٨٨/١٢) تفسير الجلالين (٦٢٢/١)

[3] فتح القدير (٦٤٥/٤)

چاہیے تھا کہ یوں کہتا: تم مسرف اور مرتاب ہو، اللہ کے معجزوں میں بے دلیل جھگڑتے ہو، لیکن چونکہ مردِ مومن کو ان کا نصیحت کرنا اور ان کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنا منظور تھا، اس لیے خطاب کے طریقے کو چھوڑ کر ان کے حال کو اسم غائب کے پیرائے میں اور بطور عموم ادا کیا، تاکہ نصیحت پذیر ہوں اور اپنے حال میں غور کریں۔ خیر خواہ، اچھی تقریر کرنے والے اور موثر نصیحت کرنے والوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

''بہتر یہی ہے کہ محبوب لوگوں کی بات اور راز دوسروں کی بات میں کہی جائے۔''

اور مسنون طریقہ بھی یہی ہے، دیکھو! نبی اکرم ﷺ جب وعظ فرماتے تو ﴿ مَا بَالُ أَقْوَامٍ ﴾ فرمایا کرتے تھے،[1] کسی خاص شخص کو خطاب نہ فرماتے۔ بالجملہ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ ﴿ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ﴾ لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا حال ہے؟ تو اس کا یہ جواب دیا: ﴿ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾۔ ﴿ كَبُرَ ﴾ میں دو احتمال ہیں: یا تو اس سے مراد تعجب ہے اور عظمت ظاہر کرنا ہے۔ یا اس سے مراد مذمت ہے، جیسے کلمۂ ''بئس'' ہے۔ اور ضمیر ﴿ مَنْ ﴾ کی طرف راجع ہے بہ اعتبارِ لفظ۔ یا جدال کی طرف جو ﴿ يُجَادِلُوْنَ ﴾ سے سمجھا جاتا ہے، یعنی وہ مسرف و مرتاب لوگ ازروئے بغض کے بڑے ہیں یا برے ہیں۔ یا بغض کے طور پر ان کا جدال برا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا بغض یا ان کے جدال کا بغض اللہ کے اور مومنوں کے نزدیک بڑا ہے یا برا ہے۔ اللہ پاک کا ان سے بغض کرنا تو اُن کی مذمت کرنا اور ان کو لعنت کرنا اور ان پر عذاب نازل کرنا ہے اور مومنین کا بغض یہ ہے کہ ان سے بہت زیادہ دشمنی رکھنا اور حد درجہ کراہت کرنا ہے۔

﴿ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴾ یعنی ان مسرف، مرتاب اور مجادل لوگوں کے دلوں پر نہایت محکم و مضبوط گمراہی کی مہر لگائی ہے کہ باوجود روشن دلیلوں کے بغیر دلیل کے ان کو باطل کرنے میں جھگڑتے ہیں، ویسے ہی اللہ ہر متکبر اور جبار کے دل پر مہر لگاتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ ﴾ اللہ پاک کے کلام کی ابتداء ہے۔ مومن کا کلام تو ﴿ مُّرْتَابٌ ﴾ تک مکمل ہوگیا، اس بنا پر ﴿ الَّذِيْنَ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ كَبُرَ ﴾ خبر ہے بنا بر حذفِ مضاف ''أَيْ: جِدَالُ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا''، امام محلی رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے اور امام ابو حیان رحمہ اللہ نے بحر میں اس کو زیادہ صحیح کہا ہے۔[2] امام جمل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ان دس اعرابوں کا، جن کو امام سمین رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، اولیٰ واحسن ہے۔ قاضی نے اس کو بہ لفظِ ''یجوز'' ''جائز ہے'' ادا کیا ہے۔[3] یا خبر ﴿ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ ﴾ ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''الَّذِيْنَ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٠٤)

[2] تفسير الجلالين (٦٢٢/١) البحر المحيط (٤٤٥/٧) [3] تفسير البيضاوي (٩٣/٥)

يُجَادِلُوْنَ فِيْ آيَاتِ اللّٰهِ كَائِنُوْنَ أَوْ مُسْتَقِرُّوْنَ فِيْ غَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ"۔ اور ﴿ كَبُرَ ﴾ کا فاعل ﴿ كَذٰلِكَ ﴾ ہے۔ "أَيْ: كَبُرَ مَقْتًا مِثْلَ ذٰلِكَ الْجِدَالِ الْقَبِيْحِ"

اب ﴿ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴾ کلامِ مستانف ٹھہرے گا، اس سے غرض اس شے کا بتانا ہے جو ان کے جدال کا سبب ہوئی، وہ شے یہی اللہ پاک کا ان کے دلوں پر مہر کرنا ہے۔ چنانچہ بجائے "عَلٰى قُلُوْبِهِمْ" کے ﴿ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴾ رکھا، تاکہ تکبر و تجبر کی ان پر تسجیل ہو جائے اور مہر لگانے کی علت معلوم ہو جائے۔ ان کے جدال کا موجب تو مہر کرنا ہوا اور مہر کرنے کی علت ان کا تکبر اور تجبر ہوا۔ وہ تکبر اور تجبر نہ کرتے تو مہر نہ ہوتی اور مہر نہ ہوتی تو جدال نہ کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس دل میں تکبر و تجبر گھر کر لیتا ہے، اس پر گمراہی کی مہر لگ جاتی ہے، پھر اس میں کوئی خیر گھسنے نہیں پاتی۔ اس کا یہی کام ہوتا ہے کہ اللہ پاک کی کھلی اور واضح باتوں میں بلا دلیل اندھا دھند جھگڑتا رہتا ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ ﴾ سے مراد یہود ہیں۔ فتح القدیر وغیرہ میں ایک یہ وجہ لکھی ہے کہ ﴿ الَّذِيْنَ ﴾ مبتداء اور ﴿ يَطْبَعُ ﴾ خبر ہے۔[1] لیکن اس کی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ واللّٰه أعلم.

جمہور نے یوں پڑھا ہے کہ قلب کو متکبر کی طرف مضاف کیا ہے۔ امام ابو حاتم اور ابو عبید رحمہ اللہ نے یہ قراءت پسند کی ہے۔ تقدیر یہ ہے: "كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ"۔ دوسرے لفظ ﴿ كُلِّ ﴾ کو بہ سبب دلالت اول کے حذف کر دیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک تمام متکبرین اور جبارین کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔ ابو عمرو وغیرہ (یعنی ابن محیصن، ابن ذکوان من اہل الشام) نے بہ تنوینِ "قلب" پڑھا ہے، اس بنا پر کہ "متکبر" "قلب" کی صفت ہے، چنانچہ قلب سے مراد جملہ (سب کے سب) اعضاء ہو گا، اس لیے کہ قلب تکبر کی جگہ ہے اور اس بارے میں باقی اعضاء اس کے تابع ہیں۔ یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ ﴾ پڑھا ہے۔[2]

امام زمخشری رحمہ اللہ کے نزدیک دوسری قراءت کی تقدیر یہ ہے: "عَلٰى كُلِّ ذِيْ قَلْبٍ مُتَكَبِّرٍ" صفت کو صاحبِ قلب کے لیے ٹھہرایا ہے۔[3] شیخ نے کہا (شاید شیخ سے مراد امام ابو حیان رحمہ اللہ ہیں۔ واللّٰه أعلم) کہ حذف کے اعتبار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔[4] صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بلکہ یہاں حذف کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ حذف ماننے سے دونوں قراءتیں باہم موافق ہو جائیں گی[5] (اسی طرح سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت سے بھی موافقت ہو جائے گی)۔ اس لیے کہ دونوں میں موصوف ایک ہو جائے گا، یعنی صاحبِ قلب۔ بہ خلاف عدمِ تقدیر کے کہ ایک میں تو موصوف قلب ہو گا اور دوسرے میں صاحبِ قلب۔ اسی طرح امام جمل رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ

[1] فتح القدير (٦٤٧/٤) [2] تفسير القرطبي (٣١٣/١٥، ٣١٤) [3] الكشاف (١٧١/٤)
[4] البحر المحيط (٤٤٦/٧) [5] فتح البيان (١٨٩/١٢)

فرماتے ہیں کہ ﴿ كُلِّ ﴾ کا کلمہ دونوں قراءتوں کی بنا پر سارے قلب کے لیے عمومِ ضلال کے لیے ہے۔[1] یعنی گمراہی نے اس کے دل کے سارے اجزاء کو گھیر لیا ہے، کوئی جگہ اس میں ہدایت پانے کے قابل نہیں ہے۔

امام حفناوی رحمہ اللہ نے اس پر یوں اعتراض کیا کہ یہ کاری گری تو "كُلّ" کو اس کے موضوع سے نکالنا ہے، وہ یہ ہے کہ "كُلّ" جب مطلقاً نکرہ پر داخل ہو، یا داخل ہو جمع معرفہ پر تو عمومِ افراد کے لیے ہوتا ہے اور جب معرفہ مفرد پر داخل ہو تو عمومِ اجزاء کے لیے ہوتا ہے اور اس جگہ نکرہ پر داخل ہوا ہے تو حق اس کا یہ ہے کہ عمومِ افراد کے لیے ہو نہ عمومِ اجزا کے لیے، جیسے کہ شارح راہ چلے ہیں۔ فَلْيُتَأَمَّل. اگرچہ قاعدہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ امام حفناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، لیکن چونکہ یہاں لفظ ﴿ كُلِّ ﴾ ﴿ قَلْبِ ﴾ پر داخل ہوا ہے اور اس سے پہلے طبع کا ذکر ہے، اس لیے طبع کا مفہوم اسی کا مقتضی ہے کہ عمومِ اجزائے قلب مراد ہو، کیوں کہ جب کسی دل پر گمراہی کے ساتھ مہر کر دی گئی تو وہ گمراہی اس کے سارے اجزاء کو عام ہو گئی، اب کوئی جز ایسا نہ بچا کہ ہدایت کے قابل ہو۔ واللہ أعلم.

بالجملہ فرعون نے جب مردِ مومن کا وعظ سنا تو اس کے قبول کرنے سے منہ پھیرا اور نفرت کی، اس لیے کہ اس کے دل پر تو گمراہی کی مہر لگ چکی تھی۔ وہ اپنے تکبر اور تجبر کی طرف رجوع ہوا اور کہا: ﴿ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا ﴾ یعنی اے ہامان! میرے لیے ایک قصرِ مشید، پختہ اور محکم محل بنا۔ جس طرح کہ اس کی تفسیر سورۃ القصص میں گزر چکی ہے۔[2] کسی نے کہا کہ ﴿ صَرْحًا ﴾ سے مراد ظاہری عمارت ہے جو ناظرین سے پوشیدہ نہ رہے، اگرچہ وہ دور ہو۔ اسی معنی سے یہ ہے کہ جب کوئی شے ظاہر ہوتی ہے تو محاورے میں بولتے ہیں: "صَرَحَ الشَّيْءُ"، یعنی وہ شے ظاہر ہوئی۔ مصباح میں ہے: "اَلصَّرْحُ بَيْتٌ وَاحِدٌ يُبْنٰى مُفْرَدًا طُوْلًا ضَخْمًا"[3] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: صرح قصر ہے یا صحنِ خانہ یا بلاط جو شیشے سے بنایا جاتا ہے۔ (بلاط وہ پتھر ہیں جو گھر کے صحن میں بچھائے جاتے ہیں)۔ اس کی اصل تصریح سے ہے اور تصریح بہ معنی کشف ہے۔ ﴿ لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴾ شاید میں اسباب کو پہنچوں، یعنی ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف راہوں کو۔ امام قتادہ، زہری، سدی اور اخفش رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ "أسباب" سے مراد ابواب ہیں،[4] یعنی اس کے دروازے جو اس کی طرف موصل ہیں، یعنی ملانے والے ہیں۔ ﴿ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ ﴾ اسباب کا بیان ہے، اس لیے کہ شے جب ابہام کی جاتی ہے پھر تفسیر کی جاتی ہے تو نفوس میں زیادہ ترجمتی ہے اور اس کی شان زیادہ تر بڑی اور بزرگ ہوتی ہے۔ یا ﴿ الْاَسْبَابَ ﴾ سے بدل ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر کے وقت زہیر کا یہ بیت پڑھا:

وَمَنْ هَابَ أَسْبَابَ الْمَنَايَا يَنَلْنَهٗ ... وَلَوْ رَامَ أَسْبَابَ السَّمَاءِ بِسُلَّمِ[5]

---

[1] تفسیر الجلالین (۶۲۲/۱) [2] رقم الآیة (۳۸) [3] المصباح المنیر (۱۷۶/۱)

[4] تفسیر القرطبي (۳۱۴/۱۵) [5] تفسیر القرطبي (۳۱۴/۱۵)

یعنی جو کوئی موتوں کے اسباب سے ڈرے تو وہ اس کو پہنچیں گے، اگر چہ زینے کے ساتھ آسمان کے دروازوں کا قصد کرے۔ مطلب یہ ہے کہ ﴿ اَلْاَسْبٰبَ ﴾ بہ معنی ابواب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَسْبٰبَ السَّمٰوٰتِ ﴾ وہ امور ہیں جن سے تمسک کیا جاتا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْاَسْبٰبَ ﴾ سے مراد طرق (راستے) اور ابواب ہیں اور وہ شے جو اُن کی طرف لے جائے اور ہر شے جو تجھے کسی شے کی طرف پہنچا دے تو وہ اس کی طرف سبب ہے۔[1] مثلاً: رسی اور ڈول پانی بھرنے کے سبب ہیں۔ قلم، دوات اور کاغذ لکھنے کے سبب ہیں۔

﴿ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى ﴾ جمہور نے بہ رفع پڑھا ہے ﴿ اَبْلُغُ ﴾ پر عطف کیا ہے، اس بنا پر یہ ترجی کے تحت میں داخل ہے۔ معنی یہ ہیں کہ شاید میں اسبابِ سماوات کو پہنچوں اور شاید میں اس کے بعد مطلع ہوں، یعنی موسیٰ کے معبود کی طرف نظر کروں اور اس کے حال پر اطلاع پاؤں۔ امام اعرج سلمی رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی عیسیٰ بن عمر اور حفص رحمہما اللہ) نے بہ نصب پڑھا ہے، اس لیے کہ ﴿ ابْنِ لِيْ ﴾ کے حکم کا جواب ہے، یہ بصریوں کی رائے ہے بنا بر جواب ترجی، جیسا کہ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے اور یہ کوفیوں کی رائے ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نصب کے معنی رفع کے معنی کے خلاف ہیں، اس لیے کہ نصب کے معنی یہ ہیں کہ جب میں اسباب کو پہنچوں گا تو مطلع ہو جاؤں گا۔[2] اس کے سوا اور کچھ بھی کہا ہے، اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ فرعون بڑا ہی جاہل تھا اور اشیاء کی حقیقت کو سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔

﴿ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ﴾ یعنی اور بے شک میں البتہ موسیٰ کو اس دعوے میں جھوٹا گمان کرتا ہوں کہ اس کا میرے سوا ایک معبود ہے جو آسمانوں سے اوپر عرش پر مستوی ہے۔ یا وہ رسالت میں جھوٹا ہے جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے۔ فرعون نے جو یہ بات کہی تو مکاری اور ملمع کاری کے لیے اور اپنی قوم کو خلط ملط کرنے کے لیے کہی، ورنہ وہ تو حقیقتِ الٰہ کو جانتا پہچانتا اور اعتقاد رکھتا تھا کہ وہ کسی جہت میں نہیں ہے، یعنی اسے علم تھا کہ وہ صحیح راستے پر نہیں ہے، لیکن اس نے اپنی قوم پر خلط ملط کرنے کا ارادہ کیا، تاکہ اس کو ان کے کفر پر باقی رہنے کا وسیلہ بنائے۔ گویا وہ یوں کہتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کا معبود موجود ہوتا تو اس کے لیے کوئی محل ہوتا تو اس کا محل زمین ہوتی یا آسمان اور ہم نے اس کو زمین میں نہ دیکھا تو اب یہ باقی رہا کہ وہ آسمان میں ہو اور آسمان کی طرف بغیر زینے کے پہنچ نہیں سکتے۔ (كذا قاله الحفناوي)

یہ تو سن چکے اب ذرا شیخ محی الدین محشی بیضاوی شریف کا واضح بیان سنو، تاکہ آیت کا مطلب ذہن میں خوب جم جائے۔ فرماتے ہیں: اگر پہلے ہی سے یوں کہہ دیا جاتا کہ "لَعَلِّيْ أَبْلُغُ أَسْبَابَ السَّمٰوَاتِ"، تو مقصد پورا ہو جاتا، مگر فرعون نے اول تو اسباب کا ذکر بطور ابہام کیا، پھر ان کو ﴿ اَسْبٰبَ السَّمٰوٰتِ ﴾ سے دو فائدوں کے لیے واضح کیا: پہلا فائدہ تو اسباب کی عظمت کو ظاہر کرنا ہے جن کے پاس پہنچنے کی اس نے آرزو کی، اس لیے کہ کسی شے کی

---

[1] تفسير النسفي (٧٤/٤، ٧٥) [2] تفسير القرطبي (٣١٥/١٥) فتح القدير (٦٤٦/٤)

وضاحت جو اس کے ابہام کے بعد ہوتی ہے تو وہ اس کی شان کے اظہار کے لیے ہوتی ہے اور اس کی عظمت اور جلالت کو ظاہر کرنے کے لیے اور اس سے آگاہ کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سننے والا اسباب کی معرفت حاصل کرنے کا مشتاق ہو جائے، کیوں کہ جس شے کو نفس نہیں پہنچتا، اس شے کی بہت زیادہ آرزو رکھتا ہے۔ چنانچہ اسباب کا ذکر مبہم کیا، تاکہ اسباب سے جو مراد ہے، اس کو جاننے کے لیے ہامان کے نفس میں شوق پیدا ہو، پھر اُن کی توضیح کر دی، تاکہ ان کا وارد کرنا ایسے نفس پر ہو جو بیدار، ہوشیار اور اس بات کا مشتاق ہو چکا ہو کہ ان کی معرفت حاصل ہو جائے، تاکہ ان کے وارد کرنے کا مقصد حاصل ہو جائے۔

فرعون نے جو ہامان کو قصر بنانے کا حکم دیا تو ظاہر یہ ہے کہ اس نے کچھ یہ ارادہ نہیں کیا کہ وہ اس کے لیے کوئی بلند عمارت بنائے، جس سے وہ آسمان کی طرف چڑھے، کیوں کہ فرعون ان دیوانوں میں سے نہ تھا، جو اس کے ناممکن ہونے کو بالبداہت نہیں جانتے، ورنہ اللہ پاک کی طرف سے یہ بات صحیح نہ ہوتی کہ وہ اس کی طرف کوئی رسول بھیجے اور اس کو اس پر ایمان لانے اور اس کے حکم کی بجا آوری کا مکلّف کرے اور اس کی طرف سے یہ حکایت فرمائے کہ اس کی طبیعت سخت ہے اور اسراف میں اس کو علو ہے اور ہمارا یہ کہنا کہ اس بات کا امتناع بالبداہت معلوم ہے تو اس لیے کہ ہر کوئی یہ بات بالبداہت جانتا ہے کہ انسان کی قدرت میں یہ نہیں ہے کہ وہ ایسا محل بنائے جو سب سے بلند پہاڑ سے بھی بلند ہو اور جو شخص آسمان کی طرف نظر کرے، اس پہاڑ کے نیچے سے جو بلند ترین پہاڑ ہے، پھر اس پہاڑ کی چوٹی سے آسمان کی طرف نظر کرے تو وہ آسمان کی نسبت میں اپنی طرف کسی طرح کا فرق نہ پائے گا، اس طرح سے کہ ایک حالت میں آسمان اس کے زیادہ قریب ہو بہ نسبت اس کی دوسری حالت مین۔ باوجود اس علم کے کوئی عقل مند کیسے اس بات کا ارادہ کرے گا کہ ایک ایسا مکان بنائے جس سے آسمان کی طرف چڑھ جائے تو اب اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی طرف ایسے ارادے کی نسبت کی جائے، اگرچہ بعض مفسر اس طرف گئے ہیں کہ فرعون نے محل بنانے کا قصد کیا اور اس کی بنیاد کی کیفیت میں ایک طویل حکایت ذکر کی ہے۔

چوں کہ بعض کا یہ قول نہایت بعید تھا، اس لیے قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ میں دو وجہیں ذکر کی ہیں: پہلی یہ ہے کہ "صرح" سے فرعون کی مراد اونچی جگہ میں رصد ہے، یعنی چبوترہ ہے اور "أسباب" سے مراد تارے ہیں جو اسبابِ سماوی ہیں، جن سے زمینی حوادث کی اطلاع کے لیے توصل کیا جاتا ہے۔

اس کا الٰہِ موسیٰ پر مطلع ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ اس پر مطلع ہو کہ آیا اس نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا ہے یا نہیں۔[1]

دوسری وجہ یہ ہے کہ فرعون دہریہ فرقہ میں سے تھا۔ دہریہ پہلے لوگوں کا ایک فرقہ ہے جو لوگ صانع، مدبرِ عالم، قادر کے منکر ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ عالم ہمیشہ سے اسی طرح موجود چلا آیا ہے، اس کے بغیر کہ کسی بنانے والے کی

[1] تفسير البيضاوي (٩٣/٥)

طرف اس کی نسبت کی جائے جو اس سب عالم سے خارج اور ماورا ہو اور مثلاً حیوان نطفہ سے اور نطفہ حیوان سے ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ لوگ زندیق ہیں اور فرعون انہی میں سے تھا۔ اس کلام سے اس کی غرض نفیِ صانع میں شبہہ وارد کرنا ہے، وہ صانع جو معبودِ عالم ہے۔ اس کی تقریر یہ ہے کہ ہم کو ایسی کوئی شے نظر نہیں آتی، جس کو الٰہِ عالم کہیں، پھر ہم اس شے کے وجود کا اقرار کیسے کریں جس کو ہم نے دیکھا ہی نہیں۔ ہم جو اس کو دیکھتے نہیں ہیں تو اس لیے کہ اگر وہ موجود ہوتا تو آسمان میں ہوتا اور جو شے آسمان میں ہے اس کو زمین والے آسمان پر چڑھے بغیر نہیں دیکھ سکتے اور آسمان پر چڑھنے کی ہم کو کوئی راہ نہیں ہے، اس لیے ہمارے لیے اس معبود کو دیکھنے کی کوئی راہ نہیں جو موسیٰ علیہ السلام کا رب ہے اور اس کے وجود کا اقرار کرنا صرف اس شخص کی تقلید کے طور پر ہے جس کو ہم جانتے نہیں کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا۔

پھر فرعون نے اس بات کے بیان کرنے میں مبالغہ کرنا چاہا کہ آسمان کی طرف چڑھنا ممکن نہیں ہے، اس لیے اس نے ہامان کو حکم دیا کہ اس کے لیے ایک محل بنائے، جس سے وہ آسمان کی طرف چڑھے، تا کہ اس کے بعد وہ اپنے عاجز ہونے کا اعتراف کرے، اس کے باوجود کہ اس کے پاس زمین والوں میں سے سب سے زیادہ وسائل اور قدرت موجود ہیں۔ اس طرح آسمان کی طرف چڑھنے کا ناممکن ہونا ثابت ہو جائے اور اس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ الٰہِ عالم کو نہ ہی دیکھا جا سکتا ہے اور نہ محسوس کیا جا سکتا ہے، حالاں کہ یہ شبہہ فاسد ہے، کیوں کہ علم کے تین ذریعے ہیں: حسِ سلیم، خبرِ صادق اور نظرِ عقل اور یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حس سے نہیں کی جا سکتی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی معرفت بالکل ہی ممکن نہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ بات کہہ دی کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی طرف جو راہ ہے وہ یہی آثار کے ساتھ نظر اور استدلال ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢٦] ”وہ تمھارا اور تمھارے اگلے باپ داداؤں کا پروردگار ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ﴾ [المزمل: ٩] ”وہ مشرق ومغرب کا پروردگار ہے۔“ مگر فرعون نے اپنے مکر اور خباثت کے سبب سے اس سے تغافل کیا اور جاہلوں کو یہ شبہہ ڈالا کہ جب اس معبود کے احساس کی طرف راہ منتفی ہے، یعنی جب اسے محسوس نہیں کیا جا سکتا تو اس کی نفی کرنا واجب ہے اور ایسے شخص کی تکذیب کرنا ضروری ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس کی طرف سے رسول ہے۔

﴿ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴾ یعنی جس طرح کہ شیطان نے فرعون کو یہ بات اچھی کر دکھائی کہ جاہلوں کو گمراہ کرنے کے لیے قولِ مذکور کہا، اسی طرح اس کو اس کا برا کام اچھا کر دکھایا، یعنی شرک و تکذیب۔ اور شیطان نے ہدایت کی راہ سے اس کو روکا اور وہ گمراہی میں بڑھتا رہا اور طغیان اور سرکشی پر جما رہا اور موسیٰ علیہ السلام کی آیات کو باطل کرنے میں فرعون کا مکر و فریب صرف خسارہ ہی خسارہ

تھا اور اس کو ہلاکت میں ڈالنے والا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ تَبَابٍ ﴾ بہ معنی خسران ہے،[1] یعنی نقصان وزیاں۔ اس معنی سے ﴿ تَبَّتْ يَدَآ أَبِيْ لَهَبٍ ﴾ [تبت: ١] ''ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔'' ہے۔

جمہور نے ''صَدَّ'' کو بہ فتح صاد و دال پڑھا ہے، یعنی فرعون نے لوگوں کو راہِ ہدایت سے روکا (اس بنا پر ''صَدَّ'' متعدی ہے اس کا مصدر ''صَدٌّ'' ہے۔ یا وہ راہِ ہدایت سے خود رکا، اس بنا پر کہ ''صد'' لازم ہو۔ لازم کا مصدر صدود ہے۔[2] كما أفاده النسفي) کوفیوں نے بہ ضم صاد بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ امام ابوعبیدہ اور ابوحاتم رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ شاید اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ زُيِّنَ ﴾ میں جو قراء کا صیغۂ مجہول ہونے پر اجماع ہے تو یہ اس کے مطابق ہے۔ یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ یحییٰ بن وثاب اور علقمہ رحمہ اللہ نے ''صِدَّ'' بہ کسرِ صاد پڑھا ہے اور امام ابن اسحاق اور عبدالرحمان بن ابی بکر رحمہ اللہ نے بہ فتح صاد وضمِ دال تنوین کے ساتھ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مصدر ہے، ﴿ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ ﴾ پر معطوف ہے۔ ''أَيْ: زَيَّنَ لَهُ الشَّيْطَانُ سُوْءَ الْعَمَلِ وَالصَّدَّ''[3]

اپنے وسوسے کے سبب سے زینت دینے والا شیطان ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ ﴾ [النمل: ٢٤] ''شیطان نے ان کے کام انھیں بھلے کر کے دکھا کر صحیح راہ سے روک دیا ہے۔'' یا زینت دینے والا اللہ پاک ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [النمل: ٤] ''ہم نے انھیں ان کے کرتوت زینت دار کر دکھائے ہیں چنانچہ وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔'' معتزلہ نے چونکہ تزئین وصد کی نسبت اللہ پاک کی طرف کرنے کا انکار کیا تو کہا کہ مزین اور صاد شیطان ہی ہے۔ اور ہم یوں کہتے ہیں کہ اگر فرعون کے لیے مزین شیطان ہی ہو تو شیطان کے لیے مزین اگر اَور شیطان ہو۔ ''لَا إِلَى النِّهَايَةِ'' تو شیاطین میں تسلسل لازم آئے گا یا دَور، حالاں کہ یہ باطل ہے اور جب یہ باطل ہوا تو اسباب ومسببات کا انتہا واجب الوجود کی طرف واجب ہوا اور اللہ ہی حقیقی فاعل ہے۔ آیتِ مذکور میں تزئین کی نسبت جو شیطان کی طرف کی ہے تو اس لحاظ سے کہ اس کو اپنے وسوسے کے سبب سے دخل ہے۔ غرضیکہ مردِ مومن نے پھر وعظ ونصیحت اور ڈرانے کی طرف رجوع کیا، جس طرح کہ اللہ پاک نے اس کی طرف سے بیان فرمایا ہے:[4]

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝۳۸
يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ
دَارُ الْقَرَارِ ۝۳۹ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ

[1] تفسير الطبري (٣٨٨/٢١)
[2] تفسير النسفي (٧٥/٤)
[3] تفسير القرطبي (٣١٥/١٥) فتح القدير (٦٤٦/٤)
[4] فتح البيان (١٨٥/١٢_١٩١)

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾

اور جو شخص ایمان لایا تھا، اس نے کہا: اے میری قوم! تم میری پیروی کرو میں تمھیں بھلائی کا راستہ بتاؤں گا ﴿38﴾ اے میری قوم! یہ دنیاوی زندگی تو بس (تھوڑا سا) فائدہ اُٹھانا ہے اور بے شک آخرت ہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے ﴿39﴾ جس نے کوئی برائی کی تو اسے بس اس کے برابر ہی بدلہ دیا جائے گا اور جس نے کوئی نیک کام کیا وہ مرد ہو یا عورت، جب وہ مومن ہو، تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے، وہاں انھیں بے حساب رزق دیا جائے گا ﴿40﴾

آلِ فرعون کے مومن کا مزید وعظ ونصیحت

مردِ مومن اپنی قوم کے لوگوں سے کہتا ہے، وہ لوگ جو متمرد و سرکش ہو کر دنیا کی زندگی کو اختیار کیے بیٹھے ہیں اور جبارِ اعلیٰ کو بھول گئے ہیں کہ اے قوم! تم میری راہ چلو، میں تم کو نیکی کی راہ پر پہنچا دوں، فرعون کی طرح نہیں جس نے اپنے اس کہنے میں جھوٹ کہا: ﴿ وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ﴾ ''اور میں تو تمھیں بھلائی کی راہ ہی بتلا رہا ہوں۔'' پھر فرعون نے ان کو دنیا میں مشغول کیا اور وہ اس کو آخرت پر اختیار کر بیٹھے اور ان کو موسیٰ علیہ السلام، جو اللہ کے رسول تھے، کی تصدیق سے باز رکھا۔

چنانچہ مردِ مومن نے کہا کہ اے قوم! یہ دنیا کی زندگی تو قلیل ہے اور زائل اور فنا ہو جانے والی ہے، عن قریب جاتی رہے گی اور آخرت ہی اصل مستقل ٹھکانا ہے، جس کو نہ کسی طرح کا زوال ہے نہ اس سے کسی طرح سے کسی اور طرف منتقل ہو سکیں گے، نہ ہی وہاں پر موت ہو گی، بلکہ وہ تو سراسر نعمتوں کی زندگی ہے، یا نارِ جہنم کی۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے کہ جس نے برائی کی تو وہ اس کے برابر بدلا پائے گا، یعنی اس کی طرح اور جس نے بھلائی کی ہے، وہ مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان رکھتا ہو تو وہ لوگ جنت میں جائیں گے اور وہاں بے شمار روزی پائیں گے، یعنی جزا کے ساتھ اس کا اندازہ نہ کیا جائے گا، بلکہ اللہ عزوجل اس کو اتنا زیادہ ثواب دے گا جو نہ تمام ہو اور نہ ختم ہو۔ واللّٰہ تعالٰی ھو الموفق للصواب۔[1] (کذا في ابن کثیر) اللہ پاک ہمیں اور آپ کو عملِ صواب کی توفیق دے۔ صواب یہ ہے کہ عمل موافقِ سنت ہو اور اخلاص کے ساتھ ہو، اس سے خاص اللہ پاک کی ذات مقصود ہو ریا وسمعہ یا اور کوئی غرض نہ ہو، ایسے عمل کا ثواب بے حساب ملتا ہے۔ اللھم وفقنا، آمین.

[1] تفسیر ابن کثیر (۱۰۱/٤، ۱۰۲)

فتح البیان کا بیان:

زیادہ صحیح یہ قول ہے کہ یہ آیت من جملہ قولِ مردِ مومن ہے۔ کسی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے قول سے ہے۔ ﴿اتَّبِعُوْنِ﴾ مصحف میں بغیر یاء واقع ہوا ہے اور اسی طرح امام ابو عمرو اور نافع رحمہما اللہ نے وقف میں بہ حذفِ یاء اور وصل میں بہ اثباتِ یاء پڑھا ہے اور یعقوب اور ابن کثیر رحمہما اللہ نے وصل و وقف میں بہ اثباتِ یاء اور باقی قراء نے وصل و وقف میں بہ حذفِ یاء۔ اثبات وحذفِ یاء دونوں قراءتِ سبعیہ ہیں۔ یہ اثبات وحذف تو لفظی لحاظ سے ہے اور لکھنے میں محذوف ہی ہے، اس لیے کہ یاءاتِ زواید سے ہے۔ چنانچہ جس نے یاء کو ثابت رکھا ہے تو بنا بر اصل ہے اور جس نے حذف کیا ہے تو اس لیے کہ وہ مصحف میں محذوف ہے۔ ﴿الرَّشَادِ﴾ کو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بہ تشدیدِ شین پڑھا ہے، چنانچہ عن قریب فرعون کے قول میں گزر چکا ہے۔[1] معنی یہ ہیں: اے قوم! تم دین میں میری اقتداء کرو اور میری نصیحت پر عمل کرو تو میں تم کو ہدایت اور صواب کی راہ پر پہنچا دوں گا۔

"رشاد" "غي" کی ضد ہے۔ "غي" کے معنی گمراہی ہے۔ اس میں تعریض شبیہ بہ تصریح ہے، اس طرف کہ فرعون اور اس کی قوم جس راہ پر ہیں وہ گمراہی کی راہ ہے۔ ﴿مَتَاعٌ﴾ کی تنوین تقلیل کے لیے ہے، یعنی اے قوم! یہ جو دنیا کی زندگی ہے، یہ ایک ذرا سی برتنے کی شے ہے جس کو چند دن استعمال کر لیا جاتا ہے، پھر وہ منقطع اور زائل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی طرف جھکنا شر کی اصل اور فتنوں کا منبع ہے اور ہر بلا اور آفت کا سر ہے۔ اور آخرت کا گھر یہی ثابت رہنے والا اور قرار والا ہے۔ چنانچہ اس سے کسی طرح کا انتقال نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو دائم ہے منقطع نہ ہو گا اور ہمیشہ رہنے والا ہے زائل نہ ہو گا اور باقی رہنے والی چیز فنا ہونے والی چیز سے بہتر ہے۔ بعض عارفین نے فرمایا ہے کہ اگر دنیا سونا فانی ہوتی اور آخرت خزفِ باقی (باقی رہنے والی ٹھیکری) تو بھی آخرت دنیا سے بہتر ہوتی، پھر وہ کیوں بہتر نہ ہو گی، حالاں کہ دنیا تو خزفِ فانی ہے اور آخرت سونا باقی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دنیا سات ہزار برس کا آخرت کے جمعوں سے ایک جمعہ ہے۔[2] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک حیاتِ دنیا ایک متاع ہے اور اس کی متاع میں صالح عورت سے زیادہ افضل کوئی شے نہیں ہے کہ جب تو اس کی طرف نظر کرے تو وہ تجھے خوش کر دے اور جب تو اس سے غائب ہو تو وہ اپنی جان اور مال میں تیری حفاظت کرے۔[3] ﴿مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا ... الخ﴾ مردِ مومن کے کلام میں سے ہے، یعنی جو کوئی دنیا میں گناہوں میں سے کوئی سا گناہ کرے تو وہ جزا نہ دیا جائے گا مگر مثل اس کے اور عذاب نہ دیا جائے گا مگر اس کے

---

[1] تفسير القرطبي (٣١٧/١٥) فتح القدير (٦٤٧/٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٦٦/١٠) [3] الدر المنثور (٢٨٩/٧)

مطابق۔ آیت کے ظاہر میں ہر وہ شے داخل ہے جس پر اسم سیئہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شرک کے ساتھ خاص ہے، حالاں کہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جس نے کوئی عملِ صالح کیا ہو؛ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ عملِ صالح کرنے والا مومن بھی ہو، یعنی وہ اللہ پر اور اس شے پر ایمان لانے والا ہو جس کو اس کے رسول لائے تو یہ لوگ جنھوں نے ایمان اور عملِ صالح کو جمع کیا، جنت میں داخل ہوں گے، وہاں رزقِ واسع دیے جائیں گے، یعنی بغیر اندازے اور حساب کتاب کے رزق دیے جائیں گے۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان پر کسی طرح کا مواخذہ نہ ہوگا اس خیر میں جو اُن کو جنت میں عطا کی جائے گی۔[1] کسی نے کہا ہے کہ عملِ صالح سے مراد "لا إله إلا الله" ہے۔ جمہور نے ﴿يَدْخُلُوْنَ﴾ کو بہ فتحِ یائے تحتیہ بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی امام ابن محیصن، ابو عمرو، یعقوب اور ابو بکر عن عاصم رحمہم اللہ) نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے،[2] یہ دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ پھر مردِ مومن نے دوبارہ اپنی قوم کو اللہ پاک کی طرف بلایا اور اپنے ایمان کی تصریح کی اور اگلی راہیں نہ چلا، وہ راہیں یہ تھیں کہ اپنی قوم کے وہم میں یہ بات ڈالتا تھا کہ وہ انھی میں سے ہے اور اُن کو جو وعظ و نصیحت کر رہا ہے تو صرف اس خوف سے کہ جس بات کی موسیٰ علیہ السلام ان کو وعید سناتے ہیں کچھ اس میں سے کہیں ان کو پہنچ جائے جس طرح کہ کوئی آدمی جو دوست ہو، وہ اپنی قوم کو اس شے میں واقع ہونے سے ڈراتا ہے جس میں ان کے واقع ہونے کا اسے خوف ہوتا ہے۔ اب کی بار ایسا نہ کیا، بلکہ صراحت کے ساتھ اپنے ایمان کا ذکر کر دیا۔[3] چنانچہ کہا:

وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۝41
تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ
عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝42 لَا جَرَمَ اَنَّمَا
تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ
وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝43
فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝44 فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ
بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْۗءُ الْعَذَابِ ۝45ۚ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا

---

[1] تفسير البغوي (۱۴۹/۷) [2] تفسير القرطبي (۳۱۷/۱۵) [3] فتح البيان (۱۲/۱۹۲۔۱۹۳)

غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝

اور اے میری قوم! مجھے کیا ہے کہ میں تو تمھیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف بلاتے ہو (41) تم مجھے بلاتے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کروں اور اس کے ساتھ ایسی چیزیں شریک ٹھہراؤں جن کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں اور میں تمھیں نہایت غالب، خوب بخشنے والے کی طرف بلاتا ہوں (42) یقینی بات ہے کہ تم مجھے جس کی طرف بلاتے ہو، وہ نہ تو دنیا میں پکارے جانے کے قابل ہے اور نہ آخرت میں اور بلاشبہ ہماری واپسی اللہ ہی کی طرف ہے اور بلاشبہ حد سے بڑھنے والے ہی دوزخی ہیں (43) لہٰذا تم عنقریب ان باتوں کو یاد کرو گے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، بلاشبہ اللہ بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے (44) پھر انھوں نے جو مکر وفریب کیا تھا، اللہ نے اس کی برائیوں سے اس (ایمان دار) کو بچا لیا اور آلِ فرعون کو بُرے عذاب نے گھیر لیا (45) (وہ دوزخ کی) آگ ہے جس پر انھیں صبح و شام پیش کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت قائم ہو گی (کہا جائے گا:) آلِ فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو (46)

مومن آلِ فرعون کا اختتامی خطاب اور فریقین کا انجام:

یہ جو کہا کہ تم مجھے دوزخ کی طرف بلا رہے ہو، یہ اپنے اوپر رکھ کر کہا اور ان کو سنایا۔ آگ کے سامنے صبح و شام لائے جاتے ہیں۔ یہ عالمِ قبر کا حال ہے، کافر کو اس کا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے اور قیامت کو اس میں داخل کیا جائے گا اور مومن کو بہشت میں داخل کیا جائے گا۔ انتہیٰ۔

مومن کہتا ہے کہ میرا کیا حال ہے کہ میں تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں، یعنی اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کی طرف اور اس کے رسول ﷺ کی طرف تم کو دعوت دیتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف بلاتے ہو کہ میں اللہ کا منکر ہو جاؤں اور بے جانے بوجھے اور بغیر کسی دلیل کے اس کا شریک ٹھہراؤں جس کی مجھے خبر نہیں۔ نیز میں تم کو اس ذات پاک کی طرف بلاتا ہوں جو اپنی عزت، غلبہ، کبریائی اور بزرگی کے باوجود اس شخص کے گناہ بخش دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع ہو۔ امام سدی اور ابن جریر رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَا جَرَمَ ﴾ بہ معنی "حَقًّا" ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: "لا کذب"، علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول روایت کیا ہے: "بَلٰىٓ اِنَّ الَّذِيْ

تَدْعُوْنَنِيْ إِلَيْهِ مِنَ الْأَصْنَامِ وَالْأَنْدَادِ لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ"[1] یعنی ہاں سچی اور پکی بات یہ ہے کہ بے شک جن بتوں اور شریکوں کی طرف تم مجھے بلاتے ہو ان کا بلاوا نہیں دنیا میں نہ آخرت میں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "اَلْوَثَنُ لَيْسَ لَهُ شَيْءٌ" یعنی بت کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی بت نہ نفع دیتا ہے نہ نقصان۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے پکارنے والے کو دنیا میں نہ آخرت میں جواب نہیں دیتا۔[2] مطلب یہ ہے کہ نکما بے کار ہے، کسی مصرف کا نہیں۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [الأحقاف: ٥۔ ٦] "اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہوگا؟ جو اللہ کے سوا ایسوں کو پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی دعا قبول نہ کر سکیں، بلکہ ان کے پکارنے سے محض بے خبر ہوں۔ اور جب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو یہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی پرستش سے صاف انکار کر جائیں گے۔" نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ﴾ [الفاطر: ١٤] "اگر تم انھیں پکارو تو وہ تمھاری پکار سنتے ہی نہیں اور اگر (بالفرض) سن بھی لیں تو فریاد رسی نہیں کر سکیں گے۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ ﴾ یعنی اور پکی بات یہ ہے کہ بے شک دارِ آخرت میں ہمارا لوٹ کر جانا اللہ کی طرف ہے۔ پھر وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا اور اسی لیے یوں کہا: ﴿ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴾ یعنی اور پکی بات ہے کہ زیادتی کرنے والے ہی دوزخ والے لوگ ہیں، یعنی اپنی زیادتی کے سبب سے اس میں ہمیشہ رہنے والے۔ وہ زیادتی یہی ہے کہ اللہ عزوجل کے ساتھ شریک کیا۔ چنانچہ آگے چل کر تم یاد کرو گے جو میں تم سے کہتا ہوں۔ یعنی آیندہ تم اس بات کی سچائی کو جان لو گے جس کا میں نے تم کو امر کیا اور جس سے میں نے تم کو منع کیا اور تمھاری خیر خواہی کی اور تم سے کھول کر بیان کر دیا۔ اور تم اس کو یاد کر کے پشیمان ہو گے، وہاں پر جہاں پشیمانی تم کو کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اور میں اپنا کام اللہ کو سونپتا ہوں اور اس پر بھروسا کرتا ہوں اور اسی سے مدد چاہتا ہوں اور تم سے قطع تعلق کرتا ہوں اور تم سے دوری اختیار کرتا ہوں، بے شک اللہ سارے بندوں کو خوب دیکھتا ہے، چنانچہ وہ راہ بتاتا ہے اس کو جو راہ بتانے کا مستحق ہے اور بھٹکاتا ہے اس کو جو بھٹکانے کے لائق ہے۔ حجتِ بالغہ اور حکمتِ تامہ اور قدرِ نافذ اسی کو ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس مردِ مومن کو ان برے داؤں سے بچا لیا جو وہ کرتے تھے، یعنی دنیا اور آخرت میں۔ دنیا میں تو اس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کو نجات دی اور آخرت میں اس طرح کہ جنت عطا فرمائی۔ اور فرعون والوں پر بری طرح کا عذاب اُلٹ پڑا، وہ عذاب ان کا دریا میں ڈوب جانا اور پھر وہاں سے دوزخ کی طرف منتقل ہونا ہے،

[1] تفسير ابن كثير (١٠٢/٤) [2] تفسير الطبري (٣٩٢/٢١)

اس لیے کہ ان کی روحیں اور جسم اکٹھے ہو کر آگ میں ڈال دیے جائیں گے۔ اسی لیے یوں فرمایا: اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو فرعون والوں کو شدید ترین عذاب میں داخل کرو، یعنی ایسا عذاب جو سزا کے لحاظ سے، درد اور تکلیف میں بہت زیادہ سخت ہے اور بڑھ کر ہے۔

عذابِ قبر کا اثبات:

اہلِ سنت ۔کثرھم اللّٰہ تعالیٰ۔ نے قبروں میں عذابِ برزخ پر جو استدلال کیا ہے تو اس بارے میں یہ آیت ایک بڑی اصل ہے، یعنی قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ﴾ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بے شک یہ آیت مکی ہے اور اس سے برزخ میں عذابِ قبر پر استدلال کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی عورت ان کی خدمت کیا کرتی تھی۔ جب بھی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس کے ساتھ کوئی نیکی کرتیں تو وہ ان سے کہتی: ”وَقَاكِ اللّٰهُ عَذَابَ الْقَبْرِ“ یعنی اللہ تم کو عذابِ قبر سے بچائے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ اس کے ساتھ کچھ احسان کرتیں تو وہ یہی دعا دیتی تھی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا قیامت کے دن سے پہلے قبر میں کوئی عذاب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ اس کا زعم کس نے کیا ہے؟ عرض کی کہ اس یہودیہ نے، میں جب بھی اس سے کوئی نیکی کرتی ہوں تو یہ کہتی ہے: ”وَقَاكِ اللّٰهُ عَذَابَ الْقَبْرِ“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہود نے جھوٹ کہا اور وہ اللہ پر بہت جھوٹ باندھنے والے ہیں، روزِ قیامت سے پہلے کوئی عذاب نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے، جس قدر اللہ نے چاہا کہ ٹھہریں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن دوپہر کے وقت اپنا کپڑا اوڑھے ہوئے نکلے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلند آواز سے کہتے جاتے تھے کہ قبر اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح ہے، اے لوگو! اگر تم اس چیز کو جانو جو میں جانتا ہوں تو تم بہت روؤ اور تھوڑا ہنسو۔ اے لوگو! اللہ سے عذابِ قبر سے پناہ مانگو، بے شک قبر کا عذاب حق ہے۔[1] (وهذا إسناد صحيح على شرط البخاري و مسلم و لم يخرجاه)

امام احمد رحمہ اللہ کا دوسرا لفظ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ ہے کہ ایک یہودی عورت نے ان سے سوال کیا اور انھوں نے اس کو جواب دیا، چنانچہ اس نے ان سے کہا: ”وَقَاكِ اللّٰهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ“ تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بات کو عجیب سمجھا۔ پھر جب انھوں نے نبی اکرم کو دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: پھر ہم سے اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور بے شک بات یہ ہے کہ میری طرف وحی کی گئی

---

① مسند أحمد (٨١/٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله رجال الصحيح“ (مجمع الزوائد: ١٧٩/٣)

ہے کہ تم اپنی قبروں میں مفتون ہوتے ہو (یعنی عذاب کیے جاتے ہو)۔[1] (وهذا أيضا على شرطهما) چنانچہ کہتے ہیں کہ اس حدیث اور اس آیت کو کیسے جمع کیا جائے جو مکی ہے اور اس میں عذابِ برزخ کی دلیل ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت اس پر دال ہے کہ روحیں صبح اور شام برزخ میں آگ پر پیش کی جاتی ہیں اور اس میں اس بات پر دلالت نہیں ہے کہ روحوں کا اس طرح سے دردمند ہونا ان کے جسموں کے ساتھ ہوتا ہے جو قبروں میں ہیں، کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ روح کے ساتھ مختص ہو۔ اب رہا برزخ میں اس کا جسم کے لیے حصول اور روح کی تکلیف کی وجہ سے جسم کا دردمند ہونا تو اس پر دلیل اس سنتِ مرضیہ میں ہے جو احادیث میں مذکور ہے جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

کبھی اس طرح کہتے ہیں کہ یہ آیت جس میں صرف کافروں پر برزخ میں عذاب کی دلیل ہے، اس سے لازم نہیں آتا کہ مومن کو اپنے کسی گناہ کے سبب قبر میں عذاب کیا جائے۔ اس کی دلیلوں میں سے ایک یہ حدیث ہے جو امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر داخل ہوئے اور ان کے پاس یہود کی ایک عورت تھی جو کہہ رہی تھی: کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم اپنی قبروں میں مفتون ہوتے ہو؟ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھبرائے اور فرمایا: "إِنَّمَا يُفْتَنُ يَهُوْدُ" یعنی مفتون تو یہود ہوتے ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: چنانچہ ہم کئی راتیں ٹھہرے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک تم قبروں میں مفتون ہوتے ہو۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: پھر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عذابِ قبر سے پناہ مانگتے ہوتے تھے۔[2] (وهكذا رواه مسلم بسنده عن الزهري به) کبھی یوں کہتے ہیں کہ اس آیت میں برزخ میں روحوں پر عذاب کی دلیل ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جسموں کے ساتھ متصل ہوں جو اپنی قبروں میں ہیں۔ پھر جب خاص طور پر اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پناہ مانگی۔ والله سبحانه وتعالىٰ أعلم۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان الفاظ میں روایت کی ہے کہ ان پر ایک یہودیہ داخل ہوئی اور کہا: "نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ" سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عذابِ قبر کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، قبر کا عذاب حق ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ پھر اس کے بعد میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ہر نماز میں عذابِ قبر سے پناہ مانگی۔[3] چنانچہ یہ حدیث اس بات پر دال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیہ کی تصدیق میں مبادرت کی (جلدی کی) یعنی اس کی خبر کو سچا کہا اور اسے پکا کیا۔ جب کہ پہلی حدیثوں میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا انکار فرمایا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی آئی؟ تو شاید یہ دونوں دو واقعے ہوں۔ والله سبحانه وتعالىٰ أعلم۔ عذابِ قبر کی حدیثیں بہت سی ہیں۔

---

[1] مسند أحمد (٢٣٨/٦) [2] صحيح مسلم، (٥٨٤) مسند أحمد (٢٤٨/٦) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٦)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے ﴿ غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ جب تک دنیا باقی رہے گی، صبح و شام ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کے لیے اور ان کو ذلیل کرنے کے لیے ان کو کہا جائے گا: اے آلِ فرعون! یہ تمھاری جگہیں ہیں۔[1] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ آج اس میں ہیں، یعنی ان کو وہاں صبح اور شام کو لے جاتے ہیں، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بے شک شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں اور جنت میں جہاں چاہیں چرتی پھرتی ہیں اور بے شک مومنوں کے بچوں کی روحیں چڑیوں کے پیٹوں میں ہیں اور جنت میں جہاں چاہیں چرتی ہیں، پھر ان قندیلوں میں بسیرا کر لیتی ہیں جو عرش میں لٹکی ہوئی ہیں۔ اور بے شک آلِ فرعون کی روحیں سیاہ پرندوں کے پیٹوں میں ہیں صبح کو اور شام کو جہنم پر جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ ہے ان کا پیش کیا جانا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[2]

حدیثِ اسراء میں بہ روایتِ ابو ہارون عبدی عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مروی ہے۔ اس میں فرمایا ہے: پھر مجھے اللہ کی مخلوق میں سے ایک خلقِ کثیر کی طرف لے گئے۔ کچھ مرد تھے، ان میں سے ہر مرد کا پیٹ ایسے تھا جیسے خانۂ سطبر، وہ آلِ فرعون کی گزرگاہ پر طوقوں میں بندھے اور جکڑے ہوئے تھے اور آلِ فرعون صبح و شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو کہا جائے گا کہ آلِ فرعون کو سخت تر عذاب میں داخل کرو۔ اور آلِ فرعون ان اونٹوں کی طرح ہیں جن کو چراگاہ میں چرنے کے لیے چھوڑتے ہیں، وہ پتھروں پر اور درختوں پر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور کچھ عقل نہیں رکھتے۔[3]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں، فرمایا کہ کسی محسن نے احسان نہیں کیا، خواہ وہ مسلم ہو یا کافر، مگر اللہ تعالیٰ اس کو ثواب دے گا۔ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ کا کافر کو ثواب دینا کیا ہے؟ تو فرمایا کہ اگر اس نے صلۂ رحم یا کوئی صدقہ دیا یا کوئی نیکی کی تو اللہ تعالیٰ مال، اولاد، صحت اور اس جیسی اور چیزوں سے اس کو ثواب دے گا۔ ہم نے عرض کی: پھر اس کو آخرت میں ثواب دینا کیا ہے؟ فرمایا: ''عَذَابٌ دُونَ الْعَذَابِ'' یعنی عذاب کی کمی ہو گی اور یہ آیت پڑھی: ﴿ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾[4] (ورواه البزار في مسنده عن زيد بن أخرم ثم قال: لا نعلم له إسنادا غير هذا)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حماد بن محمد فزاری بلخی سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے اوزاعی کو سنا اور اُن سے ایک شخص نے پوچھا، چنانچہ کہا: اللہ تجھ پر رحم کرے، ہم نے پرندوں کو دیکھا ہے کہ وہ دریا سے نکلتے ہیں سفید رنگ کے اور

---

[1] تفسير الطبري (٣٩٦/٢١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٦٧/١٠) تفسير الطبري (٣٩٥/٢١، ٣٩٦)

[3] اس کی تخریج سورت اسراء آیت نمبر (١) کے تحت گزر چکی ہے۔ نیز اس کی سند میں ''ابو ہارون عبدی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٦٧/١٠) كشف الأستار عن زوائد البزار (٤٤٨/١)

بحرِ عرب کے کنارے کے پاس آتے ہیں اور ان کی گنتی کو سوائے اللہ عزوجل کے کوئی نہیں جانتا، پھر جب شام ہوتی ہے تو ان کی طرح سیاہ رنگ کے پرندے آتے ہیں: "قَالَ: وَفَطِنْتُمْ إِلَى ذٰلِكَ؟ قَالَ: نَعَمْ" یعنی تم نے اس بات کو جانا ہے؟ اس شخص نے کہا: ہاں۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا: بے شک یہ پرندے ہیں، ان کے پوٹوں میں آلِ فرعون کی روحیں ہیں، یہ صبح و شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں، پھر وہ اپنے گھونسلوں کی طرف اس حال میں لوٹتے ہیں کہ ان کے پر جل کر سیاہ ہو گئے ہیں، پھر رات کو ان کے سفید پر اُگ آتے ہیں، چنانچہ دنیا میں یہ ان کا طریقہ ہے، چنانچہ جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ﴿ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾۔ کہا: اور کہتے تھے کہ وہ چھے لاکھ لڑنے والے آدمی تھے۔[1] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: بے شک تم میں سے ایک جب مر جاتا ہے تو اس کا ٹھکانا اس پر صبح و شام پیش کیا جاتا ہے، اگر وہ اہلِ جنت ہے تو اہلِ جنت سے اور اگر وہ اہلِ نار ہے تو اہلِ نار سے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ یہ تیرا ٹھکانا ہے، یہاں تک کہ اللہ عزوجل تجھ کو قیامت کے دن اس ٹھکانے کی طرف اُٹھائے۔[2] (أخرجاه في الصحيحين من حديث مالك به كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ندائے ثانی میں حرفِ عطف کو ترک کیا، اس لیے کہ وہ اجمالِ اول کی تفصیل ہے اور یہاں حرفِ عطف کو ذکر کیا، اس لیے کہ یہ ندا ویسی نہیں ہے، کیوں کہ یہ کلامِ اول و ثانی کے مباین ہے، چنانچہ اس میں واوِ عاطفہ کا لانا حسین ہوا۔ اسی کے مثل امام زمخشری رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے۔ ﴿ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ ﴾ میں ندا کے مکرر لانے کا یہ فائدہ ہے کہ قوم کو ہوشیار کرنے میں اور اُن کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں زیادتی ہو جائے۔[3] اور اس میں یہ ہے کہ مردِ مومن آلِ فرعون سے ہے اور وہ اس کی قوم ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ تم مجھے اپنی خبر دو کہ یہ کیا حال ہے کہ میں تو تم کو اس طرف بلاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسولوں کی بات مان کر آگ سے بچو اور جنت میں داخل ہو اور تم مجھے آگ کی طرف بلاتے ہو شرک کے سبب سے جو تم مجھ سے کرانا چاہتے ہو؟! کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "مَالَكُمْ أَدْعُوكُمْ"، جیسے تو کہتا ہے: "مَالِيْ أَرَاكَ حَزِيْنًا؟ أَيْ: مَا لَكَ؟"

پھر دونوں طرح بلانے کی تفسیر کی، چنانچہ کہا کہ تم مجھے بلاتے ہو کہ میں اللہ کا منکر ہو جاؤں اور اس کے ساتھ اس شے کو شریک کروں جس کا مجھے علم نہیں، یعنی جس کا اللہ کے شریک ہونے کا مجھے کسی طرح کا علم نہیں۔ نفیِ علم سے

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٣٩٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٦) مسند أحمد (٢/١١٣) تفسير ابن كثير (٤/١٠٢-١٠٤)

[3] الكشاف (٤/١٧٣)

مراد معلوم کی بالکل نفی ہے، یعنی معبود کی، اس کی عبادت کا کیا ذکر ہے! دوسرا ﴿ تَدْعُوْنَنِيْٓ ﴾ پہلے سے بدل ہے۔ بطور بیان کے جملہ فعلیہ میں اس پر دلالت ہے کہ ان کا بلانا باطل ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں اور ﴿ اَنَا اَدْعُوْكُمْ ﴾ میں جملہ اسمیہ اس لیے ہے کہ اس کی دعوت کے ثبوت اور قوی ہونے پر دال ہو۔ معنی یہ ہیں کہ میں تم کو اس ذاتِ مقدس کی طرف بلاتا ہوں جو اپنے کام پر اور کافروں سے انتقام لینے پر غالب ہے اور مومن اور توبہ کرنے والے کے گناہوں کو بڑا بخشنے والا ہے۔

﴿ لَا جَرَمَ ﴾ کی تفسیر سورت ہود میں گزر چکی ہے۔[1] ﴿ جَرَمَ ﴾ فعل ماضی بہ معنی "حَقَّ" ہے اور اس پر جو حرفِ لا داخل ہے تو یہ اس شے کی نفی کرنے اور اسے رد کرنے کے لیے ہے جس کا انھوں نے دعویٰ اور زعم کیا ہے۔ اس فعل کا فاعل قولہ: ﴿ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ ﴾ ہے، یعنی تمھارا مجھ کو بلانا اور تمھارا دعویٰ اور خیال مردود ہے۔ حق اور واجب اور ثابت یہ بات ہے کہ بے شک جس شے کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، اس کے لیے دنیا اور آخرت میں کوئی بلاوا نہیں ہے، مطلب یہ کہ اس کی دعوت کا باطل ہونا حق اور واجب ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہے کہ اس کے لیے کسی دعا کا قبول کرنا نہیں ہے جو نفع دے۔ کسی نے کہا ہے کہ نہیں ہے اس کے لیے کوئی بلانا جو اس کے لیے الوہیت کا موجب ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: نہیں ہے اس کے لیے کوئی شفاعت۔[2] کلمہ ﴿ مَا ﴾ "اَلَّذِيْ" کے معنی میں ہے تو اس کا حق یہ تھا کہ نون سے الگ لکھا جاتا جیسا کہ قاعدہ ہے، لیکن مصحفِ امام میں نون کے ساتھ ہی لکھا ہوا ہے، جیسا کہ امام ابن جزری رحمہ اللہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

﴿ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ ﴾ معطوف ہے ﴿ اَنَّمَا ﴾ پر، یعنی اور حق و واجب یہ بات ہے کہ بے شک ہمارا مرجع اور مصیر، یعنی پھر جانا اللہ کی طرف ہے پہلے مر کر، پھر آخرت میں مبعوث ہو کر، چنانچہ وہ ہر ایک کو اس خیر و شر کی جزا دے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ ﴿ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴾ بھی ﴿ اَنَّمَا ﴾ پر معطوف ہے، یعنی اور حق و واجب یہ بات ہے کہ بے شک کثرت سے اللہ کے معاصی (نافرمانی) کرنے والے ہی دوزخ والے ہیں۔ امام قتادہ اور ابن سیرین رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ الْمُسْرِفِيْنَ ﴾ سے مراد مشرکین ہیں۔ امام مجاہد اور شعبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ سفہاء ہیں جو کثرت سے ناحق خون ریزی کرتے ہیں۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بھی یہی ہے۔[4] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبارین متکبرین ہیں۔[5] کسی نے کہا ہے کہ وہ ہیں جو اللہ پاک کی حدود سے آگے بڑھے۔

"مُسْرِفِيْن" ایک ایسا کلمہ ہے کہ یہ سب معانی اس میں داخل ہیں۔ پھر جب مردِ مومن وعظ کرتے کرتے یہاں تک پہنچا تو اپنی بات کو ایک لطیف پیرائے میں ختم کیا۔ چنانچہ کہا: ﴿ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ﴾ یعنی آیندہ

[1] رقم الآية (٢٢) [2] تفسير القرطبي (٣١٧/١٥) [3] تفسير القرطبي (٣١٧/١٥)
[4] فتح القدير (٦٥٠/٤) [5] تفسير القرطبي (٣١٨،٣١٧/١٥)

تم اس بات کو یاد کرو گے جو میں تم سے کہتا ہوں جب تم پر عذاب نازل ہوگا اور جان لو گے کہ میں نے تمھیں بہت وعظ و نصیحت کی۔ یہ ایک عجیب مجمل مبہم کلام ہے، اس ابہام و اجمال میں وہ ڈر اور ملامت ہے جو مخفی نہیں ہے۔

قولہ: ﴿ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ کلامِ مستانف ہے، یعنی میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہوں اور اپنا کام اس کے سپرد کرتا ہوں۔ کہتے ہیں: یہ اس نے اس وقت کہا جب انھوں نے اسے ایذاء دینے کا ارادہ کیا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مومن پہاڑ کی طرف بھاگا تو اس کو طلب کیا، مگر اس پر قابو نہ پایا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اس قول کے قائل موسیٰ علیہ السلام ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾ بے شک اللہ پاک کو بندوں کی خوب خبر ہے، وہ جانتا ہے کہ باطل پر کون ہے اور حق پر کون ہے۔ ﴿ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا ﴾ یعنی اس کے ساتھ جس مکر و فریب کا ارادہ کیا اور اس کے ساتھ جس طرح طرح کے عذاب کا ارادہ کیا، اللہ پاک نے ان سب سے اس کو بچا لیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے غرق ہونے سے بچا لیا جس طرح بنی اسرائیل کو بچایا تھا۔

﴿ وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴾ یعنی برے عذاب نے آلِ فرعون کا احاطہ کیا اور ان پر نازل ہوا۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب کوئی شے نازل و لازم ہو تو محاورے میں بولتے ہیں: ”حَاقَ يَحِيْقُ حَيْقًا وَحُيُوْقًا“ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دریا میں ڈوبے اور آگ میں داخل ہوئے۔[2] آلِ فرعون سے مراد فرعون اور اس کی قوم ہے۔ فرعون کی تصریح نہ کی، اس لیے کہ قوم کا نام لینے سے اس کا نام لینے کی ضرورت نہ رہی، کیوں کہ وہ قوم سے بڑھ کر عذاب کا مستحق تھا۔ یا آلِ فرعون سے مراد خود فرعون ہے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ دنیا میں ان سب کو غرق ہونے کا عذاب کیا گیا اور آخرت میں آگ کا عذاب دیا جائے گا۔

پہلے اللہ پاک نے ﴿ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴾ کو مجمل ذکر کیا، پھر اس کو بیان فرمایا: ﴿ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ﴾۔ چنانچہ ﴿ اَلنَّارُ ﴾ کا رفع بنا بر بدل ہے ﴿ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴾ سے۔ کسی نے کہا ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے، یا مبتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ يُعْرَضُوْنَ ﴾ ہے۔ لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے اور اسی کو امام زجاج رحمہ اللہ نے راجح کہا ہے۔ آخری کی دو وجہ پر جملہ مستانفہ ہوگا اور سوالِ مقدر کا جواب ہوگا۔ گویا کسی نے کہا کہ ﴿ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴾ کیا ہے؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ ﴿ اَلنَّارُ ﴾۔ کسی نے ﴿ اَلنَّارُ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے بر تقدیرِ فعل جس کی تفسیر ﴿ يُعْرَضُوْنَ ﴾ کرتا ہے۔ ”مِنْ حَيْثُ الْمَعْنَى أَيْ: يَصْلُوْنَ النَّارَ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا“. یا بنا بر اختصاص۔ امام فراء رحمہ اللہ نے جر بھی جائز رکھا ہے، اس بنا پر کہ عذاب سے بدل ہو۔ معنی یہ ہیں کہ ان کی روحیں ان کے مرنے سے قیامت کے قائم ہونے تک صبح و شام آگ پر پیش کی جاتی ہیں۔ عرض سے مراد ان کا آگ سے

[1] تفسير القرطبي (١٥/٣١٨) [2] فتح القدير (٤/٦٤٩)

جلانا ہے۔ محاورے میں یوں ہے کہ جس وقت امیر قیدیوں کو تلوار سے قتل کرے تو اس وقت کہتے ہیں: "عَرَضَ الْأَمِيرُ الْأُسَارَى عَلَى السَّيْفِ" مطلب یہ ہے کہ ان دو وقتوں میں ان کو آگ سے عذاب کیا جاتا ہے اور اُن کے درمیان میں یا تو اور طرح کے عذاب سے معذب ہوتے ہوں یا ان کو چھٹی ملتی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صبح و شام سے مراد ہمیشگی ہو۔

بعض اہلِ علم نے اس آیت سے عذابِ قبر پر استدلال کیا ہے۔[1] أعاذنا اللّٰه تعالیٰ منه بمنه و كرمه آمين. (وبه قال: مجاهد و عكرمة و محمد بن كعب كلهم) صاحبِ فتح البیان اور ترجمان القرآن رحمہ اللہ نے کتاب "ثمار التنكيت في شرح أبيات التثبيت" میں اس کی خوب تحقیق فرمائی ہے۔ جزاه اللّٰه تعالیٰ خير الجزاء و رحمه رحمة واسعة۔ اور جمہور اس طرف گئے ہیں کہ یہ عرض برزخ میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آخرت میں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہوگی۔ "أَيْ: أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ النَّارِ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا" حالانکہ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس لیے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾ میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ عرض برزخ میں ہے، یعنی جس دن قیامت قائم ہوگی تو فرشتوں سے کہا جائے گا کہ آلِ فرعون کو ﴿ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾ میں داخل کرو۔ مراد عذابِ نار ہے، کیوں کہ یہ اس عذاب سے زیادہ سخت ہے جس میں وہ تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد انواعِ عذاب ہیں۔ بعض انواع بعض سے زیادہ سخت ہیں۔ سوائے ان نوعوں کے جن کے ساتھ وہ جب سے غرق کیے گئے معذب ہوتے تھے۔ امام حمزہ، کسائی، نافع اور حفص رحمہم اللہ نے ﴿ اَدْخِلُوْٓا ﴾ بہ قطعِ ہمزہ وکسرِ خاء پڑھا ہے۔ یہ قراءت بر تقدیرِ قول ہے جیسا کہ ترجمہ میں گزرا ہے۔ باقی قراء نے ﴿ اُدْخُلُوْٓا ﴾ بہ ہمزۂ وصل پڑھا ہے۔ "دَخَلَ يَدْخُلُ" سے۔ اس میں بہ تقدیرِ حرفِ ندا آلِ فرعون کو دخول کا حکم ہے۔ "أَيْ: أُدْخُلُوا يَا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ"[2] یعنی اے آلِ فرعون! سخت سے سخت عذاب میں داخل ہو جاؤ۔ بالجملہ جب اللہ پاک نے آلِ فرعون کے قصے کو آیتِ مذکور پر ختم کیا اور اس میں اہلِ نار کے احوال کا بیان آ گیا تو اس کے بعد ان مناظروں کا قصہ بیان کیا جو رؤسا اور اتباع کے درمیان ہوں گے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿٤٧﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ

---

(1) تفسير القرطبي (۳۱۹/۱۵) (2) فتح القدير (٦٤٩/٤) فتح البيان (۱۲/۱۹۳-۱۹۷)

47

حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿٤٨﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ
ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿٤٩﴾ قَالُوْٓا
اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا
فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿٥٠﴾

اور جب وہ جہنم میں باہم جھگڑیں گے تو جن لوگوں نے تکبر کیا تھا، ان سے کمزور لوگ کہیں گے: بلاشبہ ہم تو (دنیا میں) تمھارے تابع تھے، پھر کیا تم ہم سے آگ کا کچھ حصہ ہٹاؤ گے؟ (47) جن لوگوں نے تکبر کیا تھا، وہ کہیں گے: بے شک ہم سب ہی اس (آگ) میں ہیں، بلاشبہ اللہ نے تو بندوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے (48) اور وہ (سب) لوگ، جو آگ میں ہوں گے، جہنم کے دربانوں سے کہیں گے: تم اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ایک دن تو ہم سے کچھ عذاب ہلکا کر دے (49) وہ کہیں گے: کیا تمھارے رسول تمھارے پاس کھلی نشانیاں لے کر نہیں آتے تھے؟ وہ (جواب میں) کہیں گے: کیوں نہیں! وہ (دربان) کہیں گے: پھر تم (خود ہی) دعا کر لو اور کافروں کی دعا تو بے کار ہی جائے گی (50)

اہلِ نار کا باہمی جھگڑا:

اللہ اپنے بندوں کے درمیان فیصلے کر چکا ہے، اس لیے اب گنجایش نہیں رہی کہ کوئی کسی کے کام آئے۔ جہنمی لوگ جہنم کے داروغوں سے کہیں گے کہ ہماری سفارش کرو، وہ جواب دیں گے: سفارش کرنا ہمارا کام نہیں ہے، ہم تو عذاب دینے پر مقرر ہیں۔ سفارش کرنا رسولوں کا کام ہے اور رسولوں کی تو تم مخالفت کرتے رہے۔ انتھی[1]

اللہ پاک اہلِ نار کے باہم حجت کرنے کے بارے میں خبر دیتا ہے اور نار میں ان کے آپس میں جھگڑنے کی خبر دیتا ہے۔ فرعون اور اس کی قوم بھی انھی میں سے ہے۔ چنانچہ اتباع اپنے پیشواؤں، سرداروں اور بڑوں سے کہیں گے کہ ہم تو تمھارے تابع تھے، یعنی دنیا میں تم نے ہم کو جس کفر و گمراہی کی طرف بلایا، اس میں ہم نے تمھاری اطاعت کی تو کیا تم ہم سے آگ کا کچھ حصہ دور کرنے والے ہو کہ اس کو ہم سے اٹھا لو؟ تو وہ کہیں گے کہ ہم سب کے سب اس میں پڑے ہیں، یعنی ہم تم سے کچھ نہ اٹھائیں گے، ہم کو تو وہی عذاب و سزا کافی ہے جو ہمارے پاس ہے اور جس کو ہم نے اٹھایا ہے۔ اللہ تو بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا، یعنی اس نے ہم میں سے ہر ایک میں اس کے

استحقاق کے مطابق عذاب بانٹ دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۳۸] ''سب ہی کے لیے دوگنا ہے لیکن تم کو خبر نہیں۔''

جب دوزخیوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ عزوجل ان کی دعا نہ سنے گا اور نہ ہی قبول کرے گا، بلکہ وہ تو فرما چکا کہ ﴿ اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴾ [المؤمنون: ۱۰۸] ''پھٹکارے ہوئے یہیں پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو۔'' تو پھر خازنوں سے جو داروغوں کی طرح ہیں، اہلِ نار کے لیے یہ سوال کریں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ کافروں کا عذاب ہلکا کرے، گو ایک ہی دن کے لیے ہو تو خازن لوگ ان کی بات کو رد کر کے ان سے یوں کہیں گے: کیا اب تم یہ کہتے ہو اور کیا تمھارے پاس تمھارے رسول بینات لے کر نہیں آتے تھے؟ یعنی کیا تم پر دنیا میں رسولوں کی زبان پر حجتیں قائم نہیں ہو چکیں؟ تو وہ کہیں گے: کیوں نہیں۔ فرشتے کہیں گے: پھر اب تم خود ہی اپنے لیے دعا کرو، ہم تو نہ تمھارے لیے دعا کریں نہ تمھاری بات سنیں اور نہ ہی تمھارے خلاصی پانے کو دوست رکھیں اور ہم تو تم سے بے زار ہیں اور تم کو خبر دیے دیتے ہیں کہ تم پکارو یا نہ پکارو دونوں برابر ہیں، نہ تمھاری دعا قبول ہوگی نہ تم سے تخفیف کی جائے گی، اسی لیے فرشتوں نے یوں کہا: اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر ضلال میں، یعنی جانے میں مقبول و مستجاب نہ ہوگا بے کار جائے گا۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ کلمۂ ﴿ إِذْ ﴾ ظرف ہے اور ''أُذْكُرْ'' محذوف سے منصوب ہے۔ (اول آیت میں جو تمہید ذکر کی گئی ہے وہ اسی بنا پر ہے، اور جب ﴿ غُدُوًّا ﴾ پر معطوف ہوگا تو ''أُذْكُرْ'' کا معمول نہ ہوگا، بلکہ ﴿ يُعْرَضُوْنَ ﴾ کا ظرف ٹھہرے گا: ''أَيْ: يُعْرَضُوْنَ عَلَى النَّارِ فِيْ هٰذِهِ الْأَوْقَاتِ كُلِّهَا'') نبی اکرم ﷺ کو خطاب ہے کہ اپنی قوم سے کفار کے جہنم کے اندر باہم جھگڑنے کا ذکر کر۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس جھگڑنے کو بیان فرمایا کہ وہاں اس طرح جھگڑیں گے کہ ضعیف، کمزور اور تابع لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جنھوں نے انبیاء کے لیے فرماں بردار ہونے اور پیروی کرنے سے تکبر کیا، یہ لوگ کفر کے سردار ہیں: ہم تو تمھارے تابع تھے، تم نے ہم کو لے کر لوگوں پر تکبر کیا، اب کیا تم ہم سے آگ کے عذاب کا کچھ حصہ دور کرو گے؟ یا اس کو ہمارے ساتھ مل کر اٹھاؤ گے؟ ''تَبَعٌ'' جمع ہے ''تَابِعٌ'' کی، جیسے: ''خَدَمٌ'' جمع ہے ''خَادِمٌ'' کی۔ یا مصدر ہے کہ اسم فاعل کے موقع میں واقع ہوا ہے، یعنی تابعین۔ یا بنا بر حذف مضاف ہے: ''أَيْ: ذَوِيْ تَبَعٍ'' یعنی صاحبِ پیروی۔ بصریوں نے کہا ہے۔ ''تَبَعٌ'' واحد و جمع دونوں ہوتا ہے۔ کوفی کہتے ہیں کہ جمع ہے اس کا واحد نہیں ہے۔ ﴿ نَصِيْبًا ﴾ کا نصب فعل

[1] تفسیر ابن کثیر (۱۰۵/٤)

مقدر سے ہے جس پر ﴿ مُّغْنُوْنَ ﴾ دال ہے۔ "أَيْ: هَلْ تَدْفَعُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا". یا خود ﴿ مُّغْنُوْنَ ﴾ عامل ہے اس بنا پر کہ "حاملون" کے معنی کو متضمن ہے "أَيْ: هَلْ أَنْتُمْ حَامِلُوْنَ مَعَنَا نَصِيْبًا" اور ﴿ مِّنَ النَّارِ ﴾ صفت ہے ﴿ نَصِيْبًا ﴾ کی۔ "أَيْ: نَصِيْبًا كَائِنًا مِنَ النَّارِ"

جملۂ ﴿ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ﴾ مستانفہ ہے اور سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ مستکبرین نے ضعفاء کو کیا جواب دیا؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ انھوں نے کہا: ہم سب اُس میں ہیں۔ جمہور نے ﴿ كُلٌّ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے بنا بر ابتداء اور ﴿ فِيْهَآ ﴾ اس کی خبر ہے اور جملہ خبر ہے ﴿ اِنَّ ﴾ کی۔ یہ قول امام اخفش رحمہ اللہ کا ہے۔ امام ابن سمیفع اور عیسیٰ بن عمر رحمہما اللہ نے "كُلًّا" بہ نصب پڑھا ہے۔ امام کسائی اور فراء رحمہما اللہ نے کہا کہ نصب اس بنا پر ہے کہ اسمِ ﴿ اِنَّ ﴾ کی تاکید ہے بہ معنی "كُلَّنَا" اور تنوین عوض ہے مضاف الیہ سے۔ کسی نے کہا کہ منصوب بنا بر حال ہے۔ ابن مالک رحمہ اللہ نے اس کو ترجیح دی ہے۔[1] معنی یہ ہیں کہ بے شک ہم اور تم سب کے سب جہنم میں ہیں، پھر ہم تم سے عذاب کو کیسے دور کریں اور اگر ہم اس پر قادر ہوتے تو ہم اپنی جانوں ہی سے دور کرتے، بے شک اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے، اس طرح سے کہ ایک گروہ جنت میں ہے اور ایک گروہ دوزخ میں تو اب کوئی کسی سے کچھ دور نہیں کر سکتا۔ اس وقت تابعین کو متبوعین سے ناامیدی ہو جائے گی تو سب کے سب خزنۂ جہنم سے رجوع کریں گے اور ان سے سوال کریں گے، جیسا کہ اللہ پاک نے ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴾ یعنی وہ کافر اُمتیں جو آگ میں ہیں، ان کے مستکبر اور ضعیف سب مل کر خزنۂ جہنم سے کہیں گے کہ تم اپنے رب کو پکارو کہ ہم سے ایک دن عذاب ہلکا کرے۔

"يَوْم" سے مراد یہ ہے کہ ایامِ دنیا میں سے ایک دن جتنا عذاب ہی ہلکا کر دے، کیوں کہ آخرت میں نہ رات ہے نہ دن۔ "خَزَنَةٌ"، "خَازِنٌ" کی جمع ہے، یہ وہ فرشتے ہیں جن کے ہاتھوں میں اہلِ نار کے عذاب کا انتظام ہے۔ یہ بات کہ "لِخَزَنَتِهَا" نہ کہا، ﴿ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ﴾ کہا، یہ اس لیے کہ جہنم کے ذکر میں تہویل (خوف دلانا) ہے، یا اس لیے کہ نار میں جو اُن کا مقام ہے اس کا بیان کرنا منظور ہے، کیوں کہ جہنم آگ کے سب سے نچلے حصے کو کہتے ہیں۔ اس قول سے ماخوذ ہے کہ جس کنوئیں کی تہہ دور ہوتی ہے، اس کو "بِئْرٌ جِهْنَامٌ" بولتے ہیں اور جہنم میں بڑے بڑے سرکش، عاتی اور طاغی کافر ہیں۔ پھر شاید جو فرشتے ان لوگوں کے عذاب پر مقرر ہیں، ان کی دعا زیادہ تر قبول ہوتی ہو، ان کے اللہ پاک کے زیادہ قریب ہونے کے سبب سے، اس لیے اہلِ نار نے ان سے دعا منگوانے کا ارادہ کیا۔

جملۂ ﴿ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ﴾ مستانفہ ہے اور سوالِ مقدر کا جواب ہے اور استفہام

---

[1] فتح القدير (٦٤٩/٤، ٦٥٠)

ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے، یعنی فرشتوں نے توبیخ اور سرزنش کر کے ان کو جواب دیا، کیوں جی! کیا تمھارے پاس تمھارے رسول کھلی نشانیاں لے کر نہیں آتے تھے؟! ﴿ قَالُوْا بَلٰی ﴾ یعنی بولے: کیوں نہیں، وہ ان کو لے کر ہمارے پاس آئے تو ہم نے ان کو جھٹلایا اور ہم نہ اُن پر ایمان لائے اور نہ ہی ان واضح حجتوں پر جن کو وہ لے کر آئے۔ پھر جب انھوں نے اقرار کیا تو خازنینِ جہنم نے از راہِ مذاق ان سے کہا: ﴿ فَادْعُوْا ﴾ یعنی جب بات یوں ہے تو تم خود ہی پکارو، کیوں کہ ہم اس کے لیے دعا نہیں کرتے جو اللہ کا منکر ہو اور جس نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا، بعد اس کے کہ وہ واضح دلیلیں لے کر ان کے پاس آئے۔ پھر ان کو یہ خبر دی کہ ان کی دعا کا کچھ فائدہ نہ ہوگا، چنانچہ کہا: ﴿ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴾ "أَيْ: فِيْ ضِيَاعٍ وَبُطْلَانٍ وَخَسَارٍ وَتَبَارٍ وَانْعِدَامٍ" یعنی کافروں کی دعا باطل اور منعدم ہے۔ اس میں ان کو قبولیتِ دعا سے نا امید کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت اللہ پاک کے قول سے ہے، وہ اپنے نبی ﷺ کو خبر دیتا ہے۔ یہ قول ما بعد کے ساتھ زیادہ مناسب ہے اور اسی پر محلی اور شہاب چلے ہیں:[1]

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿51﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿52﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿53﴾ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿54﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿55﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿56﴾

بلاشبہ ہم اپنے رسول کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے ﴿51﴾ اس دن ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہیں دے گی اور ان کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے ﴿52﴾ اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو ہدایت دی اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا ﴿53﴾ عقل مندوں کی ہدایت اور نصیحت کے لیے ﴿54﴾ لہٰذا (اے نبی!) آپ صبر کیجیے، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کی معافی مانگیے اور شام کو اور صبح کو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے ﴿55﴾ بلاشبہ جو لوگ اللہ

[1] تفسير الجلالين (٦٢٤/١) حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٣٧٦/٧) فتح البيان (١٩٧/١٢-١٩٩)

کی آیات میں کسی دلیل کے بغیر جھگڑتے ہیں جو اُن کے پاس آئی ہو، ان کے سینوں میں صرف برائی (کا خبط) ہے، وہ اس تک کبھی پہنچ نہیں سکیں گے، لہٰذا آپ (ان کے شر سے) اللہ کی پناہ مانگیے، بلاشبہہ وہی خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے ﴿56﴾

رسولوں اور مومنوں کی دنیا و آخرت میں نصرتِ الٰہی:

رسول اللہ ﷺ دن میں سو سو دفع گناہ سے استغفار کرتے۔ ہر بندے سے قصور ہو جاتا ہے، اس کے مطابق ہر کسی کے لیے استغفار کرنا ضروری ہے۔ ان کے دلوں میں جو برائی ہے وہ یہ کہ ہم اس پیغمبر سے اوپر اور بہتر ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ اس تک پہنچیں۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابو جعفر بن جریر رحمہ اللہ نے ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ کی تفسیر میں ایک سوال وارد کیا ہے، چنانچہ کہا کہ یہ بات معلوم ہو چکی کہ بعض انبیاء علیہم السلام کو تو ان کی قوم نے بالکل مار ہی ڈالا، جیسے: یحییٰ اور زکریا اور شعیاء علیہم السلام اور بعض اپنی قوم کے درمیان سے نکل گئے، یا تو ہجرت کر گئے، جیسے: ابراہیم علیہ السلام، یا آسمان کی طرف اٹھا لیے گئے، جیسے: عیسیٰ علیہ السلام۔ تو اب دنیا میں نصرت کہاں ہوئی؟ پھر اس کے دو جواب دیے: ایک یہ کہ خبر عام نکلی اور اس سے مراد بعض ہیں، کہا: اور یہ بات لغت میں جائز ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ نصرت سے مراد ان کے لیے بدلہ لینا ہے اس سے جس نے ان کو ایذاء دی اور یہ بدلہ ان کی موجودگی میں بھی لیا جا سکتا ہے، یا ان کی عدمِ موجودگی میں، یا ان کی موت کے بعد جیسا کہ یحییٰ، زکریا اور شعیاء علیہم السلام کے قاتلوں کے ساتھ کیا کہ ان کے دشمنوں میں سے ایسے شخص کو ان پر مسلط کیا جس نے ان کو ذلیل کیا اور ان کے خون بہائے۔[1]

چنانچہ ذکر کیا ہے کہ نمرود کو اللہ تعالیٰ نے عزیز مقتدر کا پکڑنا پکڑا۔ رہے یہود میں سے وہ لوگ جنھوں نے مسیح علیہ السلام کو سولی دینے کا ارادہ کیا تو ان پر اللہ تعالیٰ نے روم کو مسلط کیا، چنانچہ انھوں نے ان کی توہین کی اور ان کو ذلیل کیا اور اللہ تعالیٰ نے روم کو ان پر غالب فرمایا۔ پھر یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام قیامت سے پہلے عن قریب امام عادل اور حکم مقسط ہو کر نازل ہوں گے تو مسیح دجال اور اس کے لشکروں کو جو یہود سے ہوں گے، قتل کریں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو توڑیں گے اور جزیہ موقوف کریں گے اور قبول نہ کریں گے مگر اسلام۔ یہ ایک نصرتِ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت زمانۂ قدیم اور جدید میں جاری ہے کہ وہ اپنی خلق میں سے مومن بندوں کو دنیا میں نصرت دیتا ہے اور جس نے ان کو ایذاء دی ہے، اس سے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ دیکھو صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: «مَنْ عَادَ لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ بَارَزَنِيْ بِالْحَرْبِ»[2] یعنی

---

[1] تفسیر الطبري (٢١/٤٠٠، ٤٠١) تفسیر ابن کثیر (٤/١٠٥) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦١٣٧)

جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو یقیناً وہ میرے مقابلے میں لڑنے کے لیے آیا۔

دوسری حدیث شریف میں مروی ہے: «إِنِّي لَأَثْأَرُ لِأَوْلِيَائِي كَمَا يَثْأَرُ اللَّيْثُ الْحَرْبَ»[1] یعنی بے شک میں البتہ اپنے اولیاء کے لیے خون کا بدلہ طلب کرتا ہوں جس طرح کہ شیر لڑائی کو طلب کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے قومِ نوح، عاد، ثمود اور اصحابِ رس وقومِ لوط اور اہلِ مدین کو ہلاک کر ڈالا اور ان کی طرح اور لوگوں کو جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی اور حق کے مخالف ہوئے اور اللہ پاک نے ان میں سے مومنوں کو بچا لیا اور اُن میں سے کسی کو ہلاک نہ کیا اور کافروں کو عذاب کیا اور ان میں سے کسی کو نہ چھوڑا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ عزوجل نے کبھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ اسے قتل کریں، یا کسی قوم کے مومنوں کو کہ وہ حق کی طرف بلائیں اور مار ڈالے جائیں۔ پھر وہ زمانہ جاتا رہے، یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے لیے اس شخص کو بھیجے جو اُن کی مدد کرے اور ان کے خون طلب کرے اس سے جس نے دنیا میں ان کے ساتھ یہ کیا۔ کہا: چنانچہ انبیاء علیہم السلام اور مومنین رحمہم اللہ دنیا میں قتل کیے جاتے تھے اور وہ اس میں منصور ہوتے تھے۔[2]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے اصحاب کو اس شخص پر نصرت دی جس نے آپ ﷺ کی مخالفت کی، آپ ﷺ کے ساتھ عداوت اور دشمنی کی اور آپ ﷺ کو جھٹلایا، پھر آپ ﷺ ہی کا بول بالا کیا اور آپ ﷺ ہی کے دین کو سارے دینوں پر غالب فرمایا اور آپ ﷺ کو اپنی قوم کے درمیان سے مدینۂ نبویہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا اور وہاں آپ ﷺ کے لیے انصار اور اعوان کر دیے، پھر بدر کے دن مشرکوں کے مونڈھے آپ کو عطا کیے، یعنی ان کو مطیع کر دیا، پھر آپ ﷺ کو ان پر نصرت دی اور ان کو ذلیل وخوار کیا اور اُن کے سربر آوردہ لوگوں کو قتل اور سرداروں کو قید کر لیا۔ پھر ان کو طوق اور زنجیروں سے جکڑ کر انھیں ہانک کر لائے۔ پھر اُن سے فدیہ لے کر اُن پر احسان رکھا۔ ذرا ہی مدت کے بعد مکہ کو آپ پر مفتوح کر دیا تو آپ ﷺ کی چشم مبارک اپنے شہر سے ٹھنڈی ہوگئی، یہ شہر وہی بلدِ محرم وحرام، مشرف اور معظم ہے۔ پھر اللہ پاک نے آپ ﷺ کے سبب سے اس شہر کو اس کفر وشرک سے چھڑایا جو اس میں تھا اور یمن کو آپ ﷺ کے لیے فتح کر دیا۔ پورا جزیرۂ عرب آپ ﷺ کا مطیع اور فرماں بردار ہو گیا اور جوق در جوق لوگ اللہ کے دین میں داخل ہو گئے۔

پھر اللہ پاک نے آپ ﷺ کو اپنی طرف اس کرامتِ عظیم کے لیے مقبوض کیا جو اس کے پاس آپ ﷺ کے لیے تیار تھی۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ کے بعد خلفاء قائم کیا تو انھوں نے آپ ﷺ کی طرف سے اللہ عزوجل کا دین پہنچایا اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ سبحانہٗ کی طرف بلایا اور بلاد و

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے، البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر (۱۰۶/۴) میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

[2] تفسير الطبري (۴۰۱/۲۱) تفسير ابن كثير (۱۰۶/٤)

رساتیق (کھیت) و اقالیم (سلطنتیں) مدائن و قریٰ (بستیاں) و فلوات (صحرا) فتح کیے، یہاں تک کہ دعوتِ محمدیہ زمین کے مشارق و مغارب میں پھیل گئی، پھر یہ دینِ متین تا قیامِ قیامت ہمیشہ قائم، منصور، ظاہر اور غالب رہے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ یعنی اور قیامت کے دن نصرتِ اعظم، اکبر اور اجل ہوگی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَشْهَادٌ"، ملائکہ ہیں۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ... الآية ﴾ ﴿ وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ سے بدل ہے۔ اور لوگوں نے ﴿ يَوْمَ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے، گویا ﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ سے ﴿ وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ کی تفسیر کی ہے، یعنی ﴿ وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ وہ دن ہے جس میں ظالموں، یعنی مشرکوں کو ان کی معذرت نفع نہ دے گی۔ یعنی ان سے نہ کوئی عذر قبول ہوگا اور نہ کچھ فدیہ اور اُن کے لیے لعنت ہے، یعنی رحمت سے دور کرنا اور بھگانا اور اُن کے لیے برا گھر ہے، یعنی آگ۔ (قاله السدي) نار بری منزل اور بری خواب گاہ ہے۔ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴾ "سُوْءُ الْعَاقِبَةِ"[2] یعنی بد انجام۔

﴿ الْهُدٰى ﴾ سے مراد وہ ہدایت اور نور ہے جس کو دے کر اللہ عز و جل نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا۔ ﴿ وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴾ یعنی ہم نے ان کے لیے نیک انجام کیا اور ان کو فرعون کے شہروں، حواصل، مالوں اور زمین کا وارث بنایا بہ سبب اس کے کہ انھوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی اطاعت پر اور اس کے رسول موسیٰ علیہ السلام کے اتباع پر صبر کیا اور جس کتاب کے وہ وارث کیے گئے، یعنی تورات شریف اس میں اولی الالباب کے لیے، یعنی ان کے لیے جن کی عقلیں صحیح اور سلیم ہیں، ہدایت اور نصیحت ہے۔

قولہ عزوجل: ﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾ یعنی اے محمد! تو صبر کر بے شک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے، ہم نے تجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہم عن قریب تیرا بول بالا کریں گے اور تیرے لیے اور اُن کے لیے جنھوں نے تیری پیروی کی، نیک انجام ٹھہرائیں گے اور اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا ہے۔ یہ بات جس کی ہم نے تجھے خبر دی حق ہے، اس میں کسی طرح کا شک و شبہہ نہیں ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ﴾ یعنی اپنے گناہ کی مغفرت مانگ۔ یہ امت کو استغفار پر آمادہ کرنا ہے۔ "عَشِيٌّ" سے مراد دن کا آخر اور رات کا شروع ہے اور "إِبْكَارٌ" دن کا شروع اور رات کا آخر ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ بے شک وہ لوگ جو حق کو باطل سے دور کرتے ہیں اور صحیح حجتوں کو رد کرتے ہیں، فاسد شبہوں کے ساتھ، بغیر کسی ایسی دلیل و حجت کے جو اللہ پاک کی طرف سے ہو تو اُن کے دلوں اور سینوں میں حق

---

[1] تفسیر الطبري (٤٠٢/٢١) [2] تفسیر ابن کثیر (١٠٦/٤)

کی پیروی کرنے سے تکبر ہے اور وہ اس شخص کو حقیر جانتے ہیں جو اُن کے پاس وہ حق لایا، حالاں کہ حق کو پست کرنے اور باطل کو بلند کرنے کا جو وہ قصد کرتے ہیں تو وہ ہرگز ان کو حاصل ہونے والا نہیں ہے، بلکہ حق ہی بلند ہوگا اور اُن کا قول اور ارادہ پست ہوگا۔ لہٰذا تو اللہ تعالیٰ سے ایسے لوگوں کے حال سے پناہ مانگ، بے شک وہ بڑا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ یا ان جیسے جھگڑالو لوگوں کے شر سے پناہ مانگ جو اللہ کی باتوں میں بغیر کسی دلیل کے جھگڑتے ہیں۔ یہ تو تفسیر ابن جریر رحمہ اللہ کا بیان ہے۔[1]

امام کعب اور ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ﴾ یہود کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ اس لیے کہ یہود نے یہ دعویٰ کیا کہ دجال اُن میں سے ہے اور وہ اس کی وجہ سے زمین کے مالک ہوں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ امر فرمایا کہ فتنۂ دجال سے پناہ مانگیں اور اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾[2] یہ قول غریب ہے اس میں تعسف بعید ہے، یعنی اس میں دور کا تکلف ہے، امام ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب میں اس کو روایت کیا ہے۔[3] واللّٰه سبحانه و تعالیٰ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جملہ ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ مستانفہ ہے اللہ پاک کی طرف سے۔ موصول محلِ نصب میں ہے ﴿ رُسُلَنَا ﴾ پر معطوف ہے، یعنی البتہ ہم فتح دیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور فتح دیتے ہیں ان لوگوں کو جو اُن کے ساتھ ایمان لائے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ان کو دنیا کی زندگی میں ان کے دشمنوں پر قاہر اور غالب کرتے ہیں، اس طرح کہ اللہ پاک نے ان کو اس کا خوگر کر رکھا ہے کہ ان کے دشمنوں سے ان کے قتل کرنے اور مال و اسباب چھین لینے اور قید کر لینے کی صورت میں ان کا انتقام لیتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ غلبہ اور قہر کے ساتھ انتقام لیتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حجت کے ساتھ۔ کسی نے کہا ہے کہ اس طرح انتقام لیتا ہے کہ دشمنوں کا بالکل استیصال کر دیتا ہے، اگرچہ بعض اوقات اللہ کی طرف سے امتحان کے طور پر دنیا میں مغلوب ہو جاتے ہیں اور انجام نیک انہیں کا ہوتا ہے۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے بھائی کی آبرو کی حفاظت کرے گا تو اللہ قیامت کے دن اس کے منہ سے جہنم کی آگ کو دور کرے گا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... الآية ﴾[4] (أخرجه أحمد والترمذي وحسنه وابن أبي الدنيا والطبراني وابن مردويه والبيهقي في الشعب وأخرج ابن مردويه من حديث أبي هريرة رضي الله عنه مثله)

---

[1] تفسير الطبري (٤٠٤/٢١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٦٨/١٠) [3] تفسير ابن كثير (١٠٥/٤-١٠٧)

[4] مسند أحمد (٤٥٠/٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٣١) شعب الإيمان (١١١/٦) الدر المنثور (٢٩٢/٧) صحيح الجامع (٦٢٦٢)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ سے مراد روزِ قیامت ہے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَشْهَادٌ" ملائکہ، نبیین اور مومنین ہیں۔ امام مجاہد اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ملائکہ ہیں جو انبیاء کے لیے گواہی دیں گے کہ انھوں نے رسالت پہنچا دی تھی اور اُن کی اُمتوں کی تکذیب کی گواہی دیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ ملائکہ حافظین بنی آدم پر ان کے اعمال کی گواہی دیں گے جو انھوں نے کیے اور اسی طرح جوارح اور اعضاء ان پر اس کام کی گواہی دیں گے جو انھوں نے کیا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَشْهَادٌ" جمع ہے "شَاهِدٌ" کی، جیسے صاحب و اصحاب۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ باب فاعل کا نہیں ہے کہ افعال پر جمع کیا جائے اور نہ اس پر قیاس کیا جاتا ہے، لیکن جو اس سے سنا ہوا آیا ہے وہ اسی مسموع پر ادا کیا جائے گا۔[1] چنانچہ اس بنا پر "أَشْهَادٌ" "شَهِيْدٌ" کی جمع ہوگی، جیسے: شریف و اشراف۔

بالجملہ اللہ پاک دنیا میں اور قیامت میں رسولوں کی اور مومنوں کی مدد کرتا ہے۔ قیامت میں مدد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان کو جنت میں داخل کرے گا اور اپنی کرامتوں سے ان کا اکرام فرمائے گا۔ اور کفار کو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا اور لعنت کرے گا اور دوزخ میں داخل کرے گا۔ یہ معنی ہیں ﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴾ کے کہ لعنت تو رحمت سے دوری ہے اور سوئے دار دوزخ ہے۔ ان کو جو معذرت فائدہ نہ دے گی تو اس لیے کہ وہ ایک عذرِ باطل اور بے کار کا بہانہ اور بے معنی شبہہ ہے۔ جمہور نے "تنفع" بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے اور نافع اور کوفیوں نے بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے اور لغت میں یہ سب جائز ہے۔

نکتہ:

اللہ پاک نے جو بجائے "وَفِي الْاٰخِرَةِ" کے ﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ فرمایا تو اس لیے کہ یہ بات بتانا منظور ہے کہ کوئی بڑا بادشاہ جب اپنے بعض اعلیٰ عہدے داروں کو حاضرین اور کثیر مجمع کے سامنے خاص اکرام اور تعظیم کرتا ہے اور خلعت عنایت فرماتا ہے تو اس میں زیادہ لذت اور عزت ہوتی ہے بہ نسبت اس کے کہ تنہائی میں عزت و تکریم کرے۔ "أَشْهَادٌ" سے مراد ہر وہ شخص ہے جو قیامت کے دن بندوں کے اعمال کی گواہی دے گا، خواہ وہ ملائکہ میں سے ہو یا انبیاء اور مومنین میں سے۔ فرشتے تو کراماً کاتبین ہیں، جو مشاہدہ کیا اس کی گواہی دیں گے اور انبیاء اس لیے حاضر ہوں گے کہ اپنی اُمتوں پر تصدیق اور تکذیب کی گواہی دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ٤١] "پس کیا حال ہوگا جس وقت کہ ہر امت میں سے ایک گواہ ہم لائیں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے۔" مومنین بھی لوگوں پر گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾ [البقرة: ١٤٣]

---

[1] تفسیر القرطبي (١٥/٣٢٢، ٣٢٣)

''ہم نے اسی طرح تمھیں عادل امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہو جائیں۔''

پھر اللہ پاک نے یہ بیان فرمایا کہ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام کی تکریم وتشریف اس طرح سے ہوگی کہ اس میں ان کے دشمنوں کو تین امر حاصل ہوں گے: ایک تو یہ کہ بالکل ان کا عذر مقبول نہ ہوگا۔ دوسرا یہ کہ لعنت انہیں میں منحصر ہوگی، اسی لیے ﴿ لَهُمُ اللَّعْنَةُ ﴾ فرمایا ہے۔ لعنت سے مراد توہین اور ذلت ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ ﴿ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴾ یعنی جہنم انہیں کے ساتھ مختص ہوگی۔ اپنے دشمنوں کی توہین کے وقت میں انبیاء کی عزت وتکریم کرنے سے انبیاء علیہم السلام کے ثواب کی تعظیم کو ظاہر کرنا ہے، اس لیے کہ ''بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ'' سفیدی کی خوبی سیاہی کے مقابلے میں خوب نظر آتی ہے۔ بالجملہ چونکہ انبیاء ومومنین کی نصرت اور کامیابی کا ذکر ہو رہا ہے، اس لیے اس کی ایک نظیر بھی ذکر فرمائی: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴾ یعنی البتہ واقعی ہم نے موسیٰ کو ہدایت دی۔ ہدایت سے مراد تورات ونبوت ہے جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ ﴾ [المائدۃ: ٤٤] ''بے شک ہم نے تورات نازل کی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔'' مقاتل نے کہا کہ ہدایت ضلالت سے، یعنی تورات[1] اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث کیا، یعنی اس ذلت کے بعد جس میں وہ تھے۔ ﴿ اَلْكِتٰبَ ﴾ سے مراد تورات ہے۔ وارث کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے جب موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی تو اُن کے بعد وہ بنی اسرائیل میں باقی رہی اور خلف وسلف میں سے اس کے وارث ہوتے چلے آئے۔ کسی نے کہا: کتاب سے مراد وہ ساری کتابیں ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد انبیائے بنی اسرائیل پر نازل کی گئیں۔

﴿ هُدًى وَّذِكْرٰى ﴾ یا تو مفعول لہ ہیں، یعنی ہم نے ان کو ہدایت کرنے اور یاد کرنے کے لیے کتاب کا وارث کیا، یا دونوں حال ہیں بہ معنی اسم فاعل، یعنی درآنحالیکہ وہ کتاب ہدایت دینے والی اور نصیحت دینے والی اور مرشد ہے، ان کے لیے جو عقلِ سلیم رکھتے ہیں۔ ﴿ هُدًى ﴾ اور ﴿ ذِكْرٰى ﴾ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ﴿ هُدًى ﴾ وہ شے ہے جو کسی دوسری شے پر دلیل ہو۔ اس کی شرط یہ نہیں ہے کہ وہ کسی اور شے کو جو بھول گئی تھی یاد دلائے اور ﴿ ذِكْرٰى ﴾ وہ شے ہے جو اس قسم کی ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی کتابیں انہی دو قسموں پر مشتمل ہیں، کیوں کہ بعض تو فی نفسہ دلائل ہیں اور بعض مذکر ہیں، یعنی اس شے کو یاد دلاتی ہیں جو پہلی کتبِ الٰہیہ میں ہے۔

﴿ فَاصْبِرْ ﴾ مرتب ہے ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا ﴾ پر اور ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى ﴾ جملہ معترضہ کی طرح ہے اور رسولوں کی نصرت کے بیان اور تاکید کے لیے لایا گیا۔ گویا یوں کہا کہ جب تو رسولوں کی نصرت کے بیان کو سن چکا جس کا ہم نے وعدہ کیا اور جو کچھ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا کہ ہم نے اس کو ہدایت دینے کے اسباب اور فرعون پر نصرت پانے کے اسباب دیے، وہ بھی سن چکا اور اس کے بعد بنی اسرائیل میں اس کی ہدایت کے آثار باقی رکھے تو

[1] تفسیر البغوي (۱۵۲/۷)

اب اس بات کو جان لے کہ بے شک اللہ تعالیٰ تجھے بھی نصرت دینے والا ہے جیسی نصرت ان کو دی اور مشرکوں کی ایذاء پر صبر کر، کیوں کہ اچھا انجام تیرے لیے ہے۔ بے شک اللہ کا وعدہ جو اپنے رسولوں سے کیا ہے، وہ سچا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں اور نہ ہی اس کے واقع ہونے میں کچھ شک ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا ﴾ اور اس آیت میں: ﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧١﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ [الصافات: ١٧١۔ ١٧٣] ''اور البتہ ہمارا وعدہ پہلے ہی اپنے رسولوں کے لیے صادر ہو چکا ہے کہ یقیناً وہ ہی مدد کیے جائیں گے اور ہمارا ہی لشکر غالب (اور برتر) رہے گا۔'' امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیتِ قتال نے آیتِ صبر کو منسوخ کر دیا۔[1]

پھر اللہ پاک نے آپ کو استغفار کا حکم دیا۔ ارشاد فرمایا: ﴿ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ﴾۔ کہا ہے کہ مضاف محذوف ہے "أَيْ: لِذَنْبِ أُمَّتِكَ"، یعنی مغفرت مانگ اپنی اُمت کے گناہ کے لیے۔ کسی نے کہا ہے کہ ذنب سے مراد صغائر ہیں، اس شخص کے لیے جو انبیا علیہم السلام سے صغائر کا ہونا جائز سمجھتا ہے اور جو شخص صغائر کو ان پر جائز نہیں رکھتا تو اس کے نزدیک نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ امر صرف استغفار کے ساتھ عبادت کرنا ہے، تاکہ اس استغفار کی عبادت سے اور زیادہ ثواب ملے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ پاک نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیے ہیں۔

﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ مستقل طور پر صبح و شام اللہ کی پاکی بیان کرتا رہ اس کی حمد کے ساتھ ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ تسبیح کے ساتھ حمد کر؛ "سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ"۔ اللہ سبحانہ سب برائیوں سے پاک اور ساری خوبیوں کے ساتھ موصوف ہے۔ چنانچہ تمام نقصانوں سے اس کو مبرا و منزہ سمجھنا اور اس کی پاکی بیان کرنا تسبیح ہے اور تمام کمالات کے ساتھ اس کا وصف کرنا حمد ہے۔ "بِحَمْدِ اللّٰهِ" نہ کہا ﴿ بِحَمْدِ رَبِّكَ ﴾ فرمایا، اس لیے کہ اس کی ربوبیت حمد کی وجہ ہے، کیوں کہ جو منعمِ حقیقی ہے اور شب و روز ہر لحہ پورے طور پر جس کی تربیت عام طور پر سارے عالم کی اور خصوصاً ہماری ہو رہی ہے اس کی حمد تو ضروری ہے اور مزید انعام و اکرام کا موجب ہے۔ چنانچہ جب اس کا انعام دائمی ہے تو اس کی تسبیح اور حمد بھی دائمی ہونی چاہیے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد پانچوں نمازیں ہیں۔ "عشي" تو بعد زوال کے ہوتی ہے، اس میں چار نمازیں ہیں اور "أبکار" فجر سے زوال تک۔ اس میں ایک نمازِ فجر ہے۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ ان دو وقتوں میں نماز پڑھ عصر کی اور فجر کی۔ یہ قول حسن اور قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔[2] کسی نے کہا: یہ دو نمازیں ہیں دو رکعت تو صبح کو اور دو رکعت عشیہ کو۔ یہ نماز پنج گانہ نماز کے فرض ہونے سے پہلے تھی۔

بالجملہ جب اللہ پاک نے کلام کی ابتداء آیات اللہ میں جھگڑنے والوں کا رد کرنے کے ساتھ کی تھی اور بعض کے ساتھ بعض کا کلام متصل یہاں تک چلا آیا تھا تو اب اس وجہ کا ذکر کیا جو کفار کے اس جھگڑنے کا باعث ہوتی ہے۔

[1] تفسير البغوي (١٥٢/٧) [2] تفسير القرطبي (٣٢٤/١٥)

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ﴾ یعنی جو لوگ اللہ کی آیتوں، یعنی قرآن شریف میں بغیر کسی ظاہری اور واضح حجت کے جھگڑا کرتے ہیں، ایسی حجت جو اللہ پاک کی طرف سے ان کے پاس آئی ہو، ان کے دلوں میں حق کے ساتھ تکبر ہے جو ان کو تیری تکذیب پر آمادہ کرتا ہے، ایسا تکبر جس کو وہ پہنچنے والے نہیں ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے ﴿ بِبَالِغِيْهِ ﴾ میں مضاف محذوف مانا ہے۔ ''أَيْ: بَالِغِيْ إِرَادَتِهِمْ فِيْهِ'' یعنی اس تکبر میں وہ اپنا ارادہ حاصل کرنے والے نہیں ہیں۔ وہ ارادہ یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر تعاظم وریاست وتقدم ہے، مگر یہ ہونا نہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ کے علاوہ نے کہا: تقدیر یہ ہے: ''بَالِغِيْ كِبْرَهُمْ''۔ امام قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی نبی اکرم ﷺ پر تکبر اور اس بات کا طمع کہ ان پر غالب ہوں، حالانکہ وہ اس کو پہنچنے والے نہیں ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ تکبر سے مراد امرِ کبیر ہے، یعنی نبوت طلب کرتے ہیں، یا کسی امرِ کبیر کے طالب ہیں، یعنی آپ کو قتل کرا دیں اور وہ اس کو نہ پہنچیں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کے سینوں میں ایک عظمت ہے کہ وہ اس کو پہنچنے والے نہیں ہیں۔[2] (امام مجاہد رحمہ اللہ کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: ''الأكبر أي: عظمة قريش''[3]) مجادلہ کو ﴿ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ﴾ کے ساتھ مقید کیا، باوجود اس کے کہ اس سلطان کا آنا محال ہے تو اس سے اس بات کا بتانا منظور ہے کہ جو امرِ دین میں کلام کرنے والا ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس سلطانِ مبین کی سند ہو۔

اس آیتِ کریمہ سے مراد مشرکین ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہود ہیں۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہود کے حق میں نازل ہوئی امرِ دجال کے بارے میں جس کا وہ انتظار کرتے ہیں۔[4] امام ابو السعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر جھگڑا کرنے والے کے حق میں عام ہے، گو اس کا نزول مشرکینِ مکہ کے بارے میں ہوا ہے۔[5] بالجملہ جب اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کی تسلی فرما دی کہ جھگڑنے والے اپنی مراد نہ پاسکیں گے تو اب آپ ﷺ کو حکم دیا کہ ان کے شروں سے اللہ کی پناہ مانگیں، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ یعنی ان کے شر، مکر وفریب اور سرکشی سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا رہ، بے شک اللہ تعالیٰ ان کی باتوں کو خوب سننے والا ہے اور ان کے کاموں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ اس پر ان میں سے کوئی پوشیدہ شے بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ چوں کہ دوبارہ مر کر جی اُٹھنا اور اکٹھا ہونا ایسے معاملات میں سے تھا جن میں کافر لوگ جھگڑتے تھے اور جن کا انکار کرتے تھے، بلکہ ان کے ہر جھگڑے کی بنا اسی پر تھی، اس لیے اللہ پاک نے بعث کے حق ہونے پر حجت قائم کی، چنانچہ ارشاد فرمایا:[6]

[1] فتح القدير (٤/٦٥٢) [2] تفسير الطبري (٢١/٤٠٤) [3] فتح القدير (٤/٦٥٥)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٦٨) [5] تفسير أبي السعود (٧/٢٨١) [6] فتح البيان (١٢/١٩٩-٢٠٣)

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٥٧ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۭ قَلِيْلًا
مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝٥٨ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٥٩ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝٦٠

آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے کہیں زیادہ بڑا (کام) ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (57) اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور برائی کرنے والے (برابر نہیں) تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو (58) بلاشبہ قیامت یقیناً آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے (59) اور تمھارے رب نے کہا ہے: تم مجھے پکارو، میں تمھاری (دعائیں) قبول کروں گا، بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عن قریب ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے (60)

حیات بعد الممات:

اکثر لوگ بے علم ہیں، یعنی دوسری بار پیدا ہونا محال سمجھتے ہیں۔ ایمان لانے والے اور بدکار برابر نہیں ہیں، یعنی ایک دن چاہیے کہ ان کا فرق ظاہر ہو۔ عبادت کی شرط ہے کہ اپنے رب سے مانگا جائے، نہ مانگنا غرور ہے۔ اگر دنیا نہ مانگے تو مغفرت ہی مانگے اور اس سے معلوم ہوا کہ اللہ پکار کو پہنچتا ہے، پس یہ برحق بات ہے مگر یہ نہیں کہ ہر بندے کی ہر دعا قبول کرے، وہ مالک ہے اپنی مرضی اور خوشی کرتا ہے۔ انتہیٰ.

اللہ پاک اس بات سے آگاہ فرماتا ہے کہ وہ خلائق کو قیامت کے دن دوہرا دے گا اور یہ کام اس کے لیے سہل اور آسان ہے، اس طرح سے کہ اس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا اور اُن کا پیدا کرنا بڑا کام ہے لوگوں کے پہلی بار پیدا کرنے اور دوبارہ پیدا کرنے سے۔ چنانچہ جو ذات پاک اس پر قادر ہوا ہے تو وہ اس سے کم درجے کے کام کی قدرت تو بہ طریق اولیٰ واخریٰ رکھتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓي اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [الأحقاف: ٣٣] ''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے وہ نہ تھکا، وہ یقیناً مُردوں کو زندہ

کرنے پر قادر ہے؟ کیوں نے ہو؟ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔'' یہاں یوں فرمایا: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اکثر اس کو نہیں جانتے، اسی لیے اس حجت کو سوچتے نہیں ہیں جس طرح کہ بہت سے عرب تھے، جو اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا ہے اور استبعاد، کفر اور عناد کے طور پر قیامت کا انکار کرتے تھے، حالاں کہ جس بات کا اقرار کر چکے، وہ اس بات سے بڑی تھی جس کا انکار کیا۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ... الآية ﴾ یعنی جس طرح اندھا جو دیکھ نہیں سکتا، اور بصیر، جو دیکھتا ہے جہاں تک اس کی نگاہ جاتی ہے، برابر نہیں ہو سکتے، بلکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے، اسی طرح مومنین نیکو کار اور کافر بدکردار برابر نہیں ہو سکتے۔ کیا کم سوچ رکھتے ہیں بہت سے لوگ! پھر فرمایا: بے شک قیامت آنے والی، یعنی ہو پڑنے والی ہے، اس میں کچھ شک نہیں ہے، لیکن اکثر لوگ اس کی تصدیق نہیں کرتے، بلکہ اس کے ہونے کو جھٹلاتے ہیں، امام مالک رحمہ اللہ اہلِ یمن کے ایک شیخ قدیم سے راوی ہیں کہ وہ وہاں سے آیا، اس نے کہا: میں نے یہ سنا ہے کہ جب قیامت قریب ہو گی تو لوگوں پر آزمائش سخت ہو گی اور سورج کی گرمی سخت ہو جائے گی۔[1]

واللّٰه أعلم (أخرجه ابن أبي حاتم)

دعا کی اہمیت وحکم:

اللہ سبحانہٗ کے فضل و کرم کو تو دیکھو کہ اس نے اپنے بندوں کو اپنی دعا کی طرف بلایا اور ان کے لیے دعا قبول کرنے کا ضامن ہوا، چنانچہ فرمایا: ﴿ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ جس طرح کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ''يَا مَنْ أَحَبُّ عِبَادِهِ إِلَيْهِ مَنْ سَأَلَهُ فَأَكْثَرَ سُؤَالَهُ، وَيَا مَنْ أَبْغَضُ عِبَادِهِ إِلَيْهِ مَنْ لَّمْ يَسْأَلْهُ، وَلَيْسَ أَحَدٌ كَذٰلِكَ غَيْرَكَ يَا رَبِّ''[2] یعنی اے وہ ذات کہ اس کو سب سے زیادہ محبوب وہ بندہ ہے جس نے اس سے مانگا، پھر خوب ہی مانگا! اور اے وہ ذات کہ اس کو سب سے زیادہ مبغوض وہ بندہ ہے جس نے اس سے نہ مانگا اور اے میرے رب! تیرے سوا کوئی ایسا نہیں ہے۔ اسی معنی میں ایک شاعر کہتا ہے:

اَللّٰهُ يَغْضَبُ إِنْ تَرَكْتَ سُؤَالَهُ   وَبَنِيْ آدَمَ حِيْنَ يُسْأَلُ يَغْضَبُ

''اللہ تو خفا ہوتا ہے اگر تو اس سے مانگنا چھوڑ دے اور بنی آدم سے جب کوئی مانگے تو خفا ہوتا ہے۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس اُمت کو تین چیزیں ایسی ملی ہیں کہ اس سے پہلے کسی امت کو نہیں ملیں مگر نبی کو۔ جس وقت اللہ تعالیٰ کسی نبی کو بھیجتا تھا تو اس سے فرماتا کہ تو گواہ ہے اپنی امت پر اور تم کو اس نے گواہ بنایا ہے لوگوں پر اور اس سے کہا جاتا تھا کہ دین میں تجھ پر کچھ حرج نہیں ہے اور اس نے اس اُمت

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٦٨) [2] تفسير ابن كثير (٤/١٠٨)

کے لیے یوں فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ [الحج: ٧٨] ''اور تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں ڈالی۔'' نیز اس سے کہہ دیا جاتا تھا: ﴿ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ یعنی تو مجھ سے مانگ میں تیرے لیے قبول کروں گا اور اس نے اس امت سے فرمایا ہے: ﴿ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾[1] (رواه ابن أبي حاتم)

اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: چار خصلتیں ہیں ان میں سے ایک میرے واسطے ہے اور ایک تیرے واسطے ہے اور ایک میرے اور تیرے درمیان ہے اور ایک تیرے درمیان اور میرے بندوں کے درمیان ہے: وہ خصلت جو میرے لیے ہے وہ یہ ہے کہ تو مجھے پوجے اور میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کرے اور وہ خصلت جو تیرے لیے ہے مجھ پر وہ یہ ہے کہ تو جو کوئی بھلائی کرے گا میں تجھے اس کی جزا دوں گا اور وہ جو میرے اور تیرے درمیان ہے وہ یہ ہے کہ تجھ پر دعا کرنا ہے اور مجھ پر اس کا قبول کرنا ہے اور وہ جو میرے بندوں کے اور تیرے درمیان ہے وہ یہ ہے کہ تو ان کے لیے وہ شے پسند کر جو تو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔[2] (رواه الحافظ أبو يعلىٰ عن أنس بن مالك رضي الله عنه عن النبي ﷺ فيما يروي عن ربه عزوجل) سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ» یعنی بے شک دعا عبادت ہی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾[3] (رواه الإمام أحمد و هكذا رواه أصحاب السنن الترمذي والنسائي وابن ماجه وابن أبي حاتم و ابن جرير كلهم من حديث الأعمش به وقال الترمذي: حسن صحيح و رواه أبو داود و الترمذي و النسائي و ابن جرير أيضا من حديث شعبة عن منصور و الأعمش كلاهما عن ذر به و كذا رواه ابن يونس عن أسيد بن عاصم بن مهران حدثنا النعمان بن عبدالسلام ثنا سفيان الثوري عن منصور عن ذر به و رواه ابن حبان و الحاكم في صحيحيهما وقال الحاكم: صحيح الإسناد)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ عزوجل سے دعا نہیں کرتا تو وہ اس پر خفا ہوتا ہے۔[4] (تفرد به أحمد وهذا إسناد لا بأس به) امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ان الفاظ کے ساتھ دوسری روایت کی ہے: «مَنْ لَّمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ»[5] یعنی جو شخص اللہ سے سوال نہیں کرتا تو اس پر وہ خفا ہوتا ہے۔ حافظ ابو محمد حسن بن عبدالرحمان رامہرمزی نے محمد بن سعید سے روایت کیا ہے، کہا کہ جب محمد بن مسلمہ انصاری رحمہ اللہ فوت ہوئے تو ہم نے ان کے درایۂ سیف میں ایک خط پایا (اصل میں اسی طرح

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٦٨/١٠، ٣٢٦٩)

② مسند أبي يعلىٰ (١٤٣/٥) اس کی سند میں ''صالح مری'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤١٥٢)

③ مسند أحمد (٢٧١/٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٤٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٥٠/٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٢٨) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٦٩/١٠) تفسير الطبري (٤٠٨/٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٤٠٧)

④ مسند أحمد (٤٤٣/٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٥٤)

⑤ سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٤١٨)

ہے۔ کتبِ لغت میں تلاش کیا نہ ملا۔ واللّٰہ أعلم۔ یہ کیا ہے۔ قرابِ سیف تو البتہ وہ ہوتا ہے جس میں تلوار بمعہ میان وغیرہ اس ظرف میں رکھتے ہیں یا شاید ذوَابہ ہو۔ ذوَابہ بہ معنی گیسو ہے، شمشیر میں جو چمڑا لٹکاتے ہیں، اس کو بھی ذوَابہ کہتے ہیں۔ واللّٰہ أعلم) بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِيمِ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: « إِنَّ لِرَبِّكُمْ فِيْ بَقِيَّةِ أَيَّامِ دَهْرِكُمْ نَفَحَاتٌ فَتَعْرِضُوْا لَهُ (اصل میں اسی طرح ہے۔ ظاہر "لها"، معلوم ہوتا ہے) لَعَلَّ دَعْوَةً أَنْ تُوَافِقَ رَحْمَةً فَيَسْعَدُ بِهَا صَاحِبُهَا سَعَادَةً لَا يَخْسَرُ بَعْدَهَا أَبَدًا »۔[1] یعنی بے شک تمھارے رب کے لیے زمانے کے بقیہ ایام میں رحمت کی ہوائیں ہیں، لہٰذا تم ان سے تعرض کرو، یعنی ان کے سامنے آؤ، شاید کوئی دعا کسی رحمت کے موافق پڑ جائے تو اس کے سبب سے دعا والا ایسا سعادت مند ہو جائے کہ اس سعادت کے بعد پھر کبھی زیاں کار نہ ہو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ﴾ یعنی جو لوگ میری دعا اور توحید سے تکبر کرتے ہیں، وہ عن قریب ذلیل وحقیر ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے، جس طرح کہ امام احمد رحمہ اللہ نے عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی ﷺ روایت کیا ہے کہ تکبر کرنے والے قیامت کے دن چھوٹی چیونٹیوں کی طرح آدمیوں کی صورت میں حشر کیے جائیں گے، ہر شے ان کو ذلیل کرتی ہوئی ان پر چڑھتی ہوگی، یہاں تک کہ جہنم کے ایک قید خانے میں داخل ہوں گے، جس کو بولس کہتے ہیں، ان کو آگوں کی آگ چڑھے گی اور وہ طینۃ الخبال، یعنی دوزخیوں کے پیپ اور خون کے نچوڑ سے پلائے جائیں گے۔[2]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے وہیب بن ورد سے روایت کیا ہے، کہا: مجھے ایک شخص نے بیان کیا ہے کہ میں ایک دن ارضِ روم میں جا رہا تھا، چنانچہ میں نے ایک ھاتف، یعنی آواز دینے والے کو کسی پہاڑ کی چوٹی پر سے سنا اور وہ کہہ رہا تھا: "يَا رَبِّ عَجِبْتُ لِمَنْ عَرَفَكَ كَيْفَ يَرْجُوْ أَحَدًا غَيْرَكَ، يَا رَبِّ عَجِبْتُ لِمَنْ عَرَفَكَ كَيْفَ يَطْلُبُ حَوَائِجَهُ إِلٰى أَحَدٍ غَيْرَكَ"، یعنی اے میرے پروردگار، پالنہار! میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جس نے تجھے پہچانا وہ تیرے سوا کسی اور سے کیوں کر اُمید رکھتا ہے۔ اے میرے رب! میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جس نے تجھے پہچانا، وہ تیرے سوا کسی اور سے اپنی حاجات کیسے طلب کرتا ہے!! پھر کہا کہ میں چلا اور طامۂ کبریٰ آئے۔ کہا: پھر اس شخص نے دوبارہ کہا: "يَا رَبِّ! عَجِبْتُ لِمَنْ عَرَفَكَ كَيْفَ يَتَعَرَّضُ لِشَيْءٍ مِنْ سَخَطِكَ يُرْضِيْ غَيْرَكَ"، یعنی اے میرے رب! میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں، جس نے تجھے پہچانا، وہ کیسے تجھے ناراض کر کے کسی اور کو راضی کرتا ہے۔

---

[1] المحدث الفاصل بين الراوي والواعي (٤٩٧/١)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٩٢) مسند أحمد (١٧٩/٢) صحيح الجامع (٨٠٤٠)

امام وہیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ طامۂ کبریٰ یہی کلمہ ہے۔ کہا: پھر میں نے اس کو پکارا کہ کیا تو جنوں میں سے ہے یا انسانوں میں سے؟ اس نے کہا: بلکہ میں انسانوں میں سے ہوں تو اپنے نفس کو اس چیز میں مشغول کر جو تجھے فائدہ دے اس شے کے بجائے جو تجھے فائدہ نہ دے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ پہلے پہل بغیر کسی مادے کے آسمان و زمین کا پیدا کرنا دلوں کے لیے اور سینوں کے لیے بہت بڑا کام ہے بہ نسبت لوگوں کو دوبارہ پیدا کرنے کے، اس لیے کہ زمین و آسمان کا جرم (جسم، جثہ) بڑا ہے اور وہ بغیر کسی ستون کے قرار پذیر ہیں اور افلاک تاروں کو لیے چلتے ہیں، بغیر کسی سبب کے، یہ کام زیادہ مشکل ہے، اس لحاظ سے کہ کام کرنے میں لوگوں کی عادت بھی یہی ہے کہ بڑی شے بنانے میں زیادہ محنت اور مشقت ہوتی ہے بہ نسبت چھوٹی چیز کے بنانے میں، گو اللہ پاک کے لیے بڑی اور چھوٹی چیز کو بنانے میں کوئی فرق نہیں ہے، لہٰذا جب ایسی ایسی بڑی چیزیں جن کو اللہ پاک نے بنایا ہے، رات دن دیکھ رہے ہیں، پھر کیوں دوبارہ جی اُٹھنے کا انکار کرتے ہیں اور اس شے کے زندہ کرنے کا انکار کرتے ہیں جو ہر طرح سے زمین و آسمان سے کم تر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴾ [یٰسٓ: ۸۱] ''جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کیا وہ ان جیسوں کو پیدا کرنے پر قادر نہیں، بے شک قادر ہے اور وہی تو پیدا کرنے والا دانا (وبینا) ہے۔''

یحییٰ بن سلام رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت منکرینِ بعث پر حجت قائم کرنا ہے، یعنی آسمان و زمین کا پیدا کرنا، لوگوں کے دوبارہ پیدا کرنے سے بہت بڑا کام ہے،[2] لیکن اکثر لوگ، یعنی کفارِ مکہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کو نہیں جانتے اور اس بات کو کہ اسے کوئی شے عاجز نہیں کرتی، چنانچہ وہ تو اندھے کی طرح ہیں اور جو شخص اس کو جانتا ہے، وہ دیکھنے والے کی طرح ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ چوں کہ اللہ پاک نے جدال بالباطل کا ذکر فرمایا، اس لیے مبطل اور محق کی ایک مثال بیان فرمائی کہ اندھا اور دیکھتا دونوں برابر نہیں ہوتے۔ اندھا وہ ہے جو باطل کے ساتھ جھگڑتا ہے اور دیکھتا وہ ہے جو حق کے ساتھ جدال کرتا ہے۔ یا اعمیٰ وہ ہے جو اپنے مبدأ و معاد میں حق کے پہچاننے سے غافل ہے اور بصیر وہ ہے جو ان دونوں کے پہچاننے میں بصیرت والا ہے اور اسی لیے اعمیٰ کو پہلے ذکر کیا ہے، کیوں کہ آیت میں اس سے پہلے حصے میں جو دیکھنے اور غور وفکر کی نفی فرمائی ہے۔ اس کے مناسب اعمیٰ ہے۔

---

[1] تفسير ابن كثير (١٠٧/٤-١٠٩) [2] تفسير القرطبي (٣٢٥/١٥)

اس کے بعد والی آیت کے حصے ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ﴾ میں مومنین کو جو پہلے رکھا ہے تو دو وجہ سے ہے، ایک تو بصیر کا قرب دوسرے ان کا شرف۔ ''مسيء'' کا عکس محسن ہوتا ہے۔ محسن نیکو کار کو اور ''مسیٔ'' بدکار کو کہتے ہیں، یعنی برابر نہیں ہوتا وہ شخص جو ایمان لا کر نیک کام کر کے نیکو کار ہوا ہے اور وہ شخص جو کفر و معاصی کر کے بدکار ہوا ہے۔ یہاں ''أعمیٰ'' کا بصیر سے تقابل کیا ہے اور محسن کا ''مسيء'' سے۔ تقابل تین طرح سے آیا کرتا ہے: ایک طریقہ یہ ہے کہ مناسب کے قریب وہ شے آئے جو اس کے مناسب ہو، جیسے: یہ آیت ہے کہ ''بصیر'' کی مناسبت سے محسن کو اس کے بعد ذکر کیا جس طرح کہ ''أعمیٰ'' کو ﴿ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ کی مناسبت سے بصیر پر مقدم کیا، ورنہ ''مَا يَسْتَوِي الْبَصِيْرُ وَالْأَعْمَى وَالْمُحْسِنُ وَلَا الْمُسِيْءُ'' ہوتا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دونوں متقابل مؤخر ہوں، جیسے یہ آیت ہے: ﴿ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [هود: ٢٤] ''ان دونوں فریقوں کی مثال اندھے، بہرے اور دیکھنے سننے والے جیسی ہے۔''

تیسرا یہ ہے کہ اول کا مقابل مقدم اور آخر کا مقابل مؤخر کیا جائے، جیسے یہ آیت ہے: ﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۝ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴾ [الفاطر: ١٩۔ ٢٠] ''اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں اور نہ تاریکی اور روشنی۔'' اور یہ سب بلاغت میں تفنن ہے۔ کلمۂ ﴿ لَا ﴾ کو جو ﴿ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ﴾ میں زیادہ کیا، وہ اس لیے کہ جب کلام بہ سبب صلہ کے طویل ہو گیا تو محسن کا قسیم (شریک) دور جا پڑا، چنانچہ کلمۂ ﴿ لَا ﴾ کو تاکید کے لیے اس کے ساتھ عود کر دیا۔ کلمۂ ﴿ لَا ﴾ جو دو فاعل فعل استواء کے درمیان واقع ہوتا ہے، اس میں دو مذہب ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ کا یہ مذہب ہے کہ زاید ہوتا ہے جہاں کہیں واقع ہو اور اس پر یوں استدلال کیا ہے کہ فعل استواء کا مثبت ہو یا منفی وہ دو یا زیادہ کے درمیان ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کے فاعل پر عطف اور اس کی اسناد تثنیہ یا جمع کی طرف لازم ہوئی ہے اور دو متقابل میں ہر ایک کی طرف اس کی اسناد تنہا درست نہیں ہے، اس لیے کہ تنہا اس کا قیام محال ہے۔

چنانچہ اگر یوں کہا جائے کہ ''لَا يَسْتَوِيْ زَيْدٌ وَلَا عَمْرٌو'' تو لازمی ہے کہ ﴿ لَا ﴾ زاید ٹھہرایا جائے اور جمہور اس طرف گئے ہیں کہ وہ زائد نہیں ہے، بلکہ اس کو اس لیے لاتے ہیں کہ دو متقابل میں سے ہر ایک دوسرے سے برابر نہ ہونے کا مطلب دے، ان معانی و اوصاف میں جو اس کے ساتھ خاص ہیں اور آیت میں ''مسيء'' سے محسن کی مساوات کی نفی سے مراد اس حقارت و خواری میں نفی ہے جس کا وہ مستحق ہے اور ''مسيء'' کی محسن سے مساوات اس فضل و کرامت میں جو اس کے لیے ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ نہیں برابر ہوتا وہ مومن جس نے عملِ صالح کیا اور ''مسيء'' اور نہ ''مسيء'' اور مومن برابر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے، حالاں کہ یہاں اعمیٰ، بصیر اور محسن و مسی بالذات متحد ہیں۔

تو ﴿ وَالَّذِيْنَ ﴾ کا عطف کیسے ٹھیک ہو گا؟ تو کہیں گے کہ گویا بہ اعتبارِ ذات متحد ہیں، لیکن وصف کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علاحدہ ہیں۔ اول تو بصیر کا اعمٰی پر عطف فرد بر فرد کر کے دونوں کی برابری کی نفی کی، پھر مجموع موصول کا اور جو اس پر عطف فرد بر فرد کر کے معطوف ہے، مجموع اعمٰی اور بصیر پر عطف کیا، عطف شفع بر شفع کر کے تو اس نے یہ فائدہ دیا کہ جس طرح فرد فرد برابر نہیں ہیں، اسی طرح شفع شفع بھی برابر نہیں ہیں، اس لیے کہ مجموع ثانی وصف کے لحاظ سے مجموع اول سے علاحدہ ہے، اگر چہ وہ بہ حسب ذات اکٹھے ہیں، کیوں کہ مجموع غافل و مستبصر وہ بعینہٖ مجموع محسن و مسیَ ہے، مگر وصف کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف اور علاحدہ ہیں، اس لیے کہ جن دو گروہ کے درمیان برابری کی نفی کی گئی، ان کی تعبیر اول تو اعمٰی اور بصیر کے ساتھ کی اور ثانیاً ان کو پیرائے مومن اور مسیَ فاجر میں ادا کیا اور اُن کے درمیان میں آپس میں تغایر نہیں ہے، مگر وصف کی بنا پر، اس بنیاد پر کہ مقصود بوصفین اولین مغایر بوصفین آخرین ہے۔ یا یوں کہیں گے کہ ایک شفع تو دال ہے وصفِ مقصود پر صریحاً اور دوسرا تمثیلاً۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ کو جمہور نے بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے۔ امام ابو حاتم اور ابو عبید رحمہما اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے، اس لیے کہ اس سے پہلے اور بعد میں کلام کی بنا غیبت پر ہے خطاب پر نہیں ہے[1] اور ضمیر "ناس" کی طرف راجع ہے جن کا ذکر ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ میں ہے، یا کفار کی طرف راجع ہے جو ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ ﴾ سے سمجھے جاتے ہیں۔ ﴿ قَلِيْلًا ﴾ صفت ہے مصدر محذوف کی اور کلمۂ ﴿ مَا ﴾ قلت کے معنی کی تاکید کے لیے ہے، یعنی اگر چہ وہ یہ جانتے ہیں کہ تبصر غفلت سے بہتر ہے اور یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اسی طرح عملِ صالح عملِ فاسد سے بہتر ہے، مگر وہ اس کو بہت ہی کم سوچتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ بالکل نہیں سوچتے۔ کوفیوں نے بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے، بنا بر خطاب، بطور التفات اس کا فائدہ اور وجہ کی نسبت زیادہ ہے اور مقام سے بھی اس کو مناسبت زیادہ ہے، کیوں کہ مقامِ توبیخ میں غیبت سے خطاب کی طرف مائل ہونا سخت درشتی اور انکار پر دال ہوتا ہے۔ (كما قال الكرخي)

دیکھو ﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ... الآية ﴾ میں کیا تفنن وحسنِ ادا ہے۔ مضمون صرف اتنا ہے کہ اعمٰی، بصیر، محسن اور مسیَ برابر نہیں ہیں۔ پہلے تو ﴿ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ کی مناسبت سے "أَعمىٰ" کو پہلے رکھا، پھر "بصیر" چوں کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے مناسب تھا، اس لیے اس کو اس سے متصل ذکر فرمایا، چنانچہ پہلے اس طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ پھر محسن کو ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ کے پیرائے میں ادا کیا گیا، گویا محسن کے معنی سمجھا دیے کہ محسن وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے اور اعمالِ صالح کرے۔ عملِ صالح وہ ہے جو سنت کے موافق ہو اور خالص اللہ تعالیٰ کے واسطے ہو، ریا اور سمعہ سے پاک صاف ہو۔ محسن کے معنی تو یہ ہوئے اور محسن کا لفظ مسیَ

---

[1] تفسير القرطبي (۱۵/۳۲۵)

کے مقابلے سے خود معلوم ہو گیا۔

پھر "وَالَّذِيْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا" نہ کہا، بلکہ بہ صیغۂ جمع فرمایا، شاید اس لیے کہ ایمان اور عملِ صالح ایسی نفیس شے ہے کہ اس کو سب کریں کوئی اس سے باز نہ رہے، کیوں کہ اللہ پاک کے سوا جو کچھ ہے وہ سب اس کی مخلوق ہے اور مخلوق کا کام یہی ہے کہ اپنے خالق پر ایمان لائے اور اس کی مطیع ہو۔ صالحات کی جمع لانے سے معلوم ہوا کہ محسن کی شان یہ ہے کہ بہ کثرت اعمالِ صالح کرے۔ ﴿وَلَا الْمُسِيْٓءُ﴾ کے اختصار کو دیکھو کہ "وَلَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَمِلُوْا السَّيِّأٰتِ" یا "وَلَا الَّذِيْنَ أَسَاءُوْا بِالْكُفْرِ وَالْمَعَاصِيْ" کے بجائے یہ ایک لفظ مفرد کس حسن وخوبی کے ساتھ کام دے رہا ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ برائی کے ذکر میں قصر کرنا اور بھلائی کے بیان میں طول اختیار کرنا بہتر ہوتا ہے۔ پھر "أَعْمىٰ" شروع میں اور "مسيئ" آخر میں واقع ہوا اور "بصير و محسن" درمیان میں۔ وَخَيْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَطُهَا وَكَمَا قِيْلَ: ع وَكِلَا طَرَفَيْ قَصْدِ الْأُمُوْرِ ذَمِيْمُ

"میانی روی کے دونوں کنارے قابلِ مذمت ہیں۔"

والله سبحانه وتعالىٰ أعلم بأسرار كلامه وحسن انسجامه وطوق البشر قاصر عن بلوغ مرامه فالأولىٰ أن نقول ما قاله الملائكة الكرام: سبحانك لا علم لنا إلا ما علمتنا إنك أنت العليم الحكيم، ونصلي ونسلم على سيدنا سيد العرب والعجم وعلى آله الكرام وصحبه العظام.

بالجملہ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ ... الآية﴾ کی شانِ نزول میں امام ابو العالیہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں یہود حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دجال آخر زمانے میں ہم سے ہوگا اور اس کے امر سے ہوگا، پھر اس کے امر کی عظمت بیان کی اور کہا: وہ ایسا ایسا کرے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، کہا: وہ اس شے کو نہ پہنچے گا جو کہے گا۔ ﴿فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ چنانچہ اپنے نبی کو حکم دیا کہ فتنۂ دجال سے پناہ مانگیں، البتہ زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنا دجال کے پیدا کرنے سے بڑا کام ہے۔[1] (أخرجه عبد بن حميد وابن أبي حاتم قال السيوطي بسند صحيح)

دجال کے ذکر اور صفت میں اور اس بارے میں کہ رسولوں نے اپنی اُمتوں کو اس سے ڈرایا اور آخر زمانے میں نکلے گا اور وہ امور جو اس سے واقع ہوں گے اور یہودی لوگ اس کے پیرو ہوں گے، اس سب میں بہت سی صحیح حدیثیں وارد ہوئی ہیں، جس طرح کہ صاحبِ فتح البیان نے اپنی کتاب "حجج الكرامة في آثار القيامة" میں اس کی خوب تحقیق فرمائی ہے۔ یہ جگہ ان سب حدیثوں کے بیان اور تفصیل کی نہیں ہے۔ سارے اہلِ سنت، محدثین اور فقہاء دجال کے قائل ہیں، بہ خلاف اس کے جس نے اس کا انکار کیا اور اس کے امر کو باطل کہا ہے اور وہ انکار کرنے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٦٨) الدر المنثور (٢٩٤٧)

والے خوارج، جہمیہ اور بعض معتزلہ میں سے ہیں۔ جبائی اور اس کے موافق لوگ اس بات میں مخالف ہیں کہ اس کا وجود تو صحیح ہے، لیکن یہ دعویٰ کیا ہے کہ جو اشیاء وہ لائے گا، وہ مخاریق اور خیالات ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اخبارِ صحیحہ اور متواترہ اس قول کو خوب دفع ورد کرتے ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ نے اس جگہ فی الجملہ تفصیل دی ہے۔[1]

غرضیکہ پہلے تو اللہ پاک نے ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ سے بعث کے واقع ہونے کا جواز ذکر کیا۔ پھر ﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ سے یہ بات بیان فرمائی کہ حکمت اس کے واقع ہونے کی مقتضی ہے، کیوں کہ جب اعمیٰ، بصیر، محسن اور مسیٔ برابر نہیں ہیں تو چاہیے کہ ان کے لیے ایک ایسا حال ہو جس میں ان کا فرق ظاہر ہو جائے، وہ حال بعث کے بعد میں ہوگا۔ پھر اس کے بعد یہ بیان کیا کہ قیامت ضرور ہی آنے والی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی اس کے آنے میں اور اس کے حصول اور قیام میں کسی طرح کا شک نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے شواہد واضح ہیں اور سارے رسولوں کا اس کے واقع ہونے کے وعدہ پر اجماع ہے اور جزا کا ہونا ضروری ہے، تاکہ مخلوق کا پیدا کرنا صرف اس کے فنا ہونے کے لیے نہ ہو، لیکن اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اس کی تصدیق کرتے ہیں، کیوں کہ ان کے فہم اور عقلیں حجت کے سمجھنے سے قاصر اور ضعیف ہیں۔ ﴿ اَكْثَرَ النَّاسِ ﴾ سے مراد کافر ہیں جو بعث کے منکر ہیں۔

پھر جب اللہ پاک نے یہ بیان فرمایا کہ قیامت کا قائم ہونا حق ہے اور اس میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہیں ہے تو اپنے بندوں کو وہ شے بتائی جو دارِ خلود، یعنی آخرت میں سعادت حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ لہٰذا اپنے رسول ﷺ کو حکم کیا کہ اس کی طرف سے اس چیز کو بیان کریں جس کے پہچانے کا ان کو حکم دیا ہے اور وہ یہ ہے: ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ یعنی تمھارے پروردگار نے فرمایا، جس نے تم کو پیدا کیا اور تم پر طرح طرح کے انعام کیے اور جس کے تم ہر وقت محتاج ہو کہ میری عبادت کرو، مجھے وحدہ لاشرک لہ مانو اور میری ہی عبادت کرو، میں تمھاری عبادت قبول کروں گا اور تم کو بخشوں گا اور تم کو ثواب دوں گا، چونکہ قیامت کے واقع ہونے میں حکمت یہ تھی کہ نیک و بد کو اس کے عمل کے مطابق جزا دی جائے، اس لیے بندوں کو حکم دیا کہ اچھے عمل کریں، تاکہ اچھی جزا ملے اور سب طاعتوں کا سر توحید اور عبادتِ الٰہی ہے۔ اور بیان کیا کہ جو لوگ اس کی عبادت سے تکبر کرتے ہیں، ان کی بری جزا ہے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے کہ یہاں دعا سے مراد توحید اور عبادت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر دعا سے مراد صرف عبادت نہ ہوتی تو بعد میں ﴿ عَنْ عِبَادَتِيْ ﴾ کے بجائے "عَنْ دُعَائِيْ" فرماتا۔ جب ایسا نہ کیا بلکہ لفظ عبادت ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ دعا

---

[1] تفسير الخازن (٦/٩٨-١٠١)

سے عبادت مراد ہے اور جب عبادت کو دعا کے پیرائے میں ادا کیا تو اس کی مشابہت کی رعایت سے اِثابت کو استجابت کے لباس میں ادا فرمایا۔ دوسری دلیل وہ حدیث ہے جس کو سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے اور جس میں « اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ »[1] فرمایا گیا ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ تیسری یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: "وَحِّدُوْنِيْ أَغْفِرْ لَكُمْ"[2] چوتھی دلیل یہ ہے کہ سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: "اُعْبُدُوْنِيْ"[3] دوسرا قول یہ ہے کہ دعا واستجابت سے مراد ظاہری معنی ہیں، یعنی سوال وتضرع کرنا اور دعا کا قبول کرنا ہے، لیکن دعا کی قبولیت کا وعدہ مشیتِ الٰہی کے ساتھ مشروط ہے۔ ﴿ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ میں قبول کروں گا اگر میں چاہوں گا۔ کما قال تعالیٰ: ﴿ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ ﴾[الأنعام: ٤١] ''پھر جس کے لیے تم پکارو گے اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا بھی دے۔''

اب یہ بات رہی کہ اس قول کی بنا پر ظاہر یہ تھا کہ ﴿ عِبَادَتِيْ ﴾ کی جگہ "عَنْ دُعَائِيْ"ہوتا؟ تو اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ ہے کہ جو تکبر دعا سے باز رکھنے والا ہے، اس کو مبالغے کے لیے اس استکبار کے قائم مقام ٹھہرایا جو عبادت سے روکنے والا ہے، گویا ایک دوسرے کو مستلزم ہے، کیوں کہ جس نے اللہ کریم اور منان کا احسان ماننے سے تکبر کیا تو اس نے اس کی عبادت و طاعت سے بھی تکبر کیا۔ دوسرا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عبادت سے مراد دعا ہی ہو۔ دعا کی تعبیر عبادت کے ساتھ اس لیے کی تاکہ معلوم ہو کہ دعا ابوابِ عبادت میں سے ایک باب ہے، جیسا کہ وارد ہوا ہے: « اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ »[4] کیوں کہ دعا تو یہی اللہ کے روبرو تضرع اور زاری کرنا ہے، اپنے فقر اور عاجزی کے اظہار کے ساتھ اور عبادت کا مقصد یہی ہوتا ہے اور یہی اس میں ایک بڑی عمدہ شے ہے۔

فتح البیان میں فرمایا ہے کہ پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ کتابِ عزیز کے اکثر مقامات پر دعا عبادت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ صاحبِ فتح البیان فرماتے ہیں کہ بلکہ قولِ ثانی زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ حقیقتاً اور شرعاً دعا کے معنی یہی طلب کرنے کے ہیں، پھر اگر اس کا استعمال اس کے علاوہ کسی معنی میں کیا گیا ہو تو وہ اشارتاً ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہے کہ دعا فی نفسہ اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے خود ایک عبادت ہے، بلکہ مخِ عبادت ہے،[5] جیسا کہ ترمذی اور حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں بہ روایتِ انس بن مالک رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کیا ہے کہ « اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ »[6]

نیز سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ افضل عبادت دعا ہے۔[7] اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ادبِ مفرد میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ کون سی عبادت افضل ہے؟ تو فرمایا کہ

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] تفسیر الطبري (٢١/٤٠٦) [3] مستدرك الحاكم (٢/٣٠١)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧١) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٣٠٠٣)

[5] فتح البيان (١٢/٢٠٥) [6] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [7] مستدرك الحاكم (١/٦٦٧)

مرد کی اپنے نفس کے لیے دعا۔[1] اور امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ دعا استغفار ہے۔[2] اور امام احمد، ابویعلی اور طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ حذر قدر سے نفع نہیں دیتا، لیکن دعا اس شے سے نفع دیتی ہے جو نازل ہوئی اور اس شے سے جو نازل نہیں ہوئی، چنانچہ دعا کو لازم پکڑو۔[3]

چوں کہ دعا ایک عظیم نعمت ہے، اس لیے اللہ پاک نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ اس سے دعا کریں اور ان کو دعا کی قبولیت کا وعدہ دیا ہے اور اس کا وعدہ حق ہے اور اس کے نزدیک بات بدلی نہیں جاتی اور نہ ہی وہ وعدہ کے خلاف کرتا ہے۔ پھر خود اس نے تصریح فرمائی کہ یہ دعا اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے، جو طلب کے ہیں، اس کی عبادت ہے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ یعنی بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، عن قریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔ یہ ایک سخت وعید ہے اس کے لیے جس نے دعا کرنے سے تکبر کیا اور اس میں ایک عظیم اور جلیل مہربانی اور احسان ہے، اس لیے کہ جس نے اس ذاتِ باری تعالیٰ سے خیر کا طلب کرنا اور شر کا دور کرنا طلب کرنا چھوڑ دیا، اس کو ایسی سخت وعید سنائی اور اس کو ایسی عظیم عقوبت سنائی۔ لہٰذا اے اللہ کے بندو! تم اپنی مرغوبات کو اپنے تمام مطالب میں سامنے رکھو اور اس ذاتِ پاک پر اعتماد کرو، جس نے ان کے اپنی طرف متوجہ کرنے کا تم کو حکم دیا ہے اور اس پر اعتماد کرنے کا تم کو ارشاد فرمایا ہے اور تمھارے مطلب کو تمھاری دعا کے ساتھ قبول کرنے کا تمھارے لیے ضامن ہوا ہے، چنانچہ وہ ایسا کریم مطلق ہے کہ پکارنے والے کی پکار کو پہنچتا ہے، جب وہ اس کو پکارے اور جو کوئی اپنی دین و دنیا کی حاجات اس کے فضلِ عظیم اور ملکِ واسع سے نہیں مانگتا تو اس پر خفا ہو جاتا ہے۔

الٰہی، سیدی، مولائی بے شک تو ایسا ہی ہے، میں اپنے سارے امورِ دین و دنیا تجھی سے مانگتا ہوں تو ان کو اپنے فضل و کرم سے اچھی طرح پورا کر دے اور اپنے علاوہ کسی اور کا محتاج نہ کر "اَللّٰهُمَّ اكْفِنَا بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَأَغْنِنَا بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ آمين". جمہور نے ﴿ سَيَدْخُلُوْنَ ﴾ کو بہ صیغۂ معروف اور امام ابن کثیر، ابن محیصن، ورش اور ابوجعفر رحمہ اللہ نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔[4] بالجملہ جب اللہ پاک نے اپنے بندوں کو اپنی عبادت پر آمادہ کیا جو دنیا اور آخرت میں ان کی سعادت کی موجب ہے تو اس کے بعد اپنے وجود، کمالِ قدرت اور وفورِ رحمت و حکمتِ بالغہ پر دلائل ذکر کیے، تاکہ یہ زیادہ تر ان کو اس کی عبادت کی طرف دعوت دینے والے ہوں۔ پھر یہ دلائل یا فلکی ہے یا عنصری۔ چنانچہ فلکی دلائل سے ابتدا کی:[5]

---

① الأدب المفرد (٢٤٩/١) اس کی سند میں "حسان بن مبارک" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (ضعیف الأدب المفرد: ٩٠/١)

② الدر المنثور (٣٠١٨/٧)

③ مسند أحمد (٢٣٤/٥) المعجم الكبير (١٠٣/٢٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ شہر بن حوشب رحمہ اللہ کا سماع سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے، نیز اس سند میں "اسماعیل بن عیاش" ضعیف راوی ہے۔

④ تفسير القرطبي (٣٢٨/١٥) ⑤ فتح البيان (٢٠٢/١٢۔٢٠٧)

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۶۱﴾
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫
فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾ كَذٰلِكَ یُؤْفَكُ الَّذِیْنَ كَانُوْا بِاٰیٰتِ
اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ
قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَ رَزَقَكُمْ
مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۖۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۴﴾
هُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ
لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۵﴾

اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے رات (تاریک) بنائی، تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو دکھلانے والا (روشن) بنایا، بلاشبہ اللہ لوگوں پر بڑے فضل والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ⑥① یہی اللہ تمھارا رب ہے، ہر شے کا پیدا کرنے والا، اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، پھر تم کہاں بہکائے جاتے ہو؟ ⑥② اسی طرح وہ لوگ بہکائے جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کیا کرتے تھے ⑥③ اللہ وہ ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے قرارگاہ اور آسمان کو چھت بنایا اور اس نے تمھاری صورتیں بنائیں تو بہت اچھی صورتیں بنائیں اور اس نے تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، یہی اللہ تمھارا رب ہے، سو اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے ⑥④ وہ زندہ ہے، اس کے سوا کوئی برحق معبود نہیں، لہٰذا تم اس کے لیے بندگی کرتے ہوئے اسی کو پکارو، سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں ⑥⑤

قدرتِ الٰہی اور توحیدِ باری تعالیٰ کی نشانیاں:

تمھاری صورتیں بہت اچھی بنائیں، یعنی سب جانداروں سے انسانوں کی صورت بہتر ہے اور اس کی روزی بہت عمدہ ہے۔ انتھی[1]۔

اللہ پاک اپنی خلق پر اس انعام کا احسان رکھتا ہے کہ اس نے ان کے لیے رات بنائی جس میں وہ چین پکڑتے ہیں اور دن بھر روزی کمانے کے لیے جو چلتے پھرتے اور محنت مشقت اٹھاتے ہیں اس سے راحت پاتے ہیں۔ اور دن

کو روشن بنایا، تاکہ اس میں چلیں پھریں، کاروبار کریں، زمین کے دوسرے علاقوں میں سیر و سیاحت کے لیے جائیں، صنعت اور پیشہ پر قدرت پائیں۔ بے شک اللہ تو لوگوں پر بڑا فضل و کرم کرتا ہے کہ ان کے دین و دنیا کے کام کو درست کرنے کے لیے یہ دو چیزیں بنائیں، لیکن بہت سے لوگ اللہ کی نعمتوں کا شکر بجانہیں لاتے۔ پھر فرمایا: ﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴾ یعنی جس نے یہ کام کیے وہ اللہ واحد اَحد تمھارا رب تمام اشیاء کا خالق ہے جس کے سوا نہ کوئی رب ہے نہ معبود، پھر تم کیوں کر اس کے سوا بتوں کو پوجتے ہو، جو کسی شے کو پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ وہ تو خود پیدا کیے ہوئے تراشے ہوئے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے: ؎

کل تراشے ہوئے بت آج خدا ہوتے ہیں

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح یہ لوگ غیر اللہ کو پوج کر گمراہ ہوئے، اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے افتراء و بہتان کیا، بغیر کسی دلیل اور برہان کے غیر اللہ کو پوجا، بلکہ صرف جہالت اور نفسانی خواہشات اور سرکشی سے غیر اللہ کو پوجا اور اللہ پاک کی حجتوں اور آیتوں کو جھٹلایا۔

پھر فرمایا: اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونے کی طرح قرار گاہ بنایا کہ تم اس پر زندگی بسر کرو، اس میں تصرف کرو، اس کے اطراف میں چلو پھرو اور اپنے مصالح حاصل کرو اور پہاڑوں سے اس کو مضبوط کر دیا، تاکہ تم کو لے کر ہلے جلے نہیں اور آسمان کو تمام عالم کے لیے ایک محفوظ چھت بنایا اور تمھاری صورت بنائی اور تمھاری اچھی اچھی صورتیں بنائیں، یعنی تم کو حسین تر اور کامل تر شکلوں اور احسن تقویم میں پیدا کیا اور تم کو طیبات سے روزی دی، یعنی دنیا میں تم کو کھانے پینے کی پاک چیزیں عطا کیں۔

چنانچہ ذکر کیا کہ گھر پیدا کیا اور رہنے بسنے والے بنائے اور روزیاں بنائیں، چنانچہ وہ خالق اور رازق ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۲۱ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۱۔ ۲۲] ”اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا، یہی تمھارا بچاؤ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتار کر اس سے پھل پیدا کیے اور تمھیں روزی دی، خبردار! باوجود جاننے کے اللہ کے شریک مقرر نہ کرو۔“ اور اس جگہ ان چیزوں کی پیدائش کا ذکر کرنے کے بعد یوں فرمایا: ﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی جس نے یہ سب کام کیے وہ اللہ ہے تمھارا رب سو وہ برتر ہے پاک و منزّہ و مبرّا ہے اور کل جہان والوں کا رب ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ یعنی وہ زندہ ہے، ازل و ابد میں ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا، وہی اول وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن ہے، نہ اس کا کوئی نظیر ہے نہ ہمسر۔ ﴿ فَادْعُوْهُ

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ یعنی پس تم اس کو اس حال میں پکارو کہ اس کو ایک کہنے والے ہو، ایک جاننے والے ہو اور اس بات کا اقرار کرنے والے ہو کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہل علم کی ایک جماعت اس شخص کو جو "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه" کہے، اس بات کا حکم کرتی تھی کہ اس آیت پر عمل کرتے ہوئے اس کے بعد ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کہے۔ پھر بہ سند خود سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جو شخص "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه" کہے تو چاہیے کہ اس کے بعد ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ابو اسامہ رحمہ اللہ وغیرہ نے عن اسماعیل بن ابی خالد عن سعید بن جبیر روایت کیا ہے، کہا کہ جس وقت تو ﴿ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ پڑھے تو کہہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه" اور اس کے بعد کہہ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾۔ پھر یہ آیت پڑھی۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ہر نماز کے بعد جب سلام پھیرتے تو کہتے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَا نَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ" اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کلمات کے ساتھ ہر نماز کے بعد اللہ کی تسبیح بیان کرتے تھے۔[2] (ورواه مسلم وأبو داود والنسائي من طرق عن هشام بن عروة وحجاج بن أبي عثمان وموسى بن عقبة ثلاثتهم عن أبي الزبير عن عبد الله بن الزبير رضي الله عنهما قال: كان رسول الله ﷺ يقول في دبر الصلاة لا إله إلا الله وحده لا شريك له وذكر تمامه. كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

چوں کہ پہلے تو اللہ پاک نے بندوں کو حکم دیا کہ اس کی عبادت کریں، اس سے دعا مانگیں تو اس کے بعد اس کے بعض آفاقی دلائل ذکر فرمائے جو اس کے وجود، توحید، مکمل قدرت اور عام فضل و کرم کا ثبوت ہیں۔ پھر چوں کہ دعا کو رات سے زیادہ مناسبت ہے، اس لیے رات کا ذکر پہلے کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ﴾ یعنی تم اللہ ہی کو پوجو، اسی کو پکارو، اسی سے دعا مانگو، کیوں کہ اللہ تو وہ ہے جس نے اپنی قدرت، فضل و کرم اور انعام سے تمھارے لیے رات بنائی، تاکہ تم اس میں ان حرکتوں سے چین پکڑو، جو معاش کی طلب میں دن کو کیا کرتے ہو۔ اس لیے رات کو تاریک و سرد بنایا ہے جس کے مناسب ظاہری راحت ہے جو سکون اور

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٤١٠، ٤١١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٤) مسند أحمد (٤/٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٠٦) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٤٠) تفسير ابن كثير (٤/١٠٩، ١١٠)

نیند سے حاصل ہوتی ہے جو چھوٹی موت ہے اور راحتِ حقیقی، عبادت کے ساتھ جو دائمی حیات ہے اور دن کو روشن بنایا، تا کہ تم اس میں اپنی حاجات کو دیکھو اور طلبِ معاش میں چلو پھرو۔

نکتہ:

ظاہر یہ تھا کہ "وَالنَّهَارَ لِتُبْصِرُوْا فِيْهِ" ہوتا، مگر یوں نہ کہا، بلکہ ﴿ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ﴾ فرمایا۔ ایک تو اس میں مبالغہ ہے، اس لیے کہ "إبصار" کی نسبت "نہار" کی طرف مجازی ہے، کیوں کہ فی الحقیقت "إبصار" اہلِ نہار کے لیے ہے، دن میں دیکھتے ہیں دن نہیں دیکھتا۔ مبالغہ یہ ہوا کہ گویا دن کو ایسا روشن بنایا کہ مارے روشنی کے وہ خود دیکھتا ہے۔ دوسرے اختصار ہے۔ باوجود اختصار کے "لِتُبْصِرُوْا فِيْهِ" کا مضمون نہایت خوبی اور مبالغے سے ادا ہو گیا۔ تیسرے اسلوبِ کلام کا تغیر۔ اسلوب بدلنے سے تازگی و خوبی بڑھ جاتی ہے۔ غرضیکہ رات اور دن دو عجیب نعمتیں ہیں کہ دین و دنیا کے سارے کام انہیں میں ہوتے ہیں۔ کاروبارِ عالم کے یہ دو بڑے ظرف ہیں۔ قدرت یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی ضد بنایا؛ ایک تاریک، دوسرا روشن۔

پھر فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ ﴾ یعنی بے شک البتہ لوگوں پر صاحبِ فضل وکرم واحسان ہے، ان پر اپنی بے حد وحساب نعمتوں کا فضل وانعام فرماتا ہے۔ "لَمُفَضِّلٌ" یا "لَمُتَفَضِّلٌ" نہ فرمایا، اس لیے کہ فضل کی تعظیم منظور ہے، یعنی وہ ایسے بڑے عظیم الشان فضل والا ہے کہ اس کے مثل کوئی فضل نہیں ہے۔ یہ مضمون باوجود اختصار کے کسی اور ترکیب سے ادا نہیں ہو سکتا۔ بالجملہ اگر کوئی کہے کہ اللہ پاک کی تو یہ نعمتیں اور یہ فضل، پھر لوگوں کا کیا حال ہے تو فرمایا: ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴾ یعنی لیکن اکثر لوگ ان نعمتوں کا شکر نہیں کرتے اور ان کا اقرار نہیں کرتے۔ ان کا شکر نہ کرنا دو طرح ہے: یا تو جہلِ منعم کے سبب سے نعمتوں کے کافر و منکر ہیں، یعنی وہ منعمِ حقیقی کو جانتے نہیں۔ جیسے: کفار، کیوں کہ جو کوئی یہ اعتقاد نہیں رکھے گا کہ یہ نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں تو وہ کیسے اس کا شکر ادا کرے گا، مثلاً: دہریے کہ افلاک کو واجبۃ الوجود کہتے ہیں اور عالمِ سفلی کی نعمتوں کو ان کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ لوگ اس اعتقاد کی وجہ سے منعمِ حقیقی کا شکر کیسے ادا کریں گے۔ یا ناشکری اس طرح ہوتی ہے کہ یہ جانتے ہیں کہ کل عالم اللہ کا بنایا ہوا ہے، مگر کثرت سے اللہ کی نعمتوں میں مستغرق ہو رہے ہیں۔ نعمتوں کی کثرت سے ان کی قدر و قیمت سے غافل ہو گئے ہیں، اس سبب سے ان کا شکر نہیں کرتے یہ لوگ جاہل ہیں۔

﴿ اَكْثَرَ النَّاسِ ﴾ فرمایا، "أَكْثَرَهُمْ" نہ کہا کہ "ناس" کی تکرار نہ ہوتی؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تکرار میں کفرانِ نعمت کی ان کے ساتھ تخصیص ہے اور وہی لوگ ہیں جو اللہ کے فضل کا انکار کرتے ہیں اور اس کا شکر بجا نہیں لاتے، جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴾ [الحج: ٦٦] "بے شک انسان البتہ ناشکرا ہے۔"

نیز فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴾ [ابراهيم: ٣٤] ''یقیناً انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔'' قاعدہ یہ ہے کہ ضمیر کے بجائے اسم ظاہر معرف باللام رکھنا خصوصیت ظاہر کرتا ہے۔ ﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ یعنی یہ ذاتِ معلوم جو افعالِ خاصہ کے ساتھ ممیز ہے، جن میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی موصوف بہ الوہیت و ربوبیت اور ﴿ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ جمہور نے ﴿ خَالِقُ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ خبر بعد خبر ہے۔ اور امام زید بن علی رحمہ اللہ نے اختصاص کی بنا پر بہ نصب پڑھا ہے۔[1] یہ شبہہ دور کرنے کے لیے کہ شے کے بعد صفت نہیں ہے ﴿ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ پر وقف لازم ہے۔

پھر جب وہ شے بیان کر دی جو موصوف میں مذکورہ صفات کے وجود پر دلالت کرتی ہے تو فرمایا: ﴿ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴾ یعنی جب یہ بات واضح طور پر بیان ہو چکی تو اب تمھارے لیے یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کہ تم اس کی اطاعت اور عبادت سے روگردانی کرو اور اس کے غیر کی عبادت کرو۔ پھر بیان کیا کہ یہ گمراہی کچھ انہیں لوگوں کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ وہ تو ہر اس شخص کے حق میں ثابت ہے جس نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا اور ان کو سوچا سمجھا نہیں اور نہ اُن سے اس بات پر استدلال کیا جو اعتقاد اور عمل کے بارے میں صحیح ہے اور جو شخص حق کی طلب اور عاقبت کے خوف سے لاتعلق ہو کر بیٹھ رہا۔

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴾ یعنی اس پھرنے کی طرح وہ لوگ پھر گئے جو اللہ کی آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے اور اس کی توحید کا انکار کرتے تھے، کیوں کہ وہ سب حق سے پھرے اور حق کے ساتھ متزین ہونے سے محروم ہوئے، اس سبب سے کہ آیتوں کا انکار کیا اور ان کی تکذیب کی اور اُن سے استدلال کرنا چھوڑ دیا۔ ﴿ يُؤْفَكُ ﴾ فعل مضارع ہے، مگر یہاں ماضی کے معنی میں ہے۔ حال۔ ماضی کو بیان کرنے اور اس کی صورت پیش کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ "إِنَّهُمْ جَمِيْعًا أَفَكُوْا إِفْكًا مِثْلَ إِفْكِ قَوْمِكَ" ''بلاشبہہ وہ سب تیری قوم کے پھرنے کی طرح بالکل منحرف ہو گئے۔''

پھر اللہ پاک نے ان نعمتوں میں سے جن کا ان پر انعام کیا ایک اور قسم کا ذکر کیا اس کے ساتھ کہ اس میں اس کے کمالِ قدرت اور اپنی وحدانیت پر دلیل بھی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ﴾ یعنی اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو جائے قرار بنا دیا جس میں تم زندہ رہتے ہو اور اسی میں مرتے ہو، باوجود اس کے کہ وہ انتہائی ثقیل، یعنی بھاری ہے اور اللہ کی قدرت کے علاوہ اس کو کوئی تھامنے والا نہیں ہے۔ دوسری نعمت اور قدرت یہ ہے کہ آسمان کو ایک چھت

[1] فتح القدير (٦٥٤/٤)

بنایا جو قائم اور ثابت ہے، باوجود اس کے کہ وہ افلاک ہیں اور مدتِ دراز سے تاروں کو لیے پھرتے ہیں جن سے رات اور دن اور تاریکی و روشنی پیدا ہوتی ہے۔

پھر بعض وہ نعمتیں ذکر کیں جو بندوں کی جانوں کے متعلق ہیں۔ ارشاد فرمایا: ﴿ وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ﴾ یعنی تم کو حسین تر صورت میں پیدا کیا۔ کسی اور جان دار کو تم سے زیادہ خوب صورت نہیں بنایا۔ کسی نے کہا ہے کہ تم کو چوپایوں کی طرح اوندھا پیدا نہیں کیا۔ کہا ہے کہ ابن آدم سیدھا اور معتدل پیدا کیا گیا ہے، اپنے ہاتھ سے کھاتا پیتا اور لیتا ہے اور انسان کے علاوہ دوسرے جانور اپنے منہ سے تناول کرتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم کو کل حیوانوں سے حسین تر بنایا۔ جمہور نے ﴿ صُوَرَكُمْ ﴾ کو بہ ضمِ صاد اور اعمش اور ابو زید رحمہما اللہ نے بہ کسرِ صاد پڑھا ہے۔ جوہری رحمہ اللہ نے کہا "صِوَرٌ" بہ کسرِ صاد ایک لغت ہے "صُوَرٌ" بہ ضمِ صاد میں۔[1] پھر فرمایا اور روزی دی تم کو طیبات سے، مراد کھانے پینے کی چیزوں میں سے ہیں جو لذیذ ہیں، جو چارپایوں کی روزی کے علاوہ ہیں۔

﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ﴾ یعنی یہ ذات پاک جو موصوف بہ اوصافِ جلیلہ ہے اللہ ہے جو تمھارا رب ہے: ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی پس کثیر ہوئی خیر و برکت اللہ کی جو جہان والوں کا رب ہے۔ ﴿ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ یعنی وہ ایسا باقی رہنے والا ہے کہ فنا نہ ہوگا۔ وہ الوہیت کے ساتھ اکیلا ہے۔ یہ ترکیب مفیدِ حصر ہے، یعنی اس میں مکمل علم اور قدرتِ کامل کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ پس تم اس کو پوجو اس حال میں کہ اس کے لیے اطاعت اور عبادت کو شرک سے پاک اور خالص کرنے والے ہو۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ خبر ہے اور اس میں اضمارِ امر ہے[2] مراد یہ ہے کہ خبر بہ معنی امر ہے، یعنی تم اللہ کی حمد کرو۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿ فَادْعُوْهُ ﴾ کے حالِ مقدر کا مقولہ ہے، یعنی "فَادْعُوْهُ قَائِلِيْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" اس کی تائید سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے ہوتی ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس بنا پر من جملہ کلام یہ ہوگا کہ ان کو عبادت کا حکم دیا گیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ پاک کے کلام سے ہو۔ اس بنیاد پر کہ جملہ مستانفہ ٹھہرے، اللہ تعالیٰ نے بذاتہ اپنی ذات کی حمد کے لیے ذکر کیا ہو۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ مشرکوں کو یہ بات بتا دیں کہ غیر کی عبادت سے مجھے منع کیا گیا ہے اور توحید کا حکم کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:[3]

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ

---

[1] فتح القدير (٤/٦٥٤) [2] تفسير القرطبي (١٥/٣٢٩) [3] فتح البيان (١٢/٢٠٧-٢٠٩)

لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۶ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ
نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا
اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ
وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۶۷ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ
وَيُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۶۸

آپ کہہ دیجیے: بے شک مجھے اس سے روک دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں، جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، جبکہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے واضح نشانیاں آ گئیں اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کا فرماں بردار ہوں ⑥⑥ وہی ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر وہ تمھیں بچے کی صورت میں نکالتا ہے، پھر تاکہ تم اپنی جوانی (کی قوتوں) کو پہنچو اور پھر تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ اور تم میں سے کچھ وہ ہیں جو اس سے پہلے ہی فوت کر دیے جاتے ہیں، تاکہ تم ایک مقررہ مدت کو پہنچو اور تاکہ تم سمجھو ⑥⑦ وہی تو ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، پھر جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ بس اسے کہتا ہے: ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے ⑥⑧

شرک کی ممانعت اور توحید کا حکم:

تمھاری پیدایش میں اتنے احوال تم پر گزرے، شاید ایک حال اور بھی گزرے اور وہ مر کر جینا ہے۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! آپ ان مشرکوں سے کہہ دیں کہ اللہ عزوجل اس بات سے منع کرتا ہے کہ بتوں اور انداد اور اوثان میں سے کوئی اس کے سوا پوجا جائے اور یہ بات کہ اس کے سوا عبادت کا مستحق کوئی نہیں ہے۔ یہ بات اپنے اس قول میں بیان فرمائی: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ... الآية﴾ یعنی وہ اللہ وحدہ لا شریک لہٗ ہی ہے جو تم کو ان حالتوں میں سے گزارتا ہے۔ اسی کے حکم اور تدبیر و تقدیر سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تم میں کوئی اس سے پہلے ہی مر جاتا ہے کہ موجود ہو اور اس دنیا کی طرف نکلے، بلکہ اس کی ماں اسے ادھورا گرا دیتی ہے اور کوئی صغیر مر جاتا ہے۔ کوئی جوان ہو کر اور کوئی ادھیڑ ہو کر بڑھاپے سے پہلے مر جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ

﴿ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ [الحج: ٥] ''یہ ہم تم پر ظاہر کر دیتے ہیں اور ہم جیسے چاہیں ایک ٹھہرائے ہوئے وقت تک رحمِ مادر میں رکھتے ہیں۔'' نیز اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: ''تَتَذَكَّرُوْنَ الْبَعْثَ'' یعنی شاید تم بعث کو یاد کرو۔ پھر فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ یعنی زندہ کرنے اور مارنے کے ساتھ وہی متفرد ہے، اس کے سوا کوئی اس پر قادر نہیں ہے۔ ﴿ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اس کی مخالفت اور ممانعت نہیں کر سکتا، بلکہ جو کچھ اس نے چاہا، وہ ضرور ہی ہو گیا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ مشرکین جو چاہتے ہیں کہ تم ان کے معبودوں کو پوجو تو تُو اس بارے میں ان پر رد کر کے یہ کہہ دے کہ مجھے تو عقلی دلائل کے ساتھ عام نہی کی گئی ہے اور نقلی دلائل کے ساتھ خاص نہی کی گئی ہے، اس سے کہ میں اللہ کے سوا ان کو پوجوں جن کو تم پوجتے ہو۔ مراد بت ہیں۔ پھر نہی کی وجہ یہ بیان کی کہ جب میرے پاس میرے رب کی طرف سے روشن دلائل آ چکے یعنی عقلی اور نقلی دلائل، کیوں کہ یہ دلائل توحید کو واجب کرتے ہیں اور مجھے یہ حکم ہے کہ میں رب العالمین کا تابع رہوں اور اسی کی فرماں برداری کروں، خضوع اور عاجزی کے ساتھ یا اخلاص کے ساتھ۔ پھر اس کے بعد ایک دلیل ان دلائل میں سے ذکر کی جو توحید پر دال ہیں۔ فرمایا: وہی ہے جس نے تم کو بنایا، یعنی تمھارے باپ آدم علیہ السلام کو مٹی سے جو اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کی اولاد بھی مٹی سے بنی، پھر نطفہ سے، پھر علقہ سے۔ اس کی تفسیر کئی جگہ گزر چکی ہے۔

پھر تم کو طفل کی صورت میں نکالتا ہے، مراد اطفال ہے۔ مفرد اس لیے کہا کہ طفل اسمِ جنس ہے جو مفرد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ یا اس معنی میں کہ تم میں سے ہر ایک کو طفل کی صورت میں نکالتا ہے۔ پھر تاکہ تم پہنچو اپنی جوانی کو، یعنی اس حالت میں جس میں قوت اور عقل جمع ہوتی ہے، تیس برس سے لے کر چالیس برس تک۔ ﴿ اَشُدَّ ﴾ کا بیان پورے طور پر سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔[2] تقدیر یہ ہے: تاکہ تم بڑے ہو تھوڑا تھوڑا کر کے اور تاکہ تم انتہائی کمال کو پہنچو، پھر تم کو باقی رکھتا ہے، تاکہ تم شیوخ ہو۔ ''شیوخ'' کی قراءت بہ ضم و کسرِ شین، دونوں سبعیہ ہیں۔ (ضم والی قراءت امام نافع، حفص، ابو عمرو، ابن محیصن اور ہشام رحمہم اللہ کی ہے، باقی قراء کی قراءت کسر کے ساتھ ہے[3])۔ کسی نے ''شَيْخًا'' بہ افراد پڑھا ہے، مثل ''طفلا'' کے۔ شیخ وہ ہے جو چالیس برس سے بڑھ گیا، یعنی ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد انسان کے تین مراتب ہیں: ایک تو طفولیت یہ نمو و زیادت (جس میں انسان بڑھتا اور نشوونما پاتا ہے) کی حالت

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/١١٠) [2] رقم الآیة (١٥٢) [3] تفسیر القرطبي (١٥/٣٣٠)

ہے، یہاں تک کہ کمالِ اشد، یعنی بغیر ضعف کے جوانی کو پہنچے، پھر اس کے بعد قوت کم ہوتی جاتی ہے، یہ عمر شیخوخت کی ہے۔ ﴿ مِنْ قَبْلُ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم میں بھر لیا کسی کو قبلِ اشد اور قبلِ شیخوخت کے۔

﴿ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى ﴾ اور تاکہ تم سب کے سب موت کو پہنچو یا روزِ قیامت کو۔ حرفِ لام تعلیل کا ہے یا عاقبت کا۔ ﴿ وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ اور تاکہ تم غور کر کے اپنے رب کی توحید کو سمجھ لو اور اس کی قدرتِ بالغہ کو اپنی پیدائش کے ان مختلف مراحل سے لے کر اَجلِ مذکور تک۔ ﴿ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ زندہ رکھنے اور مارنے پر وہی قدرت رکھتا ہے۔ پھر وہ ان کاموں میں سے کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو یہی اس سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے، اس کے بغیر کہ کوئی شے ذرا سا توقف کرے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ تمثیل ہے تمام کاموں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے کسی کام کو کرنے کے ارادے کے باہم تعلق کی اور یہ تصویر ہے اللہ تعالیٰ کی تکوینی قدرت کی اس کے بغیر کہ وہاں کوئی حکم دینے والا ہو یا کوئی مامور ہو۔ پہلا حرفِ "فاء" یہ بتانے کے لیے ہے کہ اس کا مابعد اس کے ماقبل کے نتائج سے ہے۔ ماقبل یہی تھا کہ اِحیاء و اِماتت،[1] یعنی زندہ کرنا اور مارنا اللہ پاک کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے معنی کی تحقیق سورۃ البقرہ وغیرہ میں گزر چکی ہے۔ پھر جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں، ان کے احوال سے تعجب دلایا، چنانچہ ارشاد فرمایا:[2]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ۞69
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ڐ
فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۞70 اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ
يُسْحَبُوْنَ ۞71 فِي الْحَمِيْمِ ڏ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۞72
ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۞73 مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا
ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَـيْــــًٔا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ
اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ۞74 ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ۞75 اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۞76

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں؟ وہ کہاں پھرے جا رہے ہیں؟ 69 جنھوں نے کتاب (قرآن) کو جھٹلایا اور ان (تعلیمات) کو بھی جن کے ساتھ

[1] تفسیر أبي السعود (۲۸۴،۲۸۳/۷) [2] فتح البیان (۲۱۱_۲۰۹/۱۲)

ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا، تو وہ عن قریب جان لیں گے ⑳ جب ان کی گردنوں میں طوق اور بیڑیاں ہوں گی (جن میں جکڑ کر) وہ گھسیٹے جائیں گے ㉑ کھولتے ہوئے پانی میں، پھر وہ آگ میں جھونک دیے جائیں گے ㉒ پھر ان سے کہا جائے گا: کہاں ہیں وہ جنھیں تم شریک ٹھہراتے تھے ㉓ اللہ کے سوا؟ وہ کہیں گے: وہ تو ہم سے گم ہوگئے، بلکہ ہم تو اس سے پہلے کسی کو بھی نہ پکارتے تھے۔ اللہ اسی طرح کافروں کو گمراہ کرتا ہے ㉔ (کہا جائے گا:) تمھارا یہ (انجام) اس لیے ہوا کہ تم زمین میں ناحق اِتراتے تھے اور اس لیے کہ تم اکڑتے تھے ㉕ (اب) تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، تم اس میں ہمیشہ رہو گے، چناں چہ تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا بہت برا ہے ㉖

انکار کرنے والوں اور جھٹلانے والوں کا انجام بد:

پہلے تو منکر ہو چکے تھے کہ ہم نے شریک نہیں پکڑا، اب گھبرا کر منہ سے نکل جائے گا کہ وہ ہم سے بہک گئے، پھر سنبھل کر انکار کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے اس حکمت سے ان کے انکار کا پول کھول دیا۔ انتہٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! کیا تو ان لوگوں پر تعجب نہیں کرتا جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور حق میں باطل کے ساتھ جھگڑتے ہیں، ان کی عقلیں کیسے ہدایت سے گمراہی کی طرف پھیری جاتی ہیں، جنھوں نے اللہ کی کتاب کی تکذیب کی اور اس ہدایت اور بیان کی جس کو دے کر اللہ پاک نے اپنے رسولوں کو بھیجا، وہ لوگ بالآخر جان لیں گے۔ یہ ان جیسے لوگوں کے لیے ایک سخت ملامت اور وعید ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ [المرسلات: ١٥] ''اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے۔'' جبکہ ان کی گردنوں میں طوق پڑے ہوں گے اور ان طوقوں سے متصل زنجیریں ہوں گی جو زبانیہ فرشتوں کے ہاتھوں میں ہوں گی، وہ ان کو ان کے منہ کے بل گھسیٹیں گے، کبھی جلتے ہوئے پانی کی طرف اور کبھی جحیم کی طرف، اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ يُسْحَبُوْنَ ۝ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴾ جیسے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴾ [الرحمن: ٤٣۔ ٤٤] ''یہ ہے وہ جہنم جسے مجرم جھوٹا جانتے تھے۔ اس کے اور کھولتے ہوئے گرم پانی کے درمیان چکر کھائیں گے۔''

اور زقوم کھانے کے اور حمیم پینے کے ذکر کے بعد اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴾ [الصافات: ٦٨] ''پھر ان سب کا لوٹنا جہنم کی (آگ کے ڈھیر کی) طرف ہوگا۔'' اور اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَاۤ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۝ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴾ [الواقعة: ٤١۔٤٤]

''اور بائیں ہاتھ والے کیا ہیں بائیں ہاتھ والے، گرم ہوا اور گرم پانی میں (ہوں گے) اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں جو نہ ٹھنڈا ہے نہ فرحت بخش۔'' یہاں تک کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ۝ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ۝ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ۝ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ۝ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴾ [الواقعة: ٥١۔ ٥٦] ''پھر تم اے گمراہو، جھٹلانے والو! البتہ کھانے والے ہو تھوہر کا درخت اور اسی سے پیٹ بھرنے والے ہو پھر اس پر گرم کھولتا ہوا پانی پینے والے ہو پھر پینے والے بھی پیاسے اونٹوں کی طرح، قیامت کے دن ان کی مہمانی یہ ہے۔''

نیز اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۝ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴾ [الدخان: ٤٣۔ ٥٠] ''بے شک زقوم (تھوہر) کا درخت ہے، گناہ گار کا کھانا ہے جو مثل تلچھٹ کے ہے اور پیٹ میں کھولتا رہتا ہے مثل تیز گرم پانی کے، اسے پکڑ لو پھر گھسیٹتے ہوئے بیچ جہنم تک پہنچاؤ پھر اس کے سر پر سخت گرم پانی کا عذاب بہاؤ۔ (اس سے کہا جائے گا) چکھتا جا تو تو بڑی عزت والا اور بڑے اکرام والا تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے۔'' یعنی یہ بات ان سے ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کے طور پر کہی جائے گی اور ان کی حقارت، تصغیر اور مذاق اور ٹھٹھا کیا جائے گا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یعلیٰ بن منیہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اللہ عزوجل اہلِ نار کے لیے ایک بدلی اٹھائے گا جو سیاہ ہو گی اور کہا جائے گا، اے اہلِ نار! تم کیا چیز طلب کرتے ہو؟ تو وہ اس سے دنیا کی بدلی کو یاد کریں گے اور کہیں گے کہ ہم پینے کا ٹھنڈا پانی چاہتے ہیں، پھر وہ بدلی ان پر طوقیں برسائے گی، ان کے طوقوں میں اور طوق بڑھ جائیں گے اور ان کی زنجیروں میں زنجیریں اور زیادہ ہو جائیں گی اور انگارے ہوں گے جو اُن پر آگ کو دہکائیں گے۔[1] یہ حدیث غریب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی ان سے کہا جائے گا: وہ بت کہاں ہیں جن کو تم اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے، آیا وہ تمھاری مدد کرتے ہیں؟ کہیں گے: وہ تو ہم سے جاتے رہے، چنانچہ ہم کو کوئی نفع نہ پہنچایا، بلکہ ہم تو پہلے کسی چیز کو نہیں پکارتے تھے، یعنی ان کے پوجنے کا انکار کر جائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣] ''پھر ان کے شرک کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ وہ یوں کہیں گے کہ قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی! ہم مشرک نہ تھے۔'' اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴾

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲٦۹/۱۰) المعجم الأوسط (۲٤۷/٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٤٠٣)

قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے ان سے کہیں گے: یہ شے جس میں تم ہو یہ تمھارے دنیا میں ناحق طور پر ریجھ جانے کا اور تمھارے تکبر اور اترانے کا بدلہ ہے۔ تم اب جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں سدا رہنے کے لیے۔ ﴿ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾ یعنی پس کیا بری منزل اور خواب گاہ ہے کہ جس میں اس شخص کے لیے ذلت اور سخت عذاب ہے جس نے اللہ کی آیتوں سے اور اس کی دلیلوں اور حجتوں کی پیروی کرنے سے تکبر کیا۔[1] واللّٰه أعلم.

فتح البیان کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴾ سے مراد ان کے احوالِ زشت اور بری آراء سے تعجب دلانا ہے اور اس مضمون کی تمہید ہے جو اس کے بعد آتا ہے کہ انھوں نے کل قرآن کی اور باقی کتابوں اور شریعتوں کی تکذیب کی اور اس پر جو وعید مرتب ہوئی ہے اس کی تمہید ہے۔ غرض یہ ہے کہ اس آیت کے ذکر سے دو فائدے مقصود ہیں: ایک تو مخاطب کو ان کے برے حال کی توجہ دلانا۔ دوسرا ما بعد کے بیان کی تمہید ہے جس طرح کہ پہلے جو ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ ... الآية ﴾ گزرا ہے، اس سے اس امر کا بیان منظور تھا کہ ان کا جھگڑا کرنا، کسی بھی بنیاد پر نہیں تھا، وہ صرف اور خالی ان کی تمنا تھی۔ اب اس تقریر کی بنا پر اس میں کسی طرح کی تکرار نہیں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ تو ان لوگوں کی طرف دیکھ جو مقابلہ کرتے ہیں اور جھگڑتے ہیں اللہ کی آیتوں میں وہ ایسی آیتیں ہیں جن پر ایمان لانا واجب ہے اور جو اُن میں جھگڑا کرنے سے منع کرتی ہیں، وہ ان سے کیوں کر پھیرے جاتے ہیں، اس کے باوجود کہ ان پر متوجہ ہونے کے باعث باہم ایک دوسرے کے مدد و معاون ہیں اور موانع ان سے بالکل منتفی ہیں اور جو دلیلیں ان کی صحت پر دال ہیں اور اس بات پر کہ وہ خود فی نفسہ موجبِ توحید ہیں، چنانچہ وہ قائم ہیں۔ یہ امام ابو السعود رحمہ اللہ کا حاصل ہے۔[2]

اب کہو کہ اس سب کے باوجود آیتوں میں جھگڑنا اور اُن سے پھرنا بڑے تعجب کی بات نہیں ہے تو پھر کیا ہے! علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سورت میں تین جگہ جدال کا ذکر ہوا ہے، چنانچہ جائز ہے کہ تین قوموں کے حق میں ہو، یا تین بتوں کے بارے میں ہو، یا اسے بار بار تاکید کے طور پر دھرایا گیا ہو۔[3] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جھگڑا کرنے والے مشرکین ہیں۔[4] اس کے بعد کا قول ﴿ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ ... الآية ﴾ اس پر دلیل ہے، یعنی اس لیے کہ مکذبِ کتاب وغیرہ مشرکین ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا اور اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ قدریہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[5] امام ابن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر یہ آیت قدریہ کے بارے میں نہیں اتری تو پھر میں نہیں

---

(1) تفسير ابن كثير (١١١/٤) (2) تفسير أبي السعود (٢٨٤/٧) (3) تفسير النسفي (٨٠/٤)

(4) تفسير الطبري (٤١٤/٢١) (5) تفسير القرطبي (٣٣١/١٥)

جانتا کہ کن لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[1] اس کا یوں جواب دیتے ہیں کہ اللہ پاک نے ان جھگڑا کرنے والوں کا ایسی صفت کے ساتھ وصف کیا ہے جو دال ہے، برخلاف قول اکثر مفسرین مذکورین کے، چنانچہ فرمایا: ﴿ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ ﴾ یعنی انھوں نے کتاب کی تکذیب کی، حالاں کہ یہ ایک ایسا وصف ہے کہ اسلام کے فرقوں میں سے کسی فرقے پر اس کا اطلاق صحیح نہیں ہے (مگر جن علماء نے بہ مقدمۂ قدریہ اس آیت کو قرار دیا ہے، جائز ہے کہ ان کے نزدیک قدریہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو کفارِ سابقین میں قدریہ ہوئے ہیں، چنانچہ یہ جواب کافی نہ ہوگا اور یہ بھی جائز ہے کہ مراد قدریہ اسلامی ہوں اور ان پر تکذیبِ کتاب کا وصف اس طرح سے صادق آئے گا کہ جب آیاتِ کثیرہ میں تصریح مسئلۂ تقدیر پر واقع ہے اور قدریہ نے پھر بھی اس مسئلے کو نہ مانا تو کتاب کے جھٹلانے والے ہوئے۔ از مصحح سلمه الله تعالىٰ)۔

بالجملہ موصولِ ثانی یا تو محلِ جر میں ہے اس بنا پر کہ صفت ہے موصولِ اول کی، یا اس سے بدل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محلِ نصب میں ہو بنا بر ذم اور کتاب سے مراد یا تو قرآن ہے، یا اللہ کی طرف سے نازل کردہ اور کتابوں میں سے کوئی کتاب ہے۔ اور ﴿ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ﴾ معطوف ہے ﴿ بِالْكِتٰبِ ﴾ پر اور اس سے مراد وہ شے ہے جس کی رسولوں کی طرف وحی کی گئی اور وہ کتاب کے علاوہ ہے اگر "الكتب" میں الف و لام جنس کے لیے ہو، یا باقی کتب اگر کتاب سے مراد قرآن ہو۔ غرضیکہ پھر اللہ پاک نے وہ وعیدِ شدید ذکر کی جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں جدال اور تکذیبِ کتاب پر مرتب ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ ﴾

کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ ﴿ يَعْلَمُوْنَ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی یہ جھگڑنے والے اور جھٹلانے والے عن قریب اپنے کام کا برا انجام جان لیں گے اور جب اُن کی گردنوں میں طوق پڑیں گے تو انھیں اپنے جھگڑے اور تکذیب اور کفر کا وبال معلوم ہو جائے گا۔ یا ﴿ اِذْ ﴾ متعلق ہے "اُذْكُرْ" محذوف سے، یعنی ذکر کر ان سے وہ وقت جب وہ طوق پہنائے جائیں گے تا کہ وہ ڈریں اور باز آ جائیں۔ "سلاسل" جمع ہے "سلسلة" کی بہ معنی زنجیر۔ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "تَسَلْسَلَ الشَّيْءُ: اِضْطَرَبَ، كَأَنَّهُ تُصُوِّرَ مِنْهُ تَسَلْسُلُ مُتَرَدِّدٍ فَتَرَدَّدَ لَفْظُهُ تَنْبِيْهًا عَلٰى تَرَدُّدِ وَمَعْنَاهُ وَمَاءٌ سَلْسَلٌ: مُتَرَدِّدٌ فِيْ مَقَرِّهٖ". ﴿ اَلسَّلٰسِلُ ﴾ ﴿ اَلْاَغْلٰلُ ﴾ پر معطوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "إِذِ الْأَغْلَالُ وَالسَّلَاسِلُ فِيْ أَعْنَاقِهِمْ" یہ بھی جائز ہے کہ "سَلَاسِلُ" مرفوع ہو اس بنا پر کہ مبتداء ہو اور اس کی خبر محذوف ہو، اس لیے کہ ﴿ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ﴾ اس پر دال ہے، یعنی "وَالسَّلَاسِلُ فِيْ أَعْنَاقِهِمْ" یہ بھی جائز ہے کہ خبر اس کی "يُسْحَبُوْنَ فِي الْحَمِيْمِ" ہو بہ حذفِ عائد "أَيْ: يُسْحَبُوْنَ بِهَا فِي الْحَمِيْمِ" یہ بات جمہور کی قراءت پر ہے جو بہ رفع "سلاسل" ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم، عکرمہ اور ابو الجوزاء رحمہم اللہ نے بہ نصبِ "سلاسل" پڑھا ہے اور ﴿ يُسْحَبُوْنَ ﴾ کو بہ فتحِ یاء بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ اس صورت میں "سلاسل" مفعول مقدم ہوگا،

[1] فتح القدير (٤/٦٥٧)

یعنی اور "سلاسل" کو حمیم میں کھینچیں گے۔ بعض نے "سلاسل" کو بہ جر پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراءت محمول ہوگی معنی پر، کیوں کہ معنی یہ ہے: "أَعْنَاقُهُمْ فِي الْأَغْلَالِ وَالسَّلَاسِلِ" امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اس قراءت پر معنی یہ ہیں: "وَفِي السَّلَاسِلِ يُسْحَبُونَ"

امام ابن انباری رحمہ اللہ نے اس پر یوں اعتراض کیا کہ یہ بات عربیت میں جائز نہیں ہے۔ محل ﴿ يُسْحَبُونَ ﴾ کا اس تقدیر پر کہ "سلاسل" "أغلال" پر معطوف ہو اور اس تقدیر پر کہ مبتداء ہو اور خبر اس کی ﴿ فِيٓ اَعْنٰقِهِمْ ﴾، نصب ہے بنا بر حال یا کوئی محل نہیں ہے، بلکہ کلامِ مستانف ہے جو جواب ہے سوالِ مقدر کا۔ "سحب" سختی سے کھینچنے کو کہتے ہیں۔ اسی معنی سے لفظ "سحاب" ہے، اس لیے کہ اس کو ہوا کھینچتی ہے، یا اس لیے کہ وہ پانی کو کھینچتا ہے۔ ﴿ اَلْحَمِيْمِ ﴾ وہ پانی ہے جو انتہائی گرم ہو۔ کسی نے کہا کہ "صدید" کے معنی میں ہے، یعنی پیپ۔ کسی نے کہا ہے کہ جہنم۔ کسی نے "حمیم" کے معنی کو کیا بلیغ عبارت میں ادا کیا ہے: "اَلْمَاءُ الْحَارُّ الَّذِيْ يَكْسِبُ الْوُجُوْهَ سَوَادًا، وَالْأَعْرَاضَ عَارًا، وَالْأَرْوَاحَ عَذَابًا، وَالْأَجْسَامَ نَارًا" اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ ''سجر'' محاورے میں بولتے ہیں: "سَجَرْتُ التَّنُّوْرَ أَيْ: أَوْقَدْتُهُ" یعنی میں نے تنور کو جھونکا، "وَسَجَرْتُهُ مَلَأْتُهُ بِالْوُتُوْدِ" یعنی میں نے اس کو ہیزم سے پر کر دیا۔ اس معنی سے ﴿ اَلْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ﴾ ہے: "أَيْ: اَلْمَمْلُوْ"۔

چنانچہ ﴿ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہوں گے کہ آگ ان سے دہکائی جائے گی، یا ان سے پر کی جائے گی۔ مراد یہ ہے کہ ان کو طرح طرح کا عذاب دیا جائے گا اور ایک باب سے دوسرے باب کی طرف منتقل کیے جائیں گے۔ امام مجاہد اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا: "تُوْقَدُ بِهِمُ النَّارُ فَصَارُوْا وَقُوْدَهَا" یعنی ان سے آگ دھکائی جائے گی تو وہ اس کا ایندھن ہو جائیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ جلتے پانی میں گھسیٹے جائیں گے تو ہر چیز جو ان پر ہوگی وہ منسلخ ہو جائے گی، یعنی کھال، گوشت اور رگیں سب کچھ اس کی ایڑی میں آ جائے گا، یہاں تک کہ کافر کا گوشت اس کی لمبائی جتنا ہوگا اور اس کی لمبائی ساٹھ گز ہوگی، پھر اسے دوسری کھال پہنائی جائے گی، پھر حمیم میں کھینچا جائے گا۔ (اصل میں "ثم يسجر في الحميم" ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جلایا جائے گا حمیم میں، مگر ظاہر "يجر في الحميم" معلوم ہوتا ہے یا "يسجر في الجحيم")۔ واللہ أعلم.

سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنٰقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ ﴿71﴾ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴾ پڑھا، پھر فرمایا کہ اگر رصاصہ مثل اس کے اور ایک کھوپڑی کی طرف اشارہ فرمایا، یعنی اگر کھوپڑی جتنا سیسے کا ایک گولہ آسمان سے زمین کی طرف چھوڑا جائے، حالانکہ یہ پانچ سو برس کی راہ ہے تو البتہ وہ زمین تک رات سے پہلے پہنچ جائے گا اور اگر وہ زنجیر کے سرے سے چھوڑا جائے تو وہ اس کی

اصل تک یا گہرائی تک پہنچنے میں چالیس برس چلے، اگر وہ رات دن مستقل چلتا رہے۔ (أخرجه أحمد والترمذي وحسنه و الحاكم و صححه و ابن مردويه والبيهقي في البعث والنشور)

قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴾ صیغہ ماضی کا اس لیے فرمایا کہ تحقق پر دال ہو، معنی ہیں: "يُقَالُ لَهُمْ" اور کلمۂ "أَيْنَ" "مَا" سے الگ لکھا جاتا ہے، جیسا کہ جزری رحمہ اللہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ پھر ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ان سے کہا جائے گا: کہاں ہیں وہ شرکاء جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے تھے؟ مراد بت وغیرہ ہیں۔ کہیں گے: وہ جاتے رہے، ہم سے غائب ہو گئے اور ہم نے ان کو گم کیا، چنانچہ وہ ہمیں نظر نہیں آتے۔ پھر اس بات سے پھر گئے اور کہنے لگے کہ ان کا کوئی وجود نہیں اور کہا کہ ہم تو پہلے کسی اور شے کو پکارتے نہیں تھے، یعنی کسی چیز کو نہیں پوجتے تھے۔

یہ بات اس وقت کہی جب ان پر وہ گمراہی اور نادانی واضح ہو گئی جس میں وہ تھے اور یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ ایسی شے کو پوجتے تھے جو نہ دیکھتی ہے نہ سنتی ہے، نہ ضرر پہنچاتی ہے نہ نفع دیتی ہے۔ اور یہ ان کی طرف سے بتوں کے وجود کا انکار نہیں جن کو وہ پوجا کرتے تھے، بلکہ ان کی طرف سے اس بات کا اقرار ہے کہ ان کا ان بتوں کو پوجنا باطل اور بے کار تھا جس طرح کہ تم محاورے میں کہتے ہیں کہ "حَسِبْتُهُ شَيْئًا فَلَمْ يَكُنْ" یعنی میں نے فلاں چیز کو خیال کیا تھا کہ وہ ایک شے ہے مگر وہ شے نہ تھی، یعنی کوئی معتد بہ شے نہ نکلی۔

امام محلی رحمہ اللہ نے ﴿ بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا ۚ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ انھوں نے انکار کیا کہ انھوں نے بتوں کو پوجا ہے۔ پھر وہ بت ان کے پاس حاضر کیے گئے تو ان کو دیکھ لیا۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ [الأنبياء: ٩٨] "تم اور اللہ کے سوا جن جن کی تم عبادت کرتے ہو، سب دوزخ کا ایندھن بنو گے۔" "أَيْ: وَقُوْدُهَا... انتھٰی" لیکن یہ بات کہ انھوں نے مقامِ حساب میں اور اللہ کے روبرو ان کی عبادت کا انکار کیا، بعید ہے۔ اسی لیے امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا کہ معنی یہ ہیں، بلکہ ہم کو یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ہم ان کے پوجنے کے سبب سے کسی شے کو نہیں پوجتے تھے، جبکہ آج ہم پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ کوئی معتد بہ شے نہ تھی۔

﴿ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ یعنی اس رسوا کرنے والی اور حد سے بڑھی ہوئی گمراہی کی طرح اللہ کافروں کو گمراہ کرتا ہے، جب انھوں نے ان بتوں کو پوجا جنھوں نے ان کو آگ کی طرف پہنچا دیا اور یہ بھی ان کو لعن طعن اور ملامت کے طور کہا جائے گا کہ ﴿ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴾ اضلال کی طرف اشارہ ہے جو ﴿ يُضِلُّ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے، یا عذاب کی طرف، یعنی یہ گمراہ کرنا یا عذاب اس سبب سے ہے کہ تم دنیا میں اللہ کی نافرمانی کر کے اور اس کے رسولوں کی اور کتابوں کی مخالفت کر کے فرح اور سرور کا اظہار

کرتے تھے۔ کسی نے کہا کہ اس لیے کہ تم مال و نوکر چاکر اور صحت و عافیت سے خوش ہوتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس وجہ سے کہ تم دوبارہ جی اٹھنے اور عذاب کا انکار کر کے مسرور ہوتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ فرح سے مراد بطر و تکبر ہے اور مرح سے مراد بطر میں زیادتی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے ﴿ تَمۡرَحُوۡنَ ﴾ کے معنی ہیں: "تَبۡطَرُوۡنَ وَتَأۡشَرُوۡنَ"۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرح تو سرور ہے اور مرح عدوان، یعنی سرکشی ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مرح سے مراد بطر اور تکبر ہے۔ کسی نے کہا کہ مرح اشد ہے فرح سے۔ مطلب یہ ہے کہ انتہا درجے کی خوشی مرح ہے، یہی تکبر کا باعث ہوتی ہے۔

﴿ اُدۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ۚ ﴾ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ لَهَا سَبۡعَةُ اَبۡوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنۡهُمۡ جُزۡءٌ مَّقۡسُوۡمٌ ﴾ [الحجر: ٤٤] "اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لیے ان کا ایک حصہ بٹا ہوا ہے۔" یعنی تم جہنم کے ساتوں دروازوں میں داخل ہو جاؤ جو تمھارے لیے بانٹے گئے ہیں اس حال میں کہ تمھارے لیے ہمیشہ ہمیشہ کا اس میں رہنا مقدر کیا گیا ہے۔ ﴿ فَبِئۡسَ مَثۡوَى الۡمُتَكَبِّرِيۡنَ ﴾ چنانچہ کیا برا ٹھکانا اور مسکن اور ہمیشہ کا مقام ہے ان لوگوں کا جو حق سے تکبر کرنے والے ہیں۔ وہ ٹھکانا جہنم ہے۔ نعوذ باللّٰہ منہا۔ ظاہر یہ تھا کہ مدخل کہا جاتا، لیکن اس کو ﴿ مَثۡوَى ﴾ کے پیرائے میں اس لیے ذکر کیا کہ ان کا داخل ہونا ہمیشہ کے لیے ہے۔ (کما قالہ أبو السعود) سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدخل اس لیے نہیں فرمایا کہ دخول دائم نہیں ہوتا۔ دائم جو ہوتا ہے وہ ثواء ہے، اسی لیے اس کو مذمت کے ساتھ مخصوص کیا، گو دخول بھی قابلِ مذمت ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو صبر کا حکم دیا ان کی تسلی کے لیے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِىۡ نَعِدُهُمۡ
اَوۡ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۷۷﴾ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ
قَبۡلِكَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ
عَلَيۡكَ ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوۡلٍ اَنۡ يَّاۡتِىَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ
فَاِذَا جَآءَ اَمۡرُ اللّٰهِ قُضِىَ بِالۡحَـقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۷۸﴾
اَللّٰهُ الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ الۡاَنۡعَامَ لِتَرۡكَبُوۡا مِنۡهَا وَمِنۡهَا
تَاۡكُلُوۡنَ ﴿۷۹﴾ وَلَـكُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ وَلِتَبۡلُغُوۡا عَلَيۡهَا حَاجَةً فِىۡ
صُدُوۡرِكُمۡ وَعَلَيۡهَا وَعَلَى الۡـفُلۡكِ تُحۡمَلُوۡنَ ﴿۸۰﴾ وَيُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَىَّ
اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنۡكِرُوۡنَ ﴿۸۱﴾

لہٰذا (اے نبی!) آپ صبر کیجیے۔ بلاشبہ اللہ کا وعدہ حق ہے۔ پھر اگر ہم (چاہیں تو) آپ کو اس (عذاب) میں سے کچھ دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں یا ہم آپ کو (اس سے پہلے ہی) فوت کر دیں، بالآخر وہ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿77﴾ اور بلاشبہ ہم نے آپ سے پہلے کئی رسول بھیجے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے آپ سے بیان کر دیا اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔ اور کسی رسول کو یہ (اختیار) نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے سوا کوئی نشانی لے آئے، پھر جب اللہ کا حکم آ گیا تو حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور اس موقع پر اہلِ باطل (جھوٹے لوگوں) نے خسارہ اُٹھایا ﴿78﴾ اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے چوپائے بنائے، تاکہ تم ان میں سے بعض پر سواری کرو اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو ﴿79﴾ اور تمھارے لیے ان میں (اور بھی) بہت سے فائدے ہیں اور تاکہ تم ان پر (سوار ہو کر اپنی) اس حاجت (منزلِ مقصود) کو پہنچو جو تمھارے دلوں میں ہو اور تم ان پر اور کشتیوں پر (بھی) سوار کیے جاتے ہو ﴿80﴾ اور اللہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، پھر تم اللہ کی کون کون سی نشانیوں کا انکار کرو گے؟ ﴿81﴾

نبیِ مکرم ﷺ کو صبر کا حکم اور فتح کی بشارت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو صبر کا امر فرماتا ہے کہ جس نے قوم میں سے ان کی تکذیب کی، اس پر صبر کریں، بے شک اللہ تعالیٰ عن قریب تجھ سے تیری قوم پر تیرے لیے اپنی مدد اور کامیابی کا جو وعدہ کیا ہے، اسے پورا کرے گا اور تیرے لیے اور ان لوگوں کے لیے جنھوں نے تیری پیروی کی ہے، دنیا و آخرت میں نیک انجام کر دے گا۔ پھر یا تو ہم تجھ کو دنیا ہی میں کوئی وعدہ، جو ہم ان کو دیتے ہیں دکھا دیں گے اور اسی طرح واقع ہوا، کیوں کہ اللہ پاک نے مومنین کی آنکھیں بڑے بڑے مشرکین کو بدر کے دن ہلاک کر کے ٹھنڈی کر دیں، پھر اللہ تعالیٰ نے مکہ کو آپ ﷺ پر فتح کر دیا اور باقی جزیرۂ عرب کو آپ کی زندگی ہی میں مفتوح کر دیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴾ یعنی یا ہم تجھ کو وفات دیں گے، پھر وہ ہماری ہی طرف لوٹ کر آئیں گے، یعنی پھر ہم ان کو آخرت میں سخت عذاب چکھائیں گے۔ پھر آپ ﷺ کی تسلی کے لیے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ﴾ جس طرح کہ سورۃ النساء میں بہ عینہ اسی طرح فرمایا ہے، یعنی ان میں سے وہ رسول جن کے حالات اور قصوں کی ہم نے تیری طرف وحی کی، وہ قصے جو ان کو اپنی قوموں کے ساتھ پیش آئے کہ کس طرح ان کی تکذیب کی، پھر رسولوں کے لیے

نیک انجام اور نصرت ہوئی۔ اور ان میں سے وہ ہیں جن کے قصے ہم نے تجھ سے بیان نہیں کیے، یہ رسول ان کی نسبت بہت زیادہ ہیں جن کا ذکر کیا گیا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں اس بات سے آگاہ کیا گیا ہے۔[1] وللّٰه الحمد والمنة.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک رسول کے لیے بھی یہ بات نہیں ہوئی کہ وہ کوئی خارقِ عادت بات، یعنی معجزہ اللہ کے اذن کے بغیر لے کر آ جائے اور وہ اس چیز کی سچائی کی دلالت کرے جو وہ قوم کے پاس لے کر آیا ہے۔ پھر جب اللہ کا امر، یعنی اس کا عذاب اور سزا آ گئی جس نے جھٹلانے والوں کو گھیر لیا تو انصاف کے ساتھ فیصلہ ہو گیا، یعنی مومنوں کو بچا لیا اور کافروں کو ہلاک کر ڈالا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ یعنی پھر جھوٹوں ہی کا وہاں نقصان ہوا۔

چارپائے اللہ تعالیٰ کے انعامات اور آیات ہیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ اللہ پاک اپنے بندوں پر اپنے عظیم انعام کا احسان رکھتا ہے کہ اس نے ان کے فائدے کے لیے اَنعام بنائے، یعنی اونٹ اور گائے اور بکریاں، ان میں سے کوئی تو ان کے لیے سواری کا کام دیتا ہے اور کسی کو کھاتے ہیں۔ چنانچہ اونٹ پر تو سوار ہوتے ہیں اور اس کا گوشت کھاتے ہیں اور دودھ پیتے ہیں اور اس پر بوجھ لاد کر دور دراز ملکوں کا سفر کرتے ہیں اور گائے کا گوشت کھاتے ہیں اور دودھ پیتے ہیں اور بیلوں سے کھیتی کرتے ہیں اور بکری کا گوشت کھاتے ہیں اور دودھ پیتے ہیں۔ ان سب کے صوف اور بال اور پشم کاٹے جاتے ہیں، پھر ان سے کئی چیزیں، کپڑے اور استعمال کی کئی دوسری چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ چنانچہ سورۃ الانعام اور سورۃ النحل میں اور دوسری کئی جگہ اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اسی لیے اللہ عزوجل نے اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تم کو آفاق میں، یعنی زمین و آسمان میں اور خود تمھاری جان میں اپنی حجتیں اور براہنیں دکھاتا ہے، پھر تم اللہ کی کون کون سی نشانیوں کا انکار کرو گے، یعنی اس کی نشانیوں میں سے کسی کا تم انکار نہ کر سکو گے، سوائے اس کے کہ تکبر اور عناد کرو اور ہٹ دھرمی سے نہ مانو۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا توضیحی اور اضافی بیان یہ ہے: چنانچہ تو صبر کر، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، یعنی اس کا وعدہ کہ ان سے انتقام لے گا ضرور ہونے والا ہے، یا تو دنیا میں یا آخرت میں۔ اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ ﴾ یعنی پھر کبھی ہم تجھ کو دنیا ہی میں اس عذاب کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا کہ ہم ان کو وعدہ دیتے

---

[1] رقم الآية (١٦٤) [2] تفسير ابن كثير (١١٢/٤)

ہیں، یعنی ان کو مقتول اور مقید اور مغلوب کر دیں۔ ﴿ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ ﴾ معطوف ہے ﴿ نُرِيَنَّكَ ﴾ پر، یعنی یا ہم ان پر عذاب نازل کرنے سے پہلے تجھ کو وفات دے دیں، پھر وہ قیامت کے دن ہماری طرف لوٹ کر آئیں گے تو ہم ان کو سخت ترین عذاب دیں گے۔

کلمۂ ﴿ اِمَّا ﴾ مرکب ہے "إِنْ" اور "مَا" سے، نون کو میم میں ادغام کر دیا ہے۔ امام مبرد اور زجاج رحمہ اللہ کے نزدیک کلمۂ "مَا" زائد ہے[1] اصل "إِنْ نُرِكَ" ہے اور فعل کے آخر میں تاکید کا نون مل گیا ہے۔ اب یہاں تاکید کے دو آلے جمع ہیں: ایک تو "مَا" زائد اول فعل میں، یہ تو شرط کی تاکید کرتا ہے، دوسرا آلہ نون آخر فعل میں۔ یہ فعل شرط کی تاکید کرتا ہے۔ ان تاکیدوں سے معلوم ہوا کہ اللہ پاک آپ کو دنیا میں کفار کا عذاب کیا جانا ضرور دکھائے گا، چنانچہ بدر کے دن دکھا دیا کہ کفار قتل کیے گئے اور قید کیے گئے اور مغلوب ہوئے۔ رہی یہ بات کہ ﴿ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ ﴾ معطوف ہے ﴿ نُرِيَنَّكَ ﴾ پر تو دو شرطیں ایک جزا میں مشترک ہوئیں، وہ جزا ﴿ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴾ ہے۔

چنانچہ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ دونوں شرطوں میں سے ہر ایک جزائے مذکور کا سبب ہو، وہ جزا یہی اللہ تعالیٰ کا آخرت میں ان سے انتقام لینا ہے۔ حالانکہ پہلی شرط کا اس جزا کا سبب ہونا معقول نہیں ہے، کیوں کہ ان کو نبی اکرم ﷺ کے روبرو دنیا میں عذاب کرنا، اللہ تعالیٰ کا آخرت میں ان سے انتقام لینے کا سبب کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر ﴿ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴾ کو صرف شرطِ ثانی کا جواب ٹھہرائیں تو پہلی شرط بغیر جواب کے رہ جاتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیں گے کہ پہلی شرط کا جواب محذوف ہے: "أَيْ: فَذَاكَ" اور دوسری کا جواب: ﴿ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴾ ہے۔

لو اب بے کھٹکے دونوں کے جواب ٹھیک ہو گئے، یعنی اگر تجھ کو اس عذاب کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم ان کو وعدہ دیتے ہیں تو فبہا اور اگر ہم ان کو عذاب دینے سے قبل تجھ کو وفات دیں تو وہ قیامت کے دن ہماری ہی طرف لوٹ کر آئیں گے، پھر ہم ان کو سخت سے سخت عذاب کریں گے۔ قاضی صاحب مرحوم نے اسی قسم کی تقریر کے بعد فرمایا ہے: ہو سکتا ہے کہ ﴿ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴾ دونوں شرطوں کا جواب ہو، اس معنی میں کہ اگر ہم ان کو تیری زندگی میں عذاب کریں یا نہ کریں، ہم ان کو آخرت میں سخت تر عذاب کریں گے، مطلب یہ کہ آخرت کے عذاب کی نسبت دنیا کا عذاب ہیچ ہے۔ یہاں پر عذاب ہو یا نہ ہو وہاں کا عذاب، جو بہت سخت ہے، وہ تو ضرور ہی ہو گا۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تجھ سے پہلے ہم نے بہت سے رسول اور نبی ان کی قوموں کی طرف بھیجے۔ ان میں سے بعض کی خبر تو ہم نے تجھے قرآن میں دی اور اس ایذاء اور تکلیف کے متعلق بتایا جو ان کو اپنی قوموں سے پیش آئی۔ یہ رسول پچیس ہیں۔ اور ان میں سے وہ رسول ہیں جن کی خبریں ہم نے تجھے قرآن میں نہیں سنائیں اور نہ ہی تجھے ہم نے اس قصے کا علم دیا جو اُن کے اور

[1] فتح القدير (٦٥٨/٤) [2] تفسير البيضاوي (١٠٢/٥)

ان کی قوموں کے درمیان گزرا۔ امام محلی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے: مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آٹھ ہزار نبی مبعوث فرمائے، چار ہزار تو بنی اسرائیل میں سے اور چار ہزار باقی لوگوں میں سے۔ انتہی۔

امام محلی رحمہ اللہ نے تو بہ لفظِ ''رُوِيَ'' ذکر کیا ہے[1] اور صاحبِ کشاف نے اس کو بہ لفظِ ''قِيلَ'' بیان کیا ہے۔[2] طیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح وہ ہے جو ہم کو روایت کی گئی ہے امام احمد رحمہ اللہ سے بہ روایت سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ، کہا: میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! انبیاء کی گنتی کتنی ہے؟ فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ ان میں سے تین سو پندرہ رسول ہیں۔[3] جَمًّا غَفِيرًا (ذكره الكرخي)۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اللہ نے ایک حبشی غلام کو مبعوث فرمایا جو ان میں سے ہے جن کا قصہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نہیں کیا ہے۔[4] (أخرجه الطبراني في الأوسط و ابن مردويه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان رسولوں میں کسی رسول کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہوا کہ وہ اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر کوئی معجزہ اللہ کے اذن کے بغیر لے آئے، اس لیے کہ معجزے تو صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق اپنے انبیاء میں بانٹ دیا ہے جس طرح کہ باقی کی چیزیں بانٹی ہیں۔ ان کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ بعض معجزوں کو اختیار کر لیں، یا ان سے جس معجزے کی فرمایش کی جائے ہو بہو وہی معجزہ لے کر آ جائیں، اس لیے کہ رسول تو اللہ کے بندے ہیں، یعنی تو بھی ان رسولوں کی طرح ہے اور تو اس بات پر قادر نہیں کہ کوئی معجزہ لے آئے، مگر اللہ کے اذن سے۔ چنانچہ یہ معجزات کے بارے میں قریش پر رد ہے جن کی انھوں نے آپ سے فرمایش کی تھی جیسے ان کا یہ قول ہے کہ تو ہمارے لیے کوہِ صفا کو سونے کا کر دے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ پھر جب اللہ کا امر آیا، یعنی وہ وقت جو دنیا اور آخرت میں ان کے عذاب کے لیے مقرر تھا تو رسولوں اور ان کے جھٹلانے والوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قضائے حق کے ساتھ اپنے حق پرست بندوں کو نجات دی اور اس وقت جو باطل کی پیروی کرنے والے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے وہ سب زیاں کار ہوئے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: پھر جب کفار پر نزولِ عذاب کے بارے میں اللہ کا امر آیا تو رسولوں اور ان کے جھٹلانے والوں کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور وہاں باطل پر چلنے والے خائب و خاسر ہوئے، یعنی لوگوں کے لیے قضا اور خسران ظاہر ہوا اور وہ خاسر تھے ہر وقت میں اس سے قبل، یعنی اس لیے کہ قضاء و خسران کا فیصلہ تو پہلے

---

[1] تفسير الجلالين (٦٨٢/١) [2] الكشاف (١٨٥/٤) [3] مسند أحمد (٢٦٥/٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٦٨)

[4] المعجم الأوسط للطبراني (٩/ ١٢٧) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں محمد بن ابی لیلیٰ راوی ''سيء الحفظ'' اور باقی رواۃ ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد: ٧/ ٢٢٧)

سے ہو چکا تھا، بلکہ ازل میں لکھا جا چکا تھا، لیکن اس کا ظہور اب ہوا۔[1] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو ﴿ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ سے ختم کیا اور سورت کو ﴿ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ سے ختم فرمایا، اس لیے کہ یہاں تو ﴿ قُضِيَ بِالْحَقِّ ﴾ سے متصل ہے اور نقیض حق کا باطل ہے اور وہاں ایمان غیر نافع سے متصل ہے اور نقیض ایمان کا کفر ہے تو جو کلمہ جس جگہ کے لیے مناسب تھا، اس کو وہیں ذکر فرمایا۔ فداً لحسن أدائك يا سيدي و مولائي.

پھر اللہ پاک نے اپنے بندوں پر مختلف قسم کے انعامات میں سے ایک قسم کا احسان جتلایا۔ وہ نعمتیں جن کا شمار نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: اللہ ہے جس نے تمھارے لیے انعام پیدا کیے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ اَلْاَنْعَامَ ﴾ اس جگہ خاص کر اونٹ ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ازواجِ ثمانیہ ہیں، یعنی اونٹ، گائے، بکری اور بھیڑ۔ لیکن ظاہر پہلا قول ہے، اس لیے کہ جن منافع کا آگے ذکر کیا گیا ہے وہ سب اونٹ میں پائے جاتے ہیں۔ پھر اس اجمال کی یہ تفصیل فرمائی: ﴿ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ دونوں جگہ کلمہ ''مِنْ'' تبعیض کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ابتدائے غایت کا ہے۔ مراد ابتدائے رکوب (سوار ہونا) اور ابتدائے اکل (کھانا) ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ معنی یہ ہیں: تاکہ تم بعض پر سوار ہو اور بعض کو کھاؤ اور تمھارے لیے ان میں سوار ہونے اور کھانے کے سوا اور بھی منافع ہیں، جیسے: روئی، صوف، بال اور مسکہ، گھی، پنیر، دودھ اور نسل وغیرہ، تاکہ تم ان سے وہ حاجت پوری کرو جو تمھارے سینوں میں ہے۔

امام مجاہد، مقاتل اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ تمھارے بوجھ لادے پھرتے ہیں، ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف۔[3] سورۃ النحل میں اس کا بیان پورے طور پر گزر چکا ہے[4] اور ان پر اور کشتیوں پر لدے پھرتے ہو، یعنی اونٹوں پر خشکی میں اور کشتیوں پر دریا میں۔ کسی نے کہا ہے کہ حمل علی الانعام سے اس جگہ بچوں اور عورتوں کا ان پر ہودجوں میں لادنا ہے اور اس کے رکوب سے علاحدہ کرنے میں اور انعام اور فلک کو اکٹھا ذکر کرنے میں یہی مصلحت ہے۔ اس لیے کہ ان میں پوری مناسبت ہے، یہاں تک کہ اونٹوں کا نام ''سَفَائِنُ الْبَرِّ'' (خشکی کے جہاز) رکھا گیا ہے۔ اس کی نظیر سورۃ النحل میں یہ آیت ہے: ﴿ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ﴾ [النحل: ٥۔ ٦] ''اسی نے چوپائے پیدا کیے جن میں تمھارے لیے گرمی کے لباس ہیں اور بھی بہت سے نفع ہیں اور بعض تمھارے کھانے کے کام آتے ہیں۔ اور ان میں تمھاری رونق بھی ہے جب چرا کر لاؤ تب بھی اور جب چرانے لے جاؤ تب بھی۔'' لیکن یہ اس سے زیادہ جامع ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے جو اس کی کمالِ قدرت اور وحدانیت پر دال ہیں، پھر تم اللہ کی آیتوں میں سے کون سی آیت کا انکار کرو گے، کیوں کہ وہ تو

---

[1] تفسير الجلالين (٦٢٨/١) [2] معاني القرآن (٣٧٨/٤)

[3] تفسير الطبري (٤٢٠/٢١، ٤٢١) فتح القدير (٦٥٩/٤) [4] رقم الآية (٧)

سب کی سب ایسی ظاہر و باہر ہیں کہ کوئی منکر اور جاحد ان کا انکار و جحد نہیں کر سکتا۔ اس میں ان کے لیے ایک بڑی سرزنش اور ملامت ہے۔ کلمہ "أَيَّ" کی تذکیر اس کی تانیث سے زیادہ مشہور ہے، اسی لیے "فَأَيَّةَ آيَاتِ اللّٰهِ" نہیں فرمایا، کیوں کہ اسمائے جامد کے مذکر و مؤنث میں فرق کرنا اسی طرح عجیب و غریب ہے جس طرح حمار و حمارہ کہنا ہے۔ یہ فرق "أَيَّ" میں اس کے ابہام کے سبب سے اور بھی زیادہ غریب ہے۔ "أَيَّ" کا نصب ﴿ تُنْكِرُوْنَ ﴾ سے ہے۔ عامل پر جو اس کو مقدم کیا ہے تو اس لیے کہ اس کے لیے صدرِ کلام ہے۔ پھر اللہ پاک نے ان کو ارشاد کیا کہ اس کی نشانیوں میں غور و فکر کریں اور عبرت حاصل کریں، چنانچہ فرمایا:[1]

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸۲ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸۳ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝۸۴ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۵

کیا پھر وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ (تعداد میں) ان سے زیادہ اور قوت اور زمین میں (چھوڑے ہوئے) آثار کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے، پھر جو کچھ وہ کرتے رہے ان کے کسی کام نہ آیا (82) پھر جب ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے تو وہ اس (جھوٹے) علم پر اتراتے رہے جو اُن کے پاس تھا، اور انھیں اس (عذاب) نے گھیر لیا، جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے (83) چناں چہ جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہا: ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور ہم ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جنھیں ہم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے (84) پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو انھیں ان کے ایمان (لانے) نے کوئی نفع نہ دیا، یہی اللہ کا طریقہ ہے، جو اس کے بندوں میں گزرا اور اس (عذاب کے) موقع پر کافروں نے خسارہ اُٹھایا (85)

---

[1] فتح البیان (۲۱۵/۱۲-۲۱۷)

سابقہ لوگوں کے حال سے عبرت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک اگلی اُمتوں کی خبر دیتا ہے، جنھوں نے زمانۂ قدیم میں رسولوں کی تکذیب کی اور کیا کچھ سخت عذاب ان پر نازل ہوا اس کے باوجود کہ ان کے قویٰ سخت تھے اور وہ لوگ زمین پر اپنی بہت کچھ نشانیاں چھوڑ گئے اور مال جمع کیے، پھر یہ سب کچھ ان کے کام نہ آیا اور نہ ہی ذرہ برابر اللہ کا عذاب ان سے دور کیا۔ یہ اس لیے ہوا کہ جس وقت ان کے پاس رسول کھلی کھلی نشانیاں اور پکی پکی حجتیں اور سرشکن براہنیں لے کر آئے تو انھوں نے ان کی طرف بالکل توجہ نہ کی اور اپنے خیال میں ان کے پاس جو علم تھا اس میں مگن رہے اور اس علم کو بالکل اہمیت نہ دی جس کو لے کر رسول ان کے پاس آئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: یوں کہا کہ ہم تو ان سے بڑھ کر عالم ہیں۔ ہم ہرگز مر کر دوبارہ زندہ نہ ہوں گے اور ہم کو ہرگز عذاب نہ دیا جائے گا۔ امام سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ اس علم سے اپنی جہالت کے سبب سے خوش تھے جو اُن کے پاس تھا۔[1] پھر ان پر اللہ تعالیٰ کے عذابوں میں سے وہ عذاب آیا جس کے مقابلے کی ان کو کچھ طاقت نہ ہوئی۔

﴿ وَحَاقَ بِهِمْ ﴾ یعنی ان کو اس شے نے گھیر لیا جس کا ٹھٹھا کرتے تھے، یعنی جس کی تکذیب کرتے تھے اور جس کے واقع ہونے کو بعید جانتے تھے۔ ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ﴾ یعنی پھر جب اپنے اوپر عذاب کے آنے کا معائنہ کیا تو بولے: ہم اکیلے اللہ پر ایمان لائے اور اس شے کا انکار کیا جس کو اس کے ساتھ شریک کرتے تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کیا اور طاغوت کے منکر ہوئے، لیکن یہ ایسی جگہ پر اور ایسے وقت پر کیا جب کہ لغزشوں سے درگزر نہیں کی جاتی اور نہ ہی عذر اور معذرت نفع دیتی ہے۔ یہ ویسی بات ہے جو فرعون نے کہی تھی جب وہ غرق ہونے لگا تھا: ﴿ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾ [یونس: ۹۰۔ ۹۱] ”میں ایمان لاتا ہوں کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں (جواب دیا گیا کہ) اب ایمان لاتا ہے؟ اور پہلے سرکشی کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا۔“

یعنی اللہ پاک نے وہ ایمان اس سے قبول نہ کیا، کیوں کہ وہ اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول کر چکا تھا، جبکہ انھوں نے یہ دعا کی تھی: ﴿ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ۸۸] ”ان کے دلوں کو سخت کر دے، سو یہ ایمان نہ لانے پائیں، حتیٰ کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔“ اللہ سبحانہ نے یہاں فرمایا: ﴿ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ﴾ یعنی یہ اللہ کا حکم

[1] تفسير الطبري (٢١/٤٢٢)

ہے ان سب لوگوں میں جنھوں نے عذاب کو دیکھ لینے کے وقت توبہ کی کہ وہ قبول نہیں ہوتی اور اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتا ہے، جب تک اس کو غرغرہ نہیں لگا ہے۔[1] پھر جب اس کو غرغرہ لگ گیا اور روح حلق میں پہنچ گئی اور فرشتے کو دیکھ لیا تو اب اس وقت توبہ نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ ﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا ﴾ مقدر پر معطوف ہے۔ "أَيْ: أَعَجِزُوْا فَلَمْ يَسِيْرُوْا فِيْ الْأَرْضِ" یعنی کیا عاجز ہو گئے سو پھرے نہیں زمین کے اطراف ونواحی میں تو اپنے سر اور دل کی آنکھوں سے دیکھتے کہ ان سے اگلی اُمتوں کا انجام کیسا ہوا، جنھوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا، کیوں کہ جو آثار اور نشانیاں ان کے شہروں اور گھروں میں موجود ہیں، وہ اس سزا کو ظاہر کر رہی ہیں جو ان کی طرف نازل ہوئی اور اس بد انجام کو جس کی طرف وہ گئے۔

پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ یہ اُمتیں ان لوگوں سے کثرت اور قوت کے لحاظ سے بڑھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی وہ گنتی میں ان سے اکثر تھے اور قوت میں ان سے سخت تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے جسم ان سے زیادہ مضبوط تھے اور وہ مال میں بھی ان سے بڑھے ہوئے تھے اور زمین میں ان کے آثار اور نشانیاں بھی ان سے زیادہ ظاہر تھیں، یعنی بڑی بڑی عمارتیں تھیں اور پانی کے حوض اور قلعے اور پختہ اور مضبوط گڑھیاں اور کھیتیاں تھیں۔

جملۂ ﴿ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ ﴾ کلامِ مستانف ہے، اس سے ان کے ابتدائی حال اور انجام کا بیان کرنا منظور ہے۔ ان کا آغاز تو یہ ہے کہ وہ گنتی اور شمار میں بہت تھے، بڑے مال دار دولت مند تھے اور جسمانی قوت میں نہایت زبردست تھے۔ گنتی کی کثرت تو اخبار ونقل سے معلوم ہوتی ہے اور ان کی قوت کا اندازہ زمین میں باقی ان کے آثار سے ہوتا ہے اور انجام ان کا یہ ہوا: ﴿ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾۔ ہو سکتا ہے کہ پہلا کلمۂ "مَا" نافیہ ہو یا استفہامیہ ﴿ اَغْنٰى ﴾ کا مفعول اور دوسرا موصولہ یا مصدریہ ﴿ اَغْنٰى ﴾ کا فاعل۔ "أَيْ: لَمْ يُغْنِ عَنْهُمْ أَوْ أَيُّ شَيْءٍ أَغْنَى عَنْهُمْ مَكْسُوْبُهُمْ أَوْ كَسْبُهُمْ" یعنی پھر ان سے اس شے نے کفایت نہ کی جس کو کماتے تھے یا ان کے کمانے نے یا کس شے کی کفایت کی ان سے ان کے کمائے ہوئے نے یا

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩٠٣)

[2] تفسير ابن كثير (١١٣/٤)

ان کے کمانے نے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی تعداد کی یہ کثرت اور یہ قوت کی سختی اور مال کی فراوانی اور ساز و سامان کی کثرت ان کے کچھ کام نہ آئی۔

﴿ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پھر جب ان کے پاس ان کے رسول واضح واضح حجتیں اور ظاہر ظاہر معجزے لے کر آئے تو کافروں نے اس شے پر ہی اپنی خوشی اور سرور کا اظہار کیا جو اُن کے پاس تھی اور جس کے بارے میں وہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ علم ہے۔ اس سے مراد وہ شکوک وشبہات اور فاسد فنون اور کھوٹے علوم تھے جو حق سے دور کرنے والے تھے۔ ان سب باتوں کو جو علم کے پیرائے میں ادا کیا وہ یا تو اس لیے کہ اُن سے مذاق کیا یا ان کے اس اعتقاد کی بنا پر کہ وہ ان کو اپنے خیال کے مطابق علم ہی سمجھتے تھے، ورنہ ان چیزوں کو علم سے کیا نسبت ہو سکتی ہے! کسی نے کہا ہے کہ علم سے مراد دنیا کے احوال کا علم ہے نہ کہ دین کا علم، جس طرح اس آیت میں ہے: ﴿ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ [الروم: ۷] ''وہ تو (صرف) دنیوی زندگی کے ظاہر کو (ہی) جانتے ہیں۔'' علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: یا علم سے مراد فلسفیوں اور دہریوں کا علم ہے، کیوں کہ یہ لوگ جس وقت اللہ کی وحی کو سنتے تو اس کو رد کرتے اور اپنے علم کی نسبت انبیاء علیہم السلام کے علم کو کم درجے کا اور حقیر سمجھتے تھے۔

سقراط سے مروی ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کا حال سنا اور اس سے کہا گیا: کاش! تو اُن کی طرف ہجرت کرتا تو بولا کہ ہم تو ایک مہذب قوم ہیں، لہٰذا ہم کو اس شخص کی حاجت نہیں ہے جو ہم کو مہذب کرے۔ یا یہ مراد ہے کہ وہ اس علم سے جو رسولوں کے پاس تھا ہنسی اور مذاق کے طور پر خوش ہوا، گویا یوں کہا کہ بینات اور علم وحی کے ساتھ اتراتے ہوئے استہزاء کیا، وہ علم جس کو رسول لائے تھے۔[1] انتہیٰ۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ﴾ سے مراد خود رسول ہیں۔ یہ اس طرح ہے کہ جب رسولوں کو ان کی قوم نے جھٹلایا تو اللہ پاک نے ان کو یہ خبر دی کہ وہ کافروں کو ہلاک کرنے والا اور مومنوں کو نجات دینے والا ہے تو وہ اس سے خوش ہوئے۔ ﴿ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ یعنی ان کو ان کے استہزاء کی جزا نے گھیر لیا۔

﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جب معائنہ کیا ہمارے عذاب کا جو دنیا میں ان پر نازل ہوا تو کہا: ہم اکیلے اللہ پر ایمان لائے اور اس شے کے منکر ہوئے جس کو ہم اس کے ساتھ شریک کرتے تھے۔ مراد وہ بت ہیں جن کو پوجا کرتے تھے۔ پھر ان کو ان کے اس ایمان نے نفع نہ دیا جو وہ ہمارا عذاب دیکھنے کے بعد لائے، اس لیے کہ یہ وہ ایمان نہیں جو اپنے صاحب کو نفع دیتا ہے، کیوں کہ جو ایمان نفع دیتا ہے وہ ایمان اختیاری ہے نہ کہ اضطراری۔

[1] تفسير النفسي (٨٢/٤)

﴿ فَمَآ اَغْنٰى ﴾ سے لے کر یہاں تک چار ''فاء'' ہیں۔ پہلے کا حرف ''فاء'' تو ان کی کثرت و شدت کا انجام بیان کرتا ہے، یعنی ان کا انجام تو اس کے بالکل خلاف ہوا جس کی اس سے اُمید رکھتے تھے۔ امید تو اس کے نفع کی تھی، بلکہ نفع کے بجائے ان کو نقصان ہی ہوا، جیسے محاورے میں بولتے ہیں: ''وَعَظْتُهٗ فَلَمْ يَتَّعِظْ'' یعنی میں نے اس کو نصیحت کی، مگر اس نے نصیحت قبول نہ کی۔ دوسرا ''فاء'' عدمِ اغنا کی تفصیل کا اشارہ کرتا ہے جس کا ابہام و اجمال کیا گیا تھا۔ تیسرا ''فاء'' صرف ان کا عقاب بتانے کے لیے ہے اور اس لیے کہ اس کے ما بعد کو اس کے ماقبل کا تابع ٹھہرائیں واقع بعد اس کے اس لیے کہ ﴿ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ ... الخ ﴾ کا مضمون یہ ہے کہ انھوں نے کفر کیا تو گویا یوں کہا گیا: ''فَكَفَرُوْا ثُمَّ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا آمَنُوْا''۔ اور چوتھا ''فاء'' ''آمَنُوْا'' پر عطف کے لیے ہے۔ گویا یوں کہا گیا: ''فَآمِنُوْا فَلَمْ يَنْفَعُهُمْ'' اس لیے کہ نفع دینے والا ایمان اختیاری ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ﴾ یعنی اللہ کا طریقہ جو اس کے بندوں میں جاری ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے ساری اُمتوں میں یہ طریقہ جاری کر رکھا ہے کہ ان کو ایمان نفع نہیں دیتا جس وقت انھوں نے عذاب کو دیکھ لیا۔ سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ میں اس کا بیان پورے طور پر گزر چکا ہے۔ ﴿ سُنَّتَ اللّٰهِ ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ فعل محذوف کا مصدر مؤکد ہے ﴿ وَعْدَ اللّٰهِ ﴾ کی طرح اور اس کی طرح کے جو اور مصادرِ مؤکدہ ہیں اس کی مثل۔ کسی نے کہا ہے کہ تحذیر کی بنا پر منصوب ہے، یعنی اے مکہ والو! حذر کرو اللہ کے طریقے سے جو پہلی اُمتوں پر جاری ہو چکا ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ یعنی اور اس وقت کافر زیاں کار ہوئے، یعنی ان کے اللہ کے عذاب اور سزا کو دیکھنے کے وقت۔ یہ معنی اس بنا پر ہیں کہ ﴿ هُنَالِكَ ﴾ اسم اشارہ مکانی استعارہ کیا گیا ہے زمان کے لیے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔[1] (كما قاله أبو السعود)۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی حاجت نہیں ہے، بلکہ اس کا اپنی اصل پر باقی رکھنا صحیح ہے، یعنی یہ معنی ہو سکتے ہیں جس جگہ اللہ کا عذاب آیا، اس جگہ کافر خاسر ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہلاک کر دیے گئے، دنیا و آخرت سے محروم ہوئے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کافر ہر وقت میں خاسر ہے، لیکن ان کے لیے ان کا خسران اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ عذاب کو دیکھتے ہیں۔[2] والله سبحانه وتعالىٰ أعلم بمراده و إسرار كتابه و هو علام الغيوب و ستار العيوب.

الحمد لله و المنة کہ سورۃ المومن کی تفسیر سات ماہِ رجب حرام ۱۳۱۳ ہجری شب چہار شنبہ نصف شب کے قریب محلہ امیر گنج میں تمام ہوئی اور اس کے تمام ہونے سے جلد دوازدہم تفسیر ترجمان القرآن کی پوری ہوئی۔ اب

---

[1] تفسير أبي السعود (٢٨٧/٧)
[2] معاني القرآن (٣٧٨/٤) فتح البيان (٢١٨/١٢۔٢٢٠)

ان شاء اللہ تعالیٰ سورت فُصِّلَت سے جلد سیزدہم شروع ہوگی۔ الٰہا سیدا باریا! اس کو قبول فرما اور آیندہ لکھنے کی قوت دے۔ فإنك أنت القوي العزيز، لا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم، اللهم إني ضعيف فقوني في رضاك، وأجرني من خزي الدنيا وعذاب الآخرة، اللهم إنك عفو تحب العفو فاعف عنا، واغفر لنا وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم. آمين، وأنا العبد الراجي رحمة ربه الباري ذوالفقار أحمد النقوي البوفالي عفا الله عنه ما جناه، ووفقه لما يحبه ويرضاه، اللهم اغفر لصاحب الترجمان مغفرة ظاهرة و باطنة لا تغادر ذنبا وأعطه الدرجات العلىٰ في الجنة آمين، والحمد لله أولا و آخراً و ظاهراً وباطناً.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَة

اسے سورت فُصِّلَتْ اور سورۃ الْمَصَابِیْح بھی کہتے ہیں۔ اس سورت مبارکہ کی چون (۵۴) آیتیں ہیں۔ کسی نے کہا کہ ترپن (۵۳) ہیں۔ امام قرطبی نے کہا ہے کہ یہ سورت سب کے قول کے مطابق مکی ہے۔[1] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ مکے میں نازل ہوئی ہے۔[2] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن قریش جمع ہوئے اور عتبہ بن ربیعہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کا ابتدائی حصہ اس پر پڑھا۔[3] (أخرجه ابن أبي شيبة وعبد بن حميد وأبو يعلىٰ والحاكم وصححه وابن مردويه وأبو نعيم والبيهقي كلاهما في الدلائل وابن عساكر) اس بارے میں اور روایتیں بھی ہیں، جن کا ذکر آیندہ آئے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ
قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۳ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ
اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۴ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ
مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ
حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝۵

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

حٰمٓ ① (یہ قرآن) بڑے مہربان، نہایت رحم کرنے والے کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے ② (یہ) ایسی کتاب ہے جس کی آیات کھول کر بیان کی گئی ہیں، حالاں کہ (یہ) قرآن عربی ہے، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں ③ جو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہے، پھر ان میں سے اکثر نے (اس سے) اعراض کرلیا تو وہ سنتے ہی نہیں ④ اور انھوں نے کہا: جس کی طرف تو ہمیں

① تفسير القرطبي (١٥/٣٣٧) ② الدر المنثور (٧/٣٠٨)

③ مصنف ابن أبي شيبة (٧/٣٣٠) مسند عبد بن حميد (١/٣٣٧) مسند أبي يعلىٰ (٣/٣٤٩) الدر المنثور (٧/٣٠٨، ٣٠٩)

بلاتا ہے، اس سے ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک پردہ ہے، لہٰذا تو (اپنا) کام کر، بلاشبہ ہم (اپنا) کام کرنے والے ہیں ⑤

شانِ قرآن اور اعراض کرنے والوں کے بہانے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ یعنی قرآن رحمان رحیم سے اتارا ہوا ہے، جس طرح کہ یہ فرمایا ہے: ﴿ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ﴾ [النحل: ١٠٢] ''کہہ دیجیے کہ اسے آپ کے رب کی طرف سے جبرائیل حق کے ساتھ لے کر آئے ہیں۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴾ [الشعراء: ١٩٢۔ ١٩٤] ''اور بلاشبہ یہ (قرآن) رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ آپ کے دل پر اترا ہے کہ آپ آگاہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ﴾ یعنی ایک کتاب ہے کہ اس کے معانی بیان کیے گئے ہیں اور اس کے احکام پختہ کیے گئے ہیں۔ ﴿ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ یعنی اس حال میں کہ وہ قرآنِ عربی ظاہر اور واضح ہے۔ چنانچہ معانی تو اس کے مفصل ہیں اور الفاظ اس کے واضح اور غیر مشکل ہیں۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴾ [هود: ١] ''یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں، پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں ایک حکیم باخبر کی طرف سے۔'' یعنی وہ اپنے معنی اور الفاظ کے لحاظ سے معجز ہے۔ ﴿ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴾ [حم السجدة: ٤٢] ''جس کے پاس باطل پھٹک بھی نہیں سکتا نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، یہ ہے نازل کردہ حکمتوں والے خوبیوں والے (اللہ) کی طرف سے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس بیان ووضوح کو جو جانتے ہیں وہ علمائے راسخین ہیں۔ ﴿ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ یعنی کبھی تو مومنین کو خوشی سناتا ہے اور کبھی کافروں کو ڈراتا ہے۔ ﴿ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴾ یعنی پھر اکثر قریش نے منہ پھیرا، چنانچہ وہ اس سے کچھ بھی نہیں سمجھتے باوجود اس کے بیان اور وضاحت کے اور بولے کہ ہمارے دل تو اس شے سے غلافوں میں ڈھکے ہوئے ہیں جس کی طرف تو ہم کو بلاتا ہے اور ہمارے کانوں میں اس چیز سے بہرا پن ہے جس کو تو ہمارے پاس لایا ہے اور ہمارے اور تیرے درمیان میں پردہ ہے، اس لیے ہم تک اس میں سے جو تو کہتا ہے کچھ بھی نہیں پہنچتا۔ لہٰذا تو اپنے طریقے پر کام کر اور ہم اپنے طریقے پر عمل کریں گے، ہم تیری پیروی نہیں کریں گے۔

امامِ عالم عبد بن حمید رحمہ اللہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک دن قریش جمع ہوئے اور کہنے

لگے کہ دیکھو تم میں سحر و کہانت و شعر و شاعری کے لحاظ سے سب سے بڑا دانا کون ہے، پھر چاہیے کہ وہ اس شخص کے پاس آئے جس نے ہماری جماعت کو متفرق اور ہمارے کام کو پریشان کر ڈالا ہے اور ہمارے دین میں نقص نکالے ہیں۔ چاہیے کہ وہ اس سے گفتگو کرے اور ہم دیکھیں وہ اس کو کیا جواب دیتا ہے۔ پھر کہا: ہم میں کوئی اور عتبہ بن ربیعہ جیسا عالم نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے اس سے کہا: اے ابو الولید! تو جا۔ پھر عتبہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے محمد! تو بہتر ہے یا عبداللہ؟ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے، پھر کہا: تو بہتر ہے یا عبدالمطلب؟ پھر بھی آپ ﷺ چپ رہے۔ پھر کہا: اگر تو یہ زعم کرے کہ یہ لوگ تجھ سے بہتر ہیں تو وہ تو اُن معبودوں کو پوج چکے ہیں جن میں تو عیب ڈالتا ہے اور اگر تو یہ زعم کرے کہ تو ان سے بہتر ہے تو تو گفتگو کر، یہاں تک کہ ہم تیری بات سنیں۔ واللہ! ہم نے تو کبھی کوئی بکری کا بچہ اپنی قوم کے لیے اتنا شوم (منحوس) نہیں دیکھا جتنا تو اپنی قوم پر ہے۔ تو نے ہماری جماعت کو متفرق کر ڈالا اور ہمارے کام کو تتر بتر کر دیا اور ہمارے دین میں عیب نکالا اور ہم کو عرب میں رسوا کر دیا، یہاں تک کہ ان میں بلا شک یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ قریش میں ایک ساحر ہے اور قریش میں ایک کاہن ہے۔

واللہ! ہم اب حاملہ عورت کی چیخ کی طرح کی آواز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ہم میں سے ہر کوئی کسی دوسرے کے سامنے تلوار لے کر کھڑا ہو جائے، یہاں تک کہ ہم آپس میں فنا ہو جائیں۔ اے شخص! اگر تجھ کو صرف حاجت ہی ہے تو ہم تیرے لیے مال و دولت جمع کریں، یہاں تک کہ تو سارے قریش سے بڑھ کر غنی ہو جائے (اصل روایت میں لفظ ہے: "حتی تکون أغنی قریش رجلا واحدا") اور اگر تجھ کو صرف جماع ہی کی ضرورت ہے تو تو قریش کی عورتوں میں سے جو جو چاہے پسند کر ہم دس عورتیں تجھے بیاہ دیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو فارغ ہو چکا؟ عتبہ نے کہا: ہاں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: « ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ ﴾ » یہاں تک کہ آپ ﴿ مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴾ تک پہنچے تو عتبہ بولا: "حَسْبُكَ حَسْبُكَ" یعنی بس بس، کیا تیرے پاس اس کے سوا اور ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں تو عتبہ قریش کی طرف لوٹ کر آیا۔

قریش نے اس سے کہا: "مَا وَرَاءَكَ"؟ یعنی کیا خبر ہے؟ کہا: میں نے کوئی شے نہیں چھوڑی جس کو میں نے خیال کیا کہ تم اس کے ساتھ گفتگو کرو گے، مگر میں نے اس کی گفتگو کی۔ قریش بولے: پھر آیا اس نے تجھے جواب دیا؟ کہا: ہاں، "لَا وَالَّذِيْ نَصَبَهَا بَنِيَّةً" یعنی قسم ہے اس کی جس نے آسمان کو بنا کر کے کھڑا کیا ہے! میں اس کی بات میں سے کچھ بھی نہیں سمجھا، سوائے اس کے کہ اس نے تم کو صاعقۂ عاد و ثمود جیسے صاعقہ سے ڈرایا ہے۔ وہ بولے: تیرا برا ہو، کوئی تجھ سے عربی زبان میں باتیں کرے اور تو اس بات کو نہ سمجھے جو اس نے کہی۔ عتبہ نے کہا: لا واللہ! میں اس میں سے جو اس نے کہا: کسی شے کو نہ سمجھا سوائے صاعقہ کے ذکر کے۔[1] (وهكذا رواه الحافظ أبو يعلىٰ الموصلي في مسنده عن أبي بكر بن أبي شيبة بإسناده مثله سواء)

[1] مسند عبد بن حميد (٣٣٧/١) مسند أبي يعلىٰ (٣٤٩/٣)

امام بغوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بہ سندِ خود سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے اس کو روایت کیا ہے، پھر حدیث کو اس قول تک ذکر کیا: ﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴾ چنانچہ عتبہ نے اپنا ہاتھ آپ ﷺ کے منہ پر رکھ دیا اور آپ کو رحم کی قسم دی اور اپنے گھر لوٹ آیا اور قریش کی طرف نہ نکلا، ان سے رُک گیا۔ پھر ابوجہل نے کہا: اے گروہِ قریش! واللہ! ہم خیال کرتے ہیں کہ عتبہ محمد کی طرف مائل ہوگیا ہے اور اس کو اس کا کھانا پسند آگیا ہے اور یہ صرف اس کی کسی حاجت کی وجہ سے ہے جو اس کو پہنچی ہے، لہٰذا تم ہمارے ساتھ اس کی طرف چلو۔ پھر وہ اس کی طرف چلے تو ابوجہل نے کہا: اے عتبہ! تجھے ہم سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ تو محمد کی طرف مائل ہوگیا ہے اور تجھے اس کے کھانے نے تعجب میں ڈال دیا، لہٰذا اگر تجھے کوئی حاجت ہے تو ہم تیرے لیے اپنا اتنا مال جمع کریں جو تجھے محمد کے کھانے سے بے پروا کر دے۔ چنانچہ عتبہ خفا ہوا اور قسم کھائی کہ محمد سے کبھی بات نہ کرے گا اور کہا: واللہ! تم اس بات کو یقینی طور پر جانتے ہو کہ میں قریش میں سب سے زیادہ مال دار ہوں، لیکن میں اس کے پاس آیا اور اس سے قصہ بیان کیا تو اس نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی کہ واللہ! وہ نہ شعر ہے نہ کہانت ہے اور نہ سحر ہے اور سورت پڑھی اس قول تک: ﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴾ پھر میں نے اس کا منہ پکڑ لیا اور اسے رحم کی قسم دی کہ رک جائے اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو کہ محمد جس وقت کچھ کہتا ہے تو جھوٹ نہیں بولتا، لہٰذا میں اس بات سے ڈرا کہ تم پر عذاب نازل ہو۔[1] (وهذا السياق أشبه من سياق البزار وأبي يعلىٰ، والله تعالىٰ أعلم.)

امام محمد بن اسحاق بن یسار رحمہ اللہ کتاب سیرت میں اس طرز کے خلاف اس قصے کو لائے ہیں۔ امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے یوں روایت کیا ہے، کہا: مجھے حدیث کی گئی ہے کہ عتبہ بن ربیعہ جو ایک سردار تھا، اس نے ایک قریش کی مجلس میں جس میں وہ بیٹھا ہوا تھا، کہا: اے گروہِ قریش! کیا میں کھڑا نہ ہوں محمد کی طرف، جو اس وقت مسجد میں اکیلے تشریف فرما تھے، اور اس سے گفتگو کروں اور اس پر کئی امر پیش کروں، شاید وہ بعض باتوں کو قبول کر لے تو اس کو ان میں سے جو چاہے وہ دیں اور وہ ہم سے باز رہے۔ یہ اس وقت کہا کہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے تھے اور دیکھا کہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ تعداد میں زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ قریش بولے کہ ہاں اے ابوالولید! تو اس کی طرف جا اور اس سے گفتگو کر۔

چنانچہ عتبہ آپ ﷺ کی طرف گیا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پاس بیٹھ گیا اور کہا: اے بھتیجے! بے شک تو ہم میں سے ہے، اس لحاظ سے کہ تو جان چکا ہے کہ کنبے کی کیا فضیلت ہے اور نسب میں جو مرتبہ ہے وہ بھی تجھے معلوم ہے اور بے شک واقعی تو اپنی قوم کے پاس ایک امرِ عظیم لایا ہے جس سے تو نے ان کی جماعت کو متفرق کر دیا ہے اور

[1] تفسير البغوي (١٦٧/٧، ١٦٨)

ان کی عقلوں کو خفیف اور سبک کر دیا ہے اور ان کے معبودوں اور دین میں عیب نکالا ہے اور ان کے گزرے ہوئے باپ دادوں کو کافر کر دیا، چنانچہ اب تو مجھ سے سن، میں تجھ پر کئی اُمور پیش کرتا ہوں کہ تو اُن میں غور کرے، شاید تو ان میں سے بعض کو مان لے۔ راوی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے کہا: اے ابوالولید! تو کہہ میں سنوں گا۔

عتبہ نے کہا: او بھتیجے! یہ امر جس کو تو لے کر آیا ہے اگر تو اس سے صرف مال ہی چاہتا ہے تو ہم تیرے لیے بہت سا مال جمع کر دیں، یہاں تک کہ تو ہم سب سے زیادہ مالدار ہو جائے۔ اگر اس سے تو شرف چاہتا ہے تو ہم تجھ کو اپنے اوپر سردار بنا لیں یہاں تک کہ تیرے بغیر کوئی کام نہ کریں اور اگر اس سے بادشاہت کا ارادہ کرتا ہے تو ہم تجھے اپنے اوپر بادشاہ بنا دیں اور اگر یہ شخص جو تیرے پاس آتا ہے، یہ کوئی جنوں کا تابع ہے جس کو تو دیکھتا ہے اور اسے اپنے سے دور کرنے کی تجھ میں طاقت نہیں ہے تو ہم تیرے لیے طبیبوں کو بلائیں اور اس کے لیے ہم اپنے مال خرچ کریں، یہاں تک کہ تجھ کو اس سے تندرست اور بھلا چنگا کر دیں، کیوں کہ بعض اوقات جنوں کا کوئی تابع آدمی پر غالب ہو جاتا ہے، تاوقتیکہ اس کا اس سے علاج کیا جائے یا جیسا کہ عتبہ نے آپ ﷺ سے کہا۔ یہاں تک کہ جب عتبہ فارغ ہوا اور رسول اللہ ﷺ اس کی بات سنتے رہے، فرمایا: اے ابوالولید! کیا تو اپنی بات سے فارغ ہو چکا؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: اب تو مجھ سے سن، اس نے کہا: میں سنتا ہوں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴾ پھر آپ ﷺ چلے اس سورت میں اور آپ ﷺ اس کو اس پر پڑھتے جاتے تھے، چنانچہ جب عتبہ نے سنا تو اس کے لیے خاموش رہا اور اپنے دونوں ہاتھ پسِ پشت ڈال دیے، ان پر ٹیک لگا کر آپ سے سنتا رہا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اس کے سجدے تک پہنچے تو آپ ﷺ نے سجدہ کیا، پھر فرمایا: ”قَدْ سَمِعْتَ يَا أَبَا الْوَلِيْدِ مَا سَمِعْتَ فَأَنْتَ وَذَاكَ“ یعنی ابوالولید یقیناً تو نے سنا جو سنا، پھر تو ہے اور یہ ہے۔ چنانچہ عتبہ کھڑا ہوا اور اپنے اصحاب کی طرف گیا تو بعض نے بعض سے کہا کہ ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ ابوالولید تمھارے پاس اس نیت کے بغیر آیا ہے جس کے ساتھ گیا تھا، پھر جب وہ ان کے پاس آکر بیٹھا تو بولے: ”مَا وَرَاءَكَ يَا أَبَا الْوَلِيْدِ؟“ یعنی اے ابوالولید! تیرے پیچھے کیا خبر ہے؟ کہا: میرے پیچھے یہ ہے کہ بے شک میں نے ایسا قول سنا ہے کہ واللہ! اس جیسا قول کبھی نہیں سنا، واللہ! وہ نہ سحر ہے نہ شعر ہے اور نہ کہانت۔ اے گروہِ قریش! تم میری اطاعت کرو اور اس اطاعت کا ذمہ مجھ پر ڈال دو، تم اس مرد کو اور اس شے کو جس میں وہ ہے چھوڑ دو اور اس کے حال میں کچھ تعرض نہ کرو اور تم اس سے علاحدہ ہو جاؤ۔

اللہ کی قسم! اس کے قول سے جو میں نے سنا ہے، اس میں ایک خبرِ عظیم ہوگی۔ اگر عرب اس کو پہنچے، یعنی اس کو مصیبت اور تکلیف پہنچائی تو مقرر تم اپنے غیر کے ساتھ اس کی کفایت کیے گئے اور اگر وہ عرب پر غالب ہو گیا تو اس کا

ملک تمھارا ملک ہے اور اس کی عزت تمھاری عزت ہے اور سب لوگوں سے بڑھ کر تم اس کے ساتھ بہرہ مند ہو گے۔ قریش بولے: ''سَحَرَكَ وَاللّٰهِ يَا أَبَا الْوَلِيْدِ بِلِسَانِهٖ، قَالَ: هٰذَا رَأْيِيْ فِيْهِ فَاصْنَعُوْا مَا بَدَا لَكُمْ'' یعنی اے ابو الولید! اس نے تو اپنی زبان سے تجھ پر جادو کر دیا۔ عتبہ نے کہا کہ اس کے بارے میں یہ میری رائے ہے، اب تم کرو جو تمھاری سمجھ میں آئے۔[1] وهذا السياق أشبه من الذي قبله و اللّٰه أعلم.

فتح البیان کا بیان:

﴿ حٰمٓ ﴾ من جملہ حروفِ مقطعات ہے اللہ ہی اس سے اپنی مراد کو خوب جانتا ہے۔ اس کے معنی و اعراب اور ﴿ تَنْزِيْلٌ ﴾ کے معنی و ترکیب پر اس سے پہلی سورت میں کلام گزر چکا ہے، یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ امام زجاج اور اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَنْزِيْلٌ ﴾ مرفوع بہ ابتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ﴾ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہو، یعنی ''هٰذَا تَنْزِيْلٌ''۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کتاب بدل ہو ﴿ تَنْزِيْلٌ ﴾ سے[2] اور ﴿ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ متعلق ہو ﴿ تَنْزِيْلٌ ﴾ سے۔

ان دو صفتوں کو خاص کر اس لیے ذکر کیا ہے کہ مخلوق اس عالم میں بیماروں کی طرح ہے جو دواؤں کی محتاج ہے اور جن دواؤں کی مریضوں کو حاجت ہوتی ہے اور جن غذاؤں کی تندرستوں کو ضرورت ہوتی ہے قرآن شریف اس پر مشتمل ہے، تو قرآن کا اتارنا جو اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق پر رحمت، لطف اور کرم کے لیے ہے، یہ اللہ کی طرف سے اس دنیا کے لیے ایک بہت فائدہ اور نفع ہوا۔ فرمایا: وہ تنزیل کیا ہے، ایک کتاب ہے جس کی آیتیں بیان کی گئی ہیں، الگ الگ کر کے ان کو لفظ اور معنی کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے۔ یا اس کی آیتیں مختلف اسلوب اور تفصیل سے نازل کی گئی ہیں۔

کہیں احکام مذکور ہیں، کہیں مثلیں اور کہاوتیں ہیں، کسی جگہ وعظ و نصیحت ہے، کبھی نباتات و حیوانات اور انسانوں کے عجب عجب حالات کا ذکر ہو رہا ہے، کبھی تہذیب و اخلاق اور ریاضتِ نفس سمجھائی جاتی ہے۔ کہیں گذشتہ اُمتوں کی تاریخ بیان ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پاکی اور تقدس کا علاحدہ ذکر ہو رہا ہے۔ کہیں آسمانوں اور زمینوں کے عجائبات اور ملک کی شرح ہوتی ہے۔ بالجملہ جو کوئی انصاف کرے گا تو وہ اس بات کو خوب جان لے گا کہ اس دنیا کی پیدائش سے لے کر انتہا تک کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں مختلف علوم جمع ہوں، جیسے کہ قرآن میں جمع ہیں۔ ''فَتَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ وَأَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ''۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''فُصِّلَتْ بِبَيَانِ حَلَالِهٖ مِنْ حَرَامِهٖ، وَطَاعَتِهٖ مِنْ مَّعْصِيَتِهٖ'' یعنی حلال کو حرام سے خوب کھول کر بیان کر دیا ہے اور اپنی طاعت کو اپنی معصیت سے واضح کر کے بتا دیا ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وعد و وعید کے ساتھ، یعنی وعدہ اور وعید کا ذکر الگ الگ کیا گیا ہے۔

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٢/١٣٠، ١٣١) تفسير ابن كثير (٤/١١٤، ١١٥) [2] تفسير القرطبي (١٥/٣٣٧) فتح القدير (٤/٦٦٢)

سفیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ثواب اور عقاب کا ذکر علاحدہ علاحدہ کیا گیا ہے۔[1] یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ان سب کی طرف محمول کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ کسی نے "فَصَلَتْ آيَاتُهُ" بہ تخفیفِ صاد بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے، یعنی اس کی آیتوں نے حق اور باطل کے درمیان فرق کر دیا۔ جملۂ ﴿ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ﴾ محلِ رفع میں ہے۔ یہ ﴿ كِتٰبٌ ﴾ کی صفت ہے اور ﴿ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ کا نصب بنا بر اختصاص ہے، یا بنا بر مدح، جیسا کہ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے: "أَيْ: أُرِيدَ بِهٰذَا الْكِتَابِ الْمُفَصَّلِ آيَاتُهُ قُرْآنًا مِنْ صِفَتِهِ كَيْتَ كَيْتَ"۔[2] یعنی میں اس کتاب سے جس کی آیتیں تفصیل کی گئی ہیں قرآن کا ارادہ کرتا ہوں جو عربی زبان میں ہے۔ یا منصوب ہے بنا بر حال "أَيْ: فُصِّلَتْ آيَاتُهُ حَالَ كَوْنِهِ قُرْآنًا عَرَبِيًّا"۔ یعنی تفصیل کی گئی ہیں اس کی آیتیں اس حال میں کہ وہ عربی زبان کا قرآن ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ بنا بر مصدریت ہے "أَيْ: يَقْرَأُهُ قُرْآنًا" یعنی اس کتاب کو اچھی طرح پڑھتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فُصِّلَتْ ﴾ کا دوسرا مفعول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فعل محذوف کا معمول ہے جس پر ﴿ فُصِّلَتْ ﴾ دال ہے۔ "أَيْ: فَصَّلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا" یعنی ہم نے قرآنِ عربی کر کے اس کتاب کی آیتوں کی تفصیل کی۔ ﴿ لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴾ ایک قوم کے لیے جو اس کے معانی کو جانتے اور سمجھتے ہیں اور وہ عربی زبان والے ہیں۔ ان کا ذکر خاص کر اس لیے کیا کہ وہ اس کو بلاواسطہ سمجھتے ہیں، کیوں کہ قرآن اُن کی زبان میں ہے۔ ان کے غیر اسے نہیں سمجھ سکتے مگر ان کے واسطے سے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قوم کے لیے جو یہ جانتے ہیں کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کے پاس سے اتارا ہوا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: جو یہ جانتے ہیں کہ وہ ایک معبود ہے، جیسا کہ تورات اور انجیل میں ہے۔[3] ﴿ لِقَوْمٍ ﴾ کا حرفِ لام محذوف سے متعلق ہے جو قرآن کی دوسری صفت ہے۔ "أَيْ: قُرْآنًا عَرَبِيًّا كَائِنًا لِقَوْمٍ"۔ یا ﴿ فُصِّلَتْ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی اس کی آیتیں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، ان کے لیے جو ان کو جانتے ہیں، یعنی عرب، کیوں کہ وہ بہ سبب عربی زبان ہونے کے ان سے نفع لینے والے ہیں، گو وہ فی نفسہ سب لوگوں کے لیے مفصل ہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور اسی طرح ﴿ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ بھی قرآن کی دو اور صفتیں ہیں۔ یا کتاب سے حال ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو خوش خبری سنانے والا اور اس کے دشمنوں کو ڈرانے والا۔ امام نافع رحمہ اللہ نے "بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ" بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ كِتٰبٌ ﴾ کی صفت ہیں، یا مبتدائے محذوف کی خبر ہیں۔

﴿ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ ﴾ اس جگہ "أَكْثَر" سے مراد کفار ہیں، یعنی کفار نے اس ڈرانے سے اعراض کیا جس پر وہ کتاب مشتمل تھی۔ ﴿ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴾ یعنی پھر وہ اس طرح سے سنتے نہیں ہیں جس سے نفع لیں، کیوں کہ انھوں نے تو اس سے اعراض کیا ہے اور کہا: ﴿ قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ ﴾ ﴿ اَكِنَّةٍ ﴾ جمع ہے کنان کی۔ کنان

[1] تفسير القرطبي (١٥/ ٣٣٧) [2] تفسير القرطبي (١٥/ ٣٣٧) [3] تفسير القرطبي (١٥/ ٣٣٧، ٣٣٨)

بہ معنی غطاء اور پردہ ہے۔ کنانہ ترکش کو کہتے ہیں جس میں تیر رکھتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: کنان قلب کے لیے ایسا ہے جیسے تیروں کے لیے جعبہ، یعنی ترکش ہوتا ہے۔① اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔② معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل پردوں، غلافوں میں ہیں اس توحید سے جس کی طرف تو ہم کو بلاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس بات کو نہیں سمجھتے جو تو کہتا ہے اور نہ ہی ان تک تیری بات پہنچتی ہے۔

﴿ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ ﴾، ﴿ وَقْرٌ ﴾ کی اصل ثقل وگرانی ہے۔ طلحہ بن مصرف نے بہ کسرِ واو اور کسی نے بہ فتحِ واو وقاف پڑھا ہے۔③ یعنی اور ہمارے کانوں میں بوجھ، یعنی بہرا پن ہے، وہ ہم کو تیری بات کو سننے سے روکتا ہے۔ ﴿ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ ﴾ یعنی اور ہمارے اور تیرے درمیان پردہ ہے۔ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کا ہے، معنی یہ ہیں کہ پردہ کی ابتداء ہم سے اور تجھ سے ہوئی ہے، چنانچہ وہ مسافت جو ہماری جہت اور تیری جہت کے درمیان ہے، وہ پوری پردے سے بھر دی گئی ہے، اس میں کچھ خلا نہیں ہے اور اگر "بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ حِجَابٌ" کہا جاتا اور لفظ ﴿ مِنْ ﴾ نہ آتا تو یہ معنی ہوتے کہ دونوں جہتوں کے درمیان میں حجاب حائل ہے، حالانکہ مقصود مبالغہ ہے تباینِ مفرط میں، چنانچہ اس لیے لفظ ﴿ مِنْ ﴾ لایا گیا ہے۔ یہ سب اس کی تمثیلیں ہیں کہ ان کے دل حق کا ادراک کرنے، اسے قبول کرنے اور اس پر اعتقاد کرنے سے دور پڑے ہوئے ہیں۔

گویا غلافوں، پردوں میں ہیں جو حق کو روکتے ہیں کہ ان کے دلوں میں اثر کرے۔ اور اس کے کہ ان کے کان حق کو پھینکتے ہیں، گویا ان کے کانوں میں حق بات کو سننے سے بہرا پن ہے اور اس کے کہ دونوں مذہبوں اور دینوں میں دوری ہے اور ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تعلق اور ملاپ ممنوع ہے، گویا ان کے اور اس دین کے جس پر وہ ہیں اور رسول اللہ ﷺ اور جس پر آپ ﷺ ہیں، ان کے درمیان ایک ساتر پردہ ہے اور پہاڑ جیسی یا اس جیسی مضبوط رکاوٹ ہے، چنانچہ کسی طرح نہ ایک دوسرے کو مل سکتا ہے نہ اس سخت پردے کی وجہ سے دیکھ سکتا ہے۔ جب باہم اس قسم کی منافرت ہے تو ﴿ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴾ یعنی تو اپنے دین پر چلتا رہ، مراد توحید ہے اور ہم اپنے دین پر چلتے رہیں، مراد شرک ہے۔

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا کہ تو عمل کر ہماری ہلاکت کے لیے، کیوں کہ ہم تیری ہلاکت کے لیے عمل کرنے والے ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: تو عمل کر اپنے معبود کے لیے جس نے تجھے بھیجا ہے، کیوں کہ ہم اپنے معبودوں کے لیے عمل کرتے ہیں جن کو ہم پوجنے والے ہیں۔④ کسی نے کہا تو عمل کر اپنی آخرت کے لیے، ہم عمل کرنے والے ہیں اپنی دنیا کے لیے۔ یا تو عمل کر ہمارے کام کو باطل کرنے کے لیے اور ہم عمل کرتے ہیں تیرے کام کو باطل کرنے کے لیے۔⑤ (كذا في فتح البيان)۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ ان کی اس بات کا جواب دیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

① تفسير الطبري (٤٢٩/٢١) تفسير القرطبي (٣٣٩/١٥) ② رقم الآية (٨٨) ③ فتح القدير (٦٦٣/٤)
④ تفسير القرطبي (٣٤٠/١٥) ⑤ فتح البيان (٢٢٣/١٢ـ٢٢٥)

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْۤا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ؕ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۙ۝۶ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۷ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۠۝۸

کہہ دیجیے: بس میں تو تمھارے جیسا ہی ایک بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے، یہ کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، لہٰذا اسی کی طرف سیدھے رہو اور اسی سے بخشش مانگو اور مشرکین کے لیے ہلاکت ہے ⑥ جو زکات نہیں دیتے اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں ⑦ بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر وثواب ہے ⑧

بشر رسول کی طرف سے توحید کی دعوت:

بعضے کہتے ہیں کہ یہاں زکات سے مراد کلمہ کہنا ہے۔ زکات کے معنی پاکیزگی۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک فرماتا ہے: اے محمد! تو ان مکذبین مشرکین سے کہہ دے کہ میں بھی تمھاری طرح ایک آدمی ہوں، میری طرف اس بات کی وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا جو معبود ہے، وہ ایک معبود ہے نہ کہ جس طرح تم بتوں اور انداد اور مختلف ارباب کو پوجتے ہو۔ اللہ جو ہے سو ایک معبود ہے۔ ﴿ فَاسْتَقِيْمُوْۤا اِلَيْهِ ﴾ لہٰذا تم اس کے لیے عبادت کو خالص کرو اس طرح پر جس کا رسولوں کی زبان پر تم کو حکم کیا ہے اور اس سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگو۔ ﴿ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ﴾ یعنی مشرکوں کے لیے ہلاکت ہے۔

﴿ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ﴾ علی بن ابی طلحہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ وہ لوگ جو لا الہ الا اللہ کی گواہی نہیں دیتے، یعنی نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ۔ اسی طرح عکرمہ نے بھی کہا ہے۔[1] یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴾ [الشّمس: ۹۔ ۱۰] ''جس نے اسے پاک کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا وہ ناکام ہوا'' اور اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝۱۴ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴾ [الأعلیٰ: ۱۴۔ ۱۵] ''بے شک اس نے فلاح پائی جو پاک ہوگیا اور جس نے اپنے رب کا نام یاد رکھا اور نماز پڑھتا رہا'' اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴾ [النازعات: ۱۸] ''کیا تو اپنی درستی اور اصلاح چاہتا ہے۔''

زکات سے مراد اس جگہ رذیل اخلاق سے نفس کی طہارت ہے، اور اس سے زیادہ اہم شرک سے نفس کی

[1] تفسير الطبري (٤٣٠/٢١)

طہارت ہے۔ مال کی زکات کا نام جو زکات رکھا تو اسی لیے کہ وہ اس کو حرام سے پاک کرتی ہے اور اس میں زیادتی اور برکت اور زیادہ نفع کا باعث ہوتی ہے اور مال کو اللہ کی طاعت کے کاموں میں استعمال کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ معاویہ بن قرہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکین اہلِ زکات میں سے نہیں ہیں جب تک کہ زکات نہ دینے پر ان کو ملامت کی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ زکات سے مراد شرک اور گناہوں سے نفس کی طہارت ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ أَيْ: لَا يُؤَدُّوْنَ الزَّكَاةَ" یعنی زکات سے مراد اموال کی زکات ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "يَمْنَعُوْنَ زَكَاةَ أَمْوَالِهِمْ" بہت سے مفسرین کے نزدیک ظاہر قول یہی ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1]

اس میں نظر ہے، اس لیے کہ زکات ۲ ہجری میں واجب ہوئی ہے اس قول کی بنا پر جس کو بہت لوگوں نے ذکر کیا ہے اور یہ آیت مکی ہے، یعنی پھر زکات کے واجب ہونے سے پہلے اس کے نہ دینے پر ملامت کیسے ہوسکتی ہے اور ملامت بھی ان لوگوں کو جو مشرک ہیں اور اہلِ زکات نہیں ہیں۔ "اللھم" مگر یوں کہیں کہ یہ بات بعید نہیں ہے کہ اصل صدقہ اور زکات کا حکم بعثت کے شروع ہی میں ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ﴾ [الأنعام: ١٤١] "اس میں جو حق واجب ہے وہ اس کے کاٹنے کے دن دیا کرو۔" اب رہی وہ زکات جو مقررہ مقدار اور نصاب والی ہے تو اس کا حکم مدینہ منورہ میں دیا گیا اور یہ دونوں اقوال کے درمیان جمع کی تاویل ہو جائے جس طرح کہ بعثت کے ابتداء میں اصل نماز سورج کے طلوع ہونے سے قبل اور غروب ہونے سے قبل واجب تھی، پھر ہجرت سے ڈیڑھ برس پہلے جب شبِ معراج ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر پانچوں نمازیں فرض فرمائیں اور اس کے بعد نماز کے تمام متعلقات اس کے شروط وارکان ذرا ذرا کر کے تفصیل سے بیان فرمائے۔ واللّٰہ أعلم.

پھر اللہ عزوجل نے اس کے بعد فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ﴿ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴾ کے معنی ہیں "غير منقطع و غير مجبوب" یعنی ان کے لیے ایسا اجر ہے کہ کبھی ختم نہ ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ﴾ [الكهف: ٣] "جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔" نیز فرمایا: ﴿ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ [هود: ١٠٨] "یہ بے انتہا بخشش ہے۔" امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "غَيْرُ مَمْنُوْنٍ عَلَيْهِمْ"[2] یعنی ایسا اجر کہ اس کا ان پر احسان نہیں رکھا جائے گا۔

بعض ائمہ نے اس تفسیر کو سدی پر رد کیا ہے۔ رد کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ جنت پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے، اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ ﴾ [الحجرات: ١٧] "بلکہ دراصل اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی ہدایت کی۔" اور اہلِ جنت نے کہا ہے: ﴿ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴾ [الطور: ٢٧] "پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہمیں تیز و تند گرم ہواؤں کے عذاب سے بچا لیا۔" نیز

---

[1] تفسیر الطبري (٤٣١/٢١) تفسیر ابن کثیر (١١٦/٤)
[2] تفسیر ابن کثیر (١١٦/٤)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « إِلَّا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ »[1] انتهى.

کاتبِ حروف ۔عفا اللہ۔ کہتا ہے کہ جس طرح ﴿ مَمْنُوْنٍ ﴾ کے اور معانی ہیں، اسی طرح سدی رحمہ اللہ کے بھی معنی ہیں جو قابلِ رد نہیں ہیں، اس لیے کہ لغت کے خلاف نہیں ہیں اور نہ ہی ضروریاتِ دین کے مخالف ہیں کہ ان کا رد ضروری ہو، بلکہ اگر ذرا غور سے دیکھو تو اس میں ایک عجیب لطف ہے، وہ یہ ہے کہ نفوسِ شریفہ جن کی جبلت میں عار وننگ رکھا گیا ہے، ان کے نزدیک احسان جتانے سے بڑھ کر کوئی چیز ناگوار نہیں ہے، بلکہ اس کو قتل سے بھی بڑھ کر سمجھتے ہیں، خصوصاً حضراتِ عربِ عربا جو سب قوموں سے زیادہ اس مزیت (فضیلت) کے ساتھ ممتاز ہیں۔ چنانچہ ان کے واقعات اس کے شاہدِ عدل ہیں، اس لیے جب آخرت کے ثواب کا ذکر کیا تو فرمایا کہ باوجود اس کی کثرت، بقاء اور خوبی کے اس کا یہ وصف ہے کہ اس کا احسان نہ رکھا جائے جس احسان کو تم قتل سے بڑھ کر سمجھتے ہو۔ چونکہ یہ آیت مکی ہے اور بعثت کے شروع کا زمانہ ہے، اس وقت کے مناسب اسی قسم کی بات ہے۔ لكل مقام مقال.

اگر یہ کہو کہ اجر تو مزدوری کے معنی میں ہے جو کسی کام کے مقابلے میں ہوتی ہے، اس میں احسان کا کیا کام ہے، کام کیا مزدوری لی، پھر غیر ممنون کا کیا فائدہ ہے؟ تو کہیں گے کہ دنیا میں بادشاہ اگر کسی کو کسی کام کے مقابلے میں کچھ مزدوری زیادہ دیتے ہیں تو اس کا احسان رکھتے ہیں، اس لیے فرمایا کہ وہاں اجر بڑا اجر ہے اور احسان کا ذکر نہیں جس سے تم کو نفرت ہے اور اسی لیے اللہ پاک نے قرآن شریف میں اکثر جگہ جنت کو اعمال کا اجر ٹھہرایا ہے، چنانچہ فرمایا ہے: ﴿ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الزخرف: ۷۲] ''یہی وہ بہشت ہے کہ تم اپنے اعمال کے بدلے اس کے وارث بنائے گئے ہو۔'' اور مزدوری کا کچھ احسان نہیں ہوتا اسی لیے نفوسِ شریفہ کے نزدیک کام کر کے اجرت لینا مفت لینے سے زیادہ پسند ہے۔ منت رکھنا یا احسان جتانا ایک سخت گناہ ہے، اللہ پاک نے اس کو حرام کیا ہے، اس میں سخت وعید وارد ہوئی ہے، یہ حرمت بندوں کے آپس کے درمیان ہے کہ احسان کر کے جتلائیں نہیں، کیوں کہ احسان تو الگ باطل ہوا اور وعید کا ہار گلے میں پڑا اور جس پر احسان کیا تھا اس کو رنجیدہ کیا۔

رہا اللہ پاک کا احسان رکھنا تو وہ مالک ہے جو چاہے کرے، حقیقت میں تو اس کا نرا فضل، کرم اور رحم ہی ہے۔ بندے اس کے، دنیا اور آخرت کی بادشاہت اس کی، اعمال کا خالق وہی، جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، احسان رکھنے کی اسے کیا ضرورت ہے، لیکن چونکہ بندے اس کے احسانات اور نعمتوں سے بے خبر ہیں اور اُن کے سمجھنے سے قاصر ہیں، اس لیے انواع واقسام کی اپنی نعمتیں شمار کر کے بتا دیں، تاکہ ان کو سمجھ کر شکر کریں اور اپنے خالق اور مالک کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ یہ احسان کرنا ان کے فائدہ کے لیے ہے۔ چنانچہ بعض اعرابی لوگ آکر مسلمان ہوئے اور اپنی نادانی کی وجہ سے اپنے مسلمان ہونے کا نبی اکرم ﷺ پر احسان رکھنے لگے تو ان کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٦)

سمجھانے کے لیے فرمایا: ﴿ لَا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ هَدٰىکُمْ لِلْاِیْمَانِ ﴾ [الحجرات: ١٧]
''اپنے مسلمان ہونے کا مجھ پر احسان نہ رکھو، بلکہ دراصل اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی ہدایت کی۔'' یعنی یہ کیا بے سمجھی کی بات کرتے ہو کہ اپنے مسلمان ہونے کا احسان جتاتے ہو۔ ہوش میں آؤ اور سمجھو کہ تم کس کی ملک ہو۔ اللہ کے بندے ہو اس نے تم کو اسلام کی راہ بتائی، وہ تم پر احسان رکھتا ہے۔ ان کے سمجھانے کے لیے اپنے فضل وکرم اور رحم کو احسان کے پیرائے میں ادا کیا۔

جنت والوں نے جو اس طرح کہا: ''فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا'' تو یہ اس لیے کہ جب جنت میں پہنچے اور عظیم نعمت دیکھی تو آنکھیں کھلیں، اپنے اعمال کو اس دائمی نعمت کے مقابلے میں حقیر سمجھے اور انتہائی خوش ہوئے تو بولے کہ ہمارے اعمال تو اس قابل نہ تھے کہ ایسی جزا ملے۔ یہ صرف اللہ کا فضل وکرم اور احسان ہے جو اس نے ہم پر کیا اور یہ نعمت دی اور آگ سے بچایا۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کا یہ قول ہے: «إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ»[1] چونکہ یہ خوف دلانے کا مقام تھا اور یہ بیان کرنا منظور تھا کہ جنت محض اللہ پاک کی رحمت اور فضل سے ملتی ہے تو اپنے اعمال پر بھروسا کر بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے، اس لیے خود نبی اکرم ﷺ نے باوجود اپنے مرتبے کی بلندی کے اپنے آپ کو بھی اس میں شریک فرما دیا۔ واللّٰه سبحانهٗ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ میں جو ہوں اگر وحی نہ ہوتی تو تمھارے جیسا ایک شخص ہوں اور اس جنس سے نہیں ہوں جو تمھارے مغائر (تم سے غیر) ہو، تاکہ تمھارے دل اس شے کو سمجھنے سے قاصر ہوں جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں اور تمھارے کانوں میں بوجھ ہو اور میرے اور تمھارے درمیان میں پردہ ہو اور میں نے تم کو اس شے کی طرف نہیں بلایا جو عقل کے مخالف ہو۔ میں نے تو تم کو توحید کی طرف بلایا ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ میں اس پر قادر نہیں ہوں کہ تم کو زبردستی ایمان لانے پر آمادہ کروں، کیوں کہ میں تو تمھاری طرح کا ایک آدمی ہوں۔ تم سے کسی طرح کا امتیاز نہیں ہے، مگر اتنا ہے کہ میری طرف توحید کی اور اس کا امر کرنے کی وحی کی گئی ہے۔ چنانچہ میرا فرض صرف پہنچا دینا ہے، پھر اگر تم نے مانا تو ہدایت پاؤ گے اور اگر نہ مانا تو ہلاک ہو جاؤ گے۔

کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ میں کوئی فرشتہ نہیں جو نظر نہ آئے۔ میں تو صرف تمھارے جیسا ایک بشر ہوں اور میری طرف تم سب کو چھوڑ کر وحی کی گئی ہے۔ اس وحی کی وجہ سے میں نبی ہو گیا ہوں اور میری پیروی تم پر واجب ہو گئی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے اس آیت کے معنی میں یوں فرمایا ہے کہ اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو تواضع کی کیفیت

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کی تعلیم فرمائی ہے کہ تواضع کس طرح کریں۔[1] جمہور نے ﴿ یُوْحٰٓی ﴾ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور امام اعمش اور نخعی رحمہ اللہ نے بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ فاعل اللہ پاک ہے۔ یعنی "یُوحِيُ اللّٰهُ إِلَيَّ"[2] ﴿ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ ﴾ میں تعدیہ بالی اس لیے ہوئی ہے کہ اس میں "تَوَجَّهُوْا" کے معنی شامل ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ تم اپنی استقامت کو ایک معبود کی طرف ایمان اور طاعت کے ساتھ متوجہ کرو اور اس کی راہ سے اِدھر اُدھر نہ ہٹو اور اس سے ان گناہوں کی اور شرک کی جو تم سے ہوگیا ہے توبہ مانگو اور اس بدعقیدہ اور عمل کی مغفرت چاہو جس پر تم ہو، پھر مشرکوں کو ملامت کی اور وعید سنائی۔

﴿ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ﴾ یعنی مشرکوں کی خرابی اور ہلاکت ہے۔ پھر ان کا یہ وصف بیان کیا: ﴿ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ﴾ یعنی وہ جو زکات کو روک لیتے ہیں اور اسے فقراء کی طرف نہیں نکالتے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کے وجوب کا اقرار نہیں کرتے۔ کہا جاتا تھا کہ زکات اسلام کا پل ہے جس نے اس کو عبور کیا تو اس نے نجات پائی اور جو اس سے پیچھے رہا، وہ ہلاک ہوا۔ امام ضحاک اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صدقہ نہیں دیتے اور اللہ کی طاعت میں خرچ نہیں کرتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ "لا إله إلا الله" کی گواہی نہیں دیتے، اس لیے کہ یہ نفوس کی زکات اور تطہیر ہے۔

امام مجاہد نے کہا: "لَا يُزَكُّوْنَ أَعْمَالَهُمْ" یعنی اپنے اعمال کا تزکیہ نہیں کرتے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکین اپنے مال خرچ کرتے تھے اور حاجیوں کو کھلاتے پلاتے تھے، پھر انھوں نے یہ اس شخص پر حرام کر دیا جو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لایا تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔[3] ﴿ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ معطوف ہے ﴿ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ﴾ پر اور اس کے ساتھ صلہ کے تحت داخل ہے۔ ضمیرِ فصل کا لانا ان کو اس میں شامل کرنے کے لیے ہے، یعنی اور وہی ہیں آخرت کے منکر اور جاحد۔

منع زکات کو جو کفر "بِالْآخِرَةِ" کے ساتھ ذکر کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو سب سے بڑھ کر محبوب اپنا مال ہے اور وہ اس کی روح کا شقیق ہے (ایک چیز کے دو ٹکڑے کریں تو ایک ٹکڑا دوسرے کا شقیق ہے، اسی لیے بھائی کو شقیق کہتے ہیں)۔ جب ایسی پیاری چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا تو یہ اس کی بہت پکی دلیل ہوئی کہ اس کی نیت سچی اور خالص ہے اور وہ دین پر قائم اور ثابت ہے۔ دیکھو یہ مال ایسی محبوب شے ہے کہ مولفۃ القلوب لوگ جو مائل کیے گئے تو یہی ذرا سی دنیا دے کر، پھر اُن کی عصبیت غائب ہوگئی اور ان کی طبیعت نرم پڑ گئی۔ بنی حنیفہ جو رسول اللہ ﷺ کے بعد مرتد ہوگئے تو اسی زکات کے انکار کی وجہ سے، پھر ان سے لڑنے کے لیے جتھے تیار کیے گئے اور ان سے جہاد کیا گیا۔ اس میں مومنین کو زکات ادا کرنے پر آمادہ کیا گیا ہے اور ان کو زکات ادا نہ کرنے پر ڈرایا گیا ہے، اس لیے کہ زکات کو روکنا مشرکین کے اوصاف میں ٹھہرایا گیا ہے اور کفر "بِالْآخِرَةِ" کے ساتھ قرین کیا گیا۔

---

[1] تفسير القرطبي (٣٤٠/١٥) [2] فتح القدير (٦٦٣/٤) [3] تفسير القرطبي (٣٤٠/١٥)

بالجملہ جب اللہ پاک نے وہ شے ذکر کی جو مشرکوں اور جاہلوں کے لیے وعید اور ڈراوا تھی تو اب وہ شے بیان کی جو ان کے برعکس لوگوں کے لیے وعدہ اور خوش خبری ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴾ یعنی بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کے لیے اجرِ غیر ممنون ہے، یعنی ایسا اجر کہ ان سے کبھی منقطع نہ کیا جائے گا اور ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ کلامِ عرب میں "مَنَّ" بہ معنی قطع ہے۔ جب تم اسی کو قطع کر ڈالو تو یوں کہو گے کہ "مَنَنْتُ الْحَبْلَ" "میں نے رسی کاٹ ڈالی۔" امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَمْنُوْنٍ ﴾ بہ معنی منقوص ہے، یعنی ایسا اجر کہ کم نہ کیا جائے گا۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی معنی مروی ہیں۔[2] امام جوہری رحمہ اللہ نے بھی "مَنَّ" کے معنی قطع و نقص کے ذکر کیے ہیں۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "غَيْرَ مَحْسُوْبٍ"[4] یعنی ایسا اجر کہ حساب نہ کیا جائے گا۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اس کا ان پر احسان نہ رکھا جائے گا، کیوں کہ احسان تو اس عطا پر رکھا جاتا ہے جو بہ طور تفضّل دی جائے، یعنی فالتو دی جائے۔ اجر و مزدوری تو حق ہے جس کا ادا کرنا ضروری ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس قول کو امام سدی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا تھا اور یہاں سدی رحمہ اللہ کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ یہ بیماروں، اپاہج لوگوں اور بوڑھوں کے حق میں نازل ہوئی ہے، جس وقت وہ طاعت سے ضعیف ہو جائیں تو اُن کے لیے وہ اجر لکھا جائے گا، جیسا کہ صحت کی حالت میں وہ عمل کرتے تھے اور اس کا اجر لکھا جاتا تھا۔[5]

(ایک لفظ یہ ہے: "كتب لهم من الأجر مثل ما كانوا يعملون في الصحة"۔ ایک یہ ہے: "كتب لهم من الأجر كأصح ما كانوا يعملون فيه"، یعنی ضعف کی حالت کے عمل کا اجر ویسا لکھا جائے گا، جیسا کہ کامل تندرستی کی حالت کے عمل کا لکھا جاتا تھا۔ والله أعلم)۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ مشرکوں کو ملامت کریں اور زجر و توبیخ کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[6]

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ
لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ۚ9 وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ
مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ
سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝10 ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ
لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَاۗىِٕعِيْنَ ۝11
فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ

[1] تفسير القرطبي (١٥/٣٤١) [2] تفسير الطبري (١٥/٤٣٢) [3] تفسير القرطبي (١٥/٣٤١)
[4] تفسير الطبري (٢٤/٣٢٧) [5] تفسير القرطبي (١٥/٣٤٢) [6] فتح البيان (١٢/٢٢٥_٢٢٧)

51

سَمَآءٍ اَمۡرَهَا ؕ وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ ۖ وَحِفۡظًا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ﴿۱۲﴾

آپ کہہ دیجیے: کیا تم واقعی اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا اور تم اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو؟ وہ تو جہانوں کا رب ہے⑨ اور اس نے اس (زمین) میں اس کے اوپر مضبوط پہاڑ بنائے اور اس میں برکتیں رکھیں اور اس میں (رہنے والوں کے لیے) اس کی غذاؤں کا (ٹھیک) اندازہ کیا، محتاجوں کے لیے یکساں طور پر (یہ سارا کام) چار دنوں میں (مکمل ہوا)⑩ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا، جبکہ وہ دھواں تھا، تب اللہ نے اس سے اور زمین سے کہا: تم دونوں خوشی یا ناخوشی سے آؤ، تو ان دونوں نے کہا: ہم دونوں خوشی خوشی حاضر ہیں⑪ پھر (اللہ نے) انھیں دو دنوں میں سات آسمان بنا دیا اور ہر آسمان میں اس کا کام الہام کر دیا، اور ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے زینت دی اور (اس کی خوب) حفاظت کی، یہ نہایت غالب، خوب جاننے والے کی تدبیر ہے⑫

تخلیقِ کائنات کی کچھ تفصیلات:

اس میں غذائیں تجویز کیں، یعنی اہلِ زمین کی خوراک، یعنی جواب پورا ہوا۔ دو دن میں زمین بنائی اور دو دن میں پہاڑ اور درخت وسبزہ جو مخلوق کی خوراک ہے۔ یہ آسمان سارا ایک تھا دھوئیں کی طرح، اس کو بانٹ کر سات کر دیے اور ہر ایک کا کارخانہ الگ ٹھہرایا۔ پھر آسمانوں اور زمین کو بلایا کہ خوشی سے آؤ یا زبردستی سے، یعنی ارادہ کیا کہ ان دونوں کے ملاپ سے دنیا بسائے۔ اپنی خوشی سے ملیں یا زور سے، دونوں اپنی خوشی سے آملے۔ آسمان کی شعاع سے گرمی پڑی تو بھاپ اٹھی، دن سے گرد اور بھاپ اوپر چڑھی اور پانی بن کر برسی۔ چار عنصر زمین پر جمع ہوں اور مخلوقات پیدا ہوں۔ پہلے زمین رکھی اور مختلف خوراکیں، یعنی اس میں ان چیزوں کے نکلنے کی قابلیت تھی۔ اور ہر آسمان کا حکم علاحدہ۔ یہ اللہ کو معلوم ہے کہ وہاں کون سی مخلوق بستی ہے اور ان کا اسلوب کیا ہے۔ اتنی زمین میں ہزارہا کارخانے ہیں تو آسمان کب خالی پڑے ہوں گے۔ انتھی[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشرکوں پر انکار ہے جنھوں نے اس کے ساتھ اس کے غیر کو پوجا، حالاں کہ وہ ہر شے کا خالق ہے، قاہر ہے اور ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔ چنانچہ فرمایا: کیا تم اس ذات کے منکر ہوتے ہو اور اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو جس نے دو دن میں زمین بنائی: ﴿ ذٰلِكَ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴾ یعنی یہ اشیاء کا پیدا کرنے والا ہی سارے جہانوں کا رب ہے۔ اس جگہ اس آیت کی تفصیل ہے: ﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھے روز میں پیدا کیا ہے۔''

چنانچہ یہاں اس شے کی تفصیل فرمائی ہے جو زمین کے ساتھ خاص ہے اور اس شے کی جو آسمان کے ساتھ خاص ہے۔ جو جو شے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مخصوص ہے، اس کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ لہٰذا ذکر فرمایا کہ پہلے تو زمین بنائی، اس لیے کہ وہ اساس و بنیاد کی طرح ہے اور بات دراصل یہ ہے کہ اساس سے ہی ابتداء کی جاتی ہے، پھر اس کے بعد چھت بنائی جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ [البقرة: ٢٩] ''وہ اللہ جس نے تمھارے لیے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا، پھر آسمان کی طرف قصد کیا اور ان کو ٹھیک ٹھیک سات آسمان بنایا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔''

اب رہی یہ آیت: ﴿ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا ﴿27﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿28﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿29﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿30﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿31﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿32﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴾ [النازعات: ٢٧۔ ٣٣] ''کیا تمھارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا۔ اس کی بلندی اونچی کی پھر اسے ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو نکالا اور اس کے بعد زمین کو (ہموار) بچھا دیا۔ اس میں سے پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو (مضبوط) گاڑ دیا۔ یہ سب تمھارے اور تمھارے جانوروں کے فائدے کے لیے (ہیں)۔'' اس آیت میں یہ ہے کہ زمین کا پھیلانا آسمان کے پیدا کرنے کے بعد تھا۔ سو "دَحٰي" کی تفسیر اس قول سے کی گئی ہے کہ ﴿ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴾ اور یہ سب آسمان کے پیدا کرنے کے بعد ہوا ہے۔ رہی زمین کی پیدائش تو وہ آسمان کی پیدائش سے پہلے ہے۔

یہ بات نص سے معلوم ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی جواب دیا ہے جس طرح کہ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ میں قرآن میں کئی چیزیں پاتا ہوں جو مجھے باہم مختلف لگتی ہیں۔ کہا: ﴿ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ١٠١] ''اس دن نہ تو آپس کے رشتے ہی رہیں گے، نہ آپس کی پوچھ پچھ۔'' ﴿ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴾ [الصافات: ٢٧] ''وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال و جواب کرنے لگیں گے۔'' یعنی پہلی آیت میں سوال کی نفی ہے اور دوسری میں اثبات ہے۔ اسی طرح: ﴿ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴾ [النساء: ٤٢] ''اور اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔'' اور ﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣] ''اللہ، اپنے پروردگار کی قسم! ہم مشرک نہ تھے۔'' پہلی آیت میں کتمان (چھپانے) کی نفی ہے اور اس آیت میں کتمان کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا ﴾ [النازعات: ٢٧] اس میں آسمان کی پیدائش کو زمین کی پیدائش سے پہلے ذکر کیا ہے۔

پھر آیت زیرِ باب میں یوں فرمایا ہے: ﴿ قُلْ اَىِٕنَّكُمْ ... الآية ﴾ اس میں زمین کی پیدائش کو آسمان کی پیدائش سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ کہا: ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾، ﴿ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾، ﴿ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾ "فَكَأَنَّهُ قَدْ كَانَ ثُمَّ مَضَى" یعنی ان اوصاف میں ماضی کا صیغہ مذکور ہے تو گویا تھا، پھر گزر گیا، اب نہیں ہے، (یعنی زمانۂ ماضی میں اس میں یہ صفتیں تھیں، پھر وہ اس میں نہ رہیں۔) چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ۱۰۱] نفخہ اولیٰ میں ہے۔ ﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ﴾ [الزمر: ٦٨] ''اور صور پھونک دیا جائے گا پس آسمانوں اور زمین والے سب بے ہوش ہوکر گر پڑیں گے مگر جسے اللہ چاہے۔''

چنانچہ اس وقت ان کے درمیان انساب نہ ہوں گے اور نہ باہم سوال کریں گے۔ پھر آخر نفخے میں بعض بعض پر متوجہ ہوں گے، باہم سوال کریں گے۔ اور رہا یہ قول: ﴿ مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣] اور ﴿ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴾ [النساء: ٤٢] تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ اخلاص کے گناہ بخش دے گا تو مشرکین کہیں گے کہ آؤ ہم بھی کہیں کہ ہم مشرک نہ تھے، چنانچہ ان کے منہ پر مہر کر دی جائے گی تو ان کے ہاتھ بولیں گے، لہٰذا اس وقت یہ بات پہچانی جائے گی کہ اللہ سے کوئی بات چھپائی نہیں جا سکتی اور اس وقت: ﴿ يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴾ [النساء: ٤٢] ''کافر اور رسول کے نافرمان آرزو کریں گے کہ کاش! انھیں زمین کے ساتھ ہموار کر دیا جاتا اور اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔''

اور پیدا کیا زمین کو دو دن میں، پھر پیدا کیا آسمان کو، پھر آسمان کی طرف چڑھا اور ان کو ٹھیک کیا اور دو دن میں پھر زمین کو بچھایا اور اس کا بچھانا یہ ہے کہ اس سے پانی اور چارا نکالا اور پہاڑوں کو اور ریت اور جمادات کو اور ٹیلوں کو پیدا کیا اور اس شے کو پیدا کیا جو ان کے درمیان میں ہے مزید دو دن میں، چنانچہ یہ معنی ہیں اللہ کے قول ﴿ دَحٰىهَا ﴾ کے۔

اب اللہ تعالیٰ کے قول کہ ﴿ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ ﴾ یعنی زمین اور جو شے اس میں ہے چار دن میں پیدا کی گئی اور آسمان دو دن میں پیدا کیے گئے، کا یہ مطلب واضح ہو گیا کہ نفسِ زمین کی پیدائش آسمان کی پیدائش سے پہلے ہے اور اس کا "دحو" آسمان کی پیدائش کے بعد ہے۔ ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾۔ "سمّٰى نَفْسَهُ بِذٰلِكَ وَذٰلِكَ قَوْلُهُ أَيْ: لَمْ يَزَلْ كَذٰلِكَ فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَمْ يُرِدْ شَيْئًا إِلَّا أَصَابَ بِهِ الَّذِيْ أَرَادَ"۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے غفور و رحیم ہونے کے ساتھ اپنا نام رکھا اور یہ نام رکھنا گزر گیا، کیوں کہ تعلق منقطع ہوا اور یہ جو غفوریت اور رحیمیت کا کہا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی رہتا ہے منقطع نہیں ہوتا، کیوں کہ جس وقت اللہ پاک نے مغفرت یا رحمت کا یا ان کے سوا اور کسی شے کا ارادہ کیا، حال میں یا مستقبل میں تو اس کی مراد کا قطعی وقوع ضروری ہے۔ "فَلَا

يَخْتَلِفَنَّ عَلَيْكَ الْقُرْآنُ فَإِنَّ كُلًّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ" یعنی اب میرے جواب دینے کے بعد ہرگز قرآن تجھ پر مختلف نہ ہو، اس لیے کہ یہ سب کا سب اللہ کے پاس سے ہے اور اگر یہ غیر اللہ کے پاس سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا۔

غرض کہ اس شخص نے چار سوال کیے تھے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان چاروں کا شافی جواب دیا۔ پہلے سوال کا حاصل یہ کہ تساءل (باہم سوال کرنا) دوسرے نفخے کے بعد ہے اور عدمِ تساءل (سوال نہ کرنا) اس سے پہلے ہے۔ دوسرے سوال کا حاصل یہ ہے کہ کتمان (چھپانا) نطقِ جوارح (اعضاء کے بولنے) سے پہلے ہے اور عدمِ کتمان اس کے بعد ہے۔ تیسرے سوال کا حاصل یہ ہے کہ نفسِ ارض کی پیدایش آسمانوں کی پیدایش سے پہلے ہے اور دحوِارض آسمان کی پیدایش کے بعد ہے۔ اور چوتھے سوال کا حاصل وہی ہے جو مذکور ہوا۔[1]

زمین کی پیدایش کے دو دن سے مراد روز یک شنبہ و دوشنبہ (اتوار اور پیر) ہے۔ زمین میں برکت رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کو مبارک کیا۔ خیر کے قابل بنایا اور بیج بونے اور درخت لگانے کے قابل بنایا۔ "أقوات" سے مراد وہ چیز ہے جس کی طرف زمین والے محتاج ہیں، یعنی اس میں ان کی روزیاں ٹھہرائیں اور وہ جگہیں بنائیں جن میں کھیتیاں کی جاتی ہیں اور درخت لگائے جاتے ہیں۔ یہ سب کام دو دن میں کیے، یعنی سہ شنبہ اور چہار شنبہ (منگل اور بدھ)۔ چنانچہ یہ دو دن پہلے دو دنوں کو ملا کر چار دن ہوئے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ﴾ یعنی پورے چار دن میں ان لوگوں کے لیے جو جاننے کے لیے اس کے پوچھنے کا ارادہ کریں۔

امام عکرمہ اور مجاہد رحمہ اللہ نے تقدیرِ اقوات کی تفسیر میں کہا ہے: "جَعَلَ فِي كُلِّ أَرْضٍ مَا لَا يَصْلُحُ فِي غَيْرِهَا وَمِنْهُ الْعَصَبُ فِي الْيَمَنِ وَالسَّابُورِيُّ فِي سَابُورَ وَالطَّيَالِسَةُ بِالرَّيِّ"[2] یعنی ہر زمین میں وہ شے رکھی جو اس کے غیر میں صلاحیت نہیں رکھتی ہے، جیسے یمن کی چادریں یمن میں اور سابوری چادریں سابور میں اور طیلسان ملکِ ری میں بنتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ملک میں کھانے پینے اور پہننے کی مخصوص اشیاء ہوتی ہیں، وہ وہیں ملتی ہیں، دوسری جگہ میسر نہیں آتیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ اور سدی رحمہ اللہ نے ﴿ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: "أَيْ: لِمَنْ أَرَادَ السُّؤَالَ عَنْ ذٰلِكَ". امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: اور مقدر کیے اس میں اقوات اس کے برابر سائلین کے لیے، یعنی اس شخص کی مراد کے مطابق جس کو کسی رزق کی حاجت ہے، یا کسی اور ضرورت کی چیز کی حاجت ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے وہی شے مقدر کی ہے جس کا وہ محتاج ہے۔ یہ قول اس کے مشابہ ہے جو اس آیت میں ذکر کیا ہے: ﴿ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ﴾ [إبراهيم: ٣٤] "اسی نے تمھیں تمھاری

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣٧)
[2] تفسير الطبري (٢١/٤٣٦)

منہ مانگی کل چیزوں میں سے دے رکھا ہے۔“[1] واللّٰہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ ﴾ دخان سے مراد پانی کے بخارات ہیں جو اس سے چڑھنے والے تھے۔ جب زمین پیدا کی گئی تو اس سے اور زمین سے کہا کہ خوشی سے آؤ یا زور سے، یعنی میرا حکم مانو اور میرے فعل کا اثر قبول کرو خوش ہو کر یا ناخوش ہو کر۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آسمانوں سے کہا کہ تم میرے سورج اور چاند اور ستاروں کو طلوع کرو اور زمین سے فرمایا کہ اپنی نہروں کو چیر اور اپنے میوے نکال تو دونوں بولے کہ ہم خوش ہو کر آئے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔[2]

﴿ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴾ کے ایک معنی یہ ہیں کہ ہم تیرا حکم مانتے ہیں مطیع ہو کر اس شے کے ساتھ جو ہم میں ہے اور اس قسم سے جس کے پیدا کرنے کا تو ارادہ کرتا ہے، یعنی ملائکہ، جن اور انسان سب کے سب تیرے مطیع ہو کر۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض اہلِ عربیت سے اس کو بیان کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: ”وَقِيْلَ تَنْزِيْلًا لَهُنَّ مُعَامَلَةَ مَنْ يَّعْقِلُ بِكَلَامِهِمَا“ مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین تو جماد ہیں، ان سے بات کرنا اور ان کا جواب دینا کیسا؟! چنانچہ کسی نے کہا کہ ان کو عقلاء کے قائم مقام ٹھہرایا، پھر ان کے کلام کے ساتھ عقلاء کا معاملہ کیا، یعنی جس طرح عقلاء سے بات کرتے ہیں اور وہ بات کا جواب دیتے ہیں، اسی طرح ان کے ساتھ برتاؤ کیا۔ کسی نے کہا کہ زمین میں سے جس خطے نے بات کی وہ وہ جگہ ہے جہاں کعبہ ہے اور آسمان میں سے وہ قطعہ ہے جو کعبہ کی جگہ کے مقابلے میں ہے۔ واللّٰہ سبحانہ أعلم۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر آسمان و زمین اللہ کے حکم کا انکار کرتے تو البتہ وہ ان کو ایسا عذاب کرتا کہ وہ اس کے درد کو پاتے۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ ﴾ یعنی پھر فارغ ہوا ان کے سات آسمان بنانے سے دو دن میں، یعنی روزِ پنج شنبہ (جمعرات) و جمعہ۔ ﴿ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ﴾ یعنی اور مرتب کیا درآنحالیکہ وہ مقرر کرنے والا تھا ہر آسمان میں اس چیز کو جس کی طرف اسے حاجت ہوتی ہے، یعنی فرشتے اور وہ چیزیں جو اس میں ہیں، جن کو اللہ پاک کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ ﴿ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ﴾ اور رونق دی ہم نے پہلے آسمان کو چراغوں سے، اس سے مراد وہ تارے ہیں جو زمین پر چمکتے دمکتے ہیں۔ ﴿ وَحِفْظًا ﴾ یعنی اور حراست اور نگہبانی کرنے والے ہیں کہ کہیں شیاطین ملائے اعلی کی طرف کان لگائیں۔ ﴿ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ یعنی یہ سب کارخانہ ایسی ذات نے چلا رکھا ہے جس نے ہر شے کو مقہور اور مغلوب کیا ہے، وہ ایسا دانا ہے جو اپنی مخلوقات کی ساری حرکات و سکنات کو خوب جانتا ہے۔

[1] تفسیر ابن کثیر (۱۱۸/۴) [2] تفسیر الطبري (۴۳۹/۲۱، ۴۴۰) [3] تفسیر ابن کثیر (۱۱۸/۴)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمان وزمین کی پیدائش کے بارے میں پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اتوار اور پیر کو زمین پیدا کی اور منگل کے دن پہاڑ بنائے اور جو کچھ ان میں منافع ہیں اور بدھ کے دن درخت، پانی، شہر، آبادی اور ویرانی بنائی، چنانچہ یہ چار دن ہوئے۔ ﴿ قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ﴾ یعنی اس کے لیے جو اس کا سوال کرے اور جمعرات کے دن آسمان بنایا اور جمعے کے دن تارے، سورج، چاند اور فرشتے پیدا کیے۔ جمعے کی تین ساعت باقی رہ گئیں۔ دوسری ساعت میں ان تمام چیزوں میں آفت ڈالی جن سے لوگ نفع لیتے ہیں اور تیسری ساعت میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور ان کو جنت میں بسایا اور ابلیس کو انھیں سجدہ کرنے کا حکم دیا اور آخری ساعت میں ان کو اس سے نکالا۔ (امام ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:
"قال ابن جرير: حدثنا هناد بن السري، حدثنا أبوبكر بن عياش عن أبي سعيد البقال عن عكرمة عن ابن عباس رضي الله عنهما قال هناد: قرأت سائر الحديث أن اليهود أتت ... الخ")۔

پھر یہود بولے: "ثُمَّ مَا ذَا يَا مُحَمَّدُ" یعنی اے محمد! اس کے بعد کیا ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ». کہا: واقعی آپ نے ٹھیک کہا، اگر تو پورا کرتا کہ "ثُمَّ اسْتَرَاحَ"، یعنی پھر راحت لی۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت سخت خفا ہوئے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖۗ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ [ق: ۳۸۔ ۳۹] "یقیناً ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب کو (صرف) چھے دن میں پیدا کر دیا اور ہمیں تکان نے چھوا تک نہیں۔ پس یہ جو کچھ کہتے ہیں آپ اس پر صبر کریں۔"[1] (هذا الحديث فيه غرابة)

رہی حدیث جو امام ابن جریج رحمہ اللہ نے بسندہ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا، پھر فرمایا کہ اللہ نے مٹی کو ہفتے کے دن پیدا کیا اور اس میں پہاڑ اتوار کو پیدا کیے اور سوموار کو درخت پیدا کیے اور مکروہ پیدا کیا منگل کے دن اور نور پیدا کیا بدھ کے دن اور اس میں جانور جمعرات کے دن پھیلائے اور آدم علیہ السلام کو جمعے کے دن بعد عصر کے پیدا کیا تمام مخلوق کے بعد اور جمعہ کی آخری گھڑیوں میں، یعنی عصر اور رات کے درمیان کی گھڑیوں میں۔[2] (فرواه مسلم والنسائي في كتابيهما من حديث ابن جريج به وهو من غرائب الصحيح وقد علله البخاري في التاريخ فقال: رواه بعضهم عن أبي هريرة رضي الله عنه عن كعب الأحبار وهو الأصح)

---

[1] تفسير الطبري (۲۱/ ۴۳۱، ۴۳۳) اس کی سند میں "ابو سعید البقال" ضعیف راوی ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۷۸۹) سنن النسائي الكبرىٰ (۶/ ۲۹۳) التاريخ الكبير (۱/ ۴۱۳)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ جمہور نے ﴿ اَئِنَّكُمْ ﴾ کو دو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے کو بین بین اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کے بعد یائے خفیفہ۔ یہ ان کے کفر کو برا بھلا کہنے کے لیے ہے۔ حرف "اِنَّ" و "لَام" یا تو تاکیدِ انکار کے لیے ہے اور ہمزے کو اس لیے پہلے رکھا ہے کہ وہ صدارت کا مقتضی ہے، یا یہ بات بتانے کے لیے کہ ان کا کفر ایسا بعید ہے کہ عقل مند لوگ اس کے وقوع کا انکار کرتے ہیں تو اب وہ تاکید کا محتاج ہے۔ چونکہ اللہ پاک نے آخرت کے انکار پر کفار کی کم عقلی اور حماقت کا ذکر کیا تو اب وہ دلائل بیان کرنے شروع کیے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخرت پر قادر ہے اور ہر شے پر قادر ہے جس کا ارادہ کرتا ہے، جیسے: جہاں کا پیدا کرنا اور جو اشیاء اس میں ہیں ان کا بنانا جس میں وہ اور ان کے معبود، جو جمادات وغیرہ سے ہیں شامل ہیں اور یہ سب کچھ پیدا کرنا یہ بتا رہا ہے کہ وہ وحدہ لاشریک لۂ ہے، اس لیے وہ ان پر انکار کرتا ہے اور وصف کے ساتھ تقریر و تاکید کر کے فرماتا ہے، کیوں کہ وہ اصل مخلوق کو جانتے تھے۔

کیوں جی تم اس ذات پاک کا انکار کرتے ہو جس کی یہ شان ہے اور یہ ظاہر و باہر قدرت ہے کہ اس نے اس لمبائی چوڑائی اور بوجھ کے باوجود زمین کو دو دن میں بنایا اور یہ مدت بھی اس لیے ذکر کی کہ مخلوق کو تحمل اور آہستگی کی تعلیم دینا منظور ہے۔ اگر وہ زمین و آسمان کو ایک لحہ میں بنانا چاہتا تو بنا سکتا تھا۔ بھلا جس کی یہ عظیم الشان قدرت ہے اس کا انکار کیوں کرتے ہو؟ کیا وہ پھر دوبارہ نہیں بنا سکتا؟ کیوں نہیں، وہ تو ہر شے کر سکتا ہے۔ کہا ہے کہ ﴿ يَوْمَيْنِ ﴾ سے مراد یک شنبہ و دو شنبہ (اتوار و سوموار) ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يَوْمَيْنِ ﴾ سے مراد "نَوْبَتَيْنِ" ہے، یعنی زمین کو دو نوبت میں پیدا کیا۔ ہر نوبت اس مدت سے تیز تھی جو ایک دن میں ہوتی ہے۔ کسی نے کہا کہ مراد ﴿ يَوْمَيْنِ ﴾ کی مقدار ہے، اس لیے کہ حقیقی یوم تو زمین و آسمان کے وجود میں آجانے کے بعد شروع ہوتا ہے۔

جملۂ ﴿ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ﴾ معطوف ہے ﴿ تَكْفُرُوْنَ ﴾ پر اور استفہام کے تحت میں داخل ہے، یعنی اور کیا اس کے لیے انداد اور شرکاء ٹھہراتے ہو؟ اللہ پاک نے کفار کی طرف سے دو منکر شے ذکر فرمائیں: ایک تو اللہ کا انکار کرنا، دوسری اس کے لیے شرکاء ثابت کرنا۔ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتداء ہے، ﴿ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ خبر ہے، یعنی یہ ذات پاک جس میں مذکورہ صفتیں موجود ہیں، سارے جہاں کا مالک ہے اور عالمین میں سے وہ ہیں جو تمھارے معبود ہیں جن کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو، پھر تم کس طرح اس کی بعض مخلوق کو اس کی عبادت میں شریک ٹھہراتے ہو۔ "عالمین"، "عالم" کی جمع ہے، عالم اس کے سوا کو کہتے ہیں۔ چونکہ عالم کی قسمیں مختلف ہیں، اس لیے عقلاء کو غیر عقلاء کے مطابق ٹھہرا کر یاء اور نون کے ساتھ اس کی جمع بنائی۔

جملہ ﴿ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا ﴾ معطوف ہے ﴿ خَلَقَ ﴾ پر، یعنی اور کیا تم اس ذات پاک کے منکر ہوتے ہو جس نے زمین میں پہاڑ رکھے جو اس کے اوپر سے جمنے والے ہیں۔ کسی نے کہا: یہ جملہ مستانفہ ہے، الگ جملہ ہے ﴿ خَلَقَ ﴾ پر معطوف نہیں ہے، اس لیے کہ دونوں کے درمیان اجنبی کی فصل واقع ہوگئی ہے۔ وہ اجنبی ﴿ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ۚ ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴾ ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ جملہ فاصل ماقبل کا مقرر و موکد ہے تو بہ منزلہ تاکید ہوگیا اجنبی نہ رہا۔ ﴿ مِن فَوْقِهَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ پہاڑ زمین پر بلند ہونے والے ہیں، اس لیے کہ وہ زمین کے اجزاء میں سے ہیں اور وہ جو زمین سے مختلف ہیں تو صرف اپنے ارتفاع کی وجہ سے تو اس حیثیت سے یہ اس کے لیے غیر کی مثل ہوئے۔

رہی یہ بات کہ ان کا زمین کے اوپر جمانا اختیار کیا تو یہ اس لیے کہ پہاڑوں کے فوائد ظاہر ہو جائیں، ان لوگوں کے لیے جو فوائد اور منافع کے طلب گار ہیں اور اس لیے کہ یہ دیکھا جائے کہ زمین اور پہاڑ بوجھ پر بوجھ ہیں اور سب کے سب کسی ایسی ہستی کے محتاج ہیں جو تھامنے والی ہو اور وہ اللہ تعالیٰ قادر و مختارِ کل ہے۔ ﴿ وَبَارَكَ فِيهَا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ زمین کو بابرکت اور خیرِ کثیر والی بنایا، ان منافع کے سبب سے جو بندوں کے لیے اس میں پیدا کیے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: اس میں اس کے درخت اُگائے۔[1] ﴿ وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا ﴾ امام حسن، عکرمہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اس کے رہنے والوں کی روزیاں مقدر کیں اور وہ تجارت کی اشیاء اور درخت اور منافع رکھے جو ان کی زندگی بسر کرنے کے لائق ہیں۔

ہر شہر میں وہ شے رکھی جو دوسرے شہر میں نہیں رکھی، تاکہ ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف سفر اور تجارت کر کے بعض لوگ بعض سے اپنی روزی حاصل کریں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ زمین کے کسی حصے والوں کے لیے تو گیہوں مقدر کیا اور کسی کے لیے کھجور، اسی طرح باقی کھانے کی چیزوں کا حال ہے۔ کسی نے کہا کہ کھیتی سب پیشوں سے بڑھ کر برکت والا پیشہ ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے اقوات کو زمین میں رکھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نہریں، ندیاں پھاڑ نکالے، درخت اگائے، پہاڑ رکھے، دریا بہائے اور زمین کے اس حصے میں وہ شے رکھی جو اس حصے میں نہیں ہے اور اس میں وہ چیز رکھی جو اس میں نہیں ہے۔[3] امام قتادہ اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اس کی نہریں پیدا کیں اور اس کے درخت اور جانور پیدا کیے۔[4]

﴿ فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اگلے دو دن ملا کر پورے چار دن ہوگئے۔ یہ قول امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے،[5] یعنی یک شنبہ، دوشنبہ، سہ شنبہ اور چہار شنبہ (اتوار، سوموار، منگل اور بدھ)۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ کہتے

[1] تفسير الطبري (٤٣٤/٢١) [2] تفسير القرطبي (٣٤٢/١٥، ٣٤٣) [3] فتح القدير (٦٦٨/٤)
[4] تفسير القرطبي (٣٤٢/١٥) [5] معاني القرآن (٣٨٠/٤-٣٨١)

ہیں کہ اس کی مثال قائل کا یہ قول ہے کہ میں بصرے سے بغداد کی طرف نکلا دس دن میں اور کوفہ کی طرف پندرہ روز میں، یعنی تتمہ پندرہ روز میں۔[1] تو اب یہ معنی ہوں گے کہ زمین کا پیدا کرنا اور اس کے مابعد کا پیدا کرنا، یہ سب بغیر کسی کمی اور زیادتی کے پورے چار دن میں مکمل ہوا۔ اور اگر تتمہ کی تقدیر نہ ہو تو آٹھ دن بنیں گے: دو دن تو اول میں، یعنی زمین کی پیدایش دو دن میں اور دو دن اخیر میں، یعنی ﴿ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ ﴾ اور چار دن درمیان میں۔

ابو شیخ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ایک دن، پھر اس کا نام رکھا "أَحَد" یعنی یک شنبہ (اتوار)، پھر دوسرا دن پیدا کیا اس کا نام رکھا "اِثْنَيْن" یعنی دو شنبہ (سوموار)، پھر تیسرا دن پیدا کیا تو اس کا نام "ثُلَاثَاء" رکھا، یعنی سہ شنبہ (منگل)۔ پھر چوتھا دن پیدا کیا تو اس کا نام "أَرْبِعَاء" رکھا، یعنی چہار شنبہ (بدھ)۔ پھر پانچواں دن پیدا کیا تو اس کا نام "خَمِيْس" رکھا،[2] یعنی پنج شنبہ (جمعرات) اور پہلے جو گزرا اس کے مطابق ذکر کیا، (یعنی وہ حدیث جو پہلے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے گزر چکی ہے جس میں یہود کے آنے کا ذکر ہے)[3] نیز ابو الشیخ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ اللہ اپنی مخلوق سے چھٹے دن میں فارغ ہوا۔[4] (وذكر نحو ما تقدم)

غرض کہ تتمہ کی تقدیر اس لیے کی گئی ہے کہ آیات و احادیث میں موافقت ہو جائے جن میں یہ آیا ہے کہ یہ سارا کارخانہ چھے دن میں بنایا گیا ہے اور اگر یہ تقدیر نہ ہو تو آٹھ دن بن جاتے ہیں۔ یہ تقدیر محاورۂ عرب کے مطابق ہے۔ پھر اگر کوئی کہے کہ جس طرح زمین کی خلق میں ﴿ فِيْ يَوْمَيْنِ ﴾ کہا ہے، اسی طرح یہاں بھی ﴿ فِيْ يَوْمَيْنِ ﴾ کہہ دیا جاتا تو یہ مراد میں زیادہ صریح ہوتا، یہاں کیوں نہ کہا؟ تو کہیں گے کہ ﴿ فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً ﴾ کہنے میں زیادہ فائدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر "خَلَقَ هٰذِهِ الثَّلَاثَةَ فِيْ يَوْمَيْنِ" کہتے تو یہ کلام یہ بات ظاہر نہ کرتا کہ دو دن ان کاموں میں صرف ہوئے۔

برخلاف اس کے جب زمین کی پیدایش کا اور ان اشیاء کی پیدایش کا ذکر کیا تو کہا: ﴿ فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً ﴾ تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ چار دن ان کاموں میں بغیر کمی بیشی کے مستغرق و مغمور ہو گئے۔ پھر اگر کوئی کہے کہ زمین کی پیدایش اور ان چیزوں کی پیدایش کی مدت جو اس میں ہیں آسمانوں کی پیدایش کی مدت سے دوگنی کیوں کی گئی، اس کے باوجود کہ آسمان زمین سے بڑا ہے اور اس کی مخلوق اور عجائبات زیادہ ہیں تو کہیں گے کہ شاید یہ زیادتی بنا بر عرف کے ہے کہ چھت کی تعمیر گھر کی تعمیر سے ہلکی اور آسان ہوتی ہے۔ (كما ذكره أبو البقاء) کسی نے کہا: اس لیے کہ اس بات سے آگاہ کرنا منظور ہے کہ مقصود بالذات زمین ہی ہے، کیوں کہ انسان اور جن اور دوسرے تمام منافع اسی میں ہیں۔ کسی نے کہا: اس لیے کہ اس میں معاصی و مجاہدات و مجادلات و معالجات کی آزمایشیں ہیں۔ یہ عالم کا کارخانہ جو چھے دن

[1] تفسير القرطبي (١٥/٣٤٣) [2] العظمة (٤/١٣٦٥)
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [4] العظمة (٤/١٣٧٤)

میں بنایا، باوجود اس کے کہ وہ اس کو ایک دم میں بنا سکتا تھا تو اس میں بندوں کو تعلیم فرمائی ہے کہ کاموں میں تأنی (دیر کرنا) اور وقار اور سکون کا برتاؤ کریں اور جلد بازی سے دور رہیں۔

﴿ سَوَآءً ﴾ کو جمہور نے بہ نصب پڑھا ہے، اس بنا پر کہ فعل محذوف کا مصدر موکد ہے جو ﴿ اَیَّامٍ ﴾ کی صفت ہے، "أَيْ: اِسْتَوَتْ أَرْبَعَةُ أَيَّامٍ". ﴿ سَوَآءً ﴾ بہ معنی استواء، یعنی چار دن میں، ایسے دن کہ بالکل برابر تھے۔ یا بنا برحال "أرض" سے، یا ان ضمیروں سے جو اس کی طرف پھرتی ہیں، یعنی پیدا کیا زمین کو درآں حالیکہ وہ برابر ہونے والی تھی۔ زید بن علی اور حسن وغیرہما، (یعنی ابن ابی اسحاق، یعقوب اور عمرو بن عبید) نے زیر سے پڑھا ہے، اس بنیاد پر کہ ﴿ اَیَّامٍ ﴾ کی صفت ہے۔ "أَيْ: فِيْ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ مُسْتَوِيَةٍ".

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "فِيْ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ مُسْتَوِيَةٍ تَامَّةٍ" یعنی "لَا تَزِيْدُ وَلَا تَنْقُصُ"۔ اور امام ابوجعفر رحمہ اللہ نے بہ رفع پڑھا ہے اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔[1] "أَيْ: هِيَ سَوَاءٌ" یعنی "مُسْتَوِيَةٌ لِلسَّائِلِيْنَ" متعلق ہے ﴿ سَوَآءً ﴾ سے۔ "أَيْ: مُسْتَوِيَاتٌ لِلسَّائِلِيْنَ" یعنی ایسے چار دن میں کہ پورے ہونے والے ہیں پوچھنے والوں کے لیے، یا محذوف سے متعلق ہے۔ گویا یوں کہا گیا: "هٰذَا الْحَصْرُ لِلسَّائِلِيْنَ فِيْ كَمْ يَوْمٍ خُلِقَتِ الْأَرْضُ وَمَا فِيْهَا؟" یعنی یہ حصر سائلوں کے لیے ہے، اس میں کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کتنے دن میں پیدا کی گئی؟ یا ﴿ قَدَّرَ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی اس میں اس کی روزیاں مقرر کی گئیں "لِأَجْلِ الطَّالِبِيْنَ الْمُحْتَاجِيْنَ إِلَيْهَا" یعنی ان طلب کرنے والوں کے لیے جو روزی کے محتاج ہیں۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ معنی یہ ہیں: "وَقَدَّرَ فِيْهَا أَقْوَاتَهَا سَوَآءً لِّلْمُحْتَاجِيْنَ فِيْ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ" امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے،[2] یعنی مقدر کیے اس میں قوت (روزیاں) حاجت مندوں کے لیے چار دن ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت کے برابر زمین میں خوراکیں رکھیں۔ جس زمین والے جس شے کے حاجت مند تھے، وہی شے وہاں پیدا کی۔

پھر جب اللہ پاک نے زمین اور جو کچھ اس میں ہے اس کا ذکر کیا تو آسمانوں کے پیدا کرنے کی کیفیت بیان کی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ ﴾ "أَيْ: عَمِدَ وَقَصَدَ نَحْوَهَا قَصْدًا سَوِيًّا وَتَعَلَّقَتْ إِرَادَتُهٗ بِخَلْقِهَا" یعنی پھر آسمان کی طرف قصد کیا برابر سیدھا قصد اور اس کا ارادہ اس کے پیدا کرنے سے متعلق ہوا۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ معنی اس محاورے سے ماخوذ ہیں کہ جس وقت کوئی شخص کسی مکان کی طرف ایسا متوجہ ہو کہ اس کے ساتھ کسی اور کام کی طرف التفات نہ کرے تو اس وقت یوں کہتے ہیں: "اِسْتَوٰى عَلَى الْمَكَانِ كَذَا" یعنی اس نے فلاں مکان کی طرف برابر سیدھا قصد کیا اور یہ اس استواء سے ہے جو اعوجاج کی ضد ہے۔ اس کی نظیر

---

[1] فتح القدير (٤/٦٦٥) [2] فتح القدير (٤/٦٦٥)

عرب کا یہ قول ہے: "اِسْتَقَامَ إِلَيْهِ" اور اسی معنی سے اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ ﴾ یعنی سیدھے اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور دائیں بائیں مت دیکھو، غیر اللہ کی طرف مت جھکو، خالص اللہ کو پوجو۔ معنی یہ ہیں کہ پھر داعیِ حکمت نے زمین اور جو کچھ اس میں ہے اس کو پیدا کرنے کے بعد اس کو آسمان کے پیدا کرنے کی طرف بلایا، یعنی اس کی حکمت اس کے پیدا کرنے کی مقتضی ہوئی۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: معنی یہ ہیں: "صَعِدَ أَمْرُهُ إِلَى السَّمَاءِ" یعنی اس کا امر آسمان کی طرف چڑھا۔[2]

اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آسمان کا پیدا کرنا زمین کے پیدا کرنے کے بعد تھا، اسی کے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما قائل ہیں، چنانچہ پہلے گزر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴾ [النازعات: ٣٠] ''اور اس کے بعد زمین کو (ہموار) بچھا دیا۔'' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ زمین کی پیدائش آسمان کی پیدائش کے بعد ہے۔ جواب یہ ہے کہ خلق کا معنی صرف ایجاد اور تکوین ہی نہیں ہے، بلکہ تقدیر، یعنی اندازہ کرنا بھی اس میں شامل ہے، چنانچہ معنی یہ ہیں: "قَضَى أَنْ يُّحْدِثَ الْأَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ بَعْدَ إِحْدَاثِ السَّمَاءِ" اور اس بنا پر اشکال زائل ہو جاتا ہے۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے استشکال کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ "ثُمَّ" تراخی زمانی کے لیے نہیں ہے، بلکہ تراخی رتبے کے لیے ہے تو اب اصل سے اشکال دور ہو جائے گا اور اس لحاظ سے کہ "ثُمَّ" تراخی زمانی کے لیے ہو تو جمع اس طرح ممکن ہے کہ زمین کی پیدائش آسمان کی پیدائش پر متقدم ہے اور دحوِ ارض، یعنی زمین کا بچھانا زمین کی پیدائش کے علاوہ ایک اور کام ہے۔ چنانچہ زمین پیدائش کے طور پر تو متقدم ہے اور بچھائے جانے کے طور پر متاخر (بعد میں) ہے، یہ بات ظاہر ہے۔[3] انتہٰی۔ شاید ﴿ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴾ [النازعات: ٣٠] کی تفسیر کے وقت اس کی زیادہ وضاحت ہو جائے۔ ان شاء اللہ۔ سورۃ البقرہ میں یہ جمع گزر چکی ہے، لیکن جو کچھ کہ زمین میں ہے، اس کی پیدائش نہیں ہو گی مگر دحو کے بعد تو اب پھر اشکال باقی ہے، اس بنا پر اشکال سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا مگر اسی بات سے جو "ثُمَّ" میں مذکور ہوئی، یا یہ کہ کلمۂ ﴿ بَعْدَ ﴾ کا معنی "قبل" ہو یا "مع" ہو۔

﴿ دُخَانٌ ﴾ وہ شے ہے جو آگ کے شعلے سے بلند ہوتی ہے۔ زمین کا بخار جو خشک سالی کے وقت دکھائی دیتا ہے، اس کو بھی استعارے کے طور پر دخان کہتے ہیں۔ اس کی جمع قلت میں "أَدْخِنَة" ہے اور کثرت میں "دِخيان" ہے جس طرح کہ "غُرَابٌ" کی جمع "أَغْرِبَة" اور "غِربان" آتی ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ دخان پانی کا بخار تھا، اس کو دخان کہنا تشبیہ صوری کے باب سے ہے، کیوں کہ دیکھنے میں اس کی صورت دخان جیسی لگتی تھی۔ یہ اس طرح ہوا کہ زمین و آسمان کی پیدائش سے پہلے رحمان کا عرش پانی پر تھا، جیسا کہ فرمایا ہے: ﴿ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ ﴾ [هود: ٧] ''اور اس کا عرش پانی پر تھا۔''

---

[1] تفسير الرازي (٩٠/٢٧) [2] تفسير القرطبي (٣٤٣/١٥) [3] فتح القدير (٦٦٦/٤)

پھر اللہ پاک نے اس پانی میں اضطراب پیدا کیا تو وہ جھاگ لایا اور بلند ہوا، پھر اس سے دخان نکلا تو جھاگ تو پانی کے اوپر باقی رہا تو اس سے یبوست (خشکی) پیدا کی اور اس سے زمین بنائی۔ رہا دخان تو وہ اوپر چڑھا تو اس سے آسمان پیدا کیے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ ﴾ یعنی پھر آسمان کی طرف قصد کیا او وہ دیکھنے میں دھواں ہو رہا تھا۔ رہی یہ بات کہ ﴿ اِسْتَوٰٓى ﴾ کی نسبت خاص آسمان کی طرف کی باوجود اس کے کہ جو خطاب اس پر مرتب ہو رہا ہے اس میں آسمان اور زمین دونوں کا ذکر ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے: ﴿ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ﴾ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ زمین کی پیدایش کا اور جو کچھ اس میں ہے اس کی تقدیر کرنے کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اس لیے اس پر اکتفا کیا۔

﴿ اِئْتِيَا ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ "اِفْعَلَا مَا آمُرُكُمَا بِهِ وَجِيْئَا بِهِ" یعنی تم اس کام کو کرو جس کا میں تم کو حکم دیتا ہوں اور اس کو لاؤ جس طرح کہ محاورے میں بولتے ہیں: "اِئْتِ مَا هُوَ الْأَحْسَنُ أَيْ: اِفْعَلْهُ" یعنی جو شے سب سے اچھی ہے تو اس کو کر۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ آؤ تم دونوں اس شکل اور وصف پر جو اس بات کے لائق اور سزاوار ہے کہ تم اس پر آؤ۔ اے زمین! تو آ بچھی ہوئی اور اپنے رہنے والوں کے لیے جائے قرار اور فرش ہو کر اور اے آسمان! تو اُن کے لیے قبہ اور چھت ہو کر آ۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے فرمایا: "أَمَّا أَنْتِ يَا سَمَاءُ فَأَطْلِعِيْ شَمْسَكِ وَقَمَرَكِ وَنُجُوْمَكِ وَأَمَّا أَنْتِ يَا أَرْضُ فَشَقِّقِيْ أَنْهَارَكِ وَأَخْرِجِيْ ثِمَارَكِ وَنَبَاتَكِ"[1] یعنی اے آسمان! تو تو اپنے سورج اور چاند اور تارے طلوع کر اور اے زمین! تو پھاڑ کر اپنی نہریں نکال اور اپنے میوے اور روئیدگی نکال۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے[2] اور فی الجملہ اختلاف کے ساتھ پہلے گزر چکا ہے۔

جمہور نے "اِئْتِيَا" پڑھا ہے بہ صیغۂ امر، "إتیان" بہ معنی آمدن سے۔ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید بن جبیر اور مجاہد رحمہ اللہ نے "آتِيَا قَالَتَا: آتَيْنَا" بہ مد پڑھا ہے۔[3] یہ قراءت یا تو "مُؤَاتَاةٌ" بہ معنی "مُوَافَقَةٌ" سے ماخوذ ہے، یعنی چاہیے کہ تم دونوں ایک دوسرے کی موافقت کرو، اس شے کے لیے جو اس کے لائق ہے۔ امام رازی اور زمخشری رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔[4] یا "إِيْتَاء" بہ معنی "إِعْطَاء" سے ہے جس طرح کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے "أٰتِيَا" کی تفسیر "أَعْطِيَا" کی ہے اور "أٰتَيْنَا" کی تفسیر "أَعْطَيْنَا" کی ہے۔[5] چنانچہ اس کا وزن پہلی تفسیر کی بنا پر تو "فاعلا" بروزن "قاتلا" ہوگا اور دوسری تفسیر کی بنا پر "أَفْعِلَا" بروزن "أَكْرِمَا" ہوگا۔ (اول میں تو ایک مفعول حذف ہوگا۔ تقدیر یہ ہے: "لتوافق كل منكما الأخرى"، "آتينا" کی تقدیر یہ ہے: "وافقت كل منا الأخرى"

[1] فتح القدير (٦٦٥/٤) [2] تفسير الطبري (٤٣٩/٢١، ٤٤٠) [3] تفسير القرطبي (٣٤٤/١٥)

[4] تفسير الرازي (٩٢/٢٧) الكشاف (١٩٤/٤) [5] تفسير الطبري (٤٤٠/٢١)

اور دوسرے میں دو مفعول حذف ہوں گے۔ تقدیر یہ ہے: "أعطيا الطاعة من أنفسكما من أمركما قالتا أعطيناه الطاعة". كما ذكره السمين)

قولہ تعالیٰ: ﴿ طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ﴾ مصدر ہیں موضعِ حال میں "أَيْ: طَائِعَتَيْنِ أَوْ مُكْرَهَتَيْنِ"۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے "كُرْهًا" بالضم پڑھا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: "أَطِيْعَا طَاعَةً أَوْ تُكْرَهَانِ كَرْهًا"[1] یعنی پوری طرح مطیع ہو جاؤ یا تم زبردستی کیے جاؤ گے پوری طرح۔ بالجملہ یہ حکم جو آسمان و زمین کو کیا کہ ﴿ اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ﴾ تو اس کے معنی ہیں: تسخیر، حصول اور وقوع۔ "أَيْ: كَوِّنَا فَكَانَتَا" یعنی ہو جاؤ تو وہ ہو گئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [النحل: ٤٠] ''ہم جب کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو صرف ہمارا یہ کہہ دینا ہوتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔'' تو اب یہ کلام تمثیل کے باب سے ہوگا۔ گویا اللہ پاک نے اپنی قدرت کی تاثیر کی اور ان کے امتناع (نافرمانی) کے محال ہونے کی مثال دی ہے کہ اس کی قدرت نے وجوباً ان میں اثر کیا اور ان کے لیے طوع و کرہ ثابت کرنا نہیں ہے۔

﴿ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴾ اس کی تمثیل ہے کہ طاعت کا ظہور ان سے ہوا اور وہ پورے طور پر قدرتِ ربانی سے اثر پذیر ہوئے۔ صانع سبحانہ کے حال کی تشبیہ آمر مطاع کے حال سے دی ہے، اس کی قدرت کی تاثیر میں، ان میں اس کے ارادے کے موافق، اور آسمان و زمین کے حال کی تشبیہ دی ہے مامور مطیع سے اس بات میں کہ انھوں نے اپنے وجود و حدوث و حصول کو قبول کر لیا، کیوں کہ وہ اس کی قدرت اور اس کے ارادے کے مطابق ہے۔ چنانچہ یہ استعارہ تمثیلیہ ہوا۔ اور استعارہ تخییلیہ بھی ہو سکتا ہے اس کے بعد کہ آسمان و زمین کی ذات میں استعارۂ مکنیہ ہو جس طرح کہ بجائے "دَلَّتِ الْحَالُ" کے ''نَطَقَتِ الْحَالُ'' کہتے ہیں۔

حال کو دلالت و برہان میں انسانِ متکلم کی طرح ٹھہرائیں، پھر اس کے لیے نطق خیال کیا جائے جو اس کا لازمی حصہ ہے جس کے ساتھ تشبیہ دی گئی، یعنی انسان اور اس کی نسبت حال کی طرف کی جائے۔ غرضیکہ یہاں دو قول ہیں: ایک تو یہ کہ آسمان و زمین سے کہا کہ تم اپنے اپنے منافع اور فوائد نکالو۔ دوسرا یہ کہ امرِ تسخیر ہے، ان کا بیان پورے طور پر پہلے ہو چکا ہے۔ چنانچہ پہلے قول کی بنا پر تو یوں ہوگا کہ ان کے پیدا کرنے کے بعد ان کو حکم دیا، یہ قول جمہور کا ہے۔ اور دوسرے قول کی بنا پر یہ ہوگا کہ ان کو پیدا کرنے سے پہلے کہا کہ ہو جاؤ تو وہ ہو گئے۔ اور اللہ پاک کے قول میں دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ ایک قول تھا جس کے ساتھ اللہ پاک نے تکلم فرمایا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قول ﴿ اَتَيْنَا ﴾ اللہ پاک کی طرف سے ایک قدرت ان کے لیے ظاہر ہو گئی۔ چنانچہ قدرت کا ظہور مقصد حاصل کرنے کے لیے کلام کے قائم مقام ہو گیا، جیسا کہ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔

[1] فتح القدير (٤/٦٦٥)

اسی طرح آسمان و زمین کے قول میں دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ ان کا قول ان کی طرف سے اطاعت کا ظہور ہے، اس طرح سے کہ وہ مطیع اور فرماں بردار ہوگئے، چنانچہ یہ اطاعت کا ظہور ان کے قول کے قائم مقام ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر اہلِ علم نے کہا ہے: بلکہ اللہ سبحانہٗ نے ان میں کلام پیدا فرمایا تھا تو وہ بولے جیسا کہ اس نے ارادہ کیا۔ امام ابو نصر سکسکی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین میں سے تو کعبۂ مشرفہ کی جگہ نے بات کی اور آسمان میں اس کے بالمقابل والے قطعے نے کلام کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی حرم رکھی۔[1] (كذا ذكره القرطبي)

فتح البیان میں اسی قول کو زیادہ بہتر فرمایا ہے[2] اور یہی ٹھیک ہے۔ دیکھو اللہ پاک نے داود علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں کو نطق (بولنے کا ملکہ) دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ﴾ [سبا: ١٠] ''اے پہاڑو! اس کے ساتھ رغبت سے تسبیح پڑھا کرو اور پرندوں کو بھی (یہی حکم ہے)۔'' اور ہاتھ پاؤں کو نطق عطا فرمایا، جیسا کہ اللہ نے فرمایا: ﴿ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [النور: ٢٤] ''جبکہ ان کے مقابلے میں ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ [حم السجدة: ٢١] ''یہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ جواب دیں گی کہ ہمیں اس اللہ نے قوتِ گویائی عطا فرمائی جس نے ہر چیز کو بولنے کی طاقت بخشی ہے۔''

اور جب اتنی جگہ نطق وارد ہوا ہے تو یہ بات کیسے بعید سمجھی جائے کہ اللہ پاک آسمان و زمین کی ذات میں حیات وعقل پیدا کر دے، پھر ان کو حکم دے اور اس کا مکلف ٹھہرائے۔ اس کی توجیہ کئی وجہ سے کی گئی ہے: پہلی یہ کہ اصل لفظ کو اپنے ظاہر پر محمول کرنا ہے، سوائے اس کے کہ کوئی امر اس سے مانع ہو، حالانکہ یہاں کوئی مانع نہیں ہے۔ دوسری یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کے لیے عقلاء کی جمع ذکر کی ہے اور ﴿ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴾ فرمایا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ﴾ [الأحزاب: ٧٢] ''ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا، لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے (مگر) انسان نے اسے اٹھالیا۔''

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشیاء اللہ پاک کو پہچانتی ہیں، اس کی تکلیف کے متوجہ ہونے کو جانتی ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اس کا یوں جواب دیا ہے کہ ﴿ اِئْتِيَا ﴾ سے مراد وجود و حدوث وحصول کی طرف آنا ہے، یعنی موجود ہو جاؤ، پیدا ہو جاؤ۔ اس تقدیر پر اس امر کے متوجہ ہونے کے وقت آسمان و زمین معدوم تھے تو وہ خطاب کو سمجھتے نہ ہوں گے، اس لیے ان کی طرف خطاب کا رخ کرنا جائز نہیں ہے۔[3] امام رازی رحمہ اللہ کا یہ جواب امرِ تسخیر کی بنا پر ہے

[1] تفسير القرطبي (١٥/٣٤٤) [2] فتح البيان (١٢/٢٣٢) [3] تفسير الرازي (٢٧/٩٤)

اور جمہور کا قول جو پہلے گزر چکا ہے، اس میں آسمان و زمین کی پیدائش کے بعد اُن سے خطاب ہے تو اس کی بنا پر کوئی محذور لازم نہ آئے گا۔ اگر کوئی کہے کہ زمین و آسمان یکے بعد دیگرے پیدا کیے گئے اور ﴿ اِئْتِيَا ﴾ کے امر میں دونوں کو جمع کر دیا ہے تو کہیں گے کہ امر کی خبر دینے سے امر کو جمع کیا ہے۔ یہ اس پر دال نہیں کہ زمانے میں امر کو جمع کیا ہو، بلکہ قول اُن کے لیے متعاقب ہو، یعنی پہلے ایک کو امر کیا پھر دوسرے کو۔

پھر اگر کوئی کہے کہ سماء و ارض تو دو اسم مفرد ہیں جو مؤنثاتِ سماعیہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا مدلول متعدد ہے، یعنی جمع میں ہے، یعنی ''سماوات و اَرضین'' ہیں، پس مناسب تھا کہ لفظ پر محمول کر کے ''طَائعتین'' کہا جاتا، یا معنی پر محمول کر کے ''طائعات'' کہا جاتا، پھر جمع مذکر عاقلین کے لفظ پر ﴿ طَآئِعِيْنَ ﴾ کیوں کہا؟ تو کہیں گے کہ چونکہ ان کا وصف عقلاء کے اوصاف کے ساتھ کیا گیا، یعنی مخاطب، مجیب، طائع اور مکرہ ہونا، اس لیے ان کے ساتھ عقلاء کا معاملہ کیا گیا اور ان کے متعدد ہونے کی وجہ سے مدلول کی جمع لائی گئی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴾ [يوسف: ٤] ''میں نے گیارہ ستاروں کو اور سورج چاند کو دیکھا کہ وہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ ﴾ آسمان کی تکوینِ مجمل کی تفسیر و تفصیل ہے جس کی تعبیر امر اور اس کے جواب کے ساتھ کی گئی تھی، نہ یہ کہ ان کی تکوین پر کوئی فعل مرتب ہے۔ معنی یہ ہیں: پس پیدا کیا ان کو پہلی دفعہ پیدا کرنا اختراع کے طور پر نہ کہ کسی مثال کے مطابق اور ان کے کام کا اتقان و احکام کیا حکمت کے تقاضے کے مطابق اور ان کو تمام کیا اور ان سے فارغ ہوا، اس لیے کہ کسی شے کے قضا کو اس کا اتمام کہتے ہیں یا مکمل ہونا اور اتمام یا تو بطور قول ہوتا ہے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣] ''اور تیرا پروردگار صاف صاف حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا۔'' اور یا بطور فعل ہوتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے اور بطور فعل مکمل کرنا یہی ہے کہ جو شے بنائی گئی، اس میں کوئی خلل یا کمی نہ ہو۔ یہی معنی اتقان کے ہیں۔

''هُنَّ'' کی ضمیر یا تو ﴿ سَمَآءِ ﴾ کی طرف راجع ہے بنا بر معنی، کیوں کہ ﴿ سَمَآءِ ﴾ گو لفظ مفرد ہے، لیکن جمع کے معنی میں ہے، اس کے مدلول کے متعدد ہونے کی وجہ سے، یا اس کی طرف راجع نہیں ہے نہ تو لفظ کے اعتبار سے نہ معنی کے اعتبار سے، بلکہ ایک مبہم ضمیر ہے۔

﴿ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ ﴾ اس کی تفسیر کرتا ہے۔ ﴿ سَبْعَ ﴾ کا نصب اول کی بنا پر یا تو اس لیے ہے کہ ﴿ فَقَضٰىهُنَّ ﴾ کا مفعولِ ثانی ہے، اس لیے کہ اس میں ''صَيَّرَهُنَّ'' کے معنی شامل ہیں، یعنی کر دیا ان کو سات آسمان، یا حال ہے اور ''قضی'' بہ معنی ''صنع'' ہے۔ ''أَيْ: قَضَاهُنَّ حَالَ كَوْنِهِنَّ مَعْدُوْدَاتٍ بِسَبْعٍ'' یعنی بنایا ان کو اس حال میں کہ وہ شمار کیے گئے سات آسمانوں کے ساتھ اور دوسری وجہ کی بنیاد پر یا تو اس لیے منصوب ہے کہ ضمیرِ مبہم کی تفسیر ہے،

یا اس سے بدل ہے، یا تمیز ہے۔ ﴿ فِيْ يَوْمَيْنِ ﴾ سے مراد پنج شنبہ (جمعرات) اور جمعہ ہے۔ اور فارغ ہوا ان سے جمعہ کی آخر ساعت میں اور اسی میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے اور اسی لیے اس جگہ لفظ "سواء" نہیں فرمایا تھا۔[1] (قاله المحلي)

اس پر امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: اس قول کا ظاہر یہ ہے کہ آدم علیہ السلام اسی روز پیدا کیے گئے جس میں کہ آسمان پیدا کیے گئے تو آدم علیہ السلام کی اور آسمانوں کی پیدایش میں کوئی فاصلہ نہیں ہے، حالانکہ یہ بات نص اور مشہور بات کے خلاف ہے کہ ان دونوں کی پیدایش کے درمیان ہزاروں برس کا فاصلہ تھا۔ (پہلے حدیثوں میں گزر چکا ہے کہ آدم علیہ السلام جمعہ کی آخری گھڑی میں پیدا کیے گئے، اسی کے موافق محلی رحمہ اللہ نے کہا۔[2] امام حفناوی رحمہ اللہ نے جو اس کے خلاف منصوص اور مشہور کہا اور قول منصوص الوف سنین کا فاصلہ ٹھہرایا۔ واللّٰه أعلم۔ یہ کہاں سے کہتے ہیں)۔

اس کا جواب اس طرح سے ممکن ہے کہ مراد یہ ہے کہ اسی دن میں پیدا کیے گئے، گو وہ دن اور سال کا تھا، جیسے تم یوں کہتے ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ (سوموار) کے دن پیدا ہوئے اور دوشنبہ (سوموار) کے دن وفات پائی۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو دنوں کی تعداد زمین وآسمان کے پیدا کرنے کی اس جگہ مذکور ہے وہ اس آیت کے موافق ہو گئی: ﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ﴾ [هود: ۷][3] یعنی جن آیتوں میں اس کی دلالت وتصریح ہے کہ چھے دن میں دونوں کی اور ان کے درمیان جو کچھ ہے اس کی پیدایش ہوئی۔ اگر غور سے دیکھو تو موافقت تتمہ کی قید سے ہوئی، جس کا ذکر ﴿ فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ﴾ میں ہو چکا ہے۔

امام کرخی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر کوئی کہے کہ یوم تو روز وشب کو کہتے ہیں اور وہ تو سورج کے طلوع وغروب ہونے کے عمل کے بعد ہی دن وقوع میں آیا اور آسمانوں اور زمین کی پیدایش سے اور سورج اور چاند کی پیدایش سے قبل دن کا وقوع کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ تو کہیں گے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اتنی مدت گزری کہ اگر وہاں فلک وشمس ہوتے تو وہ ﴿ يَوْمَيْنِ ﴾ کی مقدار کے ساتھ اندازہ کیا جاتا۔ یا یوں کہو کہ سارے عالم کو ایک مدت میں پیدا کیا کہ اگر اس میں فلک، شمس اور قمر کا تصور کیا جائے تو اس مدت کی ابتداء روزِ یک شنبہ (اتوار) کا شروع اور آخر یومِ جمعہ کے آخر تک ہوتا۔ اس کی نظیر پہلے بھی گزر چکی ہے۔ مشہور یہ ہے کہ یہ چھے دن دنیا کے دنوں کے برابر تھے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ایک یہ قول بیان کیا ہے کہ ان میں ہر دن دنیا کے دنوں کے حساب سے ہزار برس کا تھا تو چھے دن چھے ہزار برس جتنے ہوئے۔[4] انتہیٰ. امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "وَيَوْمٌ مِنَ السِّتَّةِ الْأَيَّامِ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ"[5]

قولہ: ﴿ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ﴾، ﴿ فَقَضٰىهُنَّ ﴾ پر معطوف ہے۔ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا: یعنی پیدا کیا اس میں اس کا سورج اور اس کا چاند اور اس کے ستارے اور اس کے افلاک اور وہ جو اس میں ہیں فرشتے

[1] تفسير الجلالين (٦٣١/١) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٩) تفسير الجلالين (٦٣١/١)
[3] تفسير الجلالين (٦٣١/١) [4] تفسير القرطبي (٨٥/١٤) [5] تفسير الطبري (٤٨٢/١٢)

اور دریا اور اَولے اور برف۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اس میں اس شے کی وحی کی جس کا ارادہ کیا اور اس شے کی جس کے ساتھ امر کیا۔ "إیحاء" کبھی بہ معنی امر ہوتا ہے، جس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ﴾ [الزلزال: ٥] ''اس لیے کہ تیرے رب نے اسے حکم دیا ہو گا۔'' اور اس آیت میں ﴿ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ ﴾ [المائدۃ: ١١١] ''اور جب کہ میں نے حواریین کو حکم دیا۔'' "أَيْ: أَمَرْتُهُمْ" اور یہ امرِ تکوین ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ کے لیے ہر آسمان میں گھر ہے جس کا کہ فرشتے کعبہ کے مقابلے میں حج اور طواف کرتے ہیں اور جو گھر سمائے دنیا میں ہے، وہ بیت المعمور ہے۔[1] بالجملہ یہاں تک تو غائب کی ضمیریں تھیں۔

پھر ﴿ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَحِفْظًا ﴾ میں غائب سے نونِ عظمت کی طرف التفات فرمایا، اس لیے کہ اس بات کا ظاہر کرنا منظور ہے کہ سمائے دنیا کی تزئین کے ساتھ مزید عنایت و اہتمام ہے، یعنی بندو! ذرا ہماری قدرت اور انعام کو تو دیکھو کہ ہم نے اس آسمان کو جو زمین سے متصل ہے، روشن ستاروں کے ساتھ زینت دی جو چراغوں کے چمکنے کی طرح اس پر چمکتے دمکتے ہیں۔ اگر آسمان کورا ہوتا تو رات کو کیسی ہولناک تاریکی ہوتی۔ ابر سے جب تارے چھپ جاتے ہیں تو کیسی تاریکی اور وحشت ہوتی ہے۔

﴿ وَحِفْظًا ﴾ کا نصب اس بنا پر ہے کہ فعل محذوف کا مصدر موکد ہے۔ "أَيْ: وَحَفِظْنَاهَا حِفْظًا" یعنی اور حفاظت کی ہم نے اس کی اچھی طرح سے، یا منصوب ہے بنا بر مفعول لہ۔ "أَيْ: وَخَلَقْنَا الْمَصَابِيْحَ زِيْنَةً وَّحِفْظًا" یعنی اور ہم نے چراغوں کو زینت اور نگہبانی کے لیے پیدا کیا۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے وجہِ ثانی کے بارے میں کہا ہے کہ یہ تکلف ہے اور سہل و ظاہر بات سے ہٹ جانا ہے۔[2] "حِفظ" سے مراد شیاطین سے اس کا محفوظ رکھنا ہے جو ملائے اعلیٰ کی باتیں سننے کے لیے چوری چھپے جاتے ہیں۔ شیخ محی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿ بِمَصَابِيْحَ ﴾ سے مراد سارے روشن ستارے، ثوابت اور سیارے ہیں جن کو اللہ پاک نے آسمانوں میں پیدا فرمایا ہے اور وہ سب کے سب صرف دنیا کے آسمان میں نہیں ہیں جو زمین والوں کے قریب ہے، کیوں کہ ہر سیارہ ساتوں آسمانوں میں سے ایک آسمان کے لیے خاص ہے اور ثوابت آٹھویں فلک میں مرکوز ہیں، مگر سمائے دنیا سے اوپر ان کا مرکوز ہونا اس کا مانع نہیں ہے کہ وہ دنیا کے آسمان کے لیے زینت ہوں، کیوں کہ ہم ان سب کو چراغوں کی طرح اس میں روشن دیکھتے ہیں۔

شیاطین سے آسمانوں کی حفاظت اس طرح ہے کہ وہ چوری سے باتیں سننے کے لیے آسمان کی طرف چڑھتے ہیں تو شعلوں سے مارے جاتے ہیں۔ یہ شعلے تاروں کی آگ سے ان سے منفصل (علاحدہ) ہو کر صادر ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ خود تاروں سے ان کو مارتے ہوں، کیوں کہ تارے تو فلک میں اپنے حال پر جمے ہوئے ہیں۔ یہ تو

[1] تفسیر القرطبي (١٥/٣٤٥) [2] البحر المحيط (٧/٤٦٨)

صرف مثل قبس کے ہے جو آگ سے لیا جاتا ہے اور آگ اپنے حال پر باقی رہتی ہے، اس سے کچھ کم نہیں ہوتا۔ ﴿ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ یعنی یہ عالم کا اس اتقان، احکام، حسنِ انجام اور خوبیِ نظام کے ساتھ پیدا کرنا، اس ذات پاک کا ہی کام ہے جو بلیغ القدرت اور کثیر العلم ہے، [1] سبحانه ما أعظم شأنه.

غرضیکہ جب اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو حکم کیا کہ مشرکوں کو اس قول کے ساتھ جواب دیں: ﴿ اِنَّمَاۤ اَنَاْ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ... الآیة ﴾، پھر ان پر اس قول سے حجت قائم کریں کہ ﴿ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ ... الآیة ﴾ یعنی جو معبود اس قدرتِ قاہرہ کے ساتھ موصوف ہے، اس کا انکار کرنا اور اس کے لیے شرکاء ٹھہرانا کس طرح جائز ہو سکتا ہے تو فرمایا کہ اگر وہ اس حجتِ قاہرہ کو ماننے سے انکار کریں اور جہالت اور آبائی تقلید پر جمے رہیں تو ان سے کہہ دو کہ اب تمھارا کوئی علاج باقی نہیں رہا، سوائے اس کے کہ تم پر وہ عذاب نازل کیا جائے جو تم سے اگلے لوگوں پر نازل ہو چکا ہے،

چنانچہ ارشاد فرمایا:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ
وَّثَمُوْدَ ﴿13﴾ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ
اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓىِٕكَةً
فَاِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿14﴾ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا
فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ
اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ
قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿15﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا
فِيْۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿16﴾ وَاَمَّا
ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ
صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿17﴾ وَنَجَّيْنَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿18﴾

پھر اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دیجیے: میں نے تمھیں ایسی چیخ (آسمانی عذاب) سے ڈرا دیا ہے جو عاد اور ثمود کی چیخ (عذاب) کے مانند ہوگی ⑬ جب رسول ان کے پاس ان کے سامنے سے

[1] فتح البیان (۱۲/۲۲۷۔۲۳۴)

اور ان کے پیچھے سے (یہ کہتے ہوئے) آئے کہ تم اللہ ہی کی عبادت کرو (تو) انھوں نے کہا: اگر ہمارا رب چاہتا تو ضرور فرشتے نازل کرتا، لہٰذا جو کچھ دے کر تمھیں بھیجا گیا ہے، ہم تو یقیناً اس کے منکر ہیں ⑭ پھر جو عاد تھے تو انھوں نے زمین میں ناحق تکبر کیا اور بولے: قوت میں ہم سے زیادہ سخت کون ہے؟ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ جس نے انھیں پیدا کیا وہ قوت میں ان سے زیادہ سخت ہے۔ اور وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے ⑮ چناں چہ ہم نے ان پر منحوس (ثابت ہونے والے) دنوں میں طوفانی ہوا بھیجی، تاکہ ہم انھیں دنیاوی زندگی ہی میں ذلت و رسوائی کے عذاب (کا مزہ) چکھائیں اور بلاشبہہ آخرت کا عذاب سب سے زیادہ رسوا کن ہے اور ان کی مدد نہیں کی جائے گی ⑯ اور جو ثمود تھے، تو ہم نے ان کی راہنمائی کی تو انھوں نے ہدایت پر اندھے پن کو پسند کیا، پھر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے انھیں رسوا کن عذاب کی چیخ نے آلیا ⑰ اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے اور وہ تقویٰ اختیار کرتے تھے ⑱

جھٹلانے والوں کی سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ:

آگے پیچھے سے پیغمبر آئے، یعنی ہر طرف سے۔ شاید رسول بہت آئے ہوں گے، مشہور یہی دو رسول ہیں: ھود اور صالح علیہما السلام۔ ان کے جسم بڑے بڑے ہوتے تھے۔ بدن کی قوت پر غرور آیا۔ اللہ کے سامنے غرور کا دم مارنا وبال لاتا ہے۔ ان کا غرور توڑنے کے لیے کمزور مخلوق سے ان کو تباہ کر دیا۔ کہتے ہیں: دلو کے مہینے میں آخر کے آٹھ دن تھے جن میں وہ آندھی آئی۔ ثمود کی قوم پر ایک تند آواز کے ساتھ زلزلہ آیا، اس آواز سے جگر پھٹ گئے۔ انتھٰی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! تو ان لوگوں سے کہہ دے جو شرک کرتے ہیں اور اس شے کو جھٹلاتے ہیں جو تو اُن کے پاس لایا ہے، یعنی حق کو کہ اگر تم نے اس شے سے منہ موڑا جس کو میں اللہ تعالیٰ کے پاس سے تمھارے پاس لایا ہوں تو میں تم کو ڈراتا ہوں کہ اللہ کا عذاب تم پر نازل ہو گا، جیسا کہ پہلے رسولوں کو جھٹلانے والوں پر نازل ہو چکا ہے۔ ﴿صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ یعنی میں تم کو اس عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا کہ عاد و ثمود پر سخت عذاب ہوا اور ان جیسے اَور لوگ جنھوں نے ان کا سا کام کیا، جب ان کے پاس اللہ کے رسول ان کے آگے سے اور پیچھے سے آئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ﴾ [الأحقاف: ٢١] ''اور عاد کے بھائی کو یاد کرو، جبکہ اس نے اپنی قوم کو احقاف میں ڈرایا اور یقیناً اس سے پہلے بھی ڈرانے والے گزر چکے ہیں اور اس کے بعد بھی۔''

آگے پیچھے سے مراد وہ بستیاں ہیں جو اُن کے شہروں کے قرب و جوار میں تھیں، اللہ پاک نے ان کی طرف

رسول بھیجے، وہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کا حکم کرتے تھے اور خوش خبری دیتے تھے اور ڈراتے تھے اور وہ عذاب اور سزائیں دیکھ لیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمنوں پر نازل کیں اور ان نعمتوں کو دیکھا جو اس نے اپنے دوستوں کو عطا فرمائیں اور اس کے باوجود ایمان نہ لائے اور نہ ہی رسولوں کی تصدیق کی، بلکہ تکذیب کی اور انکار کیا اور بولے کہ اگر ہمارا رب چاہتا تو البتہ فرشتے نازل کرتا، یعنی اگر اللہ رسول بھیجتا تو وہ اس کے پاس سے فرشتے ہوتے۔ چنانچہ اے آدمیو! ہم اس شے کے منکر ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو، یعنی ہم تمھاری پیروی نہ کریں گے اور تم ہم جیسے بشر ہو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: چنانچہ وہ عاد تھے تو انھوں نے زمین میں تکبر کیا، یعنی بغاوت اور سرکشی اور نافرمانی کی اور بولے کہ قوت میں ہم سے زیادہ سخت کون ہے، یعنی اپنی جسمانی ترکیب اور اعضاء کی شدت اور سختی کے ساتھ احسان رکھا اور یہ اعتقاد کیا کہ وہ اپنی قوت کے سبب سے اللہ کے عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ (اصل روایت میں اس جگہ لفظ "منوا" استعمال ہوا ہے، مگر اس کے معنی درست معلوم نہیں ہوتے۔ بظاہر "منوا" تصحیف "عتوا" کی ہے، یعنی اپنی شدتِ ترکیب وقویٰ کی جہت سے سرکشی کرنے لگے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم از مصحح سلمه الله تعالى)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴾ یعنی کیا پھر فکر نہیں کرتے ان لوگوں میں جو کھلم کھلا عداوت کرتے ہیں، پس وہ تو ایسا عظیم الشان قوت والا ہے، جس نے اشیاء کو پیدا کیا اور جو قوتیں ان کو اٹھائے پھرتی ہیں، ان کو ان میں جمع کیا اور اس کا دباؤ سخت ہے (اصل کے بھی الفاظ یہی ہیں: "أفما يتفكرون فيمن يبارزون بالعداوة" مگر یہاں بجائے "يبارزون" کے "يبارزونه" معلوم ہوتا ہے، یعنی کیا پھر غور نہیں کرتے اس ذات میں جس سے کھلم کھلا عداوت کرتے ہیں، کیوں کہ وہ... إلیٰ آخرہ)۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالسَّمَاۗءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴾ [الذاریات: ٤٧] ''آسمان کو ہم نے (اپنے) ہاتھوں سے بنایا ہے اور یقیناً ہم کشادگی کرنے والے ہیں۔''

چنانچہ انھوں نے ایسے دباؤ والے کی ظاہری طور پر عداوت کی اور اس کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی، اس لیے یوں فرمایا: ﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا ﴾ بعض نے کہا کہ ریحِ صرصر زور سے چلنے والی ہوا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سرد ہوا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ہوا ہے جس کی آواز ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ہوا میں یہ سب اوصاف تھے، کیوں کہ وہ سخت قوی زوردار ہوا تھی تاکہ ان کی سزا ان کے قویٰ کی جنس سے ہو جس کے ساتھ وہ مغرور ہوئے تھے اور وہ ہوا نہایت سرد اور زوردار آواز والی تھی، اسی معنی سے بلادِ مشرق کی مشہور نہر کا نام صرصر رکھا گیا ہے، کیوں کہ اس کے بہنے کی آواز بہت تیز ہے۔

﴿ فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ ﴾ "أَيْ: مُتَتَابِعَاتٍ" یعنی سات رات اور آٹھ دن پے در پے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴾ [القمر: ١٩] ''ایک پیہم منحوس دن میں بھیج دی۔'' یعنی ان پر عذاب اس دن میں

شروع ہوا جو ان پر نحس تھا اور یہ نحس ان پر پے در پے سات رات اور آٹھ دن رہا، یہاں تک کہ ان سب کو ہلاک کر دیا اور دنیا کی رسوائی ان کو آخرت کے عذاب کے ساتھ متصل ہوگئی۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى ﴾ یعنی آخرت کا عذاب ان کو زیادہ تر رسوا کرنے والا ہے۔ ﴿ وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴾ یعنی آخرت میں ان کی مدد نہ کی جائے گی جس طرح کہ دنیا میں مدد نہیں کی گئی اور ان کے لیے کوئی اللہ سے بچانے والا نہ ہوا کہ ان سے عذاب کو دور کر دیتا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ ... الآية ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو العالیہ، سعید بن جبیر، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا: "بَيَّنَّا لَهُمْ"۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا: "دَعَوْنَا"[1] یعنی جو ثمود تھے ان کو ہم نے ہدایت کی، یعنی ان کو شناسا اور بینا کیا۔ اور ہم نے ان کے لیے حق کو ان کے نبی صالح علیہ السلام کی زبان پر واضح اور ظاہر کیا تو انھوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کو جھٹلایا اور اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی کی سچائی پر ایک علامت اور نشانی ٹھہرایا تھا۔ پھر ان کو صاعقۂ عذابِ ھون نے پکڑا، یعنی اللہ پاک نے ان پر چنگھاڑ، لرزہ، ذلت، خواری، عذاب اور نکال (سزا) بھیجا، اس تکذیب و انکار کے سبب سے جو وہ کرتے تھے اور ان کے درمیان میں سے ہم نے ان کو بچا لیا جو ایمان لے آئے نہ ان کو کوئی برائی پہنچی نہ کچھ ضرر پہنچا، بلکہ اللہ پاک نے ان کو ان کے نبی صالح علیہ السلام کے ساتھ نجات دی، اس وجہ سے کہ وہ مومن تھے اور اللہ عزوجل کا تقویٰ رکھتے تھے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے ﴿ اَئِنَّكُمْ ﴾ میں کفار کو مخاطب کیا تھا اور ﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ ﴾ میں خطاب کے بجائے صیغۂ غائب استعمال کیا۔ اس کا نکتہ یہ ہے کہ انھوں نے منہ پھیرا تو اللہ پاک نے بھی ان کو مخاطب کرنے سے اعراض فرمایا، یہ ایک عجیب تناسبِ حسن ہے اور ﴿ اَنْذَرْتُكُمْ ﴾ میں صیغۂ ماضی اس لیے ہے کہ وہ انذار کے سچ ہونے پر دال ہو جو اس شے کے تحقق کی خبر دیتا ہے جس کے ساتھ ڈرایا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کا آنا ایسا یقینی ہے کہ گویا اس کا انذار ہو چکا اور وہ آ چکا۔ معنی یہ ہیں کہ پھر اگر وہ اس مخلوقات میں غور و فکر کرنے اور اس واضح بیان کے بعد ایمان لانے سے اعراض کریں تو تو ان سے کہہ دے کہ میں تم کو ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو عاد اور ثمود کے عذاب کے مثل ہے۔

﴿ صٰعِقَةً ﴾ سے مراد کسی بھی شے سے ایسا عذاب کرنا جو ہلاک کرنے والا ہو۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: "اَلصَّاعِقَةُ الْمَرَّةُ الْمُهْلِكَةُ لِاَيِّ شَيْءٍ كَانَ"[3] (یہ معنی ﴿ صٰعِقَةً ﴾ کی قراءت پر ٹھیک ہوں گے، کیوں کہ

---

[1] تفسير الطبري (٤٤٨/٢١) تفسير ابن كثير (١٢٠/٤) [2] تفسير ابن كثير (١١٩/٤، ١٢٠) [3] فتح القدير (٦٦٧/٤)

”فعلة“ بہ معنی ”مرة“ آتا ہے۔ چنانچہ قاضی نے کہا ہے: ”هِيَ الْمَرَّةُ مِنَ الصَّعْقِ أَوِ الصَّعَقِ“[1] بہ سکونِ عین تو مصدر ہے متعدی کا بہ معنی ”إِهْلَاك“ اور بہ فتحِ عین مصدر ہے لازم کا بہ معنی ”هلاك“ اور متعدی کا ماضی بہ فتحِ عین ہے اور لازم کا بہ کسرِ عین)۔ ”صاعقة“ اصل میں وہ ”صيحة“ یعنی چنگھاڑ ہے جس کے سبب سے ہلاکت آتی ہے، یا آگ کا ٹکڑا ہے جو آسمان سے اترتا ہے جس کے ساتھ سخت گرج ہوتی ہے۔ اس جگہ ﴿ صٰعِقَةً ﴾ سے مراد مطلق عذاب ہے، لیکن پہلے والے ﴿ صٰعِقَةً ﴾ کے لحاظ سے۔

رہا ثانی صاعقہ تو اس سے مراد حقیقی صاعقہ ہے، اس لیے کہ عاد اور ثمود اسی صاعقہ سے ہلاک ہوئے، جیسا کہ آیندہ ذکر کیا جائے گا۔ (صاعقۂ حقیقیہ سے عاد وثمود دونوں کا ہلاک ہونا غیر ظاہر ہے، بلکہ صرف ثمود اس صاعقۂ حقیقیہ سے ہلاک ہوئے اور قومِ عاد ہوا سے ہلاک ہوئے اور یہاں کی تفسیر کی بنا پر ہوا صاعقۂ حقیقیہ میں سے نہیں ہے۔ از مصحح سلمه)۔

جمہور نے دونوں جگہ ”صاعقة“کو بہ الف پڑھا ہے اور ابن زبیر وغیرہ (یعنی امام نخعی، سلمی اور ابن محیصن رحمہم اللہ) نے دونوں جگہ ”صَعقة“ بغیر الف کے پڑھا ہے۔[2] ”صَاعِقَةٌ وَصَعْقَةٌ“ کے معنی کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔[3] کلمہ ﴿ إِذْ ﴾ باعتبار متعلق کے ﴿ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴾ سے حال ہے۔ یہی وجہ ٹھیک ہے ”أَيْ: حَالَ كَوْنِهَا وَقْتَ مَجِيءِ الرُّسُلِ إِلَيْهِمْ“ یعنی ﴿ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴾ کا اس حال میں کہ وہ ہونے والا تھا، رسولوں کے ان کی طرف آنے کے وقت۔ مطلب یہ ہے کہ ان پر صاعقہ اس وقت آیا کہ ان کے پاس رسول آئے اور ان کی تکذیب کی۔ ﴿ جَآءَتْهُمُ ﴾ بہ لفظ جمع اس لیے فرمایا کہ ﴿ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴾ افراد کے لحاظ سے ہر دو جمع ہیں، اگرچہ لفظ کے اعتبار سے تثنیہ ہیں۔

﴿ اَلرُّسُلُ ﴾ سے مراد ہود اور صالح علیہما السلام اور ان سے پہلے کے رسول ہیں۔ یہ دونوں رسول نوح اور ابراہیم علیہما السلام کے درمیان تھے، ان کے درمیان ان دو رسولوں کے سوا اور کوئی رسول نہیں ہوا۔ (اس نہ ہونے پر جزم، یعنی پختہ ہونا غیر مناسب ہے، خصوصاً جبکہ ظاہر قرآن سے اور رسولوں کی آمد بھی ظاہر ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ ﴾ [الأحقاف: ۲۱] پس اس جگہ زیادہ مناسب اور احوط یہ ہے کہ یہ بات علمِ الٰہی کے سپرد کی جائے اور معاملے کو محتمل چھوڑ دیا جائے جس طرح کہ شاہ عبدالقادر۔قدس سرہ۔نے اپنے فائدہ میں کیا ہے۔ از مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔ اور ان دو پر جو رسول مقدم ہیں، وہ یہ ہیں: نوح، ادریس، شیث اور آدم علیہم السلام۔ خاص کر عاد اور ثمود کے قبیلوں کا اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ قریش ان کے بلاد پر سے گزرا کرتے تھے۔

[1] تفسير البيضاوي (۱۱۰/۵) [2] فتح القدير (٦٦٧/٤) [3] رقم الآية (٥٥)

﴿ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾، ﴿ جَآءَتْهُمُ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی رسول ان کے پاس آئے ان کی تمام اطراف سے اور اُن کے حق میں ہر قسم کی تدبیر کی، پھر ان سے سوا منہ پھیرنے کے کچھ نہ دیکھا۔ مطلب یہ ہے کہ رسول ہدایت اور نصیحت کی سب راہوں سے آئے، کبھی تو انذار (ڈرانے) اور تخویف (خوف دلانے) کی طرف سے آئے، کبھی تشویق (شوق دلانے) و ترغیب (رغبت دلانے) کی طرف سے اور کبھی توحید کے دلائل کی جہت سے۔ غرضیکہ سمجھانے اور بجھانے کا کوئی طریقہ نہ چھوڑا ہر طرح کا برتاؤ کیا، مگر کچھ مؤثر نہ ہوا۔ یا یہ معنی ہیں کہ زمانۂ ماضی کے لحاظ سے یوں آئے کہ جو عذاب کفار پر ہو چکا تھا اس سے ان کو ڈرایا اور زمانۂ آیندہ کی طرف سے یوں آئے کہ دنیا و آخرت کا جو عذاب ان پر نازل ہوگا اس سے ان کو ڈرایا۔ یا یہ معنی ہیں کہ ان کے پاس اگلے اور پچھلے رسول آئے۔ اس معنی کی بنا اس پر ہے کہ ان کے کلام کا آنا اور اُن کا حق کی طرف بلانا، اس کے آنے کو خود ان کا آنا ٹھہرایا تو گویا وہ سب رسول ان کے پاس آئے اور اُن سے خطاب کر کے یوں کہا: ﴿ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ﴾ یعنی مت پوجو مگر اللہ کو۔ کلمۂ ”أَنْ“ مصدریہ ہے۔ ”أَيْ: بِأَنْ لَّا تَعْبُدُوْا“۔ یا تفسیریہ ہے، یا مخففہ ہے مثقلہ سے اور اس کا اسم ضمیرِ شان محذوف ہے: ”أَيْ: أَنَّهُ“ امام حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسولوں نے ان کو ڈرایا اللہ تعالیٰ کے ان وقائع سے جو پہلی اُمتوں میں ہو چکے ہیں اور آخرت کے عذاب سے ڈرایا۔[1]

پھر اللہ پاک نے وہ جواب ذکر کیا جو انھوں نے رسولوں کو دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓىِٕكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ یعنی عاد و ثمود نے ہود اور صالح علیہما السلام کو خطاب کر کے کہا: اگر ہمارا رب رسول بھیجنا چاہتا تو البتہ ہماری طرف فرشتوں کو بھیجتا اور ہماری جنس میں سے بشر کو نہ بھیجتا۔ پھر کفر کی تصریح کی اور توقف نہ کیا تو بولے: بے شک ہم اس شے کے انکاری ہیں جس کا تم دعویٰ کرتے ہو کہ اللہ نے تم کو ہماری طرف بھیجا ہے، یعنی ہم اس کو نہیں مانتے، کیوں کہ تم تو ہم جیسے بشر ہو۔ تم کو ہم پر کسی طرح کی فضیلت نہیں ہے، پھر ہمیں چھوڑ کر تمھیں رسالت کے لیے کیوں منتخب کیا۔

﴿ اُرْسِلْتُمْ ﴾ میں تغلیب ہے مخاطب کی غائب پر۔ انھوں نے ہود اور صالح علیہما السلام کو ان رسولوں پر تغلیب دی جو ان سے پہلے گزرے ہیں تو گویا یوں کہا کہ ہم تم دونوں کے منکر ہیں اور ان کے بھی منکر ہیں جو تم سے پہلے ہیں اور جن پر ایمان لانے کی طرف تم نے ہم کو بلایا ہے۔ جب کہ اللہ پاک نے عاد و ثمود کا اجمالاً ذکر کیا تو جو شے ان میں سے ہر گروہ کے ساتھ خاص تھی اس کو تفصیلاً بیان کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ یعنی پس عاد جو تھے تو انھوں نے زمین میں بغیر اس تجبر اور تکبر کے استحقاق کے، جو اُن سے واقع ہوا، تکبر کیا۔

پھر ان کے بعض اقوال بیان کیے جو اُن سے صادر ہوئے جن میں ان کے تکبر کی دلیل تھی، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا

[1] الکشاف (۱۹۶/٤)

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ﴾ یعنی ہم سے بڑھ کر قوت میں کون ہے۔ ان کے جسم بڑے طویل تھے اور نہایت طاقتور تھے، چنانچہ جب ھود علیہ السلام نے ان کو عذاب کی دھمکی دی تو اپنے جسموں پر مغرور ہوئے۔ ان کی قوت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک شخص پہاڑ کی بڑی چٹان اپنے ہاتھ سے اکھاڑ لیتا تھا اور اس کو جہاں چاہتا رکھ دیتا۔ اس کہنے سے ان کی مراد یہ تھی کہ ان پر جو عذاب نازل ہوگا اس کو دور کرنے کی ان میں طاقت ہے۔

چنانچہ اللہ پاک نے ان کی اس طرح تردید کی: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا... الآية ﴾ یہ استفہام ان پر استنکار اور ملامت کرنے کے لیے ہے، یعنی انھوں نے یہ بات کہی اور یہ نہ جانا کہ اللہ پاک کی قدرت ان سے زیادہ سخت اور وسیع ہے اسی نے تو ان کو اور ان کی قوت کو پیدا کیا جس پر وہ ناز کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس پر قادر ہے کہ اپنے مختلف قسم کے عذابوں میں سے جس قسم کا عذاب چاہے ان پر نازل کرے، اس کے لیے اس کو کسی ساز و سامان کی ضرورت نہیں۔ صرف "کُنْ" کہنے سے فوراً سب کچھ ہو جاتا ہے۔ یہاں اللہ پاک نے اپنی یہ صفت بیان کی کہ ﴿ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ ﴾ اور "اَلَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ" نہ فرمایا۔ اس لیے کہ یہاں ان کی اس دعوے میں تکذیب کرنا ہے کہ وہ قوت میں منفرد اور یکتا ہیں۔

چنانچہ اس تکذیب میں ﴿ خَلَقَهُمْ ﴾ میں زیادہ مبالغہ ہے، کیوں کہ وہ تو مخلوق ہیں، لہٰذا ان کا خالق لازمی طور پر قوت میں ان سے زیادہ سخت ہوگا۔ غرضیکہ ایک تو انھوں نے ناحق تکبر کیا، دوسری بات یہ کی: ﴿ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴾ یعنی ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ آیات سے مراد رسولوں کے معجزے ہیں جو خاص طور پر ان کو عطا فرمائے اور ان کی نبوت پر ان کو دلیل و برہان ٹھہرایا۔ یا مراد تنزیلی آیتیں ہیں جن کو اپنے رسولوں پر نازل کیا، یا تکوینی نشانیاں جن کو ان کے لیے نصب فرمایا اور ان کو ان پر حجت ٹھہرایا۔ یہ سب باتیں مراد ہیں، کیوں کہ کلمہ "آیات" ان سب کو شامل ہے۔ یہ تو ان کے فاسد اقوال و افعال کا ذکر تھا۔ پھر جو عذاب اس کے بدلے میں ان پر نازل ہوا اس کا ذکر فرمایا:

﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا ﴾ یعنی پھر ہم نے ان پر ایک تند و تیز ہوا صرصر بھیجی۔ "صرصر" نہایت سخت آواز والی ہوا کو کہتے ہیں۔ یہ "صَرَّة" بہ معنی "صيحة" سے ماخوذ ہے، یعنی چنگھاڑ۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: "صرصر" کے معنی ہیں: "شَدِيْدَةٌ عَاصِفَةٌ"، یعنی نہایت زور سے چلنے والی ہوا۔ فراء نے کہا: "بَارِدَة"، یعنی نہایت سرد ہوا جو اس طرح سے جلاتی ہے، جیسے آگ جلاتی ہے۔ (قطرب نے اس کی سند میں حطیہ کا یہ شعر پڑھا:

المطعمون إذا هبت بصرصرة والحاملون إذا استودوا عن الناس

یعنی وہ ایسے سخی ہیں کہ جس وقت سرد ہوا چلتی ہے تو لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور جب ان سے دیت مانگی جاتی ہے تو لوگوں کی طرف سے اپنے اوپر اٹھا لیتے ہیں)۔

امام عکرمہ، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ "بَارِدَة"۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "اَلشَّدِيْدَةُ: السَّمُوْم"

یعنی نہایت درجہ گرم ہوا۔ ''صرصر'' کی زیادہ صحیح تفسیر ''برد'' کے ساتھ ہے، یعنی سردی کے ساتھ، اس لیے کہ کلامِ عرب میں ''صَرّ'' بہ معنی ''برد'' ہے۔ (اسی معنی سے یہ شعر ہے: ؎

لها عذر كقرون النساء ركبن في يوم ريح و صر

یعنی اس اونٹنی کی مینڈھیاں عورتوں کی مینڈھیوں کی طرح ہیں جو ترکیب دی گئی ہیں، یعنی گوندھی گئی ہیں ہوا اور سردی کے دن میں)۔ امام ابن سکیت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جائز ہے کہ ''صرصر'' بہ معنی ''صر'' یعنی ''برد'' سے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ''صرصر الباب'' یعنی دروازے کی آواز سے ہو اور ''صرۃ'' بہ معنی ''صیحۃ'' سے۔ اسی معنی سے یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ ﴾ [الذاريات: ٢٩] ''پس ان کی بیوی حیرت میں آگے بڑھی۔'' [1] غرضیکہ ان پر ایک سخت آواز والی نہایت سرد ہوا بھیجی۔

پھر اللہ پاک نے اس عذاب کے نازل ہونے کا وقت بیان فرمایا: ﴿ فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ ﴾ ''أَيْ: نَكِدَاتٍ، مَشْئُوْمَاتٍ ذَوَاتِ نُحُوْسٍ عَلَيْهِمْ'' یعنی وہ ہوا ان پر ایسے دنوں میں آئی جو سخت، ناخوش، نامبارک اور بداختر تھے کہ یہ سب باتیں ان کے لیے جمع تھیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دن ماہِ شوال کے آخری دن تھے، چہارشنبہ (بدھ) سے چہارشنبہ تک سات راتیں اور آٹھ دن لگاتار۔ [2] کسی نے کہا ہے کہ کوئی قوم عذاب نہیں کی گئی مگر بدھ کے دن۔ کسی نے کہا: ﴿ نَّحِسَاتٍ ﴾ بہ معنی ''بَارِدَاتٍ'' یعنی سرد دن۔ اس کو امام ثعلبی رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے۔ کسی نے کہا: بہ معنی متتابعات ہے، یعنی پے در پے۔ کسی نے کہا: ''شِدَادٍ'' یعنی سخت دن۔ کسی نے کہا: ''ذَوَاتِ غُبَارٍ وَتُرَابٍ ثَائِرٍ لَا يَكَادُ يُبْصَرُ فِيْهِ'' یعنی جس دن غبار اور مٹی اڑے اور کچھ نہ سوجھے۔

جمہور نے ﴿ نَّحِسَاتٍ ﴾ بہ کسرِ حائے مہملہ پڑھا ہے اور امام نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہم اللہ نے ''حاء'' کے سکون سے پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ''نحس'' کی جمع ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے بہ دلیل قولہ تعالیٰ: ﴿ فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴾ [القمر: ١٩] ''ایک پیہم منحوس دن میں۔'' اور امام ابو عبید رحمہ اللہ نے پہلی قراءت کو پسند فرمایا ہے۔ [3] ﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا ﴾ [البقرة: ١٤٨] پھر عذاب بھیجنے کی وجہ کا ذکر فرمایا: ﴿ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ ''أَيْ: لِكَيْ نُذِيْقَهُمْ'' ''خِزْيٌ'' بہ معنی ذلت و ہوان (توہین) ہے، یعنی ہم نے ان پر نحس دنوں میں تند ہوا بھیجی، تاکہ دنیا کی زندگی میں ہی ان کو ذلت، خواری اور رسوائی کا عذاب چکھائیں اس تکبر کے سبب سے جو ان سے صادر ہوا۔ یہ تو دنیا میں ہوا اور آخرت کے بارے میں فرمایا: ﴿ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى ﴾ یعنی البتہ آخرت کا عذاب اہانت اور ذلت میں اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/٣٤٧) فتح القدير (٤/٦٦٩) [2] تفسير القرطبي (١٥/٣٤٨) [3] تفسير القرطبي (١٥/٣٤٨)

عذاب کی اضافت "خزي" کی طرف فرمائی اور اصل میں "خزي" معذب کی صفت ہے۔ عذاب کو جو اس کے ساتھ موصوف کیا تو یہ مبالغے کے لیے اسناد مجازی کی بنا پر ہے۔ یعنی جب خود عذاب موصوف ذلت اور رسوائی ہے تو جو اس کے ساتھ عذاب دیے جائیں گے، ان کی ذلت کا کیا ٹھکانا ہے! چنانچہ یہ اضافتِ موصوف بہ سوئے صفت کے باب سے ہے: "اَلْعَذَابُ الْخِزْيِ" اور اسی لیے ﴿ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى ﴾ آیا ہے۔ اگر یہ اضافت موصوف بہ سوئے صفت کے قبیل سے نہ ہوتا تو لفظ "أخزی" کو نہ لاتے جو مشارکت کا مقتضی ہے: ﴿ وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴾ یعنی اور وہ عذاب جو ان پر نازل ہوگا اس کو کوئی روکنے والا ان سے نہ روکے گا۔ کوئی دور کرنے والا دور نہ کرے گا۔ یہ تو عاد کا حال تھا جن کو اپنی قوت پر ناز تھا۔ ایک ہوا نے اڑا کر ان کا ستیاناس کر دیا۔ پھر دوسری قوم کا حال ذکر فرمایا:

﴿ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ ﴾ یعنی وہ جو ثمود تھے ان کے لیے ہم نے راہِ نجات بیان کی اور ان کو حق کا راستہ بتایا، اس طرح سے کہ ان کی طرف رسول بھیجے اور اللہ کی مخلوقات میں سے ان کے لیے دلالتیں اور پتے نشان قائم کیے اور تشریعی آیتیں نازل کیں، کیوں کہ ان سب امور سے عقل مند پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ اللہ پاک پر ایمان لائے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کرے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں: "دَلَّلْنَاهُمْ عَلٰى مَذْهَبِ الْخَيْرِ بِإِرْسَالِ الرُّسُلِ" یعنی رسول بھیج کر ہم نے ان کو خیر کی راہ بتائی۔[1] شیخ ابو منصور رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہدایت کا جو ذکر ہوا تو احتمال ہے کہ اس کو بیان کرنا ہو، جیسا کہ مذکور ہوا اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان میں اہتداء کا پیدا کرنا ہو تو وہ "مهتدين" ہو گئے۔ پھر اس کے بعد کافر ہوگئے اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، کیوں کہ جو ہدایت خالق کی طرف مضاف ہوتی ہے، وہ بیان و توفیق و خلق کے معنی میں اہتداء ہی کا فعل ہوتی ہے۔

رہی وہ ہدایت جو خلق کی طرف مضاف ہے تو وہ صرف بیان کے معنی میں ہوتی ہے۔[2] صاحبِ کشاف نے اس میں کہا ہے: پس اگر تم کہو کہ تمھارا یہ قول "هَدَيْتُهُ" کیا اس کے معنی: "جَعَلْتُ فِيهِ الْهُدٰى" کے نہیں ہیں، یعنی میں نے اس میں ہدایت رکھ دی، اس پر دلیل تمھارا یہ قول ہے: "هَدَيْتُهُ فَاهْتَدٰى" بہ معنی تحصیلِ بغیہ وحصولِ بغیہ ہیں، یعنی میں نے اسے راہ بتائی تو وہ راہ پا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے مطلوب حاصل کر لیا اور وہ حاصل ہو گیا جس طرح یہ کہتے ہو کہ "رَدَعْتُهُ فَارْتَدَعَ" یعنی میں نے فلاں کو باز رکھا تو وہ باز رہ گیا۔ اب کس طرح ہدایت کا استعمال صرف دلالت میں جائز ہوا؟ تو ہم جواب دیں گے کہ اس بات پر دلالت کے لیے جائز ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قدرت دی، پھر ان کی علتیں دور کیں اور ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہا تو گویا بغیہ و مطلوب کو ان میں حاصل کر لیا اس شے کے حاصل کر دینے کے سبب سے جو مطلوب کی موجب اور مقتضی ہوتی ہے۔[3] انتھی۔ صاحبِ کشاف نے جو یہ تکلف کیا

---

[1] فتح القدير (٦٧٠/٤) [2] تفسير النسفي (٨٧/٤) [3] الكشاف (١٩٩/٤، ٢٠٠)

تو صرف اس لیے کہ خلق ابتداء کے ساتھ ہدایت کی تفسیر کرنے پر اسے قدرت نہ ملی، کیوں کہ وہ اس کے مذہبِ فاسد کے خلاف ہے۔

جمہور نے ﴿ وَاَمَّا ثَمُوْدُ ﴾ کو بہ رفع و بہ منع صَرف پڑھا ہے۔ اور امام اعمش اور ابن وثاب رحمہما اللہ نے بہ رفع و بہ صَرف اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ابن ابی اسحاق اور عاصم رحمہما اللہ نے ایک روایت میں بہ نصب وصَرف اور حسن وابن ہرمز و عاصم رحمہم اللہ نے ایک روایت میں بہ نصب ومنع صَرف پڑھا ہے۔ چنانچہ صرف تو بنا بر ابتداء ہے اور فصیح یہی ہے، اس لیے کہ حرفِ ابتداء کے بعد واقع ہوا ہے اور نصب بنا بر اشتغال ہے اور صَرف بنا بر تفسیر اسم باب وحی ہے اور منع صَرف اس بنا پر ہے کہ اس کی تاویل بہ قبیلہ ہو۔ بالجملہ اللہ پاک نے رسول بھیج کر ثمود کو خیر کا راستہ بتایا۔ ﴿ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ﴾ پس انھوں نے ایمان پر کفر کو اختیار کیا۔ (قالہ الفراء) امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عمی" کو بیان پر اختیار کیا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معصیت کو طاعت پر اختیار کیا![1] تو اس کی سزا دنیا میں ان کو یہ ملی: ﴿ فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ ... الآية ﴾

پہلے گزر چکا ہے کہ ﴿ صٰعِقَةُ ﴾ کسی بھی ہلاک کرنے والی شے کا نام ہے اور "ھون" بہ معنی ہوان یا اہانت ہے۔ گویا یوں کہا کہ ان کو ہلاک کرنے والا اور ذلیل اور اہانت کرنے والا عذاب پہنچا۔ محاورے میں ہے: "عَذَابٌ هُوْنٌ، أَيْ: مُهِيْنٌ"۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴾ "اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔" [سبا: ١٤]

قولہ تعالیٰ: ﴿ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ میں حرفِ "باء" سببیہ ہے اور کلمۂ "ما" موصولہ ہے یا مصدریہ، یعنی ان کو صاعقہ نے پکڑا بہ سبب اس شے کے جس کو وہ کماتے تھے، یا بہ سبب ان کی کمائی کے۔ مراد ان کا شرک ہے اور صالح علیہ السلام کو جھٹلانا ہے۔ ﴿ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴾. ﴿ الَّذِيْنَ ﴾ سے مراد صالح علیہ السلام ہیں اور مومن ہیں جو اُن کے ساتھ تھے، کیوں کہ اللہ پاک نے اس عذاب سے ان سب کو نجات دی۔ یہ لوگ چار ہزار تھے۔ یہ تو دنیا کے عذاب کا ذکر تھا۔ پھر آخرت کے عذاب کا ذکر فرمایا:[2]

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ

[1] تفسير القرطبي (٣٤٩/١٥) فتح القدير (٦٧٠/٤) [2] فتح البيان (٢٣٤/١٢۔٢٣٩)

تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ
وَلَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ
كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ
بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا
فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿۲۴﴾
وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ
وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ
الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

اور جس دن اللہ کے دشمن (ہانک کر) آگ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے تو ان کی درجہ بندی کی جائے گی ⑲ حتی کہ جب وہ اس (دوزخ) کے پاس پہنچیں گے تو ان کے خلاف ان کے کان اور اُن کی آنکھیں اور ان کی جلدیں ان عملوں کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے ⑳ اور وہ اپنی جلدوں سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ وہ کہیں گی: ہمیں اس اللہ نے بلوایا جس نے ہر چیز کو بلوایا اور اسی نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ㉑ اور تم (گناہ کرتے وقت یہ سوچ کر) چھپتے نہیں تھے کہ تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھارے چمڑے تمھارے خلاف گواہی دیں گے، بلکہ تم سمجھتے تھے کہ بے شک اللہ تمھارے بہت سے اعمال کو نہیں جانتا جو تم کرتے تھے ㉒ اور تمھارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے بارے میں کیا، اسی نے تمھیں ہلاک کیا، چناں چہ تم خسارہ پانے والوں میں سے ہو گئے ㉓ پھر اگر وہ صبر کریں تو بھی آگ ہی ان کا ٹھکانا ہے اور اگر وہ معافی مانگیں گے تو وہ معاف کیے گئے (لوگوں) میں سے نہ ہوں گے ㉔ اور ہم نے ان کے کچھ (بُرے) ہم نشین مقرر کر دیے تو انھوں نے ان کے اگلے اور پچھلے (تمام) اعمال خوش نما بنا کر ان کو دکھائے، آخر کار ان پر بھی (اللہ کے عذاب کی) وہ بات پوری ہوئی جو اُن سے پہلے گزرنے والے جنّوں اور انسانوں پر (پوری ہو چکی تھی کہ) بلاشبہ وہ خسارہ پانے والوں میں سے تھے ㉕

قیامت کے روز مجرموں کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے:

فرشتے جب کافروں کے اعمال لکھے ہوئے لے کر آئیں گے تو وہ انکار کریں گے اور کہیں گے کہ یہ ہمارے دشمن ہیں اور دشمنی سے ہم پر جھوٹ لکھ دیا، تب اللہ تعالیٰ آسمان وزمین سے گواہی دلوا دے گا، وہ کہیں گے: یہ بھی دشمن ہیں۔ اے رب! تیرے ہاں ظلم نہیں۔ اگر ہمارا کوئی دوست گواہی دے تو وہ سند ہے۔ تب ان کے ہاتھ پاؤں بولیں گے۔ غیر سے چھپ کر گناہ کرتے تھے، یہ معلوم نہ تھا کہ ہاتھ پاؤں بتا دیں گے کہ ان سے بھی پردہ کریں۔ اب اگر یہ صبر کریں تو بھی ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یعنی دنیا میں تو صبر کرنے سے بعضی آزمایش آسان ہو جاتی ہے، مگر وہاں صبر کریں یا نہ کریں دوزخ ان کا گھر مقرر ہو چکا۔ بعضی آزمایش منت سماجت کرنے سے ٹل جاتی ہے، وہاں بہت چاہیں گے کہ منت کریں، مگر کوئی قبول نہیں کرے گا۔ ان کے کچھ ہم نشیں مقرر کر رکھے تھے، یعنی ان پر شیطان تعینات تھے کہ برے کام ان کو اچھے کر کے دکھائے اور اللہ تعالیٰ کی یہ بات صحیح ہوگئی: ﴿ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ ﴾ [الأعراف: ١٨] ''میں ضرور جہنم کو بھر دوں گا۔'' انتھی[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ذکر کر مشرکوں کے لیے اس دن کا جس میں وہ آگ کی طرف جمع کیے جائیں گے۔ ﴿ يُوْزَعُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ زبانیہ فرشتے ان کے پہلوں کو ان کے آخر پر جمع کریں گے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح فوج کے افسر فوج کو ترتیب وار چلاتے ہیں، اسی طرح فرشتے ان کو چلائیں گے، تاکہ سب برابر چلیں، آگے پیچھے نہ ہونے پائیں۔ اسی طرح دوسری آیت میں بھی دوزخ کی طرف ہانکنے کا ذکر آیا ہے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴾ [مریم: ٨٦] ''اور گناہ گاروں کو سخت پیاس کی حالت میں جہنم کی طرف ہانک لے جائیں گے۔'' ''أَيْ: عَطَاشًا'' یعنی مجرموں کو جہنم کی طرف ہانکیں گے اس حال میں کہ وہ پیاسے ہوں گے۔

﴿ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ ... الآية ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ اس پر کھڑے ہوں گے تو ان پر ان کے اگلے پچھلے اعمال کی گواہی ان کے کان اور اُن کی آنکھیں اور ان کے چمڑے دیں گے اور ان سے ایک حرف بھی نہ چھپایا جا سکے گا۔ وہ اپنے اعضاء اور چمڑوں کو ملامت کریں گے جب وہ ان پر گواہی دیں گے۔ ان کو اس وقت ان کے اعضاء یہ جواب دیں گے کہ ہم کو تو اللہ نے بلوایا ہے، جس نے ہر شے کو بولنے کی طاقت دی ہے اور اس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا، یعنی وہ تو ایسا ہے کہ کوئی اس کی مخالفت اور ممانعت نہیں کر سکتا اور اسی کی طرف تم پھر جاؤ گے۔

اعضاء کی گواہی کے بارے میں مروی احادیث:

(1) حافظ ابوبکر بزار رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن ہنسے اور مسکرائے، پھر فرمایا کہ کیا تم مجھ سے پوچھتے نہیں ہو کہ میں کس چیز سے ہنسا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ کس چیز سے ہنسے؟ فرمایا میں نے بندے کے جھگڑنے سے تعجب کیا جو وہ قیامت کے دن اپنے رب سے کرے

گا۔ وہ کہے گا: اے میرے رب! کیا تو نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا ہے کہ تو مجھ پر ظلم نہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیوں نہیں، تو بندہ کہے گا کہ میں تو اپنے اوپر اپنے نفس کے سوا کوئی گواہ قبول نہیں کرتا تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا میں اور کراماً کاتبین ملائکہ گواہ کافی نہیں ہیں؟ کہا: پھر یہ بات بار بار کہے گا۔ پھر اس کے منہ پر مہر کر دی جائے گی اور اس کے کان اور آنکھیں اور چمڑے بولیں گے اور جو وہ کام کرتا تھا وہ بتائیں گے تو اب کہے گا: "بُعْدًا لَكُنَّ وَسُحْقًا عَنْكُنَّ كُنْتُ أُجَادِلُ" یعنی تم دور ہو میں تو تمھاری ہی طرف سے جھگڑ رہا تھا۔[1] (ثم رواه هو و ابن أبي حاتم من حديث أبي عامر الأسدي عن فضيل بن عمرو و الشعبي ثم قال: لا نعلم رواه عن أنس رضی اللہ عنہ غير الشعبي. وقد أخرجه مسلم و النسائي جميعا عن أبي بكر بن أبي النضر عن أبي النضر عن عبيد الله بن عبد الرحمن الأشجعي عن الثوري به ثم قال النسائي: لا أعلم أحدا رواه عن الثوري غير الأشجعي و ليس كما قال كما رأيت. والله أعلم)

② امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو بردہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: کافر اور منافق حساب کے لیے بلایا جائے گا تو اس پر اس کا رب اس کے اعمال پیش کرے گا تو وہ انکار کرے گا اور کہے گا: اے رب! تیری عزت کی قسم! فرشتے نے مجھ پر وہ عمل لکھ لیا ہے جو میں نے نہیں کیا، پس فرشتہ کہے گا: کیا تو نے فلاں کام فلاں دن اور فلاں مقام پر نہیں کیا؟ تو کہے گا: اے رب! تیری عزت کی قسم! میں نے اس کو نہیں کیا، کہا: پھر جب وہ ایسا کرے گا تو اس کے منہ پر مہر کر دی جائے گی۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک میں گمان کرتا ہوں کہ اس کا پہلا عضو جو بولے گا وہ اس کی سیدھی ران ہے۔[2]

③ حافظ ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں۔ فرمایا: جس وقت قیامت کا دن ہو گا تو کافر کو اس کا عمل پہچوائیں گے تو وہ انکار کرے گا اور جھگڑے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ یا فرشتہ کہے گا: یہ تیرے پڑوسی تجھ پر گواہی دیتے ہیں، کہے گا کہ جھوٹ ہے، کہا: پھر کہے گا: تیرے گھر والے اور کنبے والے گواہی دیتے ہیں تو کہے گا کہ جھوٹ ہے۔ کہا: پھر کہے گا کہ قسم کھاؤ تو قسم کھا جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ ان کو چپ کر دے گا اور اُن پر ان کی زبانیں گواہی دیں گی اور پھر ان کو آگ میں داخل کر دے گا۔[3]

④ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے ابن الازرق سے کہا: بے شک قیامت کے دن لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ نہ بولیں گے اور نہ عذر کریں گے، نہ کلام کریں گے یہاں تک کہ ان کو اِذن دیا جائے۔ پھر جب ان کو اذن دیا جائے گا تو جھگڑیں گے اور ان کا انکار کرنے

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٦٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٥٠٨/٦) مسند البزار (٣٦٠/٢) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٧١/١٠)
② تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٧١/١٠)
③ مسند أبي يعلىٰ (٥٢٧/٢) اس کی سند میں "دراج عن أبي الهيثم" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٢٧٠٨)

والا اللہ کے ساتھ شرک کرنے کا انکار کرے گا، پھر وہ اس کے لیے قسم کھائیں گے جس طرح کہ تمھارے لیے قسم کھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے منہ پر مہر لگا دے گا اور ان کی جانوں میں سے گواہ پیش کرے گا اور ان کے چمڑوں سے، ان کی آنکھوں سے، ان کے ہاتھوں سے اور ان کے پاؤں سے، پھر وہ ان کے منہ کھول دے گا تو وہ اپنے اعضاء سے جھگڑیں گے تو اعضاء کہیں گے کہ ہمیں تو اللہ نے بولنے کی طاقت دی جس نے ہر شے کو قوتِ گویائی دی تھی اور اس نے تم کو پیدا کیا پہلی بار اور اسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے، چنانچہ اب زبانیں انکار کے بعد اقرار کر لیں گی۔[1]

5 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن عبدالرحمٰن بن جبیر الحضرمی عن رافع ابی الحسن روایت کیا ہے۔ عبدالرحمان نے کہا کہ رافع نے اس شخص کی صفت بیان کی جس نے انکار کیا، کہا: پھر اللہ تعالیٰ اس کی زبان کی طرف اشارہ کرے گا تو وہ اس کے منہ میں بڑھ جائے گی، یہاں تک کہ اسے بھر دے گی، پھر وہ ایک بات بولنے کی طاقت نہ رکھے گا، پھر اس کے تمام اعضاء سے کہے گا کہ بولو اور اس پر گواہی دو تو اس پر اس کا کان، اس کی آنکھ، اس کا چمڑا، اس کی شرم گاہ، اس کے ہاتھ اور اس کے پاؤں گواہی دیں گے کہ "صَنَعْنَا، عَمِلْنَا، فَعَلْنَا"[2] یعنی ہم نے وہ کام کیے۔ سورت یٰسٓ کی آیت: ﴿ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ [یٰس: ٦٥] کی تفسیر میں بہت سی احادیث و آثار بیان ہو چکے ہیں۔ ان کو یہاں دوبارہ لانے کی حاجت نہیں ہے۔

6 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: جب مہاجرینِ دریا رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ کر آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم وہ عجیب باتیں بیان نہیں کرتے جو حبشہ کے ملک میں دیکھ کر آئے ہو؟ تو ان میں سے کئی جوانوں نے کہا: کیوں نہیں یا رسول اللہ! ہم بیٹھے ہوئے تھے تو ہمارے پاس سے ان کے رُہبانوں کی بُوڑھیوں میں سے ان کی ایک بڑھیا گزری، وہ پانی کا ایک گھڑا سر پر اٹھائے ہوئے تھی، جب وہ گزری ان میں سے ایک جوان کے پاس سے تو اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کے دونوں مونڈھوں کے درمیان رکھا اور اس کو دھکا دیا وہ اپنے گھٹنوں کے بل گر پڑی اور اس کا گھڑا ٹوٹ گیا، پھر جب وہ سیدھی ہوئی اور پھر کر دیکھا تو کہا: اے غدر! قریب ہے کہ تو جان لے گا (غدر بہ معنی غادر و بے وفاء ہے۔ اکثر اس کا استعمال حرفِ ندا کے ساتھ گالی، یعنی سب و شتم میں ہوتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے) جبکہ اللہ کرسی کو رکھے گا اور اگلے پچھلے سب لوگوں کو جمع کرے گا اور ہاتھ پاؤں بول کر وہ عمل بتائیں گے جو وہ کماتے تھے۔ چنانچہ تو عن قریب جان لے گا کہ کل کو اس کے نزدیک، میرا اور تیرا حال کیسا ہوگا۔ راوی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: "صَدَقَتْ صَدَقَتْ" یعنی اس (بڑھیا) نے سچ کہا۔ اللہ پاک اس قوم کو کیسے پاک کرے گا کہ اس کے ضعیف کے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٧٢،٣٢٧١/١٠) [2] تفسير ابن كثير (١٢١/٤)

لیے اس کا حق شدید سے نہ لیا جائے۔[1] (هذا حديث غريب من هذا الوجه قال ابن أبي حاتم: حدثنا أبي حدثنا سويد بن سعيد حدثنا يحيى بن سليم الطائفي عن أبي خيثم عن أبي الزبير عن جابر الخ. و رواه ابن أبي الدنيا في كتاب الأهوال حدثنا إسحاق بن إبراهيم حدثنا يحيى بن سليم به)

اللہ تعالیٰ کے علم سے بے پروائی تباہی کا باعث ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اپنے اعضاء اور چمڑوں کو اس بات پر ملامت کریں گے کہ انھوں نے ان کے خلاف گواہی دی، تو وہ ان سے کہیں گے کہ تم اس کام کو چھپاتے نہ تھے جس کو کرتے تھے، بلکہ تم تو اللہ کے سامنے کھلم کھلا کفر اور معاصی کرتے تھے اور اپنے خیال میں اس کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، کیوں کہ تم تو یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ تمھارے سارے کاموں کو نہیں جانتا، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ ﴾ یعنی تمھارا یہ فاسد اور باطل ظن اور اعتقاد تھا کہ اللہ تعالیٰ ان بہت سی چیزوں کو نہیں جانتا جو تم کرتے ہو۔ اسی خیالِ بد نے تم کو تمھارے اللہ کے نزدیک تباہ و برباد اور ہلاک کر دیا، ﴿ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ یعنی تم مواقفِ قیامت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو گئے، تم نے اپنی جانوں کا اور اپنے گھر والوں کا نقصان کیا۔ اس بارے میں کچھ روایات درج ذیل ہیں:

1 امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، کہا: میں کعبے کے پردوں میں چھپا ہوا تھا کہ تین آدمی آئے، ایک قرشی اور دو اس کے داماد ثقفی، یا ایک ثقفی اور دو اس کے داماد قرشی، ان کے جسموں کی چربی بہت تھی اور دلوں کی سمجھ کم تھی۔ انھوں نے کوئی بات کہی، میں نے اس کو نہیں سنا، پھر ان میں سے ایک نے کہا: کیا تم خیال کرتے ہو کہ اللہ ہماری اس بات کو سنتا ہے؟ تو دوسرا بولا کہ جس وقت ہم اپنی آوازیں بلند کریں تو اس کو سنتا ہے اور جب ہم بلند نہ کریں تو اس کو نہیں سنتا۔ پھر تیسرا بولا کہ اگر اس نے اس سے کچھ سن لیا تو سب کو سن لیا۔ کہا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، اس پر اللہ عزوجل نے آیت: ﴿ وَمَا كُنْتُمْ ﴾ نازل فرمائی۔[2] (وهكذا رواه الترمذي عن هناد عن أبي معاوية بإسناده نحوه و أخرجه أحمد و مسلم و الترمذي أيضاً من حديث سفيان الثوري عن الأعمش عن عمارة بن عمير عن وهب بن ربيعة عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ بنحوه و رواه البخاري و مسلم أيضا من حديث السفيانين كلاهما عن منصور عن مجاهد عن أبي معمر عبد الله بن سخبرة عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ به)

2 امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے عن بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١٠) تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٧٢/١٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: مختصر العلو (٧٥/١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٧٥) مسند أحمد (٣٨١/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٤٩)

53

﴿ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ تم قیامت کے دن اس حال میں بلائے جاؤ گے کہ تمھارے منہ پر بند لگے ہوئے ہوں گے، چنانچہ پہلی شے جو تم میں سے ایک کا حال بیان کرے گی، وہ اس کی ران اور ہتھیلی ہے۔[1] معمر جو بہز سے راوی ہیں، کہتے ہیں کہ حسن رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ ﴾ پھر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: «أَنَا مَعَ عَبْدِي عِنْدَ ظَنِّهِ بِي وَأَنَا مَعَهُ إِذَا دَعَانِي» یعنی میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں نزدیک اس کے گمان کے میرے ساتھ اور میں اس کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ پھر حسن رحمہ اللہ ٹھہرے اور اس میں غور وفکر کرنے لگے، پھر کہا: خبردار! لوگوں نے جو عمل کیا ہے اپنے رب کے ساتھ وہ اپنے گمانوں کے اندازے پر کیا ہے۔ چنانچہ مومن نے اپنے رب کے ساتھ نیک گمان رکھا تھا تو اس نے اچھا عمل کیا اور کافر اور منافق جو ہیں انھوں نے اللہ کے ساتھ برا گمان رکھا تو برا عمل کیا۔ پھر کہا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ... الآية ﴾[2]

3 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''تم میں سے کوئی نہ مرے مگر اس حال میں کہ وہ اللہ کے ساتھ نیک گمان رکھتا ہو۔ چنانچہ ایک قوم کو اس بات نے ہلاک کیا کہ وہ اللہ کے ساتھ برا گمان رکھتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمْ... الآية ﴾[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے: ان کے لیے برابر ہے وہ صبر کریں یا نہ کریں وہ تو آگ میں ہیں جس سے ان کے لیے کوئی مفر نہیں اور نہ ہی ان کو اس سے نکلنا ہے اور اگر وہ اس اللہ عزوجل کی رضا کی طلب کریں تو ان کے لیے کوئی عذر نہیں اور ان کی لغزشوں سے درگزر نہ کیا جائے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اگر وہ دنیا کی طرف لوٹ جانے کا سوال کریں تو ان کے لیے کوئی جواب نہیں ہے۔ کہا: اور یہ اس آیت کے مثل ہے جس میں ان کی طرف سے خبر دی ہے: ﴿ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ۝ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ۝ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴾[4] [المؤمنون: ١٠٦۔ ١٠٨] ''کہیں گے کہ اے پروردگار! ہماری بدبختی ہم پر غالب آگئی (واقعی) ہم تھے ہی گمراہ۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں یہاں سے نجات دے اب بھی اگر ہم ایسا ہی کریں تو بے شک ہم ظالم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا پھٹکارے ہوئے یہیں پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو۔''

---

1 تفسير الصنعاني (١٨٥/٣)،سنن النسائي الكبرىٰ (٤٥١/٦)
2 تفسير الصنعاني (١٨٥/٣) یہ روایت مرسل ہے۔
3 مسند أحمد (٣٩٠/٣) اس کی سند میں ''نضر بن اسماعیل'' ضعیف راوی ہے، البتہ اس کے آخری جملے (پس ایک قوم ......) کے علاوہ روایت صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٧) میں بھی مروی ہے۔
4 تفسير الطبري (٤٥٨/٢١)

مشرکوں کے ہم نشین ان کے برے اعمال خوش نما کر کے دکھاتے ہیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی نے مشرکوں کو گمراہ کیا ہے اور یہ اس کی مشیت، حکم اور قدرت سے ہے اور وہ اپنے افعال میں حکیم ہے، اس طرح سے کہ ان پر انسانوں اور جنّوں میں سے ایسے ساتھی مقرر کر دیے، جنھوں نے ماضی میں اور مستقبل میں اُن کے عمل انھیں اچھے کر دکھائے تو انھوں نے اپنے آپ کو صرف بھلائیاں کرنے والا سمجھ لیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٣٦۔ ٣٧] ''اور جو شخص رحمان کی یاد سے غفلت کرے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں وہی اس کا ساتھی رہتا ہے۔ اور وہ انھیں راہ سے روکتے ہیں اور یہ اسی خیال میں رہتے ہیں کہ یہ ہدایت یافتہ ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ان پر عذاب کا حکم ثابت اور واجب ہو گیا جس طرح کہ اُن اُمتوں پر ثابت ہو چکا جو جنّوں اور انسانوں میں سے ان سے پہلے گزر چکی ہیں، جنھوں نے ویسے کام کیے جو انھوں نے کیے۔ ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴾ یعنی خسارے اور نقصان اور ہلاکت میں یہ اور وہ برابر ہوئے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ جمہور نے ﴿ يُحْشَرُ ﴾ کو بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور ﴿ اَعْدَآءُ ﴾ کو مرفوع پڑھا ہے اور نافع نے ''نَحْشُرُ'' کو بہ نون ونصبِ ''أَعْدَاءَ'' پڑھا ہے۔[2] کلمۂ ''إذ'' میں عامل محذوف ہے جس پر ما بعد دال ہے۔ تقدیر یہ ہے: ''يُسَاقُ النَّاسُ يَوْمَ يُحْشَرُ''. یا ''اُذْكُرْ'' محذوف کا ظرف ہے: ''أَيْ: اُذْكُرْ يَوْمَ يُحْشَرُ''

بالجملہ اللہ پاک نے جو ﴿ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ ﴾ فرمایا بجائے ''يَوْمَ يُحْشَرُوْنَ'' کے، کیوں کہ پہلے قومِ ثمود کا ذکر ہے، تو ضمیر انہیں کی طرف راجع ہو جاتی، چنانچہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصد یہ ہے کہ ان کی مذمت میں مبالغہ کیا جائے، یعنی کون ثمود؟ یعنی وہ جو اللہ سبحانہ کے دشمن ہیں، اس سے بڑھ کر اور کیا مذمت ہو گی۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَعْدَآءُ اللّٰهِ ﴾ سے مراد صرف اگلے پچھلے کفار ہیں، یعنی اے محمد! تو قریش سے، جو تیرے دشمن ہیں، کفار کا حال بیان کر جو قیامت کے دن ہو گا، شاید وہ دشمنی سے باز آجائیں اور ڈر جائیں۔ نار کی طرف حشر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو آگ کی طرف ہانک لے جائیں گے، یا موقفِ حساب کی طرف، اس لیے کہ وہاں پر جنتیوں اور دوزخیوں کے فریق ظاہر ہو جائیں گے۔

﴿ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ان کا پہلا اُن کے آخر پر روکا جائے گا، تاکہ سب اکٹھے ہو جائیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/١٢٠۔١٢٢) [2] تفسیر القرطبي (١٥/٣٥٠)

امام قتادہ اور سدی رحمہ اللہ وغیرہما نے اسی طرح کہا ہے[1] اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسی کے قائل ہیں۔[2] یعنی ان کے اگلے لوگ ٹھہرائے جائیں گے، یہاں تک کہ ان کے پچھلے لوگ ان سے آکر مل جائیں۔ یہ اہلِ نار کی کثرت کا بیان ہے۔ ﴿ يُوزَعُونَ ﴾ ماخوذ ہے "وَزَعْتُهُ"، یعنی "كَفَفْتُهُ" سے۔ "وزع" کے معنی روکنے اور باز رکھنے کے ہیں۔ اس کے معنی کی تحقیق سورۃ النمل میں پورے طور پر گزر چکی ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں اس کی تفسیر میں "يُدْفَعُونَ" ہے۔[4] کسی اور نے کہا ہے کہ "يُسَاقُونَ" کے معنی میں ہے۔

﴿ حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مَا ﴾ زائد ہے، یعنی یہاں تک کہ جس وقت وہ آگ پر آئیں گے جس کی طرف ہانک لائے گئے اور اس کے حضور میں آجائیں گے، یا موقفِ حساب میں آجائیں گے تو ان پر ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے ان گناہوں کی گواہی دیں گے جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ اس گواہی کی کیفیت میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ پاک ان میں فہم اور قدرت اور بولنے کی طاقت پیدا کر دے گا تو وہ اس طرح سے گواہی دیں گے جس طرح آدمی اپنی جانی پہچانی شے پر گواہی دیتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان اعضاء میں آوازیں اور حروف پیدا کر دے گا جو ان معانی پر دال ہوں گے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ان اعضاء میں وہ احوال ظاہر ہوں گے جو انسان سے اعمال کے واقع ہونے پر دلالت کریں گے۔ ان علامات کا نام شہادتیں رکھا جائے گا جس طرح یوں بولتے ہیں کہ عالم اپنے احوال کے تغیر و تبدل کے وقوع پذیر ہونے پر گواہی دیتا ہے۔

امام کرخی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ زبان کو قوتِ گویائی دینے کی طرح ان کو بولنے کی طاقت دے گا تو وہ گواہی دیں گے۔ عقلاً ان کا بولنا زبان کے بولنے سے کچھ زیادہ عجیب و غریب نہیں ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ حیات اور علم و قدرت کے لیے بُنیہ (بنیاد) شرط نہیں ہے، اس لیے اللہ پاک ان اعضاء کے اجزاء میں سے ہر جزو میں عقل و قدرت اور بولنے کی صلاحیت پیدا کرنے پر قادر ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ ان کے اعضاء اس شے کے بارے میں بولیں گے جسے ان کی زبانوں نے چھپایا،[5] یعنی ان کا شرکیہ اعمال کرنا۔ اکثر مفسرین کے قول کے مطابق "جُلُود" سے مراد یہی معروف چمڑے ہیں، یعنی بدن کی کھال۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد صرف جوارح اور اعضاء ہیں تو اب جلود کا سمع و ابصار پر عطف، عطفِ عام بر خاص کے قبیل سے ہوگا۔

امام سدی، عبید اللہ بن ابی جعفر اور فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "جُلُود" سے مراد "فروج"[6] یعنی شرم گاہیں ہیں۔ یہ کنایات کے باب سے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا ﴾ [البقرة: ٢٣٤] "تم ان سے

---

[1] تفسیر الطبري (٢١/٤٥١) [2] المعجم الكبير (١١/٣٨٦) [3] رقم الآية (١٧)
[4] تفسیر الطبري (١٩/٥٠١) [5] تفسیر البغوي (٧/١٧٠) [6] تفسیر القرطبی (١٥/٣٥٠)

پوشیدہ وعدے نہ کرو۔'' ''سِرّ'' سے مراد نکاح ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ ﴾ [المائدۃ: ٦] ''یا تم میں سے کوئی حاجتِ ضروری سے فارغ ہو کر آیا ہو۔'' ''غائط'' سے مراد قضائے حاجت ہے۔ ''غائط'' پست زمین کو کہتے ہیں۔ چونکہ پست زمین میں پاخانہ پھرتے ہیں، اس لیے اس سے کنایہ کیا جس طرح کہ ہندی میں جنگل جانا، اس سے کنایہ ہے۔ حدیث شریف میں مروی ہے کہ انسان کے اعضاء میں سے پہلی شے جو بولے گی، وہ اس کی ران اور ہتھیلی ہے،[1] جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس تقدیر پر یہ آیت ارتکابِ زنا میں شدید قسم کی وعید ہوگی، کیوں کہ زنا کی طرف جو پیش رفت ہوتی ہے تو ران سے ہوتی ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

ان تین اعضاء کے ساتھ گواہی کو خاص کرنے کی وجہ، اگرچہ حواس پانچ ہیں، یعنی سمع و بصر وشم (سونگھنا) اور ذوق (چکھنا) اور لمس (چھونا) اور لمس کا آلہ جلد ہے، وہ ہے جو امام رازی نے ذکر فرمائی ہے کہ ذوق بعض وجوہ سے لمس میں داخل ہے، اس لیے کہ ذوق کا ادراک جو حاصل ہوتا ہے تو اس طرح کہ زبان کی جلد کھانے کی چیز کو چھو جاتی ہے۔ اسی طرح شم حاصل نہیں ہوتا جب تک ناک کی جلد سونگھے جانے والی چیز کو چھو نہ جائے تو ذوق اور شم حسِ لمس میں داخل ہو گئے۔[2] انتھی۔

اب جبکہ امام رازی رحمہ اللہ کے اس کلام سے تین اعضاء کو بالخصوص ذکر کرنے کی وجہ معلوم ہو گئی تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ''جُلُود''، یعنی چمڑوں کو خاص طور پر سوال کرنے کی وجہ بھی معلوم ہو گئی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ ﴾ اس لیے کہ جلود تین حواس پر مشتمل ہیں تو معصیت کا حصول جلود کی وساطت سے زیادہ ہوا اور جو اس کا قائل ہے کہ ''جُلُود'' سے مراد شرم گاہیں ہیں تو ان کو خاص طور پر سوال کرنے کی وجہ ظاہر ہے، اس لیے کہ جس زنا کی شہادت شرم گاہ دے گی تو وہ شہادت بہت زیادہ قبیح ہو گی اور ذلت اور سزا کو زیادہ اپنی طرف کھینچنے والی ہو گی۔

سمع کو واحد ذکر کرنے اور ابصار کو جمع ذکر کرنے کی وجہ پہلے بیان ہو چکی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ ﴾ میں ''جُلُود'' سے مراد عام (یعنی وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ)، یعنی اعضاء کے جلود ہیں تو جلود کو سوال کرنے میں کان اور آنکھ سے سوال کرنے کا ترک ہے، بلکہ وہ اس معنی کے لحاظ سے جو تم معلوم کر چکے ہو (یعنی ''جُلُود'' سے مراد مطلق جوارح ہیں) جلود میں داخل ہیں۔ غرضیکہ جب اعضاء اور جلود ان پر گواہی دیں گے تو ان سے سوال کریں گے: ﴿ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ﴾ یعنی تم نے ہم پر گواہی کیوں دی؟ یہ سوال ڈانٹ اور تعجب کا ہے۔ تعجب تو اس عجیب و غریب بات پر کیا کہ بولنے والوں میں سے نہیں ہیں، پھر بھی بولے اور ڈانٹ ڈپٹ اس لیے کی کہ دنیا میں وہ معاصی پر ان کے مدد و معاون تھے تو اب ان پر گواہی کیوں دی، اسی لیے ان کے گواہی دینے کو ایک عجیب بات سمجھا اور ان کو اس طرح

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] تفسیر الرازي (١٠١/٢٧)

سے خطاب کیا، جس طرح عقل والوں کو کرتے ہیں، کیوں کہ ان سے ایسا کام ہوا جو عقلاء سے ہوتا ہے، یعنی گواہی۔

غرضیکہ جلود نے عذر کے طور پر یہ جواب دیا کہ ہم کو تو اللہ نے بلوایا جس نے ہر شے کو قوتِ گویائی بخشی ہے۔ یعنی اس کی مخلوقات میں سے جو شے بولتی ہے، وہ اسی کی طاقت سے بولتی ہے۔ تو ہم نے تم پر ان برے اعمال کی گواہی دی جو تم نے کیے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے اختیار سے نہیں بولے، بلکہ ہم کو اللہ نے بلوایا۔ پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ یعنی اللہ کی قدرت سے ہمارا بولنا کوئی عجیب شے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اگر چاہے تو ہر حیوان کے بلوانے پر قادر ہے۔

﴿ وَهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ کلامِ جلود کے تتمہ سے ہے، یعنی جو ذات پاک تمھارے اول بار بنانے پر اور موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہے وہ جلود اور اعضاء کے بلوانے پر بھی قادر ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ ملائکہ کے کلام سے ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ مستانف ہے اللہ کے کلام سے، یعنی جو ذات پاک تمھیں پہلی بار پیدا کرنے پر قادر ہے وہی تمھارے دوبارہ پیدا کرنے اور اپنی طرف لوٹانے پر قادر ہے۔ اس قول کی بنا پر تو ﴿ تُرْجَعُوْنَ ﴾ بہ صیغۂ مضارع ظاہر ہے۔ اور اگر تتمۂ کلامِ جلود یا کلامِ ملائکہ سے ٹھہرایا جائے تو ظاہر یہ تھا کہ ''رَجَعْتُمْ'' ہوتا، کیوں کہ یہ بات چیت دوبارہ زندہ ہونے اور لوٹنے کے بعد کی ہے۔ اس وجہ پر شاید مضارع کا صیغہ اس لیے آیا ہے کہ رجوع سے مراد صرف بعث کے ساتھ حیات کی طرف لوٹنا نہیں ہے، بلکہ رجوع سے مراد وہ رجوع ہے جس میں حیات کی طرف اور اس عذابِ خالد کی طرف پھیرنا ہے جو اس پر مترتب ہوگا اور جس کا اس گفتگو کے وقت انتظار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جو رجوع متوقع ہے، اس کو اس رجوع کی طرح ٹھہرایا گیا جو واقع ہو گیا، یعنی مبعوث ہو کر زندہ ہونا۔ چنانچہ اس رجوع پر رجوعِ متوقع کو تغلیب دے کر مضارع کا صیغہ کہا۔

یہ تغلیب کلامِ عرب میں عموماً اور قرآن شریف میں بہت ہے اور بلاغت کی ایک نہایت عمدہ قسم ہے۔ اس جگہ ''رَجَعْتُمْ'' کی بہ نسبت ﴿ تُرْجَعُوْنَ ﴾ میں زیادہ خوبی ہے، کیوں کہ ''رَجَعْتُمْ'' سے صرف زندہ ہونا معلوم ہوا، چنانچہ وہ تو ظاہر ہی ہے کہ زندہ ہو گئے اور اعضاء کی گواہی ہو رہی ہے اور ﴿ تُرْجَعُوْنَ ﴾ میں یہ رجوع بھی ہے اور وہ رجوع بھی جو اس کے بعد عذابِ خالد کی طرف ہوگا جس کی ملامت و توبیخ اس سے معلوم ہوتی ہے وہ کہیں اس سے بڑھ کر ہے۔ اب کہو جو ادا اس میں ہے وہ ''رَجَعْتُمْ'' میں کہاں۔ اللهم أجرنا من النار و من موجبات النار بفضلك و رحمتك يا عزيز يا غفار و استرنا يا ستار وأعنا على ذكرك و شكرك آناء الليل و أطراف النهار، وصل وسلم و بارك عليه، وآله الأطهار و صحبه الأخيار، آمين.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ ﴾ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبیخ اور ملامت ہے یا تتمۂ کلامِ جلود سے ہے، یعنی برے کام اور بے حیائی کے کام کرتے ہوئے تم دیواروں اور پردوں کے ساتھ یہ عذر کر کے چھپتے نہیں تھے کہ اعضاء تم پر گواہی دیں گے، بلکہ تم تو

سرے سے دوبارہ جی اُٹھنے اور سزا و جزا ہی کے منکر تھے۔ اکثر علماء کا قول یہی ہے۔ چونکہ انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ معصیت کرتے وقت اپنے اعضاء سے چھپے، اس لیے یہاں پر استخفا اور استتار، یعنی چھپنے کے معنی ترکِ معصیت کے ہیں۔ یعنی اعضاء کی گواہی کے خوف سے دنیا میں تم ترکِ معصیت نہیں کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ استتار بہ معنی اتقاء ہے، یعنی تم دنیا میں تقویٰ اور خوف نہیں کرتے تھے، اس بات سے کہ تمھارے اعضاء آخرت میں تمھارے خلاف گواہی دیں گے، تا کہ تم معصیت کے کاموں کو اس گواہی کے ڈر سے چھوڑ دیتے۔

﴿ اَنْ يَّشْهَدَ ﴾ محلاً منصوب ہے بنا بر علت "أَيْ: لِأَجْلِ أَنْ تَشْهَدَ أَوْ مَخَافَةَ أَنْ تَشْهَدَ" یا بنا بر نزعِ خافض "أَيْ: بِأَنَّ أَوْ عَنْ أَنْ أَوْ مِنْ أَنْ تَشْهَدَ"۔ یا استتار میں ظن کے معنی شامل ہیں۔ تو ﴿ تَسْتَتِرُوْنَ ﴾ کا مفعول ہو گا، یعنی تم اس کا گمان نہ کرتے تھے کہ گواہی دیں گے۔ یہ قول بعید ہے۔ سیدنا معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم حشر کیے جاؤ گے اس جگہ اور اپنے دست مبارک سے ارضِ شام کی طرف اشارہ فرمایا، اس حال میں کہ تم پیادے ہو گے اور سوار اور اپنے منہ کے بل اور تم اللہ تعالیٰ پر پیش کیے جاؤ گے اور تمھارے منہ پر فدام ہوں گے (فدام بہ فتح و تشدید وہ شے ہے جو لوٹے کے منہ پر رکھی جاتی ہے، تا کہ اس میں جو شے ہے وہ اس سے صاف کی جائے)۔ اور سب سے پہلی شے جو کسی کے بارے میں اظہار کرے گی، وہ اس کی ران اور اس کی ہتھیلی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ ﴾[1]

(أخرجه عبد الرزاق و أحمد والنسائي و ابن أبي حاتم و الحاكم وصححه والبيهقي في البعث)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی تمھارے لوگوں سے ستر کرنے کے وقت، باوجود اس کے کہ تم اپنے اعضاء سے ستر نہ کر سکتے تھے، تم نے اس بات کا گمان کیا کہ اللہ تمھارے بہت سے ان معصیت کے کاموں کو نہیں جانتا جن کو تم کرتے ہو، چنانچہ تم نے ان کے کرنے پر جراٴت کی۔ کہا ہے کہ کفار کہتے تھے کہ اللہ اس شے کو نہیں جانتا جو ہمارے دلوں میں ہے، لیکن وہ جانتا ہے اس شے کو جسے ہم ظاہر کرتے ہیں نہ کہ اس شے کو جسے ہم چھپاتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اس جگہ ظن بہ معنی علم ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ظن سے مجازی معنی مراد ہیں جو اس کے حقیقی معنی کو شامل ہیں اور اس کو جو اس سے اوپر ہے، یعنی علم۔

﴿ وَذٰلِكُمْ ﴾ مبتداء ہے ﴿ ظَنُّكُمُ ﴾ اس سے بدل ہے۔ ﴿ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ ﴾ صفت ہے۔ ﴿ اَرْدٰىكُمْ ﴾ خبر ہے، یعنی یہ تمھارا ظن جو مذکور ہوا، گمان کرنا تمھارا جس کا تم نے اپنے رب کے ساتھ گمان کیا،

---

[1] مصنف عبدالرزاق (۱۳۰/۱۱) مسند أحمد (۳/۵) سنن النسائي الكبرىٰ (۴۳۹/۶) تفسير ابن أبي حاتم (۳۲۷۰/۱۰، ۳۲۷۱) مستدرك الحاكم (۴۷۸/۲)

[2] تفسير الطبري (۱۸۱/۲۱)

اس نے تم کو ہلاک کیا اور تم کو نار میں پھینک دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ظَنُّكُمْ ﴾ خبر ہے اور موصول بدل یا بیان اور ﴿ اَرْدٰىكُمْ ﴾ حال اور "قد" مقدر یا غیر مقدر۔ "أَيْ: ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمْ مُرْدِيًا إِيَّاكُمْ" یعنی یہ تمھارا گمان ہے جو تم نے اپنے رب کے ساتھ رکھا، درآنحالیکہ وہ تمھیں ہلاک کرنے والا ہے، چنانچہ تم ان لوگوں میں سے ہوگئے جو کامل خسارے اور نقصان میں ہیں۔

محققین نے کہا ہے کہ ظن دو قسم کا ہے: ایک تو حسن ہے اور دوسرا قبیح۔ حسنِ ظن تو یہ ہے کہ اللہ عزوجل کے ساتھ رحمت و فضل اور احسان کا گمان رکھے، چنانچہ حدیث: «أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ»[1] گزر چکی ہے اور ظنِ قبیح یہ ہے کہ یہ گمان رکھے کہ اللہ کے علم سے بعض افعال غائب ہوتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظن دو قسم کا ہے: ہلاک کرنے والا اور نجات دینے والا۔ نجات دینے والا تو یہ قول ہے: ﴿ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴾ [الحاقة: ٢٠] "مجھے تو کامل یقین تھا کہ مجھے اپنا حساب ملنا ہے۔" نیز یہ قول: ﴿ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ ﴾ [البقرة: ٤٦] "جو جانتے ہیں کہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں۔" اور ہلاک کرنے والا قول یہ ہے: ﴿ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾[2]

پھر اللہ پاک نے ان کے حال کی خبر دی، ارشاد فرمایا: ﴿ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴾ یعنی پس اگر وہ آگ پر صبر کریں تو آگ ان کے قرار پانے اور قیام کی جگہ ہے، ان کی اس سے خلاصی نہیں ہے اور نہ وہ اس سے نکل سکیں گے۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ بات تو معلوم ہے کہ ان کو اس سے خلاصی نہیں ہے، پھر اس قید کی کیا وجہ ہے کہ اگر وہ صبر کریں؟ تو کہیں گے کہ یہاں اضمار ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَإِنْ يَصْبِرُوْا أَوْ لَا يَصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ عَلٰى كُلِّ حَالٍ" یعنی پھر اگر وہ صبر کریں یا نہ کریں بہرحال نار اُن کا ٹھکانا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: "فَإِنْ يَّصْبِرُوْا لَمْ يَنْفَعْهُمُ الصَّبْرُ وَلَمْ يَنْفَكُّوْا بِهِ مِنَ الثَّوَاءِ فِي النَّارِ" یعنی پھر اگر وہ صبر کریں تو صبر کرنا ان کو فائدہ نہ دے گا اور وہ صبر کے سبب سے نار میں رہنے سے خلاصی نہ پائیں گے۔[3] انتھیٰ۔

کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں: پھر اگر وہ صبر کریں اور اہلِ نار کے اعمال پر جمے رہیں تو ان کے لیے ٹھکانا آگ ہے۔ محاورۂ عرب میں بولتے ہیں: "أَعْتَبَنِيْ فُلَانٌ أَيْ: أَرْضَانِيْ بَعْدَ إِسْخَاطِهِ إِيَّايَ" یعنی اس نے مجھ کو خفا کرنے کے بعد راضی کیا اور "اِسْتَعْتَبْتُ فُلَانًا" کے معنی ہیں: "طَلَبْتُ مِنْهُ أَنْ يَرْضٰى" یعنی فلاں سے میں نے یہ بات طلب کی کہ وہ راضی ہو جائے۔ معنی یہ ہیں کہ اگر وہ یہ سوال کریں کہ وہ اس شے کی طرف لوٹائے جائیں گے جس کو وہ دوست رکھتے تھے، وہ رجوع نہ کیے جائیں گے، کیوں کہ وہ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ امام خلیل رحمہ اللہ کہتے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٥)

[2] تفسير الرازي (١٠١/٢٧، ١٠٢) [3] تفسير النسفي (٨٨/٤)

ہیں: ''اِسۡتَعۡتَبۡتُهُ فَأَعۡتَبَنِيۡ'' کے معنی ہیں: ''اِسۡتَرۡضَیۡتُهُ فَأَرۡضَانِيۡ''[1] یعنی میں نے اس سے رضا طلب کی تو اس نے مجھے راضی کیا۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ رضا طلب کریں تو رضا انھیں مل نہ سکے گی، کیوں کہ ان کو تو ضرور ہی نار میں جانا ہے۔ جمہور نے ﴿ يَسۡتَعۡتِبُوۡا ﴾ بہ صیغۂ معروف اور ﴿ مِّنَ الۡمُعۡتَبِيۡنَ ﴾ بہ صیغۂ اسم مفعول پڑھا ہے اور امام حسن، عبید بن عمیر اور ابو العالیہ رحمہ اللہ نے پہلے کو بہ صیغۂ مجہول اور دوسرے کو بہ صیغۂ اسم فاعل پڑھا ہے۔[2] یعنی اگر اللہ پاک ان سے درگزر فرمائے اور ان کو دنیا کی طرف پھیر دے تو وہ اللہ کی اطاعت کے عمل نہ کریں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَلَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُهُوۡا عَنۡهُ ﴾ [الأنعام: ٢٨] ''اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھیج دیے جائیں، تب بھی یہ وہی کام کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا۔''

تقییض کی اصل تیسیر وتہییہ ہے، یعنی ہم نے کفارِ قریش وغیرہم کے لیے شیاطین سے قرناء میسر و مہیا کر دیے، ان کے دوستوں کی طرح۔ ﴿ قُرَنَآءَ ﴾ ''قرین'' کی جمع ہے۔ ''قرین'' نظیر کے معنی میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَمَنۡ يَّعۡشُ عَنۡ ذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ نُقَيِّضۡ لَهٗ شَيۡطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيۡنٌ ﴾ [الزخرف: ٣٦] ''اور جو شخص رحمان کی یاد سے غفلت کرے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں، وہی اس کا ساتھی رہتا ہے۔'' امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ''سَبَّبۡنَا لَهُمۡ قُرَنَاءَ حَتّٰى أَضَلُّوۡهُمۡ''۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ''سَلَّطۡنَا عَلَيۡهِمۡ''۔ کسی نے کہا ہے کہ ''قَدَّرۡنَا''۔

یہ سب معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ یعنی وہ قرین ان کے ساتھ لگے رہتے ہیں اور ان پر غالب اور مستولی ہوتے ہیں، مثل استیلائے قیض کے بیض پر۔ قیض انڈے کے اوپر کے چھلکے کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آگ میں قرین مقرر کیے، لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ ﴿ قُرَنَآءَ ﴾ کا مسلط کرنا دنیا میں ہے، اس لیے کہ ﴿ قُرَنَآءَ ﴾ کی صفت یہ بیان کی ہے: ﴿ فَزَيَّنُوۡا لَهُمۡ مَّا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ﴾۔ معنی یہ ہیں: پس اچھی کر دکھائی قرناء نے کفار کو وہ شے جو ان کے آگے ہے، یعنی امورِ دنیا اور اس کی خواہشیں اور ان کو اللہ کے معاصی میں پڑنے پر اس طرح سے آمادہ کیا کہ ان میں خوب منہمک ہو جائیں اور زینت دی اس شے کو جو اُن کے پیچھے ہے، یعنی امورِ آخرت تو اس طرح کہہ دیا کہ نہ تو دوبارہ جی اُٹھنا ہے، نہ حساب کتاب ہے، نہ جنت ہے اور نہ دوزخ ہے۔ امام زجاج نے کہا: ﴿ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ ﴾ وہ عمل ہے جس کو کر چکے اور ﴿ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ﴾ وہ ہے جس کے کرنے کا عزم کیا ہے۔ یہ بھی امام زجاج رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ﴿ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ ﴾ امرِ آخرت ہے اور ﴿ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ﴾ امرِ دنیا ہے،[4] اس طرح سے کہ دنیا قدیم ہے اور کوئی صانع نہیں ہے مگر طبائع اور افلاک۔

[1] تفسیر القرطبي (١٥/٣٥٤) [2] فتح القدیر (٤/٦٧٢)
[3] فتح القدیر (٤/٦٧٣) [4] معاني القرآن (٤/٣٨٤) فتح القدیر (٤/٦٧٣)

﴿ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ﴾ کلمہ ﴿ فِيْٓ ﴾ حال ہے ﴿ عَلَيْهِمُ ﴾ کی ضمیر سے۔ "أَيْ: كَائِنِيْنَ فِيْ جُمْلَةِ أُمَمٍ"۔ کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ فِيْٓ ﴾ بہ معنی مع ہے "أَيْ: مَعَ أُمَمٍ مِنَ الْأُمَمِ الْكَافِرَةِ"۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ایک کلمے کو دوسرے کلمے سے بدلیں باوجود اس کے کہ اس کو اپنے معنی پر باقی رکھنا ممکن ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ان پر عذاب واجب اور ثابت ہوا اور اس کا مقتضا متحقق ہوا۔ وہ آیت یہ ہے: ﴿ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [صٓ: ۸۵] "کہ تجھ سے اور تیرے تمام ماننے والوں سے میں (بھی) جہنم کو بھر دوں گا۔" اس حال میں کہ وہ ان امتوں میں شامل ہونے والے ہیں جو جنوں اور انسانوں میں سے کفر کی حالت پر گزر چکی ہیں۔

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴾ ان کے عذاب کے مستحق ہونے کی وجہ ہے۔ (كما قاله الكرخي) یعنی ان پر دیگر کافر اُمتوں کے ساتھ عذاب واجب ہوا، اس لیے کہ وہ اس عذاب کے مستحق تھے۔ بالجملہ جب اللہ پاک نے سورت کے شروع میں اپنی کتابِ عزیز کو اوصافِ جلیلہ کے ساتھ موصوف کیا، پھر یہ خبر دی کہ ان کے اکثر لوگوں نے اس سے اعراض کیا اور اس کو قبول کرنے اور سوچنے سے منہ موڑا تو اس قول میں ان کے اعراض کا طریقہ بیان کیا: ﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴾ [حم السجدة: ٥] اور اپنے رسول ﷺ کو حکم فرمایا کہ ان کو جواب دیں تو آپ ﷺ نے کئی وجہ سے جواب دیا اور یہاں تک کلام باہم متصل چلا آیا۔ پھر اب ایک اور طریقہ اعراض کا ان سے نقل کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝۲۶ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۲۷ ذٰلِكَ جَزَاۗءُ اَعْدَاۗءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ۭ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۲۸ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝۲۹

اور کافروں نے (ایک دوسرے سے) کہا: تم اس قرآن کو مت سنو، اور (جب پڑھا جائے تو) شور وغل کرو، تاکہ تم غالب آجاؤ⑳ چناں چہ جن لوگوں نے کفر کیا، ہم انھیں ضرور سخت عذاب

[1] فتح البيان (۱۲/۲۳۹_۲۴۵)

(کا مزہ) چکھائیں گے اور جو بدترین عمل وہ کرتے رہے ہیں، ہم انھیں ان کا بدلہ ضرور دیں گے 27 یہ آگ ہی اللہ کے دشمنوں کی سزا ہے، ان کے لیے اسی میں ہمیشہ رہنے کا گھر ہے۔ یہ سزا ہے اس (جرم) کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے 28 اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں جنّوں اور انسانوں میں سے وہ دونوں (فریق) دکھا جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، ہم انھیں اپنے پاؤں تلے کریں، تاکہ وہ انتہائی پست لوگوں میں سے ہوں 29

کفار کی ایک دوسرے کو قرآن نہ سننے کی نصیحت:

بے ہودہ گوئی کرنا یہ جاہلوں کا زور سے شور مچا کر سننے نہ دینا ہے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ انھوں نے آپس میں یہ اتفاق کیا کہ نہ قرآن کے مطیع ہوں اور نہ اس کے احکام کی فرماں برداری کریں۔ ﴿ وَالْغَوْا فِيْهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت قرآن پڑھا جائے تو اس کے سننے کی طرف کان مت دھرو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اس میں لغو بکواس کرو، چیخو، چلاؤ، سیٹی بجاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن پڑھیں تو ان کے بولنے کے ساتھ خلط ملط کرو۔ قریش ایسا کیا کرتے تھے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: "عَيِّبُوْهُ"، یعنی اس کا عیب بیان کرو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا جحد و انکار کرو اور اس سے دشمنی کرو۔[1] ﴿ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴾ شاید تم غالب ہو جاؤ۔ یہ کفار میں سے ان جاہلوں کا حال ہے اور اس کا جو قرآن سننے کے وقت اُن کی چال چلا۔ اللہ پاک نے اپنے مومن بندوں کو اس کے برخلاف حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٠٤] "اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو امید ہے کہ تم پر رحمت ہو۔"

پھر اللہ عزوجل نے قرآن کے لیے ان کافروں سے بدلہ لیا جنھوں نے اس کے ساتھ دشمنی رکھی۔ ان کے حق میں یوں فرمایا: البتہ ہم سخت عذاب چکھائیں گے ان لوگوں کو جو کافر ہوئے، یعنی اس شے کے مقابلے میں جس کا انھوں نے قرآن کے سنتے وقت اعتماد کیا اور البتہ ہم ان کو اس عمل کا، یعنی ان کے بدترین اعمال اور افعال کا برے سے برا بدلہ دیں گے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ﴿ اَضَلّٰنَا ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے، فرمایا کہ ابلیس ہے اور آدم علیہ السلام کا وہ بیٹا ہے جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا۔ اسی طرح امام عوفی رحمہ اللہ نے بھی ان سے اسی کے مثل روایت کیا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ کی ان سے روایت کے الفاظ یہ ہیں: "ہر مشرک ابلیس کو بلوائے گا

[1] تفسیر الطبري (٤٦٠/٢١) تفسیر ابن کثیر (١٢٣/٤)

اور اسے حاضر کرنے کا کہے گا، جب کہ ہر صاحبِ کبیرہ (بڑے گناہوں والا) ابن آدم کو طلب کرے گا۔ ہر شر، خواہ وہ شرک ہو یا اس سے کم تر کوئی اور گناہ، اس کی طرف دعوت دینے والا ابلیس ہے۔"[1] جیسا کہ حدیث شریف میں ثابت ہوا ہے کہ کوئی نفس از راہِ ظلم قتل نہیں کیا گیا مگر ابن آدم اول پر اس کے خون کا ایک حصہ ہوگا، کیوں کہ پہلے پہل قتل کا طریقہ اسی نے نکالا ہے۔[2]

ان کا یہ کہنا: ﴿ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا ﴾ یعنی ہم کریں ان کو عذاب میں اپنے سے نیچے، تاکہ وہ ہم سے زیادہ سخت عذاب میں ہوں اور اسی لیے یوں کہا: ﴿ لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴾ یعنی آگ کے سب سے نچلے درجے میں جیسا کہ اعراف میں گزر چکا ہے، جہاں پر اتباع نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ ان کے سرداروں پر ان کے عذاب سے کئی گنا بڑھا کر عذاب کرے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٣٨] ''سب ہی کا دُگنا ہے لیکن تم کو خبر نہیں ہے۔'' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک کو وہ سزا اور عذاب دیا ہے جس کا وہ مستحق ہے اپنے عمل اور فساد کرنے کے مطابق۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴾ [النحل: ٨٨] ''جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا ہم انھیں عذاب پر عذاب بڑھاتے جائیں گے، یہ بدلہ ہوا ان کی فتنہ پردازیوں کا۔''[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ بعض کفار نے بعض سے کہا کہ اس قرآن کو مت سنو اور اس کے سننے کے لیے خاموش مت رہو۔ کسی نے کہا کہ ﴿ لَا تَسْمَعُوْا ﴾ کے معنی: "لَا تُطِيْعُوْا" ہیں، یعنی اس کے مطیع نہ بنو۔ سند اس کی یہ محاورہ ہے کہ "سَمِعْتُ لَكَ" یعنی "أَطَعْتُكَ"۔ ﴿ وَالْغَوْا فِيْهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ لغو اور باطل کے ساتھ اس کا مقابلہ کرو، یا اپنی آوازوں کو بلند کرو، تاکہ اس کا پڑھنے والا پریشان خاطر ہو جائے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''قرآن کی تلاوت کے وقت سیٹیاں اور تالیاں بجا کر شور مچا دو اور کلام کو خلط ملط کر کے اسے لغو بنا دو۔'' امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہت باتیں کرو، تاکہ اس پر وہ بات خلط ملط ہو جائے جو وہ کہتا ہے۔ امام ابوالعالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ "قِعُوْا فِيْهِ وَعَيِّبُوْهُ"[4] یعنی اس کی برائی کرو اور اس کا عیب بیان کرو۔

جمہور نے ﴿ وَالْغَوْا ﴾ بہ فتحِ غین پڑھا ہے۔ اس محاورے سے "لَغِيَ كَسْرِ غَيْنٍ يَلْغَى إِذَا تَكَلَّمَ بِاللَّغْوِ"۔ لغو وہ شے ہے جس میں کچھ فائدہ نہ ہو، یا اس محاورے سے کہ "لَغَى بِكَذَا إِذَا رَمَى بِهِ"۔ اب "في" بہ معنی "باء" ہوگا "أَيْ: اِرْمُوْا بِهِ وَانْبِذُوْهُ" یعنی پھینک دو اس کو۔ یا ماخوذ ہے: "لَغَا يَلْغَى" بہ فتحِ غین ماضی ومضارع،

[1] تفسیر الطبري (٤٦٣،٤٦٢/٢١) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣١٥٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٧٧)
[3] تفسیر ابن کثیر (١٢٣/٤) [4] تفسیر القرطبي (٣٥٦/١٥)

جیسا کہ امام اخفش رحمہ اللہ نے حکایت کیا۔ قیاس اس کا ضمہ تھا مثل "غَزَا یَغْزُوْ" کے، لیکن حرفِ حلق کی وجہ سے فتح دیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی امام عیسی بن عمرو جحدری، ابن ابی اسحاق، ابو حیوہ، بکر بن حبیب سہمی، سماک اور زعفرانی رحمہم اللہ) نے بہ ضم غین پڑھا ہے ماخوذ "لغا" بہ فتح "یَلْغُوْ" سے، "دَعَا یَدْعُوْ" کی طرح۔[1] حدیث شریف میں "فَقَدْ لَغَوْتَ" آیا ہے[2] اور یہ غیر جمہور کی قراءت کے مطابق ہے۔ سورۃ البقرہ میں لغو پر کلام گزر چکا ہے۔[3] غرض کہ قرآن پڑھنے کے وقت تم شور مچاؤ۔

﴿ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴾ "أَيْ: لِكَيْ تَغْلِبُوْا فَيَسْكُتُوْا" یعنی تا کہ تم غالب ہو جاؤ اور قرآن پڑھنے والے چپ ہو رہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت قرآن پڑھتے تو اپنی آواز بلند فرماتے اور مشرکین لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے بھگاتے اور کہتے کہ اس قرآن کے سننے کو کان نہ دھرو اور اس کے پڑھنے میں بک بک کرو، شاید تم غالب ہو اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی آواز کو آہستہ کرتے تو صرف اس شخص کو سناتے جو قرآن سننے کو پسند کرتا، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا ﴾ [بني إسرائيل: ١١٠] "نہ تو تو اپنی نماز بہت بلند آواز سے پڑھ اور نہ بالکل پوشیدہ۔"[4] (أخرجه ابن أبي حاتم)

پھر اللہ پاک نے اس پر ان کو یہ وعید سنائی: ﴿ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی ہم کفار کو سخت عذاب چکھائیں گے اور البتہ جزا دیں گے ہم ان کو آخرت میں ان کے ان اعمال کی بہت برے بدلے کی صورت میں جو انھوں نے دنیا میں کیے۔ یہ وعید سارے کافروں کو ہے اور جن کے حق میں نازل ہوئی وہ تو بدرجۂ اولیٰ اس میں داخل ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدترین اعمال سے مراد شرک ہے۔[5] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کو اُن کے برے اعمال کی جزا دے گا نہ کہ ان کے نیک اعمال کی جزا جس طرح کہ ان سے یہ نیک کام واقع ہوتے تھے کہ صلہ رحمی کرتے تھے اور مہمان کی عزت و تکریم کرتے تھے، کیوں کہ یہ اعمال تو ان کے کفر کی وجہ سے باطل ہو گئے ان کا کچھ اجر نہ رہا۔

اس میں اس شخص کے لیے اشارہ ہے جو اللہ پاک کا کلامِ مجید پڑھتے وقت خضوع و خشوع، غور و فکر اور تدبر نہیں کرتا۔ فروتنی کر کے اس کو سمجھتا اور سوچتا نہیں، اس کی طرف دھیان نہیں کرتا۔ اور ڈراوا اور وعید ہے اس شخص کے لیے جس سے اس کے سننے کے وقت وہ بات صادر ہو جاتی ہے جو قراءت کرنے والے پر اس کی قراءت کو مشوش اور

[1] تفسير القرطبي (٣٥٦/١٥) فتح القدير (٦٧٣/٤، ٦٧٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥١) [3] رقم الآية (٢٢٥)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٢٧٢/١٠) المعجم الأوسط (١٥/٢) اس کی سند میں "داود بن حصین عن عکرمہ" ضعیف راوی ہے۔

[5] فتح القدير (٦٧٤/٤)

خلط ملط کر دیتی ہے۔ اب ذرا قرآن شریف کی عظمت و بزرگی پر نظر کرو اور اس درشتی اور سختی میں غور فرماؤ اور جو شخص اس کی تعظیم و تکریم کرتا ہے اور اس کی قدر کا اجلال و اکرام فرماتا ہے اور دل کو حاضر کر کے اپنے کان اس کے سننے کی طرف ڈال دیتا ہے، اس کے لیے اجرِ کبیر اور بہت بڑی کامیابی کی گواہی دو۔

﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ ﴾ خبر ہے۔ یا ﴿ ذٰلِكَ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ "أَيْ: اَلْاَمْرُ ذٰلِكَ" یعنی بات یہ ہے اور جملہ ﴿ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ ﴾ جملہ ماقبل کا مبین ہے۔ قولِ اول زیادہ مناسب ہے اور ﴿ اَلنَّارُ ﴾ عطفِ بیان ہے ﴿ جَزَآءُ ﴾ کا، یا اس سے بدل ہے، یا خبر ہے مبتدائے محذوف کی، یا خود مبتداء ہے اور ﴿ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ﴾ خبر ہے۔ اور اول کی تین وجہ پر جملۂ ﴿ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ﴾ مستانفہ مقرر ماقبل ہوگا۔ معنی یہ ہیں کہ یہ عذابِ شدید اور بدترین جزا اللہ کے دشمنوں کی جزا ہے۔ وہ جزا آگ ہے جس میں ان کے لیے ہمیشہ قیام کے لیے گھر ہے، جس میں رہایش میں نہ کوئی وقفہ ہے اور نہ اس سے کسی اور طرف منتقل ہونا ہے۔

﴿ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴾ "أَيْ: يُجْزَوْنَ جَزَاءً" یعنی اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے کے سبب سے پوری پوری جزا دیے جائیں گے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی وہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ قرآن اللہ کے پاس سے ہے،[1] اس بنا پر لغو کی تعبیر جحود کے ساتھ اس لیے ہوگی کہ جحود لغو کا سبب ہے تو سبب کو مسبب کی جگہ قائم کیا اور "يَلْغُوْنَ" کے بجائے ﴿ يَجْحَدُوْنَ ﴾ فرمایا۔

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ﴾ کافر لوگ یہ بات جہنم میں کہیں گے۔ اس کو ماضی کے لفظ سے اس لیے ذکر فرمایا کہ اس کے حقیقی طور پر واقع ہونے سے آگاہ کرنا منظور ہے۔ مراد یہ ہے کہ کفار اللہ پاک سے اس بات کا مطالبہ کریں گے کہ جنوں اور انسانوں کے دو فریقوں میں سے ان کو وہ شخص دکھا دے جس نے ان کو گمراہ کیا، یعنی وہ سردار اور پیشوا جنھوں نے ان کو کفر اچھا کر دکھایا اور شیطانوں میں سے وہ شیطان جو اُن پر حاوی ہوئے اور ان کو معاصی پر آمادہ کیا۔ اس لیے کہ شیطان دو قسم کے ہیں: جنی و انسی۔

اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴾ [الناس: ٥۔ ٦] "جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے (خواہ) وہ جنّ میں سے ہو یا انسان میں سے۔" نیز فرمایا ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ ﴾ [الأنعام: ١١٢] "اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیاطین پیدا کیے تھے کچھ آدمی اور کچھ جنّ۔" کسی نے کہا کہ مراد ابلیس اور قابیل ہیں، کیوں کہ انہیں دونوں نے بنی آدم کے لیے معصیت کی راہ ڈالی۔ جمہور نے ﴿ اَرِنَا ﴾ بہ کسرِ راء پڑھا ہے اور امام ابن محیصن رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی سوسی عن أبي عمرو وابن عامر وبها قرأ أبو بكر والمفضل) نے بہ سکونِ راء پڑھا ہے، یہ دونوں دو لغت ہیں۔

[1] فتح القدير (٦٧٤/٤)

ایک معنی میں امام خلیل رحمہ اللہ نے فرق کیا ہے، کہا: جب تم یوں بولو: "أَرِنِي ثَوْبَكَ" بالکسر تو اس کے معنی ہیں "بَصِّرْنِيهِ" یعنی تو مجھے اپنا کپڑا دکھا اور بہ سکونِ راء کے معنی ہیں: "أَعْطِنِيهِ"[1] یعنی تو مجھے وہ کپڑا دے دے۔

﴿ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ہم ان کو آگ میں اپنے قدموں سے روندیں، تاکہ ہم ان سے اپنے دل کی آگ بجھائیں اور تاکہ وہ ہمارے اور آگ کے درمیان وقایہ بن جائیں، یعنی آڑ یا حفاظت بن جائیں تو اس کی حرارت ہم سے ایک طرح سے ہلکی ہو اور تاکہ وہ از روئے مقام کے آگ میں اسفلین میں سے ہو جائیں، یا وہ ذلیل و خوار لوگوں میں سے ہو جائیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تاکہ وہ درکِ اسفل میں ہو جائیں[2] اور اُن لوگوں سے جو ہم سے کم تر ہیں۔ پھر جب اللہ سبحانہ کافروں کے برے عذاب کا ذکر کر چکا اور اس شے کا جو اُن کے لیے تیار کر رکھی ہے تو مومنین کے حسنِ حال کا اور ان نعمتوں کا ذکر کیا جن کا ان پر انعام کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:[3]

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝۳۱ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝۳۲

بلاشبہ جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اُترتے ہیں: نہ تم ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور جنت سے خوش ہو جاؤ، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا (30) ہم دنیاوی زندگی میں بھی تمھارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (رفیق ہیں) اور اس میں تمھارے لیے وہ (سب کچھ) ہے جو تمھارے جی چاہیں گے اور اس میں تمھارے لیے وہ (سب کچھ) ہے جو تم مانگو گے (31) (یہ) بڑے بخشن ہار، نہایت رحم کرنے والے کی طرف سے مہمان نوازی ہوگی (32)

توحیدِ الٰہی پر استقامت اختیار کرنے والوں کے لیے خوش خبری:

فرشتے حشر کے دن اُترتے ہیں جس دن ہر کسی کو اپنا فکر اور غم ہوگا یا مرنے کے وقت اترتے ہیں اور یہ کہتے ہیں جس کا ان آیات میں ذکر ہے۔ انتھٰی.

(1) تفسير القرطبي (١٥/٣٥٧) فتح القدير (٤/٦٧٤) (2) معاني القرآن (٤/٣٨٥) (3) فتح البيان (١٢/٢٤٥-٢٤٧)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بے شک وہ لوگ جنھوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر استقامت کی، یعنی عمل کو اللہ کے لیے خالص کیا اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ وہ عمل کیا جو اللہ نے ان کے لیے مشروع کیا ہے۔ استقامت کی اہمیت وفضیلت پر کچھ احادیث وآثار درج ذیل ہیں:

1 حافظ ابو یعلیٰ موصلی رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم پر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ﴾ کچھ لوگوں نے یہ کہا، پھر اکثر ان میں کافر ہو گئے۔ چنانچہ جو کوئی اس کو کہے یہاں تک کہ مر جائے تو یقیناً وہ اس پر ٹھہرا رہا۔[1] (هكذا رواه النسائي في تفسيره والبزار وابن جرير عن عمرو بن علي الفلاس عن مسلم بن قتيبة)

2 اسی طرح امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود سعید بن عمران سے روایت کیا ہے۔ کہا: میں نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس یہ آیت پڑھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا۔[2]

3 پھر اسود بن ہلال رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم اس آیت کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ تو لوگوں نے کہا کہ انھوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر گناہ سے مستقیم رہے۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "لَقَدْ حَمَلْتُمُوْهَا عَلَى غَيْرِ الْمَحْمَلِ"، یعنی تم نے اس کو اس کے محمل کے سوا کسی اور محمل پر لادا، یعنی اس سے جو مراد ہے وہ تم نے نہیں لی۔ پھر انھوں نے فرمایا کہ ان لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے اور اس کے سوا کسی اور معبود کی طرف توجہ نہ کی۔ امام مجاہد، عکرمہ، سدی اور کئی ایک اہلِ علم رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[3]

4 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب میں کون سی آیت سب سے زیادہ رخیص ہے، یعنی رخصت دینے والی؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ﴾ عَلَى شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه"، یعنی جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس بات کی گواہی دینے پر استقامت کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔[4]

5 امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی پھر فرمایا: "اِسْتَقَامُوْا وَاللّٰهِ لِلّٰهِ بِطَاعَتِهِ وَلَمْ يَرُوْغُوْا رَوَغَانَ الثَّعَالِبِ"،[5] یعنی واللہ! وہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ مستقیم رہے، یعنی ڈٹے رہے اور لومڑیوں

---

[1] مسند أبي يعلىٰ (٦/٢١٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٥٢) اس کی سند میں "سہیل بن ابی حزم" ضعیف راوی ہے۔ مسند البزار (٢/٣١٨) تفسير الطبري (٢١/٤٦٣، ٤٦٤)

[2] تفسير الطبري (٢١/٤٦٤) [3] تفسير الطبري (٢١/٤٦٤، ٤٦٥) [4] تفسير ابن كثير (٤/١٢٤) [5] تفسير الطبري (٢١/٤٦٥)

کے دوڑنے کی طرح دوڑ نہیں گئے۔ مطلب یہ ہے کہ خاص اللہ کے لیے اس کی اطاعت کی اور روباہ بازی نہ کی ایک طریقے پر جمے رہے، اس طرح نہیں کہ جس طرح لومڑی کبھی کسی سوراخ میں گھستی ہے کبھی کسی میں۔ اس کی عادت ہے کہ وہ کئی سوراخ رکھتی ہے، اس لیے اس کا پکڑنا دشوار ہوتا ہے۔

6 سیدنا علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ان الفاظ میں روایت کیا ہے، کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس کے فرائض ادا کرنے پر استقامت کی۔

7 اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا۔ کہا: اور حسن یوں کہتے تھے: "اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبُّنَا فَارْزُقْنَا الْاِسْتِقَامَةَ"[1] یعنی اے اللہ! تو ہمارا رب ہے، لہٰذا تو ہم کو استقامت عطا فرما۔ آمین!

8 امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ثُمَّ اسْتَقٰمُوْا﴾ "أَخْلَصُوْا لَهُ الدِّيْنَ وَالْعَمَلَ"[2] یعنی پھر اللہ کے لیے دین وعمل خالص کیا۔

9 امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا سفیان ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے اسلام کی کسی ایسی بات کا امر فرمائیں کہ میں اس کے بارے میں آپ کے بعد کسی اور سے نہ پوچھوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ، ثُمَّ اسْتَقِمْ» یعنی تو کہہ کہ میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر جما رہ۔ پھر اس نے پوچھا: میں کس شے سے بچوں؟ تو آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ فرمایا، یعنی زبان کے شر سے بچنا۔[3] (ورواه النسائي من حديث شعبة عن يعلى بن عطاء به)

10 پھر امام احمد رحمہ اللہ نے سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عرض کی: اللہ کے رسول! "حَدِّثْنِيْ بِأَمْرٍ أَعْتَصِمُ بِهِ" یعنی آپ مجھ سے ایک ایسی بات بیان فرمائیں کہ میں اس کو خوب مضبوط پکڑ لوں۔ فرمایا: «قُلْ رَبِّيَ اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقِمْ» میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! وہ کون سی چیز ہے جس کا آپ کو میرے بارے میں زیادہ خوف ہے؟ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک کی نوک پکڑی، پھر فرمایا: «هٰذَا» یعنی مجھ کو اس کا زیادہ خوف ہے۔[4] (وهكذا رواه الترمذي و ابن ماجه من حديث الزهري به وقال الترمذي: حسن صحيح وقد أخرجه مسلم في صحيحه والنسائي من حديث هشام بن عروة عن أبيه عن سفيان بن عبد الله الثقفي قال: قلت: يا رسول الله قل لي في الإسلام قولا لا أسئل عنه أحدا بعدك، قال: «قل آمنت بالله، ثم استقم»[5] وذكر تمام الحديث)

---

[1] تفسير الطبري (٤٦٥/٢١) [2] تفسير ابن كثير (١٢٤/٤)

[3] مسند أحمد (٣٨٤/٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٥٨/٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٣٩٥)

[4] مسند أحمد (٤١٣/٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤١٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٧٢) صحيح الترغيب والترهيب (٥٦/٣)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٥٨/٦)

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ امام مجاہد، سدی، زید بن اسلم اور فرزندِ زید رحمہم اللہ نے کہا: یعنی ان پر موت کے وقت فرشتے یہ کہتے ہوئے اترتے ہیں: ﴿ اَلَّا تَخَافُوْا ﴾۔ امام مجاہد، عکرمہ اور زید بن اسلم رحمہم اللہ نے کہا: یعنی مت ڈرو اس امرِ آخرت سے جس پر تم جا رہے ہو۔ ﴿ وَلَا تَحْزَنُوْا ﴾ اور امرِ دنیا پر رنج مت کرو جس کو پیچھے چھوڑ آئے، اولاد اور بیوی اور مال یا قرض، بے شک اس میں ہم تمھارے خلیفہ ہوں گے۔[1] ﴿ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ اور خوش خبری سنو اس بہشت کی جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا تھا، چنانچہ ان کو برائی کے جانے کی اور بھلائی کے حاصل ہونے کی خوش خبری سناتے ہیں۔ یہ ویسی بات ہے جو سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آئی ہے کہ کہا کہ فرشتے مومن کی روح سے کہتے ہیں: نکل تو اے پاک روح پاک جسم سے جس کو تو آباد رکھتی تھی، تو روح و ریحان کی طرف اور ربِ غضبان کی طرف نکل،[2] یعنی راحت و رزق یا خوشبو کی طرف اور پروردگار کی طرف جو خفا نہیں ہے۔ کسی نے کہا: ان پر فرشتے اترتے ہیں جس دن وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے۔ اس قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام سدی رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے جعفر بن سلیمان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے سیدنا ثابت رضی اللہ عنہ کو سنا کہ انھوں نے حم السجدۃ پڑھی، یہاں تک کہ اس آیت پر پہنچے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ... الآیۃ ﴾ تو ٹھہر گئے، پھر کہا: ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندۂ مومن کو اس کی قبر سے اٹھائے گا تو اس کا استقبال وہ دو فرشتے کریں گے جو دنیا میں اس کے ساتھ تھے، پھر اس سے کہیں گے کہ تو مت ڈر اور غم نہ کر اور خوش ہو جا اس جنت کے ساتھ جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا تھا۔ کہا: اللہ تعالیٰ اس کے خوف کو امن دے گا اور اس کی آنکھ کو ٹھنڈا کرے گا۔ پھر جو بھی بڑی بلا ہو گی جس سے لوگ قیامت کے دن ڈریں گے، وہ مومن کے لیے آنکھ کی ٹھنڈک ہو گی، اس شے کے سبب سے جس کی اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کو ہدایت کی اور اس شے کے سبب سے جس کے لیے وہ دنیا میں عمل کیا کرتا تھا۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: فرشتے اس کو اس کی موت کے وقت خوش خبری دیں گے اور اس کی قبر میں اور جس وقت وہ مبعوث ہو گا۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم) یہ قول تمام اقوال کو جمع کرتا ہے اور یہ نہایت خوب ہے اور حقیقت یہی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی موت کے حاضر ہونے کے وقت فرشتے مومنین سے کہتے ہیں: ہم دنیا میں تمھارے قرین اور ساتھی تھے، ہم تم کو راہِ راست بتاتے تھے اور تم کو توفیق

---

[1] تفسير الطبري (٤٦٦/٢١، ٤٦٧) تفسير ابن كثير (١٢٤/٤، ١٢٥)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (١٨٣٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٠٩) البتہ ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا براء رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

[3] تفسير ابن كثير (١٢٥/٤)

دیتے تھے اور تم کو محفوظ رکھتے تھے اللہ کے امر سے اور اسی طرح ہم آخرت میں تمھارے ساتھ ہوں گے، ہم قبروں میں وحشت کو تم سے دور کریں گے اور صور پھونکنے کے وقت میں بھی اور بعث ونشور کے دن تم کو امن دیں گے اور ہم تم کو صراطِ مستقیم سے پار کر کے جناتِ نعیم کی طرف پہنچا دیں گے اور جنت میں تمھارے لیے وہ شے ہے جس کو تمھارے دل چاہیں اور جن کو تم پسند کرتے ہو اور جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ ﴿ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴾ یعنی تم جو شے طلب کرو گے، پاؤ گے اور جو شے تم پسند کرو گے وہ فوراً تمھارے آگے حاضر ہو جائے گی۔

﴿ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ﴾ یعنی اس ذات پاک کی طرف سے ضیافت وعطا و انعام ہے جو تمھارے گناہوں کا بڑا بخشنے والا ہے۔تم پر بڑا مہربانی کرنے والا ہے کہ اس نے مغفرت کی اور تمھارے عیوب کو چھپایا اور رحم ولطف وکرم فرمایا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ﴿ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيَ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴾ کی تفسیر میں حدیثِ سوقِ جنت بیان کی ہے، وہ یہ ہے کہ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملے تو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ مجھے اور تجھے جنت کے بازار میں ملا دے تو سعید بولے کہ کیا اس میں بازار ہے؟ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ جس وقت اہلِ جنت اس میں داخل ہوں گے تو اپنے فضلِ اعمال کے ساتھ آئیں گے (یعنی جنت میں داخلہ تو محض اللہ پاک کے فضل وکرم سے ہوگا اور منازل ومکانات اور درجات اپنے اپنے اعمال کے مطابق ملیں گے)

پھر ان کو دنیا کے ایام میں سے روزِ جمعہ کی مقدار کے برابر اذن دیا جائے گا، چنانچہ وہ اللہ عزوجل کی زیارت کریں گے اور وہ ان کے لیے اپنا عرش ظاہر کرے گا اور جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ان کے لیے ظاہر ہوگا اور ان کے لیے نور کے، موتیوں کے، یاقوت کے، زبرجد کے، سونے کے اور چاندی کے منبر رکھے جائیں گے اور ان میں سے ادنیٰ مشک وکافور کے ڈھیروں پر بیٹھے گا، حالانکہ ان میں کوئی ادنیٰ نہیں ہے اور وہ یہ خیال نہ کریں گے کہ مجلس میں کرسیوں والے ان سے افضل ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا ہم اپنے رب کو دیکھیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، کیا تم سورج کو اور چودھویں رات کے چاند کو دیکھنے میں شک کرتے ہو؟ ہم نے عرض کی: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح تم اپنے رب کو دیکھنے میں شک نہ کرو گے۔ (اصل روایت کے الفاظ: ''ھل تمارون'' ہیں، بہ ضم تاء ورائے مہلہ ممارات سے۔ ''ممارۃ'' بہ معنی مجادلہ اور منازعہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ فتح ہر دو بہ حذفِ یک تاء ماخوذ ہے ''تماری'' سے جو ماخوذ ہے ''مریۃ'' بہ معنی شک سے)۔ اس مجلس میں کوئی شخص ایسا باقی نہ رہے گا جس سے اللہ تعالیٰ دو بدو باتیں نہ کرے، یہاں تک کہ وہ البتہ ہر آدمی سے ان میں سے کہے گا: او فلاں بن فلاں! کیا تجھے یاد ہے کہ فلاں دن تم نے ایسا ایسا عمل کیا؟ اس کو اس کے بعد غدرات، یعنی گناہ یاد دلائے گا

تو وہ شخص کہے گا: اے میرے پالن ہار! کیا پھر تو نے میری مغفرت نہیں کر دی؟ تو فرمائے گا: « بَلٰی فَبِسَعَةِ مَغْفِرَتِيْ بَلَغْتَ مَنْزِلَتَكَ هٰذِهٖ » یعنی کیوں نہیں! پس تو اپنے اس مرتبے کو میری ہی وسعتِ مغفرت کے سبب سے ہی تو پہنچا ہے۔ کہا: پھر وہ اسی حال میں ہوں گے کہ اسی دوران میں ان کو ایک بدلی اوپر سے ڈھانک لے گی اور ان پر ایسی خوشبو برسائے گی جس کے مثل کبھی انھوں نے کوئی شے نہ پائی ہو گی۔ کہا: پھر ہمارا رب عزوجل فرمائے گا کہ تم اس کرامت کی طرف کھڑے ہو جاؤ جو میں نے تمھارے لیے مہیا کر رکھی ہے اور لو وہ شے جس کی تم خواہش کرو۔ پھر ہم ایک بازار میں آئیں گے جس کو فرشتوں نے گھیر لیا ہو گا، اس میں وہ شے ہو گی جس کی طرح کی شے نہ کبھی آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی اور نہ ہی دلوں میں اس کا خیال کبھی آیا۔

کہا: پھر ہمارے لیے وہ شے اٹھائی جائے گی جس کی ہم نے خواہش کی۔ اس میں نہ کوئی شے بیچی جائے گی اور نہ خریدی جائے گی، اس بازار میں جنت والے ایک دوسرے سے ملیں گے۔ کہا: پھر بلند مرتبے والا شخص اس شخص کی طرف متوجہ ہو گا جو اس سے کم درجہ والا ہے، حالانکہ ان میں کوئی ادنیٰ نہیں ہے، چنانچہ اس کو وہ لباس بہت اچھا لگے گا جو اس پر ہو گا وہ شخص اپنے دل کی آخری بات کو پورا نہیں کر پائے گا کہ اس پر اس سے بھی زیادہ حسین چیز متمثل ہو جائے گی، یعنی حاضر ہو جائے گی اور یہ اس لیے کہ کسی کے لیے یہ لائق نہیں ہے کہ اس میں حزن و رنج کرے، پھر ہم اپنے گھروں کی طرف لوٹ آئیں گے تو ہماری بیویاں ہمارا استقبال کریں گی اور کہیں گی: "مَرْحَبًا وَّأَهْلًا بِحَبِيْبِنَا" یعنی مرحبا ہو ہمارے دوست کو، البتہ تو تو اس حال میں آیا ہے کہ تجھ میں حسن و جمال اور خوشبو بہت افضل ہے اس حال سے جس پر تو ہم سے جدا ہوا تھا، تو وہ کہے گا کہ ہم نے تو آج اپنے جبار تبارک و تعالیٰ کے ساتھ نشست کی ہے اور ہم کو یہی لائق ہے کہ ہم ایسی شے لے کر لوٹ کر آئیں جیسی شے لے کر ہم لوٹ کر آئے۔[1] (وقد رواه الترمذي في صفة الجنة من جامعه عن محمد بن إسماعيل عن هشام بن عمار و رواه ابن ماجه عن هشام بن عمار به نحوه، ثم قال الترمذي: هذا حديث غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهُ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهُ » یعنی جو شخص اللہ کے ملنے کو دوست رکھے تو اللہ اس کے ملنے کو دوست رکھے اور جو شخص اللہ کے ملنے کو ناپسند رکھے تو اللہ اس کے ملنے کو ناپسند رکھے۔ ہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم سب موت کو ناپسند رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ موت کی کراہت نہیں ہے لیکن جس وقت مومن کو موت حاضر ہو جاتی ہے تو اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شے کی خوش خبری سنانے والا آتا ہے جس کی طرف وہ جانے والا ہوتا ہے تو اس کو اس شے سے زیادہ محبوب کوئی شے نہیں ہوتی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملے، چنانچہ اللہ اس کے

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٤٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٣٦) اس کی سند میں ''عبدالحمید بن حبیب'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٧٢٢)

ملنے کو دوست رکھتا ہے اور جس وقت فاجر اور کافر کو موت آتی ہے تو اس کے پاس ایک آنے والا آتا ہے، اس شر کی خبر دینے کے لیے جس کی طرف وہ جانے والا ہے، یا اس شر کی جس سے وہ ملنے والا ہے تو وہ شخص اللہ کے ملنے کو ناپسند کرتا ہے تو اللہ بھی اس کے ملنے کو ناپسند کرتا ہے۔[1] (وهذا حديث صحيح و قد ورد في الصحيح من غير هذا الوجه)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کہا ہے کہ ہمارا رب اللہ ہے جو وحدہ لاشریک لہ ہے، پھر توحید پر ہمیشہ ثابت قدم رہے اور اللہ کے سوا کسی اور معبود کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انھوں نے ﴿ رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾ کہا، اس کی ربوبیت کا اعتراف کر کے اور اس کی وحدانیت کا اقرار کر کے، یعنی نہ کوئی ہمارا رب ہے اور نہ کوئی معبود ہے سوائے اللہ کے جس طرح کہ جملے سے یہ معنی ظاہر ہوتے ہیں، پھر وہ استقامت پر ہمیشہ ثابت قدم رہے۔[2]

کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ تراخیِ زمانہ کے لیے ہے، یعنی مدت کے لیے، اس لحاظ سے کہ استقامت ایک ایسا امر ہے کہ اس کا زمانہ پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ خطیب کہتے ہیں کہ ﴿ ثُمَّ ﴾ فضیلت میں تراخیِ رتبہ کے لیے ہے، کیوں کہ توحید پر ثابت رہنے کے لیے ہے ان چیزوں پر جو اس کو مرنے تک صحیح اور درست کرنے والی ہیں۔ یہ اپنے مرتبہ کی بلندی کے لیے ایک ایسی بات ہے جو اللہ ذوالجلال والاکرام کی توفیق کے بغیر ہاتھ نہیں آ سکتی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ استقامت کے معنی عمل کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنا ہے۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ یہ آیت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی۔[3] انتہٰی۔

سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ سے استقامت کے معنی میں دو قول مروی ہیں: ایک یہ ہے کہ استقامت یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔[4] دوسرا یہ ہے کہ بتوں کے پوجنے کی طرف رجوع نہ ہوں۔[5] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اِسْتَقَامُوْا بِطَاعَةِ اللّٰهِ وَلَمْ يَرُوْغُوْا رَوَغَانَ الثَّعَالِبِ"[6] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ استقامت یہ ہے کہ امر و نہی پر مستقیم ہو "وَلَا تَرُوْغُ رَوَغَانَ الثَّعْلَبِ"۔[7] سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عمل کو اللہ کے لیے خالص کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فرائض ادا کیے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے یوں مروی ہے کہ پھر اللہ کے فرائض پر استقامت کی۔ امام قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا: "اِسْتَقَامُوْا عَلٰى طَاعَةِ اللّٰهِ"۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استقامت کی اللہ کے عمل پر اور اس کی طاعت کے ساتھ عمل کیا اور اس کی معصیت سے اجتناب کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٨٣)
[2] تفسير أبي السعود (١٣/٨)
[3] البحر المحيط (٤٧٤/٧)
[4] تفسير الطبري (٤٦٤/٢١)
[5] الدر المنثور (٣٢٢/٧)
[6] تفسير الطبري (٤٦٥/٢١)
[7] تفسير البغوي (١٧٢/٧)

اور عکرمہ نے کہا ہے کہ لا الہ الا اللہ کی گواہی دینے پر استقامت کی، یہاں تک کہ مر گئے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا کہ عمل کیا اس کے موافق جو کہا۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ کے سوا سے اعراض کیا، یعنی منہ پھیرا۔ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ فنا ہونے والی چیزوں میں زہد کیا اور باقی رہنے والی چیزوں میں رغبت کی۔[1] ان میں سے بعض اقوال گزر چکے ہیں، لیکن ان میں فرق کی وجہ سے دوبارہ ذکر کیے گئے۔

کلمۂ ﴿ اَنْ ﴾ مخففہ ہے مثقلہ سے، یا مفسرہ ہے، یا ناصبہ مصدریہ اور پہلے دو کی بنا پر کلمۂ ﴿ لَا ﴾ ناہیہ ہے اور تیسرے کی بنا پر نافیہ ہے۔ خوف وہ غم ہے جو آیندہ کسی مکروہ شے کی توقع کے سبب سے نفس کو لاحق ہوتا ہے اور حزن وہ غم ہے جو ماضی میں کسی نفع کے ضائع ہونے کے سبب سے اس کو لاحق ہوتا ہے۔ بالجملہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر استقامت کی تو اُن پر اللہ پاک کی طرف سے فرشتے وہ خوش خبری لے کر اترتے ہیں جس کو وہ چاہتے ہیں، یعنی نفع پہنچنے کی خوش خبری، یا ضرر کے دور ہونے کی، یا غم کے دور ہونے کی۔ فرشتوں کا یہ اترنا موت کے وقت ہے، جیسا کہ امام مجاہد اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے، یا اس وقت یہ اترنا ہے جب وہ اپنی قبور سے بعث کے لیے کھڑے ہوں گے، جیسا کہ امام مقاتل اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے۔[2] یا ان کی زندگی میں ان احوال میں جو ان کو پیش آتے ہیں تو فرشتے ان کے پاس وہ شے لاتے ہیں جو اُن کے سینوں کو کھولتی ہے اور ان سے خوف وحزن کو دور کر دیتی ہے، جیسا کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[3]

امام وکیع رحمہ اللہ نے کہا کہ خوش خبری تین جگہ میں ہے: موت کے وقت اور قبر میں اور بعث کے وقت اور خوش خبری یہ ہے کہ اپنی موت سے مت ڈرو، اپنی اولاد پر رنج نہ کرو، کیوں کہ اللہ ان پر تمھارا خلیفہ ہے۔ (كما قال مجاهد) یا اپنے ثواب کی رو سے مت ڈرو، اس لیے کہ وہ مقبول ہے اور اپنے گناہوں پر رنج نہ کرو، کیوں کہ میں ان کو تمھارے لیے بخش دوں گا، جیسا کہ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[4] ظاہر یہ ہے کہ ملائکہ کا ان پر اترنا کسی خاص وقت کے لیے مخصوص نہیں ہے اور خوف وحزن کے دور ہونے کو بھی کسی خاص حالت کے لیے مقید نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ سب میں متعلق کو حذف کرنا اسی بات کو ظاہر کرتا ہے۔ غرضیکہ پہلے تو ضرر کے دور ہونے کی خوش خبری سنائی، پھر جلبِ نفع کی خوش خبری سنائی۔ چنانچہ کہا: اور خوش ہو جاؤ جنت کے ساتھ جس کا تم کو وعدہ دیا جاتا تھا، یعنی دنیا میں رسولوں کی زبان پر، کیوں کہ اب تم اس کی طرف پہنچنے والے اور اس میں قرار پذیر ہونے والے اور اس کی نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہو۔

پھر اللہ پاک نے ان کو اس شے کی بشارت دی جو اُن سب میں بڑی اور برتر ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی دنیا اور آخرت کے امور میں ہم تمھاری حفاظت اور معاونت

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/٣٥٨) [2] تفسير القرطبي (١٥/٣٥٨) [3] تفسير البيضاوي (٥/١١٤) [4] تفسير البغوى (٧/١٧٣)

کے ذمے دار ہیں اور جس شخص کا اللہ ولی اور ناصر ہو تو اس نے ہر مطلب حاصل کر لیا اور ہر خوف سے بچ گیا۔ کسی نے کہا کہ یہ ملائکہ کے قول میں سے ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ فرشتے ان سے کہتے ہیں کہ ہم تمھارے وہ ساتھی ہیں جو دنیا میں تمھارے ساتھ تھے، پھر جب قیامت کا دن ہوگا تو کہیں گے کہ ہم تم سے جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم دنیا میں تمھارے اعمال کے محافظ ہیں اور آخرت میں تمھارے مددگار اور دوست اور اولیاء ہیں۔[1] کسی نے کہا کہ وہ آخرت میں ان کے لیے شفاعت کریں گے اور عزت و تکریم کے ساتھ ان کا استقبال کریں گے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس طرح گناہ گاروں اور کافروں کے ساتھی شیاطین ہیں، اسی طرح دونوں جہانوں میں فرشتے متقیوں کے اولیاء اور احباء ہیں۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ ﴾ یعنی تمھارے لیے جنت میں وہ قسم قسم کی کرامتیں اور لذتیں اور طرح طرح کی نعمتیں ہیں جن کو تمھارے جی چاہتے ہیں۔ ﴿ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴾ اور تمھارے لیے اس میں وہ شے ہے جس کی تم تمنا کرو۔ افتعال ہے دعا بہ معنی طلب سے۔ ﴿ وَلَهُم مَّا يَدَّعُونَ ﴾ [یٰسٓ: ۵۷] میں اس کے معنی کا بیان پورے طور پر گزر چکا ہے۔ دونوں جملوں میں فرق یہ ہے کہ پہلا تو ان کے نفوس کی خواہشات کے لحاظ سے ہے اور دوسرا اس شے کے لحاظ سے ہے جس کو وہ طلب کریں گے، یہ عام ہے اس سے کہ وہ شے اس قسم سے ہو جس کی ان کے دل خواہش کریں یا نہ ہو، کیوں کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ ہر مطلوب شے کی خواہش کی جائے، جیسے: فضائلِ علمیہ، اگرچہ اول بھی من وجہ عام ہے بحسبِ حالِ دنیا۔ چنانچہ مریض جس کی خواہش رکھتا ہے، اس شے کا ارادہ نہیں کرتا، کیوں کہ وہ اس کے مرض میں تکلیف کا باعث ہوتی ہے، مگر یوں کہیں کہ خواہش کرنا ارادہ سے عام تر ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرے نزدیک قریب تر یہ بات ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ ﴾ جنتِ روحانی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے: ﴿ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۚ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾[3] [یونس: ۱۰] ''ان کے منہ سے یہ بات نکلے گی: ''سُبْحَانَ اللّٰہِ'' اور ان کا باہمی سلام یہ ہوگا: ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ'' اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ ''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہان کا رب ہے۔''

﴿ نُزُلًا ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے موصول سے، یا اس کے عائد سے۔ ''أَيْ: مَا تَدْعُوْنَهُ نُزُلًا'' یعنی وہ شے جس کو تم طلب کرو گے درآنحالیکہ وہ ایک نزل ہے (اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس شے کی وہ تمنا کریں گے بہ نسبت ان بڑے بڑے اجور کے جو اُن کو عطا ہوں گے مثل نزل کے ہے مہمان کے لیے۔ ''نزل'' وہ مہمانی ہے جو مہمان کی عزت واکرام کے لیے تیار کی جاتی ہے)۔ یا حال ہے ﴿ تَدَّعُونَ ﴾ کے فاعل سے۔ ''أَيْ: نَازِلِيْنَ'' یعنی درآں حالیکہ

[1] تفسیر القرطبي (۳۵۹/۱۵) [2] تفسیر النسفي (۹۰/٤) [3] تفسیر الرازي (۱۰۷/۲۷)

تم اترنے والے ہو گے۔ اس سے یہ بات بتانا منظور ہے کہ جس شے کی وہ تمنا کریں گے وہ بہ نسبت اس شے کے جو ان کو عطا ہو گی ان چیزوں میں سے جن کا خیال تک ان کے دل میں نہیں گزرا، نزلِ ضیف کی طرح ہے۔ یا فعل محذوف کا مصدر مؤکد ہے "أَيْ: أَنْزَلْنَا نُزُلًا"۔ یا "جَعَلَ" مقدر کا مفعول ہے۔ "أَيْ: جَعَلَ رِزْقًا مُهَيَّأً" یعنی جس شے کو تم طلب کرو گے، وہ کی گئی ہے ایک تیار کردہ شدہ روزی۔ "نزل" وہ رزق و ضیافت ہے جو ان کے نزول کے حال میں ان کے لیے تیار کی جائے گی۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿نُزُلًا﴾ "هُوَ الرِّزْقُ النَّزِيْلُ"[1] ہے، یعنی مہمان کا رزق۔ اس کی تحقیق سورت آلِ عمران میں گزر چکی ہے۔[2]

﴿مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ﴾ محذوف سے متعلق ہے "أَيْ: تَطْلُبُوْنَهُ مِنْ جِهَةِ غَفُوْرٍ رَحِيْمٍ" یا استقرار سے متعلق ہے جس سے "لکم" متعلق ہے "أَيْ: اِسْتَقَرَّ لَكُمْ مِنْ جِهَةِ غَفُوْرٍ رَحِيْمٍ"۔ اہلِ معانی کہتے ہیں: یہ سب چیزیں جو اس آیت میں مذکور ہوئیں یہ بطور نزل و ما حضر کے ہے کہ جلدی سے پیش کر دیا اور جب کریم منان نے یہ "نزل" عطا کیا تو اس کے بعد جو لطف و کرم، اجرِ عظیم اور تحفِ جسیم عطا فرمائے گا، ان کو خیال کرتے ہو کہ وہ کیا کچھ ہوں گے۔[3]

بالجملہ جب اللہ سبحانہ نے پہلے اس شخص کی وعید ذکر کی جس نے قرآن اور اس کے معنی سوچنے سے اعراض کیا اور اس کے بعد اس شخص کی فضیلت ذکر کی جس نے عبودیت کا اقرار کیا اور دل و جان سے مستقیم رہا تو بیان فرمایا کہ یہ مرتبہ نفس کی ذات اور جوہر کی تکمیل ہے اور جو شخص اپنے جوہرِ نفس کی تکمیل کے بعد ناقصوں کی تکمیل میں مشغول ہوا تو اس کی شان بالاتر ہے اور اس کا حال خوب تر ہے بہ نسبت اس شخص کے جس نے اپنے نفس کی تکمیل کو ہی کافی سمجھا اور اپنے غیر کے حال کی طرف توجہ نہ کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ
اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٣﴾ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ
حَمِيْمٌ ﴿٣٤﴾ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ
حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿٣٥﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٦﴾

اور اس شخص سے زیادہ اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے، جس نے (لوگوں کو) اللہ کی طرف بلایا اور

[1] تفسير النسفي (٤/٩٠) [2] رقم الآية (١٩٨) [3] فتح البيان (١٢/٢٤٨-٢٥٠)

نیک عمل کیے اور کہا: بے شک میں تو فرماں برداروں میں سے ہوں (33) اور نیکی اور برائی برابر نہیں ہوسکتیں، آپ (برائی کو) ایسی بات سے ٹالیے جو احسن ہو تو (آپ دیکھیں گے) یکا یک وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان دشمنی ہے، (ایسا ہو جائے گا) جیسے گرم جوش جگری دوست ہو (34) اور یہ (خصلت) انھی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہو (35) اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ اُبھارے تو اللہ کی پناہ مانگیے، یقیناً وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (36)

داعی الی اللہ کی فضیلت:

نیکی برائی کے برابر نہیں ہے اور نہ برائی نیکی کے برابر ہے۔ کوئی سخت کلام کہے یا برا معاملہ کرے تو اس کے مقابلے میں اس سے بہتر کر، اس طرح سے دشمن دوستوں جیسے ہو جاتے ہیں، اگرچہ دل میں نہ ہوں۔ بری بات سہار کر سامنے سے بھلی بات کہنے کے لیے کھلا حوصلہ چاہیے جو اقبال مندوں کو ملتا ہے۔ یعنی اگر کبھی بے اختیار غصہ آ جائے تو یہ شیطان کا دخل اور وسوسہ ہوتا ہے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ اس سے اچھی بات کس کی ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا، یعنی اللہ کے بندوں کو اس کی طرف بلایا اور خود بھی نیک کام کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں، یعنی اور وہ خود اس بات کے ساتھ راہ یاب ہے جو دوسروں کو کہتا ہے، چنانچہ اس کا فائدہ اپنی جان کے لیے اور دوسروں کے لیے لازم و متعدی ہے اور وہ ان میں سے نہیں ہے جو دوسروں کو تو نیک بات کا حکم کرتے ہیں مگر خود وہ نہیں کرتے اور لوگوں کو بری بات سے منع کرتے ہیں مگر خود اس کو کرتے ہیں۔ بلکہ وہ خود نیکی بجا لاتا ہے اور بدی کو چھوڑ دیتا ہے اور لوگوں کو خالقِ تبارک و تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے۔ یہ آیتِ کریمہ ہر اس شخص کے لیے عام ہے جس نے خیر کی طرف بلایا اور خود راہ یاب ہے اور رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے بڑھ کر اس کے سزاوار ہیں، جیسا کہ امام محمد بن سیرین، سدی اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا۔[1] داعی الی اللہ کے بارے میں کچھ احادیث و آثار درج ذیل ہیں:

1. کسی نے کہا کہ اس سے مراد مؤذنینِ صلحاء ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم میں ثابت ہوا ہے کہ قیامت کے دن گردنوں کے لحاظ سے سب لوگوں سے دراز اذان دینے والے ہوں گے۔[2]

2. سنن میں مرفوعاً آیا ہے کہ امام ضامن ہے اور مؤذن مؤتمن، ہدایت دے اللہ اماموں کو اور مغفرت کرے مؤذنوں کی۔[3]

---

(1) تفسير الطبري (٤٦٩/٢١) (2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٧)

(3) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٧)

3 امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مؤذنوں کے حصے قیامت کے دن مجاہدوں کے حصوں کی طرح ہوں گے اور وہ اذان اور اقامت کے درمیان اس شخص کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے خون میں تڑپ رہا ہے۔

4 کہا: اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں مؤذن ہوتا تو مجھے حج نہ کرنے اور عمرہ نہ کرنے اور جہاد نہ کرنے کی پروا نہ ہوتی۔

5 کہا: اور امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں مؤذن ہوتا تو میرا معاملہ کامل ہوتا اور میں اس بات کی پروا نہ کرتا کہ میں قیامِ شب کے لیے محنت نہ اٹھاؤں اور نہ دن کے روزے کے لیے۔ میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ فرماتے تھے: اے اللہ! مؤذنوں کے لیے بخشش کر، تین بار کہا۔ چنانچہ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ نے ہم کو چھوڑ دیا، حالانکہ ہم تو اذان پر تلواریں لے کر لڑتے ہیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كَلَّا يَا عُمَرُ » یعنی اے عمر! اللہ سب کو بخشے۔ بے شک حال یہ ہے کہ عن قریب لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ اذان کو اپنے ضعفاء پر چھوڑ دیں گے اور وہ گوشت جن کو اللہ عزوجل نے آگ پر حرام کیا ہے وہ مؤذنوں کے گوشت ہیں۔

6 کہا: اور ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ان کے لیے، یعنی مؤذنوں کے لیے، یہ آیت ہے: ﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ فرمایا: چنانچہ وہ مؤذن ہے کہ جب اس نے "حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ" کہا تو واقعی اس نے اللہ کی طرف بلایا۔

7 اور اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مؤذنوں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[1]

امام بغوی رحمہ اللہ نے سیدنا امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿ وَعَمِلَ صَالِحًا ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے: یعنی اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعت نماز۔[2] پھر امام بغوی رحمہ اللہ نے سیدنا عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث وارد کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ہر دو اذان کے درمیان نماز ہے، ہر دو اذان کے درمیان نماز ہے، پھر تیسری بار فرمایا: « لِمَنْ شَاءَ » یعنی اس کے لیے جو چاہے۔[3] (وقد أخرجه الجماعة في كتبهم من حديث عبد الله بن بريدة عنه) اور امام ثوری رحمہ اللہ سے مروی حدیث وارد کی عن زيد العمي عن أبي إياس معاوية بن قرة عن أنس بن مالك رضی اللہ عنہ کے واسطے سے امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ انس رضی اللہ عنہ نے اسے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ اذان اور اقامت کے درمیان کی جانے والی دعا رد نہیں کی جاتی۔[4] (ورواه أبو داود والترمذي والنسائي في اليوم و الليلة كلهم من حديث الثوري به وقال الترمذي: هذا حديث حسن ورواه النسائي أيضا من حديث سليمان التيمي عن قتادة عن أنس رضی اللہ عنہ به)

---

[1] تفسير ابن كثير (١٢٦/٤، ١٢٧) [2] تفسير البغوي (١٧٤/٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣٨) تفسير البغوي (١٧٤/٧)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٢٢/٦) صحيح الجامع (٣٤٠٨)

صحیح یہ ہے کہ یہ آیت مؤذنوں اور ان کے علاوہ دوسروں کے حق میں عام ہے، اس لیے کہ اس آیت کے نزول کے وقت اذان شروع ہی نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ یہ سورت مکی ہے اور اذان تو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مشروع ہوئی، جبکہ یہ سیدنا عبداللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ کو خواب میں دکھائی گئی تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا قصہ بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کو حکم دیا کہ بلال رضی اللہ عنہ پر اس کا القا کریں، اس لیے کہ ان کی آواز زیادہ بلند ہے۔ چنانچہ یہ امر اپنی جگہ میں مقرر ہے تو اب صحیح یہی بات ٹھہری کہ آیت عام ہے جس طرح کہ عبدالرزاق نے عن معمر عن الحسن البصری روایت کیا ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ تو یوں فرمایا: یہ شخص تو اللہ تعالیٰ کا دوست ہے، اللہ تعالیٰ کا ولی ہے، اللہ تعالیٰ کا منتخب شدہ ہے، اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہے، روئے زمین کے تمام لوگوں سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے، اس نے اپنی دعوت میں اللہ تعالیٰ کی بات کو قبول کیا اور اپنی دعوت میں جس اللہ تعالیٰ کی جس بات کو خود قبول کیا تھا، لوگوں کو بھی اس کی طرف دعوت دی اور اللہ تعالیٰ کی بات کو قبول کرتے ہوئے نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں، یہ شخص تو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔[1]

دعوت میں حکمتِ عملی:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ﴾ یعنی نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ یعنی جس نے تجھ سے برائی کی ہے تو تو اس پر احسان کر کے اپنے سے اس کی برائی کو دور کر، جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ جس نے تیرے حق میں اللہ کی نافرمانی کی، اس کے لیے اس سے بڑی سزا کوئی نہیں کہ تو اس کے بارے میں اللہ کی اطاعت کرے۔[2] مطلب یہ ہے کہ جو تیرے ساتھ برائی کر کے اللہ کا گناہ گار ہوا تو اس کے ساتھ نیکی کر اور اللہ کا مطیع ہو۔ اس سے بڑھ کر اس کی کوئی سزا نہیں ہے۔

﴿ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴾۔ ﴿ وَلِيٌّ ﴾ بہ معنی دوست ہے اور ﴿ حَمِيْمٌ ﴾ بہ معنی قریب، یعنی جب تو اس شخص کے ساتھ نیکی کرے گا جس نے تجھ سے بدی کی ہے تو یہ تیرا اس کے ساتھ نیکی کرنا اسے تیری دوستی، محبت اور شفقت کی طرف کھینچ لائے گا، یہاں تک کہ وہ تیرا دوست اور شفیق ہو جائے گا، گویا کہ تیرا سچا دوست اور تیرا رشتہ دار ہے، اس طرح سے کہ وہ تجھ پر شفقت کرے گا اور تجھ سے بھلائی کرے گا۔

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ﴾ یعنی اس وصیت کو وہی قبول کرے گا اور اس پر عمل کرنے والا ہوگا جو اس پر صبر کرے گا، کیوں کہ یہ بات نفوس پر مشکل اور دشوار ہوتی ہے۔ ﴿ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ یعنی یہ برتاؤ اسی کو نصیب ہوتا ہے جس کو دنیا اور آخرت میں سعادت مندی اور بہرہ مندی کا وافر حصہ عطا ہوا ہو۔ امام علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول اس آیت کی تفسیر میں بیان

---

[1] تفسير الصنعاني (١٨٧/٣) [2] تفسير ابن كثير (١٢٧/٤)

کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو غصے کے وقت صبر کا، جہالت کے وقت حوصلے اور بردباری کا اور کسی کی برائی پر عفو ودرگزر کا حکم دیا ہے۔ پھر جب انھوں نے یہ کام کیے تو اللہ تعالیٰ ان کو شیطان سے محفوظ رکھے گا اور ان کا دشمن ان کے لیے نرم اور عاجز ہو جائے گا، گویا وہ دلی دوست ہے۔[1]

﴿ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ﴾ یعنی انس کا شیطان تو بسا اوقات اس کے ساتھ نیکی کرنے سے فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اب رہا جن کا شیطان تو اس کے لیے کوئی حیلہ اور تدبیر کامیاب نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ اس کے خالق سے پناہ مانگی جائے جس نے اس کو تجھ پر مسلط کیا ہے، چنانچہ جب تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ پناہ مانگے گا اور اس سے التجا کرے گا تو وہ اس کو تجھ سے روک دے گا اور اس کے مکر وفریب کو دور فرمائے گا۔ نبی اکرم ﷺ جس وقت نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو فرماتے: ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ''۔[2]

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ قرآن شریف میں اس مقام کی کوئی نظیر نہیں ہے، مگر سورۃ الاعراف میں یہ آیت ہے: ﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [الأعراف: ١٩٩۔ ٢٠٠] ''آپ درگزر کو اختیار کریں، نیک کام کی تعلیم دیں اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جائیں اور اگر آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجیے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔'' نیز سورۃ المومنین میں یہ آیت: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴾[3] [المؤمنون: ٩٦۔ ٩٨] ''برائی کو اس طریقے سے دور کریں جو سراسر بھلائی والا ہو، جو کچھ یہ بیان کرتے ہیں ہم بخوبی واقف ہیں اور دعا کریں کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے رب! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس آ جائیں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا توضیحی بیان یہ ہے: اور اس سے بہتر کس کی بات ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا، یعنی اس کی توحید وطاعت کی طرف۔ امام حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ شخص مومن ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی دعوت کو قبول کیا اور لوگوں

---

1. تفسیر الطبري (٤٧١/٢١)
2. سنن أبي داود، رقم الحدیث (٧٧٥) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٤٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (صحیح أبي داود: ٣٦١/٣)
3. تفسیر ابن کثیر (١٢٦/٤۔١٢٨)

کو اس شے کی طرف بلایا جس میں اس نے اللہ کی دعوت کو قبول کیا،[1] یعنی اللہ کی اطاعت اور نیک عمل کیا اپنے جواب دینے میں اور کہا کہ بے شک میں اپنے رب کے لیے حکم برداروں میں سے ہوں۔ اس کہنے سے غرض صرف زبان سے کہنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کہنے کے ساتھ دل کا اعتقاد ملائے۔ چنانچہ اس تلفظ کے ساتھ اپنے دل سے دینِ اسلام کی حقیقت کا معتقد ہو، یعنی دل سے اسلام کا معتقد ہو اور اس سے شاداں و فرحاں ہو کر اور اس کو اپنا دین و مذہب ٹھہرا کر اور اس کے ساتھ فخر کر کے زبان سے کہا: ﴿ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴾

امام ابن سیرین، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ قول امام حسن رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام عکرمہ، قیس بن ابی حازم اور مجاہد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مؤذنوں کے بارے میں نازل ہوئی۔[2] اس بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔ آیت کو عموم پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے، جیسا کہ الفاظ اس کے مقتضی ہیں اور اس کا جو سببِ نزول ہے وہ تو بدرجۂ اولیٰ اس میں داخل ہے۔ چنانچہ ہر وہ شخص جس نے دونوں عمل جمع کیے، یعنی بندوں کو اس شے کی طرف بلایا جس کو اللہ نے مشروع کیا ہے اور خود بھی نیک عمل کیا تو یہ اس شے کو ادا کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر فرض کی ہے، اس کے ساتھ اس شے سے اجتناب کیا جو اللہ پاک نے اس پر حرام کی ہے اور وہ دین کے لحاظ سے مسلمانوں میں سے تھا نہ کہ ان کے غیر میں سے تو کوئی شے اس سے بہتر نہیں ہے اور نہ اس کے طریقے سے زیادہ واضح ہے اور نہ اس کے عمل سے ثواب میں زیادہ ہے۔

دعوت الی اللہ کے مراتب ہیں: پہلا مرتبہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا ہے، کیوں کہ یہ لوگ حجتوں اور برہانوں اور تلوار کے ساتھ اللہ پاک کی طرف بلاتے ہیں۔ غیر انبیاء کے لیے یہ مرتبہ نہیں ہے۔ دوسرا مرتبہ علماء کی دعوت کا ہے، یہ لوگ صرف دلائل اور براہین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ علماء تین قسم کے ہیں: ایک عالم باللہ غیر عالم بامر اللہ۔ دوسرا عالم بامر اللہ غیر عالم باللہ اور تیسرا عالم باللہ و عالم بامر اللہ۔ چنانچہ پہلا تو وہ شخص ہے جس کے دل پر اللہ تعالیٰ کی معرفت غالب ہو گئی، چنانچہ وہ تو اس کے نورِ جمال اور صفاتِ کبریا کے مشاہدے میں مستغرق ہو گیا، چنانچہ وہ علمِ احکام کے سیکھنے کے لیے فارغ نہیں ہوتا، مگر اس قدر جتنا ضروری ہے۔ دوسرا عالم بامر اللہ غیر عالم باللہ۔ یہ وہ ہیں جنھوں نے حلال و حرام پہچانا اور احکام کی تفصیلات کو جانا، لیکن اسرارِ جلال اللہ کو اور اس کے جمال کو نہیں پہچانتے۔

رہے تیسری قسم کے علماء، یعنی عالم باللہ و باحکام اللہ، تو یہ لوگ وہ ہیں جن میں پہلی دونوں قسم کے علماء کے فضائل جمع ہیں، یہ کبھی تو اللہ تعالیٰ کے حب اور ارادے کے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی اللہ کی مخلوق کے ساتھ رحمت اور شفقت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ ایسے ہو جاتے ہیں جیسے ان میں سے ایک ہیں، گویا وہ اللہ تعالیٰ کو پہچانتے نہیں ہیں اور جس وقت اپنے رب کے ساتھ علاحدگی میں ہوتے ہیں تو

---

[1] تفسیر البغوي (۱۷۳/۷) [2] تفسیر الطبري (٤٦٩/٢١) تفسیر القرطبي (٣٦٠/١٥)

اس کے ذکر میں مشغول ہو جاتے ہیں، گویا وہ مخلوق کو پہچانتے ہی نہیں ہیں، یہ راہ ہے مرسلین وصدیقین کی۔

دعوت کا تیسرا مرتبہ دعوت بالسیف ہے، یہ مرتبہ بادشاہوں کے لیے ہے، کیوں کہ یہ لوگ کفار سے لڑتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اللہ کے دین و اطاعت میں داخل ہو جائیں۔ چوتھا مرتبہ دعوت کا مؤذنوں کا نماز کی طرف بلانا ہے، چنانچہ یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی اطاعت کی طرف بلانے والے ہیں۔ یہ مرتبہ اللہ کی طرف دعوت دینے والا ضعیف ترین مرتبہ ہے، چنانچہ جب ان مراتب میں سے ہر مرتبہ دعوتِ الی اللہ میں داخل ہے تو یہ بات ظاہر ہوگئی کہ آیت کو ان مراتب میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص کرنا بے وجہ ہے۔ بالجملہ اقوال میں سے بہترین قول اس شخص کا ہے جو ان تینوں خصلتوں کا مالک ہے: ایک تو اللہ تعالیٰ کی طرف بلانا، دوسرے عملِ صالح کرنا، تیسرے دینِ اسلام کو اپنا دین ٹھہرانا اور اس سے خوش ہونا اور اس کے ساتھ فخر کرنا۔

پھر جب اللہ پاک نے مشرکوں کی برائیاں شمار کیں اور ان کا برا انجام بیان کیا تو اب نبی اکرم ﷺ کو اس بات پر آمادہ کرنا شروع کیا کہ ان کو اللہ کی طرف اور اس کی اطاعت کی طرف بلاتے رہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ﴾۔ حسنہ سے مراد وہ شے ہے جس پر آپ قائم ہیں، یعنی دینِ حق کی طرف ان کو بلانا اور ان کی جہالت پر صبر کرنا اور ان سے انتقام نہ لینا اور اُن کی کم عقلی اور حماقت کی طرف توجہ نہ کرنا اور سیئہ سے مراد وہ مخالفت اور دشمنی ہے جو انھوں نے ظاہر کی، جیسے: ان کا یہ قول: ﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ... الآیۃ ﴾ اور یہ قول: ﴿ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴾

تو گویا اللہ پاک نے یوں فرمایا کہ اے محمد! تیرا فعل تو حسنہ ہے اور ان کا فعل سیئہ ہے اور جزاء وحسنِ انجام میں حسنہ وسیئہ برابر نہیں ہوتے تو جس وقت تو نے یہ حسنہ کیا تو تُو دنیا میں تعظیم کا اور آخرت میں ثواب کا حق دار ہوا اور وہ اس کی ضد ہیں تو یہ لائق نہیں کہ ان کا اس سیئہ پر اقدام کرنا تجھ کو اس حسنہ میں مشغول ہونے سے روکے تو تُو ان کو اللہ کی طرف بلائے جا۔ ان کے ماننے یا نہ ماننے سے کچھ بحث نہیں۔ کسی نے کہا کہ وہ حسنہ جس سے اللہ پاک راضی ہوتا ہے اور جس پر ثواب دیتا ہے اور وہ سیئہ جس سے اللہ تعالیٰ کراہت کرتا ہے اور جس پر سزا دیتا ہے، یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ کسی نے کہا کہ حسنہ توحید ہے اور سیئہ شرک ہے۔ کسی نے کہا کہ حسنہ مدارات ہے، یعنی آپس میں نرمی کرنا اور سیئہ غلظت، یعنی سختی اور درشتی ہے۔ کسی نے کہا کہ حسنہ عفو ہے، یعنی درگزر کرنا اور سیئہ انتصار، یعنی بدلہ لینا۔ کسی نے کہا کہ حسنہ علم ہے اور سیئہ فحش۔ اس کے سوا اور اقوال بھی ہیں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ اطاعت کی مختلف اقسام میں سے کسی ایک قسم کے ساتھ حسنہ کو مخصوص کیا جائے اور اسی طرح سیئہ کو اللہ تعالیٰ کی معصیت کی مختلف اقسام میں سے کسی ایک قسم کے ساتھ مخصوص کیا جائے، کیوں کہ الفاظ اس سے زیادہ وسیع ہیں۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَلَا السَّيِّئَةُ ﴾ میں کلمۂ ”لا“ زائد ہے۔[1] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تاکید کے لیے ہے، اس لیے کہ استوا ایک کے ساتھ مکتفی نہیں ہوتا ہے، چنانچہ معنی یہ ہیں کہ حسنہ سیئہ کے ساتھ برابر نہیں ہے، بلکہ حسنہ خیر ہے اور سیئہ شر ہے۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جملۂ ﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ ﴾ مستانفہ ہے جو محاسنِ اعمال کے بیان کے لیے لایا گیا ہے، وہ اعمال جو بندوں کے درمیان جاری ہیں ان محاسنِ اعمال کے بیان کے بعد جو بندے اور رب عزوجل کے درمیان جاری ہیں۔ اس سے منظور رسول اللہ ﷺ کو مشرکوں کے ایذا پر صبر کرنے کی اور برائی کا مقابلہ بھلائی کے ساتھ کرنے کی ترغیب دینا ہے۔[2] جملۂ ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ حسنہ کے اچھے انجام کے لیے استینافِ مبین ہے، یعنی جب تجھے برائی کرنے والے کی طرف سے برائی پہنچے تو اس برائی کو ایسی بہترین بھلائی کے ساتھ دور کر جو ممکن ہو، اس میں سے یہ ہیں کہ برائی کا بھلائی سے مقابلہ کرنا، گناہ کا عفو سے مقابلہ کرنا اور غضب کا مقابلہ صبر سے کرنا اور بکواسات وزلات سے چشم پوشی کرنا اور مکروہات کو برداشت کرنا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تو اس کے ساتھ سلام کے ساتھ ملاقات کر۔[3] امام مجاہد اور عطاء رحمہما اللہ نے کہا: یعنی ”بِالسَّلَامِ إِذَا لَقِيَ مَنْ يُّعَادِيْه“۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ”بِالْمُصَافَحَةِ عِنْدَ التَّلَاقِيْ“ مطلب یہ ہے کہ حسنہ وسیئہ اپنی ذات میں الگ الگ ہیں، کوئی نیکی اعلیٰ درجے کی، کوئی اوسط درجے کی، کوئی ادنیٰ، اسی طرح سیئہ ہے۔ چنانچہ جب تیرے سامنے دو نیکیاں ہوں تو وہ نیکی لے جو دوسری سے خوب اور بہتر ہو پھر اس کے ساتھ اس برائی کو دور کر جو تجھ پر اپنے بعض اعداء سے وارد ہو۔ مثلاً اگر کسی شخص نے تجھ سے کوئی برائی کی تو حسنہ یہ ہے کہ تو اس کو معاف کر دے اور وہ حسنہ جو احسن اور بہتر ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی برائی کے بدلے تو اس کے ساتھ احسان کرے۔ وہ تیری مذمت کرتا ہے تو تو اس کی تعریف کرے، یا وہ تیرے لڑکے کو مار ڈالے تو تُو اس کے بیٹے کو اس کے دشمن کے ہاتھ سے فدیہ دے کر چھڑا لے۔ ﴿ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ کو بجائے ”بِالْحَسَنَةِ“ کے رکھا؟ تو اس لیے کہ حسنہ کے ساتھ دفع کرنے میں خوب مبالغہ ہو جائے، کیوں کہ جس نے دفع کیا ساتھ احسن کے تو اس پر آسان ہو جائے گا دفع کرنا ساتھ اس شے کے جو اس سے کم درجے کی ہے۔ پھر جو فائدہ دفع ﴿ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ سے حاصل ہوتا ہے، اس کو بیان کیا ہے۔

﴿ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴾ یعنی جب تو یہ دفع کرے گا تو دشمن دوست کی طرح اور بعید مثل قریب کے ہو جائے گا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے، یہ نبی اکرم ﷺ کا دشمن تھا، پھر اس سسرالی رشتے کے سبب سے جو آپ ﷺ کے اور اس کے درمیان واقع

---

[1] فتح القدير (٦٧٦/٤) [2] تفسير أبي السعود (١٤/٨) [3] الدر المنثور (٣٢٧/٧) [4] تفسير القرطبي (٣٦١/١٥)

ہوا، پھر مسلمان ہوا اور آپ کا دوست ہوگیا، صہارت کے سبب سے اسلام میں حمیم ہوگیا۔[1] یعنی سسرالی رشتے کے سبب سے۔ اس کے سوا اور کچھ بھی کہا گیا ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ آیت کو عموم پر محمول کیا جائے۔ ﴿ وَمَا يُلَقّٰهَآ ﴾ کی ضمیر فَعْلَة کی طرف راجع ہے، یا حالت کی طرف، جیسا کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ حالت یہی سیئہ کو حسنہ کے ساتھ دور کرنا ہے، یعنی یہ توفیق و خاص حالت صرف انہی لوگوں کو دی جاتی ہے جنھوں نے غصہ کو پی جانے پر صبر کیا اور مکروہ اور ناپسندیدہ چیزوں کو برداشت کرنے اور سختیوں کو گھونٹ گھونٹ کر کے پی جانے اور بدلہ نہ لینے پر صبر کیا۔[2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی ہے کہ اس کا بھائی اسے گالی دیتا ہے تو وہ کہتا ہے: اگر تو سچا ہے تو اللہ مجھے بخشے اور اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تجھے بخشے۔[3] سُبْحَانَ اللّٰهِ۔ نفوسِ قدسیہ کے سوا بھلا یہ کام کسی اور کا ہو سکتا ہے! اسی لیے فرمایا: ﴿ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ یعنی یہ بات اسی کو ملتی ہے جو ثواب اور خیر میں بڑے حصے والا ہے، یا جس کو اچھے اخلاق اور کمالِ نفس سے بڑا حصہ ملا ہے۔ یہ قول سب سے زیادہ مناسب ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ جنت ہے۔[4] "أَيْ: وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا مَنْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ"۔ کسی نے کہا کہ ﴿ يُلَقّٰهَآ ﴾ کی ضمیر جنت کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا کہ کلمۂ توحید کی طرف راجع ہے۔ جمہور نے ﴿ يُلَقّٰهَآ ﴾ کو "تلقیہ" سے پڑھا ہے اور امام طلحہ بن مصرف اور ابن کثیر رحمہما اللہ نے ایک روایت کے مطابق "تلاقاها" ملاقات سے پڑھا ہے۔[5]

پھر اللہ تعالیٰ نے شیطان سے پناہ مانگنے کا حکم دیا: ﴿ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ﴾ "نزغ" "نخس" کے مشابہ ہے، "نخس" چونکا مارنے اور چھیڑنے کو کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ وسوسہ کو تشبیہ دی ہے، اس لیے کہ وسوسہ شر کا باعث بنتا ہے۔ صحاح میں کہا ہے: "نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنَهُمْ"، یعنی شیطان نے ان کے آپس میں فساد ڈالا۔ "وَنَزَغَهُ بِكَلِمَةٍ"[6] یعنی اس میں طعن کی مثل "نَخَسَهُ بِعُودٍ أَوْ بِإِصْبَعٍ" یعنی اس کو لکڑی سے یا انگلی سے چونکا مارا۔ "نزغ" کو نازغ ٹھہرایا بطور مجاز عقلی کے، جیسے: "جد جده". یا "نزغ" سے مراد "نازغ" ہے۔ شیطان کو موصوف بہ مصدر کیا ہے بطور مبالغے کے، یا اس کی تسویل و تزئین کے سبب سے۔ کلمۂ "من" ابتدائیہ ہے، یعنی ایسا "نزغ" کہ جو شیطان کی جہت سے شروع ہوتا ہے اور صادر ہوتا ہے اور جب "نزغ" بہ معنی "نازغ" ہو تو کلمۂ "من" تجرید یہ ہوگا اس معنی میں کہ شیطان سے ایک اور شیطان نکالا اور اس کا نام "نازغ" رکھا۔

اب کلام میں دو مجاز ہوں گے: ایک تو یہ ہوا کہ وسوسہ کی تعبیر نزغ کے ساتھ کی۔ دوسرا یہ ہوا کہ شیطان کو نازغ ٹھہرایا۔ کلمۂ ﴿ اِمَّا ﴾ "إن" شرطیہ ہے اور "ما" زائدہ تاکید کے لیے ہے شرطیت و استلزام کے معنی میں، اسی لیے

[1] تفسير البغوي (١٧٤/٧) [2] اللباب في علوم الكتاب (١٤١/١٧) [3] الدر المنثور (٣٢٧/٧)
[4] تفسير الطبري (٤٧٢/٢١) [5] فتح القدير (٦٧٦/٤) [6] الصحاح (١٣/٤)

نون تاکید کا فعلِ شرط سے لاحق ہوا ہے، اس لیے کہ تاکید کا نون اس کے ساتھ لاحق نہیں کیا جاتا جب تک کہ "ما" کے ساتھ شرطیہ کی تاکید نہ کی جائے، معنی یہ ہیں کہ اگر شیطان تجھے ان چیزوں میں سے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے مشروع کی ہیں، کسی چیز سے تجھے پھیرنے یا تجھ کو برائی کو بہترین حسنہ کے ساتھ دور کرنے سے روکے اور تجھے برائی کو اَور بدتر برائی سے دور کرنے کا حکم دے تو تو اللہ کے ساتھ اس کے شر سے پناہ مانگ اور اپنے حلم پر چل اور اس کا کہنا مت مان اور اللہ کی مشروع کی ہوئی شے پر عمل کر، یا برائی کو بہترین حسنہ کے ساتھ دور کر۔

جملۂ ﴿ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ تعلیلِ ماقبل ہے، یعنی اللہ کے ساتھ اس لیے پناہ مانگ کہ وہ ہر سننے کی بات کا بڑا سننے والا ہے، اسی سے تیرا پناہ مانگنا ہے اور وہ ہر جاننے کی شے کا بڑا جاننے والا ہے، اسی میں تیرا فعل اور حال ہے اور جو ذات پاک ایسا بڑا سننے اور جاننے والا ہے تو وہ ضرور اس کو پناہ دیتا ہے جو اس سے پناہ مانگتا ہے۔

نکتہ:

یہاں ﴿ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ فرمایا، یعنی اس میں کلمۂ ﴿ هُوَ ﴾ زیادہ کیا اور الف و لام تعریف بھی استعمال کیا اور سورۃ الاعراف میں ﴿ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ ان دونوں کے بغیر کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایسے کلام کے ساتھ متصل ہے جس کی تکرار اور حصر کے ساتھ تاکید کی گئی ہے، یعنی ﴿ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ اس لیے یہاں اس تاکید کے مناسب ایسا ہی کلامِ مؤکد ہے اور وہاں چونکہ کلام تاکید سے خالی ہے، اس لیے کلام حسبِ قیاس لایا گیا، وہ قیاس یہی ہے کہ مسند الیہ معرفہ ہو اور مسند نکرہ۔

بخاری و مسلم وغیرہما نے سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ دو شخصوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سخت کلامی اور آپس میں گالی گلوچ کی، پھر ان میں سے ایک کا غصہ سخت ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میں البتہ ایک کلمے کو جانتا ہوں، اگر وہ اس کو کہتا تو اس سے غصہ جاتا رہتا: "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" چنانچہ وہ شخص بولا: کیا آپ مجھ کو مجنون خیال کرتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی ﴿ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ... الآية ﴾[1]

حکایت:

جناب الشیخ اکبر ابن عربی۔قدس سرہ۔ نے فتوحاتِ مکیہ میں ذکر فرمایا ہے، مروی ہے کہ ایک اعرابی عرب کے فصیح لوگوں میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور وہ یہ سن چکا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الکلم عطا ہوئے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسی کتابِ معجز نازل کی گئی ہے جس کے مقابلے سے فصحائے عرب عاجز ہیں، چنانچہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ پر جو نازل کیا گیا ہے، اس میں اس طرح کا کلام ہے جو میں نے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦١٠) مستدرك الحاكم (٤٧٨/٢) فتح البيان (١٢/ ٢٥١_ ٢٥٥)

55

کہا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو نے کیا کہا ہے؟ چنانچہ اس اعرابی نے کہا: میں نے یہ کہا ہے: ؎

وَحَيٌّ ذَوِيْ الْأَضْغَانِ تسب عقولهم تحيتك القربى فَقَدْ يرفع النغل
وَإِنْ جَهَرُوْا بِالْقَوْلِ فَاعْفُ تَكَرُّمًا وَإِنْ سَتَرُوْا عَنْكَ الْمَلَامَةَ لَمْ تبل
فَإِنَّ الَّذِيْ يُؤْذِيْكَ مِنْهُ اسْتِمَاعُهُ وَإِنَّ الَّذِيْ قَدْ قِيْلَ خَلْفَكَ لَمْ يقل

(''أضغان'' ''ضغن'' کی جمع ہے بہ معنی کینہ و عداوت ''سبي'' بہ معنی قید کردن ''يقال نغل الاديم'' بالكسر فسد والعامة تقول قلبه على أي ضغن يعني حي من بينك وبينه عداوة وحقد تحية كتحيتك أقربائك فقد يرفع بذلك الضغن'')۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیتِ کریمہ پڑھی: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ... الآية﴾ تو وہ اعرابی بول اٹھا: ''هٰذَا وَاللّٰهِ السِّحْرُ الْحَلَالُ، وَاللّٰهِ مَا تَخَلَّيْتُ وَلَا كَانَ فِيْ عِلْمِيْ أَنَّهُ نَزَلَ وَيُؤْتَى بِأَحْسَنَ مِمَّا قُلْتُ، أَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَاللّٰهِ مَا خَرَجَ هٰذَا إِلَّا مِنْ ذِيْ ال'' (انتهى كلامه ذكره الشيخ زاده)۔ ال بہ معنی اللہ عزوجل ہے۔ ''أَيْ: وَاللّٰهِ مَا بَلَغَ هٰذَا الْكَلَامُ إِلَّا مَنْ هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ جَاءَ بِهِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهِ لِأَنَّهُ خَارِجٌ عَنْ وُسْعِ الْبَشَرِ'' یعنی یہ واللہ! کلام سحرِ حلال ہے، واللہ! میں نے خیال کیا اور نہ میرے علم میں تھا کہ وہ نازل ہوا اور اس سے بہتر لایا جائے گا جو میں نے کہا، میں گواہی دیتا ہوں کہ تم اللہ کے رسول ہو، واللہ! نہیں پہنچایا اس کلام کو مگر اس نے جو اللہ کا رسول ہے، وہ اس کو اپنے رب کے پاس سے لایا، کیوں کہ وہ بشر کی طاقت سے باہر ہے۔

بالجملہ برائی کا مقابلہ اچھی سے اچھی بھلائی کے ساتھ کرنا، اسی بختاور آدمی کا کام ہے جس کو فضائلِ نفسانی اور قوتِ روحانی کا بڑا حصہ ملا ہے، کیوں کہ انتقام میں مشغول ہونا تو صرف ضعفِ نفس کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس لیے کہ نفس خارجی عوامل سے اثر پذیر ہو جاتا ہے، اس لیے کہ جب نفس قوی ہوتا ہے اور خارجی واردات سے متاثر نہیں ہوتا اور جب ان سے متاثر نہ ہوا تو ان کو برداشت کرنا اس کے لیے مشکل نہیں ہوتا اور نہ وہ انتقام میں مشغول ہوتا ہے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ یہ نیک سیرت اسی کو ملتی ہے جس کو قوت اور صفائے نفس کا ایک بڑا حصہ ملا ہوا ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ معنی یہ ہوں کہ یہ نیک خصلت اسی کو نصیب ہوتی ہے جو آخرت کے ثواب سے ایک عظیم حصہ والا ہے۔ تو اس وجہ سے قولہ: ﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا﴾ ان کے صبر کرنے کی وجہ سے ان کی تعریف ہو گی۔ اور قولہ: ﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ﴾ بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہوگا۔ پھر جب اللہ پاک نے اگلی آیت میں یہ بات بیان فرمائی کہ احسن اعمال و اقوال اللہ کی طرف دعوت دینا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ دعوت الی اللہ کے طریقوں میں سے بڑا عمدہ طریقہ دلائل کا بیان کرنا اور حجتوں اور برہانوں کا قائم کرنا ہے جو معبودِ برحق کے وجود پر دلالت کرتی ہے جو وحدہ لاشریک لہ قادر مطلق ہے اور جس کی صفت حکمتِ بالغہ ہے تو اب ان دلیلوں کی تقریر شروع کی، چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَمِنۡ اٰيٰتِهِ الَّيۡلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ ؕ لَا تَسۡجُدُوۡا
لِلشَّمۡسِ وَلَا لِلۡقَمَرِ وَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ الَّذِىۡ خَلَقَهُنَّ اِنۡ كُنۡتُمۡ
اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ ۝٣٧ فَاِنِ اسۡتَكۡبَرُوۡا فَالَّذِيۡنَ عِنۡدَ رَبِّكَ
يُسَبِّحُوۡنَ لَهٗ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَهُمۡ لَا يَسۡـَٔمُوۡنَ ۝٣٨ وَمِنۡ
اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الۡاَرۡضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا
الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ ؕ اِنَّ الَّذِىۡۤ اَحۡيَاهَا لَمُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ؕ اِنَّهٗ
عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝٣٩

اور اسی (اللہ) کی نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند بھی ہیں۔تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، اگر واقعی تم اسی کی عبادت کرتے ہو تو تم اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان (سب) کو پیدا کیا ہے (37) پھر اگر وہ تکبر کریں تو (پروا نہیں کیوں کہ) جو (فرشتے) آپ کے رب کے پاس ہیں، وہ اس کی رات دن تسبیح کرتے ہیں اور وہ اُکتاتے نہیں (38) اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ آپ زمین کو دبی ہوئی (خشک اور بنجر) دیکھتے ہیں، پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ لہلہانے لگتی ہے اور اُبھرنے (پھلنے پھولنے) لگتی ہے، بلاشبہ وہ (اللہ) جس نے اس (زمین) کو زندہ کیا، وہ مُردوں کو ضرور زندہ کرنے والا ہے۔بے شک وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے (39)

قدرتِ الٰہی کی نشانیاں:

یہ کیا چیز ہیں اور ان کا غرور کیا چیز ہے۔ انتھٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو اپنی عظیم قدرت سے آگاہ کرتا ہے اور اس بات پر آگاہ کرتا ہے کہ کوئی اس کا نظیر اور مثل نہیں ہے اور ہر اس شے پر قادر ہے جس کو وہ کرنا چاہتا ہے اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے رات دن اور سورج و چاند ہیں۔یعنی اس نے رات کو اس کی تاریکی کے ساتھ بنایا اور دن کو اس کی روشنی کے ساتھ بنایا اور یہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں۔اس نے سورج بنایا اور اس کا نور اور روشنی اور چاند اور اس کی روشنی بنائی اور اس کے فلک میں اس کی منزلوں کا اندازہ مقرر کیا اور اپنے فلک میں اس کی چال مختلف کی، تاکہ اس کی اور سورج کی چال کے اختلاف سے رات اور دن اور ہفتوں اور مہینوں اور سالوں کی

مقدار معلوم ہو سکے اور اس کی وجہ سے حقوق اور عبادات کے اوقات اور معاملات کا پورا ہونا ظاہر ہو جائے۔

پھر ان سب اجرام میں سے جو زیادہ تر حسین تھے جن کا عالم علوی وسفلی میں مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، یعنی سورج اور چاند تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ یہ دونوں مخلوق ہیں، اس کے بندوں میں سے دو بندے ہیں، اس کے غلبے اور تسخیر کے تحت وہ مقہور اور مسخر ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ تم سورج اور چاند کو سجدہ مت کرو، بلکہ سجدہ اللہ کو کرو جس نے ان کو بنایا اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔ یعنی اسی کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ لہٰذا تمھارا اس کو پوجنا اس حالت میں کہ اس کے ساتھ غیر کو بھی پوجو تم کو کچھ فائدہ نہ دے گا، کیوں کہ وہ اس کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

اسی لیے یوں فرمایا کہ پھر اگر وہ تکبر کریں، یعنی اکیلے اس کو پوجنے سے اور اس پر اڑ جائیں کہ اس کے ساتھ اس کے غیر کو شریک کریں تو جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں، یعنی فرشتے وہ دن رات اس کی پاکی بولتے ہیں اور وہ تھکتے نہیں ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٨٩] ''سو اگر یہ لوگ نبوت کا انکار کریں تو ہم نے اس کے لیے ایسے بہت سے لوگ مقرر کر دیے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں۔'' حافظ ابو یعلی رحمہ اللہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رات کو اور دن کو اور سورج اور چاند کو گالی مت دو اور نہ ہواؤں کو گالی دو، کیوں کہ یہ ایک قوم کے لیے رحمت کے طور پر بھیجی جاتی ہیں اور ایک قوم کے لیے عذاب کے طور پر۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ ... الآية ﴾ یعنی اور مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت کی نشانی کے طور پر تو دیکھتا ہے کہ زمین خاشعہ، یعنی ہامدہ ساکن ہوتی ہے اس میں کچھ روئیدگی نہیں ہوتی، بلکہ وہ مردہ ہوتی ہے، پھر جب ہم نے اس پر پانی اتارا تو اس نے سب قسم کی کھیتیاں اور میوے نکالے۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْۤ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ یعنی جس نے اس کو زندہ کیا، وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ اس کو ہر شے پر قدرت ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ قدرتِ الٰہی کی آیات میں سے رات دن اس بات پر ہیں کہ ایک مقرر حد پر ایک دوسرے کے پیچھے چلے آتے ہیں اور ایک تقسیم شدہ اندازے کے مطابق نوبت بنوبت آتے رہتے ہیں اور سورج اور چاند میں اللہ تعالیٰ کی نشانی یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی چال مقرر ہے اور ان کا نور بھی خاص طور پر مقرر ہے۔ وہ دونوں روشن ہیں مگر ہر ایک کی روشنی علاحدہ ہے، وہ دونوں چلتے ہیں، مگر ہر ایک کی چال اور

---

[1] مسند أبي يعلیٰ (١٣٨/٤) اس کی سند میں ''سفیان بن وکیع'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (١٢٨/٤)

انداز جدا جدا ہے، رنگ ڈھنگ الگ الگ ہے۔ ایک کا تسلط دن کو ہوتا ہے اور دوسرے کا رات کو۔ غرض یہ کہ رات دن کا اس طرح سے ایک دوسرے کے آگے پیچھے آنا کہ اس میں مخلوق کے فوائد اور مصالح ہوں اور سورج اور چاند کو اس کام کے لیے مسخر کرنا جو اُن سے مطلوب ہے، ان ظاہر تر نشانیوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت اور علم و حکمت کے کمال پر دلالت کرتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ چار چیزوں کا ذکر کیا، اس کے باوجود کہ پوجنے والوں نے تو سورج اور چاند کو پوجا، جیسا کہ آیندہ آئے گا، رات دن کو نہیں پوجا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات بتانا منظور ہے کہ سورج اور چاند پورے طور پر سجدہ کے مرتبے سے گرے ہوئے ہیں، اس طرح کہ مخلوقیت میں ان کو اعراض (منہ پھیرنا) کے رشتے میں پرویا ہے، وہ اعراض کہ جن کو بہ ذاتِ خود کسی طرح کا قیام اور قرار نہیں، وہ کیسے اس قابل ہو سکتے ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے، یا عبادت کی جائے۔ اور یہی بھید ہے کہ سب کو آیات کی لڑی میں منظّم کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سجدے کے قابل نہ ہونے میں، جیسے: اعراض وغیرہ مخلوق ہے ویسے ہی یہ ہیں۔ اس بارے میں ان کو اَور مخلوق پر کوئی شرف حاصل نہیں، جس طرح دوسری مخلوق اپنے خالق کی وحدانیت اور قدرت پر دال ہے، اسی طرح یہ بھی ہیں، گو منافع کے لحاظ سے وہ کسی دوسری مخلوق سے زیادہ منافع دینے والے ہوں یہ اَور بات ہے۔

پھر جب یہ بیان کیا کہ چاروں اللہ پاک کی نشانیوں میں سے ہیں تو مخلوق کو سورج چاند کے پوجنے سے منع کیا اور حکم دیا کہ اللہ عزوجل کو سجدہ کریں۔ ارشاد فرمایا کہ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، کیوں کہ یہ دونوں تو اس کی مخلوقات میں سے دو مخلوق ہیں، گو اُن کے فوائد کثرت سے ہیں۔ چنانچہ کچھ اس وجہ سے یہ بات ٹھیک نہیں ہو سکتی کہ اپنے خالق کی ربوبیت میں اس کے شریک ہو جائیں، بلکہ یہ تو اپنے طلوع و غروب اور چلنے میں مختلف ہونے کی بنا پر اور رات دن کی حرکت سے علی الاعلان پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ بھائیو! ہم تو اپنے خالقِ قدیر و قادر کی مخلوق اور مقہور ہیں، اس کے حکم کے مطابق تمھارے کاروبار کی اصلاح کے لیے چکر لگا رہے ہین اور رات دن چلتے رہتے ہیں۔

فرمایا: اور سجدہ کرو اللہ کو جس نے ان کو بنایا، کیوں کہ سجدے کا مستحق خالق ہی ہے، مخلوق اس لائق نہیں کہ اسے سجدہ کیا جائے۔ ﴿ خَلَقَهُنَّ ﴾ کی ضمیر ان چار اشیاء کی طرف راجع ہے جن کا پہلے ذکر آیا ہے، اس لیے کہ غیر عقلاء کی جمع کا حکم وہی ہے جو اناث کی جمع کا ہے۔ یا ان کی ضمیر آیات کی طرف پھرتی ہے، یا شمس و قمر کی طرف پھرتی ہے، اس لیے کہ ائمہ کی ایک جماعت کے نزدیک تثنیہ بھی جمع ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ کی تبیین یہ ہے کہ چار کی تعبیر جو ضمیرِ اناث کے ساتھ کی، باوجود اس کے کہ ان میں سے تین مذکر ہیں اور عام طور پر مذکر کو مؤنث پر غالب کیا جاتا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ جب ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهِ ﴾ فرمایا، پھر چاروں کو آیات کے رشتے میں پرویا تو ان میں سے ہر ایک آیت ہو گیا اس لیے ان کو ضمیرِ اناث کے پیرائے میں ادا کیا اور ﴿ خَلَقَهُنَّ ﴾ فرمایا۔

﴿ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾ اس شرط کا جواب محذوف ہے، تقدیر یہ ہے: ''لَا تَسْجُدُوْا لِغَيْرِهٖ'' اور ﴿ اِيَّاهُ ﴾ کو جو پہلے رکھا تو وہ حصر اور تخصیص کے لیے ہے، یعنی اگر تم خاص اسی کو پوجتے ہو تو اس کے غیر کو سجدہ مت کرو، اس لیے کہ سجدہ تو اللہ پاک کی خاص ترین عبادات میں سے ہے، کیوں کہ عبادت سجدے ہی سے عبارت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے ذلیل ہونا اور اس کی جناب کی تعظیم کرنا اور سجدہ کرنا انتہا درجے کی تعظیم ہے تو عبادت کی دوسری وجوہ کی نسبت اللہ سبحانہٗ کے ساتھ زیادہ خاص ہوا۔ لہٰذا جو شخص عبادت کو اللہ پاک کے ساتھ خاص کرے، اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کے غیر کو سجدہ نہ کرے، اس لیے کہ صرف اسی اللہ کے لیے عبادت کا خاص کرنا بطریق اولیٰ لازمی ہے۔ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ سورج اور چاند کو سجدہ کرتے تھے، جیسے: صابئین جو تاروں کو پوجتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ان کو سجدہ کرنے سے ان کا ارادہ اللہ کو سجدہ کرنا ہوتا ہے تو انھیں اس سے منع کیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ خاص طور پر سجدہ کی ممانعت کا ذکر کیا گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ سجدہ مراتبِ عبادت کی انتہا ہے۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مشرک بولے کہ مت سجدہ کرو مگر لات و عزیٰ کو، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْــَٔمُوْنَ ﴾ اب اگر کوئی یہ کہے کہ جو متکبر ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم کمتر اور ذلیل تر ہیں، اس لیے ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت بالذات کے لائق نہیں، اس لیے ہم صرف اس کو پوجتے ہیں جو اس کے پاس ہماری سفارش کرے اور ہم کو اس کے قریب کر دے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے: ؎

خدا کی عبادت کے قابل نہیں ہوں　　　میں بندے کا بندہ بنا چاہتا ہوں

پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے سجود سے تکبر کرنے والا ٹھہرایا؟ تو کہیں گے کہ استکبار سے مراد اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے سے استکبار نہیں ہے، بلکہ استکبار سے مراد رسول اللہ ﷺ کے اس قول کو قبول کرنے سے تکبر کرنا ہے جس میں اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ تم غیر اللہ کو سجدہ کرو۔ معنی یہ ہیں کہ پھر اگر وہ تیرے حکم کی بجا آوری میں تکبر کریں اور انکار کریں اور واسطہ ٹھہرانے کی بات کریں۔ فَذٰلِكَ لَا يُقَلِّلُ عَدَدُ مَنْ يَخْلُصُ عِبَادَتَهُ لِلّٰهِ تَعَالٰى۔ یہ جواب محذوف ہے شرط کا۔ اس کی جگہ میں ﴿ فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْــَٔمُوْنَ ﴾ کو رکھ دیا ہے۔

یہ جواب محذوف کی علت اور اس پر دال ہے، یعنی ان کے اس استکبار سے ان لوگوں کی گنتی کم نہیں ہو جاتی جو اپنی عبادت کو اللہ پاک کے لیے خالص کرتے ہیں، کیوں کہ مقرب فرشتے اللہ تعالیٰ کے پاس ہمیشہ شریکوں سے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، کافر بے شک تکبر کرتے رہیں، ان کے تکبر سے کیا بگڑتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جواب محذوف ''فَدَعْهُمْ وَشَأْنَهُمْ'' ہے، یعنی اگر یہ لوگ حکم کی بجا آوری سے تکبر کریں تو تُو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دے،

کیونکہ اللہ کے ایسے بندے ہیں جو اس کو پوجتے ہیں، جیسا کہ فرشتے ہمیشہ سے رات دن اللہ سبحانہ کی تسبیح کیا کرتے ہیں۔

کسی نے کہا کہ ﴿ يُسَبِّحُوْنَ ﴾ کے معنی ''يَسْجُدُوْنَ'' ہیں، یعنی سجدہ کرتے ہیں اور اس میں تسبیح کہتے ہیں، یا بہ معنی ''يُصَلُّوْنَ'' ہے، یعنی نماز پڑھتے ہیں اور اس میں سجود وغیرہ کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک عابد کو کبھی ختم نہیں کرتا، بلکہ اس کی مخلوق میں سے وہ ہیں جو دائمی طور پر اس کی عبادت کیا کرتے ہیں، نہ اکتاتے ہیں نہ سست پڑتے ہیں۔ کلمۂ ''عند'' سے مراد ان کی مکانیت اور تشریف کا نزدیک ہونا ہے، مکانی مراد نہیں ہے، کیوں کہ اللہ سبحانہٗ مکان سے پاک ہے وہ تو کون و مکان کا خالق ہے، یہ تشریفی عندیت ہے، جیسا کہ اس حدیث شریف میں ہے: «أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ»[1]، «وَأَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ»[2]

یہ آیتِ کریمہ بلا اختلاف آیاتِ سجود میں سے ہے۔ اختلاف موضع سجود میں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ سجدے کا مقام ﴿ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾ ہے، اس لیے کہ امر سے متصل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سجدے کا مقام ﴿ وَهُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ ﴾ ہے، کیوں کہ یہاں کلام مکمل ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ حم سجدہ سے دو آیتوں کے آخر میں سجدہ کرتے تھے اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان میں سے پہلی آیت پر سجدہ کرتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ پہلی اور آخری آیت پر سجدہ کرتے تھے۔[3] جب اللہ پاک نے چار فلکی دلیلیں ذکر کیں تو ان کے بعد دلائلِ ارضی بیان کیے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً ﴾

یہ ہر صالح کو خطاب ہے، یا رسول اللہ ﷺ کو ہے، یعنی اللہ پاک کی نشانیوں میں سے جو اس کی قدرت اور وحدانیت اور بعث پر دال ہیں یہ بات ہے کہ تو دیکھتا ہے کہ زمین دبی پڑی ہے، یعنی بعض زمین کو تو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے اور بعض کو دل کی آنکھ سے دیکھے ہوئے پر قیاس کر کے کہ وہ خشک پڑی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رؤیت کے دو معنی ہیں: ایک تو آنکھ سے دیکھنا اور دوسرے دل سے جاننا تو یہاں دونوں معنی ٹھیک ہیں۔ چنانچہ جس زمین کو اپنے سر کی آنکھ سے دیکھا تو یہاں بصری رؤیت ہوئی اور جس کو آنکھ سے نہیں دیکھا تو دیکھے ہوئے پر قیاس کر کے اس کو دل سے دیکھا تو یہ قلبی رؤیت ہوئی۔

﴿ خَاشِعَةً ﴾ کے معنی ہیں: ''يَابِسَةً مُتَطَامِنَةً لَا نَبَاتَ فِيْهَا'' یعنی خشک ساکن جس میں روئیدگی نہیں ہے لفظ ﴿ خَاشِعَةً ﴾ کے یہ معنی زیادہ مناسب ہیں۔ کسی نے ﴿ خَاشِعَةً ﴾ کی تفسیر یوں کی: ''يَابِسَةً، جَدَبَةً، جَامِدَةٍ''، یعنی خشک قحط زدہ جمی ہوئی۔ کسی نے کہا ہے کہ ''اَلْغَبْرَاءُ الَّتِيْ لَا تُنْبِتُ''، یعنی غبار اڑتی بغیر روئیدگی کے۔ امام ازہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس وقت زمین خشک ہو گئی اور اس پر پانی برسایا نہ گیا تو محاورۂ عرب میں بولتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٥)

[2] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ [3] الدر المنثور (٣٢٩/٧)

"قَدْ خَشِعَتْ"[1] خشوع بہ معنی تذلل و تقاصر ہے، یعنی ذلیل و پست و کم ہونا۔ جیسے کہتے ہیں کہ فلاں نے فلاں کے لیے خشوع کیا، یعنی تواضع اور فروتنی کی، اپنے آپ کو پست کیا اور چھوٹا کیا۔

تکبر اس کی ضد ہے، چونکہ عربی عجب عروس زیبا زبان ہے، اس میں اکثر استعارات و کنایات کے زیور سے آراستگی کی جاتی ہے، اس لیے حالتِ قحط اور بے نباتی کے لیے خشوع کا استعارہ کیا گیا، گویا اس حال میں وہ ایسی ہو رہی ہے، جیسے: کوئی شخص خاضع، خاشع، متواضع اور خاموش ہو رہا ہے۔ جس طرح کہ اس آیتِ کریمہ میں زمین کو "هُمُوْد" کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے: ﴿ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً ﴾ [الحج: ٥] "تو دیکھتا ہے کہ زمین (بنجر اور) خشک ہے۔" "هُمُوْد" آگ کے بجھنے کو کہتے ہیں، یہاں اس کے خشک اور بے نبات ہونے کو آگ بجھنے سے تشبیہ دی ہے۔

خشوع و ہمود یہ دونوں وصف زمین کے خلاف ہیں اس کے وصف کے اہتزاز و ربو کے جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ﴾۔ "ماء" سے مراد بارش کا پانی ہے، یا نہر ندی کنوئیں باؤلی کا پانی، کیوں کہ اس کی اصل بھی آسمان ہی کے پانی سے ہے۔ یعنی تم دیکھتے تھے کہ زمین کا یہ حال ہو رہا تھا کہ خشک بے نبات گرد آلود دبی پڑی تھی، پھر جب اللہ پاک نے اس پر پانی نازل کیا تو اس نے روئیدگی لے کر ایک عظیم اور کثیر اور تیز حرکت کی تو اس کا یہ حرکت کرنا ایسا ہوا جیسے کوئی خود اپنی سعی سے اس کو کرتا ہے اور وہ ابھری۔ "اهتزاز" کے معنی حرکت کرنا یا ہلنا ہیں۔ آدمی جب حرکت کرتا ہے تو محاورے میں کہتے ہیں: "اِهْتَزَّ الْإِنْسَانُ" جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:

تَرَاهُ كَنَصْلِ السَّيْفِ يَهْتَزُّ لِلنَّدَى إِذَا لَمْ تَجِدْ عِنْدَ امْرِءٍ لِسُوْءٍ مَطْعَمًا

یعنی دیکھے تو ممدوح کو کہ تلوار کے پھل کی طرح خوشی کے مارے ہلتا ہے سخاوت کے واسطے جبکہ تو بد آدمی کے نزدیک کھانا نہ پائے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا: "ربت" کے معنی یہ ہیں کہ زمین پھولی اور بلند ہوئی، اس سے قبل کہ روئیدگی اگائے۔[2] یعنی پھٹے روئیدگی سے اپنے مردہ ہونے کے بعد۔ اس بنا پر عبارت میں تقدیم و تاخیر ہوگی۔ تقدیر یہ ہے: "رَبَتْ وَاهْتَزَّتْ" یعنی پھولی اور نبات کو لے کر حرکت کی۔ کسی نے کہا ہے کہ "اهتزاز" اور "ربو" کبھی تو زمین سے روئیدگی نکلنے سے پہلے ہوتی ہیں اور کبھی اس کے بعد ہوتی ہیں۔ "ربو" کے معنی لغت میں مرتفع ہونے کے ہیں، جس طرح کہ بلند جگہ کو "ربوۃ و رابیة" بولتے ہیں۔ چنانچہ نبات باہر آنے کے لیے حرکت کرتی ہے، پھر اپنے جسم کے طول و عرض میں بڑھتی جاتی ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ بارش سے خوش ہوتی ہے اور روئیدگی کے ساتھ پھولتی ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ شق ہوگئی، پھر اس کی مٹی بلند ہوئی اور اس سے روئیدگی نکلی اور زمین و آسمان کے درمیان بلند ہوئی روئے زمین کو ڈھانکتی ہوئی اور اس کی رگیں منشعب ہوئیں، پھیلیں اور اس کے تنے موٹے ہوئے تو اب اس

[1] فتح القدير (٦٧٩/٤) [2] تفسير الطبري (٤٧٦/٢١)

کے اس آسان حالت پر چلنے کو مانع ہو گئے جس میں وہ پہلے تھی اور اس روئیدگی سے متزین ہوئی، گویا ایسے ہو گئی جیسے کوئی اپنے لباس اور زینت میں تکبر کرتا ہے اور اکڑتا ہے، اس لیے کہ اس سے پہلے تو وہ ذلیل اور متواضع کی طرح تھی۔ امام ابوجعفر اور خالد رحمہ اللہ نے "رَبَأَتْ"[1] پڑھا ہے۔ اس آیت کی تفسیر پورے طور پر سورۃ الحج میں گزر چکی ہے۔[2]

پھر جب اللہ پاک نے بیان کیا کہ اللہ پاک کے دین کی طرف دعوت دینا بہت عظیم منصب اور بہت باعزت مرتبہ ہے تو پھر یہ بیان کیا کہ اس کی طرف دعوت دینا صحیح معنوں میں یہ ہے کہ اس کے وجود کے دلائل ذکر کیے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ وہ عظمت کی صفات کا مالک ہے اور اس بارے میں بہت سے دلائل اور آیات ذکر فرمائے اور اب ان لوگوں کو ڈرانے اور دھمکانے کی طرف توجہ کی جو ان آیات میں جھگڑا کرتے ہیں اور شبہہ ڈال کر ان میں جھگڑتے ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۭ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝40 اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝41ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝42 مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ۝43 وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ۭ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ۭ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاۗءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝44

بلاشبہ جو لوگ ہماری آیات میں کج روی وکفر کرتے ہیں، وہ ہم سے چھپے نہیں رہتے۔ کیا پھر جو شخص آگ میں ڈالا جائے گا، وہ بہتر ہے یا وہ جو روزِ قیامت امن کے ساتھ آئے گا؟ تم جو چاہو عمل کرو، تم جو کچھ کرتے ہو بے شک اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے 40 بے شک جن لوگوں نے ذکر (قرآن) کو نہ مانا، جب وہ اُن کے پاس آیا (تو وہ اپنا انجام دیکھ لیں گے)

[1] فتح القدير (٦٧٩/٤) [2] رقم الآية (٥) فتح البيان (١٢/٢٥٥_٢٥٧)

حالاں کہ بلاشبہہ یہ تو ایک بہت بلند مرتبہ کتاب ہے﴿41﴾ باطل اس کے پاس پھٹک بھی نہیں سکتا، اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، یہ بڑی حکمت والے، تعریف کیے ہوئے کی طرف سے نازل کی گئی ہے﴿42﴾ آپ سے بھی وہی کچھ کہا جا رہا ہے جو آپ سے پہلے رسولوں سے کہا گیا، بے شک آپ کا رب معاف کر دینے والا بھی ہے اور دردناک عذاب دینے والا بھی﴿43﴾ اگر ہم اسے عجمی (زبان کا) قرآن بنا کر بھیجتے تو وہ ضرور کہتے: اس کی آیتیں (عربی میں) کھول کر بیان کیوں نہیں کی گئیں؟ کیا (کتاب) عجمی ہے اور (رسول) عربی؟ کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے، جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ اُن کے حق میں اندھا پن ہے، یہ لوگ (جو حق بات نہیں سنتے گویا) دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہوں﴿44﴾

آیاتِ الٰہی میں کج روی اختیار کرنے والوں کی سزا:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کلام کو اس کی غیر جگہ پر رکھنا الحاد ہے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ الحاد کفر و عناد ہے۔[2] ﴿لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا﴾ میں سخت قسم کی دھمکی اور وعید ہے، یعنی اللہ پاک اس شخص کو جانتا ہے جو اس کی آیات اور اسماء و صفات میں الحاد کرتا ہے اور وہ عن قریب اس کو اس پر عقوبت اور سزا دے گا، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ یعنی قیامت کے دن آگ میں پڑنے والا اور بے خوف ہو کر آنے والا یہ دونوں برابر نہ ہوں گے۔ پھر اللہ عزوجل نے کافروں کو دھمکاتے ہوئے فرمایا: ﴿اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ﴾۔ امام مجاہد، ضحاک اور عطاء خراسانی رحمہم اللہ نے کہا یہ وعید ہے،[3] یعنی تم جو چاہو کرو خیر یا شر بے شک وہ تم کو جانتا ہے اور تمھارے اعمال کو دیکھتا ہے، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾۔

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ﴾۔ امام ضحاک، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ذکر قرآن شریف ہے۔[4] ﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ﴾ یعنی بے شک وہ البتہ ایک بڑی غالب کتاب ہے، کوئی اس جیسی کتاب لانے کا قصد نہیں کر سکتا۔ باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے نہ پیچھے سے، یعنی بطلان اس کی طرف آ ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ وہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ

---

[1] تفسير الطبري (٤٧٨/٢١) [2] تفسير ابن كثير (١٢٨/٤) [3] تفسير الطبري (٤٧٨/٢١) [4] تفسير الطبري (٤٧٩/٢١)

﴿ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴾ یعنی وہ اس ذات پاک کی طرف سے اتارا ہوا ہے جو اپنے اقوال و افعال میں حکمتوں والا ہے، اپنے سارے اوامر و نواہی میں سراہا ہوا ہے، سب کے نتائج اور انتہا بہت اچھی ہے۔

پھر اللہ عز و جل نے فرمایا: ﴿ مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ تیرے واسطے بھی ویسی ہی تکذیب کہی جاتی ہے، جیسی کہ ان رسولوں کے واسطے کہی گئی تھی جو تجھ سے پہلے تھے۔ چنانچہ جیسا تو جھٹلایا گیا، ویسے ہی وہ جھٹلائے گئے اور جیسا انھوں نے اپنی قوم کی ایذاء دہی پر صبر کیا، ویسا ہی تو اپنی قوم کی ایذاء دہی پر صبر کر۔ اس قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اور امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور کوئی قول بیان نہیں کیا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ﴾ یعنی بے شک تیرا رب البتہ بخشش والا ہے، اس شخص کے لیے جو اس کی طرف رجوع ہوا اور دردناک عذاب والا ہے اس شخص کے لیے جو اپنے کفر، سرکشی، عناد، دشمنی اور مخالفت پر چلتا رہا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ﴾ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کا عفو اور درگزر کرنا نہ ہوتا تو کسی کو عیش گوارا نہ ہوتا اور اگر اس کی وعید اور سزائیں نہ ہوتیں تو البتہ ہر کوئی بھروسا کر بیٹھتا۔[2]

قرآنِ مجید کا انکار کرنا عناد اور سرکشی ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ جَعَلْنَٰهُ قُرْءَانًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا ﴾ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کا ذکر فرمایا اور اس کے الفاظ و معانی میں جو فصاحت و بلاغت اور حکمتیں ہیں، ان کا بیان فرمایا اور اس کے باوجود مشرکین اس پر ایمان نہ لائے تو اس بات سے آگاہ فرمایا کہ ان کا قرآن شریف کے ساتھ کفر کرنا دراصل عناد و تعنت و سرکشی کا کفر ہے، جیسا کہ اللہ عز و جل نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ نَزَّلْنَٰهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ۝ فَقَرَأَهُ عَلَيْهِم مَّا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ﴾ [الشعراء: ۱۹۸۔ ۱۹۹] ''اور اگر ہم اسے کسی عجمی شخص پر نازل فرماتے پس وہ ان کے سامنے اس کی تلاوت کرتا تو یہ اسے باور کرنے والے نہ ہوتے۔''

اور اسی طرح اگر سارا قرآن شریف عجم کی زبان میں اتارا جاتا تو سرکشی اور دشمنی سے کہتے کہ یہ عرب کی زبان میں کھول کر کیوں نہیں اتارا گیا اور البتہ اس کو اوپرا جانتے تو کہتے کیا اوپری زبان کی کتاب اور عرب کا آدمی، یعنی عجمی کلام ایک عربی مخاطب پر کیسے اتارا جاتا ہے جو اس کو سمجھتا نہیں ہے۔ اسی طرح یہ معنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما،

---

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۴۸۱) تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۲۷۳)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۲۷۳) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ''علی بن زید'' ضعیف راوی ہے۔

امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم سے روایت کیے گئے ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ان کے قول: ﴿ لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ بعض آیتیں اوپری زبان میں اور بعض عربی زبان میں کیوں نہ اتاری گئیں۔ یہ قول امام حسن بصری رحمہ اللہ کا ہے اور وہ اس کو اسی طرح یعنی ﴿ اَعْجَمِيٌّ ﴾ پر بغیر استفہام کے پڑھتے تھے۔ یہ قول امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔[2] اس قول میں بہ نسبت پہلے قول کے زیادہ سرکشی اور عناد ہے۔

قرآنِ مجید ہدایت اور شفاء ہے:

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ﴾ یعنی اے محمد! تو کہہ دے کہ یہ قرآن اس شخص کے لیے جو اس پر ایمان لایا اس کے دل کے لیے ہدایت ہے اور ان شکوک و شبہات کے لیے شفا ہے جو سینوں میں ہیں۔ اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے، یعنی وہ اس شے کو سمجھتے نہیں ہیں جو اس میں ہے اور وہ ان پر اندھاپا ہے، یعنی وہ اس بیان کی طرف راہ نہیں پاتے جو اس میں ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾ [بني إسرائيل: ٨٢] ''یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں مومنوں کے لیے تو سراسر شفاء اور رحمت ہے۔ ہاں ظالموں کو بجز نقصان کے اور کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا، یعنی وہ پکارے جاتے ہیں اس جگہ سے جو ان کے دلوں سے دور ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: معنی اس کے یہ ہیں گویا جو شخص ان سے خطاب کرتا ہے وہ ان کو دور جگہ سے پکارتا ہے، نہیں سمجھتے ہیں اس بات کو جو وہ کہتا ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ آیت مثل اس آیت کے ہے ﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٧١] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اس (جانور) کو پکارتا ہے جو پکارنے اور چلانے کے سوا کچھ نہیں سنتا۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، اس لیے وہ عقل نہیں رکھتے۔'' ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پکارے جائیں گے قیامت کے دن ان کے زشت تر ناموں کے ساتھ۔[4]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں میں سے ایک شخص کے ساتھ بیٹھے ہوئے فیصلہ کر رہے تھے، اچانک اس شخص نے کہا "یَا لَبَّیْکَاہُ"، یعنی اے شخص میں حاضر ہوں تو عمر رضی اللہ عنہ نے اس فرمایا: تو کیوں "لَبَّیْکَ" کہتا ہے؟ کیا تو نے کسی کو دیکھا ہے یا کسی نے تجھے پکارا ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھے ایک پکارنے والے نے پکارا ہے دریا کے پیچھے سے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴾۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا ہے۔[5]

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٤٨٢) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٢٧٣) [2] تفسير الطبري (٢١/٤٨٣)
[3] تفسير الطبري (٢١/٤٨٥،٤٨٤) [4] تفسير الطبري (٢١/٤٨٥) [5] تفسير ابن كثير (٤/١٢٨-١٣٠)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ الحاد اصل میں مطلق نافرمانی اور انحراف اور دوسری طرف توجہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی معنی میں قبر کی لحد کو لحد بولتے ہیں، اس لیے کہ وہ اس کے ایک طرف کو زیادہ مائل ہوتی ہے جبکہ قبر کھودنے والا سیدھی کھودنے سے ہٹ کر ایک جانب کو کھودتا ہے تو کہتے ہیں: "أَلْحَدَ الْحَافِرُ وَلَحَدَ"۔ چنانچہ الحاد کا استعارہ حالِ زمین کے لیے کیا گیا ہے، جبکہ وہ ملحود ہو، یعنی مائل کی ہوئی ہو۔ پھر اس کا استعارہ آیاتِ قرآن کی صحت و استقامت کے لحاظ سے ان کی تاویل میں منحرف اور مائل ہونے کے لیے کیا گیا اور محاورے میں بولتے ہیں: "أَلْحَدَ فِي دِيْنِ اللّٰهِ" یعنی اللہ کے دین سے میل وعدول کیا اور لحد بھی کہتے ہیں، یہ ایک لغت ہے "أَلْحَدَ" میں۔ ﴿ يُلْحِدُوْنَ ﴾ کو "أَلْحَدَ وَلَحَدَ" سے پڑھا ہے، یہ دونوں قراءتِ سبعیہ ہیں۔

الحاد کی تفسیر پورے طور پر پہلے گزر چکی ہے، یعنی بے شک جو لوگ ہماری آیتوں میں حق اور راستی سے مائل ہوتے ہیں، اس طرح سے کہ ان میں طعن کرتے ہیں اور باطل قسم کی تاویل وتحریف کرتے ہیں اور ان میں لغو بکتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: قرآن پر ایمان لانے سے مائل ہوتے ہیں۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن کے وقت ﴿ مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ﴾ [الأنفال: ٣٥] یعنی لغو و گانے بجانے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہماری آیتوں میں جھوٹ بولتے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معاندہ و مشاققہ، یعنی دشمنی اور مخالفت کرتے ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ شرک کرتے ہیں۔[2] یہ سب معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

بالجملہ ﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ﴾ کا رجوع ان لوگوں کی طرف ہے جنھوں نے کہا تھا: ﴿ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ ﴾ [حٰمٓ السجدة: ٢٦] یہ وہی ہیں جنھوں نے الحاد کیا اللہ کی آیتوں میں اور حق سے مائل ہوئے تو بولے کہ قرآن اللہ کے پاس سے نہیں ہے یا شعر ہے یا سحر ہے۔ چنانچہ آیات سے مراد آیاتِ قرآن ہیں، جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[3] ﴿ إِنَّ ﴾ کی خبر ﴿ لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ﴾ ہے، یعنی یہ لوگ جن کا ذکر ہوا ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ ہم ان کو جانتے ہیں۔ پھر ہم ان کو ان کاموں کی جزا دیں گے جو وہ کرتے تھے۔

پھر جزا کی کیفیت اور مومن اور کافر کے درمیان فرق بیان فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ استفہام تقریر کے لیے ہے اور اس سے غرض اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ جو آیتوں میں الحاد کرنے والے ہیں وہ تو آگ میں ڈالے جائیں گے اور جو اُن پر ایمان لانے والے ہیں، وہ قیامت کے دن بے خوف

[1] تفسير القرطبي (١٥/٣٦٦) فتح القدير (٤/٦٧٩) [2] تفسير الطبري (٢١/٤٧٧) [3] تفسير القرطبي (١٥/٣٦٦)

ہو کر آئیں گے۔ آیت کا ظاہر عام ہے، اس لیے کہ اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ چنانچہ یہ کافر اور مومن کی تمثیل ہے۔ کہا ہے کہ ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی ہے اور "مَنۡ يُّلۡقٰى" سے مراد ابوجہل ہے اور ﴿ مَّنۡ يَّاۡتِىۡۤ اٰمِنًا ﴾ سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی رضی اللہ عنہ ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "مَنۡ يُّلۡقٰى" سے مراد ابوجہل بن ہشام اور ﴿ مَّنۡ يَّاۡتِىۡۤ اٰمِنًا ﴾ سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ سیدنا بشیر بن تمیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابوجہل اور سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔[1] کلمۂ ﴿ اَمۡ ﴾ کلمۂ ﴿ مَّنۡ ﴾ سے مصحفِ امام کی اتباع کے لیے علاحدہ لکھا جاتا ہے۔

نکتہ:

ظاہر یہ تھا کہ "اَمۡ مَّنۡ يَّدۡخُلُ الۡجَنَّةَ" فرمایا جاتا، مگر یوں نہ فرمایا، اس لیے کہ منظور یہ تھا کہ ان کے امن کی اور خوف کے دور ہونے کی تصریح کی جائے۔ (كما قاله الكرخي) ﴿ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ﴾ امر تہدیدی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ لفظ تو امر کا لفظ ہے اور اس کے معنی وعید ہیں،[2] یعنی تم اپنے وہ اعمال کرو جو تم کو نار میں ڈالیں گے جو بھی تم چاہو، چنانچہ وہ تم کو تمھارے کل اعمال کا بدلہ دے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ﴾ خاص کر اہلِ بدر کے لیے ہے۔[3] مطلب یہ ہے کہ یہ کلمہ اہلِ بدر کے علاوہ تو دھمکی اور وعید ہے اور اہلِ بدر کے لیے بشارت ہے اور ان کے بلند مرتبے کی اطلاع ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّهٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴾ یعنی تم عمل کرو جو چاہو، بے شک وہ تمھارے اعمال کو خوب دیکھتا ہے، اس پر کوئی مخفی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے، پھر وہ اس پر تم کو جزا دے گا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِالذِّكۡرِ لَمَّا جَآءَهُمۡ‌ ۚ وَاِنَّهٗ لَـكِتٰبٌ عَزِيۡزٌ ﴾ جملہ مستانفہ ہے جو ما قبل کی تقریر و تاکید کرتا ہے۔ اور ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر محذوف ہے۔ "أَيْ: يُجَازُوْنَ بِكُفْرِهِمْ أَوْ هَالِكُوْنَ أَوْ يُعَذَّبُوْنَ" یعنی بے شک جو لوگ قرآن کے منکر ہوئے جب وہ ان کے پاس آیا یہ لوگ اپنے کفر کا بدلہ اس طرح سے دیے جائیں گے یا ہلاک کیے جائیں گے یا عذاب کیے جائیں گے۔

شاید یہی نکتہ ہو حذفِ خبر کا کہ جو کوئی اپنے رب کی کتاب کا منکر ہو، وہ کتاب جس میں دین و دنیا کی بھلائی ہے اور ہر قسم کی پند و نصیحت ہے جو فائدہ مند ہے، تو ایسے شخص کی سزا بیان سے باہر ہے جو بری سے بری سزا سمجھو، وہ اس کا مستحق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ﴿ يُنَادَوۡنَ مِنۡ مَّكَانٍۢ بَعِيۡدٍ ﴾ ہے۔ لیکن یہ قول بعید ہے گو

[1] الدر المنثور (٣٣٠/٧) [2] معاني القرآن (٣٨٨/٤) [3] الدر المنثور (٣٣١/٧)

عمرو بن العلاء رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی خبر کے قائم مقام وہی سابق ﴿ إِنَّ ﴾ کی خبر ہے[1] یعنی ﴿ لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ﴾۔ کسی نے کہا کہ یہ جملہ بدل ہے اول جملہ سے، یعنی ﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِيٓ ءَايَٰتِنَا ﴾ اور خبر ﴿ إِنَّ ﴾ کی ہی خبرِ سابق ہے۔ اس بدل سے یہ نکلا کہ آیات میں الحاد کرنے والے قرآن کے منکر ہیں۔ امام سمین رحمہ اللہ نے اَور وجوہ بھی ذکر کی ہیں۔ جب اللہ پاک نے آیات اللہ میں الحاد کرنے والوں کی ملامت میں مبالغہ کیا تو اس کے بعد قرآن شریف کی عظمت بیان فرمائی۔

﴿ وَإِنَّهُۥ لَكِتَٰبٌ عَزِيزٌ ﴾ یعنی بے شک وہ قرآن جس میں کافر الحاد کرتے تھے، البتہ ایک بڑی کتاب عزیز ہے۔ عزیز یا تو عزت سے ماخوذ ہے جس کے معنی غلبہ ہیں، یعنی وہ غالب اور ممتنع ہے اس بات سے کہ کوئی اس کا مقابلہ و معارضہ کرے، یا طعن کرنے والے اس میں طعن کریں، ہر عیب سے ممنوع ہے، اللہ پاک کی حمایت اس کو حاصل ہے، اللہ پاک نے اپنی حفاظت سے اس کو بچایا ہے اور اس کے لیے ہر وقت محافظ اور مانع مقدر فرما دیے ہیں، وہ لوگ اس کی نگہبانی کرتے ہیں اور اسے محفوظ رکھتے ہیں، اس طرح سے کہ اہلِ ہوا اور کجی والوں کے شبہوں کو دور کرتے ہیں اور ان کی تاویلاتِ فاسدہ کا رد کرتے ہیں، چنانچہ وہ اللہ کی حفاظت کے ساتھ غالب ہے۔ یا وہ عزت سے ماخوذ ہے، یعنی وہ کثیر نفع والی عدیم النظیر کتاب ہے، مخلوق اس کے مقابلے سے عاجز ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "أَعَزَّهُ اللّٰهُ"، بہ معنی "منعه" سے ماخوذ ہے، یعنی اس میں ابطال اور تحریف نہیں ہو سکتی۔

پھر اس کی یہ صفت بیان کی کہ وہ حق ہے، باطل کسی طرح سے اس کی طرف راہ نہیں پا سکتا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لَّا يَأْتِيهِ الْبَٰطِلُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِۦ ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس بات سے محفوظ ہے کہ اگر اس سے کم کیا جائے تو باطل آگے سے اس کے پاس آئے، یا اس میں زیادہ کیا جائے تو باطل پیچھے سے اس کے پاس آئے۔ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اس بنا پر باطل کے معنی زیادت ونقصان کے ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی تکذیب نہ تو ان کتابوں سے کی جا سکتی ہے جو اس سے پہلے ہیں اور نہ اس کے بعد کوئی کتاب آئے گی کہ اس کو باطل کرے۔

امام کلبی اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔[2] کسی نے کہا کہ "باطل" شیطان ہے، یعنی وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا کہ اس میں کمی بیشی کرے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ نہ اس میں بڑھایا جاتا ہے نہ اس سے گھٹایا جاتا ہے، نہ جبرائیل علیہ السلام کی طرف سے اور نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے۔ کسی نے کہا ہے کہ کسی بھی وجہ سے اس میں کوئی تبدیلی اور تناقض (ضد) نہیں آ سکتا ہے۔ کسی نے کہا کہ باطل اس چیز کے ذریعے نہیں آ سکتا جس کی پہلے زمانے سے خبر دی اور نہ اس چیز کے ذریعے سے جس میں بعد میں آنے والی خبر دی ہے، یعنی اس کی اگلی پچھلی سب خبریں درست اور راست ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ کسی بھی طرف سے باطل اس کی طرف راہ نہیں پاتا، معنی یہ ہیں کہ ہر وہ شے

[1] فتح القدير (٤/٦٨٠)
[2] تفسير القرطبي (١٥/٣٦٧) فتح القدير (٤/٦٨٠)

جو اس میں ہے حق اور سچی ہے، اس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو واقع کے مطابق نہ ہو۔ یہ سب معانی ٹھیک ہیں، لیکن عموم زیادہ مناسب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی۔ "أَيْ: هُوَ" یا کتاب کی دوسری صفت ہے، اس شخص کے لیے جو غیر صریح صفات کی تقدیم صریح صفات پر جائز رکھتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ صفت کتاب کی ہے اور جملہ ﴿ لَا يَأْتِيْهِ الْبٰطِلُ ﴾ معترضہ ہے موصوف اور صفت کے درمیان۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ جملہ کتاب کی دونوں مذکورہ صفات کی تعلیل ہے، یعنی وہ کتاب عزیز کثیر النفع، عدیم النظیر یا منیع اور غالب جس کا ابطال کسی کے بس میں نہیں ہے، اس لیے کہ وہ حکیم کی طرف سے اتاری گئی ہے اور وہ کتاب حق ہے کہ باطل اس کی طرف راہ نہیں پاتا، اس لیے کہ وہ حمید کی طرف سے اتاری گئی ہے۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنی آیتوں کا شریف درجہ اور اپنی کتاب کا بلند درجہ بیان کیا تو اس طرف رجوع ہوا کہ اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ اپنی قوم کی ایذا پر صبر کریں اور وہ لوگ جو کتاب اللہ کے سوچنے سے منہ موڑتے ہیں، اس سے دل تنگ نہ ہوں، کیوں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ﴾۔ کلمہ ﴿ مَا ﴾ نافیہ ہے۔ کسی نے کہا کہ استفہامیہ ہے۔ "أَيْ: أَيُّ شَيْءٍ"۔ استفہام انکاری بھی بہ معنی نفی ہوتا ہے، حاصل دونوں کا ایک ہے، یعنی یہ جو کافر لوگ تجھے ساحر کاذب و مجنون کہتے ہیں تو یہ صرف تجھے ہی نہیں کہا جاتا، بلکہ یہ اس کی طرح ہے جو تجھ سے پہلے رسولوں کو کہا جا چکا ہے، کیوں کہ ان کی قوم ان کو ویسا ہی کہتی تھی جیسا کہ یہ لوگ تجھ کو کہتے ہیں۔

یہ نبیِ کریم ﷺ کو تسلی ہے کہ ان کو کہنے دیں اور ان کی ایذا دہی کا اثر نہ لیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ آپ کو جو توحید اور اللہ کے لیے عبادت کو خاص کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو یہ وہی ہے جو اگلے رسولوں کو بھی کہا گیا، کیوں کہ ساری شریعتوں میں یہ بات مشترک ہے، یعنی توحید کوئی نئی بات نہیں یہ تو ہمیشہ سے چلی آئی ہے، پھر کفار اس کو کیوں اوپرا سمجھتے ہیں۔ اب جو کوئی توحید اختیار کرے گا اور اکیلے اللہ کو پوجے گا اس کی مغفرت ہوگی اور جو کفر و شرک اور تکذیب کرے گا اس کو عقاب ہوگا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ یعنی بے شک تیرا رب البتہ اس شخص کے لیے بڑی مغفرت والا ہے جو اس کا مستحق ہے، یعنی وہ موحد جنھوں نے تیری پیروی کی اور ان نبیوں کی جو تجھ سے پہلے تھے اور کفار کے لیے دردناک عذاب والا ہے جو اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو جھٹلانے والے اور دشمن ہیں۔

یا یہ معنی ہیں کہ تیرا رب اپنے نبیوں کے لیے صاحبِ مغفرت ہے اور دردناک عذاب والا ہے ان کے دشمنوں کے لیے۔ قولِ ثانی کی بنا پر یہ بھی احتمال ہے کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ مقولہ ہو

قول کا، اس معنی میں کہ اس شے کا، جو تیری طرف اور اُن کی طرف وحی کی گئی، حاصل یہ ہے کہ مومنوں کو مغفرت کا وعدہ ہے اور کافروں کو عذاب کا وعدہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ﴾ امام کرخی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ ان کے اس قول کا جواب ہے کہ قرآن عجم کی زبان میں کیوں نہ اتارا گیا۔ چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا کہ اگر ہم اس قرآن کو جس کو تو لوگوں پر پڑھتا ہے، عرب کی غیر زبان میں کرتے تو پھر یہ کہتے کہ اس کی آیتیں ہماری زبان میں کیوں نہ نازل کی گئیں، کیوں کہ ہم تو عرب ہیں، عجم کی زبان کو نہیں سمجھتے؟ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ اس کی آیتیں تفصیل کیوں نہ کی گئیں کہ بعض عجم کو سمجھانے کے لیے اعجمی کی جاتیں اور بعض عرب کو سمجھانے کے لیے عربی کی جاتیں۔

﴿ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ﴾ میں استفہام انکاری ہے اور تتمہ قولِ مشرکین سے ہے۔ یعنی البتہ یہ کہتے: کیا کلام اعجمی اور رسول عربی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! اگر ہم قرآن کو اعجمی کرتے اور تیری زبان عربی ہے تو کہتے: ﴿ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ﴾ تو اس کو ہمارے پاس مختلف اور مختلط لاتا ہے، اس کی آیتیں ظاہر کیوں نہ کی گئیں، تاکہ قرآن زبان کی طرح ہوتا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے نہ کیا، تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں تو اب ان پر حجت ہو گئی۔[1]

اعجمی وہ ہے جو فصیح و صاف نہیں بولتا، برابر ہے کہ عرب سے ہو یا عجم سے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اعجمی اس کلام کو کہتے ہیں جو سمجھا نہیں جاتا اور اس کلام کے بولنے والے کو۔ حرفِ یاء وصف میں مبالغے کے لیے ہے، جیسے: "أَحْمَرِيّ"، یعنی نہایت سرخ۔[2] امام سمین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اعجمی وہ ہے جو صاف نہیں بولتا، گو عرب سے ہو، یہ اپنی صفت کی طرف منسوب ہے احمری و درّاری کی طرح۔ حرفِ یاء اس میں وصف میں مبالغے کے لیے ہے۔ اس میں نسب حقیقی نہیں ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے لوامح میں فرمایا ہے کہ یہ حرفِ یاء مثل یا "كُرْسِيٌّ وَبُخْتِيٌّ" کے ہے۔ شیخ نے ان دونوں میں فرق کیا ہے، کہا کہ یائے "كرسي و بختي" کی طرح نہیں ہے، کیوں کہ ان دونوں کی یاء پر کلمہ کی بنیاد رکھی گئی ہے بہ خلاف یائے اعجمی کے، کیوں کہ عرب لوگ "رَجُلٌ أَعْجَمٌ وَأَعْجَمِيٌّ" بولتے ہیں۔ انتھٰی.

اعجم فصیح کی ضد ہے، یعنی وہ شخص جو اپنے کلام کو ظاہر اور واضح نہیں کرتا۔ اور حیوانِ غیر ناطق کو بھی اعجم کہتے ہیں۔ ابوبکر، حمزہ اور امام کسائی رحمہم اللہ نے ﴿ ءَاَعْجَمِيٌّ ﴾ دو ہمزہ محقق کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی امام ابو العالیہ، نصر بن عاصم اور ہشام رحمہم اللہ) نے ایک ہمزہ کے ساتھ بنا برخبر پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ تسہیلِ ہمزۂ ثانیہ بین بین پڑھا ہے۔[3] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک قراءت تو یہ ہے کہ ہمزۂ ثانیہ کی تحقیق ہو، یعنی اس کے اور

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۲۷۳/۱۰) [2] تفسیر أبي السعود (۱٦/۸)

[3] تفسیر القرطبي (۳٦۸/۱۵، ۳٦۹) فتح القدير (٦۸۰/٤، ٦۸۱)

پہلے ہمزہ کے درمیان الف کو داخل کرنے کے بغیر۔ دوسرے ہمزۂ ثانیہ کا قلب الف ممدودہ بہ مد لازم سے۔ تیسرے ہمزۂ ثانیہ کی تسہیل اور اس کے ساتھ ساتھ الف کو اس کے اور ہمزۂ اولیٰ کے درمیان داخل کرنے سے۔ چوتھے تسہیل ثانیہ کے، بغیر داخل کرنے الف کے۔ یہ چار سبعیہ ہیں۔ پانچویں ہمزۂ اولیٰ کے اسقاط کے ساتھ۔ یہ ان کے کلام کا حاصل ہے۔

عمرو بن میمون رحمہ اللہ نے "أَعجمي" بہ فتح عین پڑھا ہے یہ عجم کی طرف منسوب ہے، اس میں حرفِ یاء نسب کے لیے ہے۔ حقیقتاً یوں بولتے ہیں: "رَجُلٌ عَجَمِيٌّ" اگرچہ فصیح ہو۔ ﴿ءَاَعْجَمِيٌّ﴾ کے رفع میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ خبر محذوف کا مبتداء ہے۔ تقدیر یہ ہے: "أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ يَسْتَوِيَانِ" یعنی کیا اعجمی و عربی برابر ہوتے ہیں؟ دوسری یہ ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ "أَيْ: أَهُوَ أَيِ الْقُرْآنُ أَأَعْجَمِيٌّ وَالْمُرْسَلُ بِهِ عَرَبِيٌّ" یعنی کیا وہ قرآن اعجمی ہے اور جو اس کو دے کر بھیجا گیا عربی ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ فاعل ہے فعل مقدر کا۔ "أَيْ: أَيَسْتَوِي أَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ" یعنی کیا اعجمی اور عربی برابر ہوتا ہے، یہ وجہ ضعیف ہے، اس لیے کہ فعل صرف انہیں جگہوں میں محذوف ہوتا ہے جن کا بیان امام سمین رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں: معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں کسی بھی طریقے سے ان کے پاس آتیں تو وہ ان میں تعنت اور سرکشی کرتے، کیوں کہ وہ کوئی طالبِ حق تو تھے نہیں، وہ تو صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے تھے۔ اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر اللہ قرآن کو عجم کی زبان میں اتارتا تو وہ قرآن ہوتا۔ چنانچہ یہ دلیل ہوگی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی کہ نماز کو فارسی میں ادا کرنا جائز ہے۔[1] انتہیٰ.

فتح البیان میں ہے کہ اس میں امام صاحب کے لیے کوئی حجت نہیں ہے، جیسا کہ علامہ نسفی رحمہ اللہ وغیرہ نے زعم کیا ہے، کیوں کہ یہ ترکیب تو مخرجِ فرض و تقدیر میں خارج ہوئی ہے نہ کہ بطور وقوع و تحقیق کے۔[2] انتہیٰ۔ شیخ زادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ کفار اپنی تعنت و سرکشی کی وجہ سے کہتے تھے کہ قرآن عجم کی زبان پر کیوں نہیں اترا، چنانچہ اس کا ان کو یہ جواب دیا گیا کہ اگر بات ویسی ہوتی جیسی تم فرمائش کرتے ہو تو بھی تم اعتراض و تعنت و سرکشی کو نہ چھوڑتے۔ امام رازی رحمہ اللہ مفسرین کے اس قول سے راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ یہ قول قرآن شریف میں طعن سے خالی نہیں ہے، کیوں کہ یہ اس کا مقتضی ہے کہ ایسی آیات کا ورد جائز رکھا جائے جن کا ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہ ہو تو اب کتاب منتظم نہ ٹھہرے گی، معجزہ ہونا تو دور کی بات ہے۔ پھر کہا ہے کہ بلکہ میرے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ سورت شروع سے آخر تک ایک کلام ہے بعض بعض سے متعلق ہے۔

یہ کلام اس قول سے متعلق ہے جو اللہ تعالیٰ نے کفار سے نقل فرمایا ہے کہ ﴿قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ﴾ اور اس کا جواب بھی۔ تقدیر یہ ہے کہ اگر ہم اس قرآن کو عجم کی زبان میں نازل کرتے اور تو ان کو وہ پہنچاتا تو پھر وہ یوں کہتے کہ تو نے عجمی کلام نبی عربی کی زبان پر قومِ عرب کی طرف کیوں بھیجا اور ان کا یہ کہنا

[1] تفسير النسفي (٤/٩٢، ٩٣) [2] فتح البيان (١٢/٢٦٠)

ٹھیک ہوتا کہ ہمارے دل اس کلام سے غلافوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے، کیوں کہ ہم تو اس کو سمجھتے نہیں ہیں اور نہ اس کے معنی کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ اب جبکہ یہ قرآن عرب کی زبان میں اترا اور تم اس زبان کے لوگوں میں سے ہو تو پھر تم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہو کہ تمھارے دل اس سے غلافوں میں ہیں اور تمھارے کانوں میں بوجھ ہے! لہٰذا ظاہر ہو گیا کہ اگر ہم اس کلام کو اس کلام کا جواب ٹھہرائیں تو سورت شروع سے آخر تک احسن وجوہ انتظام پر رہے گی اور اس وجہ پر جس کو لوگ ذکر کرتے ہیں امر انتظام مختل ہو جائے گا، یعنی خلل والا۔ تو یہ وجہ نہایت عجیب ہے۔[1] انتہٰی۔

پھر جب اللہ پاک نے کفار کی فرمایش کا بطلان بیان کیا اور یہ بات بتائی کہ وہ آیتوں میں سرکشی اور تعنت کرنے سے باز نہ آئیں گے، خواہ وہ کسی طرح سے آئیں تو اب بہ سبب وضوحِ آیات وسطوعِ براہینِ قرآن اس کا یہ وصف بیان کیا کہ وہ حق کی طرف راہ بتانے والا ہے اور شکوک و شبہات کو دور کرنے والا ہے اور کفر و جہالت و شک کے مرض سے شفا دینے والا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ ﴾ یعنی وہ قرآن ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہدایت ہے کہ اس سے حق کی طرف راہ پاتے ہیں اور شفا ہے کہ اس کے سبب سے باطنی شک و شبہہ اور ظاہری دکھ درد سے شفا پاتے ہیں۔ امام شہاب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ان پر رد ہے اس طرح سے کہ قرآن ان کے لیے ہادی ہے اور جو درد ان کے سینوں میں ہے اس کے لیے شافی ہے اور شبہہ دور کرنے کے لیے کافی ہے، چنانچہ اسی لیے یہ قرآن معجز، "بَيِّنٌ فِيْ نَفْسِهٖ مُبَيِّنٌ لِغَيْرِهٖ" ہو کر ان کی زبان میں وارد ہوا ہے۔[2]

شیخ زادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا حال ایمان کی طرف رجوع ہو گا، کیونکہ ان کے نفوس کدوراتِ نفسانی اور برے اخلاق سے پاک ہیں۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ مبتداء ہے ﴿ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ ﴾ بہ تقدیر کلمۂ ﴿ هُوَ ﴾ خبر ہے، اس لیے کہ آگے ﴿ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ﴾ فرمایا ہے، جبکہ اس بات کی خبر دی کہ قرآن ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے تو اب یہ خبر دی کہ وہی قرآن کافروں کے کانوں میں بوجھ ہے اور ان پر اندھاپا ہے، اس لیے کہ وہ اس کے سننے سے اور اس کے معانی سمجھنے سے زبردستی بہرے بنتے ہیں، اسی لیے انھوں نے آپس میں اتفاق کیا کہ اس کے پڑھتے وقت لغو بکو، شور مچاؤ اور اور جو آیات اور نشانیاں وہ ان کو دکھاتا ہے، ان سے بہ تکلف اندھے بنتے ہیں۔ نفسِ قرآن شریف کو جو "ھدیٰ و وقر" ٹھہرایا تو وہ مبالغے کے لیے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ موصولِ ثانی موصولِ اول پر معطوف ہے اور ﴿ وَقْرٌ ﴾ معطوف ہے ﴿ هُدًى ﴾ پر اس شخص کے نزدیک جو معمولین عاملین مختلفین پر عطف جائز رکھتا ہے، (یعنی امام اخفش و محققین من المتاخرین۔) تقدیر یہ ہوئی: "هُوَ لِلْأَوَّلِيْنَ هُدًى وَّشِفَاءٌ وَّلِلْآخَرِيْنَ وَقْرٌ فِيْ آذَانِهِمْ" امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کافی لوگ قرآن سے بہرے ہوئے اور اندھے ہوئے۔[3] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے دل اس سے اندھے ہوئے۔ کسی نے

[1] تفسير الرازي (۱۱۵/۲۷) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (۴۰۲/۷) [3] تفسير الطبري (۴۸۴/۲۱)

کہا: معنی یہ ہیں: "وَهُوَ عَلَيْهِمْ ذُوْ عَمًى" یعنی قرآن ان پر اندھاپے والا ہے۔ مصدر کے ساتھ اس کا وصف مبالغے کے لیے کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ هُوَ ﴾ راجع ہے ﴿ وَقْرٌ ﴾ کی طرف، یعنی وہ بوجھ ان پر ﴿ عَمًى ﴾ ہے، یعنی تاریکی وشبہہ۔ جمہور نے ﴿ عَمًى ﴾ بہ فتح میم منون پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مصدر ہے: "عَمِيَ يَعْمَى عَمًى" کا (بہ کسرِ عینِ ماضی و فتحِ عینِ مضارع مثل "صَدِيَ يَصْدَى") جیسے: "هَوِيَ يَهْوىٰ هَوًى"۔

سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن الزبیر، عمرو بن العاص اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے بہ کسرِ میم منون بنا بر اسم منقوص پڑھا ہے، اس لیے کہ قرآن کا اس کے ساتھ مجازاً وصف کیا گیا۔ عمرو بن دینار رحمہ اللہ نے بہ کسرِ میم و فتحِ یاء بہ صیغۂ فعل ماضی پڑھا ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے پہلی قراءت کو اختیار کیا ہے،[1] اس لیے کہ پہلے ﴿ هُدًى وَّشِفَآءٌ ﴾ فرمایا ہے، ہادی وشافی نہیں کہا، تو پہلے کے مناسبِ حال یہ ہے کہ یہاں بھی مصدر ہو۔ ﴿ أُولٰٓئِكَ ﴾ مبتداء ہے ﴿ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴾ خبر ہے، یعنی وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ہیں، وہ دور جگہ سے پکارے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن شریف کو سمجھتے نہیں، باوجود اس کے کہ وہ خوش بیان ہے اور وہ لوگ زبان دان ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے حال کی تمثیل اس شخص کے حال سے دی جو کسی دور جگہ سے پکارا جاتا ہے، پھر وہ وہاں سے اس کی آواز نہیں سنتا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو شخص تمھاری بات کو سمجھتا نہیں ہے، اس سے تم یوں کہتے ہو: "أَنْتَ تُنَادَى مِنْ مَكَانٍ بَعِيْدٍ"[2] یعنی تو دور جگہ سے پکارا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ بات نہیں سمجھتا۔ چنانچہ اس میں استعارہ تمثیلیہ ہے۔[3]

پھر جب اللہ پاک نے کفار کے وصف میں عناد وتکذیب کے ساتھ مبالغہ کیا جیسے ان کا یہ قول کہ ﴿ قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ ﴾ تو نبی اکرم ﷺ کو یوں تسلی دی کہ انبیاء کے درمیان تو کچھ منفرد نہیں ہے کہ صرف تو نے ہی اپنی قوم سے ایذا پائی ہے، بلکہ یہ تو قدیم رسم ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿٤٥﴾
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ
بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿٤٦﴾ اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ
اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَيَوْمَ
يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ﴿٤٧﴾ وَضَلَّ
عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿٤٨﴾

[1] تفسیر القرطبي (٣٦٩/١٥) فتح القدير (٦٨١/٤) [2] فتح القدير (٦٨١/٤) [3] فتح البيان (٢٥٧/١٢-٢٦١)

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ۫ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ
قَنُوْطٌ ﴿۴۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ
لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ
اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِمَا عَمِلُوْا ۫ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۰﴾

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر آپ کے رب کی
طرف سے ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی، تو ان کے درمیان ضرور فیصلہ کر دیا جاتا۔
اور بلاشبہہ وہ اس (قرآن) کے متعلق بے چین کر دینے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں 45
جس نے نیک عمل کیا تو اس کے اپنے ہی لیے ہے اور جس نے برا کیا تو (اس کا) وبال اسی پر
ہے اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں 46 قیامت (کے آنے) کا علم اللہ ہی کی
طرف لوٹایا جاتا ہے اور جو بھی پھل اپنے شگوفوں سے نکلتے ہیں اور جو مادہ حمل سے ہوتی ہے
اور بچہ جنتی ہے (سب کچھ) اللہ کے علم میں ہے۔ اور جس دن وہ انھیں پکارے گا: میرے
شریک کہاں ہیں؟ وہ کہیں گے: ہم آپ سے عرض کر چکے ہیں (کہ آج) ہم میں سے کوئی بھی
(شرک کا) گواہ نہیں 47 اور ان سے وہ گم ہو جائیں گے، جنھیں وہ اس سے پہلے پکارا کرتے
تھے اور وہ یقین کر لیں گے کہ ان کے لیے کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں 48 انسان بھلائی مانگنے
سے نہیں تھکتا، اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ انتہائی مایوس، سخت نا اُمید ہو جاتا ہے 49
اور جو تکلیف اسے پہنچی ہے، اس کے بعد اگر ہم اسے اپنی رحمت (کا مزہ) چکھائیں تو وہ
یقیناً کہتا ہے: یہ تو میرے ہی لیے ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر
مجھے میرے رب کی طرف لوٹایا گیا تو بلاشبہہ اس کے پاس میرے لیے بھلائی ہی ہو گی،
چناں چہ ہم ان کافروں کو ضرور بتائیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے اور ہم انھیں سخت عذاب
(کا مزہ) ضرور چکھائیں گے 50

موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا:

بات وہی نکل چکی کہ فیصلہ آخرت میں ہے۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: اور البتہ ہم نے واقعی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی، پھر اس میں اختلاف کیا گیا، یعنی ان کی تکذیب کی گئی اور ان کو ایذا دی گئی، چنانچہ تو صبر کر، جیسا کہ اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا اور اگر ایک بات نہ ہوتی جس کا تیرے رب کی طرف سے پہلے سے اعلان کر دیا گیا، یعنی حساب کو قیامت کے دن تک مؤخر کیا جائے گا تو البتہ ان میں فیصلہ کر دیا جاتا، یعنی البتہ ان کے لیے عذاب جلد ہی بھیج دیا جاتا، بلکہ ان کے لیے تو وعدے کی ایک جگہ اور مدت مقرر ہے، اس کے بعد ہرگز انھیں پھرنے کی کوئی جگہ نہ ملے گی اور وہ اس بات سے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں جو انھیں چین نہیں دیتا، یعنی ان کا اس کو جھٹلانا کسی بصیرت اور بینائی کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ جو بات کہی اس کو پختہ طور پر سمجھے بوجھے نہیں، بلکہ جو کچھ انھوں نے کہا، اس میں بھی انھیں شک تھا، وہ جس خیال میں تھے، اس میں بھی محقق اور پختہ کار نہیں تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ اسی طرح کی ہے اور اسی کا احتمال بھی ہے۔[1] واللّٰه أعلم.

ہر شخص اپنے عمل کے مطابق ہی بدلہ پائے گا:

اللہ پاک فرماتا ہے: جس نے بھلائی کی تو وہ اپنے واسطے کی، یعنی اس کا فائدہ اسی کو ملے گا اور جس نے برائی کی تو اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا اور تیرا رب ایسا نہیں کہ بندوں پر ظلم کرے، یعنی وہ کسی کو عذاب نہیں کرتا مگر اس کے گناہ کے سبب سے اور اس وقت تک عذاب نہیں کرتا جب تک حجت قائم نہ کر لے اور اس کی طرف رسول نہ بھیج لے۔

قیامت کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے:

پھر اللہ عزوجل نے فرمایا کہ اسی کی طرف قیامت کا علم پھیرا جاتا ہے، یعنی اس کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور آپ سید البشر ہیں، جبرائیل علیہ السلام سے اور وہ ملائکہ کے سرداروں میں سے ہیں، جب انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کا سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس سے اس کے متعلق پوچھا جاتا ہے، وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا اور جس طرح کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ﴿ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ﴾ [النازعات: ٤٤] ''اس کے علم کی انتہا تو اللہ کی جانب ہے۔'' اور فرمایا ہے: ﴿ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ﴾ [الأعراف: ١٨٧] ''اس کے وقت پر اس کو اللہ کے سوا کوئی اور ظاہر نہ کرے گا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ﴾ یعنی ساری اشیاء اس کے علم سے ہوتی ہیں اس کے علم سے تو نہ ذرہ بھر زمین میں غائب ہوتا ہے نہ آسمان میں۔ اللہ سبحانہٗ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا ﴾ [الأنعام: ٥٩] ''اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے۔'' اور فرمایا

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١٣٠/٤)

ہے: ﴿ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ﴾ [الرعد: ۸] ''مادہ اپنے شکم میں جو کچھ رکھتی ہے اسے اللہ بخوبی جانتا ہے اور پیٹ کا گھٹنا بڑھنا بھی، ہر چیز اس کے پاس اندازے سے ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ [فاطر: ۱۱] ''اور جو بڑی عمر والا عمر دیا جائے اور جس کسی کی عمر گھٹے وہ سب کتاب میں لکھا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ پر یہ بات بالکل آسان ہے۔''

مشرکوں کا قیامت کے دن شرکاء سے انکار:

قولہ سبحانہ و تعالیٰ: ﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِيْ قَالُوْۤا اٰذَنّٰكَ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ﴾ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مشرکوں کو ساری خلائق کے سامنے پکارے گا کہ میرے شریک جن کو تم نے میرے ساتھ پوجا تھا کہاں ہیں؟ تو کہیں گے کہ ہم نے تجھے خبر دے دی کہ ہم میں سے کوئی بھی آج اس بات کی گواہی نہیں دیتا کہ تیرے ساتھ کوئی شریک ہے اور جن کو پہلے پوجا تھا وہ جاتے رہے، انھوں نے ان کو کچھ نفع نہ پہنچایا ﴿ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴾ یہ ظن یقین کے معنی میں ہے، یعنی قیامت کے دن مشرکوں نے یقین کر لیا کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴾ [الکہف: ۵۳] ''اور گناہ گار جہنم کو دیکھ کر سمجھ لیں گے کہ وہ اسی جگہ میں جھونکے جانے والے ہیں لیکن اس سے بچنے کی جگہ نہ پائیں گے۔''

تنگ دستی کے بعد خوش حالی سے انسان میں کیا تبدیلی واقع ہوتی ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ﴾ یعنی آدمی اپنے رب سے خیر کے مانگنے سے اکتاتا نہیں، مراد مال و دولت اور جسمانی صحت ہے۔ اور اگر اس کو کوئی برائی، یعنی بلا یا محتاجی لگ جائے تو ناامید ہو جائے، یعنی اس کے ذہن میں یہ آئے کہ اس کے بعد اس کو کوئی خیر نہ ملے گی اور اگر ہم اس کو اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچے اپنی کچھ مہربانی کا مزہ چکھا دیں تو کہنے لگے گا کہ یہ ہے ہی میرے لائق، یعنی اس کے بعد کہ وہ سختی میں تھا، اس کو کوئی بھلائی اور رزق پہنچے تو کہنے لگے کہ یہ میرے لیے ہے، بے شک میں اپنے رب کے نزدیک اس کا مستحق تھا اور میں قیامت کو قائم ہونے والی خیال نہیں کرتا، یعنی وہ قیامت کے قائم ہونے کا انکار کرتا ہے، یعنی وہ اس نعمت کے سبب سے جو اسے دی گئی اترانے لگتا ہے اور بڑائی مارتا ہے اور کفر کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۙ۝۶ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ﴾ [العلق: ۶۔ ۷] ''سچ مچ انسان تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو بے پروا (یا تونگر) سمجھتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَّلَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْۤ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ﴾ یعنی اور اگر وہاں پھر جانا ہوگا تو ضرور میرا رب مجھ پر احسان کرے گا، جیسا اس نے اس گھر میں مجھ پر احسان کیا ہے، باجود برے عمل کرنے کے اور عدمِ یقین کے اللہ عزوجل پر تمنا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴾ جس شخص کا یہ عمل اور اعتقاد ہو اللہ پاک اس کو عذاب اور سزا کے ساتھ دھمکاتا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ﴾ ایک کلامِ مستانف ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی و تشفی شامل کی گئی ہے، اس رنج و غم سے جو آپ ﷺ کو قوم کے کفر کرنے اور قرآن شریف میں طعن کرنے کی وجہ سے پہنچتا تھا۔ چنانچہ اللہ پاک نے خبر دی کہ یہ تو رسولوں کی امتوں میں ایک پرانی عادت ہے، یہ کچھ تمھاری قوم کے ساتھ خاص بات نہیں ہے۔ جو کتابیں پہلی امتوں کی طرف نازل کی جاتیں تو وہ ان میں اختلاف کیا کرتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ حق ہیں اور بعض لوگ کہتے کہ باطل ہیں۔ جس طرح کہ تمھاری قوم نے تمھاری کتاب میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ کوئی اس کی تصدیق کرتا ہے اور کوئی تکذیب کرتا ہے۔ یہاں کتاب سے مراد تورات شریف ہے اور ﴿ فِيْهِ ﴾ کی ضمیر اسی کی طرف پھرتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ اوپر سے کتاب ہی کا ذکر چلا آ رہا ہے، اگرچہ نبی میں اختلاف کرنا بعینہٖ کتاب میں اختلاف کرنا ہے۔ پھر اگر یہ خیال ہو کہ اگلی اُمتوں کے مکذب تو ہلاک کر دیے جاتے تھے، اس امت کے مکذبوں کو کیوں عذاب نہیں کیا جاتا؟ تو اس کی یہ وجہ ذکر فرمائی:

﴿ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے سے یہ بات طے نہ ہوتی کہ تیری امت میں سے جن لوگوں نے قرآن کی تکذیب کی ان کے عذاب میں تاخیر کی جائے گی، یا ان کو مہلت دی جائے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ [النحل: ٦١] ”لیکن وہ تو انھیں ایک وقتِ مقرر تک ڈھیل دیتا ہے۔“ تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا اس طرح سے کہ ان کے مکذبین کو جلد عذاب کر دیا جاتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے لیے ایک وقت اور ایک مدت اللہ پاک کی طرف سے پہلے سے طے ہو چکی ہے جس کو وہ پہنچنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تکذیب کی وجہ سے وہ اسی لائق ہیں کہ ہلاک کر دیے جائیں لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ ان کو ایک مدت تک یا روزِ قیامت تک مہلت دی جائے اور وہاں تصدیق کرنے والے اور تکذیب کرنے والے کے بارے میں فیصلہ ہو۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١٣٠/٤، ١٣١)

﴿ وَاِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴾ یعنی اور بے شک وہ البتہ شک میں ہیں تیری کتاب سے جو تجھ پر نازل کی گئی ہے، یعنی قرآن، ایسا شک کہ مریب ہے، یعنی شک میں ڈالنے والا، یا ایسا شک جو "شدید الریبة" یعنی اضطراب کے لیے موجب ہے۔ کسی نے کہا کہ اس سے مراد یہود ہیں، یعنی یہود تورات کے بارے میں شکِ مریب میں ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

پھر فرمایا کہ کافر لوگ جو تیرے حق میں اور تیری کتاب کے بارے میں بدگوئی کرتے ہیں تو اس سے وحشت کرنے والا مت ہو، اس لیے کہ ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا ﴾ یعنی جو کوئی اللہ کا مطیع ہوگا اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے گا اور ان کی تکذیب نہ کرے گا تو اس کا ثواب اسی کی طرف لوٹے گا اور اس کا نفع بھی اسی کے ساتھ خاص ہوگا تو اس کی برائی کی سزا بھی اسی کو ملے گی نہ کہ کسی اور کو، کیونکہ اللہ پاک ہر ایک کو قیامت کے دن وہی جزا دے گا جس کا وہ مستحق ہے، اسی لیے فرمایا: ﴿ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴾ یعنی اللہ پاک کسی کو عذاب نہیں کرتا مگر اس کے گناہ کے سبب سے اور نہ اس سے کسی پر ظلم واقع ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:
﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْـًٔا ﴾ [یونس: ٤٤] "یہ یقینی بات ہے کہ اللہ لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا۔"

"ظَلَّام" نسب کا صیغہ ہے جیسے: "تَمَّار وَبَقَّال وَخَبَّاز"، مبالغہ کا صیغہ نہیں ہے۔ یہ تقریر اور تقریروں سے بہتر ہے۔ (اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ﴾ [النساء: ٤٠] "بے شک اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔" ﴿ وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴾ [غافر: ٣١] "اور اللہ (اپنے) بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔" اور فرمایا: ﴿ وَلَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ [الکھف: ٤٩] "اور تیرا رب کسی پر ظلم وستم نہ کرے گا۔" اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور نہ ظلم کا ارادہ کرتا ہے اور نہ کسی پر ظلم کرتا ہے، غرض یہ کہ ظلم کا اتا پتا نہیں تو "ظَلَّام" کے معنی ظالم کے ہوئے، یعنی اللہ تعالیٰ متصف بہ ظلم نہیں ہے اور یہ صیغہ ایسا ہے جیسا کہ کھجور والے کو "تمّار" اور سبزی فروش کو "بقّال" اور نان فروش کو "خبّاز" کہا جاتا ہے۔ مبالغے کے صیغے میں لازم آتا ہے کہ نفی سے زیادتی جاتی رہے اور اصل ظلم باقی رہے، حالاں کہ یہاں اصل ظلم ہی نہیں ہے۔ یہاں "ظَلَّام" کے لانے میں حسن یہ ہے کہ اس کے بعد "عبید" صیغہ جمع کا ہے۔ جہاں تکرار و کثرت منظور ہوتی ہے وہاں بہ نظرِ اختصار تثنیہ و جمع و کثرت کا صیغہ لا کر اس کو ادا کرتے ہیں جیسے "﴿ اَلْقِیَا ﴾ اور ﴿ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴾ میں ہے۔ یہاں بھی "عبید" کی جمع کا لحاظ کر کے "ظَلَّام" فرمایا، مبالغہ مراد نہیں ہے۔) امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظلام کے معنی ظلم والا ہے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ "ظَلَّام" صیغۂ مبالغہ نہیں ہے۔

سورت آلِ عمران میں ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴾ [آل عمران: ١٨٢] کی تفسیر کرتے ہوئے اس

آیت کے معنی پر گفتگو گزر چکی ہے اور اسی طرح سورۃ الانفال میں بھی۔[1] چونکہ یہاں اس بات کا گمان تھا کہ کوئی کہے کہ یہ دن کب ہوگا؟ اس لیے اللہ پاک نے خبر دی کہ قیامت کا اور اس کے قیام کا وقت اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ یہاں مضاف مقدر ہے: "أَيْ: عِلْمُ سُوَالِ السَّاعَةِ" یعنی "مَتٰى تَكُوْنُ"، مطلب یہ ہے کہ اس سوال کے جواب کا علم اسی کی طرف پھیرا جاتا ہے، لہٰذا جس وقت قیامت کے متعلق سوال کیا جائے تو مسئول پر واجب ہے کہ اس کے علم کو اللہ کی طرف پھیرے نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔ یہ حصر (قید) ﴿ اِلَيْهِ ﴾ کو پہلے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ مروی ہے کہ مشرکوں نے کہا تھا: اے محمد! اگر تو نبی ہے تو ہم کو بتا کہ قیامت کب قائم ہوگی؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

قولہ: ﴿ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا ﴾ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ نافیہ ہے اور پہلا ﴿ مِنْ ﴾ استغراق کے لیے اور دوسرا ابتدائے غایت کے لیے ہے، یعنی اور میوے اپنے غلافوں سے نہیں نکلتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے محل جر میں، معطوف ہے ساعت پر اور پہلا ﴿ مِنْ ﴾ بیانیہ ہے، یعنی اس کی طرف قیامت کا علم رد کیا جاتا ہے اور ان میووں کا علم جو اپنے غلافوں سے نکلتے ہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ بعد کا ﴿ مَا ﴾ نافیہ ہے موصولہ نہیں بن سکتا اور نظم کلام ایک ہے تو معلوم ہوا کہ نافیہ ہونا بہتر ہے۔ "أَكْمَامٌ" جمع "كِمٌّ" بہ کسر کاف ہے۔ "کم" میوے کے ظرف کو کہتے ہیں جس میں وہ ہوتا ہے، اس کا اطلاق ہر ظرف پر ہوتا ہے، مال کا ظرف ہو یا کسی اور شے کا۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "أَكْمَامُهَا أَوْعِيَتُهَا"۔ "أَوْعِيَة" وہ ظرف ہیں جن میں میوے ہوتے ہیں، اس کا واحد "كُمٌّ وَكُمَّةٌ" ہے۔[2] راغب کہتے ہیں کہ "کم" وہ شے ہے جو ہاتھ کو کرتے سے ڈھانکتی ہے اور وہ شے ہے جو میوے کو ڈھانکتی ہے۔ اس کی جمع "أكمام" ہے۔ یہ قول اس پر دال ہے کہ "كُمٌّ" بہ ضم کاف ہے، کیوں کہ اس کو "کم"، قمیص کے اور "کم"، ثمرہ کے درمیان مشترک ٹھہرایا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قمیص کی "کم" بہ ضم ہے، یعنی کرتے کی آستین۔ ہوسکتا ہے یوں کہیں کہ جو "کم" میوے کا ظرف ہے اس میں دو لغت ہوں ضم اور کسر کے ساتھ۔

جمہور نے ﴿ مِنْ ثَمَرٰتٍ ﴾ مفرد کے صیغے کے ساتھ پڑھا ہے بنا بر ارادۂ جنس اور نافع، ابن عامر اور حفص رحمہم اللہ نے بہ صیغۂ جمع پڑھا ہے،[3] اس لیے کہ پھلوں کی قسموں میں اختلاف ہوتا ہے۔ (جس نے ﴿ ثَمَرٰتٍ ﴾ بہ جمع پڑھا ہے، اس نے ﴿ اَكْمَامِهَا ﴾ کو "أَكْمَامِهِنَّ" پڑھا ہے۔ زیادہ فصیح یہ ہے کہ قلت کی جمع میں اناث کا معاملہ کیا جاتا ہے اور کثرت کی جمع میں انثیٰ کا معاملہ۔ ﴿ ثَمَرٰتٍ ﴾ جمع قلت ہے، اس لیے زیادہ فصیح "مِنْ أَكْمَامِهِنَّ" ہوا)۔

[1] رقم الآية (٥١) [2] اللباب في علوم الكتاب (١٥٣/١٧) [3] تفسير القرطبي (٣٧١/١٥)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ”مِنْ أَكْمَامِهَا حِيْنَ تَطْلُعُ“[1] یعنی نہیں نکلتے کوئی میوے اپنے غلافوں سے جبکہ نکلتے ہیں۔ ﴿وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثٰى وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهٖ﴾ یعنی اور نہیں اٹھاتی کوئی مادہ اپنے پیٹ میں حمل کو اور نہ اس حمل کو جنتی ہے مگر اللہ سبحانہٗ کے علم کے ساتھ۔ استثنائے مفرغ ہے اعم احوال سے، یعنی نہیں واقع ہوتی کوئی شے، یعنی میوے کا اپنے غلاف سے نکلنا، کسی حاملہ مادہ کا حمل اور کسی جننے والی کا جننا، کسی بھی حال میں ہو یا کسی بھی شے کے ساتھ ہو، مگر اللہ کا علم اس کے شاملِ حال ہوتا ہے۔ چنانچہ قیامت کا علم اسی کی طرف رد کیا جاتا ہے جس طرح ان حادثاتی امور کا علم اس کی طرف رد کیا جاتا ہے۔

نکتہ:

متعلقِ علم کا ذکر تعمیم کے لیے نہیں کیا، کیوں کہ اس وقت سننے والے کا ذہن ہر طرف جائے گا، یعنی حمل کا نر و مادہ ہونا، خوبصورت و بدصورت ہونا اور بچے کی ماں دن پورے ہونے پر وضع حمل کرے گی یا اس سے پہلے اور میوہ پکنے کے وقت کو پہنچے گا یا اس سے پہلے بگڑ جائے گا اور اس طرح کے اور امور۔

حکایت:

مروی ہے کہ منصور دوانقی کو ایک مدت تک اپنی عمر جاننے کا فکر رہا، پھر اس نے خواب میں ایک خیال دیکھا کہ اس نے اپنا ہاتھ دریا سے نکالا اور پانچ انگلیوں سے اشارہ کیا۔ اس نے اس کے بارے میں علماء سے پوچھا تو انھوں نے اس کی تعبیر پانچ برس کی اور پانچ مہینے اور اس کے سوا اور تعبیریں کہیں، یہاں تک کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کی تاویل یہ ہے کہ غیب کی کنجیاں پانچ ہیں اور یہ آیت پڑھی: ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ [لقمان: ٣٤] ”بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے وہی بارش نازل فرماتا ہے اور ماں کے پیٹ میں جو ہے اسے جانتا ہے، کوئی (بھی) نہیں جانتا کہ کل کیا (کچھ) کرے گا نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ کس زمین میں مرے گا۔“ (كذا ذكره الشيخ زاده رزقه الله حسنىٰ وزيادة)

اگر کوئی کہے کہ اصحابِ کشف میں سے اگر کوئی مردِ صالح کوئی بات کہتا ہے اور وہ سچ ہو جاتی ہے اور اسی طرح کاہن اور نجومی بھی سچا ہو جاتا ہے تو کہیں گے کہ اصحابِ کشف جب کوئی بات کہیں گے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو الہام اور اطلاع ہو گی، چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم سے ہوئی جس کی طرف حوادث کا علم رد کیا جاتا ہے۔ رہے کاہن اور نجومی تو ان کی کوئی بات ہرگز قطعی اور حتمی نہیں ہے، ان باتوں میں سے جو وہ کہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ

---

[1] تفسير الطبري (٢١/٤٨٨)

ایک کمزور سا گمان ہوتا ہے جو کبھی بھی سچ نہیں ہوتا اور اللہ پاک کا جو علم ہے تو وہی قطعی علم ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔[1] (کذا قال الخازن)

فتح البیان میں ہے کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اصحابِ کشف اور کاہن لوگوں اور اہلِ نجوم کی باتوں میں سے کوئی بات قطعی اور حتمی نہیں ہے، یعنی وہ واقع سچی بات ہے، کاہنوں اور نجومیوں کا تو کچھ بھی ٹھیک نہیں۔[2] اربابِ کشف کے لیے بہت سخت شرائط ہیں کہ ان کا موجود ہونا نہایت دشوار ہے۔ مردِ صالح، پکا شریعت کا تابع، اللہ کا سچا ولی ہو اور کشف بھی ظاہرِ شریعت کے مطابق ہو۔ ہر بے سروپا، بے دین اور شیطان کے تابع کے کشف کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔

بالجملہ جب کہ اللہ پاک نے قیامت کا ذکر کیا تو اس کے بعد کچھ قیامت کا حال بھی ذکر کر دیا اور اس سے شرکاء اور انداد کے قائلین کو وعید سنائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَآءِي ﴾ (جمہور نے ﴿ شُرَكَآءِي ﴾ بہ سکونِ یاء پڑھا ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہ فتح یاء پڑھا ہے)۔ کلمۂ ﴿ يَوْمَ ﴾ میں "اُذْكُرْ" محذوف عامل ہے،[3] شرکاء کی اضافت اپنی ذات کی طرف فرمائی ان کے زعمِ باطل کی بنا پر، یعنی ذکر کر اس دن کا جس میں اللہ سبحانہٗ مشرکوں کو پکارے گا، مراد قیامت کا دن ہے، پھر مذاق، ملامت اور سرزنش کے طور پر ان سے فرمائے گا کہ دنیا میں تم بتوں وغیرہ میں سے میرے شریک ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، وہ کہاں ہیں۔ اب تم ان کو بلاؤ تو چاہیے کہ وہ تمھارے لیے سفارش کریں یا عذاب کو تم سے دور کریں۔

﴿ قَالُوٓا اٰذَنّٰكَ ﴾ ماضی کا صیغہ بہ معنی مضارع ہے۔ ماضی کے پیرایہ میں اس کو اس لیے ادا کیا ہے کہ حق بات ثابت ہو جائے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "آذَنَ يُؤْذِنُ إِذَا أَعْلَمَ" یعنی "إِيْذَانٌ" بہ معنی "إِعْلَامٌ" ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "أَعْلَمْنَاكَ"۔[4] کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی "أَخْبَرْنَاكَ" ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول ظاہر تر ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو اس کا عالم تھا اور اعلام عالم کا محال ہے، سوا اس کے نہیں کہ عالم بالشیَ کے لیے خبر دینا تحقق ہے اس شے کا جس کو وہ جان چکا ہے مگر یہ کہ معنی یوں ہوں کہ تو نے اب جان لیا ہمارے دلوں سے کہ ہم وہ باطل گواہی نہیں دیتے، کیوں کہ جب اس نے اس بات کو جان لیا ان کے نفوس سے تو گویا انھوں نے اس کو اعلام کیا۔[5] انتہٰی. یا یوں کہو کہ اعلام مجاز ہے قول سے، کیوں کہ اعلام کی حقیقت کا تو اللہ تعالیٰ کے حق میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ کہہ سنایا اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جو "أَعْلَمْنَا" کی تفسیر فرمائی ہے[6] وہ لغت کے اعتبار سے ہے۔ دوسری یہ ہے کہ "إِعلام" بہ معنی اخبار ہو سکتا ہے جس

---

(1) تفسير الخازن (٩١/٤) ط: دار الكتب العلمية، بيروت. (2) فتح البيان (٢٦٤/١٢) (3) فتح القدير (٦٨٣/٤)
(4) تفسير الطبري (٤٨٨/٢١، ٤٨٩) (5) تفسير النسفي (٩٣/٤) (6) تفسير الطبري (٤٨٨/٢١، ٤٨٩)

طرح کہ مجازاً بہ معنی قول آتا ہے۔ معنی یہ ہیں: مشرکین کہیں گے ہم نے تجھے خبر دے دی۔ ﴿مَا مِنَّا مِنْ شَهِيدٍ﴾ یعنی نہیں ہے ہم میں سے کوئی گواہ جو اس کی گواہی دے کہ تیرے واسطے کوئی شریک ہے۔ یہ یوں ہے کہ جب قیامت کا معائنہ کریں گے تو شریکوں سے بے زار ہو جائیں گے اور جن بتوں کو پوجتے تھے وہ ان سے بیزار ہو جائیں گے۔ کسی نے کہا کہ اس قول کے قائل معبود لوگ ہیں جن کو وہ پوجتے تھے۔ یعنی ہم میں سے کوئی گواہ نہیں ہے جو ان کے لیے یہ گواہی دے کہ وہ حق پر تھے۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

﴿وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَظَنُّوا مَا لَهُمْ مِنْ مَحِيصٍ﴾ یعنی آخرت میں وہ اصنام وغیرہ جن کو دنیا میں پوجا کرتے تھے وہ سب غائب اور زائل اور باطل ہو گئے اور یہ بات جان لی اور اس پر یقین کر لیا کہ اب ان کے لیے عذاب سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ "حیص" بہ معنی فرار ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "حَاصَ يَحِيصُ حَيْصاً إِذَا هَرَبَ" کسی نے کہا کہ ظن اپنے حقیقی معنی پر ہے، کیوں کہ اس حال میں ظن اور رجا (گمان اور امید) ان کے لیے باقی رہیں گے، لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ یہاں ظن بہ معنی یقین ہے، جیسا کہ ترجمہ میں گزر چکا ہے۔

جب اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ یہ کافر آخرت میں شرکاء سے بے زار ہوں گے اس کے بعد کہ دنیا میں شریکوں کو ثابت کرنے پر اصرار کرتے تھے تو اب یہ ذکر کیا کہ انسان سارے اوقات میں متغیر الاحوال ہے، یعنی ایک راہ پر جمتا نہیں، کسی خیر اور قدرت کا احساس کرتا ہے تو پھول جاتا ہے اور بڑا بنتا ہے اور اگر کسی آزمائش یا نعمت کا احساس کرتا ہے تو ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ﴿لَا يَسْأَمُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ﴾ یعنی انسان اپنے نفس کے لیے خیر کے مانگنے سے اور اسے اپنی طرف کھینچنے سے ملول نہیں ہوتا اور ہمیشہ اپنے رب سے مال کا سوال کرتا رہتا ہے۔ اس جگہ خیر سے مراد مال وصحت وسلطان وغلبہ ورفعت ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس جگہ ﴿الْإِنْسَانُ﴾ سے مراد کافر ہے۔[1] کسی نے کہا کہ ولید بن مغیرہ ہے۔ کسی نے کہا کہ عتبہ اور شیبہ ہیں جو ربیعہ اور امیہ بن خلف کے بیٹے ہیں۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ آیت کو باعتبار غالب کے عموم پر محمول کیا جائے۔ تو اب مخلص عباد کا خروج اس کے منافی نہ ہو گا۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "مِنْ دُعَاءِ الْمَالِ" پڑھا ہے[2] اور اگر اس کو برائی پہنچے، یعنی آزمائش یا تنگی وفقر اور بیماری تو بڑا ناامید ہونے والا ہے، اللہ کی آسایش سے اور اس کی رحمت سے بڑا آس توڑنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خیر ملنے کی حالت میں تو انسان کا یہ حال ہے کہ جتنا بھی اس کو مل جائے وہ اس پر اور زیادہ مال و دولت کا طالب ہوتا ہے اور اس کے طلب کرنے سے کبھی ہچکچاتا نہیں اور بد اقبالی، بد نصیبی اور محرومی کی حالت میں اللہ کی

---

[1] تفسير الطبري (٤٩٠/٢١) [2] تفسير القرطبي (٣٧٢/١٥)

رحمت سے ناامید ہو جاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ "یؤس" یہ ہے کہ اپنی دعا کے قبول ہونے سے نا امید ہے اور قنوط یہ ہے کہ اپنے رب سے بدگمان ہے۔ کسی نے کہا: "یؤس" اس مکروہ کے زائل ہو جانے سے ہے جو اس کو لگا ہے اور ﴿ قَنُوْطٌ ﴾ اس چیز کے متعلق جو اس کو حاصل ہے یہ گمان کرنا کہ وہ ہمیشہ رہے گی۔

"یأس" قلب کی صفت ہے، یعنی امید کا توڑ دینا اور ﴿ قَنُوْطٌ ﴾ اس کے آثار کا ظاہر بدن پر نظر آنا ہے۔ حالِ محلی ترادف کی مقتضی ہے اور بعض اسی کے قائل ہیں اس بنا پر دونوں کا جمع کرنا تاکید کے لیے ہوگا۔ "یؤس" اور "قنوط" دونوں مبالغے کے صیغے ہیں اور اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ سخت ناامید اور عظیم القنوط ہے۔ دو طرح سے اس میں مبالغہ کیا گیا ہے: ایک تو بنائے فعول کے طریق سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا اور دوسرے تکریر کے طریق سے، اس کے ساتھ کہ ناامیدی کا اثر ظاہر ہو جو قنوط میں ہے، کیوں کہ قنوط یہ ہے کہ ناامیدی کا اثر اس پر ظاہر ہو۔ پھر وہ متضایل (لاغر وحقیر) ہو اور منکسر (عاجز) ہو، یعنی اللہ کے فضل و رحمت سے امید توڑ دے۔ یہ کافر کی صفت ہے، اس آیتِ کریمہ کی رو سے: ﴿ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [یوسف: ٨٧] "یقیناً رب کی رحمت سے ناامید وہی ہوتے ہیں جو کافر ہوتے ہیں۔"

قولہ: ﴿ وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ﴾۔ حرفِ لام توطۂ قسم کا ہے۔ "أَيْ: وَاللّٰهِ لَئِنْ" اور ﴿ لَيَقُوْلَنَّ ﴾ قسم کا جواب ہے۔ چونکہ یہ قائم مقام جوابِ شرط کے ہو گیا اس لیے اس کو حذف کر دیا ہے، یعنی البتہ اگر ہم سختی، بیماری اور فقر کے بعد اس کو کوئی خیر و عافیت اور غنا دیں تو البتہ وہ کہے گا: ﴿ هٰذَا لِيْ ﴾ یعنی یہ ایک ایسی شے ہے کہ میں اللہ پر اس کا حق رکھتا ہوں، اس لیے کہ وہ میرے عمل سے راضی ہے۔ چنانچہ یہ خیال کیا کہ یہ نعمت جس میں وہ ہو گیا، یہ اس کو اس سبب سے پہنچی کہ وہ اس کا مستحق ہے اور یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خیر اور شر کے ساتھ آزماتا ہے، تاکہ اس کا شکر گزار بندہ جاحد اور منکر سے الگ ظاہر ہو جائے اور صبر کرنے والا بے صبری کرنے والے سے الگ ظاہر ہو جائے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ میرے عمل کے سبب سے ہے اور میں اس کے لائق ہوں۔[1] یا یہ معنی ہیں کہ یہ میرے لیے ہمیشہ کے لیے ہے اور زائل نہ ہوگی۔

﴿ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً ﴾ یعنی میں گمان نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہوگی جس طرح کہ انبیاء علیہم السلام اس کی خبر دیتے ہیں۔ یا میں بعث کے بارے میں یقین پر نہیں ہوں۔ یہ بات کافرین اور منافقین کے ساتھ خاص ہے تو اب ﴿ الْاِنْسٰنُ ﴾ سے جو آیت کے شروع میں مذکور ہے اس کے غالب افراد کے اعتبار سے جنسِ انسان مراد ہوگی، کیوں کہ اللہ کی رحمت سے ناامیدی اور اس کی خیر سے قنوط اور بعث میں شک صرف کافروں ہی کو ہوتا ہے، یا ان کو جو دین میں متزلزل ہیں تکلف کے ساتھ؛ اسلام ظاہر کرتے ہیں اور کفر کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔

---

[1] فتح القدير (٦٨٤/٤)

﴿ وَلَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ ﴾ میں حرفِ لام قسم کا ہے ﴿ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ﴾ قسم کا جواب ہے، اس لیے کہ قسم شرط پر سابق ہے، یعنی البتہ اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا جاؤں قیامت کے سچ ہونے اور بعث اور نشور کے سچ ہونے کی بنا پر، جس کی ہم کو انبیاء علیہم السلام خبر دیتے ہیں تو بے شک میرے لیے اللہ کے پاس میرے لیے انعام و اکرام والی اچھی حالت ہوگی۔ چنانچہ اس نے یہ خیال کیا کہ وہ دنیا کی بھلائی کا مستحق ہے، اس خیر و خوبی کی بنا پر جو اس میں ہے اور آخرت کی بھلائی کا بھی مستحق ہے، اس بات کے سبب سے جس کا اپنے دل میں اعتقاد کیا اور اس کو اپنے نفس کے لیے ثابت کیا، حالاں کہ یہ ایک باطل عقیدہ اور ظنِ فاسد ہے۔ اس کلام میں کئی مبالغے شامل ہیں: ایک تو ﴿ وَاِنْ ﴾ کے ساتھ تاکید کی، دوسرے دونوں ظرف مقدم کیے، تیسرے صیغۂ تفضیل کی طرف عدول کیا، اس لیے کہ "حسنیٰ" احسن کی تانیث ہے۔

اللہ پاک نے اس کافر کے قول کا یہ جواب دیا: ﴿ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ﴾ یعنی پس ہم البتہ ان لوگوں کو خبر دیں گے جو قیامت کے دن اس عمل کے منکر ہوئے جو انھوں نے کیا۔ مطلب یہ ہے کہ بات ویسی نہیں جیسی وہ خیال کرتا ہے، اس کے لیے تو سخت سزا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴾ یعنی اور البتہ چکھائیں گے ہم ان کو گاڑھا عذاب ان کے گناہوں کے سبب سے۔ یہ لام اور پہلے کا لام دونوں توطئہ قسم کے ہیں۔[1] پھر جب اللہ پاک اس شخص کے اقوال نقل کر چکا جس پر انعام کیا، اس کے بعد کہ اس کو تکلیف پہنچی تھی تو اب اس کا احوال بھی بیان کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴿٥١﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿٥٢﴾ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿٥٣﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ﴿٥٤﴾

اور جب ہم انسان پر احسان کرتے ہیں تو وہ منہ موڑ لیتا ہے اور کنارہ کش ہو جاتا ہے اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے والا بن جاتا ہے (51) آپ کہہ دیجیے: بھلا دیکھو

[1] فتح البیان (١٢/٢٦١_٢٦٧)

تو! اگر یہ (قرآن) اللہ کی طرف سے ہو، پھر تم اس کا انکار کرو تو اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہے جو (حق کی) مخالفت میں دور چلا جائے ﴿52﴾ جلد ہم انھیں اپنی نشانیاں آفاق (دنیا) میں بھی اور خود اُن کی ذات میں بھی دکھائیں گے، حتیٰ کہ ان کے لیے واضح ہو جائے گا کہ بے شک یہ (قرآن) حق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں کہ بے شک آپ کا رب ہر چیز کا شاہد ہے ﴿53﴾ خبردار! بے شک وہ لوگ اپنے رب کی ملاقات سے شک میں ہیں۔ خبردار! بے شک وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے ﴿54﴾

انسان بڑا تھڑدلا ہے:

یہ سب انسان کے نقصان کا بیان ہے، نہ سختی میں صبر ہے اور نہ نرمی میں شکر۔ انتہٰی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: معنی یہ ہیں اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو وہ اطاعت سے منہ موڑے اور اللہ کے احکام کا مطیع اور فرماں بردار ہونے سے تکبر کرے، جیسا کہ اللہ جل جلالہ نے فرمایا: ﴿ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ ﴾ [الذاریات: ٣٩] ”پس اس نے اپنے بل بوتے پر منہ موڑا“ اور جب اسے برائی، یعنی سختی پہنچے تو ایک شے میں اپنے سوال کو طول دے، یعنی لمبی لمبی دعائیں کرے۔ چنانچہ کلامِ عریض وہ ہے جس کے الفاظ طویل ہوں اور معنی تھوڑے اور کلام وجیز اس کا الٹ ہے، یعنی ”مَا قَلَّ وَدَلَّ“، یعنی الفاظ تھوڑے اور معنی زیادہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۚ ﴾ [یونس: ١٢] ”اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے لیٹے بھی، بیٹھے بھی، کھڑے بھی، پھر جب ہم اس کی تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے اپنی تکلیف کے لیے جو اسے پہنچی تھی کبھی ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔“

صداقتِ قرآن کے دلائل:

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! تو ان مشرکوں سے کہہ دے جو قرآن کی تکذیب کرتے ہیں کہ مجھے بتاؤ کہ اگر یہ قرآن اللہ کے پاس سے ہو، پھر تم اس کے منکر ہوئے، یعنی تم اپنے آپ کو اس ذات پاک کے پاس کس طرح دیکھتے ہو جس نے اس کو نازل کیا اپنے رسول ﷺ پر۔ اسی لیے یوں فرمایا کہ اس شخص سے زیادہ بھٹکنے والا کون ہے جو ﴿ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ میں ہے، یعنی کفر و عناد میں ہے اور حق کی مخالفت میں ہے اور ہدایت کے راستے سے بہت دور ہے۔

پھر فرمایا: عن قریب ہم ان کو دنیا میں اپنی نشانیاں دکھا دیں گے، یعنی ہم ان پر دنیا میں اپنی دلالتیں اور حجتیں اس بات پر ظاہر کریں گے کہ قرآن حق ہے، اللہ کے پاس سے رسول اللہ ﷺ پر اتارا گیا ہے۔ وہ خارجی دلیلیں ہیں

جو دنیا میں ہی ظاہر ہوں گی اس طرح سے کہ ملک فتح ہوں گے، اسلام اقالیم پر اور سارے دینوں پر غالب ہوگا۔ امام مجاہد، حسن اور سدی رحمہم اللہ نے کہا: ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ یعنی اور ہم ان کو ان کی جانوں میں دلیلیں دکھائیں گے، مراد جنگِ بدر، فتح مکہ وغیرہ قسم کے واقعات ہیں جو اُن پر نازل ہوئے، جن میں اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو نصرت دی اور آپ ﷺ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کو مظفر ومنصور کیا اور باطل کو اور ان کے جتھوں کو ذلیل وخوار کیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد وہ عجیب وغریب مواد واخلاط وہیئات ہوں جن سے اور جن میں اور جن پر انسان مرکب کیا گیا ہے۔

چنانچہ یہ بات علمِ تشریح میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت پر دال ہے اور اسی طرح وہ مختلف اچھے اور برے اخلاق جن پر انسان پیدا کیا گیا ہے اور وہ اعمال وافعال اور کاروبار جو وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے تحت کرنے والا ہے، جن کو کرنے کی یا ان میں کمی بیشی کرنے کی قدرت وہ اپنی قوت اور ترکیب کی بنا پر نہیں رکھتا، بلکہ یہ سارے تصرفات اللہ پاک کی قوت اور تقدیر سے نافذ اور ظاہر ہوتے ہیں اور وہ اس کے تحت مجبور ہے۔ چنانچہ امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "التفکر و الاعتبار" میں اس مضمون کی نظم اپنے شیخ ابوجعفر قرشی سے روایت کی ہے۔ حیث قال و أحسن المقال:

وَإِذَا نَظَرْتَ تُرِيْدُ مُعْتَبِرًا ... فَانْظُرْ إِلَيْكَ فَفِيكَ مُعْتَبَرٌ
أَنْتَ الَّذِيْ تُمْسِيْ وَتُصْبِحُ ... فِيْ الدُّنْيَا فِيْ كُلِّ أُمُوْرِهِ عِبَرٌ
أَنْتَ الْمُصَرِّفُ كَانَ فِيْ صِغَرٍ ... ثُمَّ اسْتَقَلَّ بِشَخْصِكَ الْكِبَرُ
أَنْتَ الَّذِيْ تَنْعَاهُ خِلْقَتُهُ ... يَنْعَاهُ مِنْهُ الشَّعْرُ وَالْبَشَرُ
أَنْتَ الَّذِيْ تُعْطَى وَتُسْلَبُ لَا ... يُنْجِيهِ مِنْ أَنْ يُسْلَبَ الْحَذَرُ
أَنْتَ الَّذِيْ لَا شَيْءَ مِنْهُ لَهُ ... وَأَحَقُّ مِنْهُ بِمَالِهِ الْقَدَرُ [1]

یعنی جس وقت تو نظر کرے کسی شے کی طرف عبرت حاصل کرنے کے لیے تو تُو خود اپنی طرف نظر کر۔ تجھی میں بڑی عبرت ہے تُو خود پورے کا پورا ایک عجیب عبرت گاہ ہے۔ ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ [الذاریات: ۲۱] ''اور خود تمھاری ذات میں بھی، تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔'' تو دنیا میں صبح وشام کرتا ہے تیرے سارے کام ایک سے یک بڑھ کر عبرتیں ہیں، مگر تو اپنی طرف سے تو نظر بند کر لیتا ہے، اپنے کاموں میں غور نہیں کرتا خود کو سب سے بہتر سمجھ کر علاحدہ کر لیتا ہے۔ سارا دن دوسروں کا روزنامچہ لکھا کرتا ہے: فلاں اچھا، فلاں برا، اگر اس طرح سے اپنا نامہ اعمال لکھتا تو ایک کام کی بات تھی اور غور کرنے سے اپنی اچھائی اور برائی معلوم ہوتی اور اپنی ہر بات ایک عبرت ظاہر ہوتی۔ بالجملہ تو اپنی بچپن کی حالت پر غور کر کہ تو محض عاجز تھا اپنا کوئی کام نہیں کر سکتا تھا تجھ میں تصرف کیا جاتا تھا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱۳۱/٤، ۱۳۲)

پھر آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا کر کے تیرے جسم میں بڑائی آئی، تو چھوٹے سے بڑا ہوا۔ سب اعضاء میں قوت وتوانائی آئی۔ اب اپنے سارے کام خود کرنے لگا اور اس وقت کو بھول گیا۔ اپنے جمال وکمال وقوت پر ناز وتکبر کرنے لگا، گویا ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ یہ ہوتے ہوتے ضعفِ قویٰ کی صبحِ کاذب نمودار ہوئی، بڑھاپا آ گیا، پھر صبح صادق ہوگئی اب تیرا سارا بدن تجھے موت کی خبر دینے لگا۔ ایک طرف سے سفید بال خبر دے رہے ہیں، دوسری طرف سے کھال کی چمک اور صفائی غائب ہوگئی اور جھریاں کہہ رہی ہیں کہ عیش ونشاط کی بساط (بچھونا) اٹھاؤ، ضعیفی اور کمزوری کا فرش بچھاؤ۔ اب تین زمانوں میں غور کر کہ ان میں کتنا فرق ہے۔

بیچ کا زمانہ جس کا ہر بوڑھا فریفتہ اور دیوانہ ہے، اس میں تیرے زور، قوت، ہمتِ وجود اور شجاعت کا یہ حال تھا کہ اپنے ہمسروں سے خوب لڑتا بھڑتا تھا، دشمنوں سے مال چھینتا تھا، دوستوں کو عطا کرتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ موت کے قاصد تجھ سے ایک ایک قوت چھینتے جاتے ہیں اور تو موت سے ڈر رہا ہے اور وہ تجھ سے سب کا سب چھین لے جائے گی اور تیرا اس سے بھاگنا تجھے اس سے نجات نہ دے گا۔ تیری کوئی شے تیری ملکیت نہیں ہے اور جو کچھ تیرا ہے قدر اس سب کی تجھ سے زیادہ حق دار ہے۔ اللهم توفيقاً وغفراً ورحمةً وفضلًا جماً وأي عبد لك لا ألما.

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ یعنی اللہ کافی ہے گواہ اپنے بندوں کے افعال واقوال پر اور وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ محمد رسول ﷺ اس شے میں سچے ہیں جس کی آپ ﷺ نے اس کی طرف سے خبر دی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ١٦٦] ”جو کچھ آپ کی طرف اتارا ہے، اس کی بابت خود اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ اسے اپنے علم سے اتارا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بطور گواہ کافی ہے۔“

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ۗ ﴾ یعنی خبردار! بے شک وہ قیامت کے قائم ہونے کے بارے میں شک میں ہیں، اسی لیے وہ اس میں غور وفکر نہیں کرتے اور نہ اس کے لیے عمل کرتے ہیں اور نہ اس سے ڈرتے ہیں اور خوف کرتے ہیں، بلکہ وہ ان کے نزدیک ایک باطل امر ہے جس کی پروا نہیں کرتے، حالانکہ وہ ضرور ہونے والی ہے۔ اس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے۔

امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے سعید انصاری سے روایت کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ منبر پر چڑھے، اللہ پاک کی حمد وثنا کی، پھر فرمایا: ”أَمَّا بَعْدُ! أَيُّهَا النَّاسُ فَإِنِّي لَمْ أَجْمَعْكُمْ لِأَمْرٍ أُحْدِثُهُ فِيكُمْ، وَلَكِنْ فَكَّرْتُ فِي هَذَا الْأَمْرِ الَّذِي أَنْتُمْ إِلَيْهِ صَائِرُوْنَ، فَعَلِمْتُ أَنَّ الْمُصَدِّقَ بِهَذَا الْأَمْرِ أَحْمَقُ وَالْمُكَذِّبَ بِهِ هَالِكٌ“ پھر اتر پڑے، یعنی حمد وثنا کے بعد فرمایا: اے لوگو! میں نے تم کو کسی امر کے لیے جمع نہیں کیا کہ اس کو جاری کروں، لیکن میں نے اس امر میں غور وفکر کیا جس کی طرف تم جانے والے ہو۔ چنانچہ میں نے یہ بات جان لی کہ جو شخص اس کا

ماننے والا ہے وہ احمق ہے اور جو اس کی تکذیب کرنے والا ہے، وہ ہلاک ہونے والا ہے۔ یعنی احمق اس لیے ہے کہ جیسے اس کے لیے اَور لوگ عمل کرتے ہیں، وہ اس کے لیے ویسا عمل نہیں کرتا اور نہ اس سے اور اس کی ہولنا کیوں سے ڈرتا اور خوف کرتا ہے اور وہ باجود اس کے کہ اس کی تصدیق کرنے والا اور اس کے واقع ہونے کا یقین کرنے والا ہے اور باوجود اس کے اپنے لہو ولعب اور شہوات و گناہوں میں تمادی (ہیشگی) کر رہا ہے تو اس لحاظ سے وہ احمق اور نادان ہوا۔ لغت میں احمق کمزور عقل والے کو کہتے ہیں اور جو اس کو یعنی آخرت کو جھٹلانے والا ہے، وہ ہلاک ہونے والا ہے، یہ بات تو ظاہر اور واضح ہے۔ واللّٰہ أعلم.

پھر اللہ پاک نے یہ بات ثابت کی کہ وہ ہر شے پر قادر ہے اور ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کے لیے قیامت کا قائم کرنا سہل و آسان ہے۔ ﴿ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ﴾ یعنی ساری مخلوق اس کے زیرِ تسلط اور اس کے قبضے میں ہے اور اس کے علم کی لپیٹ میں ہے اور وہی اس سب میں اپنے حکم سے تصرف کرنے والا ہے۔ جو اس نے چاہا، وہ ہوا اور جو نہ چاہا، نہ ہوا۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ[1] آخر تفسير سورة حم السجدة، ولله الحمد والمنة.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ اَلْاِنْسٰنُ ﴾ سے غالب افراد کے اعتبار سے جنسِ انسان مراد ہے۔ ﴿ نَاٰ ﴾ بروزن "رمٰی" بہ معنی "بَعُدَ" ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "نَأَيْتُ وَتَنَاءَيْتُ" بہ معنی "بَعُدْتُ وَتَبَاعَدْتُ" اور "مُنْتَأَى" مکانِ بعید کو کہتے ہیں۔ یزید بن قعقاع نے ﴿ نَاٰ ﴾ بروزن "قَالَ" پڑھا ہے "بِالْأَلِفِ قَبْلَ الْهَمْزَةِ"۔[2] حرفِ باء تعدیت کا ہے ﴿ نَاٰ ﴾ جانب کنایہ ہے اعراض سے، یعنی انسانوں میں سے بہت سے افراد کا یہ حال ہے کہ جب اللہ پاک ان میں سے کسی پر انعام کرتا ہے تو وہ شکر سے اعراض کرتا ہے اور حق کا مطیع ہونے سے ترفع (اپنے آپ کو بالاتر سمجھنا) وتکبر وتجبر کرتا ہے اور ناز کرتا ہوا اپنی جانب کو موڑتا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ شکر سے منحرف ہوتا ہے، یا جانبِ مجاز ہے نفس سے، یعنی تکبر کے مارے بذاتہ وکلیتہ شکر سے دور ہوتا ہے نہ بجانبہ۔

مطلب یہ ہے کہ تکبر کے مارے صرف اپنی جانب کو شکر سے نہیں پھیرتا، بلکہ پورے کا پورا اس سے دور ہوتا ہے۔ محاورے میں "جانب" بولتے ہیں اور ذات مراد لیتے ہیں، چنانچہ شخص کے نام کی تصریح نہیں کرتے اور اس کی ذات سے مجلس، مکان اور جانب وغیرہ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے یہ منظور ہوتا ہے کہ اس کی تعظیم کی خبر دیں چنانچہ یوں کہتے ہیں: "حَضَرْتُ فُلَانَ وَمَجْلِسَ فُلَانٍ وَكَتَبْتُ إِلَى جِهَةِ فُلَانٍ وَإِلَى جَانِبِهِ الْعَزِيْزِ وَإِلَى جَنَابِهِ الرَّفِيْعِ" اور اس سے مراد اس شخص کی ذات ہوتی ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اس کو کوئی نعمت دیتا ہے

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/١٣١، ١٣٢) [2] تفسير القرطبي (١٥/٣٧٣)

تو نعمت اس کو اِترا دیتی ہے۔ پھر منعم کو بھول جاتا ہے اور اس کے شکر سے اعراض کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور دعا سے دور ہوتا ہے۔

﴿وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ﴾ اور جب اس کو پہنچے تکلیف و آزمایش وفقر ومرض تو وہ صاحبِ دعائے کثیر ہے۔ عرب لوگ عرض وطول کو مجازاً کثرت میں استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی باتیں اور دعا بہت کرے تو کہتے ہیں: "أَطَالَ فُلَانٌ فِيْ الْكَلَامِ وَأَعْرَضَ فِيْ الدُّعَاءِ" اور یہ بطور استعارہ ہے۔ جس شے کا عرض فراخ ہو، اس کی کثرت بتانے کے لیے اس سے اس کا استعارہ کیا ہے، کیوں کہ جو شے عریض ہوتی ہے تو اس کے اجزاء کثیر ہوتے ہیں۔ یہ استعارہ تخییلیہ ہے، پہلے تو دعا کو اس شے سے تشبیہ دی جو موصوف بامتداد (پھیلی ہوئی) ہوتی ہے، پھر اس کے لیے عرض ثابت کیا۔ (كذا قاله الكرخي)

﴿عَرِيْضٍ﴾ مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی بڑی چوڑی دعا۔ طویل نہ کہا، اس لیے کہ طول اطول امتدادین ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس کا عرض بڑا ہو تو اس کے طول کا کیا کہنا کہ کتنا بڑا ہوگا۔[1] (كما أفاده أبو السعود) معنی یہ ہیں کہ جب اس کو برائی پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے تضرع وزاری کرتا ہے اور اس سے فریاد رسی چاہتا ہے کہ جو بلا اس پر نازل ہوئی ہے وہ اس سے دور کر دے اور اس کی بہ کثرت دعا مانگتا ہے۔ چنانچہ شدت اور تکلیف میں تو اس کو یاد کرتا ہے اور راحت و آرام میں اس کو بھول جاتا ہے اور سزا کے نزول کے وقت اس سے فریاد رسی چاہتا ہے اور حصولِ نعمت کے وقت اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ کام کافروں کا ہے اور ان مسلمانوں کا ہے جو غیر ثابت قدم ہیں۔

امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اب اگر کوئی کہے کہ اس کا لمبی چوڑی دعا مانگنا اس وصف کے منافی ہے جو پہلے گزر چکا ہے، وہ یؤس اور قنوط ہے، کیوں کہ دعا رجاء اور طمع کی شاخ ہے اور قنوط میں ناامیدی کا اثر ہوتا ہے تو دعا کا ظہور جو رجاء اور امید پر دال ہے، اس کے منافی ہے تو کہیں گے کہ اس منافات کا دفع یوں ممکن ہے کہ اس کو عدمِ اتحاد اوقات واحوال پر محمول کریں۔[2] انتھٰی. یعنی کسی وقت تو یؤس قنوط ہوتا ہے اور کسی وقت لمبی چوڑی دعا کرتا ہے، یا یوں کہو کہ یہ حال اَور قوم کا ہے اور وہ حال دوسری قوم کا، یا سب کا حال بعض اوقات میں ایسا ہوتا ہے۔[3] (قاله أبو السعود)

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یا جنگل میں قنوط ہے اور دریا میں ذو دعائے عریض ہے۔ یا دل سے تو قنوط ہے اور زبان کے ساتھ ذو دعائے عریض ہے۔ یا بت سے تو قنوط ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے ذو دعائے عریض ہے۔[4]

پھر جب اللہ پاک نے مشرکوں کی وعید میں مبالغہ کیا اور یہ بیان کیا کہ وہ شرک سے اور شرکاء کی گواہی سے رجوع کریں گے جن کو دنیا میں پکارا کرتے تھے تو اس کے بعد ایک اور تقریر فرمائی جو اُن پر یہ بات واجب کرتی ہے

[1] تفسير أبي السعود (١٩/٨) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٤٠٥/٧)

[3] تفسير أبي السعود (١٩/٨) [4] تفسير النسفي (٩٤/٤، ٩٥)

کہ قرآن سے اعراض کرنے میں اور اس میں توحید و نبوت و حشر نشر و جزا کے متعلق جو فرمایا گیا ہے، اس کے قبول نہ کرنے میں مبالغہ نہ کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرۡتُمۡ بِهٖ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ هُوَ فِیۡ شِقَاقٍۢ بَعِيۡدٍ ﴾ یعنی تم مجھے اپنی حالتِ عجیب کی خبر دو، کہا اگر قرآن پاک، جیسا کہ میں نے کہا، اللہ کے پاس سے ہو، پھر تم نے اس کو جھٹلایا اور قبول نہ کیا اور نہ اس شے پر عمل کیا جو اس میں ہے تو اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے، جو خلافِ بعید میں ہے، یعنی ایسا مخالف کہ حق سے بہت دور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری بدبختی اور سخت عداوت کے سبب سے تم سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں۔

کلمۂ ﴿ اَرَءَيۡتُمۡ ﴾ بہ معنی "أَخۡبِرُوۡنِيۡ" ہے۔ اس کا اخبار کے معنی میں استعمال مجاز ہے۔ مجاز کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی شے کا علم اس شے کے متعلق خبر دینے کا سبب ہے، یا کسی شے کو دیکھنا اس شے کا علم کے ساتھ احاطہ کرنے کا طریقہ ہے اور اس کے متعلق صحیح خبر دینے کا تو جو صیغہ طلبِ علم کے لیے تھا، یا طلبِ ابصار کے لیے (دکھانے کے لیے) تھا، اس کو طلبِ خبر کے لیے استعمال کیا گیا، اس لیے کہ یہ دونوں طلب میں مشترک ہیں۔ چنانچہ اس میں دو مجاز ہیں: ایک تو "رَأَی" کا استعمال، جو خبر دینے میں بہ معنی "علم" یا "أبصر" ہے۔ دوسرا ہمزہ کا استعمال ہے جو طلبِ اخبار میں طلبِ رؤیت کے لیے ہے۔ (قاله الشهاب)

شیخ نے دو مجاز یوں بتائے کہ رؤیت کا اطلاق کیا گیا اور اخبار مراد لیا گیا، اس لیے کہ رؤیت (دیکھنا) اخبار (خبر دینا) کا سبب ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ استفہام بہ معنی امر ٹھہرایا گیا، اس لیے کہ استفہام و امر دونوں میں طلب ہوتی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ﴿ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ هُوَ فِیۡ شِقَاقٍ ﴾ اصل میں "أَيُّ شَيۡءٍ أَضَلُّ مِنۡكُمۡ" ہے، یعنی کون سی شے تم سے بڑھ کر گمراہ ہے۔ لہٰذا "مَنۡ هُوَ فِيۡ شِقَاقٍ" کو "مِنۡكُمۡ" کی جگہ میں رکھا ہے، اس لیے کہ منظور ان کے حال کا بیان کرنا ہے جو شقاق و مخالفت میں ہے۔ اور یہ مخالفت ان کی گمراہی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ "رَأَی" کا پہلا مفعول محذوف ہے۔ "أَيۡ: أَرَءَيۡتُمۡ أَنۡفُسَكُمۡ" یعنی تم مجھے اپنی جانوں کی خبر دو۔ دوسرا مفعول جملہ استفہامیہ ہے۔ (كما قاله الكرخي)

اور جملہ شرطیہ معترضہ ہے دونوں مفعولوں کے درمیان اور شرط کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "فَأَنۡتُمۡ أَضَلُّ مِنۡ غَيۡرِكُمۡ" یا "فَلَا أَحَدٌ أَضَلُّ مِنۡكُمۡ" (أفاده الجمل) یعنی تم سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں، اس لیے کہ تم نہایت دور کی مخالفت میں ہو، کیوں کہ جو کوئی اس شے کا منکر ہوا جو اللہ تعالیٰ کے پاس سے نازل ہوئی، اس طرح سے منکر ہوا کہ اس کو یوں کہے کہ وہ اگلوں کی کہانیاں ہیں یا شعر و سحر ہے، یا چنیں و چناں ہے تو بے شک وہ اللہ کا ایسا دشمن ہوا کہ اس کی دشمنی دوستی سے نہایت دور جا پڑی اور ایسا مخالف ہوا کہ اس کی مخالفت اتفاق سے انتہائی دور جا پڑی اور بلاشک جو ایسا ہے تو وہ انتہا درجے کی گمراہی میں اور پرلے سرے کے بہکاوے میں ہے۔

چونکہ آیت کا حاصل یہ تھا کہ تم نے جب یہ قرآن سنا تو اس سے اعراض کیا، یہاں تک کہا کہ ہمارے دل اس شے سے غلافوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہیں اور یہ امر بالضرورت معلوم ہے کہ قرآن کا اس قسم سے ہونا کہ اس سے اعراض کرنا اور اس کو ترک کرنا واجب ہے، اس کا علم و یقین اس قبیل سے نہیں ہے کہ بالبدیہہ حاصل ہو جائے اور توحید و نبوت کے قائل ہونے کی برائی کا علم بھی ایسا نہیں ہے۔ جب یہ بات ثابت ہوئی تو اب جو کوئی اس میں غور و فکر اور استدلال کی طرف رجوع کرنے سے پہلے قرآن سے اعراض کرے اور اس میں جو چیزیں اعتقاد اور عمل کے متعلق ہیں، ان کا منکر ہو تو وہ واجب الاتباع حق کا منکر ہونے سے اور عذابِ شدید کا مستحق ہونے سے کیسے امن میں رہ سکتا ہے!

چنانچہ قرآن شریف کی تکذیب پر اڑے رہنا اور اس میں غور و فکر اور استدلال سے پہلے ہی اس سے منہ موڑ لینا، نہایت درجے کی بعید بات ہے۔ کوئی عقل مند ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر ذرا بھی اس کی آیتوں اور دلیلوں میں غور و فکر کرتے تو اس کی حقیقت اور ان امور کی درستی جن کی طرف وہ بلاتا ہے، روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو جاتی۔ لیکن چونکہ عداوت اور دشمنی کی کالی گھٹا ان کے دلوں پر چھا رہی تھی، اس لیے اس کی دلیلوں کی روشنی سے اندھے ہو کر انکار و اعراض کیا۔

جب ان آیتوں کے دکھانے سے کام نہ چلا تو اللہ پاک نے ان کو دوسری آیتیں دکھانے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ یعنی عن قریب ہم ان کو قرآن کے سچ ہونے کی دلالتیں اور اطرافِ زمین میں ایسی علامتیں دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی جانوں میں ایسی باتیں دکھائیں گے جن سے ان کے لیے یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ وہ حق ہے۔ آفاقی آیات سے مراد وہ حوادث ہیں جن کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے ان کو خبر دی، یعنی آیندہ پیش آنے والے واقعات اور گزرے ہوئے حوادث کے آثار اور ملکوں کا فتح کرنا جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے اور آپ ﷺ کے خلفاء کے لیے میسر کیے اور مشرق و مغرب کے ممالک پر خرقِ عادت کے طور پر آپ کو غلبہ اور تسلط عطا فرمایا۔

چنانچہ اگر قرآن اور رسول، جس پر اس کو نازل کیا، حق نہ ہوتے تو آیندہ حوادث کا وقوع ویسا نہ ہوتا جیسی ان کی خبر دی تھی، حالاں کہ وہ حوادث عالمِ غیب میں تھے اور جو خبریں قرآن میں گزرے ہوئے حوادث کے بارے میں ہیں، وہ اس کے مطابق نہ ہوتے جو تواریخ والوں کے نزدیک مقرر اور لکھے ہوئے ہیں، حالاں کہ خبر دینے والا اُمی ہے، نہ لکھنا جانے نہ پڑھنا اور نہ تاریخ دان لوگوں سے ملا جلا اور اسی طرح جو لوگ حاملینِ قرآن ہیں اور اس پر ایمان لائے ہیں، ان کو یہ خارقِ عادت نصرت نہ دیتا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں کی اور ان کے خلفاء کے دشمنوں کی اور ان کے ناصرینِ دین کے دشمنوں کی ذلت اور شکست ہر زمانے میں بطور خارقِ عادت و خارج از معہود ہوئی ہے۔

چنانچہ اگر دین کا معاملہ حق نہ ہوتا تو ان کو یہ ثبات اور غلبہ و استقرار نہ ہوتا، کیوں کہ باطل کی تو ایک ہوا چلتی

ہے، پھر تھم جاتی ہے اور ایک غلبہ ظاہر ہوتا ہے، پھر مضمحل ہو جاتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یعنی ہم ان کو آفاق میں اپنی وحدانیت وقدرت کی نشانیاں دکھائیں گے، یعنی اگلی اُمتوں کے منازل کا اجڑنا اور ان کی جانوں میں آزمائش یا امراض کے ساتھ۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آفاق میں تو آیاتِ سماء اور ان کے نفوس میں حوادثِ ارض۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آفاق میں ان بستیوں کا فتح ہونا جن کی فتح اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے اور آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء کے لیے میسر کی اور عموماً مشرق ومغرب کے ممالک میں اور مغرب کی طرف خصوصاً ایسی فتوحات کہ ان جیسی فتوحات خلفائے زمین میں سے کسی کو ان سے پہلے میسر نہ ہوئیں۔ یا جابر اور کسریٰ جیسے حکمرانوں پر غلبہ عطا کرنا اور ان کے قلیل کا کثیر پر غالب کرنا اور ان کے ضعفاء کا ان کے قوی لوگوں پر مسلط کرنا اور ان کے ہاتھوں پر اللہ پاک کا ایسے امور کا جاری کرنا جو معہود سے خارج اور خارقِ عادات ہیں۔

﴿ وَفِيٓ اَنْفُسِهِمْ ﴾ سے مراد فتح مکہ ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو ترجیح دی ہے اور منہال بن عمرو اور سدی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ فِي الْاٰفَاقِ ﴾ سے اللہ پاک کی مراد وہ واقعات ہیں جو اُمتوں میں واقع ہوئے اور ﴿ وَفِيٓ اَنْفُسِهِمْ ﴾ سے مراد بدر کا دن ہے۔ عطاء رحمہ اللہ نے کہا ﴿ فِي الْاٰفَاقِ ﴾ سے مراد اقطارِ سماوات و ارض ہیں، جیسے: سورج، چاند، تارے، رات و دن، ریاح و امطار و رعد و برق و صواعق اور روئیدگی، درخت، پہاڑ اور دریا وغیرہ۔[1] اور ﴿ فِيٓ اَنْفُسِهِمْ ﴾ سے مراد وہ لطیف کاری گری اور بدیع حکمت ہے جو انسان کی پیدائش میں رکھی ہے، یہاں تک کہ پاخانے اور پیشاب کی راہ میں کہ آدمی ایک جگہ سے کھاتا پیتا ہے اور دو جگہ سے متمیز ہو کر نکلتا ہے اور دونوں آنکھوں میں جن سے زمین سے لے کر آسمان تک پانچ سو برس کی راہ تک دیکھتا ہے اور دونوں کانوں میں جن سے مختلف آوازوں کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور عجیب وغریب حکمتیں ہیں جو اللہ پاک نے انسان میں رکھی ہیں۔

اب اگر کوئی کہے کہ ﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ ﴾ اس کا مقتضی ہے کہ اللہ پاک نے ان نشانیوں کے بارے میں ان کو مطلع نہیں کیا، بلکہ اس کے بعد ان کو مطلع کرے گا، باوجود اس کے کہ ان سب پر ان کو مطلع کر چکا اور یہ نشان ان کے پیشِ نظر ہیں تو کہیں گے کہ اس بنا پر مراد یہ ہے کہ ہم ان کو اپنی نشانیوں کے اسرار و بھید دکھائیں گے۔ چنانچہ اگر وہ بالفعل ان پر مطلع ہیں تو ان کے بھید اور حکمت کو ابھی تک نہیں جان سکے۔ (کذا قال الکرخي) امام ابن جریج رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ بارش روک دی ساری زمین سے۔ ﴿ وَفِيٓ اَنْفُسِهِمْ ﴾ میں کہا کہ وہ بلایا (آزمائشیں) جو اُن کے جسموں میں ہوتی ہیں۔

---

[1] تفسیر الطبري (۲۱/۴۹۳) تفسیر القرطبي (۱۵/۳۷۴، ۳۷۵)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مکہ والے سفر کرتے تو عاد وثمود کے آثار دیکھتے۔ پھر کہتے: "واللہ البتہ مقرر سچ کہا محمد ﷺ نے۔" اور ﴿ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ﴾ کے بارے میں فرمایا: امراض۔[1] کسی نے کہا کہ ﴿ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ﴾ سے مراد انسان کا نطفہ ہوتا ہے، اس کے سوا اور انتقالِ احوال، جس طرح کہ سورۃ المومنون میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔[2] ﴿ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ کی ضمیر قرآن شریف کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسلام کی طرف راجع ہے جس کو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔ کسی نے کہا کہ خود نبی اکرم ﷺ کی طرف راجع ہے، یعنی ان کو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ آپ ﷺ اللہ کے پاس سے رسولِ برحق ہیں۔ کسی نے کہا کہ اس شے کی طرف راجع ہے جو اللہ پاک ان کو دکھائے۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے دو قول لکھے ہیں: قرآن یا اسلام۔[3] قاضی رحمہ اللہ نے چار لکھے ہیں: قرآن یا رسول یا توحید یا اللہ۔[4] وجودیہ نے اس آیت کی یوں تحریف کی ہے کہ اس کو خالق ومخلوق کے اتحاد پر محمول کیا "تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا"۔ "آفَاقٌ" جمع "أُفُقٌ" بہ ضمِ ہمزہ وفاء ہے۔ اہلِ لغت نے اسی طرح کہا ہے، جیسے: أعنَاقٌ وعنق۔ افق کنارے کو کہتے ہیں۔ آفاق نواحی واطراف ہوئے۔ امام راغب رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ "أَفَقٌ" بہ فتحتین کہتے ہیں، جیسے: "جَبَلٌ وَأَجْبَالٌ"[5]

جملہ ﴿ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ مستانفہ ہے، اس سے منظور یہ ہے کہ ان کو ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کی جائے اس پر کہ قرآن کی شان میں تردد کرتے ہیں اور ان کے عناد پر جو داعی ہوتا ہے طرف وارد کرنے آیات کے اور اس پر کہ اللہ تعالیٰ کے خبر دینے پر اکتفا نہیں کرتے۔ ہمزہ انکاری ہے اور حرفِ واؤ مقدر پر عطف کے لیے ہے جس کا کہ مقام مقتضی ہے۔ "أَيْ: أَلَمْ يُغْنِهِمْ وَلَمْ يَكْفِهِمْ" اور ﴿ بِرَبِّكَ ﴾ محلِ رفع میں ہے فاعل ہے ﴿ يَكْفِ ﴾ کا۔ حرفِ باء زاید ہے فاعل میں۔ راجح یہی قول ہے اور مفعول محذوف ہے۔ "أَيْ: أَوَلَمْ يَكْفِكَ رَبُّكَ" اور ﴿ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ بدل ہے ﴿ بِرَبِّكَ ﴾ سے، کیا غنی نہ کیا ان کو اور کافی نہ ہوا ان کو آیاتِ موعودہ سے جو قرآن کی حقیقت بیان کرنے والی ہیں۔ (کسی نے ﴿ اَنَّهٗ ﴾ کو بالکسر پڑھا ہے بنا بر اضمارِ قول یا بنا بر استیناف)۔

یہ بات کہ اللہ پاک ساری اشیاء پر شہید ہے، یعنی اس کا ساری اشیاء پر شہید ہونا کافی ہے اور کسی آیت کی ضرورت نہیں ہے کہ قرآن کی حقیقت پر لائی جائے اس کے خبر دینے کے بعد کہ وہ حق ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ کیا تیرا رب کفار کے اعمال پر گواہ کافی نہیں ہے، یعنی اس کی گواہی کافی ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کیا تیرا رب اس پر شاہد کافی نہیں ہے کہ قرآن اس کے پاس سے اتارا گیا ہے۔ ﴿ شَهِيْدٌ ﴾ بہ معنی عالم ہے، یا بہ معنی حاضر،

---

[1] فتح القدير (٦٨٦/٤) [2] رقم الآية (١٣، ١٤) [3] تفسير النسفي (٩٥/٤)

[4] تفسير البيضاوي (١٢٠/٥) [5] اللباب في علوم الكتاب (١٥٨/١٧)

شہادت سے ماخوذ جس کے معنی حضور کے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اس جگہ کفایت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ عزوجل ان کے لیے وہ شے بیان کر چکا جس میں حقیقتِ قرآن پر یا دینِ اسلام پر یا نبیِ کریم ﷺ کی نبوت کے صدق پر کافی دلالت ہے۔[1] یا یہ معنی ہیں کہ کیا تجھ کو یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر شہید ہے، اس کا محقق ہے۔ چنانچہ وہ تیرے کام کو محقق کر دے گا آیاتِ موعودہ کے ظاہر کرنے سے جس طرح کہ اس نے باقی اشیاء کو محقق کیا ہے۔ یا وہ مطلع ہے تو وہ تیرے حال کو اور ان کے حال کو جانتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ کیا یہ امر انسان کو معاصی سے ڈرانے کے لیے کافی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہر شے پر مطلع ہے، کوئی پوشیدہ چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے۔ ﴿ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ﴾ یعنی خبردار! بے شک وہ بعث و حساب و ثواب و عذاب کے بارے میں شک میں ہیں۔ کسی نے (یعنی عبدالرحمان وحسن نے۔ یہ ایک لغت ہے ﴿ مِرْيَةٍ ﴾ بہ کسرِ میم میں۔)[2]

﴿ مُرْيَةٍ ﴾ کو بہ ضمِ میم پڑھا ہے، جیسے: "خِفْيَةٌ وَخُفْيَةٌ" ﴿ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ﴾ محاورے میں بولتے ہیں: "أَحَاطَ يُحِيْطُ إِحَاطَةً وَحِيْطَةً" یعنی اللہ پاک کے علم نے ساری معلومات کا اور اس کی قدرت نے سارے مقدورات کا احاطہ کر لیا ہے۔ اس میں وعیدِ شدید ہے، اس لیے کہ جس نے ہر شے کا احاطہ کر لیا، اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے تو وہ نیک کو اس کی نیکی کا بدلہ دے گا اور بد کو اس کی بدی کا۔[3] والله سبحانه أعلم بمراده وأسرار كتابه.

الحمد لله والمنة کہ اس سورت کی تفسیر قبل نماز صبح تاریخ ہفتم شعبان روز پنج شنبہ (جمعرات) ۱۳۱۳ ہجری کو محلّہ امیر گنج میں خاکسار ذوالفقار احمد کے دستِ ضعیف پر تمام ہوئی۔ الٰہی قبول کر اور آگے لکھنے کی توفیق دے۔ اللهم تب علينا واغفرلنا وارحمنا وعافنا واعف عنا، ووفقنا وأحسن عواقبتنا في الأمور كلها، وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب الآخرة، آمين. لا حول ولا قوة إلا بالله، وصل وسلم وبارك على سيدنا ومولانا ومولى العالمين سيد المرسلين محمد وعلى آله وصحبه وأتباعه وأشياعه إلى يوم الدين، آمين آمين آمين. والحمد لله أولًا وآخراً وظاهراً وباطناً.

---

(1) معاني القرآن (۳۹۲) (2) روح المعاني (۸/۲۵) (3) فتح البيان (۱۲/۲٦۷۔۲۷۰)